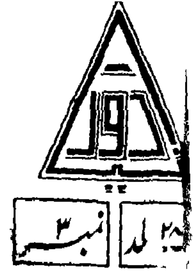
ديوان



عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے بہر حال متفق ہو



جلد ۲۷ | نمبر ۳

جون ۱۹۷۲ء

جیٹھ ۱۸۹۴ شک

سالانہ پانچ روپے

فی پرچہ پچاس پیسے

ایڈیٹر

خورشید احمد

پبلشر

سروجنی شرما

اطلاعات۔ اتر پردیش

پرنٹر

ک در

پرنٹنگ و اسٹیشنری۔ یو پی

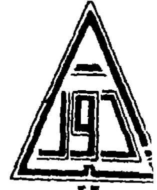
مطبوعہ

گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

ساتھ ۔۔۔۔

اطلاعات۔ اتر پردیش

سنہ ء



۲۸ لد | نمبر ۳

جون ۱۹۷۲ء
جیٹھ ۱۸۹۴ اشک

سالانہ پانچ روپے
ٹکٹ پچاس پیسے

اسڈیٹر
اخورشید احمد

پبلشر
روہنی شرما
اعات۔ اُتر پردیش

بیٹی
ک در
پرنٹنگ و اسٹیشنری۔ یو۔ پی

مطبوعہ
ورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنو

سالانہ چندہ
لاعات۔ اُتر پردیش

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے ہر حال متفق ہو

جیٹھ ۱۸۹۴ اشک

اپنی بات

وزیر مال شری ادت نرائن تیواری نے ۹ مئی ۱۹۷۲ء کو زرعی [illegible] شہری جایداد کی بالائی حد مقرر کرنے کی غرض سے الگ الگ دو بل اتر پردیش ریاستی اسمبلی میں پیش کیے۔ زرعی آراضی حد بل ۱۹۷۲ء کی رو سے شوہر، بیوی اور تین نابالغ بچوں پر مشتمل ایک خاندان کے لیے ان علاقوں میں جہاں آبپاشی کی سہولت میسر ہے جوت کی زیادہ سے زیادہ حد ۷٫۳۰ ہیکٹر رکھی گئی ہے جو ۱۸ ایکڑ سے کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ یہ بل دراصل اس قانون میں ترمیم کا بل ہے جو پردیش میں گزشتہ گیارہ سال سے نافذ ہے اور جس کی رو سے ۵ افراد پر مشتمل خاندان کے لیے جوت کی حد قسم زمین کے لحاظ سے ۴۰ تا ۱۲۵ ایکڑ تھی۔ لیکن زیر نظر ترمیمی بل میں یہ حد گھٹا کر ۱۸ ایکڑ کر دی گئی ہے اور افراد خاندان کی تعداد بھی جوت کی انتہائی حد کے مقصد سے ۵ سے گھٹا کر ۵ کر دی گئی ہے جن میں شوہر اور بیوی کے علاوہ تین نابالغ بچے شامل کیے گئے ہیں۔ البتہ سہولت کے خیال سے ہر خاندان میں بالغ لڑکوں کے لیے ۵ ایکڑ فی بالغ کے حساب سے مزید آراضی رکھنے کی اجازت دی گئی ہے مگر یہ مزید آراضی مجموعی طور سے ۱۵ ایکڑ سے زائد نہ ہوگی۔ غیر آبپاشی والے علاقوں میں یہ حد آبپاشی والے علاقے کی حد کی ڈیوڑھی اور باغات کے معاملے میں دگنی ہوگی۔ بندیل کھنڈ اور بعض دیگر علاقوں میں یہ حد ۳۵ ایکڑ تک رکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اس بل کے ذریعے بہت سے مستثنیات جو سابقہ قانون میں رکھے گئے تھے ختم کر دیے گئے ہیں۔

اسی طرح شہری جایداد انتہائی حد بل ۱۹۷۲ء میں پانچ افراد پر مشتمل خاندان کے لیے جایداد کی حد تین لاکھ روپے رکھی گئی ہے اور مزید سہولت بہم پہنچانے کے خیال سے ہر خاندان کو فی بالغ ایک لاکھ روپے کی مزید جایداد رکھنے کی اجازت ہوگی۔ مگر زرعی آراضی حد کی طرح شہری جایداد کے سلسلے میں بھی مزید جایداد ۲ لاکھ روپے سے زائد نہ ہونا چاہیے۔

ہم نے اپنا نصب العین سوشلزم بنایا ہے اور سوشلزم ہی کے راستے ملک کو ترقی کی جانب لے جانا اور اسے خوش حال بنانا چاہتے ہیں۔ خوش حالی کے لیے نابرابری کو ختم کرنا اتنا ہی ضروری ہے جتنا ضروری ملک کو غیر ملکی اقتدار سے نجات دلانا اور اسے آزاد کرانا تھا۔ حصول آزادی اس طرح پہلا قدم تھا۔ دوسرا قدم عدم مساوات اور سماجی و اقتصادی نابرابری کو دور کرنا ہے اور حد بندی کے مجوزہ دونوں قانون اس سمت خاصے بڑے قدم ہیں جو حکومت اتر پردیش نے اٹھائے ہیں۔

● اتر پردیش اردو اکاڈمی نے پورے خلوص اور انہماک سے کام کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس کا ثبوت وہ کام ہیں جو اس نے اپنے قیام کی قلیل مدت کے دوران انجام دیے ہیں۔ ان کاموں کی جانب وزیر ریاست برائے سماجی بہبود، سیاحت و یک جہتی اتر پردیش اور اردو اکاڈمی کی صدر بیگم حامدہ حبیب اللہ نے ایک جلسے میں کیا جو حال ہی میں لکھنؤ میں اردو کو مقبول عام بنانے کے ذرائع اور وسائل دریافت کرنے کے لیے منعقد ہوا تھا۔ اردو اکاڈمی نے اس عرصے میں مختلف شعبوں میں کام کرنے کے لیے متعدد ذیلی کمیٹیاں قائم کی ہیں۔ ان ذیلی کمیٹیوں میں علاوہ دیگر کمیٹیوں کے ایک ترجیحات ذیلی کمیٹی، ایک تعلیمی ذیلی کمیٹی، ایک کتب خانوں و دارالمطالعوں کو مالی امداد دینے کی ذیلی کمیٹی، ایک کتابوں پر انعام دینے کی ذیلی کمیٹی اور ایک مصنفین کو مالی امداد دینے کی ذیلی کمیٹی شامل ہے۔ بیشتر ذیلی کمیٹیوں نے اپنا کام شروع کر دیا ہے چنانچہ انعام ذیلی کمیٹی کی سفارش پر اتر پردیش اردو اکاڈمی کی مجلس انتظامیہ نے دس گیارہ مصنفوں کو ان کی کتابوں پر جو یکم دسمبر ۱۹۷۰ء اور ۳۰ نومبر ۱۹۷۱ء کے درمیان شائع ہوئی تھیں مجموعی طور سے دس ہزار سات سو روپے کے انعامات دیے ہیں۔ یہ کتابیں اردو اکاڈمی کے قیام کے بعد ڈائرکٹر تعلیمات اتر پردیش کی معرفت اکاڈمی کو موصول ہوئی تھیں۔ ان کتابوں کے علاوہ اکاڈمی اردو کی دوسری کتابوں پر بھی انعامات دے گی۔ اس سلسلے میں اکاڈمی کی جانب سے قواعد و ضوابط اور مزید کتابیں بھیجنے کی تاریخ کا عنقریب اعلان ہونے والا ہے۔ ڈائرکٹر تعلیمات کی معرفت موصولہ جن کتابوں پر اکاڈمی نے انعامات دیے ہیں ان کے نام مع مصنفین اور رقوم انعام یہ ہیں: خواجہ میر درد از ڈاکٹر وحید اختر ۲ روپے، ڈھائی دھرم از اختر انصاری ۲ روپے، انتخاب از حسن نعیم ۱ روپے، عراقی امیتی میں حد ماتی تاویل از ڈاکٹر سلام سندیلوی ۱ روپے، یادوں کی خوشبو از رشید احمد جامی ۱ روپے، لاہور کا جو ذکر کیا از گوپال متل ۱ روپے، گھر آنگن از جاں نثار اختر ۱ روپے، دو قدم ایک منزل از شایان قدوائی ۱ روپے، آج کی سائنس از امیر حیات لال ۱ روپے، حسن لب از ایاز ملگرامی ۱ روپے اور جدول سائنس از عزیز احمد قاسمی ۵ روپے۔

کتب خانوں اور دارالمطالعوں سے مالی امداد کے لیے اکاڈمی کے مقررہ فارم پر درخواستیں طلب کی جائیں گی۔ اس اثنا میں اکاڈمی کو نظامت تعلیم کی وساطت سے جو درخواستیں موصول ہو چکی ہیں ان پر امداد کے لیے لائبریری ذیلی کمیٹی غور کرے گی۔ اسی طرح مصنفین کو مالی امداد دینے سے متعلق ذیلی کمیٹی بھی جلد ہی ضروری قواعد وضع کرے گی اور ضرورت مند مصنفین کو مالی امداد دینے کی سفارش کرے گی۔

اردو اکاڈمی نے اپنا کام باقاعدہ طور سے شروع کر دیا ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کی ترقی سے دلچسپی رکھنے والے اپنے مفید مشوروں سے اکاڈمی کے ساتھ تعاون کریں تاکہ وہ اپنے مقاصد حاصل کر سکے اور ماضی کی طرح اردو زبان جدید ہندستان کو مستحکم، خود کفیل اور خوش حال بنانے میں ایک اہم رول ادا کر سکے۔

ایڈیٹر

نکہت و رنگ

جمیل مظہری

بوئے گل سے یہ رنگِ گل نے کہا
تو وطن کو چلی بہ دوشِ صبا

اور میں ہوں ہنوز اسیرِ قفس
مجھ کو بھی اپنے ساتھ لیتی چل

پھول کا ہو چکا ہے سینہ چاک
آچکا اس کی زندگی میں خلل

میں بھی مہماں ہوں چند لمحوں کا
میرا اک لمحہ انتظار تو کر

قفسِ گل کی تیلیاں ٹوٹیں
ہو مبارک تجھے نشاطِ سفر

بوئے گل بولی اے رفیق مرے!
تجھ میں یک گونہ جو کثافت ہے

یہی اس زندگی کی لعنت ہے
ہے اسی سے ترے قیام کو طول

ایک لمحہ ہو یا کہ دو لمحہ
جھیلنی ہے تجھے یہ قیدِ فضول

یوں بھی کیا ہے سوالِ ہم سفری
ہے یہ گلزارِ دو جہاں گذری

موجِ مے، موجِ آب، موجِ نسیم
زلفِ پُرپیچ و عنبریں کی شمیم

نکہت و رنگ ہو کہ شعلہ و دود
اک سفر ہے یہ کاروانِ وجود

فائدہ کیا ہے ساتھ چلنے کا
جب نہ منزل، نہ راستا معلوم

کس کی منزل کہاں ہو کیا معلوم
ہم کہاں، تو کہاں، خدا معلوم

عین ممکن ہے یہ کہ ہم اے دوست
ہوں گرفتارِ زلفِ مشکیں میں

تو مقید ہو رشِ رنگیں میں
پھر ہے کیا سُود ہم عنانی کا

ہر اثر اس جہانِ فانی کا
اک مرقع ہے بہتے پانی کا

ہم تو ملتے ہی ہیں بچھڑنے کو
تیز ہیں بحرِ وقت کے دھارے

میں چلی، الفراق! اے پیارے!

عظمت اللہ خاں کا نظریۂ شاعری اور شاعری

بشیر بدر

[سیاد ورنامہ اپریل ۱۹۶۲ء میں عظمت اللہ خاں کے نظریات شاعری پر روشنی ڈالی گئی تھی۔ زیر نظر حصے میں ان کی شاعری سے بحث کی گئی ہے ——— ایڈیٹر]

مرحوم کی روح اگر میرے خلوص سے بدگمان نہ ہو تو میں اسی گردن زدنی صنف سخن کا یہ شعر پڑھوں ؎

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا
یہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

اچھے شاعر کا فن اس کا شعر ہے۔ اس کی نثر اسے سمجھنے میں ضرور مدد دے سکتی ہے لیکن اُسے غلط سمجھنے میں بھی مدد دے سکتی ہے۔ خاص طور پر جب شاعر باغی اور رومانی ہو۔ عظمت اللہ خاں کی رومانی سفاکی غزل سے زیادہ اُن کی اپنی شاعری پر ظلم کرتی ہے۔ یہ رومانی اُن کی عقل سے وہ بڑا کام لینا چاہتی ہے جس کے وہ اہل نہیں۔ ایک خوبصورت شاعر کے لیے یہ کم نصیبی زیادہ عیب بھی نہیں۔ عظمت اللہ خاں میں ماقدانہ بصیرت اور فلسفیانہ بلوغت نہیں ہے۔ مگر سخن کی ایک خوبصورت دُنیا تخلیق کرنے کی صلاحیت ہے۔ یہ دنیا محبت کی مختصر دُنیا ہے۔

اچھی اور عظیم شاعری جذبہ و فکر کا امتزاج ہوتی ہے اس میں درد دل کے گوشے، فکر و حکمت کے وزن کی وجہ سے اِسی مادی دنیا کے آس پاس چمکتے ہیں، غیر مادی یا ماورائی نہیں ہو جاتے ہیں۔ پوری زندگی کی ترجمان شاعری بہت معصوم اور رومانی نہیں ہو سکتی۔ دُنیا میں عقل و حکمت کا بھی حُسن ہے۔ غور و فکر نے بھی اسے سنوارا ہے۔ اس لیے زندگی کی عکاس شاعری میں اپنا دَور، ماضی، مستقبل، اُن کے تفکرات، یادداشت اور تجربات ہوتے ہیں لیکن ایسی شاعری جس میں بچپن کی یادیں، نوجوانی کے رومانی تجربے، زندگی اور حسن کو چھونے اور پانے کی لذت اور تمنا ہو یا شادی کے بعد اپنے گھر کی پاک مسرتیں ہوں، خوبصورت اور حقیقی ہوتے بھی فلسفیانہ غور و فکر کی شرط نہیں رکھتی۔ ان کیفیاتی منظروں کا عکاس ہماری وسیع دُنیا کے ایک خوبصورت حصے کا عکاس ہوتا ہے۔ آج بھی انسان گناہ محبت میں معصوم نظر آتا ہے۔ عظمت اللہ خاں کی کافی نظمیں اسی معصوم محبت کے رنگ میں ڈوبی ہوئی خوبصورت منظریہ ہیں۔ وہ اس شعری دُنیا کی تخلیق کرتے ہیں جس میں 'موہنی مورت موہنے والی'، 'پیارا پیارا گھر اپنا'، 'من موہن بن رو رہی آتما کے سورج کی'، 'مرنے حُسن کے لیے کیوں مرے'، 'دام میں یاں نہ آیئے'، 'پیت کی ماری ستی'، 'شاعر رویا تھی'، 'بالی بیوی سے'، 'وہ پھول ہوں جس کا پھل نہیں'، 'مجھے پیت کا یاں کوئی پھل نہ ملا'، 'تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو'، 'برسات کی رات دکن میں' جیسی خوبصورت نظمیں ہیں

عظمت اللہ خاں نے خوبصورت دنوں کی خوبصورت یادوں کی شعری کہانی لکھی ہے۔ اُن کی کہانی یادوں کی کہانی ہے جو بچپن کی محبت سے عبارت ہے۔ اس معصوم محبت کی نرم و گرم جھلکیاں ہم

ی بار اُردو میں دیکھتے ہیں۔ عظمت اللہ ہمیں بچپن کی اس
نیا میں لے جاتے ہیں جہاں معصومیت، بے فکری اور بھولی
بھالی یادیں ہیں۔ دو تین گھروں کا آپس میں میل جول۔ اینٹیں
جما کر بنائی ہوئی گھڑکی۔ بچپن کے کھیل۔ گڑیا گڈے کی شادی۔
آنکھ مچولی۔ چھوٹے لڑکے، لڑکیوں کی غیر شعوری کشش۔ یہ تصویریں
پہلی بار کامیابی کے ساتھ عظمت اللہ کی نظم "تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو"
میں ملتی ہیں۔

تھے پڑوسی ہم یہ یہ حال تھا کہ گھروں میں کھڑکی سائی تھی
تھے عزیز ہم۔ یہ خیال تھا کوئی تیسرا نہ ہم میں پرائی تھی
تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ لڑائیاں بھی کبھی کبھی کبھی روٹھنا، کبھی مَن گئے
ابھی کٹیاں تو ملاپ ابھی ابھی چٹکیاں ابھی قہقہے
تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

وہ تمھاری گڑیا کی شادیاں وہ مرا برات کا انتظام
مرا باجہ منہ کا سیٹیاں بڑا شور و غل بڑی دھوم دھام
تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

لیکن تعلیم نے اس پیار کو دبا دیا۔ محبت وہی ہے جو مٹی میں دبے تو جڑ پکڑ جائے۔ جب دونوں کے راستے بھی جدا جدا ہوئے اس وقت بھی بچپن کی یاد ٹیس بن کر دلوں میں بسی رہی۔ پیار اُن کے یہاں درد کے کونپل کی طرح بچپن میں پھوٹتا ہے اور جوانی تک درد کا شجر ہو جاتا ہے۔ اس درد میں نہ وہ جنون و دیوانہ پن ہے جو ساری دُنیا سے الگ کر کے روایتی مجنوں اور لیلیٰ بنا دے، بلکہ یہاں درد محبت، کارِ جہاں میں روشنی کا نشتر بن کر گاہے گاہے کلیجے میں چبھتا رہتا ہے۔ "مجھے پیت کا ہاں کوئی پھل نہ ملا" بھی عورت کی دبی د کا نغمہ ہے۔ وہ محبت جو اپنے خاندان کے لڑکے لڑکیوں کے درمیان کھیل ہی کھیل میں "اپنے تایا کے پوت" سے ہو گئی۔ دونوں ایک دوسرے کو پہچان گئے۔ اُسی لڑکی کی زبانی سے سنیئے۔

تھے تو باپ ہی تم پہ تھا تم کو بڑا مرا دھیان۔ کس کی مجال تھی
مجھے ٹیڑھی نظر سے بھی دیکھے ذرا مجھے کھیل میں بھی۔ دُکھی کیا

اِس محبت کی ٹکر نے بچپن ہی میں اپنے دل میں کسی کو بسا لیا تھا

مرے سر میں تمھارا ہی دھیان سا مری چاہ کے راج دُلارے بنے
تمھیں دیوتا مان کے میں نے رکھا مری بھولی سی آنکھوں کے تارے بنے

اس کی چچی نے اِس پیار کو اور ہوا دے دی

مرا جیتو ابھی سے ہے اس پہ فدا یہ بھولی ہے موہنی میری ہو
یہ چچی کا کہا مرے دل سے گُھسا دہیں دوڑ گیا مرے مُنہ پہ لہو

اسی بات کے گھر میں چرچے ہوئے سبھی کہتے تھے مجھ کو تمھاری دُلھن
مجھے تم نے بھی اپنے لگا کے گلے کئی بار کہا۔ میری پیاری دُلھن

لیکن "تایا" گھر کی معصوم دُنیا کے علاوہ باہر کا زمانہ بھی دیکھے تھے۔ انھوں نے اپنے ہونہار لڑکے کے لئے کوئی اور ہی گھرانا ڈھونڈ لیا۔ اس درد کی کلی نے بھی اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا۔ شادی کے کاموں میں ایسا کھوئی کہ دُنیا کو اس کے پیار کا گمان تک نہ ہوا لیکن درد کی یہ ہوا بڑے بڑے جنگلوں کو جھلسا دیتی ہے۔ گلاب کی وہ حیر کلی کب تک مقابلہ کرتی۔ چپکے چپکے وہاں پہنچ گئی جہاں بیت کی آگ سارے تن کو جلا رہی ہے۔ آخری وقت ہے

مرا آخری وقت ہے آن لگا کوئی اور ہے تمھاری پیاری دُلھن
مجھے اب بھی تمھارا ہی دھیان لگا یہی یہ رہی ہوں تمھاری دُلھن

عظمت اللہ کی جن نظموں میں پیار کی ابتدا کھیلنے کودنے کے دنوں سے ہے، اُن میں دلوں کی معصوم کشش ہے۔ پھر یہ جوانی کی لہک اور من کی لیک نہیں۔ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ ابتدائے جوانی یا عین جوانی میں وصال نہیں ہوتا۔ بلکہ ہجر و دوری ہوتی ہے خواہ وہ "تایا" کی زمانہ سازی سے ہو یا دُنیا کی رکاوٹ اور فریق ثانی کی بے وفائی سے، مگر یہ لڑکے لڑکیاں حسوں کی گرفت میں نہیں ہیں۔ اُن کے یہاں مثالی محبت کا وہ دیوانہ پن نہیں بلکہ اسی دُنیا میں رہ کر پیار کرنا ہے۔ پیار کے ساتھ ساتھ سماجی اور اخلاقی تصوّر انھیں اپنا دِل مسوس کر رہ جانے، ضبط کر جانے ضبط کرتے کرتے خاک ہو جانے پر مجبور کرتا ہے۔ اس طرح بچپن کی سرشاریاں جوانی

کمر آتے آتے اکثر تجربے کسک میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔

'مرے حسن کے کیوں لیے مرے' ایک ایسی ہی لڑکی کی داستان ہے جس نے دل و جان سے اپنے محبوب کو چاہا ہے اور اپنا سب کچھ اس پر نثار کر دیا ہے۔

مری چاہ لی۔ مرا دل لیا جو طلب کیا وہ تمھیں دیا
جو نہی حسن سے مرے دل بھرا وہ پھری نگاہ وہ دل پھرا
مرے حسن کے لیے کیوں مرے
ہیں لیے تھے تمھیں یوں مرے

لڑکے کی بے وفائی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اسے صرف طلب حسن و جسم تھی۔ وہ بے وفا تھا۔ مگر لڑکی وفا کی پتلی تھی۔ اس بے وفا سے نفرت تو کیا کرتی بھلا تک نہ سکی۔

تمھیں چاہ اور کی جب ہوئی مری وہ بہشت تو جا چکی
مگر آرزو یہ ضرور تھی تمھیں دیکھ لیتی کبھی کبھی
مرے حسن کے لیے کیوں مرے
ہیں لیے تھے تمھیں یوں مرے

اسی طرح ایک نظم "دام میں یاں نہ آیئے" میں مرد کی سچی محبت اور عورت کی جنسی آلودگی ہے۔ یہ نوجوان مرے حسن کے کیوں لے مرے کی ہیروئن کی طرح معصوم ہے۔ محبت اس کی ضرورت نہیں فطرت ہے۔ برخلاف اس کے اس کی ہیروئن دنیادار ہے۔ شروع میں محبت کی پینگ بڑھاتی ہے۔ اس کے دل کو محبت کا پہلا سبق پڑھاتی ہے۔ لڑکیں کو مرد کرتی ہے۔ لڑکے نے اس اتصال جسم سے زیادہ اتصال روح و جسم کو سمجھا لیکن عورت دھن والی تھی اسے دنیاوی جاہ اور حصول زر تھا۔ ایک کرس رئیس اس کے دام حسن میں گرفتار ہوا۔ اس نے اس سے شادی کر لی اور اس نظم کے معصوم نوجوان کو دنیاداری سکھانا چاہتی ہے کہ شادی تو دنیاداری ہے۔ کر لی۔ ورنہ دل سے اب بھی میں تمھاری ہوں۔ ہمارے عیش وصال بدستور رہیں گے۔

مجھ سے کہا کہ کیا ہوا اب بھی ہوں تم پہ میں فدا
عیش مرے وہی رہیں وہی رہے معاملا

اس نوجوان کے یہاں محبت کا تصور خالص جسمانی نہیں بلکہ وہ روح و جسم کا اتصال ہے۔ اس کی اس ریاکاری پر اس کے جی میں آیا۔ ؎

سنتے ہی جی میں آئی یہ گھونٹ دوں بے وفا کا گلا
خون کا گھونٹ پی کے میں واں سے چلا یہ کہہ چلا
دام میں یاں نہ آیئے۔ دل نہ یہاں لگایئے

یہ بات پوری یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ ان کے یہاں بچپن، اس سے وابستہ گھر، کھیل، تماشے، انھیں میں دو بچوں کا روحانی پیار ان کی سب سے عزیز یادیں ہیں لیکن عظمت اللہ خاں ایک دل گرم اور ذہن بیدار رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں نظموں کے کردار رومانی ٹائپ ہیں، نہ ہی یکسر تخیل زدہ ہیں۔ تخیل، رومان اور حقیقت کا عکس ان کے کرداروں کی زندگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں یکسانیت کا ڈھرا نہیں ہے بلکہ مختلف شکلیں ہیں، نہ فارمولا ہے کہ مرد بے وفا ہوتا ہے یا عورت باوفا ہوتی ہے۔ ایک نظم میں ہم نے مرد کی بے وفائی دیکھی تو دوسری میں عورت کی عیاری۔ اس طرح عظمت اللہ کے یہاں واقعات اور کردار کا تنوع اپنی مخصوص دنیا میں ہے لیکن یہ بات بھی طے ہے کہ وہ صرف محبت کے شاعر ہیں، محبت جو بچپن میں معصومیت ہے، جوانی میں مہک ہے۔ بے وفائی میں درد اور حقیقت میں امر ہے۔ یہی محبت میاں، بیوی کے روپ میں ایک خوش حال گھر بناتی ہے۔

بچپن کی یادوں اور نوجوانی کی رومانی محبت سے ان کا قدم اور آگے بڑھتا ہے اب وہ میاں بیوی کی محبت کو اپنے شعری قصوں کا نغمہ بناتے ہیں۔ عظمت اللہ اپنی تمام نمائندہ نظموں میں رومانی نظر سے زندگی کی حقیقتوں کو دیکھتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں بچپن سے لے کر گھر بس جانے تک کی اس زندگی کی پرخلوص عکاسی ہے جو محبت اور حسن کی زندگی ہے۔ ان کا مزاج رومانی لے کا اظہار ہے۔ اس رومانی معصومیت میں ذہانت یا کتابی رہنمائی سے شامل کی ہوئی زندگی کی سنجیدہ حقیقتوں کا امتزاج غیر فطری ہوتا ہے۔ رومانی لہر کا یہ دھارا، حسن، جوانی اور اپنے گھر کے محدود حلقے میں رہ کر سچا ہے کہ اس میں تجربہ کی سچائی ہے، اظہار کی سادگی

ہے۔ اس کی لذت میں جہاں دیدہ ہوسناک لذتیت نہیں بلکہ ایک متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ رومانی نوجوان کی لذتیت ہے۔ اُن کے درد میں تیر نشتر کی کاٹ نہیں بلکہ کسک ہے۔ یوں بھی عظمت اللہ کے یہاں جذبہ کا وہ جنون نہیں جو بے خطر آتش نمرود میں کود پڑے نہ ہی درد کی گہرائی ہے۔ نہ میر کی نشتریت ہے نہ اقبال کی حرکت عظمت اللہ خاں کیٹس کی طرح حُسن کے تصور میں سرتا قدم پگھلتا ہوا احساس نہیں ہو جاتے بلکہ اُن کی دھیمی لے، جاڑوں کی نرم دھوپ ہے یہ محبت بن کر دل کو گرم اور روشن رکھتی ہے ایسی سلامت روی جذبہ کے چمک کے بجائے جذبوں کی کہانی سُنا سکتی ہے، سپردگی چاہت کی تدریج، کیفیت کا ایک نشتر لگا سکتی ہے لیکن یاد یا درد کہانی بن کر ندی کی طرح چُپ چاپ دور تک دیر تک رواں رہے اس کے لیے عظمت اللہ خاں جیسے مخصوص، نرم رومانی جذبہ کی ضرورت ہے۔ عظمت اللہ کی یہ انفرادیت ہے کہ متوسط طبقے کی وہ تصاویر، اُن کے رومانی مسائل، مسلم گھرانوں میں رشتہ دار بھائی بہنوں سے پُرخلوص پیار، ناکامی پر خاموشی سے کڑھنا، جلنا، اُن کے شعروں میں مل جائیں گی۔ یہ اس دور کے نمایندہ ادبی رجحانات تھے۔ یہ کہانیوں کی فضا تھی جو عظمت اللہ خاں کے یہاں اتنی معصومیت اور خلوص کے ساتھ نظر آتی ہے۔

چند نظموں میں عظمت اللہ اپنی انھیں تمام صفات کے ساتھ ایک قدم اور آگے بڑھے۔

یہاں محبت کامراں ہے۔ یہ محبت نئے شادی شدہ جوڑے کی ہے۔ اس میں پیار کو پانے کی آرزو، چاہے اور چاہے جانے کی طلب، حُسن کی شرمساری، عشق کی شرم دستی، شعری مرقعے بن جاتی ہیں۔ 'بالی بیوی سے'، اور 'پہلا آمنا سامنا' موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے بہت ملتی جلتی نظمیں ہیں۔ دونوں میں شادی کے بعد کی اجنبیت، شرم، فطری چاہت موجود ہے۔ 'بالی بیوی سے' میں حسن نو بہار کا یوں نقشہ کھینچا ہے۔

تو کلی ہے نئی نئی ابھی بند ہیں پنکھڑیاں
ابھی سال کٹیں گئی کہ چمک پڑیں انکھڑیاں
ابھی آنکھ ڈری ڈری سی ہے ابھی آگ دبی دبی سی ہے

یہ سراپا ملاحظہ ہو

ترے ہونٹ یہ لال ہیں نہیں سانس میں گرمیاں
ترے پھول سے گال ہیں نہیں باس میں مستیاں
ابھی آنکھ ڈری ڈری سی ہے ابھی آگ دبی دبی سی ہے

یہ نظم اپنے اختتام تک پہنچتے پہنچتے بہت متوازن ہو جاتی ہے۔ شاعر کی اس خود کلامی میں ایک نیک آرزو ہے کہ میں اپنی محبت سے اپنی بیوی کی روح جیت لوں تب ہی محبت کی زندگی واقعی ملے گی۔

ترے کھلنے کے ساتھ ساتھ ترے دل میں ہو گھر مرا
تری روح جو آئے ہاتھ مجھے زیست کا پھل ملا
ابھی آنکھ ڈری ڈری سی ہے ابھی آگ دبی دبی سی ہے

'پہلا آمنا سامنا' میں نسبتاً شوخی زیادہ ہے لیکن محبت کی تمازت سے یہ نظم اسی طرح روشن ہے۔ پہلا آمنا سامنا ہوا ہے، دُلھن سے گھونگھٹ اُٹھانے کی فرمائش ہو رہی ہے:

بڑی اس دن کی تھی آرزو کہ ہوں اس رنگ سے روبرو
تو ہو دل کھول کے گفتگو اجی بس شرم اُٹھاؤ تم
مری نینوں میں سماؤ تم مرے من میں بسو آؤ تم

"تمھیں یاد ہیں وہ دن بھی" زن و شوہر کے اہم مسئلہ پر مبنی ہے۔ میاں بیوی ایک دوسرے کے جاں نثار ہیں مگر اولاد سے محروم ہیں۔ بیوی میاں کو دوسری شادی پر مجبور کرتی ہے۔ دوسری بیوی سے بچے ہوتے ہیں۔ زندگی کی یہ ضرورت بھی پوری ہو جاتی ہے۔ پہلی بیوی کا یہ ایثار اسے اپنے شوہر کو اور جیت لیتا ہے۔ اس کا یوں اعتراف ہے

ہوئے مجھ کو بال بچے مرا دل رہا تمھارا
بنے ہم وہ دوست سچے کہ جہاں ہے بیچ سارا
مری آتما تمھاری مری آتما کی پیاری

عورت کا یہ ایثار، محرومی کا یہ خوبصورت حل، مرد کی وفاداری غیر حقیقی تو نہیں ہیں لیکن رومانی افکار کی دین ہیں۔ رومانی افکار کی یہ معصومیت بذات خود ایک حسن ہے۔

"برسات کی رات دکن میں" ایک پُرسکون گھر کی ایک شب مسرت کا خوبصورت نقشہ ہے۔ اس مطمئن گھریلو محبت کی تصویر کو کسی بھی ڈرامائی، پُرجوش اور پُرجوش محبت کے موقعے سے شرمانے کی ضرورت نہیں۔ اس کا حسن سادہ بن پھول ہے حسن میں کوئی بیل بوٹا نہیں ہے۔ عظمت اللہ کے اندر کے کہانی کار اور شاعر دونوں نے مل کر اس کی تصویر کشی کی ہے۔

دکن کی ایک رات۔ برسات کی رم جھم سے پڑا سرا ہے۔ زندگی کے پھول اور تتلیاں بستر پر سو رہے ہیں۔ سندر چترا گھر کے کاموں کو نمٹا چکی ہے۔ بچھونا بچھاتی ہے۔ پان کھلاتی ہے۔ گھر کی چھوٹی موٹی باتیں ہونے لگتی ہیں۔ کمرے میں آسودہ پیار کی نرم روشنی ہے۔ باہر بادل کی گرج اور بجلی کی چمک ہے۔ آنگن جل تھل ہو رہا ہے۔ ہوائیں جھکی رچی جاتی ہے۔ شاعر یہاں تک لا کے صرف چند مصرعوں میں گھر کے پیار کی آسودگی بانٹ دیتا ہے

تن کو اوڑھا لی ہے دُلائی
اب سندر کی سیج دُہائی
کیا ہی بھلی سانس کی گرمائی

جسم کی گرمی ان کی

اور وہ نظم یوں تمام ہوتی ہے

گھر میں مالک آبادی ہو
چاہے والی گھر والی ہو
ہنسی خوشی گذر جاتی ہو

یوں ہی برسیں برسات کی راتیں

بچپن کی یادوں اور جوانی کے آسودہ گھر سے نکل کر اُن کی محبت دُنیا کے بازار میں نہیں گئی۔ اور یہ کوئی بُری بات نہیں ہر فنکار کے لیے حدود ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسے حدود سے نکلنا بھی نقصان دہ ہو سکتا ہے۔ "گھونگھٹ"، "بیل" کی اہمیت سے قطعی کم نہیں مگر ان پر گھاس نہ لادنا ہی انصاف ہے۔ ایسی اس گھریلو دُنیا سے نکل کر عظمت اللہ جب روایتی کہانیوں، تاریخی قصوں کی دُنیا میں پہنچے تو وہاں بھی انہیں حُسن و محبت کا پیکر ملی۔ وہ بیت کی ماری

ستی، شاعرہ رو پامتی تھی۔ روپامتی میں انہیں جیسے اپنے تصور کا آئیڈیل مل گیا۔ وہ کامنی، جس کی کوئل کے میٹھے سروں کی شاعرہ تھی۔ اپنے محبوب شوہر سے چھُٹ کر دوسرے کی نہیں ہوئی۔ عظمت اللہ کے دل کے تار اس کی عقیدت میں تھرتھرا اُٹھے۔ اس کے حسن، صفات، وفا کی کہانی، عظمت اللہ کی کامیاب نظم ہوگئی۔ چار مختصر مصرعوں کے بعد

"بیت کی ماری ستی شاعرہ روپامتی"
کی تکرار اِک کراہ بازگشت کی طرح گونجتی ہے۔

بدقسمتی سے عظمت اللہ خاں کا عین عالم جوانی میں انتقال ہوگیا۔ عظمت اللہ اپنی خوبصورت دُنیا کے خالق تھے۔ انھوں نے انگریزی نظموں کے ترجمے بھی کیے۔ ورڈس ورتھ کی نظم CUCKOO بائرن کی نظم ISLES OF GREECE میرڈتھ کی نظم THE YOUNG USURPER براؤننگ کی نظم A WOMAN'S LAST WORDS ترجمے کی حیثیت سے ٹھیک ہیں مگر میں اُن کا زیادہ قائل نہیں۔ مثلاً CUCKOO میں جو سادگی، روانی، یادوں کی نرم روی ہے اس کا حق ادا نہیں ہوتا آپ کہیں سے دیکھ لیں۔

O BLESSED BIRD! THE EARTH WE PACE
AGAIN APPEARS TO BE
AN UNSUBSTANTIAL FAIRY PLACE
THAT IS FIT HOME FOR THEE

ان رواں مصرعوں کا ترجمہ مجروح اور تھکا تھکا سا لگتا ہے

مبارک پرندے، یہ دُکھیاری دُنیا
نظر میں مرے پھر ذرا کی ذرا
پرستان ہے یا تخیل کی نگری
ترے آشیانہ کی موزوں جگہ

اسی طرح براؤننگ کی نظم میں جو عورت کی تہ داری اور عورت پن ہے وہ بھی ترجمے میں قائم نہیں رہ سکا۔

منظر کشی کی بہترین مثال "بیل"، "صبح" اور "برکھا رت کا پہلا مینہ" ہیں۔ ان نظموں میں گیتوں کے نغمے سے زیادہ محاکاتی نظموں

مسطر کشی ہے۔

"اُن کی نظم "وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں" اگرچہ فنی حیثیت سے بہت اہم نہیں لیکن اس کا موضوع عظمت اللہ خاں کی دوسری نظموں سے الگ ہے۔ ایک لڑکی کو حالات نے طوائف بنا دیا ہے۔ اس کا اخلاق اور اصول وغیرہ کے بارے میں متشکک نظریہ اس بات کا اشارہ کرتا ہے کہ عظمت اللہ محبت کی پُرخلوص دُنیا سے آگے نکل کر بازاری فضا کا مطالعہ کرنا چاہتے تھے لیکن موت نے انھیں مہلت نہیں دی۔

عظمت اللہ خاں کی نمایندہ نظمیں پاکیزہ مادی محبت کی دلفریب دُنیا ہیں جہاں بچپن آنگن میں کھیلتا ہے۔ نوجوانی میں محبت کی مہک اور بدن کی بہک ہے۔ شادی کے بعد شرمائی لجائی گل کامنی ہے۔ زندگی کے پھول اور تتلیاں ہیں۔ عورت کا آسودہ پیار ہے گھر کی فضا ہے۔ اس کے لیے عظمت خاں نے سادہ پُرخلوص اسلوب برتا۔ عظمت کی شاعری رات کے خاموش سمے کی طرح ہے۔ جی چاہتا ہے کہ اب مزید فکر و تجزیہ سے اسے مجروح نہ کیا جائے۔ مگر بے بسی یہ ہے صبح، تپشے کے کرن کی منتظر رہی ہے۔

عظمت اللہ کی شاعری یادوں کا خوبصورت گھر ہے۔ اس کا خالق رومانی ذہن کا توازن ہے۔ برخلاف اس کے ان کا مضمون اسی رومانی ذہن کی غیر متوازن بغاوت ہے۔ عظمت اللہ کے یہ دو متضاد رنگ ایک طالب علم کے لیے پریشان کن ہیں، لیکن پروفیسر آل احمد سرور نے اپنے مضامین میں اس رومانیت کی متضاد کارفرمائیو کی اکثر وضاحت کی ہے۔ انھیں کا ایک فقرہ ہے کہ" رومانیت کبھی مضحک بھی ہوتی ہے"۔ اب عظمت اللہ خاں کے تضاد کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔

عظمت اللہ خاں کی معصوم اور پُراثر شاعری کو سمجھنے میں جو سب سے زیادہ گمراہ کرنے والی بات ہے وہ اُن کے مضمون کی عروضی ورزش اور اونچے بول کا لہجہ ہے۔ ہر شاعر اس کا یقین کرے گا کہ جب عظمت اللہ نے اپنی اچھی نظمیں کہی ہوں گی تو عربی، ہندی یا انگریزی عروض کے ڈر سے نہیں کہی ہوں گی۔ پھر عروض کا مسئلہ شعر سے متعلق ہوتے ہوئے بھی خالص شعر کا مسئلہ نہیں ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اُن کی کامیاب نظمیں خالص عربی عروض میں ہیں مثلاً

ا۔ نہ بھلے کی تھی نہ بُرے کی تھی مجھے کچھ جہاں کی خبر نہ تھی

بحر کامل مثمن سالم۔ متفاعلن ۴ بار

۲۔ مجھے سیت کا ماں کوئی بھل نہ ملا۔ بحر متدارک مخبون

فعلن چار بار۔

دیکھا رت جس پر محترم عندلیبؔ کا بھی نوٹ ہے کہ یہ خالص ہندی کی بحر میں ہے وہ بھی اُردو کی بحر متدارک مخبون ورسالمی ہی میں ہے ہم اگر عظمت اللہ کے مضمون کی باتوں پر اُن کی شاعری کو جانچیں تو اُن کی خوبصورت نظمیں نواقی کی زیادتی میں گردن زدنی معلوم ہوں گی مثلاً یہ بند ہے

عشق کی دیوی تھی تو
شعر میں یکتا تھی تو
حُسن کی پُتلی تھی تو
اک کویتا تھی تو

اس بند پر اُن کے نقطۂ نظر سے یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ پہلے اور تیسرے مصرع اور دوسرے اور چوتھے مصرعے کو اس لیے دور کیا گیا کہ وہ قافیوں کی مارا ماری گری ہیں ورنہ مضمون کے خاکے سے اس بند کو یوں ہونا چاہیئے تھا

عشق کی دیوی تھی تو
حُسن کی پُتلی تھی تو
شعر میں یکتا تھی تو
اک کویتا تھی تو

پھر ان مختصر مصرعوں میں ردیف اور قافیے کے کھیل کے علاوہ کیا ہے۔ لیکن اس طرح کی باتیں ذہانت کا ٹیڑھاپن ہوتی ہیں جس طرح شعر احساس کی قوت سے شعر ہوتا ہے اسی طرح سخن فہمی کے لیے بھی احساس کی شرافت، معصومیت اور ہمدردی کی شرط ہے۔ اسی طرح اُن کی نظم "وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں" میں ہر دو مصرعے

(بقیہ صفحہ ۱۵ پر)

غزل

جاں نثار اختر

موجِ گل، موجِ صبا، موجِ سحر لگتی ہے
سر سے پا تک وہ سماں ہے کہ نظر لگتی ہے

لمحے لمحے میں بسی ہے تری یادوں کی مہک
آج کی رات تو خوشبو کا سفر لگتی ہے

ہم نے ہر گام پہ سجدوں کے جلائے ہیں چراغ
اب تری راہ گزر، راہ گزر لگتی ہے

واقعہ شہر میں کل تو کوئی ایسا نہ ہوا
یہ تو اخبار کے دفتر کی خبر لگتی ہے

کوئی آسودہ نہیں اہلِ سیاست کے سوا
یہ صدی دشمنِ اربابِ ہنر لگتی ہے

لکھنؤ کیا تری گلیوں کا مقدر تھا یہی
ہر گلی آج تری خاک بسر لگتی ہے

اڑیا ڈرامے کا ارتقا

مظہر امام

اڑیا ڈرامے کا آغاز دراصل دوسری صدی عیسوی میں ہی
ہو گیا تھا۔ بھونیشور کے نزدیک اُودے گری کے ایلیفینٹا غاروں
کے کھدے ہوئے نقوش اسی بات کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔ اس کے
علاوہ قدیم تعمیرات نے رقص کرتی ہوئی شکلوں کے ذریعے مندروں کی
دیواروں پر اپنے نقوش چھوڑے ہیں۔ پوری، بھونیشور اور کونارک
کے مندروں میں یہ نقوش دیکھے جا سکتے ہیں۔ بھارت منی نے اپنی
لافانی تصنیف "ناٹیہ شاستر" کے چودھویں باب میں "اودرا ماگدھی"
کا ذکر کیا ہے۔

پندرہویں صدی میں اڑیسہ کے مہاراجہ کپلیندر دیو نے
"پرسورام وجیوگ" نام کا ایک سنسکرت ڈرامہ لکھا اور پیش کیا۔ اس
کے مکالمے سنسکرت میں تھے لیکن گانے اُڑیا میں تھے۔ اَن پڑھ طبقے
میں ڈرامے کو کامیاب بنانے کے لیے ایسا کیا گیا تھا۔ سولھویں صدی
میں رائے رامانند پٹنائک نے "جگن ناتھ ولبھ" نام کا سنسکرت ڈرامہ
لکھا اور پیش کیا۔ یہ ڈرامہ مہاراج پرشوتم دیو کے دربار میں اسٹیج کیا گیا۔
مرد اداکاروں کے علاوہ اس میں عورتوں نے بھی اداکاری کی۔ اس سے
پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں بھی اڑیسہ کی خواتین اداکارانہ صلاحیتوں
کے اظہار پر قادر تھیں۔ اوپیرا یا سنگیت ناٹکوں میں رام لیلا اور کرشن لیلا
کو زیادہ مقبولیت حاصل تھی۔ یہ سنگیت ناٹک نوجوانوں کے لیے توجہ کا
مرکز بنے تھے۔ سترہویں صدی میں یہ سنگیت ناٹک اپنے اڑیا گانوں
کی وجہ سے گاؤں میں بھی مقبول ہونے لگے۔ رام لیلا میں چھوٹے چھوٹے
گانے ہوتے تھے جنھیں عام لوگ بے حد پسند کرتے تھے۔ "جاترا" کی
شکل یہیں سے پیدا ہوئی۔ اٹھارہویں صدی کے اوائل میں مرہٹوں
نے اڑیسہ پر حملہ کیا اور حکومت کرنے لگے۔ مہاراجہ برج کشور دیو نے
ایک ڈرامہ "مدمادتی ہرن" لکھا۔ گنجام اور کوراپٹ اضلاع ۱۸۶۴ء
میں اڑیسہ سے علیحدہ کر کے صوبہ مدراس میں ملحق کر دیے گئے۔ پھر بھی جنوبی
اڑیسہ کے رجواڑوں جلنتاپور، چکی، منجوسا، سُرنگی وغیرہ کے راجاؤں
نے ڈرامے لکھے اور اپنے درباروں میں پیش کیے۔ رگھوناتھ پریچھا کا لکھا ہوا
ڈرامہ "گوپی ولبھ" اس زمانے میں سب سے زیادہ مقبول ہوا۔ انیسویں
صدی میں جگموہن لالا نے "بابا جی" اور رام شنکر رائے نے اپنی غیر فانی
تخلیقات "کانچی کاویری" اور "حسنہ لیلا" پیش کیں۔ یہ ڈرامے اُڑیا
زبان میں لکھے گئے تھے۔ ناٹیہ شاستر کے اصولوں کے مطابق سُتر دھار،
ناٹیہ، ناٹی اور ودُوشک کرداروں نے ان ڈراموں میں حصہ لیا۔ مکالمے
نثر و نظم میں اور بے حد طویل ہوتے تھے۔ آج کے دور میں یہ غیر دلچسپ
معلوم ہوں گے۔ لیکن اس زمانے میں وہ حیرت انگیز طور پر مقبول تھے۔
اُن دنوں جاترا کی مقبولیت بڑھ رہی تھی۔ اس زمانے میں جاترا کا
سب سے ہر دلعزیز اور نامور مصنف، اداکار اور ہدایت کار گوپال
داس تھا۔

کپل مصرا نے رام شنکر رائے کے رنگ میں دو ڈرامے "سما
ساد" اور "بسنت لتیکا" لکھے۔ زبان آسان تھی اور سماجی ڈراموں کی
طرف ان کا رجحان نظر آتا تھا۔ ہر چند کہ نثر و نظم میں حد درجہ دلیری (ویر
رس) کا اظہار کیا گیا تھا۔

گاؤں میں "جاترا" روز بروز مقبول ہو رہے تھے۔ زبان آسان

سے آسان تر ہو گئی۔ لوک ناٹک کا ناچ اور گانا اس سے پر ہوتے
تھے۔ کبھی کبھی گندے اور فحش گانے اور مذاق بھی ان میں ہوا کرتے تھے۔
اس رجحان کو روکنے اور لوک ناٹکوں کو سنہرا اور صحت مند بنانے کا کام
مقبول ترین مصنف اداکار اور ہدایت کار ... اور بال کرشن
مہنتی نے انجام دیا۔ یہ دونوں حضرات جدید اڑیا کے بابائے آدم کی حیثیت
رکھتے ہیں۔

ڈراموں کی مقبولیت اور ناٹک کے باعث اندھا دھند بنگالی
ڈراموں کے ترجمے پیش کیے جانے لگے۔ پڑھے لکھے اعلیٰ تعلیم یافتہ
لوگوں نے ڈرامہ لکھنے کی طرف توجہ دی۔ پنڈت گوداوریش مصرا کے ڈرامے
"پرشوتم دیو" میں بڑی منجھی زبان استعمال ہوئی، لیکن اسٹیج کی ضروریات
کے لحاظ سے یہ ڈرامہ کچھ زیادہ مناسب نہیں تھا۔ بھکاری چرن پٹنائک
نے "کٹک وجے"، "سدکیتو" کی کے علاوہ مشہور سماجی ڈرامہ "سوسیلا"
لکھا۔ اپنے خوبصورت مکالموں، اسٹیج کی ضروریات سے مطابقت اور اپنی
ندرت کے باعث "سوسیلا" کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی

بیسویں صدی تھیٹریکل انجمنیں معرض وجود میں آئیں۔ آ...
... نے زیادہ کرشن کھٹرا ... اس کے لیے اسوینی کمار گھوش ڈرامے
لکھا کرتے تھے۔ تاریخی اور اساطیری ڈراموں میں اب تک ان کی
کا مقابلہ نہیں ہوا۔ "کالا پہاڑ"، "کونارک" اور "میر قاسم" کو
اب تک ہر دلعزیزی حاصل ہے۔ زبان آراستہ پیراستہ ہے اور
جذبات کا اظہار نہایت عمدہ مقفیٰ شاعری میں کیا گیا ہے۔ ان ڈراموں
کی بنیاد خاص طور پر لڑائی اور عام انگریز واقعات و حادثات پر رکھی
گئی ہے۔ "کالا پہاڑ" کے آخری منظر میں اسٹیج پر ... کو ناچ مردوں
کے درمیان بیٹھے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ اس زمانے میں اس ناٹک کو
جو اسٹیج پر کھیل سے حاصل ہونے والے اثر (STAGE EFFECT)
بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ ... کا خواب میں میر قاسم کو آسمان پر
اڑتے ہوئے دکھایا، کونارک مندر کی تعمیر میں بجلی گرنے
اور آگ لگنے کا منظر ... اور ...
مناظرات تک دکھائے جاتے ہیں۔ اساطیری اور نیم اساطیری ...
میں جوڑ توڑ (TRICKS) سے کام لینا پڑتا تھا۔ میلو ڈرامہ

کو بنیادی حیثیت حاصل تھی۔ اسوینی کمار گھوش نے ناٹیہ بھارتی
لوما سے ۱۹۱۵ء میں لکھنا شروع کیا اور ۱۹۶۲ء تک وہ اڑیسہ کے
اہم ترین ڈرامہ نگار رہے۔

گوبند چندر سُردو نے ۱۹۱۶ء میں ایک رس پارٹی قائم کی۔
"رس" کی زندگی اور روح نغمہ و رقص ہیں۔ اس میں عموماً سری کرشن
کی زندگی کے متعلق واقعات پیش کیے جاتے ہیں اور گیت، موسیقی اور
ناچ کو نمایاں اہمیت دی جاتی ہے۔ مکالمے کوئی خاص اہمیت نہیں
رکھتے۔ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیان "رس" کی چار پارٹیاں
اڑیسہ میں سرگرمی کے ساتھ ایسے ڈرامے اسٹیج کیا کرتی تھیں۔ ایسے
خوبصورت گیتوں اور اڑیسی سُر کی بنا پر بہت پسند کیے جاتے تھے
ان کے مصنف کو ایک ڈرامہ نگار سے زیادہ ایک باکمال شاعر ہونا
پڑتا تھا۔ صرف ایک نغمہ "اتّا اور پاتھیر" تھا۔ جو اب اسی نام کے
... کی حیثیت سے قائم ہے۔

کوی چندر کالی چرن پٹنائک نے ۱۹۳۹ء میں اپنی "رس
پارٹی" ختم کر کے "اڑیسہ تھیٹر" کے نام سے ایک تھیٹریکل کمپنی قائم کی۔
کوی چندر کو اڑیا ادب پر عبور حاصل تھا۔ اس وقت نیو تھیٹر اور
بمبئی ٹاکیز کی سماجی فلمیں بہت مقبول ہو چکی تھیں۔ اس لیے کوی چندر
نے اڑیا ڈرامے میں ایک نئے رجحان ــــ جدید معاشرتی رجحان کا
آغاز کیا۔ ہرچند کہ ہندوستانی فلموں اور بنگالی ڈراموں کا اثر ان کے
ڈراموں میں نمایاں تھا، پھر بھی اس حقیقت پسندانہ نمائندگی کے باعث
انہیں بے حد سراہا گیا۔ کوی چندر نے منہ پھیر کر بولنے کی تکنیک کبھی
نہ ختم ہونے والی تقریروں اور خود کلامی سے دامن چھڑانے کی کوشش
کی۔ ۱۹۳۹ء میں ان کی پہلی تخلیق "گرلس اسکول" نے ۱۲ راتوں
کا ریکارڈ قائم کیا، حالانکہ پہلے میں ساتوں دن ڈرامہ دیکھا جاتا تھا۔ پھر
ان کے پیش کردہ "... مالا"، "جمبس"، "... کھاٹا"، "جیکری"، "اکھیا"
"... دلو" اور کئی دوسرے ڈرامے منظر عام پر آئے۔ تقریباً دس سال کے
عرصے میں کالی چرن پٹنائک نے اڑیسہ میں نئے انداز کے ڈراموں کی
بھرمار کر دی۔ "اتّا اور پاتھیر" اب تک اسوینی کمار کے لکھے ہوئے تاریخی
اساطیری اور معاشرتی اساطیری ڈراموں کو پیش کر رہا تھا۔ نئے ڈراموں

کی ہر دلعزیزی کے باعث اسوسی کمار کی مقبولیت کم ہوگئی اور جب کالی چرن پٹنائک کا "اڑیسہ تھیٹر" دس سال تک شاندار کارنامے انجام دینے کے بعد بند ہوگیا تو ان کی تخلیقی سرگرمیاں بھی ماند پڑ گئیں۔

اس کے بعد مقبول ناول نگار کنتی دھر مائیک نے ایسے ڈرامے "دھرم تیمی" "لال چابک" اور "منیجر" پیش کیے۔ ان ڈراموں میں عورت، شراب اور پستول کو نمایاں جگہ حاصل تھی۔ یہ ڈرامے تماشہ دیکھنے والوں میں اپنی تیز رفتاری اور SUSPENS کی وجہ سے بہت مقبول ہوئے۔ انا پورنا تھیٹر نے اڑیسہ تھیٹر کے آرٹسٹوں کو لے کر ایک "بی گروپ" قائم کر لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس نئے تھیٹر کو جس میں پہلے کالی چرن پٹنائک کے ڈرامے کھیلے جاتے تھے نئے ڈرامہ نگاروں کی ضرورت محسوس ہوئی جو کوئی چندر کی خالی جگہ کو پر کر سکیں۔

دو نوجوان لکھنے والے رام چندر مصرا اور بھنج کشور پٹنائک سامنے آئے۔ شری مصرا کے ڈراموں "نولیا" "بھائی کھوج" "گھر سنسار" وغیرہ نے بے مثال کامیابی حاصل کی۔ شری مصرا کی سحر کاری کا راز ان کے سادہ لیکن پر اثر مکالموں اور جذباتی مناظر میں تھا۔ انھوں نے ایسے کردار کی تخلیق کی جو ناظرین کی ہمدردی پیدا کر سکیں اور ایسے مناظر پیش کیے جو اپنی جذباتی تاثر انگیزی کے باعث آنکھوں میں آنسو لا سکیں۔ ان کے ڈرامے شہروں اور گاؤں دونوں میں مقبول تھے بلکہ اب تک ہیں، کیونکہ ان میں عام انسانی مسائل کی تصویرکشی کی گئی ہے۔

ایک خاندان کے مختلف افراد سے متعلق ڈراموں کو بھی اسی دور میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ بھنج کشور پٹنائک نے انا پورنا تھیٹر کے "بی گروپ" کے لیے "پہلی رجہ" (پہلا تہوار)، "نایکا جوڑی"، "پیرا گیا انصار انیقی" وغیرہ ڈرامے لکھے جو رواج کے مطابق فیملی ڈرامے تھے۔ ان میں جذبات، کردار نگاری اور خصوصاً مزاح پر زور دیا گیا تھا۔ ان کے ڈراموں "رہز" اور "چہ مالا" کو مسائلی ڈرامہ سمجھنا چاہیے کیونکہ اول الذکر میں سماجی مسائل کو پیش کیا گیا ہے اور موخر الذکر میں ادیبوں اور شاعروں کے مسائل کو۔ ان کا ڈرامہ "چہ مالا" دور جدید کا واحد المیہ ناٹک ہے۔ پیشہ ور تھیٹر ٹریجڈی کو "خطرناک" سمجھتا ہے۔

ایک دوسری تھیٹریکل کمپنی معرض وجود میں آئی جس کا نام پہلے "روپا سری" تھا اور پھر "جیتا رنگ منچ" میں تبدیل ہوگیا۔ یہ ایسے ڈرامے اس وقت کٹک میں اسٹیج کر رہی ہے۔ نئی تھیٹریکل کمپنیوں کے وجود نے نئے لکھنے والوں کی ضرورت بھی پیدا کر دی۔ نئے ڈرامہ نگار نئے پلاٹ کے ساتھ پیشہ ورانہ اسٹیج پر اپنے کارنامے دکھانے کے لیے منظر عام پر آئے۔

منورنجن داس کا "بجنی جگمدھو" غیر معمولی طور پر کامیاب رہا۔ یہ ایک تاریخی ڈرامہ تھا اور بنگلہ اسٹیج کے "سراج الدولہ" اور "ٹیپو سلطان" کی یاد دلاتا تھا۔ اسد اسنکر داس کا "سمادھی" اور دھرمید مہنتی کا "چوتھی راتی" اسٹیج کیے گئے اور بہت کامیاب رہے ـــ اننداشنکر کے ڈرامے "جو ہکا" (جہیز) "لوہا سکولی" (لوہے کی زنجیر) "حکا کھوری" مقبول ڈرامے ہیں جو سماجی مسائل سے بحث کرتے ہیں۔ ان کی قابل ذکر تخلیق "ولو اتاد" ہے جو بچوں سے متعلق ہے اور اسٹیج پر اپنی نوعیت کا واحد ڈرامہ ہے۔

اس دوران میں ایک اور ہونہار ڈرامہ نگار گوپال چھوٹرائے نے اپنی تخلیقات "پھری آ" (واپس آ) اور "بھرسہ" (بھروسہ) سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا ہے۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ سادہ لیکن انتہائی اثر انگیز مکالمے لکھتے ہیں۔ ان کا "ترکلم" (تیر کا قلم) واحد سیاسی ڈرامہ ہے جو صوبے کے وزیر اعلیٰ کی مات بے باکی سے اظہار خیال کرتا ہے۔ اس ڈرامے میں اسمبلی سیشن کو بھی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اوڑیا ڈراموں میں اسے عہد آفریں سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد گوپال چھوٹرائے نے اڑیا کے مقبول ترین ناولوں کو ڈرامہ کا روپ دینا شروع کیا۔ 'جھنجھا' (طوفان)، 'امرا ماٹھ'، 'ملاجہنہ' (مردہ چاند) کے ADAPTATIONS اسٹیج پر بہت کامیاب ہوئے کیونکہ اصل ناولوں کا تاثر ان ڈراموں میں کسی طرح کم نہیں ہوا ہے۔

کارتک کمار گھوش کا معاشرتی اساطیری ڈرامہ "لاکھیہ ہیرا" انتہائی خوبصورت تخلیق ہے جس نے تمام اڑیسہ میں شہرت و مقبولیت حاصل کی ہے۔ شری گھوش کی دوسری کامیاب پیشکش "سجارہے"۔ "لاکھ ہیرا" کا تاثر اس کے جذباتی مناظر کے سبب ہے۔

ملرام مصرا، کے مصرا، دھیو رپٹنائک، نرسنگھ مہاپاترا جنت کار

وعصری ڈرامہ نگاروں نے ہو راسی کوئی علمی پیش نہیں کی ہے جسے ناقابل فراموش کہا جاسکے۔

اس وقت کے سوال اور سرگرم عمل ڈرامہ نگار کمل لوچن کھیتی اور بھوپیشور بتھاکر ہیں۔ ان کے ڈراموں اور ان کی مقبولیت کے لیے ان ڈرامہ نگاروں کے اپنے اصول و ضوابط ہیں۔ کمل لوچن کھیتی کے ڈرامے سماجی ہوتے ہیں۔ وہ براہ راست حکومت کی پالیسی اور سماجی برائیوں پر تنقید کرتے ہیں۔ عوام ان راہ راست حملوں کو پسند کرتے ہیں کیونکہ انھیں محسوس ہوتا ہے کہ اسٹیج پر ان کے دل کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ "کرانی" "سوامی استری" اور "جاگ تکلیا" کی مقبولیت انھیں باتوں کی وجہ سے ہے۔ بھوپیشور بتھاکر کے ڈراموں کی بنیاد جرائم اور جاسوسی پر ہے۔ شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہ اڑیسہ کے واحد جاسوسی اور SUSPENSE ڈرامہ نگار ہیں۔ ان کے ڈرامے "ٹوٹھ بھٹ کا جگ کا جگہ" (شیشہ اور سونا) اور "سوتی محل" اپنے سنسنی خیز پلاٹ اور کلائمکس کے باعث مقبول ہوئے۔

یدو ملکیش تریپاٹھی نے "ایک دو تین" اور "ہرش چندر" لکھے ہیں اور انھیں پیش بھی کیا ہے۔ انھوں نے "ایک دو تین" میں ایک ہی سیٹ میں سین ایکٹ پیش کرنے کی جدید ٹکنیک کا تجربہ پہلی بار کیا ہے۔ یہ ڈرامہ شروع سے آخر تک طربیہ ہے جو اڑیسہ کے عوام کے لیے بالکل نئی چیز ہے۔ یہ محض ایک تجربے کے طور پر لکھا گیا تھا اور اس کے رد عمل کا مطالعہ توجہ سے کیا گیا تھا۔ ناظرین کا صرف پڑھا لکھا طبقہ اس سے پوری طرح محظوظ ہوسکتا ہے کیونکہ صرف وہی اس کے طربیہ مکالموں کو سمجھ سکتے ہیں۔ پھر بھی یہ ڈرامہ اپنی ندرت کے باعث کافی مقبول ہوا۔

اس رجحان کو کمل لوچن کھیتی نے "ٹک بگاڑ" میں اپنا لیا ہے۔ ڈرامے کے پروڈیوسر نے اسے بالکل اسی طرح پیش کرنے کی ہمت نہ کی۔ اس لیے اس کے مصنف سے درخواست کی کہ اس میں چند اور مناظر جوڑ دیے جائیں۔ چنانچہ اس اضافے کے بعد یہ ڈرامہ اسٹیج ہوا۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ڈرامہ نگار موجودہ رجحان سے واقف ہو رہے ہیں۔ لیکن وہ جدید رنگ کے ڈرامے لکھنے کی ہمت نہیں کرتے کیونکہ پروڈیوسر اور تھیٹریکل کمپنیوں کے مالک انھیں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اڑیا ڈراموں میں نیا رجحان آہستہ آہستہ داخل ہو رہا ہے لیکن اس کی رفتار سست ہے۔ اسٹیج کے ساز و سامان اطمینان بخش نہیں ہیں اور پروڈیوسر ایسے اندازکے ڈراموں کے عادی نہیں۔ رولنگ (ROLLING) مناظر اور روشنی کے لیے معمولی بلب عام طور پر استعمال کیے جاتے ہیں۔ بکھنے کی ٹکنیک ابھی استعمال ہوتی ہے جسے مقامی طور پر کھولوس کرو کی ٹکنیک کہتے ہیں۔ یہ اسٹیج کے لیے مناسب ہے۔ سامنے اور درمیان کا اسٹیج، اسٹیج کا منظر آراستہ کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جب یہ منظر اختتام پذیر ہوتا ہے تو کسی دوسرے منظر کا پردہ نیچے گرتا ہے تاکہ سامنے کے اسٹیج کو پوشیدہ کردے۔ ہر لکھنے والے کو اس طریق کار کی پابندی کرنا پڑتی ہے کیونکہ اس سے ڈرامے کی رفتار قائم رہتی ہے اور اسٹیج کی ترتیب و تنظیم کے لیے زیادہ وقت ضائع نہیں ہوتا۔ شیکسپیر کے انداز کے سین اور ایکٹ اب تک مستعمل ہیں۔ عام طور پر ہر ڈرامے میں تین ایکٹ ہوتے ہیں اور ہر ایکٹ میں پانچ سے سات تک مناظر۔ یہ اسٹائل بھوپیشور بتھاکر استعمال نہیں کرتے۔ وہ اپنے ڈراموں میں ایک ہی وقفہ (انٹرول) دیتے ہیں۔ بلاشبہ یہ ٹکنیک فلموں سے لی گئی ہے۔ ہرچند کہ مناظر ہر دس یا بیس منٹ پر بدلتے ہیں لیکن ڈرامے کی رفتار پر کوئی اثر نہیں پڑتا اور سامعین اپنی دلچسپی نہیں کھوتے، بلکہ اگر بیس منٹ میں بھی منظر تبدیل نہیں ہوتا تو ناظرین مصنف اور پروڈیوسر کی اس خلاف معمول حرکت پر حیرت کرنے لگتے ہیں۔ ہرچند کہ یہ ٹکنیک پرانی ہے لیکن یہ سلک کی توسیع کا سامان فراہم کرتی ہے اور چاروں پانچ گھنٹہ میں سال بھر اس کے باعث دوسی ہوتی رہتی ہے۔

پروڈیوسر اور ڈرامہ نگار دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ ایک ڈرامے میں کم از کم چار "رس" ہونے چاہئیں۔ ان میں سب سے زیادہ ضروری کرودھ (غصہ) ہاسیہ (مزاح) شرنگار (عاشقی) اور ویر (دلیری) یا رود (دہشت) رس ہیں۔ پروڈیوسر ڈرامہ کی کامیابی کے مایوس کن انجام کی بابت بہ آسانی پیش گوئی کرسکتے ہیں، اگر ان میں سے کسی ایک رس کی کمی ہو۔ حتیٰ کہ اصل پلاٹ کے ساتھ ساتھ ایک ضمنی پلاٹ بھی چلتا رہتا ہے تاکہ ہاسیہ رس کی تکمیل ہوسکے۔ گانے اور ناچ بھی اسی قدر

ضروری ہیں، یہاں تک کہ وہ کردار بھی جو اصل پلاٹ سے کوئی مطابقت نہیں رکھتے، بلکہ وہ گانے اور ناچ کے لیے لائے جاتے ہیں۔ پروڈیوسر اور ڈرامہ نگار ان کرداروں کی آمد کے لیے عجیب و غریب بہانے نکالتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ بہرحال "ضروری" ہیں ورنہ سامعین یہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ پروڈیوسر اور ڈرامہ نگار نے انھیں قصداً دھوکا دیا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ "رس" کا رسیا کسی منظر کی تبدیلی کے وقت چلا اٹھتا ہے "ایک ناچ ایک ناچ" یا "ایک مذاق، ایک مذاق" گانے والوں پر جا ترسے اور رس کا یہ اثر ہے۔ تفریح پسند عوام کی تسکین بہرحال ضروری ہے اور یہ پروڈیوسر کا کام ہے کہ اس کی تکمیل کرے۔ اس لیے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ ڈرامہ نگار ناچ گانے اور مزاحیہ کرداروں کو ملحوظ رکھتے ہیں، جب وہ ڈرامے کے عروج، ارتقا کی بابت سوچتے ہیں۔ بہت کم ڈراموں میں گانوں اور جھونپڑے کا امرا ناٹہ واحد ڈرامہ ہے جس میں گانوں اور ناچ کو خیر باد کہنے کی جرأت کی گئی۔

عام طور پر ڈرامہ لکھنے والوں کو اسٹیج سے متعلق آرٹسٹوں کی واقفیت ہوتی ہے جب وہ کسی مخصوص تھیٹریکل کمپنی کے لیے لکھتے ہیں تو وہ اس کمپنی کے آرٹسٹوں کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ انھیں ہمیشہ احساس رہتا ہے کہ وہ جن کرداروں کی تخلیق کر رہے ہیں وہ فلاں فلاں ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے لیے ہیں۔ اس لیے ان کے کردار آرٹسٹوں کی مناسبت سے تخلیق کیے جاتے ہیں جس سے آرٹسٹوں کو بڑی سہولت مل جاتی ہے۔ اگر یہ رول آرٹسٹوں کی مناسبت سے نہ لکھے جائیں تو انھیں تبدیل کر دیا جاتا ہے، اُن میں کوئی ترمیم کر دی جاتی ہے، یا بعض حلقوں میں انھیں از سرِ نو لکھا جاتا ہے تاکہ وہ آرٹسٹوں کے مطابق ہوں۔ تھیٹر کا مالک یا منیجر کبھی کبھی پروڈیوسر کو مجبور کرتا ہے کہ فلاں آرٹسٹ کو اہم رول دیا جائے۔ اس لیے پروڈیوسر اور ڈرامہ نگار سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں اور "معاشی مفاد" کے پیشِ نظر کوئی نہ کوئی صورت نکالتے ہیں۔

بہرحال اُڑیا ڈراموں کی سمت آتا ہوا انقلاب نمایاں ہے۔ 'ایک دو تین' اور "ڈاک بنگلہ" کی روایت کو بڑھا رہا ہے۔ اسٹیج بذاتِ خود ایک بڑا نقص ہے۔ آرٹسٹ، پروڈیوسر اور ڈرامہ نگار پرانے رجحان کو خیر باد کہہ دیں گے، بشرطیکہ اسٹیج کا معیار اونچا ہو اور اس کے لیے تازہ ترین ساز و سامان مہیا کیے جا سکیں۔ سر دست تو اصول یہ ہے کہ ——

"عوام کو مطمئن کرو اور پروڈکشن کے اخراجات کو برابر کرو۔ تھیٹر کا وجود اور آرٹسٹوں کی زندگی قائم رہنا چاہیے۔ ڈرامہ نگار کو پہلے اس کے بارے میں سوچنا ہے اور نئے خیالات کو بہم رسید کرنا ہے۔ ہم لوگ نئے تجربات، نئے خیالات اور نئی تمثیلوں کے بارے میں اس وقت سوچیں گے جب ہمارے پاس نیا اسٹیج ہوگا لیکن سر دست روشنیوں کو جلتے رہنے دو۔"

عظمت اللہ خاں کا نظریۂ شاعری اور شاعری —— (صفحہ ۹ کا بقیہ)

کے بعد یہ مصرعہ "وہ ہوں پھول جس کا پھل نہیں ہے وہ ہوں آج جس کا کل نہیں ہے" ٹیپ کے بند کی طرح ۲۲ شعروں کی نظم میں ۲۳ بار آتا ہے۔ ٹیپ کا یہ مصرعہ اس سے لگایا گیا ہے کہ عظمت صاحب کو اپنی نظموں کو گیت کہنے پر اصرار ہے۔ اگر میں یہ اعتراض کروں تو یہ میری انتہا پسندی ہوگی۔

اس مضمون میں نظموں کو گیت نہ کہہ کر نظم کہا گیا ہے۔ گیت کے لیے جس سپردگی، والہانہ پن اور اختصار کی روایت ہے وہ ان نظموں میں نہیں ہے۔ اور جب یہ اپنے موضوع، اسلوب اور بحر کے لحاظ سے نظم کی دنیا سے آتی ہیں تو انھیں میرے نزدیک نظم ہی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ چند نظمیں عورت کی زبان سے ادا کی گئی ہیں، یہ گیت کی روایت ہے لیکن حالی کی نظم 'مناجاتِ بیوہ' بھی تو عورت ہی کی زبان سے ادا ہوئی ہے، صرف اتنی سی بات پر نظم گیت نہیں کہی جا سکتی۔

عظمت اللہ کا نظریۂ شعر رومانیت زدہ، غیر متوازن ذہن کا نا عیاں اعلان نامہ ہے۔ اس میں ذہانت کی معصومیت کبھی قابلِ برداشت ہے اور کبھی مضحکہ خیز، برخلاف اس کے اُن کی نظمیں ایک مختصر، حسین اجنبی اور جانی پہچانی دنیا کی تخلیق کرتی ہیں۔ وہ دنیا ہمارے حقیقت کے خوابوں کی طرح خوبصورت ہے۔ عظمت اللہ خاں کی عظمت میر، غالب اور اقبال کی طرح کھلے ہی نہ ہو مگر وہ اُس دنیا کے خالق ہیں جو انہی کی اپنی ہے۔ اور بیسویں صدی کے اوائل کے متوسط طبقے کے پڑھے لکھے گھرانے کے نوجوانوں کی دنیا ہے۔ اُس کے یہاں وہ خوبصورت جادو ہے جسے محبت کہتے ہیں۔ محبت وہ قوت ہے اپنے عہد اور وقت کے قیود میں رہ کر اُن سے آزاد بھی رہتی ہے۔ عظمت اللہ خاں اسی محبت کے شاعر ہیں۔ اردو کے تیسرے دَور کے اچھے شاعروں میں وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ ادب میں یہ سعادت بھی مقدور بار وہیں مل سکتی ہے۔

وطن کی زمین

ظہور رضوی

تیرے منظر دل رُبا کس قدر دل نشیں مسکراتے سنبل کی اے بہشت بریں
چاند تاروں کی دنیا سے زیادہ حسیں خم ہے تیرے لیے کہکشاں کی جبیں
تیرے ذرات ہیں آسماں آفریں
اے وطن کی زمیں اے وطن کی زمیں

تیرے دامن میں کرتی ہیں اٹھکھیلیاں پاک گنگا و جمنا کی رعنائیاں
گلستانوں میں بہاروں کی انگڑائیاں حُسنِ فطرت کی معصوم پرچھائیاں
دل کشی کون سی ہے جو تجھ میں نہیں
اے وطن کی زمیں اے وطن کی زمیں

تیری دل کش سحر تیری رنگین شام زندگی کے لیے اک مقدس پیام
وہ بہاروں کا گلشن وہ طرزِ خرام اک سرشاریِ مسلسل نشاطِ دوام
جیسے روئے زمیں پہ بہشت بریں
اے وطن کی زمیں اے وطن کی زمیں

تیرے دریاؤں میں فیضِ قدرت رواں تیرے پربت تری عظمتوں کے نشاں
لہلہاتی ہوئی یہ تری وادیاں کلکِ فطرت کی رنگین گل کاریاں
کس قدر خوش نما اور کتنی حسیں
اے وطن کی زمیں اے وطن کی زمیں

ناز پروردۂ حُسنِ فطرت ہے تو کتنے رنگیں نظاروں کی جنت ہے تو
مختلف مذہبوں کی امانت ہے تو اپنی کثرت میں بھی ایک وحدت ہے تو
تیری تہذیب ہے شان دار و حسیں
اے وطن کی زمیں اے وطن کی زمیں

تیرے دیوانے میداں میں آجائیں گے متحد ہوکے دشمن پہ چھا جائیں گے
جان تک کی یہ بازی لگا جائیں گے مسکراتے ہوئے سر کٹا جائیں گے
تیری عزت پہ حرف آئے ممکن نہیں
اے وطن کی زمیں اے وطن کی زمیں

(افسانہ)

بادشاہ

رضیہ سجاد ظہیر

اگر آپ کسی کالونی میں آٹھ سال سے رہ رہے ہوں، آپ کو بڑی خوش فہمی ہو کہ آپ کا مشاہدہ کافی تیز ہے، روز دن میں دو نہیں تو کم از کم ایک بار آپ بازار کا پھیرا کرتے ہوں، کبھی کبھی ایکشن باکسی اور چکر میں آپ گھر گھر، دوکان دوکان گھومتے بھی ہوں اور پھر بھی آپ کو کسی دن پتہ چلے کہ اس کالونی کی سب سے دلچسپ شخصیت کو تو آپ نے اب تک دیکھا ہی نہیں تھا، تو جو آپ پر گزرے گی کچھ ویسی ہی مجھ پر بھی گزری جب بالکل اتفاق سے میری ملاقات ایک دن بابو لال سے ہو گئی۔

ملاقات بھی یوں تھوڑا ہی ہوئی کہ کسی نے تعارف کروایا۔ بات دراصل یہ ہوئی کہ میرے گھر میں صرف دو عدد کرسیاں ہیں اور ان میں سے بھی ایک کا سیٹ، یعنی کہ جسے اب پلاسٹک کہا جاتا ہے، وہ ٹوٹ گئی تھی۔ بازار میں فرنیچر کی ایک ہی دوکان ہو تو اس کے مالک کا نخرہ معلوم۔ ایسے میں میں اپنی گلی میں کھلنے والے دروازے پر کھڑی دور سے جلوہ دکھاتے کسی سبزی والے کی منتظر تھی کہ بابو لال کو میں نے سائیکل پر سوار گزرتے دیکھا اور جیسے ہی مجھے اس کے کندھے پر لٹکے پلاسٹک کے لچھوں کی جھلک دکھائی دی، میں نے بے قرار ہو کر اسے آوازیں دینا شروع کر دیں۔ اس نے فوراً سائیکل موڑی اور قبل اس کے کہ میں اس سے کچھ کہتی وہ یوں مجھ سے مخاطب ہوا جیسے نہ جانے کب سے مجھے جانتا تھا: "اجی، ج ج جے ہند ——— تم آواز دے رہی ہو نہ؟"

"ہاں بھئی" میں نے اس کی بے تکلفی پر ذرا کھسیا کے کہا "آپ کرسی بُن دیں گے؟"

وہ فوراً ایسی کچھ اسا سائیکل میری دو سیڑھیوں پر چڑھا کر اس زور سے اندر آیا کہ میں بوکھلا کے پیچھے ہٹ گئی۔ اس نے سائیکل دیوار سے لگائی اور کندھے پر سے پلاسٹک کے لچھے اتارتے ہوئے فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا اور مجھے حکم دیتا ہوا بولا "نکالو کرسی، اب پہلے ہم دیکھیں گے"

میں نے ذرا ڈر کے پوچھا "مگر آپ کو آتا ہے نہ کرسی بُننا؟ باریک بُننا ہے؟"

اس نے میری طرف بڑی حقارت سے دیکھا "یہ پ پ پوچھو ہمیں کیا نہیں آتا۔ ک ک کرسی ہم بُنیں، بجلی ہم ب ب بنائیں، پانی کا ن ن نل ٹھیک کریں ——— اور جی، اس کا کیا نام، ک کھانا اچھے سے اچھا پ پکائیں ——— دری کا کام"

میں نے گھبرا کے فوراً کرسی باہر نکال دی "دیکھیے ——— یہ ہے۔ کیا لیجیے گا اس کی بُنوائی؟ ایسی ایک اور ہے"

اس نے ایک بار مجھے غور سے دیکھا، پھر کرسی کے معائنے میں لگ گیا۔ پھر دیکھ دیکھ کے بولا "ہوں"

"تو کیا ہو گی بُنوائی؟"

اس نے اوزاروں کے تھیلے میں سے ایک چمٹا سی نکالی اور کرسی کو گھمایا، بولا "جس کسی نے بھی ب ب بنی تھی، اچھی ب ب بنی تھی"

"مگر آپ کیا دام لیں گے؟" میں نے تیسری بار پوچھا۔

اس نے یوں مجھے دیکھا جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو میں کیا

کہہ رہی ہوں: بیٹے پیسے کو پوچھ رہی ہو؟"

میں نے دھیرے سے کہا "ہاں، کیا دام ہوں گے؟"

وہ ہنسنے لگا "اجی، دو دام کی فکر مت کرو۔ دام تو ہم نے یہاں گلی بھر پہ چھوڑ رکھے ہیں۔ کبھی آیا نہیں دیے، بیچ چلا گیا کہ جی پھر دے دینا۔"

اور بس وہ اتنا کہہ کر کرسی میں جٹ گیا۔

اس کی عمر کوئی چالیس پچاس کے بیچ ہوگی۔ خاکی رنگ کا بہت ہی میلا، گھٹنوں پر سے پھٹنے کی حد تک گھسا ہوا پیلوں، جس کے آگے والے دو بٹن کھلے ہوئے تھے، ہرے رنگ کی قمیص یعنی کہ جو کبھی ہرے رنگ کی رہی ہوگی جس کی پوری آستینیں کف میں بٹن نہ ہونے کی وجہ سے کہنی کے پاس سے جھول رہی تھیں، ننگے سر، سوکھا جسم، روکھے بال، جلے تانبے کا سا رنگ، بات کرتے ہیں تھوک کی چھینٹیں اڑاتا ہوا دہانہ، لمبی سی ناک، طنز سے بھری چھوٹی چھوٹی چمکتی ہوئی آنکھیں —— سائیکل میں اوزاروں کا پھٹیچر تھیلا اور کئی عدد اور نہ جانے کیا الم غلم سی، سائیکل کے پاس جوتا، بے رنگ، مٹی سے بھرا، جس میں رنگ برنگے چمڑے کی چیتیاں زیادہ تھیں اور اصل جوتا کم تھا۔

میں آنگن میں پڑے ایک پلنگ پر بیٹھ کر اس کو دیکھنے لگی، کچھ دیر بعد مجھ سے رہا نہیں گیا۔ آہستہ سے بولی "آپ کون ہیں مستری جی؟"

اس نے میری طرف دیکھا نہیں، ہنستے ہوئے جواب دیا "کون کیا؟ آدمی ہیں، ہم مستری ہیں۔ کام کرتے ہیں۔"

پھر ایک دم ہنس پڑا "اچھا —— ہم سمجھا —— میرا نام ہے بابو لال —— بابو لال کے معنی سمجھتی ہو؟ بابو کا بیٹا۔ تم کو جو ہم کہا تھا —— ہم مسلمان ہوتا تو سلام کرتا، ہندو ہوتا تو نمسکار —— ہم میں نے کہا دونوں کو گولی مارو، سب سے انسان اچھا۔"

میں انتہا شرمندہ ہوتے ہوئے بولی "یہ تو بہت عمدہ بات ہے —— اچھا کتنا کما لیتے ہیں آپ؟" "بہت، دینے والے نے ہم کو اتنا دیا ہے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا رکھوں کہاں؟"

میں دنگ رہ گئی —— یہ پھٹیچر کپڑے، یہ کٹے پھٹے، کھردرے ہاتھ پاؤں، یہ ستر جوڑ بہتر پیوند کا جوتا، یہ کھچڑا سائیکل اور اس پر اوزار کا چھوٹا تھیلا —— اور یہ استغنا!

"تو پھر آپ ڈھنگ کے کپڑے کیوں نہیں پہنتے بابو لال؟" میں نے کہا۔

"اجی، بات یہ ہے کہ امیروں میں کام کرتا ہوں نہ، ان کے ہاں اچھا کپڑا پہن کے جاؤ تو حج جلتے ہیں۔"

میں ایک دم ہنس پڑی "تو جلا ہے۔"

اس نے میری طرف حیران ہو کر دیکھا اور پھر زبان کی نوک نکال کے بولا "نہ —— نہ نہیں، ہم کسی کو نہیں جلاتے۔"

میرے شوہر پاس ہی دیوار میں لگے تیلے کے سامنے کھڑے شیو بنا رہے تھے، دھیرے سے بولے "یہ تو کوئی پہنچے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔"

جب کام ختم ہو گیا تو میں دو کرسیوں کی بنوائی ساڑھے دس روپے اس کو دینے لگی۔ وہ بولا "اٹھنی بیچ میں کیوں دے رہی ہو؟"

"تو کیا ہوا رکھ لیجیے" —— میں نے کہا۔

"نہیں نہیں —— ہم خیرات نہیں لیتے، محنت کے لیتے ہیں۔" اور یہ کہہ کر اس نے اٹھنی کو یوں چٹکی سے پکڑا جیسے وہ کوئی بہت ہی گندی چیز تھی اور میری ہتھیلی پر رکھ دیا۔

میں اتنا سا منہ لے کے رہ گئی!

سائیکل باہر نکالتے وقت وہ بڑبڑایا "تمہارے کام میں اس کے تین بجے ہو گئی، بیٹی بیٹھی ہو گی انتظار میں۔"

"کون؟ آپ کی بیوی؟"

"نہیں جی، وہ میری بلی —— روز اس کے لیے قیمہ لاتا ہوں نہ، وہ یہی کھاتی ہے —— نہیں لاتا تو خفا ہو جاتی ہے۔"

جب وہ روانہ ہونے لگا تو میں نے کہا "بابو لال —— آپ کہاں ملتے ہیں، کبھی کوئی کام ہو تو۔"

"اجی، وہ سبزی والا سردار ہے نہ، وہیں میری دکان بھی ہے۔ صبح بجے ہنس" —— اور وہ فوراً سائیکل پر بیٹھ کر نو دو گیارہ ہو گیا۔ واضح رہے کہ اس پوری گفتگو میں وہ مجھے برابر 'تم' کہتا رہا، میں اسے آپ کہتی رہی۔

دو تین دن بعد ایک روز شام کو میں بازار گئی تو سب سے پہلے سبزی والے سردار کی دوکان پر گئی اور میں نے دیکھا کہ اس سے دو ہی چار قدم دور، ایک ٹاٹ زمین پر بچھا ہے اور اس پر کچھ عجیب و غریب چیزیں ملی جلی رکھی ہیں۔ مثلاً بچوں کے رنگ برنگے پلاسٹک کے کھلونے کیلیں اور پیچ، تالے کنجیاں، بے حد خراب پھٹی ہوئی چھتریاں، گھٹیا قسم کا حصاب سائیکل کی پرانی گدیاں، جوتوں کی بیٹریاں، ربر کی مٹی مٹی چپلیں، چاندی یا کسی چمکتی دھات کی انگوٹھی چھلے ـــــ اور یہ نہیں کیا کیا اُلّم غلّم ـــــ مطلب یہ تھا کہ ایک تو بابو لال کھڑا تھا، دوسرے ایک خوبصورت سی مگر غریب سی نوجوان ماں کھڑی تھی اور تیسرا ایک سال بھر کا منّا سا بچہ جو اسی ماں کی کمر پر لٹک رہا تھا۔ اور اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا رنگین پلاسٹک کا جھنجھنا تھا۔ ماں اس سے وہ جھنجھنا لینے کی کوشش کر رہی تھی اور بابو لال ماں کو لیکچر دے رہے تھے "اجی، ب بت بھارا بچہ مجھے پ پ پیارا لگ رہا ہے تو تو م م میں دے رہا ہوں۔"

ماں نے کہا "مگر بھیّا! میں اتنا مہنگا تو نہیں لے سکتی۔"

بابو لال خفا ہو کے بولے "تو دَ دَ دام تم سے کون مانگ رہا ہے۔ دَ دَ دام سسرے کا کیا ہے، دینے والے نے م م مجھے اتنا دیا ہے، س س سمجھ میں نہیں آتا۔ رکھوں کہاں۔"

میں نے آگے بڑھ کر دھیرے سے کہا "بابو لال جی! کل ذرا آجائیے گا، کچھ بجلی کی چیزیں بنا دیجیے گا" ـــــ میری بات ختم بھی نہ ہوئی تھی کہ ایک سفید سیاہ چتیوں والی بلی پیڑ کی آڑ سے نکل آئی۔ وہ میری بات سننے کے بجائے بلی کی طرف مخاطب ہو گیا "ک ک کل میں ان کے ہاں جاؤں گا، س س سامان ٹھیک کرنے ـــــ بَ بَ رد بیو مت" ـــــ پھر مجھے حکم دیتا ہوا بولا "ن ن نکال رکھنا سامان ـــــ کبھی ب ب بارہ ایک بجوا دو ـــــ پ پ پھر میری بلی کے ق ق قیمے کو دیر ہو جائے گی۔"

اگلے دن وہ صبح آٹھ ہی بجے آگیا۔ میں نے کئی ایک بگڑی ہوئی چیزیں اس کے سامنے رکھ دیں ـــــ گیارہ بجتے بجتے اس نے سب بنا دیں اور پیسے لے کر جا ہی رہا تھا کہ میرے شوہر آگئے اور بولے "ارے بھئی مستری جی! آپ کا بہت شکریہ جو آپ نے یہ سب کام کر دیا مگر یہ بھی تو بتائیے کہ یہ سب چلیں گی کتنے دن؟ گارنٹی کیا ہے؟"

وہ بڑے طنز سے مسکرایا "اجی اگ گ گارنٹی تو رب نے آدمی کی ہی نہیں دی کہ ک ک کتنے دن چلے گا ـــــ ج ج جے ہند۔"

اس فلسفیانہ تاویل پر ہم دونوں میاں بیوی دم بخود رہ گئے!

پھر تو یہ ہونے لگا کہ میں بازار میں آتے جاتے اس کی دوکان پر ضرور حاضری دیتی ہوں مگر وہ اکثر وہاں نہیں ملتا ـــــ دوکان کھلی ہوئی ہے، ایک بلی بیٹھی اونگھ رہی ہے، دو تین کتّے کے پلّے کوئی ٹہل رہا ہے، کوئی چیزوں پر ٹھوتھنی جمائے سو رہا ہے۔ ایک دن وہ مجھے مل گیا تو میں نے کہا "بابو لال جی، آپ کوئی خاص وقت طے کر لیجیے اس وقت دوکان پر بیٹھا کیجیے، ہم آتے ہیں، چلے جاتے ہیں کچھ پتہ ہی نہیں چلتا کہ کس وقت آپ ملیں گے۔"

وہ بُرا مان گیا "اجی واہ، وہ ہم کیا کوئی سرکاری نوکر ہیں جو ٹ ٹیم پر ڈیوٹی دیں، ہم بادشاہ ہیں، ب ب بادشاہ ـــــ ج ج جی میں آیا آئے، ن ن نہیں آیا نہیں آئے۔"

اب آپ ہی کہیے میں اس بات کا کیا جواب دے سکتی تھی!

ایک دن وہ میرے یہاں پانی کا نل ٹھیک کرنے آیا تو یوں ہی اس سے پوچھا "بابو لال آپ کیا ہمیشہ سے ہکلاتے ہیں یعنی کہ کیا بچپن سے آپ"

وہ نل کھول کر اس میں نیا واشر لگا رہا تھا، بولا "ک ک کام کر لوں تو بتاؤں" ـــــ اس نے واشر کو اسی جگہ پر بٹھا کر اس پر ٹوٹی رکھی، اسے کسا اور پھر بولا "اب دیکھو" اور یہ کہہ کر اس نے دھیرے سے نل کھولا، پانی کی دھار بالکل برابر سے گرنے لگی ـــــ اور پھر اس نے نل کو خوب کھول دیا ـــــ پانی کی دھار دور دور تک گرنے لگی، وہ خود بھی بھیگ گیا، مجھ پر بھی چھینٹے پڑے اور غسل خانے کے فرش پر تو خیر بالکل ہی سیلاب آگیا۔

"لو لو لو" ـــــ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔

میں اس کا منھ تکنے لگی۔ وہ سمجھ گیا کہ میں کچھ نہیں سمجھی، ہنسا اور اپنے سر کو ایک انگلی سے ٹھونکتا ہوا بولا "ج ج جن لوگوں کے یہاں کم رہتا ہے، وہ د د دھیرے بولتے ہیں۔ اور جو دَ دَ دماغ کھلا ہو تو"

میں نے سر ہلا کے کہا "میں سمجھ گئی مستری جی! آپ کا دماغ زیادہ تیز دوڑتا ہے، زبان اتنی تیز نہیں دوڑ سکتی، بس ٹھوکر کھا جاتی ہے۔ ہے نہ"؟

(بقیہ صفحہ ۴۳ پر)

ارتقائی سفر

فسانۂ منزلِ دشوار کا ۔۔۔
لگا کے جان کی بازی قدم بڑھائے ہیں
یہ راہ کتنی ہی پُرخار ہے تو غم کیا؟
کہ ہم تو شعلوں پہ چل کر یہاں تک آئے ہیں
عظیم راہرو! ہے یہ ارتقا کا سفر
درازِ وقت پہ سورج کی طرح چڑھنا ہے
دلوں کے زخم نصیبِ بجا سہی لیکن
غبارِ راہ کو مرہم سمجھ کے بڑھنا ہے
نئی فضائیں، نئی زندگی نیا ماحول
یہ اہتمام ضروری ہے دورِ نو کے لیے
بچھڑ گئی ہے شبِ ماہتاب دائم کی
اک ایک شمع کی افسوں طرازِ نو کے لیے
یہ کہہ رہی ہیں زمانے کی ملتجی نظریں
حقیقتوں کو نئی زندگی عطا کر دو
تقاضا ہے سحر تارہ کی شعاعوں کا
ہمارے جلووں کو تابندگی عطا کر دو
سرشتِ فتنہ گری ہے تغیر آمادہ
ستارے کہتے ہیں ہم پھول بن کے مہکیں گے
یہ کہہ رہے ہیں اندھیرے کہ رات کے آثار
تجلیوں کا نیا رنگ پا کے مہکیں گے
تڑپ رہی ہیں امنگوں کی بجلیاں دل میں
ستارے ناچ رہے ہیں دمکتے ماتھوں پر
عزائم اپنی بلندی پہ ناز فرما ہیں
حیات کرتی ہے بیعت ہمارے ہاتھوں پر
غمِ حیات کے مارے ہوؤ! ذرا ٹھہرو
تمہارے ہونٹوں کو ہم مستقل ہنسی دیں گے
اٹھو ذرا اٹھ کے کرو صبحِ نو کا استقبال
ہم آفتاب ہیں دنیا کو روشنی دیں گے

حرمت الاکرام

رباعیات

شوکت پردیسی

(۱)

صد احتیاطِ حیا سے قدم اٹھائے ہوئے
چہرے کو نقابِ عارض سے چھپائے ہوئے
ابھی نظر سے بچ کے یہ گزرا ہے کون
ہر اک کی نگاہ میں مگر سمائے ہوئے

(۲)

اڑتا ہوا بادل کہیں ہاتھ آیا ہے
چھوٹا ہوا آنچل کہیں ہاتھ آیا ہے
بکھری ہوئی جوت کبھی سمٹی ہے کہیں؟
گزرا ہوا اک پل کہیں ہاتھ آیا ہے

(۳)

جینے کی کوئی آس نہیں ہو جیسے
یا شعلۂ انفاس نہیں ہو جیسے
یوں دردِ محبت سے ہے اب دل خالی
انسان کو احساس نہیں ہو جیسے

(۴)

ہم تم تو محبت کے پرستار رہے
حالات کی گردش سے بھی دوچار رہے
اب وقت سے اتنا بھی یہ ممکن ہو گا
دو دل ہو ہم ساتھ رہیں پیار رہے

(۵)

کب جوگ سدا رہا کس سے کہوں
کیوں مائلِ فریاد رہا کس سے کہوں
جب تم کو بھی کچھ ہوش نہیں ہے میرا
میں شاد کہ ناشاد رہا کس سے کہوں

(۶)

ہم تم سے تغافل کا گلہ کیا کرتے
کس طرح محبت کا تقاضا کرتے
جب بیچ میں تھی وقت کی دیوار کھڑی
کرتے بھی تو کیا کس طرح تمنا کرتے

(۷)

بدرا کی کوئی تان ہے یا انگڑائی
کویل کی یہ مسکان ہے یا انگڑائی
یہ سر سے اچانک ترے گرتا آنچل
اٹھتا ہوا طوفان ہے یا انگڑائی

یحییٰ اعظمی — ایک تاثر

ضیاء الدین اصلاحی*

جناب یحییٰ اعظمی کا ۲۲ فروری ۱۹۷۲ء کو مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ وہ بڑے پختہ مشق اور خوش فکر شاعر اور پکے قوم پرور اور محب وطن مسلمان تھے۔ ان کی عمر ساٹھ اور ستر کے بیچ میں تھی۔ ابتداءً وہ ڈسٹرکٹ بورڈ کے اسکول میں معلم تھے۔ یہ ترکِ موالات کی تحریک کے شباب کا زمانہ تھا، جب ترکی کے واقعات نے مسلمانانِ ہند میں بڑی شورش و ہیجان برپا کردیا تھا اور مجلس خلافت کی شاخیں پورے ملک میں آناً فاناً قائم ہوگئی تھیں اور خلافت و کانگریس کے مشترکہ پلیٹ فارم نے ہندستان کے ہر ہر گوشے میں برطانوی استبداد و آمریت کے خلاف منافرت اور بغاوت کے جذبات بیدار کرکے اتحاد و یکجہتی اور آزادی و حریت کی لہر دوڑا دی تھی۔ یحییٰ اعظمی کے دل میں بھی قوم و وطن کا درد تھا انھوں نے ڈسٹرکٹ بورڈ کی معلمی کی نیم سرکاری ملازمت ترک کرکے ۱۹۲۵ء کے اوائل میں دارالمصنفین اعظم گڑھ کے دفتر میں ملازمت کرلی۔

دارالمصنفین ایک خالص علمی و تحقیقی ادارہ ہے۔ اس کو ملک و قوم کے عام عملی کاروبار اور ہنگامہ آرائی حد و جہد سے زیادہ سروکار نہیں لیکن ایسے نازک اور پر آشوب دور میں قوم و وطن کی آزادی و اتحاد کی تحریک سے الگ تھلگ رہنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا دارالمصنفین کے بانی و مؤسس علامہ شبلی نعمانی مرحوم کی طرح ان کے لائق جانشینوں نے بھی ملک کی آزادی و اتحاد کی تحریک کا ساتھ دیا اور اس کے اس زمانے کے کارپردازوں، مولانا سید سلیمان ندوی مولانا عبدالسلام ندوی اور مولانا مسعود علی ندوی نے جنگ آزادی کے رہنماؤں اور قائدین کے دوش بدوش اس میں بڑھ چڑھ کر نمایاں حصہ لیا۔

دارالمصنفین کا یہ علمی و ادبی اور نیم سیاسی ماحول یحییٰ اعظمی کے مزاج کے مطابق تھا۔ اس میں ان کو اپنے ذوق کی تسکین اور ذہن کے سکون کا پورا سامان ملا اس لیے وہ اس سے اس طرح وابستہ ہوئے کہ اب موت ہی ان کی وابستگی اور تعلق کا خاتمہ کرسکی ہے۔ یہیں ان کی مولانا شبلی کے ممتاز شاگرد مولانا اقبال سہیل سے ان کی ملاقات ہوئی جو شعر و ادب کے امام، علم و فن میں یکتا، ذہانت و طباعی کا حیرت انگیز نمونہ اور قدرت کے انعامات اور بخششوں کا عجوبہ تھے۔ ان کی صحبت اور دارالمصنفین کے علم و ادب پرور ماحول میں رہ کر یحییٰ اعظمی کی شاعری کی دبی چنگاریاں بھڑک اٹھیں۔

یحییٰ اعظمی کی تعلیم اگرچہ ایسی کچھ زیادہ نہ تھی مگر ان میں شعر و سخن کا ملکہ فطری اور خداداد تھا علاوہ ازیں یحییٰ صاحب کو دو ناموران فن اور اصحاب کمال سے نسبت کا شرف بھی حاصل ہے یعنی علامہ شبلی اور مولانا سہیل سے۔ اول الذکر سے اگرچہ ان کو براہ راست استفادہ کا موقع نہیں ملا، مگر موخر الذکر سے جن کے حصے میں شبلی کی شعری و ادبی وراثت زیادہ آئی تھی، خاص تعلق تھا اور وہ ان کو فخر سے "فرزند معنوی" کہتے تھے۔ سہیل کی صحبت نے ان کی فطری صلاحیتوں میں نہ صرف جلا پیدا کی بلکہ ان میں شعر و سخن کا ایسا پختہ اور رچا ہوا ذوق پیدا کردیا کہ ان کے اور سہیل کے کلام میں

فرق و امتیاز کرنا مشکل ہوگیا۔

یحییٰ اعظمی نے حالات اور طرز ادا دونوں میں شبلی اور سہیل کا تتبع کیا خصوصاً مؤخرالذکر کا رنگ سخن تو انھوں نے پوری طرح اپنا لیا تھا چنانچہ اقبال سہیل ان کے پہلے مجموعہ کلام نوائے حیات کے متعلق لکھتے ہیں

"یہ مجموعہ جو اس وقت آپ کے پیش نظر ہے تمام تر اس ہی کا نتیجۂ فکر ہے مگر یہ ان کے تتبع کا کمال ہے کہ اکثر ان کی نظموں پر اہل نظر کو بھی استاد کے نقش قلم کا دھوکہ ہوتا ہے کچھ تو ان کی فطری استعداد اور کچھ مذہبی و سیاسی رجحانات اور ادبی ذوق میں استاد کے ساتھ ہم آہنگی، ان کی فنی ترقی میں بہت مساعد ہوئی اور اب تو یہ عالم ہے کہ ان کی نقش قلم کو میری ذہنی مخلوقات سے ممتاز کرنا بڑے بڑے مبصرین کے لیے بھی دشوار ہے۔"

یحییٰ اعظمی نے خود بھی نہایت فراخ دلی اور جذبہ احسان مندی کے ساتھ اعتراف کیا ہے کہ

"اہل نظر واقف ہیں کہ میرا ذوق و وجدان شبلی و سہیل سے متاثر ہے اور مؤخرالذکر اور اس ناچیز کے درمیان تو آفتاب و ذرہ کا ربط رہا ہے اور بلا تامل عرض ہے کہ اس کے پاس جو کچھ بھی ہے سب اسی آفتاب دانش کی ضیا بخشی کا نتیجہ ہے ؎

شعاع فیض کی ہیں یہ نوازشیں ورنہ
کہاں یہ ذرہ، کہاں مہر ضو فشان سہیل"

یہ تو استاد و شاگرد کے اپنے بیانات ہیں اس سلسلے میں بعض اور مبصرین اور اہل نظر کے آرا نقل کرنا مناسب نہ ہوگا مولانا سید سلیمان فرماتے ہیں

"شاعر کے کلام پر نمایاں اثر شبلی اور شبلی کے جوہر سخن گو شاگرد حضرت سہیل کا ہے وہی اردو میں فارسی ترکیبوں کا رواج وہی جذبات کا جوش و خروش اور ہر نظم میں مذہب و سیاست کا رنگ، اتحاد کا شکوہ جذبات کا جوش اور حق و صداقت کا زور اس کے کلام کے خصوصیات ہیں۔"

سابق صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم رقم طراز ہیں

"مجھ کو طالب علمی کے زمانے میں سہیل کی رفاقت نصیب ہوئی۔ ان کی قدرت کلام نے میرے دل پر گہرا اثر ڈالا اسی قدرت کلام کی جھلک مجھے یحییٰ صاحب کے کلام میں دکھائی دی ہے جنھیں سہیل سے گہرا تعلق تھا۔ مجھے تو ان کی بعض نظموں کو پڑھتے ہوئے ایسا گمان ہوتا ہے کہ سہیل کی نظم پڑھ رہا ہوں"

وہ شبلی و سہیل کے رنگ سخن کے بھرپور نمائندہ تھے اور ان پر اس انداز کلام کا خاتمہ ہوگیا۔ افسوس کہ ارقیلہ محبوں کیسے بماند

اقبال سہیل کی طرح یحییٰ اعظمی کو بھی نظم سے زیادہ اور حقیقی مناسبت تھی لیکن ان کا گلستان شاعری غزل کے زمزمہ سے خالی نہیں ہے۔ ان کی غزلوں میں کیف و حلاوت، سوز و اثر، لطافت و پاکیزگی، قلبی واردات و تاثرات، خیالات کی رنگینی و مستی اور طرز ادا کی رعنائی و دلکشی موجود ہے۔ مگر ان کا اصل سرمایہ فخر و کمال نظمیں ہیں۔ ان میں مختلف قومی و ملی اور سیاسی مسائل و امور پر پرشکوہ انداز میں اظہار خیال کیا گیا ہے اور یہ مذہبی روح، قومی غیرت، ملی حمیت، سیاسی رجز، حب الوطنی، سبق آموزی اور درس اخلاق وغیرہ سے معمور اور شاعرانہ محاسن، مشق و مہارت کی پختگی، قوت تخیل کی رفعت و ندرت، انداز بیان کی حلاوت و دلآویزی، احساسات کی شدت، مشاہدات کی گہرائی اور اقبال سہیل کی طرح زبان و بیان پر غیر معمولی استادانہ قدرت کا نمونہ ہیں۔

یحییٰ اعظمی نے قوم و ملت اور ملک و وطن کی مقدس و نامور ہستیوں کے شاندار اور پرشکوہ کارنامے اور گزشتہ زریں تاریخ کے عظیم الشان اور پرعظمت واقعات بیان کر کے قوم و وطن میں بیداری کی نئی روح پھونکی ہے۔ ان کے ابتدائی دور کا کلام دراصل قومی رجحانات و میلانات کا عکس اور سیاسی حقائق و کوائف اور مجاہدین آزادی کے کارناموں اور خدمتوں کا مرقع ہے۔ ان کی نظموں میں ہم عصر مشاہیر علم و فن اور قوم و وطن کے اکابر کے اوصاف و کمالات بھی جوش و ولولہ کے ساتھ

بیان کیے گئے ہیں۔ انھوں نے مرحومین کے پردرد نوحے اور دل دوز مرثیے بھی کہے ہیں جو شدتِ تاثر، جوشِ غم اور جذبۂ عقیدت سے معمور ہونے کے علاوہ شاعر کی علم و ادب شناسی اور قوم و وطن پروری کا ثبوت اور موجودہ نسل کے لیے درسِ عبرت اور پیامِ موعظت ہیں۔ آزادی کے بعد کی نظموں میں انھوں نے خاص طور پر ہندوستان کی برق رفتار ترقی، اس کے درخشاں مستقبل اور عظیم الشان تعمیری و فلاحی منصوبوں کا ذکر کیا ہے۔

یحییٰ اعظمی ہمیشہ سے قوم و وطن پرور رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی آزادی سے پہلے بھی وہ آزادی و اتحاد کی تحریک کے ایسے ہی پرجوش حامی تھے جیسے خود غرض، مفاد پسند اور فرقہ پرست عناصر کے مخالف تھے۔ اس زمانے میں ان کا قلم ملک کی مظلومی و غلامی پر نوحے لکھتا اور ان سرفروشانِ وطن کو ہدیۂ تبریک اور نذرِ خلوص پیش کرتا رہا جو غیر ملکی سامراج کے خلاف صف آرا اور سرگرمِ عمل تھے اور جب آزادی کا سورج طلوع ہوا تو ان کا دل مسرت و شادمانی سے معمور ہو گیا اور وہ دل و جان سے قوم و وطن کی تعمیر و ترقی کے آرزومند بن گئے۔ اس زمانے میں ان کی شاعری کا مطمحِ نظر ان قومی رہنماؤں کو تہنیت و عقیدت پیش کرنا اور ان کے ہاتھ مضبوط کرنا بن گیا جو ملک میں جمہوریت، سیکولرزم، سوشلزم اور عدل و انصاف کو فروغ دے کر چھوت چھات، اونچ نیچ، امیری و غریبی کا فرق، ذات پات کا بندھن اور فرقہ وارانہ آویزش کی لعنت مٹانا اور سماجی و معاشی ناہمواری اور ناانصافی و بدعنوانی کا انسداد کرنا اور پورے ملک کو اتحاد و یکجہتی اور میل ملاپ کا گہوارہ بنانا چاہتے تھے۔

علم و ادب اور سیاست کے جن مشاہیر سے ان کو عمر بھر عقیدت و محبت تھی اور جن کے علمی و ادبی کمالات اور قومی و ملی اور سیاسی خدمات کا انھوں نے شاندار اور پُراثر انداز میں ذکر کیا ہے ان میں علامہ شبلی و سہیل کے علاوہ گاندھی جی، مولانا ابوالکلام آزاد، جواہر لال نہرو، ڈاکٹر ذاکر حسین، لال بہادر شاستری، اور شریمتی اندرا گاندھی کے نام خاص طور سے لائقِ ذکر ہیں۔ ان لوگوں کے معاملے میں ان کے جذبات نہایت نازک تھے اور وہ ان کے خلاف کوئی بات نہ سن سکتے تھے۔ مولانا آزاد اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے یحییٰ اعظمی کے کلام کی بڑی تحسین کی ہے، جو ان کے لیے بڑی سند ہے۔ مولانا ابوالکلام نے قومی و وطنی شاعری کے صلہ میں ان کے لیے حکومتِ ہند سے سو روپیے ماہانہ وظیفہ مقرر کرا دیا تھا جو تاحیات ان کو ملتا رہا۔

شریمتی گاندھی کی عظمت کا نقش بھی ان کے دل پر ثبت تھا۔ وہ اپنی کم آمیزی کی بنا پر جلسے جلوس میں شرکت کرنے کے بالکل عادی نہیں تھے۔ مگر یہ اندرا گاندھی کی شخصیت کی کشش اور جادو تھا کہ وہ جب جب اعظم گڑھ آئیں تو یہ ان کے جلسوں میں ضرور بڑے شوق اور پابندی سے گئے۔ ایک دفعہ اعظم گڑھ میں ان کی آمد کے موقع پر انھیں دارالمصنفین میں مدعو کیا گیا جس کو اندرا جی نے شدید مصروفیت کے باوجود غالباً اس تعلق کی بنا پر جو ان کے والد اور دادا کو دارالمصنفین اور اس کے قدیم کارکنوں سے رہا ہے خوشی سے منظور کر لیا۔ یحییٰ اعظمی نے اس موقع پر ایک نظم کہہ کر ان کا خیر مقدم کیا۔

شریمتی گاندھی نے گزشتہ چند سالوں کے اندر جو عظیم الشان اقدامات، حیرت انگیز انقلابی فیصلے کیے ہیں اور جرأت مندانہ ترقی پسندانہ کارنامے انجام دیے ہیں ان کے یحییٰ اعظمی بڑے معترف اور مداح تھے۔ حال میں بنگلہ دیش کی آزادی اور وہاں کے مظلوموں کی ہمدردی میں ملک نے اندرا جی کی قیادت میں جو رول ادا کیا ہے اس سے بھی وہ بہت متاثر تھے۔ چنانچہ اس موقع پر انھوں نے انھیں تبریک و عقیدت کی ارمغان پیش کی۔ یہی ان کی آخری نظم بھی جو "فتح عظیم" کے عنوان سے انھوں نے لکھی تھی۔

ان کا کلام معارف اعظم گڑھ، آج کل دہلی، نیا دور لکھنؤ اور قومی آواز لکھنؤ میں برابر چھپتا تھا اور دو مجموعے بھی مواعظِ حیات اور نوائے عصر کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ اس مضمون میں ان کی شاعری پر مفصل تبصرہ مقصود نہیں ہے۔ آئندہ کبھی اس کے مختلف پہلوؤں اور قومی و سیاسی رجحانات اور حب الوطنی کے

نقوش اُجاگر کیے جائیں گے۔ وہ فرقِ مراتب کا بڑا لحاظ کرتے تھے۔ ان کی تحریریں افراط و تفریط اور بے احتیاطی سے پاک ہیں

یحییٰ اعظمی بڑے لطافت پسند تھے سادگی کے باوجود ان کی زندگی میں خوش سلیقگی اور تناسب تھا۔ ان کے مکان اور دفتر کے کمرے بہت صاف ستھرے رہتے تھے اور ان کی ہر چیز بڑے قرینے اور سلیقے سے رکھی ہوئی ہوتی تھی اور میز کی تمام چیزیں بہت مرتب رہتی تھیں لباس موٹے جھوٹے کھدر کا نہایت صاف ستھرا پہنتے تھے۔

وہ طبعاً کم آمیز، خاموش اور عزلت پسند تھے ان میں نام و نمود کی ہوس اور تکلف و تصنع کا شائبہ نہیں تھا۔ ناموری اور شہرت طلبی کے مواقع سے ہمیشہ دور رہتے، مشاعرے اور جلسے تو درکنار علمی محفلوں اور مخصوص ادبی و شعری نشستوں میں بھی شریک ہونے سے احتراز کرتے تھے۔ لوگوں سے ملنے ملانے میں ان کو بڑا تکلف اور سخت گھبراہٹ ہوتی تھی۔ مگر یہ ان کے افتادِ طبع کا نتیجہ تھا ورنہ مزاج میں ترفع کی بجائے خاکساری اور فروتنی تھی اس لیے جب کسی سے ملتے تو انکسار اور خندہ پیشانی سے ملتے اور چھوٹوں سے بھی شفقت و مروت سے پیش آتے۔

شرم و حیا اور پاکبازی میں بے مثال تھے۔ اپنے بے تکلف دوستوں کے سامنے بھی ان کی جھجک قائم رہتی اور کوئی بات سنجیدگی و متانت کے خلاف نہیں کرتے تھے۔ امانت و دیانت، فرض شناسی اور اوقات کی پابندی کا خاص خیال رکھتے تھے اور اپنے متعلقہ فرائض بڑی دیانت داری اور خوش اسلوبی سے انجام دیتے تھے۔ دارالمصنفین میں ہزاروں روپے کے کاروبار کا حساب کتاب تنہا ان ہی کے ذمے تھا۔ لیکن اس میں کبھی ایک حبہ کا فرق نہیں ہوتا تھا۔

استقامت و استقلال کا یہ حال تھا کہ تحریک خلافت اور نان کوآپریشن کے زمانے میں انہوں نے جو عقیدہ اور سیاسی مسلک اختیار کر لیا تھا، اس پر ہمیشہ استوار اور قائم رہے، اور بڑے سے بڑا طوفان بھی ان کے قدم کو متزلزل نہیں کر سکا۔ زندگی کے دوسرے اشغال و معمولات میں بھی ان کی وضعداری، رکھ رکھاؤ اور استقامت کا یہی حال تھا۔

حسن اتفاق ہے کہ مولانا ابوالکلام کے مداح و عقیدت کیش نے بھی اسی تاریخ کو اس جہان فانی کو الوداع کہا جس تاریخ کو چودہ سال پہلے خود مولانا نے الوداع کہا تھا۔



تصحیح

نیا دور کے جنوری۔ فروری ۷۲ء کے مشترکہ شمارے میں ایک تصویر شائع ہوئی ہے جو گزشتہ سال کی ہند پاک جنگ کے دوران "جن جاگرن" پروگرام سے متعلق ہے۔ جن جاگرن کا یہ پروگرام سوچنا وبھاگ اتر پردیش کے زیر اہتمام سوچنا کیندر حضرت گنج لکھنؤ سے روزانہ شام کو نشر ہوا کرتا تھا۔ غلطی سے تصویر کی سرخی میں اس پروگرام کو ہندی۔ اردو سنگم کے زیر اہتمام ہونا لکھ گیا ہے جس کا افسوس ہے۔

—— ایڈیٹر



وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی ۲۲ر اپریل ۸۲ء کو بڑہل گنج (گورکھپور) میں ایک بڑے جلسۂ عام کو خطاب کرتے ہوئے



بہار کے وزیر اعلیٰ شری کیدار پانڈے ۲۶ر اپریل ۸۲ء کو وزیر اعلیٰ اتر پردیش شری کملاپتی ترپاٹھی سے ان کے دفتر میں بات چیت کرتے ہوئے





اترپردیش سنگیت ناٹیہ اکادمی کی جانب سے ۱۵ فنکاروں کو انعامات دینے کی ایک تقریب رویندرالیہ لکھنؤ میں ۲۸ مارچ سنہ۸۰ء کو منعقد ہوئی۔ تصویر میں گورنر ڈاکٹر بی گوپال ریڈی ہندی کے ممتاز ادیب شری امرت لال ناگر کو انعام دیتے ہوئے



شری کے۔ سی۔ پنت وزیر ریاست برائے امور خارجہ حکومت ہند نے حال ہی میں بینی کو اے بندرگاہ کا افتتاح کیا۔ تصویر میں شری پنت اس موقع پر ہونے والی دستکاریوں کی نمائش دیکھ رہے ہیں



شری کملاپتی ترپاٹھی یو پی پولیس کے ڈپٹی انسپکٹران جنرل کے سالانہ جلسے کو لکھنؤ میں ۲۵ مارچ سنہ ۷۲ء کو خطاب کرتے ہوئے نائب وزیر
داخلہ شری رام کرشن دویدی جی وزیر اعلیٰ کے بائیں جانب بیٹھے ہوئے ہیں

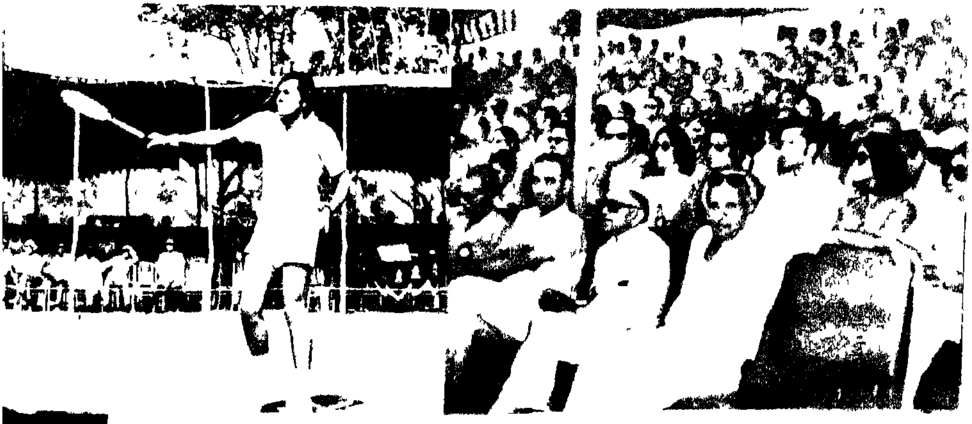


وزیر آبپاشی اتر پردیش شری رام
لکھن کردی ضلع باندہ میں جیسلی
لعلی پمپ نہر کا ۲ اپریل کو
سنگِ بنیاد رکھتے ہوئے



اس سال میونخ میں ہونے والے اولمپک ہاکی میچ کے لیے ہندستانی ٹیم کے کھلاڑیوں کے انتخاب کے واسطے اپریل میں لکھنؤ میں ہاکی کے ممتاز کھلاڑی اور سابق کپتان شری گوربچن سنگھ (بالو) کی نگرانی میں ایک ماہ کا تربیتی کیمپ منعقد ہوا۔ تصویر میں (بائیں) کیمپ میں حصہ لینے والے کھلاڑیوں کا گورنر ڈاکٹر بی۔ گوپال ریڈی سے تعارف اور (دائیں) شری بالو ہاکی استعمال کرنے کا صحیح طریقہ بتا رہے ہیں

مرکز میں : صدر شری فخر الدین علی احمد لکھنؤ میں سیلون اور ہندستان کے درمیان ہونے والے ڈیوس کپ لان ٹینس کا دوسرے دن (۳ اپریل ۷۲ء) کا میچ اپنے دیکھ رہے ہیں ہندستان کے شری جے دیپ مکرجی اور شری پریم جیت لال نے میچ جیتا



مشرقی اترپردیش کی ترقی میں ایک اور اہم کڑی

دوھری گھاٹ کا پُل

وارانسی گورکھپور قومی شاہراہ نمبر ۲۹ پر دوہری گھاٹ کے قریب نو تعمیر گھاگھرا کا پل، جس کا افتتاح وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ۲۲ اپریل ۷۲ء کو کیا، گورکھپور، دیوریا اور بستی کے ضلعوں کو اعظم گڑھ، غازی پور، سلطان پور، وارانسی اور جون پور ضلعوں سے براہ راست ملاتا ہے یہ پل پردیس کے اس پس ماندہ علاقے کی معاشی ترقی کے سلسلے کی ایک اہم کڑی ہوگا۔ دریائے گھاگھرا نے اب تک مشرقی اترپردیش کے سب سے گھنی آبادی کے اس وسیع علاقے کو تقریباً دو حصوں میں بانٹ رکھا تھا۔ ان دونوں حصوں کو جوڑنے کی پہلی کڑی تھی فیض آباد کے قریب کے پل کی تعمیر اور دوسری اہم کڑی ہے یہ دوہری گھاٹ کا پل۔

گھاگھرا کا پل ہر موسم میں آمد و رفت اور باربرداری کی زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرکے صنعت، تجارت اور زراعت کو فروغ کی نئی سمت اور نئی رفتار عطا کرے گا۔

اب مشرقی اترپردیش کے یہ ضلعے بہار، مغربی بنگال اور نیپال سے براہ راست رابطہ قائم کرکے اپنی ضرورتیں پوری کرسکیں گے اور اپنی مصنوعات اور پیداوار دور دراز کی منڈیوں تک لے جاسکیں گے۔

اس پل کی عدم موجودگی میں اب تک پیپے کے پل کے ذریعہ دریائے گھاگھرا کو پار کیا جاتا تھا۔ برسات کے موسم میں تقریباً چھ مہینے تک پیپے کا پل ہٹا دیا جاتا تھا اور اس زمانے میں اس بڑے دریا کو صرف کشتیوں کے ذریعہ پار کیا جاسکتا تھا یہ انتظام بے انتہا پریشان کن اور ساتھ ہی گراں خرچ تھا اس میں وقت بھی زیادہ لگتا تھا۔ گھاگھرا پل کے بن جانے سے یہ دشواری ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی ہے اس پل پر آمد و رفت کے لیے ٹول ٹیکس نہیں لگایا جائے گا

گورکھپور کے کھاد کے کارخانے کے لیے کچا مال اور دوسری ضروری اشیاء دور دور کے مشرقی پردیسوں سے لانا پڑتی ہیں اور تیار شدہ کھاد اسے ہی دور دراز کے علاقوں تک بھیجا

گھاگھرا کا پُل خوش حالی کا راستہ ہوگا

وزیراعلیٰ کا پیغام

دوہری گھاٹ میں گھاگھرا کے نو تعمیر پل کے افتتاح کے موقع پر وزیراعلیٰ شری کملا پتی ترپاٹھی نے حسب ذیل پیغام دیا تھا

"گھاگھرا کا پل، جس کی ضرورت عرصۂ دراز سے محسوس کی جارہی تھی اس کے بن جانے سے جو خوشی ہو رہی ہے اس کا اظہار لفظوں میں مشکل ہے۔ لوہے اور سیمنٹ سے بنا ہوا یہ پل ایک مادّی پل ہی نہیں بلکہ سماجی، جغرافیائی اور معاشی پروگراموں کو مربوط کرنے اور خوش حالی لانے والا پل بھی ثابت ہوگا۔ اس کی تکمیل سے ایک بہت بڑی کمی دور ہوگئی ہے۔ قرنوں سے پس ماندہ پردیس کے دو حصے اب ایک ہوگئے ہیں ہمارے راشٹر کی وزیراعظم اندراجی اس کا افتتاح کر رہی ہیں اس سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس پل کے ذریعہ مشرقی ضلعوں کی خوش حالی اور ترقی کے دروازے کھل گئے ہیں"



دوہری گھاٹ کا نو تعمیر پل

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی ۲۲ اپریل [illegible] کو پل کا افتتاح کرتے ہوئے تصویر میں مرکزی وزیر شری فخرالدین علی احمد وزیر اعلیٰ یو۔ پی شری کملاپتی ترپاٹھی بھی دکھائی دے رہے ہیں

ثابت ہوتے۔ ریلوے ویگنوں کی کمی اور وقت سے ان کے نہ مل پانے کے باعث گھاگھرا کے جنوب میں واقع پردیش کے مختلف ضلعوں کو کیمیاوی کھاد وقت پر اور مناسب مقدار میں نہیں مل سکتی تھی۔ اسی کے ساتھ گورکھپور کے کارخانے کی کھاد گنگا کے جنوب میں واقع ریاست بہار کے وسیع علاقے تک بھی دشواری کے ساتھ پہنچ پاتی تھی لیکن گھاگھرا کے پل نے تیار مال اور تیار کھاد کے نقل و حمل کو بے حد آسان بنا دیا ہے۔

دوہری گھاٹ اور اس کے قرب و جوار کے علاقے کھادی اور دوسری دیہی صنعتوں کے لیے مشہور ہیں۔ یہاں ایک ترقیاتی بلاک بھی قائم کیا گیا ہے۔ بستی اور گورکھپور کے اضلاع بھی کافی مقدار میں کھادی اور ہینڈلوم کا سامان تیار کرتے ہیں۔ گھاگھرا کا پل اس مال کے لیے بازار مہیا کرے گا۔ مال تیار کرنے والوں کو معقول پیسہ دے گا اور ان کی ہمت افزائی کرے گا۔

پردیش کے مختلف قابل دید مقامات کی سیر کے لیے ہر سال ملکی اور غیر ملکی سیاح لاکھوں کی تعداد میں آتے ہیں۔ وہ بنارس اور بودھی تیرتھ استھان سارناتھ تو لازماً آتے ہیں اور وہاں سے بودھوں کے مذہبی مقامات لمبنی، کشی نگر اور آوستی جاتے ہیں۔ اب تک اس سفر میں دریائے گھاگھرا اور اس کی سیلابی موجیں حائل رہتی تھیں لیکن گھاگھرا کے نو تعمیر پل نے ان یاتریوں اور سیاحوں کے سفر کو بہت ہی آسان بنا دیا ہے۔

گورکھپور، دیوریا اور بستی سے الٰہ آباد پہنچ جانے پر وہاں سے باندہ اور جھانسی یعنی بندیل کھنڈ جانے کا راستہ کھل جاتا ہے۔ یہ سہولت بھی اس پل کے بن جانے سے مہیا ہوئی ہے۔

اس پل کی تعمیر کے لیے حکومت ہند نے ۱۹۶۵ء میں ایک

[illegible] ۱۹۸۴ تک

اسکیم منظور کی تھی جس پل کی تعمیر پر ۲۲ء۱۸۳ لاکھ روپے کی لاگت آئی ہے تفصیلی سروے کے بعد دوہری گھاٹ سے متصل موجودہ ناؤ گھاٹ سے ۳ میٹر نیچے کی جانب یہ جگہ پل کی تعمیر کے لیے موزوں پائی گئی یہاں دریا کا بہاؤ سیدھا ہے

اس مقام پر دریائے گھاگھرا کے پانی کا انتہائی بہاؤ ۸۰۰۳ مربع میٹر فی سکنڈ ہے۔ اتنی مقدار میں پانی کے بہاؤ کے لیے ۶۲ میٹر لمبا پانی کا سیدھا راستہ درکار ہے۔ پل میں کنکریٹ کے ۱۳ پائے ہیں جو سیمنٹ کنکریٹ کے کنوؤں پر تعمیر کیے گئے ہیں۔

گھاگھرا پل پر سڑک کی چوڑائی ۷٫۵ میٹر ہے جس پر بھاری گاڑیاں بیک وقت دونوں جانب سے گزر سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ پیدل چلنے والوں کے لیے دونوں طرف ۱٫۵ میٹر چوڑے فٹ پاتھ بنائے گئے ہیں۔ اس پل کی تعمیر کا کام ۱۳ مارچ ۱۹۷۶ء کو شروع ہوا تھا اور مکمل ہونے کے بعد ۲۲ اپریل ۱۹۸۲ء کو وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے عام آمد و رفت کے لیے اس کا افتتاح کیا۔ گاڑیاں بیک وقت دونوں جانب سے گزر سکتی ہیں اس کے علاوہ پیدل چلنے والوں کے لیے دونوں طرف ۱٫۵ میٹر چوڑے

دفاعی فنڈ میں ایک کروڑ کا عطیہ

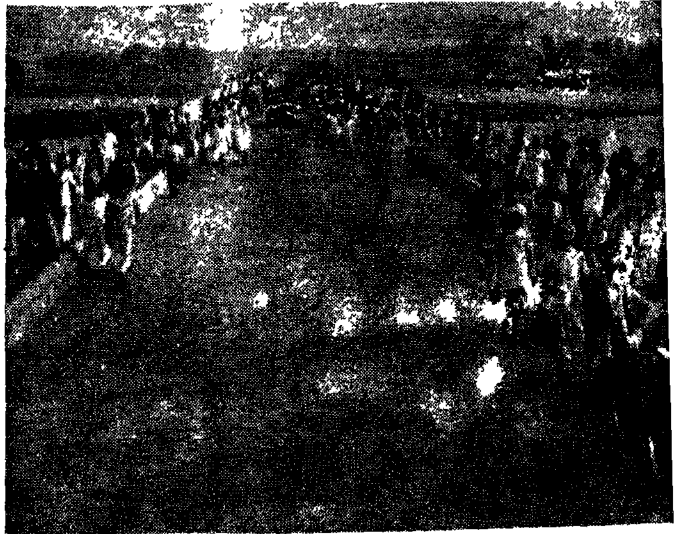
پل کے افتتاح کے موقع پر ہونے والے جلسہ عام میں وزیر اعلیٰ شری کملا پتی ترپاٹھی نے دفاعی فنڈ کے لیے ایک کروڑ روپے کی تیسری قسط وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کو پیش کی۔

وزیر اعلیٰ نے قومی دفاعی فنڈ کے ۱۳٫۵ کروڑ روپے کی پہلی قسط ۸ جنوری ۱۹۸۲ء کو لکھنؤ کے ایک جلسہ عام میں وزیر اعظم کو پیش کی تھی۔

دفاعی فنڈ کے لیے ایک کروڑ کی دوسری قسط وزیر اعلیٰ نے وزیر اعظم کے دورہ رائے بریلی کے موقع پر ۲۴ جنوری ۱۹۸۲ء کو پیش کی تھی۔

اس طرح قومی دفاعی فنڈ میں اتر پردیش کا عطیہ ۱۵٫۵ کروڑ روپیے کا ہو گیا۔ اس فنڈ میں عوام کے عطیات کا سلسلہ برابر جاری ہے۔





دوہری گھاٹ پل کی ۷٫۵ میٹر چوڑی سڑک اور دونوں جانب کے فٹ پاتھ کا ایک حصہ

غزل

هزار لکھنوی

نہ جانے کتنی دہلیزوں پہ سر رکھنا پڑا مجھ کو
ترے دھوکے نے دنیا بھر کا بندہ کر دیا مجھ کو

بہت اکسا رہی تھی جرأتِ عرضِ وفا مجھ کو
مگر کچھ بات ایسی تھی کہ چپ رہنا پڑا مجھ کو

گنہ گارِ محبت کو یہ اطمینان کیا کم ہے
کم از کم اپنا بندہ تو سمجھتا ہے خدا مجھ کو

صدائے بازگشت آتی ہے یا وہ گنگناتا ہے
غزل پڑھتے ہوئے شاید کسی نے سن لیا مجھ کو

محبت جرم ہے تو عمر بھر میں نے خطا کی ہے
اب اس کے بعد جو مرضی ہو وہ دیجے سزا مجھ کو

زمین و آسماں کو جب متحمل نہیں پایا
مرے مالک نے سارا غم اٹھا کر دے دیا مجھ کو

ہزار اپنا تو سر ظالم کے آگے خم نہیں ہوتا
کہوں کیا شکر کی توفیق دیتا ہے خدا مجھ کو

ستمبر ۱۸۹۴ اشک

غزل

حضر برنی

سوا ہے درد و غم سود و زیاں تک بات جا پہنچی
گماں تک بھی نہ تھا جس کا وہاں تک بات جا پہنچی

مرے ذوقِ طلب نے راہ میں منزل کے دم توڑا
تماشا بن گیا آہ و فغاں تک بات جا پہنچی

صبا گلشن میں چپکے سے یہ غنچوں کو بتا دینا
تبسم کی تمہارے باغباں تک بات جا پہنچی

غمِ بیچارگی میں اشک پلکوں پر سمٹ آئے
برا ہو عاشقی کا داستاں تک بات جا پہنچی

نشیمن سے دھواں اٹھ کر سرِ افلاک جا پہنچا
ارے توبہ مرے غم کی کہاں تک بات جا پہنچی

کبھی سوچا ہے کچھ تو نے تماشا دیکھنے والے
ترے چھپنے سے ناقوس و اذاں تک بات جا پہنچی

بلا نوشو! یہ میخانے کے در اب وا نہیں ہوں گے
سنا تم نے حضر پیرِ مغاں تک بات جا پہنچی

جون ۱۹۷۲ء

مثنوی سحرالبیان کا محاکاتی پہلو

مرزا احسن بیگ

میر حسن کی مثنوی سحرالبیان اردو ادب کا لافانی شاہکار ہے۔ میر حسن نے یوں تو کئی مثنویاں لکھی ہیں لیکن جو قبول عام سحرالبیان کو نصیب ہوا اور کسی مثنوی کے حصے میں نہ آیا۔ بقول میر حسن انھوں نے اس کہانی میں اپنی عمر صرف کر دی تب کہیں جا کے بڑھاپے میں یہ مثنوی لکھی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ میر حسن کی یہ تصنیف ادب العالیہ میں شمار کی جاتی ہے اور بقول مولانا حالی اردو کی عشقیہ مثنویوں میں آج تک ایسی مثنوی نہیں لکھی گئی۔

مثنوی سحرالبیان پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر احتشام حسین صاحب لکھتے ہیں۔

"اگر سحرالبیان کے بارے میں یہ بات کہی جائے کہ یہ اردو زبان کی اچھی مثنوی ہے تو کہیں نہ کہیں سے یہ آواز ضرور آئے گی کہ یہ رائے درست نہیں، لیکن اگر یہ کہا جائے کہ یہ مثنوی اردو کی بہترین مثنویوں میں شمار کی جاتی ہے تو شاید کسی کو شدت کے ساتھ اختلاف نہ ہوگا کیونکہ اس کی کہانی اور انداز بیان میں صرف کچھ ایسے عناصر ہیں جن کا مطالعہ اس کی عظمت کا پتہ دیتا ہے۔"[1]

مثنوی سحرالبیان کے متعلق میر شیر علی افسوس دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"مثنوی اسم بامسمیٰ ہے کیونکہ اس کا ہر شعر اہل مذاق کے دلوں کا موہنی منتر اور اس کی ہر داستان سحر سامری کا دفتر ہے۔"

مثنوی سحرالبیان میں میر حسن نے ایسا سحر سمو دیا ہے اور اپنی محنت اور کمال کا انھیں خود بھی احساس تھا ورنہ وہ یہ دعویٰ نہ کرتے

نہیں مثنوی ہے یہ اک پھلجھڑی
مسلسل ہے موتی کی گویا لڑی
نئی طرز ہے اور نئی ہے زباں
نہیں مثنوی ہے یہ سحرالبیاں
رہے گا جہاں میں مرا اس سے نام
کہ ہے یادگار جہاں یہ کلام
ہر اک بات پر دل کو میں خوں کیا
تب اس طرح رنگیں یہ مضموں کیا

اس مثنوی کے پلاٹ میں یہ دکھایا گیا ہے کہ تخت و تاج کا وارث نہ ہونے کی وجہ سے ایک بادشاہ کی زندگی قبر کی طرح سنسان ہے۔ وہ دنیا سے قطع تعلق میں ہی سفر دیکھتا ہے اور عقلمند وزرا اسے مناسب مشورہ دیتے ہیں۔ بہت سے قصوں کی طرح یہاں بھی فقیر، برہمن، نجومی ایک لڑکے کی پیشین گوئی کرتے ہیں لیکن اس خطرے سے بھی آگاہ کر دیتے ہیں کہ عمر کے ایک خاص سال میں سخت مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس طرح پری کا شہزادے کے اوپر عاشق ہونا، کل کا گھوڑا، خواب میں راز کا انکشاف ہونا اور شہزادی کا مشکلیں اٹھانا شروع سے آخر تک بہت سی ایسی سرگرمیاں ہیں جن کے سہارے مثنوی کا پلاٹ آگے بڑھتا ہے لیکن یہ ساری چیزیں قدیم

---

[1] تنقیدی جائزے ص ۱۰۵

داستانوں اور روایتوں سے ماخوذ ہیں۔ پھر بھی اس میں ایسی دلکشی اور صناعی موجود ہے جو کسی دوسرے مثنوی نگار کو نصیب نہ ہو سکی۔ درحقیقت اس بات کو آج کل کے سماجی ڈھانچے میں پرکھنے کے بجائے اس دور کے اس ماحول میں جانچنا چاہیے جہاں موضوع اور پلاٹ میں ندرت تلاش کرنا عبث ہوگا۔ اس کے بجائے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس میں بھی دلکشی اور دل کشی کس حد تک موجود ہیں۔

ہندستان میں میر حسن کا زمانہ موجودہ زمانے سے بے حد مختلف تھا۔ شاہی نظام اور جاگیردارانہ معاشرت اپنے زوال کی طرف بڑھ رہی تھی۔ لکھنؤ کے نوابوں اور بادشاہوں کی درباری، علوم پرستی، شعر و ادب سے دلچسپی برسوں زیادہ دیر تک قائم رہ سکیں لیکن ان میں عیش و عشرت کے جو عناصر داخل ہو چکے تھے ان کی وجہ سے نئے تصورات کو اپنانے کی طرف دھیان نہیں دیا جا سکتا تھا بلکہ قدیم روایات اور خیالی دلچسپی دلکشی ہی سب کچھ سمجھ لی گئی تھی۔ ایسی حالت میں کسی شاعر سے یہ امید کرنا کہ وہ بگڑے حالات سے منہ موڑ کر اپنی اسی کیفیت کو نئے سانچے میں ڈھال لے گا غلط ہوگا۔ آصف الدولہ کے عہد حکومت نے سرپرستی، سخاوت اور داد و دہش کا ایک وقتی اور مصنوعی ڈھانچہ ضرور کھڑا کر دیا تھا لیکن اس میں جد و جہد کی ایسی قوت نہیں تھی کہ خیال و تصورات کی بنیادوں کو بدل کر نئی حقیقت پیدا کی جا سکے۔ میر حسن نے اسی دور میں پرورش پائی۔ اس وقت تک سائنس نے نہ اتنی ترقی کی تھی نہ معلومات کی اتنی روشنی بڑھی تھی۔ سادہ طبع لوگ ان باتوں پر اعتبار رکھتے تھے جو آج مضحکہ خیز معلوم ہوں گی۔ چنانچہ کہانیوں کو دلچسپ بنانے کے لیے ضروری تھا کہ مافوق الفطرت عناصر (SUPER—NATURAL ELEMENT) اور ان کی حرکتوں کا ذکر کر کے کہانی میں حیرت کا عنصر پیدا کیا جائے۔ قصے کی دلکشی میں اضافے کے لیے ان چیزوں سے مدد لی جاتی تھی جو انسانی دسترس سے باہر ہیں۔ داستانوں اور مثنویوں کی مقبولیت کے لیے ان چیزوں سے مدد لینا ایک خاص زمانے تک ہر ادبی تخلیق کے لیے ضروری تھا اس سے الگ کر کے سحرالبیان کا مطالعہ کرنا سخت ناانصافی ہوگی۔ چنانچہ میر حسن نے جب مافوق الفطرت عناصر (SUPERNATURAL ELEMENT) یا غیر انسانی عناصر کو پیش کیا تو اس سے مثنوی کی فنی خوبیوں پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ بارہ سال

کی عمر میں بے نظیر کا تمام علوم پر قدرت حاصل کر لینا، دیو پری کا وجود، عجیب و غریب پھولوں کا ذخیرہ، جواہرات کی بہتات، پریوں کا انسانی خصائل اختیار کرنا، یہ سب غیر فطری واقعات ہو سکتے ہیں لیکن میر حسن کے لیے اس کے بغیر مثنوی کو مقبولیت دینا ممکن نہ تھا اور سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ان چیزوں کے درمیان انھوں نے اپنے دور کی تہذیبی اور معاشرتی زندگی کی ایسی دلکش اور مکمل تصویر پیش کر دی کہ مافوق الفطرت عناصر کا تذکرہ پس پشت رہ جاتا ہے۔ حسن کا بیان اور سماجی زندگی کی عکاسی ایسی تیز روشنی پھیلا دیتی ہے کہ ساری مثنوی پر یہی چھائے رہتے ہیں جس سے یہ حقیقت سے قریب ہو کر ہمیشہ کی زندگی حاصل کر لیتی ہے۔

سحرالبیان کی جس خصوصیت نے میر حسن کو سب سے زیادہ شہرت بخشی وہ اس کی کردار نگاری کا حسن ہے۔ ممکن ہے میر حسن نے شعوری طور پر اس پہلو کی طرف دھیان نہ دیا ہو، ان کے زمانے میں کردار نگاری کو اتنی اہمیت حاصل تھی کہ وہ اسے جان بوجھ کر سنوارتے لیکن جدید نقادوں کی نظر میں یہی اس مثنوی کا سب سے بڑا حسن ہے اور اسی میں بقیہ تمام صناعی و فن کاری سمٹ کر آ گئی ہے۔ سحرالبیان جن کرداروں کے گرد گھومتی ہے ان کی تعداد زیادہ نہیں۔ "کوئی بادشاہ، بے نظیر، ماہ رخ، بدر منیر، مسعود شاہ، نجم النسا یہی چند کردار کہانی کا تانا بانا بنتے ہیں۔" ان میں بھی بادشاہ مسعود شاہ ضمنی حیثیت رکھتے ہیں جن کی کوئی اہمیت نہیں اور اس طرح قصے کو آگے بڑھانے اور اس میں حسن و خوبی پیدا کرنے کے لیے صرف چار کردار باقی رہ جاتے ہیں۔ عام سماجی تقاضوں کے تحت عجیب و غریب مردوں اور عورتوں کا ذکر ضروری تھا ورنہ اس دور میں مقبولیت کیسے حاصل ہوتی۔ درمیان میں بھی خادماؤں، خواصوں اور لونڈیوں کی فراوانی اس شاہانہ تمدن کا پتہ دیتی ہے جس سے قصے کی ابتدا کی گئی ہے۔ قصے کے ارتقا کے لیے ان چیزوں کا ذکر بھی ضروری تھا لیکن میر حسن نے جہاں بھی کرداروں کو پیش کیا ہے وہاں ان کی پوری تصویر سامنے آ جاتی ہے۔

بے نظیر کہانی کا ہیرو بارہ سال کی عمر میں یوسف سے زیادہ خوبصورت، رستم سے زیادہ طاقتور اور بڑے بڑے علما سے زیادہ عالم ہے۔ یہ شہزادے یعنی ہونے والے بادشاہ کا ذکر ہے جس کے لیے ان خصوصیات

کا ہونا ضروری تھا۔ اس کردار کے سلسلے میں جب عملی منزل شروع ہوتی ہے تو میر حسن کا فن اور زیادہ ابھر آتا ہے۔ کہانی میں جتنی پیچیدگی بڑھتی ہے جتنی گتھیاں پڑتی جاتی ہیں اتنی ہی کرداروں کی اہمیت بڑھتی ہے چنانچہ بے نظیر جو مردانہ اوصاف کا مالک ہوتے ہوئے بھی پری کی طاقت کا شکار ہو جاتا ہے جو اسے سوتے میں اٹھا لے جاتی ہے۔ محبت کے سارے زور صرف کرتی ہے۔ بے نظیر اجنبی ماحول میں خوف و ہراس محسوس کرتا ہے لیکن میر حسن چونکہ پہلے اسے غیر معمولی طاقت ور اور بہادر بتا چکے ہیں اس لیے یہاں بھی بڑی چابک دستی سے یہ خوف و ہراس اس کے چہرے پر عیاں نہیں ہونے دیتے۔ کل کے گھوڑے کی مدد سے بدر منیر سے ملاقات ہوتی ہے۔ یہیں سے اس کی زندگی کا نیا باب شروع ہوتا ہے جس میں عشق کا جذبہ غالب آ جاتا ہے۔ بدر منیر اسے دیکھ کر یہ رائے قائم کرتی ہے ؎

برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن
جوانی کی راتیں مرادوں کے دن

بے نظیر شروع میں اظہار عشق سے دور رہتا ہے لیکن شراب پینے کے بعد ساری کہانی بدر منیر کو سنا دیتا ہے۔ پری غیر مخلوق تھی اس لیے اس سے محبت نہ کر سکتا تھا لیکن بدر منیر انسانی حسن و جمال کا نمونہ تھی۔ اس کے قدموں پر سر رکھ سکتا تھا۔ انسانی فطرت کا یہ خاکہ بے نظیر کے کردار میں بڑی بلندی پیدا کر دیتا ہے۔ ایک دن کوئی دیو اس پری ماہ رخ کو بدر منیر اور بے نظیر کے عشق کا حال بتا دیتا ہے۔ بے نظیر قید کر دیا جاتا ہے۔ بعد ازاں جب نجم النساء کی مدد اور تدبیروں سے کنویں سے باہر آتا ہے تو فطری طور پر اس سے لپٹ کر روتا ہے۔ محبت میں کامیابی حاصل کر کے بدر منیر سے شادی کر لیتا ہے۔

بدر منیر کا کردار بے نظیر سے ملتا جلتا ہے۔ اس کے حسن کے سامنے آفتاب و ماہتاب کی حقیقت نہیں۔ اس کا ہر انداز انتہا سے زیادہ پیارا ہے۔ اس میں ایسی متانت اور وقار ہے جو شہزادیوں کے لیے ضروری ہے البتہ اس میں عشق کے معاملے میں جرأت کی کمی ہے جو محبت کو کامیاب بنا سکے۔ اسے پڑھنے لکھنے کا شوق تھا۔

سرہانے مجلد دھری ہے کتاب — ظہوری نظیری کا کل انتخاب
بھری اک بیاض اور رنگیں کہیں — پر از شعر سودا و میر و حسن

بے نظیر اس سے پری کا ذکر کرتا ہے تو عورت کی فطرت کے مطابق ساری سنجیدگی بھول کر رشک و حسد کی آگ میں جلنے لگتی ہے۔ لیکن دل میں محبت کا جذبہ بے قرار ہے۔ یہی جذبہ اسے جلد بے تکلف بنا دیتا ہے۔ وہ آزاد طبیعت کی مالک ہے۔ اس طرح بدر منیر کی محبت میں پرانے انداز کی سچی محبت کا پتہ چلتا ہے۔ کسی وقت بے نظیر سے غافل نہیں ہوتی یہاں تک کہ خواب میں بھی بے نظیر کو کنویں میں دیکھ کر اپنی ہم راز نجم النساء سے سارا قصہ سناتی ہے۔ پھر بھی بدر منیر اور بے نظیر دونوں کا کردار ایک ہی سانچے میں ڈھلا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

سحر البیان میں سب سے اہم کردار نجم النساء کا ہے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ سحر البیان ہی میں نہیں اردو کی تمام مثنویوں میں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ وہ ایک زندہ حقیقت ہے جو بے عملی میں عمل اور جمود میں حرکت پیدا کر دیتی ہے۔ میر حسن شعوری طور پر نجم النساء کی فطرت کو کہانی کی ایک ایسی اہم کڑی بنا دیتے ہیں جو آگے چل کر قصے کو ختم ہونے سے بچا لے۔ پہلی دفعہ جب نجم النساء سامنے آتی ہے تو وہ ایک عملی کردار کی طرح کہانی کے خاص موقعوں پر کام کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ بے نظیر جب بدر منیر کے باغ میں پہنچتا ہے بدر منیر خواصوں کے جھرمٹ میں نظر آتی ہے۔ عشق کا تیر پار ہو چکا ہے، بے نظیر غش کھا کر گر چکا ہے، بدر منیر بھی بے ہوش ہو چکی ہے، خواصیں، سہیلیاں سہمی ہوئی کھڑی ہیں کہ اسی عالم میں نجم النساء ظاہر ہوتی ہے۔ کہانی میں بے ہوشی کی حالت زیادہ دیر تک نہیں دکھائی جا سکتی ہے اس لیے اختصار کا کمال دکھاتے ہوئے میر حسن نے نجم النساء کی صورت اور سیرت کا نقشہ صرف دو شعروں میں پیش کیا ہے

تھی ہم راز اک اس کی دخت وزیر — نہایت حسین و قیامت شریر
زبس تھی ستارہ سی وہ دلربا — اسے لوگ کہتے تھے نجم النساء

ان دونوں شعروں میں مثنوی نگار نے نجم النساء کا سارا خاکہ پیش کر دیا ہے۔ وہ گھبراتی نہیں ہے۔ بے ہوش دیکھ کر دونوں کو ہوش میں لاتی ہے۔ دونوں کے دلوں کے حجاب کا اندازہ لگا لیتی ہے۔ شراب پلا کر شرم و حیا کی اس کیفیت کو دلوں سے دور کرتی ہے۔ اس طرح جہاں کہیں کہانی میں جمود کی سی کیفیت پیدا ہوتی ہے، نجم النساء اس میں حرکت پیدا کرتی ہے۔ نجم النساء شریر ہے وہ وزیر زادی ہونے کی وجہ سے بدر منیر سے زیادہ

بے تکلف ہے۔ اسے چھیڑتی ہے، اس کا امتحان لیتی ہے۔ جب اس کی محبت کا یقین ہو جاتا ہے تو طے کر لیتی ہے کہ دوست کی حیثیت سے بدر منیر کی مدد کرنا اس کا فرض ہے۔ اس کا ذہن اتنا تیز تھا کہ بدر منیر کے خواب پر بے نظیر کو تلاش کرنے نکلتی ہے۔ جوں کی دنیا میں پہنچ کر بھی اس کی ذہانت اور تیزی قائم رہتی ہے۔ اس کا عزم متزلزل نہیں ہوتا۔ اس کے ارادے میں کمزوری نہیں۔ وہ دوست کے لیے ہر قربانی دے سکتی ہے۔ اس میں ایسی ہمدردی ہے کہ مستقل سے بے پروا ہو کر بدر منیر کے کام آنا چاہتی ہے۔ وہ عورت ہو کر جرأت کا سبق دیتی ہے۔ جوگن بن کر نکلنا ایک خاص منصوبہ رکھتا ہے، جس میں تیاگ، ایثار سبھی کچھ شامل ہے۔ پھر اس بزرگ میں تار اور تان سے ڈھلے ہوئے موتیوں کا عارض کر اس کا چہرہ بہت حسین ہو گیا۔ اپنے حسن سے فیروز شاہ کو تابو میں کر لیتی ہے۔ اسے عشق میں ایسا کمال حاصل ہے کہ پری زاد بھی اس کا بھید نہیں پاتا جو بحر البسار عشق میں گرفتار ہو جاتی ہے لیکن پہلے اپنا مقصد پورا کر لینا ضروری سمجھتی ہے۔ اس کا جادو کبھی خالی نہیں جاتا۔ اس کا منتر ہر جگہ کام آتا ہے۔ فیروز شاہ کی مدد سے بے نظیر مل جاتا ہے۔ پھر پری زاد کو بدر منیر کے سامنے لاتی ہے جس سے اس کے عشق کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی حیثیت سے یہ حصہ میر حسن کے لیے بہت نازک تھا۔ وہ بدر منیر اور بے نظیر کو بے قابو ہونے سے روکتی ہے۔ یہ وہ عورت ہے کہ کسی کو اس کے حکم کی سرتابی کی ہمت نہیں۔ وہی سب کچھ ہے۔ وہ کہانی کو جس طرف موڑتی ہے مڑ جاتی ہے۔ نجم النساء کی تخلیق میر حسن کا بہت بڑا کمال ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ بہت سی دوسری خصوصیت کے ساتھ اس مثنوی کی اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ایسی کردار نگاری اردو کی کسی دوسری مثنوی میں اتنے اعلیٰ پیرائے میں نظر نہیں آتی۔

سارے قصے کے درمیان میر حسن نے واقعہ نگاری، منظر کشی اور سماجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو جس عمدگی سے پیش کیا ہے وہ بھی ان کی انفرادیت اور ذہنی قوت کا پتہ دیتی ہے۔ اس زمانے میں جاہ و حشمت اور شان و شوکت کی جو فضا اور معاشرتی زندگی کی جو کیفیات تھیں میر حسن نے اس کے ایک ایک پہلو کو اس طرح پیش کیا ہے کہ اس کی ہو بہو تصویر سامنے آ جاتی ہے۔ انھوں نے شہزادے کی پیدائش کے موقع پر جشن کی جو تصویر کشی کی ہے اور ان محفلوں کا جو نقشہ کھینچا ہے اس کی کیفیت آج بھی اسی طرح محسوس کی جا سکتی ہے۔ وہ معمولی سے معمولی جزئیات کو نظر انداز نہیں کرتے۔ ہر تصویر میں اس قدر خوبصورتی سے رنگ بھرتے ہیں کہ ایک ایک نقش ابھر آتا ہے۔ نجومیوں، رمالوں اور برہمنوں کا ذکر جس طرح کیا ہے اس سے محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے ساری عمر جیوتش اور رمل کا علم حاصل کرنے میں صرف کی۔ موسیقی کا ذکر کرتے ہیں تو اس فن کے سب سے بڑے ماہر معلوم ہوتے ہیں۔ آتش بازی کا ذکر، محل اور باغ کی دلکشی، فانوس اور شمع کی سجاوٹ، نوکروں، خدمت گاروں اور کنیزوں کی بھیڑ بھاڑ، طوائفوں کی رنگینیاں، جادوگری اور جوگی غرضیکہ جو کچھ جہاں مناسب ہوا اس کی پوری عکاسی کر دی اور ایسی مکمل تصویر کشی کی کہ اس موقع کا میر حسن سے بڑھ کر کوئی دوسرا صناع نظر نہیں آتا۔ اس طرح ایک مختصر سی مثنوی ہوتے ہوئے بھی یہ معلومات اور علمی باتوں سے بھری ہوئی ہے۔ شاعر نے اس مثنوی کو سنوارنے، سجانے اور نوک پلک سے درست کرنے میں زندگی کا کتنا بڑا حصہ صرف کیا ہوگا اور کتنی عرق ریزی کرنا پڑی ہوگی اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ وہ ہر فن کی ایک ایک کیفیت اور اس کے ایک ایک جزو پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ بچے کی ولادت پر دائی جانی، مغلانی، خواص ہر ایک کے ذمے ایک خاص خدمت ہوتی ہے۔ اس سے محل کی زندگی کا ایک رخ معلوم ہوتا ہے۔ لونڈیوں اور کنیزوں کے نام کے انتخاب میں چنبیلی، رنگیلی، کام روپ، جیت لگن، دل لگن، کیتکی، ماہتاب، جس کو ذخیرہ محض عرفیت کے لیے یا پیار کے نام کے طور پر نہیں گنوائے گئے ہیں بلکہ ان ناموں کے ساتھ ان کی خدمات، امتیازی خصوصیات اور ان کے آقاؤں کی زندگی اور ان کے رجحانات پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔

میر حسن نے اپنے دور کے رسم و رواج کی تصویر کشی کر کے پورے معاشرے اور تہذیبی زندگی کی عکاسی کر دی ہے۔ بچے کی پیدائش پر نجومی اور رمال کا فال دیکھنا، انعام و اکرام پانا، خوشیاں منانا، مسجد میں چراغ روشن ہونا، بھانڈوں اور قوالوں کا مبارک سلامت کی دھوم مچانا، انعامات اور خلعتوں کی تقسیم، خیر و خیرات کا سلسلہ، نذر و نیاز غرضیکہ جزئیات پیش کرنے کا یہ عالم ہے کہ میر حسن چھٹی کی رسم، برس گانٹھ، دودھ بڑھانا، بسم اللہ کی رسم کسی چیز کو نظر انداز نہیں کرتے۔ اس طرح ہر موقع پر اختصار کے باوجود کسی چیز کی کمی کا احساس نہیں ہوتا۔ مختلف رسومات و

مقامات پر سخن کے طریقے، محل، دربار، عوام سب کی منہ بولتی تصویریں نظر آتی ہیں۔ میر حسن اپنی ذہانت اور تخیل سے بڑے بڑے کام لیتے ہیں ہر چیز کو بیں ساعت سے بیان کرتے ہیں اور یہی خصوصیت ان کا تخلیقی [illegible] مشاہدے کی گہرائی کا پتہ دیتی ہے۔

میر حسن نے اس شاعری کی کامیابی کے لیے زبان، بیان اور [illegible] [illegible] بہت [illegible] اس کا انداز بیان ایسا سحر ہے کہ سلاست [illegible] کے لحاظ سے یہ آپ کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ میر حسن کی سادہ بیانی [illegible] کو دیکھ کر محمد حسین آزاد نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا

"[illegible] آگے والوں کی باتیں سنائی دیتی ہیں کہ کچھ کہا [illegible] جو بات چیت ہم تم بول رہے ہیں"

زبان اور الفاظ و تراکیب کے استعمال پر بحث میر حسن کی قادر الکلامی [illegible] شعور کے تابع ہیں [illegible] ایک ایک مصرعے [illegible] جو [illegible] دیا ہے اس کی مثال کسی دوسری جگہ ملنا مشکل ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس [illegible] بو عطف [illegible] فصاحت و بلاغت کا ایک دریا بہتا چلا آتا ہے جس سے تاثیر [illegible] تعبیر نہیں رہتا ایک [illegible] تشبیہ الفاظ، ایہام گوئی اور صنعت گری زبان و بیان کی خوبیاں ہیں [illegible] میر حسن کا اس قدر سلیس زبان استعمال کرنا حیرت خیز ہے۔

مختصر یہ کہ سحرالبیان کا انداز بیان، اس کی تفصیلات، جذبات، محاوروں کا برمحل استعمال اس کی رنگینی [illegible] کسی دوسری مثنوی میں نہیں پائی جاتی اور سب سے بڑھ کر اس میں [illegible] کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔ اس طرح انسانی اعمال، انسان کی شعوری [illegible] الف لیلہ، طلسمی [illegible] درجے کی [illegible] معلوم ہوتی ہیں [illegible] یہی چیز سحرالبیان کی عظمت کی [illegible] دلیل ہے۔

زبان کی صفائی اور اس کی شگفتگی کا اعتراف کلیم الدین احمد تک کو ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ

"[illegible] سرسری نظر آتے ہیں لیکن ان کی مثال کسی [illegible] [illegible] نہیں بلکہ یہ جیسی فطری [illegible] معلوم ہوتی ہے۔"

اس مثنوی میں خوبیوں کے ساتھ کچھ خامیاں بھی ہیں۔ ان پر اکثر جس نے ناقدانہ نظر ڈالی ہے کہتے ہیں

"کون سا پھول ہے جس میں کانٹے نہ ہوں۔ مذاق سلیم کو اس مثنوی میں بہت سی باتیں کھٹکتی ہیں۔ سحرالبیان میں [illegible] کثرت سے ہیں بلکہ کہیں کہیں موقعوں پر بھرتی کے الفاظ ڈھیلی بندشیں اور قواعد کی غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں"

آخر میں ڈاکٹر حسین نے ایک ایمان دار محقق کی طرح جو رائے پیش کی ہے وہ ایک فیصلہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

"اس مثنوی کے معائب کثرت محاسن کی چکا چوند میں نظر سے غائب ہو جاتے ہیں۔ سحرالبیان کو کتنی ہی ہٹ دھرمی سے پڑھا جائے کتنی ہی معترضانہ اور معاندانہ نظر سے دیکھا جائے لیکن جیسے جیسے اس مثنوی کو پڑھا جائے گا سحر سے سحر تک [illegible] ہوجائے گا۔"

بادشاہ

(صفحہ ۱۹ کا بقیہ)

وہ خوش ہو کے بولا "ہاں ہاں، بس بس" — سچ سچ بہت ہی۔

ابھی دو دس دن ہوئے کوئی مغرب کا وقت ہو گا جو میں بازار گئی۔ وہاں اس وقت خوب چہل پہل تھی۔ موٹروں اور اسکوٹروں اور دیگر سواروں کا ہل، دکانداروں، چھابڑی والوں کی صدائیں، لوگوں کی چیخ پکار — اور اس سب کے بیچ میں بابو لال اپنی دکان کے ٹاٹ پر ایک ہاتھ کا تکیہ بنائے، گھٹنوں کو پیٹ میں سکوڑے غافل سو رہا تھا۔ بلی اس کے سینے سے لگی آرام کر رہی تھی۔ سرہانے ایک کتا سحروں پر تھوتنی جمائے اونگھ رہی تھی اور پاؤں کے پاس دو مٹے ملے جون ایک دوسرے سے بیٹے پڑے تھے جیسے کوئی دوسرے دن کا الاکٹ ہو — دکان کا سامان اسی طرح ذرا آگے کو رکھا تھا — آدھا ٹاٹ پر اور آدھا زمین پر۔ کوئی چاہتا تو سب کچھ اٹھا لے جاتا۔

میرا بے اختیار دل چاہا کہ اس کے نزدیک جاؤں اور آہستہ سے اس سے کہوں "بابو لال تم واقعی بادشاہ ہو — بھلا بادشاہوں کو بھی یہ نیند کہاں میسر؟ یہ تو اسی کا حصہ ہے جس کے دل میں قناعت کا نور ہو، سر میں ہنر اور محنت کا سرور، پھر چاہے وہ چیتھڑوں میں لپٹا ہو مگر وہ بادشاہ نہیں تو پھر کون بادشاہ ہے!"

غزل

انور [illegible]

[illegible] کو عالم کیا طرح پیدا [illegible] کرن [illegible] ہیں
[illegible] ساقی [illegible] بھلے ہوے [illegible] پیمانے ہیں

اس [illegible] اک [illegible] کیے
[illegible] کی [illegible] دل [illegible] میں ہم ویرانے میں

تشبیہ [illegible] کیا [illegible]
کیوں رقت [illegible] دیتا ہے دیوانوں کو سمجھانے میں

بس تب تک [illegible] تھی [illegible]
کیا آگ تھی [illegible] کیا شعلہ تھا [illegible] میں

[illegible] کوئی [illegible] تو [illegible] الفت کی کوئی
ناکامی حسرت اب بھی ہے [illegible] افسانے میں

ساقی کی نظر [illegible] اٹھی [illegible] کیسے [illegible] بتلائے
اک ہوش [illegible] پیمانے میں اک لہر سی ہے میخانے میں

بس حسن مجازی رہنے دے دنیا کی نگاہیں اٹھتی تھیں
اب اتنی حقیقت [illegible] سب نام [illegible] سارے ہیں

[illegible] ۱۸۹۴ تک

غزل

صدیق احمد یاور

اے جنوں آوارہ گردی سے گریز میرے لیے
گنبد نیلی سے آگے ڈھونڈھو گھر میرے لیے

صبح عشرت کے تصدق، شام غربت کے نثار
اک تماشا بن گئے شام و سحر میرے لیے

میرے لب پر تو رہتی زلف و قامت کی بات بھی
جانے کیا کچھ لے اڑے افسانہ گر میرے لیے

زندگی محرومیوں کے جائزے لینے لگی
موت نے آواز دی بس بس ٹھہر میرے لیے

دل شکستہ ہی سہی، محروم الفت ہی سہی
ہر شکست فاش ہے فتح و ظفر میرے لیے

سرگزشت زندگانی پوچھنے والوں کی خیر
مفت کیوں ناحق کوئی ہے دردسر میرے لیے

(مزاحیہ)

نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

ایم اے حنان

ہم قسم کھا کر کہتے ہیں کہ نہ ہم نیند کی گولیوں کے استعمال کے عادی ہیں اور نہ خوش قسمتی سے کسی محبوبۂ دل نواز کی یاد میں کروٹیں بدلتے اور ستارے گنتے رہتے ہیں۔ یہ بات بھی نہیں ہے کہ دن میں خوب سوئے ہوں اور ایسا تو ہرگز ہرگز نہیں ہے کہ ہم عاشقِ زار واقع ہوئے ہوں۔ ہم مرضِ بے خوابی کا شکار بھی نہیں ہیں۔ اس کے بعد بھی اگر "نیند" نہ آتی ہو تو کس قدر حیرت اور دکھ کی بات ہے۔ ہمارے لیے تو یہ ایک ایسا المیہ ہے جس کی کربناکی اور وحشت کا اندازہ اس بات سے بآسانی ہو جاتا ہے کہ ہم مالکِ دو جہاں سے دعا گو ہیں کہ وہ ہمیں مال و زر نہیں، جاہ و جلال نہیں، امارت و ثروت اور اعلیٰ مرتبہ نہیں بلکہ ایک رات کی گہری نیند عطا فرمائے تو ہمارے حق میں احسانِ عظیم ہوگا۔ لیکن "آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک" کے مصداق اس کے شرفِ قبولیت بخشے جانے تک ہم میٹھی نیند سو جائیں گے۔ کچھ کہے نہ کچھ کہیے۔ ڈاکٹر کے پاس جاؤ تو وہ نیند کی گولیاں دے دیتا ہے، جو مستقبل میں بذاتِ خود نیند کو اڑانے والے عناصر کا آلۂ کار ثابت ہوتی ہیں۔ کسی یارِ دوست کو حالِ دل سناؤ تو وہ کسی بُتِ کافر کے دامِ الفت میں گرفتار گردانتا ہے۔ کسی بزرگ حضرت کے گوش گزار کریں تب وہ شادی کا مشورہ دیتے ہیں (حالانکہ ہماری ایک شادی ہو چکی ہے) اور لوگ کچھ ایسی تیکھی نظروں سے دیکھنے لگتے ہیں کہ ہم شرم سے دوہرے ہوئے جاتے ہیں۔

یہاں یہ بات ہم آپ کے علم میں لانا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم نیند کی دیوی کو راضی کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کرتے۔ بستر کا خاص اہتمام کرتے ہیں، موسم کا خیال رکھتے ہیں، ماحول کو مدِنظر رکھتے ہیں یہ سوچ کر اگر دن میں سونا مقصود ہو تو رات کا سماں آسانی پیدا کر لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ تجربہ کار اور اس "فن" میں ماہر حضرات کی کہی اور بتائی ہوئی باتوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے کئی کئی بار ان کی آزمائش کر ڈالی ہیں۔ یہاں تجربہ کار حضرات سے مراد وہ اشخاص ہیں جو ہر وقت نیند میں ہوتے ہیں۔ باتیں کم کرتے اور اونگھتے زیادہ ہیں۔ اور باتیں کرتے کرتے یکایک دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے ہیں، اور خراٹے بھرتے ہوئے اس فانی دنیا سے اپنا تعلق قطعی منقطع کر لیتے ہیں، جن کے ہاں موسم، مقام وغیرہ کی کوئی قید نہیں۔ لائبریری ہو یا پارک، ہوٹل ہو یا گرجا گھر، مندر، مسجد، اسکول موقع پاتے ہی نیند کی آغوش میں چلے جاتے ہیں۔

طبی اور نفسیاتی طریقوں سے یہاں مراد یہ ہے کہ بعض اطبا یا دانشوروں کا قول ہوتا ہے، یا کتابوں میں لکھا ہوتا ہے کہ سونے سے پہلے ٹھنڈے پانی سے پاؤں دھو لینے، بستر میں جانے سے قبل ایک گلاس دودھ پی لینے سے نیند کی دیوی بہت جلد مہرباں ہو جاتی ہے اور بڑی گہری نیند آتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ آپ کی اطلاع کے لیے عرض کیے دیتے ہیں کہ نہ صرف ہم نے ان ہدایات پر ہو بہو عمل کیا، بلکہ انہیں کچھ زیادہ ہی مؤثر انداز سے برت کر دیکھا۔ مثال کے طور پر ٹھنڈے پانی

میں ہم نے برف کا اضافہ کر لیا اور دودھ میں بادام کا خاص خیال رکھا لیکن پھر بھی ناکامی اور مایوسی ہی ہمارا حصہ رہی۔ اور ہم ’پیدا نہ‘ جا سکے۔

بے شک کسی ماہر نفسیات کے بتلائے ہوئے اصول پر بستر پر جانے سے پہلے دنیا کی ہر بات کو ذہن سے نکال باہر کیا، کسی بات پر سوچ بچار اور غور و فکر کرنا تو دور کی بات ہے اپنے ماں باپ، بھائی بہن، رشتہ دار، دوست احباب کو یکسر بھلا دیا اور ایسے میں کوئی آپ کا نام آ بھی گیا تو فوراً اسے بجائے صاف انکار کر دیا غرض کہ خالی الذہن ہو کر اور نیند نہ آنے کے خیال کو ذہن سے نکال کر رات بھر یہی سوچتے رہے کہ ہم کو بڑی گہری نیند آ رہی ہے یوں بستر پر لیٹے آنکھیں موندیں اور دیکھتے ہی دیکھتے نیند کی آغوش میں چلے گئے اور یہی سوچتے سوچتے صبح تک برابر خیال رہا کہ ”ہم کو تو بڑی گہری نیند آ رہی ہے“ اور ”ہم گہری نیند سو گئے ہیں“

بہت کافی سوچ بچار کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ہم کو بھی دوسرے صحت مند انسانوں کی طرح بڑی اچھی نیند آتی ہے لیکن اس موقع پر چند ایسے عوامل آن دھمکتے ہیں کہ اسے بھاگنے میں ہی عافیت نظر آتی ہے

چنانچہ ہمارا یہ روز کا معمول ہے کہ دس بجتے ہی ہم بچھے ہوئے بستر پر دراز ہو جاتے ہیں آہستہ آہستہ رگ پٹھوں اور دیگر اعضا میں سکون و فرحت کی کیفیت پیدا ہوتی رہتی ہے اور بے خبری و غنودگی طاری ہونے لگتی ہے کہ یکایک زلزلہ آ جانے کا گمان ہوتا ہے جس میں زمین نہیں پھٹتی، درخت نہیں اکھڑتے، عمارتیں سجدہ ریز نہیں ہوتیں بلکہ ہمارے دولت کدہ کے اطراف و اکناف کی دکانیں بند ہونا شروع ہو جاتی ہیں ”شٹرس“ کچھ اس طرح گرائے جاتے ہیں کہ بمباری کا گمان گزرتا ہے کھڑکیوں اور دروازوں کی دل ہلا دینے والی کھڑکھڑاہٹ ہوش گم کیے دیتی ہے۔ اور سلسلہ یہی وقت ہوتا ہے کہ دکاندار کو بیٹھے بٹھائے اپنے قفلوں کی وفاداری پر شک گزرتا ہے اور وہ ان کی آزمائش کرتے ہوئے ایک ایک قفل کو اس قوت سے جھٹکے دینے لگتا ہے کہ ادھر بستر پر ہم ایک ایک فٹ اوپر اچھل پڑتے ہیں۔ پھر بھی ہم انتہائی صبر و ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے سونے کی کوشش کرتے ہیں اور اسی کوشش میں کچھ کامیاب بھی ہو جاتے ہیں اور نیند آ رہی ہوتی ہے کہ دفعتاً دروازہ پر ایک زوردار دستک ہوتی ہے۔ ہماری خفگی کا اندازہ کر کے ہمارا لڑکا دروازہ کی جانب دوڑتا ہے تب پتہ چلتا ہے کہ کوئی صاحب رسمی طور پر ملاقات کرنے کا جو اہتمام ہے ملاقات پر یہ چلتا ہے کہ کوئی سائل ”ہے“ دو دن سے بھوکا ہے اور کچھ خیرات کا طالب ہے۔ سخت برہمی کے عالم میں ہمارا دل یہ فیصلہ صادر کرتا ہے کہ اسے بغیر کچھ دیے ہی لوٹا دیا جائے یہ بات وہ ہمارے لڑکے سے بھی کہہ سکتے تھے شاید وہ ہمارے بیدار ہو جانے کے خوف سے کچھ دے بھی ڈالتا۔

اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ہم بیدار بیٹھے ہوتے ہیں اور گھڑی پر نظر ڈالتے ہیں سب رات کے کوئی گیارہ بجتے ہوتے ہیں۔ یہ جانی میاں موٹر سائیکل مستری کے گھر لوٹنے کا وقت ہوتا ہے جن کی آمد کا خیال کر کے ہماری نیند دل بیٹھنے لگتا ہے۔ ’جانی میاں‘ کے گھر لوٹنے پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ ہر شریف آدمی رات اپنے گھر پر ہی بسر کرتا ہے۔ اگر وہ سائیکل پر گھر آتے تو اس سے نہیں کہا۔ رکشہ میں آتے تب کرایہ نہیں چھوٹتے ہی چکا یا ہے۔ لیکن اگر وہ پیدل آئیں تب بھی ہم ان کے احسان مند رہیں لیکن وہ تو اپنی بیسی موٹر سائیکل پر آتے ہیں جو دیکھنے میں پرانے زنگ آلود لوہے کا ڈھیر معلوم ہوتی ہے جس کا کوئی پرزہ پوری طرح درست ہوتا ہے اور نہ ہی پوری طرح خراب چنانچہ ان دونوں کی درمیانی حالت میں دراصل موٹر سائیکل پر آدھی رات کے ہولناک سناٹے میں جب کہ پرندہ بھی پر نہیں مارتا، آپ ہارن پہ ہارن دیے جاتے ہیں اور ایک خوفناک ”گھڑ گھڑاہٹ“ کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔ اس پر ستم یہ کہ ان کی موٹر سائیکل عین ہمارے گھر کے سامنے آ کر باقاعدہ اور بلا ناغہ ”فیل“ ہو جاتی ہے

ہلاتا جنرنا یہ آلات حرکت میں آجاتے ہیں اور درستگی کا ناقابل بیان عمل شروع ہو جاتا ہے سنا ہے کہ جہاں وہ کام کرتے ہیں ابھی میکانکی کے ابتدائی دور میں ہیں اور ان سے صرف موٹر سائکلیں و بچے ناچے کو صاف کرنے کا کام لیا جاتا ہے لیکن یہاں تو وہ اسے "حشر" کر رکھ دیتے ہیں۔ ہم نے ان سے صاف طور کہدیا ہے کہ اگر انھیں موٹر سائکلیں چلانا ہی ہیں اور وہ بھی اتنی رات گئے تو کیوں نہ ہمارے اوپر ہی سے چلا دیتے۔ لیکن وہ ہم سے ہماری جان عزیز کو کسی قسم کا خطرہ لاحق ہونے سے قبل اپنی جان پر کھیل جانے کا سرسری تذکرہ کر چکے ہیں چنانچہ ان کی آمد سے نہ صرف ہم بلکہ ہمارا سارا گھر بیدار ہو جاتا ہے منے کو تو دودھ کی ایک عدد بوتل کی رشوت دے کر چپ کرایا جاتا ہے منے کی ماں تو بچے کے بیدار ہونے کے خوف سے ہی نیند کی آغوش میں چلی جاتی ہیں۔ دادی جان کو بھی تھوڑی سی جدوجہد کے بعد چپ کرایا جاتا ہے اور ہم چادر تان کر داخلی اور خارجی معاملات سے قطعی رشتہ منقطع کرتے ہوئے سونے کی پوری پوری کوشش کرتے ہیں لیکن وقت کا ذرا غلط انتخاب ہوتا ہے اور سکنڈ شو "چھوٹتا ہے پھر گانا بجانا مکالمے ڈائرکس ڈانس، ایکٹنگ بیک وقت شروع ہو جاتے ہیں فرق صرف ایسا ہوتا ہے کہ کوئی مکالموں کو فحش گالیوں میں بدل دیتا ہے تو کوئی "ربیع" کی تان سے سُر ملاتے ہوئے دل دوز چیخ مارتا ہے اور عین ہمارے گھر کے سامنے "فائٹنگ" شروع ہو جاتی ہے۔ غرض کہ وہ سب کچھ ہوتا ہے جو ہماری نیند بھگانے کے لیے کافی ہے

اور یہ تو دنیا کا دستور ہے کہ کمزور آدمی کی کمزوری سے ہر شخص فائدہ اٹھاتا ہے لیکن ملاحظہ ہو اس حقیر کیڑے کھٹمل کی بیباکی کو کہ وہ ہم سے الجھنے کی جرأت کر بیٹھتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ایک بڑی بھاری فوج ہم پر ٹوٹ پڑتی ہے حالاں کہ سنگین ہو جانے پر ہم "مارشل لا" نافذ کر دیتے ہیں اور دکھائی دیتے ہی شوٹ کر دینے کے احکام صادر کر کے ان پر قابو پا لیتے ہیں—— کہ اب دشمن کا فضائیہ حرکت میں آجاتا ہے چنانچہ اس کا بھی سخت تعاقب کر کے مار بھگایا جاتا ہے اور اسی تگ و دو میں۔ اس کا بیشتر حصہ گزر جاتا ہے اور کوئی تین بجے ہوتے ہیں کہ پبلک نل پر پانی بھرنے والوں کی آمد شروع ہو جاتی ہے۔ مرد عورتیں جوان، بچے بوڑھے اپنی اپنی عمر مزاج بساط کے مطابق کھانستے کھنکھارتے، چیختے، پکارتے، آنے شروع ہو جاتے ہیں—— بالٹی، صراحیاں، گھڑے رکھے جانے شروع ہو جاتے ہیں "کیو" بننے لگتا ہے جس کا آخری آدمی کسی نہ کسی طرح ہمارے گھر تک آجاتا ہے پھر جیسے ہی نل کھلتا ہے کیو میں کچھ بدنظمی پیدا ہو جاتی ہے۔ ہر شخص اپنے سامنے والے شخص سے پہلے آنے کا دعوے دار ہو جاتا ہے اور سب بیک وقت نل پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ اس گڑبڑ میں دو چار گھڑے بآسانی شہید ہو جاتے ہیں کوئی پانی بھرنا چاہتا ہے تو کوئی میلے کپڑوں کے ڈھیر کو سینے سے لگائے آ بیٹھتا ہے تو کوئی پورے جسم کو صابن لگا کر اُف اُف کرتے ہوئے لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے—— اتنے میں "ملک بوتھ" والا آجاتا ہے۔ نیلے کاگ کی بوتل، سُرخ کاگ کی بوتل، منٹھ جیسے ستر پیسے کا وِرد آمد سحر کا پیغام لاتا ہے۔

جس دن خوش قسمتی سے ان میں سے کچھ نہیں ہوتا اس دن ہمارے کوئی پڑوسی زندگی میں پہلی بار عزم سفر کر بیٹھتے ہیں اور آدھی رات سے بیدار ہو کر ایک ہنگامہ کھڑا کر دیتے ہیں یا کوئی جلسہ عام منعقد ہو جاتا ہے یا قوالی کی محفل رنگ جما دیتی ہے یا پھر کوئی کنوارہ بیاہ رچا لیتا ہے۔ لاؤڈ اسپیکر بجنے لگتا ہے اور بینڈ باجہ والے سامعہ نوازی شروع کر دیتے ہیں—— !!!



منی پور کی دستکاریاں

[illegible]

ریاست [illegible] ہندوستان [illegible]
اس کی سرحد [illegible] اور [illegible] ریاست [illegible]
سے اور [illegible] آسام کے ضلع [illegible]

ریاست منی پور کو [illegible]
اس ریاست کا مجموعی [illegible]
وسطی وادی اور پہاڑ لوں پر مشتمل ہے [illegible] وادی [illegible]
کی ہے جو سطح سمندر سے [illegible] فٹ بلند ہے [illegible]
بیضوی [illegible] صورت [illegible]
کھپل کا رقبہ [illegible] مربع میل اور وادی کا مجموعی [illegible]
ہے [illegible] گھاس [illegible]
[illegible] اور [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] کا [illegible]
یہاں کی [illegible]
کی جاتی ہے [illegible]
کا ایک خاص مقام ہے۔

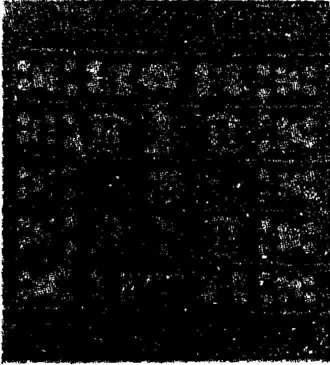
[illegible] کی آبادی [illegible]
تعداد مردوں کے مقابلے [illegible]
مقامی [illegible]

مقابل سے [illegible] آبادی [illegible] آبادی ناگا اور کوکی مقابل
[illegible] الگ الگ [illegible] ہیں مگر منی پوری
[illegible] اوسط تقریباً
[illegible] اعلیٰ تعلیم کو فروغ دینے کے لیے
[illegible] کالج، ۱۲۲ [illegible] اسکول،
[illegible] اسکول اور ۲۱۲ پرائمری مدرسے کھولے جا چکے ہیں
[illegible] پانچ ضلعوں میں منقسم ہے۔
[illegible] یہاں کی راجدھانی اور ایک صدر شہر ہے۔

یہاں کے [illegible] آزادانہ [illegible] رقص [illegible]
[illegible] منی پوری [illegible] رقص اور اس کی دلکشی
[illegible] سارے ہندوستان میں مشہور ہے

تاریخی [illegible] منی پور کا تعلق [illegible] انڈمانت اس وقت
[illegible] میں [illegible] چڑھائی کر دی۔ یہاں کے راجہ
نے [illegible] سے [illegible] ایک کمک مدد کے لیے بھیج دی
[illegible] حملہ آوروں کو پسپا کر دیا۔ دوبارہ ۱۸۲۴ء میں منی پور
کے [illegible] کی [illegible] دی گئی۔
[illegible] منی پور میں [illegible] کے لیے مستقل [illegible]
[illegible] ۱۸۹۱ء میں اس وقت کے راجہ کا ایک بھائی [illegible]
تھا اس نے راجہ کو گدی سے اتار کر اس کے ایک نابالغ بیٹے کو
گدی پر بٹھا دیا اور سارا [illegible] اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ [illegible]
[illegible] ۱۹۱ [illegible] میں آسام کے

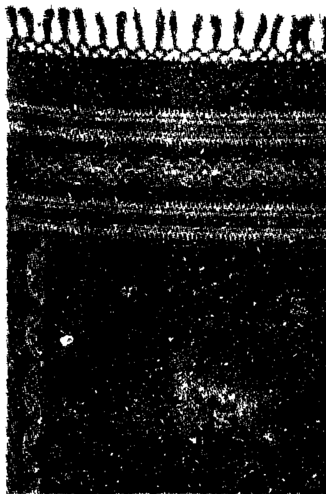
منی پور کی دستکاریوں کے نمونے



کشیدہ کاری کے نمونے



ہاتھی دانت کے ظروف کے نمونے



ٹی ورسال کا ایک نمونہ

PICTURES TAKEN FROM MIRROR - SEP 1968 (BADILZZAMAN)

چیف کمشنر چار سو گورکھا سپاہیوں کی پلٹن لے کر منی پور اس غرض سے گئے کہ سیناپتی کو ہٹا کر راجہ کو گدی واپس دلادیں۔ سیناپتی کو گرفتار کرنے کی کوشش کی گئی مگر وہ مفرور ہو گیا۔ منی پور کے لوگوں نے ریذیڈنسی پر حملہ کر دیا۔ مگر اس پر جلد ہی قابو پا لیا گیا۔ ایک صلح نامہ کی رو سے چیف کمشنر آسام مسٹر جیمس ولیم کوئنٹن پولیٹیکل ریذیڈنٹ اور تین اعلیٰ افسروں کے ہمراہ باغی سرداروں سے بات چیت کرنے کے لیے قلعہ میں گئے۔ مگر باغی گروہ نے حسبِ سازش کے تحت دھوکے سے ان لوگوں کو مار ڈالا۔ اِدھر کیا تھا منی پور پر فوج کشی کی گئی۔ باغی گروہ کے افراد مقابلے کی تاب نہ لا کر کچھار کی طرف بھاگ گئے۔ اس طرح پوری ریاست پر قبضہ ہو گیا۔ سیناپتی گرفتار کر لیا گیا۔ اس پر مقدمہ چلایا گیا اور اسے پھانسی دے دی گئی۔ شاہی خاندان کا ایک پانچ سالہ بچہ مسمی چوڑا چند گدی پر بٹھا دیا گیا۔ اس کی نابالغی کے زمانے میں حکومت کا کام ریذیڈنٹ کرتا رہا۔ بہت سے اصلاحی کام عمل میں آئے۔ غلامی بند کر دی گئی۔ تعلیم کو فروغ دیا گیا۔ [illegible] دی گئی۔ نئی نئی سڑکیں نکالی گئیں۔ ایک سڑک آسام بنگال ریلوے لائن سے جوڑنے کے لیے منی پور سے دیما پور تک تعمیر کی گئی جو تجارتی شاہراہ کا درجہ رکھتی ہے۔

جو راجہ کے تابع ہو جانے کے بعد ۱۹۴۷ء میں سارا اقتدار راجہ کو سونپ دیا گیا۔ راجہ کی مدد کے لیے ایک کونسل بنا دی گئی۔ انڈین سول سروس کے ایک ممبر کو اس کا نائب صدر بنا دیا گیا۔ ہندوستان کو آزادی ملنے کے دو برس بعد ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۹ء کو یہ ریاست ہندوستان میں شامل ہو گئی۔ اب یہاں پارلیمانی طرز کی حکومت رائج ہے۔ شری بی۔ کے نہرو یہاں کے گورنر اور ۱۹۷۲ء کے عام انتخابات کے بعد پیپلز پارٹی کے لیڈر شری محمد علیم الدین چیف منسٹر ہیں۔

دستکاریاں۔ یہاں کی دستکاریاں اپنی مثال نہیں رکھتیں۔ دستکاری اہلِ منی پور کی زندگی کا ایک اہم جُز ہے۔ قدرت نے اس ریاست کو قدرتی مناظر سے فیاضی کے ساتھ نوازا ہے۔ ہرے بھرے پہاڑی سلسلے، خوب صورت جھیلیں، سرسبز و شاداب وادیاں اور انواع و اقسام کے خوشنما پھول پودے قدرت کے عطیات ہیں۔ ان قدرتی مناظر کا عکس یہاں کی عام زندگی اور مصنوعات پر نمایاں رہتا ہے۔ یہاں کے دستکار طرح طرح کی دستکاریوں کے نمونے پیش کرتے رہتے ہیں جو اپنی جاذبیت سے نہ صرف ہندوستان میں بلکہ بیرونِ ہند بھی مقبول ہیں۔ یہاں کی دستکاریوں میں پارچہ بافی، کشیدہ کاری، گڑیاں اور کھلونے کا کام، ہاتھی دانت کا کام، پتھر پر کھدائی، لکڑی پر نقش و نگار کی کھدائی، بانس اور بید کی مصنوعات کے ظروف بنانے کا کام، مصنوعی پھول اور زیورات سازی اور دیواروں پر آویزاں کرنے کے لیے ہرن کی سینگوں کو تیار کرنا خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

پارچہ بافی۔ یہ یہاں کی قدیم اور سب سے بڑی صنعت ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کپڑے کی صنعت ایک ایسے محور کی حیثیت رکھتی ہے جس پر ان کا معاشرہ گردش کرتا ہے کیونکہ یہ صنعت کسی خاص قبیلے یا کسی خاص طبقے سے منسوب نہیں ہے۔ گھر گھر تیار کیے گئے کپڑے زبانِ حال سے ان کے کمالِ فن کی شہادت دیتے ہیں۔ اعلیٰ درجے کے سوتی اور ریشمی کپڑوں کے علاوہ چادریں اور پردے وغیرہ بھی یہاں تیار کیے جاتے ہیں جو بہترین ڈیزائن کے نمونے ہوتے ہیں۔

کشیدہ کاری۔ میتائی قبیلے کی عورتوں کی پوشاک پر ریشمی دھاگوں سے کشیدہ کاری کا کام ایک ضروری جُز مانا جاتا ہے۔ خاص کر شال نما چادروں پر بیل بوٹے بنانا اور انھیں ہاتھی، گھوڑے اور پرندوں کے شکار کی تصویروں یا قبائلی لڑائیوں کی شکلوں سے مزین کرنا ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ شال کے حاشیے رنگ آمیزی کے شاہکار مانے جاتے ہیں۔ اسی انداز پر ساڑیوں، چادروں، پردوں، میز پوشوں، ٹی کوزیوں، گدّوں کے غلاف اور بڑے کور کو بھی آراستہ کیا جاتا ہے۔

ناچ کا لباس۔ منی پور کا کلاسیکل رقص سارے ہندوستان میں پسند کیا جاتا ہے۔ اُن کا رقص اُن کے لیے ان کے جیون موتی کا روپ رکھتا ہے۔ رقص کی زرق برق پوشاک جس پر سنہلے اور چاندی کے تاروں کا کام ہوتا ہے، گویا دل کشی و دل آویزی اور خوب صورتی کا پیکر ہوتی ہے جسے حاصل کرنے کے لیے ہر جوان لڑکی سدا سپنا دیکھتی رہی ہے۔

گڑیا سازی کا فن ۔ یہاں کی بنی ہوئی گڑیاں رقص کی پوشاک میں ملبوس رہتی ہیں۔ وہ راس لیلا یا ناگا رقاصاؤں یا قبائلی ناچ پارٹی کی شبیہ ہوتی ہیں ایسی بھی گڑیاں بنائی جاتی ہیں جو وہاں کے قبائل اور قبائلی تمدن کی صحیح عکاسی کرتی ہیں۔ یہ گڑیاں منی پور کے حدود کے باہر منہ مانگے داموں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتی ہیں اس صنعت کا مستقبل بہت ہی درخشندہ ہے۔

زیورسازی ۔ رقص کرنے والی لڑکیوں کو بھڑکیلی پوشاک کے علاوہ جگمگاتے ہوئے زیورات سے بھی آراستہ کیا جاتا ہے۔ رولڈ گولڈ کے گلوبند، ہار اور بازوبند بنائے جاتے ہیں ان کے علاوہ چوڑیاں، نتھ اور بالیاں بھی بنائی جاتی ہیں۔ گلوبند اور ہار رنگ برنگے موتیوں اور سکّہ کے موتی سے آراستہ جاتے ہیں اور بازوبند پر سانپ کے منھ بنے رہتے ہیں۔ یہاں کے بنے ہوئے زیورات کی مانگ ہندستان کے باہر دوسرے ملکوں میں زیادہ ہے۔

بانس اور بید کی صنعت ۔ بانس اور بید منی پور کے لیے قدرت کی ایک دین ہے۔ ان سے مختلف اقسام کی، مختلف رنگ کی اور مختلف کاموں میں استعمال ہونے والی ٹوکریاں بنائی جاتی ہیں یہ صنعت بھی یہاں کی ایک قدیم صنعت ہے۔ ٹوکریوں میں پھروک (مالٹی کی شکل کی)، چنگث یول (مربع کی شکل کی)، ین پاک (چھتری کی شکل کی ٹوپی)، ٹنگول (مچھلی پکڑنے کا ٹاپا) مخصوص ہیں ان کے علاوہ اور بہت سی چیزیں بنائی جاتی ہیں جیسے چھڑی، بائسکل کی ٹوکریاں، سوٹ کیس، ہینڈ بیگ، گلدان، ایش ٹرے، کیلنڈر، اسٹینڈ، چڑیوں کے پنجرے وغیرہ۔ عمدہ قسم کے بانس اور بید سے ڈرائنگ روم فرنیچر بھی بنائے جاتے ہیں جیسے میز، کرسیاں، رنگ وغیرہ۔ مختلف قسم کے باجے، تیر کمان، تمباکو کے پائپ اور کھلونے بھی بانس ہی کے بنائے جاتے ہیں۔ غرض یہاں کے معاشرے میں بانس کی بہت زیادہ اہمیت ہے۔

گھنٹہ بنانے کی صنعت ۔ یہاں کا تجربوں کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جس نے گھنٹے بنانے کی صنعت کو اپنایا ہے۔ یہ لوگ ایک مخصوص علاقے میں رہتے ہیں۔ گھنٹہ بنانے کے علاوہ یہ لوگ سنگاردان کی قسم کا زیورات رکھنے کا صندوقچہ بنانے میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ ڈلی رکھنے کے لیے اسی دھات کی ایک خاص قسم کی ڈبیہ بھی بناتے ہیں۔ یہ ڈبیاں اسارا ان کے فن کی بھرپور نمائندگی کرتی ہیں۔ ان کی نمائش نیا ہی ماہ اور مذہبی تہواروں کے موقع پر خاص طور پر کی جاتی ہے۔

نقاشی کا کام ۔ ہاتھی دانت، پتھر اور لکڑی پر نقاشی کا کام یہاں کی عام صنعت ہے۔ مکانوں کے دروازوں اور کھڑکیوں پر اعلیٰ درجہ کی نقاشی کی جاتی ہے۔ ہاتھی دانت کی چوڑیاں کھلونے اور سجاوٹ کے لیے انواع و اقسام کی چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ اب سے کچھ عرصہ پہلے یہ صنعت بہت زیادہ ترقی پر تھی۔ فی الحال ایسے سامان بنائے جاتے ہیں جن سے مکانوں کی سجاوٹ ہو سکے۔

دیواروں پر آویزاں کرنے کے لیے سر کی شکلیں اس طرح تیار کی جاتی ہیں کہ دیکھنے میں حادث نظر معلوم ہوں۔ بانس کی چھڑیاں جن کے دستاوں پر نقش و نگار بنے ہوتے ہیں منی پور کی ایک خاص صنعت ہے۔ یہ اشیا تحائف دینے کے لیے استعمال میں لائی جاتی ہیں۔

زمانے کی ترقی کے ساتھ ساتھ جب یہ علاقہ آمد و رفت کی سہولتوں میں اضافے کے باعث ہندستان کے مختلف علاقوں سے جڑ جائے گا تو یہاں کی جملہ دستکاریوں کے فروغ کی راہیں نکل آئیں گی۔ ملک کے بڑے بڑے شہروں جیسے کلکتہ، بمبئی، مدراس، دلی وغیرہ میں یہاں کی حسین مصنوعات کی مانگ اور کھپت کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اہلِ منی پور کی خوشحالی اور فارغ البالی میں بھی اضافہ ہوتا جائے گا۔



اتر پردیش شاہراہ ترقی پر

امداد باہمی قرضہ پالیسی میں انقلابی تبدیلی — غریبوں کو بلا ضمانت قرضہ ... قومی بچت اسکیموں کے تحت نشانے سے زیادہ رقم جمع ... مرمت مکان کے لیے پیشگی رقم کی انتہائی حد میں اضافہ ... اسکولی عمارتوں کے لیے تقریباً ۵ لاکھ روپیہ منظور ... سرکاری اسپتالوں میں طبی اسقاط حمل کی سہولتیں ... اردو کتابوں پر انعامات — اردو اکادمی کا فیصلہ ... جنگ کے سورماؤں کے لیے آگرہ میں مکانات کی تعمیر ... دفاعی فنڈ میں عطیات ... فیکٹری انسپکٹروں کی ملازمت کے قواعد میں ترمیم ... وارانسی میں دو لفٹ نہروں کی تعمیر ... گورکھپور پالی ٹکنیک میں ریفریجریشن اور ایر کنڈیشننگ کورس کا انتظام ... ۲۸ بستیوں کو بجلی کی فراہمی ... ساڑھے گیارہ لاکھ ایکڑ آراضی کے لیے آب پاشی کی سہولتیں ... متفرقات

اس سال سے شروع ہونے والے 'سعید انقلاب' کے پروگرام کے تحت سماج کے کمزور اور نادار طبقے کے افراد کو بڑے پیمانے پر بلا ضمانت قرضے دینے کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔ یہ اقدام امداد باہمی قرضہ پالیسی میں ایک انقلابی تبدیلی ہے۔ یہ قرضے ممبروں کو بھینسوں کی شکل میں دیے جائیں گے۔

وزیر امداد باہمی شری کشن سنگھ یادو نے امداد باہمی قرضہ پالیسی میں اس تبدیلی کا ذکر دیہی بے روزگاری دور کرنے کے سلسلہ میں "سعید انقلاب" کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کیا۔ وزیر موصوف جونپور سے تقریباً ۴۵ کلومیٹر دور موضع تاسی میں ایک عام جلسے کو خطاب کر رہے تھے۔

وزیر امداد باہمی نے کہا کہ بینکنگ کے موجودہ طریقہ کار میں اب تک ناداری کو سب سے بڑی نااہلی تصور کیا جاتا تھا لیکن امداد باہمی قرضوں کے ذریعے اپنے لیے روزگار کے متلاشی افراد کے لیے اب ان کی ناداری ہی سب سے بڑی اہلیت اور ضمانت بن جائے گی۔

شری یادو نے کہا کہ امداد باہمی بینکوں نے رکشا چلانے والوں کی امداد باہمی انجمنوں کے ہزاروں ممبروں کو بلا ضمانت قرضے کی شکل میں رکشے فراہم کرکے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ناداروں کو بلا ضمانت قرضہ دینے کے سلسلے میں خطرہ کا کوئی جواز نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ ایسی ایک بھی شکایت موصول نہیں ہوئی ہے کہ رکشا چلانے والا رکشا لے کر بھاگ گیا ہے یا اس نے قرضے کی یومیہ قسط کی ادائگی میں کوئی گڑبڑی کی ہو۔

شری یادو نے کہا کہ "سعید انقلاب" کے پروگرام کے تحت دیہی امداد باہمی دودھ انجمنوں کے ہریجن اور بے زمین ممبروں کو بلا ضمانت قرضے کی شکل میں بھینسیں دی جائیں گی۔ موٹے طور پر تخمینہ لگایا گیا ہے کہ فی بھینس ۱۵۰ روپیہ سے لے کر ۲۰۰ روپے ماہانہ تک کی خالص آمدنی ہوگی۔ سعید انقلاب پروگرام کے تحت اضلاع میں کم سے کم ۲۰۰ دودھ امداد باہمی انجمنیں قائم کی جائیں گی اور ہر انجمن میں ممبروں کی تعداد ۲۰ سے زیادہ ہوگی۔

x x x x

اتر پردیش نے ۱۹۷۱-۷۲ء کے دوران ۳۲ء۱۶ کروڑ روپے کی رقم جمع کی ہے جب کہ بنیادی نشانہ ۲۹ کروڑ روپے کا مقرر کیا گیا تھا۔

ریاستی حکومت نے گزشتہ ۱۱ نومبر کو منعقدہ ریاستی مشاورتی بورڈ کے جلسے میں ۴۰ کروڑ روپے کے نظر ثانی شدہ نشانہ کا اعلان کیا تھا۔

اضلاع میں سیتاپور نے اپنے بڑھتے ہوئے نشانہ کی ۱۵۵

فی صد رقم جمع کر کے پہلا مقام اور میرٹھ نے ۱۳۹٫۲۴ فی صد رقم جمع کر کے دوسرا مقام حاصل کیا ہے۔ تیسرا مقام مظفر نگر نے حاصل کیا ہے جہاں مقررہ نشانہ کی ۱۳۷٫۲۴ فی صد رقم جمع کی گئی ہے۔ اس طرح ریاست میں چھوٹی بچت تمسکات کے تحت رقمیں جمع کرنے کا ایک نیا ریکارڈ قائم ہوا ہے۔

دیگر اضلاع جنھوں نے قومی بچت اسکیموں کے تحت مقررہ نشانوں سے زیادہ رقمیں جمع کی ہیں حسب ذیل ہیں

مرزا پور ۱۱۶٫۸۷ فی صد، سہارن پور ۱۱۵٫۷۵ فی صد، اٹیہ ۱۱۲ فی صد، نینی تال ۱۱۱ فی صد، دہرہ دون ۱۱۰٫۳۳ فی صد، چمولی ۱۰۸٫۵۷ فی صد، پوڑی گڑھوال ۱۰۶ فی صد، پتھورا گڑھ ۱۰۳ فی صد، بلند شہر ۱۰۱ فی صد اور دیوریا ۱۰۰ فی صد۔

اس کے علاوہ حسب ذیل ۱۸ ضلعوں نے ریاست کے ۲۷ کروڑ روپے پر مبنی اپنے بنیادی نشانہ سے زیادہ رقم جمع کی ہے۔

پتھورا گڑھ ۱۴۶ فی صد، وارانسی ۱۲۸ فی صد، بجنور ۱۲۷٫۴۴ فی صد، بارہ بنکی ۱۲۰٫۲۰ فی صد، گونڈہ ۱۱۴٫۵ فی صد، الموڑہ ۱۱۱ فی صد، سلطان پور ۱۰۸٫۲ فی صد، اترکاشی ۱۰۷٫۱۲ فی صد، بہرائچ ۱۰۶٫۵ فی صد، پیلی بھیت ۱۰۵٫۹۵ فی صد، بلیا ۱۰۵٫۵۶ فی صد، الہ آباد ۱۰۴٫۴ فی صد، غازی پور ۱۰۳٫۹ فی صد، فتح پور ۱۰۳٫۳ فی صد، علی گڑھ ۱۰۲٫۳۳ فی صد، رام پور ۱۰۲ فی صد، گورکھپور ۱۰۰ فی صد اور ٹہری ۱۰۰ فی صد۔

× × × ×

ریاستی حکومت نے اپنے ملازمین کو مکانات کی مرمت کے لئے منظور کی جانے والی رقم کی انتہائی حد میں اضافہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ فیصلہ ریاستی کابینہ نے اپنے ایک حالیہ جلسے میں کیا ہے۔

اس فیصلے کے مطابق ۴۵۰ روپے ماہانہ تک تنخواہ پانے والے ملازمین کو مکان کی مرمت کے لیے ان کی تنخواہ کے ۲۴ گنا تک پیشگی رقم منظور کی جائے گی لیکن شرط یہ ہے کہ انتہائی حد ۱۰۰۰ روپے سے تجاوز نہ کرے۔ وہ ملازمین جو ۴۵۰ روپے ماہانہ سے زیادہ تنخواہ پا رہے ہیں انھیں یہ رقم ان کی تنخواہ کے ۲۱ گنا تک کے بقدر منظور کی جا سکے گی لیکن اس کی انتہائی حد ۳۵۰۰ روپئے ہوگی۔ ملازمین ان پیشگی رقموں کی ادائیگی بالترتیب ۹۶ اور ۴۸ قسطوں میں کریں گے۔

کابینہ نے یہ فیصلہ مکانات کی مرمت کے لیے درکار ساز و سامان کی قیمتوں میں اضافے کے پیش نظر کیا ہے۔ اب تک مکان کی مرمت کے لیے پیشگی رقم بنیادی تنخواہ کے ۱۲ گنا تک منظور کی جاتی تھی اور اس کی ادائیگی ۴۸ قسطوں میں کی جاتی تھی۔

× × × ×

ریاستی حکومت نے دیہی علاقوں میں ضلع پریشد کے ۵۸۸۲ جونیر بیسک اسکولوں کی عمارتوں کی تعمیر کے لیے ۴۹۹۷۰۰۰ روپے کی رقم منظور کی ہے۔ پریشدوں کو ان اسکولوں کی عمارتوں کی تعمیر کا کام ۳۱ دسمبر ۱۹۷۲ء تک مکمل کر لینا ہوگا۔ مذکورہ بالا منظور شدہ رقم میں سے ضلع پریشدوں کو ہر اسکول کی عمارت کی تعمیر کے لیے ۸۵۰ روپے کی بطور امداد دیے جائیں گے۔

اس رقم سے حسب ذیل ۱۶ ضلعوں میں اسکول کے لیے عمارتیں تعمیر کی جائیں گی

مین پوری، بہرائچ، گورکھپور، الموڑہ، کھیری، اناؤ، سیتا پور، دہرہ دون، بریلی، بدایوں، شاہ جہاں پور، مرزا پور اور وارانسی۔

اس کے علاوہ مندرجہ ذیل ۱۵ ضلعوں میں بھی اسکولوں کے لیے عمارتیں تعمیر کی جائیں گی۔

آگرہ، علی گڈھ، اٹیہ، متھرا، الہ آباد، اٹاوہ، فرخ آباد، فتح پور، کانپور، بارہ بنکی، فیض آباد، گونڈہ، پرتاب گڈھ، سلطان پور، پوڑی گڑھوال، ٹہری گڑھوال، اعظم گڈھ، بستی، دیوریا، باندہ، ہمیر پور، جالون، جھانسی، نینی تال، ہردوئی، لکھنؤ، رائے بریلی، بلند شہر، میرٹھ، مظفر نگر، سہارن پور، بجنور، مراد آباد، پیلی بھیت، رام پور، بلیا، غازی پور اور جونپور۔

× × × ×

ریاست میں طبی اسقاط حمل سے متعلق ۱۹۷۱ء ایکٹ

یکم اپریل ۱۹۷۲ء سے نافذ کر دیا گیا ہے۔

ریاستی گزٹ کی ایک غیر معمولی اشاعت میں شائع شدہ "اتر پردیش طبی اسقاط حمل ضوابط" کے تحت قانونی اسقاط حمل کی سہولتیں ریاست کے منتخب اسپتالوں کو اور مصدقہ نجی مقامات پر حاصل ہوں گی۔

حکومت نے اسقاط حمل کے سلسلے میں رجسٹرڈ معالجین اور مصدقہ نجی مقامات کی سفارش کرنے کے لیے ایک تصدیق بورڈ کی تشکیل کی ہے۔

اتر پردیش کے علاج و صحت کے محکمہ کے ڈائرکٹر باعتبار عہدہ اس بورڈ کے بالترتیب چیرمین ہوں گے اور جوائنٹ ڈائرکٹر (خاتون) سکریٹری۔ کے۔ جی میڈیکل کالج لکھنؤ کے متعلقہ مضامین کے پروفیسر اور انڈین میڈیکل ایسوسی ایشن اتر پردیش کی ریاستی شاخ کے صدر بورڈ کے ممبران ہوں گے۔

ریاست کے تمام اسپتالوں میں چونکہ اسقاط حمل کے علاج سے متعلق تربیت یافتہ ڈاکٹر اور دیگر ضروری ساز و سامان دستیاب نہیں ہیں اس لیے اسکیم کے پہلے مرحلے میں اس کے لیے جن اسپتالوں کا انتخاب کیا گیا ہے ان کے نام حسب ذیل ہیں:

لیڈی لیال اور ڈفرن اسپتال آگرہ، اے۔ ایچ۔ ایم اینڈ ڈفرن اسپتال کانپور، اسٹوری میموریل اسپتال وارانسی، ڈفرن اسپتال لکھنؤ، ڈفرن اسپتال الہ آباد، میڈیکل کالج الہ آباد، میڈیکل کالج کانپور، میڈیکل کالج آگرہ اور میڈیکل کالج میرٹھ۔

× × × ×

اتر پردیش اردو اکاڈمی نے گذشتہ سال شائع شدہ کتابوں پر جو اکاڈمی کو موصول ہو چکی ہیں، انعامات دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

اکاڈمی کی مجلس عاملہ نے جس کا جلسہ گذشتہ ۸ اپریل کو ہوا تھا، یہ بھی محسوس کیا کہ گذشتہ سال کے دوران شائع شدہ کتابوں پر انعامات دینے کے علاوہ یکم دسمبر ۱۹۶۸ء سے ۳۰ نومبر ۱۹۷۱ء کے درمیان میں شائع شدہ کتابیں بھی انعامات دینے کے لیے غور کرنے کے واسطے طلب کی جانا چاہیے۔

یاد ہوگا کہ کتابوں پر انعامات دینے کی اسکیم ایک لاکھ روپے کی رقم کے ساتھ حال ہی میں نظامت تعلیم سے اتر پردیش اردو اکاڈمی کو منتقل کر دی گئی ہے۔ بنیادی اسکیم کے تحت صرف یکم دسمبر ۱۹۷۰ء سے ۳۰ نومبر ۱۹۷۱ء تک کے دوران شائع شدہ کتابوں پر بھی انعام کے لیے غور کیا جاتا تھا۔

مجلس عاملہ نے اردو کتب، اخبارات اور جرائد کی خریداری کے لیے لائبریری ذیلی کمیٹی کے قواعد و ضوابط کی بھی منظوری دی۔

مجلس عاملہ نے اردو تعلیم کا کام دیکھنے کے لیے ایک تعلیمی ذیلی کمیٹی اور مصنفین کو مالی امداد دینے کے لیے ایک ذیلی کمیٹی بھی مقرر کی۔

× × × ×

جنگ کے سورماؤں کی بیواؤں اور معذور ہو جانے والے فوجی جوانوں کو رہائش کی سہولتیں فراہم کرنے کی غرض سے آگرہ میں مکانات کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا ہے۔

تعمیراتی پراجیکٹ کا افتتاح وزیر ریاست برائے صحت شری دیو کی نندن وبھو نے کل آگرہ میں کیا۔ اس تقریب میں بری، بحری اور فضائی افواج کے سینیر افسروں نے شرکت کی۔ اسی طرح کی ایک کالونی لکھنؤ میں تعمیر کی جا چکی ہے۔

وزیر موصوف نے جنگ کے سورماؤں کے لیے تعمیر مکانات کے پراجیکٹ کے واسطے تقریباً ۱۵ لاکھ روپیہ جمع کیا تھا جس میں سے کانپور نے ۵ء۵ لاکھ روپیہ اور میرٹھ نے ۵ء۳ لاکھ روپیہ دیا تھا اور بقیہ رقم دیگر اضلاع نے دی تھی۔ یہ کل رقم وزیر اعلیٰ دفاع فنڈ میں دیدی گئی ہے۔

× × × ×

۱۹۷۱ء

اتر پردیش ریاستی شہری کونسل نے یکم اپریل اور ۱۵ اکتوبر کے درمیان ۳۰ اضلاع سے ۲۲ء۳ لاکھ روپے سے زیادہ کے عطیات جمع کیے۔ اس کے علاوہ ہندوستان کمرشیل بینک میں کونسل کے کھاتہ میں ۴۵ء۲ لاکھ روپے کی رقم پہلے سے ہی جمع تھی۔ اس طرح کل رقم ۶۷ء۵ لاکھ روپے سے زیادہ ہو گئی۔

یہ اطلاع وزیر اعلیٰ شری کملا پتی ترپاٹھی نے حال ہی میں ودھان پریشد کے ممبران کو دی اور مزید بتایا کہ شہری کونسل نے وزیر اعظم قومی امدادی فنڈ میں ۴۰۹۰۰۱ روپے کا عطیہ دیا اور بنگلہ دیش کے پناہ گزینوں کی امداد پر ۱۵۴۵۸ روپے کی رقم خرچ کی۔ دیگر اخراجات میں مصیبت زدہ افراد کی امداد کے لیے دی جانے والی ۱۱۰۰۰ روپے کی رقم بھی شامل ہے۔

اتر پردیش ریاستی شہری کونسل کے ورکنگ صدر شری رام کمار شاستری کی اطلاع کے مطابق اپریل ۱۹۷۲ء تک اس ضلع میں دفاع فنڈ کے لیے ۱۱،۵۰ لاکھ روپیہ جمع کیا جا چکا ہے۔

ضلع کی رفتار ترقی کا جائزہ لیتے ہوئے شری شاستری نے کہا کہ وہاں چھوٹی بچت اسکیم کے تحت ایک کروڑ روپے کی رقم جمع کی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ تیز رفتار پروگرام کے تحت سڑک کی تعمیر کے کام میں کافی ترقی ہوئی ہے۔

انھوں نے یہ بھی بتایا کہ مسرکھ میں مچھلیوں کی ترقی کے لیے ایک خوب صورت تالاب تعمیر کیا گیا ہے۔

اتر پردیش ریاستی بجلی بورڈ کے افسروں اور ملازموں نے وزیر اعلیٰ دفاعی فنڈ میں اب تک ۵۴۶۱۴۱ روپے کا عطیہ دیا ہے۔ اس سے قبل ۲۲ دسمبر ۱۹۷۱ء کو بورڈ کے افسروں اور ملازموں نے ۳،۴۳۰ روپے کی تھیلی وزیر اعلیٰ شری کملا پتی ترپاٹھی کو پیش کی تھی۔ اس کے بعد ۷۶۸۱۴۱ روپے کی مزید رقم جمع کر کے وزیر اعلیٰ دفاع فنڈ میں دی گئی ہے۔

× × × ×

حکومت اتر پردیش نے انسپکٹر آف فیکٹریز کی آسامیوں پر تقرری کے لیے عمر کی انتہائی حد اور لازمی متبادل تعلیمی استعداد سے متعلق ضوابط میں ترمیم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

مجوزہ ترمیمات کے مطابق وہ افراد بھی انسپکٹر آف فیکٹریز کی آسامی پر تقرری کے حق دار ہوں گے جنھوں نے کوئی ایسی ڈگری یا ڈپلوما حاصل کیا ہے جسے انجینیرنگ یا ٹیکنالوجی کی کسی شاخ میں ہندوستان میں قانون کے تحت قائم شدہ کسی یونیورسٹی کی ڈگری کے مساوی تسلیم کیا جاتا ہو بشرطیکہ وہ دیگر شرائط بھی پوری کرتے ہوں۔

جہاں تک عمر کا تعلق ہے امیدواروں کی عمر کی انتہائی حد آسامی کے مشتہر ہونے کی تاریخ کے بعد پڑنے والی یکم جنوری کو ۴۰ سال سے گھٹا کر ۳۰ سال کر دی گئی ہے۔

اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے امیدواروں کے لیے عمر کی انتہائی حد بہرحال ۳۵ سال رکھی گئی ہے۔

× × × ×

کسانوں کو آب پاشی کی سہولت فراہم کرنے کے لیے ضلع وارانسی کی چندوسی کی تحصیل میں دو نئی لفٹ نہروں کی تعمیر مکمل ہو گئی ہے۔

ان میں سے ایک ۴،۵۰ لاکھ روپے کی لاگت کی ملکی پور پمپ نہر جو موضع ملکی پور کے قریب واقع ہے اور جس سے ۲۰ کیوسکس کے حساب سے ۱۳۰۰ ایکڑ کی آب پاشی کی جائے گی۔ دوسری نہر ۱۱،۶ لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیر کی جانے والی کنڈا کلاں پمپ نہر جو موضع کنڈا کے نزدیک واقع ہے اور جس سے ۵ کیوسکس کی شرح سے ۷۵۰ ایکڑ کی آبیاری کی جائے گی۔

ان دونوں نہروں کے لیے گنگا ندی سے پانی حاصل کیا جائے گا اور کسانوں کو ان نہروں کے ذریعے فراہم کیا جائے گا۔

× × × ×

گورنمنٹ پالی ٹیکنیک، گورکھپور میں آیندہ تعلیمی سال سے ریفریجریشن اور ایرکنڈیشننگ میں ایک سال کا پوسٹ ڈپلوما کورس شروع کیا جائے گا۔

کولڈ اسٹوریجوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور بڑے پیمانے پر ایرکنڈیشننگ کے ساز و سامان کی تیاری کے پیش نظر اس کورس کو شروع کرنا مناسب سمجھا گیا کیونکہ اس قسم کا ساز و سامان تیار کرنے اس کو درست حالت میں رکھنے اور استعمال کرنے کے لیے بڑی تعداد میں ہنرمند مزدوروں اور انجینیروں کی ضرورت ہوتی۔

متفرقات

خصوصی علاقائی پراجیکٹ ۔ ریاستی حکومت نے دہرہ دون میں کلسی اور رکھیری میں جنگلات کے علاقہ میں قبائل مندرجہ فہرست کی فلاح کے لیے خصوصی علاقائی پراجیکٹ بروئے کار لانے کے لیے مزید ۴۲۰۰ روپے کی منظوری کی ہے۔

ان پراجیکٹوں میں زراعت، باغبانی کی ترقی، نقل و حمل، چھوٹے پیمانے کی آبپاشی، اجتماعی ترقی، تعلیم اور ترقیاتی مرکزوں سے متعلق اسکیمیں شامل ہیں۔

ممتاز اُردو مصنف کو علاج کے لیے مالی امداد ۔ اُتر پردیش اُردو اکاڈمی نے اُردو کے معمر ممتاز مصنف اور شاعر شری حامد اللہ 'افسر' کو علاج کے لیے ۵۰۰ روپے کی مالی امداد دینے کا فیصلہ کیا ہے شری افسر کچھ عرصے سے علیل اور بالکل صاحب فراش ہیں۔

جنوری تک ۲۲۰۱۱ مواضعات میں بجلی ۔ وزیر مالیات شری نارائن دت تیواری نے ودھان پریشد کے حالیہ اجلاس کے دوران ایوان کو مطلع کیا کہ ریاست میں گزشتہ ۳۱ جنوری تک ۲۲۰۱۱ مواضعات کو بجلی فراہم کی جا چکی تھی اور بقیہ مواضعات کو بھی بجلی فراہم کرنے کی اسکیم تیار کر لی گئی ہے۔

وزیر موصوف نے ایوان کو مزید مطلع کیا کہ سنہ ۱۹۷۲-۷۳ء میں ۲۰۰۰ مواضعات کو اور سنہ ۱۹۷۳-۷۴ء میں ۳۰۰۰ مواضعات کو بجلی فراہم کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ اس اسکیم کا مقصد سنہ ۱۹۷۹ء تک اتر پردیش کے ۱۱۲۶۲۴ مواضعات کو بجلی فراہم کر دینا ہے۔

شری تیواری نے کہا کہ پانچویں منصوبے میں دیہی علاقوں کو بجلی فراہم کرنے اور دیہی سڑکوں کے کام کو اولیت دی جائے گی۔

لکھنؤ گورنمنٹ پالی ٹیکنک میں نیا کورس ۔ گورنمنٹ گرلس پالی ٹیکنک لکھنؤ میں سال رواں کے دوران پوشاکوں کے ڈیزائن اور ملبوسات کی تیاری سے متعلق تین سال کی مدت کا ایک نیا کورس شروع کیا جائے گا۔

اس کورس کے لیے چوتھے منصوبے میں ۱۰۹۷۰۰ روپے کی جو چھوٹے منصوبے کے دوران اس کورس کو چلانے پر ۲۴۹۳۰ روپیہ خرچ کیا جائے گا۔ اس کورس کے لیے ریاست کے سنہ ۱۹۷۲-۷۳ء کے بجٹ میں ۱۰٫۷۰ لاکھ روپیے کا بندوبست کیا گیا ہے۔

ریاست میں گزشتہ مارچ کے دوران ٹہری، پوڑی اور الموڑہ کے ضلعوں میں جن ۲۸ بستیوں کو بجلی فراہم کی گئی ہے، ان میں سے دو بستیاں ضلع ٹہری کی، ۸ بستیاں ضلع پوڑی کی اور ۱۸ بستیاں ضلع الموڑہ کی ہیں۔ ان بستیوں کے نام یہ ہیں ——

چھام اور ڈوبرا (ٹہری) اینٹھا مانگ، پدم پور سستا در پور، بلبھدر پور، شمبھو نگر دوی، کشن پور، لوک مانی پور اور بجے دیو پور (پوڑی) اور ستکورا، کھرکہ کارکی، پامیٹ، ماڈلیکھ پانڈے، مجکارکی، تکستروا، کھارکین، پاتور، تھاٹن، موہر، چوسل، کولی ڈھیکہ، سیناہاٹ، تالی ہاٹ، پاپا، کمدٹ، دار جر، چوکھٹیا اور گنائی (الموڑہ)

× × × ×

چھوٹے پیمانے پر آبپاشی کی نجی اسکیموں کے تحت گزشتہ فروری کے آخر تک ۱۱ لاکھ ۳۳ ہزار ایکڑ مزید آراضی کو آبپاشی کی سہولتیں فراہم کی گئیں۔ ان اسکیموں میں کنووں اور گولوں کی تعمیر پمپنگ سیٹوں کی تنصیب نجی اور سرکاری ٹیوب ویلوں وغیرہ کی تعمیر شامل ہے۔

زیر نظر مدت کے دوران دیگر کاموں کے علاوہ ۲۱۸۵۱ پکے کنووں کی تعمیر کی گئی، ۲۰۳۲۹ پمپنگ سیٹ لگائے گئے، ۴۰۲۷۶ نجی ٹیوب ویلوں کی تعمیر کا کام پورا کیا گیا اور ۲۴۷۶۶ پمپنگ سیٹوں اور ٹیوب ویلوں کو بجلی فراہم کی گئی۔

اس کے علاوہ ۷۳۳۵۹ ایکڑ آراضی پر نجی اور گاؤں سبھا کی بندھیوں کی تعمیر کی گئی۔ پہاڑی اضلاع میں ۱۲۵۶ ایکڑ زمین کو آبپاشی کی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے گولوں اور ذخیرہ ہائے آب کی تعمیر بھی کی گئی۔

× × × ×

رقم رکھی گئی ہے اس میں ۷۳-۱۹۷۲ء کے لیے ۲۵۰۰۰ روپے کا بندوبست کیا گیا ہے۔

اترکاشی کے لیے دوسرا ٹاؤن ایریا۔ حکومت اتر پردیش نے سرحدی ضلع اترکاشی کی بارکوٹ گرام سبھا کا درجہ بلند کر کے اس کو مارچ ۱۹۷۲ء سے ٹاؤن ایریا کمیٹی بنا دیا ہے۔ ضلع میں یہ دوسری ٹاؤن ایریا کمیٹی ہوگی۔ پہلی ٹاؤن ایریا کمیٹی بھٹواری کی ہے۔

مرزاپور میں دنیا کا سب سے بڑا قالین کرگھا۔ مرزاپور میں دنیا کا سب سے بڑا قالین لوم ہے جو کسی بھی مطلوبہ لمبائی کا ۴۶ فٹ تک کا چوڑا قالین تیار کر سکتا ہے۔ یہ انکشاف وارانسی میں اس سے قبل ہفتہ کے دوران منعقدہ قالین سازی کی صنعت سے متعلق ایک سیمینار میں کیا گیا۔

مرزاپور بھدوہی اور نواحی علاقوں میں عالمی بازار کے لیے ۱۲ کروڑ روپے سالانہ مالیت کے قالین تیار کیے جاتے ہیں۔

تربھون یونی ورسٹی کی ڈگریاں تسلیم۔ حکومت اتر پردیش نے ریاستی ملازمتوں اور آسامیوں پر تقرری کے لیے تربھون یونیورسٹی کاٹھمنڈو کی ڈگریوں اور سرٹیفکیٹوں کو تسلیم کر لیا ہے۔ یہ فیصلہ حال ہی میں اتر پردیش کابینہ کے ایک جلسے میں کیا گیا۔

تربھون یونی ورسٹی کی طرف سے دی جانے والی ڈگریوں اور ڈپلوما کو کسی بھی ہندستانی یونی ورسٹی کی ڈگریوں اور ڈپلوما کے مساوی تصور کیا جائے گا۔ حکومت ہند نے بھی اس یونیورسٹی کی ڈگریوں اور ڈپلوما کو تسلیم کر لیا ہے۔

قیدیوں نے پیتل کے ۹۰۳۰۴ برتن تیار کیے۔ سنٹرل جیل وارانسی کے قیدیوں نے ۱۹۷۱ء کے دوران جیل کے محکموں کے استعمال کے لیے ۴۲۴۳۴ روپے مالیت کے مختلف قسم کے پیتل کے ۹۰۳۰۴ برتن تیار کیے ہیں۔ زیر نظر سال کے دوران اس کام میں اوسطاً روزانہ ۲۰ قیدیوں نے حصہ لیا۔



اتر پردیش اردو اکاڈمی کی جانب سے کتب خانوں کو مالی امداد

نئی درخواستیں نئے فارم پر ۳۱ اگست ۷۲ء تک مطلوب

اتر پردیش اردو اکاڈمی نے کتب خانوں اور دارالمطالعوں کو اردو کتابیں، اخبارات اور رسائل کی خریداری کے لیے ۳۶،۵۰۰ روپے کی مالی امداد منظور کی ہے۔ ان کتب خانوں اور دارالمطالعوں کی درخواستیں نظامت تعلیمات کی معرفت اردو اکاڈمی کو موصول ہوئی تھیں۔

اتر پردیش اردو اکاڈمی نے آئندہ مالی امداد منظور کرنے کے لیے شرائط اور نئے قواعد تیار کیے ہیں اور کتب خانوں / دارالمطالعوں سے اپنے مقررہ فارم پر نئی درخواستیں طلب کی ہیں۔ یہ فارم سکریٹری، اتر پردیش اردو اکاڈمی علا حضرت گنج لکھنؤ سے طلب کیے جا سکتے ہیں۔

درخواستیں فارم کی خانہ پری کر کے اور ضروری تصدیق کرا کے سکریٹری اتر پردیش اردو اکاڈمی کو اس طرح بھیجی جائیں کہ زیادہ سے زیادہ ۳۱ اگست ۷۲ء تک انھیں مل جائیں۔ صرف وہی کتب خانے / دارالمطالعے درخواستیں بھیجیں جو اردو اکاڈمی کے مقرر کردہ شرائط کو پورا کرتے ہوں۔ تاریخ مقررہ کے بعد موصول ہونے والی درخواستیں قبول نہیں کی جائیں گی۔ وہ ادارے بھی اکاڈمی کے فارم بھر کر مالی امداد کی درخواست بھیج سکتے ہیں جو مستقبل قریب میں کتب خانے اور دارالمطالعے کھولنے والے ہوں۔

نقد و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

علی جواد زیدی

کربل کتھا کا لسانی مطالعہ: (ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ)

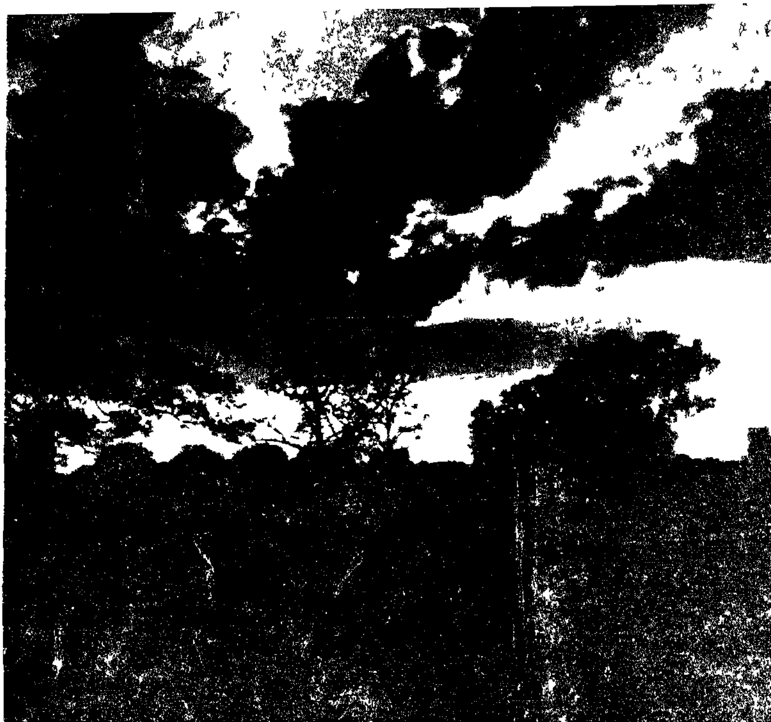
ناشر، مکتبہ شاہراہ، اردو بازار دہلی۔ صفحات ۱۰، قیمت چار روپے

"کربل کتھا کا لسانی مطالعہ" خلیق انجم اور ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا مشترک کارنامہ ہے۔ اکیاسی صفحات کا یہ مختصر رسالہ نثر اردو کی اولین تصنیف "کربل کتھا" کی لسانی خصوصیات اور اہمیتوں کو ظاہر کرنے کے لیے لکھا گیا ہے۔ اصل کتاب کا مصنف فضل علی فضلی دور محمد شاہی کے دہلوی مرثیہ نگاروں میں بھی اہمیت رکھتا ہے۔ اُس نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ "کربل کتھا" اُردو زبان میں پہلا ترجمہ ہے۔ ترجمے کی زبان، وہ بھی جب اصل زبان کی معاون زبان سے ترجمہ کیا گیا ہو، اکثر معاون زبان کے الفاظ و تراکیب سے بوجھل ہو جاتی ہے۔ فارسی کتابوں کے اردو ترجموں میں یہ بات عام طور سے دیکھنے میں آتی ہے۔ پھر بھی زبان اپنی خصوصیات تو ظاہر کرتی ہی ہے۔ فضلی اچھے مترجم ہیں اور زبان پر عبور رکھتے ہیں۔ فارسی اور عربی سے واقف ہیں۔ عام فہم زبان لکھنے پر بھی قادر ہیں۔ ڈھائی سو برس کی زبان کی بہت سی خصوصیتیں "کربل کتھا" کے آئینے میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

مصنفین نے یہ ثابت کیا ہے کہ "کربل کتھا" کی زبان پنجابی، کھڑی بولی اور برج بھاشا کے اثرات کی حامل ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے صوتی، صرفی، نحوی، لفظی اور املائی تبدیلیوں کی تفصیلی نشاندہی کی ہے۔ بعض لسانی خصوصیات پر "کربل کتھا" کے مرتبین مالک رام اور مختار الدین احمد نے بھی روشنی ڈالی تھی۔ اُس وقت تبصرہ کرتے ہوئے میں نے لکھا تھا کہ بہت سی خصوصیتیں جو پنجابی سے وابستہ قرار دے لی گئی ہیں وہ یوپی کے مشرقی اضلاع میں بولی جانے والی زبان میں بھی پائی جاتی ہیں۔ وہی بات اب بھی دہرانا چاہتا ہوں۔ مصنفین نے بعض الفاظ میں سادہ بندشی آوازوں کو ہکار بنا دینے کی چند مثالیں دی ہیں مثلاً ڈھونڈے کی بجائے ڈھونڈھے اور پھوپیاں کی بجائے پھوپھیاں۔ یہ استعمال مشرقی اور کسی حد تک وسطی اتر پردیش میں بھی عام ہیں۔ کل کی بجائے کلھ (یعنی ایک مزید ہکار آواز) کا استعمال بھی مشرقی اضلاعِ اتر پردیش میں ہوتا ہے۔ دال کی جگہ ڈال کا استعمال جیسے داڑھ کی جگہ ڈاڑھ بھی مشرقی اتر پردیش میں مستعمل ہے۔ بعض مصمتوں کے اضافے کی مثالیں بھی مشرقی اتر پردیش میں مل جاتی ہیں مثلاً "سیجا" "پوچھا"۔ گیارہ سے اٹھارہ تک اعداد ترتیبی کو نون غنّہ کے اضافے کے ساتھ استعمال کرنا مثلاً گیاراں، باراں وغیرہ بھی اودھ بالخصوص لکھنؤ میں عام ہیں۔

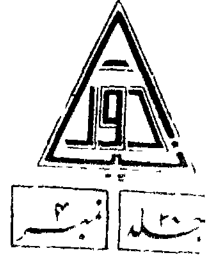
دلّی جو قوموں اور زبانوں کی گزرگاہ تھی وہاں پنجاب اور برج کے علاقوں کے اثرات کے علاوہ پوربی، بھوجپوری، اودھی وغیرہ کے اثرات بھی برابر پہنچتے رہتے تھے۔ اردو اور ہندی کے ماہرینِ لسانیات کا فرض ہے کہ وہ ان اثرات پر بھی غور فرمائیں اور ایک سائنسی نقطۂ نظر عام کرنے میں مدد دیں۔

ڈاکٹر نارنگ اور ڈاکٹر خلیق انجم کی یہ کوشش مشکور ہے۔ دہلوی مراثی اور بعض دوسرے قدیم مخطوطات کا مطالعہ بھی اس سلسلے میں مفید نتائج کا حامل ہوگا۔ اگر یہ ان دونوں صاحبانِ بصیرت کی طرح دوسرے اصحاب بھی اس میدان میں دادِ تحقیق دیتے رہے تو بہت سے لسانی مسائل بھی حل ہو جائیں گے اور ادبی مورخین و ناقدین کے لیے بھی راہ ہموار ہو گی۔



29(4)

نیادور



جلد ۲۰ | نمبر ۴

جولائی ۱۹۷۲ء

اساڑھ ۱۸۹۴ تک

چندہ سالانہ پانچ روپے

فی پرچہ پچاس پیسے

اسسٹنٹ ایڈیٹر

خورشید احمد

سلسلہ

شرومنی شرما

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

پبلشر

اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یوپی

مطبوعہ

سو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ

محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

سرورق
جھوم کے آئی گھٹا
فوٹو کرس سروپ سکسینہ

عنوانات

اپنی بات

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے متعلق ریفورمنگ بل اُس کی سماعت پر جون ۱۹۷۲ء کو منظور کر دیا ... پارلیمنٹ میں صدر جمہوریہ ہند کی منظوری حاصل کر کے یہ بل علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۷۲ء کے نام سے نافذ العمل ہو گیا ہے۔ اس کے خلاف [illegible] آواز اٹھائی جا رہی ہے اور اس کی جو مخالفت کی جا رہی ہے اس کے سلسلے میں غور طلب امر یہ ہے کہ [illegible] علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ کے مضمرات اور [illegible] اس عظیم ادارے کے بانی کے مقصد اور نصب العین سے ٹکراتے ہیں اور اس لحاظ سے ایکٹ کی مخالفت جائز [illegible] درست ہے۔ واضح رہے کہ [illegible] ایکٹ کی مخالفت [illegible] ... اور اس کے ذریعے یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کو ختم کیا جا رہا ہے ... یونیورسٹی کی خود مختاری [illegible] دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس عظیم ادارے کے بانی مرحوم سرسید احمد خاں کے پیش نظر کوئی ایسا منصوبہ [illegible] اقلیتی کردار عطا کرنے کا تھا اور کیا اس درس گاہ کا کوئی ایسا کردار [illegible] جسے اقلیتی کردار کہا جا سکے ... سرسید احمد خاں جدید تعلیم اور سماجی اصلاح کے ذریعے مسلمانوں کی بہبود چاہتے تھے ... کے خواہاں تھے اور انھیں کس میری دلت رسوائی [illegible] ... ۱۸۵۷ء کے انقلاب میں غیر ملکی حاکموں کے کامیاب ہونے اور اس کے نتیجے میں بے پناہ جبر و تشدد کا نشانہ بننے کے باعث پڑے ہوئے تھے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے سرسید نے ... مختلف مقامات پر مدارس قائم کیے۔ پھر ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ کے نام سے ایک درس گاہ قائم کی ... ۱۸۷۷ء میں [illegible] اس کالج کو [illegible] ذات پات اور فرقہ کی حد بندیوں سے بالاتر ہو کر ... اس لیے اس کے دروازے انھوں نے ہر ہندوستانی کے لیے کھلے رکھے اور مدرسہ [illegible] ... قواعد تعمیر ... اور مسلمان دونوں اس مدرسے میں تعلیم پائیں گے ... مدرسۃ العلوم تو ان مدرسہ ہوگا جس میں ہر مذہب کے لوگ تعلیم پائیں گے ... کالج میں داخل ہونے والا ایک ... تعلیم ... ہندو ... اور مسلمانوں کے درمیان ... ۱۸۷۷ء کو کالج کا ... مدرسۃ العلوم کے نام سے ... کہا اور اس کے قومی کردار ... مدرسہ قائم ... ہندو مسلمان ...

[illegible]

مدرسۃ العلوم علی گڑھ ... ۱۸۷۷ء میں ایم اے او کالج بن جانے کے بعد بھی سرسید کے اس نصب العین ... بعد ازاں ۱۹۲۰ء میں کالج نے یونیورسٹی کا درجہ حاصل کیا۔ اس وقت بھی اسے کسی خاص فرقے کا ادارہ بنا کر اقلیتی کردار عطا نہیں کیا گیا ... علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ... ایک ہندو ... تقریباً ایک ... یہ حقائق ظاہر کرتے ہیں کہ ... اس ادارے کا کردار ... اور یونیورسٹی کو ... کے تقاضوں سے ہم آہنگ ... کے تعلیمی نظام میں اسے ایک اہم رول ادا کرنے کے لیے تیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس لیے اس کی مخالفت کی کوئی وجہ نظر آتی ہے ... یونیورسٹی کے ... ایک سال ... ایم اے او کالج کے بھی دو سال شامل ہیں اور اتنی مدت ... علی گڑھ یونیورسٹی سے کچھ ... ترمیمی ایکٹ کوئی ایسا اقدام ... حکومت ... ہوا ... کہ بھارت میں بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں مسلمانوں کی بہبود کے لیے ... کسی طرح اس اقدام ... علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ... کو حق ... شعبہ ... اور شعبہ علوم اسلامی کو نہیں چھیڑا گیا ... مختلف اکیڈمک ... کے طلبا کے لیے مخصوص کر دی گئی ہیں ... یونیورسٹی کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ طلبا تنظیم کو کورٹ میں نمائندگی دی گئی ہے اور اس طرح ان کے مفادات ... معاملات میں ان کو موثر رول ادا کرنے کا ... ترمیمی ایکٹ کی رو سے ... کے اختیارات کو بڑھا دیا گیا ہے لیکن ہمیں ان کے خصوصی حالات کے پیش نظر ... اس طرح کے اختیارات کی عدم موجودگی میں موثر اور فوری اقدامات ممکن نہ ہو سکے۔

"... یہ ہے کہ اس سلسلے میں جس قدر بھی اعتراضات ہوئے ہیں ان کا کوئی اصولی جواز نہیں ہے۔ یونیورسٹی ... حالانکہ علی ... ہوتا ہے چنانچہ اس مقصد کے حصول کے ... سرسید نے صحیح ہی کہا ہے کہ "جب تک مسلمان قوم کی صف میں ان کے دوش بدوش نہیں کھڑے ہو جاتے تب تک وہ ترقی کی راہ پر گامزن عوام سے قدم ملا کر آگے نہیں بڑھ سکتے۔"

اگر پردھان منتری ... صاحب کی جانب ... ایک ہلکا سا اشارہ ہے اور اس ایکٹ کے نافذ کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ اس کمی کو دور کیا جائے ... ہم نے اس عادت سے ماضی میں بھی بھاری نقصان اٹھایا ہے ... دیگر شعبوں میں ... تعلیم کے معاملے میں ... سیکولرازم ... کے لیے تیار کر ... مقابلے کے لیے تیار ... یونیورسٹی میں اس قسم کی پالیسی کو دیکھ کر مجھے دکھ ہوتا ہے۔ اگر ہم اس طرح کی پالیسی کے خطرناک نتائج سے سبق لینے کے لیے تیار نہیں ہیں ... اقدام ... کوئی شخص خواہ کچھ بھی کہوں ... مجھے اس کے کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ ... یونیورسٹی کو ایک اقلیتی ادارہ بنانے کی ... اس امر کی ... زیادہ وسیع پیمانے پر توسیع ... دی گئی ہے۔"

دوسرے یہ کہ بھارت کے وزیر تعلیم نے اعلان کیا ہے ... یونیورسٹی کے سامنے جو مقصد ہے وہ ہے جدید تعلیم کو فروغ دینا۔ اس طرح سے وہ سرسید کے اس مقصد کو یاد دلا رہے ہیں جو انھوں نے ... مسلمانوں کو جدید تعلیم ... دوسرے الفاظ میں اس ایکٹ کا مقصد یہ ہے کہ اس ادارے سے رجعت پسندانہ ... سرگرمیوں کو خارج کر کے اُسے جدید تعلیم کے فروغ کا ذریعہ بنایا جائے۔"

اس مختصر سے ... کے بعد ... یونیورسٹی ایکٹ کی مخالفت یا اس کے سلسلے میں احتجاج کی پشت پر کوئی خاص مقصد یا مفاد تو کار فرما نہیں ہے اور اس لیے ہمارا طرز عمل کیا ہونا چاہیے؟

——— اسلم

دستگیر مرثیہ گو کا مذہب اور ہندوؤں کے اسلامی نام

پروفیسر مسعود حسن رضوی ادیب

ماہنامہ نیا دور بابت دسمبر ۱۹۷۱ء میں جناب کالیداس گپتا رضا کا ایک مقالہ لکھنؤ کے مشہور و مقبول مرثیہ گو دستگیر کے حال میں شائع ہوا ہے۔ اس میں کئی باتیں ایسی آگئی ہیں جو حقیقت کے خلاف ہیں۔ بعض تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ دستگیر جو اصلاً ہندو تھے بعد کو مسلمان ہو گئے تھے۔ رضا صاحب اس کو قطعاً غلط سمجھتے ہیں۔ سرور نے فسانۂ عجائب میں دستگیر کو میاں دستگیر اور استاد نے قطعۂ تاریخ میں مرزا دستگیر لکھا ہے جس سے ان کے مسلمان ہو جانے کا خیال پیدا ہو سکتا ہے۔ رضا صاحب اس خیال کو باطل ثابت کرنے کے لیے تحریر فرماتے ہیں

"سرور نے دستگیر کو میاں دستگیر تحریر کیا ہے۔ آج کل سوءِ اتفاق سے میاں کا لفظ کم و بیش مسلمانوں سے متعلق ہو گیا ہے۔ مگر سرور کے زمانے میں میاں صرف عزت اور محبت کا لفظ تھا اور ہندو مسلمان سب ہی کے نام کے ساتھ لگایا جاتا تھا۔ سرور نے بھی میاں انھیں معنوں میں استعمال کیا ہے جس کے معنی جناب یا حضرت کے علاوہ کچھ نہیں۔"

سوال یہ ہے کہ کیا ایسی ایک مثال بھی پیش کی جا سکتی ہے جہاں میاں کا لفظ کسی ہندو کے لیے استعمال کیا گیا ہو۔ اگر ایسی کوئی مثال نہ مل سکے تو لفظ میاں دستگیر کے مسلمان ہو جانے کی دلیل قرار پائے گا۔

رضا صاحب لکھتے ہیں:۔

"یہ بات میری سمجھ میں بالکل نہیں آئی کہ استاد نے دستگیر کو مرزا کیوں تحریر کیا ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ دستگیر ہندو تھے۔ پھر ان کا مرزا یا مغل ہونا کیونکر ممکن ہو سکتا۔ اگر بالفرض وہ مسلمان بھی ہو جاتے تب بھی ان کی مرزائیت کا کوئی امکان نہ تھا۔ نومسلم مرزا نہیں ہو سکتے۔"

نومسلم کو مرزا کہنے کی بہت نمایاں مثال موجود ہے یعنی مرزا قتیل۔ مرزا کے لیے مسلمان ہو جانے کی شرط بھی نہیں ہے۔ غالب کے مشہور شاگرد مرزا ہرگوپال تفتہ کی مثال سامنے موجود ہے۔

دستگیر کے تبدیل مذہب کے خلاف رضا صاحب نے ایک مضبوط اور بدیہی دلیل پیش کی ہے کہ "ہمیں کسی تذکرے یا تالیف میں دستگیر کا کوئی اسلامی نام نہیں ملتا۔" یہ بات درست نہیں کیونکہ تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا کے ایک قدیم قلمی نسخے میں جو پٹنے میں موجود ہے ان کا اسلامی نام غلام حسین لکھا گیا ہے۔

اسی سلسلے میں رضا صاحب لکھتے ہیں:۔ "دیوان اودھ افتخار الدولہ مہاراجہ میوارام تو بہرحال ہندو تھے اور دستگیر انھیں کے مصاحب تھے۔" آگے چل کر رقم طراز ہیں کہ "ایک ہندو مہاراجہ کے ملازم ہوتے ہوئے ان کا ہندو مذہب چھوڑ کر مسلمان ہو جانا کتنا احمقانہ خیال معلوم ہوتا ہے۔" یعنی رضا صاحب کے خیال میں دستگیر کے مسلمان نہ ہونے کا بہت بڑا ثبوت یہ ہے کہ ان کے سرپرست مہاراجہ میوارام ہندو تھے۔ لیکن ان کو خبر نہیں کہ میوارام خود مسلمان ہو گئے تھے۔ ذیل میں تاریخ اودھ جلد چہارم کے دو اقتباس نقل کیے جاتے ہیں:

"نصیرالدین حیدر نے اپنے جلوس کے بعد میوا رام پسر نول کرشن بن دیاکرشن کو مہاراجہ اعتمادالدولہ کا خطاب دیا اور دیوانی کا عہدہ بخشا اور تین لاکھ روپیہ نقد صیغۂ انعام میں مرحمت کیا[۱]۔"

"مہاراجہ میوارام نے ہندو مذہب کو چھوڑ کر دین اسلام میں قدم رکھا تھا۔ دو تین لاکھ روپیہ سالانہ عشرۂ محرم اور ایام وفات ائمہ اطہار وغیرہ میں خرچ کرتے تھے اور دیوانی کا کام کرتے تھے۔ ان کا درماہہ سات ہزار روپیہ ماہوار تھا[۲]۔"

میوارام کا اسلامی نام ہدایت علی تھا[۳]۔

دلگیر نے ایک جگہ مہاراجہ میوارام کی بیوی کو بیگم صاحبہ لکھا ہے۔

آگے اے دلگیر کر درگاہ حق میں یہ دعا اعتمادالدولہ پر سایہ رہے اللہ کا
حشمت و اقبال سے قائم رہے وہ دائما اور بیگم صاحبہ پر بھی رہے فضل خدا

اس کے بارے میں رضا صاحب فرماتے ہیں کہ "مہاراجہ میوارام کی بیوی کو دلگیر مہارانی نہیں بیگم صاحبہ کہہ رہے ہیں جو خالص اودھ کی تہذیب ہے۔ گزارش ہے کہ ہندو رانی کو بیگم کہنا اودھ کی تہذیب نہیں ہے اور اس کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔ اودھ میں چھوٹی بڑی بہت سی ریاستیں تھیں جن کے مسلمان والیان ریاست راجہ اور مہاراجہ اور اُن کی بیویاں رانی اور مہارانی کہلاتی تھیں اور اس کی بیسیوں مثالیں اس وقت بھی موجود ہیں۔

رضا صاحب فرماتے ہیں کہ "دلگیر کے مذہب بدلنے کا سوال لغو ہے اور اس کے لیے ہمارے پاس کوئی قطعی شہادت نہیں۔ لیکن اس کی قطعی شہادت بھی موجود ہے۔ دلگیر اپنی ایک منظوم عرضداشت میں جو انھوں نے محمد علی شاہ فرماں روائے اودھ کے حضور میں پیش کی تھی اپنے مسلمان ہوجانے کا ذکر یوں کرتے ہیں۔

محمد علی شاہ کیواں مکاں فلک آستاں و ملک پاسباں
ہمیشہ ہیں اس در پہ جو جبہہ سا یہ ہے اُن کی خدمت میں اب التجا
ہوا میں جو مشہور مداح شاہ کہ آگہ ہوئے جنت آرام گاہ[۴]
یہ سُن کر کیا آپ نے سرفراز دیا مجھ کو ہم چشموں میں امتیاز
پڑھا جب کہ معروضۂ خانہ زاد کرم سے کیا نام بندے پہ صاد
اسی طرح برسوں ملازم رہا دُعاگو ہمیشہ یہ خادم رہا
زمانہ جو شاہ زمن[۵] کا ہوا مشرّف با اسلام بندہ ہوا[۶]

دلگیر کے مسلمان ہوجانے کا اس سے زیادہ قطعی ثبوت اور کیا ہوسکتا ہے۔ اب اس میں کوئی شک نہیں رہا کہ انھوں نے اپنا آبائی مذہب ترک کرکے اسلام قبول کر لیا تھا۔

رضا صاحب نے ایک فٹ نوٹ میں گپت سہاے سریواستو کے حوالے سے لکھا ہے کہ دلگیر کا دیوان نایاب ہے۔ مگر یہ اطلاع بھی درست نہیں ہے۔ دیوان دلگیر کا ایک قلمی نسخہ ریاست محمود آباد ضلع سیتاپور کے کتب خانے میں موجود ہے جس کو مرتب کرکے ایک مبسوط تحقیقی مقدمے کے ساتھ ڈاکٹر اکبر حیدری صاحب کاشمیری نے ۱۹۷۰ء میں منظومات میاں دلگیر کے نام سے شائع کردیا ہے۔ حیدری صاحب اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ اس میں دلگیر کی کوئی غزل یا مرثیہ نہیں ہے بلکہ چند مثنویاں، مسدس، ترجیع بند اور قطعات شامل ہیں۔ دلگیر نے جب مرثیہ کہنا شروع کیا تو اپنا دیوان غزلیات موتی جھیل میں ڈبو دیا تھا۔ اُن کے موجودہ دیوان میں اُن کی غزلیں کیوں کر شامل ہوسکتی تھیں۔

میں نے آج سے کچھ کم چالیس برس پہلے اکتوبر ۱۹۳۲ء میں دلگیر کے حالات اُن کے خاندان کے دو بزرگوں سے دریافت کرکے لکھ لیے تھے۔ ایک بزرگ لالہ دینا ناتھ عرف حسین بخش واجپئی کے پوتے منشی امبکا پرشاد سکینہ تھے اور دوسرے بزرگ واجپئی کے پوتے منشی کھمو لال تائب تھے۔ منشی امبکا پرشاد قدیم کمیاب کتابوں کی تلاش میں میری مدد کیا کرتے تھے۔ اُن کی

۱ے تاریخ اودھ جلد چہارم - نجم الغنی، ص۲۱۶-۲۱۷ ۲ے ایضاً ص۲ ۳ے منظومات میاں دلگیر ص۶ - حاشیہ ۱ ۴ے جنت آرام گاہ - نواب سعادت علی خاں ۱۲۱۲ - ۱۲۲۹ھ ۵ے شاہ زمن - غازی الدین حیدر ۱۲۲۹ - ۱۲۴۳ھ ۶ے منظومات میاں دلگیر - سرفراز قومی پریس لکھنؤ ۱۹۷۰ء - ص۴۵

والدۂ گرامی دلگیر کی بھتیجی تھیں یعنی دلگیر اُن کے پھپھا تھے۔
منشی صاحب مرحوم نے میری فرمائش پر دلگیر کے حالات
اپنی نہایت معمر والدہ سے دریافت کرکے لکھ دیے تھے
جو انھیں کے قلم سے لکھے ہوئے میرے پاس موجود ہیں اور
ذیل میں لفظ بہ لفظ نقل کیے جاتے ہیں۔

حالات میاں دلگیر بانی والدۂ ماجدہ یعنی
لالہ دینا ناتھ صاحب المتخلص بہ واجب
لالہ چھنگو لال صاحب کا نسبتہ سکینہ دوسرے تھے۔ آپ کے
والد کا نام رائے بالکرام صاحب تھا۔ شروع میں بہت خوشحال

تھے۔ لالہ چھنگو لال صاحب کو لالہ دینا ناتھ عرف حسین بخش
واجب کی ہمشیرہ منسوب تھیں یعنی لالہ لکھمن لال صاحب
طالب داروغۂ چاندی خانہ کی دختر۔ شاعری کا بہت شوق
تھا۔ ایک دیوان کہا تھا مگر عرق موتی جھیل کر دیا اور تب سے
مرثیہ گوئی کی طرف مائل ہوگئے۔ مشرف بہ اسلام ہوئے اور

دلگیر تخلص کیا۔ عوام میاں دلگیر کہنے لگے۔ تعزیہ داری کرتے
تھے اور ماہ محرم میں بڑی عقیدت کے ساتھ ماتم داری عزاداری
کیا کرتے تھے۔ تعزیہ اٹھنے پر خود و شاگرد و دیگر صاحبان
مرثیہ گوئی کرنے تھے۔ مرثیہ گوئی میں ایسا نام پیدا کیا کہ

آج تک لوگوں کی زباں پر ہے۔

میاں دلگیر کے پانچ بیٹے تھے (۱) لالہ مانکے لال عرف ٹکو (۲) لالہ سمن لال (۳) اودھ بہاری عرف ابدو (۴) عبوص علی (۵) حسوت رائے عرف حصو۔ دو لڑکیاں تھیں ایک رمی لالہ بانکے لال صاحب ساکن سرائے معالیجاں کو منسوب تھی دوسری لڑکی لالہ کجی لال کو منسوب تھی۔ لالہ کجی لال صاحب دیوان سُندر لال کے بیٹے تھے۔

مسلمان ہوجانے پر بال بچوں اور اہل خانہ کا چولہا دونوں علیحدہ ہوگیا۔ میاں دلگیر کو دونوں وقت کھانا پکا کر دیدیا جاتا تھا۔ شروع میں سسرال میں بڑی خاطرداری و مدارات ہوتی تھی۔ مسلمان ہوجانے پر آتے جاتے ضرور رہتے تھے لیکن وہ بات نہ رہی۔ مکان اُن کا بجی گنج کے چوراہے پر پان والی کی دوکان کے پاس تھا۔ شادی کے وقت بہت کم سن تھے بیوی کو چھٹا سال تھا۔ لالہ سمن لال مسلمان ہوگئے تھے۔ لالہ مانکے لال عرف ٹکو نے ایک معلانی ڈال رکھی تھی۔

میاں دلگیر مرے پر مثل اہل تشیع اٹھائے گئے۔ مجمع کثیر تھا۔

میاں دلگیر کے والد کی دو شادیاں ہوئی تھیں چھنگولال کی وجہ تسمیہ دو انگوٹھے ہونے سے پڑی۔ سب لڑکے اور لڑکیاں انتقال کر گئے۔

لالہ مانکے لال کے ایک لڑکا مسدو بیوی سے گیتولال تھا جو O.R.R. میں بطور گارڈ تھا۔ شادی نہیں ہوئی اور انتقال کر گیا۔ میاں دلگیر کی لڑکیوں کی پرناتی اور نواسی اب بھی موجود ہیں۔

بڑی برسات میں کچھ حصہ قلمی مرثیوں کا کوٹھری میں پانی بھر جانے سے تلف ہوگیا تھا جس کا بہت رنج و قلق رہا۔ بہت کچھ پھر تیار کر لیا۔ کوئی سن یعنی وفات و پیدائش کا نہیں یاد ہے۔ فقط

منشی کھنولال تائب ایک چھوٹے سے دستی پریس مطبع بہار اودھ کے مالک تھے۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء میں جب میں اُن سے ملا تو وہ بہت ضعیف ہو چکے تھے۔ میرے دریافت کرنے پر انھوں نے دلگیر کے جو حالات بیان کیے تھے وہ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

دلگیر کا نام چھنولال اور تخلص طرب تھا۔ ابتدا سے اُن کا رُجحان اسلام کی طرف تھا۔ چنانچہ عالم شباب ہی میں وہ مسلمان ہوگئے تھے۔ اُن کے دو صاحبزادے تھے چھنگولال اور مہنگولال۔ مہنگولال بھی مسلمان ہوگئے تھے۔ علموں پر عربی عبارت کندہ کرنا اُن کا پیشہ تھا اور اس فن میں اُن کو بڑی مہارت تھی۔ میں نے ان دونوں کو دیکھا ہے۔ چھنگولال واجب کے بہنوئی تھے۔ دلگیر کا اسلامی نام کسی سے نہیں سُنا۔ اُن کو سب لوگ میاں دلگیر کے نام سے یاد کرتے تھے۔ چھنگولال کے یہاں تعزیہ داری ہوتی تھی۔

خاندانِ دلگیر کے ان دونوں بزرگوں کے باتوں میں کچھ اختلاف نظر آتا ہے۔ وہ سن کی زیادتی حافظے کی کمزوری اور ناموں میں جزوی مماثلت کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ منشی کھنولال نے دلگیر کا نام چھنولال بتایا ہے اور منشی امکا پرشاد کی والدہ نے اُن کا نام مع وجہ تسمیہ چھنگولال بتایا ہے۔ ان کے ایک ہاتھ میں دو انگوٹھے تھے یعنی چھ انگلیاں تھیں۔ ایسے چھ انگلیوں والے لوگ چھنگا کے نام سے یاد کیے جاتے تھے۔ میرے ایک ننہالی بزرگ خورشید علی کا عرف چھنگا تھا۔ لکھنؤ کے ایک عالی خاندان مگر اَن پڑھ مرثیہ گو صادق حسین، حسین چھنگا صاحب کہلاتے تھے۔

منشی تائب کا بیان ہے کہ لکھنؤ کے بعض کائستھ خاندانوں میں دو نام رکھنے کا رواج تھا ایک ہندوانہ ایک اسلامی۔ واجب کے خاندان کے علاوہ ایک دوسرے خاندان میں بھی عابد حسین اور غلام عباس تھے۔ عابد حسین کے دادا کو شاہ اودھ کی سرکار سے اُدھ راج کا خطاب مرحمت ہوا تھا۔ یہ خطاب مہاراجگی کے خطاب سے بھی بڑھا ہوا تھا۔ اس بیان کی تائید میں چند باتیں اور پیش کی جاتی ہیں۔

تائب کا ایک قصیدہ جو کسی راجہ کے فرزند کی گھوڑے چڑھائی کی تقریب پر سنہ ۱۳۱۰ھ میں کہا گیا تھا اور انھیں کے مطبع بہار اودھ میں جون سنہ ۱۸۹۱ء میں چھپا تھا میرے پاس موجود ہے۔ انھوں نے اس قصیدے کے آخر میں اپنا نام یوں لکھا ہے "خیر سگال کھنو لال تائب خلف مرحمت حسین صاحب ولد منشی حسین بخش واجب ابن منشی سکھن لال طالب داروغہ نقارہ خانہ سلطان غازی الدین حیدر بہادر"۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تائب کی شاعری تین پشتوں کی میراث تھی۔ ان کے والد دادا اور پردادا سب شاعر تھے۔

یہاں تائب نے اپنے والد کا صرف اسلامی نام مرحمت حسین لکھا ہے۔ لیکن ایک دوسرے موقعے پر ان کا ہندوانہ نام جھاؤلال بتایا ہے۔

مندرجہ بالا بیانات میں چند ہندو کائستھوں کے اسلامی نام آگئے ہیں یعنی حسین بخش، عیوض علی، مرحمت حسین اور حضرت بخشی الملک راجہ الفت رائے بہادر الفت کی کتاب انشائے الفت[ے] میں ان کے علاوہ چند اور نام ملتے ہیں یعنی لالہ امام بخش، حسن بخش صاحبزادہ رائے گنگا پرشاد اور غلام عباس صاحبزادہ رائے گنگا پرشاد۔

تفنن طبع کے لیے یہ لطیفہ سن لیجیے کہ لکھنؤ میں کائستھوں کا ایک بڑا خاندان تھا جس کے بیشتر افراد شاعر تھے اور اُن کے تخلص ہم وزن و ہم قافیہ تھے۔ دینا ناتھ واجب، جھاؤ لال ناصب، کھنولال تائب، سکھن لال طالب، رجن لال قالب، بھندن لال کاتب، سیتا رام حاسب، آخری تین نام حسین بخش واجب کی مثنوی بہارستان شادی[شہ] کے قطعات تاریخ میں ملتے ہیں۔

ضمیمہ

منشی امبکا پرشاد اور منشی کھنولال تائب

منشی امبکا پرشاد کے بزرگ ذی عزت اور خوشحال تھے۔ ان کے والد دیوان رمن لال کا پھاٹک محلہ نواز گنج میں میں نے دیکھا تھا۔ ان کے بڑے بھائی ماتا پرشاد عتیقہ فروش تھے، قلمی کتابوں اور تصویروں وغیرہ کی تجارت کرتے تھے۔ میں ایک دفعہ ان سے ملنے گیا تھا۔ ان کے مکان کے وسیع کمپاؤنڈ میں ایک طرف چھوٹی سی مسجد تھی جس کی دیکھ بھال وہ خود کرتے تھے اور نماز کے لیے چٹائیاں اور وضو کے لیے پانی موجود رکھتے تھے۔ ان کی عنایت کی ہوئی ایک قلمی تصویر اب بھی میرے پاس ہے جس پر 'قدسیہ محل' لکھا ہوا ہے۔ یہ لوگ لکھنؤ کی ہند و مسلم مشترک تہذیب کے باقیات الصالحات تھے۔

منشی کھنولال تائب کے بارے میں اوپر لکھا جا چکا ہے کہ ان کے والد، دادا اور پردادا شاعر تھے اور ان کے تخلص ترتیب وار ناصب، واجب اور طالب تھے اب انھیں کی بتائی ہوئی دو چار باتیں اور لکھی جاتی ہیں۔ انھوں نے آٹھ مرتبہ حیدرآباد دکن کا سفر کیا۔ پہلا سفر سنہ ۱۳۰۹ھ میں ہوا۔ پانچ چھ مرتبہ نظام دکن کے دربار میں باریابی کا شرف حاصل ہوا۔ حیدرآباد میں ان کے متعدد شاگرد تھے، جن میں مشرف یاور جنگ خانہ تقاریب سلطانی و سررشتہ دار افواج نظام راجہ سری پرشاد احقر اور سرجن جمعیت نظام محبوب دکن مرزا داؤد بیگ مرزا سب سے ممتاز تھے۔



ے انشائے الفت۔ مطبع علوی، لکھنؤ سنہ ۱۲۷۰ھ صفحات ۵۹ و ۹۲، ۹۴ ۔ شہ بہارستان شادی۔ مطبع علوی، لکھنؤ، سنہ ۱۲۷۰ھ

کل رات

جلال ملیح آبادی

تھی کوئی زہرہ جبیں، شمعِ شبستاں کل رات
مدتوں بعد، زمانہ تھا غزل خواں کل رات
زلف بکھرائے ہوئے دوش پہ ناہیدِ بہار
تھی فضائے شبِ مہتاب میں رقصاں کل رات
طلعتِ ماہ میں شبنم سے فروزاں تھا چمن
گل بہ گل لالہ بہ لالہ تھا چراغاں کل رات
حسن کو عشق کا وہ پاس تھا اللہ اللہ
نازبردار تھی وہ نازشِ دوراں کل رات
شوق شاداب تھا پلکوں کے حسیں سائے میں
اس کی باہوں میں سرشار تھے ارماں کل رات
نکہتِ کاکلِ شب رنگ سے تھے عطر فروش
سوسن و نسترن و لالہ و ریحاں کل رات
گلستاں رنگ تھی اک لیلیٔ شیریں کل شب
کہکشاں تاب تھی اک زلفِ پریشاں کل رات
حسن سا حسن تھا؟ رعنائی سی رعنائی تھی؟
پیکرِ رنگ تھی اک جانِ بہاراں کل رات
شعلۂ بادہ جو گرتا تھا تو لو اٹھتی تھی
رنگِ مے سے مرا ساغر تھا فروزاں کل رات
خلد زارِ چمنستاں میں مرے دوش بہ دوش
کوئی سلمائے دل آرا تھی خراماں کل رات



مصنف

غزل کا مختصر جائزہ
میرے حافظے کی روشنی میں

سام موہن جگر بریلوی

اردو اصناف سخن میں غزل کو جو مقبولیت حاصل ہوئی کسی اور صنف کو حاصل نہیں۔ ساتھ ہی ساتھ اس میں پیرائی بھی بہت ہے۔ یہی شعرا کا معیار ٹھہری، اسی سے ان کا درجہ قائم ہوا اور اسی سے ان کے مخصوص رنگ بن گئے ہیں۔ جب غزل کی خوبیوں اس کی پہنائیوں اور وسعت پر غور کرتا ہوں حیرت میں ڈوب جاتا ہوں۔ اس کا یار دل کے معنی میں ملتا ہے۔ اس کے معنی کیا ہیں؟ اس کے معنی صاحب غیاث اللغات یوں لکھتے ہیں "باری کردن محبوب و حکایت کردن از جوانی و حدیث محبت عشق و زناں" اس کا مطلب مختصراً یہ ہوا محبوب عورتوں سے جوانی کی، عشق و محبت کی باتیں کرنا۔ یہ باتیں کون نہیں کرتا اور کون کرنا نہیں چاہتا مگر یہ باتیں خلوت میں بھی ہوتی آئی ہیں اور جلوت میں بھی۔ خلوت کا مطلب ہے پردہ اور حجاب، جلوت کے معنی ہیں بے پردگی اور بے حجابی، جس کے لیے بازاروں کے کوٹھے مخصوص ہیں۔ یہاں حقیقت لینے والے شرم و حیا کے پردے چاک کر ڈالتے ہیں اور وہ عریانیت و رکاکت نظر آتی ہے کہ الٰہی توبہ۔ غزل کی دونوں تصویریں ہیں۔ میں پہلے اچھی تصویر کے خط و خال پیش کرتا ہوں۔

ابتدا میں غزل نے نشو و نما دو ہی دبستانوں دلی اور لکھنؤ میں پائی، جس میں دلی کو فوقیت حاصل ہے۔ لہٰذا دلی سے ابتدا کی جاتی ہے۔

خدائے سخن میر تقی میر فرماتے ہیں ؎

سرہانے میر کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے
تھمتے تھمتے تھمیں گے آنسو رونا ہے یہ کچھ ہنسی نہیں ہے
میں جو بولا کہا کہ یہ آواز اسی خانہ خراب کی سی ہے
میر ان نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے
خوش نہ آئی تمہاری چال ہمیں یوں نہ کرنا تھا پائمال ہمیں
دور بیٹھا غبار میر اس سے عشق بن یہ ادب نہیں آتا

مندرجہ بالا شعروں میں کتنی شستگی، سکینی اور درد ہے۔ ذیل کا شعر داد سے مستغنی ہے۔ یہ دردِ دل بھی اور عشق کا کرشمہ ہے۔ ذرا غور فرمائیے۔

ہائے غیوری حسن کی دیکھی جی ہی نکلتا ہے ایسا
دیکھیے اس کی اور نہیں پھر یہ بھی عشق کی غیرت ہے

اس شعر کو ذہن میں رکھیے تو دل کا شعر بخوبی سمجھ میں آ جائیگا۔

مخدوم سجدہ آخر جانا پڑا جہاں سے جوشِ حیا سے ہم سے وہ آستاں نہ پایا

یہ شعر بھی انہیں کا ہے ؎

کچھ نہ دیکھا بجز اک شعلۂ پر پیچ و تاب
شمع تک تو ہم نے دیکھا تھا کہ پروانہ گیا

میر بالکل بجا فرماتے ہیں ؎

گفتگو ریختے میں ہم سے نہ کر یہ ہماری زبان ہے پیارے

ان سے گفتگو کرنے کا ہر شخص اہل نہیں۔

میر کے بعد مومن کو دیکھیے۔ یہ غزل کے بادشاہ تھے۔ کوئی ان سے بڑھ کر غزل نہ کہہ سکا۔ ذیل کے شعر کا تو جواب ہی نہیں

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اور دیکھیے

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی
چلی سوخی نہ کچھ بادِ صبا کی بگڑنے میں بھی زلف اس کی بنا کی
ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

سہم سجود پائے صنم پر دمِ وداع مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

نہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا
میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

یہ شعر تو مدت سے ضرب المثل ہے

عمر تو ساری کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

اب غالب کو دیکھیے ان کا رنگ سب سے جدا ہے۔ سب سے انوکھا ہے۔ ایسے شعر بھی کثیر تعداد میں ہیں جن کو سوا عجبتا کے اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

اسد ہم وہ جنوں جولاں گدائے بے سر و پا ہیں
کہ ہے سر پنجۂ مژگانِ آہو پشت خار اپنا

اور ایسے بھی جو غزل کا اچھا نمونہ ہیں ؎

کوئی امید بر نہیں آتی کوئی صورت نظر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
پہلے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی اب کسی بات پر نہیں آتی

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے آخر اس درد کی دوا کیا ہے
ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

کسی کو دے کے دل کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو
نہ ہو جب دل ہی سینے میں تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو

اب داغ کا غلغلہ بلند ہوتا ہے۔ ہر طرف داغ کی دھوم ہے۔ انھوں نے غزل کو ایسے رگڑے دیے کہ بیچاری کی ہڈی پسلی سب ٹوٹ گئی بقول حکمت داغ کی شاعری عیاشانہ شاعری ہے ؎

آنکھیں دکھلاتے ہو جوبن تو دکھاؤ صاحب
وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے

عاشقی کی بھی حد ہو گئی فرماتے ہیں ؎

حوروں کا انتظار کرے کون حشر تک
مٹی کی بھی ہو تو روا ہے شباب میں

داغ نے چار دیوان لکھے۔ بہت شہرت پائی۔ ان کے ہزاروں شاگرد تھے جنھوں نے اپنے استاد کا رنگ ملک کے اطراف و جوانب خوب پھیلایا۔ گھروں میں، محفلوں میں، گلی کوچوں میں، بازاروں کے کوٹھوں پر ہر جگہ انھیں کے راگوں کی دھوم ہے۔ آخر مولانا حالی نے فتویٰ صادر فرمایا ؎

غزل اور قصیدے کا ناپاک دفتر عفونت میں سنڈاس سے جو ہے بڑھ کر

داغ کے بعد دلی میں کوئی قابلِ ذکر شاعر نہیں ہوا اور غزل کا جنازہ نکل گیا۔ اب دبستانِ لکھنؤ کی سیر کیجیے۔ یہاں سرآمد شعرا افصح الفصحا خواجہ حیدر علی آتش پر سب سے پہلے نظر جاتی ہے۔ آتش عارف باللہ ہیں۔ ان کا کلام سنیے اور وجد کیجیے ؎

خدا سر دے تو سودا دے تیری زلفِ پریشاں کا
جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو ایسے سنبلستاں کا

حسنِ پری اک جلوۂ مستانہ ہے اس کا ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اس کا

وہ یاد ہے اُس کی کہ بھلادے دوجہاں کو — حالت کو کرے غیر وہ یارانہ ہے اُس کا
گل آتے ہیں ہستی میں عدم سے ہمہ تن گوش — بلبل کا یہ نالہ نہیں افسانہ ہے اُس کا

تصوّر سے کسی کے ہم نے کی ہے گفتگو برسوں
رہی ہے ایک تصویر خیالی رو برو برسوں

شیریں زباں ہوئی ہے فرہاد کے دہن میں
لیلیٰ پکارتی ہے مجنوں کے پیرہن میں

چشم نامحرم کو برق حُسن کر دیتی تھی سد
دامنِ عصمت برا آلودگی سے پاک تھا

حشر کو بھی دیکھنے کا اُس کے ارماں رہ گیا
دل ہوا ابر آفتاب آنکھوں سے پنہاں رہ گیا

گستاخ بہت شمع سے پروانہ ہوا ہے
موت آئی ہے سر چڑھتا ہے دیوانہ ہوا ہے

اب ستی بوت رائے نظر آتے ہیں۔ یہ شاعر ہی نہیں، ہرفن مولا ہیں یعنی ادیب، نقاد، محقق، مصوّر۔ ان کے تنقیدی مضامین بڑے بصیرت افروز ہوتے ہیں اور بہت بلند معیار کے۔ ان کا ایک بسیط مضمون مصوّرانِ لکھنؤ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ان کی سی جامع کمالات ہستیاں کم پیدا ہوتی ہیں۔ ان پر دو کتابیں لکھی گئیں۔ یادگار نظر[1] راقم نے لکھی اور نقد نظر مختار احمد مانی ایم۔ اے مرحوم نے۔ یہ دراصل وہ مقالہ ہے جو مرحوم نے ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کے لیے لکھا تھا مگر یونیورسٹی میں پیش نہ کر سکے کہ پیام اجل آگیا۔ ان کی وفات کے بعد یہ مقالہ ان کے بڑے بھائی افتخار احمد ایڈوکیٹ بریلی نے شائع کر دیا۔ نظر کا کلام تمام تر داخلی ہے۔ فرماتے ہیں:

سُن لو کر رنگِ محفل کچھ معتبر نہیں ہے — ہر اک زبان گویا شمعِ سحر نہیں ہے
مدت سے ڈھونڈھتا ہوں ملتا مگر نہیں ہے — وہ اک سکوں خاطر جو میسّر نہیں ہے
دل تھا تو ہو رہا تھا احساس زندگی بھی — مُردہ ہوں اب کہ زندہ یہ بھی خبر نہیں ہے
آہیں بھریں بہت کچھ دم توڑتا ہے باقی — اس آہ میں کبھی دیکھوں ہے یا اثر نہیں ہے

کوئی مجھ سا مستحقِ رحم و غمخواری نہیں — سو مرض ہیں اور بظاہر کوئی بیماری نہیں

ضبط سے دل نزار رہتا ہے — اندرونی بخار رہتا ہے
قطعِ اُمید ہو تو کیونکر ہو — روز اک انتظار رہتا ہے

وہ ایک تم کہ سراپا بہار و نازشِ گل — وہ ایک میں کہ نہیں صورت آشنائے بہار

یاس سے ویرانیٔ حسرت کبھی ایسی نہ تھی — دل میں سناٹا نہ تھا وحشت کبھی ایسی نہ تھی

دل کی حالت نہیں سنبھلنے کی — اب یہ دُنیا نہیں بدلنے کی

زمانے کی ناقدر دانی کے لیے دل کو یوں سمجھاتے ہیں:

نظر اپنی تسلی کے لیے کافی ہے یہ مصرع — کہاں تک دہر میں بیقدریٔ جنسِ ہنر ہوگی

نظر کے بہت دن بعد اُستادی لسان الہند مرزا محمد ہادی عزیز لکھنوی آتے ہیں۔ ان کے یہاں بڑی تابناکی بلکہ جلال ہے:

یہ آج کس کی جوانی کو میں نے دیکھا تھا
مری نگاہ کو تکتے ہیں آستانے بہار

دیل کا شعر یقیناً لافانی ہے:

حامۂ قدرت نے دل کا نام یہ کہہ کر لکھا — ہر جگہ اس لفظ کے معنی بدلتے جائیں گے
جھپتے کیوں ہو جو سراپا قدم دیکھتے ہیں — یہ کوئی اور ہی ہے جسے تمہیں ہم دیکھتے ہیں
اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حُسن — بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

انگڑائی پر بہت شعر نظر سے گذرے مگر اس شعر کا عالم ہی

---

[1] مطبوعہ انجمن ترقی اُردو علی گڑھ۔

نرالا ہے۔ دلی اور لکھنؤ کی سحر بیانیاں ختم ہوئیں۔ اب کچھ ان اہلِ کمال کی جادو بیانیاں دیکھیے جو ان سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ باہر کے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے شاد عظیم آبادی کا نام و کلام زبان پر آتا ہے۔

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں پاؤ گے نہیں نایاب ہیں ہم
تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہمنفسو وہ خواب ہیں ہم
میں حسرت و حیرت کا مارا خاموش کھڑا ہوں ساحل پر
دریائے محبت کہتا ہے آ کچھ بھی نہیں پایاب ہیں ہم

ذیل کا شعر کس بلا کا ہے کہ سننے والا تڑپ کر رہ جاتا ہے۔ میری نظر سے اُردو میں اس مفہوم کا کوئی شعر نہیں گذرا۔ ؎

مرغانِ قفس کو پھولوں نے اے شاد یہ کہلا بھیجا
آنا ہو اگر تو آ جائیں ایسے میں ابھی شاداب ہیں ہم

اگر لب پر نہ مرتے دم بھی تیرا نام آئے گا
میں اس جینے سے در گذرا مرے کس کام آئے گا

ان کے بعد انھیں کے پیرو مرزا واجد حسین یاس دیگانہ جنگیزی غزل سرائی کرتے ہوئے بڑے دم خم کے ساتھ لکھنؤ میں قدم رکھتے ہیں۔ یہ ایک طرف اہلِ لکھنؤ کو کڑک کر للکارتے ہیں دوسری طرف مانگے دہلی غالب کے بخیے اُدھیڑنا شروع کرتے ہیں اور اُس وقت تک دم نہیں لیتے جب تک ایک پوری کتاب غالب شکن نہیں لکھ ڈالتے۔ لکھنؤ والوں سے مدت تک ان کی جنگ رہی جس کے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ ان کا دیوان آیاتِ وجدانی ایک زمانہ ہوا نظر سے گذرا تھا۔ ان کے اشعار بڑے مضبوط کھرے اور جاندار ہوتے ہیں۔ ؎

لپٹتی ہے بہت یادِ وطن جب دامنِ دل سے
پلٹ کر اِک سلامِ شوق کر لیتا ہوں منزل سے

دھواں سا جب نظر آیا سوادِ منزلِ کا نگاہِ شوق سے آگے تھا قافلہ دل کا
چلے چلو جہاں لے جائے ولولہ دل کا دلیل، راہ محبت ہے فیصلہ دل کا
سلامت رہیں دل میں گھر کرنے والے اس اُجڑے مکاں میں گذر کرنے والے
گریباں میں منہ ڈال کر خود تو دیکھیں بُرائی پہ میری نظر کرنے والے

دن کٹتے کٹتے ہے عمر گھٹنے کے لیے مفت دن گننے کو ہم آئے گئے سنگار میں

یگانہ نے متبذل لفظ کو زورِ دست حقیقتوں سے وابستہ کر کے کلیوں پا [illegible] بنا دیا۔ اسے مسیحائی کہتے ہیں۔ یہ ھر انھیں کا حصہ ہے۔ سبحان اللہ!

یکساں کبھی کسی کی نہ گذری زمانے میں یادش بخیر بیٹھے تھے کل آشیانے میں

دل کے شہر سے لکھنؤ والوں سے ان کی معرکہ آرائیاں ظاہر ہیں ؎

دنیا میں یہ کرتے ہیں شکر کے سجدے دعا جو تو کیا اہلِ لکھنؤ کرتے

اب جگر مرادآبادی تشریف لاتے ہیں۔ انھوں نے بقول خود ایسا معلوم کیا ہے۔ ان کی غزل داغ کی صدائے بازگشت ہے۔ زبان البتہ صاف ادرے۔ اس میں فارسیت کی مود ہے۔ داغ کے بعد ان کو پڑھے لکھے لوگوں میں اچھی شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کا دیوان شعلۂ طور پچیس سال کے قریب ہوئے دیکھا تھا، مگر شعر ایک بھی یاد نہیں۔ بیگم اختر کی زبانی ریڈیو پر ایک غزل ان کی سنی تھی اس کا مطلع یاد رہ گیا ہے۔ ؎

کام آخر جذبۂ بے اختیار آ ہی گیا
دل کچھ اس صورت سے تڑپا اُن کو پیار آ ہی گیا

اب شوکت علی خاں فانی بدایونی جلوہ افروز ہوتے ہیں۔ یہ بی۔ اے۔ ایل۔ ایل۔ بی بھی ہیں۔ ان سے اُمید کی جاتی تھی کہ غزل کے دامن پر جو دھبے آ گئے تھے وہ صاف ہو جائیں گے اور کچھ دماغی آسودگی و مسرت کا سامان بہم پہنچے گا۔ مگر باوجود اُس روشن خیالی کے جو انگریزی تعلیم کی بدولت ان کو حاصل تھی انھوں نے ایک اندھیرے کمرے میں قدم رکھا۔ ایسے کمرے میں کہ جتنا یہ آگے بڑھتے گئے اندھیرا گہرا ہوتا گیا یہاں تک کہ سوا ظلمت و تاریکی کے کچھ نہ رہا۔ دنیا اور اُس کی جلوہ سامانیاں سب اسی میں

ڈوب گئیں۔ وکالت بھی دُنیا کی جیسی تھی وہ کیا اُبھرتی مگر معاش کے لیے اس کو قائم رکھنا اور اُبھارنا لازمی تھا۔ اس سے بے بیاری بس کی بات نہیں تھی۔ پہلے اپنے وطن میں پھر بریلی میں قسمت آزمائی کی مگر ڈھاک کے تین پات کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا۔ آخر حیدرآباد پہنچے۔ نظام حیدرآباد کی سرکار سے وابستہ ہوئے۔ مگر فنافی الشعر ہو چکے تھے۔ وہاں کی آب و ہوا بھی سازگار نہ ہوئی بے نیل مرام واپس آئے۔

ان کا کلام ان کی طبیعت کا آئینہ ہے۔ جو قنوطیت طبیعت میں سرایت کر چکی تھی وہی لفظ لفظ سے ٹپکتی ہے۔ ہاں فارسی ترکیبوں کی افراط ہے اور غالب کا تتبع ہے۔ راقم کی ملاقاتیں بھی ان سے رہیں۔ ان کا کلام بھی ان کی زبانی سنا۔ جیسا کلام تھا پڑھتے بھی خوب تھے مگر گاتے نہیں تھے۔ ان کا دیوان باقیات فانی شائع ہو چکا ہے۔ ان کی غزل عام فہم نہیں عام پسند نہیں پھر بھی ایک طرز خاص رکھتی ہے جو ابتذال سے پاک ہے۔ فانی سراپا غم تھے۔ ان کو ہنسی شاید عمر بھر نہیں آئی۔ صورت سے حسرت و یاس ٹپکتی تھی۔ زمانے نے ان کے کلام پر قنوطیت کا فتویٰ صادر کیا۔

مآلِ سوزِ غمہائے نہانی دیکھتے جاؤ
بھڑک اُٹھی ہے شمعِ زندگانی دیکھتے جاؤ
چلے بھی آؤ وہ ہے قبر فانی دیکھتے جاؤ
تم اپنے مرنے والے کی نشانی دیکھتے جاؤ
سُنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے
کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ
وہ اُٹھا شور ماتم آخری دیدار میت پر
اب اُٹھا چاہتی ہے لاش فانی دیکھتے جاؤ

کون اُٹھائے مری وفا کے ناز   دل ستم دوست وہ رقیب نواز

تو جانِ مدعائے دل اور دل جگہ جگہ
ہے ایک شمع رونقِ محفل جگہ جگہ

شوق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا
ساری اُمیدیں ٹوٹ گئیں دل بیٹھ گیا جی چھوٹ گیا
فصل گل آئی یا اجل آئی کیوں در زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آ پہنچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا
اُس نے عدو کا سوگ کیا یاں اُس سے وفا کی آس بندھی
رنگ تمنا رنگ حنا کی دیکھا دیکھی چھوٹ گیا

نہیں معلوم حضرت رقیب کا اُردو شاعری سے کب پیچھا چھوٹیگا اور وہ کب تشریف لے جائیں گے۔ انھوں نے غزل کا دامن بالکل سیاہ کر رکھا ہے۔ فانی کے دو شعر اور یاد آگئے سُن لیجیے۔

خوشی سے رنج کا بدلہ یہاں نہیں ملتا   وہ مل گئے تو ہمیں آسماں نہیں ملتا

دُنیا میری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مُفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

آخری شعر سے ان کی طبیعت کا رنگ آئینہ ہے۔



غزل

صدقی حیدرآبادی

کیا بتاؤں، ہے کس غضب کی بات؟
جب وہ کرتا ہے اپنے ڈھب کی بات

ہر ادا اُس کی ہے عجیب و غریب
اُس کی ہر بات ہے عجب کی بات

ہائے، کس مُنہ سے اور کب نکلے!
بیٹھے چُپ سُن رہا ہوں سب کی بات

لاکھ میں نے کُرید کی لیکن
دل سے لب تک نہ آئی ڈھب کی بات

ذکرِ وعدہ پہ یہ ہوا ارشاد
ہے کہاں کی، کدھر کی، کب کی بات؟

کُھل نہ جائے کہیں زباں میری
ہو جو ایسا تو ہے غضب کی بات

ذکرِ لطفِ قدیم اور اُس سے!
صبح جو بھول جائے شب کی بات

عمر بھر سر دُھنو اگر سُن لو
میرے کانوں سے اُس کے لب کی بات

کتنی بے جوڑ بات ہے، توبہ!
مُنہ مِرا اور اُس کے لب کی بات!

چُپ رہو بھی کہ بات رہ جائے
آپ کا مُنہ اور اُس کے لب کی بات

بات پر بات یاد آتی ہے
دہن اُس کا اور اُس کے لب کی بات

کوئی پہنچائے اُس مسیحا تک
بات اور مجھ سے جاں بلب کی بات

ذکر اُس کے دہن کا ہر لب پر
ہر زباں پر ہے اُس کے لب کی بات

دور پہنچی ہے، یہ نہ ہوتا، کاش!
رہتی مجھ تک ہی اُس کے لب کی بات

پھر سُنوں میں خدا کرے، صدقیؔ
اُس کے مُنہ سے اُسی کے لب کی بات

غزل

یادؔ دہلوی

صبحِ بہاراں یوں آئی ہے جادو سے تن جب ٹوٹا ہے
غنچہ و گل کی رنگینی کو دستِ صبا نے لوٹا ہے

گریۂ شب بھی زخمِ جگر کا کوئی مداوا کر نہ سکا
اوس کی بوندوں میں پھولوں کا رنگ بھلا کب چھوٹا ہے

نقشِ قدم پر پھول کھلے ہیں تب سے لیکن خار مٹی
راہِ طلب میں پائے جنوں کا آبلہ جب بھی پھوٹا ہے

آج کی اس بے حس دنیا میں غم کا ساتھی کوئی نہیں
سب کے چہرے نقلی ہیں اور سب کا تبسم جھوٹا ہے

شہرِ وفا میں اہلِ جنوں کو فرقِ وصال و ہجر نہیں
اُن کا تصور ساتھ رہا ہے اُس کا جو دامن چھوٹا ہے

اہلِ سخن میں اپنی غزل کے آج یہ کیوں کر چرچے ہیں
یادؔ کا اُن کی عکس پڑا ہے اُن سے جو رشتہ ٹوٹا ہے

تلسی داس کی رامائن

ڈاکٹر انصار اللہ نظر

لفظ بھاکا یا بھاشا کے متعلق بعض بزرگوں کی تحریر دیکھ یہ خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ برج بھاشا کے لیے مخصوص تھا لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہندستان کی کم و بیش سبھی مقامی بولیوں کیلیے یہ لفظ ایک مشترک نام کی حیثیت سے مستعمل رہا ہے۔ پروفیسر محمود خاں شیرانی نے لکھا ہے :

" بھاشا شاعری کی زبان تھی اور اس میں ہر ہندی شاعر عام اس سے کہ وہ اودھی ہو یا گجراتی، مالوی یا بہاری شعر لکھتا تھا مسلمانوں کے لیے جہاں فارسی شاعری اور ادب کی زبان تھی اسی طرح بھاشہ موسیقی اور شعر کی زبان تھی۔ اہل اسلام کی شعر دوستی نے بھاکا کی شاعری کو بہت کچھ تقویت دی ہے۔ انہی کے زمانے سے اس زبان میں شعر و ادب پیدا ہوتے ہیں گویا اہل اسلام کے پاس تین زبانیں تھیں اوّل فارسی جس میں وہ شعر و ادب، تاریخ و انشا لکھتے رہے، دوسری اردو جس کو اپنے ساتھ پنجاب سے لے کر گئے، تیسری بھاکا یا بھاشا جس میں موسیقی اور شعر لکھتے رہے " (پنجاب میں اردو ص ۱۳۶)

اس اقتباس سے درج ذیل امور سامنے آتے ہیں۔

۱۔ بھاشا یا بھاکا اردو سے مختلف کوئی زبان تھی، یہ کوئی ایسی زبان تھی جو برج، کھڑی، قنوجی وغیرہ سے الگ یا ان سب مرکب تھی اور ہر علاقے میں موسیقی اور شعر کی مشترکہ زبان تھی، ایسی کسی ایک مشترک زبان کے وجود کے لیے نہ کوئی قطعی ثبوت ملتا ہے اور نہ اس کا کوئی امکان ہی معلوم ہوتا ہے۔

۲۔ اردو اس زمانے میں بھی مستقل زبان کی حیثیت رکھتی تھی جب مسلمان ہندستان میں وارد ہوئے۔ یہ بات بھی حقیقت سے بعید ہے۔ مزید براں اگر اردو کی جداگانہ حیثیت بھی تسلیم کی جائے تو اقتباس بالا میں یہ نہ بتایا گیا کہ یہ زبان کس مقصد کے لیے استعمال میں آتی تھی اور مسلمان اس کو کب پنجاب سے لے کر گئے۔

۳۔ بھاشا میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے شعر و ادب نہ تھا۔ اردو کا بھی یہی حال تھا۔ پھر دونوں کی حیثیت میں کیا فرق تھا؟ کیا دونوں بول چال ہی کی زبانیں تھیں؟

حقیقت یہ ہے کہ جس زمانے کی لسانی کیفیت اس اقتباس میں زیر بحث ہے اس وقت اردو کی موجودہ صورت کے وجود میں آنے کا سوال ہی نہ تھا۔ البتہ " دیارِ مشرق " میں جہاں مسلمان شمالی ہند میں سب سے پہلے باقاعدہ طور پر سکونت پذیر ہو چکے تھے، اس زبان کے خد و خال سب سے پہلے ابھرے اور اس زبان کے اسی علاقے میں پہلے ادبی نقوش ملتے ہیں۔ پروفیسر شیرانی نے اس حقیقت کا ذکر اس طور پر کیا ہے :

" ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ بھاشا کے میدان میں مسلمانوں کے نام ہندو شعرا سے اقدم ہیں۔ ہندی کا بڑا شاعر کبیر ہے جو نویں صدی ہجری سے تعلق رکھتا ہے ہندو شعرا زیادہ تر دسویں صدی ہجری میں پیدا ہوتے ہیں " (پنجاب میں اردو ص ۱۴۳)

ہندستان کے اہلِ علم سنسکرت، پراکرت اور پھر زیادہ سے زیادہ اپ بھرنش کو علمی مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے۔ بھاشاؤں کی ان کے نزدیک کوئی علمی یا ادبی اہمیت نہ تھی۔ البتہ مسلمانوں کی مصلحتوں نے انھیں بھاشاؤں سے دلچسپی لینے پر مجبور کیا۔ عوام سے رابطے کے لیے اس سے بہتر کوئی صورت نہ تھی کہ ان کی بول چال کی زبان کو اختیار کیا جائے۔ چنانچہ شارح اکھروتی کا یہ بیان حقیقت پر مبنی ہے کہ :

"ہریکی از اولیا بدیں لسان تکلّم می فرمودند تا کہ عہد خلافت ایشاں با محقق لاثق دمراد از ملک محمد جائسی، رسید دوی دریں زبان بسیاری از مصنفات از رسائل و مطولات تصنیف فرمودہ"۔ (اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیا کا کام، ص...)

مسلمان بزرگوں کے اقوال کو قلمبند کرنے کا سلسلہ بھی اغلب ہے کہ ان کے یہاں یہ باقاعدہ قیام کے فوراً بعد شروع ہو گیا ہوگا اور اسی نے بالآخر تالیف و تصنیف کے سلسلہ کی صورت اختیار کر لی۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمان پنجاب کے راستے سے آئے تھے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ سیاسی اعتبار سے دلی مرکزی مقام تھا اور اسی سبب سیاسی استحکام کے ساتھ ساتھ اس شہر کو علما اور ادبا کے مرجع کی حیثیت بھی حاصل ہوئی لیکن ایک مدت تک اس علاقے میں جنگی معرکوں کا سلسلہ جاری رہا اور دہلی کی حیثیت "سیاسی چھاؤنی" کی رہی۔ اسی لیے یہاں کے مقابلے میں "پورب دیس" میں مسلمانوں کے زیر اثر جلد تر وہ زبان وجود میں آئی جس پر بالآخر اردو کی بنیاد قائم ہوئی۔

بھاشا یا بھاکا کی اصطلاح "پورب دیس" کی بولی کے لیے بھی استعمال میں آتی رہی ہے۔ خواجہ امیر خسرو نے بھی اودھی کی مستقل اور انفرادی حیثیت کو تسلیم کیا ہے۔ اس زبان کی بیشتر اہم تصانیف کے قدیم ترین مخطوطے فارسی رسم الخط میں دریافت ہوئے ہیں۔ مسلمان مصنفین نے اسی زبان کو سب سے پہلے اپنایا تھا چنانچہ کچھ ہی عرصے کے بعد اس زبان کو علمی اور ادبی حیثیت بھی حاصل ہو گئی۔ شارح اکھروتی نے ملک محمد جائسی کو "محقق اور مدقق" کہا ہے۔ زبان کی تحقیق و تدقیق کی گنجائش اسی صورت میں ہو سکتی تھی جب زبان کو علمی حیثیت حاصل ہو چکی ہو۔ پروفیسر محمد حسین آزاد نے جائسی کی "پدماوت" پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

"اس کی عبارت ہندی رکھی ہے اور ورق کے ورق الٹتے چلے جاؤ فارسی عربی کا لفظ نہیں ملتا، مطلب اس کا آج مسلمان ملک ہند کا بھی نہیں سمجھتا"۔

(آبِ حیات ص ۴۸)

عربی اور فارسی کے الفاظ سے اس حد تک شعوری طور پر اجتناب برتنا شاعر کی زبان پر حاکمانہ قدرت کے علاوہ خود زبان کی استعداد اور وسعت پر بھی دال ہے۔ یہ عادت کی زبان مصنف کی شعوری کوشش کے سبب پُرتکلف اور مصنوعی ہے۔ یہ علمی اور ادبی تصنیف کی زبان ضرور ہے لیکن اسے عوام کی بول چال کی زبان سمجھنا غلطی کا سبب ہو سکتا ہے۔ جائسی اور ان کے ہم مسلک لوگوں کی کوششوں سے زبان اور ادب جس سطح پر ترقی کر رہا تھا اس کے خلاف ردِّعمل کی صورت بھی جلد ہی پیدا ہوئی چنانچہ پروفیسر شیرانی نے اس کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے۔

"قطبن، ملک محمد جائسی اور شیخ عثمان غازیپوری نے عام مذاق تصنیفیں لکھ کر ہندی شاعری کو عالمگیر مقبولیت کی شاہراہ پر گامزن کر دیا تھا لیکن افسوس ہے کہ بعد کے آنے والے شعرا نے اس کو مذہبی رنگ میں رنگ دیا۔ تلسی داس اور سور داس نے زبان کو مذہبی تنگنائے میں محصور کر کے شری رام چندر اور شری کرشن کے لیے وقف کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہندی شاعری مذہب کی جکڑ بندیوں سے کبھی آزاد نہ ہو سکی"۔

(پنجاب میں اردو ص ۴۶)

جہاں تک مذہبی رنگ کا معاملہ ہے میرا خیال ہے کہ مسلمانوں نے مقامی بولی کو جس وقت اختیار کیا تھا اس وقت ان کا ایک مقصد بہرحال اس زبان کے ذریعے اپنے عقائد کی تبلیغ و ترویج تھا۔ اس لیے مذہبی رنگ تو قطبن، جائسی اور عثمان کے یہاں بھی ملتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے عقائد کو زیادہ پُرکشش اور قابلِ قبول

امداز میں پیش کرنا تھا۔ انھوں نے مقامی مصلحتوں اور ضرورتوں کو بھی پیش نظر رکھا۔ یوں ان کے یہاں فکر و نظر کی وسعت زیادہ تھی۔ ہندو علما کا مسئلہ اپنے مذہب اور اپنی قدروں کی حفاظت کا تھا۔ بیرونی اثرات سے بچاؤ کے لیے اپنے گرد حصار کھینچ لینا ناگزیر ہوتا ہے۔ اس حصار کو زیادہ مضبوط بنانے کے لیے خود اپنی بعض ایسی چیزوں کو ترک کرنا پڑتا ہے جن میں بیرونی اثرات کا کوئی شائبہ بھی معلوم ہو۔ چنانچہ تلسی داس وغیرہ کے یہاں اگر "جکڑ بندیوں" کا احساس ہوتا ہے تو یہ مذہب کے سبب نہیں بلکہ ان کے مخصوص حالات کے سبب تھا۔ ان کی ان تصانیف میں بھی یہ صورت ملے گی جو خالص مذہبی نہیں ہیں۔ پروفیسر مسعود حسین خاں نے جائسی اور تلسی داس کی زبان کو ایک ہی خانے میں رکھا ہے

"کبیر کی پوربی تلسی داس اور جائسی کی پوربی بولی سے مختلف ہے کبیر کے کلام میں کھڑی بولی، راجستھانی اور پنجابی تک کے اثرات جھلکتے ہیں۔"

(مقدمہ تاریخ زبان اردو ص ۱۴۵)

پروفیسر شیرانی بھی تلسی داس کی بولی کو کبیر کی زبان سے مختلف سمجھتے ہیں لیکن ان کے نزدیک فرق مختلف ہے :

"تلسی داس اور سور داس اگرچہ کبیر کے بہت بعد گزرے ہیں لیکن ان کا کلام اس قدر دقیق اور عالمانہ ہے کہ ہم اس کا اکثر حصہ سمجھنے سے قاصر ہیں لیکن کبیر کے ہاں یہ دقت محسوس نہیں ہوتی۔"

(پنجاب میں اردو ص ۱۷۹)

لیکن یہ دونوں ہی رائیں ایسی ہیں جن سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ کسی زبان میں اگر کسی دوسرے کے کسی قدر اثرات داخل ہو جائیں تو محض اتنی سی بات سے وہ زبان کچھ اور نہیں ہو جاتی۔ پھر کبیر کے یہاں راجستھانی اور پنجابی کے قابل ذکر حد تک اثرات پائے جانے میں بھی شک ہے۔ اسی طرح کسی شخص کا کلام اگر دقیق اور عالمانہ ہو تو اس سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ اس کی زبان بھی بدل گئی۔ کبیر اپنی زبان کو پوربی کہتے ہیں جائسی اور تلسی داس کی زبان بھی پوربی ہے۔ البتہ معمولی مقامی فرق ضرور ہے اور وہ اودھی اور بھوجپوری کے علاقوں سے متعلق ہونے کے سبب ہے۔

تلسی داس کا بہت بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے حالات کے بدلتے ہوئے رُخ کو اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ انھوں نے اس بات کو بخوبی سمجھ لیا تھا کہ اب ترقی پذیر اور زندہ زبان اودھی ہے اور اسی کو علمی اور ادبی حیثیت حاصل ہونا چاہیے۔ وہ ایک راسخ العقیدہ برہمن تھے۔ ان کے نزدیک وقت کی سب سے بڑی ضرورت یہی تھی کہ مذہبی روایات کو اس ترقی پذیر زبان میں منتقل کر دیں۔ اگر وہ اس ضرورت کو محسوس نہ کرتے تو کون کہہ سکتا ہے کہ سری رام چندر کے واقعات آج اسی طور پر عوام میں رائج رہتے جیسے کہ ہیں تلسی داس نے اپنے عقائد اور مذہبی روایات کو اپنے عہد کی ترقی پذیر عوامی زبان (اودھی) میں پیش کرنے پر اپنی صلاحیتوں کو صرف کیا تھا۔ اصولاً انھوں نے عربی اور فارسی لفظوں سے اپنے کلام کو محفوظ رکھنے کی بھی کم و بیش شعوری کوشش کی ہوگی۔ پھر وہ سنسکرت کے عالم بھی تھے۔ اس کے باوجود ان کی رامائن کی بابت پروفیسر محمد حسین آزاد نے لکھا ہے۔

"سترھویں صدی عیسوی میں بابا تلسی داس برہمن ضلع باندہ کے رہنے والے کہ پنڈت بھی تھے، شاعر بھی تھے، فقیر بھی تھے، انھوں نے رامائن کو بھاشا میں اس طرح ترجمہ کیا کہ وہ لاثانی کتاب مطبوع خاص و عام ہوئی۔ ان کے دوہروں میں بہت اور کتاب مذکور میں کہیں کہیں الفاظ فارسی عربی کے موجود ہیں۔"

(آب حیات)

رامائن میں عربی اور فارسی کے الفاظ کا ملنا اس حقیقت کے لیے کافی شہادت ہے کہ اس زمانے تک ان زبانوں کے اثرات اودھی میں اس حد تک راسخ ہو چکے تھے کہ ان کو حذف کرنا معمولاً ممکن نہ تھا۔ البتہ اتنی بات تھی کہ لفظوں کا تلفظ مقامی بول چال کے مطابق بدل گیا تھا۔ خ کی جگہ کھ، ذ کی اور ز وغیرہ کے مقام پر

ج، ش کی جگہ بیشتر س اور ق کے محل پر ک وغیرہ بولتے اور لکھتے تھے۔ مقامی الفاظ میں حروف ثقیلہ ٹ، ڈ، ڑ کے علاوہ بھ پھ تھ ٹھ وغیرہ کا استعمال بھی عام تھا۔ اودھی کے مسلمان مصنفین کے یہاں بھی ان آوازوں کا استعمال ملتا ہے۔ پروفیسر محمد حسین آزاد نے تلسی داس کا جو کلام بطور نمونے کے پیش کیا ہے، اس میں الفاظ باگ (باغ)، گریب (غریب)، کواجے (نوازے) اور کُلہ (کلاہ : ٹوپی) نظم ہوئے ہیں۔ پروفیسر آزاد نے راماین کی زبان کو "بھاشا" کہا ہے۔ میرے پیش نظر اس کتاب کا جو نسخہ ہے اس کے سرورق پر جو عبارت درج ہے اس میں بھی اس کی زبان "بھاکھا" ہی بتائی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں بھاکھا سے مراد اودھی بھاکھا ہے اسے برج بھاشا نہیں کہا جا سکتا۔ سرورق کی عبارت من و عن نقل کی جاتی ہے :[1]

ترجمہ راماین آسمبر کاش اردو
اجودھیا کانڈ سٹیک
یعنی
شری گوسوامی تلسی داس کرت شری راماین کا
ترجمہ اردو زبان میں
پنڈت لکھمی دت ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول میرٹھ ساکن
میرٹھ نے ہری بھگتوں کے شوق کے لیے اپنی بنائی ہوئی
تلسی کرت سٹیک راماین سے جو زبان بھاکھا میں تھی اردو میں ترجمہ کیا
رام پریس میرٹھ میں بہ شرکت رام ناتھ کے مکان پر چھپا

اس کتاب کے مطالعہ سے کئی نہایت دلچسپ امور سامنے آتے ہیں،

۱۔ انکار کے لیے بیشتر لفظ "جن" بہ کسرۂ اول آیا ہے [اعظم گڑھ وغیرہ میں یہ لفظ اب بھی اس معنی میں اکثر سنا گیا ہے[2]] لیکن ساتھ ہی اکثر "نہ" بھی نظم ہوا ہے اور انکار کے لیے فارسی میں بھی "نہ" ہی آتا ہے۔

۲۔ اعداد شمار میں ایک (اور یک بھی)، دو، چار (اور چہار بھی) آئے ہیں جو فارسی میں بھی ملتے ہیں۔

۳۔ حرف "کہ" (بمعنی جو) بھی جگہ جگہ آیا ہے بعض مقامات پر "یا" کے معنی میں بھی نظم ہوا ہے مثلاً

مثال دیہو اتر اس کہو کہ ناہیں

۴۔ اودھی کا عام قاعدہ ہے کہ قافیہ کے لفظ کی آخری حرکت کو اکثر طول دیتے ہیں، عربی اور فارسی کے لفظوں کے ساتھ بھی یہ صورت رائج رہی ہے، جیسا کہ ذیل کی مثالوں سے ظاہر ہے

ــہ گرن دھار تم اودھی جہاجو   چڑھے اوسکل پر یہ نیک سماجو
ــہ بھئی نرگھیر بجوپ دربارا   برنی نہ جائے بکھاو ایا را
ــہ جاسو رام سرت یک بارا   اترہیں نر بھو سندھو اپارا

فارسی میں اچھے کے معنی میں "نیک" آتا ہے۔ اودھی میں یہ لفظ یائے معروف کے ساتھ ملتا ہے۔

ــہ یہ کل ریتی رام کھنڈ نیکا   سبھی سہاے ہوہے سشی نیکا
مثل جو یا کبھی مت لاکھی ٹیکا

عربی میں رخصت کے معنی میں لفظ وداع آتا ہے اودھی میں "بدا" (مکسورالاول) کہتے ہیں۔ پھر اس سے "بدائی" اور "بدائگی" بھی بنا لیتے ہیں۔ اسی طرح فارسی کے مصدر تپیدن کے مشتقات بھی یہاں قدرے مختلف صورت سے ملتے ہیں۔ تپ کی جگہ تاپ اور پھر تپنا اور تاپنا اغلب ہے کہ اسی قبیل سے ہیں۔

۵۔ ضمائر کا معاملہ بھی توجہ طلب ہے۔ فارسی میں غائب کی ضمیریں "ایں"، "او"، "وے" ہیں، اودھی میں آخرالذکر دونوں اسی طور پر مستعمل ہیں۔ البتہ "ایں" کی جگہ "ای" (بہ حذف نون غنہ)

---

[1] یہ کتاب سید محترم صاحب مہرالٰہی کی عنایت سے مجھے دستیاب ہوئی، میں ان کا شکر گزار ہوں۔ (انصار الستار)
[2] اعظم گڑھ وغیرہ میں لفظ جن انکار کے معنی میں نہیں بلکہ روکنے اور منع کرنے کے موقع پر عوام استعمال کرتے ہیں مثلاً کھٹی چیز نہ کھاؤ، دھوپ میں مت جاؤ۔ ان مثالوں میں نہ اور مت کی بجائے جن کہیں گے۔ (ایڈیٹر)

آتا ہے لیکن ساتھ ہی ان تینوں کی جگہ 'یہ' اور 'وہ' بھی (واحد اور جمع دونوں صورتوں میں) مستعمل ہیں۔ اردو میں 'ای' 'او' 'وے' متروک ہوئے اور "یہ" اور "وہ" رہ گئے۔ یہ صورت حال بالخصوص توجہ طلب ہے۔ حاضر کی ضمیر "تو" فارسی اودھی اور اردو میں مشترک ہے۔

اودھی میں جو مختلف آوازیں رائج ہیں ان پر بھی توجہ کی ضرورت ہے۔ ڈ، ڈھ، ڑ، ڑھ کے متعلق بعض علما کا خیال ہے کہ یہ بعد کا ارتقا ہیں۔ بہرحال تلسی داس کی راماین میں یہ آوازیں ملتی ہیں

؎ چڑھ رتھ سیہ سہت دوا دبھائی چلے ہردے اودھی سترائی

؎ سن گوہ کہے بیک کہہ دوڈھا سہا کرہیا ہیں وڈھا

؎ تھوتہ نولی جیری بڈیا بنی جھاڑی سوالس کاری جنوسا بنی

اردو میں ہائے مخلوط کے ساتھ مختلف حروف انھیں آوازوں کے اظہار کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔

اودھی میں 'والا' کے معنی میں 'ہار' یا 'ہارا' کے لاحقہ کا استعمال بھی عموماً ملتا ہے' جیسے پالن ہار وغیرہ۔ اسی طرح 'موہے' بمعنی 'مجھ کو' بولتے ہیں۔ جمع کی صورت میں یہ 'ہے' بدل کر 'ہیں' ہو جاتا ہے

؎ جس کہے او موہے دوی روا ما مانگے او جو کچھ موہے سہاما

اودھی کے ضمائر میں بھی ان دونوں لاحقوں کا صرف ملتا ہے۔ مختلف ضمائر اس طرح ہیں

(الف) غائب کے لیے ۔ وہ، او، یہ، ای، وے، یے

ع بہامنی بیٹھے او دودھ کی ماکھی

؎ جیٹھ سوامی سیوک لگھو بھائی یہ دنکر کل ریتی سہائی

جے بے می پٹ دھر جبٹل سندر ستھی سو کمار

(ب) حاضر کے لیے ۔ روان، تو، تم ـــــ ان میں سے "روان" اب بھی اس علاقے کی بول چال میں رائج ہے لیکن اردو میں بالکل متروک ہے۔ یہاں اس موقع پر "آپ" کہتے ہیں البتہ آخرالذکر دونوں کی مختلف صورتیں مروج ہیں۔ قدیم اردو اور اودھی میں بھی 'تو' کے مقام پر لفظ 'تیں' کا استعمال اگرچہ ملتا ہے لیکن جدید اردو میں یہ متروک ہے:

؎ بن یرنی بکھوں رات کو بیسے کہوں رتو بے موہ لبس اپنے

؎ کدرو متھی دینہہ ۔ بکھ تھیں کر تلپیا دیو

ان مثالوں میں دوسری صورت میں "تم" کے ساتھ "ہیں" کے الحاق سے "تھیں" (معنی تم کو) وضع کیا گیا۔ اسی طرح "توہے" کا معاملہ ہے۔ اردو میں پہلی صورت یعنی "تھیں" تو مستعمل ہے لیکن "توہے" کا "تجھے" (= تجھے) کس طرح ہو گیا یہ نہیں کہا جا سکتا۔ ضمائر کی فاعلی صورت "ہار" اور "ہارا" کے الحاق سے مبنی ہے۔ چنانچہ 'تو' سے تو ہار یا تُہار اور تو ہارا یا تُہارا اور "تم" سے تمھار اور تمھارا بنتا ہے۔ اردو میں 'تو' کا استعمال اب کم ہو چلا ہے۔ چنانچہ تُہار یا تُہارا بھی متروک ہیں۔ البتہ تمہارا اور تمہارا میں ہائے ہوز کی آواز میم ماقبل سے مخلوط ہو کر تمھارا اور تمھارا ہو جاتا ہے۔ ان میں تمھار اب متروک ہے۔ اودھی میں یہ سب صورتیں بدستور رائج ہیں۔

ع ہیں تمھری سیوا لس راماو

؎ جو سں شرسم لاگ تمھارے کاہے نہ بولے ادیکن سنھارے

؎ جارے پرگ سبھاو ہمارا رن بھل دیکھ نہ جائے تمھارا

(ج) متکلم کے لیے ۔ میں، ہم آتے ہیں لیکن فاعلی اور مفعولی وغیرہ حالتوں میں 'میں' کی جگہ 'مو' لے لیتا ہے چنانچہ 'موہے' 'مورا' آتا ہے۔ 'مورا' کے متعلق خیال ہے کہ یہ "موہارا" کا مخفف "موہرا" ہے کثرت استعمال سے "توہرا" کی طرح اس میں بھی "ہائے ہوز" حذف ہو گیا اور "مورا" بروزن "تورا" رائج ہوا۔ مورا اور تورا دونوں میں الف آخر کے حذف کا رواج بھی ہے چنانچہ 'مور' اور 'تور' بھی مروج ہیں۔ جمع کی صورت میں "ہمہارا" (= ہم ہارا) میں دوسرا 'ہ' خفیف ہو کر حذف ہو جاتا ہے اور 'ہمارا' رہ جاتا ہے۔ یہاں بھی الف آخر کو حذف کرنے کا قاعدہ ہے چنانچہ 'ہمار' بھی آتا ہے۔ اردو میں 'مور' 'مورا'، 'ہمار' 'ہمرا' وغیرہ نہیں آتے البتہ "ہمارا" آتا ہے۔ واحد کی صورت میں "میرا" بولتے ہیں۔ اغلب ہے کہ یہاں 'میں' اودھی کی طرح 'مو' میں نہیں بدلتا چنانچہ

موا کی جگہ میرا ہی باقی رہتا ہے۔ اردو میں مورے کی جگہ مجھے آتا ہے اور یہ اس قاعدے کے مطابق ہے جس قاعدے کی رو سے توہے کا تجھے ہو جاتا ہے۔ جمع کے مقام پر "ہمیں" اودھی اور اردو دونوں میں مشترک ہے

مثلاً آج ہمیں بڑا اچرج لاگا

یہ امور اس لیے زیادہ توجہ طلب ہیں کہ زبانوں کے صحیح رشتے کو بتانے کے لیے ضمائر کی اہمیت کو متفقہ طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔

اضافت کے لیے اردو میں کا، کی، کے آتے ہیں۔ اودھی میں کی اور کے تو عام ہیں لیکن 'کا' کے مقام پہ قدیم اودھی میں 'کر' ملتا ہے۔

کی — مثلاً بہامنی بھئے اد دودھ کی ماکھی
کے — مثلاً لکھن رام کے بنو
کر — مثلاً راکھے رام جائے رکھو ہم سب کر ہت ہوے

چنانچہ ضمائر کے ساتھ بھی انھیں حروف کا استعمال ہوتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ اودھی میں ضمیر بیشتر اپنی اصلی حالت پر قائم رہتی ہے مثلاً "اوکر" (= اسکا)، اوکی (= اسکی) وغیرہ۔ لیکن اردو میں "وہ" اور "یہ"، اُس (مضموم الاول) اور اِس (مکسور الاول) کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

حرف عطف بھی اردو اور اودھی میں "اور" ہے۔ پنجابی اور دکنی میں یہ "ہور" ہو جاتا ہے

؎ سونین ہیں اور پیادے ہی پلے تسکر ساکھی لیے اور اہی کھاے
؎ شمع اور اشمع کرم انو ہاری دئے ایش کھل ہردے پکاری

اسی طرح "سے" کے لیے "تیں" اور "تے" بھی آتا ہے۔ اس حرف کی یہ دونوں صورتیں دکنی میں بھی پائی جاتی ہیں۔

؎ پراں تیں ادھک رام پریہ مورے تنکے تلک چھوٹھ کس تورے

حالت فاعلی کے لیے اردو میں "نے" کا التزام کیا جاتا ہے۔ اودھی میں اس کا استعمال کمتر ہے۔ البتہ پنجابی میں یہ حرف کبھی فاعل کے لیے اور کبھی مفعول کے لیے بھی آتا ہے۔ اودھی میں مفعول کے لیے یہ کبھی نہیں آتا اور اس لحاظ سے اردو اور اودھی زبانوں میں اشتراک کی صورت ہے — حرف 'نے' کے حذف کی مثال یہ ہے:

؎ میں سب کہیہ لو ہے سو پوچھے تلتے پہے او موریکا چھوپیچھے

اودھی میں 'کو' کے علاوہ اسی معنی میں حرف 'کا' بھی آتا ہے:

مثلاً دن پرلی دیکھوں رات کو سپنے
؎ سہو پران پتی بھاوت جی کا دیہو ایک بر بھر تہی ٹیکا

اور یہ "کا" پاریسے منسوب اس شعر میں بھی ہے جس کا پہلا مصرع اس طور پر بتایا گیا ہے

مثلاً سچ کا یہ ہوا یچ ہوس مانک موتی

ماہرین لسانیات کا اتفاق ہے کہ زبانوں کے رشتے متعین کرنے میں اعداد کو بھی خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اودھی اور اردو میں اعداد بہت حد تک ایک جیسے ہیں اور اس سے بھی ان دونوں زبانوں کا قریبی تعلق ظاہر ہے۔

ضمائر، حروف اور اعداد کے بعد سب سے زیادہ اہمیت افعال کو حاصل ہے عام طور پر خیال کیا گیا ہے کہ اودھی میں فعل کے آخر میں 'یا' کی بجائے 'وا' آتا ہے اور اس خیال کے سبب دونوں زبانوں میں فرق کیا گیا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اردو میں صرف ان مصادر کے ماضی کی علامت 'یا' ہے جن میں علامت مصدر 'نا' سے پہلے الف ہو جیسے آنا سے آیا، کھانا سے کھایا وغیرہ۔ اودھی میں ان مصادر کے ماضی میں 'وا' ہوتا ہے چنانچہ آوا اور کھاوا کہتے ہیں لیکن باقی تمام مصادر کے ماضی دونوں زبانوں میں مشترک ہیں۔ جیسے چلنا سے چلا، اٹھنا سے اٹھا، کھلنا سے کھلا، پڑھنا سے پڑھا، دیکھنا سے دیکھا وغیرہ۔ اس موقع پر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ماضی میں "یا" ہو یا "وا" دونوں صورتوں میں "آ" کی آواز مشترک ہے اس طرح دونوں زبانوں کے ماضی میں فرق بہت تھوڑا رہ جاتا ہے

زبان اردو کی اصلاح میں شیخ ناسخ اور ان کے تلامذہ نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے ان کے اعادہ کی اس موقع پر ضرورت نہیں۔ البتہ بعض امور کی طرف توجہ کرنا مفید ہو سکتا ہے۔ دیکھی

کلب حسین خاں نادر نے لکھا ہے :

"اکثر شعرا بٹھانا اور بیٹھانا بمعنی نشانیدن و بنشانیدن استعمال کرتے ہیں مگر میر رشک صاحب نے اس کو ترک کیا اور رہا ہے کہ بعد بائے عربی کے یائے حطی اور لفظ ثانی میں بعد بائے فارسی کے ہائے ہوز کا ہونا ضروری ہے۔" (تلخیص معلی)

تلسی داس نے ان دونوں لفظوں کا تلفظ وہی نظم کیا ہے جسے میر رشک نے بعد میں صحیح قرار دیا :

مثل سہت سیہ کھٹ بیٹھاری

مثل کھائے پہرے راج بٹھائے

"پہرنا" مصدر اردو میں "پہننا" ہو جاتا ہے اور اس کا ماضی قدیم اودھی میں "پہرا" اور اردو میں "پہنا" ہے جیسا کہ "پہنایا" کے مقابلے میں "پہنایا" قابل ترجیح ہے۔

محمد حسین آزاد نے دہلی اور لکھنؤ کی زبان کا محاکمہ کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

"شیخ صاحب اور خواجہ حیدر علی آتش کے کمال نے لکھنؤ کو دلی کی قید دیاری سے آزاد کر کے استقلال کی سند دی اور وہی مستند ہوئی۔ اب جو چاہیں کہیں، ہم نہیں روک سکتے چنانچہ شیخ ناسخ صاحب فرماتے ہیں

مثل چاندنی تام ہے تبریز کی اندھیاری کا

اگر دلی میں نیچے سے ڈیڑھے تک اندھیری رات کہتے ہیں مگر لکھنؤ والوں کو ٹوکنے کا منہ نہیں"۔ (آب حیات)

یہ لفظ بھی تلسی داس نے اسی طور پر نظم کیا ہے چنانچہ اودھ کی بول چال یہی ہے :

لاگت اودھ بھیانک بھاری مانھو کال راتی اندھیاری

آزاد نے رشک تلمیذ ناسخ کی اصلاحات زبان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"زمانے تھے یہاں، وہاں یعنی جاں نہ ہو مردن جہاں ہو"۔ (آب حیات)

یہ الفاظ بھی اصلاً اودھی ہیں۔ "ہاں" جگہ کے معنی میں آتا ہے چنانچہ داہاں، یاہاں، جاہاں اسی لاحقہ کی مدد سے وضع کیے گئے۔ الف کشیدہ خفیف ہو کر وہاں، یہاں، جہاں رہ گیا۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب نے سایہ کے معنی میں چھانو (چھاوں) کو صحیح اور "چھانہہ" کو غلط کہا ہے۔ اودھ کی بول چال میں یہ لفظ "چھانہہ" ہی ہے۔ چنانچہ تلسی داس کہتے ہیں۔

چھانہہ کرہیں گھن بیدھ کن برکھیں سمن سہاہیں

تلسی داس کی رامائن کی اہمیت مسلم ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ یہ کتاب ایک سے زاید بار فارسی رسم خط میں شائع ہو چکی ہے لیکن بنیادی طور پر اعلیٰ ہے کہ یہ دیوناگری رسم خط میں لکھی گئی تھی۔ بہر حال میری اس جسارت کے بعد امید ہے کہ ایسے اہل علم حضرات بھی اس کتاب کی طرف متوجہ ہوں گے جو اس کام کے واقعی اہل ہیں یقین ہے کہ ان کی توجہ سے زبان اردو کے بارے میں بہتر اور صحیح تر معلومات سامنے آئیں گی۔



یہ سرزمین وطن

خورشید افسر

جواں کیا ہے اسے مدبھری ہواؤں نے
بھری ہے مانگ بھی فطرت کی اپسراؤں نے
بڑی لگن سے سنوارا ہے دیوتاؤں نے
یہ مسجد دل کی ادائیں، یہ مندروں کے بھجن
یہ سرزمینِ وطن، یہ سرزمینِ وطن

کبھی ہواؤں کے جھونکوں میں برف کی للکار
ثمر فشاں کبھی موسم، کبھی فضا گلنار
کبھی جواں بگولے، کبھی حسین پھوار
کئی رُتوں نے بنایا ہے اس کو مل کے دلھن
یہ سرزمینِ وطن، یہ سرزمینِ وطن

کبھی یہ گوتم و نانک کو جنم دیتی ہے
کبھی یہ سرمد و چشتی کو گود لیتی ہے
یہی تو گاندھی و ٹیگور کی جیتی ہے
دیا ہے نذرل و حالی نے خراج سخن
یہ سرزمینِ وطن، یہ سرزمینِ وطن

یہ سرخ قلعۂ دلی، یہ حسنِ تاج محل
یہ الورا، یہ اجنتا، یہ شالیمار، یہ ڈل
اودھ کی شام، بنارس کی صبح سب کا بدل
جو نرم نرم ادائیں تو سرخ سرخ بدن
یہ سرزمینِ وطن، یہ سرزمینِ وطن

یہ سحرکاریِ رانجھی، یہ حسنِ نینی تال
یہاں ہے شوخیِ پنجاب و جادوئے بنگال
یہ ہیر اور یہ رانجھا، یہ سوہنی مہینوال
یہ رام و شیام کی دھرتی یہ پیار کا آنگن
یہ سرزمینِ وطن، یہ سرزمینِ وطن

یہاں سبھی کے لیے ہے بہار کا پیغام
گلے ملو کہ ہے یہ اس دیار کا پیغام
اک ایک لہر سناتی ہے پیار کا پیغام
مچل مچل کے گلے مل رہے ہیں گنگ و جمن
یہ سرزمینِ وطن، یہ سرزمینِ وطن

غزل

سراج احمد رہبر جونپوری

رنجوں کا انبار سجائے دنیا کی پرخاش لیے
گھوم رہے ہیں اپنے سر پر ہم غم کا آکاش لیے

ہر لمحہ ہے کتنا زریں پوچھو ہم معماروں سے
وہ کیا جانیں وقت کی قیمت جو بیٹھے ہیں تاش لیے

جس آپے پر ناز ہے تم کو خاک میں وہ مل جائے گا
جب پہنچیں گے ہم دیوانے اپنا حالِ فاش لیے

توڑ دو لے کر عزم کا تیشہ راہ کی ان چٹانوں کو
بیٹھے کیوں روتے ہو یارو تم قسمت کی لاش لیے

جس منزل پر لوگ پہنچ کر خود منزل بن جاتے ہیں
اُس منزل تک تم بھی آتے رہبر ہم کو کاش لیے

افسانہ

فیملی فرینڈ

رام لعل

مسز پربھا سرن اپنے بچے کو اسکول سے لانے کے لیے جلدی جلدی تیار ہوئی۔ تین بج چکے تھے۔ اس کی ساڑھے تین بجے چھٹی ہو جاتی تھی۔ اسکول بس کے خراب ہو جانے کی ہی وجہ سے اسے خود جانا پڑ رہا تھا۔ گزشتہ روز منٹی اسکول سے واپس آیا تھا تو اس کی ایک کاپی میں اس کی ٹیچر نے لکھ بھیجا تھا — "کل سے اسکول کی بس ورکشاپ میں اوور ہالنگ کے لیے بھیجی جا رہی ہے۔ مہربانی کر کے دو دن کے لیے اپنے بچے کو خود ہی اسکول تک پہنچانے اور یہاں سے لے جانے کا انتظام کر لیں۔"

آج صبح وہ خود ہی منٹی کو وہاں چھوڑ آئی تھی۔ اس کا پتی چندر سرن دہلی سے باہر تھا۔ ورنہ وہ خود ہی یہ سب کرتا۔ صبح دفتر جانے سے پہلے منٹی کو اپنی اسکوٹر پر بٹھا کر لے جاتا اور سہ پہر میں دفتر سے شارٹ لیو (SHORT LEAVE) لے کر پھر اس کے اسکول پہنچ جاتا۔ مسز سرن اسکوٹر چلانا نہیں جانتی تھی ورنہ اسے اتنی دقت ہرگز نہیں اٹھانا پڑتی۔ کپڑے بدل کر وہ باہر نکل آئی۔ سڑک پر اچانک تیز دھوپ کا احساس ہوا تو اس نے پرس میں سے کالا چشمہ نکال کر آنکھوں پر لگا لیا۔ سخت گرمی کی وجہ سے ترشے ہوئے بال پسینے سے بھیگ بھیگ جاتے ہیں۔ گردن پر چپکنے لگتے ہیں۔ اسی لیے اس نے اپنے بالوں کو گردن کے پیچھے ایک کلپ کے ذریعے اکٹھا کر لیا تھا۔

اس نے اِدھر اُدھر ٹیکسی کے لیے دیکھا۔ بس اسٹاپ بھی اگرچہ زیادہ دور نہیں تھا، لیکن اس کا کیا بھروسہ کہ بس فوراً مل ہی جائے گی۔ کبھی کبھی تو فوراً مل جاتی ہے۔ انتظار بھی نہیں کرنا پڑتا لیکن کبھی کبھی بہت زیادہ انتظار کرنا پڑتا ہے۔ آج تو وہ کوئی چانس نہیں لے سکتی۔ دیر ہو گئی تو منٹی بے چارہ اسکول کے گیٹ پر کھڑا کھڑا پریشان ہو جائے گا۔ اسے رُیا کر روہانسا ہو اٹھے گا۔ سات سال کا ہی تو ہے! اس کے ہم جماعت لڑکے اور لڑکیاں اپنے اپنے گارجین کے ساتھ چل دیں گے تو اس کا من یقیناً دکھی ہو اٹھے گا۔

مسز سرن کو کوئی بھی ٹیکسی آتی ہوئی دکھائی نہ دی تو وہ خود گھبرا اٹھی۔ بس اسٹاپ کی طرف بڑھ گئی۔ کچھ تو ملے اسکول تک پہنچنے کے لیے! بڑی تیزی سے آتی ہوئی دو تین کاریں اس کے قریب پہنچ کر دھیمی ہو گئیں۔ شاید کار والے یہ توقع کر بیٹھے کہ وہ ان سے لفٹ کے لیے کہے گی! لیکن اس نے منہ پھیر لیا۔ وہ لفٹ چاہتی ہی نہیں ہے کیا معلوم کون شریف صورت آدمی اچانک اپنے سنجیدہ وجود میں سے باہر نکل کر اس کا ہاتھ پکڑ لے! مرد کی فطرت کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ عورت کو وہ عام طور پر ایک ہی نظر سے دیکھتا ہے۔ عورت صرف ایک عورت ہے۔ راحت کا ذریعہ ہے، اگر دلکش بھی ہے تو پھر تو کہنا ہی کیا!
اس نے دور سے آتی ہوئی ایک خالی ٹیکسی کو دیکھ کر رکنے

کے لیے ہاتھ اٹھا دیا لیکن ڈرائیور نے کوئی توجہ ہی نہیں دی۔ سیدھا دیکھتا ہوا نکلا چلا گیا

"کرُوئل!" (CRUEL) اس کی زبان سے بے اختیار نکل گیا۔ غیر مرد مہرباں ہونے پر اتر آئے تب بھی وہ ظالم ایسا نہ کرے تب بھی وہ ظالم ہی کہلانے کا حق دار ہوسکتا ہے! مسز پربھا سرن کو اپنی حماقت پر بس لمحہ بھر کے لیے ہی کڑھن ہوئی۔ اس کے بعد وہ ایک اور ٹیکسی کی طرف متوجہ ہوگئی لیکن وہ بھی اسی طرح نکلی ہی چلی گئی۔ دراصل اس میں ایک سواری موجود تھی۔ دور سے دکھائی نہیں دی تھی۔

اس نے سمجھ لیا وہ وقت پر منٹی کے اسکول تک نہیں پہنچ سکتی ہے۔ اب یہ کسی بھی طرح ممکن نہیں رہا۔ بس اسٹاپ بھی خالی ہے۔ دور دور تک کسی بس کی جھلک دکھائی نہیں دیتی لیکن اچانک اس نے سڑک کے پار ایک آدمی کو اپنی طرف ہاتھ لہراتے ہوئے دیکھ لیا۔ وہ جلدی سے اسکوٹر گھما کر اسی کے پاس آنے کے لیے اشارہ کر رہا تھا۔ اسے پہچان کر وہ حیران سی رہ گئی۔ لمحہ بھر کے لیے ہی۔ پھر لمحہ بھر کے لیے وہ خوش بھی نظر آئی لیکن ساتھ ساتھ اس کا دل بھی ڈوبنے لگا (یہ تو ہری ہے! کہاں سے ٹپک پڑا؟)

اگلے چند لمحوں میں تیس بتیس برس کا ایک خوبصورت خوش پوش آدمی اس کے بالکل پاس اپنی اسکوٹر روک کر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ اس نے جلدی سے آنکھوں پر سے اپنا دھوپ کا چشمہ بھی چھین سا لیا۔ جیسے وہ اسے اپنی ننگی آنکھوں سے اور بھی واضح طور پر دیکھ لینا چاہتا ہو!

"کہاں جانا ہے مسز سرن آپ کو؟"

"اوہ!" مسز سرن نے خود کو متوازن کرنے میں بس دو تین ہی لمحے لیے۔ پھر وہ بولی ــــ "جی مجھے منٹی کے اسکول تک ہی جانا ہے۔ آج اسکول بس آؤٹ آف آرڈر ہے۔ سوا تین بج چکے ہیں۔ وہ میرا انتظار ہی کر رہا ہوگا! لیکن بس یا ٹیکسی کچھ بھی تو نہیں مل رہی ہے!"

"تو آیئے۔ میں پہنچا دیتا ہوں!"

(یہ تو تم نے ٹھیک ہی کہا ہے! میں واقعی اس طرح وہاں فوراً پہنچ جاؤں گی!) لیکن وہ کچھ پس و پیش میں پڑ گئی بولی "جی نہیں۔ آپ کو بے کار تکلیف کیوں دوں؟ پتہ نہیں آپ کیسے ضروری کام سے جا رہے تھے۔ ابھی جاؤں گی۔ کوئی نہ کوئی کنوینس (CONVEYANCE) مل ہی جائے گی۔ تھینک یو!"

(بھگوان کے لیے اب یہاں سے چل ہی دو نا!) وہ من ہی من میں منانے لگی۔)

"مجھے کوئی بھی ضروری کام نہیں ہے اس وقت۔ ہوتا تب بھی کوئی بات نہیں تھی۔ بلکہ آپ کہیں تو میں ہی جا کر منٹی کو لے آؤں۔ آپ گھر جایئے؟"

(اوہ! یہ آدمی آج میرے گھر ہی آکر رہے گا! منٹی کو پہنچا دینے کا اسے بہانہ مل رہا ہے نا!) وہ کھڑی سوچتی رہ گئی۔ فوراً کوئی جواب نہیں بن پڑا۔

"منٹی اسی ٹائنی ٹاٹس اسکول میں پڑھتا ہے نا؟ گول مارکٹ کے پاس!" ہری نے پھر سے آنکھوں پر چشمہ لگا کر اسے گھورا اور مسکرانے لگا۔ اسکوٹر بھی اسٹارٹ کرتا رہا۔ پاؤں مار مار کر۔

"اچھا تو چلیے۔ آپ کے ساتھ ہی چلتی ہوں میں۔ آپ کو پھر سے اتنی دور سے لوٹنے کی تکلیف کیوں دوں؟"

(یہی اچھا ہوگا! تھوڑی دور تک ہری کا ساتھ برداشت کر ہی لوں گی۔ گھر پر بلا کر تو نہ صرف گھنٹے بھر تک اس کی نظروں کے سامنے بیٹھے رہنا ہوگا بلکہ دو دن بعد ان کے سامنے بھی جواب دہ ہونا پڑے گا! پھر وہ کئی روز تک روٹھے روٹھے پھریں گے!)

بعض لمحے ایسے جذباتی حادثے سے ہمکنار ہو جاتے ہیں جن کا اثر فوراً محسوس ہونے لگتا ہے۔ ہری کے پیچھے اسکوٹر پر بیٹھتے ہی مسز سرن کو احساس ہو گیا کہ دھوپ میں جلتی ہوئی کول تار کی یہ سڑک ایک سیاہ ناگن بن کر اس کی آئندہ زندگی کے گرد لپٹتی جا رہی ہے۔ دراصل اسے اچانک ایسے آدمی جیسے ایک اور خوبصورت اور پورے مرد کے مضبوط کندھے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا پڑ گیا ہے۔ اس کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں ہے۔ ان

لمحوں میں اس آدمی کا سہارا نہ لے تو کہیں بھی ہلکا سا جھٹکا کھا کر وہ گر پڑے گی، لیکن وہ اپنا ہاتھ جلتا ہوا سا محسوس کرنے لگی (اف! اس آدمی کے بدن میں کتنی آگ ہے!)

"سرن کہاں ہوگا اس وقت؟ اپنے آفس ہی میں نا!"

(اب اسے اسے بتانا ہی پڑے گا سب کچھ) ہوں ——

"جی وہ ایک ضروری کام سے امرتسر گئے ہیں!"

"اچھا! کب لوٹیں گے؟"

"دو روز بعد!"

"بہت دنوں سے وہ ملا نہیں مجھ سے!"

(اس کا سبب تو میں بھی جانتی ہوں اور تم بھی! ہم اب ملنے کے لیے عرصے تک کیوں نہیں مل پاتے!)

بہت تیز رفتار سے جاتی ہوئی اسکوٹر کی وجہ سے بہت سے الفاظ اڑ اڑ جاتے انھیں جھپٹنا پڑتا اور جواب دینے کے لیے اسے اونچا بھی بولنا پڑتا۔ دو ایک بار اس نے جان بوجھ کر خاموشی اختیار کر لی۔ کوئی جواب ہی نہ دیا۔ (یہی ٹھیک ہے۔ سڑک پر جاتے ہوئے کون گلا پھاڑ کر چلاتا ہوا جائے! اور پیچھے سے اس کی گردن سے ایسا کان سٹا کر سنے!) لیکن خاموش رہ کر بھی وہ دزدیدہ نگاہوں سے اس کی گھنے سیاہ بالوں سے ڈھکی ہوئی گردن کو دیکھنے سے خود کو باز نہ رکھ سکی۔

ایک واقعہ یہ بھی تھا کہ چندر دو سال پہلے اچانک اپنے بہت ہی قریبی دوست کو اپنے سے الگ کرنے لگا تھا۔ وہ ان کے گھر آجاتا تو بظاہر تو چندر اس کے ساتھ بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آتا، لیکن اس کے کچھ رویے ایسے بھی تھے جن سے صاف ظاہر ہوتا کہ وہ اسے دور کر دینا چاہتا ہے۔ جب وہ اس کی کسی پیشکش کو قبول نہ کرتا۔ کوئی بہانہ بنانے لگتا۔ جہاں تک ممکن ہوتا اسے وہ اپنے یہاں بلانے سے گریز ہی کرتا۔ اس کی پسند کی کبھی تعریف نہ کرتا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر اختلاف کر کے بات کو بڑھا دیتا جس سے ایک ناخوش گواری فضا بھی پیدا ہو جاتی۔ دوست چلا جاتا تو وہ اس کی برائیاں کرنے بیٹھ جاتا۔ چندر کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی کہ پربھا بھی اس کے ساتھ اتفاق ضرور کرے۔ وہ ایسا نہ کرتی تو چندر اس سے خفا ہو جاتا۔ پربھا کو بہت حیرانی ہوتی۔ شادی کے موقعے پر تو چندر نے اپنے دوست کا تعارف یہ کہہ کر کرایا تھا کہ "میرا سب سے اچھا اور ہمدرد فرینڈ بیری ہی ہے۔" اس کے بعد کئی سال تک وہ بیری کی ویسی ہی قدر کرنے کے لیے اسے مجبور کرتا رہا جیسی قدر وہ خود اس کی کرتا تھا۔ یہ صحیح تھا کہ بیری نے ہر موقعے پر ان کی مدد کی تھی۔ مدد کے حدود نہیں ہوتے۔ جب کوئی پورے خلوص سے اپنے دونوں ہاتھ بڑھا دیتا ہے تو ان کے گھیرے میں کیا کچھ نہیں سمٹ کر آجاتا!

پربھا کو پرائیویٹ بی۔ اے کرتے وقت اکنومکس میں چند نمبروں کی سخت ضرورت پڑ گئی تھی۔ ورنہ وہ پاس نہیں ہو سکتی تھی۔ اس وقت بیری نے ہی یونیورسٹی کے کارپردازوں کو درخواست دے کر اس کے نمبروں کی دوبارہ جانچ کرا دی تھی۔ پھر جب اس کے سامنے ایک آفس میں سروس کا مسئلہ آ کھڑا ہوا تھا، وہاں بھی بیری کی ہی سفارش کام آئی تھی، اگرچہ بعد میں منّی کی پیدائش کے بعد اس نے سروس کو خیرباد ہی کہہ دیا۔ جب چندر کے والد گزر گئے تھے اس وقت چندر دہلی میں نہیں تھا۔ اس کی غیر حاضری میں ساری ذمے داری بیری نے ہی نبھائی تھی۔ ایک بار چندر کا تبادلہ دہلی سے باہر ایک اور شہر میں کر دیا گیا تھا۔ چندر وہاں نہیں جانا چاہتا تھا اس تبادلے کو منسوخ کرانے والا بھی بیری تھا۔ اس کے بغیر یہ کام ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ کوئی کوئی خاندان ایسا ہوتا ہے جہاں صرف دوست ہی زیادہ اہم سمجھے جاتے ہیں، رشتے داروں کی اہمیت بالکل نہیں ہوتی۔ اس کے پتی کا خاندان بھی اسی قسم کا تھا۔ اس خاندان میں کون کون سے دور یا نزدیک کے رشتے دار ہیں، پربھا کو کبھی کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ اسے تو لگتا تھا یہ خاندان، خاندان کے صحیح معنوں پر پورا ہی نہیں اترتا ہے۔ یہ تو صرف دو چار ہی افراد پر مشتمل ایک چھوٹا سا گھر ہے جہاں اس کے پتی کے صرف دوست ہی دوست دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ واجبی

قسم کے دوست۔ کچھ اچھی قسم کے دوست کچھ بہت اچھی قسم کے دوست۔ لیکن اس کا سب سے اچھا اور قریبی دوست وہی تھا۔ لیکن دھیا بیری جیسے نہ جانے کیوں اس کا پتی رفتہ رفتہ الگ ہی کر دینے پر تُل گیا تھا۔ لیکن پربھا کو یہ جان لینے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ اس کے پتی کے یہاں درحقیقت کون سا جذبہ کام کر رہا ہے۔ چندر کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ اپنے دوست سے جس قدر محبت کرتا ہے، اس میں اس کی بیوی بھی حصہ دار بن رہی ہے۔ وہ بھی اسے اسی قدر پسند کرنے لگی ہے۔ مسز پربھا جانتی تھی یہ سراسر غلط ہے۔ وہ اپنے پتی کی وجہ سے ہی اس کی عزت کرتی ہے۔ چندر سرن جس قدر اپنے دوست کو چاہتا ہے اسے دیکھ کر اگر پربھا نے حسد یا جیلسی (JEALOUSY) کا رویہ اپنا لیا ہوتا تو شاید چندر اسے کبھی برداشت نہ کر سکا ہوتا۔ جس طرح عام طور پر اپنے دوستوں سے محبت کرنے والے پتی اپنی بیویوں کے اس طرح کے رویے پر برا مان جاتے ہیں۔ اس نے بیری کے تئیں حسد کا جذبہ نہ اپنا کر اپنے پتی کو محض خوش کرنے کے لیے ہی اس کی ہمیشہ تعریف کی تو چندر خود ہی حسد کا شکار ہو گیا۔ عورتیں بعض معاملوں میں مردوں سے کہیں زیادہ فراخ دل ہوتی ہیں وہ اپنے گھریلو سکوں کی خاطر اپنے پتی کی تمام کمزوریوں کو معاف کر سکتی ہیں۔ اپنے من کو سمجھا سکتی ہیں اسی ماحول میں رہنا خوشی قبول کر سکتی ہیں جو ان کے لیے ان کے آدمی ساکر دیتے ہیں۔ وہ بھی ایسا کیوں نہ کرتی!۔

جن دنوں بیری اپنے لیے کسی لڑکی کا انتخاب کر لینا چاہتا تھا اس میں وہ پربھا اور چندر دونوں کی رائے لے لینا چاہتا تھا۔ انھیں بھی لڑکی دکھا کر۔ چندر نے ہی اس کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ اسی لیے پربھا کو بھی مجبوراً لاتعلق بننا پڑا تھا۔ من سے تو وہ یہاں تک چاہتی تھی۔ بیری جیسے برسرِ روزگار، خوبصورت اور سوشل نوجوان کے سامنے اپنی چھوٹی بہن سروجا ہی کا نام تجویز کر دے جو خوبصورت اور تعلیم یافتہ بھی تھی۔ ہر لحاظ سے بیری کے لیے موزوں تھی لیکن وہ اپنے پتی کے عجیب و غریب رویے کی ہی وجہ سے ایسا نہ کر سکی۔ جب بیری کی شادی ہو گئی تو اس میں صرف چندر ہی جا کر شریک ہوا اپنے ساتھ پربھا کو لے کر نہیں گیا تھا وہ۔ شادی کے بعد چندر نے اپنے دوست اور اس کی بیوی کو اپنے یہاں مدعو کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔ یہ بھی اس کے پتی کی ایک غیر شریفانہ حرکت تھی جس پر وہ دل میں بہت کڑھی۔ پھر ایک روز اچانک بیری اپنی بیوی کو ساتھ لے کر ان کے یہاں چلا آیا۔ ویسے تو پربھا اور چندر دونوں نے ہی ندامت سی محسوس کی لیکن اس کے پتی نے فوراً ہی اپنے اس احساس پر قابو پا لیا۔ جب کہ وہ ایسا نہ کر سکی۔

اب تو بیری کو بھی صاف صاف دکھائی دینے لگا تھا کہ چندر اس سے کھنچتا جا رہا ہے۔ اس پر بھی اس نے کبھی بُرا نہیں مانا۔ خود ہی آکر کبھی کبھی مل لیتا تھا۔ چندر نے بیری کی جگہ پُر کرنے کے لیے کئی اور دوستوں کو قریب کر لیا تھا۔ پربھا دیکھتی رہتی تھی۔ یہ گھر دوستوں کے ہی کندھوں پر کھڑا ہے۔ دوست ہی ستون بن کر اسے سہارا دیے ہوئے ہیں۔ یہ سب نہ ہوں تو اس گھر کے اندر ایک ناقابلِ برداشت قسم کا سناٹا بھر جائے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہی تھی کہ بیری کے سوا اور کوئی بھی شخص اپنی جھولی میں پُرخلوص اور بے لوث قہقہے بھر کر اس گھر میں نہیں آیا۔ وہی سب کو ہنسایا کرتا تھا۔ وہی اپنے اخلاق سے سب کا من بھی موہ لیا کرتا تھا۔ دوسرے جتنے بھی دوست آئے اپنی کوئی نہ کوئی غرض ہی لے کر آئے۔ جب پوری نہ ہو سکی تو گلہ شکوہ کر کے الگ ہوتے چلے گئے۔

اپنے پتی کی دیکھا دیکھی پربھا سرن نے بھی ایک فیملی فرینڈ بنانے کی جرأت کی تھی۔ ان کے گھر کے سامنے دو ادھیڑ عمر میاں بیوی رہتے تھے۔ مرد کسی ایسے دفتر میں ملازم تھا جہاں اسے دوپہر کے بعد پوری چھٹی ہو جاتی تھی۔ اس کی بیوی روزانہ لنچ کے بعد پربھا سے اخبار مانگ کر لے جاتی تھی۔ پربھا نے کبھی انکار نہ کیا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اپنے آدمی کے لیے ہی اخبار لے جاتی ہے۔ وہ خود اخبار کا خرچ برداشت نہیں کر سکتا یا اس نے ابھی تک ایسا کرنے کی عادت ہی نہیں ڈالی ہے۔ اس آدمی کو وہ شکل و صورت سے انتہائی نیک، ہمدرد اور قابلِ رحم سمجھتی۔ اس نے

سوچا کیوں نہ اس آدمی کو وہ اپنے گھر کے قریب تر کرلے۔ وقت بے وقت کام بھی آئے گا۔ اس کی عورت تو اس کے قریب تھی ہی۔ دن میں ایک دو بار ضرور اس سے ملنے کے لیے آجاتی تھی۔ گھنٹہ دو گھنٹے پاس بیٹھ کر اپنی اور دنیا جہان کی کتھا سُناجاتی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اس کے کام کاج میں بھی ہاتھ بٹاتی رہتی، جو بھی کام اس وقت اس کے ہاتھ میں ہوتا۔ وہ ترکاری چھیل رہی ہوتی تو اسی کو اپنی طرف سرکالیتی۔ پربھا کوئی کپڑا سی رہی ہوتی تو وہ اس سے مشین لے کر خود ہی سینے بیٹھ جاتی۔ سلائی کڑھائی کے کام میں وہ خاصی ماہر تھی۔ جن دنوں اس کا منٹی پیدا ہونے والا تھا، وہی عورت اس کی سب سے بڑی مددگار ثابت ہوئی تھی۔ تجربہ کار عورتوں کی طرح اس نے پربھا کو ساری اونچ نیچ ذہن نشین کرادی اس کے ساتھ اسپتال بھی پہنچی۔ ڈیلیوری کے وقت بھی وہ اس کے ساتھ تھی۔ ایسی عورت کے آدمی کی وہ عزت کیوں نہ کرتی؟ اسے جب معلوم ہوگیا کہ وہ مطالعے کا بے حد شوقین ہے تو وہ اس کے گھر روزانہ اخبار کے علاوہ کئی رسالے اور کتابیں بھی بھجوانے لگی۔ اس کے گھر میں ایسی چیزوں کی کمی نہیں تھی۔ چندر اور وہ دونوں ہی کتابوں اور رسالوں کے شوقین تھے۔ اس کے علاوہ بھی وہ اکثر کھانے پینے کی چیزیں بھی ان کے ہاں بھجوانے لگی۔ جو بھی خاص چیز وہ گھر پر تیار کرتی مثلاً سموسے، آئس کریم، گاجر کا حلوہ وغیرہ، اس کے لیے ضرور بھیجتی۔ پھر رفتہ رفتہ پربھا نے اس آدمی کو اپنے گھر پر بلانا شروع کر دیا۔ کبھی کسی کام کے بہانے سے کبھی کبھی خاص طور پر چائے پر ہی مدعو کرلیتی۔ چندر بھی اس سے مل کر بے حد خوش ہوا۔ اس کے آنے جانے پر وہ کبھی بھی معترض نہ ہوا۔ وہ آدمی اگرچہ بے حد باتونی نکلا اپنی بیوی سے بھی زیادہ۔ وہ ان کے منٹی سے یوں کہ بہت محبت کرتا تھا، اسی لیے اس کی زیادہ بولنے کی عادت کو پربھا نے نظرانداز ہی کر دیا۔ لیکن کچھ عرصے بعد اچانک وہ اس آدمی سے بےاعتنائی برتنے لگی۔ اسے اچانک احساس ہوگیا کہ وہ آدمی چپکے چپکے اس سے محبت کر رہا ہے۔ اس کی طرف بڑے جذبے سے تاکتا ہے اور سر جھکا لیتا ہے۔ اپنے مکان کی کھڑکی میں سے پردے کے پیچھے کھڑا ہو کر اکثر اسے گھورا کرتا ہے۔ پہلے تو پربھا من ہی من میں خوب ہنسی۔ یہ آدمی کتنا عجیب نکلا! لیکن پھر ایک روز اس نے اس آدمی کو ایک اور چوری کرتے ہوئے بھی پکڑ لیا۔ وہ ان کے ڈرائنگ روم میں سے ایک فریم میں رکھی ہوئی اس کی فوٹو نکال کر لیے جا رہا تھا۔ پربھا نے ہاتھ بڑھا کر اس سے اپنی فوٹو واپس لے لی اور اس کی طرف بڑی خفگی سے دیکھا۔ بس اتنا ہی کیا تھا اس نے۔ وہ آدمی اتنے ہی سے بے حد شرمندہ ہوگیا۔ اس کے بعد اس نے پربھا کی طرف دیکھنے کی کبھی جرأت نہ کی۔ اُن کے گھر آنا بھی چھوڑ دیا۔ اپنا الگ اخبار بھی منگوانے لگا۔ یہ دیکھ کر پربھا نے اطمینان کی سانس لی۔ چلو بہت سستے میں جان چھوٹ گئی! اپنے پتی کو اس نے جب یہ واقعہ سُنایا تو وہ بھی خوب ہنسا اگرچہ وہ اس آدمی کے ساتھ پہلے کی طرح بڑی مہربانی سے ہی پیش آتا رہا۔

مسز پربھا سنہا بیری کے ساتھ اسکول پہنچی تو منٹی کو اس نے سچ مچ گیٹ کے سامنے ہی اپنی کتابوں کے بکس پر بیٹھا ہوا پایا۔ روتی سی صورت ہلے جیسا کہ اس کا اندازہ تھا۔ گرمی کی شدت سے اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ وہ بھاگ کر اس کے پاس گئی اور اسے اپنے سینے سے چپٹا لیا۔ بڑے پیار سے اسے بتلانے لگی —— "مجھے ٹیکسی نہیں مل سکی منٹی! اسی لیے دیر ہوگئی۔ پھر یہ تمہارے انکل آ گئے۔ انھوں نے ہی میری مدد کر دی اور میں تمہارے پاس فوراً پہنچ گئی!"

منٹی ماں کے گلے میں باہیں ڈالے بیری کو گھورنے لگا جو ابھی تک اپنی اسکوٹر پر بیٹھا اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

اس وقت اگر منٹی کا باپ یہاں ہوتا تو وہ بھی اپنے بچے کی طرف ایسی ہی محبت بھری مسکراہٹ سے دیکھتا۔ کسی کسی مسکراہٹ میں زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ چاہے وہ باپ کی ہو یا باپ کے کسی

دوست کی۔

"ہیلو منٹی!"

بیری کا اشارہ پاکر منٹی اس کے ساتھ ہاتھ ملانے کے لیے آگے بڑھ گیا تو پربھا بہت خوش ہوئی۔ منٹی سے بولی ـــ "دیکھو بیٹے! اپنے انکل کو اب تھینک یو بھی کہہ دو، کیوں کہ انھوں نے تجھے تمھارے پاس بھیجا ہے نا!"

"تھینک یو انکل!" بے حد شرمیلے اور دھیمے لہجے میں اس نے بیری کا شکریہ ادا کیا۔

"اور انکل سے اب یہ بھی کہو آپ اب جائیے۔ میں اپنی ممی کے ساتھ گھر چلا جاؤں گا۔"

منٹی نے وہی بات بڑی معصومیت سے دہرا دی تو پربھا بھی کہہ اٹھی ـــ "آپ کا شکریہ کیسے ادا کروں؟"

"اس طرح کہ آپ دونوں اب میرے ساتھ کسی ریسٹورنٹ میں چلیے۔ منٹی کو بہت پیاس لگ رہی ہے شاید! اسے وہاں کچھ کھلایا پلایا جائے! کیوں منٹی؟"

بیری نے براہ راست منٹی کو مخاطب ہوکر امناسب سمجھا "چلو گے نا میرے ساتھ آئس کریم کھانے؟"

مسز سرن نے جلدی سے اپنی ساڑی کے پلو سے ہی منٹی کا چہرہ پونچھتے ہوئے کہا ـــ "آپ تکلیف نہ کیجیے، دیر ہو جائے گی۔ اب آپ جائیں!"

"نہیں نہیں! مجھے بالکل دیر نہیں ہوگی۔ وہاں جاکر بیٹھیں گے وہیں سے میں اپنے آفس کو فون کرلوں گا۔ آئیے۔ بیٹھ جائیے پیچھے۔ منٹی بیٹے، تم آگے آجاؤ۔ یہاں کھڑے ہو جاؤ۔ اپنا تھیلا ممی کو دیدو"

منٹی جیسے یہی چاہتا تھا جھٹ سے تھیلا اس نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ آگے بیری کی ٹانگوں کے درمیان کھڑا ہوگیا۔ پربھا کے لیے اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا۔ اسے بھی اسکوٹر پر پیچھے بیٹھنا پڑا۔ پہلے کی طرح بیری کا کندھے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا اب اسے وہ کندھا پتھر سے بھی زیادہ سخت لگا۔

چبھتا ہوا سا تھی۔ حد سے بڑھا ہوا خلوص کبھی کبھی ایسا ہی محسوس ہونے لگتا ہے۔

اسکوٹر چل پڑا تو منٹی نے بڑے مسرور لہجے میں پوچھا:

"انکل، ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"آئس کریم کھانے۔ کھاؤ گے نا؟"

"کھاؤں گا!" اس نے بڑے اوتھکار سے کہا۔

"اور کیا کیا کھاؤ گے؟"

"جو بھی کھلائیں گے آپ!"

بیری نے اس کے سر پر بڑے پیار سے بوسہ دیدیا۔ کہا ـــ "میرے ساتھ دوستی کروگے تو بہت سی چیزیں کھلاؤں گا سمجھے؟"

"اچھا تو آپ کی اور میری دوستی پکی! ہاتھ ملاؤں؟"

"ارے نہیں۔ ابھی نہیں! جب اسکوٹر سے اتریں گے تب ہاتھ ملائیں گے۔ بڑے زور سے۔ ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے انکل!" وہ کھل کھلاکر ہنس بھی پڑا۔

دیکھتے ہی کتنی جلدی دوستی کرنے پر آمادہ ہوگیا ہے! معلوم ہوتا ہے اسے یہ خاصیت اپنے باپ سے ورثے میں ملی ہے! پربھا من ہی من میں کچھ خوش ہوئی کچھ پریشان تھی!

کناٹ پلیس میں ایک ایرکنڈیشنڈ ریسٹوراں کے سامنے پہنچ کر بیری نے اسکوٹر روک لی۔ منٹی نے اترتے ہی پہلے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ "انکل اب ہاتھ ملائیے پہلے دوستی کریں!"

ہاتھ ملاکر دوستی کا اقرار کرنے کا طریقہ اسے اس کے ڈیڈی نے ہی سکھا رکھا تھا۔ پربھا نے اپنے ننھے سے بچے کو ایک پورے مرد کے سے رویے کے ساتھ بیری کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مارتے ہوئے دیکھا، اور پھر دونوں کو آگے آگے ہنستے ہوئے اندر جاتے ہوئے۔ پربھا کو یاد آیا کہ اسی ریسٹوران میں وہ، چندر اور بیری بیسیوں بار آچکے ہیں۔ کافی عرصہ پہلے۔ یہاں انھوں نے کتنی دعوتیں اڑائی ہیں۔ ہنستے ہنستے، ایک دوسرے سے جرمانے کے طور پر وصول کی گئی دعوتیں۔ جرمانہ کسی بھی غلطی کی بنا پر کر لیا جاتا تھا۔ معمولی سے معمولی غلطی پر بھی۔ دراصل جرمانہ



وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی ۹ مئی ۷۳ء کو الموڑہ میں ایک جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے



وزیر اعلیٰ اتر پردیش شریمتی کملا پتی
ترپاٹھی ۵ مئی ۷۳ء کو لکھنؤ میں
راج رشی پرشوتم داس ٹنڈن
ہندی بھون کا افتتاح کرتے ہوئے



وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی، ۲ مئی سنہ ۷۳ء کو الموڑہ میں ترقی سیمینار کو خطاب کرتے ہوئے



نیپال کے وزیر اعظم شری کرتی ندھی بسٹ ۲ مئی سنہ ۷۲ء کو پنت نگر (نینی تال) یونیورسٹی دیکھنے تشریف لائے تصویر میں موصوف ایک ترقی یافتہ چقندر کا معائنہ کرتے ہوئے



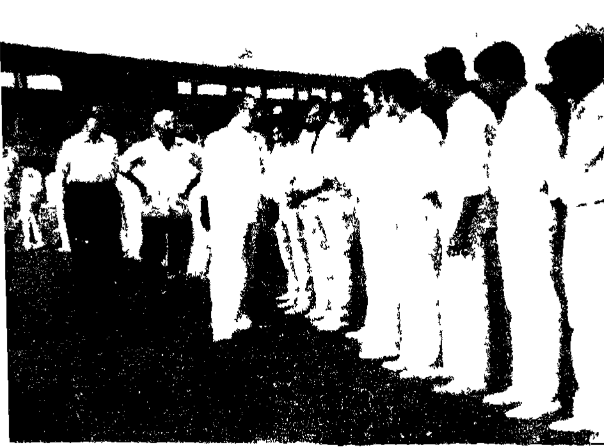
وزیر اعلیٰ شری کملاپتی ترپاٹھی جنگ میں
کام آنے والے سورماؤں کے خاندانوں
کے لیے لکھنؤ میں تعمیر کیے جانے والے "شہید دھام"
کا ۲ مئی سنہ ۷۲ء کو افتتاح کرتے ہوئے



وزیر اعلیٰ ۲ مئی سنہ ۷۲ء کو لکھنؤ کے شہید دھام
کے ایک کوارٹر کے قبضے کا اجازت نامہ ایک
شہید کی بیوہ کو سونپتے ہوئے



اتر پردیش تنخواہ کمیشن کی نشست ۱۱ مئی
سنہ ۷۲ء کو تلک ہال کونسل ہاؤس لکھنؤ
میں ہوئی۔ کمیشن کے ممبران آپس میں
صلاح مشورہ کرتے ہیں



اسپورٹس کے وزیر سری احیت پرتاپ سنگھ
۱۰ اپریل ۸۲ء کو لکھنؤ میں ہونے والے تیسرے آل
انڈیا کرکٹ ٹورنامنٹ کا افتتاح کر رہے ہیں



سیمی فائنل کا ایک منظر جس میں روسی مودی
ٹیم کے روہن گمر جی کو حیدر آباد ٹیم کے عبد الحئی
نے بولڈ آؤٹ کر دیا



فائنل میچ حبیب بلیکس لائٹ الہ آباد اور
روسی مودی الیون ناگپور کے درمیان ہوا جس
میں روسی مودی کو تیسرے سال بھی کامیابی
ہوئی۔ تصویر میں سلیم درانی (حبیب بلیکس) کے
عارف بالنگ پر صاف بولڈ آؤٹ ہونے
کا منظر

کرنے کے لیے غلطیاں تلاش کی جاتی تھیں یا خود ہی جرمانہ ادا کرنے کیسے کوئی غلطی کرلی جاتی تھی۔

پربھا سرن نے قہقہوں سے بھرے ہوئے اور قلمی گانوں سے نہتے ہوئے ریسٹوران کے اندر پہنچ کر اچانک خود کو اداس محسوس کیا۔ میں خوش کیوں نہیں ہوں؟ یہ سارے لوگ، مرد اور عورتیں کس قدر مسرور ہیں! ایک دوسرے کی طرف کتنی محبت سے تاک رہے ہیں!

وہ ابھی میز کے سامنے جاکر بیٹھی ہی تھی کہ منٹو اور بیری دونوں اپنی جگہ سے اٹھ کر آئس کریم کے بڑے ریفریجریٹر کے پاس جاکھڑے ہوئے۔ بیری کے کہنے پر بیرے نے ریفریجریٹر کا ڈھکن اٹھا دیا اور منٹو اپنی پسند کی آئس کریم دیکھنے لگا۔ پربھا سرن بیری کی پشت پر سے اپنی نظریں نہ ہٹا سکی۔ اسے ایسا لگا منٹو کا ڈیڈی وہی ہو۔ اس کا آدمی بھی وہی ہو لیکن یہ سوچ کر وہ کانپ کانپ بھی گئی۔ اس کا جی چاہا جلدی سے اٹھ کر وہاں سے چل دے۔ انھیں بتائے بغیر ہی لیکن وہ ایسا نہ کرسکی۔

وہ دونوں اپنے ہاتھوں میں آئس کریم کے دو دو کپ لیے ہوئے واپس آگئے۔ سارے کپ اس کے سامنے پھیلا کر رکھ دیے۔ منٹو نے اپنی نیکر کی جیبوں میں سے بون بون کی دو ڈبیاں بھی نکال کر اسے دکھائیں اور کہا ــــ "ممی! انکل کتنے اچھے ہیں!"

بیری نے مسکرا کر پربھا کی طرف دیکھا لیکن وہ اس سے آنکھیں نہ ملا سکی۔ بس گھبرائی گھبرائی سی اپنے بیٹے کے خوش و خرم چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ منٹو نے پھر کہا۔

"انکل اچھے ہیں نا ممی!"

پربھا کو مجبوراً سر ہلا کر کہنا ہی پڑا۔ "ہاں ہاں بہت اچھے ہیں۔ بہت ہی اچھے! لیکن اب تم جلدی سے یہ سب کھا لو۔ پھر گھر چلیں گے!"

"یہ سب میں تھوڑی کھا پاؤں گا،" منٹو نے حیرت سے قدرے چیخ کر کہا۔

بیری نے دو کپ اس کے سامنے بھی سرکا دیے۔

"یہ دو آپ کے لیے ہیں مسز سرن! اور یہ دو میرے۔ اور یہ ہمارے منٹو کے! کیوں؟"

(اس نے ہمارے منٹو، اتنی آسانی سے کیسے کہہ دیا ہے؟ جیسے سچ مچ ایسا ہی ہو!) پربھا نے فوراً احتجاج کرنا چاہا لیکن وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی ــــ "میں صرف ایک ہی کپ لوں گی۔ بس!" ــــ اور دوسرا کپ اس نے بیری کے سامنے واپس رکھ دیا۔

"لیجیے لیجیے ما بہت زیادہ نہیں ہے۔ دیکھیے ہم بھی تو دو کھائیں گے۔ کیوں منٹو!"

"ہاں اور نہیں تو کیا؟" منٹو نے فوراً اس کی تائید کردی۔

منٹو کو بیری کے اس قدر قریب ہوتا دیکھ کر پربھا کو ایک اور خطرے کا احساس ہوا۔ وہ بیری کو پھر سے پہلی سی بے تکلفی کے ساتھ گھر میں آنے کے لیے حوصلہ دیدیگا۔ چندر اس بات کو کبھی پسند نہیں کرے گا۔ کہیں ایسا نہ ہو ان دونوں میں کبھی جھگڑا ہو جائے! ایسی نوبت آسکتی ہے۔ وہ اپنے پتی کا مزاج جانتی ہے۔ خود تو اس نے ایسا کبھی نہیں چاہا کہ بیری کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جائے۔ اسی لمحے میں وہ اپنے دل میں بیری کے لیے ایک بے حد نرم گوشہ محسوس کرکے کانپ بھی گئی۔ (یہ محبت ہے! یہ محبت ہے!! یہ محبت ہے!!!) کوئی چپکے چپکے جیسے دستک دے دے کر اسے یہ احساس دلانے لگا۔ اس سے وہ انکار نہ کرسکی۔ سر جھکا کر سوچنے لگی۔ دھیرے دھیرے آئس کریم بھی کھاتی رہی۔ بہت دیر تک اس نے سر اٹھا کر بیری کی طرف نہ دیکھا۔ اس کی صرف آواز ہی سنتی رہی۔ منٹو کو وہ کیسی کیسی دلچسپ باتیں سنا سنا کر ہنسا رہا ہے!

"اپنی آنٹی سے ملو گے؟ تمہارے ساتھ وہ بھی دوستی کرنا پسند کرے گی!"

"کیا آنٹی بہت سندر ہے؟"

"ہاں بہت سندر!"

"میری ممی کی طرح؟"

یہ سن کر بیری مسکرا دیا اور پربھا سرن کی طرف دیکھنے لگا۔ بڑے غور سے۔ پربھا گھبرا گئی۔ پھر اس نے بیری کو کہتے ہوئے سنا۔ "ہاں بالکل تمھاری ممی کی طرح!"

منٹی بولا ـــــ "میرے ڈیڈی تو ممی سے بہت پیار کرتے ہیں۔ کیا آپ بھی آنٹی سے بہت پیار کرتے ہیں؟"

بیری ہنستے ہنستے دوہرا ہو گیا۔ اپنے دونوں ہاتھوں میں منٹی کا چہرہ بھر کر بولا ـــــ "ہاں بہت۔ وہ ہے ہی اتنی اچھی!"

پربھا کو اچانک ایک صدمہ سا ہوا۔ اس کا جی پھر چاہا اٹھا وہ وہاں سے اٹھ کر باہر چلی جائے۔ (جس آدمی کو میں نے ہمیشہ اپنے گھر کے قریب تر دیکھنے کی آرزو کی ہے اسی سے یک بیک دور ہو جانے کی خواہش اس قدر تیز کیوں ہو گئی ہے؟) اس نے ڈرتے ڈرتے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے قریب بیٹھی ہوئی ایک خوبصورت اور جوان عورت کے وجود سے بالکل بے پروا ہو کر ایک ننھے اور معصوم بچے کے سامنے اپنی بیوی کی تعریف کرنے میں لگا ہوا ہے۔ وہ کیسے کپڑے پہنتی ہے، کیا کھاتی ہے، کیا پیتی ہے! اس کے شوق، اس کی پسند و ناپسند! اس اثنا میں بیری نے ایک بار بھی اس کی طرف نہ دیکھا۔ اسے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ اس کی باتوں کا پربھا پر کس قسم کا ردعمل ہو رہا ہے! وہ کیسی کیسی سوچوں میں کھو گئی ہے!

پربھا کو اس کے چہرے پر ایک عجیب سی معصومیت دکھائی دی۔ وہی معصومیت اور خوشی اور حیرت جو منٹی کے چہرے پر نمایاں تھی۔ وہ اسے جلانے کے لیے ہی یہ سب نہیں کہہ رہا ہے۔ وہ تو اپنی ہی خوشیوں میں کھویا ہوا ہے، بے حد مسرور ہے، بے حد مطمئن ہے۔ لیکن پربھا کے اندر صدمے کا احساس بڑھتا ہی گیا۔ اس کے چہرے پر بے چینی اور گھبراہٹ اور زیادہ نمایاں ہوتی گئی۔ (میں اپنے آپ سے اب جھوٹ کیسے بول سکتی ہوں! میں ہی اس سے محبت کرتی ہوں! میں ہی اس سے خوف بھی کھاتی ہوں! اسے تو کچھ احساس بھی نہیں ہے!)

اس نے اچانک ایک فیصلہ کر لیا۔ آئس کریم کا پہلا کپ ختم کر کے اس نے اپنے آپ ہی دوسرا کپ بھی اپنے آگے سرکا لیا۔ بولی ـــــ "آپ کو یاد ہے ایک مرتبہ آپ نے میرے پتی کا ٹرانسفر کینسل کرانے میں بڑی مدد کی تھی؟"

"ہاں خوب یاد ہے۔ کیا سرن کا پھر کہیں تبادلہ ہو گیا ہے؟ اس بار بھی رکوا دوں گا۔ میرے ہوتے ہوئے انھیں یہاں سے باہر کون بھیج سکتا ہے!" بیری نے بڑے غرور سے کہہ ڈالا۔

پربھا نے آئس کریم کا ایک بھرپور چمچ نکالا، پورا منھ کھول کر اندر ڈالا پھر اس کی ساری ٹھنڈک کو دھیرے دھیرے رگ و پے میں محسوس کرتی ہوئی بولی ـــــ

"ان کا ٹرانسفر ابھی تو کہیں نہیں ہوا ہے، لیکن میں چاہتی ہوں کہیں نہ کہیں فوراً ہو جائے۔ اِدھر دہرہ دون، آگرہ، لکھنؤ ـــــ کہیں بھی! اب یہاں میرا من نہیں لگتا ہے۔ بس اس کام میں میری مدد کر دیجیے۔ انھیں معلوم بھی نہ ہونے پائے۔ کینسل کر دینے کے لیے وہ آپ سے کہیں تو آپ انکار کر دیجیے گا!"

بیری ہکا بکا سا بیٹھا رہ گیا۔ اس کی سمجھ میں جیسے کچھ نہ آ سکا۔ پربھا جلدی جلدی آئس کریم ختم کر کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بولی "آپ کا بڑا آبھار مانوں گی۔ یہ کام صرف آپ ہی کرا سکتے ہیں!"




مصنف

کلام انیس میں تغزل

سعی حسن نقوی

انیس نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی لیکن بہت جلد اپنے والد میر خلیق کے مشورے سے جو خود ایک اچھے مرثیہ گو ہونے کے ساتھ ایک اچھے غزل گو بھی تھے، غزل ترک کرکے مرثیہ کا میدان اختیار کر لیا[1] اور اسی کے ہو کر رہ گئے۔ اسکے بعد انھوں نے اپنی طبیعت کی تمام رنگینیاں اور جولانیاں مرثیے پر صرف کر دیں اور نتیجے میں مرثیے کا، اور اسی کے ساتھ مرثیہ گو شاعر کا، درجہ اتنا بلند کر دیا کہ لوگ "بگڑا شاعر مرثیہ گو" کہنا بھول گئے، بلکہ مرثیہ گو شاعر کو "اصلی شاعر" تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے۔[2]

چنانچہ انیس مرثیہ گو شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں، لیکن انھوں نے سلام بھی کہے اور رباعیاں بھی کہیں۔ سلام بہ اعتبار ہیئت، اگر اس میں سے مدحیہ اور مذہبی اشعار کو نکال دیا جائے تو مکمل و مستقل غزل ہوتا ہے اور رباعی میں بھی تغزل کا رنگ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ان کے مرثیوں میں بھی تغزل رچا ہوا ہے جس کی مرثیے میں کوئی گنجائش نہیں تھی بقول پروفیسر مسعود حسن رضوی اس وقت غزل کا مذاق عام طور پر دلوں میں ایسا بس گیا تھا کہ مرثیوں میں بھی تغزل کا محل پیدا کر لیا گیا۔[3] ایسا کرکے انیس نے وقت کے تقاضوں کو پورا کیا، اور اگر وہ ایسا نہ کرتے تو شاید مرثیے کو وہ مقبولیت حاصل نہیں ہو سکتی تھی جو اُسے حاصل ہوئی اور جو آج تک حاصل ہے۔ غالب مومن کے اس شعر کے بدلے —

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا   جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اپنا پورا دیوان مومن کو دینے کے لیے تیار ہو گئے تھے۔[4] انیس کے مرثیوں میں بے شمار مقامات ایسے ملتے ہیں جن پر غزل گویوں کے دیوان نثار کیے جا سکتے ہیں۔ انیس کا تغزل، خواہ سلام میں، رباعی میں، یا مرثیے میں، قریب قریب اُن تمام خصوصیات کا حامل ہے جو غزل گو شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔

---

[1] محمد حسین آزاد نے آب حیات میں ایک روایت نقل کی ہے (ص۵۵۵) کہ میر انیس ایک مرتبہ مشاعرے میں گئے اور غزل پڑھی۔ اس کی بڑی تعریف ہوئی تعقیب باپ دل میں خوش ہوا مگر تجاہل کے طور پر بیٹے سے پوچھا "رات کہاں گئے تھے؟" سعادتمند بیٹے نے باپ کو سارا ماجرا کہہ سنایا۔ اسکے بعد باپ نے بیٹے سے کہا "اب اس غزل کو سلام کرو۔" اس فقرہ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس غزل کو سلام بنا دو۔ دوسرا یہ کہ غزل کہنا چھوڑ دو۔ سعادتمند بیٹے نے دونوں باتوں پر عمل کیا۔ [2] انیس مرثیے کے مقابلے میں صنف غزل کو پست سمجھتے تھے۔ میر مہدی احسن نے واقعاتِ انیس میں ایک روایت نقل کی ہے (ص۹۷) کہ ایک مجلس میں میر انیس کے بڑے فرزند میر نفیس مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ سامعین میں کاملین شامل تھے۔ میر انیس منبر کے پیچھے بیٹھے ہوئے بیٹے کے شاعرانہ مضامین کی داد دے رہے تھے۔ مجلس کے ایک گوشہ میں چند شعرا نے آپس میں سرگوشیاں شروع کر دیں۔ میر انیس کو شبہ ہوا کہ کلام پر نکتہ چینی ہو رہی ہے۔ آداب مجلس کی یہ توہین ان سے برداشت نہ ہوئی اور وہ عصا ٹیک کر نصف قد سے کھڑے ہو گئے اور ان لوگوں سے فرمایا "یہ گیارہ شعر کی غزل نہیں جس میں کنگھی چوٹی کا ذکر کرکے دل خوش کر لیتے ہو۔ اس میدان میں شاعر قدم رکھے تو کلیجہ خون ہو کر بہ جاتا ہے"۔ اس کے بعد بیٹے سے کہا کہ مرثیہ پڑھنا بند کر دیں۔ اس ڈانٹ پھٹکار پر اہل مجلس کی زبانیں بند ہو گئیں۔ بڑی خوشامد درآمد کے بعد میر انیس راضی ہو گئے اور بیٹے کو مرثیہ پڑھنے کی اجازت دی۔ [3] مسعود حسن رضوی "انیس بحیثیت غزل گو" آجکل جون ۱۹۷۱ء [4] ملاحظہ ہو 'یادگار غالب' از مولانا حالی، ص۔

مثلاً معشوق کا سراپا، تصوف، اخلاق و حکمت، ضرب المثل، آفاقی حقیقت، قلندری، بے ثباتی دنیا، شاعرانہ تعلّی وغیرہ وغیرہ۔

غزل کے ارتقا میں بنیادی عاشقانہ شاعری کی ہے۔ عام غزل گو شعرا کا معشوق دو قسم کا ہوتا ہے۔ مجازی اور حقیقی۔ جب معشوق مجازی ہوتا ہے تو اس کا سراپا محض ہیئت کذائی اختیار کر لیتا ہے۔ غزل گو شعرا اپنے معشوق کی آنکھوں کو نرگس و بادام سے، ابرو کو کمان سے، مژگاں کو تیر سے، رخسار کو گلاب سے، دانتوں کو موتیوں سے، لبوں کو برگ گل سے، دہن کو غنچہ سے، گردن کو صراحی سے، کمر کو عدم سے تشبیہ دیتے ہیں[1]۔

محبوب انیس بھی رکھتے ہیں، لیکن ان کے "محبوب" کا تصور عام غزل گو شعرا کے محبوب کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ ان کے محبوب کی اخلاقی حیثیت اور جمالیاتی مجازی ہے۔ وہ اپنے حسینوں کو دیکھ کر درود پڑھواتے ہیں۔ پڑھے درود نہ کیوں دیکھ کر حسینوں کو — خیال صنعت صانع ہے پاک بینوں کو

کر سکے نام تو پڑھئے، جوان، لڑکے، بچّے سب ان کے محبوب ہیں اور ان سب کی تعریف انیس اس والہانہ انداز میں کرتے ہیں کہ غزل گو شعرا کے تمام مجازی محبوب پست اور ہیچ نظر آنے لگتے ہیں۔ انیس کے یہاں لڑکے حبیب ابن مظاہر کے ابرو کماں ہیں اور مژگاں تیر۔ ان کی آنکھوں پر غزالان حرم قرباں ہوتے ہیں۔ ان کی ضیائے رخ سے خورشید سے افزوں ہے اور ... لب ایسے کہ یاقوت بھی کٹ جائے شرم سے۔ عباس کا سراپا وہ اس طرح نظم کرتے ہیں

جلوے ہیں کیونکر نہ دکھائیں سحر و شام — ہے حسن کی آتش سے مصوّر کا رخ گلفام

خال اور خط سبزہ دار ہے تو یہ دام — ہے سب دل عالم کی اسیری کا سرانجام

بینی کو جو دیکھو کہ عجب شوکت و شاں ہے

یہ حسن علمدار کے لشکر کا نشاں ہے

... جوانوں میں علی اکبر کا سراپا نظم کرنے میں کس قدر نادر تشبیہوں سے کام لیا ہے

لب ہیں یا ہیں ماہ نہ نکلے ہوا کے — رخسار ہیں کہ پھول کھلے ہیں گلاب کے

———

سُلی نہیں جسم ... سینہ کے حجاب میں — پنہاں ہے روئے حضرت یوسف نقاب میں

یا ایک دوسری جگہ علی اکبر کا سراپا اس طرح نظم کیا ہے:

چہرہ کو اگر صبح کہیں زلف کو گر رات — ان دونوں سے حسن فلک سے کر لی ہے سوغات

دنیا میں سدا سامنے ہے دونوں کے رات — ہے صبح میں خورشید ادھر رات ادھر رات

گیسوئے رسا رو کے دل انور پہ سم ہے

کیا قدرت حق ہے کہ شب و روز بہم ہے

عون و محمد کی پیشانیاں ماہ انور سے زیادہ روشن، ابرو محراب سے زیادہ خم، اور پلکیں نشتر سے زیادہ تیز ہیں۔ اور آنکھیں

آہو میں غزالوں کو گرفتار کیا تھا — نرگس کو انھیں آنکھوں نے بیمار کیا تھا

قاسم کی پلکیں سرمہ، سیہ، نظر معلوم ہوتی ہیں۔ ان کے چہرے پر جو گیسو لہرا رہے ہیں معلوم ہوتا ہے چاند گہن میں آ گیا ہے۔ رخسار دو آئینۂ نور ہیں جن کی صفا پر نظر ٹھہر نہیں سکتی۔ ٹھہری نسیم سحر بھی وہ ضیا ہیں جو ان کی بینی میں ہے۔ لبوں کو لعل سے تشبیہ دینا عقل سے دور ہے، کیونکہ

وہ سنگ ہے پتھر سنگ میں گویائی کہاں

گویائی بھی یک سو ہے مسیحائی کہاں

قاسم کی کمر کی تعریف میں لکھتے ہیں

باریک ہے کیا دہن میں صف کمر آئے — سوز نہ سے باریک جسے ہوتے نظر آئے

یہ فکر رسا جائے کہاں اور کدھر آئے — ممکن ہی نہیں یہ کہ عدم کی خبر آئے

واں تک خرد و علم رسائی نہیں دیتا

یاں بار نظر ہے کہ دکھائی نہیں دیتا

انیس جس والہانہ انداز میں اپنے محبوب کرداروں کا سراپا نظم کرتے ہیں اسی جذب اور جوش سے اُن کرداروں کے گھوڑے اور تلوار کی تعریف میں اپنی طبیعت کی تمام تر رنگینیاں صرف کر دیتے ہیں اور بڑے اہتمام کے ساتھ ایسے الفاظ، تراکیب اور تشبیہات استعمال کرتے ہیں کہ اس تعریف میں تغزل کا رنگ صاف جھلکنے لگتا ہے۔ اُن کا گھوڑا جھل بل میں عجیب بار دکھاتا ہے۔ اس کی رفتار کے مقابلے میں حوصلۂ کبک دری پست ہے۔ کہیں اس کے بار پر غزالان حتن رشک کرتے ہیں تو کہیں اس کا جھگڑا پری جیسا نظر آتا ہے۔ اس کے ہر گام پر معلوم ہوتا ہے طاؤس سپہر جیسے کو جا رہا ہے اور کہیں:

لہ ملاحظہ ہو مقدمہ شعر و شاعری (ایڈیشن ۱۹۵۳ء) ص ۔

اوڑھنی ہے زلف سے حور سے موشگافیاں کی　　دیکھیں تو لیں بلائیں سدا بال بال کی
پریاں حرام ناز میں شاگرد چال کی　　غمزہ میں جست سیر کی شوخی غزال کی

وہ حُسن نہ بہ سار کا جوبن تراں کا
ڈلڈل کے ہاتھ پاؤں تو چہرہ بُراق کا

ارکی تعریف میں تغزل کا رنگ اس سے زیادہ نمایاں ہے۔ کہیں وہ تلوار کو "لیلیٔ ظفر راہ" کہتے ہیں تو کہیں "سلیمان کی پری"۔ اُس کے خم کو دیکھ کر مہ نو شرم سے کٹ جاتا ہے، اور جب وہ "معشوق سرخ رنگ" بن جاتی ہے تو اُس کے لبوں پر لہو سے پان کی لالی جمی ہوئی دکھائی دینے لگی ہے۔ اس جیسی گرمی اور لگاوٹ کسی حور میں دیکھنے میں آئی۔ پری میں۔ اس کی عشوہ گری نے لاکھوں کو بے دم کر دیا۔ جب وہ اپنی فطری بے دردی کے ساتھ اٹکھیلیاں کرتی ادھر سے اُدھر نکل جاتی تو اُس کی لٹک دیکھ کر سیکڑوں بسمل ہو جاتے تھے ـــ

زخم سینوں کے گریباں کی طرح پھٹتے تھے　　حال کیا تھی کہ ہزاروں کے گلے کٹتے تھے

دل کے دو بند تغزل کے رنگ میں خاص طور سے ملاحظہ کے قابل ہیں

کاٹھی تھی ذوالفقار کی یا تھا اجل کا گھر　　حملہ تھا یا نقاب رخ لیلیٔ ظفر
گھونگھٹ اُٹھا کہ دلہن سی چمکی ادھر اُدھر　　گویا دلہن حجاب سے نکلی جھکا کے سر

دکھلائی سب کو منہ کی صفائی لڑائی میں
جا میں ہزار دم سے لیں رونمائی میں

کاٹھی سے اس طرح ہوئی وہ شعلہ خو جُدا　　جیسے کنار شوق سے ہو حور رو جُدا
مہتاب سے شعاع جدا گُل سے بو جدا　　سینے سے دم جُدا رگِ جاں سے لہو جُدا

گرجا جو رعد ابر سے بجلی نکل پڑی
محمل میں دم جو گھٹ گیا لیلیٰ نکل پڑی

ایک دوسرے مرثیے میں تلوار کے بارے میں کہتے ہیں

رنگ تھا دمِ جنگ پری وش اسے کہا　　معشوق کی سُرخ لباس اُس نے جو پہنا
اس ادا پہ وہ سر کو جھکائے ہوئے رہنا　　جو ہر تھے اک پہنے تھی دلہن پھولوں کا گہنا

سیب جس جلد کی بو باس تھی پھل میں
رہتی تھی وہ تسبیر سے دولہا کی بغل میں

یہ سب خالص تغزل ہے۔ لیکن ابتذال اس کے قرب سے ہو کر نہیں گذرا، "شاہد بازی" سے اس کا دور کا بھی علاقہ نہیں اور "ہوا پرستی" کی اُسے ہوا تک نہیں لگی، جو عام غزل گو شعرا کی محبوب روش اور لکھنؤ اسکول کی امتیازی خصوصیت ہے۔ انیس کے کلام میں شروع سے آخر تک نفاست، متانت اور سنجیدگی پائی جاتی ہے وہ خود کہتے ہیں۔ ع

"بات جو منہ سے نکلتی ہے وہ سنجیدہ ہے"

اُنھوں نے کبھی گالیاں کھا کر دعائیں صرف دربان ہی کو نہیں دیں۔ اور نہ وہ کبھی وصل میں خوف رقیب سے مضطرب ہوئے۔ اسی لیے انھوں نے "غزل کو سلام" کر کے مرثیہ اختیار کر لیا اور اپنی تمام فنی صلاحیتیں مرثیہ ہی پر صرف کر دیں۔

مولانا حالی لکھتے ہیں "غزل کو جن لوگوں نے چمکایا اور مقبول خاص و عام بنایا، یہ وہ لوگ تھے جو آج تک اہل اللہ اور عارف باطن یا کم سے کم عشق الٰہی کا راگ گانے والے سمجھے جاتے ہیں　　ان کی غزل کا موضوع　.　عشق مجازی نہ تھا، بلکہ وہ حقیقت کو مجاز کے پردے میں ظاہر کرتے تھے"[1] لیکن اس کا کیا جائے کہ ایسے شعرا کے حقیقت والے اشعار پر مجاز کا دھوکا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، اور عام لیاقت کا آدمی کچھ سوچ کر ہی یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ شعر حقیقت میں ہے یا مجاز میں؟ اور اکثر وہ بیشتر حقیقت کو مجاز سمجھ بیٹھتا ہے۔ انیس کے تغزل کی شان ہی نرالی ہے ان کے تغزل پر مجاز کا گمان ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ حقیقت مجرد ہے اور مجاز کی گھناؤنی پرچھائیں بھی اس پر نہیں پڑ سکتی۔

غزل کے ارتقا میں دوسری منزل تصوّف کی ہے، یعنی وہ منزل جس میں شاعر کا محبوب حقیقی ہو جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ شعرا نے عاشقانہ مضامین سے گذر کر معرفت کے مضامین غزل میں باندھنا شروع کر دیے یہ منزل غزل کے ارتقا میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس مدرسہ فکر کے فارسی شعرا میں سعدی اور حافظ اور اُردو شعرا میں میر اور درد امام کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سعدی کا مشہور شعر ہے ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار　　ہر ورقے دفتریست معرفتِ کردگار

فارسی کا ایک اور مشہور شعر ہے ؎

---

[1] مولانا حالی: مقدمہ شعر و شاعری ص۱۲۱

نہ مہر رہے گے کہ خواہی جامہ می پوش   من انداز قدت را می شناسم[1]

اسی مضمون کو میرؔ نے اس طرح باندھا ہے ؎

گل و آئینہ کیا خورشید و مہ کیا   جدھر دیکھا تدھر تیرا ہی رو تھا

اسی خیال کو میر دردؔ نے اس طرح ادا کیا ہے۔ ؎

جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا   تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

اور میر انیسؔ نے اسی خیال کا اظہار اس طرح کیا ہے۔ ؎

اُسی کا نور ہر اک شے میں جلوہ گر دیکھا   اُسی کی شان نظر آگئی جدھر دیکھا

اُٹھ گئے، ناس کے سارے حجاب   ایک فقط آنکھوں کا پردہ رہ گیا[2]

اسی مضمون کو رباعیوں میں اس طرح باندھا ہے

گلشن میں صبا کو جستجو تیری ہے   بلبل کی زباں پہ گفتگو تیری ہے
ہر رنگ میں جلوہ ہے تری قدرت کا   جس پھول کو سونگھتا ہوں بو تیری ہے

گلشن میں پھروں کہ سیر صحرا دیکھوں   یا معدن و کوہ و دشت و دریا دیکھوں
ہر جا تری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے   حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

پتلی کی طرح نظر سے مستور ہے تو   آنکھیں جسے ڈھونڈھتی ہیں وہ نور ہے تو
ہے قربِ رگِ جاں سے اس پر یہ بُعد   اللہ اللہ کس قدر دور ہے تو[3]

سلاموں اور رباعیوں کی حد تک بھی بات سمجھ میں آتی ہے لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ انیسؔ کے مرثیوں میں بھی معرفت کے اشعار اس قدر کثرت سے بکھرے ہوئے ہیں کہ انھیں احاطۂ تحریر میں لانا مشکل ہے۔ بند رجہ ذیل بند ملاحظہ فرمائیے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ حمد باری کا جو اسلوب انیسؔ نے اختیار کیا ہے وہ نہ صرف یہ کہ اُن کا اپنا ہے بلکہ عام غزل گو شعرا کے کلام میں ذرا کم دستیاب ہو سکتا ہے:

وہ قمریوں کا چار طرف سرو کے ہجوم   کو کو کا شور نالۂ حق سرہٗ کی دھوم
سبحان ربنا کی صدا تھی علی العموم   جاری تھے وہ جو اُن کی عبادت کے تھے رسوم
کچھ گل فقط نہ کرتے تھے ربّ علا کی مدح
ہر خار کو بھی نوکِ زباں تھی خدا کی مدح

موتی بھی ہاتھ اُٹھا کے یہ کہتی تھی بار بار   اے دانہ کش ضعیفوں کے رازق ترے نثار
یا حیّ یا قدیر کی تھی ہر طرف پکار   تسبیح تھی کہیں، کہیں تہلیل کردگار
انساں زمیں پہ محو ملک آسمان پر
جاری تھا ذکر قدرت حق ہر زبان پر[4]

غزل گو شعرا کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے کلام میں اخلاقی اور حکیمانہ مضامین بھی نظم کرتے ہیں۔ مولانا عبدالحق نے کلام میرؔ کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "اُن کی شاعری عاشقانہ ہے لیکن کہیں کہیں وہ اخلاقی اور حکیمانہ مضامین کو اسی رنگ میں ایسی سادگی، صفائی اور خوبی سے ادا کر جاتے ہیں جس پر ہزار طبع زاد یاں اور نازک خیالیاں قربان ہیں۔"[5] کلام انیسؔ میں بھی اخلاق و حکمت کے فلسفیانہ نکتے جا بجا ملتے ہیں، اور کمال یہ ہے کہ اگرچہ وہ نکتے پند و نصیحت کا حکم رکھتے ہیں، پھر بھی اُن میں موعظت کی تلخی اور خشکی نہیں بلکہ غزل کی تری اور شیرینی رچی ہوئی ہے۔ ان معاملات پر انیسؔ اظہار خیال کے لیے ایسا خوبصورت، پُر اثر اور صاف و سادہ پیرایہ بیان اختیار کرتے ہیں کہ عام متغزلین کے یہاں اُس کی مثال مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

ڈاکٹر احسن فاروقی کا یہ کہنا کہ میر انیسؔ کسی طرح مفکر نہ تھے اور اس لیے اُن کے مرثیے اُن لوگوں کے لیے کسی خاص دلچسپی کا باعث نہیں ہو سکتے جو شاعری میں غور و فکر کے عنصر کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں" نیز یہ کہ "اُن کی رباعیوں اور سلاموں میں ایک آدھ شعر ایسے ضرور آگئے ہیں جن میں کچھ فکر کا پہلو پایا جاتا ہے"[6] انیسؔ ناشناسی کی دلیل ہے لیکن اس کے بعد انیسؔ کے سلام میں دو شعر نقل کرکے، جو اُن کے نزدیک فکر انگیز ہیں، انھوں نے اپنے قول کی خود ہی تردید کر دی ہے اور اس بات کا ثبوت دے دیا ہے کہ انیسؔ کا کلام اخلاق و حکمت کے عنصر سے بہر حال یکسر خالی نہیں ہے۔

نمود و بود بشر کیا محیط عالم میں   ہوا کا جب کوئی جھونکا چلا حباب نہ تھا
تڑپ بھی برق کی یہ پا کہ تھی شرر کی لپک   ذرا جو آنکھ جھپک کر کھلی شباب نہ تھا

---

[1] شاعر کا پتہ نہ چل سکا۔ اگر کوئی صاحب شاعر کے نام کی طرف میری رہنمائی کریں گے تو میں شکر گزار ہوں گا۔ [2] میر کہتے ہیں ؎ پیدا جو آپ کو تو میں سمجھا خدا کے تئیں   معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا
[3] اس بند میں پہلے دو شعر ایک بند سے انتخاب کیے گئے ہیں اور بیت ایک دوسرے بند سے   [4] مولانا عبدالحق، انتخاب کلام میر، (مقدمہ)، ص ۲۱
[5] ڈاکٹر محمد احسن فاروقی، مرثیہ نگاری اور میر انیس، ص ۹۲

لیکن انیس کے یہاں ایک سے زیادہ مقامات ایسے ملیں گے جہاں شاعری میں غور و فکر کے عنصر کا متلاشی اپنے ذوق کی جی بھر کے تسکین کر سکتا ہے سلام کے چند شعر اور ملاحظہ فرمائیں :

سر اک کے ساتھ ہے روشن دلو طلوع و غروب ۔ سحر کو چاند نہ تھا شب کو آفتاب نہ تھا
موج وجود کو غافل حباب سمجھے ہیں ۔ وہ جاگتے ہیں جو دنیا کو خواب سمجھے ہیں
خود نوید زندگی لائی قضا میرے لیے ۔ شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لیے

اسی مضمون کی رباعیاں ملاحظہ فرمائیے :

ادبار کا کھٹکا حشم و جاہ میں ہے ۔ جاگو جاگو کہ خوف اسی راہ میں ہے
اٹھو اٹھو نہ خواب غفلت کب تک ۔ دیکھو دیکھو اجل کمیں گاہ میں ہے

— — —

کیا قدر زمیں کی آسماں کے آگے ۔ جھکتے ہیں قوی بھی ناتواں کے آگے
نرمی سے مطیع سنگ دل ہوتے ہیں ۔ دنداں صف بستہ ہیں زباں کے آگے

— —

گر لاکھ برس جیے تو پھر مرنا ہے ۔ پیمانۂ عمر ایک دن بھرنا ہے
ہاں توشۂ آخرت مہیا کر لے ۔ غافل تجھے دنیا سے سفر کرنا ہے

سلاموں اور رباعیوں کی حد تک ڈاکٹر فاروقی بھی مانتے ہیں لیکن وہ کہتے ہیں "مرثیوں میں ایسے خیالات کہیں نہیں ہیں"[1] یہ دعویٰ بے بنیاد ہے۔ انیس نے مرثیوں میں بھی جابجا حکیمانہ انداز اختیار کیا ہے۔ مندرجۂ ذیل بند میں میر انیس نے فلسفۂ حیات و ممات، اعمال نیک اور فشار قبر وغیرہ جیسے فلسفیانہ موضوعات پر انسان کو للکارا ہے، فکر انگیز ہیں۔ لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا، تغزل کی چاشنی نے ناصحانہ تلخی کو شیرینی میں بدل کر دیا ہے اور اس قدر خوشگوار و خوش آیند بنا دیا ہے کہ مشکل ہی سے کوئی صاحب نظر ہوگا جو اثر قبول نہ کرے اور وجد میں آکر سر نہ دھننے لگے

اس باغ میں نے زہے کوئی اور کوئی رہے گا ۔ صحت سے کوئی صورت نرگس کوئی بیمار
آزاد ہے گر سرو تو قمری ہے گرفتار ۔ گل ہیں جو چمن میں کسی جا پر تو کہیں خار
اسکوں سے رخ گل کو سدا دھوتی ہے شبنم
سچ تو یہ ہے دیتے ہیں اور روتی ہے شبنم

بھائی ہو کہ بیٹا ہو گدا ہو کہ شہنشاہ ۔ جز نیک عمل جا نہیں سکتا کوئی ہمراہ
وہ راہ ہے دھڑکا سحر و شام ہے جس کا
منزل ہے نہ سر لیکن مقام ہے جس کا[2]

ایک دوسرے مرثیے کے حسب ذیل بند بھی اسی نسل کے ہیں ۔

اصلا نہیں جس نے کی یاں صبح سے تا شام ۔ ہستی کو یہ سمجھو کہ ہے خورشید لب بام
یاں کام کرو ایسا کہ آئے جو وہاں کام ۔ آ پہنچے صدا جانے کب موت کا پیغام
اس نے کوئی ملک نہ املاک سمجھا
ہوتا ہے قفس خاک یہ سب خاک سمجھا

اس ریست پہ پھولو نہ اجل کو بھی کرو یاد ۔ گھر سیکڑوں یاں میل ملانے کیے برباد
دنیا میں عمارت نہ بنا کر جو کوئی شاد ۔ اس قالب خاکی کی عجب سست ہے بنیاد
کل اوج نہ جو لوگ تھے وہ زیر زمیں ہیں
ہے خاک کا ڈھیر اب نہ مکاں ہے نہ مکیں ہیں

کس کس گل رنگیں کی نہ اس باغ میں تھی دھوم ۔ اک آن میں شبنم کی طرح ہو گئے معدوم
دکھلا رہی ہے رنگ عجب ہستی موہوم ۔ کیا قصد ہے گلچیں اجل کا نہیں معلوم
اس باغ میں جس سرو کو دیکھا تو رواں ہے
حسن گل پہ بہار آج ہے کل اس پہ خزاں ہے[3]

بے ثباتی دنیا کا موضوع بھی حکیمانہ شاعری کے تحت آتا ہے۔ اردو کے تمام بڑے شاعروں نے اس موضوع پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔ کلام انیس میں بھی اس موضوع پر جابجا اشعار ملتے ہیں۔ لیکن انیس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جو کچھ بھی

---

[1] ڈاکٹر محمد احسن فاروقی مرثیہ نگاری اور میر انیس ص ۹۴ [2] اس موضوع پر مرثیے لکھے جاتے ہیں۔ ۔ موت اک ماندگی کا وقفہ ہے ۔ یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

[3] اس مضمون کو میر نے اس طرح باندھا ہے

نام آج کوئی یاں نہیں لیتا ہے انھوں کا ۔ جن لوگوں کے کل ملک یہ سب زیر نگیں تھا
جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا ۔ کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا
آنا نہ تھا زور سر جن کا کل آسماں سے ۔ ہیں ٹھوکروں میں اُن کے آج استخواں ہیں ر

کہتے ہیں اس میں زماں کا شمارہ ضرور ہوتا ہے، اور روزمرہ کو وہ کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ سلام کے چند شعر اس موضوع پر ملاحظہ فرمائیے۔

جو عدم سے آگیا دُنیا میں وہی بس کے ہوئے   اور تو دو چار دن کے یہاں مہماں ہوئے

مقام یوں ہوا اس کارگاہِ دنیا میں   کہ جیسے دن کو مسافر سرا میں آکے چلے
انیس دم کا بھروسہ نہیں ٹھہر جاؤ   چراغ لے کے کہاں سامنے ہوا کے چلے

اسی مضمون کی رباعیاں ملاحظہ ہوں۔

جو شے ہے فنا اُسے بقا سمجھا ہے   جو حد ہے کم اسے سوا سمجھا ہے
ہے بحرِ جہاں میں عمر مانندِ حباب   غافل اس زندگی کو کیا سمجھا ہے

اب گرم حریص کے آنے کی ہے   ناداں تجھے فکر آب و دانے کی ہے
ہستی کے لیے ضرور اک دن ہے فنا   آنا سرا دلیل جانے کی ہے

پرساں کوئی کب جوہرِ ذاتی کا ہے   ہر گل کو گلہ کم التفاتی کا ہے
شبنم سے جو وجہ گریہ پوچھی تو کہا   رونا فقط اپنی بے ثباتی کا ہے[1]

انیس نے جس ماحول میں آنکھ کھولی اُس پر جاگیردارانہ نظام چھایا ہوا تھا۔ بادشاہوں، نوابوں اور رئیسوں کی شان میں قصیدے کہنا اس عہد کے شعرا کا عام شعار تھا۔ یہاں تک کہ میر جو فقر و فاقہ، خودداری، خود پسندی اور "بد دماغی" کے لیے بدنام ہیں انھوں نے بھی ایک قصیدہ نواب آصف الدولہ کی شان میں کہا۔[2] غالب نے تعریف و خوشامد میں حد گذار دی کہ معمولی رئیسوں اور انگریزوں کی شان میں بھی قصیدے کہے۔ بہادر شاہ کی غلامی پر انھوں نے فخر کیا۔ ایک قصیدہ میں بادشاہ کے حضور اپنی غریبی، فاقہ کشی اور قرض داری کا دُکھڑا رو کر اپنی تنخواہ ماہ بماہ کرنے کی درخواست کی۔ ایک غزل میں کہتے ہیں:

دیا ہے خلق کو بھی تا اسے نظر نہ لگے   بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے
زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا   کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے
نصیرِ دولت و دیں اور معینِ ملت و ملک   بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لیے

لیکن انیس اپنے عہد کے اس ماحول اور نظام سے متنفر تھے۔ انھوں نے کبھی کسی بادشاہ یا نواب وغیرہ کی شان میں کوئی قصیدہ نہیں کہا۔ وہ خود کہتے ہیں۔ ع "دل سے کبھی مدح امرا کی نہیں میں نے"۔ اس اعتبار سے انیس کا مقام منفرد ہے۔ میر کے مقابلے میں بھی ان کا پلّہ بھاری ہے اور غالب تو ان کے سامنے پست اور ہیچ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان کی شانِ استغنا ہے

کسی کے سامنے کیوں جا کے ہاتھ پھیلاؤں   مرا کریم تو دیتا ہے بے سوال مجھے

مہدی احسن نے جو خود میر انیس کے بڑے فرزند میر نفیس کے شاگرد اور جن کے والد میر انیس کے دوستوں میں سے تھے، واقعات انیس میں ایک روایت نقل کی ہے جس کی تائید تھوڑے سے تغیر کے ساتھ مولوی اتہری نے حیاتِ انیس میں کی ہے، کہ ایک مرتبہ نواب واجد علی شاہ کی والدہ ملکہ کشور جہاں نے مرزا دبیر اور میر انیس دونوں کو مجلس پڑھنے کی دعوت دی ـــــ میر انیس نے صاف صاف کہہ دیا کہ ذاکری کی حالت میں دربارداری کا حفظِ مراتب مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ حاصلہ الکبیر اپنی روزمرہ

---

[1] اس موضوع پر میر فرماتے ہیں

موجیں کرے ہے بحرِ جہاں میں ابھی تو تُو   جانے گا بعد مرگ کہ عالم حباب تھا
ہستی اپنی حباب کی سی ہے   یہ نمائش سراب کی سی ہے
کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات   کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

غالب کہتے ہیں

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے   نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

[2] سید مہدی احسن، واقعات انیس، ص ۸۵

پوشاک میں مجلس پڑھنے کی اجازت مل گئی۔ مرزا دبیر درباری قبا پہنے باندھے ہوئے تھے۔ انھوں نے منبر پر پہنچ کر پہلے بادشاہ کی شان میں کچھ اشعار مدح کے پڑھے اور اس کے بعد مرثیہ شروع کیا۔ بعد ازاں انیس کی باری آئی۔ انیس نے اوّل ایک سلام پڑھا جس کا مطلع تھا[۱] غیر کی مدح کریں شہ کے ثنا خواں ہو کر مجرئی اپنی ہوا کھوئیں سلیماں ہو کر[۱] اس عہد میں اس قسم کی اخلاقی جرأت ایک عدیم المثال کارنامہ ہے[۲] انیس علما و درویش صفت اور فقیر منش واقع ہوئے تھے۔ وہ اُن لوگوں سے نفرت کرتے تھے جنھوں نے دولت حاصل کرنے کے لیے ناجائز طریقے استعمال کیے تھے۔ اُن کا قول تھا کہ گنہ گاروں کے مکروہ چہرے کو دولت مندی کی نقاب نہیں چھپا سکتی اور نہ شرافت کے جوہر اصلی کو مفلسی کا دو رخہ کھا سکتا ہے[۳] وہ اس کے قائل تھے کہ قابل یا جوہری اصلی محروم نہیں بلکہ وہ ہے جو اپنی دولت کے ذریعے سے غریبوں کی جانوں کا شکار کھیلتا ہے[۴] یعنی جدید اصطلاح استعمال کی جائے تو یہ الفاظ دیگر غریبوں کو "اکسپلائٹ" کرتا ہے[۵]

دراصل انیس کو اپنی اس قلندری پر ناز تھا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ دولت فقر کے مقابلے میں دولت دنیا ہیچ ہے۔ وہ اللہ سے عاجزت ہیں۔ " ع " دولت کے عوض فقر کی جاگیر عطا کر"۔ ان کے نزدیک دولتِ فقر حاصل کرنے کے بعد معمولی انسان بھی تونگر بن جاتا ہے ورنہ بادشاہ بھی ہو تو گدا کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی اُن کا نظریۂ زندگی تھا اور یہی اُن کا فلسفۂ حیات۔ اس جہت سے اگر دیکھا جائے تو انیس اپنے عہد سے آگے جا رہے تھے۔ فقیری اور قلندری کی تصنیف اور شاہی اور ریاست و امارت کی تحقیر و مذمت میں انیس نے جیسا کچھ کہہ دیا اور

---

[۱] اور اس کے بعد جب میر انیس نے سلام کا تیسرا شعر پڑھا ؎

زلف اکبر کو جو دیکھا سر پیرہ بڑھ جوں   دے سر کھول دے ماں نے پریشاں ہو کر

تو مجلس اٹھا کر بادشاہ باہر نکل آئے اور بے ساختہ فتح الدولہ برق سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ یوں فتح الدولہ میں یہ کہتا تھا کہ میر انیس لکھنؤ میں ایک ہی شاعر ہیں۔ دیکھا تم نے یہ زبان انھیں کے لیے خاص ہے۔ بعد ختم مجلس علی نقی خاں کو حکم دیا کہ میر صاحب کو دروازہ تک رخصت کرنے کی رسم پوری کریں (سید مہدی احسن واقعات انیس صہ[۱])

[۲] سید مہدی احسن نے ایک اور واقعہ میر انیس کے متعلق حیدر آباد کا لکھا ہے جو انیس کی اخلاقی جرأت کا مظہر ہے۔ میر انیس کی ایک مجلس میں ایک نواب صاحب تشریف لائے چونکہ لوگ ان کی شخصیت سے واقف تھے اس لیے سرو قد تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے اور ہاتھوں ہاتھ منبر تک پہنچا دیا۔ میر صاحب نے ان کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی اور صرف اتنا کہا بسم اللہ۔ پھر میر انیس منبر پر گئے اور ایک سلام پڑھا جس کا مطلع یہ تھا ؎

ابتدا سے ہم ضعیف و ناتواں پیدا ہوئے   اُڑ گیا جب رنگِ رخ سے استخواں پیدا ہوئے

اس کے بعد میر انیس نے نواب صاحب سے مخاطب ہو کر کہا، سنیے۔ آپ کے سننے کے شعر ہیں

نوبتِ جمشید و دارا و سکندر اب کہاں   خاک تک چھانی نہ قبروں کے نشاں پیدا ہوئے

خاکساری نے دکھائیں رفعتوں پر رفعتیں   اس زمیں سے واہ کیا کیا آسماں پیدا ہوئے

حیدر آباد ہی سے متعلق ایک روایت یہ مشہور ہے کہ میر انیس حیدر آباد گئے تو نظام سے ملنے نہیں گئے۔ نظام ان کی مجلس میں از خود تشریف لائے۔ انیس نے ان کے ساتھ معمولی سامع کا سا برتاؤ کیا اور مجلس ختم کرنے کے بعد سیدھے اپنے کمرہ میں چلے گئے۔ اس کے بعد نظام میر انیس سے ملنے ان کے کمرہ میں خود گئے۔ وہاں کچھ دیر صحبت رہی جس کے دوران میر انیس کی فرمائش پر نظام نے اپنا کلام بھی سنایا۔ طبقۂ شعرا میں اس قسم کی مثالیں اس عہد میں نایاب ہیں۔ [۳] میر مہدی احسن واقعات انیس صہ۱۵۰ [۴] ایضاً

[۵] انیس کی زندگی میں بے شمار واقعات ایسے ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انیس نوابوں اور رئیسوں کو منہ نہیں لگاتے تھے۔ ایک دن میر حسن علی رئیس اپنی گاڑی میں سوار میر مہدی احسن کے والد کے مکان کے سامنے سے گذر رہے تھے۔ میر انیس اس وقت کھلی ہوا میں وہاں سامنے ہی بیٹھے تھے۔ رئیس نے کوچوان کو حکم دیا کہ گاڑی آہستہ کر دے تاکہ میر انیس انھیں دیکھ کر سلام کریں۔ جب ان کی سواری قریب آئی تو میر انیس نے اس طرف سے منھ پھیر لیا۔ بعد میں لوگوں نے ان سے اس کا سبب دریافت کیا تو فرماتے تھے کہ "اس شخص نے ہزاروں بے گناہوں کی گردن پر چھری پھیری ہے۔ مجھے اس شخص کی صورت سے نفرت ہے"۔ (میر مہدی احسن۔ واقعات انیس، صہ۹۳)

کر دکھایا وہ ایک عظیم کارنامہ ہے جس کی نظیر معاصر عہد میں تلاش کرنا مشکل ہے۔ اُن کے ارشادات کو جن سے حق گوئی، خودداری، اور اخلاقی جرأت کی بڑی بو آ رہی ہے، ہم بہرلحاظ جدید اصطلاحی معنوں میں "انقلابی" نہیں تو کم از کم انقلاب آفریں ضرور کہہ سکتے ہیں۔ کیونکہ اس عہد میں جب کہ تمام اگلے اور معاصر شعرا دولت مندوں کی خوشامد میں لگے ہوئے ہیں، انیس برملا مگر ذیل کہہ رہے ہیں

جرأت جھکتے نہیں ہم بادشاہ کے سامنے ۔۔۔ ہاتھ پھیلاتے ہو گر گیا گدا کے سامنے
فقر کی دولت کو کیا جانیں یہ کیا ہیں دنیادار ۔۔۔ ہاتھ پھیلاتے سلطاں بھی گدا کے سامنے
در پہ شاہوں کے نہیں جاتے فقیر اللہ کے ۔۔۔ سر جہاں رکھتے ہیں سب ہم واں قدم رکھتے نہیں
یہ اوج ہم سے بٹھا کو رہے ۔۔۔ یہ دلق مرقع امرا کو نہ ملے
کشتی ہے خدا نے ہم کو یہ دولت فقر ۔۔۔ برسوں ڈھونڈھیں اگر بادشاہ کو نہ ملے

بے شک انیس کوئی انقلابی شاعر نہیں ہیں اور نہ اُنھیں کسی بھی اعتبار سے "اشتراکی" کہا جا سکتا ہے۔ یہ اصطلاحیں دورِ جدید کی یعنی انیس سے تقریباً نصف صدی بعد کی پیداوار ہیں لیکن انیس کا کردار جو متقدمین و معاصرین سے یکسر مختلف ہے نقشِ انقلابی ہے اور اس سمت سے ہم انھیں جاگیردارانہ نظام کا پہلا حریف، اور بعد میں آنے والے انقلابی شاعروں کا "امام" ضرور کہہ سکتے ہیں۔

مندرجہ ذیل رباعیوں اور سلاموں کے چند اشعار سے ان کی قلندرانہ شان، انقلابی ذہن اور فلسفیانہ طرزِ فکر کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ فرماتے ہیں،

دولت کا خیال ہم میں آتا ہی نہیں ۔۔۔ یہ نشۂ فقر ہے کہ جاتا ہی نہیں
لبریز ہیں یہ دولتِ استغنا سے ۔۔۔ آنکھوں میں کوئی غنی سماتا ہی نہیں
قناعت و گوہر آبرو و دولت دیں ۔۔۔ ہم اپنے کیسہ خالی میں کیا نہیں رکھتے

سلام کے شعر ہیں

طلب سے عار ہے اللہ کے فقیروں کو ۔۔۔ کبھی جو ہو گیا بڑا صدا سنا کے چلے[1]
کریم جو تجھے دینا ہے بے طلب دیدے ۔۔۔ فقیر ہوں پہ نہیں عادتِ سوال مجھے
انیس محل و دنیا سے کیا فقیروں کو ۔۔۔ اسی زمیں کو ہم فرشِ خواب سمجھے ہیں
نہ ملا یہ بادشہ سر گرانش ۔۔۔ فقیری میں بھی دل تو نگر رہے
فقیروں کی کیا موت کیا زندگی ۔۔۔ جگہ جس جگہ مل رہی سو رہے[2]

پروفیسر رشید احمد صدیقی کی رائے ہے کہ "بہترین شعر ایک طور پر وہ ہے جو ضرب المثل بن جائے ۔۔۔ کسی شاعر کے مقبول ہونے کی ایک کسوٹی یہ بھی ہے کہ اس کے کتنے اشعار ضرب المثل بن گئے۔ غزل ضرب الامثال کی دارالضرب ہوتی ہے ۔۔۔ بالفاظ دیگر غزل ضرب الامثال تصنیف کرنے کی کوشش ہے"[3]۔ رشید صاحب نے بڑی سچی اور بہت خوبصورت بات کہی ہے۔ مگر اس میں انھوں نے ایک کسر بھی چھوڑ دی ہے، اور وہ شاید اس لیے کہ انھیں یہ اندیشہ لاحق ہوگا کہ آگے چل کر کوئی شخص انھیں ٹوکے

---

[1] اسی مضمون کو میر نے اس طرح باندھا ہے

فقیرانہ آئے صدا کر چلے ۔۔۔ میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے
جو بے کیا جو اہلِ کرم کے جود کا کچھ نہ خیال کیا ۔۔۔ ہم جو فقیر ہوئے تو ہم نے بھی ترکِ سوال کیا
میر بندوں سے کام کب نکلا ۔۔۔ مانگنا ہے جو کچھ خدا سے مانگ

[2] اس شعر کی شانِ نزول یہ ہے کہ ایک مرتبہ واجد علی شاہ نے چاہا کہ شاہنامہ کے طور پر اپنے خاندانی حالات نظم کرائیں۔ اس خدمت کے لیے پانچ شاعر تجویز ہوئے جن میں ایک انیس بھی تھے۔ میر انیس دربار میں طلب ہوئے تو انھوں نے اخلاقاً اقرار کر لیا۔ بادشاہ نے علی نقی خاں وزیر کو اشارہ کیا کہ میر انیس کو مصاحب منزل کے کمرے دکھائیں۔ جو کمرہ میر صاحب پسند فرمائیں ان کے قیام کے لیے اسباب راحت وغیرہ جمع کر دیا جائے۔ میر انیس کو جب یہ معلوم ہوا کہ اس خدمت کے لیے دن رات وہاں رہنا پڑے گا تو بددل ہو گئے، لیکن اخلاقاً علی نقی خاں کے ہمراہ ہو لیے اور مصاحب منزل کے کمرے دیکھنے لگے۔ علی نقی خاں ہر کمرہ دکھاتے اور میر صاحب سے پوچھتے کہ یہ آپ کو پسند ہے؟ آخر میر انیس نے پریشان ہو کر فرمایا "صاحب ہم فقیروں کی کیا موت کیا زندگی ۔۔۔ جگہ جس جگہ مل گئی سو رہے" (میر مہدی حسن، واقعاتِ انیس، صفحہ ۴۲)

[3] رشید احمد صدیقی جدید غزل، ص ۱۱، یہ وہ مقالہ ہے جو انھوں نے پروفیسری کے اعزاز میں پڑھا تھا۔

سے شاعرانہ کہہ دے۔ وہ کمی یہ ہے کہ بات اس کے برعکس بھی ممکن ہے۔ یعنی یہ کہ اگر کوئی مصرعہ یا شعر ضرب المثل بن جائے تو وہ چاہے غزل کا ہو، غزل کا مصرعہ یا غزل کا شعر کہلانے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ مصرعہ اور شعر پر ہی منحصر نہیں، بلکہ اگر نثر کا کوئی چھوٹا سا جملہ بھی ضرب المثل بن جائے تو اُسے بھی غزل کے شعر کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ مثلاً اُن کے خود کے یہ دو چھوٹے چھوٹے فقرے — "بہترین شعر وہ ہے جو ضرب المثل بن جائے۔" اور "غزل ضرب الامثال کی دار الضرب ہوتی ہے۔" غزل کے بہترین شعر کی حیثیت رکھتے ہیں۔

کلام انیس میں ایسے اشعار کی بہتات ہے۔ دوسرے شعرا اور انیس کے کلام میں ضرب الامثال کا تناسب اگر باقاعدہ ریاضی کے اصول پر نکالا جائے تو معلوم ہوگا کہ اوروں کے یہاں اگر دو چار شعر ایسے نکلیں گے جو ضرب المثل بن گئے ہیں اور زبان زد خاص و عام ہو گئے ہیں تو انیس کے یہاں دس بیس۔ ذیل میں کچھ اشعار پیش کیے جاتے ہیں جو مختلف سلاموں، رباعیوں اور مرثیوں میں وارد ہوئے ہیں اور ضرب المثل بن چکے ہیں۔ مثلاً ایک مسدس کی بیت کا آخری مصرعہ "ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد" ضرب المثل بن گیا ہے۔ پورا بند یہ ہے:

ہے کجی عیب مگر حسن ہے ابرو کے لیے   سُرمہ زیبا ہے فقط نرگسِ جادو کے لیے
تیرگی بد ہے مگر نیک ہے گیسو کے لیے   زیب ہے خالِ سیہ چہرۂ گلرو کے لیے
داند آں کس کہ فصاحت بہ کلامے دارد
ہر سخن موقع و ہر نکتہ مقامے دارد

اس بند کا ہر مصرعہ ضرب المثل بننے کی صلاحیت رکھتا ہے، مگر آخری مصرعہ زیادہ مشہور ہو گیا ہے۔

انیس کی ایک اور بیت ہے:

جوہر طبیعتوں کے دکھانے کا وقت ہے
شیرو بڑھو یہ جان لڑانے کا وقت ہے

اس شعر کو پروفیسر آل احمد سرور نے حال ہی میں مسئلۂ جنگ کے زمانے میں اپنے ایک مقالۂ افتتاحیہ میں استعمال کیا اور اُسے ایسا سرمایۂ کلام قرار دیا۔ لکھا ہے: "انیس نے کسی اور پس منظر میں یہ شعر کہا ہے، لیکن اس میں جو آفاقیت ہے اس کی وجہ سے وہ آج تک زندہ ہے اور غالباً ہمیشہ زندہ رہے گا، یا کم از کم اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک دنیا میں جنگ کا وجود رہے گا اور اس میں جوش دلانے کی ضرورت باقی رہے گی۔"[1]

ایک سلام کے یہ دو شعر بہت مشہور ہو چکے ہیں اور زبان زد خاص و عام ہو گئے[2] ہیں:

یہ جھریاں نہیں ہاتھوں میں ضعفِ پیری کی   چُنا ہے جامۂ اصلی[3] کی آستینوں کو
خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم   انیس ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

حسبِ ذیل رباعی بہت مشہور ہے اور ضرب المثل بن گئی ہے:

دنیا بھی عجب سرائے فانی دیکھی   ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آ کے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا   جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

کسی آفاقی حقیقت[4] کو شعر کے سانچے میں ڈھال دیا جائے تو بہت آسانی سے ضرب المثل بن جاتی ہے۔ انیس کا کلام ضرب الامثال کے ہونے کی بے شمار آفاقی حقیقتوں سے مملو ہے۔ حسبِ ذیل اشعار مختلف مرثیوں کے ہیں۔ یہ سب آفاقی حقیقتیں ہیں اور ضرب المثل کا درجہ رکھتی ہیں اور بقول رشید احمد صدیقی ضرب الامثال تصنیف کرنے کی کامیاب کوششیں ہیں:

---

[1] ہماری زبان، علیگڑھ، ۱۸ دسمبر ۱۹۶۱ء [2] مندرجۂ ذیل دو شعر بھی اسی سلام کے ہیں

آداب و قاعدے سے دلیرو بڑھے چلو   تلواریں تولتے ہوئے سیرو بڑھے چادر
ہے بات کی یہ بات کہ ہیں ایسے بہادر   جو کہتے ہیں منہ سے وہی کرتے ہیں بہادر

[3] مطبوعہ نسخوں میں ہر جگہ "اصلی" چھپا ہوا ہے اگرچہ میں نے بزرگوں سے "ہستی" بھی سنا ہے۔ [4] یہ میں نے انگریزی لفظ (Universal Truth) (یونی ورسل ٹروتھ) کا ترجمہ کیا ہے۔

کس طرح ۔ آسیب جراں آ سینچ تا   گل کو نسا کھلا ہے جو مرجھا نہیں جاتا[1]

مذاقِ اصل تکبر کے معنی کہتے ہیں اکثر   جو صاحبِ جوہر ہیں جھکے رہتے ہیں اکثر

مِٹتا تو ہے کم رتبہ عالی نہیں ہوتا   عزت وہ خزانہ ہے کہ خالی نہیں ہوتا

صحبت اہل دل دل کو طلا کرتی ہے   مس کو آن میں اکسیر طلا کرتی ہے

سر سبز جو گل ہو اُکھاڑا نہیں جاتا   پانی سے بھی ایسا اُکھاڑا نہیں جاتا

گر کسی جوہر کو سنبھلنے نہیں دیا   ۔دی کو کبھی جھولے پھلنے نہیں دیتا

مندرجہ ذیل مصرعے بھی آفاقی تشبیہیں ہیں اور ضرب المثل کا درجہ رکھتے ہیں۔ ع تیغ سے کسی کا کون ہوا ہے جہاں میں"

ع جو طرف کرمالی ہے سب پاتا ہے   ع کیا مرے ابر اسکی جو موتی کی لڑی آئے"

ع سچ کہتے ہیں سرسائی کم ظرف میں اوام ہے ع دنیا میں کسی کی کبھی یکساں نہیں گزری"

ع دولت سے بد کو شرافت نہیں ملتی ع ۔۔۔ بات آئے تو سرمایہ عزت ہے"

ع جو دم گذر گیا وہ "آتا نہیں کبھی لوٹ کے" ع آنکھیں دیکھتا ہے جو انجام کو دیکھے"

اگرچہ میر تقی میر اور میر انیس کا کوئی موازنہ نہیں ہو سکتا کیونکہ دونوں کی راہیں الگ الگ ہیں مختلف اور علاحدہ علاحدہ ہیں۔ کا ہو ۔۔ اور انیس کا ۔۔ لیکن مولانا عبدالحق نے اپنے انتخاب کلام میر کے مقدمہ میں میر اور انیس کا موازنہ کرنا پسند کیا ہے اور اس سلسلہ میں بہت سی غلط فہمیوں کو جنم دے دیا ہے جن کا ازالہ ضروری ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔ "اہل لکھنو کے کھانے پینے، رہنے سہنے، لباس، آداب و اطوار، غرض تمام طرز معاشرت میں ۔۔ تصنع اور تکلف پایا جاتا ہے[2]، اور اسی وجہ سے شعرائے لکھنو کا کلام عموماً، میں انیس بھی شامل ہیں اسی رنگ میں رنگا ہوا ہے۔"

مولانا کی اس رائے سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ اہل لکھنو کا تکلف اور تصنع ۔۔ نظر میں تصنع اور تکلف ہو سکتا ہے لیکن اہل لکھنو کے نزدیک وہ کلچر کا "جزو" بن چکا تھا۔ ۔۔ جب انسان اس کا عادی ہو جاتا ہے تو وہ تکلف نہیں رہتی بلکہ معمول ہو جاتی ہے۔ مغربی تہذیب میں "تھینک یو"، "ساری" اور "پلیز" روزمرہ میں داخل ہیں۔ ہم مشرق میں بسنے والے اسے تصنع اور تکلف سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی طرح بوس و کنار مغرب میں سماجی معمولات میں شامل ہے۔ ہم مشرق والے اسے معیوب سمجھتے ہیں لیکن ہمارا یہ فیصلہ کہ یہ آداب و اطوار غیر فطری ہیں یا ان میں تصنع اور تکلف پایا جاتا ہے غیر منصفانہ ہے۔ مغربی ماحول میں یہ باتیں قطعاً فطری اور نیچرل ہیں۔ جس طرح مورخ عہد، ماحول اور معاشرہ کو پیش نظر رکھ کر تاریخی واقعات کو جانچتا اور پرکھتا ہے اسی طرح نقاد کو بھی چاہیے کہ وہ عہد، ماحول اور معاشرہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے تنقید کرے۔ کلام انیس میں جسے ہم تصنع اور تکلف کا نام دیتے ہیں وہ لکھنوی ماحول میں عین فطری اور نیچرل ہے۔

ایک دوسرے مقام پر مولانا فرماتے ہیں "میر انیس بھی جن کا فصاحت میں بہت بلند درجہ ہے اور جو سوز و غم کے بیان میں اپنی نظیر نہیں رکھتے، میر صاحب کو نہیں پہنچتے[3]۔" یہ بات بھی محل نظر ہے۔ میر اور انیس کے سوز و غم کی قدروں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ میر کا سوز و غم ان کی نجی ناآسودگی کا نتیجہ ہے۔ انیس کے یہاں سوز و غم حسن کی حیثیت رکھتا ہے۔ ۔۔ میر غزل کے بادشاہ ہیں۔ لیکن میر کے بعد دنیا میں ایک ایسا شہنشاہ سخن بھی پیدا ہوا جس کی طرز شاعری میں جتنی گہرائی، گیرائی، وسعت، رنگینی و تنوع، فصاحت و بلاغت، درد و غم اور وہ سب خوبیاں بیک وقت موجود ہیں جو بہت کم شعرا کو نصیب ہو سکیں۔ یہ انیس کی شاعرانہ تعلّی نہیں، ٹھوس حقیقت کہی ہے ؎

کسی نے مری طرح سے اے انیس   عروسِ سخن کو سنوارا نہیں

اسی طرح مولانا عبدالحق کی یہ عقیدہ کہ "میر انیس رُلاتے ہیں میر خود

---

[1] اسی مضمون کو اس رباعی میں باندھا ہے

سنبل جہاں سے دوست کیا کیا گئے   اس باغ سے کیا کیا گل رعنا گئے

تھا کون سا گل جسے دیکھی بہار   وہ کون سے گل کھلے جو مرجھا نہ گئے

[2] ۔۔ کی تعریف میں کہی گئی ہے مگر اس کے ذریعے انیس نے ایک اہم اخلاقی سبق دیا ہے اور اس کے لیے کتنا خوبصورت انداز اختیار کیا ہے کہ یہ مطلق سوز ۔۔ الگ ۔۔ اخلاقی ۔۔ یہ انیس کا حصہ ہے۔ [3] مولانا عبدالحق انتخاب کلام میر (مقدمہ) ص ۔۔ [4] مولانا عبدالحق انتخاب کلام میر (مقدمہ) ص ۲۵

 ۔۔ ۱۹۶۳ ۔۔

روتا ہے نہ آپ بیتی ہے وہ جگ بیتی۔[1] کلام انیس کا صحیح تجزیہ یہی ظاہر ہے کہ آپ بیتی کے مقابلے میں جگ بیتی بیان کرنا مشکل ہے۔ دوسرے خود رونا آسان ہے، رُلانا مشکل ہے، بلکہ رُلانا بجائے خود ایک فن ہے۔ جو رُلا سکتا ہے وہ تو اول خود روتا ہے جو خود نہیں روتا وہ دوسرے کو کیا رُلا سکتا ہے۔ انیس اول خود روتے تھے تب وہ دوسروں کو رلانے میں کامیاب ہوتے تھے۔ وہ خود کہتے ہیں:

رونا ہی آنکھوں سے ہے حاصل اور دریا ہیں آنکھوں سے روانی ...

اسی سلسلے میں مولانا فرماتے ہیں "میر انیس کے ہاں دھوم دھام اور بلند آہنگی ہے میر کے ہاں سکون اور خاموشی۔"[2] کلام میر کے بارے میں مولانا کی رائے شعر بہ شعر درست ہے، لیکن کلام انیس کے بارے میں صرف انیس کے ہاں دھوم دھام اور بلند آہنگی ہی نہیں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ انیس کے کلام میں رزم بزم اخلاق و جذبات، آفاقی تصورات، ضرب المثل، کردار نگاری، منظر کشی، بین، سب ہی کچھ ہے۔ اور انیس ہر موقع کے لیے علیحدہ اسلوب اختیار کرتے ہیں۔ وہ بقول خود اس کے قائل ہیں کہ ہر شخص موقع و محل کے مطابق ... اور معنی موقع ہو جہاں جس کا عبارت ہو وہی" یہ ایک ایسا وصف ہے جو شعرائے اردو کے حصے میں کم آتا ہے۔ جہاں انیس رزم لکھتے ہیں وہاں بے شک ان کے کلام میں دھوم دھام اور بلند آہنگی ہے، لیکن جہاں بزم نظم کرتے ہیں، خصوصاً جہاں تغزل سے کام لیتے ہیں وہاں مکمل سکون اور خاموشی پیدا کر دیتے ہیں۔

مندرجہ ذیل اشعار ایک سلام سے انتخاب کیے گئے ہیں۔ یہ سب غزل کے شعر ہیں اور ان میں مکمل سکون اور خاموشی پائی جاتی ہے:

جب کشتی ثابت مہ نما رخصت — کون سا اُلفت کا رشتہ رہ گیا
کاش اعمال بھی رخصت ہو — ساتھ ... میں سہارا رہ گیا
قبر میں ہوگا حساب زندگی — بعد مرنے کے بھی جھگڑا رہ گیا
تیری کشتی پر فلک ... پڑیں — دور ہو کر دل کا سیپارہ رہ گیا
دم میں رکھ کر نہ ٹھہرا کوئی دوست — میں نئے گھر میں اکیلا رہ گیا
سو گئے کب کے ... اٹھو انیس — دل ہے غفلت میں تھوڑا رہ گیا

ایک دوسرے سلام کے یہ شعر بھی اسی قسم کے ہیں:

کسی کا بوجھ جو گردن پہ ہم اٹھا کے چلے — جہاں سے آئے تھے اُس سے سر جھکا کے چلے
ملا جنہیں انہیں افتادگی سے اوج ملا — انھیں نے کھائی ہے ٹھوکر جو سر اٹھا کے چلے
تمام عمر جو کی سب نے بے رخی ہم سے — کفن میں ہم بھی عزیزوں سے منہ چھپا کے چلے
کسی کا دل نہ کیا ہم نے پائمال کبھی — چلے جو راہ تو چیونٹی کو بھی بچا کے چلے

اور ہو سکے تو سلاموں کے سارے شعر منتخب کیے گئے ہیں، لیکن ہر سلام میں ایک دو اور کبھی کبھی زیادہ اشعار ایسے مل جاتے ہیں جو غزل کا مقام حاصل کر سکتے ہیں۔ متعدد سلاموں میں سے اسی طرح کے چند اور ملاحظہ فرمائیے:

اُن کی جب پھول منھ سے جھڑ پڑے — مسکرائے جب تو غنچہ کھل گیا
ہمارے شیشۂ دل کو نہ توڑ اے زاہد — یہ ظرف وہ ہے کہ جس میں کلام ربانی ہے
وہ دل جلے ہیں اٹھا ... کہ سحر سے گر ہاتھ — ... ہے
آخر ہے عمر ... اس دل بھی سیر ہے — ... چلیے ... دیر ہے
... گل میں محبت نہ بلبل میں ... — الٰہی یہ کیسی ... ہو گئی
... کی آہ کچھ عمر رفتہ کی قدر — عمر عزیز کو رائگاں کر دیا
... سے ترے لب انیس — ہر ایک زاغ کو خوش بیاں کر دیا

مسدس نظم کرتے کرتے انیس کے قلم سے بعض ایسی بیتیں نکل جاتی ہیں جنہیں کسی بھی اچھی سے اچھی غزل کا مطلع قرار دیا جا سکتا ہے۔ تجربہ کار شاعروں کا تجربہ ہے کہ غزل میں سب سے زیادہ مطلع کہنے میں سب سے زیادہ دقت پیش آتی ہے، ورنہ مطلع کے دونوں مصرعوں کے دولخت ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔ مسدس کے تینوں شعر اپنے مقام پر مطلع ہوتے ہیں۔ انیس نے اس طرح ہزاروں مطلع کہے ہیں۔ ان میں سے چند ایسے مطلع انتخاب کر کے پیش کیے جاتے ہیں جو غزل کی زینت بن سکتے ہیں:

کس شان سے ہوائے لو گل مہک گئے — جب ہنس کے بات کی تو ستارے چمک گئے
شادی سدا نہیں ہمیں درکار ہے — ... ان میں وہ جو ہنسا ... ہار ہے
جادوں سے پوچھیے، کسی گل سے پوچھیے — صدمہ خزاں کے لٹنے کا بلبل سے پوچھیے

(بقیہ صفحہ ۴۵ پر)

[1] مولانا عبدالحق انتخاب کلام میر ... ص ۲۶ [2] ایضاً

غزل

رماں رسیدی

ملا کبھی آج وہ مجھ کو تو اس طرح یارو
سفر میں کوئی مسافر ہو جس طرح یارو

سفر میں بھی دی کہ سفر میں بھی ہی
سناؤں ان کو کھلاؤں میں کس طرح یارو

مرے مزاج میں رس بس گیا ہے وہ ایسا
صبا میں کیف، مہک گل میں جس طرح یارو

کبھی کبھی یاد تو ہوں گے وہ مہرواں حیات
خزاں میں پھول کھلاتے تھے کس طرح یارو

سفر کٹے گا یہ گر اس حد ہوں ست
سحر نہ پاؤ گے منزل تک اس طرح یارو

شامِ عظمت اعلاف تنل گاہ چلو
کہ سایے، مسکدے جاتے ہیں جس طرح یارو

رہی کہ محرم لہو کی ہرن صرور ہے
اُگے گی ایک ہی فصل اس طرح یارو

اٹھی تو ذرّے میں آؤ کہ آفتاب میں
حمد اصغر، عثماں جس طرح یارو

غزل

آدراہ سکوتی

شبِ غم کی بات ہی نکلنے نہیں کوئی بس کسی کا چلا نہیں
مری سرد آہ سے بجھ کے جو چراغ پھر وہ جلا نہیں

نئی راہ جس نے دکھائی تھی وہی اُن روش پہ چلا نہیں
نئی روشنی کا بیامبری روشنی میں ڈھلا نہیں

کہیں جھوم نے کی تجلیاں کہیں چھوٹ روئے نگار کی
مری کائناتِ شباب میں کبھی آفتاب ڈھلا نہیں

مرے نقشِ پا سرِ رہ گذر کسی کام کے نہ سہی مگر
وہ بھٹک گئے جو خرد زدہ مرے راستے پہ چلا نہیں

مجھے دل وہ درد بھرا دیا جو غموں کی تاب نہ لا سکا
وہ چراغ مجھ کو عطا ہوا جو ہوا کے رُخ پہ جلا نہیں

سبھی عہدِ نو میں ترقیاں ہوئیں انقلاب کے نام پر
جو بُرا تھا اب وہ بُرا نہیں جو بھلا تھا اب وہ بھلا نہیں

مری عمر آذرِ غم زدہ بڑی آن بان سے کٹ گئی
وہ نگاہ ناز تھی ملتفت تو کوئی ملال کھلا نہیں

غزل

حبیب ہاشمی

روئے زمیں سے اُڑ کے سرِ آسماں گئے
دیکھیے! تو کوئی خاک کے ذرّے کہاں گئے

اب تک نہ بھر سکے ہیں غمِ بے رُخی کے زخم
اک عمر ہو گئی نفحۂ مہرِ بتاں گئے

آیا نہ لوٹ کر کوئی منزل سے آج تک
اس کارواں سے مل کے کئی کارواں گئے

گردن تک اپنی اٹھ نہ سکی اس سے تیغِ ناز
مقتل میں بار بار سبھی امتحاں گئے

اب مہوشوں کے لب کا تبسم محال ہے
شہرِ وفا کے چاند ستارے کہاں گئے

اللہ رے یہ حُسنِ تکلّم کی شوخیاں
مجھ کو سنا کے خود وہ مری داستاں گئے

تم کو سکونِ دل نہ میسر ہوا حبیب
تم درد ہی سمیٹ کے لائے جہاں گئے

رُباعیات

مطلوب رسول

آئی ہے گھٹا جھومتی بندرابن سے
شعلے سے بھڑک اُٹھتے ہیں میرے تن سے
پریتم کی برہ میں جوگ بیراگ لیا
اے کاش اُتر جائے وہ میرے من سے

جذبات پہ قابو ہے نہ دل پر قابو
اُمڈے ہی چلے جاتے ہیں میرے آنسو
صحرا میں ٹھکانا ہے نہ گھر میں میرا
مانوس نہیں مجھ سے ابھی تک آہو

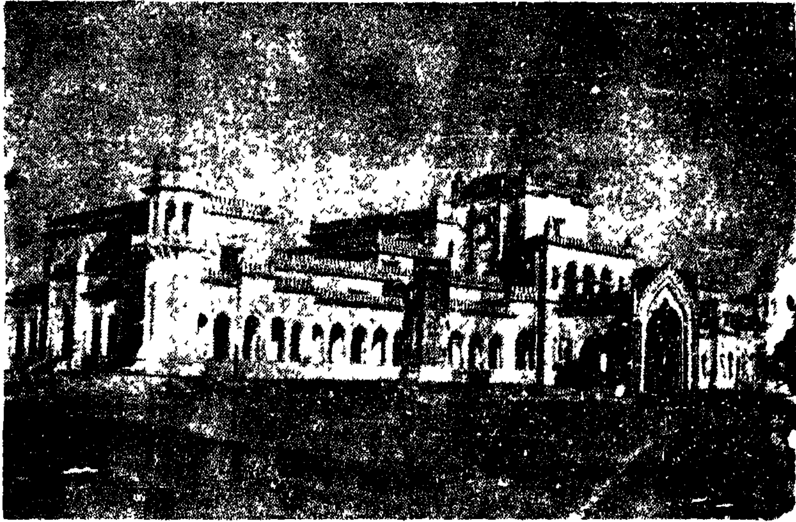
رہنے دو یہ دلداری و اندازِ کرم
اے دوست نہ کھل جائے رفاقت کا بھرم
بیٹھا ہوں گھنی چھاؤں میں سستانے کو
حالات کے جس موڑ پہ ہارے ہیں قدم

آنکھوں کے حسیں جام ہیں چھلکے چھلکے
لہرائے موئے شانوں پہ گیسو ڈھلکے
اے میری سکھی تو نے بھی اُن کو دیکھا
نرموہی ہیں پریتم وہ بڑے کس بل کے

کتب خانہ ندوۃ العلماء کے اردو مخطوطات

[illegible]

اب سے ۸۰ سال پہلے ۱۸۹۰ء میں جب اس [illegible] خیال [illegible] علما [illegible] ندوۃ العلماء کے [illegible] لکھنؤ میں اس عظیم درسگاہ کا سنگ بنیاد [illegible] تعلیم [illegible] کی اشاعت [illegible] کے [illegible] کھلے رہیں۔ اس وقت کی بات ہے [illegible] بانکی پور، رام پور اور آصفیہ حیدرآباد کے کتب خانے [illegible] ہیں سے اور محققین کو



[illegible] دارالعلوم کی عمارت

کے لیے ایک [illegible] کتب خانہ [illegible] اس وقت ان [illegible] آسانی سے استفادہ کے مواقع حاصل نہیں تھے۔ جس میں ایک ایسے کتب خانہ کا تصور بھی تھا [illegible] کتابوں کے ساتھ عربی فارسی مخطوطات کا اہم ذخیرہ ہو اور [illegible] خاص [illegible] اس وقت کے اخبارات و رسائل میں علامہ شبلی اور مولانا آزاد کی تحریروں اور [illegible] سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس

کتب خانہ کا قیام ضمنی نہیں تھا بلکہ درسگاہ کے مقاصد اور اس تحریک کا اہم جز تھا۔

اس مقصد سے متعلق علمی کام تھا جہاں پورے کے اجلاس سے شروع ہوا۔ سب سے پہلے مولوی عبدالرافع صاحب ڈپٹی کلکٹر نے تقریباً دو ہزار کتابوں کے بیش بہا عطیہ سے اس کا سنگ بنیاد رکھا۔ پھر پٹنہ کے اجلاس میں مولوی عبدالعظیم صاحب نے دو سو کتابوں کا اس پر اضافہ کیا اور مولوی سید عبدالغنی نے تاریخ و ادب کی ایک سو ایک کتابیں عطا فرمائیں۔ ان کے علاوہ وقتاً فوقتاً بعض اور عطیے بھی اس سرمایے کو وسیع کرتے رہے جن میں نواب عالمگیر محمد خاں بہادر جاگیردار کھویال، سید حمیدالدین صاحب رئیس پٹنہ، مولوی محمد یحییٰ صاحب مرحوم اور سید احسن شاہ کے عطیات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ان عطیوں کی تعداد کا اندازہ صرف اس سے ہوسکتا ہے کہ اس وقت اس کتب خانہ میں کتابوں کی کل تعداد لگ بھگ ۶۲ ہزار ہے جن میں بہت بڑی تعداد عطیات ہی کے ذریعے حاصل ہوئی ہے۔ بعض اہل علم نے تو پورے پورے کتب خانے اس کے لیے وقف کر دیے چنانچہ اس وقت متعدد مستقل ذخیرے [illegible] یہاں ہیں ان میں نواب صدیق خاں، نواب نورالحسن خاں، نواب نجم الحسن خاں، واجد علی خاں، [illegible] الخلیل اور علامہ سید عبدالحی حسنی کے [illegible] کتب خانے شامل ہیں جو قلمی اور مطبوعہ نادر و نایاب کتابوں سے مالا مال ہیں۔ کتب خانہ میں زیادہ تر کتابیں عربی کی ہیں۔ ان کے بعد فارسی اردو اور انگریزی کی ہیں۔ عربی فارسی اور اردو مخطوطات تقریباً ڈھائی ہزار ہیں جن میں سے بیشتر شائع نہیں ہوئے تھے اور اب حال ہی میں شائع ہوئے ہیں۔

اردو زبان میں مخطوطات کی تعداد گو کم ہے مگر ان میں بیشتر قدیم الخط ہیں اور چند ایسے بھی ہیں جو شائع نہیں ہوئے یا انھیں حوالہ اور اصل کی حیثیت حاصل ہے۔ ذیل میں ادبیات اردو سے متعلق چند اہم مخطوطات کا تعارف قلمبند کیا جاتا ہے:

۱۔ دیوان منتظر: سطور فی صفحہ ۱۵۔ سائز ۹ × ۵۔ سنہ کتابت ۱۲۳۸۔ اوراق ۲۳۴۔

خواجہ نورالاسلام منتظر مصحفی کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ انھوں نے مصحفی کی طرف سے ان کے حریفوں کو جوابات دیے ہیں۔ مصحفی نے منتظر کا ذکر اپنے تذکرہ ہندی گویاں میں کیا ہے اور اس وقت ان کی عمر ۲۵ سال بتائی ہے۔ یہ تذکرہ چونکہ ۱۲۰۹ھ میں مرتب ہوا ہے اس لحاظ سے منتظر کا سال پیدائش تخمیناً ۱۱۸۴ ہوتا ہے۔

دیوان شاعر کی حیات میں لکھا گیا۔ مخطوطہ تقریباً ۴۸۰۰ اشعار پر مشتمل ہے۔ کاغذ عمدہ ہے۔ کہیں کہیں کرم خوردگی کی وجہ سے الفاظ محو ہوگئے ہیں۔ مجموعی طور پر کتابت خوشخط اور حسین ہے۔ اس پر علامہ شبلی کے دستخط ہیں اور انھوں نے اپنے قلم سے بعض مقامات پر تصحیح بھی کی ہے۔ اس دیوان کا دوسرا نسخہ ہندستان کے کسی کتب خانہ میں موجود نہیں ہے۔ دیوان حمد کے بعض اشعار سے شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد غزلوں کا سلسلہ ہے جو زیادہ طویل ہے۔ اخیر کا ½ حصہ مخمسات اور ہجو مایہ مشتمل ہے۔

آغاز:

اسی کی حمد کی خاطر ہوئی منہ میں زباں پیدا
کیا اک حرف کُن میں جس نے یہ کون و مکاں پیدا

نمونۂ کلام

میں منتظر اُس شوخ کی فرقت میں جو دیکھا
اللہ نہ دکھلاوے وہ غم اور کسی کو

ترقیمہ: تمام شد دیوان تصنیف میاں منتظر شاگرد میاں مصحفی صاحب تاریخ ہفتم شوال ۱۲۳۹ھ

۲۔ کلیات میر مسمی محمد تقی میر بن عبداللہ متوفی ۱۲۲۵ھ سنہ کتابت ۱۲۳۸ھ، سائز: ۱۱ × ۶۔ سطور ۲ اوراق ۴۵۔

میر کے ۱۳ سال بعد کی کتابت ہے۔ مجموعی طور پر دیوان

اس سے ماقبل اور بعد کے دو ایک صفحات غائب ہیں۔
۳۔ تذکرہ الشعراء (تذکرہ ہندی گویاں) شیخ غلام ہمدانی مصحفی متوفی ۱۲۴۰ھ تاریخ کتابت ۱۲۰۹ھ سائز [illegible] ۵۔ سطور ۱۳ [illegible] ۴۳۔

یہ تذکرہ [illegible] کا لکھا ہوا ہے لیکن یہ تحقیق نہیں معلوم ہوتا [illegible] جس سے یہ معلوم ہوا ہے [illegible] البتہ کئی مقامات پر کاٹ کر اصلاح کی [illegible] نہیں معلوم ہوتا ہے [illegible] دوسروں سے نقل کرایا ہے اور اس پر [illegible] اصلاح کی ہے۔

[illegible] مصحفی کے قلم سے [illegible] کتاب کے [illegible] ایک رشحات [illegible] اور دوسرا [illegible] جیسے محمد [illegible] صرف ۱۸ ورق ہے۔ اس [illegible] کے دستخط ہوں گے

ترقیمہ [illegible]

۴۔ رسالہ [illegible] سطور [illegible] ۱۲۱۱ [illegible]

آغاز [illegible] کرتا ہے کہ [illegible] ہیں۔

ترقیمہ [illegible] ۱۲۷۸ [illegible] محمد حسین

۵۔ دیوان مصحفی [illegible] ہمدانی [illegible] محمد متوفی ۱۲۴۰ھ۔ سنہ کتابت ۱۲۰۹ [illegible] ورق ۶۳۔ سطور ۱۵ [illegible] قدیم [illegible]

یہ [illegible] مصحفی کا چوتھا دیوان ہے کیونکہ [illegible] مصحفی کے ۳ دیوان مکمل ہو چکے تھے۔ اس کا اقرار ایک تذکرہ ہندی میں موجود ہے [illegible] ہندی میں

قصائد اور ہجو موری حسنا موجود ہے۔ "مرید" تابوت میں لگی والی غزل کا ہونا ظاہر کرتا ہے کہ یہ چوتھا دیوان ہے۔ خود معاصرین کے لیے ایک ہجو یہ قطعہ "رنوانے کی شاعری چھپانے کی شاعری" اس میں موجود ہے۔ اس لیے بھی اسے چوتھا دیوان ہونا چاہیے۔ لیکن یہ دیوان مکمل نہیں ہے۔ اس میں صرف ردیف "ی" کی غزلیں ہیں اور کچھ قصیدے بھی۔ صفحہ ۴ کے حاشیہ پر لکھی ہوئی غزل جس کا مقطع ہے ؎

اے مصحفی [illegible] تو وہ بولا
[illegible] مرا سائل کئی دن سے

خود مصحفی کے ہاتھ کی تحریر معلوم ہوتی ہے۔ اگرچہ اس کا کوئی اور ثبوت اس نامکمل دیوان میں نہیں ہے تاہم اندازہ یہی ہے کہ [illegible] کی زندگی میں نقل ہوا۔

مصحفی کے تذکرہ ہندی کا قلمی نسخہ جو اس کتب خانہ میں موجود ہے اور اس میں مصحفی نے اپنے قلم سے کچھ اصلاحیں کی ہیں اس نسخہ کا خط [illegible] کتابت بڑی حد تک اس دیوان کی تحریر سے ملتا ہے۔ دیوان میں وہ قصیدہ بھی ہے جو میر کی زندگی میں [illegible] کیا تھا۔

آغاز [illegible] بے رنگ سیاہی لیے جواس کی حنا کا
ہاتھوں پہ [illegible] کی او داہٹ نہیں آتی

۶۔ دیوان مومن مرزا محمد تقی خاں مومن۔ سائز [illegible] سطر ۱۳۔ نسخہ قدیم و خوشخط۔ سنہ کتابت موجود نہیں۔ اوراق ۳۹۔

آغاز

نقوش کلک قسمت سے ہے اندیشہ کو حیرانی
بڑھا جاتا نہیں سرگرمی سے خط پیشانی

اختتام۔

یم دانستم نہیں اُس کی ادا سے حالی
ترم اک فتنۂ خوابیدہ تہ مژگاں ہے

تمام شد دیوان

دیوان کا دوسرا نسخہ بھی اس کتب خانہ میں موجود ہے جو زیادہ مکمل اور صحیح ہے۔ لیکن یہ فیصلہ مشکل ہے کہ مذکورہ دونوں دیوانوں میں تاریخ کتابت کے لحاظ سے کون سا نسخہ زیادہ قدیم ہے۔ دوسرے نسخہ میں عربیات کے سوا مثنویات کا حصہ بھی شامل ہے۔

۷- **مثنوی سراپا سوز: محمد صادق خاں اختر** - سن کتابت ۱۲۴۸ھ - سائز ۹½×۶½ - سطور ۱۳ - اوراق ۴
نسخہ قدیم اور خوشخط ہے۔

آغاز در صفت عشق حقیقی کہ دو سطر ایک عالم است و سبب خلقت بنی نوع آدم۔
خلق عالم سے مدعا ہے عشق مظہر ذات کبریا ہے عشق

اختتام:

سمجھ مراک کو ہوشیار ہم آئے تھے یہاں اختر
بچشم غور جو دیکھا تو متوالوں کی بستی ہے

۸- **مظہر معجزات ائمہ معصومین** ناصر تخلص ناصر۔ سنہ کتابت ۱۲۵۷ھ کاتب علی نقی بن مہرخان۔ سطور ۱۶ - سائز ۹½×۶ - اوراق ۱۰۰ - نسخہ خوشخط و قدیم۔

آغاز:

سزاوار حمد و ثنا ہے خدا خدا ہی سزاوار حمد و ثنا

اختتام و ترقیمہ:

یہ تاریخ پہلی ہوئی تھی بہم
کیا تھا تجلی خاطر رقم

۱۲۵۲

کتاب تمام شد بر مکان نواب ممتاز اللہ خاں بہادر دام اقبالہٗ رو برو داروغہ دلدار خاں و طاہر صاحب و امیر خاں بخط علی نقی ساکن نگینہ در لکھنؤ مولف سنہ شہر ذی الحجہ ۱۲۵۷ھ۔

۹- **دیوان برہمن: سن کتابت نامعلوم** - سائز ۱۰×۶ - سطور ۱۵ - اوراق ۶۵

آغاز "بسم اللہ الرحمن الرحیم"
دیوان اس حال کے مطابق ہوتا [illegible] سوائے [illegible]

اختتام:

کاش ناصد کہ یاد آوے [illegible] تماد آوے [illegible]
[illegible] میں ہے [illegible] تیری وقت
[illegible]
[illegible] مثنوی [illegible] سائز [illegible]
[illegible] قدیم [illegible] نامعلوم [illegible] ورق ۱۱۹۔

آغاز

[illegible] ذات خدا سے ہے

اختتام

[illegible] حساب میں
[illegible] تمام [illegible] ہے

۱۱- **معراج نامہ** [illegible] دکھنی [illegible]
[illegible] نامعلوم - سائز [illegible] سطور [illegible] - اوراق ۳۰۔

آغاز معراج نامہ دکھنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم [illegible]

[illegible] صفت [illegible]

اختتام [illegible] شد [illegible]

[illegible] تھی میں [illegible] وجہ سے سمجھ میں نہیں آتے۔ سین [illegible]ھ اور [illegible]ھ تحریر [illegible] اس کے ساتھ تاریخ وفات لکھی ہے۔

۱۲- **منتخب الامثال، مقبول احمد ابن قدرت احمد متی**۔ سائز [illegible] سطور [illegible] - اوراق [illegible] - سنہ کتابت [illegible] ۱۲۵۲ھ۔

اردو کے ضرب الامثال کا مجموعہ ہے۔ حروف تہجی کی بنیاد پر مرتب کیا گیا ہے۔ [illegible] خوشخط اور عمدہ ہے۔ کہیں کہیں میر حسن

[illegible] تک

کی مہریں ثبت ہیں۔

۱۲۔ شاہنامہ اُردو: نسخہ قدیم ہے۔ سائز ۱۰″ × ۶″۔
اوراق ۲۱۔

آغاز

سرنامہ حمد خُدائے کریم کہ ہے کردگارے غفور و رحیم

آخر کے کچھ صفحات غائب ہیں۔

ان مخطوطات کے سوا درج ذیل نسخے قابل ذکر ہے جن کا تفصیلی تعارف کسی مناسب موقع سے کیا جاسکے گا

۱۔ نوادر اللغات مرتبہ سراج الدین علی خاں آرزو
۲۔ نان و حلوہ (نامعلوم مجموعہ) مرزا فتیح
۳۔ تذکرہ ریختہ گویاں۔ مرتبہ علی حسینی گردیزی سنہ تالیف ۱۱۶۶ھ سال کتابت ۱۱۷۴ھ
۴۔ تذکرۃ الشعراء۔ مرتبہ میر غلام حسین متخلص حسن متوفی ۱۲۱۰ھ
۵۔ لغات بے نقط مرتبہ عزیز بلگرامی
۶۔ رسالہ مصائب اہل بیت۔ از علمائے شیعہ
۷۔ دیوان محمدی (مولوی محمد نظام) سال ترتیب ۱۲۶۱ھ۔
۸۔ دیوان ولی دکنی
۹۔ غنچہ آرزو: دیوان میر وزیر علی صبا تلمیذ آتش متوفی ۱۲۷۱ھ۔ سال ترتیب ۱۲۷۲ھ
۱۰۔ دیوان شیدا
۱۱۔ کلیات ناسخ (امام بخش ناسخ ۱۲۵۴ھ)
سال کتابت ۱۲۴۹ھ
۲۸۔ کلیات میر (میر تقی میر متوفی ۱۲۲۵ھ)
سال کتابت ۱۲۴۹ھ
۲۹۔ مثنوی شمشاد و صنوبر۔ سال کتابت ۱۲۴۹ھ
۳۰۔ کلیات سودا۔ ۱۱۲۵–۱۱۹۵ھ
۳۱۔ مثنوی سحرالبیان (میر غلام حسن دہلوی متوفی ۱۱۹۹ھ) اور
۳۲۔ دیوان نظام۔

صرف ادبیات اُردو سے متعلق چند مخطوطات کا تعارف تھا۔ اس کے سوا مذہبی تاریخی اور متفرق موضوعات سے متعلق اُردو مخطوطات کا بڑا ذخیرہ بھی یہاں موجود ہے۔



اُتّر پردیش شاہ راہِ ترقی پر

[illegible] آراضی بنک میں [illegible] ارب [illegible] ● ● ● [illegible] میں اون کی [illegible] کے لیے ایک [illegible] پروگرام ● ● ● امداد باہمی [illegible] کے امکانات ● ● ● [illegible] کاشتکاروں کو مالی امداد ● ● ● پہاڑی ضلعوں کے ۱۹۳ [illegible] فراہم [illegible] ● ● ● [illegible] علاقوں کے [illegible] ● ● ● [illegible] مزدوروں کی اجرت [illegible] ۲۵ روپے کا [illegible] اضافہ ● ● ● [illegible] سے [illegible] ● ● ● [illegible] کی [illegible] لاکھ کا [illegible] ● ● ● [illegible] شائع ● ● ● [illegible] کی [illegible] تحفظ کا بندوبست ● ● ● [illegible] ● ● ● [illegible] کا استعمال [illegible] ● ● ● متفرقات

اتر پردیش ریاستی امداد باہمی [illegible] کے لیے قرضے تقسیم کرنے کے سلسلے میں ملک میں اول مقام حاصل کرنے کے بعد یکم مئی سے ایک نئی اسکیم جاری کر کے امداد باہمی [illegible] ایک نئے [illegible] کا اضافہ کیا ہے۔

بنک نے نئی اسکیم [illegible] کے نام سے شروع کیا ہے جس کا افتتاح وزیر امداد باہمی [illegible] نے ایک مخصوص تقریب میں بینک کے احاطے [illegible]

اس اسکیم نے آغاز کے [illegible] روپے کی رقم جمع ہوگئی۔

وزیر امداد باہمی نے اس اسکیم کا خیر مقدم کرتے ہوئے [illegible] کہ یہ اسکیم بنک کے اپنے وسائل کی تعمیر کے سلسلے میں معاون ہوگی۔

بنک کے صدر نے عوام کو بنک کی رفتار ترقی سے [illegible] کرتے ہوئے کہا کہ بنک نے گذشتہ چھ سال کی مدت میں مجموعی طور پر ۵ [illegible] کروڑ روپے کے قرضے ریاست کے [illegible] لاکھ سے زیادہ کسانوں میں ان کی زراعتی ضروریات کی تکمیل کے لیے تقسیم کیے ہیں۔ مزید یہ کہ بنک نے گذشتہ ماہ میں ختم ہونے والے مالیاتی سال کے دوران ۲۴ کروڑ روپے کے قرضے تقسیم کر کے ایک نیا ریکارڈ قائم کیا ہے اور مالیاتی سال [illegible] کے دوران اس کارگزاری میں مزید اضافہ ہوگا اس لیے کہ [illegible] کروڑ روپے کے قرضے تقسیم کرنے کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔

حکومت اتر پردیش [illegible] اتر پردیش میں [illegible] اور [illegible] اضلاع میں جہاں بکثرت بھیڑیں پائی جاتی ہیں بھیڑوں کی [illegible] نسل اور [illegible] کے لیے ۳۶ء ۲۹ لاکھ روپے لاگت کی [illegible] شروع کی ہے۔ ریاست میں پائی جانے والی [illegible] بھیڑوں کی تقریباً [illegible] فیصد بھیڑیں اس خطے میں پائی جاتی ہیں۔

اس پراجیکٹ کے تحت جس کی تکمیل موجودہ منصوبے کی مدت میں متوقع ہے، ایک لاکھ کیلوگرام سے زیادہ اون تیار کیا جائے گا جس سے [illegible] اور [illegible] ڈالر کمانے والی قالین سازی کی صنعت کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ اس پراجیکٹ کے تحت [illegible] سے زیادہ افراد کو براہ راست روزگار ملے گا۔

آغاز کار کے طور پر ان اضلاع میں بھیڑوں اور اون کے ترقیاتی توسیعی مراکز قائم کیے جا رہے ہیں جن کی کل تعداد ۵۰ ہوگی۔ ہر مرکز میں ۵۰ بھیڑیں ہوں گی۔

نظامت نگہداشت مویشیاں بھیڑوں کے امراض کی بروقت تشخیص کے لیے ایک تجربہ گاہ قائم کرنے کی تجویز بھی رکھتی ہے۔ ان کے نقصان کو کم کرنے کے لیے [illegible] علاقے میں [illegible] آنتاریت والی مشینوں کا استعمال شروع کیا جا رہا ہے اور نظامت نے ایسی [illegible] مشینیں حاصل کر لی ہیں۔

یاد ہوگا [illegible] سے [illegible] میں اون کی [illegible] فیصدی اور

جے پور ریاست کا ایک پراجیکٹ شروع کیا ہے تاکہ کھیتی باڑی والے
والوں کو بہتر قیمت مل سکے۔ اس سہولت کی توسیع کھیتی باڑی
والوں کی امداد باہمی انجمنوں کے ذریعے اس علاقے میں بھی کی جا رہی ہے۔

آسام حکومت نے ضلع افسروں کو ہدایت کی ہے کہ ایسے
مصیبت زدوں کو امداد، تقاوی اور قرضوں کی بروقت ادائیگی کا
بندوبست کریں جو قدرتی آفات مثلاً آتش زدگی، سیلاب، شدید
بارش اور خشک سالی سے متاثر ہوئے ہوں۔

حکومت نے اس بات پر تشویش کا اظہار کیا ہے کہ قدرتی آفات
کا شکار ہونے والوں کو سرکاری مالی امداد بروقت اور مستقل طور پر
نہیں ملتی۔ بعض اوقات آتش زدگی سے شکار ہونے والے افراد کو
حکام کی اس غلط فہمی کی بنا پر کوئی مالی امداد نہیں مل پاتی کہ
آتش زدگی ایک قدرتی آفت نہیں ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں حکومت
کے کثیر مصارف کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔

ہدایات میں کہا گیا ہے کہ ضلع افسروں کو اس بات کا پورا خیال
رکھنا چاہیے کہ مستقبل میں ایسی شکایتیں پیدا نہ ہوں۔

اترپردیش کے محکمہ مال نے وقتاً فوقتاً جو گشتی مراسلے جاری
کیے ہیں اُن کے موجب ایسے خاندانوں کو ۱ روپے تک کی معت
مالی امداد منظور کی جا سکتی ہے جو بالکل بے سہارا ہوں۔ ضلع افسر
یہ رقم ایسے کاشتکاروں کو منظور کرنے کے سلسلے میں بھی اپنے اختیارات
استعمال کر سکتے ہیں جن کے پاس ایک ایکڑ تک زمین ہو۔

غریب خاندانوں کو ایسے مکانات کی تعمیر اور مرمت کے لیے رقم
منظور کرنے کا بندوبست کیا گیا ہے جنھیں نقصان پہنچا ہو۔ دیہی
علاقوں میں فی خاندان ۲ روپے تک اور شہری علاقوں میں فی خاندان
۳ روپے تک منظور کیا جا سکتا ہے۔

دیہی علاقوں میں مکان کی تعمیر کے لیے ایک غیر زراعت پیشہ
خاندان کو امدادی تقاوی کی شکل میں ۵۲ روپے تک اور شہری
علاقوں میں ۲ روپے تک کی رقم منظور کی جا سکتی ہے۔ خصوصی
معاملات میں شہری علاقوں کے لیے یہ رقم ۳ روپے تک بڑھائی جا سکتی
ہے۔ امدادی تقاوی کی منظوری کے لیے ۱ء۵۶ ایکڑ تک کی جوتوں کے
کاشتکار کو غیر زراعت پیشہ تصور کیا جائے گا۔

اس اسکیم کے تحت ۱ء۵۶ ایکڑ یا اس سے زیادہ رقبے کے
کاشتکاروں کو مکانات کی تعمیر کے لیے امدادی تقاوی کے طور پر ۵۰۰
روپے تک دیا جا سکتا ہے۔ خصوصی حالات میں یہ رقم کاشتکاروں
کو مکانات کی تعمیر کے علاوہ ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیے بھی دی
جا سکتی ہے۔

حکومت نے لائبریریوں کی ترقی کے لیے مالی امداد دینے کے واسطے
رضاکار تعلیمی تنظیموں سے درخواستیں طلب کی ہیں۔ مالی امداد کا استعمال
عمارتوں کی تعمیر، نیز کتابوں، فرنیچر اور ساز و سامان کی خریداری
کے لیے کیا جائے گا۔

اس اسکیم کے تحت صرف ایسی رضاکار تنظیمیں مالی امداد حاصل
کر سکتی ہیں جو پبلک لائبریریوں کو چلا رہی ہوں اور کم سے کم
۵ افراد کو پڑھنے کے لیے کتابیں مہیا کر رہی ہوں۔ ریاستی
حکومت یا لوکل باڈیز کے زیر انتظام چلنے والی تنظیموں کو یا ایسی
تنظیموں کو جو ریاستی مجالس قانون ساز کے ایکٹ کے تحت قائم
کی گئی ہوں مالی امداد نہیں مل سکتی۔

خواہش مند تنظیموں کو چاہیے کہ وہ اپنی درخواستیں مقررہ فارم
پر متعلقہ ریاست کے محکمہ تعلیمات کے توسط سے محکمہ ثقافتی امور حکومت
ہند کو بھیج دیں۔ درخواستوں کے مقررہ فارم اور دیگر تفصیلات ضلع
انسپکٹر آف اسکولز سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ مقررہ فارم پر درخواستوں
کی پانچ نقلیں متعلقہ ضلع انسپکٹر آف اسکولز کے پاس بھیجنا چاہیے۔
جس میں سے تین نقلیں ڈائرکٹر تعلیمات کے توسط سے ریاستی حکومت
کو آئندہ ۱ اگست تک قطعی پہنچ جانا چاہیے۔

وزیر بحالیات شری نارائن دت تواری نے حال ہی میں ودھان سبھا
کے سوالات کے دوران بتایا کہ ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۱ء کے دوران
پہاڑی منطقہ کے آٹھ اضلاع میں مجموعی طور پر ۱۹۳ مواضعات کو بجلی

فراہم کی گئی ہے۔ اُنھوں نے مزید بتایا کہ ان میں سے ۸۴ مواضعات کو ۱۹۶۹ء اور ۱۰۹ مواضعات کو ۱۹۷۱ء میں بجلی فراہم کی گئی۔

وزیر موصوف نے کہا کہ ان دو برسوں میں نینی تال ضلع میں ۴۳ مواضعات کو کاشی پور گڑھوال میں ۱۳، پوڑی گڑھوال میں ۱۹، المورہ میں ۷، اتر کاشی میں ۶، چمولی میں ۲۰، تھوراگڑھ میں ایک اور دہرہ دون میں ۴۶ مواضعات کو بجلی فراہم کی گئی۔

اتر پردیش میں وناسپتی لائسنسنگ آرڈر میں ایک ترمیم کے بموجب دیہی علاقوں میں چھوٹے دوکاندار اب ۵۰ کیلوگرام تک وناسپتی روغن کی خرید، اس کا ذخیرہ اور اس کی فروخت بغیر لائسنس کے کر سکتے ہیں۔

یہ اقدام دیہی علاقوں کے صارفین کو وناسپتی فراہم کرنے اور ایسے وقت جب اس کی آمد بازار میں اچانک کم ہو جائے چور بازاری کو روکنے کے مقصد سے کیا گیا ہے۔

دیہی علاقوں کے وناسپتی روغن فروخت کرنے والے دوکانداروں کو ضلع سپلائی افسر کا بلا قیمت جاری کردہ ایک کارڈ اپنے پاس رکھنا ہوگا۔ اس کارڈ پر نمبر پڑے ہوں گے اور اس پر دوکاندار کا نام، دوکان کی جگہ اور اس کا پتہ درج ہوگا۔

تھوک دوکانداروں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ ہر ماہ اپنے کوٹہ کا ۲۵ فیصد دیہی علاقوں کے غیر لائسنس شدہ دوکانداروں کو ڈلیوری کرنے پر فراہم کر دیں۔ انھیں یہ ہدایت بھی کی گئی ہے کہ وہ اپنی فرم کا نام، پتہ اور وناسپتی روغن کی مقدار غیر لائسنس یافتہ دوکاندار کے کارڈ پر درج کر دیا کریں۔

ریاستی حکومت نے پردیش میں تین جوٹ ملوں کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے مزدوروں کو یکم جنوری ۱۹۷۲ء سے ماہانہ اجرتوں میں ۲۵ روپے کا خصوصی کا اضافہ کریں۔ اضافہ کا حکم جن کو دیا گیا ہے یہ ہیں جے۔ کے جوٹ مل کانپور، کانپور جوٹ ادیوگ کانپور اور مہابیر جوٹ مل سہجنوا، گورکھپور۔

یہ حکم گذشتہ ۲۸ اپریل کو اُس کمیٹی کی عارضی رپورٹ موصول ہونے کے بعد دیا گیا ہے جو ریاست میں جوٹ مل مزدوروں کی اجرتوں اور دیگر معاملات کی جانچ کے لیے مقرر کی گئی تھی۔

کمیٹی نے ان ملوں میں کام کرنے والے مزدوروں کے لیے متعینہ طور پر اس وقت تک کے لیے خصوصی اضافے کی سفارش کی ہے جب تک وہ اپنی قطعی رپورٹ نہ پیش کر دے۔

خصوصی اضافے سے متعلق حکم چھ ماہ کی مدت تک یا کمیٹی کی قطعی سفارشات پر عمل درآمد ہونے تک، جو بھی پہلے واقع ہو نافذ رہے گا۔

حکومت اتر پردیش نے ریاست میں ۱۹۷۲ء کے دوران مزدوروں کی فلاح کے مزید ۱۰ مرکز کھولنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ مرکز دہرہ دون، بنکی (کانپور)، گوپی گنج، مغل سرائے (وارانسی)، مئو (اعظم گڑھ)، ٹانڈہ (فیض آباد)، بستی، سیتاپور، ماری آنا (میرٹھ) اور خورجہ (بلند شہر) میں کھولے جائیں گے۔

اس مقصد کے لیے ریاست کے ۱۹۷۲-۷۳ء کے بجٹ میں ۱،۷۸۰ روپے کا بندوبست کیا گیا ہے۔

یہ مرکز ریاست کے مزدوروں کی سماجی ضروریات پوری کریں گے۔ جن کی تعداد چوتھے پنج سالہ منصوبے کے دوران ریاست کی تیز رفتار صنعت کاری کے نتیجے میں کافی بڑھ گئی ہے۔ اس کے علاوہ ان کا مقصد صنعتی امن برقرار رکھنا اور صنعتی پیداوار میں اضافہ کرنے کے سلسلے میں مزدوروں کا پورا تعاون حاصل کرنا اور ان میں سماجی تحفظ کا احساس پیدا کرنا ہے۔

ریاستی راجدھانی لکھنؤ سے بارہ کیلومیٹر دور لکھنؤ بارہ بنکی روڈ پر تقریباً ۱۳ مربع کیلومیٹر رقبہ میں پھیلے ہوئے ککریل کے جنگل کو مالیاتی سال رواں کے دوران ۲،۷۸ لاکھ روپے کی تخمینی لاگت سے ایک دلکش تفریح گاہ میں تبدیل کر دینے کا منصوبہ تیار کر لیا گیا ہے۔

اس منصوبے کے تحت یہاں سیاحوں کے لیے جلد ہی ایک ٹورسٹ ہٹ۔

آرام گاہ، کیفے ٹیریا، بچوں کے پارک، سیروں کے پارک، باغ اور ایک مصنوعی جھیل کی تعمیر کی جائے گی۔ اس کے علاوہ سیاحوں کی جدید سہولیتیں فراہم کی جائیں گی۔

حکومت [illegible] سے ۱۹۷۱ء میں ضلع [illegible] میں ایس۔ بی شوگر مل کو [illegible] انتظام میں لے لیا تھا۔ [illegible] سال اس مل کو [illegible] لاکھ روپیہ کا [illegible]

۔ مل [illegible] سے [illegible] پر چل رہی تھی۔ حکومت نے اس [illegible] ضلع مجسٹریٹ [illegible] میں دے دیا۔

حکومت نے جب اس مل کو [illegible] مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ [illegible] اور [illegible] اور مزدوروں کو مہینوں سے اُجرت [illegible] اور ملازمین کا بھی کوئی پُرساں حال نہ تھا۔

پنجاب نیشنل بینک سے ۱۰ لاکھ روپیہ [illegible] کی مدت دو ماہ کے اندر [illegible] اخراجات ہوئے۔

مل کی پیداوار [illegible] میں بھی اضافہ ہوا ہے اور [illegible] سال گنے سے شکر کی پیداوار کا فیصد [illegible] سے بڑھ کر ۹٫۴ ہو گیا۔

مل کے مزدوروں اور ملازموں کی [illegible] پابندی [illegible] اور دیگر [illegible] کی ادائیگی [illegible] مزدوروں کو ہر ماہ پہلی تاریخ کو [illegible] کے ساتھ ان کی اجرت ادا کی گئی اور اس طرح تمام ملازمین کا [illegible] حاصل کیا گیا۔

حکومت نے پنجاب نیشنل بینک [illegible] اور گارنٹی کمیشن [illegible] دیگر تمام [illegible] کی ادائیگی بھی کر دی۔

ریاستی محکمہ تعمیرات عامہ نے ۷۲-۱۹۷۱ء کے دوران پُلوں کی تعمیر کے [illegible] مقررہ نشانہ سے ۱۱۱ فیصد سے زیادہ کام کیا ہے۔ [illegible] سال میں ۲ پُلوں کی تعمیر مکمل کی گئی جبکہ ۱۰ کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ ریاست کے مختلف حصوں میں ۱۴۱ [illegible] پُلوں پر کام ہو رہا تھا۔ ان پُلوں کی کُل تخمینی لاگت ۱۱ [illegible] روپے سے زیادہ ہے۔

[illegible] کے دوران [illegible] پُلوں کی تعمیر مکمل ہوئی ان میں علاوہ دیگر [illegible]

ضلع [illegible] ۱۹ [illegible] روپے کی لاگت کا گنگا ندی [illegible] روپے کی لاگت کا [illegible] ۲۴ لاکھ روپے کی لاگت کا [illegible] ۱۹ لاکھ روپے کی [illegible]

[illegible] سال [illegible] دوران [illegible] قومی شاہراہ نمبر [illegible] ۲۳ ۱۴ لاکھ [illegible] کی لاگت کا پُل تعمیر کیا گیا [illegible] اس کا افتتاح وزیر اعظم [illegible]

[illegible] مشرقی [illegible] کے سنگلی علاقوں میں کو [illegible] کی [illegible] وں کی پناہ گاہ دودھوا میں کیا جا رہا ہے۔ یہاں ان کی تعداد تقریباً ایک ہزار ہے۔

[illegible] پناہ گاہ [illegible] مقام سے تقریباً ۶۰ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے اور ۲۱۲ مربع کلومیٹر کے رقبہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ [illegible] پناہ گاہ [illegible] موتار پور پناہ گاہ کے نام سے موسوم تھی اسے ایک دلکش [illegible] کی حیثیت سے ترقی دی جا رہی ہے۔ وہاں جلد ہی جیسے گاڑیوں، ریسٹ ہاؤس، ہاتھیوں اور دیگر [illegible] کی [illegible] کا بندوبست کیا جائے گا۔

[illegible] میدانی اور ترائی بھابر میں پائے جانے والے [illegible] کی نسل تیزی سے [illegible] ہوتی جا رہی ہے جس کا سبب

جنگلات کی کٹائی، بھرپور کاشت اور اندھا دُھند شکار سے اُتّر پردیش کے محکمہ جنگلات کے افسران اس نسل کو فنا ہونے سے بچانے کے لئے سرگرم اقدامات کر رہے ہیں۔

اعلیٰ دفاعِ فنڈ میں گذشتہ ۴ مئی تک تقریباً ۷۳ء۵ کروڑ روپے کی رقم جمع ہوگئی تھی جو ۱۹۶۲ء میں دفاع فنڈ کے عطیات کی مجموعی رقم تقریباً ۲ء۵ کروڑ روپے سے بھی زیادہ ہے۔

میرٹھ ڈویزن نے ۷۵۳۰۱۰۹ روپے جمع کرکے پہلا مقام حاصل کیا ہے۔ اس کے بعد ترتیب وار روہیلکھنڈ ڈویزن نے ۵۲۷۷۴۴۷ روپے، گورکھپور ڈویزن نے ۵۱۲۴۳۱۳ روپے، آگرہ ڈویزن نے ۳۹۸۶۱۹۵ روپے، لکھنؤ ڈویزن نے ۳۷۲۷۳۳۲ روپے، فیض آباد ڈویزن نے ۳۵۷۳۷۴۵ روپے، کمایوں ڈویزن نے ۲۷۳۸۳۳۲ روپے، وارانسی ڈویزن نے ۲۶۷۸۶۱۵ روپے، جھانسی ڈویزن نے ۲۳۰۱۷۵۷ روپے، الٰہ آباد ڈویزن نے ۱۶۴۳۷۷۱ روپے اور گڑھوال ڈویزن نے ۱۷۱۷۶۰۸ روپے جمع کیے۔

کمایوں ڈویزن نے فی کس ۴۹ر۱ روپے عطیہ دے کر پہلا مقام حاصل کیا ہے۔ اس کے بعد دوسرا مقام میرٹھ ڈویزن نے تیسرا روہیلکھنڈ ڈویزن نے اور چوتھا مقام جھانسی ڈویزن نے حاصل کیا جہاں فی کس عطیہ کی رقم بالترتیب ۷۶ر۱ روپے، ۷۲ر۱ روپے اور ۵۴ر۱ روپے ہوئی۔

ریاست کے امداد باہمی ڈویزن نے فنڈ کے لیے ایک کروڑ روپے کی رقم جمع کی۔ اس کے علاوہ اُتّر پردیش تہری کونسل نے وزیر اعلیٰ دفاع فنڈ کے لیے ۱۵ لاکھ روپے جمع کیا ہے۔

وزیر اعلیٰ دفاع فنڈ میں دس اضلاع نے سب سے زیادہ رقم جمع کی ہے جن کے نام مع رقم درج ذیل ہیں:۔

میرٹھ ۳۴۳۸۱۵۷ روپے، بستی ۱۹۰۷۵۵۱ روپے، بدایوں ۱۷۹۳۵۰۰ روپے، گورکھپور ۱۷۰۹۰۰۰ روپے، بریلی ۱۶۵۹۱۲۸ روپے، نینی تال ۱۵۷۵۲۳۲ روپے، مظفرنگر ۱۵۵۰۰۰۰ روپے، علی گڈھ ۱۴۸۰۹۳۹۰ روپے، سہارنپور ۶۲۲۲۳۷۵ روپے اور دیوریا ۱۲۱۸۹۹۲ روپے۔

ریاستی حکومت نے عوام کو متنبہ کیا ہے کہ وہ ایسے پیمائشی فیتوں کو تیار کرنے، فروخت کرنے یا استعمال کرنے سے احتراز کریں جن پر انچوں کے یا انچ اور میٹرک پیمائش دونوں کے نشانات لگے ہوں کیونکہ یہ غیر قانونی ہے۔ ایسے پیمائشی فیتوں کی تیاری یا استعمال "معیاری اوزان اور پیمائش ایکٹ ۱۹۵۶ء" اور "اتر پردیش وزن اور پیمائش ایکٹ ۱۹۵۹ء" کی دفعات کی خلاف ورزی ہے اور خلاف ورزی کرنے والے پر مقدمہ چلایا جا سکتا ہے۔

ریاستی حکومت کے وزن اور پیمائش افسروں سے جار لیسنس حاصل کیے بغیر پیمائشی فیتوں کا کاروبار بھی مذکورہ بالا ایکٹ ۱۹۵۹ء کی دفعات کے خلاف ہے جو ایک قابلِ سزا جرم ہے۔ چنانچہ بیوپاریوں کو مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ اپنے متعلقہ حلقے کے وزن اور پیمائش کے اسسٹنٹ کنٹرولر سے لیسنس حاصل کریں۔

متفرقات

صنعتی انجینئرنگ میں پوسٹ ڈپلوما کورس۔ ریاستی حکومت نے سرکاری پالی ٹیکنک، مرزاپور میں آئندہ تعلیمی سال سے صنعتی انجینئرنگ کا ایک سالہ پوسٹ ڈپلوما کورس شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

یہ کورس صنعتی پیداوار میں اضافہ کرنے اور توسیع پذیر صنعتوں کے انتظامی امور کی دیکھ بھال کرنے کے پیش نظر اہل انجینئروں کی بڑھتی ہوئی مانگ کو پورا کرنے کے لیے شروع کیا جا رہا ہے۔ اس کورس میں ابتداً دس امیدواروں کا داخلہ کیا جائیگا۔ اس کے لیے سال رواں کے واسطے ۱۰۸۶۰۰ روپے کا بندوبست

کیا گیا ہے۔

ہوائیہ کے تین جوانوں کو نقد انعامات۔ حالیہ ہند پاک جنگ کے دوران غیر معمولی بہادری کا مظاہرہ کرنے والے ہندستانی ہوائیہ کے تین فوجیوں کو تین ہزار روپے فی کس کی شرح سے نقد انعامات دیے جائیں گے۔ ان فوجیوں کو ویرچکر کے اعزاز سے بھی نوازا گیا ہے۔ ان میں سے ایک کو ویرچکر کا اعزاز بعد از مرگ دیا گیا ہے۔

انعامات پانے والوں کے نام یہ ہیں۔ فلائٹ لفٹیننٹ آر۔ اے۔ میسی (الہ آباد)، فلائٹ لفٹیننٹ جے۔ بی سکلانی (دہرہ دون) اور فلائٹ لفٹیننٹ این گریجا۔ فلائٹ لفٹیننٹ گریجا کا انعام شریمتی ایم۔ ایم۔ سنگھ (سہارنپور) کو دیا جائے گا۔

اخبارات کے خلاف کارروائی۔ تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۵۳ اے کے تحت سن ۱۹۷۱ء میں جن ۷ اخبارات کے خلاف فرقہ واریت پھیلانے کے سلسلے میں کارروائی کی گئی تھی، ان میں سے ۴ اخبارات اردو کے ہیں۔

یہ اطلاع وزیر اعلیٰ شری کملاپتی ترپاٹھی نے ودھان سبھا کے سوالات کے وقفہ میں ایک سوال کے جواب میں دی۔



کلام انیسؔ میں تغزل — (صفحہ ۴۱ کا بقیہ)

رہ بجا تارِ نفس حلق میں جینے کے لیے — چاک زخموں کے فقط رہ گئے سینے کے لیے
بیتاب ہے دل ہجر کا مارا نہیں مجھکو — اب فصل کر وصل گوارا نہیں مجھکو
معشوق کے سوا کوئی پیش نظر نہیں — یہ شوق وصل ہے کہ کسی کی خبر نہیں
سادی نہیں رہتی ہے سدا غم نہیں رہتا — دنیا کا کبھی ایک سا عالم نہیں رہتا
جو آتا ہے اک دن اُسے درپیش ہے جانا — آگے کوئی پیچھے کوئی ہو جاتے روانا
وقفہ کسی دن کا ہے تو عرصہ کسی شب کا — جب طے ہوئی منزل تو مکاں یکّہ سب کا

مندرجہ بالا اشعار میں جس سادگی، سکون اور جادو کیسے وہ ناقابل تردید ہے اور اس قسم کے بے شمار اشعار انیسؔ کے کلام میں دستیاب ہو سکتے ہیں۔

مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں لکھا ہے "دنیا میں جتنے شاعر استاد مانے گئے ہیں اُن میں ایک بھی ایسا نکلے گا جس کا تمام کلام اوّل سے آخر تک حسن و لطافت کے اعلیٰ درجے پر واقع ہوا ہو۔ یہ خاصیت صرف خدا کے کلام میں ہو سکتی ہے"۔[۱] اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے ایک دوسرے مقام پر مولانا فرماتے ہیں کہ میرؔ، دردؔ، آتشؔ، مصحفیؔ وغیرہ استادوں کے دیوان زیادہ تر بھرتی اور پُرتکلف اشعار سے بھرے ہوئے ہیں۔[۲] میر تقی میرؔ کے ضخیم کلیات میں بقول مولانا عبدالحق "رطب و یابس"[۳] بھرا ہوا ہے اور بقول مولانا آزردہؔ "پستش بغایت پست و بلندش بغایت بلند"۔[۴] شعرا کی طویل فہرست میں ایک انیسؔ ایسے شاعر دکھائی دیتے ہیں جن کے کلام پر نہ کہیں رطب و یابس کا اطلاق ہو سکتا ہے نہ کہیں پستی، ابتذال یا عامیانہ پن کا پرتو اُس پر پڑا ہے۔ انیسؔ کا یہ دعویٰ کہ "بھرتی سے کلام ہے مبرا میرا" من و عن درست ہے۔

کلام انیسؔ ایک سمندر ہے جس کا طوفان اُمڈا چلا جاتا ہے اور تھمنے کا نام نہیں لیتا۔ ان کے کلام میں بھرتی حرز نہیں۔ معلوم ہوتا ہے خیالات، جذبات اور الفاظ و تراکیب کی ایک فوج ہے جو پرے باندھے اُن کے چشم و ابرو کے اشارے کی منتظر دست بستہ کھڑی ہے کہ کب آقا حکم دے اور کب تعمیل کے لیے حاضر ہوں۔ مختصر یہ کہ ہم میر انیسؔ کو کچھ نہیں تو کم از کم "سرتاج شعرائے اُردو" ضرور کہہ سکتے ہیں اور دنیا کے عظیم شاعروں میں اُنھیں شمار کر سکتے ہیں۔

---

[۱] مولانا حالی مقدمہ شعر و شاعری، ص۵۸ تا ص۵۹ ۔ [۲] ایضاً ص۵ [۳] مولانا عبدالحق انتخاب کلام میر (مقدمہ) ص۱۹ [۴] مقدمہ شعر و شاعری ص۴۲

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

مصنف: پنڈت کیلاش رائے کول بیدل دہلوی

تصوّراتِ بیدل ناشر: دانش محل امین آباد لکھنؤ۔ قیمت پانچ روپے

شاہ راہِ فن پر سمجھ بوجھ کر چلا جائے تو ایک مرحلہ ہے۔ اس بار میں خرد و جنوں کی ایک وقت ضرورت پڑتی ہے جن کے مطالبات سمجھنے کے لیے خرد کی رہنمائی اور اظہارِ جذبات کے لیے جنوں کی کارفرمائی قریب قریب لازمی ہے۔ شدتِ احساس اگر مناسب و متوازن اندازِ بیان نہ پا سکے تو جا ہی ... تک استعارِ خیالات، دلنشینی سے ہم آہنگ نہیں ہوتے اس راز کو پنڈت کیلاش کول بیدل دہلوی نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا اس قیاس کی وجہ سے ان کی وہ شاعری ہے جو تصوّرات میں جا بجا بکھری ہوئی ہے۔ اس کے مطالعے سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ صرف نام کے بیدل نہیں بلکہ تمام جذبات میں کبھی کبھی ایسا گم ہو گئے ہیں کہ جیسے وہ حقیقتِ منتظر یا صداقتِ حال سے دوچار رہے ہوں۔ رہا جو اس رنگ کی گم شدگی نے اظہارِ خیال کے لیے سازو سامان کی سستی سے بے خبر نہیں ہوئے۔ جذبات کو اسی انداز میں پیش کیا ہے جو ان کا فطری تقاضہ تھا ایسے مقامات پر آپ کو کبھی محسوس نہ ہوگا کہ الفاظ کی قبا خیال کی قامت سے تنگ ہو گئی ہو۔ مثال کے لیے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

جنوں لے چلا ہم کو یا ہم جنوں کو — نہ وہ جانتا ہے نہ ہم جانتے ہیں
گنا کرتا ہوں میں جو دیے اپنے قطرہ میں — ہر شے میں شامل ہوں یہ کون جانے
ارے تو نے کیا کہہ گیا بیخودی میں — الٰہی مرا راز افشا نہ ہو جائے

شدتِ جذبات سے جنوں میں کہہ تو دیا کہ "میں ہر شے میں شامل ہوں یہ کون جانے"۔ پھر ہوش آیا، بیان کی کم مائیگی کا احساس ہوا اور دورازِ خرد کی زبان سے اظہار تو نہ ہوا۔ یہ تو معرفت کی بات ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ذاتی شاعری نے اس طرح کہنے پہ مائل کر دیا مگر اس کا کیا جواب ہے کہ جب ان کی انفرادیت ایک وسیع حقیقت دنیا کے سامنے اس طرح پیش کرتی ہے۔

کوئی پھول ہے جو نہ مرجھائے کھل کر — خزاں سے نہ پوچھو بہاروں سے پوچھو

بہاروں سے اس انجام کا ثبوت طلب کرنا ذاتی مشاہدہ و انفرادی تفکر کا نتیجہ ہے جس لب و لہجے میں ایسی باتیں بیدل صاحب ادا کرتے ہیں اس سے بہتر اندازِ بیان سوچنا مشکل ہے۔ یہ اندازِ فکر و بیان جہاں کہیں بھی راہ پا گیا ہے شعر نقطۂ عروج پر پہنچ گیا ہے۔ مثلاً

مرا نہ ختم ہو سلسلہ تصور کا — وہ آ بھی جائیں ہمیں پھر بھی انتظار رہے
خرد کو کھو دیا وحشت میں بس یہ تو سمجھ میں آ گیا ہے — دیا عصیاں اور روزِ جزا یہ سب افسانہ کیا ہے
معراجِ جنوں پہ بالآخر تسکیں یوں ہو جاتی ہے
وحشت سے بھی وحشت ہوتی ہے دل ایسا دیوانہ ہوتا ہے

حسرتیں ہیں آئی کب اور گئی کب — پکارا کیے ہم جوانی جوانی

بیدل کی شعر گوئی کا اندازِ بیان کسی مفروضہ یا قیاس آرائی کا نتیجہ نہیں بلکہ ان کی عملی تنقید کی تشریح ہے جیسا کہ ایک جگہ خود رقمطراز ہیں کہ "جو شعر میں کہنے کی کوئی بات ہو تو شانِ الفاظ نہ ہو نظمِ خیالات تو ..." شاعری میں ابلاغ و ترسیل جتنے اہم عناصر ہیں اتنی ہی ان کی تشریح ضروری بھی ہے۔ مفہوم کو واضح و دل نشین کرنے کے لیے تشبیہ و استعارہ کا سہارا لینا بظاہر آسان ہے مگر موقع و محل کے لحاظ سے ان کا استعمال اور صنائع بدائع کی نزاکت و لطافت سے مفہوم کی وضاحت خوبصورتی سے ... تک پہنچانا گھاٹ گھاٹ سے بچ کر نکال لے جانے سے کم نہیں۔ یہ بھی فن کا رنگ ہے جس کو شاعرانہ مطالبات، حسنِ خیال کا صحیح مذاق حاصل ہو۔ تصوّراتِ بیدل میں ہمیں اس پہلو کی بہتیری تصویریں جا بجا نظر آتی ہیں جن کے دیکھنے سے یقین ہوتا ہے کہ فن کار کی فکری کاوشیں فطرت کی دین ہیں جن کو شاعر نے شرح سمجھ کر فنِ شعر میں صرف کیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اے سیاہ گھوم رہا ہے کہ لے شلک — لہرا رہی ہے آہ کسی بیقرار کی
رت بھیگی جو چمکی تو لے دن لے جوری — ... تار کی

ستم رسیدہ میری کشتی تھی کہ ساحل ہو گئی — جیتے ہوئے آرزوئے بیدل ہو گئی

بیدل کا اندازِ فکر غالباً نتیجہ ہے اُن کی فکری صلاحیتوں کا۔ ان کے مجموعۂ کلام پر سرسری نظر ڈالنے والے کو بھی آسانی سے ایسے اشعار مل جاتے ہیں جو خیال کی ندرت و بیان کی رنگینی کی وجہ سے دل و دماغ کے لیے کشش کا مرکز بن جاتے ہیں جن میں فکری عنصر بھی ہے اور فن کی بالیدگی بھی جو بیان کی دقت جہاں کہیں بھی حسنِ امتزاج سے پیش کی گئی ہے وہ فنکار کے ریاض و حسنِ بیان کا ثبوت بن جاتی ہیں۔ ہماری نظر میں ایسے اشعار یہ ہیں مثلاً

آتے آتے رحمتِ حق پر یقیں آ ہی گیا — ہوتے ہوتے مست بندوں میں شامل ہو گیا
کب حشر کس سے کہتا پھرتا یہ اسرارِ عشق — آپ نے اچھا کیا بیدل کو دیوانہ کیا
نقطۂ مستی کی بہاروں کی تو تھی دل کیوں تلاش
مدتیں گزریں کہ غالب کا دیوان ہو گئیں
جدائی کی راتیں گزاری ہیں کیسے — قسم ہے کہ تم چاند تاروں سے پوچھو

ان تمام خوبیوں کے دیکھنے کے بعد ہم کو محسوس ہوتا ہے کہ تصوراتِ بیدل نہ تو خیالی باتوں کا مجموعہ ہے نہ روایات کا مرقع ہے بلکہ ایک ذہین فن کار و باخبر شاعر کا قابلِ قدر مجموعہ ہے جو اپنی خوبیوں کے بل بوتے پر اہلِ نظر سے داد طلب ہے اور باوجود قحط الرجال کے اردو کی دنیا میں ابھی اتنے قدر شناس فضلا باقی ہیں جو ایسے پاکیزہ کلام کو فرصت سمجھ کر دل سے داد دیں گے۔

—— پروفیسر ڈاکٹر اعجاز حسین

مصنف جمیل مظہری۔ ناشر مکتبۂ ارتقا
آب و سراب ۱۵ اسی صندل اسٹریٹ کلکتہ ۱۶
(مثنوی) قیمت ۱۰ روپے۔

جمیل مظہری صاحب اختر شیرانی، جوش اور فراق کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں مگر ابھی ان کی شاعری کے سوتے خشک نہیں ہوئے ہیں۔ آج بھی ان کا سفر ارتقا جاری ہے۔ مثنوی آب و سراب سنہ ۱۹۶ء میں لکھی گئی اور پہلے "اردو ادب" میں (شمارہ ۴، ۱۹۶۳ء) شائع ہوئی۔ اب کتابی شکل میں منظر عام پر آئی ہے (جولائی سنہ ۹۷ء)۔

یہ مثنوی فکر انگیز کی تحریر ہے۔ بقول شاعر اس کے مندرجہ ذیل اشعار بے ساختہ لکھی گئی ہے ؎

کیا شکوہ تحیر بے سمجھے — افسوس کہ آدمی نہ سمجھے
یہ قطرہ سحر کبریائی — دریائے تو ہے آشنائی
ہم جائے میں تشنہ عشق کے — بچھڑے ہیں یہ پیچ ویس کے

یہ اشعار اس مثنوی کے مرکزی فکر کو ظاہر کرتے ہیں۔ شاعر نے اس میں عرفان حقیقت کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ اس نے ان تمام فلسفیانہ نظریات اور عقائد کا جائزہ لیا ہے جس کے ذریعے انسان اب تک حقیقت کی تلاش کرتا رہا ہے اور آخر میں وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ خود شناسی کے ذریعے ہی حقیقت کا عرفان ممکن ہے۔

آب و سراب نہ صرف جمیل مظہری کا اہم ترین کارنامہ ہے بلکہ ڈاکٹر محمد حسن کے الفاظ میں اس دہائی کی بھی اہم ترین تخلیق ہے۔ امید ہے کہ اس کتاب کی ادبی حلقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوگی۔ چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں:

جب تک نہ کرے گی آدمیت — فطرت کے خلاف اک بغاوت
اس وقت تلک یہ پیکر خاک — مجبور رہے گا زیر افلاک
بسمل کے عزم جنگ یکسر — برپا کر دو اک جہاد اکبر
ہر سانس میں عزم فاتحانہ — ہر سانس میں جنگ کا ترانہ
میلان سے اپنے اک لڑائی — رجحان سے اپنے اک لڑائی
ہر جذبۂ خام کو کچل دو — فطرت کا مزاج ہی بدل دو

——— فضل امام نقوی

مصنف ڈاکٹر وحید اختر شائع کردہ
خواجہ میر درد تصوف اور شاعری انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔
(مارچ سنہ ۱۹۷۱ء) قیمت پندرہ روپے سائز ۲۲×۱۸/۸ ضخامت ۵۰۳ صفحات۔

یہ کتاب دراصل ڈاکٹر وحید اختر شعبۂ فلسفہ، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا فلسفہ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لیے منظور شدہ تحقیقی مقالہ ہے جو کافی ترمیم و اضافے کے ساتھ موجودہ شکل میں شائع ہوا ہے۔

مصنف نے مقدمہ میں تقریباً ۵۰ صفحات پر مشتمل ہے خواجہ میر درد کے حالات زندگی، شخصیت اور تصانیف وغیرہ پر روشنی ڈالی ہے۔ چار ابواب پر مشتمل کتاب کے حصہ اول میں تصوف کے مختلف مکاتیب اور درد کے نظریات تصوف کو کافی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ حصہ دوم میں درد کی شاعری سے بحث کی گئی ہے۔ یہ حصہ پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ نویں باب میں درد کے تلامذہ کا ذکر کیا گیا ہے اور آخر میں فہرست کتابیات شامل ہے۔

خواجہ میر درد کے معتقدات تصوف اور کلام کو سمجھنے کے لیے یہ ضخیم کتاب یقیناً مفید ہے۔ البتہ چند باتوں کی جانب توجہ دلانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ اگر کتاب میں اشاریہ بھی شامل کر دیا گیا ہوتا تو اس ضخیم کتاب کی افادیت اور بڑھ جاتی۔

۲۔ فہرست کتب کو حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب کیا جانا مناسب ہوتا۔

۳۔ خواجہ میر درد کے حالات زندگی بیان کرنے میں بہت اختصار سے کام لیا گیا ہے۔

۴۔ مقدمے میں بہت سے متنازعہ امور کو محققانہ طور پر پیش کیا گیا ہے لیکن ڈاکٹر وحید اختر کے حسب ذیل دو بیان قابل غور ہیں۔

(الف) "مختلف تذکروں میں درد کا سن وفات مختلف بتایا گیا ہے" (ص ۲۳)

(ب) "تمام تذکرے اس بات پر صاد کرتے ہیں کہ درد نے اپنے وصال کا جو سال متعین کیا تھا اسی سال وہ ۶۶ برس کی عمر میں واصل بحق ہوئے۔" (ص ۴۲)

یہ دونوں بیان واضح طور پر ایک دوسرے سے مختلف اور متضاد ہیں۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر وحید اختر نے اپنی اس کتاب میں آب حیات کی بنا پر محمد حسین آزاد کے اس قول کی تائید بھی فرمائی ہے کہ خواجہ میر درد کا انتقال ۶۸ برس کی عمر میں ہوا۔ مزید برآں موصوف نے دیوان درد مرتبہ بیدار مطبوعہ لکھنؤ سنہ ۱۲۷۱ھ سے ایک قطعہ تاریخ بھی نقل کیا ہے جس کی رو سے درد کی وفات ۶۸ سال کی عمر میں ہونا قرار پاتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ متعین نہیں کیا جا سکتا کہ درد کا سن وفات کیا تھا۔

بہرحال ان کمیوں کے باوجود وحید اختر صاحب کی یہ کتاب یقیناً اس قابل ہے کہ اس پر موصوف کو مبارک باد دی جائے۔ اردو شعر و ادب کے شائقین کے لیے یہ کتاب دلچسپ و مفید ثابت ہوگی اور درد کے کلام کو سمجھنے اور سمجھانے میں اس سے بڑی مدد ملے گی۔

——— کاظم علی خاں

★

REGD No. L 319



[illegible]
[illegible]

آزادی کی پچیسویں سال گرہ

(اسپیشل نمبر اگست ۱۹۷۲ء)

28 (S)



[illegible] کی یادگار (لکھنؤ)

ایڈیٹر [illegible]

پبلشر [illegible] محکمہ اطلاعات [illegible]

پرنٹر [illegible]

مطبوعہ [illegible]

شائع کردہ محکمہ اطلاعات، اتر پردیش

اس شمارے کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا گیا ہے ضروری نہیں کہ حکومت [illegible] ان سے بہرحال متفق ہو

میرے خوابوں کا ہندستان

میں ایک ایسے ہندستان کے لیے جدوجہد کروں گا جس میں غریب سے غریب آدمی بھی یہ محسوس کرے گا کہ یہ اس کا اپنا ملک ہے اور جس کی تعمیر و ترقی میں اس کی آواز کی بھی اہمیت ہے۔ اس ہندستان میں عوام کے چھوٹے بڑے طبقے نہیں ہوں گے اور تمام طبقوں میں مکمل ہم آہنگی ہوگی۔ ایسے ہندستان میں چھوت چھات اور منشیات کی کوئی جگہ نہیں ہوگی۔ عورتوں کو مردوں کے مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ ہم چونکہ تمام دنیا کے ساتھ دوستی اور امن و امان کے ساتھ رہیں گے اس لیے نہ ہمارا استحصال ہوگا اور نہ ہم کسی کا استحصال کریں گے۔ ہماری فوج ممکن حد تک کم سے کم ہوگی۔ ایسے تمام ملکی غیر ملکی مفادات کا احترام کیا جائے گا جو کروڑوں بے آواز انسانوں کے مفادات کے منافی نہ ہوں گے۔ ذاتی طور پر ملکی اور غیر ملکی کے امتیاز سے مجھے نفرت ہے —— یہ ہے میرے خوابوں کا ہندستان! —— اس سے کم پر میں مطمئن نہیں ہوں گا۔

—— مہاتما گاندھی

ہم ایک آزاد ملک ہیں

جواہر لال نہرو

[[illegible] ایک سال [illegible] اگست کو سری جواہر لال نہرو [illegible] ۱۵ اگست ۱۹۴۸ء کو [illegible]]

آج [illegible] اور مبارک دن ہے جو ہم نے برسوں سے دیکھے ہیں [illegible] ہم [illegible] کہ ایک منزل پر ہم پہنچ [illegible] ہم نے ایک بڑی منزل پار کی اور یہ بات طے ہو گئی [illegible] اور کوئی غیر حکومت [illegible]

آج ہم ایک آزاد ملک ہیں [illegible] حکومت کا [illegible] لیکن آزادی [illegible] کا سامنا [illegible] اور ایک آزاد حیثیت سے ہمیں بڑھنا ہے [illegible]

سوال [illegible] سارے عوام کی بہبود کے [illegible] کرنا ہے [illegible] آزادی محض ایک سیاسی چیز نہیں ہے۔ آزادی [illegible] سے جب تک کوئی فائدہ نہ ہو [illegible] ہمارا فرض ہے کہ پوری طرح سے ان سوالوں کو حل کرنے کی [illegible] سوال ہے اور وہ یہ کہ ہمارے سارے ملک میں امن و شانتی [illegible] تک لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں [illegible] معقول طریقے سے [illegible] یہ ہے کہ آج جو ہماری گورنمنٹ [illegible] آپس کی یہ جو نااتفاقی اور جھگڑے ہوتے ہیں [illegible] اتفاقی [illegible] اور ماردھاڑ سے کس طرح حل ہوگی [illegible] آزاد لوگوں کو [illegible]

ہم نے کہا کہ ہم اس ملک میں جمہوری حکومت چاہتے ہیں۔ جمہوری حکومت [illegible] سوال ہیں ہمیں آپس میں صلاح و مشورہ کر کے ایک دوسرے کا [illegible] حل کرنے ہیں [illegible]

اس لیے [illegible] ہے کہ ہمیں [illegible] اس قسم کے [illegible] بڑے اقتصادی سوال اٹھائے ہیں [illegible] کچھ اقتصادی ترقی کرنا ہے، کارخانے کھولنے ہیں [illegible] بڑھے کہ تھوڑی سی جیبوں میں نہ جائے بلکہ عوام کو اس سے فائدہ ہو۔

[illegible] آپ کو اس شبھ دن کی مبارکباد دیتا ہوں لیکن اس کے ساتھ ساتھ آپ کو یاد دلاتا ہوں کہ [illegible] ذمہ داریاں ہیں اس کے معنی ہیں کہ ہمیں آئندہ [illegible] ایک دوسرے سے مل کر کام کرنا ہے تبھی ہم ایسے بڑے سوالوں کو حل کر سکیں گے۔ جے ہند

سراونڈ ۴۸ ۱۹ء تک

اسپیشل نمبر اگست [illegible]



پیغام

اس ماہ ہم ہندوستان کی آزادی کی پچیسویں سالگرہ منا رہے ہیں۔ پچیس سال کا یہ زمانہ آزمائش اور کشمکش کا زمانہ رہا ہے۔ لیکن ہم نے کامیابی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا جس کے نتیجے میں ہمارا ملک زیادہ طاقتور اور زیادہ متحد ہی نہیں ہو گیا ہے بلکہ اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے اس کے ارادے اور بھی مستحکم ہو گئے ہیں۔

جمہوریت کا قیام عمل میں آ چکا ہے اور اس نے اپنے وجود کو ثابت بھی کر دیا ہے۔ لیکن معاشی آزادی یعنی قوم میں معاشی خود اعتمادی پیدا کرنے اور عوام کی روزمرہ کی زندگی کو بہتر بنانے کا کام انجام دینا ابھی باقی ہے۔

افلاس دور کرنے کی جو مہم ہم نے شروع کی ہے اس کا تقاضا ہے کہ ملک کے تمام لوگ اجتماعی حیثیت سے اس کام میں ہاتھ بٹائیں۔ یہ قوم کا مصمم عزم اور ہر فرد کا اشتراک و تعاون ہی تھا جس کی بدولت ہم کو سیاسی آزادی ملی۔ ہمارا نصب العین بالکل واضح اور غیر مبہم ہے۔ لیکن چونکہ کسی اور ملک نے اس طرح کے پیچیدہ حالات میں اتنا عظیم کام انجام نہیں دیا ہے اس لیے جیسے جیسے ہم آگے بڑھیں ہمیں اپنا راستہ خود متعین کرنا ہے اور ان تمام رکاوٹوں کے مقابلے کے لیے تیار رہنا ہے جو درپیش ہیں یا آئندہ پیش آئیں۔

آیئے ہم اس نئے سماج کی تعمیر میں خود اعتمادی، ہمت اور استقلال کو اپنا شریک سفر بنائیں جس میں ہر شخص کو انصاف اور مساوی مواقع کی ضمانت دی گئی ہو، جہاں ہر شہری کو ترقی کرنے کا پورا پورا موقع ملے، جس میں تمام مرد اور عورتیں جمہوری نظام کو بروئے کار لانے میں برابر کے شریک ہوں اور اپنے ہم وطنوں کے تئیں اپنی ذمہ داری کا پورا پورا احساس رکھتے ہوں۔

دستخط
اندرا گاندھی
وزیر اعظم

نئی دہلی
یکم اگست ۱۹۷۲ء

(انگریزی سے ترجمہ)

اِدارۂ نیا دور

آزادی کی پچیسویں (۲۵) سال گرہ

کی تہنیت پیش کرتا ہے

اپنی بات

پندرہ اگست ۱۹۷۲ء کو ہماری آزادی کے ۲۵ سال پورے ہو رہے ہیں اور ملک بھر میں ۲۵ویں سالگرہ کا جشن منانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بھی طے پایا ہے کہ جشن سالگرہ کا سلسلہ سال بھر جاری رہے گا۔ ہم جس آزادی کی پچیسویں سالگرہ منا رہے ہیں وہ بڑی مشکلات، پریشانیاں اور تکلیفیں جھیلنے اور قربانیاں دینے کے بعد حاصل ہوئی ہے۔ آزادی کی راہ میں جو قربانیاں دی گئیں وہ جان و مال، گھر بار اور عزت و وقار سبھی طرح کی تھیں۔ اس لیے مشکلوں سے حاصل کی ہوئی اپنی آزادی کا جشن بھی ہم نے شایان شان طریقے سے منایا اور آج جب کہ اس آزادی کو ربع صدی کا عرصہ گزر چکا ہے ہم ۲۵ویں سالگرہ کا جشن منا رہے ہیں۔ یہ جشن صرف رسمی نہیں ہے بلکہ ان ۲۵ برسوں میں ملک جن حالات و مشکلات سے گزرا، جن مصائب اور پریشانیوں کا اسے سامنا کرنا پڑا، جو مسائل درپیش ہوئے اور جس طرح کے چیلنج کا سامنا رہا، درحقیقت ان پر قابو پا کر ایک مستحکم تر قوم کی حیثیت سے اُبھرنے اور عالمی برادری میں اپنا ایک ممتاز و باوقار مقام بنانے، ترقی کے سفر میں حیرت انگیز رفتار سے بڑھتے، اپنی دفاعی اور بہت سی دوسری ضروریات کے معاملے میں خودکفیل ہو جانے کی خوشی میں ہم یہ جشن منا رہے ہیں جو بالکل قدرتی ہے اس لیے کہ ایسی مثال نہیں ملتی کہ کسی ملک نے اس قلیل مدت میں اتنی ترقی کی ہو۔ اگر کوئی مثال ملے گی بھی تو نہ وہ ملک اتنا بڑا اور اتنا وسیع ہوگا، نہ اس کے مسائل اتنے پیچیدہ رہے ہوں گے اور نہ ان حالات میں اسے آزادی ملی ہوگی جن حالات میں ہندستان کو آزادی ملی۔ اس کی بھی کوئی مثال نہیں ملتی کہ آزاد ہونے کے بعد ۲۵ سال کے عرصے میں کسی ملک پر چار بار مسلح حملہ ہوا ہو اور فوج کشی کی گئی ہو۔ یہ بھی ہمارا ہی کارنامہ ہے کہ ہم نے ۱۹۴۷ء میں آزاد ہونے کے بعد سے ۱۹۷۱ء تک کے قلیل عرصے میں چار دفاعی جنگیں لڑیں اور چاروں مرتبہ ہمیں کامیابی حاصل ہوئی جس سے ہماری ساکھ اور بھی بڑھ گئی۔ اس لیے اپنی ۲۵ سالہ کامیابیوں اور ترقیوں پر خوش ہونا اور جشن منانا بالکل فطری ہے۔

اس موقع پر ان ہزاروں افراد کی یاد آتی ہے جنہوں نے جدوجہد آزادی کے جرم میں قید و بند کی سختیاں جھیلیں، اپنے گھر بار، اثاثے اور جائداد سے ہاتھ دھویا، مرتے مر گئے مگر آزادی کی جدوجہد کے پرچم کو سرنگوں نہ ہونے دیا۔ یہ انہیں کے ایثار و قربانی، عزم مصمم اور اٹل ارادے کا نتیجہ ہے کہ ملک آزاد ہوا۔

اب ہمارے کام کرنے کی باری ہے۔ ہم نے اپنے لیے سوشلزم کا راستہ اختیار کیا ہے اور اس راستے پر گامزن ہو کر ملک کو خوشحالی اور خودکفالتی کی منزل تک لے جانا ہے، ملک سے غریبی اور نابرابری کو دور کرنا ہے۔ مرکز اور ریاست دونوں کی حکومتیں اس مقصد کو سامنے رکھ کر پروگرام مرتب کر رہی ہیں لیکن یہ تنہا حکومت کے کرنے کا کام نہیں ہے اس کے لیے ہم سب کو مل کر کوشش

کرنا ہے۔ اسی کے ساتھ ملک میں امن و امان برقرار رکھنا ہے تبھی ہم سکون کے ساتھ اپنے مقصد کو حاصل کر سکیں گے۔ آج ہمیں آزادی کی بیسویں سالگرہ کے موقع پر ہم پھر سے عہد کریں کہ ملک سے افلاس و جہالت اور نابرابری کو دور کرنے کا جو خواب ہمیں بنایا ہے اسے پورا کرنے کے لیے اسی جوش، اسی لگن، اسی عزم صمیم اور اسی صداقت و قربانی سے کام کریں گے جس جوش و خروش اور انہماک سے ہمارے بزرگوں نے حصول آزادی کے لیے کام کیا تھا۔

ہندوستان کی آزادی کی بیسویں سالگرہ کے مبارک موقع پر نیا دور کا جو خصوصی شمارہ شائع ہونے والا تھا وہ [illegible] ہے ہمیں افسوس ہے کہ ہم اس نمبر کو جس طرح مرتب کرنا چاہتے تھے وہ نہ ہو سکا اس کی وجہ صرف وقت کی کوتاہی ہے۔ ہمارے پیش نظر اس نمبر کو ہر قیمت وقت پر شائع کر دینا تھا۔ چنانچہ وہ عام مضامین وغیرہ جو ہمیں موصول ہوئے تھے ان میں شامل کرنا ممکن نہیں رہا۔ جب وقت پر بہت سی تصویریں، مضامین اور نظمیں وغیرہ جو ہمیں موصول ہوئی تھیں روک لینے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ [illegible] نیا دور کے آئندہ شماروں میں شامل کی جاتی رہیں گی اس لیے کہ آزادی کی ۲۰ ویں سالگرہ کے جشن کا سلسلہ سال بھر جاری رہے گا۔

اس نمبر کے مضامین کی ترتیب کے سلسلے میں ہم یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ بعض تخلیقات اور مضامین وغیرہ بے انتہا تاخیر سے موصول ہوئے اور جیسا کہ عرض کیا گیا کہ اس نمبر کو ہر قیمت وقت پر شائع کرنا تھا اس لیے ایسا کیا گیا کہ جیسے جیسے مضامین وغیرہ آتے جائیں ان کی کتابت اور ساتھ ہی ساتھ طباعت بھی ہوتی جائے۔ اسی لیے آپ دیکھیں گے کہ ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات جس طرح ترتیب ہونا چاہیے تھا اس طرح ترتیب نہیں ہوئی ہے۔ اس ترتیب سے کوئی اور نتیجہ نکالنا کسی حیثیت سے بھی درست نہ ہوگا۔

ہمیں اس کا احساس ہے کہ ملک کے بعض ممتاز اہل قلم اور شعرا کا تعاون اس نمبر کو حاصل نہ ہو سکا۔ ان میں کچھ حضرات نے ہماری استدعا پر وقت کی تنگی کا گلہ فرماتے ہوئے معذرت ظاہر کی۔ ہمیں اعتراف ہے کہ ان حضرات کی مصروفیات کے لحاظ سے یقیناً وقت بہت کم تھا۔ بہرحال ان کی خدمت میں ہماری درخواست ہے کہ جشن کا سلسلہ چونکہ سال بھر رہے گا اس لیے اب وہ اپنی نگارشات اور شعری تخلیقات عنایت فرمائیں۔

آخر میں ہم ان ادیبوں اور شاعروں کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتے ہیں جنھوں نے باوجود انتہائی مصروفیت کے نیا دور کے اس نمبر کے لیے خصوصی مضامین اور نظمیں عنایت کیں۔ جن کرم فرماؤں نے وعدے کیے اور ایفائے وعدہ نہ کر سکے ان سے شکایت نہیں البتہ گزارش ہے کہ اب سے ہمیں شکر گزار ہونے کا موقع دیں۔

——— ایڈیٹر

دولتِ سیمیں

شمیم کرہانی

نظر نظر کو مبارک ہو یہ عظیم سحر
جو ظلمتوں کے قفس سے گزر کے آئی ہے
کرن کرن پہ ہے مہرِ تبسّمِ ابدی
کہ مقتلِ شہدا سے نکھر کے آئی ہے
سیاہ خانۂ جمہورِ وقت کی قندیل
فرازِ دار و رسن سے اُتر کے آئی ہے

سحر کے نام سے دل جس کو یاد کرتا ہے
وہ جامِ سرخ ہے رندانِ تشنہ لب کے لیے
برائے چہرۂ عالم ہے بوسۂ اخلاص
تو حرفِ نرم ہے بیمارِ نیم شب کے لیے
جو قید خانۂ ماضی سے پھوٹ نکلا ہے
وہ زندگی کا اُجالا ہے اور سب کے لیے

خدا کرے کہ اُفق کی یہ دولتِ سیمیں
جہاں میں صورتِ کیفِ شراب اور بڑھے
زمین پیار کی شبنم سے بھیگتی جائے
سکوں کی نیند، محبت کا خواب اور بڑھے
نگاہِ بد سے رہے دور صبحِ آزادی
جمال اور فزوں ہو شباب اور بڑھے

اندھیرے سے اُجالے تک

ہندوستان کی صد سالہ٭ جنگِ آزادی سے مُتعلق تمثیلی منظومیہ

مارش پرتاب گڑھی

پہلی آواز —————— خوف و ہراس و اضمحلال
دوسری آواز —————— جرأت و عزم و استقلال

پہلی آواز۔

سرمئی شام بکھرتی ہی چلی جاتی ہے
روشنی ہائے مرتی ہی چلی جاتی ہے
آرزو حبس کے عالم میں گھٹتی جاتی ہے
دل میں اندیشے سماتے ہی چلے جاتے ہیں
آسیبی خوف ڈراتے ہی چلے جاتے ہیں
ٹہنیاں پیڑوں میں زنجیر سی ہلانے لگیں
جھاڑیاں بھوت سے کچھ بڑھ کے نظر آنے لگیں
پتیاں تالی بجاتی ہیں کہ دیوانہ ہے
جس کو یہ بھی نہیں معلوم کہ کہاں جانا ہے
لو کہ رات آگئی ظلمت میں نظر ڈوب گئی
سینۂ شب میں ہر اک راہ گزر ڈوب گئی
رات آئی تو سبھی نیند میں مدہوش ہوئے
ولولے سرد ہوئے حوصلے، خاموش ہوئے
سخت ہے رات، مناسب ہے کہ جھک جائیں ہم
تن بہ تقدیر اسی موڑ پہ رک جائیں ہم

دوسری آواز:

سخت ہے رات یہ مانا، مگر اتنی بھی نہیں
کہ چمکنے ہی نہ پائے کسی تارے کی جبیں
ہم جو ٹھہریں گے تو سامانِ سفر کھو دیں گے
ہم جو دم لیں گے تو ارمانِ سحر کھو دیں گے
عقل سے دور ہے ظلمت کے تھپیڑے سہنا
شرط نہیں تقدیر کو روتے رہنا
حوصلے راہ کی ظلمت سے کہاں ڈرتے ہیں
ولولے سختیِ ماحول سے کب مرتے ہیں
روشنی رات کے پردوں میں نہیں رک سکتی
زندگی موت کے قدموں پہ نہیں جھک سکتی

لو کہ نومیدی کے عالم میں سہارا جاگا
رات کی گود میں وہ ایک ستارا جاگا

پہلی آواز

لیکن اس ایک ستارے کی حقیقت کیا ہے
آنکھیں رکھتے ہو تو دیکھو کہ یہ ظلمت کیا ہے

دوسری آواز۔

یہ بھی کیا کم ہے کوئی لے کے اجالا تو اٹھا
کوئی اس رات کو للکارنے والا تو اٹھا
صرف مبہم سا اشارہ بھی بہت ہوتا ہے
ایک تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے
زندگی کرتی ہے جاں بخش سہارے کو سلام
روشنی کرتی ہے اس پہلے ستارے کو سلام

٭ ہماری پہلی جنگ آزادی سنہ ۱۸۵۷ء

سادو [illegible]

پہلی آواز:

وہ ستارا تو اندھیرے میں کہیں ٹوٹ گیا
ہاتھ سے دامنِ امید و یقیں چھوٹ گیا
ہر نفس راہزنی ہوتی چلی جاتی ہے
رات کچھ اور گھنی ہوتی چلی جاتی ہے

دوسری آواز:

کھو گیا سینۂ شب میں وہ ستارا لیکن۔

پہلی آواز:

اب اجالے کا تصور بھی نہیں ہے ممکن
صرف سہمے ہوئے سناٹے، بھیانک سائے
کوئی جگنو بھی پر افشاں ہو تو وہ مرجائے
ظلمتیں اتنی گھنیری ہیں کہ دل ہلتے ہیں
رات کے پاس اجالے بھی کہیں ملتے ہیں؟

دوسری آواز:

زندگی نور کو جس لمحہ صدا دیتی ہے
رات خود چاند ستاروں کو جگا دیتی ہے

آخرکار[2] — ستاروں کی نگاہیں جاگیں
مشعلیں چونک اٹھیں سوئی ہوئی راہیں جاگیں
ساتھیو! چلتے رہو، ہم سفرو! آگے بڑھو
رہرو! جاگ اٹھو، راہ گرو! آگے بڑھو
دوستو! مژدۂ ہنگامِ سحر آیا ہے

پہلی آواز:

کہاں آیا ہے، کب آیا ہے، کدھر آیا ہے؟
ہاتھ میں جتنے بھی ہاتھ آئے وہ سب چھوٹ گئے
تارے کچھ دیر چمکتے رہے — پھر ٹوٹ گئے
ان ستاروں سے مداوائے الم ہو نہ سکا
رات کا غم تو کسی طرح بھی کم ہو نہ سکا

دوسری آواز:

تیرگی نور کے دھاروں پہ کبھی چھا نہ سکی
موت سے کھیلنے والوں کو اجل پا نہ سکی
بیج مٹتا ہے کہ ہو کوئی گلِ تر پیدا
تارے بجھتے ہیں کہ ہو مہرِ منور پیدا
یہ بھی تسلیم، بہت سخت اندھیرا ہے ابھی
یہ بھی تسلیم کہ دکھ درد کا پھیرا ہے ابھی
لیکن اب رات کے سینے میں کھٹک کیسی ہے
دیکھو، وہ دیکھو افق پر — وہ چمک کیسی ہے
چاند ہے — ظلمتِ نو پر تجلی کا سفیر
آخرش جاگ اٹھی ذوقِ عمل کی تقدیر
مشعلیں تیز کرو راہیں مہکتی جائیں
ظلمتوں سے یہ کہو دور سرکتی جائیں
چاند کو اٹھ کے سحر بار بنا دو یارو
رات کو موت کا پیغام سنا دو یارو

پہلی آواز:

چاند پر بھی تو وہی ابرِ سیہ دوڑ آیا
پھر وہی رات، وہی گہرا گھنیرا سایا
پھر وہی فکر کہ انجامِ سفر کیا ہوگا
کوئی رہبر نہ کوئی راہگذر — کیا ہوگا
اور گہری ہوئی، کچھ اور بھی گہری ہوئی رات
اور اک بار اجالے کا مقدر ہوئی بات

دوسری آواز:

خیر ہم ہار گئے، خیر کوئی جیت گیا
پھر بھی اس دور کا کیا ذکر کہ جو بیت گیا
دل سے ناکامی کا احساس مٹا دیتا ہے
وقت ہر تلخیِ ماضی کو بھلا دیتا ہے

---

[1] پہلی جنگِ آزادی کے بعد کے حالات [2] آزادی کی جدوجہد میں بے شمار تحریکیں [3] اگست ۱۹۴۲ء "ہندوستان چھوڑ دو" کی عوامی تحریک

موج دیتی ہے جو کوئی تو اُچھلنے کے لیے
ٹھوکریں کھاتا ہے انسان سنبھلنے کے لیے

پہلی آواز:

لیکن اب آس تو مرتی ہی چلی جاتی ہے
رات کی زلف بکھرتی ہی چلی جاتی ہے

دوسری آواز:

رات کی زلف بکھرتی ہے بکھر جانے دو
درد اگر حد سے گزرتا ہے گزر جانے دو
یہی دستور ہے فطرت کا کہا جاتا ہے
موت سے قبل سنبھالا بھی لیا جاتا ہے
رات کچھ اور بھی بہکے گی، سرک جائے گی
آتشِ درد ابھی اور بھڑک جائے گی
اشکِ شب رنگ و سیہ تاب چھلک جائے گا
قافلہ اجنبی راہوں پہ بھٹک جائے گا
تیرگی اور بھی ماحول پہ چھا جائے گی
رات ہم سب کی رگ و پے میں سما جائے گی
اور پھر رات کے سینے پہ چمک آئے گی
ظلمتِ شب کی قبا کھل کے ڈھلک جائے گی
تیرہ ماحول کے ماتھے سے کرن پھوٹے گی
قیدِ ظلمات سے ایک ایک نظر چھوٹے گی
یہ جو پیروں میں ہے زنجیر سیہ ٹوٹے گی
رات کی زلفیں سمٹتی ہی چلی جائیں گی
ظلمتیں راہوں سے ہٹتی ہی چلی جائیں گی
اک کرن آئے گی، ناچے گی، کھنک جائے گی
صبح ہو جائے گی، یا رب چھنک جائے گی

پہلی آواز:

کون جیتا ہے مگر زلف کے سر ہونے تک

دوسری آواز:

فاصلہ کچھ بھی نہیں اپنے سحر ہونے تک
حوصلے زندہ رکھو، شوق کو مہمیز کرو
جوشِ دل تیز کرو، تیز کرو، تیز کرو
رات کے پاس بڑے ظلم سہی، جور سہی
پینے والا ہو تو پھر زہر کا بھی دور سہی
ایک دو لمحہ یہ اشکوں کی جھڑی اور سہی
صبح کے واسطے غم کی یہ گھڑی اور سہی
رات خود اپنے اندھیروں ہی میں کھو جائے گی
صبح تو ہونی ہے اور صبح تو ہو جائے گی

پہلی آواز:

صبح ہو جائے گی! آتا ہی نہیں دل کو یقیں
نور بھی سینۂ شب ہی میں نہ کھو جائے کہیں
تیرگی اور بھی اک بار نظر چھین نہ لے
ڈر رہا ہوں کوئی یہ خوابِ سحر چھین نہ لے
پا بہ زنجیر اُجالوں کی سواری نہ رہے
رات کی لاش کہیں صبح پہ بھاری نہ رہے

دوسری آواز:

تیرگی اپنی جگہ صبح کو دے جائے گی
رات کی لاش تو خود رات ہی لے جائے گی

سرِ[1] اٹھاؤ کہ فضا زیست سے معمور ہوئی
لو پھٹی، صبح ہوئی، ظلمتِ شب دور ہوئی
روشنی رات کے پردوں سے ابھرتی آئی
زندگی موت کو ٹھکرا کے گزرتی آئی
تارے جو ڈوبے تھے، انوارِ سحر بن کے اٹھے
خون کے قطرے گرے اور گلِ تر بن کے اٹھے
موجۂ زیست کی رفتار پہ قابو نہ ملا
رات کو صبح کی للکار پہ قابو نہ ملا
قید بھی جرأتِ پروانہ کو جھٹلا نہ سکی
تیرگی نور کے اعجاز کو جھٹلا نہ سکی
قسمتِ زیست فقط درد و غلامی تو نہیں
رات تاریک تو ہوتی ہے، دوامی تو نہیں

[1] ۱۵ راگست ۱۹۶۰ء یوم آزادی

بہارِ آزادی

سوروا حدی

بہار نام نہیں عیش و کامرانی کا　　بہار نام ہے تعمیرِ زندگانی کا
بہار زندہ ہے گاندھی کی آبیاری سے　　بہار فیض ہے نہرو کی باغبانی کا
بہار رمز ہے قدوائی کی، امانت کا　　بہار ذکر ہے جوہر کی جانفشانی کا
بہار نام ہے اوراقِ زندگانی پہ　　شکستہ خامۂ آزاد کی روانی کا
بہار تازہ ہے راجندر کی ریاضت سے　　بہار جلوہ ہے مظہر کی نکتہ دانی کا
بہار یہ ہے کہ ہر رنگ کے چمن میں ہوں پھول　　چمن نمونہ ہو اندازِ گل فشانی کا

پچیس سال کا عرصہ بہت ہے جینے کو
فضا بتاتی ہے اقوام کے قرینے کو

یہ جشن سیمیں ہے اس دور کے عوام کا جشن　　زمیں سے تا بہ فلک اس نئے نظام کا جشن
یہ جشن ملک کی اک خوش سلیقگی کا ظہور　　یہ جشن اپنی حقیقت کے انتظام کا جشن
یہ جامِ جم کی حسیں محفلوں کا رقص نہیں　　یہ جشن نغمہ گرانِ شکستہ جام کا جشن
یہ جشن کہنہ امارت کی سازشوں سے الگ　　ہے زندگی میں غریبوں کی ایک شام کا جشن
یہ جشن وحدتِ ہستی کے اعتراف کے ساتھ　　ہے امن و صلح کے پرچم کے اہتمام کا جشن
ابھی ہے دورِ محبت میں پختگی کا مقام　　ابھی ہے جشن بھی دنیا کے ذوقِ جام کا جشن

ابھی تو چلتے ہیں لیکن بہکتے چلتے ہیں
ابھی تو قافلے والے بھٹکتے چلتے ہیں

یہ جشن وہ ہے کہ جس کا نہیں جواب کوئی　　جلے ہے شب کے چراغوں میں انقلاب کوئی
یہ شہر باغ ہے حضرت محل کی یادوں کا　　ہر ایک کوچہ ہے کھلتا ہوا گلاب کوئی
نظر نواز ہے دلّی کی چاندنی بھی مگر　　اودھ کی شام کا ملتا نہیں جواب کوئی
حسیں تصور ماضی نقوشِ مستقبل　　یہ لکھنؤ ہے کہ ہے گومتی کا خواب کوئی
یہاں حرم کی کہ لوں دیر کی مے رنگیں　　درونِ میکدہ مشکل ہے انتخاب کوئی
مجھے یقین ہے ہر آدمی کی نیکی کا　　ہجوم شر سے نہیں مجھ میں اضطراب کوئی
پگھلتی جاتی ہے دیوارِ برفِ سرمایہ　　نکلنے والا ہے شاید کہ آفتاب کوئی
تضادِ قول و عمل کا ہے میکدہ کی شکست　　الٹ کے جام کو پیتا ہے کب شراب کوئی

زمانہ اہلِ ادب کا مقام پوچھے ہے
یہ آپ کون ہیں ہر شخص نام پوچھے ہے

شجرِ نور

فضا ابن فیضی

نشانِ فتح ہے پندرہ اگست کا یہ دن
نئے نظام نئے بند و بست کا یہ دن

یہ دن تو اک شجرِ نور ہے سحر زادو
اسے لہو کی حرارت سے تم نے سینچا تھا
یہ ہنستی صبحوں کا منشور ہے قمر زادو
جسے نڈھال شبوں کی تھکی جبینوں پر
خطِ شعاع کی صورت میں تم نے لکھا تھا

ہوئے پچیس برس جب تمہاری دھرتی پر
یہ کاروانِ مہ و آفتاب اترا تھا
ہوئے پچیس برس جب تمہاری آنکھوں میں
یہ مست و سرخوش و دلدار خواب مہکا تھا

افق سنورتے رہے اور سحر دمکتی رہی
چراغ جلتے رہے، تیرگی جھجکتی رہی
زمیں تب سے اجالوں کی فصل اگتی رہی
کلی چٹکتی رہی زندگی مہکتی رہی
یہ میکدہ عہد کے جمہور کی نئی، نیا
نئے شعور کے قدموں کی چاپ سنتی رہی
جراحتوں کے خیاباں سے پھول چنتی رہی
دریدہ جسم رہی اور گیت بنتی رہی

بڑے شعور، بڑی آگہی سے لوگوں نے
دمکتے جاگتے خوابوں کی پاسبانی کی
خمار حد سے بڑھا تو نشہ کو چھلکایا
سبو بہ سبو لے کے شراروں کی پاسبانی کی
صبا کو نذر کیا خوشبوؤں کا سرمایہ
بہار نے [illegible] کے گلابوں کی پاسبانی کی
مگر با ایں ہمہ گل ریزی و حنا بندی
یہ وصفِ شوخی و تمکین و آرزومندی

کبھی کبھی بڑی شدت سے سوچتا ہوں میں
کہیں کہیں مرے ماحول کی جبینوں پر
جراحتِ سوز و جراحت کا یہ غبار ہے کیوں
نفس نفس میں وہی شعلہ کیوں لپکتا ہے
قدم قدم پہ وہی حشر رونما رہے کیوں

پچیس سالہ یہ "تقریبِ جشنِ آزادی"
کچھ اور دلکش و رعنا و کامراں ہوتی
کچھ اور لالہ چکاں و رطب فشاں ہوتی
کچھ اور قند بگو، تہمد جسم و جاں ہوتی
جو درمیاں میں نہ ہوتی فصیلِ کہنہ [illegible]
جو راستوں میں نہ ہوتی خلیج حرص و ہوس
جو زندگی میں نہ ہوتی یہ قدر بغض و عناد

مرے قلم کے امینو! رفیقو! ہم نفسو!
کچھ ایسا راستہ سوچو، کچھ ایسا کام کرو
جو قلب و روح کے زخموں کو مندمل کر دے
وہ شعر لکھو جو اس دور کے تقاضوں کو
حسین و خوب و لفظوں میں منتقل کر دے
وہ حرف ڈھونڈھ کے لاؤ جو شگفتگیِ سینوں سے
جو حرف وقت کے شعلوں کو مشتعل کر دے
دیارِ شوق میں رائج کرو وہ اصلاحات
فسادِ ذہن و نظر کو جو مضمحل کر دے
جو زندگی کو سنوارے، نظر کو دل کر دے

شباب کروٹیں لے، نیند سے بدن جاگے
خمار ٹوٹے، رسن چھلکے، انجمن جاگے
رہ نوردِ شوق چلے کارواں ہم نفساں
غزل کی آنکھ کھلے، غمزۂ سخن جاگے
حدیثِ لطف کی خوشبو سے محفلیں مہکیں
نوائے گرم سے محرابِ فکر و فن جاگے

نیا لہو لیے تہذیب کی امنگوں کو
بجھے بجھے ہوئے خوابوں کا بانکپن جاگے
نظر سمجھ سکے حالات کے تقاضوں کو
حسین وقت کی سوئی ہوئی شکن جاگے
کھلائے پھول ضمیر و زباں کی آزادی
شعورِ خوش نفسی کا چمن چمن جاگے
صلیب و دار کی آواز گیت میں ڈھل جائے
بجھا بجھا سا ہے جو سوزِ جاں، تن جاگے
یہی ہے زندہ دلانِ جنوں کا منشا بھی
[illegible] کے آہنگ سے ختن جاگے

جو تم گزر گئے ان منزلوں سے آسودہ
تو جب بھی کوئی مورخ قلم اٹھائے گا
تمہاری فہم و فراست کے گیت گائے گا
لکھے گا تم کو کہ یہ فاتحِ زمانہ تھے
نقیبِ صلح تھے، انصاف کا خزانہ تھے
صداقتوں کا مرقع، وفا کا پیکر تھے
اخوت اور مساوات کے پیمبر تھے
مگر یہ سوچ لو یہ بھی کہ وقت اور تاریخ
کبھی کسی غلطی کو معاف کرتے نہیں
یہ ڈھونڈھ لیتے ہیں سچائیوں کے قاتل کو
جنوں، کم نظری کو معاف کرتے نہیں
لحاظ کرتے نہیں نام و تاج [illegible] کا
وہ کوئی ہو یہ کسی کو معاف کرتے نہیں

یہ دن تو اک شجرِ نور ہے سحر زادو
اسے لہو کی حرارت سے تم نے سینچا تھا
یہ ہنستی صبحوں کا منشور ہے قمر زادو
جسے نڈھال شبوں کی تھکی جبینوں پر
خطِ شعاع کی صورت میں تم نے لکھا تھا

★

جشنِ سیمیں

نذیر بنارسی

الفراق اے مری آزادی کے پچیسویں سال تونے سلجھائی ہے الجھی ہوئی زلف بنگال
تونے دی وقت کے چنگیز و ہلاکو کو شکست تونے ہی فتح کی دولت سے کیا مالا مال
جس کو اپنائے زمانہ وہ قرینہ تو ہے
ہے مرا دیش انگوٹھی تو نگینہ تو ہے
خون سے دھو کے غبارِ رخِ تاباں تونے حسنِ بنگال کیا سب پہ نمایاں تونے
پیارے بھارت کے جوانوں کا لہو دے کر ارضِ مقتل کو بنایا ہے گلستاں تونے
آج بھی نقش ترا میرے جواں باقی ہے
موت کے منھ پہ طمانچے کا نشاں باقی ہے
زندگی آکے رہی بن کے رہا بنگلہ دیش کال کے گاؤں میں کرنے لگا جیون پردیش
لوگ لہرانے لگے دھان کے پودے کی طرح ندیاں دینے لگیں سب کو خوشی کے سندیش
جس کا عنوان ہے شملہ وہ فسانہ تو ہے
جس کو گاتی ہے محبت وہ ترانہ تو ہے
بڑھ کے چھبیسویں صفحے پہ کہانی آئی میرے آزاد وطن تیری جوانی آئی
ڈوبا صہبائے شفق رنگ میں دن کا راجہ لے کے گیسو کی کمک رات کی رانی آئی
آرزو سوئی تھی کاندھے سے ملا کر کاندھا
بھیرویں چھڑ گئی جب رات نے جوڑا باندھا
جائزہ پھولوں کا لیتی ہوئی مالن آئی سیر کرتی ہوئی دوشیزۂ گلشن آئی
میری آزادی کے دن تیرا جنم دن آیا زندگی لے کے بہارِ رخِ روشن آئی
رند سمٹے ہوئے بیٹھے ہیں گھٹا چھائی ہے
ہاتھ میں جام لیے پندرہ اگست آئی ہے

دل کے ہر داغ کو ہنس کر سے تاباں کر دو   غم چھپا جاؤ خوشی آج نمایاں کر دو
گھر تو گھر ہی ہے کھنڈر کو بھی سجا دو یارو   آج ویرانہ بھی ہم رنگ گلستاں کر دو

رنگ ٹپکے نہ کسی شکل سے بربادی کا
جشن سیمیں ہے مرے دیش کی آزادی کا

پھول کی طرح سے زخموں کو ہنسانا ہوگا   آج رنگین کفن غم کو پہنانا ہوگا
لب تک آئے نہ کوئی درد میں ڈوبی آواز   آہ کو واہ کے پردے میں چھپانا ہوگا

آج غربت سے کہو دوسری منزل میں رہے
پیٹ جلتا ہے جلے روشنی محفل میں رہے

آگے اوروں کے نہ جھکنے کی قسم کھائی ہے   ہم نے ملتی ہوئی امداد بھی ٹھکرائی ہے
امن کے واسطے جیتی ہوئی دھرتی دے کر   اپنے آدرش نے دنیا پہ وجے پائی ہے

خط پہ خط آج مرے دیش کے نام آئے ہیں
ساری دنیا سے محبت کے پیام آئے ہیں

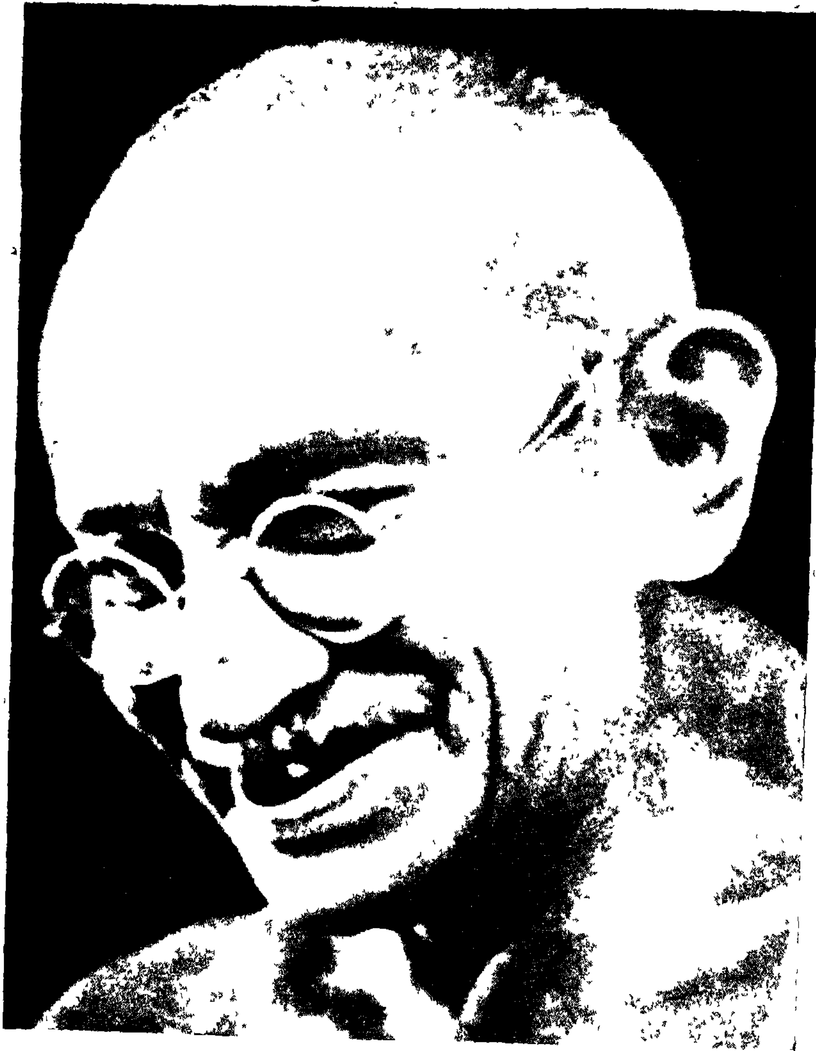
میرے سامان کا شہرہ ہے خریداروں میں   دیکھیے ساکھ مری دوسرے بازاروں میں
تھے جو دشمن کبھی وہ دوست نظر آنے لگے   پھونک دی روح وفا میں نے جفا کاروں میں

اب مرا ملک کسی ملک کا محتاج نہیں
کل تھا جو حال مرے دیش کا وہ آج نہیں

خشکیٔ صلح بھی ہے گرمیٔ پیکار بھی ہے   زندگی ڈھال بھی جلتی ہوئی تلوار بھی ہے
زہر کے گھونٹ نذیر اب نہ پیے جائیں گے   کیوں کہ آزاد ہیں اب جرأت انکار بھی ہے

السلام اے مری آزادی کے چھبیس سال
دل سے ہر بھارتی کرتا ہے ترا استقبال





ت سنہ ۲ء
ہسپتل نر

معمار آزادی

مہاتما گاندھی

یوم آزادی کی جھلکیاں

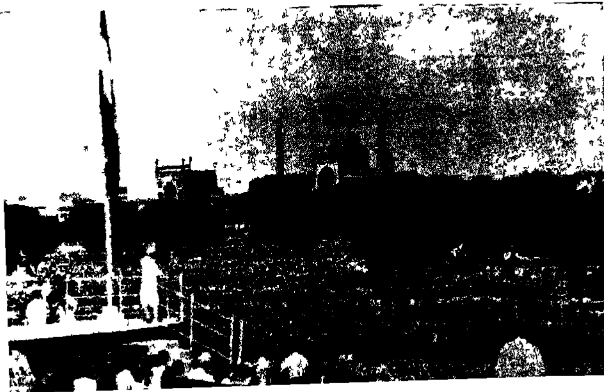




پنڈت جواہر لال نہرو ۱۴ اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو قانون ساز اسمبلی کے نصف شب کے اجلاس کو خطاب کر رہے ہیں

لارڈ ماؤنٹ بیٹن ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی حلف برداری کی تقریب میں آزاد ہندستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کو حلف دے رہے ہیں

لال قلعہ کی فصیل سے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی تقریر (یوم آزادی اگست ۱۹۴۸ء)



تکمیل دستور



وزیر اعظم پنڈت جواہرلال نہرو ہندستان کے نئے دستور پر
۲۶ جنوری ۱۹۵ء کی تقریب میں لیے دستخط کرتے ہوئے



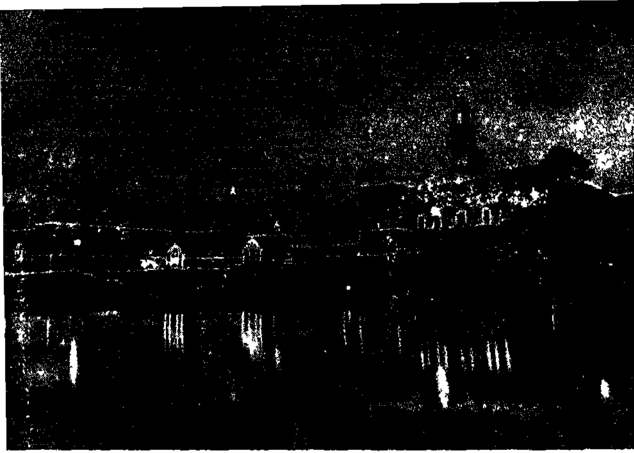
وزیر اعظم پنڈت جواہرلال نہرو جمہوریہ ہند کے دستور کے منظور ہو ج
دستور ساز اسمبلی کے صدر آنجہانی ڈاکٹر راجندر پرشاد کو مبارکباد

سری سی راج گوپال اچاریہ ہندستان کے پہلے گورنر جنرل کی
حیثیت سے حلف اُٹھاتے ہوئے



کی جھلکیاں

یوم آزادی



یوم آزادی کے موقع پر مرکزی سکریٹریٹ کی عمارت پر چراغاں

لکھنؤ میں ریزیڈنسی کے باقیات۔ یہاں انگریزوں اور ہندستانیوں کے درمیان ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران گھمسان کی جنگ ہوئی تھی





لارڈ اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن اور پنڈت جواہرلال نہرو یوم آزادی کی تقریبات کے دوران انڈیا گیٹ، نئی دہلی پر



پہلی جنگ آزادی کے دوران سکندر باغ کئی خونریز جنگوں کا میدان رہا ہے۔ یہاں شہید ہونے والوں کی ایک یادگار قائم کی گئی ہے۔ تصویر میں (دائیں) آنریری اجیت پرتاپ سنگھ وزیر جنگلات، یوپی یادگار کا افتتاح کرتے ہوئے اور (دائیں) جلوس کا ایک حصہ جو ۱۸۵۷ء کی یاد منانے کے سلسلے میں ۳ جون کو لکھنؤ میں نکالا گیا

آزادی کے بعد اردو شاعری

رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری

ادب کے ادوار دوسرے تاریخی واقعات و حالات کے ادوار سے سو فیصدی مطابقت نہیں رکھتے۔ ادوار شاعری میں تبدیلیاں کئی امور پر منحصر ہوتی ہیں اور بسا اوقات بطن ماضی و حال سے ہی نئے دور کا آغاز ہو جایا کرتا ہے۔ مثلاً غالب، حالی، داغ و امیر کا زمانہ قریب قریب ایک ہی زمانہ ہے جس میں ذوق، داغ، غالب، مومن، شیفتہ، حالی اور شاد عظیم آبادی نغمہ سرائیاں کر رہے ہیں۔ لیکن کیسی مختلف آوازوں سے اور کتنے رنگارنگ انداز سے۔ حالی کے بعد بھی ریاض خیرآبادی، جلیل مانک پوری، آسی غازیپوری، بیخود دہلوی، اسمٰعیل میرٹھی، درگا سہائے سرور جہان آبادی، برج نرائن چکبست، مہر گوالیاری، شبلی نعمانی، ظفر علی خاں، تلوک چند محروم، نادر کاکوروی، اکبر الہ آبادی اور ڈاکٹر اقبال ایک دوسرے سے بالکل الگ انداز میں اچھی سے اچھی شاعری کرتے رہے۔ اس سلسلے میں میں صرف ایک نام لوں گا اور وہ نام ہے نظم طباطبائی کا جن کی غزلیں انتہائی درجہ تک قدامت زدہ ہیں لیکن انگریزی نہ جانتے ہوئے بھی مشہور انگریزی نظم (GRAY'S ELEGY) کا جو ترجمہ "گور غریباں" کے نام سے نظم طباطبائی نے کیا ہے وہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور صدہا کامیاب ترین اور مشہور ترین اردو نظموں پر سبقت لے جاتا ہے۔ اب ہم پہلی جنگ عظیم یا بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی میں اپنے آپ کو پاتے ہیں اور ایک نئی نسل کے شعراء نئی آوازوں سے نغمہ سرا ہوتے ہیں جن میں ایک بڑی تعداد ان کی ہے جو دوسری جنگ عظیم اور ہندوستان کی آزادی سے پہلے [illegible] شاعری کرتے رہے اور بعد کو بھی یعنی آزادی ہندوستان میں بھی جن کی آوازیں گونجتی رہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعری کے اکثر ادوار ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں بلکہ ہر دور میں ماضی، حال اور مستقبل کے ادوار کا سنگم نظر آتا ہے۔ ایسا ہر دور ایک مخلوط دور ہوتا ہے۔ اجازت ہو تو اسی موضوع کا میں اپنا ایک شعر پیش کروں ؎

آج دو جگ مل رہے ہیں کاٹتی ہیں یہ سپے
پاس کی پرچھائیوں کو دور کی پرچھائیاں

آزادی سے پچیس تیس سال پہلے یا اس سے کچھ پہلے حسرت موہانی، سلیم پانی پتی، ثاقب لکھنوی، عزیز لکھنوی، نوبت رائے نظر لکھنوی، صفی لکھنوی، فانی بدایونی، یاس یگانہ چنگیزی، اصغر گونڈوی، جگر مرادآبادی، جوش ملیح آبادی اور یہ خاکسار یعنی فراق گورکھپوری اپنا کام یا تو جاری رکھے ہوئے تھے یا شروع کر چکے تھے۔ فیض کا نام بھی اسی زمانے میں آتا ہے اور فیض ہی کیوں جاں نثار اختر، کیفی اعظمی اور سردار جعفری ان سب نے اپنا سا رشاعری دوسری جنگ اور آزادیٔ ہند سے پہلے الگ الگ انداز سے نکھر گیا تھا اور ان میں سے کئی ایسے ہیں جن کی ۱۹۴۷ء سفر شاعری آزادیٔ ہند کے بعد بھی جاری تھی اور جاری ہے میں یعنی آزادیٔ ہند سے دس گیارہ سال پہلے ہی ترقی پسند ادب و شاعری کا دور شروع ہو چکا تھا اور انقلاب روس نے نئے خواب زندگی اور نئے تصورات شاعری کو جنم دے دیا تھا۔

آزادیٔ ہند کے بعد کا اردو دورِ شاعری ایک ایسا دور ہے جو آزادیٔ ہند سے پہلے ہی پیدا ہو چکا تھا جب دور پر آنے والی آزادی [illegible] ہند کی پرچھائیاں آزادی سے پہلے ہی پڑنے لگی تھیں۔ ذہن اپنے

خواہوں اور اپنے تصورات میں آزاد ہوتی ہیں اس کے بعد زندگی میں آزاد ہوتی ہیں۔ اگر ہم آزادی سے نصف صدی پہلے کے ہندستانی ادب پر نظر ڈالیں تو شاید یہ کہنے میں ہم حق بجانب ہوں گے کہ ہندستان میں آزادی کی پہلی نظم وہ بنگالی نظم ہے جس کا عنوان ہے "بندے ماترم" اور جس کے مصنف ہیں بنکم چندر چٹرجی۔ یہ نظم نصف صدی سے آج تک ہمارا قومی ترانہ رہی ہے۔

دوسری نئی چیز جو اس دور کی شاعری میں ہمیں نظر آتی ہے وہ پہلے ادوار کی شاعری کے مقابلے میں کہیں زیادہ بوقلمونی اور رنگا رنگی یا انفرادیت اور تنوع کے نمایاں صفات ہیں۔ کہاں داغ و امیر کا زمانہ جب کہ انیسویں صدی اردو شاعری بالکل ایک رنگ میں رنگی ہوئی نظر آتی تھی اور کہاں موجودہ صدی کی چوتھی پانچویں اور چھٹی دہائی [illegible] شاعری جو قوس قزح کے رنگوں کی طرح مختلف رنگوں میں لہلہاتی [illegible] مختلف راگ راگنیوں میں گنگناتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔ یہ دور ایک خاص بات کے لیے بھی یادگار رہے گا اور وہ بات ہے اردو شاعری میں غیر مقفیٰ اور غیر مردف یعنی BLANK VERSE کی شاعری کا آغاز اور اس کا ارتقا۔ یوں تو کہا جاتا ہے کہ BLANK VERSE کا آغاز اسمٰعیل میرٹھی کی اس نظم سے ہوا تھا جس کا عنوان ہے "تاروں بھری رات"۔ لیکن BLANK VERSE کو اس زمانے تک تو اردو شاعری میں شمار کیا جا سکتا تھا محض ایک تجربہ تھا۔ آزادی سے کچھ ہی پہلے BLANK VERSE کا ریلا اردو شاعری میں آ گیا۔ ن۔ م۔ راشد، فیض، سردار جعفری، مخدوم، کیفی اعظمی، سکندر علی وجد اور ساحر لدھیانوی کے علاوہ اور کئی دوسرے شاعر کامیاب نمونے اردو BLANK VERSE کے پیش کرنے لگے تھے۔ اسی زمانے میں میں نے BLANK VERSE میں وہ نظمیں لکھیں جن کو میں اپنا حاصل شاعری سمجھتا ہوں یعنی "آدھی رات" اور "پرچھائیاں"۔ آزادی کے بعد میں نے یہ سلسلہ اب تک جاری رکھا ہے۔ "جگنو"، "ہنڈولہ"، "کاریکی پوریا" اور کچھ دوسری نظمیں۔ اردو BLANK VERSE کا ہر شاعر ایک دوسرے کے سُر سے اپنا سُر نہیں ملاتا، کسی خاص شاعر کی تقلید نہیں کرتا یا کسی مخصوص نمونے کی شاعری نہیں کرتا۔

ہر غیر مقفیٰ اور غیر مردف BLANK VERSE [illegible] بحر میں پایا جاتا ہے جس کا ہر مصرع برابر کا ہوتا ہے یعنی ہر مصرع کے ارکان کی تعداد برابر ہوتی ہے۔ BLANK VERSE کے علاوہ آزادی سے پہلے اردو میں آزاد نظم کا دور بھی شروع ہو جاتا ہے جس میں مصرعوں کی لمبائی یکساں نہیں ہوتی۔ کبھی کبھی کئی بحریں بھی ایک ہی نظم میں ملتی ہیں۔ ابھی تو نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کی نظمیں مشہور تر ہیں اور مقبول تر بن چکی ہیں لیکن ایسا ہونے کا امکان اس نئی صنف شاعری میں ضرور ہے۔ وقت اس کا فیصلہ کرے گا۔ میری ایک آزاد نظم بعنوان "جمہور کے شاعر سے خطاب" اسی تکنیک کی ہے۔ یہ مخصوص صنف شاعری ابھی سب بہ برشاہد دمشاطہ ہے۔ دیدہ باید۔ گزشتہ چند برسوں سے اردو شاعری میں ایک نئی تحریک بھی شروع ہو گئی ہے جسے جدید شاعری کہتے ہیں۔ ابھی اس شاعری کا بچپن ہے اور اس کے زیادہ تر نمونے بالکل خام ہیں۔ وہ لوگ جو جدید شاعری کی تحریک کے بانی سمجھے جاتے ہیں یہ کہا کرتے ہیں کہ ہم دنیائے ادب میں باغی لوگ ہیں [illegible] اور ادب کے اکثر لوگ ایسے مصرعے اور ایسے چند یا ایسی نظمیں [illegible] کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ کچھ نظمیں بے معنی ہوتی ہیں۔ بے تصور، بے ربط، بدنو اعداد کی اور بے ڈھنگی تعبیرات جن کا کوئی مفہوم بھی نہیں ہوتا اس شاعری کے طرۂ امتیاز ہیں۔ اس شاعری کے خود ساختہ علمبردار یہ کہتے ہیں کہ جب زندگی ہی بے ٹھکانہ ہے تو ٹھکانے کی شاعری ہی کیوں کی جائے۔ زندگی نیم مجنونانہ دور سے گزر رہی ہے تو شاعری بھی نیم مجنونانہ کیوں نہ ہو۔ آج کی زندگی بالکل بے مقصد ہو چکی ہے۔ ہر شخص اپنے سہارے کھو چکا ہے اور بھری دنیا میں اکیلا ہے۔ وہ کیا چاہتا ہے اسے وہ خود نہیں جانتا کوئی اکھڑی پتنگ کہاں گرے گا کدھر کدھر کے جھونکے کھائے گا اور کہاں جا کے اٹکے گا اس کی جڑ خود اکھڑے ہوئے پتنگ کی نہیں ہے۔ ہم میں ہر ایک ایک ٹوٹا ہوا پتنگ ہے اور ہمارا شاعر بھی ایک ٹوٹا ہوا پتنگ ہے۔ لیکن اس دور کا انتشار کہ جب تک منظر کے پیش نہیں کیا جائے گا اس وقت تک ایسی شاعری کوئی ٹھوس ہی کے والی چیز یا کوئی دل کش چیز ہو سکے گی۔ کیا دنیا کا تمدن، دنیا کی تہذیب انحطاط یا شکن کی اس منزل میں آ گئی ہے جو فنا ہونے کے

[illegible]

شہزاد [illegible]

پہلے کی تہذیب یا تمدن پر سلط ہو جاتی ہے۔ ہر سانچی شاعری اب گھر کی شکل کی شاعری ہوتی ہے۔ شاعری کا سب سے بڑا مقصد شعور میں بحران برقرار رکھنا ہوتا ہے اور غیر منظم حالت کو بھی منظم کر کے دکھانا ہوتا ہے۔ میں سب سے جدید شاعری کا مخالف ہرگز نہیں ہوں۔ مجھے یاد آتا ہے کہ کچھ نمونے جدید شاعری کے کامیاب ہیں۔ جدید شاعری کی ایسی ہر کامیاب مثال اس امر کا ثبوت پیش کرتی ہے کہ شاعر انتشار کو منظم کر چکا ہے اور اسے ایک پوری اکائی کی شکل دے چکا ہے۔ لیکن اس قسم کی شاعری کی زیادہ تر مثالیں ناکامیاب ہیں۔

آج کی زندگی دنیا بھر میں اور ہندوستان میں بھی غیر مطمئن اور غیر یقینی بن چکی ہے۔ اس کی جڑیں اکھڑ چکی ہیں، امید عنقا ہو چکی ہے۔ مجھے خود ایسا شعر یاد آ گیا ہے

اور کھوئی کھوئی یہ زندگی ارے اکھڑی اکھڑی سی زندگی

ہے کیا وطن میں سکون ہو کہ وطن ہی آج ہوئے وطن

ہم لوگ ایک صبر آزما اور ہمت شکن دور سے گزر رہے ہیں۔ گویا زندگی ٹوٹ چکی ہے۔ روزگار ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ہمیں ... تعلیم تازی سادہ ایک آمدنی جو معمولی ضروریات زندگی ... پوری کر سکے ایسا مستقبل جس پر حال اعتبار کر سکے حاصل کر اس ... کے نوجوانوں کی زندگی کا المیہ ایسی حقیقتیں ہیں جنہوں نے زندگی کو بے لطف بھی بنا رکھا ہے اور بے معنی بھی۔ جدید شاعری کرنے والے نوجوان یہ حق کہ دینے کا ہمیں حق نہیں پہنچتا۔ ہمیں ان کے ساتھ انسانی ہمدردی برتنا ہے اور ادبی ہمدردی بھی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد کی دنیا متزلزل ہو چکی ہے۔ بڑی عمر والوں اور نئی نسل والوں کی زندگی میں ایک ناقابل عبور خلیج پیدا ہو چکی ہے۔ آج کوئی کسی کا نہیں ہے۔ اجنبیت، غیریت، بے تعلقی، بے سروکاری اور بے ٹھکانہ پن نے زندگی کو ایک ایسا ریگستان بنا دیا ہے جو قدروں سے بالکل محروم ہے۔

پھر بھی جسے جدید اردو شاعری کے دلدادگان سے پوری ہمدردی کے ساتھ اور ان کے دکھ درد کو پوری طرح سمجھتے ہوئے میں یہ گزارش کرنے کی جرأت کروں گا کہ دیکھو بھائی ادب کو ٹکڑے ٹکڑے نہیں کیا جا سکتا۔ آخر جدید ناول نگاری، افسانہ نگاری، ڈرامہ نگاری، مضمون نگاری میں ایسا انتشار کیوں نہیں آیا کہ ان کی تخلیقات بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں۔ کیا جدید ادب صرف جدید شاعری ہے؟ کیا ضروری ہے کہ شاعری اپنی بہن نثر نگاری سے اور اس کی سیکڑوں نسلوں سے اپنی تعلق ہو جانے کو بہتانے کا رشتہ ہی ٹوٹ جائے۔

جدید شاعری کے دلدادگان کو یہ حقیقت کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ شروع سے لے کر آج تک کی شاعری کو ہضم کیے بغیر حقیقی جدید شاعری جنم نہیں لے سکتی۔ مشہور انگریزی مصنف اسٹیونسن لکھتا ہے کہ میں نے جان بوجھ کر بڑی محنت کے ساتھ سیکڑوں قسموں سے قدیم مصنفوں کی سندروں کی طرح نقالی کرنا سیکھی ہے تب کہیں جا کر اپنا انفرادی رنگ پیدا کر سکا۔ ہر تعلیم اور ہر تربیت ملا تقاضہ تقلید کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ زبان و بیان کے قاعدے یا لفظوں کی لغت اور ان کا مفہوم نظر انداز کر کے یا انہیں بالکل توڑ مروڑ کے جدید شاعری پیدا نہیں کی جا سکتی۔ جدت قدامت ہی کا ایک نیا استعمال ہے۔ نیا پرانے سے ہی جنم لیتا ہے۔ کل تک کے ادب سے جدید شاعری کی ناآسودگی بجا اور برحق ہے لیکن کل تک کی شاعری سے بالکل بے تعلق ہو کر جدید شاعری نہیں کی جا سکتی۔ جو جدید شاعری کے نمونے کامیاب ہیں وہ ادب کے دائمی اصولوں کے نئے علامتی استعمال سے ہی کامیاب ہو سکے ہیں۔ کورانہ تقلید کی راہ میں ہرگز نہ دوں گا فلاں فلاں اور یہ جدت استعداد کی راہ دوں گا۔ خود اردو کی پرانی شاعری کا بہت بڑا حصہ اب باسی ہو چکا ہے۔ لیکن قطب شاہ کے وقت سے لے کر ہیک ہومر اور فردوسی کے وقت سے شاعری کے ایسے سرمایہ موجود ہیں جو آج بھی اپنی قدامت سمیت تازگی اور زندگی کا ثبوت دیتے ہیں۔ شاعری جدید ہو یا قدیم اگر اس میں تاثیر نہیں تو ایسی شاعری کس کام کی۔ نئی نسل کے لوگوں کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ان کی عمروں کا دوران کی رنگینیوں کا آغاز صرف اس وقت نہیں ہوا جب وہ پیدا ہوئے۔ ہم میں ہر ایک کے اندر ان بہائم وحشیوں اور ان وحشیوں کا خون جاری ساری ہے جو لاکھوں برس پہلے اس دھرتی پر چل پھر چکے ہیں اور خاک میں مل چکے ہیں۔ سائنس اور منطق اس حقیقت کو ثابت کر چکے ہیں کہ آواز میں وہ اثر ہے کہ جانور بھی اور پودے بھی یہاں تک کہ پتھر بھی خوشگوار

آدارے خوشگوار ردِعمل کا ثبوت دیتے ہیں۔ یہاں خوشگوار کا مطلب یہ نہیں ہے [illegible] باتوں کی حامل آدار ہو، ضرور ہو مگر ہو سکتا ہے انسان کو دماغ اس لیے عطا ہوا ہے کہ بکھری ہوئی اور منتشر چیزیں منظم طور پر سمجھ سکے۔ اس طرح منتشر غیر مربوط اور بظاہر بکھرے ہوئے [illegible] ربط و نظام کا احساس اعتماد عطا کرتا ہے۔ دوسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ خارجی وجود کو سمجھ کر یعنی اس میں ایک نظام کو کارفرما دیکھ کر انسان اسے ماحول پر کارفرما ہو جاتا ہے۔ اسے یہ لگتا ہے [illegible] طور اس پر حاوی ہو جاتا ہے۔ اگر ہم دیوار اس طرح اٹھائیں کہ وہ کوئی حافظ بن سکے، مینار بن سکے، گھر بن سکے اور یہ سمجھ میں آسکے کہ دیوار کس غرض کے لیے اٹھائی گئی ہے تو ایسی دیوار بنانا ایک مجموعہ حرکت ہوگی۔ اسی طرح نظریات کی [illegible] ایک سمجھ میں آنے والی [illegible] کلام میں آنے والی [illegible] ہو جانا چاہیے۔ [illegible] لکھ دیتے کہ عمل ہم [illegible] کو [illegible] سمجھ سکتے ہیں۔ کسی [illegible] کا دراز [illegible] آئے تو اس کا [illegible] کل [illegible] کر [illegible] کہ [illegible] اسی طرح [illegible] گل [illegible] سے [illegible] کو نہیں لیا ہے۔

[illegible] کے بعد اردو [illegible] میں [illegible] ترجمہ [illegible] سے [illegible] آزادی [illegible] جاتے رہے ہیں [illegible] ایک [illegible] شائع ہوتی آرہی ہیں جن کا [illegible] ہندوستان [illegible] نظموں کی تعداد [illegible] ڈھائی [illegible] ہے [illegible] ترقی کی تھا جو [illegible] لال [illegible] کے [illegible] بعد ان موضوعات پر بہت بڑی تعداد میں نظمیں لکھی گئی ہیں۔ [illegible] ہے کہ ہمارے [illegible] اس [illegible] پر [illegible] نظمیں لکھی ہیں۔ [illegible] کی بڑی نظموں کی [illegible] ملکی سطح پر [illegible] ہیں۔ بین الاقوامی واقعات اور موضوعات پر بھی آزادی کے بعد اردو میں بہت نظمیں لکھی گئی ہیں [illegible] انقلاب جیسے پر میری [illegible] طویل نظمیں آزادی کے بعد ہی لکھی گئی ہیں۔

میرے دل پر جس نظم کا سب سے زیادہ گہرا اثر ہوا وہ سردار جعفری کی دور نظم ہے جس کا عنوان "دیت نام" ہے۔ میری نظم "دھرتی کی کروٹ" اور "داستانِ آدم" میں بھی مارکسی تصورات کو کئی زاویوں سے پیش کیا گیا ہو لیکن میں اب یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ حبِ وطن، قومیت اور بین الاقوامی موضوعات پر نظمیں گو مستند بھی ہیں پسوں میں کہی گئی ہیں خاص کر ترقی پسند تحریک سے براہِ راست متاثر ہو کر جو نظمیں کہی گئی ہیں ان میں سارے [illegible] نظمیں ظاہری طمطراق کے باوجود تہی حسن ہو گئیں اور جس کو پڑھ کر بھلا دی گئیں۔ ان نظموں میں طویل عمری اور حقیقی [illegible] کے ساتھ نہیں تھے۔

آزادی کے بعد سے اردو شاعری میں ہندوستان کے متعلق جتنا [illegible] شعور [illegible] ہوا ہے اس امر میں میں تو یہی کہوں گا کہ بہت کم [illegible] ہندوستان [illegible] ہزاروں میلوں اور اس کی ہزاروں جھلکیاں گزشتہ پچاس برسوں میں اردو شاعری میں قریب قریب پہلی بار سنجیدگی سے [illegible] سے اجاگر کی گئی ہیں۔ اردو شاعری [illegible] کام [illegible] پہلے پریم چند نے شروع کر رکھا تھا۔ ہندو مزاج [illegible] انداز میں آزادیِ ہند کے بعد اردو شاعری میں ظاہر ہونے لگا ہے۔ ہندوستان کا عام آدمی اور ہندوستان کی عوامی زندگی اب اردو شاعری کے مستقل موضوعات بن گئے ہیں۔ اس سلسلے میں سکندر علی وجد کی [illegible] اور اپنائی ہوئی مشہور نظمیں "اجنتا" اور "ایلورا" کا ذکر ضروری ہے۔ یوں تو اسی زمانے میں چودھری جگت موہن لال رواں کی "مثنوی" ہما یادھو اور بشیشر پرشاد منور لکھنوی کی ترجمہ کالیداس کی نظم کمارسمبھو سطح عام پر آ سکی جہاں تک اسلوب بیان اور اسلوب [illegible] کا تعلق ہے ان میں ہند [illegible] نہیں ہو سکی ہے۔ کیا اس سلسلے میں میں اپنے [illegible] رباعیوں کا ذکر کر سکتا ہوں جو روپ کے نام سے شائع ہوئی ہیں یا ان [illegible] رباعیوں کا ذکر بھی کیا میں کر سکتا ہوں جو "ہندوستانی خطاب" کے عنوان سے شائع ہو چکی ہیں؟ جیسے آزادی پا کر ہم نے اپنا وطن پالیا اسی طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہند و مزاج کی ترجمانی کے لحاظ سے بھی اردو نے بھی اپنا وطن پالیا۔

آزادیٔ ہند کے بعد ایک اور صنعت اردو شاعری میں رونما ہوئی۔ BLANK VERSE آزاد نظم، رباعی کی ... اور مغربی انداز کی نظم نگاری کا ذکر ضمناً یا مفصل طور پر ہم کر چکے ہیں۔ ہاں سلیم پانی پتی نے ونکیش بندھو چترنجن داس کی مشہور نظم "ساگر سنگیت" کا جو منظوم ترجمہ اردو میں کیا ہے اور جو رسالہ زمانہ کانپور میں پہلے پہل شائع ہوا تھا ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں ان کے مجموعۂ کلام میں نہیں ہے۔ یہ نظم آزادیٔ ہند کے پہلے شائع ہو چکی ہے لیکن جدوجہد آزادی کے زمانے کی چیز ہے۔ یہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ادبی ادوار سیاسی ادوار سے پہلے ہی پیدا ہو جاتے ہیں اور سیاسی ادوار سے پہلے ان کی ترقی ہوئی پرچھائیوں کے حامل ہوتے ہیں۔ ہاں تو جو نئی چیز آزادیٔ ہند کے بعد کی اردو شاعری میں پیدا ہوئی ہے وہ واقعیت اور صداقت احساس ہے یعنی جو چیز اور جو کیفیت فی الحقیقت جیسی ہے اس کو جوں کا توں پیش کرنا۔ اسی کے ساتھ صدق و خلوص تخیل کے علاوہ رسمی یا روایتی اسلوب بیان کی جگہ پر انفرادی اسلوب فکر اور اسلوب بیان نے اردو شاعری میں جگہ پائی۔ غلامی ذہنوں کو جیسے کا ... بنا دیتی ہے۔ میرا ایک مصرعہ ہے ع

غلام قوم کے اشعار تک غلام

لیکن غلامی کے ساتھ غلامی کے خلاف بغاوت بھی آزادی سے کچھ پہلے اردو شاعری میں رونما ہو چکی تھی۔ آزادی کے بعد یہ بغاوت ایک اثباتی قدر کی حیثیت سے اردو شاعری میں اسلوب، موضوعات، انداز فکر اور انداز بیان کی شکل میں اپنا کام کر رہی ہے۔ انگریزی حکومت ہی کے خلاف یہ بغاوت نہیں رہی ہے بلکہ رسوم و روایات کے خلاف بھی یہ بغاوت آزادی کے بعد ظاہر ہوئی ہے۔ سوشلزم، سماج وادی عوام کی خود شناسی اور اپنے حقوق کا تدریجی شعور یہ تمام قوتیں اس دور شاعری میں کارفرما ہیں جو آزادی کا تصور رہ رہ کر نئے جنم لیتا رہا ہے اور اس کی جھلک گزشتہ پچیس برسوں کی اردو شاعری میں صاف دکھائی دیتی ہے۔ دور آزادی میں ایک اور نئی بات اردو شاعری میں پیدا ہوئی ہے۔ وہ ہے نئے استعاروں نئی تشبیہوں اور نئی تعبیروں کا استعمال۔ آج کا اردو شاعر ان معاملات میں ماضی کی کورانہ تقلید نہیں کرتا۔ ایک نیا علم البیان اور فن بیان نئی اردو شاعری میں پیدا ہو گئے ہیں

اس مضمون میں آزادیٔ ہند کے بعد اردو شاعری پر ایک طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے میں نے دوران مضمون میں کچھ شاعروں کے نام گنوائے ہیں اور کچھ نظموں کے بھی۔ یقیناً بہت سے نام چھوٹ گئے ہوں گے جنھیں میں نے قصداً نظر انداز نہیں کیا ہے بلکہ ایک مختصر مضمون میں ہر شاعر اور ہر شعری تخلیق کی مکمل فہرست پیش کرنا ممکن نہیں۔ اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔



"یہ میری خواہش ہے کہ بھارت یہ محسوس کرے کہ اس کے پاس اس کی اپنی روح ہے جو نہ کبھی مر سکتی ہے اور نہ تباہ ہو سکتی ہے اور اس میں ہر جسمانی کمزوری پر فتح پانے کی طاقت موجود ہے اور وہ تمام دنیا کا مقابلہ کر سکتی ہے۔"

مہاتما گاندھی

اگست ۱۹۴۷ء — کچھ یادیں

ڈی۔ آر۔ منکیکر

[illegible] ۱۹۴۷ء [illegible] حالات کے ساتھ جس طرح دیکھے تھے اور جو اثرات ان کے ذہن پر [illegible] میں کیا ہے [illegible] — ایڈیٹر

چودہ اگست ۱۹۴۷ء [illegible] شام [illegible] آسمان [illegible] [illegible] کے [illegible] [illegible] تھا [illegible] وہ انسانوں کا [illegible] آزادی [illegible] کی [illegible]

[illegible] اور [illegible] کا احساس [illegible] ادھر [illegible] عوام [illegible] جو [illegible] تھے [illegible] وہ ان لوگوں [illegible] عوام نے [illegible] تھا [illegible]

ایک [illegible] کے [illegible] گئی۔ [illegible] کر دیا [illegible] کے لیے انتظام کیا گیا تھا [illegible] کی تقریب [illegible] کا پرچم [illegible] دیکھ سکیں۔ وہ تقریب اس دن [illegible] ہونے والے تاریخی واقعہ کا گویا مقدمہ تھی۔ [illegible] سیلاب کی طرح تمام رکاوٹوں کو توڑ دیتا ہے [illegible] بندوبست [illegible] کر دیا [illegible] افراد جو اس تقریب میں شرکت کے لیے مدعو کیے گئے تھے اپنی اپنی [illegible]

[illegible] جواہر لال [illegible] آزادی [illegible]

[illegible] حضرت [illegible] طرف [illegible] ادھر [illegible] ہجوم [illegible] کے چہرے جذبات [illegible] کرتے ہوئے [illegible] ہجوم [illegible] لگاتے ہوئے [illegible] کی گاڑی [illegible] کی طرف [illegible] سے ہٹ [illegible] جا رہے تھے۔

[illegible] وائسرائے کی گاڑی [illegible] دی۔ گاڑی میں جواہر لال جی کے علاوہ [illegible] بھی تھیں۔ [illegible] لوگ ہنستے اور چیختے ہوئے ہجوم کے والہانہ خیر مقدم کا جواب خوشی سے ہاتھ ہلا کر دے رہے تھے۔ [illegible] وائسرائے کی گاڑی کی منزل مقصود [illegible] پارک [illegible] پارک

کے نام سے موسوم ہے، کے قریب تک نہ پہنچ سکی۔ یہ قافلہ پرچم کے ستون سے چند گز دور ہی رک گیا۔ ماؤنٹ بیٹن اس مقام سے آگے نہ جا سکے۔ تھکے ہارے جوانوں نے، جو ٹریفک کا انتظام کر رہے تھے، وائسرائے کی گاڑی کے لیے راستہ بنانے کی لاحاصل کوشش کی۔

ماؤنٹ بیٹن نے مجمع کی طرف اشارہ کر کے مسکراتے ہوئے نہرو سے کہا: "یہاں کا دل سے اگر جو مراسم صورت نہ رہ سکا ہے ہیں تو منع کرنے والا میں کون ہوتا ہوں!" نہرو دور سے پرچم کے ستون کی حفاظت کرنے والے جوانوں کو برطانوی پرچم 'یونین جیک' اتار کر ہندوستانی ترنگا لہرانے کا اشارہ کر کے مطمئن ہو گئے۔ اس طرح ملک میں آزادی لانے والا اس سرزمین کا کوئی بڑا آدمی نہیں بلکہ ایک



لارڈ اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن پنڈت نہرو کے ساتھ انڈیا گیٹ نئی دہلی کی تقریب آزادی میں

عام سپاہی تھا۔

ترنگا جب لہرا گیا تو مجمع نے ایک نہایت خوبصورت اور مکمل ہمہ رنگی قوس قزح کو پرانے قلعہ اور میل اسٹیڈیم کے دھند کی تہوں کے اوپر کماں بناتے ہوئے دیکھا اور اس کے فوری بعد ہلکی بارش ہونے لگی جس سے پسینے میں تر اور عوام کو ٹھنڈک کا احساس ہوا، گویا آسمان بھی شام کے ان پروگراموں کو آشیرواد دے رہا تھا۔

تقریب کے ختم ہوتے ہی ایک بھگدڑ مچ گئی اور اس میں پھنسے ہوئے افراد کو کسی محفوظ جگہ پہنچنے میں کئی گھنٹے لگے۔ مگر اس تمام کشمکش کے ہوتے کسی شرارت یا گستاخی کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔ وہ ایک خوش و خرم اور منظم مجمع تھا۔

تاریخ سے بھرپور ان دنوں میں سے اس دن کا یہ تھا وہ نظارہ جو میری یادداشت پر گہرے نقوش چھوڑ گیا ہے۔

اس دن کا سب سے سنجیدہ نظارہ پارلیمنٹ ہاؤس کے مرکزی ہال میں ۱۴ر-۱۵ر اگست کی نصف شب کی تقریب کا تھا۔ اس گھڑی، جب کہ ساری دنیا محو خواب تھی، بھارت کو آزادی حاصل ہوئی اور اس کا مقدر جاگا۔

اس رات پریس گیلری سے نیچے کے جگمگاتے ہوئے منظر پر نظر پڑ جانے پر میں نے گاندھی ٹوپیوں کے بیچ چند ٹیڑھے کلف کالی پوشاکیں دیکھیں کالی ٹوپیاں اور جنوبی ہند کے زریں سفید صافوں سے مل گئی تھیں۔ خواتین ارکان اپنی بہترین پوشاکوں میں



یوم آزادی ۱۹۴۷ء کے موقع پر مرکزی سکریٹریٹ کی عمارت پر چراغاں

ملبوس تھیں۔ ان کی شاداب رنگا رنگ ساڑیوں سے یہ منظر رنگین ہو گیا تھا۔ فرینک انتھونی کی قیادت میں اینگلو انڈینس کا ایک چھوٹا گروہ اپنے نفیس یورپی طرز کے سوٹ اور نکٹائیوں میں ملبوس دکھائی دے رہا تھا۔ دھوتی، چوڑی دار، لنگی اور مغربی پتلون ایک جگہ موجود تھے۔ درحقیقت وہ مختلف ہندوستانی پوشاکوں کا عجائب گھر تھا جس سے ہندوستان کے رشتۂ اتحاد کا پتہ چلتا تھا۔

رات کے بارہ بجتے ہی 'بھارت ماتا کی جے' اور 'مہاتما گاندھی کی جے' کے نعروں اور ناقوس کی تیز آواز سے مرکزی ہال کا گنبد گونج اٹھا۔ پنڈت گووند مالویہ نظریں بچا کر ناقوس ہال میں لے آئے تھے۔ ناقوس بجاتے ہوئے ان کے بچوں جیسے گال تقریباً پھٹ رہے تھے۔

افسوس کہ مہاتما گاندھی اپنے دیرینہ خواب کو شرمندۂ تعبیر ہوتے ہوئے دیکھنے کے لیے وہاں موجود نہ تھے۔ وہ دور نواکھالی میں بٹوارے کے بعد کی بربریت کے شکار لوگوں کو دلاسا دینے اور ان کی دلجوئی کرنے میں لگے ہوئے تھے۔

اس رات جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر رادھا کرشنن کی دو یادگار تقریروں کے علاوہ دستور ساز اسمبلی کے ارکان کی جانب سے حلف اٹھانے کی سنجیدہ تقریب میرے ذہن پر نقش ہے۔ ہندستان سے وفاداری کا حلف اٹھانے والوں میں انڈین مسلم لیگ کے دو ستون چودھری خلیق الزماں اور حسین امام تھے۔ یہ دونوں دو مہینوں کے اندر اندر کراچی میں بیٹھے تھے جن میں سے ایک تو پاکستان مسلم لیگ کے برائے نام صدر رہے اور دوسرے گمنامی میں کھو گئے۔

مجھے یاد آ رہا ہے کہ اپنے اخبار کے لیے میں نے اس تاریخی واقعہ سے متعلق رپورٹ ان سنجیدہ سطور پر ختم کی۔

"اور اس گھڑی جبکہ دارالسلطنت میں خوشیاں منائی جا رہی ہیں پنجاب میں جو زیادہ دور نہیں ہے، ہونے والی خونی وارداتوں کی گھن گرج پر کوئی بھی کان دھرے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مگر یہ ایک الگ کہانی ہے"

بٹوارے کے بعد دو ہفتوں کے اندر اندر وزرائے اعظم جواہر لال نہرو اور لیاقت علی خاں فساد زدہ ہندستانی اور پاکستانی پنجابیوں کا دورہ کر کے ان بے سہارا اور بے گھر انسانوں کو دلاسا دے رہے تھے جو بربریت کے باعث، جس کی مثال نہیں ملتی، عارضی پناہ گزین کیمپوں میں مقیم تھے۔

وہ رکھشا بندھن کا دن تھا۔ وزیر اعظم نہرو کی جماعت ملتان مغربی پنجاب پہنچی۔ پناہ گزین کیمپ میں مقیم لوگوں نے نہرو کا خیر مقدم غصہ اور درد بھری چیخ و پکار سے کیا۔ جب یہ ہنگامہ فرو ہوا تو میں نے دل کے تاروں کو چھونے والا ایک منظر دیکھا۔

دھندلی آنکھوں اور اشکوں سے تر چہروں کے ساتھ چیتھڑے زیب تن کیے ہوئے عورتوں کی ایک قطار خاموشی سے جواہر لال کے قریب پہنچی۔ ان کے ہاتھوں میں معمولی دھاگوں کے ٹکڑے تھے۔ ہر ایک نے آگے بڑھ کر نہرو کی کلائی پر اس دھاگے کو باندھا اور ان کے لیے "بھائی کی حفاظت" کا عہد یاد دلایا۔

جب نہرو نے راکھی بندھوانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو بے اختیار آنسو ان کے گالوں پر بہنے لگے اور اس وقت جو لوگ وہاں موجود تھے ان میں کوئی بھی آنکھ ایسی نہ تھی جو پُرنم نہ ہو۔

امرتسر (ہندستان) میں واقع ایک دوسرے کیمپ میں جو مسلمانوں کا تھا پاکستانی وزیر اعظم کی جماعت اور حفاظتی دستہ کو اچانک مسلمانوں کے ایک غضب ناک مجمع نے گھیرے میں لے لیا۔ معائنہ کرنے والوں میں لیاقت علی خاں کے علاوہ حکومت مغربی پنجاب کے وزیر اور لاہور کے میاں ممتاز دولتانہ بھی شامل تھے۔

کیمپ میں مقیم ایک مسلم جج نے پاکستانی قائدین سے رقت آمیز لہجے میں کہا "تم کو تمھارا پاکستان مل گیا ہے اور تم نے اپنی اقتدار کی ہوس پورا کر لیا ہے۔ اسی ہوس کے شکار لوگوں کی [illegible]۔ تم نے آبادیوں کے تبادلہ کا انتظام کیوں نہیں کیا؟ تم نے معصوم لوگوں کی حفاظت کے لیے کوئی انتظام کیوں نہیں کیا؟"

وہ ایک خطرناک صورت حال تھی۔ پولیس کی کمک فوراً کیمپ روانہ کی گئی تاکہ پاکستانی لیڈروں کو وہاں سے بحفاظت واپس لایا جا سکے۔



اردو میں تحقیق آزادی کے بعد

پروفیسر احتشام حسین

یہ کہنا تو درست نہ ہوگا کہ ادبی تحقیق کی جانب باقاعدہ توجہ کی شروعات بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے ہوتی ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اردو میں تحقیق کو کوئی ایسا مقام اس سے پہلے حاصل نہ تھا جس پر فخر کیا جا سکے۔ تذکرے جن سے اس کی امید ہو سکتی تھی، تحقیق کا کوئی قابل ذکر نمونہ پیش نہ کر سکے۔ اگر سرسید کی آثار الصنادید کو نظر انداز کر دیا جائے جو ایک خاص نوعیت کا علمی اور تحقیقی کارنامہ تھا، تو اردو کا دامن بہت دنوں تک فراہمی مواد اور ترتیب و تدوین کے نقطۂ نظر سے خالی سا ہی نظر آتا ہے۔ مولانا حالی جس حالت سے قریب حاصل تھا اور ذرائع کی بھی کمی تھی، یادگار غالب میں تحقیق کا حق ادا نہ کر سکے۔ محمد حسین آزاد نے آب حیات میں تحقیقی نقطۂ نظر اختیار کیا لیکن اس میں ایسی خامیاں رہ گئیں جو اسے معارضۂ تصنیف بناتی ہیں، مولانا شبلی نے موازنۂ انیس و دبیر میں اردو مرثیہ کی تاریخ کے ساتھ انصاف کیا اور انیس کے حالات کی طرف توجہ کی، مولانا نذیر احمد کا ذہن منطقی ضرور تھا لیکن ادبی تحقیق کی جانب ان کا میلان بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ عبدالحلیم شرر کی چند تاریخی، سوانحی اور علمی تحریریں یقیناً ان کے ذوق تحقیق کا ثبوت ہیں لیکن انھیں معیاری نہیں قرار دیا جا سکتا۔ اس طرح ہمارے اہم ترین عالموں اور مصنفوں نے بھی تحقیق کا کوئی معیار قائم نہیں کیا۔ ہاں ان کے بعد خاص طور سے مستشرقین کے خیالات عام ہونے کی وجہ سے اردو میں بھی تحقیق کی راہیں کھلنے لگیں چنانچہ مولانا سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، خواجہ محمد شفیع، پروفیسر محمود شیرانی، مولانا عبدالحق، حبیب الرحمٰن خاں شیروانی اور پھر ان کے بعد پروفیسر مسعود حسن رضوی، امتیاز علی عرشی، ڈاکٹر محی الدین قادری زور، پروفیسر نجیب اشرف ندوی، پروفیسر عبدالقادر سروری وغیرہ نے مختلف حیثیتوں سے تحقیق کے میدان کو وسیع کیا۔

یونیورسٹیوں میں اردو کی تعلیم عام ہونے لگی تو اس کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے موضوعات کی طرح تحقیق کے معیار میں بھی تبدیلی ہوئی۔ یہی کتابیں شائع ہونے لگیں۔ متن کی صحت اور ترتیب کی جانب توجہ ہوئی اور سب سے بڑھ کر یہ ہوا کہ قدیم سرمایے کی تلاش نے ایک رومانی کیفیت اختیار کر لی۔ اردو کے لسانیاتی مطالعہ کی داغ بیل بہت پہلے پڑ چکی تھی اور یورپی مصنفوں کی تحقیقات کا سہارا لے کر یونیورسٹیوں میں بھی غور و فکر کے دروازے کھل گئے تھے لیکن علم اللسان کے اصولوں سے عام عدم واقفیت کی وجہ سے قابل اعتماد نتائج نہیں نکالے جا سکے تھے۔ جیسے جیسے اردو کے قدیم نمونے سامنے آنے لگے، لسانیات کی معلومات بڑھنے لگیں اور ہندوستان کی دوسری جدید زبانوں کی تاریخ مرتب کی جانے لگی، اردو کے آغاز اور ماخذ کے متعلق چھان بین بڑے پیمانے پر شروع ہو گئی۔ اس سلسلے میں حافظ محمود شیرانی

[1] صرف ہندوستان کا ذکر کیا گیا ہے۔

مولانا عبدالحق، ڈاکٹر زور، مولانا سلیمان ندوی، حبیب اشرف ندوی وغیرہ نے آزادی سے پہلے تحقیق کی راہیں کھول دی تھیں جس کا نتیجہ آج بھی ہمارے فکر کا سرمایہ فراہم کرتا ہے۔ اگرچہ زیادہ تر تحقیقی کام یونیورسٹیوں کے دائرہ میں ہو رہا تھا لیکن اس کے باہر بھی مولانا امتیاز علی عرشی، قاضی عبدالودود، مرحوم نصیرالدین ہاشمی، مالک رام، حامد علی وغیرہ بھی تحقیق کی شمع بلند کر رہے تھے۔

۱۹۴۷ء کے بعد تحقیق کی جانب اور توجہ ہوئی یہاں تک تنقید نگاری کا تعلق تھا، اتنا دو مختلف دبستانوں میں تقسیم تھے ایک دوسرے سے، رجحانات ادبی یا فکری نقطۂ نظر کا نتیجہ ہوتا تھا کہ تحقیق میں اس طرح کی تقسیم نہیں اگرچہ بحث ہو سکتی تھی یعنی مواد کی دریافت، شواہد کی صحت یا اصل ماخذ کی بنیاد پر ہو سکتی ہے۔ اس لحاظ سے تحقیق میں نقطۂ نظر کا انداز الگ الگ ہونے کے باوجود کسی مرکزی صورت سے متعلق زیادہ سے زیادہ معتبر مواد اور اصل ماخذ سے متعلق ہوتا ہے۔ ہاں! اس میں زیادہ موشگافی کرنے کی وجہ سے کبھی کبھی غیر ضروری اور غیر اہم بحثیں بھی چھڑ جاتی ہیں۔ لیکن تحقیق کا تقاضا یہی ہے کہ جذباتیت، جانبداری، ذاتی پسند، پہلے سے قائم کیے ہوئے نقطۂ نظر سے بلند ہو کر محض حقائق اور ٹھوس مواد کی بنیاد پر نتائج نکالے جائیں۔ یہ کام مشکل بھی ہے اور صبر آزما بھی۔ تحقیق جس قسم کی ریاضت، دیدہ ریزی اور دقت نظر کا مطالبہ کرتی ہے اس کے لیے بہت تھوڑے سے لوگ موزوں ہو سکتے ہیں۔ اگر تحقیق معیار اور استناد کی صحت کو پیش نگاہ رکھ کر کی جائے تو یہ صرف اپنے نتائج کے اعتبار سے غیر معمولی ادبی کارنامے کی حیثیت سے زندہ رہ سکتی ہے بلکہ اپنے طریق کار کی درستی اور دشوار پسندی سے سائنٹفک اصولوں سے کام لینے کا عملی نمونہ بھی بن سکتی ہے۔ بہت تھوڑے سے محققین حقائق کی تلاش، حقائق کی اہمیت، تجزیہ، تضادات کی نوعیت، مختلف علوم اور متعلقہ مسائل کی مدد سے اخذ نتائج اور اس کے ساتھ ہی نتائج کی ادبی اہمیت کا صحیح شعور رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے گزشتہ پچیس سال میں اگرچہ تحقیق کے نام پر ہزار ہا صفحات کا مواد سامنے آیا ہے لیکن اس کا کچھ ہی حصہ ایسا ہے جو تاریخ ادب میں ایسا مقام بنانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ درست ہے کہ اکثر تحقیق کا خیال کسی متنازعہ مسئلہ سے پیدا ہوتا ہے لیکن بدقسمتی سے مسئلہ اپنی جگہ پر رہ جاتا ہے اور چھوٹے بڑے محققین اپنی بات کی تہ رکھنے کے لیے غیر ضروری باتوں میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔ بہرحال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بہت سی خامیوں کے باوجود تحقیق کا ایک معیار بن رہا ہے اور تحقیقی ادب کے ذخیرے میں اضافہ بھی ہو رہا ہے۔ یہ بات البتہ قابل ذکر ہے کہ دو اصول تحقیق پر چند مضامین کے علاوہ صرف دو ہی کتابیں لکھی گئی ہیں، وہ بھی موضوع کے چند ہی پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے متنی تنقید کے لوازم سے بحث کی ہے اور عبدالرزاق قریشی نے کچھ سرسری اصولوں سے۔ اس سلسلہ کا سب سے ضروری کام کتابیات اور حوالہ جات کی تیاری ہے جن کے بغیر تحقیق کا کام مشکل ہی سے آگے بڑھ سکتا ہے۔ بعض رسائل میں بالالتزام چھپے ہوئے ادب کبھی میں اور بعض میں کبھی کبھی، جیسے اردو ادب اور ہماری زبان علی گڑھ میں کچھ ایسا مواد یکجا کر دیا جاتا ہے جو تحقیق میں مدد دے سکتا ہے لیکن یہ ناکافی ہے۔ مختلف موضوعات، مختلف مصنفین، مختلف رسائل اور اخبارات سے متعلق یہ کام سائنٹفک طور پر بہت کم ہوا ہے اور جیسی کہ ہماری عادت ہے، جہاں ایک نے کسی موضوع کی طرف توجہ کی، کئی محقق اور نقاد اسی میں الجھ جاتے ہیں اور اکثر تکرار کے سوا بہت کم نیا مواد ہاتھ آتا ہے۔ گذشتہ چند برسوں کے اندر غالب کی قسمت جاگ اٹھی ہے اور حوالہ جات کی اچھی بری کئی کتابیں مرتب ہو گئی ہیں۔ میر، سودا، آتش، انیس، حالی، آزاد، شبلی اور بہت سے غیر معمولی طور پر اہم شاعروں اور ادیبوں کا کوئی پوچھنے والا نہیں۔ یہ درست ہے کہ ہمارے ملک میں ایسے ادارے، اکاڈمیاں اور علمی

جنھیں نہیں ہیں جو ان کاموں کو سنجیدگی اور ذمہ داری سے اپنے ہاتھ میں لے سکیں لیکن کام اتنا اہم ہے کہ اسے یونیورسٹیوں، سرکاری امداد سے چلنے والی انجمنوں اور تحقیق کا صحیح ذوق رکھنے والے افراد کو اسے اپنے ذمے لینا ہی چاہیے۔ اگر اصول تحقیق پر چند کتابیں اور رسائل مرتب ہو جائیں اور حوالہ جات کی مختلف جلدیں شائع ہو جائیں تو امید کی جا سکتی ہے کہ تحقیق کی رفتار میں اضافہ ہوگا۔

جہاں تک موجودہ تحقیقی ادب کا تعلق ہے اس کا تنقیدی اور تحقیقی جائزہ لینا بھی ایک بڑا کام ہے کیونکہ جسے کہا گیا اس کا بیشتر حصہ محض لفظی گوشت، ذاتی اختلافات اور دیگر باتوں پر مشتمل ہے۔ اس میں کہیں کہیں کارآمد باتیں بھی نظر آ جاتی ہیں لیکن وہ بھی اپنے غیر ادبی اندازِ بیان کی وجہ سے متوجہ کرنے میں ناکام رہتی ہیں اور کچھ مختصر خطوں، مراسلوں اور مختصر معلوماتی بیانوں کی شکل میں ہوتے ہیں جو ہمارے رسائل کے اوراق میں کھو جاتی ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ بچ رہتا ہے وہ یقیناً ہمارے علم میں اضافے کا ذریعہ بنتا ہے۔

اس ضرورت کا بار بار اظہار کیا گیا ہے کہ شعرا کے کلیات اور ادیبوں کی تخلیقات کے صحیح متن شائع کیے جائیں ورنہ تاریخ ادب کی ساری عمارت غلط بنیادوں پر قائم ہوگی۔ یہ کام جتنا آسان نظر آتا ہے اتنا ہے نہیں، خاص کر قدیم قلمی نسخوں کی بنیاد پر صحیح قرأت اور صحیح متن کا تعین محض ادبی ذوق کی مدد سے نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے لسانیات، عروض، معنی و بیان، علم لغت، تاریخ، تصوف، طب، فلکیات اور نجوم، مذہبی علوم اور اساطیری تلمیحات کا علم رکھنا ضروری ہے۔ اس سلسلے میں کچھ برا بھلا کام کیا جا رہا ہے لیکن ان پہلوؤں کی طرف توجہ کم ہے جن سے اکثر سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ مثلاً اس وقت تک میر، سودا، مومن، ظفر، شیفتہ، میر انیس، آتش، ناسخ کے دواوین اس حیثیت سے مرتب نہیں کیے گئے ہیں کہ ان پر کامل اعتماد کیا جا سکے۔ نثر میں تو اور برا حال ہے۔ پھر بھی گذشتہ ربع صدی میں چند ایسے متن مرتب کیے گئے ہیں جن پر فخر کیا جا سکتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ہر محقق اور ادیب نے ترتیب و تدوین میں اپنے طرز فکر سے کام لیا ہے، بعض نے متن کو کئی نسخوں سے مرتب کرنے اور اختلاف نسخ کے واضح کرنے پر زور دیا ہے تو کسی نے مقدمہ اور حواشی میں مفید اور کارآمد معلومات یکجا کی ہیں۔ لیکن علمی اور تحقیقی اعتبار سے ان میں سے کسی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان میں ہر ممکن احتیاط ملحوظ رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میرے خیال میں جن کتابوں کو مختلف حیثیتوں سے اہمیت دی جا سکتی ہے وہ ہیں کتاب نورس، دیوان غالب (نسخۂ عرشی)، کربل کتھا، امداد ستک، ارشاد نامہ، قصۂ مہر افروز و دلبر، من سمجھاون، ابراہیم نامہ، لیلیٰ مجنوں، مینا ستونتی، پرت نامہ، سٹ کہانی، دیوان حسرت، گل رعنا، گنج خوبی، کلمۃ الحقائق وغیرہ۔ ان میں سے بعض کی تحقیقی اہمیت یہ ہے کہ ہمیں ان کے وجود کا علم پہلی بار ہوا ہے اور بعض اپنے مقدمہ، حواشی، ترتیب اور معلوماتی نکات کی وجہ سے توجہ طلب ہیں۔ ان میں سے چند کی بعض خصوصیات کی جانب اشارہ شاید مفید مطلب ہو۔

کتاب نورس کا ذکر ڈاکٹر زور، مولانا عبد الحق، نصیر الدین ہاشمی اور دوسرے محققین کی تحریروں میں اکثر آتا تھا اور بعض غیر متعلق بحثیں بھی اس میں کی گئی تھیں۔ لیکن اس کی اصل صورت اس وقت واضح ہوئی جب ڈاکٹر نذیر احمد نے اس کے متعدد نسخے ڈھونڈ نکالے۔ ڈاکٹر نذیر احمد کا موضوع تحقیق ظہوری تھا۔ ان کا طریق کار یہ ہے کہ وہ جہاں تک ممکن ہوتا ہے موضوع سے تعلق رکھنے والے سارے مواد کا زیادہ سے زیادہ حصہ دیکھ لیتے ہیں۔ پھر جب انھوں نے عادل شاہی دور کا مطالعہ شروع کیا اور ظہوری کی تحریروں کا تجزیہ کیا تو انھیں ابراہیم عادل شاہ کے کارناموں سے بھی دلچسپی پیدا ہوئی اور اس طرح ان کی رسائی نورس کے نسخوں تک ہوئی۔ ان کی دلچسپی کا دائرہ پوری عادل شاہی تہذیب تھا۔ انھوں نے اس عہد کی مصوری، خطاطی، شاعری، زبان اور زندگی کے کئی پہلوؤں کا مطالعہ گہری نظر سے کیا۔ چونکہ نورس کی صحیح ترتیب و تدوین ان تمام متعلقات کے بغیر ممکن نہیں تھی اس لیے کوئی ایسا ہی شخص اس کو ہاتھ لگا سکتا تھا جس کی نگاہ صرف ایک اچھے نسخے کے نقل کر دینے پر نہ ہو بلکہ جو ان دوسرے لوازم پر بھی نگاہ رکھتا ہو جو صحیح متن کی تیاری میں معاون ہوتے ہیں۔ انہی معلومات کے ساتھ ایڈٹ کرنے کی وجہ سے کتاب نورس کے کئی

پہلو روشن ہوگئے۔ چنانچہ اس کے انگریزی ایڈیشن کو اس لیے اہمیت حاصل ہوئی کہ اس سے اس ہندوستانی موسیقی کی تاریخ مرتب کرنے میں مدد لی جاسکتی ہے جو سولھویں اور سترھویں صدی کے دکن میں رائج تھی اور جس کے فروغ میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا ہاتھ تھا۔

مولانا امتیاز علی عرشی کے مرتب کیے ہوئے دیوان غالب کے متعلق کسی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کیونکہ اس کے سلسلے میں بہت کچھ کہا جاچکا ہے۔ عرشی صاحب اس سے قبل دستور الفصاحت، مکاتیب غالب اور نادرات شاہی شائع کرکے بہترین تحقیق سے لوگوں کو روشناس کراچکے تھے۔ دیوان غالب کو نئے انداز سے مرتب کرکے انھوں نے تحقیق کی چھوٹی راہیں روشن کیں کیونکہ اس کا طریق کار مرکب اور پیچیدہ تھا۔ بہت سے قلمی اور مطبوعہ دواوین غالب کی مدد سے متن کی تیاری خود ایک مشکل کام ہے لیکن عرشی صاحب نے اس کے ساتھ ایک مخصوص ترتیب سے وہ غیر متداول کلام جو عام ایڈیشنوں میں شامل نہیں ہے، اور وہ کلام بھی جو غالب کے نام سے مشہور ہے، جمع کردیا ہے۔ مقدمہ اور حواشی، مختلف اشاریے ایسی معلومات سے بھرپور ہیں جن سے غالب کے سمجھنے میں غیر معمولی مدد لی جاسکتی ہے۔

کربل کتھا کی اشاعت محض اس لحاظ سے بھی ایک تاریخ ساز واقعہ تھی کہ جس کتاب کے وجود سے کم و بیش مایوسی ہوچکی تھی، اس کا مکمل نسخہ سامنے آگیا لیکن مالک رام اور ڈاکٹر مختارالدین نے اسے جس طرح ایڈٹ کیا ہے وہ بھی ایک بے مثال تحقیقی کارنامہ ہے۔ اس کتاب کی تلاش کی کہانی بھی دلچسپ ہے اور یہ بات بھی کہ تقریباً ایک ہی زمانے میں اس کے دو ایڈیشن الگ الگ تیار کیے گئے۔ ایک کے مرتب ہیں ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی اور دوسرے کے ڈاکٹر مختارالدین اور مالک رام۔ بعض وجوہ سے ڈاکٹر فاروقی کا ایڈیشن طباعت کی منزلوں سے گزر جانے کے باوجود شائع نہیں ہوسکا، دوسرا ایڈیشن عام ہوچکا ہے۔ اس کی ترتیب اور تدوین میں ان تمام باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے جو کسی کتاب کا محض ایک نسخہ دستیاب ہونے کی صورت میں کیا جاسکتا ہے۔ تاریخی، لسانی، ادبی خصوصیات کے علاوہ مذہبی تلمیحات، روایات اور اشارات، اعلام اور معاملات کو حل کرنے کی پوری کوشش کی گئی ہے اور وہ ساری باتیں واضح کی گئی ہیں جو کسی ایسی تصنیف کے مطالعہ کے وقت ذہن میں پیدا ہوتی ہیں۔ اگر اس میں فضلی کے حالات نہیں ملتے یا نواب اشرف علی خاں کے متعلق کچھ نہیں معلوم ہوتا تو یہ سمجھنا چاہیے کہ موجودہ مواد میں کچھ نہیں مل سکا، ہوسکتا ہے کہ آئندہ کسی ذریعے سے حالات کی گتھی حل ہوسکے۔ اور اگر اتفاق سے کربل کتھا کا کوئی دوسرا نسخہ ہاتھ آجائے تو املا اور تلفظ کے علاوہ بعض الفاظ کی لسانیاتی ساخت کے متعلق بھی یقین کے ساتھ کچھ کہا جاسکے۔

جس کربل کتھا کے متعلق کم سے کم یہ تو معلوم تھا کہ اس نام کی کوئی کتاب محمد شاہی عہد میں لکھی گئی تھی لیکن قصۂ مہر افروز و دلبر کی صورت تو یہ ہے کہ کسی کو اس کے وجود ہی کا علم نہ تھا۔ غالباً اس داستان کا واحد نسخہ گویا برسوں حضرت جی کے کتب خانے کی زینت رہا اور ۱۹۲۹ء میں ایک بزرگ نے اسے پروفیسر آغا حیدر حسن کو تحفۃً پیش کردیا۔ موصوف نے اسے ڈاکٹر مسعود حسین خاں کے حوالے کیا کہ وہ اس کو مرتب کرکے شائع کریں۔ اس واحد نسخہ میں نہ کوئی ابتدائیہ ہے نہ اختتامیہ جس سے کتاب کے مصنف، زمانۂ تصنیف، مقام کتابت، زمانۂ کتابت کے متعلق کچھ معلوم ہوسکے۔ کتاب کے سرورق پر ایک جگہ 'عیسوی خاں بہادر' ایک دوسرے خط میں لکھا ہوا ہے اور ایسی جگہ پر جہاں عام طور سے مصنف کا نام نہیں ہوتا۔ ڈاکٹر مسعود حسین نے عیسوی خاں کو عارضی طور پر اس داستان کا مصنف قرار دے کر قصہ کی اندرونی شہادتوں اور لسانی خصوصیات کی بنیاد پر اس کے زمانہ کا تعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ علم اللسان کے ماہر ہونے کی حیثیت سے یہ کام وہی خوبی کے ساتھ کرسکتے تھے۔ تمام پہلوؤں کو پیش نظر رکھ کر ڈاکٹر مسعود حسین خاں نے اس کا زمانۂ تصنیف ۱۷۳۲ء اور ۱۷۵۹ء کے درمیان قرار دیا ہے۔ میری ذاتی رائے میں ایسے سارے نتائج عارضی ہی ہوسکتے ہیں کیونکہ جس کاتب نے اسے لکھا ہے، اس نے الفاظ کے لکھنے میں جس طرح کا املا استعمال کیا ہے، یہ اس کا انفرادی عمل ہے۔ ممکن ہے کوئی دوسرا

میرا مسعود حسن رضوی ادیب، ڈاکٹر غلام مصطفےٰ، اور کئی دوسری دکنی مطبوعات کو کلی پیش نظر رکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ صحیح معنوں میں مرتب کرنے کی طرف جو رجحان [illegible] ادھر چند برسوں میں پیدا [illegible] اس بات کا ہے کہ اہم [illegible] کلیات کی طرف [illegible] کی جائے۔ جامعہ کراچی [illegible] سلسلہ شروع کیا ہے اس میں تنگ [illegible] متنوں کی تصحیح [illegible] ہے۔ [illegible] ایک مختصر [illegible] ڈھنگ کا ہو [illegible] دانا مستحق رہ ہو۔

[illegible] ہم تذکروں [illegible] کرتے ہیں جو مدنظر رکھنا ہے [illegible] کو پایا جا سکتا ہے [illegible] بہت سے تذکرے [illegible] کیا تھا [illegible] حیات [illegible] تذکروں کا [illegible] کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا [illegible] بعض دوسرے اداروں نے بھی [illegible] شائع کیے تھے لیکن اب یہ مذکورہ [illegible] گوشہ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے [illegible] کیا جاتا تھا محققوں کو [illegible] اور گزشتہ چند برسوں کے اندر تلاش [illegible] اور رفتار اشاعت بھی۔ چونکہ [illegible] تھے اس لیے کبھی کبھی ان کے خلاصے اور ترجمے بھی شائع کیے گئے ہیں اور تحقیقی نقطۂ نگاہ سے انھیں زیادہ اہمیت [illegible] ان کی اضافی افادیت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بعض تذکروں کی دوبارہ اشاعت بھی اس لیے مفید ہے [illegible] دوسرے حقیقی نسخوں کے دستیاب ہونے سے بعض کے متن اختلافی نظر آنے لگے ہیں۔ جن جن تذکروں کی اشاعت خاص طور پر قابل ذکر ہے وہ ہیں تذکرہ مسیحیہ (مرتبہ ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی) تذکرہ [illegible] (مرتبہ [illegible])، گلشن سخن (مرتبہ مسعود حسن رضوی)، تذکرہ مسرت افزا (مر[illegible]

خاص طور اور دوسرے [illegible] ڈاکٹر تمیم [illegible] مجمع الانتخاب [illegible] الشعرا [illegible] (مرتبہ نثار احمد [illegible] گلشن ہند (مرتبہ ڈاکٹر [illegible] الدین احمد) دو ملکی رسالے (مرتبہ [illegible]) اس کے علاوہ بعض تذکروں کے حلقے کبھی رسائل میں [illegible] شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں سب [illegible] کو [illegible] اشاعتی پروگرام [illegible]

[illegible]

[illegible] ترقی [illegible] ہو کر رہ جاتے ہیں۔ صرف مثال کے طور پر ایک سال کا ذکر کر کے یہ بات واضح کرنا چاہتا ہوں۔ کوئی بیس سال ہوئے ایک طالب علم نے پنڈت برج نرائن چکبست کی زندگی اور [illegible] کام شروع کیا۔ [illegible] دو برس تک وہ ایسے اشخاص سے ملتا رہا جن کے متعلق ذرا بھی خیال ہوا کہ وہ چکبست کے بارے میں کچھ معلومات رکھتے ہوں گے۔ اس سے فائدہ ہوا لیکن محقق نقطۂ نظر سے کوئی ایسا مواد نہ ملا جو ان کی زندگی یا ان کے کلام کے متعلق کوئی غیر معمولی بات بتاتا۔ بہت سے لوگ ان کی وضع قطع رفتار گفتار، وکالت کی کامیابی حسن کے ادراک کے متعلق بتانے

رہے کسی نے ان کے شعر پڑھنے کے طریقے کا ذکر کیا، کسی نے عزیزوں کا اور عزیزوں اور دوستوں کے ساتھ برتاؤ کا، کسی نے ان کے سیاسی خیالات کا۔ ان میں سے اکثر باتیں ایسی تھیں جن کا معاملہ کے لیے بہت ضروری نہ تھیں۔ بڑی تلاش کے بعد ان کی کچھ ڈائریاں اور خطوط ملے۔ ڈائریاں معمولی تھیں۔ ان میں زیادہ تر عام باتوں کے متعلق یادداشتیں تھیں۔ کہیں کہیں کسی ادبی جلسہ، مشاعرہ یا محفل میں حاضر ہونے کا ذکر تھا جس میں وہ صاحب صدر کی حیثیت سے [illegible] ہونے کا ذکر تھا۔ خطوں میں البتہ کئی کام کی چیزیں تھیں۔ ان میں اصلاحِ اشعار یا ان کی کاروباری کے سلسلے میں جلسوں کا ذکر ان میں کہیں کہیں انتقادی حیثیت سے تھا۔ وہ مباحثے جو ان میں تھے اصلاحی مباحث ہیں مختصر۔ تحقیق سے ان کے تعلیمی، ادبی اور سیاسی خیالات کا اندازہ ہوتا تھا۔ یہ کاروباری معاملات سے متعلق نہیں لیکن ان سے زیادہ عقیدہ کا ایک نمونہ ان سے ملتا ہے جس کی حیثیت سے ان کی تحریر کچھ آپ بیتی کے تحت ہے "[illegible]" کے تحت تھی اور ان سے بہت سی باتیں معلوم ہوتی تھیں کیونکہ انھیں یہ تمام ایک ایک صفحے پر پڑھے سے پہلے وہ میری ایک ایک بات یاد ہے اس کا خیال ہی نے لیکن نسخے کسی کی ناگہانی احتیاط نہیں کی۔ آپ اس سے کہ اس بات کو معلوم ہوتا ہے۔ اسلامی شاعری میں باقاعدہ نہیں یا سادہ طور پر کسی کا کلام دیکھ لیتے تھے ان سے اسے تحقیق کہیے لیکن کسی اور ذریعے سے اس مسئلہ پر کوئی روشنی نہ پڑ سکی۔ نظم بھی غیر مطبوعہ تھی بلکہ جہاں تک یاد آتا ہے، وہی تھی جو آپ استاد کے نام سے صحیح وطن میں شائع ہے اور ۱۸۹۹ء میں لکھی گئی تھی۔ اس مثال کے پیش کرنے کا مقصد یہ تھا کہ بعض قسم کے "تحقیقی" مقالات میں تحقیق کی گنجائش بہت کم تھی۔

بہرحال یونیورسٹیوں میں جو مقالات منظور ہوتے ہیں ان کے تحقیقی معیار میں یکسانیت نہیں ہو سکتی اور نہ ہوتی ہے کیونکہ ہر موضوع کے مطالبات مختلف ہوتے ہیں۔ تاہم چند مقالات جنھیں دوسروں کے مقابلہ میں معیاری کہا جاسکتا ہے طالب علمانہ کاوش ہی کا نتیجہ ہیں۔ اس وقت جن کا خیال آرہا ہے ان میں ڈاکٹر رفیع سودا (ڈاکٹر خلیق انجم)، اردو مثنوی شمالی ہند میں (ڈاکٹر گیان چند)، رجب علی بیگ سرور (ڈاکٹر نیر مسعود)، خواجہ میر درد (ڈاکٹر وحید اختر)، ذوق (ڈاکٹر تنویر علوی) قابل ذکر ہیں کیونکہ ان میں تحقیقی مواد بھی کافی علمی ذوق اور تجسس بصیرت کے ساتھ جمع کیا گیا ہے۔ چند اور مطبوعہ مقالات بھی پیش نگاہ ہیں لیکن ان کی تنقیدی اہمیت زیادہ ہے۔

سرسری طور پر [illegible] اس بات کی طرف اشارہ کیا جا چکا ہے کہ بہت سا تحقیقی سرمایہ صرف ان مباحث اور مناقشات میں بکھرا پڑا ہے جو رسائل میں اکثر اعتراض، جواب، جواب الجواب اور جواب جواب الجواب کی شکل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان کا کچھ حصہ ترتیب پاکر کتابی شکل میں شائع ہو جاتا ہے اور کچھ یونہی ادھوری علمی باتوں کی صورت میں کچھ دن زندہ رہ کر ختم ہو جاتا ہے۔ حال میں جو ادبی ہنگامہ اس دیوان غالب کے سلسلہ میں چھڑی جو دیوان غالب بخط غالب کہا جاتا ہے وہ تحقیقی دنیا میں یادگار رہے گی۔ امروہہ کے ایک تاجر کو بھوپال میں ایک دیوان غالب دستیاب ہوا، جو کچھ دن بعد ہندوستان میں شائع ہو گیا۔ اس سلسلے میں اس بحث کا موضوع یہ ہوا ہے کہ وہ غالب کے قلم کا لکھا ہوا ہے یا نہیں، اگر ہے تو کس عمر میں لکھا گیا کیونکہ ترقیمہ میں اس کی کچھ حالت ہے۔ کچھ لوگوں نے تو بعض آدھے صفحوں کا عکس دیکھا اور اعلان کر دیا کہ غالب کا دیوان ہے اور انھیں کے قلم سے لکھا ہے۔ کچھ نے شک ظاہر کیا، کچھ نے اس تصدیق واپس لی اور کچھ نے انکار کیا کہ یہ دیوان بخط غالب ہے اور وہ بھی انیس سال کی عمر کا۔ اس بحث میں درجنوں ارباب قلم نے حصہ لیا ہزاروں صفحات لکھے گئے کتابیں شائع ہوئیں اور کئی ناخوشگوار واقعات پیش آئے۔ اس میں شک نہیں کہ اس سلسلہ میں جو تحقیق ہو سکتی تھی وہ کی گئی ہے اُس سے غالب شناسی میں اضافہ ہوتا ہے، اردو شاعری کی تاریخ پر اس کا اثر پڑتا ہے لیکن ذوقِ تجسس کے وسیع دائروں میں پھیلنے کا اندازہ ضرور ہوتا ہے۔ ابھی یہ بحث ختم نہیں ہوئی ہے اس لیے بہت سے لوگ نتیجہ کا انتظار کر رہے ہیں کیونکہ تحقیق کے وہ ذرائع اور حربے ہر محقق اور قاری کی دسترس میں نہیں ہیں جن کی مدد سے یہ مسئلہ حل کیا جاسکتا ہے۔

...[illegible] تحقیق کے میدان میں
[illegible] ایک
[illegible] ۱۸۵۷ء کو
[illegible]
[illegible] لکھا
[illegible] سے نہیں آیا
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] رہا ہے۔
[illegible] تاریخ
[illegible]
[illegible] ادبی ہے
[illegible] سے دو ات نکتے
[illegible] بعض حیات [illegible]
[illegible] سے پہلے والوں کے لیے [illegible]
[illegible] سکی ہے کہ وہ لوگ
[illegible] اور اس دور کا
[illegible] حقائق سے بے مگر ہمارے
[illegible] آئے ہیں ایک
[illegible] تاریخ [illegible]
[illegible] ہمارے کی [illegible]
[illegible] کا خوب ہوا ہو۔
[illegible]
[illegible] کر سکتے ہیں لیکن
[illegible] فقط [illegible] واضح خطوط

کی [illegible] ہے اس وقت کاروان تحقیق چل رہا ہے اور
[illegible] راستہ میں حائل ہوتی ہیں۔ اس
[illegible] کا ذکر بھی آگیا کیونکہ اُن کے بغیر مسائل کو
[illegible] تذکرہ بھی ضمناً آگیا ہے حالانکہ
[illegible] پروفیسر مسعود حسن رضوی نے اردو
[illegible] لکھتے ہوئے یہ کہوں کہ
[illegible] صحیح تفتیش و مسابقت ہو جائے
[illegible] اور رسالہ کا
[illegible] کلیشے کے ڈراموں کا
[illegible]
[illegible] انہیں شائع کر دیا
[illegible] ان کا مطالعہ [illegible]
[illegible] تحقیق [illegible]
[illegible] کوئی تحقیقی کام
[illegible]
[illegible] طلب ہے کہ [illegible]
[illegible] فارسی میں جو نسخے ہندوستان
[illegible] کے عطف سے ناول کی بعض شرطوں
[illegible] کہیں نگاہ رکھا جائے۔
[illegible] خاص کر ان کی ابتدائی تاریخ
[illegible] ادبی اور تحقیقاتی اداروں
کی نگرانی [illegible] جا سکتا ہے۔ خصوصیں اُردو کی ابتدا اور فورٹ
ولیم کالج اور [illegible] اُردو اور علاقائی بولیوں کا تعلق چند ایسے
موضوعات ہیں جن پر ابھی بہت کام کرنے کی گنجائش ہے۔

[illegible] محققوں کا ذکر [illegible] آ چکا ہے ان کے علاوہ بھی چند ایسے نام
ہیں جو ابھی شگ سا چکے ہیں یا تیز رفتاری سے شہرت کی جانب بڑھ
رہے ہیں کیونکہ ان کی تحریروں میں حقائق کی تلاش اور ان سے نتائج
نکالنے کی مخلصانہ کوشش پائی جاتی ہے۔ بعض کی کئی کئی کتابیں چھپ
چکی ہیں، بعض کے مقالات متوجہ کرتے ہیں اور بعض کی تحریریں امید افزا

ہیں جیسے ڈاکٹر محمود الٰہی (نکات الشعراء اور خط تقدیر) ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ (اردو نثر کا ارتقاء ۱۸۵۷ء تک) علی جواد زیدی (دو ادبی اسکول) عتیق صدیقی (گل کرسٹ اور اس کا عہد) ہندوستانی اخبار نویسی رشید حسن خاں (باغ و بہار، گلزار نسیم، انتخاب ناسخ) مسیح الزماں (اردو مرثیہ کا ارتقاء) ڈاکٹر عبدالستار دلوی (دو تحقیقات) ڈاکٹر [illegible] دیوان میر، مطبوعات دیگر) ڈاکٹر اسعد اللہ، ڈاکٹر خلیل عبدالعطا، شکیل ڈاکٹر گوپی چند نارنگ [illegible] ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں) ڈاکٹر نورالسعید اختر (تاج الحقائق) [illegible] نجم تحریر [illegible] ڈاکٹر نعیم الدین ڈاکٹر [illegible] (نسخہ آب حیات) [illegible] دوسرے ادیب [illegible] [illegible] [illegible] اور طریق کار یہاں کی سند ہے۔

اس تحقیق [illegible] [illegible] [illegible] تحقیق [illegible] [illegible]

[illegible] [illegible] کاموں میں [illegible]

کی طرف رجحان ہے۔

۲۔ متنی تحقیق کے علاوہ تحقیق کے دوسرے پہلوؤں مثلاً حوالہ جات اور کتابیات کی تیاری بھی ضروری ہے۔

۳۔ تحقیقی کاموں میں ادبی حسن بھی ملحوظ رکھا جانا ہوگا۔

۴۔ تحقیق سے دلچسپی رکھنے والوں کو لسانیات، تاریخ، لغت نویسی، علم معنی، زبان، ادب اور سماجی روایات کے ارتقا کا علم بھی ہونا چاہیے

۵۔ اس وقت تک جو کام ہوا ہے وہ [illegible] لیکن اس کا بہت سا حصہ [illegible] ہے اور یہ تاریخ ادب میں اضافہ کرتا ہے۔

[illegible] اور [illegible] ضروری [illegible] اور [illegible] میں مرکز بھی سرپرستی ہے

۶۔ تحقیق میں کوئی بات حرف آخر نہیں اس لئے اس وقت تک [illegible] کے سلسلہ میں جو کام ہوئے ہیں انھیں بھی کام سمجھنے [illegible] چاہیے

۷۔ ہمارے اچھے محققوں کو تحقیق کے اصولوں [illegible] الہامی [illegible] جانے اور [illegible] نئے محققوں کو واقف کرکے ان کی رہنمائی کیا جانا چاہیے۔

۸۔ [illegible] رسالوں میں جو مقالے لکھے جاتے ہیں ان کے معیار کی طرف [illegible] زیادہ توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

★

جشنِ حیات

[illegible] لکھنوی

کس حسن سے صحن چمن سے آئے — [illegible] نور [illegible] میں سے [illegible]
کتنا حسین جلوۂ صبح وطن سے آئے — موج صبا میں جلوۂ گنگ و جمن سے آئے
گویا ہوا فضا میں پیام حیات سے — بکھرا ہیں [illegible] زندگی
ہنگامۂ بہار چمن در حسن سے آئے — لیکن [illegible] کی دلوں میں [illegible] سے آئے
[illegible] ہوئے ہیں جو [illegible] — [illegible] جشن حیات [illegible]
بدلے ہوئے مزاج میں اک حسن ظن سے آئے — اے [illegible] کہاں [illegible] سے آئے



ترانۂ قفس

ظہور رضوی

مولوی حفیظ الرحمان خاں صاحب مخلصی فرخ آبادی اُن مجاہدینِ جنگ آزادی میں سے ہیں جنھوں نے اوائل شباب اور زمانۂ تعلیم ہی سے تا حیات وطن کی آزادی کے لیے خود کو اسیری کی قید و بند کی صعوبتوں کے لیے پیش کر دیا تھا۔ آزادیٔ وطن کی تحریک جس وقت ۲۲-۱۹۲۱ء میں خلافت تحریک کے ساتھ زور شور پر تھی، حفیظ صاحب گوالیار میں میٹرک میں زیر تعلیم تھے اپنے خاندانی وقار کے تحت نائب تحصیلداری کے لیے نامزد ہو چکے تھے۔ لیکن مہٹی رمال کے اخبار کیسری سے جو تحریک آزادی کا نقیب تھا، متاثر ہو کر اور سب سے زیادہ لوک مانیہ تلک کی بے پناہ حب الوطنی سے مسحور ہو کر وہ مجاہدین کی صف میں پہنچ گئے۔ پہلی بار ۱۹۲۱ء میں ان کو ایک سال کی قید کا حکم ہوا۔ اور یہ فتح گڈھ سنٹرل جیل میں محبوس کر دیے گئے۔

تاریخ وطن کا یہ دور قومی یکجہتی، جذباتی ہم آہنگی اور ذہنی ارتباط و محبت کا بہترین نمونہ تھا۔ چنانچہ اس اتحاد و اخوت کے مناظر جیلوں میں بھی دیکھنے میں آتے۔ اسی کے ساتھ ساتھ مجاہدین آزادی کے ذوق ادب نے جیل خانوں میں مشق سخن بھی جاری رکھی۔ چنانچہ آگرہ ڈسٹرکٹ جیل میں، جو سیاسی قیدیوں کے لیے مخصوص کر دی گئی تھی، باقاعدہ طرحی مشاعروں کا انعقاد ہوا۔ جیل کی زندگی، روزانہ کے معمولات، ذوق سخن اور مشاعروں کے نقوش جو حفیظ صاحب کے ذہن میں محفوظ رہ گئے ہیں اور جن کو وہ اکثر دورانِ گفتگو بیان فرماتے ہیں، اس دور کی تاریخ اسیری کی مقدس یادگار ہیں۔

حفیظ صاحب فتح گڈھ سنٹرل جیل میں مولانا ظفر الملک، پنڈت رام پرشاد مصر تلک وادی، پرائس پرشاد روڑا، پنڈت رگھبر دت شاستری، مولوی محمد مصطفیٰ خاں مداح بچھرایونی جو سیاسی دنیا میں احمق پھپھوندوی کے نام سے معروف تھے، میر عوض رضا فرخ آبادی جو پھپھوند میں گرفتار ہوئے تھے، بابا راگھو داس گورکھپوری وغیرہ تقریباً سو سیاسی قیدیوں کے ساتھ تھے۔ احمق پھپھوندوی اپنے طرز کے منفرد شاعر تھے میر عوض رضا کی گرفتاری پر فرمایا تھا

ڈر کے نہ اظہار امر حق میں   گئے دھڑلے سے جیل خانے

پھپھوند والوں کی لاج رکھ لی   جناب میر عوض رضا نے

فتح گڈھ جیل میں ڈیڑھ ماہ کے قیام کے بعد یہ سیاسی قیدی آگرہ ڈسٹرکٹ جیل منتقل کر دیے گئے۔ یہ جیل ۲۲ء میں سارے ہندستان کی مرکزی جیل تھی۔ یہاں مہاراشٹر، مدراس وغیرہ دور دور کے صوبوں کے سیاسی کارکن نظر بند تھے جن میں خصوصیت سے پروفیسر رنگا آئنگر مدراس سے، مہادیو ڈیسائی مہاراشٹر سے، پنڈت کپل دیو مالوی، پنڈت کرشن کانت مالوی، اڈیٹر ابھیودے الہ آباد، پنڈت گووند کانت مالوی، مولوی نذیر احمد خجندی میرٹھی اڈیٹر عالب ممبئی، مولوی حیدر علی، مولوی سید محمد ٹونکی، عبدالمجید خواجہ، پنڈت رام رتن شاستری، مولانا عارف لکھنوی، بابو رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری، بابو رتن لال رمز سکندر آبادی، اور حافظ محمد عثمان قابل ذکر ہیں۔

ان اسیران آزادی میں وکیل بھی تھے، اڈیٹر بھی، عالم بھی تھے حافظ بھی، شاعر بھی تھے ادیب بھی۔ سیاسی اور اخلاقی تربیت کے لیے روزانہ کے معمولات میں مختلف چیزیں شامل تھیں۔ ایک

تقریر گیتا کی تعلیمات پر ہوتی تھی جو اکثر پنڈت رام نرلیش ترپاٹھی کے سپرد تھی جنھوں نے رام چرت مانس پر ٹیکا لکھا ہے۔ یہ رامائن پر بھی لکچر دیتے تھے۔ ایک نشست درس قرآن کی ہوتی تھی جس کے مہتمم مولانا مدیرا۔ محمدی اور مولوی حیدر علی سہاپوری ہوتے تھے

مولوی سید محمد ٹونکی ایک روزانہ دستی اخبار جو جیل میں خود تحریر کیا کرتے تھے اور تمام سیاسی قیدیوں کو ہر صبح سناتے تھے اس میں کچھ روزانہ کے جیل کے حالات ہوتے تھے اور کچھ بیرونی خبریں جو کسی نہ کسی طرح جیل کی حدود میں آجاتی تھیں۔ اس دستی روزنامہ کے لیے آتم تھیم ندوی نے کہا تھا

جو بیچ نکالیں ملّا ٹونکی قیامت آئے نہ کیوں مرغوں کی

مولوی حیدر علی ایک سادہ کتاب پر مختلف لوگوں کی رائے ... تک کر رہے تھے۔ جب ان بزرگ سے آتم صاحب سے اس موضوع پر ان کی رائے کتاب پر لکھ دینے کی خواہش کی تو انھوں نے برجستہ فرمایا:

دیا ہے جب کی ... کے لکھا ہے

مولوی حیدر علی صاحب بھی پونے آٹھ ہیں

حفیظ صاحب فرماتے ہیں کہ اس شعر میں ان کے ہمارے طویل لیکچر، سادہ لوح بزرگ کا پورا سراپا تھا۔

ایک "بزم ہمائم" بھی قائم ہوئی تھی، جس میں مختلف جانوروں کی بولیاں بولنے والے منتخب ہوتے تھے۔ اس کی تصدیق آتم تھیم ندوی نے ایک بہ طویل کے شعر سے ہوتی ہے جو اتفاق سے حفیظ صاحب کے ذہن میں محفوظ رہ گیا ہے۔ یہ شعر اس تفریحی بزم کے علاوہ اس دور کے حالات کا بھی آئینہ دار ہے۔ شعر یہ ہے کہ جس کا پہلا مصرعہ مندرجہ ذیل ہے:

"ہمیں یاد آتی ہے اب آگرہ کے جیل کی وہ صحبت پر لطف
کہ تھا عارف و خواجہ و محمدی و حمیدی و حکمت ...
میاں ٹونکی و ترپاٹھی و رنگا و کرسٹنا و کیل و ...
عزیز احمد و رنگھیت کے سبب سے وہ مصیبت کدہ
دوسرا مصرعہ ظلم جیل رہا مسرت،
کہ رہا کرتی تھی ہر وقت عجب رونق و تفریح"

کبھی انجمن شعر و سخن اور احباب کے دل چسپ ترانے کبھی دعوت، کبھی گانا، کبھی تفریح کے میچ اور کبھی بزم ہمائم کہ ہوا کرتا تھا جس سے عجب اظہار مسرت

ہر ہفتہ جمعہ کے دن ایک طرحی مشاعرے کی بنیاد ڈالی گئی جس کی نظامت حفیظ صاحب کے سپرد ہوئی۔ حفیظ صاحب خود خوش کلام اور بے انتہا زود گو شاعر ہیں۔ نکتہ فکر و شعر میں حضرت اصغر حسین، صفیر آبادی اور حضرت مولانا حسرت موہانی سے استفادہ کیا ہے۔ یہ مشاعرے اس قدر کامیاب ہوئے کہ ہر شخص کچھ نہ کچھ فکر سخن کرنے لگا یہاں تک کہ آٹھواں اور آخری مشاعرہ شب میں اتنی دیر جاری رہا کہ جیل کا لاک اپ (...) وقت پر نہ ہو سکا۔ چنانچہ تادیبی طور پر نمایاں شعراء اور مشاعروں کے سرگرم افراد کو مختلف جیلوں میں تبدیل کر دیا گیا۔ ان سب مشاعروں میں پڑھے گئے کلام کی ترتیب و تدوین جیل میں ہو گئی تھی مگر اس دور میں شائع کیا جانا ممکن نہ ہو سکا۔ البتہ یہ مجموعۂ کلام پنڈت کرشن کانت مالوی نے اپنے ذوق سلیم کے ماتحت 'ابھیوریہ' ہندی میں ترانۂ قفس کے نام سے اپنے پریس سے شائع کیا تھا۔ مگر اس کی اشاعت کے فوراً بعد ہی ان کا "ابھیودیہ" پریس اور ترانۂ قفس دونوں سرکار وقت نے ضبط کر لیے۔ افسوس کہ باوجود مسلسل تلاش اور کوشش کے کوئی جلد اس مجموعۂ کلام کی دستیاب نہ ہو سکی۔ حفیظ صاحب کا حافظہ صرف چند ہی اشعار کی بازیابی کر سکا، جن میں زیادہ تر خود ان کے ہیں۔ مگر یہ اشعار اس دور کے عزم و تاثرات کے آئینہ دار ضرور ہیں۔ اس لیے انھیں یہاں درج کیا جا رہا ہے کہ کم از کم یہی محفوظ ہو جائیں۔

آگرہ جیل کے پہلے طرحی مشاعرے کی ایک غزل کے کچھ اشعار یہ ہیں۔

شان عشاق نہیں تنگ بداماں ہونا مشکلوں میں نہ کبھی نادل گریاں ہونا
آدمی کو نہیں لازم ہے پریشاں ہونا کوئی آفت ہو مصیبت ہو ہمیشہ خوش ہو
چاک دل چاک جگر چاک گریباں ہونا عشق کی شان ہے عشاق کا شیوہ یہی

دوسرا طرحی مشاعرہ اس زمین میں تھا

اگر ہمدردی ہے تو ہندوستاں پہ جاں فدا کردے
مٹا دے اپنی ہستی کو وطن کا حق ادا کردے
مرے دل میں وطن کی آگ نے شعلے بھڑکائے ہیں
بس اب اے محبِ قومی مجھ کو وہ طاقت عطا کر دے
[illegible] کا صلہ [illegible] سے
مرے جو قوم کی خاطر وطن پہ جاں فدا کر دے
ابھی کچھ زندگی کا لطف بعد مرگ پاتا ہے
جو انساں آپ کو اخلاص قومی میں فنا کر دے
تیسرے مشاعرہ کا مصرعہ طرح تھا ع
[illegible] میں [illegible] انقلاب ہیں نظر [illegible]
[illegible] میں کچھ اشعار ملاحظہ ہوں
[illegible] جو کالے [illegible] اگر [illegible]
جو ملک پہ قرباں ہو کے جائیں بلا سے ... نرتش کی حکومت میں انصاف کا [illegible]
آمادہ ہوں بے تو [illegible] ... تیغ تن نے کبھی [illegible] ہو سکے [illegible]
جو تھے مشاعرہ میں [illegible]
[illegible]
[illegible] سے تعلق [illegible] شاعری [illegible] فرمایا تھا
[illegible] میں [illegible]
حفیظ صاحب [illegible] فرمایا تھا
[illegible] کی ... جنہ الوں سے [illegible]
[illegible] ... [illegible]
[illegible] ... صدیوں سے بہت [illegible] کی
[illegible] ... [illegible] کی
جیل کے [illegible] کوشش [illegible]
نہیں ہو سکے تاہم اس قید و بند میں نئے نئے کچھ ادبا شعرا اور
[illegible] یادگار واقعات قابل ذکر و ہیں۔ ڈاکٹر
ذاکر حسین صاحب مرحوم سابق صدر جمہوریہ ہند جب سے

[illegible] ہوئے ملاقات کے لیے آگرہ جیل آئے تھے تو حفیظ صاحب
نے برجستہ ایک نظم کہی تھی جس کے دو شعر یہ ہیں
جاتا ہے [illegible] کی طرف اک محبِ قوم ... تعلیم بھی ہے سلسلۂ جنبانِ حریت
[illegible] ... ہوگا اسی طرح سے وہ سامانِ حریت
[illegible] سے [illegible] آباد جیل جاتے ہوئے حفیظ صاحب نے فرمایا تھا
[illegible] ہے [illegible] میں ہم نے حفیظ
[illegible] سے آج فیض آباد کو جاتے ہوئے
[illegible] فیض آباد جیل سے لکھنؤ جیل جاتے ہوئے فرمایا تھا
[illegible] بیٹھے ہوئے [illegible] کی حالت میں حفیظ
جا رہے ہیں لکھنؤ [illegible] فیض آباد سے
[illegible] کے معمولات میں آج [illegible] [illegible] سے
[illegible] میں جمع ہو کر قومی ترانہ گایا جاتا تھا [illegible]
[illegible] سیاسی قیدیوں کے جسم [illegible]
[illegible] سے [illegible] وطن [illegible] قومی [illegible]
[illegible] جیل [illegible] میں [illegible]
[illegible] سال جیل کے [illegible] کے لحاظ [illegible]
[illegible] سیاسی قیدی [illegible]
[illegible] سے کوسوں دور تھے۔ غذا کے لیے [illegible] سامان لیتے
[illegible] اور [illegible] کبھی [illegible] نہیں کھا۔
[illegible] جیل میں [illegible] علاقہ کے سیکڑوں میدان
سیاسی [illegible] آزادی جمع تھے۔ ان میں میاں [illegible] لال جی
[illegible] سید [illegible] حسن سید [illegible] حسن اور حافظ محمود سے اتا [illegible]
[illegible] اکثریت مسلمان سیاسی قیدیوں کی تھی۔ ماہ صیام آتے
ہی جیل کے حکام سے درخواست کی گئی کہ سیاسی قیدی تراویح
[illegible] میں پڑھیں گے۔ لہٰذا ایک [illegible] جیل
کے سپرنٹنڈنٹ رائے بہادر [illegible] لال جی کو سب سیاسی

(بقیہ صفحہ ۴۲ پر)

ہندستان میں تعلیم کے حالیہ رجحانات

ڈاکٹر سلامت اللہ

ہندستان کی موجودہ صورت حال میں تعلیمی رجحانات کا ذکر [illegible] حالیہ زمانے کے بعض [illegible] واقعات کی تصویر [illegible] سامنے آتی ہے [illegible] کام کرنے والوں کے [illegible] میں [illegible] کا [illegible] میں [illegible] بحال رہتے ہیں [illegible] کی [illegible] حال موقع میں [illegible] طور سے [illegible] جاتی ہے [illegible] اکثر ہوتے رہتے ہیں [illegible] واقعات کی [illegible] سکتا ہے [illegible] میدان کے یہ سب حقائق [illegible] ملک کے لیے خطرے سے خالی نہیں۔ لیکن ان [illegible] کا یہ مناسب موقع نہیں ہے۔ یہاں صرف ان تعلیمی [illegible] کا ذکر کیا جائے گا جو تعلیمی میدان میں ہمارے ملک کے روشن مستقبل کی نشاندہی کرتے ہیں اور ان [illegible] کی طرف بھی اشارہ [illegible] جائے گا جو ملک کی تعلیمی ترقی میں مانع آسکتی ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ ہمارے یہاں برطانوی دور میں تعلیمی نظام کا ایک محدود مقصد تھا۔ ملک کا نظم و نسق چلانے کے لیے ضروری تھا کہ [illegible] درجے کی ملازمتوں کی خاطر ہندستانیوں کی خدمات حاصل کی جائیں تاکہ وہ حکمرانوں اور محکوموں کے درمیان رابطہ قائم کرسکیں یہی وہ مقصد تھا جس کو سامنے رکھتے ہوئے پورا تعلیمی نظام مرتب کیا گیا تھا۔ جو صورت الفاظ میں اسے "لبرل تعلیم" کہا جاتا تھا یعنی ایسی تعلیم جو انسانی فکر و نظر کو آزادی عطا کرتی ہے لیکن دراصل اس تعلیم کا [illegible] بالکل برعکس تھا [illegible] [illegible] معنوں میں [illegible] سکتا تھا [illegible] [illegible] کو [illegible] [illegible] کہ آدمی [illegible] [illegible] ملکی حکومت [illegible] [illegible] تعلیم کی [illegible] زندگی کے ساتھ کوئی [illegible] [illegible] ہوا کہ [illegible] تعلیم [illegible] طبقہ [illegible] [illegible] ملک میں [illegible] زندگی [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کی بہر صورت [illegible] [illegible] نظام کو ترک کیا [illegible] [illegible] [illegible] نقاد مقدم رکھا [illegible] کی [illegible] [illegible] [illegible] رہا ہے۔ اس کے علاوہ [illegible] تعلیم کی اساس [illegible] خوشحال طبقے کے لیے تعلیم کے مواقع فراہم کیے جاتے تھے [illegible] عوام کی تعلیم کا تعلق ہے۔ کہا جاتا تھا کہ اعلیٰ طبقے کے تعلیم یافتہ لوگ [illegible] [illegible] علم کی روشنی پہنچائیں گے۔ لیکن تجربے نے [illegible] بتایا ہے کہ یہ نہیں ہونے والا تھا۔

ناقص نظام تعلیم کے باوجود ہندستانیوں کی [illegible] [illegible] بڑھتی ہوئی بدحالی نے [illegible] [illegible] کے بعد ہندستانیوں نے آزادی حاصل کرلی۔ قومی تحریک کے [illegible] رہنماؤں نے جس نظام تعلیم کو ہمیشہ ناقص اور نقصان دہ سمجھا تھا اس

[illegible] نمایاں ہو گئیں۔ اس کے نتیجے کے طور پر گزشتہ چند سال سے ہمارے تعلیمی نظریات میں اور انکے عملی جامہ پہنانے کے [illegible] میں [illegible] کی صورت پیدا ہوتی ہے۔

آزادی کے بعد کے دور میں [illegible] زیادہ زور دیا گیا ہے۔ تعلیم [illegible] تعلیم کو اب قومی ترقی کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ [illegible] بالکل مختلف ہے جس کے مطابق تعلیم کو محض فرد کے ذاتی [illegible] کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ اس سے پہلے ہی نظر [illegible] یہ دیکھنا ہے کہ تعلیمی میدان میں قومی ترقی کے [illegible] تعلیم [illegible] بات ہو سکتی ہے جب ہم اس [illegible] جو ہم اپنے ملک میں قائم کرنا چاہتے ہیں۔ [illegible] سوشلسٹ قسم کا سماج قائم کر رہے ہیں۔ اس معاشرے میں [illegible] وسائل کو ترقی دی جاتی ہے جن میں تمام [illegible] اقتصادی اور [illegible] وسائل شامل ہیں۔ اس کے [illegible] حاصل رہے گی کے موقع [illegible] ہے۔ اس قسم کے سماجی نظام کی [illegible] سماجی [illegible] تاکہ سماجی انصاف قائم کیا جا سکے [illegible] ہر شخص کو [illegible] نشو و نما پانے کے [illegible] کافی مواقع [illegible] سکیں [illegible] ذرائع فراہم [illegible] اصول [illegible] میدان میں کار فرما ہونا چاہیے [illegible] مد نظر رکھا جائے کہ جو کچھ پیدا کیا جائے اس میں ہر شخص حصہ دار [illegible] استعمال کرنے کے [illegible] مواقع حاصل ہوں۔

اس طرح تعلیم آج قومی [illegible] کے ان [illegible] روشنی ڈالتی ہے۔ ایک طرف تعلیم ایسی عادتیں اور مہارتیں پیدا کرتی ہے جو ملک کی مادی [illegible] اٹھانے کے لیے ضروری ہیں اور دوسری طرف تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ [illegible] سے حاصل کردہ وسائل سے فائدہ [illegible] اٹھانے کا رجحان [illegible] پیدا کیا جائے۔ یہ بات واضح ہے کہ بنیادی تعلیم کی اسکیم میں سماجی پہلو سے ایک خاص [illegible] حیثیت حاصل ہے اور اسی طرح ہمہ مقصدی ثانوی تعلیم کی تجویز میں [illegible] ہے۔ یہ سچ ہے کہ یہ دونوں

اسکیمیں اتنی ترقی نہیں کر سکیں جتنی کہ کرنا چاہیے تھی۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان اداروں کی سرگرمیوں نے ہمارے اسکولوں میں بحیثیت مجموعی کسی نہ کسی طرح ایک خاص [illegible] حاصل کر لیا ہے۔ آج پیداوار کے مقصد کو مد نظر رکھتے ہوئے جو تعلیم دی جاتی ہے اس کے خلاف لوگوں میں بہت [illegible] مزاحمت کا جذبہ موجود نہیں [illegible] ملک کے نصاب [illegible] اور اعلیٰ حلقوں میں بھی تکنیکی تعلیم کو رجحان [illegible] جا رہا ہے اور بہت جگہ [illegible] خصوص [illegible] جنہیں عام طور پر پبلک اسکول کہا جاتا ہے [illegible] طلبا عملی کام [illegible] میں حصہ لیں مثلاً [illegible] کا کام [illegible] بڑھئی کا کام وغیرہ

لیکن جب یہ کہا جاتا ہے کہ ہمارے موجودہ تعلیمی نظام میں سب سے [illegible] سماجی ضرورت یعنی پیداوار [illegible] کو ملحوظ رکھا جائے گا تو اس کا مطلب [illegible] ہے کہ [illegible] مقصد کے [illegible] کام بنایا جا رہا ہے۔ اب تک اسکولوں میں پیداوار [illegible] کی جو کوششیں کی گئی ہیں ان کا خاطر خواہ [illegible] نہیں ہو سکے۔ [illegible] وجہ یہ ہے کہ اس قسم کے کام میں [illegible] سے [illegible] کیا گیا ہے وہ ناقص ہے [illegible] ضرورت نہیں ہونا چاہیے کہ پیداواری کام سے اکثر موقع فائدے حاصل نہیں ہوتے کام کی طرف طلبا میں جو صحیح رویہ پیدا ہونا چاہیے تھا وہ نہیں ہو سکا اسی طرح تکنیکی اور زرعی تعلیم کے میدان میں بھی خاطر خواہ [illegible] ہوئی ہے۔ پیشہ ورانہ تعلیم کے اداروں [illegible] جن کا مقصد تکنیکی کام سکھانا ہے کم و بیش یہی صورت حال ہے یعنی یہاں بھی پیداواری کام کی طرف صحیح رویہ کا اسی طرح فقدان ہے جس طرح عام تعلیم کے اداروں میں۔ اس کمزوری پر قابو پانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ سب لوگ مل کر کوشش کریں جو تعلیمی میدان میں کام کر رہے ہیں اور اس سلسلے میں سب سے زیادہ ذمے داری خود اساتذہ پر عائد ہوتی ہے۔ اس طرح تعلیم کو سماجی ضروریات پوری کرنے کے لیے [illegible] رجحانات کا حامل بنایا جا سکتا ہے۔ کام نہ کرنے کے لیے یہ بہانہ تلاش کرنا کہ جسمانی محنت کے خلاف عام طور پر جو رجحان پایا جاتا ہے، اسکول اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا، اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ

ان مفاد پرستوں کے سامنے سرِ تسلیم خم کر رہے ہیں جو موجودہ صورتِ حال برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ انتہائی شرمناک شکست ہے۔

اوپر کی سطور میں جس تعلیمی رجحان کا ذکر کیا گیا ہے اسی سے متعلق سب سے اہم رجحان یہ ہے کہ سماج کے تمام طبقوں کے لیے تعلیم کے مساوی مواقع فراہم کیے جائیں۔ یہ سماجی انصاف کا مساوی اصول ہے ایک طرف اس سے فرد کی صلاحیت کو خود اس کے ذاتی مفاد میں فروغ دینے کا امکان پیدا ہوتا ہے اور دوسری طرف یہ سماج کے اجتماعی مفاد میں اضافے کے لیے بھی بہت اہم ہے۔ گزشتہ پچیس سال میں اس نظریے کی مساوی تسلیم شدہ ہو گئی ہے۔ اگرچہ دستورِ ہند کی دفعہ ۴۵ کی ہدایت کے باوجود ملک ابھی تک چودہ سال تک کی عمر کے تمام بچوں کو مفت لازمی ابتدائی تعلیم مہیا نہیں کر سکا ہے تاہم تقریباً ہر جگہ اس عمر کے بچوں کو اسکول جانے کی سہولتیں مہیا کی جا چکی ہیں اور موجودہ اندازے کے مطابق ۱۹۸۰ء تک دستور کی ہدایت کی تکمیل ہو جائے گی۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ اسکول جانے والے بچوں میں ان کی تعداد اچھی خاصی ہے جن کے والدین نے کبھی اسکول کی شکل نہیں دیکھی تھی۔

تعلیم حاصل کرنے کی خواہش اتنی بڑھ رہی ہے کہ تعلیمی اداروں کی تعداد اور ان میں طلبا کے بے تحاشا بڑھنے کے باوجود ابتدائی اور ثانوی درجوں میں طلبا کی تعداد کے لحاظ سے تعلیمی سہولتیں ناکافی ثابت ہو رہی ہیں۔ یہاں تک کہ یونیورسٹی کی سطح پر بھی تعداد میں بہت اضافہ ہو رہا ہے۔ تعلیم کی توسیع اتنی تیزی سے ہو رہی ہے کہ اس کی وجہ سے بہت سے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ تعلیم کا معیار گرتا جا رہا ہے اور ڈسپلن کا مسئلہ بہت مشکل ہو گیا ہے۔ ڈسپلن کی خرابی کا ایک سبب یہ ہے کہ طلبا کی تعداد میں یکایک غیر معمولی اضافہ ہوا ہے اور ان کا تعلق سماج کے مختلف طبقوں سے ہے جن کی روایات جدا جدا ہیں اور جن کی اقدار ایک دوسرے سے ٹکراتی ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مساوی تعلیمی مواقع فراہم کرنے کی سمت میں یہ ایک صحیح قدم ہے۔

بعض لوگ نفسیاتی اصولوں اور بظاہر معقول دلیلوں کا سہارا لے کر تعلیم کے مساوی مواقع فراہم کرنے پر اعتراض کرتے ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ ذہانت، صلاحیت، رجحان اور قابلیت کے اعتبار سے افراد ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان مختلف صلاحیتوں کے طلبا کے لیے تعلیم کے مساوی مواقع فراہم کرنا قومی وسائل کو ضائع کرنا ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کم ذہین اور کم صلاحیت والے بچے اعلیٰ قسم کی تعلیم سے فائدہ اٹھانے کے اتنے مستحق نہیں ہیں جتنے کہ زیادہ ذہین بچے۔ لیکن بہ نظرِ غائر دیکھا جائے تو اس دلیل میں کچھ زیادہ وزن نہیں ہے۔ اوّل تو ذہانت اور دوسرے رجحانات جنھیں ہم پیدائشی اور فطری سمجھتے ہیں دراصل سماجی اور معاشی حالات کی دین ہوتے ہیں اور بڑی حد تک ان کا تعلق اس ماحول سے ہوتا ہے جس میں فرد کی نشو و نما ہوتی ہے۔ دوم پہلے سے قطعی طور پر یہ طے کرنا مشکل ہے کہ تعلیمی مواقع کے سلسلے میں کس کے ساتھ کیا رویہ اختیار کیا جانا چاہیے۔ تمام بچوں کو مساوی مواقع فراہم کرنے کے بعد ہی اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کسی مخصوص ہنر کے سیکھنے میں بچوں کی صلاحیت ایک دوسرے سے کتنی مختلف ہے۔ ممکن ہے یہ بھی سچ ہے کہ ایسے بچوں کو جو یکساں استعداد اور صلاحیت نہ رکھتے ہوں برابر سمجھنا اتنی ہی بے انصافی ہوگی جتنی کہ مساوی استعداد رکھنے والوں کے ساتھ غیر مساوی سلوک کرنا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ لوگ حق بجانب نہیں ہیں جو انصاف اور مساوات اور بعض اوقات جمہوریت کا نام لے کر سماج کے کمزور طبقوں کو دی جانے والی ان مراعات اور خصوصی سلوک کی مخالفت کرتے ہیں جو خاص طور پر درج فہرست ذات والوں اور درج فہرست قبیلوں کو دستور ہند کی دفعہ ۴۶ کے تحت حاصل ہیں۔ ہمارے سماج کے ان طبقوں کی پسماندگی کی تاریخی وجوہات ہیں۔ یہ صحیح نہیں ہے کہ وہ فطری یا نسلی طور پر کمتر ہیں۔ یہی بات عورتوں اور کچھ دوسرے پسماندہ طبقوں کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنھیں طاقتور طبقے نے صدیوں سے دبا کر کمتر حیثیت میں رکھا ہے۔ اگر ہمارے سماج کو ترقی کی راہ پر گامزن ہونا ہے تو اس تاریخی غلطی کا ازالہ کرنا ضروری ہے۔ اس لیے کمزور طبقے کے مفادات ہماری خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ خوشی کی بات ہے کہ تعلیم اور روزگار دونوں میدانوں میں اس کی جھلک دکھائی

[illegible] ہے۔ لیکن [illegible] کی راہ میں رکاوٹیں سی آ گئی [illegible] کے لیے [illegible] جیسے کام کرتے رہتے ہیں۔ [illegible] کا جو اور اعلیٰ تعلیم [illegible] اور [illegible] سماج کے [illegible] طبقوں کے لئے [illegible] کیے گئے ہیں اور ان کے [illegible] [illegible] کی تعلیم کا [illegible] سلسلے میں ایک [illegible] برآمد نہیں ہوا ہے [illegible] کا [illegible] گیا ہے [illegible] عام [illegible] ایک طرف [illegible] کی [illegible] کار [illegible]

[illegible] حال واضح ہو رہے۔ [illegible] ہے کہ قومی [illegible] موجودہ دور میں پلاننگ کی ایک [illegible] برائی [illegible] تعلیمات منصوبوں میں [illegible] میں پلاننگ [illegible] ۱۹۰ [illegible] پڑھ جاتے ہیں۔ [illegible] سال [illegible] کے [illegible] سال کی [illegible] سے اسے [illegible] کے بعد مسلموں نے طویل [illegible] مقاصد کے حصول کے لیے [illegible] طے کرنا ہوں گی [illegible] پلاننگ کا ایک [illegible] سامنے ہونا چاہیے۔ قومی [illegible] کی [illegible] ہے۔ [illegible] ہوگا ایک [illegible] کے انسانی وسائل میں اضافے کے لیے ضروری ہے [illegible] کہ تعلیم سماجی خدمت کی ایک قسم ہے جس

کے ذریعے انسان کی انفرادی اور سماجی دونوں لحاظ سے نشو و نما ہوتی ہے۔ تعلیم کو ایک طرف تو ترقی پذیر معیشت اور خدمات کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے تربیت یافتہ افراد مہیا کرنا ہوں گے اور دوسری طرف تعلیم کا کام یہ ہو گا کہ ایسے ہمدرد مرد اور عورتیں ابھر کر سامنے آئیں جو اپنی شخصی [illegible] کی تشکیل کے ذریعے سماج کی فلاح و بہبود کے لیے مستقل سلسلہ کو رواں رکھ سکیں۔ تعلیمی منصوبہ بندی اس طرح کی جانا چاہیے کہ یہ مقصد حاصل ہو سکے۔

گزشتہ پچیس سال کے دوران ہندوستان میں تعلیم کے شعبہ میں بھی اسی طرح منصوبہ بندی کی گئی ہے جس طرح قومی زندگی کے دوسرے شعبوں میں۔ [illegible] منصوبوں کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔ تعلیم کے میدان میں ہر سطح پر تعداد کے اعتبار سے کافی توسیع ہوئی ہے لیکن ہر [illegible] حیرت سے [illegible] لیے گئے تھے وہ اکثر پورے نہیں ہوئے [illegible] کچھ [illegible] کام ہوا ہے۔ [illegible] منصوبہ بندی کے سلسلے [illegible] منصوبوں کو [illegible] [illegible] ان منصوبوں کو کامیابی سے ساتھ عملی جامہ پہنانے کے لیے جو [illegible] [illegible] کہ [illegible] حقیقت پسندی [illegible] پہلے سے [illegible] حقیقت پسندی کی کمی کا اظہار اس طریقہ کار سے بھی ہوتا ہے جو پلاننگ میں اختیار کیا گیا۔ پلاننگ بالکل اوپر سے [illegible]۔ تمام اعداد و شمار مرکز کی طرف سے اکٹھے کیے گئے اور انہیں اعداد و شمار کی بنیاد پر منصوبوں کی تشکیل کی گئی۔ ان مخصوص حالات پر توجہ نہیں دی گئی جن کے تحت منصوبہ پر عمل درآمد ہونا تھا۔ اس غلطی کو درست کرنا ضروری ہے۔ اگر تعلیمی قومی مقاصد کی [illegible] میں پلاننگ کا کام انفرادی اداروں یا مقامی حالات کی بنیاد پر شروع کیا جاتا تو شاید زیادہ حقیقت پسندانہ اور مربوط قومی پلان تشکیل دیا جا سکتا تھا۔

اس تنقید میں کافی وزن معلوم ہوتا ہے کہ عام لوگوں کی تعلیم یعنی ابتدائی تعلیم اور تعلیم بالغان کو ان منصوبوں میں خاطر خواہ ترجیح نہیں دی گئی ہے۔ ایک ماہر تعلیم کا یہ قول ہندوستان کی

موجودہ تعلیم پر صادق آتا ہے کہ ہماری تعلیمی عمارت کی نہ بنیاد مضبوط ہے اور نہ اس کی چھت محفوظ اور پائیدار ہے۔ عوام کی کثیر تعداد جسے ابتدائی تعلیم اور تعلیم بالغان کی ضرورت ہے، دراصل قومی دولت پیدا کرتی ہے۔ اس لیے عوام کی تعلیم کو ہماری تعلیمی منصوبہ بندی میں سب سے زیادہ اہمیت دی جانا چاہیے تھی۔

مزید برآں تعلیم کی تیزی کے ساتھ توسیع کرنے کے جوش میں تعلیمی معیار کے پہلو کو نظر انداز کر دیا گیا۔ طلبا اور تعلیمی اداروں کی تعداد میں تو بڑی توسیع ہوتی رہی مگر تعلیمی معیار پختگی کے ساتھ ملحوظ نہیں کیا گیا۔ [illegible] نے کتنا صحیح کہا تھا کہ لوگ [illegible] رہ جاتے ہیں گے۔ یہ بہت ضروری ہے کہ اب [illegible] گرتے ہوئے تعلیمی معیار کو بہتر بنانے پر بھی زور دیا جائے۔

اب نصاب تعلیم اور پڑھانے کے ان جدید رجحانات پر نظر ڈالنا ہے جو اس تعلیمی پس منظر پر ابھرتے ہوئے جس کا خاکہ اوپر کی سطور میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں سب سے زیادہ اہم رجحان نصاب تعلیم اور تعلیمی مواد کو بہتر بنانے کی باشعور کوشش کی شکل میں جلوہ گر ہوا ہے۔ یہ رجحان خاص طور پر سائنس اور سماجی علوم کے میدان میں بہت نمایاں ہے۔ اگر تعلیم قومی ترقی میں اہم رول ادا کرنا چاہتی ہے تو ان مضامین کا مناسب مطالعہ کرنا ضروری ہے۔

آج کی دنیا میں ہر ایک صنعت اور ٹکنالوجی کی بنیاد سائنس پر ہے۔ جدید دنیا میں تمام تر ترقی کا سرچشمہ سائنس کا علم ہی نہیں بلکہ وہ جدید نقطۂ نظر ہے جو سائنسی طریقوں کو اپنانے سے پیدا ہوتا ہے۔ اسکولوں کے نصاب اور عام تعلیم کے ایک حصے کے طور پر انڈر گریجویٹ تعلیمی پروگرام میں سائنس کی تعلیم پر جو زور دیا جا رہا ہے وہ بہت خوشگوار رجحان ہے۔ علم کی حالیہ حیرت انگیز ترقی بالخصوص سائنس کے میدان میں علم کی ترقی کے پیش نظر اسکولوں کے نصاب میں سائنس کے مواد تعلیم کا معیار بلند کیا جا رہا ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ جو اساتذہ اسکولوں میں کام کر رہے ہیں ان کے لیے ایسے پروگرام شروع کیے جائیں جن کی مدد سے وہ ان چیزوں سے واقف ہو سکیں جو انھیں نئے نصاب کی رو سے پڑھانا ہوں گی۔ یہ سب ٹھیک ہے لیکن سب سے زیادہ نتیجہ خیز جو سائنس کے مطالعے سے حاصل ہونی چاہیے اس پر ابھی توجہ نہیں دی جا رہی ہے جس کی ضرورت ہے جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے جدید دور میں تمام ترقی کی بنیاد سائنسی نقطۂ نظر ہے۔ سائنسی نقطۂ نظر اپنانے کے لیے سائنس ہی کے معلمین میں نہیں بلکہ دوسرے مضامین پڑھانے والے تمام اساتذہ میں سائنسی رجحان کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ معقول طریقے پر چیزوں کا مشاہدہ کر کے نتیجے خود اخذ کریں۔ انھیں کسی روایت یا طاقت کے دباؤ میں آ کر خواہ وہ کتنی ہی مقدس کیوں نہ ہو پیش کیے گئے کسی بھی نظریے کو تسلیم نہیں کرنا چاہیے۔ ہمارے سماج میں توہمات اور تاریک اندیشی اس قدر زیادہ ہے کہ وہ مختلف طریقوں سے ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتی ہے۔ اسکول کی فضا بھی ان چیزوں سے چھائی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ کبھی دانستہ اور کبھی نادانستہ طور پر اسکول ان گمراہیوں کے پھیلانے اور تقویت پہنچانے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اس لیے محض سائنسی معلومات دے دینا کافی نہیں ضرورت اس بات کی ہے کہ طلبا میں تجربے کرنے اور تجربے کے نتائج اخذ کرنے اور انھیں صحیح مقام دینے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ اسے ایک لفظ میں یوں کہیے کہ سائنسی نقطۂ نظر پیدا کیا جائے تب کہیں جا کر تعلیم موجودہ توہمات اور تعصبات کو دور کرنے میں کامیاب ہو سکے گی۔

جہاں تک اسکول کے نصاب اور انڈر گریجویٹ تعلیمی نصاب میں سماجی علوم شامل کرنے کا سوال ہے تو جس طرح سائنس کے سلسلے میں اسی طرح اس معاملے میں بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ مضمون کو اس طرح پڑھایا جائے کہ طلبا میں سماج کے مختلف اداروں اور طریقہ کار کے بارے میں صحیح رویہ اپنانے اور ان کو ٹھیک طور سے سمجھنے کی صلاحیت پیدا کی جا سکے۔ ہمارے جیسے ملک میں جہاں زبان، ذات پات، مذہب، علاقے اور کلچر کی بنیاد پر لوگ ایک دوسرے سے مختلف ہیں اس مضمون کے مطالعے کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس بات میں شبہ ہے کہ کیا سماجی علوم کے مطالعے سے ہمارے طلبا میں کثرت میں وحدت کا نظریہ پیدا ہو رہا ہے جیسی کہ توقع ہے۔ قومی ترقی کے

لیے ملک میں موجود مختلف النوع معاشروں کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرنا اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ سائنسی نقطۂ نظر اپنانا۔ یہاں پھر استاد کا رول توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔

مضمون طویل ہوگیا ہے لیکن دو رجحانات اور قابل ذکر ہیں کیونکہ میرا خیال ہے کہ تعلیمی ترقی میں ان کی کافی اہمیت ہے۔ اس میں ایک رجحان کا تعلق طلبا کی ترقی کا جائزہ لینے سے ہے، جسے جائزہ ([illegible]) کہا جاتا ہے اور دوسرا توسیعی پروگراموں کے ذریعے ان اساتذہ کی کارکردگی کو بہتر بنانا ہے جو اسکولوں میں کام کر رہے ہیں۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں جائزہ کا مطلب طلبا کی عمومی ترقی کے مختلف پہلوؤں یعنی علمی استعداد، کردار، شخصیت وغیرہ کا جائزہ لینا ہے۔ اس کا مقصد ایک خاص وقت میں محض طلبا کی علمی لیاقت کا ریکارڈ کرنا اور اس کی تصدیق کرنا ہی نہیں ہے بلکہ جائزہ کا اصل مقصد ترقی کے پورے عمل میں مدد کرنا ہے۔ یہ معلوم کرنے کے بعد ہی کہ جوتا کس جگہ کاٹتا ہے، اس کی مرمت کرائی جاتی ہے۔ جائزہ یا جانچ، تعلیمی طریقۂ کار کا جزو لاینفک ہے۔ گزشتہ دس سال کے دوران جائزہ کا نظریہ اساتذہ، تعلیمی منتظمین اور سرکاری امتحانات سے متعلق حکام میں کافی مقبول ہوا ہے۔ اس مقصد کے لیے مختلف سمیناروں، کانفرنسوں اور جلسوں کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ جائزہ اب اساتذہ کی تعلیم سے متعلق تمام پروگراموں کا ایک ضروری حصہ ہو گیا ہے۔

اس نظریے کی روشنی میں امتحانات لینے والے بعض اداروں نے امتحانات کی تکنیک میں تبدیلیاں بھی کر دی ہیں۔ اس کا اظہار اس لائحہ عمل سے ہوتا ہے جو اسکولوں میں اختیار کیا جا رہا ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود تعلیم کی عمومی ترقی پر جائزے کے نئے تصور کا کوئی قابل ذکر اثر نہیں پڑا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس معاملے پر تعلیم کے دوسرے پہلوؤں سے الگ ہوکر غور کیا گیا ہے۔ جائزے کو جب تک نصاب اور پڑھانے کے پورے معاملے کے ساتھ منسلک کرکے اس پر غور نہ کیا جائے گا، اس وقت تک محض نئی تکنیک استعمال کرنے سے خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔

اب اس بات میں صداقت نہیں رہی ہے کہ جو ایک دفعہ استاد ہو گیا وہ ہمیشہ کے لیے استاد ہے۔ استاد کو بھی دوسرے پیشے کے لوگوں کی طرح ان تمام ترقیوں کے بارے میں جدید ترین معلومات ہونا چاہیے جو تعلیم کے میدان میں ہوتی رہتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی یہ مخصوص ضرورت پوری کرنے کے سب سے زیادہ اہل اساتذہ کے مدرسے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں سے بہت سے کالجوں کو توسیعی پروگرام ترتیب دینے کا کام سونپا گیا ہے، تاکہ اساتذہ اپنے اسکولوں میں تعلیم کے معیار کو بہتر بنا سکیں۔ اس سلسلے میں جو کام کیا گیا ہے اس کی بہت سی رپورٹیں موجود ہیں۔ جو اساتذہ ملازمت کرتے ہوئے اپنی علمی اور پیشہ ورانہ استعداد بڑھانا چاہتے ہیں ان کے پروگراموں کو کمیت اور کیفیت دونوں اعتبار سے زیادہ پائیدار اور بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔



ترانۂ قفس — (صفحہ ۴۳ کا بقیہ)

قیدی "نانا" کہہ کر مخاطب کرتے تھے جیل کے قواعد کسی صورت سے اس رعایت کے لیے تیار نہ ہوئے۔ اس باب میں تمام ہندو اور مسلم سیاسی قیدیوں کی مجلس شوریٰ بیٹھی اور یہ طے ہوا کہ افطار صوم کے بعد تراویح باہر ہی پڑھی جائے گی۔ مسلمان قیدی نماز پڑھیں گے اور ہندو قیدی ان کی حفاظت کریں گے تاکہ نماز میں کوئی خلل نہ پیدا ہو سکے۔ قیدیوں میں بہت سے حفاظ قرآن تھے۔ تراویح کو اتنا طول دیا جانے لگا کہ وقت سحر سے مل جائے۔ یہاں پر مولانا حسرت موہانی کا یہ شعر قابل ذکر ہے:

درس حق جاری ہے یاں بھی حسرت آزاد کا
جیل خانہ مدرسہ گویا ہے فیض آباد کا

اللہ اللہ کیا زمانہ تھا! ہندو مسلم اتحاد کا یہ روح پرور نظارہ بیان کرتے ہوئے حفیظ صاحب کا تاثر قابل دید ہوتا ہے۔

جوانی آگئی مشرق پہ سارا ایشیا جاگا

میکش اکبرآبادی

وہی ہندوستاں جو قبلۂ اقوامِ عالم تھا
سبق جس نے زمانے کو دیا تھا علم و دانش کا
بدل دیں خوئے محکومی نے ساری خصلتیں اس کی
تہی دامن ہوا خود جو کبھی دنیا کا داتا تھا

پھر اک مردِ خدا اٹھا پھر اک مردِ فقیر آیا
خمِ گردن سے جس کے خنجرِ فولاد کو کاٹا
لڑایا جس نے کجتکِ ستہ پہ کوتاہی سے
بہایا اپنا خوں اور موت کا سر کر گیا اونچا

شریکِ کار اس کا اک جوانِ کامیاب آیا
چھپائے دل میں غم، سینے پہ مہکائے گلاب آیا
جوانی آگئی مشرق پہ سارا ایشیا جاگا
ہوئی کافور اندھیری رات جب یہ آفتاب آیا
ہوائیں امن کی سنکیں، چمن لہکا فضا مہکی
وہ کیا آیا کہ ساری قوم پر جیسے شباب آیا

کلی کو اپنی نکہت دے کے ہم سے ہوگیا رخصت
کلی بھی ہے وہ گل بھی تیغ بھی آہن بھی دیبا بھی
حرم اندر حرم دل اس کا، رُخ اس کا صنم خانہ
وہ قاتل بھی مسیحا بھی، وہ مومن بھی وہ ترسا بھی
سیاست اس کی عزم اس کا شجاعت اس کی حسن اس کا
متاعِ عقل و دانش بھی سرِ دورِ جام و مینا بھی

شجرِ آزادی

عمر انصاری

صحنِ گلشن میں جو یہ پیڑ کھڑا ہے لوگو
اس کا افسانہ کچھ اس سے بھی بڑا ہے لوگو

پیار کا ہے یہ نشاں، عظمتِ انساں کا بھرم
پیڑ ہے یہ کوئی امن و سکوں کا پرچم

سرزمیں اس کی تمناؤں کی ہے اک وادی
نام ہے اس کا جہاں میں شجرِ آزادی

قد و قامت میں جو سرسبز ہمالہ سے نہیں
حسن بھی کم کسی سلما و غزالہ سے نہیں

سب در اندازیوں عاشق کی وفائیں جیسے
اور یہ سائے ہیں کہ ساون کی گھٹائیں جیسے

پات پات اس کا ہے مستانہ نگاہوں کی طرح
ڈال ڈال اس کی ہے محبوب کی باہوں کی طرح

ٹہنیاں حق و مروت کے سکھاتی ہیں سبق
پتیاں ہیں کہ ہیں تاریخ محبت کے ورق

اس کے پہلو میں مرادوں کے کنول کھلتے ہیں
دوست تو دوست ہیں دشمن بھی گلے ملتے ہیں

راہ تکتا ہے شب و روز یہ کس کی کس کی
آشیانوں کے لیے وقف ہیں شاخیں اس کی

کارواں درد کے ماروں کے اترتے ہیں یہیں
کیسے ہی کیوں نہ مسافر ہوں ٹھہرتے ہیں یہیں

چرخ کا جب کبھی ستایا کوئی آ جاتا ہے
زندگی اس کی گھنی چھاؤں میں پا جاتا ہے

دیکھ سکتا ہو تو دیکھے کوئی جوبن اس کا
ہاں مگر یہ کہ نظر میں رہے بچپن اس کا

ہائے وہ دور، تصور نہیں ممکن جس کا
جرم تھا جب کہ یہاں نام بھی لینا اس کا

ہر نظر ایک دہکتی ہوئی چنگاری تھی
دھوپ ہی دھوپ کی ہر سمت عملداری تھی

عالمِ ہو تھا ہر اک سمت بس اک آہ کے بعد
کوئی والی ہی نہ تھا اس کا ظفر شاہ کے بعد

اس کے باوصف کہ ٹوٹا کیے پتھر لاکھوں
ہم نے سینچا ہے اسے اپنے لہو سے برسوں

اب یہ کہنے کو پری رو ہے پری زادہ ہے
ہے ہمارا ہی جگر جس پہ یہ استادہ ہے

یہ زمیں آگ تھی مشکل تھا جمانا اس کا
ہم تھے کمزور تو دشمن تھا زمانہ اس کا

اس سے پہلے کہ یہاں لا کے لگایا تھا اسے
من چلے خوابوں کے آنگن میں اگایا تھا اسے

تیر کیا کیا نہ زمانے نے کلیجے پہ چلائے
کیسے کیسے نہ ستم اس کے لیے ہم نے اٹھائے

آرزو میں کہ اسے پھولتا پھلتا دیکھیں — کتنی کٹوا دیں خود اپنے ہی سروں کی فصلیں
اپنے وہ شام سویرے ہمیں یاد آتے ہیں — رسن و دار کے پھیرے ہمیں یاد آتے ہیں
جان یوں اس پہ فدا کر گئے کرنے والے — زندگی اپنی اسے دے گئے مرنے والے
بات ابھی کل کی ہے نازک سا یہ اک پودا تھا — ہم بچا لیں اسے، ہر سر میں یہی سودا تھا
اس سے پہلے کہ کرم اس پہ کوئی فرمائے — بس یہی دھن تھی کہ یہ پیڑ جواں ہو جائے
نقد جاں ہار کے بھی بازیٔ دل جیت گئے — دیکھتے دیکھتے پچیس برس بیت گئے

آج اسے دیکھ کے آتا نہیں یاد ایک بھی غم — کم ہے کیا کچھ کہ ہیں بیٹھے تو گھنی چھاؤں میں ہم
سربلندی میں اگر اس کی ہے ٹیپو کی اٹھان — سرکشی میں بھی ہے جھانسی کی رانی کے سمان
کی عطا اس کو نانک نے صفتِ غم خواری — عظمتیں اس کو یہ باپو سے ملی ہیں ساری
جب کہیں جا کے ہوا ہے یہ لاثانی — آب موتی سے، تو جوہر سے ملی تابانی
بانکپن میں ہے تو سوچ تو سازش تو ہو — اس کی رگ رگ میں بھگت سنگھ کا دوڑے ہے لہو
ہو اثر اس پہ تو کیونکر نہ تلک نہرو کا — کہ ہے محبوب یہ آزاد و حسین احمد کا
آئے تعلیم جو ... جالی ہے موتی اس میں — بات یہ ہے کہ جواہر کی ہے جوتی اس میں
دوسرا ہو تو بڑا فخر بڑا ناز کرے — مرنے والے جو ملیں لال بہت در ایسے
کیا عجب ہو جو سرِ فخر اٹھے اور اونچا — اس کا دامن کبھی تو اندرا کے ہاتھ سے سدھا

آخری قافلۂ شوق کی یہ منزل ہے — اس کے سینے میں ہمارا ہی دھڑکتا دل ہے
ہم نہ یوں چاہیں اسے، یہ تو نہیں ہو سکتا — سوکھ جانے دیں اسے، یہ تو نہیں ہو سکتا

جان دے دیں گے، ابھی اسے پہنچے جو گزند
اس کے پھولوں کی قسم، اس کے پھلوں کی سوگند

نیا دور

مسعود اختر جمال

اٹھو عہدِ ماضی کے ماتم گسارو — غمِ رفتگاں آج دل سے بھلا دو
روانہ ہوا کارواں سوئے منزل — زمانے کو خوابِ گراں سے جگا دو
زمانے کو خوابِ گراں سے جگا دو

نیا عزم جاگا کہ اب دور آیا — نئے حوصلے ہیں، ارادے نئے ہیں
نئی بزم آراستہ ہو رہی ہے — امنگیں نئی ہیں، تقاضے نئے ہیں

اٹھو عصرِ حاضر کے پروردگارو — یہ تفریقِ شاہ و گدا اب مٹا دو
روانہ ہوا کارواں سوئے منزل — زمانے کو خوابِ گراں سے جگا دو
زمانے کو خوابِ گراں سے جگا دو

اٹھو میری دنیا کے محنت کشوں کو — خودی کیا ہے رازِ خدائی بتا دو
دلوں کو محبت سے معمور کر دو — نگاہوں کو تاثیرِ صدق و صفا دو
کنشت و کلیسا و دیر و حرم کے — نگہباں بھی تم، رازداں بھی تمہیں ہو
جو زد میں نہ آئے وہ تدبیرِ ربانی — یہ فتنہ ہے اٹھنے سے پہلے دبا دو
خدا سے نہ پائے نہ مسند کوئی — غریبوں پہ اب ہو نہ بیداد کوئی
قیامت نئی ہو نہ ایجاد کوئی — یہ نظمِ کہن خاک میں اب ملا دو
ہوس اور شاہی کا اک شعلۂ تر — فنا ہو یہ گنجشک و ماہی یہیں اب
یہ تخریبِ پیہم، یہ جورِ مسلسل — یہ سلطانیت اب جہاں سے مٹا دو
وہ شرق کی پیشانیوں سے ابھر کر — ہوا جلوہ گر صبحِ نو کا تبسم
جنہیں ظلمتِ شب نے بے حس کیا ہے — وہ بے نور و افسردہ شمعیں بجھا دو

زمانے کو خوابِ گراں سے جگا دو — کہ تشکیلِ بزمِ بشر ہو رہی ہے
سیہ رات دم توڑتی ہے فضا میں — افق سے ہویدا سحر ہو رہی ہے

"گیا دورِ سرمایہ داری گیا اب — تماشا دکھا کر مداری گیا اب"

اٹھو عصرِ حاضر کے پروردگارو — اب اس بزم کو رشکِ جنت بنا دو
روانہ ہوا کارواں سوئے منزل — زمانے کو خوابِ گراں سے جگا دو
زمانے کو خوابِ گراں سے جگا دو

آزادی کا روپ

رام کرشن مضطر کگوڑوی

کتنا دل کش ہے ترے رخ کا یہ شاداب چمن
کتنے پُر نور ہیں ان مد بھری آنکھوں کے کنول
کتنے تازہ ہیں مہکتے ہوئے ہونٹوں کے گلاب
کتنا سندر ہے یہ مکھڑا یہ سنہری آنچل

یہ چٹکتی ہوئی کلیاں یہ مہکتے ہوئے پھول
اک کرشمہ ہے تری شوخی و رعنائی کا
یہ لچکتی ہوئی شاخیں یہ حسیں قوسِ قزح
آئینہ ہیں تری مستی بھری انگڑائی کا

اے نسیمِ سحری! اے روحِ نوجوانِ حیات
تو نے بخشا ہے جمالِ گل و نسریں کو نکھار
تیرے جلووں سے ہی زینت ہے سمن زاروں کی
تیرے نغموں سے ہی رقصاں ہے ہر اک سمت بہار

اپنی دھرتی ہے، چمن اپنا ہے، گل اپنے ہیں
اپنے جیون کے ہر انداز میں اپنا پن ہے

لہلہاتے ہوئے کھیت اور یہ گاتے دریا
جنتیں جس میں ہیں آباد یہ وہ دامن ہے

اپنے ہاتھوں سے ہی بنتی ہے یہ مٹی سونا
اپنی محنت کا ہے اعجاز نمایاں ہر سو
اپنے ہاتھوں نے ہی فولاد کو پگھلایا ہے
کارفرما ہے ہر اک شے میں عمل کا جادو

مقصدِ اہلِ وفا آرزوئے جاں بازاں
ہند کے روئے جہاں تاب کی تنویر ہے تو
تیری خاطر تری راہوں میں بہا جن کا لہو
ان شہیدوں کے حسیں خواب کی تعبیر ہے تو

عظمتِ قوم ہے جمہور کی آزادی ہے
تیرے انداز پہ سو جان سے قرباں ہم ہیں
تیری ہستی سے ہی قائم ہے ہماری ہستی
تیری ہستی کے نگہدار و نگہباں ہم ہیں

شکتی

جگیشور ناتھ بیتاب بریلوی

پھونکتی روح بہاروں میں گھٹا آئی ہے
آج تخصیص تماشا نہ تماشائی ہے

جادوئے چشمِ حسیناں ہے کہ برسات کی رات
سایۂ رحمتِ یزداں ہے کہ برسات کی رات

حلقۂ زلفِ بہاراں ہے کہ برسات کی رات
جلوۂ صبحِ چمن شامِ اودھ رات کی رات

پردۂ غیب سے سبزہ پہ نکھار آیا ہے
پھر نیا دور بعنوانِ بہار آیا ہے

جگمگاتے ہیں ختن ساز فضاؤں میں کنول
رزم امکاں ہے زہے جلوہ گہِ حسنِ عمل

ظلمتِ دود چراغاں ہوئی بکھرا کافور
گیسوئے نور پریشاں ہیں سرِ قشقۂ نور

اب وہ ادبارِ مسلسل ہے نہ دورِ آلام
صبحِ بیمارِ اجل چارہ نہ مدقوق سی شام

صورتِ بابِ قفس باز نئی راہیں ہیں
اب عناں گیر بہر گام کئی راہیں ہیں

پیشِ پا منزلِ مقصود فتادہ نہ سہی
رائگاں سعیِ طلب جائے تو کچھ شرط رہی

حسنِ تدبیر سے پتھر کا جگر پانی ہے
ظرفِ تنویرِ سیہ خانۂ ویرانی ہے

جام ہونٹوں سے لگائے ہوئے جمنا[1] جل کا
رشکِ گلشنِ فردوس ہے صحرا کل کا

اک چراغِ تہِ داماں ہے چراغِ خورشید
پرتوِ سروِ خراماں ہے صفوں سے ناپید

ذرّہ خاکِ وطن ہے مہ و انجم کا جواب
مسکراتی ہوئی کلیاں ہیں بطِ بادۂ ناب

نائلِ حالِ مقدر بھی ہے مقدور بھی ہے
خدشۂ دار تو ہے جرأتِ منصور بھی ہے؟

---

[1] جمنا ایڈن برد حکیٹ

اُردو کے ضبط شدہ مطبوعات

علی جواد زیدی

پہلی جنگ آزادی کی صد سالہ یادگار سنہ ۱۹۵۷ء میں منائی گئی تھی آج سنہ ۱۹۷۲ء میں ہم حصول آزادی کی پچیسویں سالگرہ منانے جا رہے ہیں۔ پہلے موقع پر میں نے ایک مختصر سا رسالہ "اردو میں قومی شاعری کے سو سال" کی شکل میں پیش کیا تھا۔ اب جشن سیمیں کے موقع پر "یادِ دور" کی فرمایش پر اسی سے ملتے جلتے کسی موضوع پر کچھ لکھنے کی فکر ہوئی۔ مذکورہ بالا کتاب کے شائع ہو جانے کے بعد موضوع سے متعلق جو مواد ملتا رہا اسے میں جمع کرتا گیا۔ لیکن اب وہ ذخیرہ کاغذات کے انبار میں کہیں دب گیا ہے اور سامنے نہیں آ رہا ہے، اس لیے تلاش موضوع میں ذہن دوسری سمتوں میں بھٹکنے لگا کہ یکایک سنہ ۱۹۴۲ء کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔

میں آل انڈیا اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے جنرل سکریٹری کی حیثیت سے پٹنہ گیا ہوا تھا۔ وہاں میں نے سیاست حاضرہ پر اظہار خیال کیا جو مقامی اخبارات میں شائع ہوا۔ معمر سیاستداں سچدانند سنہا زندہ تھے اور وہاں کی ثقافتی زندگی کے ہر نشیب و فراز پر ان کی نظر رہتی تھی۔ اخباری اطلاع پاتے ہی انھوں نے اپنے ایک عزیز طالب علم کی وساطت سے مجھے دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔ ایسی شناسا نظریں اب کہاں ہیں؟ کھانے کے بعد انھوں نے مجھے اپنے کتب خانے کی زیارت کرائی۔ پھر کچھ مقفل الماریوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ ان میں ضبط شدہ کتابیں محفوظ ہیں۔ جب کوئی گورنر یہاں آتا ہے تو میں یہ الماریاں اسے ضرور دکھاتا ہوں۔ ان کی اس عالمانہ آن نے مجھے مسحور کر دیا۔ آزادی کے بعد میں سرکاری کاموں اور مصروفیتوں میں پھنس گیا اور ان محبوس و محصور کتابوں کو بھول سا گیا۔ سنہ ۱۹۴۷ء، سنہ ۱۹۵۱ء، سنہ ۱۹۵۷ء میں ان کی یاد ضرور آئی لیکن ہوا کی طرح ایک دریچے سے آئی اور دوسرے دریچے سے نکل گئی۔

آج پھر یاد آئی تو خیال آیا کہ کم از کم ضبط شدہ کتابوں کا جائزہ لے لینا چاہیے۔ مشکل یہ تھی کہ یہ کتابیں مختلف دبستانوں اور کتب خانوں میں بکھری ہوئی تھیں۔ ان کی فہرست کی ترتیب بھی تقریباً ناممکن تھی۔ اتفاق سے میری نظر حکومت بنگال کے ہوم ڈپارٹمنٹ (پریس) کی مندرجہ ذیل شائع کردہ کتاب پر پڑی۔

LIST OF POBLICATIONSPROSCRIBED IN BENGAL DURING THE PERIOD FROM MARCH. 1-1910 TO DECEMBER 9 1919.

(بنگال میں ضبط شدہ مطبوعات کی فہرست۔ یکم مارچ سنہ ۱۹۱۰ء و ۹ دسمبر سنہ ۱۹۱۹ء کے مابین)

یہ کتاب سنہ ۱۹۲۰ء میں گورنمنٹ پریس علی پور سے شائع ہوئی تھی۔ تلاش کے بعد معلوم ہوا کہ اس کے چار برس پہلے گورنمنٹ پریس علی پور بنگال سے ایک اور فہرست حکومت بنگال کے پولیٹکل ڈپارٹمنٹ نے شائع کی تھی اس کا نام ہے

LIST OF PUBLICATIONS PROSCRIBED FROM 1920 TO 1934 (JUNE)

(سنہ ۱۹۲۰ء اور سنہ ۱۹۳۴ء (جون) کے مابین ضبط شدہ مطبوعات کی فہرست)

پھر اسی حکومت کے ہوم (پریس) ڈپارٹمنٹ کی جانب سے شائع شدہ ایک اور فہرست کا پتہ چلا۔ یہ جنوری ۱۹۳۷ء اور ۳۱ دسمبر ۱۹۵۰ء کے درمیانی وقفے میں ضبط شدہ مطبوعات کی فہرست ہے۔ اول الذکر دونوں کتابیں عام مطبوعات ہیں جو شائع ہونے کے بعد عام فروخت کے لیے کتب فروشوں کو دے دی گئی تھیں۔ لیکن آخری فہرست صرف سرکاری استعمال کے لیے ہے اور عام طور پر خریدی نہیں جا سکتی۔

مزید تحقیق سے پتہ چلا کہ ایسی فہرستیں دوسری حکومتوں کے پاس بھی مطبوعہ یا غیر مطبوعہ شکل میں موجود ہیں۔ اگر ارباب تحقیق کوشش کریں تو ان تک رسائی ہو سکتی ہے۔ ان فہرستوں میں تحریک آزادی کی تاریخ اور ادب سے متعلق بیش بہا مواد موجود ہے اور اس کی بڑی ضرورت ہے کہ اس سب کو ایک رشتے میں پرو دیا جائے اور ۱۹۱۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کی ان ضبط شدہ کتابوں اور دوسری مطبوعات کا مکمل جائزہ لے کر ایک تفصیلی فہرست مرتب کی جائے تاکہ تحقیق کے راستے کی ایک اہم رکاوٹ دور ہو۔

انھیں فہرستوں سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ پہلے انڈین پریس ایکٹ ۱۹۱۰ء کی دفعہ ۱۲ (۱) کے تحت اور اس قانون کی منسوخی کے بعد قانون ضابطۂ فوجداری (کریمنل پروسیجر کوڈ) کی دفعہ ۹۹ (الف) کے تحت کتابیں اور مطبوعات ضبط ہونے لگیں۔ ۱۹۱۰ء کے کون سے مطبوعات ضبط ہوئے اس کا سراغ لگانا باقی ہے پہلے کوئی ایک حکومت ضبطی کے احکام صادر کر دیتی تھی۔ اس کے بعد دوسری حکومتیں بھی اپنے گزٹ میں ان احکام ضبطی کا اعادہ کرتی تھیں۔ لیکن سب حکومتیں ایسا نہیں کرتی تھیں۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاں جہاں مطبوعات کی رسائی تھی یا جہاں تحریک آزادی مضبوط تھی وہاں ضبطیوں کی زیادہ فکر ہوتی تھی۔ چونکہ بنگال میں تحریک زیادہ زور شور سے چل رہی تھی اس لیے وہاں ضبط شدہ اور قابل ضبطی مطبوعات پر زیادہ کڑی نظر رکھی جاتی تھی۔ یہ صورت اکثر دیکھنے میں آئی ہے کہ مطبوعات طبع یا شائع کہیں اور ہوئے اور ضبط کہیں اور۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان مطبوعات پر پولیس کی نظر پہلے اس ریاست میں پڑی جہاں ضبط ہوئی۔

ضبط شدہ مطبوعات میں سبھی طرح کی چیزیں ہیں۔ کتاب، کتابچہ پمفلٹ، لیف لٹ (چھوٹا اشتہار عموماً دو ورقہ یا چو ورقہ) پوسٹر، نقشہ تصاویر، اخبارات، رسائل غرض کچھ بھی بچنے نہیں پاتا تھا۔ کلکتہ کے دلیر اور طباع قوم پروروں نے ایک نیا طریقہ نکالا۔ دھوتیوں کے کناروں پر ایک بنگالی نظم چھاپ دی۔ نظم کا عنوان تھا "الوداع ماں" ۔ یہ دھوتیاں کلکتہ، ہوڑہ اور مدنا پور میں فروخت ہوتی پائی گئیں اور بنگال کی حکومت نے حکم نمبر 1350 P مورخہ ۲۳ مارچ ۱۹۱۰ء کے ذریعے ضبط کر لیں۔

ضبط شدہ کتابوں میں بہت سی ہندستان کے باہر برطانوی ہند کے باہر طبع ہوئی ہیں۔ ان مقامات کے نام یہ ہیں۔
(۱) پیرس (۲) لندن (۳) برلن (۴) سین فرانسسکو (۵) نیو یارک (۶) جنیوا (۷) قسطنطنیہ — بیرونی ممالک میں چھپنے والے مطبوعات کی اکثریت سین فرانسسکو سے شائع ہوئی ہے۔ کچھ کتابیں پانڈیچری سے شائع ہوئی ہیں۔ پانڈیچری اس وقت فرانسیسی مقبوضہ تھا۔ بعض مطبوعات کی جائے طباعت میں شہروں کی بجائے ملک یا بر اعظم کا نام درج ہے۔ مثلاً یورپ یا انگلینڈ۔ سین فرانسسکو کئی ہندستانی تحریکوں کا مرکز بن گیا تھا۔ مثلاً حکاستر، غدر پارٹی وغیرہ۔

ان فہرستوں میں کئی نام بے حد غلط درج ہیں بعض معلومات جو بہت ضروری تھیں مثلاً مصنف وغیرہ کا نام، وہ بھی درج نہیں کیا گیا ہے بطور مثال کے طور پر 'الہلال' کے بارے میں یہ نہیں لکھا ہے کہ اس کے مدیر مولانا ابو الکلام آزاد تھے۔ اعلانات اور اشتہار جون یا فتاویٰ وغیرہ کے سلسلے میں بھی نام درج نہیں ہیں۔ پوسٹروں اور لیف لٹوں کے بارے میں تو یہ سوچا بھی جا سکتا ہے کہ نام شاید اصل میں بھی درج نہ ہوں۔ لیکن فتاویٰ کے سلسلے میں یہ صورت نہیں ہو سکتی۔

۱۹۱۰ء تا ۱۹۱۹ء کے دوران شائع ہونے والے مطبوعات میں زبان کی تشریح الگ سے نہیں کی گئی ہے صرف دو ایک جگہ 'اردو' کا ذکر ہے باقی کا اندازہ نام اور دوسرے قرائن سے لگایا گیا ہے لیکن یہ فہرستیں مزید تحقیق کی محتاج ہے اور جب تک اصل فائلیں یا گزٹ وغیرہ نہ دیکھا جائے یہ قطعیت سے نہیں کہا جا سکتا کہ یہ مطبوعات

اردو ہی کے ہیں - یہ صورت سنہ ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۳ء کی فہرست مطبوعات کی نہیں ہے - اس میں ہر زبان کی فہرست الگ الگ درج ہے - اردو کے بعض مطبوعات کے نام اور عنوانوں کا اردو سے انگریزی میں ترجمہ کر دیا گیا ہے اور اصل نام معلوم نہیں ہو پاتا - جہاں نام انگریزی میں درج ہیں وہاں املا کی بے حد غلطیاں ہیں بعض اوقات الفاظ کو پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے - پروف ریڈنگ میں بڑی بے پروائی برتی گئی ہے - بعض اوقات ایک ہی کتاب کا نام ایک جگہ اردو میں اور دوسری جگہ انگریزی میں درج ہوا ہے مثلاً "مغربی بندر" از محمد فہیم خاں ایک اور جگہ WESTERN MONKEYS کے عنوان سے درج ہے - بعض مطبوعات مختلف جگہوں سے شائع ہوئے یا ایک جگہ ضبط ہو جانے کے بعد دوسری جگہ سے شائع کیے گئے - مولانا مسعود علی ندوی نے اعظم گڑھ خلافت کمیٹی کی جانب سے حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ کا ایک ضروری خط چھپوایا جو پہلے یو پی چیف سی پی دربار میں ضبط ہوا - غالباً اسی کو دوبارہ علی گڑھ سے شائع کرایا گیا - یہاں عنوان مختصر کر دیا گیا ہے - "حضرت ایک ضروری خط" - صرف یو پی میں ضبط ہوا غالباً یہ دونوں ایک ہیں - لیکن مزید تحقیق کے بغیر قطعی حکم لگانا ناممکن ہے۔

کچھ مطبوعات ایسے بھی ہیں جو اردو اور پنجابی میں شائع ہوئے ہیں - فہرست میں پنجابی کو ہر جگہ "گورمکھی" لکھا گیا ہے - لیکن ایک عنوان "ذکر شاہی دا نمونہ - بانواں ڈائرحصیا" از گیانی مان سنگھ صاف طور سے پنجابی ہے - غلطی سے اسے بھی اردو درج کر دیا گیا ہے لیکن ایسی مثال یہی ایک ہی ہے - شاید ایک آدھ اور بھی ہو۔

مطبوعات کے نام کے ساتھ جو تفصیلات دی گئی ہیں ان کی شکل یہ ہے:

1... (NAME OF BOOK) PUBLISHED FROM... BY

اس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ By کا اشارہ ناشر یا طابع کے نام کی طرف ہو یا مصنف و مدیر کے نام کی طرف - جہاں یہ بات بالکل ہی صاف نہیں ہے وہاں میں نے اسے ناشر فرض کر لیا ہے اور جہاں معلومات کی بنا پر یا قرائن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ مصنف و مدیر ہے وہاں میں نے قرائن و معلومات پر اعتبار کیا ہے - لیکن یہاں بھی مزید تحقیق کی طالب ہے۔

ہندستان کی برادرانِ حکومت کی جانب سے جو چند مطبوعات شائع ہوئے ان میں بعض پر عبید اللہ یا م - عبید اللہ درج ہے - یہ مولانا عبید اللہ سندھی ہیں - دوسرے اہم ناموں میں — مولانا حسین احمد مدنی، مرزا فہیم بیگ چغتائی، شیخ مشیر حسین قدوائی، عبد الحئی گوپال نرائن سکسینہ (جو بعد میں پالن جی کے نام سے مشہور ہوئے) مولانا شبیر احمد عثمانی، بھائی پرمانند، کشن چند زیبا وغیرہ کے نام آتے ہیں - مولانا ابوالکلام آزاد اور مولوی مسعود علی ندوی کا ذکر پہلے ہی آ چکا ہے۔

اس دور کے اکثر مطبوعات کا تعلق آزادی کی تحریکوں سے ہے جن میں خلافت کی تحریک کے علاوہ ہنگامہ، غدر پارٹی وغیرہ شامل ہیں لیکن بعض مطبوعات کی ضبطی کا سبب فرقہ داریت بھی ہے - چونکہ اس کی تشریح کہیں نہیں کی گئی ہے اس لیے اس کو ذہن میں رکھنا بہت ضروری ہے کہ ان میں وہ مطبوعات بھی شامل ہو سکتے ہیں جو اس بنا پر ضبط ہوئے ہوں کہ ان سے فرقہ داریت پھیلنے کا اندیشہ تھا مزید تحقیقات کے بغیر ان سب کو تحریک آزادی سے وابستہ سمجھ لینا غلط ہوگا لیکن ان کی بہت بڑی اکثریت (جیسا کہ نام سے اور دوسری تشریحات سے صاف ظاہر ہے) تحریک آزادی سے متعلق ہیں - ان میں نظموں کے بھی کئی مجموعے ہیں۔

یہ فہرستیں دو حصوں میں تقسیم ہیں (الف) کا تعلق سنہ ۱۹۱۰ء تا سنہ ۱۹۱۹ء سے اور (ب) کا تعلق سنہ ۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۳ء سے ہے۔

فہرست الف

(۱) ایک اخبار کا نام "تلوار یا شمشیر" تھا یہ بنگال میں حکم نمبر ۱۷۹۶ - مورخہ ۲۹ مارچ سنہ ۱۹۱۰ء کے ماتحت کسی دوسری حکومت میں ضبط قرار دی جانے کی بنا پر ضبط کر لیا گیا تھا - نام سے تو اخبار اردو زبان کا معلوم ہوتا ہے - لیکن تفصیل نہیں معلوم ہوئی۔

(۲) اسی طرح حکم نمبر P 115 (A) مورخہ ۱۸ اپریل ۱۹۱۰ء کے ذریعے مصطفیٰ کامل (کمال؟) پاشا کی تقریر ضبط قرار دی گئی — زبان لامعلوم۔

(۳) پنجاب سے ایک پرچہ بہ عنوان "مرنا بھلا ہے" شائع ہوا تھا، وہ حکم نمبر P 329 (A) کے ذریعے ضبط ہوا — زبان کی تشریح تو نہیں ہے لیکن صاف ظاہر ہے کہ اردو ہی ہوگی۔

(۴) الہ آباد سے لدا رام سناسی کی مصنفہ حالات تمہید اور سناسی کی آواز" اور "ہندستان کی حالت ماضیہ" نامی مطبوعات بحکم نمبر P 1127 (A) مورخہ ۲۷ مئی ۱۹۱۰ء ضبط ہوئیں۔

(۵) رلس کے لواز نامی اخبار کی اشاعت مورخہ ۲ فروری ۱۹۱۰ء بحکم PD 1178 (A) مورخہ ۲۷ مئی ۱۹۱۰ء ضبط ہوئی۔

(۶) ناڈیڈ ضلع کیرا سے الف ڈی شاہ اور سی، ایں، دیسائی نے INDIAN NATIONAL SONGS شائع کیے تھے۔ یہ بھی حکم PD 1230 / مورخہ ۱۳ جولائی ۱۹۱۰ء ضبط ہوئیں۔ زبان کے بارے میں تفصیل نہیں ہے لیکن اگر یہ نظمیں کسی مل جائیں تو خاصے کی چیزیں ہوں گی۔

(۷) بارد فرنگی کو "نامی مطبوعہ حکم مورخہ ۲۲ اکتوبر ۱۹۱۰ء ضبط ہوا زبان، مصنف، جائے اشاعت وغیرہ کا حال معلوم نہیں۔ بظاہر اردو ہے۔

(۸) بابو بسنن پرادکر کی مصنفہ "دش کی بات" بحکم P 4124 مورخہ ۱۵ نومبر ۱۹۱۰ء ضبط ہوئی۔ (اردو؟)

(۹) "الہلال" کلکتہ اشاعت مورخہ ۷ اگست ۱۹۱۳ء حکم PD 3241 مورخہ ۱ ستمبر ۱۹۱۳ء ضبط ہوا۔ نام مدیر درج نہیں۔

(۱۰) "درد جگر" از رحمت اللہ مدرائی حکم PD 3255 مورخہ ۱۷ ستمبر ۱۹۱۳ء ضبط ہوئی۔

(۱۱) "الہلال کلکتہ" اشاعت مورخہ ۱۳ اگست ۱۹۱۳ء حکم PD 3414 مورخہ ۲۰ ستمبر ۱۹۱۳ء ضبط ہوئی۔ نام مدیر درج نہیں۔

(۱۲) "حبل المتین" کلکتہ مورخہ ۱۱ اگست ۱۹۱۳ء اردو ایڈیشن نام مدیر لامعلوم۔ ایضاً بنگالی ایڈیشن مورخہ ۱۲ و ۱۷ ضبط ہوئے۔

(۱۳) سین فرانسسکو سے شائع اخبار "ہندستان" مورخہ ۲۱ جولائی ۱۹۱۴ء بحکم P 9902 A مورخہ ۲۶ اکتوبر ۱۹۱۴ء ضبط ہوا۔ لکھا ہے کہ اردو، گورمکھی، گجراتی یا اردو میں۔ پتہ نہیں کہ یہ سب زبانوں میں نکلتا تھا یا ایک ہی شمارے میں سب زبان کے مضامین ہوتے تھے۔ یا مرتب فہرست کو پتہ نہیں کہ مندرجہ بالا زبانوں میں سے کس زبان میں تھا۔

(۱۴) "انا لیلی" یو مائنڈ ڈیراد نسر مطبوعہ — اسرائی الفاظ" پالیسی پسند رائج الوقت حکومت کے سامنے "اور آخری الفاظ" سدیش بھگتی، مطبوعہ رام پریس آکاش پور۔ ضبط حکم P 3514 مورخہ ۱۵ مارچ ۱۹۱۵ء مصنف لامعلوم۔

(۱۵) "الانتقام" کلکتہ سے مطبوعہ۔ آغاز "رہے ریاے (رہ یاے؟)" ضبط حکم P 3215 (A) مورخہ ۱۲ مارچ ۱۹۱۵ء مصنف لامعلوم۔

(۱۶) "مسلمانوں کو کس کا ساتھ دینا چاہیے" پنجاب سے شائع شدہ ضبط بحکم P 4139 مورخہ ۲۹ مارچ ۱۹۱۵ء مصنف لامعلوم۔

(۱۷) "لغات ہند" نمبر ۲ یوپی سے شائع شدہ ضبط حکم P 4920 (A) مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۱۵ء مصنف لامعلوم

(۱۸) "تاریخ ہند" از بھائی پرمانند۔ بزبان اردو مطبوعہ وطن اسٹیم پریس لاہور ضبط حکم P 5004 (A) مورخہ ۱۱ اپریل ۱۹۱۵ء

(۱۹) جَاهِدُوا فِی سَبِیْلِ اللّٰہ مصنف لامعلوم یوپی سے طبع۔ ضبط حکم P 5336 مورخہ ۱۶ اپریل ۱۹۱۵ء

(۲۰) "سار مانہ" سین فرانسسکو۔ ضبط حکم PD 43 (A) زبان و مصنف لامعلوم۔

(۲۱) وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ۔ آغاز "بروح عمل زندگانی کردن" اختتام "بارحم الراحمین" پتہ نہیں فارسی میں تھا یا اردو میں۔

(۲۲) خروجِ دجّال مطبوعہ پنجاب ضبط بحکم P 1073 — مورخہ ۵ ستمبر ۱۹۱۶ء مصنف لامعلوم

(۲۳) "جہاد" آغاز "اگر فردوس بر روئے زمین است" اختتام لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ضبط حکم P 13739 مورخہ ۶ دسمبر ۱۹۱۶ء مصنف لامعلوم

(۲۴) آریہ سماج کے بانی دیانند اور اس کے خفیہ پولیٹکل مقاصد کا

کفرفاکہ " از امر سنگھ از لاہور۔ ضبط بحکم 1494P (A) مورخہ ۱۱ر دسمبر ۱۹۱۹ء

(۲۵) " فرمان " ضبط بحکم P 6807 مورخہ ۱۳ر مئی ۱۹۱۹ء مصنف وغیرہ لاسلام۔

(۲۶) " خونی کفن " ضبط بحکم P 9937 مورخہ ۲۵ر جولائی ۱۹۱۹ء

فہرست ب

۱۹۲۰ء

(۱) " ایڈریس " ناشر شیخ مشیر حسین قدوائی، فیض آباد — پہلے دلی سے ضبطی ہوئی بعد میں مدراس، بمبئی، یوپی اور سی پی کی حکومتوں نے احکام ضبطی جاری کیے۔

(۲) ADMINISTRATIVE DEPARTMENT PROVISIONAL, GOVT OF INDIA بزبان اردو۔ از عبیداللہ وزیر حکومت ہند AND MOUKATA پہلے یوپی میں پھر مدراس، برما اور بمبئی میں ضبطی ہوئی

(۳) " اورنگ خلافت " ناشر بستی احسان الحق سہارنپور پہلے یو، پی پھر پنجاب، سی پی، دلی اور مدراس میں ضبط ہوئی۔

(۴) " DAY OF THE MORTYR " بزبان اردو۔ سان فرانسسکو میں طبع ہوا۔ پہلے سرحد میں پھر دلی اور بمبئی میں ضبط ہوا۔

(۵) اعلان عام افواج ہند کے نام " پراویژنل گورنمنٹ آف انڈیا ملٹری ڈپارٹمنٹ کی جانب سے مطبوعہ۔ پہلے پنجاب پھر مدراس یوپی، برما، سی پی اور دلی میں ضبطی ہوئی۔

(۶) " فتویٰ امام ہند " پمفلٹ ناشر محمد سعد خاں ہوشیارپور۔ پہلے پنجاب میں پھر مدراس، یوپی برما، سی پی اور دلی میں ضبط ہوا۔

(۷) " فتویٰ علماء ہند " ناشر اقبال علی علوی لکھنؤ۔ پہلے سی، پی میں ضبط ہوا پھر دلی اور پنجاب میں۔

(۸) " حضرات خطاب یافتگان دکی، خدمت میں کھلی چٹھی " ناشر نصر مسلم دطوری، بمبئی۔ پہلے یوپی میں پھر بمبئی پنجاب سی پی اور دلی میں ضبطی ہوئی

(۹) " خلافت " پمفلٹ ناشر محمد عبدالغنی کانپور۔ پہلے یوپی میں ضبط ہوا پھر مدراس، پنجاب، برما، سی پی اور دلی میں۔

(۱۰) " اشتہار " از عبدالرزاق جلال آباد۔ پہلے سرحد میں ضبطی ہوئی بعد میں پنجاب، مدراس، آسام، یوپی اور دلی میں۔

(۱۱) " MUSLIMS SAVE INDIA " ناشر شفاعت علی علوی لکھنوی۔ پہلے دلی پھر پنجاب اور سی پی میں ضبطی ہوئی۔

(۱۲) " اشتہار عید " ناشر ام۔ عبداللہ وزیر حکومت MOAKATA ہند۔ پہلے آسام میں پھر دلی میں ضبط ہوا۔

(۱۳) " ندائے غیب " ناشر سلیمان طاہر۔ پہلے دلی پھر مدراس، پنجاب اور برما میں ضبطی ہوئی

(۱۴) " نظمیں " EWFALLY (عوض علی؟) اور عبدالغنی نے کراچی سے شائع کیا۔ پہلے دلی میں اور پھر مدراس، بمبئی، یوپی، دلی اور سی پی میں ضبط۔

(۱۵) " PRAYERS ON KHILAFAT QUESTION " پہلے دلی میں ضبطی ہوئی پھر پنجاب اور مدراس میں۔

(۱۶) " THE FRIST AND FORE MOST WAY CHARITY FOR CURSE OF GOD " عبدالستار اسمٰعیل نے رنگون سے شائع کیا پہلے برما میں اور پھر سی پی اور دلی میں ضبطی کے احکام صادر ہوئے۔

(۱۷) WHAT IS THE KHILAFAT? MUSLIMS SAVE INDIA شفاعت علی علوی نے لکھنؤ سے شائع کیا۔ پہلے یوپی پھر پنجاب، سی پی اور دلی میں ضبطی ہوئی۔

(۱۸) " یا قومنا اجیبوا داعی اللہ " JIJBOO IDAI ایک گنا ہگار مسلمان نے شائع کیا۔ پہلے پنجاب پھر مدراس، برما اور دلی میں ضبط ہوئی۔

(۱۹) " پردیسی ہندستانیوں کی بھارت نواسیوں کے نام کھلی چٹھی ہینڈ بل۔ مطبوعہ سین فرانسسکو از ہندستان غدر پارٹی۔

(۲۰) " پیام امت " از میرزا ابراہیم بیگ چغتائی بمبئی۔ بمبئی میں ضبطی ہوئی

(۲۱) " پولٹیکل ہولیوں کا گلدستہ " پمفلٹ ناشر لال سادرور برما۔ دہلی پہلے یوپی، پھر سی پی اور مدراس میں ضبط ہوا۔

(۲۲) " نظمیں آغاز " ہندو اسے ہیں فقط گردن کٹانے کے لئے — اختتام " قوم اگر تیار ہے جرخہ چلانے کے لئے۔ "

(IN THE NAME OF GOD THE MOST MERCIFUL AND GRACIOUS.)

رما میں ضبطی ہوئی پھر سی' پی میں۔
(۲۳) "قومی ترانہ۔ آزادی کا نسخہ" پیلی بھیت سے محمد حمید عرف
پیارے خاں نے شائع کیا۔ پہلے یو پی پھر مدراس اور بہار و اڑیسہ میں ضبطی ہوئی
(۲۴) "راشٹریہ گیت" بہار و اڑیسہ میں ضبطی ہوئی۔
"RELIGOUS UKASE OF ALL THE ULEMAS (۲۵)
OF INDIA (FATWA)" مطبوعہ لاہور۔ بعد میں مدراس نے ضبط کیا
(۲۶) "سچی رہنمائی" از مولانا محمد ریاست علی خاں مطبوعہ ہاشمی پریس
دہلی۔ پہلے رما میں پھر مدراس اور سی پی میں ضبطی ہوئی
(۲۷) "شکریہ انگلینڈ" (FEELING OF SABR) ترسین کا
نام غالباً "جذبات صبر" کا ترجمہ ہے مطبوعہ شمسی پریس میرٹھ۔ از مولانا
سید ایوب احمد قنبر بخاری شاہجہانپوری۔ پہلے یو' پی پھر سی' پی اور
مدراس نے ضبط کیا۔
(۲۸) "صلائے عام" یا SARWIYA-I-DAND از مولانا حافظ
محمد برکت اللہ رضا۔ مطبوعہ لکھنؤ۔ سی میں ضبط ہوئی۔
(۲۹) "سپاہیہ" (سپاہی) لیف لٹ مطبوعہ حبیب پرنٹنگ ورکس
بانکی پور۔ پہلے بہار و اڑیسہ میں ضبطی ہوئی پھر رما میں۔
(۳۰) "تحریر دربارۂ تحریک ترک موالات کفار" خلافت سے متعلق پمفلٹ۔ مولوی
نور الحق ساکن موضع کھنڈے والا نے لاہور سے شائع کیا۔ پہلے مدراس
نے ضبط کیا پھر سی پی نے۔
(۳۱) "ترانۂ قوم" بھوانی پرشاد نے ہاپوڑ سے شائع کیا۔ پہلے یو' پی
پھر مدراس بہار و اڑیسہ اور سی پی نے ضبط کیا۔
(۳۲) "ترانۂ قوم" لالہ سدلال نے بریلی سے شائع کیا۔ پہلے یو پی پھر مدراس
بہار و اڑیسہ اور سی پی نے ضبط کیا۔
(۳۳) "ترانۂ خلافت" مولوی مصباح الاسلام صدیقی عزیزی نے
دیو بند سے شائع کیا۔ پہلے یو' پی پھر مدراس و سی پی نے ضبط کیا۔
THE RELIGIOUS FATWA OF THE ULEMAS (۳۴)
OF INDIA دلی سے طبع ہوا۔ پہلے یو' پی پھر بنگال' سی پی اور
مدراس میں ضبط ہوا۔
(۳۵) "تمام ہندستان کے عالموں کا شرعی فتویٰ" لاہور کے جلسہ
عمومی دارالاشاعت ہند نے شائع کیا۔ پہلے یو پی پھر بنگال آسام
بہار و اڑیسہ اور مدراس نے ضبط کیا۔
THE ORDER OF THE KHILAFAT COMMITTEE (۳۶)
AND CONGRESS لیف لٹ۔ مطبوعہ اخلاقی پریس بانکی پور
مخاطب ممبران کانگرس و خلافت کمیٹی ندوہ۔ پہلے بہار و اڑیسہ پھر سی پی
و مدراس میں ضبط ہوا۔
(۳۷) "مدرستی کپڑوں کو چھوڑ دو" علی گڑھ سے سکریٹری کانگرس
کمیٹی نے شائع کیا۔ پہلے یو پی پھر سی پی میں ضبطی ہوئی۔
(۳۸) "طلبان حریت کا ترانہ" (نظمیں مختلف شعرا) خلافت کمیٹی جونپور
نے شائع کیا۔ پہلے یو پی، پھر سی پی اور مدراس میں ضبطی ہوئی۔
(۳۹) "کانگرس بھجن" مطبوعہ العدل پریس، بانکی پور۔ پہلے بہار و
اڑیسہ پھر سی پی اور مدراس میں ضبط کیا گیا۔
(۴۰) COMPLAINT OF INDIA (غالباً شکوۂ ہند کا ترجمہ)
مولانا عقیل الرحمٰن ندوی کی نظم اردو۔ سہارن پور سے طبع کی گئی۔
رما میں ضبط کی گئی پھر سی' پی و مدراس میں۔
(۴۱) "درد خلافت" (نظم) از حاجی احمد مطبوعہ علی گڑھ۔ پہلے
یو پی میں ضبط ہوئی پھر سی پی و مدراس میں۔
(۴۲) "فغان ہند" پمفلٹ از قاضی محمد جمیل۔ مطبوعہ بجنور۔ پہلے
رما میں ضبط ہوا پھر مدراس، سی، پی و یوپی میں۔
(۴۳) "فریاد جگر" ڈاکٹر جمال حیدر سکینہ از بلند شہر۔ پہلے یو پی پھر
مدراس میں ضبطی ہوئی۔
(۴۴) "فصل الخطاب" کتابچہ مشتمل بر تقریر عبدالماجد (عبدالمجید) بدایوں
پہلے بمبئی میں پھر سی پی میں ضبط ہوا۔
(۴۵) "فتویٰ" کتابچہ مشتمل بر تقریر عبدالماجد جمعیۃ العلماء، دلی۔ پہلے
بمبئی میں پھر سی پی میں ضبط ہوا۔
(۴۶) "فتویٰ کی مسطی" کتابچہ مشتمل بر تقریر عبدالماجد پہلے بمبئی میں،
پھر بہار و اڑیسہ ضبط کیا گیا۔
(۴۷) "گلدستہ خلافت" از عبدالحی سکریٹری بہار پراونشل کمیٹی بانکی پور۔
پہلے بہار و اڑیسہ میں پھر مدراس میں ضبط کیا گیا۔

(۴۸) "حضرات خطاب یافتگاں کی خدمت میں کھلی چٹھی" از فقیر مسلم دہلوی۔ بمبئی۔ پہلے بہار و اڑیسہ میں پھر مدراس و یوپی میں ضبطی ہوئی۔

(۴۹) "حادثۂ نجف اشرف" منشی مشتاق احمد میرٹھ شہر۔ پہلے یوپی میں پھر مدراس میں ضبطی ہوئی۔

(۵۰) "حقائق پنجاب" از حاجی احمد دلی۔ پہلے بنگال میں پھر مدراس میں ضبط کیا گیا۔

(۵۱) "ہندستان ویج غدر" سین فرانسسکو میں یگا نتر آشرم سے شائع ہوا۔ زبان اردو و گورمکھی۔ پہلے پنجاب میں پھر مدراس، برما، سی پی و کورگ میں ضبط ہوا۔

(۵۲) "انقلاب ہند" نظم از ہیرداس پرکاش مطبوعہ میرٹھ۔ پہلے یوپی میں ضبطی ہوئی پھر سی پی میں۔

(۵۳) "اسلام کی فریاد" از دلی محمد مطبوعہ مرادآباد۔ سی پی میں ضبطی ہوئی

(۵۴) "اتحاد اسلامی" منشی مشتاق احمد مطبوعہ میرٹھ۔ پہلے سی پی میں ضبط پھر مدراس، برار اور برما میں۔

(۵۵) "جذبۂ مسلم" اردو نظم مطبوعہ اخلاقی پریس پٹنہ ھکتن۔ پہلے بہار و اڑیسہ میں ضبط کی گئی پھر سی پی و مدراس میں۔

(۵۶) "کاش گنج کا خواب" از لال بہادر ورما۔ مطبوعہ بریلی۔ پہلے یوپی میں ضبطی ہوئی پھر سی پی اور بہار و اڑیسہ میں۔

(۵۷) "کاش گنج کا خواب" از لال بہادر ورما مطبوعہ بریلی ۔ یو۔ پی میں ضبط کیا گیا۔

(۵۸) "قومی نظام" (نظم) از بالگوپال زائن سکسینہ مطبوعہ لکھنؤ۔ پہلے یوپی میں ضبط ہوئی پھر سی پی و مدراس میں۔

(۵۹) "خطبۂ صدارت و فتویٰ"۔ ناشر منیجر خلافت کمیٹی دیوبند

(۶۰) "خون حرمین" از حافظ عبدالرحمٰن خاں۔ مطبوعہ جیادہ پریس جون پور۔ پہلے بہار و اڑیسہ میں ضبط پھر یوپی میں۔

(۶۱) "کسان بھیا" از برہمانند۔ مطبوعہ بنارس۔ پہلے یوپی میں ضبطی ہوئی پھر بہار و اڑیسہ اور سی پی میں

(۶۲) "خون حرمین" از سید عغار شاہ وارثی۔ مطبوعہ دلی۔ بمبئی میں ضبطی ہوئی۔

(۶۳) "خون حرمین" اردو پمفلٹ (دوسری معلومات درج نہیں)

(۶۴) "خون اسلام حرمین میں" از منشی مشتاق احمد مطبوعہ میرٹھ — یوپی میں ضبط کیا گیا۔

(۶۵) "لیف لٹ" دو طرفہ لکھا ہوا۔ مطبوعہ سہارن پور از محمد محسن الدین انصاری بہار و اڑیسہ میں ضبط ہوا۔

(۶۶) "لیف لٹ" دو طرفہ لکھا ہوا۔ مطبوعہ دیوبند۔ از محمد مبین یوپی میں ضبط کیا گیا۔

(۶۷) "مغربی بندر" (نظمیں) از محمد فہیم خاں۔ از لکھنؤ۔ پہلے یوپی میں ضبط ہوئیں۔ پھر سی پی و مدراس میں۔

(۶۸) "متفقہ فتویٰ" مطبوعہ فنی پریس دلی۔ پہلے برما میں ضبط ہوا پھر سی پی و مدراس میں۔

(۶۹) "نوحہ رام" پمفلٹ اردو انانند سرسوتی۔ مطبوعہ علی گڑھ۔ پہلے یوپی میں ضبط ہوا پھر سی پی میں۔

(۷۰) دو طرفہ لیف لٹ۔ ایک طرف علمائے ہند کے متفقہ فتوے درج تھے پر اسلامی فتویٰ "امن سبھا اور سول لیگ میں شرکت ہونا حرام ہے۔" مدراس میں ضبط ہوا۔

(۷۱) "پہلی لومر غدر یا ڈٹی ڈاون" اردو گورمکھی کے پرچے مطبوعہ سین فرانسسکو مقام حگا نتر آشرم۔ پنجاب میں ضبطی ہوئی۔

(۷۲) "ترک موالات" (کتابچہ) از مولانا حسین احمد مطبوعہ دیوبند۔ پہلے بنگال میں ضبط ہوا پھر سی پی، یوپی، آسام اور مدراس میں۔

(۷۳) "ترک موالات" از شبیر احمد عثمانی مطبوعہ دیوبند۔ سی پی میں ضبطی ہوئی۔

(۷۴) "ترک موالات پر تقریر زبردست" پمفلٹ از محمد مبارک حسین محمودی مطبوعہ میرٹھ۔ یوپی میں اور بعدۂ مدراس میں اور بہار و اڑیسہ میں ضبط ہوا۔

(۷۵) Religious fatwa of the Holy Ulama of Islam اور متفقہ فتویٰ علماء کے دستخطوں کے ساتھ پہلے مدراس میں پھر سی پی میں ضبط ہوا۔

(۷۶) علمائے ہند کا متفقہ فتویٰ سول لیگ اور امن سبھاؤں میں شریک ہونا شرعاً حرام ہے" از محمد محسن الدین انصاری۔ مطبوعہ

سہارن پور۔ پہلے یوپی پھر مدراس میں ضبط ہوا۔
(۷۷) علمائے ہند کا متفقہ فتویٰ ۔ ناشر فخر الدین دہرہ دون ۔ مدراس میں ضبط ہوا۔
(۷۸) "علمائے ہند کے متفقہ فتوے" ناشر آنریری سکریٹری سنٹرل خلافت کمیٹی بمبئی۔ پہلے بمبئی میں پھر مدراس، سی پی اور برما میں ضبط ہوا۔
(۷۹) "علمائے ہند کے متفقہ فتوے" ناشر محمد مبین دیو بند۔ مدراس میں ضبط ہوا۔
(۸۰) "Western monky" (غالباً مغربی بندر) از محمد فہیم خاں مطبوعہ لکھنؤ۔ پہلے یوپی پھر سی پی اور مدراس میں ضبطی ہوئی
(۸۱) "واقعۂ پنجاب" پمفلٹ از حاجی احمد علی گڑھی۔ مطبوعہ دہلی۔ پہلے یوپی پھر برار، سی پی اور مدراس میں ضبط ہوا۔
(۸۲) "واقعہ پنجاب" حصہ دوم پمفلٹ از حاجی احمد علی گڑھی مطبوعہ دہلی پہلے یوپی، پھر سی پی میں ضبط ہوا۔
(۸۳) "زخمی پنجاب" از خان چند ریا مطبوعہ لاہور۔ پہلے پنجاب پھر یوپی، سی پی اور مدراس میں ضبط ہوئی۔
(۸۴) "زمیندار لاہور" اشاعت مورخہ ۵ راگست ۱۹۲۱ء از ابوالحسن (غالباً مدیر یا ناشر؟) پہلے پنجاب پھر بہار و اڑیسہ اور سی پی میں ضبط کیا گیا ۱۹۲۲ء
(۸۵) "انگریزاں دے ٹوٹے" (پنجابی توہین) از عبدالحق مطبوعہ سیالکوٹ۔ پہلے پنجاب پھر بہار و اڑیسہ میں ضبطی ہوئی۔
(۸۶) "انگریزوں کی گڑ گڑوں" پمفلٹ۔ ناشر نیشنل سنٹرل بک ڈپو۔ دلی۔ پہلے بہار و اڑیسہ پھر یوپی، بمبئی، مدراس اور سی پی میں ضبط ہوا۔
(۸۷) انگریزوں کی میاؤں" مطبوعہ لکھنؤ۔ پہلے یوپی میں ضبط کیا گیا پھر سی پی و مدراس میں۔
(۸۸) "Pledge of civil disobedience" مطبوعہ الہ آباد۔ یوپی میں ضبطی ہوئی۔
(۸۹) "آہ مظلوماں" پمفلٹ از ایس اے احمد مطبوعہ سہارنپور پہلے یوپی پھر سی پی اور مدراس میں ضبط ہوا۔
(۹۰) "مسلمانان بمبئی سے اپیل" (۹۱) "Appeal to The

[illegible] ناشر Musalmans of Bombay
پہلے بمبئی پھر سی۔پی و مدراس میں ضبطی ہوئی۔
(۹۱) "Appeal to Musalmans to enrol as Volunteers in national volunteer corps"
از۔ ایم ۔ بی قاضی و دیگر حضرات۔ مطبوعہ کلیان پہلے بمبئی پھر سی پی مدراس میں ضبطی ہوئی۔
(۹۲) "آزادی ہند" مطبوعہ مراد آباد۔ یوپی میں ضبطی ہوئی۔
(۹۳) آزادیٔ ہند۔ سوراج کی دلہن" مطبوعہ مراد آباد۔ پہلے یوپی پھر سی پی، برما اور بمبئی میں ضبط کیا گیا۔
(۹۴) انگریزوں کی اکڑفوں" زبان اردو و ہندی۔ ناشر نیشنل بک ڈپو دلی۔ پہلے یوپی پھر سی پی و مدراس میں ضبطی ہوئی۔
(۹۵) "انگریزوں کی میاؤں میاؤں" مطبوعہ لکھنؤ پہلے یوپی پھر بہار و اڑیسہ سی پی میں ضبطی ہوئی۔
(۹۶) "انگریزوں کا خون" مطبوعہ سوراج پرنٹنگ ورکس دلی پہلے سی پی پھر مدراس، پنجاب اور بہار و اڑیسہ میں ضبط کیا گیا۔
(۹۷) "بندے ماترم، ست سری اکال، اللہ اکبر" سپاہیوں بھری فوجیوں اور دوسروں سے درخواست کی گئی ہے کہ وہ حکومت سے تعلقات منقطع کریں۔ ناشر لال سنگھ۔ پہلے بمبئی پھر سی پی و یوپی میں ضبطی ہوئی۔
(۹۸) "برباد مسافر" دو حصوں میں۔ کتاب۔ مطبوعہ گلزار ہند پریس بمبئی۔ پہلے بمبئی پھر برما میں ضبط کی گئی۔
(۹۹) "بیداری ہند" حصہ اول از جگدیش پرکاش ورما دنیا چند ولیش۔ مطبوعہ بدایوں۔ پہلے یوپی پھر سی پی و مدراس میں ضبط ہوئی
(۱۰۰) "بیداری ہند حصہ دوم" از جگدیش پرکاش ورما دنیا چند ویش مطبوعہ بدایوں۔ پہلے یوپی پھر مدراس میں ضبط ہوئی۔
(۱۰۱) "برباد مسافر یعنی گورو نانک جہاز کے مسافروں کی درد بھری کہانی۔ از ارجن سنگھ برگاڑی مطبوعہ بمبئی۔ پہلے بمبئی، پھر پنجاب و سی پی میں ضبط ہوئی۔



ڈاکٹر راجیندر پرشاد
(پہلے صدر)



ڈاکٹر رادھا کرشنن
(دوسرے صدر)

جمہوریۂ ہند کے صدر

(۱۵ر اگست ۷۲ء۔ اسپشل نمبر)



ڈاکٹر ذاکر حسین
(تیسرے صدر)



شری۔ وی۔ وی۔ گری

آزاد ہندستان کے

وزراے اعظم



پنڈت جواہر لال نہرو۔ پہلے وزیر اعظم

شریمتی اندرا گاندھی



شری لال بہادر شاستری



۱۵ر اگست سنہ ۷۲ء

( )

اسپیشل نمبر

(۱۰۲) "بھارت سپوت" از بان بہاری آفس دلّی۔ پہلے یو پی پھر مدراس و سی پی میں ضبطی ہوئی۔

(۱۰۳) "بی اماں کا پیام اپنے فرزندوں کے نام" اردو نظم ناشر محمد قادر حسین صاحب مطبوعہ ترچنا پولی پہلے سی پی پھر برما میں ضبط ہوئی۔

(۱۰۴) "بی آماں کا پیام اپنے فرزندوں کے نام" ناشر محمد قادر حسین — مطبوعہ مدراس۔ پہلے مدراس پھر بمبئی میں ضبطی ہوئی۔

(۱۰۵) "بسم اللہ الرحمٰن" پمفلٹ۔ پہلے بہار و اڑیسہ پھر سی پی و مدراس میں ضبط ہوا۔

(۱۰۶) "بائیکاٹ" پمفلٹ — از مولانا ابوالکلام آزاد مطبوعہ میرٹھ پہلے یو پی پھر سی پی و مدراس میں ضبط ہوا۔

(۱۰۷) "بائیکاٹ" پمفلٹ ناشر مشتاق احمد میرٹھ۔ پہلے یو پی پھر سی پی و مدراس میں ضبط ہوا۔

(۱۰۸) "تیرے کی چرخ چوں" از شیخ دلدار حسین دلدار مطبوعہ مراد آباد پہلے یو پی پھر سی پی و برار میں ضبطی ہوئی۔

(۱۰۹) "جو ماسہ برسات" از لیقر چند مطبوعہ دلی۔ برما میں ضبطی ہوئی۔

(۱۱۰) "دیدار ہند" مجریہ بدایوں یو پی میں ضبط کیا گیا۔

(۱۱۱) "فریاد ہند" حصہ اوّل پمفلٹ۔ از محمد عنایت علی خاں مطبوعہ سہارنپور پہلے یو پی پھر سی پی و برما میں ضبط ہوا۔

(۱۱۲) "فریاد ہند" از قاضی محمد جمیل الدین مطبوعہ بجنور۔ پہلے یو پی پھر مدراس بہار و اڑیسہ برما اور سی پی میں ضبطی ہوئی۔

(۱۱۳) "فریاد بیکس" از محمد اسمٰعیل مطبوعہ سہارنپور۔ پہلے یو پی پھر بہار و اڑیسہ اور مدراس میں ضبط کیا گیا۔

(۱۱۴) "فغان ہند" مجریہ بجنور۔ برما و سی پی میں ضبط ہوا۔

(۱۱۵) "فوجی ملازمت" از ابوالکلام آزاد مطبوعہ میرٹھ۔ پہلے یو پی پھر بہار اور اڑیسہ و مدراس میں ضبطی ہوئی۔

(۱۱۶) "فغان مسلم فغان علی" از منشی احمد علی مطبوعہ بجنور۔ پہلے یو پی پھر بہار و اڑیسہ اور مدراس میں ضبطی ہوئی۔

(۱۱۷) "فریاد قوم" کتابچہ۔ از مولوی احمد حسن مطبوعہ مراد آباد۔ یو پی میں ضبط ہوا۔

(۱۱۸) "فرمان کابلی" مجریہ سہارنپور۔ یو پی میں ضبط ہوا۔

(۱۱۹) "فغان مسلم" از محمد ابراہیم، سرجنٹ خلافت والنٹیر کور مطبوعہ بمبئی۔ پہلے بمبئی پھر سی پی، برما اور مدراس میں ضبطی ہوئی۔

(۱۲۰) "گلشن خلافت" از ماسٹر عبدالستار مطبوعہ دھام پور (غالباً دھام پور ؟)۔ یو پی میں ضبطی ہوئی۔

(۱۲۱) "غلامی" مجریہ سیالکوٹ۔ پنجاب میں ضبطی ہوئی۔

(۱۲۲) "جنرل ڈائر اور جلیان والا باغ" مطبوعہ سوراجیہ پرنٹنگ ورکس دلّی۔ پہلے سی پی اور پھر برما میں ضبط ہوا۔

(۱۲۳) "گریہ ہند" از قاضی محمد جمیل الدین۔ مطبوعہ بجنور۔ پہلے یو پی پھر سی پی و مدراس میں ضبطی ہوئی۔

(۱۲۴) "گلدستہ رضاکار" ناشر سید میاں محی الدین مدراس — پہلے مدراس پھر سی پی میں ضبط ہوا۔

(۱۲۵) "گلدستہ قمیض خلافت" از محمد عبدالحسین مطبوعہ دھام پور (بجنور) پہلے یو پی پھر سی پی و پنجاب میں ضبط ہوا۔

(۱۲۶) "گلزار جنت" از ماسٹر عبدالستار مطبوعہ دھام پور (بجنور)۔ پہلے یو پی پھر سی پی و مدراس میں ضبطی ہوئی۔

(۱۲۷) "گلشن خلافت" (بقیہ تفصیلات درج نہیں)

(۱۲۸) "گلزار جنت" از جگناتھ پیتواری مطبوعہ مظفر نگر۔ پہلے بہار و اڑیسہ پھر سی پی میں ضبطی ہوئی۔

(۱۲۹) "غلامی" کتابچہ ناشر: مولوی مظفر الدین اینڈ سنس سیالکوٹ۔ پہلے پنجاب پھر سی پی و مدراس میں ضبط ہوا۔

(۱۳۰) "ہڑتال" لعنت لعنت پہلے بہار و اڑیسہ پھر سی پی میں ضبط ہوا۔

(۱۳۱) "حکومت کی پول" ناشر منیجر آریہ گرستھ رتناکر۔ یو پی میں ضبطی ہوئی

(۱۳۲) "حضرت ایک ضروری خط" مجریہ علی گڑھ یو پی میں ضبط ہوا۔

(۱۳۳) "حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ کا ایک ضروری خط" از مسعود علی ندوی خلافت کمیٹی مطبوعہ اعظم گڑھ۔ پہلے یو پی پھر سی پی و برما میں ضبط ہوا۔

(۱۳۴) "حادثۂ مسجد اسٹریٹ" مجریہ میرٹھ۔ یو پی میں ضبط ہوا۔

(۱۳۵) "ہندی راشٹارہ" (ہند کا ستارہ) ناشر محمد غلام نبی —

مطبوعہ لاہور۔ پہلے پنجاب میں پھر بمبئی، سی پی اور برما میں ضبط ہوا۔

(۱۹۳) "ظالموں کی بیداد مظلوموں کی فریاد" پمفلٹ پہلے بہار و اڑیسہ پھر سی پی مدراس اور یوپی میں ضبط ہوا۔

(۱۹۴) ظالم و مظلوم کی گفتگو" از عبدالعلیم مطبوعہ بدایوں۔ پہلے یوپی پھر سی پی۔ مدراس نے ضبط کیا۔

(۱۹۵) "زمیندار" اسر سید احمد لاہور۔ پنجاب میں ضبط ہوا۔

۱۹۲۴ء

(۱۹۶) "المجاہد" شمارہ ۱۸ مورخہ ۲ رمئی ۱۹۲۳ء پہلے سی پی میں پھر برما میں ضبط ہوا۔

(۱۹۷) اخبار المجاہد شمارہ ۵ تا ۱۷۔ بیشہر سمرقند مجاہدین۔ پہلے سی پی پھر برما میں ضبط ہوے۔

(۱۹۸) انوری شمشیر یا شمشیر اسلام" مطبوعہ صداقت پریس بمبئی۔ پہلے برما پھر سی پی نے ضبط کیا۔

(۱۹۹) "ٹوٹے گی آرزو تری مٹی کے تیل میں" پمفلٹ مطبوعہ تانتی پرنٹنگ پریس بہار نیور۔ پہلے برما پھر سی پی مدراس میں ضبط ہوا۔

(۲۰۰) "فریاد مسلم" مرتبہ انعام الحق مطبوعہ مظفرپور۔ پہلے بہار و اڑیسہ نے پھر سی پی و برما نے ضبط کیا۔

(۲۰۱) "عریاں کابل" پمفلٹ از شیخ انوار الحق مطبوعہ سہارن پور — پہلے یوپی میں پھر سی پی و برما میں ضبط ہوا۔

(۲۰۲) حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمہ اللہ کا ضروری خط" پوسٹر اردو۔ ناشر مسعود علی ندوی، خلافت کمیٹی اعظم گڑھ۔ پہلے یوپی میں پھر سی پی، برار اور برما میں ضبط ہوا۔

(۲۰۳) "ہندستانی اخبار" سین فرانسسکو۔ یوپی میں ضبط ہوا۔

(۲۰۴) "ہندستانی اخبار" سین فرانسسکو۔ پہلے مدراس میں پھر برما میں ضبط ہوا۔

(۲۰۵) "ہندستانی اخبار" سین فرانسسکو پہلے مدراس میں پھر برما میں ضبط ہوا۔

(۲۰۶) "ہندستانی کے نام کھلی چٹھی" پمفلٹ مجریہ سین فرانسسکو منجانب ہندستانی ایسوسی ایشن۔ پہلے یوپی میں پھر سی پی مدراس اور برما میں ضبط ہوا۔

(۲۰۷) "ہندستانی اپیل" مجریہ سین فرانسسکو منجانب ہندستان غدر پارٹی۔ پنجاب میں ضبط ہوا۔

(۲۰۸) "تجارت خالصہ" حصہ اول از سورج سنگھ مطبوعہ جالندھر پہلے پنجاب پھر سی پی، برار اور کورگ نے ضبط کیا۔

(۲۰۹) کامل سوراج المعروف ہند میں انگریزوں سے راج لینے کی کتاب" ناشر محبوب بخشی لاہور۔ پہلے برما پھر سی پی میں ضبط ہوئی۔

(۲۱۰) "خاتون نمبر" پمفلٹ مطبوعہ لکھنؤ پہلے بہار و اڑیسہ میں پھر سی پی و برما میں ضبط ہوا۔

(۲۱۱) کرکری از شنکر لال گم۔ مجریہ لکھنؤ پہلے بہار و اڑیسہ میں پھر سی پی و برما میں ضبط ہوا۔

(۲۱۲) "مسائل حاضرہ یا ہندستان کی سیاسی جد و جہد" پمفلٹ مرتبہ غلام نبی خاں۔ لاہور پہلے پنجاب پھر سی پی و برما میں ضبط ہوا۔

(۲۱۳) "manage of shah Badiul Alam to Mahatma Gandhi" ناشر محمد بدیع العالم۔ مدراس میں ضبط ہوئی۔

(۲۱۴) (1) A massage of shah Mohd Badial To Mahatma Gandhi

(2) A massage of shah mohd Badiul Alam Dolar ezgone of sunnas

(3) manage arth

مذکورۂ بالا مطبوعات کے ناشر محمد بدیع العالم۔ پہلے سی پی میں ضبط ہوئیں پھر دوسری حکومتیں مطلع کر دی گئیں۔

(۲۱۵) "نادر شاہی زمانہ" پمفلٹ مطبوعہ ریوا دلا پریس علی گڑھ — سی پی میں ضبط ہوا۔

(۲۱۶) "نادرشاہی زمانہ" پمفلٹ ناشر ریوا دلا پریس جبل پور، برما میں ضبطی ہوئی اور دوسری حکومتیں مطلع کر دی گئیں

(۲۱۷) "نعرہ ہائے اسلام" پمفلٹ از شیخ محمد یامین و شیخ مجیب احمد مطبوعہ سہارن پور پہلے برما پھر سی پی برار اور یوپی میں ضبط ہوا۔

(۲۱۸) "پولیٹیکل گیت" پمفلٹ ناشر نیر بک ڈپو لاہور۔ پہلے پنجاب پھر برما اور سی پی نے ضبط کیا۔

(۲۱۹) "قول فیصل" پمفلٹ۔ مطبوعہ بمبئی۔ پہلے بنگال پھر سی پی، و برار، برما اور پنجاب میں ضبط ہوا۔

(۲۲۰) "صدائے بازگشت" از مرزا فہیم بیگ۔ آگرہ (پمفلٹ) پہلے یوپی میں پھر بمبئی و سی پی میں ضبط ہوا۔

(۲۲۱) "شہنشاہ کابل کا فرمان" ناشر شیخ حبیب الرحمٰن سہارنپور۔ پہلے یوپی میں پھر برار و سی پی اور برما میں ضبط کیا گیا۔

(۲۲۲) شہنشاہ کابل حصہ دوم (پمفلٹ) از حافظ ظہور احمد سہارنپور۔ پہلے یوپی میں پھر پنجاب میں ضبط ہوا۔

(۲۲۳) "سکھ اور ڈاکر شاہی جبر مظلوم پنجاب" کتابچہ از سورج بھائی مطبوعہ امرتسر۔ پہلے پنجاب میں پھر برما، مدراس اور سی پی میں ضبط ہوا

(۲۲۴) "سودیشی توپ" پمفلٹ ناشر یونین پریس لکھنؤ۔ پہلے بہار و اڑیسہ میں پھر سی پی و برما میں ضبط ہوا۔

(۲۲۵) "تارہ رحم سنگھ گورو کے باغ کا نظارہ" پہلے پنجاب پھر برار اور برما نے ضبط کیا

(۲۲۶) Heroic Scenes of non Violent Satyagrahi Akalis at Guru ka Bagh

باتصویر لیف لٹ۔ ناشر ستر دمی چتر شالا لاہور۔ پہلے برما میں پھر سی پی میں ضبط ہوا۔

(۲۲۷) A Scene of Akali Sacrifice

باتصویر لیف لٹ۔ ناشر رام راکھا اینڈ کمپنی امرتسر۔ پہلے برما میں پھر سی پی و مدراس میں ضبط ہوا۔



آزادی کی کسوٹی

اس دیش میں ہزاروں کام ہیں۔ ہزار کام ہم کریں گے پھر بھی ہزاروں کام باقی رہیں گے۔ کام کا ہم اس طرح اندازہ کریں کہ ہم نے کوئی نئی عمارت بنائی، کوئی نیا اسکول بنایا اور کوئی نیا بڑا کام کیا، تو ٹھیک ہے لیکن آخر میں کام کا اندازہ یہ ہے کہ اس ملک میں ایسے کتنے لوگ ہیں جن کی آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں۔ ان میں سے کتنے آنسو ہم نے پونچھے، کتنے آنسو ہم نے کم کیے۔ وہ اندازہ ہے اس ملک کی ترقی کا، نہ کہ عمارتیں جو کہ ہم بنائیں یا کوئی شاندار بات جو ہم کریں۔ آخر یہ ملک کیا ہے؟ یہ ہمالیہ پہاڑ نہیں ہے، نہ کنیا کماری ہے۔ یہ ملک اس کے رہنے والے ۳۶ کروڑ آدمی ہیں۔ مرد، عورت اور بچے اور اخیر میں اس ملک کی بھلائی برائی ان ۳۶ کروڑ آدمیوں کی بھلائی اور برائی ہے۔

—— جواہر لال نہرو

—— ۱۹۵۲ء ——

ہندستان سے ایک ملاقات

آوارہ

عمر عزیز کا ایک بڑا اور بہت بیش بہا حصہ سیر و شکار کی نذر ہوگیا۔ جنگل جنگل گھومے، ان گنت ندی نالے، گھاٹیاں پھلانگ ڈالیں، بے گنتی کارتوس پھونک ڈالے — قازوں اور مرغابیوں کی ڈاروں کے تعاقب میں گھٹنوں گھٹنوں دلدل اور گردن گردن پانی کو اس طرح تحصیل لیا جیسے آج کل لوگ سینما کا ٹکٹ لینے کے حصول میں جیب کتروں کو نظر انداز کر جاتے ہیں — سانبھر اور ہرن سے لے کر 'بگ گیم' تک کے تمام مراحل طے کیے۔ کبھی تو یہ مقصود ہاتھ آیا اور کبھی کچھ بھی نہیں پھر بھی کھیل کا لطف — دل بھر کی دوڑ دھوپ اور راتوں کی صحرا نوردی کے بعد پاس کے کسی ویران اور شکستہ ڈاک بنگلے میں شکاری ساتھیوں کے ساتھ چائے یا کافی کے مہکتے ہوئے گرم گرم پیالوں پر دن بھر یا پھر شب بھر کی تکان اور کوفت کو — غرق مئے ناب اولیٰ — کہہ کر اڑا دیا — اور جو کبھی اس تگ و دو کا صلہ کسی سیخ پر مرغابی، قاز یا ہرن کی شکل میں مل گیا تو پھر کامیاب شکار کی مسرت اور بھرپور سرخوشی۔ لذت کام و دہن مستزاد۔ لیکن ع

یہ باتیں ہیں تب کی کہ آتش جواں تھا

خدا نخواستہ اس سے یہ نتیجہ نہ نکال لیجیے گا کہ اب آتش بوڑھا ہو چلا ہے۔ صاحبو، بات یہ ہے کہ بڑھاپا قوت ارادی اور جذبۂ عمل کے اضمحلال کا نام ہے۔ سو الحمد للہ کہ چار اوپر اسّی کے اس سن میں بھی، حسب بقول اپنے 'اپنے' مجھ ایسی عمر کے اور لوگ کھونٹیوں پر لٹکا دیے جاتے ہیں اور ڈال ڈالا گئی' ملاوٹ اور فضائی آلودگی کے اس دور میں میوزیم (یا اکثر رڈ) میں رکھ دینے اور نہ یاد کرنے کی حسرت رہ جاتے ہیں۔ یہ خاکسار ابھی تک خود کو جوان بلکہ نوجوان محسوس کرتا ہے۔ خیر یہ عادت تو 'بقول شخصے' بدرجۂ نسبت شکاری کی ایک کمزوری، حالانکہ میں ذاتی طور پر اسے اس کی سب سے بڑی تہذیبی تصور کرتا ہوں یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے گزشتہ کارناموں کی لذیذ حکایات کو درازی سے دراز تر کرنے کا عادی ہوتا ہے۔ بلکہ بعض معتبر بزرگوں سے تو یہ بھی سنا ہے کہ کارنامے اور روداد میں جتنی زیادہ قیاسی اور فرضی ہوتی ہیں اتنی ہی زیادہ لذیذ اور دلچسپ — خیر، اس کا تو کوئی ذاتی تجربہ نہیں، ہوتی ہوں گی، واللہ اعلم بالصواب۔ یہاں تو یہ کیفیت ہے کہ جاڑوں کی راتوں میں لحافوں میں دبکے ہوئے، اور کونوں کے زرہ بکتر میں پناہ لیے ہوئے اور شالوں کے قلعوں میں محصور، ماشاء اللہ درجنوں نواسے نواسیاں، پوتے پوتیاں، بھانجے بھتیجے داماد اردگرد، کافی کا دور چل رہا ہے اور 'نقل محفل' کے طور پر ایک طرف سے ارشاد ہوتا ہے "نتھو بھائی (جی ہاں یہی خاکسار) کوئی شکار کا دلچسپ واقعہ" کسی طرف سے فرمائش ہوتی ہے "بابا دادا، حیدرآباد میں قیام کے زمانے کی کوئی داستان" اور کوئی صاحب یا صاحبہ فرماتے ہیں "حضرت، اپنی یادداشت کا کوئی ناقابل فراموش ورق" — غرض یہ کہ آل انڈیا ریڈیو میں اس خاکسار کے داخلے اور پطرس بخاری مرحوم سے ملاقات سے لے کر نقل کلب کے مقابلوں کے واقعات اور پھر فری میسنوں کی حیرت انگیز داستانوں تک، خدا

جانے کس کس داستان اور کس کس واقعہ کو دُہرانے کی فرمائشیں ہوتی ہیں — اب آپ باور فرمائیے کچھ دیر کے لیے ذہن اچھا خاصا ریس کورس بن کر رہ جاتا ہے — زندگی کے میدان کے ان نوواردوں کو کیا پتہ کہ اُن کی یہ معصوم سی فرمائشیں ذہن اور تصور کے کتنے مرقعوں کے ورق ایک ساتھ اُلٹ جاتی ہیں جن پر ماہ و سال کی گرد جم چکی ہے۔ ایک فرمائش کے ساتھ ذہن کے نگار خانے کا ایک باب کھلتا ہے اور ایک تصویر متحرک ہوتی ہی ہے کہ دوسری فرمائش کسی اور بھولی ہوئی یاد کو جگا جاتی ہے — اور شکار کی داستان؟ اللہ اللہ! جس مشغلہ میں نصف صدی سے بھی زیادہ مدت گزر گئی ہو، بلکہ اب بھی روز بروز شبِ ماہتاب میں جو شوق سر اُٹھا لیتا ہو، اُس کی داستان کا ایک ورق بھی کیا چند لمحوں میں بیان ہو سکنے کی چیز ہے۔

غالب، خدا ان کی مغفرت فرمائے، خدا جانے کس لیے فرماتے تھے۔ ع

ہوسِ سیر و تماشا، سو وہ کم ہے ہم کو

اب ملاحظہ فرمائیے کہ رامپور اور لکھنؤ سے لے کر کلکتہ کے سبزہ زار ہائے مسطری تک خدا جانے کہاں کہاں گھوم لیے، کیا کیا دیدنی اور نادیدنی دیکھ لی، لیکن انکسار ہو تو ایسا کہ "سو وہ کم ہے ہم کو" — اب کوئی پوچھے کہ حضرت اگر یہ ہوسِ سیر و تماشا کم تھی تو اور کیا تھا — مگر اب وہ ملیں کہاں — بہت سے بہت یہی کر سکتے ہیں آپ کہ کسی غالب نمبر میں ایک طویل تحقیقی مضمون لکھ کر ان کی روح اور ناظرین کے ذوق کو تکلیف پہنچانے کی سعی فرمائیں —

بات کہاں سے کہاں پہنچی۔ عرض کرنے کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ اس مضمون کے راقم کو اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں — جیسا کہ ہر شریف اور معقول انسان جانتا ہے، سیر و شکار لازم ملزوم ہیں۔ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور بھی محال ہے۔ اور پھر حقیقت تو یہ ہے کہ سیر کے بغیر شکار اسپورٹ نہیں رہتا، ایک ظالمانہ فعل بن کر رہ جاتا ہے — تو صاحب، اول تو ایک ایماندار اور با اصول شکاری ہونے کے سبب سے سیر و تماشا سے طبعی مناسبت اور تعلق اور پھر اس قلمی نام (دیوانہ کرم کوئی صاحب ایسے قلمی نام کی تعمیل کی کوئی شے نہ تصور کریں) کی برکت پانچ اور تین جیسی برسوں سے شخصیت کا جزو بن کر رہ گیا ہے، سیر و سیاحت اور قدرت کی کاریگری کے نمونوں سے بالمشافہ ملاقات زندگی کا اہم مشغلہ رہی ہے — شکار کی داستانوں نے تو اب آبروئے اہلِ نظر ہی کھو دی ہے کیونکہ ہر وہ بوالہوس جو قلم چلانا سیکھ چکا ہے کسی ڈائجسٹ کے لیے کوئی نہ کوئی داستانِ شکار لے کر موجود ہے۔ روئے سخن کسی کی طرف نہیں، لیکن اتنا کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ ان میں سے اکثر داستانیں ایسی ہوتی ہیں کہ اگر ان کے مصنفوں سے صرف اس قدر دریافت کرنے کی جرأت کی جائے کہ حضرت، اگر آپ شکار کی یہ داستان نہ سناتے تو دنیا کے معمولات میں کیا فرق پڑ جاتا، تو شاید اُن کے پاس کوئی جواب نہ ہوگا — مگر اس کو کیا کیجیے کہ جم کاربٹ کی داستانوں کے اُردو ترجمے اس قدر آسانی سے دستیاب ہیں کہ جنگل کی شکل عمر میں ایک بار بھی نہ دیکھی ہو تو بھی ڈائجسٹ کے لیے کچھ نہ کچھ دال دلیا تو فراہم کیا ہی جا سکتا ہے۔

خیر — یہ سب تو یونہی چلتا ہی رہتا ہے۔ اس تمام گزارش کا لب لباب یہ ہے کہ پہلے ارادہ یہ کیا کہ آج کی صحبت میں شکاری زندگی کا کوئی پرانا ورق ہی ناظرین کے سامنے پیش کیا جائے۔ پھر فوراً ہی خیال آیا کہ قبلہ کہیں اس کو بھی "ڈائجسٹی شکاریات" میں ایک اور کہانی کا اضافہ ہی تصور نہ کر لیا جائے۔ لہٰذا آج کی اس صحبت میں گفتگو کو محض سیر تک محدود رکھیے اور شکار کو کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھیے —

جم نے امریکہ سے لکھا کہ وہ ہندوستان سے براہِ راست ملاقات کے لیے بے حد مشتاق ہیں اور اس سلسلہ میں سفر کی تمام تیاریاں مکمل کر چکے ہیں اور عنقریب وارد ہندوستان ہوا چاہتے ہیں — لیکن ٹھہریے، پہلے میں آپ سے جم صاحب کا تھوڑا سا تعارف تو کرا ہی دوں۔ یہ حضرت ایک باذوق اور دلچسپ امریکی ہیں اور ہندوستان اور اُس کے علوم کے شیدائی۔ میری اُن سے ملاقات اب تک نصف ہی تھی اور ایروگرام اور ہوائی ڈاک

سروس کی مرہونِ منت ۔۔۔ لیکن ہندوستانی اور فارسی زبان و ادب اور سیر و سیاحت میں ان کی شدید دلچسپی نے ہمارے مکتوبی تعلقات کو ایک بے حد مضبوط مشترک بنیاد فراہم کر دی تھی ۔۔۔ بہرحال۔ اب ان کی آمد کی اطلاع آ چکی تھی اور اس سے اگلا قدم تھا خود اُن کی اپنی آمد۔ انھوں نے ہندوستان سے ملاقات کے لیے اپنی کار کے ذریعہ جس پر وہ اپنے سفر کا بیشتر حصّہ طے کرنے والے تھے، آگرہ، دہلی، بمبئی، بنگلور، مدراس، اور خدا جانے کہاں کہاں کے سفر کا پروگرام طے کیا تھا اور سبھی کے لیے۔ ع

قرعۂ فال بنام منِ دیوانہ زدند

اتنا کچھ پڑھ لینے کے بعد آپ یقیناً سوچ رہے ہوں گے کہ شاید اس سفر میں کسی بڑے پُراسرار واقعہ کا بیان ہوگا لیکن ۔۔۔ لیکن چھوڑیئے، شکاریات کی داستانوں میں تو تجسّس یعنی سسپنس خواہ مخواہ پیدا کیا جاتا ہے تاکہ لوگ اُسے کسی طرح آخر تک پڑھ لیں یہاں میں اگر سچ سچ کہہ دوں تو میری یہ سیر و سیاحت کی داستاں سسپنس کے حسن سے محروم رہ جائے ۔۔۔ اس لیے آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔

ایک خوب صورت صبح (ایک انگریزی فقرہ کا یہ ترجمہ بھی بہت خوب صورت لگتا ہے) حضرت جم مع اپنی واکس ویگن کے سرزمینِ ہندوستان پر تھے اور یہ خاکسار اُن کی موٹر میں ان کی برابر کی نشست پر۔

اب سنیے کہ ہندوستان سے ملاقات کے سلسلے میں جم صاحب کی فہرست میں تاج محل، ایلورا، اجنتا، کھجوراہو، سانچی، مدرائی اور اسی طرح کے بہت سے مقامات شامل تھے۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ حضرت اپنی گاڑی کو حرکت میں لائیں عرض کیا گیا کہ قبلہ چونکہ یہ خاکسار ہندوستان کو اتنا ہی جانتا اور پہچانتا ہے جتنا آپ امریکہ کو، اس لیے اس سلسلے میں بجائے اس کے کہ آپ اپنی فہرست اور سفر کے شیڈول پر بھروسہ کریں، مجھ پر بھروسہ کیجیے اور جہاں اور جیسے میں عرض کروں، بے چون و چرا چلتے رہیے۔

جیسا کہ زیادہ تر پردیسیوں کا حال ہے، حضرت جم بھی ہندوستان

سے اپنے اب تک کے غائبانہ تعارف کے سلسلے میں ہاتھیوں اور شیروں کی یہاں بے روک ٹوک چہل قدمی اور جگہ جگہ ناگوں کے رقص کی کہانیوں کو اپنا جزوِ ایمان بنا چکے تھے ۔۔۔ لیکن دہلی سے تریوندرم تک کے طویل سفر میں ہمیں نظر آیا تو کیا ۔۔۔ فقط چند دُبلے پتلے اونٹ، جو آگرہ کے مضافات میں اتفاقاً سرِ راہ مل گئے اور ہماری طرف ایک نگاہ غلط انداز بھی کیے بغیر اپنے رستے پر چلتے رہے یا پھر گھنے پیڑوں کے درمیان بل کھاتی ایک سڑک کے کنارے بیٹھی ہوئی چند فاختائیں، کہیں کہیں اٹکھیلیاں کرتے، بلکہ خوش فعلیاں کرتے کچھ بندر، موروں کا ایک جوڑا جس نے ہماری شدید خواہش اور بے حد انتظار کے باوجود ہمیں اپنے رقص سے محظوظ نہیں کیا ۔۔۔ ہاں یاد آیا ۔۔۔ ایک ہاتھی سے بھی ملاقات ہوئی ضرور لیکن اتفاق سے اس پر ایک مہاوت بیٹھا ہوا تھا۔

آگرہ سے گزرتے ہوئے ایک عجیب اتفاق ہوا ایک پُل پار کرتے ہوئے جیسے ہی حضرت جم کو ایک بورڈ نظر آیا جس پر لکھا تھا 'چمبل ندی'، تو اچانک جیسے وہ کچھ سہم سے گئے ۔۔۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں اور اب تک آپ پر بخوبی ظاہر بھی ہو چکا ہوگا، آدمی بہت پڑھے لکھے تھے، بلکہ ہیں اور امریکی اور دوسرے مغربی مصنفوں اور صحافیوں کی نگارشات کے ذریعے سے ہندوستان سے خاصا تعارف پہلے ہی حاصل کر چکے ہیں چمبل گھاٹی سے گزرتے ہوئے یقیناً اُن کے گوشِ تخیل میں خوفناک ڈاکوؤں کی بندوقوں کی دھائیں دھائیں گونجنے لگی ہوں گی اور چشمِ تصور کے آگے خوفناک چہروں پر اُگی ہوئی خوف ناک مونچھیں، خوف ناک ہتھیار اور خوف ناک مڈبھیڑیں رقص کرنے لگی ہوں گی ۔۔۔ سہمے ہوئے انداز میں فرمایا "یہاں ڈاکو؟" عرض کیا "جی ۔۔۔ بس چلتے رہیے ۔۔۔ چپ چاپ" ۔۔۔

ظاہر ہے کہ اس سلسلے میں میرے مشورے کے بغیر بھی وہ ایسا ہی کرتے، بہرحال اس خطرناک علاقے کا سفر بہ خیریت گزر گیا سوائے ایک عجیب اتفاق کے، جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے ۔۔۔ یعنی ایک جگہ اچانک ایک ناعاقبت اندیش خرگوش شہر جانے کی بجائے بیچ سڑک پر آ گیا اور ہماری کار کی روشنیوں کی چکا چوند سے مبہوت

ہوکر بے وقوفوں کی طرح وہیں بیٹھ کر رہ گیا۔

جم کے دورے کی مدت بہت مختصر تھی اسی لیے وہ زیادہ سے زیادہ جگہیں دیکھ لینے اور بقول اُن کے حقیقی ہندوستان سے ملاقات کرلینا چاہتے تھے۔ لہذا ظاہر ہے کہ ہمارا بیشتر وقت اُن کی واپسی دکن میں ملک کی سڑکوں کی پیمائش کرتے گزرا — ہندوستان کی دو طرفہ سایہ دار پیڑوں سے گھری ہوئی سڑکوں پر موٹر کے ذریعے سفر ایک بہت دل چسپ اور خوش گوار تجربہ ہے — سفر کی تکان حد سے بڑھ جائے اور اعصاب کھنچنے لگیں تو کسی موڑ، کسی چوراہے، کسی مضافاتی علاقے میں چند منٹ کے لیے رُکیے، اور کنارے کے کچے یا نیم پختہ ’رستوران‘ میں گرم اور گاڑھی چائے کے ساتھ، یا موسم اگر گرم ہو تو دہی کی لذیذ لسی کے ساتھ طرح طرح کے پکوڑے، نمکین، مٹھائیاں، کچوریاں نوش جان فرمائیے — اس سفر میں جم کے لیے یہ تجربہ بے حد لذیذ ثابت ہوا۔ اُن کا کہنا تھا کہ امریکہ میں بھی اسی قسم کے ’روڈ سائڈ اسٹال‘ پائے تو جاتے ہیں لیکن ہر جگہ وہی ہیم برگر اور ہاٹ ڈاگ کھاتے کھاتے مُنہ اُبٹ جاتا ہے۔

رستے میں ایک ایسے ہی ’رستوران‘ پر خاصی دعوت شیراز رہی۔ دوکان کی ظاہری دھج تو کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہ تھی لیکن صاحب سچ یہ ہے کہ وہاں کی مُرغ بریانی بے حد لذیذ تھی۔ دوکان کے مالک بڑے میاں باورچی یعنی ’چیف‘، بیرے اور منیجنگ ڈائرکٹر تینوں کے فرائض تن تنہا انجام دے رہے تھے۔ اس دعوت سراپے میں اگر کوئی چیز قدرے ناخوش گوار تھی تو وہ تھا ایک نیم فاقہ کش سا کُتا، جو بار بار بظاہر بڑی بے پروائی اور استغناء کے ساتھ ہماری نیم شکستہ ڈائننگ ٹیبل کے نیچے چکر لگاتا پھر رہا تھا اور کبھی کبھی ایسی دزدیدہ نگاہوں سے ہماری طرف بھی دیکھ لیتا تھا جن میں جم کو شرکت دعوت کی درخواست اور مجھے خودداری اور سیر شکمی کی جھلکیاں نظر آتی تھیں — اتفاقاً اسی جگہ جم کی پہلی ملاقات ہندوستان کی سرزمین پر ہندوستان کی موسیقی سے بھی ہوگئی — اور اس ملاقات کا کریڈٹ اس بریانی رستوران کو ہی جانا چاہیے جس میں رکھے ہوئے سال خوردہ ولایتی ٹرانزسٹر پر جم نے محمد رفیع صاحب کو اپنے پورے ’پیچ‘ پر گاتے ہوئے سُن لیا۔ اب بے چارے غالباً تکلف میں مجھ سے یہ بھی نہ پوچھ سکے کہ یہ چیز کلاسیکل تھی یا سیمی کلاسیکل یا لائٹ یا فوک۔ ہندوستان کے ان سڑک کنارے کے رستورانوں پر مرغ بریانی اور پنیر پکوڑوں کے بعد اگر جم صاحب کو کوئی چیز بے حد لذیذ معلوم ہوئی تو وہ تھی جنوبی ہند کی سانبر، ڈوسہ اور پاپڑ۔

رستے میں کئی جگہ ہماری ننھی سی واکس ویگن اور دیو پیکر ٹرکوں میں معانقہ ہوتے ہوتے بچا۔ آخر جم نے ترکیب یہ نکالی کہ جیسے ہی دور سے کسی ٹرک کو آندھی طوفان کی طرح آتا دیکھتے تھے، جھٹ سے کار کو سڑک سے نیچے اُتار، رک جاتے تھے اور جب ٹرک خیریت سے برابر سے گزر جاتا تھا، سفر پھر سے شروع کر دیتے تھے — ایک بار فرمانے لگے ”سڑکوں کی چوڑائی میں تو اضافہ شاید مشکل ہو لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ کے یہاں کے ٹرکوں کی چوڑائی کچھ کم ہو جائے۔“ ظاہر ہے کہ اس قدر ٹیکنیکل سوال کا جواب دینا مجھ ایسے غیر ٹیکنیکل آدمی کے لیے مشکل تھا لہذا چپ رہا۔

ہندوستان کے طول و عرض میں ہمارے اس سفر نے ہمیں یادوں کا ایک بیش بہا ذخیرہ اور نظاروں کا ایک بے مثال مرقع فراہم کیا۔ سیل گری اور اوٹی اور مسوری کی پہاڑیوں سے نیچے، دامن کوہ میں پھیلے ہوئے ہرے بھرے میدان اور وادیاں، رستے میں دم لینے کے لیے ہماری کار رُکتے ہی اُس کے ارد گرد اکٹھا، شوخ و سادہ آنکھوں والے ننھے منے بچوں کی بھیڑ جو حیرت بھری نگاہوں سے کبھی ہمیں کبھی واکس ویگن کو دیکھتے تھے، کسی تنہا دور دراز پہاڑی چوٹی کے پاس کوئی سنسان مندر، ہرے بھرے لہلہاتے گیہوں کے کھیت، پیلی سرسوں کی پھولی ہوئی شفق، چائے کے حسین باغات اور دھان کے گیلے گیلے کھیت، گاؤں کے کسی کنویں پر جمع ہنستی، چہکتی، لڑتی، ملتی عورتیں، سادہ دیہاتی سفید کرتوں لال ٹوپیوں، نیلی جھنڈیوں اور پرانی سائیکلوں پر شور مچاتے مختلف پارٹیوں کے الیکشن ورکر — یہ تھا ہندوستان کا وہ روپ جس سے جم نے میرے ساتھ اس سفر میں براہ راست ملاقات کی۔ ہندوستان کا ایک روپ وہ ہے جو اُس کے عظیم الشان کارخانوں، ملوں، سائنسی تجربہ گاہوں میں

ملتا ہے ــــ ایک روپ وہ ہے جو اس کی عظیم تاریخی عمارتوں میں نظر آتا ہے ــــ لیکن ہندوستان کے جس روپ سے ہم کی اس سفر میں ملاقات ہوئی شاید وہ روپ ہندوستان کا وہ حسین روپ ہے جو مہمان کا سب سے پہلے استقبال کرتا ہے اور پھر ہمیشہ کے لیے ذہن پر اپنی چھاپ چھوڑ جاتا ہے۔ ذرا تصور کیجیے، ہندوستان سے حقیقی ملاقات کے لیے اور اسے صحیح طور پر پہچاننے کے لیے اس سچی، پُرخلوص اور سادہ مسکراہٹ سے بہتر بھی کوئی وسیلہ ہو سکتا ہے جو آپ کو صحیح سمت اور رستہ بتاتے ہوئے اُس ہندوستانی کے لبوں پہ نمودار ہوتی ہے جس سے آپ رستہ بھول جانے پہ مدد اور رہنمائی کے طالب ہوتے ہیں ــــ یہی بے لوث اور پُرخلوص مسکراہٹ ہمارے تمدن کا ورثہ ہے اور ہمارا عزیز ترین سرمایہ۔

سیر و سیاحت کی یہ داستاں تو خیر یہیں پر ختم ہو جانی چاہیے کیونکہ ہم نے حقیقی ہندوستاں کی ایک جھلک دیکھ لی لیکن اس سیر کی داستان کے تتمہ کے طور پر جس طرح اصل سے مثنیٰ وابستہ ہوتا ہے شکار کی ایک مختصر لیکن دلچسپ داستان بھی وابستہ ہے۔ وہ بھی پیش کرتا ہوں۔

ہم میرے غریب خانہ پر سفر کی تکان اُتارنے کے سلسلے میں مقیم تھے اور وطن واپسی کی تیاریوں میں مصروف۔ انھیں اس سفر میں ہر چیز اور ہر بات پسند آئی تھی اور بے حد خوش تھے لیکن افسوس تھا تو صرف اتنا کہ اس سارے قیام ہندوستاں میں وہ نہ تو ہمارے یہاں کے شیروں سے ملاقات کر سکے نہ سانپوں سے۔ ویسے ان کے اشتیاق اور بے چینی کے پیش نظر ممبئی کے سفر کے دوران میں ایک بار محمد علی روڈ سے گزرتے ہوئے میں نے انھیں ایک سات منزلہ عمارت کے پیچھے چھپتے ہوئے ایک شیر کا نظارہ کرانا چاہا تھا لیکن جب تک وہ میرے "وہ دیکھو، اُدھر اس عمارت کے پیچھے ایک شیر!" کے جواب میں اپنی گردن گھماتے، شیر غالباً کسی عمارت کے پیچھے کے پیچھے غائب ہو چکا تھا۔ اس کا انھیں رستے بھر افسوس رہا تھا اور اپنی اس محرومی کا ذکر وہ بڑی حسرت سے کرتے تھے۔

اُن کی روانگی امریکہ میں غالباً دو دن باقی تھے۔ ہم لوگ باہر کے احاطے میں بیٹھے سہ پہر کی چائے پی رہے تھے۔ اچانک میر صاحب دوڑتے ہوئے آئے اور اطلاع دی کہ حویلی کے آنگن میں اینٹوں کے ایک ڈھیر کے نیچے ایک سانپ تھا جسے بحمداللہ قتل کیا جا چکا ہے۔ یہ اطلاع جب میں نے ہم صاحب کو دی تو وہ خوشی مسرت میں اُچھل پڑے ــــ مکمل ناامیدی کے بعد یک بیک کامیابی کا کیسا حسین اور درخشاں سورج طلوع ہوا تھا ــــ نہ سہی شیر، مگر سانپ سے یہ ملاقات تو ہندوستان کے سفر کی بیش بہا یادوں میں سے ایک اہم یاد رہے گی ــــ ہم لوگ فوراً جائے واردات پر پہنچے ــــ ہم صاحب دفور جذبات سے کانپ رہے تھے۔ واقعی وہاں ایک سچ مچ کا سانپ مرا پڑا تھا ــــ خاصا چار پانچ انچ لمبا اور پنسل سے کچھ ہی کم موٹا سانپ کا ایک بچہ جو اپنی ناعاقبت اندیشانہ مٹرگشتی کی پاداش میں اب بے جان پڑا تھا ــــ سانپ کے برابر کھڑے ہو کر ہم صاحب نے مختلف زاویوں سے چار پانچ تصویریں اُتروائیں ــــ ایک سانپ پکڑنے والے کو بطور خاص بلوایا گیا کہ وہ اس سانپ کی کھال اُتار کر ہم کو دے، کیونکہ وہ اُسے اپنے ساتھ ایک سووینیر کے طور پر امریکہ لے جانا چاہتے تھے ــــ لیکن پھر اُنھیں سانپ کے ساتھ اتروائی ہوئی تصویروں ہی کی یادگار لے جانے پر اکتفا کرنا پڑا کیونکہ سپیرے نے ایک پیشہ ورانہ بے پروائی کے ساتھ مطلع کیا کہ اس سانپ کی کھال اُترنا ممکن نہیں کیونکہ اگر ایسی کوئی کوشش کی گئی تو کھال کے ساتھ پورا سانپ بھی اُتر آئے گا۔



۱۹۴۷ء کے بعد اردو ناول

ڈاکٹر محمد حسن

فہرست سازی میرا دستور نہیں گو مجھے فہرست سازی کی اہمیت سے انکار نہیں ہے۔ اعداد و شمار کی بھی اپنی اہمیت ہوتی ہے اور ان کی روشنی میں چھان بین آسان ہو جاتی ہے اور ادبی ذخیرے کی کیفیت اور کمیت کا اندازہ لگانا بھی آسان ہو جاتا ہے۔ اردو میں ناولوں کی تعداد کا اندازہ لگانا بھی دشوار ہے۔ پچھلے پچیس[۲۵] سال میں ہزاروں ناول چھپے اور بکے۔ اور کیسے کیسے ناول۔ رومانی، جاسوسی، ترجمے، طبعزاد ایسے جن کی حیثیت اچھے ادبی ذوق کے لیے چھوت کی بیماری کی سی تھی، ایسے جو محدود حلقے میں رائج ہوئے اور ختم ہو گئے۔ ان سب کا شمار نہ ممکن ہے نہ لازمی۔ البتہ یہ بات حیرت ناک ہے کہ پچھلے پچیس سال میں صرف چند نام ہی باقی رہ گئے ہیں اور انھیں یاد کرتے وقت بھی ادبی مورخ اطمینان یا فخر محسوس نہیں کر سکتا۔

ظاہر ہے کہ کوئی تنقیدی جائزہ بھی ہر قسم کے ناولوں کا احاطہ نہیں کر سکتا یہاں محض ادبی مرتبے کے ناولوں کا ذکر ہوگا۔ لیکن خود ادبی مرتبے کا تعین آسان نہیں۔ مختصراً یوں کہا جائے تو طے جانا ہوگا کہ ادبی مرتبے کے ناولوں سے مراد وہ ناول ہیں جن میں موضوع کے اعتبار سے فکری صلابت اور طرز تحریر میں ادبی چاشنی موجود ہو۔ گھٹیا ناول واقعات پر توجہ مرکوز کرتا ہے، ادبی ناول ان میں مضمر اقدار کی عکاسی کے لیے واقعات کو استعمال کرتا ہے۔ گھٹیا ناول کے لیے خارج کی تصویرکشی بڑا کام ہے، ادبی ناول کے لیے خارج بصیرت کا وسیلۂ اظہار بنتا ہے۔ ارسطو نے اعلیٰ سنجیدگی اور اعلیٰ صداقت کی انھی اقدار کی بنا پر ادب کو تاریخ پر ترجیح دی تھی۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ خوبیاں پچھلے پچیس[۲۵] سال کے کتنے اردو ناولوں میں پائی جاتی ہیں۔

۱۹۴۷ء میں جن ناولوں کی دھوم دھام تھی ان میں اب صرف کرشن چندر کے ناول شکست اور عصمت چغتائی کے ناول ضدی اور ٹیڑھی لکیر کے نقوش ذہن پر ثبت ہیں۔ ان تینوں ناولوں کا موضوع تھا عنفوان شباب کی کشمکش۔ دور وہ تھا جب نئی رومانیت کے لب و لہجے کا چلن تھا۔ فلم دیوداس کے اثر سے ابھی پرانی نسل پوری طرح آزاد نہیں ہوئی تھی اور آزادی آزادروی، آزادخیالی کے ارمان نے عنفوان شباب کو انارکزم اور رومانیت سے قریب کر دیا تھا۔ ذکر سماجی استحصال اور تمدنی الجھنوں کا بھی ہوا مگر بنیادی طور پر شکست، ضدی اور ٹیڑھی لکیر تینوں بوہیمین ازم اور انارکزم کی سرحدوں کی داستانیں ہی تھیں۔ رومانی سرمستی، انفرادی خواہش اور تلاش نشاط ہی حاصل کائنات تھی اور سماجی ضوابط اور قانون مذہب اور اخلاق کے سبھی بندھن جو اس فطری خواہش سے ٹکراتے ہیں پاش پاش ہونے چاہییں۔ یہ اظہار ذات کی باغیانہ خواہش ناول پر حاوی رہی۔ اسی خواہش کی زد میں سماجی زندگی کے بہت سے نشیب و فراز آ گئے کہ یہ دور ہی عنفوان شباب کی رومانیت کو سماجی سیاق و سباق بخشنے کا دور تھا جس کا ایک سرا قاضی عبدالغفار کے ناول لیلیٰ کے خطوط سے جا ملتا تھا

جنھوں نے رومانیت کی سرمستی، گھن گرج اور اسلوب کے رنگ و آہنگ کو سماجی معنویت کے لیے برتنے کی کوشش کی تھی۔ اہم بات یہ تھی کہ یہ ناول نئے موڑ کے نمائندہ تھے۔ اس دور کا نوجوان جذباتی، آزاد خیال اور لذت کا جویا۔ سنگین حقائق کے سامنے چور چور ہوا جاتا تھا مگر تیچرلی حقیقتیں اسے خواب دیکھنے سے باز نہیں رکھ سکتی تھیں اور ان خوابوں میں وہ اپنی کمی آرزومندی کے رشتے اجتماعی فلاح سے بلکہ ایک مثالی سماج کی تشکیل سے ملاتا۔ اس کے ہاں ایک اضطراب تھا غیر مرئی، انوکھا اور بے نام۔ ابھی اس کی کوئی سمت متعین نہ تھی گو وہ اسے کبھی ایک نام دیتا تھا کبھی دوسرا۔

تقسیم نے اس خواب دیکھنے والے نوجوان کو توڑ مروڑ کر رکھ دیا۔ وہ تو صرف خواب دیکھتا رہا اور حقیقتوں نے اسے چور چور کر ڈالا۔ اس نے سماج کے جن توہمات اور تعصبات کو اپنے خیال و خواب کی دنیا میں کچل ڈالا تھا وہ اس شدت سے ابھرے کہ ان کی بنیاد پر ملک، تہذیب، خاندان، گھر بار حتیٰ کہ انسان کا وجود تقسیم ہو گیا۔ فرد کے اعتقادات اور اقدار خارجی زندگی کی حقیقتوں سے اس طرح ٹکرائے کہ شیشوں کے ٹکڑوں کی طرح بکھر گئے۔ تقسیم کا یہ کرب ایسا تھا جو ایک مدت تک اردو ناول پر کابوس کی طرح مسلط رہا

نجی اور اجتماعی سطح پر احتجاج کی یہ آواز بنیادی طور پر جذبے کی آواز تھی۔ اس جذبے میں فکر کا عنصر کم تھا بے اطمینانی کا زیادہ اور اس لیے اطمینانی کی صحیح سمت ہنوز متعین نہیں ہوئی تھی۔ یہ احتجاج دراصل عنفوان شباب کی ذاتی آزادی کی خواہش کا دوسرا نام تھا اسی لیے اس دور کا انقلابی رنگ و آہنگ یا جنسی آزادی کی آواز ہو یا مذہب اور اخلاق کے مسلمات کے خلاف سرکشی ہو سب اسی قسم کے مزاج کا مختلف روپ تھے اسی لیے اس دور کی آگہی میں تینوں تصورات گڈمڈ سے ہو گئے تھے۔ مارکس ازم فرائڈ ازم اور انارکزم تینوں تصورات عنفوان شباب کی آزادروی کی سرحد پر بکھرے ہوئے تھے اور ایک مدت تک ان کی درمیانی سرحدیں واضح نہیں ہوئی تھیں۔

فکر کی اس عقبی زمین کا تذکرہ کرتے ہوئے شاید ان اقدار کی نشانی وہی ضروری ہے جنھیں ناول میں تلاش کیا جانا چاہیے۔ ناول اگر واقعات یا کرداروں کا آئینہ خانہ ہے تو فنی تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا بلکہ فن دراصل اس معنویت میں پنہاں ہوتا ہے جو ان واقعات اور کرداروں کو ناول بخشتا ہے یعنی اچھا ناول پڑھنے والے کو نئی بصیرت عطا کرتا ہے فکر اور جذبے کی ترتیب نو کرتا ہے اور زندگی کو ایک نئے روپ میں دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت بخشتا ہے۔ گویا ناول کی عظمت کی بحث کا مدار اس کی جمالیاتی اقدار کے ساتھ ساتھ اس کے فکری اقدار پر بھی ہے جمالیات ناول کے لیے بصیرت کے اظہار اور ترسیل کا ذریعہ ہے کیونکہ اسی کے ذریعے سے وہ قاری کے تصورات کو نئی سمت میں لے جاتا ہے اور زندگی کی بصیرت کا نیا موڑ بخشتا ہے۔ انسانی زندگی کی بصیرت کے اعتبار سے ناول کے فکری ذخیرے یا فکری عظمت دونوں کو پرکھنا ہوگا۔

دوسری جہت خارج اور ناول کی اندرونی تانے بانے کے درمیان رشتے سے پیدا ہوتی ہے۔ ناول صرف اس بنا پر اچھا یا برا نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے اردگرد بکھرے ہوئے سماج کے واقعات اور کرداروں کی کتنی اچھی یا کتنی بری عکاسی کرتا ہے کیونکہ یہ تو اس کے موضوع نہیں اس کا خام مواد ہیں جن کے وسیلے سے اسے زندگی کی اعلیٰ تر شعور کا اظہار کرنا ہوتا ہے۔ اس طرح اچھا ناول ہمیشہ ہی زندگی کے خارجی مظاہر سے انسانی وجود کی نئی ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اندرونی اور بیرونی محاکمات کے درمیان یہ مطابقت جتنی گہری اور جتنی بامعنی ہوگی ناول اتنا ہی عظیم ہوگا۔

ناولوں کی قدر و قیمت کا تعین بنیادی طور پر انھیں اقدار پر ممکن ہے۔ شکست اور ٹیڑھی لکیر کے کچھ ہی دن بعد راماند ساگر کے ناول اور انسان مر گیا کا چرچا ہوا جیسا چرچا اس کے دیباچے کی وجہ سے زیادہ ہوا جس میں خواجہ احمد عباس نے فرقہ وارانہ فسادات کی ذمہ داری محض برطانوی سامراج کے بجائے خود ہندستانی مزاج کی کسی کمزوری پر ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اس بحث سے قطع نظر راماند ساگر کا ناول خلوص، دردمندی اور مشاہدہ

کی قوت کے ساتھ لکھا گیا تھا قتل و خون کی یہ فضا کچھ دنوں تک ہمارے ناولوں پر چھائی رہی کچھ ادیبوں نے اس کو مختلف پہلوؤں سے دیکھا مگر اس دور کی اس غالب حقیقت کو نظرانداز کرنا ممکن نہ تھا مثلاً منٹو جیسا فن کار بھی جو اس زمانے میں سماجی ذمہ داری سے کم و بیش انکار کر رہا تھا اور ترقی پسندوں کی سخت تنقید کر رہا تھا سیاہ حاشیے اور موذیل کی کہانیاں لکھ رہا تھا جس میں فرقہ وارانہ فسادات کے بوجھ کے نیچے آکر انسان کی شخصیت کی چھپی ہوئی نفسیاتی گرہوں کا پتہ لگا رہا تھا۔ ساگر کا ناول ان چند مثالوں میں ہے جب دیباچہ اصل تصنیف کو کھا جاتا ہے ساگر کا اچھا ناول دیباچے کی بحث کی نذر ہو گیا۔ ساگر کے ناول یا فرقہ وارانہ فسادات کے مسئلے پر لکھے ہوئے کسی ناول کی کامیابی کا دار و مدار اس بات پر نہیں ہے کہ اس میں ہنگامی صورت حال کی دردمندانہ عکاسی کی گئی ہے یا فرقہ وارانہ فسادات کے المیے کی تصویر کشی ہوئی ہے بلکہ اس کی کامیابی اس میں ہے کہ انسانی شخصیت کا سارا رہبر ان ناولوں میں سامنے آیا انھوں نے ایک غیر معمولی صورت حال سے انسان کی انفرادی شخصیت کے نئی سطح پر مطابقت یا مخالفت کرنے کی صلاحیت کو ظاہر کیا۔ ان ناولوں کی کشمکش انسان کے تہذیبی مزعومات، اقدار و اعتقادات اور زندگی کی سنگین حقیقتوں کے درمیان ٹکراؤ کی کشمکش سے پیدا ہوا تھا گہرائی سے دیکھا جائے تو یہ پوری صورت حال جو اس قسم کے ناولوں کے لیے عقبی زمین کا کام دے رہی تھی دراصل ہندستان کے ذہن اور دل، ضمیر اور انفرادی شخصیت، مزعومات اور عمل کی کشمکش تھی ایک طرف تو یہ کشمکش ظاہر کرتی تھی کہ ہمارا دانش ور طبقہ، اس کے تصورات اور مزعومات ہندستانی سماج سے کتنے دور اور الگ تھلگ تھے دوسری طرف اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ خود ہمارے دانش وروں میں اقدار و اعتقادات اور عمل میں حقیقی کشمکش موجود تھی اور سائنسی روشنی اور بصیرت سے ان کی ساری وابستگی محض جذباتی تھی جس سے وہ اپنے اردگرد کے سماج کی تو در کنار خود اپنی شخصیت کے دوسرے گوشوں کو منور نہیں کر پائے تھے یہ گویا اس بات کا ثبوت تھا کہ عنفوان شباب کے راستے سے آیا ہوا کمیونزم سے جو جذباتی لگاؤ پیدا ہوا تھا وہ محض بے بنیاد تھا اور حقیقت کی آندھی نے اسے شکست کر ڈالا وہ بھی اس طرح کہ خود ان کی اپنی شخصیتیں بھی فرقہ وارانہ فسادات کی آگ سے دونیم ہو گئیں۔

لیکن ناول کی عقبی زمین پر اس صورت حال کے اثرات خاصے دور رس ثابت ہوئے۔ ایک طرف تو اس آگ نے پرانے سبھی جذباتی مزعومات کے آگے سوالیہ نشان لگائے اور نئے سرے سے تصورات کی نفی (یا اگر ممکن ہو تو ان کی تعمیر نو) کی ضرورت واضح کر دی۔ دوسری طرف تقسیم نے جو ناسٹلجیا پیدا کیا اس کی تلخی اور چاشنی مدتوں تک غالب رہی۔ ماضی کی طرف ہمارا رویہ کیا ہونا چاہیے؟ کیا ابھی تک زندگی کی ساری سوجھ بوجھ مشترک تمدن کی ساری جھلکیاں مستقبل کے سبھی خواب محض فریب تھے؟ اور اب اس نئی زندگی اس نامہربان لمحۂ موجود کی طرف کون سا رویہ اختیار کرنا چاہیے؟ آئندہ چند سال تک ماضی کو لازمی طور پر ہمارے افسانوی ادب کا ہیرو ہونا تھا اور وہی ہوا۔

میرے بھی صنم خانے یقین اور گمان کی اسی دھوپ چھاؤں میں لکھا گیا۔ قرۃ العین حیدر گو اس زمانے میں پاکستانی شہری تھیں لیکن موضوع اور ان کی موجودہ شہریت دونوں کے پیش نظر اس کا ذکر ہندستانی ناولوں ہی کے ضمن میں آتا ہے۔ قرۃ العین نے اس صنم خانے کے سبھی صنم بڑی محبت اور پیار سے تراشے ہیں اور ان کی پرستش بھی کی ہے۔ البتہ ان کو شکست کرنے کا فریضہ وقت کے ناگزیر اور بے رحم عمل کے ہاتھوں پورا ہوا ہے زندگی جاگیردارانہ نظام کی ہے اور اس جاگیردارانہ طبقے کی جو آہستہ آہستہ نئے صنعتی نظام میں ڈھل رہا ہے، انگریزی تعلیم اور تمدن اپنا رہا ہے اور ہندستان میں گویا بین الاقوامی کلچر کی نعمتوں کو اختیار کرتا جا رہا ہے اور اس عمل میں ہندستانی سماج کی ساری قدیم تقسیموں کو مٹاتا جا رہا ہے چھوت چھات، توہمات، ذات برادری، مذہب — مگر اس ساری فضا پر جذباتیت اور عنفوان شباب کی تصور پرستی غالب ہے قرۃ العین نے جاگیردارانہ طبقے کے روشن خیال نوجوانوں کو مشترک ہندستانی

تہذیب ہی کا نہیں عالمی تمدن کی اعلیٰ ترین اقدار کا بھی امین کہلاتا ہے۔ اسی لیے جب رسیداری ختم ہوتی ہے تو گویا تہذیب انسانی کا خاتمہ ہوتا نظر آتا ہے یا جب تقسیم ہندستان ہوتی ہے تو بھی قرۃ العین اسے محض بلائے ناگہانی کے طور پر پیش کرتی ہیں، ان طبقوں کی ذمہ داری اس میں نہیں دیکھتیں جو انھیں اتنے عزیز ہیں

سیاسی اور تہذیبی بصیرت سے قطع نظر "میرے بھی صنم خانے" میں بھی عنفوانِ شباب کا وہی رومان ابھرتا ہے جس کا عکس کرشن چندر اور عصمت کے ناول پیش کر رہے تھے۔ میرے بھی صنم خانے کی مقبولیت کا بڑا سبب غالباً یہ تھا کہ جس چمکتی جگمگاتی اوپری طبقے کی زندگی کی عکاسی قرۃ العین کر رہی تھیں وہ اردو داں طبقے کے لیے نئی تھی۔ کلبوں کی زندگی، تعلیم یافتہ آزاد خیال مردوں اور عورتوں کی زندگی جہاں جنسی زندگی پر گھریلو دیواروں کی قدغن تھی نہ پردہ دار خواتین کی گھٹی گھٹی سی آرزوئیں تھیں۔ یہ چمکتی زندگی نہ عصمت کے ناولوں کی گھریلو فضا میں تھی نہ کرشن چندر کے متوسط طبقے کے نگار خانے میں۔ اس لیے اس چمکتی دمکتی فضا نے جی موہ لیا اس پر طرہ یہ ہوا کہ سماجی زندگی کی پرچھائیوں اور تہذیبی اکائی کے بکھراؤ کا عکس بھی اس کے پس منظر میں ابھرا۔ اتنا بہت کافی تھا جس طرح ہندستانی سماج اٹھارہویں صدی کے تمدن پر بیسویں صدی کا پیوند لگا رہا تھا اسی طرح قرۃ العین نے بھی ماڈرن زندگی کی چمک دمک میں جاگیردارانہ نظام کی نفاستوں کا جوڑ لگا لیا اور اس میں نئی تعلیم یافتہ نسل کی رومانی دردمندی کا اضافہ کر کے پیچ کی داستان مکمل کر لی۔ بنیادی طور پر یہ فضا کا ناول ہے جس میں سماجی آہنگ کی آمیزش سے نئی سمت پیدا کی گئی ہے فکری صلابت کی تلاش یہاں بے سود ہے۔

"میرے بھی صنم خانے" کا شاید سب سے خوب صورت رمزیہ حصہ وہ ہے جہاں تقسیم ہندستان کو مہابھارت کی تلمیح کی مدد سے بیان کیا گیا ہے۔ ایک طرف کوروں ہیں دوسری طرف پانڈوں کا لشکر اور بیچ میں ارجن کا رتھ ہے جسے گیتا والے سری کرشن چلا رہے ہیں اور ارجن کے دل میں یہ دکھ ہے کہ دونوں طرف اس کے اپنے عزیز اور رشتے دار ہیں وہ آخر کس پر وار کرے۔ مگر جس طرح یہ سب کچھ ہوا ہے ایسا لگتا ہے کہ اس میں کسی کا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔ وہ تاریخی عمل قرۃ العین نے فراموش کر دیا جو تقسیم ہندستان کی شکل میں انجام پایا۔ یہیں ہوا تھا کہ اچانک انگریزوں کے جی میں آئی اور وہ ملک کو تقسیم کر کے چلے گئے۔ وہ نفرت کی آگ جو ڈھیر ڈھیرے بڑی تھی جس کی ذمہ داری ہمارے اپنے سر تھی ہمارے اپنے تاریخی عوامل کے سر تھی جس میں کچھ جیسے نہ جانے کتنے نوجوان عملی طور پر سرگرم تھے ان کے تذکرے کے بغیر ناول ایک رومانی معصومیت کے ساتھ تاریخی عوامل کے جرم دسنرا پر محض جذباتیت کا ہلکا سا لبادہ ہی ڈال سکتا ہے اس سے یہ مراد نہیں کہ اس ناول یا کسی اور ناول سے تاریخ کے مطالبات روا ہیں لیکن یہاں کمزوری تاریخی شعور کی ہے اور اس تاریخی شعور سے پیدا ہونے والی فکری توانائی کی۔

'آنگن' پاکستان میں لکھا گیا لہذا ہماری بحث سے خارج ہے لیکن تاریخی شعور، فنی بالیدگی اور فکری صلابت کے اعتبار سے کم سے کم میرے نزدیک وہ اس موضوع پر سب سے اچھا ناول ہے اور 'میرے بھی صنم خانے' سے کہیں آگے

قرۃ العین کے فن میں جو چیز خاص طور پر اہمیت رکھتی ہے وہ جان بوجھ کر الجھاؤ اور بکھراؤ کا استعمال ہے بعض اسے شعور کی رو سے تعبیر کر لیتے ہیں حالانکہ دونوں میں فرق ہے شعور کی رو تو کسی کردار کے ذہن میں جس ترتیب یا بے ترتیبی سے مختلف خیالات گزرتے ہیں ان کا جوں کا توں بیان ہے جس کے نمونے محمد حسن عسکری کی چائے کی پیالی یا حرام جادی۔ یا اس سے بھی بہتر طریقے پر کالج سے گھر تک میں پیش کیے ہیں یا سجاد ظہیر کے افسانے نیند نہیں آتی میں ملتے ہیں۔ الجھاؤ اور بکھراؤ سے میری مراد یہ ہے کہ کسی واقعے یا کردار کو بیان کرتے کرتے دوسرے غیر متعلق واقعات یا خیالات در آئیں اور اس میں جملۂ (یا صفحۂ) معترضہ کی صورت پیدا ہو جائے یعنی ناول کا وحدت تاثر ایک تسلسل اور ترتیب کے بننے کے بجائے غیر مرتب اور غیر مسلسل ٹکڑوں سے مل کر بنے۔ یہ بکھراؤ بھی ایک فن ہے بشرطیکہ آگے چل کر بیان کا سلسلہ ان تمام غیر مرتب اور غیر مسلسل ٹکڑوں میں ایک گہرا ربط پیدا کر دے جیسے دستاوسکی

کے ناول BROTHERS KARAMAZOR کے پہلے سو صفحات کا بکھراؤ بعد کے بیان سے مربوط ہو جاتا ہے۔ قرۃ العین کے ہاں بکھراؤ تکنیک نہیں عادت ہے بلکہ مجھے معاف کیا جائے تو کمزوری ہے جسے آرٹ سمجھ لیا گیا ہے۔ قرۃ العین ترشے ہوئے پلاٹ پر قادر نہیں (ہاؤسنگ سوسائٹی اور کسی حد تک سیتا ہرن استثنا ہیں) یہ بکھراؤ اول تو بے جا طوالت پیدا کرتا ہے دوسرے تاثر کی شدت کو مجروح کر دیتا ہے۔

جس ناول نویس کی شہرت کا غلغلہ اتنا بلند ہو اس کے بارے میں یہ بات شاید عجیب سی لگے مگر ان کے ناول پڑھتے وقت بارہا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کا ذہن گیلری کی طرف بھٹک جاتا ہو اور وہ اپنی بات کو بے کم و کاست اور بے محابا کہنے کے بجائے بے جا آرائش بیاں اور آراستگی کی طرف متوجہ ہو جاتی ہوں۔ ان کے چھوٹے ناولوں میں بھی یہ عیب موجود ہے۔

اس کے بعد کچھ اور آگے بڑھے تو زمینداری کے خاتمے کا اعلان ہوا جس نے دیہی معاشرت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا جاگیرداری طبقہ آخری سانسیں لے رہا تھا مگر اس دھچکے نے اس کی ساری آب و تاب بھی ختم کر دی لیکن زمینداری کا خاتمہ ایک ادھورا قدم تھا جس نے پرانے آقاؤں کا دم تو نکال لیا مگر نچلے طبقے کے دبے کچلے کسانوں کے لیے پیام راحت نہ لا سکا پرانے آقاؤں کی جگہ نئے آقا ابھرے اور دیہاتوں میں نو دولتی کسان نے زمیندار کی گدی سنبھال لی مگر اس کی تہذیبی میراث جدا گانہ تھی دیہات کی تصویر کشی اردو ناول میں قاضی عبدالستار ہی کے ذریعے ہوئی بچے ہوئے انداز بیان اور شاعرانہ اسلوب کے باوجود قاضی عبدالستار کا مشاہدہ بہت گہرا اور تخیل کی اڑان نہایت بلند ہے قاضی کو فضا کا جادو جگانے کا فن آتا ہے گو ان کی ہمدردیاں واضح طور پر مرتے ہوئے جاگیردارانہ طبقے کے ساتھ ہیں جس کی وضع داری اور تہذیبی آب و تاب کو وہ فراموش نہیں کر پاتے۔ قاضی سے پہلے ہمارے ہاں دیہاتوں کی ایسی بھرپور عکاسی کبھی نہیں ہوئی تھی "شکست کی آواز" اور اس کے بعد "شب گزیدہ" دونوں میں یہ عکاسی ایسی تابناک ہے کہ دیہات کی پوری تصویر آنکھوں کے سامنے لا کھڑی کرتی ہے۔

قاضی ہی نے اس دور کے دو تاریخی ناول لکھے غازی صلاح الدین اور دارا شکوہ اور دونوں میں تخیل کے زور سے ماضی کو پوری رنگا رنگی کے ساتھ زندہ کر دکھایا! اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا تاریخ کا مطالعہ جزئیات تک پر حاوی ہے اور انھی جزئیات سے ان کے تخیل کو غذا ملتی ہے۔

راجندر سنگھ بیدی کے ناول ایک چادر میلی سی کا حسن تہذیبی تصویر کشی ہی میں مضمر ہے مرکزی خیال تو صرف اتنا ہے کہ انسانی زندگی مخاصموں سے لبریز ہے ہر قدم پر ناگوار حقیقتوں اور کبھی دشمن چہروں سے سابقہ ہے تو کبھی ماضی کے ٹوٹے اور بے جوڑ رشتوں سے اور انسانی زندگی کا تقاضہ یہ ہے کہ حالات جن ناگوار حقیقتوں کی گود میں پھینک دیں انھیں سے سمجھوتہ کر لو۔ رانو کے لیے یہ سمجھوتا بہت دل دوز تھا لیکن کہانی کا پس منظر اس کے پیش منظر سے کہیں آگے ہے اور اسی وجہ سے وہ پنجاب کی قصباتی زندگی کو پورے تہذیبی سیاق و سباق کے ساتھ بیان کرتی ہے کہ وہ اس زندگی کا ایک ٹکڑا معلوم ہونے لگتی ہے۔ بیدی کا ناول زبان کی ناہمواری اور انداز بیان کے کچے پن کے باوجود اردو کے اعلیٰ ناولوں میں گنا جائے گا کیونکہ اس میں خیال کا حجم اور تجربے کی روشنی میں ڈھل کر فن کا روپ رنگ اختیار کر گیا ہے۔

عصمت کے ناول معصومہ اور دل کی دنیا اسی عرصے میں شائع ہوئے مگر معصومہ کمزور ہے اور دل کی دنیا کینوس کے اعتبار سے افسانے سے زیادہ نہیں۔ البتہ کرشن چندر کے متعدد ناولوں کی ناکامی کے باوجود دادر پل کے بچے اور گدھے کی سرگزشت قابل لحاظ ہیں۔ کرشن چندر اپنے اسلوب کو دل چسپ اور شاعرانہ بنانے اور کہانی اور کردار دونوں کو عام فہم سطح تک قائم رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اکثر اس کوشش میں فکری صلابت اور فلسفیانہ گہرائی کو صحافتی دل چسپی کی خاطر قربان کر دیتے ہیں لیکن پھر بھی فن پر ان کی دسترس اور عصری زندگی کی اتنی سوجھ بوجھ اسی تیکھی اور سچی ہے کہ ان کی زود نویسی کے باوجود کہیں کہیں جلوہ دکھا جاتی

ہے۔ واد دیپل کے بیچھے اسی قسم کے ناولوں میں ہے۔

گدھے کی سرگزشت کو بہت سے لوگ طنز و مزاح کی صف میں رکھیں گے اور اسے باضابطہ ناولوں کی فہرست میں جگہ نہ دیں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ طنز کے سارے آداب لوازم کو ملحوظ رکھنے کے بعد بھی عصری زندگی کی پیچیدگی اور رنگارنگی کو کرشن چندر نے اس ناول میں بڑی خوبی سے سمویا ہے۔

اس دور کے اہم ناولوں میں حیات اللہ انصاری کا ناول لہو کے پھول بھی شمار کیا جائے گا جو پانچ جلدوں میں شائع ہو کر اردو کا ضخیم ترین ناول قرار پایا۔ اس ناول میں حیات اللہ انصاری نے سنہ ۱۹۱۱ء سے سنہ ۱۹۵۰ء تک یا اس کے قریب قریب ہندوستانی سماج کی تہذیبی اور خصوصاً سیاسی کروٹوں کی تاریخ بیان کی ہے۔ اسی لیے صحافت کا بیانیہ انداز زیادہ غالب ہو گیا ہے۔ البتہ جہاں کہیں حیات اللہ کا قلم تہذیبی زندگی کی مختلف پرتوں کا بیان کرتا ہے وہاں ناول نئی بلندیوں کو چھو لیتا ہے۔ ہندوستانی ریاستوں کے محلوں کی اندرونی زندگی، قدیم مسلم جاگیردارانہ گھرانوں کی ریت رسمیں اور تہذیبی فضا، متحدہ اور منقسم ہندوستان میں قوم پرست مسلمان کا المیہ —— یہ سب کچھ بڑی دردمندی اور ہنرمندی سے بیان ہوا ہے۔ لہو کے پھول یقیناً عظیم ناول نہیں لیکن اہم ناول ضرور ہے۔

اس کے بعد جن ناولوں کا ذکر آئے گا ان میں عظمت نہیں۔ شاید ان سب کو اہم بھی نہ کہا جا سکے لیکن ان میں کئی قابل لحاظ ہیں بعض کی حیثیت ایسے خاکوں کی ہے جن میں مشق اور ریاضت سے رنگ بھر آگیا تو شاید آگے بہتر تخلیقات کا وجود ممکن ہو سکے کچھ ایسے ہیں جو پڑھتے وقت اچھے لگتے ہیں لیکن ہاتھ سے چھوٹتے کے تھوڑی دیر بعد ہی ذہن سے فراموش ہونے لگتے ہیں۔

خواجہ احمد عباس ہمارے پرانے پختہ مشق ناول نگار ہیں لیکن اس عرصے میں بھی ان کا کوئی ایسا ناول اردو ادب کے حصے میں نہیں آیا جو ادبی شہ کار کی حیثیت رکھتا ہو یا اپنے مصنف کی صلاحیتوں کا پوری طرح اظہار کر سکتا ہو۔ نام گنانے سے کوئی فائدہ نہیں لیکن خواجہ احمد عباس کے صحافتی رنگ نے اور آسانی سے اور جلد اتر دکھانے کی کوشش نے ان کے ناولوں کو اعلیٰ سنجیدگی کی سطح تک پہنچنے نہیں دیا۔

انور عظیم کا ناول پرچھائیوں کی وادیاں چھپا جس میں ایک چھوٹے سے تعلیمی حلقے کی مختلف ہستیوں کی نفسیاتی پیچیدگیوں اور سماجی تہ داریوں کی تصویر کشی کی گئی تھی۔ انور عظیم ہمارے ان لکھنے والوں میں ہیں جن کی کہانیاں تہذیبی مرقعے ہوا کرتی تھیں لیکن ایسا لگتا ہے کہ اس ناول میں تہذیبی تصویر کشی اور نفسیاتی تحلیل کے تقاضوں کے درمیان وہ اس طرح الجھ کر رہ گئے ہیں کہ ناول میں معنویت پیدا نہیں ہو سکی۔

آمنہ ابوالحسن کا نیا ناول سیاہ سرخ سپید، رضیہ سجاد ظہیر کا سمن اور سر شام، صالحہ عابد حسین کے ناول راہ عمل اپنی اپنی صلیب اور حامدی کاشمیری کا ناول بلندیوں کے خواب اس دور کے اچھے ناولوں میں شمار کیے جائیں گے۔ ان میں دلچسپی رنگینی اور کشش ہے۔

پچھلے چند مہینوں میں البتہ ایک اہم ناول عظیم مسرور کا بہت دیکھ دی نظر سے گزرا جو چونکا دینے کی حد تک کامیاب اور اعلیٰ تھا۔ عظیم مسرور نئے لکھنے والے ہیں لیکن کردار نگاری کا سلیقہ، واقعہ نگاری کا سنبھلا ہوا انداز، مکالموں کی شگفتگی اور سلجھی ہوئی نثر ان کی فن کارانہ پختگی کی گواہی دیتی ہے۔ پلاٹ اور کردار نگاری دونوں کے لحاظ سے خاصا روایتی ہے لیکن ناول نگار نے انسانی کردار میں تبدیلیاں پیدا کرنے والے نفسیاتی عوامل اور سماجی محرکات کو جس طرح ایک فنی تجربے کے روپ میں ڈھال دیا ہے وہ اسے خاصے کی چیز بنا دیتا ہے۔

۲۵ سال اور صرف چند گنے چنے ناول —— فہرست بنانا مقصود بھی نہیں اور دوسرے اور تیسرے درجے کے ناولوں کی فہرست بنانا ممکن ہے نہ مفید لیکن چند گنے چنے نام اردو ناول نگاری کی نئی جہات کا اندازہ لگانے کے لیے کافی ہیں۔ بلاشبہ اردو ناول پچھلی ربع صدی کے مقابلے میں (ما سوا پریم چند) اس ربع صدی میں کہیں آگے نکل آیا ہے مگر ابھی وہ عالمی شہ پاروں کے مقابلے میں ابتدائی حالت ہی میں ہے۔ ابھی اس میں فکر کی تابناکی، مشاہدے کی قوت، تجربے کی وسعت اپنے عروج تک نہیں پہنچ سکی ہے۔

ہمارے دستور کے بنیادی حقوق

عرش ملسیانی

آزادی کو ملے پچیس سال ہو گئے۔ ماہِ اگست ۱۹۴۷ء میں برطانوی حکومت اپنے اختیارات سونپ کر الگ ہو گئی۔ صرف ایک بات تسلی بخش نہ ہوئی اور وہ یہ کہ ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ہر چند یہ تقسیم مذہب کی بنا پر ہوئی لیکن مابعد کے ہندستان میں مذہب کی بنا پر کوئی تفریق نہ ہوئی۔ ہندستان سیاسی اعتبار سے ترقی پذیر ہوا۔ اس کی خارجہ پالیسی بھی دنیا میں بڑی مقبول ہوئی۔ اقتصادی، زرعی اور صنعتی ترقی میں ہندستان اتنا آگے بڑھا کہ دنیا کے ملک دیکھتے رہ گئے۔ اس کی سرحدوں کے محافظ بھی ہر وقت چوکس رہے۔ فوجی اور دفاعی انتظام بہت ترقی پذیر رہا۔ ملکی ضروریات زیادہ تر ملک ہی میں مکمل ہونے لگیں۔ دریاؤں کو قابو میں لا کر ان پر بڑے بڑے بند بنائے گئے اور یہ سلسلہ آب پاشی اور بجلی کی پیداوار میں بڑا معاون ثابت ہوا۔ آج ہندستان سے کروڑوں روپے کا صنعتی سامان دوسرے ملکوں کو بھیجا جاتا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں سے افضل جو بات اس زمانے میں ہوئی وہ یہاں کے دستور کا بننا تھا۔ ایک آئین ساز اسمبلی نے سیکولر دستور تیار کیا۔ ہمارے ہمسایہ ملکوں میں ابھی تک کوئی دستور ہی نہیں اور اگر ہے بھی تو عوام کے لیے ناقابلِ اعتبار۔

اس مضمون میں ہم اس دستور میں بنیادی حقوق کی چند دفعات کا جائزہ لیں گے جن پر سیکولرزم اور عوام آزادی کا دارومدار ہے۔ یہ تو عام طور پر سب کو معلوم ہی ہے کہ تقسیمِ ملک کے بعد آبادی کی از خود تبدیلی اور فسادات کی وجہ سے ملک میں بڑا انتشار پیدا ہو گیا تھا لیکن ان تمام فتنہ انگیزیوں پر قابو پانے کے بعد ملک میں دستور سازی کی طرف فوراً توجہ کی گئی اور آئین ساز مجلس کا قیام عمل میں آیا۔

مجلس آئین ساز کا پہلا جلسہ ۹ دسمبر ۱۹۴۶ء کو ہی شروع ہو گیا تھا لیکن آزادی اور اس کے بعد کے حوادث کی وجہ سے کام میں تاخیر ہو گئی۔ اس میں سب قوموں اور اداروں کے نمائندے تھے۔ بہرحال آئین منظوری کے لیے مجلس کی آخری نشست ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ء کو منعقد ہوئی۔ اس کی کچھ تفصیلات ذیل میں درج ہیں

(۱) آئین سازی میں ۲ برس، ۱۱ ماہ، ۱۸ دن کا وقت صرف ہوا۔ مجلس آئین ساز کے کل گیارہ سیشن ہوئے۔ (۲) سیشن دیکھنے کے لیے آنے والوں کی تعداد ۵۳ ہزار تھی۔ (۳) آئین سازی پر کل ۶۳،۹۶،۷۲۹ روپے کے اخراجات ہوئے۔ (۴) آئینی مسودے کے مرتبہ آئین کی دفعات و جدول بالترتیب ۲۴۳ اور ۱۳ تھی۔ (۵) ترتیبِ مسودہ پیش کردہ مسودہ کمیٹی ۳۱۵ دفعات اور ۸ جدول۔ (۶) مسودہ میں جس قدر ترمیموں کا نوٹس دیا گیا ان کی کل تعداد ۷۶۳۵ تھی۔ (۷) ان میں سے حقیقتاً ۲۴۷۳ ترمیمیں پیش ہوئیں۔ (۸) آئین کے آخری مسودے کی ترتیب ۳۹۵ دفعات اور ۸ جدول۔

اس آئین کی ڈرافٹنگ کمیٹی کے ممبران مندرجہ ذیل تھے۔

ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیدکار (چیرمین)، آنجہانی مسٹر شری بی۔ ایس۔ راؤ۔ لیکن ـــــ شری گوپالا سوامی آئینگر، شری کے۔ ایم۔ منشی، شری ٹی۔ ٹی۔ کرشنا چاری، شری الادی کرشنا سوامی آئر اور شری محمد سعد اللہ۔

آئین ساز اسمبلی کے صدر ڈاکٹر راجندر پرساد تھے جو

بعد میں جمہوریۂ ہند کے پہلے صدر رہے۔ یہ دستور ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو نافذ کیا گیا۔

ہندستان کا دستور انگریزی تعلیم، مغربی اداروں سے ہمارے تعلق اور وابستگی اور ہندستانی روایات کی آمیزش سے بنا ہے۔ اس میں پیچیدہ دستور کی سب خوبیاں موجود ہیں یعنی جامع بھی ہے اور توضیح بھی، لوچ بھی ہے اور لچک بھی ہے۔ البتہ اختصار نہیں۔ اتنے بڑے ملک میں جس میں اتنی زبانیں، فرقے اور [illegible] ہوں اختصار ممکن بھی نہیں تھا۔ اگر اختصار [illegible] بنیادی حقوق کا [illegible] دستور میں بھی حقوق بہت ضروری ہوتے ہیں۔

ہمارے حقوق سات اقسام کے ہیں

(۱) حق مساوات (۲) حق آزادی (۳) استحصال سے حفاظت کا حق (۴) مذہبی آزادی کا حق (۵) تعلیمی اور ثقافتی حقوق (۶) جائداد کے حقوق اور (۷) دستوری معاملات میں محافظت کے حقوق۔

آخری دو حقوق بہت وضاحت طلب ہیں اور اس مضمون میں ان کی گنجائش نہیں۔ اس لیے پہلے پانچ حقوق کا ذکر اختصار سے کیا جاتا ہے۔

۱۔ اس کا تو مطلب صاف ہے کہ کسی شخص کو مذہب، نسل، ذات، صنف یا جائے پیدائش کی بنا پر کسی دستوری حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں سماجی برابری قائم کرنے کے لیے حکومت ہند نے خطابات کی منسوخ کر دی ہے۔ اب جو بھارت رتن، پدم وبھوشن، پدم بھوشن، پدم شری وغیرہ اعزاز دیے جاتے ہیں وہ سرکاری خطابات نہیں ہیں۔

چھوت چھات کی منسوخی۔ چھوت چھات قانونی طور پر قطعی منسوخ کر دی گئی ہے اور کسی شخص کا داخلہ نسل، رنگ، ذات پات کی وجہ سے کسی دوکان، ہوٹل یا عام تفریح گاہ میں منع نہیں کیا جا سکے گا۔ کسی شخص کو حکومت کے کلی یا جزوی طور پر بنوائے ہوئے کنوئیں، تالاب یا گھاٹ یا سڑک کے استعمال سے نہیں روکا جا سکے گا۔

۲۔ اسی طرح ہر شخص کی شخصی آزادی بھی محفوظ ہے اور اسے بغیر کسی جرم یا بلا وجہ حراست میں رکھا نہیں جا سکتا اگر [illegible] جہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ ہندستان کے دستور کے مطابق بیگار بھی لینا منع ہے۔ انسانوں کا بردہ فروشی ہونا اور چودہ سال سے کم عمر کے بچوں کا فیکٹریوں، کانوں اور خطرناک کاموں میں تقرر بھی قانونی طور پر جرم ہے۔

۴۔ پہلے ہم تعلیمی اور ثقافتی آزادی کا ذکر کریں گے اور بعد میں مذہبی آزادی کا۔ حکومت ہر اقلیت کو اپنی ثقافت، زبان اور رسم خط کو قائم رکھنے کی اجازت دیتی ہے۔ مطلب یہ کہ اگر کہیں کوئی طبقہ اپنی تہذیب، زبان اور [illegible] کو قائم رکھنا چاہتا ہے تو حکومت اس پر [illegible] کرے [illegible] لیے کہ وہ اکثریت کی راہ [illegible] اسی طرح [illegible] کی مدد سے چلنے والے اسکولوں یا کالجوں میں کسی شہری کو مذہب [illegible] وغیرہ کی بنا پر داخل ہونے سے [illegible] حاصل [illegible] تعلیم کا حق دیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ ترمیمات بھی دستور میں کی گئی ہیں [illegible] کو ایسے اختیارات دیے گئے ہیں جن سے کسی کی حق تلفی اس [illegible] ابتدائی [illegible] اعلیٰ مدارج تک [illegible] انتظامیہ میں بھی [illegible] ہو سکتی۔

۵۔ مذہبی آزادی۔ یہ ایک ضروری بنیادی حق ہے اور یہی بعض اوقات ہمارے فسادات کی وجہ بن جاتا ہے۔ بعض لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو کر معمولی باتوں کو مذہب میں دخل اندازی قرار دے دیتے ہیں۔ لیکن ہمارے دستور کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ کسی کو بھی مذہبی طور پر امتیاز یا گھٹیا پن حاصل نہیں۔ یہاں کا ہر شہری ہر عہدے پر پہنچ سکتا ہے خواہ وہ صدر کا عہدہ ہی کیوں نہ ہو۔ بعض ملکوں میں صدر کے لیے کسی خاص مذہب کا ہونا ضروری ہے۔ سکھوں کو کرپان پہننے کی اجازت بھی دی گئی ہے کیونکہ یہ ان کے مذہبی لباس کا ایک حصہ ہے۔

ہماری جمہوریت کو بعض اوقات بڑی نازک باتوں سے عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے۔ کیوں کہ جب کسی مقام پر مذہبی رواداری ختم ہوتی ہے تو وہاں آتش غیظ و غضب بھڑک اٹھتی ہے لیکن بڑے بڑے

ہمارے دستور کے بنیادی حقوق

عرش ملسیانی

آزادی کو ملے پچیس سال ہو گئے۔ ماہِ اگست ۱۹۴۷ء میں برطانوی حکومت اپنے اختیارات سونپ کر الگ ہو گئی۔ صرف ایک بات تسلی بخش نہ ہوئی اور وہ یہ کہ ملک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ہر چند یہ تقسیم مذہب کی بنیاد پر ہوئی لیکن مابعد کے ہندوستان میں مذہب کی بنیاد پر کوئی تفریق نہ کی گئی۔ ہندوستان سیاسی اعتبار سے ترقی پذیر ہوا۔ اس کی خارجہ پالیسی بھی دنیا میں بڑی مقبول ہوئی۔ اقتصادی، زرعی اور صنعتی ترقی میں ہندوستان اتنا آگے بڑھا کہ دنیا کے ملک دیکھتے رہ گئے۔ اس کی سرحدوں کے محافظ بھی ہر وقت چوکس رہے۔ فوجی اور دفاعی انتظام بہت ترقی پذیر ہے۔ ملکی ضروریات زیادہ تر ملک میں بننے لگیں۔ سینکڑوں دریاؤں کو قابو میں لا کر ان پر بڑے بڑے بند باندھے گئے اور یہ سلسلہ آب پاشی اور بجلی کی پیداوار میں بڑا معاون ثابت ہوا۔ آج ہندوستان سے کروڑوں روپے کا صنعتی سامان دوسرے ملکوں کو بھیجا جاتا ہے۔ لیکن ان تمام باتوں سے افضل جو بات اس زمانے میں ہوئی وہ یہاں کے دستور کا بننا تھا۔ ایک آئین ساز اسمبلی نے سیکولر دستور تیار کیا۔ ہمارے ہمسایہ ایک دو ملکوں میں ابھی تک کوئی دستور ہی نہیں اور اگر ہے بھی تو عوام کے لیے ناقابلِ اعتبار۔

اس مضمون میں ہم اس دستور میں بنیادی حقوق کی چند دفعات کا جائزہ لیں گے جن پر سیکولرزم اور عام آزادی کا دار و مدار ہے۔ یہ تو عام طور پر سب کو معلوم ہی ہے کہ تقسیمِ ملک کے بعد آبادی کی ادلا بدلی اور فسادات کی وجہ سے ملک میں بڑا انتشار پیدا ہو گیا تھا لیکن ان تمام فتنہ انگیزیوں پر قابو پانے کے بعد ملک میں دستور سازی کی طرف فوراً توجہ کی گئی اور آئین ساز مجلس کا قیام عمل میں آیا۔

مجلس آئین ساز کا پہلا جلسہ ۹ دسمبر ۱۹۴۶ء کو ہی شروع ہو گیا تھا لیکن آزادی اور اس کے بعد کے حوادث کی وجہ سے کام میں تاخیر ہو گئی۔ اس میں سب قوموں اور اداروں کے نمائندے تھے۔ بہرحال آئین منظوری کے لیے مجلس کی آخری نشست ۲۶ نومبر ۱۹۴۹ء کو منعقد ہوئی۔ اس کی کچھ تفصیلات ذیل میں درج ہیں

(۱) آئین سازی میں ۲ برس ۱۱ ماہ ۱۸ دن کا وقت صرف ہوا۔ مجلس آئین ساز کے کل گیارہ سیشن ہوئے۔ (۲) سیشن دیکھنے کے لیے آنے والوں کی تعداد ۵۳ ہزار تھی۔ (۳) آئین سازی پر کل ۶۳۹۶۷۲۹ روپے کے اخراجات ہوئے۔ (۴) آئینی مسودہ کے مرتبہ آئین کی دفعات و جدول بالترتیب ۲۴۳ اور ۱۳ تھی۔ (۵) ترمیم مسودہ پیش کردہ مسودہ کمیٹی ۳۱۵ دفعات اور ۸ جدول۔ (۶) مسودہ میں جس قدر ترمیموں کا نوٹس دیا گیا ان کی کل تعداد ۷۶۳۵ تھی۔ (۷) ان میں سے حقیقتاً ۲۴۷۳ ترمیمیں پیش ہوئیں۔ (۸) آئین کے آخری مسودے کی ترتیب ۳۹۵ دفعات اور ۸ جدول۔

اس آئین کی ڈرافٹنگ کمیٹی کے ممبران مندرجہ ذیل تھے:

ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیدکار (چیئرمین)، آئینی مشیر شری بی۔ این۔ راؤ، رکن — شری گوپالا سوامی آینگر، شری کے۔ ایم۔ منشی، شری ٹی۔ ٹی۔ کرشنماچاری، شری الادی کرشنا سوامی آئر اور شری محمد سعد اللہ۔

آئین ساز اسمبلی کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد تھے جو

بعد میں جمہوریہ ہند کے پہلے صدر بنے۔ یہ دستور ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو نافذ کیا گیا۔

ہندستان کا دستور انگریزی تعلیم یافتہ مغربی اداروں سے [illegible] تعلق اور وابستگی اور ہندستانی بات کی آمد تک سے [illegible] اس میں لچک دستور کی سب خوبیاں موجود ہیں [illegible] اور توضیح بھی [illegible] ۔ البتہ [illegible] بڑے [illegible] ضروری ہوتے ہیں۔

بنیادی حقوق سات اقسام کے ہیں

(۱) حق مساوات (۲) حق آزادی (۳) استحصال سے حفاظت کا حق (۴) مذہبی آزادی کا حق (۵) تعلیمی اور ثقافتی حقوق (۶) جائداد کے حقوق اور (۷) دستوری معاملات میں مداخلت کے حقوق۔

آخری دو حقوق بہت وضاحت طلب ہیں اور اس مضمون میں اس کی گنجائش نہیں۔ اس لیے پہلے پانچ حقوق کا ذکر اختصار سے [illegible]

۱۔ اس کا تو مطلب صاف ہے کہ کسی شخص کو مذہب، نسل، ذات، صنف یا جائے پیدائش کی بنا پر کسی دستوری حق سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اس سلسلے میں سماجی برابری قائم کرنے کے لیے حکومت ہند نے خطابات کی منسوخ کر دی ہے۔ اب جو بھارت رتن، پدم وبھوشن، پدم بھوشن، پدم شری وغیرہ اعزاز دیے جاتے ہیں وہ ہرگز خطابات نہیں ہیں۔ چھوت چھات کی منسوخ۔ چھوت چھات قانونی طور پر قطعی منسوخ کر دی گئی ہے اور کسی شخص کا داخلہ نسل، رنگ، ذات پات کی وجہ سے کسی دوکان، ہوٹل یا عام تفریح گاہ میں بند نہیں کیا جائے گا۔ کسی شخص کو حکومت کے کلی یا جزوی طور پر سرمائے ہوئے سڑک، کنوئیں، تالاب یا گھاٹ یا سڑک کے استعمال سے نہیں روکا جا سکے گا۔

۲۔ اسی طرح ہر شخص کی شخصی آزادی بھی محفوظ ہے اور اسے بلا جرم یا بلا وجہ حراست میں رکھا نہیں جا سکتا۔ گرفتار [illegible] جا سکتا۔

۳۔ ہندستان کے دستور کے مطابق بیگار بھی لیا منع ہے۔ انسانوں کا فروخت ہونا اور چودہ سال سے کم عمر کے بچوں کا فیکٹریوں، کانوں اور خطرناک کاموں میں تقرر بھی قانونی طور پر جرم ہے۔

۴ پہلے ہم تعلیمی اور ثقافتی آزادی کا ذکر کریں گے اور بعد میں مذہبی آزادی کا۔ حکومت ہر [illegible] کو اپنی ثقافتی زندگی اور [illegible] کو قائم رکھنے کی اجازت دیتی ہے۔ مطلب یہ کہ اگر کہیں کوئی [illegible] زندگی اور [illegible] کو قائم رکھا جائے تو حکومت اس [illegible] کرے اور [illegible] ہے کہ وہ [illegible] کی راہ [illegible] طرح حکومت کے [illegible] مدد سے چلنے والے اسکولوں یا کالجوں میں کسی شہری کو محض مذہب، رنگ، نسل وغیرہ کی بنا پر داخل ہونے سے روکا نہیں جا سکتا [illegible] تعلیم کا حق دیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی [illegible] دستور [illegible] کی رو سے [illegible] کو ایسے اختیارات دیے گئے ہیں جس سے کسی کی حق تلفی اس [illegible] تعلیم اعلیٰ مدارج تک [illegible] اور [illegible] میں بھی [illegible] ہو رہی ہے۔

۵۔ مذہبی آزادی۔ یہ ایک ضروری بنیادی حق ہے اور یہی بعض اوقات [illegible] ہوتا ہے۔ بعض لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو کر معمولی باتوں کو مذہب میں دخل اندازی قرار دے دیتے ہیں۔ لیکن ہمارے دستور کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ کسی کو بھی مذہبی طور پر امتیاز یا گھٹیا پن حاصل نہیں۔ یہاں کا ہر شہری ہر عہدے پر پہنچ سکتا ہے خواہ وہ صدر کا عہدہ ہی کیوں نہ ہو۔ بعض ملکوں میں صدر کے لیے کسی خاص مذہب کا ہونا ضروری ہے۔ سکھوں کو کرپان پہننے کی اجازت بھی دی گئی ہے کیونکہ یہ ان کے مذہبی لباس کا ایک حصہ ہے۔

ہماری پارلیمنٹ کو بعض اوقات بڑی نازک باتوں سے عہدہ برآ ہونا پڑتا ہے۔ کیوں کہ جب کسی مقام پر مذہبی رواداری ختم ہوتی ہے تو وہاں آپس میں غیظ و غضب بھڑک اٹھتی ہے لیکن بڑھنے بڑے

ملکوں میں یہ باتیں ناگزیر ہوتی ہیں۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ جہالت ختم ہوتی ہے اور لوگوں میں روشن خیالی آجاتی ہے۔ جب ہمارا دستور بنا تھا تو ہندوستان کے اکابرین نے اس پر رائے زنی کی تھی۔ اس زمانے میں ایک صاحب ہی معتبر رائے سید سلطان احمد کی ہے جو وائسرائے کی ایگزیکٹیو کونسل کے ممبر رہ چکے تھے اور معتدل مزاج کے سیاستدان تھے۔ اونچے درجے کے قانون دان بھی تھے۔ انھوں نے دستور کو بہ غور دیکھا ہوگا اگر اس شخص جو اس وقت کی حکومت کا رکن بھی رہ چکا ہو ایسی رائے دے تو ہمیں قبول کرنا چاہیے۔ واقعی وہ [illegible] تک حق بات کہہ گئے

اقلیت کا مسئلہ سیاست کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ [illegible] کے لیے [illegible] ہے [illegible] سیاسی [illegible] کر سکا [illegible] ملکوں [illegible] کہ غیر ملکوں کے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] ہر سال [illegible] سیاست دانوں کو [illegible] اقلیت کا مسئلہ [illegible] یورپ کے مقابل ملکوں [illegible] اس مسئلے [illegible] کی کوشش [illegible] [illegible] مسئلے کو حل کرنے کی خواہش [illegible] اس نے [illegible] مجلس اقوام (لیگ آف نیشنز) کے [illegible] تمام ریاستوں کو بین الاقوامی طور پر [illegible] دینے کا جائزہ تیار کیا گیا جو لیگ میں شامل ہونے والی ہر ریاست پر عائد کیا گیا۔

گول میز کانفرنس کے وقت ہندوستان کی اقلیتوں کے سوال نے دنیا کی توجہ کو نمایاں طور پر اپنی طرف کھینچا۔ مہاتما گاندھی کی سرتوڑ کوششوں کے باوجود دوسری گول میز کانفرنس میں اقلیتوں کے سوال پر کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ اس معاملے میں کانگریس کو جو ناکامی ہوئی اس کا ازالہ کرنے کے لیے اس نے چند سال بعد ایک رابطہ عوام کی تحریک جاری کی لیکن مسلم لیگ نے اسے اپنے لیے ایک چیلنج کیا اور

ایک طویل خواب کے بعد یکایک جاگ اٹھی۔ اور اس نے سرگرم تنظیمی کام شروع کر دیا۔ انتخابات میں مسلم لیگ کو وسیع پیمانے پر کامیابیاں ہوئیں۔ کچھ دیر بعد رقابت نے اقلیت اور اکثریت کے سوال کی شکل [illegible] کر دی اور ہندوستان کی سیاست کے میدان میں دو قوموں کا نظریہ نمودار ہوا۔ اس نظریے کو لیگ نے اپنے اجلاس لاہور میں سرکاری طور پر ایک ریزولیوشن کی شکل میں پیش کیا۔ کئی سال کی باہمی نفرت اور [illegible] کے بعد اس نے قطعی شکل اختیار کی کہ ملک ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم ہوگا۔ اب یہ ایک طے شدہ مسئلہ ہے [illegible] کا ایک واقعہ ہے۔ مستقبل کی تشکیل ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہمیں دانشمندی سے ایسے طریقے اختیار کرنے چاہییں تاکہ دونوں ملکوں اور ان کے عوام کے درمیان ہمسایوں جیسے [illegible] تعلقات پیدا ہوں [illegible] اس بات سے اجتناب کرنا چاہیے [illegible] [illegible] ہمارے نئے دستور میں [illegible] [illegible] کی خود داری اور [illegible] کا انتظام [illegible] بڑی آسانی سے ایک [illegible] بنیادی حقوق میں اسے کوئی ایک تحفظ کہہ [illegible] بین الاقوامی [illegible] وجود [illegible] ان بنیادی حقوق میں امریکہ اور [illegible] دستوروں اور [illegible] موجود ہیں۔

ہندوستان کا نیا دستور کئی اعتبار سے ایک اہم اور قابلِ ستائش دستاویز ہے۔ ہندوستانی اقلیتوں کے نقطۂ نگاہ سے بھی یہ کچھ کم اہم نہیں۔ اس میں موجودہ دور [illegible] کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔ ۔۔۔۔۔ ہندوستان کی تقسیم دو قوموں کے نظریے پر ہوئی تھی اور تقسیم کے ساتھ ہی دو قوموں کے نظریے کو ختم ہو جانا چاہیے۔ اگر دو قوموں کو اب بھی برقرار رہنا ہے تو ہند کو اس بھدے اور تباہ کار انداز میں کیوں تقسیم کیا گیا تھا۔ اب ہندوستان میں صرف ایک ہی قوم رہے گی اور اس کا ایک ہی جھنڈا ہوگا

[illegible] تمام شہریوں کے لیے جو بنیادی حقوق تسلیم کیے گئے

ہیں۔ ان میں ہر بات شامل ہے۔ یہ اتنے ہمہ گیر ہیں کہ ان کی موجودگی میں مجالس آئین ساز میں مسلمانوں کے لیے نشستوں کی تخصیص بالکل بےمعنی اور غیر ضروری ہے۔ ستم کہ انتخاب کے رواج سے یہ ٹھوس فائدہ ہوگا کہ اس دستی ٹکی کا خاتمہ ہو جائے گا جو سالہا سال تک فرقہ وارانہ طرز پر ووٹ ڈالنے کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی۔ برطانیہ کے اخراج کے بعد یہ بالکل قدرتی اور مناسب ہے کہ فرقہ وارانہ سیاست کو بھی یہاں سے نکال دیا جائے

جناح کا نظریہ تو مسلمانوں کے تحفظ اور دوسرے دونوں کے کفار کے لیے حاجت دی۔ اگر ہندوستان کا مسلمان آج بھی اپنے دل میں یہ محسوس نہیں کرتا کہ ان تحفظات کے علاوہ جو آئین میں موجود ہیں مہاتما گاندھی کی لافانی میراث بھی اس کی حفاظت کرتی ہے تو وہ اخلاص ایمانی کا انسان کس حد تک کہا جا سکتا ہے۔ اس کو اس لافانی پیغام کا سندیسہ سنا چاہیے جو ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو لال ہند کے تئیں سے عام ہوا تھا ”وطن کے متعلق ہندوستانی قوم کی پیدا ہے آج سے

بائیس سال پرانی ہے اور کتنی اہم ہے۔

۱۹۴۷ء میں وزیر اعظم جواہر لال نے ریڈیو پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

ہم کسی مذہب سے تعلق نہیں رکھتے۔ ہم سب مادرِ وطن کے فرزند ہیں۔ ہم عملاً اور فعلاً تنگ دلی اور مذہبی جنون کو پھلتا پھولتا نہیں دیکھ سکتے۔ چنانچہ ہم نے دیکھا کہ ایک مسلمان ہندوستان کا راشٹرپتی ہوا۔ مسلمان، عیسائی، سکھ، اینگلو انڈین اور پارسی بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے جن میں کابینہ کے وزیر بھی رہے۔ گورنر بھی اور دوسرے ممتاز عہدوں پر بھی۔

حال ہی میں بنگلہ دیش نے دو قومی نظریے کو ٹھکرا دیا اور وہ ایک جمہوری نظام قائم کرنے کی طرف گامزن ہے۔ یہ ہندوستان کے آئین میں بنیادی حقوق کی سب سے بڑی فتح ہے۔ مسز اندرا گاندھی کی پالیسی میں ملک سماجی نظام کی طرف بڑی تیزی سے اصلاحات میں مصروف ہو رہا ہے اور ”غریبی ہٹاؤ“ کا نعرہ ایک عجیب متاثر کن رہا ہے۔

★

فدایانِ وطن کے عزائم

— — روشن پٹیالوی

ہزار ہا کی آزادی کا پرچم ہم لہرائیں گے
حقیقی آزادی کے حق سے ہم سب کو ملائیں گے
ماحولِ حیات افراد میں ہم نئے بسائیں گے
ہر ایک کے من میں دولت کے دیے جلائیں گے
چمن میں سرسبز عصر کو ہم نئے بنائیں گے
ہم اپنے عزم و عمل کا کرشمہ بھی دکھائیں گے
نئی بیداریِ احساس سے جادہ جگائیں گے
حسین اقدار کا دنیا کو شیدائی بنائیں گے
دماغ و دل کا ہر گوشہ مہک اٹھے گا خوشبو سے
گلستانِ وطن میں ہم بہاریں ایسی لائیں گے

ہر سمت کی ہر راہ میں ہم سمت بنائیں گے حقائق کی
خیالاتِ ظلمات کی سیاہی کو مٹائیں گے
ہر ایک سمت میں محبت کا لہو بھر کر
ہر ادنیٰ و اعلیٰ زمانے سے مٹائیں گے
ہر اک دل میں بھریں گے جذبۂ اخلاص کا جوہر
نظر انسان سب کو ایک ہی مرکز پہ لائیں گے
حکومت ہوگی حق کی ہمارے عالم پر
زباں سے کہتے ہیں جو اسے کر کے دکھائیں گے
ہر اک دل میں نئے جوشِ عمل کا ولولہ بھر کر
سبھی کو عظمتِ قومی کا شیدائی بنائیں گے

دکھا کر اس کا روشن حسین چہرہ زمانے کو
نشاں کل سامراجی جنگ ماندوں کا مٹائیں گے

ملکوں میں یہ باتیں ناگزیر ہوتی ہیں۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ جہالت ختم ہوتی ہے اور لوگوں میں روشن خیالی آجاتی ہے۔ جب ہمارا دستور بنا تھا تو ہندوستان کے اکابر نے اس پر رائے زنی کی تھی۔ ان دلائل میں ایک نہایت ہی معتبر رائے سید سلطان احمد کی ہے جو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے ممبر رہے تھے اور معتدل مزاج کے سیاستدان تھے۔ اونچے درجے کے قانون دان بھی تھے۔ انھوں نے دستور کو بہ غور دیکھا ہوگا۔ اگر اس شخص جو اس وقت کی حکومت کا رکن بھی تھا یہ الگ رائے دے تو ہمیں قبول کرنا چاہیے کہ واقعی وہ [illegible] حد تک حق بات کہہ گئے۔

"اقلیت کا مسئلہ سیاست کا ایک اہم مسئلہ ہے۔ ہندوستان جیسے [illegible] کے لیے جہاں [illegible] [illegible] کام [illegible] سیاسی [illegible] سیاست کے [illegible] [illegible] کر سکا تو کوئی [illegible] [illegible] کہ غیر ملکوں کے [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] تاریخ [illegible] [illegible] [illegible] [illegible] کر سکے ہیں) [illegible]

بہر حال یورپ نے سیاست والوں کو اس بات کا احساس ضرور دلایا [illegible] اقلیت کا مسئلہ ایک [illegible] مسئلہ ہے۔ [illegible] یورپ کے مقابل ملکوں [illegible] اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش [illegible] طریقہ اگرچہ غلط تھا [illegible] مسئلے کو حل کرنے کی خواہش ضرور موجود تھی۔ اس کے علاوہ مجلس اقوام (لیگ آف نیشنز) کے [illegible] تمام اقلیتوں کو بین الاقوامی طور پر [illegible] کے لیے کا چارٹر تیار کیا گیا جسے لیگ میں شامل ہونے والے [illegible] منظور کیا

گول میز کانفرنس کے وقت ہندوستان کی اقلیتوں کے سوال نے دنیا کی توجہ کو نمایاں طور پر اپنی طرف کھینچا۔ مہاتما گاندھی کی انتہائی کوششوں کے باوجود دوسری گول میز کانفرنس میں اقلیتوں کے سوال پر مناسب سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ اس معاملے میں کانگرس کو جو ناکامی ہوئی اس کا ازالہ کرنے کے لیے اس نے چند سال بعد ایک رابطہ عوام کی تحریک جاری کی۔ لیکن مسلم لیگ نے اسے اپنے لیے ایک چیلنج مانا اور

ایک طویل خواب کے بعد یکایک جاگ اٹھی۔ اور اس نے سرگرم تنظیمی کام شروع کر دیا۔ انتخابات میں مسلم لیگ کو وسیع پیمانے پر کامیابیاں ہوئیں جن کے بعد رقابت نے اقلیت اور اکثریت کے سوال کی شکل ترک کر دی اور ہندوستان کی سیاست کے میدان میں دو قوموں کا نظریہ نمودار ہوا۔ اس نظریے کو لیگ نے اپنے اجلاس لاہور میں سرکاری طور پر ایک ریزولیوشن کی شکل میں پیش کیا۔ کئی سال کی باہمی نفرت اور [illegible] کے بعد اس نے قطعی شکل اختیار کی [illegible] ملک ہندوستان اور پاکستان میں تقسیم ہو گیا۔ اب یہ ایک طے شدہ مسئلہ ہے اور تاریخ گزشتہ کا ایک واقعہ ہے۔ مستقبل کی تشکیل ہمارے ہاتھ میں ہے۔ ہمیں دانشمندی سے ایسے طریقے اختیار کرنے چاہییں [illegible] دونوں ملکوں اور ان کے عوام کے درمیان ہمسایوں جیسے [illegible] تعلقات پیدا ہوں [illegible] بات سے اجتناب کرنا چاہیے [illegible] ہوں۔ [illegible] حقیقت [illegible] ہمارے نئے دستور میں بنیادی حقوق [illegible] اقلیتوں کی خود داری اور [illegible] آسانی سے ایک [illegible] بنیادی حقوق میں ایسے ہی ایک تحفظ کو [illegible] بین الاقوامی [illegible] موجود ہے۔ ان بنیادی حقوق میں امریکہ اور [illegible] دستوروں اور [illegible] مثالیں موجود ہیں۔

ہندوستان کا نیا دستور کئی اعتبار سے ایک اہم اور قابل ستائش دستاویز ہے [illegible] اقلیتوں کے نقطہ نگاہ سے بھی کچھ کم اہم نہیں۔ اس میں موجودہ دور کے [illegible] دستوروں کی تمام خوبیاں موجود ہیں ...... ہندوستان کی تقسیم دو قوموں کے نظریے پر ہوئی تھی اور تقسیم کے ساتھ ہی دو قوموں کے نظریے کو ختم ہو جانا چاہیے۔ اگر دو قوموں کو اب بھی برقرار رہنا ہے تو ہند کو اس بھدے اور تباہ کار انداز میں کیوں تقسیم کیا گیا تھا۔ اب ہندوستان میں صرف ایک ہی قوم رہے گی اور اس کا ایک ہی جھنڈا ہوگا

نئے دستور میں تمام شہریوں کے لیے جو بنیادی حقوق تسلیم کیے گئے

ہیں۔ ان میں ہر بات شامل ہے۔ یہ اتنے ہمہ گیر ہیں کہ ان کی موجودگی میں مجالس آئین ساز میں مسلمانوں کے لیے نشستوں کی تخصیص بالکل بے معنی اور غیر ضروری ہے۔ مشترکہ انتخاب کے رواج سے یہ ٹھوس فائدہ ہوگا کہ اس دشمنی کا بھی خاتمہ ہو جائے گا جو سالہا سال تک فرقہ وارانہ طور پر ووٹ ڈالنے کی وجہ سے پیدا ہو گئی تھی۔ برطانیہ کے اخراج کے بعد یہ بالکل غیر ضروری اور نامناسب ہوگا کہ فرقہ وارانہ سیاست کو بھی وہاں سے نکال دیا جائے۔

مہاتما گاندھی نے مسلمانوں کے تحفظ اور ہندوؤں کی خاطر اپنی جان دے دی۔ اگر ہندوستان کا مسلمان آج بھی اسے دل میں محسوس نہیں کرتا کہ ان تحفظات کے علاوہ جو آئین میں موجود ہیں مہاتما گاندھی کی لازوال میراث بھی اس کی حفاظت کر رہی ہے تو وہ احساسِ کمتری کا اسیر ایک حد تک رہے گا۔ ہمیں لازوال حقائق کو کہنا چاہیے جو ہماری ۱۹۴۷ء کی تہذیب کے حق میں تھے "دو قوموں کے متعلق ہندوستان کے لیے آج سے

★

فدایانِ وطن کے عزائم

— — — روشن پنڈیالوی

ہندوستان کا یہ ہر قصبہ ہر گاؤں
محبت کے گیت سے حق سے گائیں گے
ہماری حیاتِ نو اے وطن ہم بنائیں گے
ہر اک کے ہر دل میں تیری محبت جگائیں گے
پہنچ کر منزلِ مقصود پہ ہم جشن منائیں گے
ہم اپنے عزم راسخ کا کرشمہ بھی دکھائیں گے
نئی بیداریِ احساس سے جادو جگائیں گے
حسین اقدار کا دنیا کو شیدائی بنائیں گے
دماغ و دل کا ہر گوشہ مہک اٹھے گا خوشبو سے
گلستانِ وطن میں ہم بہاریں ایسی لائیں گے

ہر اک کے دل میں ہم سچی حقائق کی
خیالات ظلمت کی سیاہی کو مٹائیں گے
ضمیرِ آدمیت میں محبت کا لہو بھر کر
تمیزِ ادنیٰ و اعلیٰ زمانے سے مٹائیں گے
ہر اک دل میں بھریں گے جذبۂ اخلاص کا جوہر
بطورِ انسان سب کو ایک ہی مرکز پہ لائیں گے
حکومت ہوگی جنتا کی ہمارے عالم نو پر
زباں سے کہتے ہیں جو اسے کر کے دکھائیں گے
ہر اک دل میں نئے جوش عمل کا ولولہ بھر کر
سبھی کو عظمتِ قومی کا شیدائی بنائیں گے

دکھا کر اس کا روشن حسین چہرہ زمانے کو
نشاں کل سامراجی جنگ بازوں کا مٹائیں گے

بائیس سال پرانی ہے اور کتنی اہم ہے۔

۱۹۴۷ء میں پنڈت جواہر لال نے ریڈیو پر تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

ہم کسی مذہب سے تعلق نہیں رکھتے۔ ہم سب مادرِ وطن کے فرزند ہیں۔ ہم عملاً اور فعلاً تنگ دلی اور مذہبی جنون کو پھلتا پھولتا نہیں دیکھ سکتے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ ایک مسلمان ہندوستان کا راشٹرپتی بھی ہوا۔ مسلمان، عیسائی، سکھ، اینگلو انڈین اور پارسی بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے جن میں کابینہ کے وزیر بھی رہے۔ گورنر بھی اور دوسرے ممتاز عہدوں پر بھی۔

حال ہی میں بنگلہ دیش نے دو قومی نظریے کو ٹھکرا دیا اور وہ ایک سیکولر نظام قائم کرنے کی طرف گامزن ہے۔ ہندوستان کی تاریخ میں سیاسی حقوق کی سب سے بڑی فتح ہے۔ مسز اندرا گاندھی کی قیادت میں ملک سماجی نظام کی طرف بڑی تیزی سے اصلاحات میں مصروف ہے اس کا غریبی ہٹاؤ کا نعرہ ایک حقیقت بنتا نظر آ رہا ہے۔

غلام نہیں انسان چاہیئے

صالحہ عابد حسین

وہ امی کے سنٹر کی سب سے ذہین، سب سے حسین، سب سے [illegible] لڑکی تھی۔ بہت دنوں سے وہ اسی جد و جہد میں تھی کہ کوئی نیک، پڑھا لکھا اور معقول لڑکا ملے "معقول" یعنی جو جہیز [illegible] جس کو ساس سسر کے کدھوں [illegible] مطلوب نہ ہو تو وہ اس پیاری سی لڑکی کا ماہ [illegible] لڑکے ملنا تو اب ناممکنات میں سے [illegible] ماں کے پاس چار جوڑے نئے [illegible]!

[illegible] آج وہ امی کی موہن کڑائی ہے سرخ بنارسی جوڑے خوبصورت زیوروں سے آراستہ، حیا کی سرخی، مسرت کی جھلک نے اس کے حسن کو اور نکھار دیا ہے:

وہ دونوں اس کے سامنے آکر جھک گئے۔ "ماں ہمیں دعا دو ۔۔۔ ہمیشہ تمھاری محبت اور خدمت کی مسرت ہمیں نصیب رہے ۔۔۔" بیٹے نے پیار سے کہا تو ماں نے دونوں کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ سال بھر بعد پہلی دفعہ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برکھا ہوئی۔

انجینیر صاحب نے حیرت سے اُسے دیکھا ۔۔۔ یہ وہی پتھر دل عورت ہے جو ان کی ببلی کے لیے نہ روئی تھی ۔۔۔ آج ۔۔۔ آج یہ کیوں رو رہی ہے ۔۔۔ کس کے لیے؟

"لیجیے ۔۔۔ اسے گلے سے لگا لیجیے ۔۔۔ یہ آپ کی ببلی واپس آگئی۔" بیوی نے سسکیوں کے درمیان میاں کے شانے پر سر رکھ کر کہا۔ انھوں نے بیٹے کو دیکھا، بیوی کو دیکھا بہو کو دیکھا ۔۔۔ سچ مچ کتنی خوبصورت ہے ۔۔۔ اور اسی کی صورت ۔۔۔ تو ۔۔۔ تو ۔۔۔ ہاں ہاں۔ میری ببلی سے ملتی ہے ۔۔۔ آنکھیں دھندلا گئیں ۔۔۔ انھوں نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور بیٹا بہو دونوں ان کے سینے سے لگ گئے اور سال بھر بعد ان کو لگا کہ اندر جو شعلے بھڑک رہے تھے وہ مدھم پڑ گئے!

رات گئے جب دولہا دلہن کو ان کے کمرے میں بھیج دیا گیا، مہمان بہت سے چلے گئے، کچھ سو گئے تو انجینیر صاحب تھکے ہارے اپنے کمرے میں آکر کرسی پر ڈھ گئے۔ سامنے مینٹل پیس پر ببلی کی بڑی سی تصویر رکھی تھی ۔۔۔ بالکل انھیں لگا کہ وہ سچ مچ کی ببلی ہے، ابھی وہاں سے اتر کر آئے گی اور ان کے گلے میں باہیں ڈال دے گی اور ٹھنک ٹھنک کر ان سے اپنی بات منوائے گی! وہ ایک ٹک اس تصویر کو دیکھ رہے تھے!

"پاپا ۔۔۔ پاپا ڈیر ۔۔۔ میں ایم۔ اے یہاں نہیں کروں گی میں تو بمبئی میں پڑھوں گی پاپا۔"

"مگر ڈارلنگ۔ تمھاری ماں ۔۔۔ وہ اتنی دور بھیجنے کے لیے تیار نہیں ۔۔۔" انھوں نے پیار سے سمجھانا چاہا۔

"پاپا آپ ممی سے بہت ڈرتے ہیں ۔۔۔ وہ تو جانے کیسی باتیں کرتی ہیں۔ ایک طرف اتنی پڑھی لکھی ۔۔۔ اتنے بڑے ادارے کی چیرمین ہیں، سنٹر چلاتی ہیں ۔۔۔ اور بیچ بیچ، ذہن

بات، چھوٹے بڑے، امیر غریب کسی چیز کی قائل نہیں — آزادی کی علمبردار ہیں — خود نوکری کرتی ہیں — میرے پاپا بیچارے کی کوئی خدمت نہیں کرتیں —" اس نے آنکھیں نچائیں۔ وہ سیاہ گہری حسین کنول کی سی آنکھیں — اور باپ کی پیشانی چوم لی۔ "ہاں! اور میرے لیے مدامت پسند بن جاتی ہیں —"

"نہیں بیٹے۔ یہ بات نہیں — اصل میں وہ تجھے اپنے سے جدا کرنا نہیں چاہتیں — اور پھر — میں — بن کیسے رہوں گا تیرے بغیر" وہ لوگ جی جان سے اس پر فدا تھے۔ دو تین چھوٹے چھوٹے مر کر وہ رہ گئی تھی لو ماں باپ تو آپ ہی اس پر قربان سے تھے۔ دنیا کی کوئی بھی چیز ایسی نہ تھی جو انہوں نے اس کے لیے فراہم نہ کی ہو۔ کوئی سی حسرت جو پوری نہ کی ہو۔ ... سات سال بڑا چھوٹا تھا مگر وہ ماں کا لاڈلا تھا۔ ... پاپا کی جان وبلی تھی۔

[illegible] ... کی دوست بھی وہیں جاتے ہیں — ... چھوڑ دوں گی —" اور انھیں اس کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑتے تھے — بیوی کو کسی نہ کسی طرح راضی کرنا پڑتا۔ وہ کالج پڑھنے چلی گئی تھی۔ وہاں سے چھٹیوں میں آتی تو پھول کی طرح کھلی ہوئی سال بھر سے اس کا ایک دوست بھی آکر ٹھہرا کرتا — ماں باپ دونوں نے بھانپ لیا کہ دوستی سے اگلی منزل شروع ہو چکی ہے لڑکا اچھی صورت شکل کا، ... اور شریف لگتا تھا ذات اس سے بھی ضرور تھی مگر وہ ذات پات کے قائل ہی کب تھے۔ اور پھر بلبلی کی خوشی میں ان کی خوشی تھی۔

اگلے سال بلبلی نے ایم ایس سی فرسٹ کلاس میں پاس کرلیا — بہت خوش تھے دونوں! آنے کا انتظار کر رہے تھے لیکن جب اس کے بجائے اس کا خط آیا کہ میں نے بمبئی ہی میں نوکری کرلی ہے تو پہلی بار انھیں اپنی لاڈلی بیٹی پر غصہ آیا تھا۔ کیا ان کی محبت کا اتنا حق بھی نہ تھا کہ وہ ان سے پوچھ لیتی — اور اس وقت بیوی نے الٹی بلبلی کی طرف داری کی تھی — آج کل کے نوجوان کہاں یہ سب دیکھتے اور مانتے ہیں — اچھا ہے جہاں وہ خوش رہے۔

— کئی مہینے بعد بلبلی ملنے آئی — ساتھ میں اس کا دوست بھی تھا۔ اور بلبلی نے ماں باپ کو یہ خبر سنائی کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے اور خود درخواست کرنے آیا ہے تو باپ غصہ وصہ بھول گئے۔ ان کی اکلوتی بیٹی کا بیاہ ہوگا۔ یہ سوچ کر وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ لڑکے نے ان سے کہا "پاپا — میرے والد صاحب خود آپ سے ملنے آئیں گے۔ مگر میں نے سوچا پہلے میں آپ سے خود ہی بات کر لوں!"

انھوں نے بہت خوشی سے انھیں شادی کی اجازت دی مگر اس شرط پر کہ شادی ... ہمارے ہی طریقے پر ہوگا — بعد میں ... انھیں بتایا تھا کہ انھوں نے لڑکے سے ... کہہ دیا ہے کہ وہ جہیز وغیرہ ... ہاں ... کا جو کچھ بھی ہے — ... عمر بھر دونوں نے کمایا ہے۔ وہ سب ان تینوں بچوں کا ہے — اور اس ... لڑکے نے کہا تھا "ہاں جی — مجھے ... چاہیے بلبلی چاہیے — ... آپ کے ... کی خاطر ... کبھی خوش ہوں گی وہ۔ وہ ٹھہرے ... کے خلاف ... کمیٹی کی سکریٹری اور سرگرم کارکن — وہ بھلا یہ کیسے گوارا کرلیں!

مگر آہ! پھر سب کچھ خاک میں مل گیا!

اس رات دونوں میں رات بھر لڑائی ہوتی رہی تھی

بلبلی نے باپ کو خط لکھا تھا کہ حمی — شادی کے فوراً بعد مزید تعلیم کے لیے امریکہ جانا چاہتا ہے — اور اسی کے لیے اُسے پچیس ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پاپا اگر اسے دے دیں تو اس کی یہ تمنا بر آجائے گی . . . . اور ساتھ ہی بہت کچھ اس کی طرف سے صفائی بھی دی تھی!

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ یہ لڑکا بھتا تو بڑا وہ تھا۔ مگر اندر سے وہی لالچی، خودغرض، روپے کا لوبھی نکلا! وہ جانتا ہے کہ میری جائداد ہے، گھر ہے، نقد ہے — تینوں بچوں کے

غلام نہیں انسان چاہیئے

صالحہ عابد حسین

وہ اسی کے سٹر کی سب سے نرلیب، سب سے حسین، سب سے [illegible] سب لڑکی تھی بہت دل سے وہ اسی جد و جہد میں تھی کہ کوئی سک پڑھا لکھا او معقول لڑکا ملے "معقول" یعنی جو جہیز [illegible] مانگے، [illegible] چاہے، جس کو ساس سسر کے [illegible] ترقی کا مطلب نہ ہو تو وہ اس پیاری سی لڑکی کا [illegible] لڑکے ملنا تو اب ناممکنات میں سے [illegible] ماں کے پاس چار جوڑے نئے [illegible] تھا!

[illegible] آج وہ آس کی موہن کہ آئی ہے سرخ بنارسی جوڑے، خوبصورت زیوروں سے آراستہ، حیا کی سرخی مسرت کی جھلک نے اس کے حسن کو اور نکھار دیا ہے:

وہ دونوں اس کے سامنے آکر جھک گئے۔ "ماں ـــ ہمیں دعا دو ـــ ہمیشہ تمھاری محبت اور خدمت کی مسرت ہمیں نصیب رہے ـــ" بیٹے نے پیار سے کہا تو ماں نے دونوں کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ سال بھر بعد پہلی دفعہ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برکھا ہوئی۔

انجینیر صاحب نے حیرت سے اسے دیکھا ـــ یہ وہی پتھر دل عورت ہے جو ان کی بیلی کے لیے نہ روئی تھی ـــ آج ـــ آج یہ کیوں رو رہی ہے ـــ کس کے لیے؟

"دیکھیے ـــ اسے گلے سے لگا لیجیے ـــ یہ آپ کی بیلی واپس آگئی ہے" بیوی نے سسکیوں کے درمیان میاں کے شانے پر سر رکھ کر کہا۔ انھوں نے بیٹے کو دیکھا، بیوی کو دیکھا بہو کو دیکھا ـــ سچ مچ کتنی خوبصورت ہے ـــ اور اسی کی صورت ـــ تو ـــ تو ـــ ہاں ہاں۔ میری بیلی سے ملتی ہے۔ [illegible] آنکھیں دھندلا گئیں [illegible] انھوں نے دونوں ہاتھ پھیلائے اور بیٹا بہو دونوں ان کے سینے سے لگ گئے اور سال بھر بعد ان کو لگا کہ اندر جو شعلے بھڑک رہے تھے وہ مدھم پڑ گئے!

رات گئے جب دولہا دلہن کو ان کے کمرے میں بھیج دیا گیا، مہمان بہت سے چلے گئے، کچھ سو گئے تو انجینیر صاحب تھکے ہارے اپنے کمرے میں آکر کرسی پر بیٹھ گئے سامنے شیلف میں پر بیلی کی بڑی سی تصویر رکھی تھی ـــ بالکل انھیں لگا کہ وہ سچ مچ کی بیلی ہے، ابھی وہاں سے اتر کر آئے گی اور ان کے گلے میں باہیں ڈال دے گی اور ٹھنک ٹھنک کر ان سے اپنی بات منوائے گی، وہ ایک ٹک اس تصویر کو دیکھ رہے تھے!

"پاپا ـــ پاپا ڈیر ـــ میں ایم اے یہاں نہیں کروں گی میں تو بمبئی میں پڑھوں گی پاپا"

"مگر ڈارلنگ۔ تمھاری ماں ـــ وہ اتنی دور بھیجنے کے لیے تیار نہیں ـــ" انھوں نے پیار سے سمجھانا چاہا۔

"پاپا آپ ممی سے بہت ڈرتے ہیں ـــ وہ تو جانے کیسی باتیں کرتی ہیں۔ ایک طرف اتنی پڑھی لکھی ـــ اتنے بڑے ادارے کی چیئرمین ہیں، سنٹر چلاتی ہیں ـــ اور اونچ نیچ، ذہن

بات، چھوٹے بڑے، امیر غریب کسی چیز کی قائل نہیں ـــ آزادی کی علمبردار ہیں ـــ خود نوکری کرتی ہیں ـــ میرے پاپا بچارے کی کوئی خدمت نہیں کر سکے" اس نے آنکھیں جھکائیں۔ وہ سیاہ گھنی حسین کنول کی سی آنکھیں ـــ اور باپ کی پیشانی چوم لی "ہاں! اور میرے لئے تو آپ پسند کی جاتی ہیں ـــ

"نہیں بیٹے۔ یہ بات نہیں ـــ اصل میں وہ تجھے اپنے سے جدا کرنا نہیں چاہتیں ـــ اور پھر ـــ تم ـــ کیسے رہوں گا تیرے بغیر۔ وہ تو مجھ سے اس رشتے کے حق میں چھوٹے تھوڑے مگر وہ بندہ بھی تھی تو بات ہے۔ وہ تو باپ کی اس پر قربان رہتے تھے دنیا کی کوئی بھی ... تو انہوں نے ... کی ہو۔ کوئی بھی ... جو ... بیٹی ... سال بھر چھوٹا تھا مگر وہ ماں کا لاڈلا تھا ... ماں ... بھی۔

... باپ کی دولت بھی ... ہی چھوڑ دوں گی ـــ اور ... اس کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے تھے ـــ بیوی کو کسی نہ کسی طرح راضی کیا تھا اور وہ ... پڑھنے چلی گئی تھی۔ وہاں سے چھٹیوں میں آتی تو ان کی تربیت کھلی ہوئی سال بھر سے اس کا ایک دوست بھی آ کر ٹھہرا کرتا ـــ ماں باپ دونوں نے بھانپ لیا کہ دوستی سے آگلی منزل شروع ہو چکی ہے لڑکا اچھی صورت شکل کا، قابل اور شریف لگتا تھا۔ ذات اس سے بھی ضرور تھی مگر وہ ذات بات کے قائل ہی کب تھے۔ اور پھر سلمٰی کی خوشی میں ان کی خوشی تھی۔

اگلے سال سلمٰی نے ایم۔ ایس سی۔ فرسٹ کلاس میں پاس کر لیا ـــ بہت خوش تھے دونوں اُسے کا انتظار کر رہے تھے لیکن جب اس کے بجائے اس کا خط آیا کہ میں نے بمبئی ہی میں نوکری کر لی ہے تو پہلی بار انھیں اپنی لاڈلی بیٹی پر غصہ آیا تھا۔ کیا ان کی محبت کا اتنا حق بھی نہ تھا کہ وہ ان سے پوچھ لیتی ـــ اور اس وقت بیوی نے الٹی سلمٰی کی طرف داری کی تھی ـــ آج کل کے نوجوان کہاں سب دیکھتے اور مانتے ہیں ـــ اچھا ہے جہاں وہ خوش رہے۔

ـــ کئی مہینے بعد سلمٰی ملنے آئی ـــ ساتھ میں اس کا دوست بھی تھا۔ اور سلمٰی نے ماں باپ کو یہ خبر سنائی کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے اور خود درخواست کرنے آیا ہے تو باپ غصہ وغصہ بھول گئے۔ ان کی اکلوتی بیٹی کا بیاہ ہوگا۔ یہ سوچ کر وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ لڑکے نے ان سے کہا "پاپا ـــ میرے والد صاحب خود آپ سے ملنے آئیں گے۔ مگر میں نے سوچا پہلے میں آپ سے خود ہی بات کر لوں۔"

انھوں نے بہت خوشی سے انھیں شادی کی اجازت دی مگر اس شرط پر کہ منگنی ... ساتھ ... طریقے سے ہوگا ـــ بعد ... انھیں بتایا تھا کہ انھوں نے لڑکے سے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ وہ جہیز وغیرہ ... کچھ ... جو کچھ بھی ہے ـــ ... ہے۔ ... دونوں نے کمایا ہے۔ وہ سب ان تینوں بچوں ہی کا تو ہے ـــ اور اس پر لڑکے نے کہا تھا "ہاں جی ـــ مجھے ... چاہیے سلمٰی چاہیے۔ اس کے یا آپ کے روپے کی خاطر شادی نہیں کروں گا" کسی قدر خوشی ہوئی تھی ... وہ ٹھہری ... کے خلاف ... کی سیکریٹری اور سرگرم کارکن ـــ وہ بھلا ... کیسے گوارا کرتی!

مگر آہ! پھر سب کچھ خاک میں مل گیا!

اس رات دونوں میں رات بھر لڑائی ہوتی رہی تھی۔

سلمٰی نے باپ کو خط لکھا تھا کہ جمی ـــ شادی کے فوراً بعد مزید تعلیم کے لیے امریکہ جانا چاہتا ہے ـــ اور اسی کے لیے اُسے بیس ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پاپا اگر اسے دے دیں تو اس کی یہ تمنا بر آجائے گی ..... اور ساتھ ہی بہت کچھ اس کی طرف سے صفائی بھی دی تھی!

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ یہ لڑکا بتاتا تو بڑا دہ تھا۔ مگر اندر سے وہی لالچی، خودغرض، روپے کا لوبھی نکلا! وہ جانتا ہے کہ میری جائداد ہے، گھر ہے، نقد ہے ـــ تینوں بچوں کے

حصے میں کافی آئے گا۔ پھر بیلی خود سات آٹھ سو کی نوکر ہو گئی ہے۔ پھر بھی۔ پھر بھی ـــــ وہ! اور میں مان بھی لوں تو اس کی ماں ـــــ وہ تو کبھی نہ سنے گی یہ بات! اور وہی ہوا ـــــ وہ سنتے ہی بھڑک اٹھی ـــــ "مجھے ایسے لڑکے سے اپنی لڑکی نہیں بیاہنی ہے۔"

"مگر بیلی کا کیا ہوگا بیلی ـــــ وہ تو اسے دل و جان سے چاہتی ہے۔"

"اگر یہ چاہت یک طرفہ ہے تو بیلی کی زندگی عذاب ہو جائے گی ـــــ اس لڑکے کو اگر بیلی سے سچی محبت ہوتی تو وہ کبھی دہیز نہ مانگتا ـــــ"

اور رات بھر دونوں میں لڑائی ہوتی رہی۔ وہ ہر طرح سمجھاتا رہا ہماری لڑکی ضدی ہے ـــــ جذباتی ہے ـــــ میں اس کا مستقبل دیکھتا ہے۔ روپیہ بعد میں نہ دیا پہلے دے دیا فرق کیا پڑتا ہے ـــــ مگر اس کی سوچ سمجھ میں بات نہ آئی مجھیں صرف اپنی لڑکی کی فکر ہے مجھے ہندوستان بھر کی لڑکیوں کی چنتا ہے۔ میں اس لعنت کو دور کرنے کے لیے بیس برس سے جدوجہد کر رہی ہوں۔ تقریریں کرتی ہوں، مضمون لکھتی ہوں۔ میں نے کتنی ہی ایسی شادیاں رکوائی ہیں ـــــ کتنے ہی ایسے نوجوانوں کی ہمت افزائی کی ہے جو غریب لڑکیوں سے بیاہ کرتے ہیں اگر چہ کم جہیز اور روپیہ مانگتے نہیں! اور اب میں ہی کیا اپنی لڑکی کے لیے کروں ـــــ نہیں ـــــ یہ نہ ہوگا ـــــ میں مر جاؤں گی ـــــ مگر یہ شکست قبول نہ کروں گی" وہ بے بس ہو گیا ـــــ بیٹی کو تار دیا میں مجبور ہوں ـــــ تو خود آکر اپنی ماں سے بات کر!

اس سے آگے سوچنے کی جیسے ہمت نہ رہی ـــــ بیلی کی تصویر کو سینے سے لگا کر وہ بلک بلک کر رونے لگے۔

وہ بستر پر لیٹی تھی، آنکھیں چھت پر گھومتے پنکھے کو گھور رہی تھیں اور سال بھر پہلے کے واقعات اس پنکھے سے زیادہ تیزی سے دماغ میں چکر کھا رہے تھے!

"ممی ـــــ ڈارلنگ ممی!"

"ہاں میری بچی ـــــ"

"ماں۔ پاپا نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے ـــــ میں آپ کی مشکل سمجھتی ہوں ـــــ مگر ماں ـــــ وہ بہت کم اسے ماں کہتی تھی ـــــ مگر جب کہتی تو کتنا پیارا لگتا تھا اس کے منہ سے یہ انمول لفظ۔

"ماں ـــــ ممی ـــــ میں مانتا ـــــ وہ روپیہ چاہتا ہے ـــــ نقد روپیہ ـــــ"

"اور تو نے یہ نہیں کہا کہ تو مجھے چاہتا ہے یا روپے کو ـــــ"

"ماں ـــــ تم نہیں جانتیں ـــــ آج کل زندگی کا انداز کتنا بدل گیا ہے۔ ماں یہ تو عام بات ہے دلی میں، بمبئی میں، حیدرآباد میں، مدراس، بنگال میں ـــــ ہر جگہ۔ ہر مذہب، ہر قوم کے نوجوان اپنی قیمت لگاتے ہیں۔"

"جانتی ہوں ـــــ مگر میں انسان خریدنے کے خلاف ہوں۔ مجھے غلام نہیں مٹانا چاہیے۔ جو انسان ہو۔ نوجوان ـــــ وہ خود اپنی عزت خاک میں ملاتے ہیں۔ وہ لڑکیوں کے قاتل ہیں۔ وہ جن لڑکیوں سے بیاہ کرتے ہیں ان کو سچی محبت نہیں دے سکتے ـــــ عزت نہیں کر سکتے۔ وہ صرف پیسے کے لوبھی ہوتے ہیں۔ تجھے ایک سے ایک اچھا لڑکا مل جائے گا میری بچی ـــــ اس کم ظرف، لالچی خود غرض کے لیے تو اپنی شخصیت مسخ کر دے گی؟ اپنی ماں کو ذلیل کرے گی۔ اس کے عمر بھر کے اصولوں کو خاک میں ملا دے گی۔ کیا اسی لیے ہم نے تجھے اتنا بڑا کیا تھا؟"

ماں رونے پر آمادہ ہو رہی تھی!

سلی کے ہونٹ کانپنے لگے ـــــ "ماں ممی ـــــ تم ـــــ ماں ـــــ میں بہت دور نکل آئی ہوں ـــــ اب واپس نہیں جا سکتی ـــــ"

ماں کا چہرہ سفید پڑ گیا ـــــ "سلی۔ تو کیا کہہ رہی ہے ـــــ کیا تو نے میرے اعتماد کو ٹھیس نہیں لگائی ـــــ کیا ـــــ تو نے ـــــ کیا تو " وہ جملہ پورا نہ کر سکی!

"نہیں ماں ـــــ میں نے تمہاری عزت اب تک بچائی ہے مگر میں جیجی کو اتنا چاہتی ہوں کہ اب ـــــ کہ اب کسی اور کو وہ مقام

نہیں دے سکوں گی ——— امّی ———"

ماں چپ رہی

"تمھیں دنیا کی لڑکیوں کا درد ہے ماں۔ اپنی بیٹی کا نہیں؟"

"ہاں سلمیٰ ——— تو میری کوکھ سے ضرور پیدا ہوئی ——— مگر مجھے ان لڑکیوں کا بھی اتنا ہی درد ہے جو ہر سال جانے کتنی اس دہیز کی لعنت کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔"

"اور اگر تمھاری بیٹی بھی اس کی بھینٹ چڑھ گئی تو؟"

"سلمیٰ! یہ تو کیا کہہ رہی ہے تو ایسی بزدل نہیں ہو سکتی تو پڑھی لکھی ہے۔ سمجھدار ہے۔ اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی خود اعتمادی سے بھرپور ——— نہیں نہیں تو مجھے ڈرانے کو کہہ رہی ہے ———"

"ہاں ہاں یہی بات ہے" ... سو جاؤ اب! میں ذرا پاپا سے مل لوں۔"

وہ بلقیس کے پیچھے پیچھے گئی اور دراز میں سے جھانکنے لگی کہ باپ بیٹی میں کیا باتیں ہوتی ہیں۔

"پاپا"

"ہاں بیٹے ——— آج ماں سے ...؟"

"ہاں پاپا"

"بات ہو گئی ———"

"ہو گئی پاپا ———"

"مان گئی وہ؟"

"پاپا ——— ممی تو پتھر کی چٹان ہیں۔ وہ کیا مانیں گی ———"

"تو اب کیا ہوگا بیٹی" بے بسی سے انھوں نے کہا۔

"آپ انھیں مجبور نہیں کر سکتے پاپا"

"نہیں بیٹی۔ اسے کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔ مگر میں چپکے سے اپنی بزنس بیچ کر ——— تجھے روپے دے دوں گا۔ اسے خبر بھی نہ ہوگی ———"

"نہیں پاپا۔ نہیں پاپا ——— یہ نہ ہوگا۔ آپ زندگی بھر اصول پرست رہے ہیں۔ آپ میں اور ممی میں مثالی محبت ہے ——— میں ——— میں ہرگز یہ نہیں چاہوں گی کہ میری وجہ سے آپ دونوں کے بیچ دیوار کھڑی ہو ——— ممی کے دل میں آپ کی عزت کم ہو جائے!"

"تو پھر؟"

"سب ٹھیک ہو جائے گا ——— سب ٹھیک ہو جائے گا پاپا ... ہے"

اس نے باپ کے گال کو بوسہ دیا۔ ماں جلدی سے اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گئی۔ سلمیٰ نے دروازے سے جھانکا۔

"گڈ نائٹ ماں۔ گڈ نائٹ"

"گڈ نائٹ بیٹی" ماں نے بہت پیار سے کہا۔ ... سننے سے پہلے ... تب لیٹی ہی ———

اگلے دن سلمیٰ ... کی موت سو رہی تھی۔ ...

سارا شہر اس کے سارے کے ساتھ تھا ——— باپ پاگل سے ہو گئے تھے۔ بہن بھائی دیواروں سے سر پھوڑ رہے تھے ——— سارا خاندان، سارا شہر رو رہا تھا ——— موت اور ایسی موت! ——— مگر وہ چپ تھی۔ سب اسے دیکھ رہے تھے ——— مگر اس کی آنکھ سے ایک آنسو نہیں نکل سکا تھا ——— اس کی سہیلیاں، بہنیں، اس کے سنٹر کی لڑکیاں اس کی کولیگ اس کے چاروں طرف جمع تھیں سب یہ چاہ رہی تھیں کہ ... مگر ——— وہ کیا کرے ——— ہر طرف ایک صحرا تھا ——— ایک ویرانی ——— ایک بے حسی ——— ... اس کے سارے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔

لوگ کہتے تھے وہ پاگل ہو جائے گی ——— مر جائے گی ——— مگر انسان کیا کچھ سہار لیتا ہے۔ کیا کچھ!

•

اس نے سر اٹھایا ... چاروں طرف دیکھا۔ کارنس پر سلمیٰ کے بچپن کی تصویر مسکرا رہی تھی ——— اس کے برابر ہی دونوں لڑکوں کی تصویریں تھیں۔ بڑی کی ڈگری کا گاؤن میں اور چھوٹے بیٹے کی سوٹ میں!

حصے میں کافی آئے گا۔ پھر سلی خود سات آٹھ سو کی نوکر ہو گئی ہے۔ پھر بھی۔ پھر بھی ——— وہ! اور میں ماں بھی ہوں تو اس کی ماں ——— وہ تو کبھی نہ سنے گی یہ بات! اور وہی ہوا ——— وہ سنتے ہی بھڑک اٹھی ——— "مجھے ایسے لڑکے سے اپنی لڑکی نہیں بیاہنی ہے۔"

مگر سلی کا کیا ہوگا سلی ——— وہ تو اسے دل و جان سے چاہتی ہے۔"

"اگر یہ چاہت یک طرفہ ہے تو سلی کی زندگی عذاب ہو جائے گی ——— اس لڑکے کو اگر سلی سے سچی محبت ہوتی تو وہ کبھی دہیز نہ مانگتا ———"

اور رات بھر دونوں میں لڑائی ہوتی رہی۔ وہ ہر طرح سمجھاتا رہا۔ ہماری لڑکی ضدی ہے ——— جذباتی ہے ——— میں اس کا مستقبل دیکھتا ہے۔ روپیہ بعد میں نہ دیا پہلے دے دیا فرق کیا پڑتا ہے ——— مگر اس کی موٹی سمجھ میں بات نہ آئی!

"تمہیں صرف اپنی لڑکی کی فکر ہے۔ مجھے ہندوستان بھر کی لڑکیوں کی چنتا ہے۔ میں اس لعنت کو دور کرنے کے لیے بیس برس سے جدوجہد کر رہی ہوں۔ تقریریں کرتی ہوں، مضمون لکھتی ہوں! میں نے کسی ہی ایسی شادیاں کروائی ہیں ——— کتنے ہی ایسے نوجوانوں کی ہمت افزائی کی ہے جو غریب لڑکیوں سے بیاہ کرتے ہیں اور جو کم جہیز اور روپیہ مانگتے نہیں! اور اب میں وہی کچھ اپنی لڑکی کے لیے کروں ——— نہیں ——— یہ نہ ہوگا ——— میں مر جاؤں گی ——— مگر یہ شکست قبول نہ کروں گی۔" وہ بے بس ہو گیا ——— بیٹی کو تار دیا میں مجبور رہوں ——— تو خود آکر اپنی ماں سے بات کر!

اس سے آگے سوچنے کی جیسے ہمت نہ رہی ——— سلی کی تصویر کو سینے سے لگا کر وہ بلک بلک کر رونے لگے۔

وہ بستر پر لیٹی تھی، آنکھیں چھت پر گھومتے پنکھے کو گھور رہی تھیں اور سال بھر پہلے کے واقعات اس پنکھے سے زیادہ تیزی سے دماغ میں چکر کھا رہے تھے!

"ممی ——— ڈارلنگ ممی۔"

"ہاں میری بچی ———"

"ماں۔ پاپا نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے ——— میں آپ کی مشکل سمجھتی ہوں ——— مگر ماں ——— وہ بہت کم اسے ماں کہتی تھی ——— مگر جب کہتی تو کتنا پیارا لگتا تھا کہ اس کے منہ سے یہ انمول لفظ۔

"ماں ——— ممی ——— میں مانتا ——— وہ روپیہ چاہتا ہے ——— نقد روپیہ ———"

"اور تو نے یہ نہیں کہا کہ تو مجھے چاہتا ہے یا روپے کو ———"

"ماں ——— تم نہیں جانتیں ——— آجکل زندگی کا انداز کتنا بدل گیا ہے۔ ماں یہ تو عام بات ہے دلی میں، بمبئی میں، حیدرآباد میں، کشمیر میں، بنگال میں ——— ہر جگہ۔ ہر مذہب، ہر قوم کے نوجوان اپنی قیمت لگاتے ہیں۔"

"جانتی ہوں ——— مگر میں انسان خریدنے کے خلاف ہوں! مجھے غلام نہیں بیٹا چاہیے۔ جو انسان ہو۔ نوجوان ——— وہ تو اپنی عزت خاک میں ملاتے ہیں۔ وہ لڑکیوں کے قاتل ہیں۔ وہ جن لڑکیوں سے بیاہ کرتے ہیں ان کو بھی محبت نہیں دے سکتے ——— عزت نہیں کر سکتے۔ وہ صرف پیسے کے لوبھی ہوتے ہیں۔ تجھے ایک سے ایک اچھا لڑکا مل جائے گا میری بچی ——— اس کم ظرف، لالچی خود غرض کے لیے تو اپنی شخصیت مسخ کر دے گی؟ اپنی ماں کو ذلیل کرے گی۔ اس کے عمر بھر کے اصولوں کو خاک میں ملا دے گی۔ کیا اسی لیے ہم نے تجھے اتنا بڑا کیا تھا؟"

ماں رونے پر آمادہ ہو رہی تھی!

سلی کے ہونٹ کانپنے لگے ——— "ماں۔ تمہیں ——— تم ——— ماں ——— میں بہت دور نکل آئی ہوں ——— اب واپس نہیں جا سکتی ———"

ماں کا چہرہ سفید پڑ گیا ——— "سلی۔ تو کیا کہہ رہی ہے ——— کیا تو نے میرے اعتماد کو ٹھیس نہیں لگائی ——— کیا ——— تو ——— کیا تو ———" وہ جملہ پورا نہ کر سکی!

"نہیں ماں ——— میں نے تمہاری عزت اب تک بچائی ہے مگر میں ممی کو اتنا جانتی ہوں کہ اب ——— کہ اب کسی اور کو وہ مقام

نہیں دے سکوں گی ـــــ ممکن ـــــ"

ماں چپ رہی۔

"تمھیں دنیا کی لڑکیوں کا درد ہے ماں۔ اپنی بیٹی کا نہیں؟"

"ہاں سلی ـــــ تو میری کوکھ سے پیدا ہوئی ـــــ مگر مجھے ان لڑکیوں کا بھی اتنا ہی درد ہے جو ہر سال جانے کتنی اسی جہیز کی لعنت کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔"

"اور اگر تمھاری بیٹی بھی اس کی بھینٹ چڑھ گئی تو؟"

"سلی! یہ تو کیا کہہ رہی ہے۔ تو ایسی بزدل نہیں ہو سکتی تو پڑھی لکھی۔ سمجھ دار۔ اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی خود اعتمادی سے بھرپور ـــــ نہیں۔ تو مجھے ڈرانے کو کہہ رہی ہے ـــــ"

"ہاں ماں یہی بات ہے" ... "خیر تم سو جاؤ اب! میں ذرا پاپا سے مل لوں۔"

وہ بیٹی کے پیچھے پیچھے گئی اور دروازے سے جھانکنے لگی کہ باپ بیٹی میں کیا باتیں ہوتی ہیں۔

"پاپا"

"ہاں ڈیئر ـــــ تم آج ماں سے ؟"

"ہاں پاپا"

"بات ہوئی ـــــ"

"ہوگئی پاپا ـــــ"

"ماں کی وہ ؟"

"پاپا ـــــ ممی تو جہیز کی پیچھے ہیں۔ وہ کیا مانیں گی ـــــ"

"تو اب کیا ہوگا بیٹی" بے بسی سے انھوں نے کہا۔

"آپ انھیں مجبور نہیں کر سکتے پاپا؟"

"نہیں بیٹی۔ اسے کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔ مگر میں چپکے سے اپنی بس بیچ کر ـــــ تجھے روپے دے دوں گا۔ اُسے خبر بھی نہ ہوگی ـــــ"

"نہیں پاپا۔ نہیں پاپا ـــــ یہ نہ ہوگا۔ آپ زندگی بھر اصول پرست رہے ہیں۔ آپ میں اور ممی میں مثالی محبت ہے ـــــ میں ـــــ میں ہرگز یہ نہیں چاہوں گی کہ میری وجہ سے آپ دونوں کے بیچ دیوار کھڑی ہو ـــــ ممی کے دل میں آپ کی عزت کم ہو جائے!"

"تو پھر؟"

"سب ٹھیک ہو جائے گا ـــــ سب ٹھیک ہو جائے گا پاپا ڈارلنگ ـــــ"

اس نے باپ کے گال کو بوسہ دیا۔ ماں جلدی سے اپنے پلنگ پر لیٹ گئی۔ سلی نے دروازے سے جھانکا۔

"گڈ نائٹ ماں۔ گڈ نائٹ۔"

"گڈ نائٹ بیٹی" اس نے بہت پیار سے کہا۔ ... ہو رہے ہیں ... لیٹی رہی ـــــ

اگلے دن سلی اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ ابدی نیند!

سارا شہر اس کے ماں باپ کے ساتھ تھا۔ ماں باپ پاگل سے ہو گئے تھے۔ جیسے دیواروں سے سر پھوڑ رہے تھے ـــــ سارا خاندان، سارا شہر رو رہا تھا ـــــ موت اور ایسی موت ـــــ مگر وہ چپ تھی۔ سب اسے دیکھ رہے تھے۔ مگر اس کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ نکل سکا تھا ـــــ اس کی سہیلیاں، بہنیں، اس کے سٹر کی لڑکیاں، اس کی کولیگ اس کے چاروں طرف جمع تھیں سب انتظار کر رہی تھیں مگر ـــــ وہ کیا کرے ـــــ ہر طرف ایک خلا تھی ـــــ ایک ویرانی ـــــ ایک گھٹن ـــــ شدید گھٹن، اس کے سارے وجود پر چھائی ہوئی تھی۔

لوگ سمجھ رہے تھے وہ پاگل ہو جائے گی ـــــ مر جائے گی ـــــ مگر اس نے کسی کا کچھ سہارا نہ لیا تھا!

اس نے سر اٹھایا ... چاروں طرف دیکھا۔ کارنس پر سلی کے بچپن کی تصویر مسکرا رہی تھی ـــــ اس کے برابر ہی دونوں لڑکوں کی تصویریں تھیں۔ ممی کی ڈگری کا گاؤن میں اور چھوٹے بیٹے کی سوٹ میں!

"ممّی ــــ میرا پیارا بچہ" ۔ آہ! کس قدر اسے خیال ہے میرا" اس نے سوچا۔ اور اس کی ساری باتیں اس کے ذہن میں تازہ ہوگئیں، چار مہینے بھی تو نہ ہوئے تھے بسلی کو سدھارے ہوئے!

وہ دونوں بازو پہ سر رکھے ــــ میز پر جھکی ہوئی تھی۔ جو دن بیت رہے تھے۔ غم کا ساگر اور گہرا ــــ اور گہرا ہوتا جا رہا تھا ــــ ہر پل پہاڑ۔ اب تو ان کاموں میں بھی جی نہ لگتا تھا جن پر ساری زندگی بتائی تھی، آہ وہ معمولی عورت ہوتی ــــ یہ سب کچھ نہ کرتی ہوتی تو شاید اس کا دل اتنا سخت نہ ہوتا ــــ وہ اکی بیٹی کو اصول پر قربان نہ کر دیتی؟ مگر   مگر   اس نے جو کیا صحیح کیا ہے۔ ۔ طمانیت ــــ ۔ روحانی خوشی اس کے دل کو ڈھارس دے رہی تھی

"ماں" اس نے سر اٹھایا۔ ممّی سامنے کھڑا تھا۔

"ماں!"

"ہاں میرے بچے"

"ماں میرا بیاہ کر دو ــــ" وہ اس کا منہ دیکھنے لگی ــــ ابھی تو بسلی کو گزرے چار دن ہوئے ہیں اور اسے بیاہ کی پڑ گئی!

"جو جی چاہے کرو میرے لال ــــ" اس نے افسردگی سے کہا

"نہیں ــــ ماں۔ یہ کام تو تمھیں کو کرنا ہے۔ میں چاہتا ہوں گھر میں تمھاری بہو ــــ آ جائے۔ بہے ہوں تو تمھارا اور بابا کا جی بہل جائے گا!"

"مگر بیٹے۔ تم۔ تم تو انگلینڈ جا رہے تھے نا"

"نہیں ماں۔ میں کہیں نہیں جا رہا ہوں۔ تمھارے ہی پاس رہوں گا ــــ"

"کون لڑکی ہے وہ؟" ماں جانتی تھی وہ ایک لڑکی سے بہت پینگ بڑھا رہا ہے

"کوئی نہیں ماں

"مگر وہ تمھاری دوست

"ماں میں اس سے بیاہ نہیں کروں گا ــــ وہ نئے زمانے کی لڑکی ہے۔ خود غرض، دولت پرست، اصلی لڑکی ــــ وہ خاندان والوں کا خیال پسند نہیں کرتی ــــ وہ کسی ایسے لڑکے سے شادی کرے گی جو اسے یورپ اور امریکہ لے جائے ــــ وہیں رہ جائے ــــ مگر میں ــــ میں اپنے ماں باپ کو کیسے چھوڑوں گا؟"

ماں کا دل چاہا اسے کلیجے میں چھپا لے ــــ مگر کچھ بولی نہیں،

"ماں۔ تم جو لڑکی پسند کرو ــــ جیسی بھی ہو ــــ جو تمھارے دل کا خلا بھر سکے ــــ میں اسی سے بیاہ کروں گا ماں"

"مگر تیری پسند؟"

"ماں تمھاری پسند اتنی اونچی ہے کہ اس سے بہتر لڑکی میں خود تلاش نہیں کر سکوں گا"

وہ چپ ہوگئی ــــ پھر کہاں کہاں لڑکی دیکھی رہی ــــ اور پھر ایک دن اچانک جب بازو نے آ کر اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا "ماں۔ تمھارا اداس چہرہ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا ماں ــــ" تو اس کی آنکھیں برس اٹھیں اور لگا اسے لڑکی مل گئی! مگر یہ غریب ابا تھا۔ لڑکی، انجینیر صاحب ــــ اس کا ڈاکٹر بیٹا ــــ اس کو کیوں پسند کریں گے؟

ممّی نے ماں کی پسند پر صاد کیا ــــ باپ چپ رہے ــــ اور آج وہ بہو بیاہ لائی ــــ پیاری سی بہو ــــ بسلی کا بدل!

برابر کے کمرے سے دولہا دلہن کی دبی دبی ہنسی کی آواز آ رہی تھی۔ ماں کی آنکھیں چھلک اٹھیں ــــ مسرت اور غم کے ملے جلے آنسو اس کے زخم پر مرہم رکھ رہے تھے۔



افسانہ

کلیانی

سہیل عظیم آبادی

کلیانی ماں باپ کی چھاتی پر بھاری پتھر بن کر رہ گئی تھی۔ جب پیدا ہوئی تو کوئلے جیسی کالی، چپٹی ناک اور چھوٹی چھوٹی گول گول آنکھیں، ماں باپ کی طبیعت رہ گئی۔ مگر جیسے جیسے بڑھتی گئی ان دونوں کو اندازہ ہوا کہ تیز ہے۔ اور آستے محلے کی ایک عورت کے پاس پڑھنے کو بٹھا دیا گیا۔ پڑھنے میں سب لڑکیوں میں تیز تھی۔ ماں باپ نے اسے بھی غنیمت جانا اور پڑھانے لگے لیکن آٹھ برس کی تھی کہ چیچک نکل آئی۔ اچھی تو ہو گئی مگر چیچک کے داغ سے چہرہ اور کھدرا ہو گیا۔ وہ پڑھتی رہی۔ ماں باپ کبھی سوچتے تھے کہ پڑھ لکھ لے گی تو شاید کوئی اچھا بر مل جائے گا۔ مگر ان کا خیال غلط نکلا کلیانی نے بائیس سال کی عمر میں ایم۔ اے کر لیا۔ مگر کوئی بیاہ کی بات کرنے کو ٹھیکا تک نہیں رشتہ داروں میں اس کی نیکی، سگھڑپن اور عقل مندی کی تعریف ہوتی تھی۔ مگر بیاہ کی بات نہیں ہوتی تھی۔ جب کسی نے بات چلائی اور لڑکے کی رشتہ دار عورتیں اسے دیکھنے کو آئیں تو پھر جا کر کوئی بات ہی نہیں کی۔ آنکھ رہتے کوئی مکھی کیسے کھاتا۔ بدصورتی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا تھا، اس کے ماں باپ کی پریشانی بڑھتی جاتی تھی۔ کلیانی سب کچھ سمجھتی تھی مگر بے بس تھی۔ صورت کو بدل لینا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ ماں باپ کی پریشانی دیکھ کر وہ خود بھی پریشان رہتی تھی۔ کئی بار اس نے اپنی زندگی کو کسی طرح ختم کر ڈالنے کی بات سوچی لیکن ہر بار ایک دوسرے خیال نے آ کر اسے سہارا دیا۔ اپنے ہاتھوں زندگی کو ختم کر ڈالنا تو بزدلی ہے۔ بیاہ نہیں ہوگا تو کیا؟ بیاہ کیے بغیر بھی وہ زندہ رہ سکتی ہے، اپنے ماں باپ، رشتہ داروں اور دوسروں کو آرام پہنچا سکتی ہے، فائدہ پہنچا سکتی ہے اور زندگی کا سکون حاصل ہو سکتا ہے۔ دن رات کی الجھنوں نے اسے زیادہ پڑھنے اور زیادہ سوچنے کا عادی بنا دیا تھا لیکن اس کی زندگی میں کوئی فرق نہیں آ رہا تھا۔

ماں باپ کی بڑی کوششوں سے کلیانی کے بیاہ کی بات ایک جگہ چلی۔ شیام لال ایک مڈل اسکول میں ماسٹر تھا۔ اس کی دو بیویاں مر چکی تھیں، اور تین بچے تھے۔ عمر چالیس سال سے زیادہ تھی ماں باپ خوش تھے۔ ان کو یقین تھا کہ بات پکی ہو جائے گی اور کلیانی کو سر چھپانے کے لیے چھپر کا سایہ مل جائے گا۔ اور شیام لال کی بہن اسے دیکھنے آئی کلیانی کو دیکھتے ہی اٹھ کر چلی گئی۔

بات ختم ہو گئی لیکن کلیانی پر اس کا اثر کچھ اور ہوا۔ وہ اچانک بالکل بدل گئی۔ ماں سے اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اب وہ بیاہ کرے گی ہی نہیں۔ وہ ایسے لوگوں سے کوئی لگاؤ رکھنا نہیں چاہتی جو چہرے کو دیکھتے ہیں، گنوں کو نہیں دیکھتے ماں نے اس کی بات سن کر سر پیٹ لیا۔ اور باپ سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ جلے پر نمک کا چھڑکاؤ تھا۔ پہلے تو لوگ اس کی صورت کی برائی کرتے تھے۔ اب اس کی بات سنیں گے تو نہ جانے کیا کیا کہیں گے۔ ماں نے سمجھانے کی کوشش کی۔ مگر کلیانی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس نے کہہ دیا کہ اگر پھر بیاہ کی بات چلی اور کوئی عورت اسے دیکھنے آئی تو اسے گھر سے نکال دے گی۔ یا خود کہیں چلی جائے گی — ماں باپ سوچتے رہ گئے۔ اگر بیاہ نہیں کرے گی تو دنیا کیا کہے گی۔ مگر کر بھی

کیا سکتے تھے۔ اتنے روپے بھی نہیں تھے کہ اس کے لیے ایک پتی خرید لیتے

کلیانی نے اپنی زندگی بدل ڈالی۔ وہ کمزور سی لڑکی کی طرح گھر کے اندر سمٹی سمٹائی نہیں رہی۔ نہا دھو کر کپڑے بدلے اور محلے میں گھوم کر کئی غریب بچیوں کو اُن کے ماں باپ سے کہہ کر لے آئی۔ ان کو پڑھانا شروع کر دیا۔ ماں باپ کو اس کا یہ کام اچھا نہیں لگا۔ ماں باپ نے اسے سمجھانا چاہا۔ مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر اسے بچیوں کو پڑھانے سے منع کیا گیا تو گھر چھوڑ کر کہیں اور چلی جائے گی۔ ماں باپ اس کی باتیں سُن کر چپ ہو گئے۔

غریب بچیوں کو پڑھانے میں اس کا جی لگ گیا اور وہ خود کو بھولنے لگی۔ مگر پھر قدم قدم پر نئی پریشانیاں۔ بچیوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی۔ جگہ کم تھی۔ بچے بہت تھے۔ نہ کتاب نہ کاغذ اور نہ دوسرا کوئی پڑھانے والا۔ کلیانی زیادہ بچیوں کے پڑھانے کا انتظام نہیں کر سکتی تھی اور کڑھتی رہتی تھی۔ ماں باپ میں مدد کرنے کی صلاحیت نہیں تھی اور کوئی دوسرا مددگار نہیں تھا۔ سوچتے سوچتے اس نے ایک دن ہمت کر کے ایک قدم اور بڑھایا اور شہر کے مشہور وکیل کیدار بابو کے یہاں پہنچ گئی۔ کیدار بابو ایسے کاموں میں مدد کرتے تھے۔ اُن کی پتنی دس سال پہلے مر چکی تھی۔ ایک بیٹا تھا وہ انگلینڈ میں بیرسٹری پڑھ رہا تھا۔ اپنی پتنی سے انھیں اتنی محبت تھی کہ اس کے مرنے کے بعد انھوں نے دوسری شادی کا کبھی خیال تک نہیں کیا۔ حالانکہ جب وہ مری تھی تو کیدار بابو کی عمر پینتیس سال سے زیادہ نہ تھی۔ کیدار بابو نے کلیانی کو دیکھتے ہی کہا۔

"جلدی بتاؤ کیا کام ہے؟"

کلیانی نے انھیں بتایا کہ وہ کیوں آئی ہے۔ کیدار بابو نے پھر کوئی سوال نہیں کیا۔ دراز میں سے سو روپے نکال کر اُس کے سامنے رکھ دیے۔

کام کرنے سے کلیانی میں نئی ہمت پیدا ہو گئی تھی۔ اس نے روپیوں کو چھوا تک نہیں۔ اور بولی۔

"مجھے اپنے کام کے لیے روپیوں کی ضرورت قدم قدم پر ہے۔ لیکن میں آپ سے روپے صرف اس شرط پر لوں گی کہ آپ میرا اسکول آ کر دیکھیں۔ اور۔۔۔"

کیدار بابو بولے

"اسکول تو دیکھنا کیا ضروری ہے۔"

کلیانی بولی۔

"آپ کو کیا معلوم کہ میں سچ بول رہی ہوں یا جھوٹ۔ دوسری بات یہ ہے کہ میں آپ سے زیادہ مدد چاہتی ہوں۔ اسکول کو بڑا بنانا چاہتی ہوں۔"

کیدار بابو نے کلیانی کو غور سے دیکھا۔ اس کالی کلوٹی لڑکی میں کتنی خود اعتمادی تھی۔ کیدار بابو نے کہا

"یہ روپے لے لو۔ پھر کبھی آنا۔"

کلیانی نے روپے نہیں اٹھائے اور بولی

"میں چاہتی ہوں کہ اسکول بڑا بن جائے جہاں زیادہ لڑکیاں پڑھ سکیں۔"

کیدار بابو کچھ سوچنے لگے۔ کلیانی بولی

"اگر آپ کو اعتراض نہ ہو۔ تو اسکول کا نام آپ کی پتنی کے نام پر آشا دیوی اسکول رکھ دوں۔"

کیدار بابو کی رگوں میں جیسے برف جمنے لگی۔ وہ کلیانی کو دیکھتے رہ گئے۔ اس نے ان کی دُکھتی نس پر انگلی رکھ دی تھی۔ بہت دنوں سے ان کے دماغ میں ایک بات چلی آ رہی تھی۔ آشا دیوی کی کوئی یادگار قائم کریں۔ کلیانی یہ کام کرنے کو تیار تھی۔ کیدار بابو نے اس سے بہت سی باتیں پوچھیں اور جب انھیں معلوم ہو گیا کہ کلیانی نے ایم۔ اے کیا ہے اور اندازہ ہو گیا کہ اسے کام کرنے کا شوق ہے تو بولے:

"میں تمھاری آخری حد تک مدد کروں گا۔"

کلیانی نے دیکھا کہ اُن کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی تھی اور آواز رُندھ گئی تھی کلیانی پر اس کا بڑا اثر ہوا اور وہ بولی:

"آپ میری مدد کریں گے تو مجھے امید ہے میں اسے اچھا اسکول بنا لوں گی۔"

کیدار بابو نے چار سو روپے اور نکال کر دیے اور بولے

"تم کام کرو۔ میں تمھارا اسکول دیکھوں گا۔ تمھاری مدد ہر طرح کروں گا۔"

کلیانی نے روپے لے کر ٹوکرے میں رکھ لیے اور کرسی چھوڑ کر کھڑی ہو گئی اور بولی

"آپ کو اسکول دکھانے کے لیے کس دن انتظار کروں —"

کیدار بابو کو جیسے جلدی تھی جیسے وہ خود بھی جانا چاہتے تھے۔ بولے

"آج شام کو —"

کلیانی نے پاؤں چھو کر اُن کو سلام کیا اور چلی آئی۔

کیدار بابو نے اسکول دیکھا۔ جگہ کی بڑی کمی تھی۔ بچیاں زیادہ تھیں۔ ٹیچر کم — دوسرا کوئی پڑھانے والا بھی نہ تھا۔ انھوں نے کلیانی کے باپ سے کلیانی کی بڑی تعریف کی اور اس کی ہمت بڑھائی۔ اسکول کے لیے اپنا ایک مکان بھی دے دیا۔

آشا دیوی اسکول ہر روز ترقی کرنے لگا۔ کئی پڑھانے والی استانیاں آگئیں اور بچیوں کی تعداد بڑھنے لگی۔ کیدار بابو اور کلیانی نے طے کیا کہ اسکول لڑکیوں کا ہوگا۔ صرف چھوٹے بچے داخل کر لیے جائیں گے۔

جب اسکول ترقی کرنے لگا تو بہت سے لوگ کلیانی کے مخالف بھی پیدا ہو گئے اور طرح طرح کی باتیں اس کے بارے میں کہی جانے لگیں۔ کچھ لوگوں نے کیدار بابو کے بارے میں بھی جو جی میں آیا کہہ دیا۔ ایسے لوگوں کی زبان پر کون تالا لگا سکتا ہے۔ لیکن کیدار بابو کو اس کا رنج ہوا۔ ایک شریف لڑکی جو حالات کا مقابلہ کر کے اپنے لیے زندگی کی نئی راہ تلاش کر سکتی ہے اُس کے بارے میں ایسی باتیں کہنا — اور خود ان کے بارے میں — حالانکہ وہ اپنی مری بیٹی کا نام زندہ رکھنے کے لیے سب کچھ کر رہے تھے۔

آخر کیدار بابو نے سوچ کر ایک راہ نکالی۔ اسکول کے سلسلے میں بڑا جلسہ کیا۔ شہر کے سارے بڑے بڑے آدمیوں کو بلایا۔ اسکول کے بارے میں اپنے ارادے بتائے اور انھوں نے کہا کہ اس کام میں ان کی مدد اُن کی بیٹی کلیانی کر رہی ہے۔ وہ سچ مچ کلیانی کو بیٹی کی طرح ماننے لگے تھے۔ وہ وہی کام کر رہی تھی جو کیدار بابو بہت دنوں سے کرنا چاہتے تھے۔

کلیانی بہت خوش تھی۔ وہ جو کچھ چاہتی تھی اس کی خواہش کے مطابق ہو رہا تھا۔ کیدار بابو نے دل کھول کر کلیانی کی مدد کی اور کلیانی نے دوڑ دھوپ کر اسکول کو دو سال میں اتنا بڑھا لیا کہ مڈل بنانے کی بات ہونے لگی اور کلیانی کی تعریف ہونے لگی۔ لیکن جلنے والے ابھی جگہ پر تھے۔ وہ طرح طرح کی باتیں کرتے تھے جو منھ میں آتا تھا کہتے تھے۔ بعضوں نے اس کی دیکھا دیکھی نئے اسکول بھی بنا ڈالے۔ لیکن ان باتوں کا اثر کلیانی پر کچھ نہیں ہوا۔ اس کی مخالفت جتنی بڑھتی جاتی تھی۔ اتنی ہی اس کی خود اعتمادی بڑھتی جاتی تھی۔ اب وہ اپنی زندگی سے مطمئن تھی۔ اس نے اپنے طور پر فیصلہ کر لیا تھا کہ ساری زندگی آشا دیوی اسکول کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے اور لڑکیوں کی زندگی سُدھارنے میں ختم کر دے گی۔ اب اُسے کوئی فکر نہیں تھی۔ کبھی کوئی دوسرا خیال اس کے دل میں پیدا نہیں ہوتا تھا۔

ایک دن کیدار بابو نے اُسے خبر دی کہ اُن کا لڑکا سنیل لندن سے بیرسٹر ہو کر واپس آ رہا ہے۔ وہ اُس دن بہت خوش تھے۔ انھوں نے سو روپے دیے کہ مٹھائی اسکول میں تقسیم کی جائے اور ہنستے ہوئے بولے

"سنیل آ جائے گا تو تم کو اور مدد ملے گی۔ تم کام کرتی جاؤ۔ ہائی اسکول تک میں اسے اپنی زندگی میں پہنچا ہی دوں گا۔ اس کے بعد سنیل کی ذمہ داری ہوگی کہ ماں کے نام پر کالج بنائے اور کیدار بابو نے ایسے جذباتی انداز میں یہ بات کہی کہ کلیانی جیسے خوابوں کی دنیا میں کھو گئی۔ آشا دیوی اسکول جو ابھی مڈل اسکول بھی نہیں تھا بڑھ کر ہائی اسکول بن جائے گا — اور آشا دیوی لڑکیوں کا کالج بھی بن جائے گا — اس نے جو پودا لگایا ہے وہ ایک دن تناور درخت بن جائے گا۔ اس کی زندگی کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ زندگی کا مقصد آخر کیا ہے۔ سدھار۔ زندگی تو سبھی گزار لیتے ہیں کوئی کام انسان کر جائے اور اس کا نام رہ جائے یہی زندگی ہے۔ آشا دیوی کے نام کے ساتھ اس کا نام بھی زندہ ہو جائے گا۔

اور وہ سوچنے لگی ـــــ سنیل کیسا ہوگا۔ خوبصورت تو ضرور ہوگا ـــــ کیدار بابو اس عمر میں بھی خوبصورت آدمی ہیں۔ آشا دیوی خوبصورت تھیں۔ سنیل ضرور خوبصورت ہوگا۔ یکایک اسے اپنی بدصورتی کا خیال آیا اور وہ مرجھا گئی۔ لیکن پھر وہ سنبھل گئی۔ اسے خوبصورتی سے کیا لینا دینا ہے۔ اسے بیاہ نہیں کرنا ہے۔ اسے اس کی پروا نہیں کہ کوئی مرد اسے قبول نہیں کرے گا۔ اب وہ شادی کرنے کے لیے خود بھی تیار نہیں تھی۔ اگر کوئی کرنا چاہتا تو انکار کر دیتی۔ اب وہ اپنی زندگی کے دوسرے سہانے خواب دیکھا کرتی تھی اور محسوس کرتی تھی کہ وہ عام عورتوں سے بہت بلند ہے جو اپنے لیے زندہ رہتیں اور اسنے لیے مرتی ہیں۔ اب اس کا اپنا کچھ بھی نہیں رہ گیا تھا۔ اپنا غم بھی نہیں اپنی خوشی بھی نہیں۔

کبھی کبھی اسی قسم کے خیالوں میں وہ کھو جاتی تھی اور جب خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ جاتا تھا تو خود اپنے اوپر اسے غصہ آتا تھا۔ وہ اپنے کو غلط نہ سمجھ لے۔ اسے تجربوں نے بتا دیا تھا کہ جو لوگ غلط اندازہ کرتے ہیں وہ راستہ بھول جاتے ہیں اور بھٹکتے رہتے ہیں۔ اور وہ جو راستہ ڈھونڈھ چکی تھی اسے بھلانا نہیں چاہتی تھی۔

سنیل بیرسٹر ہوکر آگیا۔ کیدار بابو نے خوشی میں بڑی دعوت کی۔ دوستوں نے انہیں دل کھول کر مبارکباد دی۔ دوسرے دن وہ اسکول دیکھنے آیا اور کلیانی اسے دیکھ کر اچانک پریشان ہوگئی۔ سنیل بہت خوبصورت جوان تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں اور کتاب دیکھنے لگی ـــ سنیل کتنا خوبصورت اور وہ کتنی بدصورت ـــ اس نے سوچا بہت سی لڑکیاں دل سے چاہیں گی کہ اس سے اُن کا بیاہ ہوجائے اور ایک وہ تھی، کوئی بھی اس سے بیاہ کرنا نہیں چاہتا۔

اچانک اُس میں ایک نیا اعتماد جاگ اُٹھا۔ اُسے وہ کرنا ہے جو سنیل نہیں کرسکتا۔ کیدار بابو نے اسے بیٹی کہا ہے اور وہ آشا دیوی کا نام زندہ کر دینے کا وعدہ کرچکی ہے۔ سنیل دیر تک اسکول میں رہا۔ سب سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا رہا۔ اس سے بھی ـــــ اور اسکول سے چلا گیا۔

اب کیدار بابو کو ایک فکر تھی اور وہ یہ کہ سنیل کا بیاہ ہوجائے۔ اور وہ وکالت شروع کردے۔ لیکن سنیل کو کوئی جلدی نہ تھی۔ وہ کچھ دن یوں ہی وقت گزارنا چاہتا تھا۔ شادی اور وکالت ـــــ ساری زندگی کا ساتھ رہے گا۔

کیدار بابو کے یہاں بہت سی جگہوں سے سنیل کے لیے باتیں آرہی تھیں۔ ایک سے ایک خوبصورت اور پڑھی لکھی لڑکیوں کی تصویریں خاندان کے حالات۔ اور کیدار بابو کو فیصلہ کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ لیکن آخر انھوں نے فیصلہ کر ہی لیا۔ امرناتھ وکیل کی لڑکی سمترا ان کو بھی پسند آئی اور سنیل کو بھی۔ اور بات پکی ہوگئی۔

لیکن ایک دن اچانک جیسے دنیا بدل گئی۔ سنیل موٹر چلاتا آرہا تھا سخت حادثہ پیش آیا۔ اسے شدید چوٹ لگی۔ بہت سے گہرے زخم آئے۔ مہینوں اسپتال میں پڑا رہا۔ اور جب اسپتال سے اچھا ہوکر آیا تو اس کی آنکھوں کی روشنی جا چکی تھی۔ وہ اندھا تھا۔

کیدار بابو کی دنیا ہی بدل گئی۔ بیوی مر چکی تھی۔ بیٹا اندھا ہوگیا تھا۔ وہ غم سے نڈھال ہوگئے اور تھوڑے ہی دنوں میں بوڑھے نظر آنے لگے۔ کلیانی کے لیے یہ بڑا غم تھا ـــ کیدار بابو کا غم ـــ اس کا غم بن گیا تھا۔ اسکول کے بعد وہ گھنٹوں کیدار بابو کے پاس بیٹھتی اور ان کا غم کم کرنے کی کوشش کرتی۔ گھنٹوں سنیل کے پاس بیٹھتی اور اس کا جی بہلاتی۔ اندھا ہوجانے کے بعد اُسے زیادہ سے زیادہ ہمدردی کی ضرورت تھی، ایک ایسے آدمی کی ضرورت تھی، جس کی آنکھیں اس کی مدد کرسکیں۔ یعنی اس کا بیاہ ہوجائے کوئی اچھی سی لڑکی سے جو سنیل کو زیادہ سے زیادہ آرام پہنچا سکے۔ لیکن سنیل اندھا ہوچکا تھا۔ چودھری امرناتھ کی لڑکی سمترا سے بات پکی ہوکر ختم ہوچکی تھی۔ اور کیدار بابو کو فکر تھی کہ جلد سے جلد سنیل کا بیاہ کردیں۔ اس کا اکیلا پن ختم ہوجائے۔ وہ دوسروں کی ہمدردی کا محتاج نہ رہے۔ اس کی پتنی اس کی دیکھ بھال کرے۔ لیکن بات بن نہیں رہی تھی۔ جو لڑکیاں اُن کو پسند آتی تھیں ان کے ماں باپ اندھے سے بیاہ کرنے پر رضامند نہیں ہوتے تھے اور جن لڑکیوں کے ماں

(باقی صفحہ ۸۸ پر)

افسانہ

رشتے

مسیح الحسن رضوی

زبیدہ سنگار میز آئینے کے سامنے کھڑی ہوئی وہ مسکرا کر رہ گئی
گورا چہرہ ستواں ناک اور ناک کے نتھنوں کے نیچے وہ گلاب کی پتیاں۔
"ہونٹ اس کے تو ہیں گلاب کی پتیوں جیسے ملائم اور رنگین" اور پھر
اس کی نظریں گلاب کی پتیوں سے ہٹ کر اپنے سڈول [illegible] جسم [illegible] شباب
کی رعنائیاں سمجھا رہی ہوتی ہیں۔ لیکن آدمی سے ایک موہوم [illegible]
ایک مبہم اور لایعنی سے سہارے پر [illegible] جا رہے ہیں۔ ایک [illegible]
ادھیڑ عمر کے اعلیٰ سرکاری افسر کے لیے، والدین نے کتنی حفاظت سے
پرورش کی تھی۔ معاذاللہ!!

دو روٹھا ہوا تو کی چیخ گونج گئی۔ کیا برا سگون۔ لیکن سگون تو اسی
دن برا ہو چکا تھا جس دن بلال کو اس کے گھر سے ہمیشہ کے لیے رخصت
کر دیا گیا تھا کیوں۔ نہ جانے کیوں اس نے سوچا۔ بلال اس کا چچیرا
بھائی اس وسیع و عریض دنیا میں بے سہارا چھوڑ دیا گیا ہے۔ چچا نے
صرف محبت کی سزا دی [illegible] دھکے دے کر اسے گھر سے نکلوا دیا۔ آہ
بے چارہ بلال۔ لیکن خطا کس کی تھی اس کی؟ نہیں بلال کی؟ نہ نہ
بے چارہ بلال تو [illegible]

پھر یہ خطا کس کی تھی؟ والدین کی جنھوں نے بلال کو صرف
اس امید پر گھر میں رکھا تھا کہ پڑھ لکھ کر کم از کم چار سو کا نوکر ہو جائے
گا اور پھر اس کو بیاہ کر لے جائے گا۔ کہاں بیاہ کر لے جائے گا؟ یہ کہو
کہ زبیدہ خود اس کو بیاہ کر اپنے گھر رکھ لے گی۔ لیکن اب تو وہ جا چکا
تھا۔ ہمیشہ کے لیے۔

اور یہ اس کا نیا دولہا جو منگیتر جس نے ابھی جوانی میں آنکھیں پھوڑ پھوڑ کر

مقابلے کے امتحان کی تیاری کی تھی [illegible] کتابوں کی جلد پڑھائے
دن رات کتابوں پر جھکا رہا۔ [illegible] دماغ لیا، مقدس کاموں مطالعہ
کیا [illegible] ایک [illegible] جو ہوا سے حرکت [illegible] ہو [illegible]
[illegible] وہ بھی تھی۔ اس میں [illegible] سب کچھ ہیں دولت
[illegible] اور اس [illegible] پورا اتر رہا تھا۔

[illegible] زبیدہ کی خوش قسمتی ہی کیا [illegible] جوانی [illegible]
[illegible] ملبوس [illegible] ہوا کرے گی کلبوں میں جا کر ہلکے ہلکے
قہقہے [illegible] کی [illegible] کرے گی [illegible] کے [illegible]
[illegible] آیا جایا کرے گی۔

"کون ہے [illegible] ہوا اپنے سکریٹری سے سرگوشی
کرے گا۔

[illegible] علی

"او بہت خوب، [illegible] سیٹھ لیپے سکریٹری سے کہے گا
[illegible] کرتے ہوئے ہال کی دوسری طرف کچھ نوجوان
اور سیٹھوں کے [illegible] آپس میں سرگوشیاں کرتے ہوں گے
"او گاڈ او رام [illegible] آصف کی [illegible] بھگوان، اے
رب میرے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت کے فن کار نے
عورت کے حسن سکر کو ارغوانی شراب میں حل کر دیا ہے۔"
"دیکھو وہ ادھر ہی آ رہی ہے، خاموش۔"
اور پھر زبیدہ ان منچلے نوجوانوں کے درمیان سے گذرتی
اپنی مخصوص [illegible] کرتا شیمپین کا ایک گلاس نوش جان کرے گی۔

اور اس کے بعد کسی کے مضبوط ہاتھوں کو اپنی نازک کمر پہ محسوس کر کے رقص کرنے لگے گی۔

ادھر ایک بم گولا اسی ہوا چلی کہ دفتر کی افسر اور برھو سمجھے، اور ادھر والے اور ادھر اور معلوم نہیں کہ کیا ہوا کہ میاں آصف ڈپٹی کلکٹری کے مستحق قرار پا گئے۔ ربیدہ نے جب اس خبر کو اخبار میں دیکھا تو وہ تقریباً چیخ پڑی "امی ——" پھر وہ عالماً بیہوش ہو گئی۔ ملال نے اسے بھوت بن کر ڈرا دیا۔

جب اسے ہوش آیا تو اس نے اپنے کو ایک مسہری پر پڑا پایا۔ آصف سرہانے کھڑا تھا۔ جانے کہاں سے ٹپک پڑا تھا۔ وہی اداس چہرہ، وہی آنکھیں، اور جھکے سیاہی دوڑتے ہونٹ۔ لیکن اتنی آج واقعی سولہ سنگار کیے تھیں۔ سفید جارجٹ کی ساری حسن پر پڑے کھول کر چڑھتے ہوئے تھے، رس جسم تھی لپ اسٹک کی دھڑی ہونٹوں پر، اور سر کی جھریوں میں پاؤڈر کا پلستر۔ شادی کس کی ہو رہی تھی؟ ربیدہ کے دماغ میں یہ سوال پھسلتا چلا گیا۔ اور وہ ہلکے سے مسکرا دی آصف کا بے ہنگم قہقہہ فضا کو چیرتا ہوا گم ہو گیا۔ اور ربیدہ نے سوچا کہ کبا دن میں بھی الو بول سکتا ہے۔

شام کو آصف کے اعزاز میں ڈنر دیا جانا طے پایا۔ شہر بھر کے نے فکرے آنا فاناً جمع ہو گئے۔ کالے کالے ڈنر سوٹ اور زرد پیلی اور سبز کرنوں کے تانے بانے سے بنی ہوئی ساریاں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ارکے سیاہ و سفید ٹکڑے رس رچا کر اور رنگ داروں کے جلوس میں محو خرام ہیں۔

ربیدہ اوپر سے نیچے آ رہی تھی اور آصف اوپر جا رہا تھا۔ اس نے اسے گنجے سر پر وگ لگا رکھی تھی۔ اور اس کی عمر دس سال کم ہو گئی تھی۔ دونوں کی سیڑھیوں پر مڈبھیڑ ہو گئی۔ ربیدہ کے بیگم کی کنواری خوشبو شبنم آلود گلاب کی پتیوں جیسے ہونٹ اور سینے کی رقصاں سانس۔ آصف راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔

"ڈارلنگ ——"

"ڈیئر" ربیدہ کے منہ سے عالمِ بے اختیاری میں نکلا۔ اسے معلوم ہوا جیسے آسمان سے شہابِ ثاقب ٹوٹ کر اس کے دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا جا رہا ہے۔

"شادی ——؟"

"اور بہت جلد غالباً اگلے ماہ" ربیدہ نے ہنستے ہوئے کہا اپنے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔ اسے احساس ہوا جیسے اس کی کوفت اور اذیت پر بہت جلد شادی کا غلاف

چڑھ رہا ہے اور اس طرح آہستہ آہستہ پھیلتا جا رہا ہے جیسے پہلی تاریخ کا چاند۔

اس کے دوسرے دن اسے بلال کا خط ملا۔

ربیدہ احمد آباد آ کر مجھے ایک نوکری مل گئی ہے۔ اگر محنت سے کام کیا تو ترقی کا بھی وعدہ ہے۔ فی الحال دو سو روپے مل رہے ہیں۔ تمہارا 'مرغ بادنما' ایک دم ککڑوں کوں ڈپٹی کمشنر ہو گیا۔ کہو کب تک شادی کا ارادہ ہے؟ مبارک!!

"مرغ بادنما۔ ککڑوں کوں"۔ ربیدہ نے خط کے پرزے پرزے کرتے ہوئے کہا ایک ڈپٹی کلکٹر کی اتنی بڑی بے عزتی۔ اس نے خط کے پرزے کھڑکی کی راہ باہر پھینک دیے جو ہوا میں لہرانے ایک دوسرے سے جدا ہو کر کولتار کی سڑک پر بکھر گئے۔ ربیدہ نے اطمینان کی سانس لی گہری اور لمبی۔ وہ بلال کے خیال کو یکلخت اپنے دل سے نکال دینا چاہتی تھی۔ کمبخت آدمی جب تک یہاں رہا پریشان کرتا رہا۔ اور اب وہاں سے تیر اندازی کر رہا ہے۔ اس کی خوبصورت آنکھوں کے گوشوں میں پانی جمع ہو گیا۔ کیا وہ رو رہی ہے۔ نہیں اس کے دشمن روئیں اس نے آنکھیں صاف کرتے ہوئے سوچا۔

برابر کی کوٹھی سے ایک سہانی آواز چلی آ رہی تھی ؎

ہوئے تم دوست جس کے، ہوئے تم

ربیدہ اس خوش نصیب جوڑے کو اچھی طرح جانتی تھی۔ چھ ماہ ہوئے یہ میاں بیوی دلی سے تبدیل ہو کر برابر والی کوٹھی میں آ کر رہے تھے۔ کیا یہ دونوں ہی زندگی سے خوش نہیں ہیں؟ اگر یہ بدنصیب ہیں تو اس قدر خوش کیوں ہیں؟ لیکن آواز تھی کہ برابر چلی آ رہی تھی۔ ربیدہ اٹھی کھڑکی سے جھانکا عورت ریڈیو گرام کے کان اینٹھ رہی تھی۔ اور اس کا شوہر اس کے شانوں پر ہاتھ رکھے کھڑا مسکرا رہا ہے۔ کھٹ کھٹاک، ایک دھڑاکے سے اس نے کھڑکی بند کی اور آ کر صوفہ میں دھنس گئی۔ تھوڑی دیر بعد موٹر سائیکل کی پھٹ پھٹ سنائی دی۔ سامنے میاں بیوی کلب جا رہے تھے۔

اچانک شادی سے دو روز پہلے بلال آ دھمکا۔ ربیدہ کے چچا نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں جسم کی پوری قوت جمع کرتے ہوئے اسے گھورا۔ اس کے باپ نے اپنی چھوٹی مونچھوں پر تھوک اڑاتے ہوئے اس کی غیر متوقع آمد پر نوکری کی آڑ لے کر خوب لتاڑا۔ لیکن اس نے خاموشی

سے سب کچھ برداشت کرلیا۔ وہ زبیدہ سے آخری بار ملنا چاہتا تھا۔ اور اس کی خاطر اتنا لمبا سفر کرکے آیا تھا۔ آخر شام کو بلال کو زبیدہ سے بات کرنے کا موقع مل ہی گیا۔ دور سرو کے درختوں سے پرے سورج غروب ہو رہا تھا۔ زبیدہ اپنی کوٹھی کے وسیع چمن میں انگوروں کی بیل کے پاس کھڑی ہوئی ہوئے سورج کو دیکھ رہی تھی۔ شفق کی سرخی کو دیکھ کر اسے جانے کیوں بلال کے قلب کی سرخی یاد آرہی تھی۔

"بہن زبیدہ۔" اس کے کانوں میں ایک لرزتی ہوئی صدا گونج گئی۔

"بلال تم جاؤ خدا کے واسطے میری آنکھوں کے سامنے سے ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو جاؤ۔"

بلال نے ایک مست قہقہہ لگایا۔

"تم رو رہی ہو۔۔۔۔۔"

"زبیدہ یاد ہے" اس نے بمشکل اپنی ہنسی روکتے ہوئے کہا "یاد ہے میں نے کہا تھا کہ تمہارا جسم ریشم کا کپڑا ہے جس سے صرف ریشم ہی تیار کیا جا سکتا ہے۔"

"آہ یاد ہے۔ سب کچھ یاد ہے لیکن خدا کے واسطے تم چلے جاؤ، جاؤ نہیں جائے۔"

"ہاں جا رہا ہوں، لیکن یہ میرا تحفہ" بلال نے ایک سنہرا لاکٹ جیب سے نکالتے ہوئے کہا "قبول کرلو۔ اپنے بھائی کی نشانی۔" زبیدہ کو چکر آگیا۔ اس نے بلال کا سہارا لیا اور پھر اسے کو سنبھالتی ہوئی بغیر کچھ کہے تیسے اندر چلی گئی۔ اور بلال اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ وہ بہت ہی خاموشی سے اسی دن احمد آباد لوٹ گیا۔ وہ زبیدہ سے یہ بھی نہ کہہ سکا کہ وہ اپنے شوہر کی سرکار میں سفارش کرکے اسے کوئی چھوٹی موٹی سی آسامی دلانے کی کوشش کردے۔ ★

کلیانی (صفحہ ۸۵ کا بقیہ)

باپ رضامند ہوتے تھے وہ لڑکیاں انھیں پسند نہیں آتی تھیں۔

کیدار بابو کے سامنے صرف ایک بات تھی۔ ایسی لڑکی سے سنیل کا بیاہ کریں جو اسے زیادہ سے زیادہ آرام پہنچا سکے۔ جو خود کو بھول کر سنیل کے آرام کا خیال کرے۔ اور ایسی لڑکی انھیں نہیں مل رہی تھی۔

کیدار بابو بہت پریشان تھے۔ سنیل اندھا ہو گیا تھا۔ ان کی دنیا اندھیری ہو گئی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں۔ کلیانی کی ہمدردیاں زیادہ بڑھتی جارہی تھیں۔ اسکول کے بعد اس کا زیادہ وقت کیدار بابو یا سنیل کے پاس گزرتا تھا۔ کیدار بابو ہر بات میں اس سے مشورہ لینے لگے تھے۔ کلیانی سے بڑا ہمدرد انھیں کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ کلیانی خود بھی سنیل کے لیے کوئی اچھی لڑکی تلاش کر رہی تھی۔ ایسی لڑکی جسے اپنے سے زیادہ سنیل کی فکر ہو۔ لیکن کوئی مل نہیں رہی تھی۔ وہ خود بھی چاہتی تھی کہ سنیل کا جلد سے جلد بیاہ ہو جائے تو کیدار بابو کی فکر دور ہو۔ اور سنیل کے بچوں سے اپنا دل بہلائیں۔

ایک دن کیدار بابو نے کلیانی سے ایک لڑکی کے بارے میں پوچھا۔ کلیانی اسے جانتی تھی۔ اچھی لڑکی تھی۔ اچھی بھلی صورت نیک اور سمجھ دار۔ اس نے کیدار بابو سے کہا کہ اس سے اچھی لڑکی اسے نظر نہیں آتی۔ غریب ماں باپ کی بیٹی تھی۔ سنیل کو خوش اور آرام سے رکھ سکے گی۔ اور کیدار بابو نے طے کرلیا کہ ہاں کہہ دیں گے اور جلد ہی بیاہ کا انتظام کرلیں گے۔

شام کے وقت کلیانی اسکول ختم کرکے سنیل کے پاس چلی گئی۔ اب وہ اس گھر کی ایک فرد تھی۔ کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ کوئی تکلف نہیں تھا نوکر نے چائے کی ٹرے لاکر رکھ دیا۔ کلیانی نے چائے بنا کر سنیل کو دی اور خوش ہو کر بولی۔

"سنیل بابو! مبارکباد ۔۔۔ آپ کا بیاہ ہونے والا ہے۔ ریکھا بہت خوب صورت اور اچھی لڑکی ہے ۔۔۔"

سنیل کے ہاتھ سے چائے کی پیالی چھوٹ کر گر گئی۔ کلیانی نے اسے سنبھالنے کی کوشش کی۔ تو سنیل نے کلیانی کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے اور بولا۔

"کلیانی ۔۔۔ مجھے مت چھوڑو۔ مجھے دوسرے کے حوالے مت کرو۔ میں کسی دوسری لڑکی سے بیاہ نہیں کروں گا۔ تم سے اچھی کوئی لڑکی نہیں ہو سکتی۔ تم سے خوبصورت کوئی لڑکی نہیں ہو سکتی ۔۔۔ تم کلیانی ہو۔ تم ہی میرا کلیان کر سکتی ہو ۔۔۔"

کلیانی کا سر چکرانے لگا اور وہ خود کو سنبھال نہیں سکی۔ کرسی سے نیچے گر پڑی۔ ★



شری ایچ۔ پی۔ مودی
(۲ مئی ۱۹۴۹ء تا یکم جون ۱۹۵۲ء)



شریمتی سروجنی نائیڈو
(۱۵ اگست ۱۹۴۷ء تا مارچ ۱۹۴۹ء)

آزادی کے بعد اتر پردیش کے گورنران

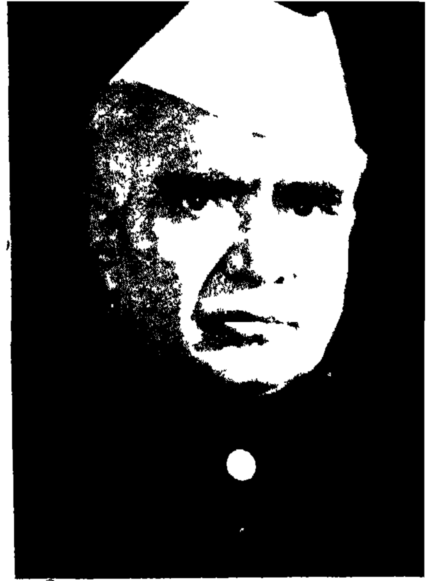
۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۲ء

شری وی۔ وی۔ گری
(۱ جون ۱۹۵۷ء تا ۳ جون ۱۹۶۰ء)

شری کے۔ ایم۔ منشی
(۲ جون ۱۹۴۹ء تا ۹ جون ۱۹۵۷ء)







شری بی۔ رام کرشن راؤ

(یکم جولائی ۱۹۶۰ء تا ۱۵ اپریل ۱۹۶۲ء)



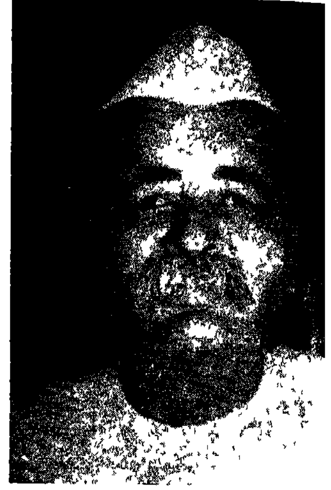
ڈاکٹر بی۔ گوپال ریڈی

(یکم مئی ۱۹۶۷ء تا ۳ جون ۱۹۷۲ء)



شری بسواناتھ داس

(۱۶ اپریل ۱۹۶۲ء تا ۳۰ اپریل ۱۹۶۷ء)



شری گوبند بلبھ پنت



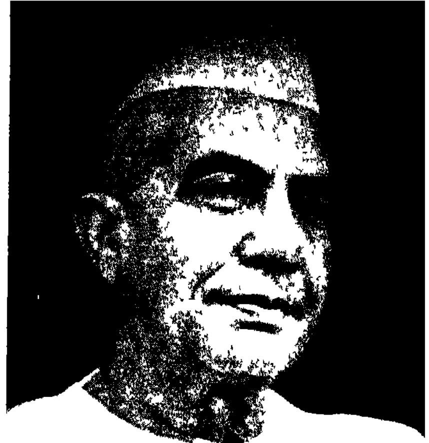
ڈاکٹر سمپورنانند

اتر پردیش کی عوامی حکومتوں کے وزراے اعلیٰ

۱۹۳۷ء تا ۱۹۷۲ء







سری چرن سنگھ



سری کملاپتی ترپاٹھی
(موجودہ وزیر اعلیٰ)



سری تربھون نرائن سنگھ

(افسانہ)

باپُو

رتن سنگھ

ڈیم بڑی تیزی سے اُبھر رہا تھا۔

ہزاروں ہاتھ مصروف تھے کوئی نقشے بنا رہا تھا۔ کوئی مٹی کاٹ رہا تھا۔ کوئی مٹی ڈھو رہا تھا۔ کوئی پتھر توڑ رہا تھا۔ کوئی لوہے کی سلاخوں سے لے کر گرانڈیل گرڈروں کو مناسب جگہوں پر رکھ رہا تھا۔ کوئی بڑی بڑی مشینوں اور کرینوں کی مدد سے ٹنوں وزنی چیزیں اِدھر سے اُدھر پھینک رہا تھا۔ اور اس سارے کام میں اتنا شور تھا کہ ساری وادی ہر وقت گونجتی ہوئی سی معلوم ہوتی تھی۔

رات کے وقت جب بجلیوں اور گیسوں کی چمکتی روشنیوں میں کام کرنے والوں کے سائے لمبے لمبے ہو جاتے تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہاں آدمی نہیں بلکہ بڑے بڑے دیو کام کر رہے ہوں۔

ہاں! دیو ہی تو کام کر رہے تھے۔ تبھی تو مٹی کا باندھ اونچے پہاڑوں کے قدموں سے اُبھرا اور دیکھتے ہی دیکھتے سر اُٹھا کر پہاڑوں کی اونچی چوٹیوں سے آنکھ ملا کر بات کرنے لگا۔

مٹی کے اس باندھ کے ایک طرف پانی کی پتلی سی ندی سوکھ گئی تھی اور باندھ کے دوسری طرف اُسی ندی کا پانی جمع ہو کر ایک چھوٹے سے سمندر کی شکل اختیار کر رہا تھا۔

اور اس ساری وادی میں سڑکوں کا ایک جال سا بچھ گیا تھا جن پر موٹر گاڑیاں، ٹرک کرینیں، بُل ڈوزر بھاگتے رہتے چنگھاڑتے رہتے۔

پہاڑوں کی ڈھلانوں پر وادیوں کی گود میں اور ڈیم کے ارد گرد بڑی بڑی عمارتیں بھی بن گئی تھیں۔ جہاں بڑی بڑی مشینیں لگائی جا رہی تھیں۔ تاروں کے تانے بانے اور مشینوں کی پیچیدگیوں کو دیکھ کر عقل حیران ہوتی تھی

وہ دماغ وہ ہاتھ اور پاؤں جب کام کرتے کرتے تھک جاتے تو تھوڑی دیر سستانے کے لیے اپنے سارے گھروں میں چلے جاتے۔ وہاں تھوڑی دیر سوتے۔ چائے پیتے۔ کھانا کھاتے اور کپڑے بدل کر تازہ دم ہو کر پھر وہ ہوتے اور اس ڈیم کا کام۔

اُن مصروف لوگوں کے بیچ کچھ روز سے ایک بوڑھا آنے لگا ہے اس کے لاغر جسم پر صرف ایک دھوتی ہوتی ہے۔ ہاتھ میں سوٹی اور پاؤں سے ننگا۔ اس لیے اس کی شخصیت میں کوئی بھی چیز ایسا سر چاپ نظر نہیں ہے۔ اور ممکن ہے اُن مصروف لوگوں کو اُس شخص کی آمد کا احساس بھی نہ ہوتا لیکن چشمے کے پیچھے سے جھکتی ہوئی اُس کی ذہین آنکھوں سے کچھ ایسی روشنی پھوٹتی ہے جو مقناطیسی کشش کی طرح لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔

بوڑھا اُن لوگوں کے بیچ سے گزرتا ہوا اچانک کسی شخص کے پاس رُک جاتا ہے اور پوچھتا ہے

”یہ ڈیم کب بن جائے گا؟“

”دو سال میں۔“

”پھر اس ڈیم سے پیدا ہونے والی بجلی کلو کو ملے گی؟“

”کون کلو؟“ کام کرنے والا آدمی پوچھتا ہے۔

”وہ دور ایک چھوٹے سے گاؤں میں رہتا ہے۔“

”ہاں۔ یہ بجلی ارد گرد کے سو میل کے رقبے والے سبھی لوگوں

کو ملے گی۔"

"کلو کو بھی؟" بوڑھا پھر وہی نام دہراتا ہے۔

"ہاں سبھی کو" کارندہ جلدی سے گول سا جواب دیتا ہے

کچھ دور آگے جا کر بوڑھا پھر رک جاتا ہے اور کسی سے پوچھتا ہے "اس نہر سے جو پانی کی سڑک نکل رہی ہے وہ کلو کے کھیتوں کو پانی دے گی؟"

"ہاں اس نہر سے چار ہزار مربع میل کھیتوں کو پانی ملے گا۔"

"کلو کے کھیتوں کو بھی؟" بوڑھا اپنا مخصوص سوال دہراتا ہے۔

اس کارندے کے پاس تمام وقت نہیں ہے کہ وہ ان سے پوچھ سکے کہ کلو کے کھیت کہاں ہیں۔ اس لیے وہ اسے جواب دیتا ہے

"ہاں کلو کے کھیتوں کو بھی پانی ملے گا۔"

بوڑھا یہ جواب سن کر مطمئن ہو کر آگے بڑھ جاتا ہے

اسی طرح وہ بوڑھا کچھ دن تک آتا رہا اور لوگوں سے یہی مخصوص سوال دہراتا رہا

"کیا کلو کے گھر تک اس ڈیم کی بجلی پہنچے گی؟"

"کیا کلو کے سوکھے کھیتوں کو اس ڈیم سے نکلنے والی نہر سیراب کرے گی؟"

پھر اچانک وہ بوڑھا کہیں غائب ہو گیا اور ڈیم پر کام کرنے والے دوسرے کاموں میں مصروف ہو کر اس بوڑھے کو بھول گئے۔

وہاں ڈیم اور اونچا ہوتا رہا اور وادی میں [illegible] دوڑتی رہیں اور مشینیں اور ٹرک چیونٹیوں کی طرح ادھر سے ادھر [illegible] یہاں تک کہ [illegible] سال کا وقفہ [illegible]

بن کر تیار ہو گیا۔ اس چھوٹے سے مصنوعی سمندر کا پانی بڑی بڑی سرنگوں سے ہوتا ہوا نیچے گرا تو کتنے ہی ٹربائن حرکت میں آ گئے اور ان سے لاکھوں کلو واٹ بجلی پیدا ہو کر بے جان تاروں میں زندگی کی رو دوڑانے لگی۔ [illegible] ڈیم کا پانی نہروں میں چاندی [illegible] جہاں ہزاروں لوگ صدیوں سے اپنے سوکھے کھیتوں میں [illegible] اس چاندی کا انتظار کر رہے تھے۔

ڈیم کے افتتاح کے وقت سبھی لوگ خوش تھے۔ بہت خوش [illegible] میں سے کسی کو بھی اس بوڑھے کا سوال یاد نہ آیا جو یہ پوچھا کرتا تھا کہ کیا اس ڈیم کی بجلی کلو کے گھر پہنچے گی کیا اس نہر کا پانی کلو کے کھیتوں کو ملے گا؟

ڈیم کے مکمل ہونے کے ساتھ ہی وہاں ڈیم پر کام کرنے والوں کے لیے [illegible] مکانوں کی ایک بستی بھی بسائی گئی تھی جہاں [illegible] ڈیم کے بننے کی خوشی میں ملک کے راشٹرپتی [illegible] کا ایک قد آدم مجسمہ بھی بستی کے وسطی چوک میں نصب کیا تھا۔ اس دن اس کا [illegible] ادگھاٹن تھا

وہ سب لوگ اس موقع پر مجسمے کے چاروں طرف جمع تھے۔ جب اس مجسمے سے پردہ ہٹایا گیا تو ملک کا راشٹرپتی [illegible] کے ساتھ کھڑا تھا۔

[illegible] کمر میں لنگوٹی باقی بدن ننگا۔ ایک ہاتھ میں موٹی [illegible] سا [illegible]۔ اس کے ہونٹ ہلتے ہوئے سے معلوم ہو رہے تھے جیسے وہ ان سب سے پوچھ رہا ہو

"جس ڈیم کو تم نے بنایا ہے اس کی بجلی کلو کے گھر گئی ہے [illegible] اور اس نہر کا پانی کلو کے کھیتوں کو سیراب کر رہا ہے یا نہیں؟"

★

(طنز و مزاحیہ)

آج کریں مجھے نہ تنگ

عبدالمجیب سہالوی

ہمارے ایک دوست مے آزادی سے مست یہ گنگناتے ہوئے نکلے ؏

آج کریں مجھے نہ تنگ مذہب و حقائق یا فرنگ

میں نے کہا یہ نعرہ کس خوشی میں لگایا جا رہا ہے۔ انھوں نے جھوم کر فرمایا آپ کو نہیں معلوم آج ہم آزادی ہی نہیں بلکہ اپنی آزادی کی ۵۵ویں سالگرہ کا جشن منا رہے ہیں یعنی ہم ۱۵ اگست کو آزادی کا کیپسول عام لٹانے جا رہے ہیں۔

میں نے کہا معاف کیجیے گا شاید آپ آزادی کا مطلب عقل و ہوش سے آزادی سمجھتے ہیں اسی لیے آپ مذہب، عقل اور رنگ کی بیڑیاں توڑ کر جشن آزادی منانے کے لیے نکل پڑے ہیں۔

انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا تو آپ ابھی تک عقل و ہوش کے چکر میں پڑے ہیں حالانکہ آپ صاحب ذوق جانتے ہیں کہ

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

چنانچہ میں نے آج اسے تنہا چھوڑ دیا ہے۔

میں نے کہا کہ اگر آپ کی طرح سبھی لوگ اسے تنہا چھوڑ دیں تو جشن آزادی منانا تو بڑی بات ہے سڑک پر چلنا دشوار ہو جائے۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اجتماعی آزادی کے لیے انفرادی آزادی پر پابندی ضروری ہے اگر آپ چاہتے ہیں کہ چوراہے پر سے سب لوگ آزادی اور سلامتی کے ساتھ گزر سکیں تو اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر فرد سڑک پر دائیں بائیں ہر طرف سے گزرنے کی اپنی انفرادی آزادی پر تھوڑی سی پابندی عائد کرے اور صرف بائیں طرف سے گزرے تاکہ حادثات سے بچا جا سکے اور لوگوں کی آمد و رفت میں خلل نہ پڑے۔

آزادی کے معنی کبھی یہ نہیں ہو سکتے کہ آپ دوسروں کی آزادی کا لحاظ کیے بغیر اودھم مچاتے ہوئے جو جی میں آئے کر گزریں ہاں جہاں تک ایسی باتوں کا تعلق ہے جن کے کرنے یا نہ کرنے سے آپ کے سوسائٹی پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا آپ ان باتوں کے کرنے میں ایک حد تک آزاد ہیں مثلاً آپ کا دل چاہے تو چلچلاتی دھوپ میں جشن آزادی کی سیر کے لیے نکل سکتے ہیں اور جشن آزادی منانے والوں کے لیے تفریح کا سامان فراہم کر سکتے ہیں اس کا تعلق خود آپ کے ذوق و شوق سے ہے۔

لیکن اگر آپ آزادی کی موج میں آ کر دامن دریدہ بھی نہیں بلکہ پاجامہ ترک کرتے ہوئے بھی آزاد ہو کر سیر کے لیے نکل پڑیں تو آپ کی یہ حرکت دوسروں کے لیے تکلیف کا باعث ہوگی۔ اس لیے آپ ننگے رہنے کے اپنے پیدائشی حق کو اس وقت تک استعمال نہیں کر سکتے جب تک سوسائٹی آپ کی اس حرکت کو بغیر تکلیف کے برداشت کرنے کے لائق نہ ہو جائے۔

انھوں نے یہ سن کر جوش کے ساتھ کہا ؏

جلد ہی روز میرے دوست فقط چند ہی روز

گھبرائیے نہیں وہ دن دور نہیں جب ہم برہنگی کا موجودہ ذوق بڑھ کر مکمل برہنگی کی منزل پہ پہنچ جائے جس نے لباس کو تن ڈھکنے

کا ذریعہ بنانے کے بجائے اس کی نمائش کا وسیلہ بنا دیا ہے۔

میں نے کہا کہ جس طرح آپ نے سیاسی آزادی کا مطلب تمام پابندیوں سے آزادی خیال کر لیا ہے اسی طرح فیشن پرستوں نے لباس کی آزادی کا مفہوم عریانی سمجھ لیا ہے حالانکہ دونوں غلطی پر ہیں۔ سیاسی آزادی اپنے ساتھ صرف آزادی ہی نہیں بلکہ بہت سی ذمہ داریاں بھی لاتی ہے۔ وہ شخص جو ان ذمہ داریوں کو اٹھانے کے لیے تیار نہیں اسے آزادی منانے کا بھی حق نہیں۔ آزادی کے حصول کی طرح اس کی حفاظت اور اسے بیرونی دباؤ اور مداخلت سے محفوظ رکھنا بھی ضروری ہے۔ آزادی کی حفاظت کے لیے اتحاد اور بیرونی دباؤ سے بچنے کے لیے معاشی استحکام ضروری ہے۔ اس لیے حقیقی آزادی منانے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ ان تمام اقوال پر عمل کیا جائے جن سے ہمارے قومی اتحاد میں رخنہ پڑتا ہے۔ فرقہ وارانہ نفرت، صوبائی اور لسانی تعصب، نیچ اونچ کا فرق اور چھوت چھات سب سے پہلے ختم کی جائیں بلکہ دوسروں کو بھی دور رکھنے کی کوشش کی جائے۔

اسی طرح دولت کے اس فرق کو بھی دور کرنے کی ضرورت ہے جس نے ملک کے کروڑوں عوام کو بنیادی ضروریات زندگی سے بھی محروم کر رکھا ہے۔ ملک کی پیداوار بڑھانے کے ساتھ ساتھ اس کی منصفانہ تقسیم کے لیے بھی جدوجہد ضروری ہے تاکہ آزادی کے بعد ملک میں آئی ہوئی خوشحالی سے صرف اتنے گنے آدمیوں کے بجائے عام لوگ فائدہ اٹھا سکیں اور آزادی کی نعمتوں سے محظوظ ہو سکیں۔ ملک میں سماجی انصاف بھی صحیح معنوں میں اس وقت تک نہیں حاصل ہو سکتا جب تک معاشی فرق نہ دور کیا جائے۔ دولت کا یہ فرق عوام کو نہ صرف یہ کہ ضروریات زندگی سے محروم رکھتا ہے بلکہ انھیں سماج میں باعزت جگہ بھی حاصل کرنے نہیں دیتا۔

اجتماعی خوش حالی کے لیے انفرادی راحتوں میں کمی اسی طرح ضروری ہے جس طرح اجتماعی آزادی کے لیے انفرادی آزادی پر پابندی جس طرح ٹریفک پرسکون سے گزرنے کے لیے دائیں بائیں سمت سے گزرنے پر پابندی لگائی جاتی ہے اسی طرح ملک کی معاشی زندگی کو پرسکون بنانے کے لیے ضروری ہے کہ کارخانہ داروں اور سرمایہ داروں کی بے لگام معاشی سرگرمیوں پر مفاد عامہ کو سامنے رکھتے ہوئے پابندیاں عائد کی جائیں اور معاشی سرگرمیوں کا مقصد محض ذاتی منافع کے بجائے اجتماعی منافع اور قومی مفاد بنایا جائے۔

ہمارے دوست نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا کہ اگر ایسا ہو جائے تو ہمیں عقل و ہوش سے آزاد رہنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔ آپ جانتے ہیں کہ کمزور کا غصہ دوسرے پر نہیں اپنے ہی پر چلتا ہے اس لیے زندگی کی محرومیوں سے عاجز آکر ہم اپنی پریشانیاں تو بھول جاتے ہیں اور کپڑے پھاڑ کر باہر نکل پڑتے ہیں۔

میں نے کہا کہ اگر آپ کپڑے پھاڑنے کی زحمت گوارا کرنے کے بجائے ذرا عقل پر زور دینے کی تکلیف گوارا کرتے تو آپ کی سمجھ میں آجاتا کہ یہ دکھ تنہا آپ کے نہیں عام جنتا کے ہیں۔ آپ کو عقل و ہوش سے بیزار ہونے کے بجائے عوام کو بیدار کرنا چاہیے۔ اگر وہ واقعی بیدار ہو گئے تو دنیا کی کوئی طاقت انھیں اپنے جائز حقوق سے محروم نہیں رکھ سکتی۔ آج آزادی کا پچیسواں سال پورا ہو رہا ہے۔ اٹھیے اور ملک کے نوجوانوں کو جھنجھوڑ کر کہیے ؎

گریباں کو دو چاک اہل جنوں اب کہ دھومیں مچانے کے دن آ گئے



آزادی کے پچیس (۲۵) سال

(ایک طویل تمثیلیہ)

جگن ناتھ آزاد

راوی نمبر ۱
(تحت اللفظ)

وطن! اے اجنبی ہاتھوں میں [illegible]
وطن کی سرزمیں پر جب غلامی کی حکومت تھی
یہ دیس اک [illegible] کا [illegible] لیکن
یہ وہ دور تھا جس [illegible] کی حکومت تھی

راوی نمبر ۲
(تحت اللفظ)

غلامی [illegible] سے [illegible]
بھی [illegible]
جس [illegible] لیکن اس [illegible] کوئی
ہمارے [illegible] تھا

راوی نمبر ۳
(ترنم سے)

اس وطن کی قربانی سے آخر اک دن ایسا آیا
آزادی کے رنگ [illegible] بہت [illegible]
[illegible] ہار گئیں ، ظلمت [illegible]

کورس
(موسیقی، سازوں کے ساتھ)

دیس ہوا آزاد ہمارا دیس ہوا آزاد
دل کا [illegible] آنکھ کا تارا دیس ہوا آزاد
سندر سندر پیارا پیارا دیس ہوا آزاد
گونج اٹھا ہر سمت یہ نعرہ دیس ہوا آزاد
دیس ہوا آزاد

[illegible] آؤ دیکھو گاندھی جی کا نام
جس کے دم سے آج [illegible] کا نام
اپنے بل سے جس نے توڑا سامراج کا دام
آج اس گاندھی جی کا پیارا دیس ہوا آزاد
دیس ہوا آزاد

اپنے دیس کی کشتی [illegible] طوفانوں کے پار
اپنے من میں کیسے خوش ہیں اس کے کھیون ہار
راجن بابو، نہرو جی، مولانا اور سردار
ڈھونڈ لیا کشتی نے سہارا، دیس ہوا آزاد

دیس ہوا آزاد

آج کے دن سے ٹوٹ گئی ہے [illegible] کی زنجیر
آج کے دن سے [illegible] اس دیس کی ہر تصویر
ایسی [illegible] کی دنیا ایسا ہے کشمیر
گونج اٹھا ہر سمت یہ نعرہ دیس ہوا آزاد
دیس ہوا آزاد

راوی
(تحت اللفظ)

ہم تو آزادی کے [illegible] رہے تھے ادھر
جنگ کی [illegible] پاکستان تھا
جموں و کشمیر پر [illegible] نے حملہ کر دیا
[illegible] کہ اس کے دل میں کیا ارمان تھا
[illegible] اس کو [illegible] سبق
[illegible] آسمان تھا

رجز کے انداز میں موسیقی کے ساتھ

بہادران صف شکن بڑھے چلو بڑھے چلو
دلاوران تیغ زن بڑھے چلو بڑھے چلو
[illegible] دشمن [illegible] بڑھے چلو بڑھے چلو
سروں سے باندھ کر کفن بڑھے چلو بڑھے چلو
تمہاری آن ہے وطن، وطن کی آن تم سے ہے
ہر اک عروج [illegible] ہر اک اقبال تم سے ہے
وطن کی لاج تم سے ہے وطن کی شان تم سے ہے
[illegible] بڑھے چلو بڑھے چلو

رجز کے انداز میں موسیقی کے ساتھ

ہمارے کارناموں سے وطن کا نام روشن ہے
اسی کی صبح سے بزم جہاں کی شام روشن ہے
[illegible] دشمن ناکام [illegible] ہے
کہ دنیا پر ہماری نصرت [illegible] روشن ہے
ہم اس کے دور سے جھنڈا رکھیں گے سربلند اپنا
خدا چاہے تو ہوگا ہر ارادہ [illegible] اپنا

راوی (تحت اللفظ) [illegible] تھا [illegible] ہوا
وطن ہمارا [illegible] ہوا
[illegible] سائنس کی سمت کی [illegible] سے
[illegible] ڈال دی اس نے
رنگ [illegible] نگاہوں میں رقص کرنے لگی
[illegible] میں [illegible] بکھرنے لگی

راوی (تحت اللفظ) [illegible] دکھائی [illegible] سے
[illegible] سے
[illegible] اٹھی
[illegible] عمر سے

راوی (مختلف آواز) (تحت اللفظ) [illegible]
[illegible]
[illegible]

راوی (تحت اللفظ) [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

راوی (مترنم آواز کے ساتھ) [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

راوی (تحت اللفظ) اس [illegible] اگرچہ کاری تھا
یہ دیس [illegible] گیا [illegible] بھاری تھا
گاندھی تو نہیں تھے [illegible] بھی گئی تھی
اور ان کی [illegible] کے سبب [illegible] تو ایک تسلی تھی

نہ دھیمی سنے مولانا بھی قدوائی بھی سردار بھی تھے
گفتار بھی تھی کردار بھی تھے اور کار بھی تھے افکار بھی تھے
اور دل اپنا منزل کو چلتا ہی گیا بڑھتا ہی گیا
[illegible] کی جانب چڑھتا ہی گیا چڑھتا ہی گیا

کورس کی آواز: کچھ ایسے جذبِ دل اپنا فروزاں کر دیا ہم نے
اندھیری رات میں جشن چراغاں کر دیا ہم نے
شریک رنگ ذرا [illegible] خون جگر اپنا
کہ ہر ذرے میں پیدا اک گلستاں کر دیا ہم نے
کہیں [illegible] طوفانوں [illegible]
[illegible] موج کو ساحل کا داماں کر دیا ہم نے
[illegible] کو موڑا تو [illegible]
[illegible] میں سامان بہاراں کر دیا ہم نے
[illegible] کو چھیڑا تو [illegible] نفاست سے
[illegible] کو اک لعل بدخشاں کر دیا ہم نے
کوئی مشکل [illegible] رستے میں [illegible] حائل
[illegible] آساں کر دیا ہم نے
[illegible] مشکل میں کوئی دیکھے
[illegible] کر دیا ہم نے
[illegible]
[illegible] آساں کر دیا ہم نے
[illegible]
[illegible] کر دیا ہم نے
[illegible] کوئی ہو
[illegible] کر دیا ہم نے
[illegible] آج [illegible]
[illegible] سامان کر دیا ہم نے
[illegible] بن کے بہتا ہے
کہیں وہ [illegible] اس کو [illegible] کر دیا ہم نے
وطن کے ہر بیاباں کو گلستاں میں بدل دینا
بڑا مشکل تھا لیکن اس کو آساں کر دیا ہم نے
[illegible] ہم نے [illegible] سے تقدیریں [illegible]
ہر اک خاموش منظر کو غزل خواں کر دیا ہم نے

دوسری آواز — اگلے ہیں کہیں چاک نے سربستہ خزانے
گاتی ہیں شبنمیں کہیں فردا کے ترانے
وہ دن بھی نہیں دور کہ ہو جائیں گے جس دن
بیکار یہ داماں وطن خصم [illegible]
اے گردش افلاک ہم آگئے ہیں اب اس سمت
کٹرے کے [illegible] کے بستے کے ستارے
[illegible] کی رہی نعمت [illegible]
[illegible] کے بیٹے [illegible]
اس [illegible] یانی کی طرح عام ہو گئی
[illegible]
[illegible]
[illegible]

تیسری آواز — [illegible] دل کی امنگ
[illegible] مرگٹ
[illegible] کو [illegible]
اسی نے آج [illegible] دنوں سے [illegible]
[illegible]
[illegible] کی راہ [illegible]
[illegible]
اگر [illegible] تو پھر کیا ہے
[illegible] کا کرشمہ ہے
ہماری ہمت عالی کا اک کرشمہ ہے
ہمارا عزم مصمم جب آشکارہ ہوا
تو جو بھی سنگ گراں تھا [illegible] پارہ پارہ ہوا
جب اپنے [illegible] کا ارادہ کیا
تو [illegible] دامان دل کشادہ کیا
سرا جو اپنے تعلق کا گر [illegible] ہی گیا
جو ایک چاک تھا دامن میں آج سل ہی گیا
یہ کام [illegible] کے اہتمام کا ہے
تمام جلوہ یہ اک سوز ناتمام کا ہے

راوی — [illegible] اور سپہر کے میدان میں ہر ایک ترقی جاری تھی
صنعت کی زمینوں پر ہر سو ہر روز نئی گلکاری تھی

تعلیم و زراعت کی دنیا خود [illegible] سے مہکی تھی
صحت کی کلی کھڑا [illegible] اک حدت [illegible] مہکی تھی

راوی — [illegible] گویا ہر اک سمت آباد

(مختلف آواز) — اچانک اس میں اٹھا شور نالہ و فریاد
[illegible] ہجوم [illegible] میں [illegible] گیا
وطن سے ہو گئے رخصت ابوالکلام آزاد

راوی — [illegible] سے روشن [illegible] دماغ

(مختلف آواز) — [illegible] گیا وہ علم کا دانش کا حکمت کا چراغ

راوی — اے وطن [illegible] کارواں جاتا رہا

(مختلف آواز) — [illegible] جاتا رہا
[illegible] داستاں جاتا رہا
[illegible] جاتا رہا
[illegible] روشن [illegible]
[illegible] اسرار [illegible]
تیرے دم سے تھا سیاست کو بھی حاصل [illegible]
تیری سطوت [illegible] کے [illegible] حصار
[illegible]
[illegible] کا صدق تھا سری نظر سے آشکار
جلوہ آرا [illegible] تیرے سینے میں تھا
[illegible] کے آئینے میں تھا

راوی — [illegible] وطن میں تھا کیا سماں اس وقت

(مختلف آواز) — [illegible] کا تھا سماں اس وقت
[illegible] آزاد
[illegible] آزاد

راوی

(مختلف آواز) — آزاد اگرچہ تمہارے سے جام کا رشتہ توڑ گیا
[illegible] چھوڑ گیا
[illegible] کس واسطے آخر گھبراتا
کیوں شکوہ [illegible] کا کرتا کیوں اپنی جبیں پر بل لاتا
[illegible] اس کا مزار جواہر تھا
طوفاں سے [illegible] جواہر تھا

ایک آواز۔ — اے جواہر لال نہرو رہبر روشن ضمیر
(ترنم کے ساتھ) — کارواں [illegible] قومی کے امیر

آج سے مری صبا سے ورقِ انساں مستنیر
آسماں تک ہند کے گھر گھر میں

دوسری آواز (تحت اللفظ)
دنیوں کی ایک دنیا ہے تری آواز میں
حسن کا دریا دم ہے جس سے [illegible] میں
ہے کتنا درد ہوتا ہے تیرے ساز میں
تیرے شوقِ فکر کی پرواز میں
کارواںِ شوق کو ہے تیری قیادت کی قسم
کارواں آگے ہی بڑھتا جائے گا
کارواں کو تجھ سے ہے حوالِ محبت کی قسم
کارواں راہ سے نہ بھٹکنے پائے گا

راوی
میں ایک دن اس تمنا [illegible] وہ بھی ٹوٹ گیا
(مختلف آواز)
اپنے دشمن کے ہاتھوں سے [illegible] کھو گیا

راوی
ذوق [illegible] کا مظہر چلا گیا
(مختلف آواز)
جس سے ساری حیات تھی معطر چلا گیا
موجِ تبسم [illegible] لبوں سے پھسل گئی
لعلِ دنیا کی آب [illegible] سے پھسل گئی

راوی
جب رخصت ہوگئے [illegible] خاک میں ملا
(مختلف آواز)
محسوس یوں ہوا کہ ہمیں خاک میں ملا
[illegible] کے تاج [illegible] خاک میں ملا
سارا جہاں [illegible] خاک میں ملا
اے خاکِ ہند آج [illegible] خیال کر

راوی
محسن کی راکھ ہے اسے رکھنا سنبھال کر
(مختلف آواز)
تو آج وطن کا [illegible] بھی
تو ایک [illegible] بھی
بیمار حسبِ قوم کی تھا چارہ ساز بھی
فولاد بھی تھا موم کی صورت گداز بھی
کشتِ وطن کی حاصلِ کشتِ چمن بھی تھا
دیکھا چمن بھی اور سیرِ چمن بھی تھا

راوی
انساں تھا اک محاسنِ بے پایاں لیے ہوئے
(مختلف آواز)
قطرہ تھا اپنے ظرف میں طوفاں لیے ہوئے
دل میں لشکر کا دردِ فراواں لیے ہوئے
لامذہبی میں دولتِ ایماں لیے ہوئے

ایماں کی روح یوں وہ زمانے میں بھر گیا
دردِ بشر سے دہر کو معمور کر گیا

راوی:
اب اس الم کا کوئی ایماں کے دل سے پوچھ
(مختلف آواز)
ہندو کے دل سے اور مسلماں کے دل سے پوچھ
لنکا کے دل سے پوچھ نہ ایراں کے دل سے پوچھ
حالِ دلِ تباہ بس انساں کے دل سے پوچھ
ہندو کی موت ہے نہ مسلماں کی موت ہے
نہرو کی موت ہے وہ ایک انساں کی موت ہے

راوی
وابستگی میں [illegible] دل [illegible]
(مختلف آواز)
تھی [illegible] کوئی کہ پہاڑوں میں جوئے شیر
[illegible]
عالم [illegible] سے سیر
آیا کہاں سے [illegible] میں سرور لیے
[illegible] کا دل سے کر گئے"

راوی
تیرا ہی کمال تھا تیرا ہی انتظام
(مختلف آواز)
گنگا کی موج ہے تو [illegible] ہم کلام
جمنا کو [illegible] کی طرف سے ملا پیام
اے [illegible] ہند کے [illegible] حرام
سارا ہے مختلف ہیں مگر تو ایک ہے
عنواں الگ الگ ہیں فسانہ تو ایک ہے

راوی
حق سے دنیا [illegible] تمام
(مختلف آواز)
دنیا کے اہلِ فن [illegible] کرتے تھے احترام
اس بات میں نہیں ہے کسی کو ذرا کلام
[illegible] کہ عالم کے صبح و شام
تیرا ہے بات کرنے کا انداز ہی کچھ اور
[illegible] جہاں میں ہے تری آواز ہی کچھ اور

راوی:
جو کچھ بھی لکھ گیا ہے ترا کلکِ خوش کلام
(مختلف آواز)
پیغامِ اتحاد ہے نوعِ بشر کے نام
تیرا اک ایک لفظ سیاست کے اے امام
ہے تاجِ گل کہیں تو کہیں تیغِ بے نیام
جو درد آج ہے دلِ دنیا لیے ہوئے
تیرا قلم ہے اس کا مداوا لیے ہوئے

راوی: (ترنم آواز سے)
اس کے جانے سے وطن کا حال بھی بے حال تھا
وہ ہمارا تھا جواہر وہ ہمارا لعل تھا
حادثے کتنے پڑے ہوں کام رکتے ہیں کہیں
تیز رفتاری کے عادی گام رکتے ہیں کہیں
اسے مصوّر یہ عالم تھا وطن پوری طرح
مست تھا اپنی ہی دھن میں جیسے پوری طرح
کارخانے، تجربہ گاہیں، ادارے، مدرسے
سب اپنے کام میں مشغول تھے مصروف تھے
دہقاں تندہی سے لگ رہے تھے کھیت میں گلشن کھِلے
رہنما اپنا لگا ہے نامی کا تھا اصول

راوی: (مختلف آواز تحت اللفظ)
ایسے عالم میں جب اپنی دھن میں گم تھا ہمدست
جو تھی لی کا نام دل رہے دل میں ہی تھا اک رماں
جنگی طبل بجی کر یا کہساں نے کی ہم پر یلغار
پوس اس کی ہم پر سکس جیسے ہم ہوں رم سکا
ٹینک اس کے میداں میں سر کے گرد دیتے سار
کون بتائے پیچھے سے کون ملا تھا

نئی آواز (تحت اللفظ)
اس طوفاں کے رکنے کو جب بھارت کا ہم زور تھا
محنت کا دو رنگ جو آیا ہم کو سب ستور تھا
دشمن کے حملے سے بچانے دشمن کی مٹی کو
سرحدوں میں جو ان لہرایا دل میں ایک سرور تھا
دانش وروں نے قلم سنبھالا اور فن کاروں نے اپنا فن
جوش گرم دہقاں چمکا چہرے پہ رنگ نور اٹھا
میدانوں میں فوجیں اتریں تیکڑی میں مدد اٹھا

راوی (مختلف آواز)
سارے ہند کے جو گھٹا اس کے چھا گئے
چیچا ہند کہ دو فضاؤں میں آ گئے
عوام اس تھپڑ پہ جاکر ستا گئے
حملے کے مرکزوں میں قیامت اٹھا گئے
جو شہروں کے سر میں تھی وہ شیطانی گئی
دور دور میں غزہ گیا جو دوسری گئی

دوسری آواز: (تحت اللفظ)
اے مجاہد اے بہادر اے سپاہی اے شہید
جان نثاران وطن کے سورما اے عبدالحمید
جان دے کر تو نے پائی ہے حیات جاوداں
نام بھی تیرا مبارک کام بھی تیرا سعید

راوی
آخر چھٹ گئے جنگ کے بادل امن والوں کا دور آیا
جب یہ سب ختم ہوئی اور امن والوں کا دور آیا
ایسے میں بھارت والوں نے ملک کو یہ پیغام دیا
چھوڑا ان کو سرکی نا ہیں قلب بیاں کا دور آیا

ایک آواز
ہاں حال سے تاریخ کہہ رہی ہے یہی
بس جنگ ہم اسے نہیں کرتے
مدافعت کی لڑائی ہمارا شیوہ ہے
اور اس میں رکھ کے قدم ہم رکا نہیں کرتے

دوسری آواز۔
ہم آج پھر یہی کہتے ہیں اے دنیا
ترے عوام سے ہم کو کوئی عناد نہیں
ہمارا طرز عمل اس سے عبارت ہے
ہمارے بیچ نظر صلح ہے فساد نہیں

تیسری آواز
اسے مصوّرے میں تھا سدھ ممکن جنگ کے بعد
آئی تھی پھر سے گلستاں پہ پھیس جنگ کے بعد
گو یہ فتح سی ہو گئی یہ جنگ بھی ہم پہ لیکن
سیر جو نکلا تھا یہ وطن جنگ کے بعد

مختلف آواز
جنگ کے بعد جو معمول پہ حالات آئے
سامنے اس دو رنگی کے خیالات آئے

مختلف آواز:
سال بعد ان کی آئی گاندھی صدی بھی آئی
زندگی بھی آئی وہ زندگی بھی آئی
علمی ساتھیوں نے پھر دیس کو سنوارا
پھر مرکز بنا تھا ہندوستاں ہمارا
ہندوستاں کی عزت دو رسے بیدار ہو گئی
اپنی ضیائے صنعت جاپان میں بھی دکھی
ہندوستاں سے اک محفل سماج داری
جب انقلاب آیا جمہور نے صدا دی



عظمتِ قومی

محسن نقوی

موجِ تسنیم سے الفت کی کرن پھوٹی ہے جیسے کلیوں سے [illegible] کی کرن پھوٹی ہے
نکھرے سونے سے حقیقت کی کرن پھوٹی ہے کھلتے پھولوں سے محبت کی کرن پھوٹی ہے
[illegible] عظمتِ قومی کا مقام آیا ہے
بہاروں کی قطاروں میں [illegible] پیام آیا ہے
ہم نے پھولوں سے محبت کے طلب گاروں کو [illegible] سکھائے ہیں زنجیر کی جھنکاروں کو
ہم نے توڑا ہے چمکتی ہوئی تلواروں کو کر دیا سرد دہکتے ہوئے انگاروں کو
لو حقیقت کی نکلنے لگی انسانوں سے
[illegible] علم کا سبق سیکھا ہے [illegible] والوں سے
[illegible] نکلی کہ ہمارا گھر [illegible] کرے تاج اُبھرا کہ محبت کو سدا یاد کرے
دل میں ہے حسن کے صداقت [illegible] اجڑی بستی ہو جو بستی اُسے آباد کرے
یاد سے مٹتے گئے [illegible] کی [illegible] سے
عظمتیں [illegible] انجام کو آزادی سے
حُسن [illegible] یاد کرو عہدِ [illegible] کا سبق یاد کرو
پھول کہتے ہیں [illegible] یاد کرو پھر سے قربانی [illegible] یاد کرو
باتیں ہوتی ہیں تصور میں [illegible] سے
اب بھی آتی ہے صدا کی آواز [illegible] سے
لکشمی بائی کی ہمت کا سبق یاد کرو اپنی تاریخِ شہادت کا ورق یاد کرو
[illegible] خون میں ڈوبا ہوا گنگ [illegible] یاد کرو
[illegible] کا پیغام [illegible] یاد کرو
[illegible] کرو
[illegible] جھکے ہوئے پیمانوں کی
[illegible] دیوانوں کی
عظمت [illegible] محبت کی [illegible] ہیں
کتنی [illegible] ہیں

بادِ نو بہار چلے

وقار خلیل

(شملہ چوٹی کانفرنس کے پس منظر میں)

کہا تھا یہ مرے مخدوم نے مسرت سے
جہاں میں جنگ نہیں امن سربلند چلے
نسیم صبح چلے، بادِ نوبہار چلے

بڑھاؤ ہاتھ کہ انسانیت کا نام کریں
گلے ملیں کہ زمانے میں شاد کام رہیں
گلاب بن کے کھلیں، دوستی کے بیج چھڑکیں
کہ ہند و پاک ہیں دو بستیاں اجالوں کی

تمام حرص و ہوس کی ہوس اور رقابت کو
دو آب پیار کو، احساس کی شرافت کو
عقیدتوں کے رشتے سے استوار کرو
خلوص فکر و نظر پر تو اعتبار کرو

ہم اہل ہند ہیں، مہتاب آرزوؤں کا
کرن کرن سے بکھرتے ہیں آفتاب کی
جہاں بھی ظلم ہوا، حریت پہ آنچ آئی
سکونِ صبح کے دریچے دکھا سکے ہیں وہیں

لکھی تھیں ہم نے کسی نظم میں یہ سطریں بھی
کرن سحر کی، اسیرِ ہوس نہیں ہوتی
سحر ستارہ شناسوں کی مسکراہٹ ہے

اور آج پھر یہی کہنا ہے، گوشِ دل سے سنو
کہ ہند و پاک ہیں دو بستیاں اجالوں کی
کہ ان میں جنگ نہیں، امن سربلند رہے
ہوا ہے ظلم نہیں، بادِ نوبہار چلے
بقولِ فیض، محبت کا "کاروبار چلے"

ذوقِ آزادی

سعادت نظیر

جمادِ زیست میں ٹوٹا طلسمِ صیادی
صدائے نغمہ سے بدلی صدائے فریادی
جو قید ہو تو ہو کس طرح ذوقِ آزادی
تعینات کہاں؟ عزم ہو جو فولادی
قدم اٹھے تو گئے بیٹھ رہزنوں کے جگر
ستارے بن گئے گرد و غبارِ راہِ سفر
ہر ایک ذرے میں لرزاں ہے نقشِ سحر
جنونِ شوق کی کروٹ کا نام ہے محشر
کمالِ عزم سے نصرت ہے، کامرانی ہے
شعورِ پختہ سے تہذیبِ زندگانی ہے
نگاہِ گرم سے ہے سرد زلزلوں کا جلال
نشاطِ کار سے ہے حوصلوں کا حسن و جمال
وہ عقدے ہوگئے حل جو کبھی تھے امرِ محال
بقا کی حد میں گزشتہ، جو گزرے ماہ و سال
وہ "کل" جو بیت گیا، ہے جواب ترے "آج"
رسوم ہو گئے مدفن، رہے نہ قدیم رواج
دیارِ ہند پہ رہا ہے شاہِ دل کا راج
مزاجِ شعلہ بہ بستر ہے زندگی کا مزاج
عجیب شان سے نکھرا ہے شبابِ فکر و نظر
قدم قدم پہ صبا پاش ہیں نجوم و قمر
شبِ سیاہ کے دامن میں ایک تازہ سحر
رگوں میں غنچہ و گل کی ہے رقصِ برق و شرر
ہوا فروغ کچھ ایسا مذاقِ حکمت کو
کہ مل گئی نئی معراج آدمیت کو

رامائن اور اردو

ویریندر پرشاد سکسینہ

سنسکرت میں مہرشی والمیک نے ایک تاریخی کہانی نظم کی تھی جو راماین کہلاتی ہے۔ ایک ایسی کہانی ہے جو ہندوستان کی مختلف زبانوں میں بلکہ دنیا کے ادب میں کسی نہ کسی صورت میں آج تک بار بار دہرائی جاتی رہی ہے۔

سنسکرت اور ہندی سے قطع نظر خود اُردو میں بھی راماین کا حصہ مختلف صورتوں میں لکھا جاتا رہا ہے۔ جیسا کہ راماین سے متعلق اردو ادب [illegible] ایک طویل سلسلہ ہے جس میں آئے دن اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

اُردو میں راماین [illegible] غالباً [illegible] مرحوم کے زمانے [illegible] سے ہوئی ہے۔ اس کے بعد جدید دور میں بھی شعلہ، سرور، جگت [illegible] جگر بریلوی، ضیائی [illegible] ادیبوں [illegible] بریلوی وغیرہ نے اس کے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی ہے۔ اُردو راماین کے مصنفین کی طویل فہرست میں ہندو اور مسلمان دونوں دوش بدوش نظر آتے ہیں۔ اُردو میں منشی شنکر دیال فرحت لکھنوی، منشی جگن ناتھ خوشتر لکھنوی، ملک الشعرا دوارکا پرشاد افق لکھنوی، منشی سورج نرائن مہر اور دوسرے شاعروں کی راماینوں کا رواج تلسی داس کی رامائن جو ترجمہ تلسی سے روشن ہوا ہے اور اردو نظم میں رام بھگتی کے ذریعے ان شعرا نے اردو زبان کو اپنی تخلیقات سے مالامال کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اردو کے بعض نقادوں اور ادیبوں نے یہ لکھ دیا ہے کہ اردو میں راماین اور مہابھارت کی داستانیں تبرک کے طور پر ملتی ہیں۔ حق بات تو یہ ہے کہ ہمارے ان ادیبوں اور نقادوں کا رام بھگتی اور کرشن بھگتی پر اُردو میں کوئی مطالعہ نہیں تھا ورنہ یہ حضرات اپنا غلط اعتراض اُردو زبان پر نہ لیتے۔ اس مقالے میں چند رام بھگت شعرا کا ذکر کیا جاتا ہے جنھوں نے رام بھگتی میں ڈوبی ہوئی شاعری کی ہے اور اس کی وجہ سے ان کا نام اُردو ادب میں زندہ جاوید ہو گیا ہے۔

منشی شنکر دیال فرحت نے متعدد کتابیں تصنیف کیں جو خیر مذہبی رنگ کی ہیں۔ لیکن [illegible] اور راماین کا اُردو نظم میں ترجمہ کیا۔ یہاں یہ عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ اُردو اپنے ابتدائی زمانے میں ترقی و توسیع کے لیے مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں کی سعی کی مرہونِ منت ہے۔ اس سعی نے ہندو دھرم کے قدیم صحیفوں کے منظوم و منثور ترجموں کی شکل اختیار کی تھی جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ زبانِ اُردو کی تاریخ کو ہندوؤں کے بارے میں دیگر امور کے ساتھ ساتھ ان ترجموں سے متعلق ایک فرض انجام دینا ہے یعنی یہ تحقیق کرنا ہے کہ ان کی تعداد کیا ہے؟ اُردو کی ترقی میں ان کا کتنا اہم کس نوعیت کا حصہ ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اردو کے ذریعے سے معاشرے میں جو تبدیلیاں ہوئیں ان پر ان کا کیا اثر ہے۔

فرحت کی منظوم راماین بہت مقبول ہوئی اور حق یہ ہے کہ اس کی بدولت ان کا نام اُردو دنیا میں پایندہ ہو گیا ہے۔ یہ مثنوی بلاغت و فصاحت کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ روانی اور جوش سے بھی معمور ہے۔ صنائع و بدائع بھی کافی ہیں۔ بندش چست، الفاظ اور ترکیبیں مرصع، تشبیہیں اور استعارے پُر لطف اور برمحل۔ غرض شاعری کی تمام خوبیوں سے یہ مالامال ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ درج کیے جاتے ہیں:

قریبِ بن جب پہنچے سری رام   قدم سے دامنِ صحرا لیا تھام

دھنک کو توڑ کر پھینکا زمیں پر | اندھیرا چھا گیا عرشِ بریں پر
بدن میں دوڑتا پھولے جز و کل | تو کی اوجِ ثریا سے بارشِ گل
پھڑک اٹھے جنک سیتا ہوئیں شاد | خوشی سے خانۂ خاطر ہوا آباد
بہ ہمراہِ جلیباں حسب آئیں | جناب جی بھی محفل میں آئیں
جناب رام کے قرب آ کے فی الحال | پہنا دی پھول کر کھولوں کی جے مال

منشی جگن ناتھ خوشتر کی مقبولیت اور شہرت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے ہر ہندو گھر میں جن کی مادری زبان اردو ہے، رامائن خوشتر ضرور ملے گی۔ رامائن خوشتر پہلی مرتبہ ۱۸۶۴ء میں مطبع منشی نولکشور میں چھپی اور اس کے بعد اس نسخے کے ۱۶ ایڈیشن اسی مطبع سے شائع ہوئے۔ سولہواں ایڈیشن ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا تھا۔ پہلی مرتبہ ۱۹۲۴ء میں یہ رامائن شائع ہوئی تو نسیم دہلوی نے یہ تاریخ کہی ؎

عیسوی تاریخ اے فکرِ رسا
لکھ "چھپے خوشتر کے افکارِ رسا"

اردو کے مثنوی نگاروں میں میر حسن، پنڈت دیا شنکر نسیم، شوق قدوائی، جگر بریلوی، برق سہالوی وغیرہ کافی مشہور ہیں۔ لیکن اس صنفِ سخن میں خوشتر کی شہرت مثنوی رامائن خوشتر کے باعث کسی سے بھی کم نہیں ہے۔ مثنوی ان کا کارنامہ سمجھا جانا چاہیے اور اس کا شمار اردو کی بہترین مثنویوں میں ہو سکتا ہے۔ سلاستِ زبان، بندش کی چستی اور شگفتہ طرزِ بیاں میں یہ مثنوی لاجواب ہے۔ منظر نگاری کے دلکش اور نادر نمونے اس میں ملتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے

ہوا جب مطلعِ خورشید روشن | گلستانِ جہاں میں جلوہ افگن
ہوا مشرق سے ظاہر عارضِ حور | رخِ عالم پہ چمکا پرتوِ نور
اڑا زاغِ سیاہِ شب جہاں سے | ہمائے روز نکلا آسماں سے
ہوئی قوسِ ہلالِ شب شکستہ | عروسِ صبح نکلی دست بستہ
فلک پر شاہدِ خورشید آیا | درِ شبنم کا زیبا ہار لایا
ہوا بیدار شاہِ بخت بیدار | شہنشاہِ فلک نو نیک کردار
بہ روشن جبین و ماہ سیما | ہوا تختِ شہی پر جلوہ فرما

ملک الشعراء منشی دوارکا پرشاد افق لکھنوی نے رام ناٹک کے نام سے ایک ڈرامہ ۱۹۰۵ء میں ہنر کلب لاہور کے لیے تصنیف کیا تھا۔ ۱۹۱۴ء میں آپ کی منظوم رامائن منشی نولکشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے جو ایک ادبی شاہکار ہے۔ حسرت جگر بریلوی یادِ رفتگاں میں فرماتے ہیں

"رامائنیں کئی لکھی گئیں جن میں ایک ایک قافیہ ہے۔ لیکن یہی تصنیف آپ کی قادر الکلامی کی زبردست دلیل ہے اور واقعی عدیم المثال چیز ہے۔"

منشی سورج نرائن مہر نے اپنی تصنیف مہا اپدیش میں بھگوت گیتا کے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ آپ کی سب سے زیادہ مشہور کتاب جیون درشن ہے جس میں کہانیوں کے ذریعے ویدانت کے اصول سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ آپ کی رامائن مہر ۱۹۱۴ء میں مادھو پریس دہلی سے شائع ہوئی تھی اس میں تلسی داس جی مہاراج کی شاعرانہ خصوصیتوں اور دلی بھگتی کا فوٹو مہر صاحب نے اردو نظم میں ۴۵۳ صفحات میں پیش کیا ہے۔ آپ نے رامائن منظوم میں زبان بہت سیدھی سادی استعمال کی ہے تاکہ یہ رامائن عوام میں مقبول ہو سکے۔ رامائن مہر کی ابتدا ان اشعار سے ہوتی ہے۔

رام روپ اپنے گرو کی دمبدم | میں لگاؤں آنکھ میں خاکِ قدم
درحقیقت خاک ہے یہ کیمیا | دردِ دنیا کے لیے کامل شفا
خاک کیسی یہ تو وہ اکسیر ہے | جس کی کشفِ ذاتِ حق تاثیر ہے
ظاہر و پنہاں جس سے رام کے | دیدۂ دل کو نظر آئیں کھلے
کوہ و دریا دشت و صحرا بحر و بر | دیوتا سدھ آدمی اور جانور
کیا خلا میں کیا ملا میں ہر ملا | کیا زمیں کیا چرخ ہر اک جا
جلوہ فرما ایک میرے رام ہیں | وہ ہی میرے وہ تیرے رام ہیں

کانپور کے منشی سورج پرشاد لفظ نے رامائن گیتاولی کا منظوم لفظی ترجمہ کیا تھا جو مدت ہوئی شائع ہو چکا ہے۔ اس منظوم ترجمے میں بڑی پختگی، شگفتگی اور روانی ہے اس کی ایک جلد میری لائبریری میں محفوظ ہے۔

---

۱ رام کی شکل کے کھیل

پنڈت چکبست کے مجموعہ کلام "صبح وطن" میں "رامائن کا ایک سین" کی مشہور نظم ہے جس میں انھوں نے شری رام چندر جی کا اپنی والدہ سے رخصت ہونا دکھایا ہے۔ چکبست نے اصل میں رامائن کے کئی سین نظم کئے تھے لیکن ان کی وفات کے بعد اُن کے نظم کیے ہوئے کسی سین کا پتہ نہیں چلا۔ پنڈت منوہر لال زتشی کا ایک مقالہ "زمانہ" جنوری ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا ہے اس میں زتشی صاحب فرماتے ہیں:

"چکبست کی رامائن کا ایک ٹکڑا چھپ گیا ہے کئی اور ٹکڑے چکبست نے لکھے تھے اور ان کے دوستوں نے ان کی زبانی سنے تھے۔ اُن میں آخری جنگ سے پہلے راون کی تقریر خاص طور سے قابل ذکر ہے مگر وہ سب اُن کے ساتھ فنا ہوگئے۔ میں نے اُن کے مرنے کے بعد اُن کے کاغذات کو چھانا مگر افسوس کہ مجھے کچھ نہیں ملا۔"

رام چندر جی کے بن باس پر ماں کے جذبات کو چکبست یوں بیان کرتے ہیں۔

اپنے بھی نامراد بہت آئیں گے نظر — گھر جن کے بے چراغ رہے آہ عمر بھر
رہتا مرا بھی نخل تمنا جو بے ثمر — یہ جائے صبر تھی کہ دعا میں نہیں اثر
لیکن یہاں تو بن کے مقدر بگڑ گیا
پھل پھول لا کے باغ سا اجڑ گیا

رام چندر جی کا جواب چکبست کی زبان میں سنئے

اپنی نگاہ بھی ہے کسی کارساز پر — صحرا چمن بنے گا وہ ہے مہرباں اگر
جنگل ہو یا پہاڑ سفر ہو کہ ہو حضر — رہتا نہیں وہ حال سے بندے کے بے خبر
اس کا کرم شریک اگر ہے تو غم نہیں
دامانِ دشت دامنِ مادر سے کم نہیں

منشی درگا سہائے سرور جہاں آبادی اردو شعرا میں سے ہیں جن کی شاعری میں سارے ہندوستان کا دل دھڑکتا ہوا نظر آتا ہے انھوں نے رامائن کے کئی سین نظم کیے ہیں۔ مہاراجہ دشرتھ کی بے قراری اور سیتا جی کی گریہ وزاری ملاحظہ فرمایئے۔

"مہاراجہ دشرتھ کی بیقراری"

بالک تھے رام دشت نوردی کے دن نہ تھے
بچے ابھی تھے بادیہ گردی کے دن نہ تھے

کانٹے قدم قدم پہ بچھائے گا آہ کون
غربت میں زخم دل کے [illegible]

"سیتا جی کی گریہ وزاری"

مجھ سے شب فراق میں تڑپا نہ جائے گا
روز سیاہ ہجر کا دیکھا نہ جائے گا
گھر میں جو چھوڑ جاؤ گے سیتا غریب کو
پاؤ گے بن سے آ کے نہ جیتا غریب کو
صورت تمہاری دیکھ کے غم بھول جاؤں گی
صحرا کے سارے رنج و الم بھول جاؤں گی

لکشمی نرائن جوہر بدایونی مرحوم نے "پتپ بانکا" کو مثنوی گلزار نسیم کی بحر میں نظم کیا تھا۔ جوہر مرحوم کی یہ مثنوی امیر الاقبال پریس بدایوں سے ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ جوہر کی اس مثنوی میں بڑی روانی ہے لیکن ادبی حیثیت سے اس کا مقابلہ "گلزار نسیم، سحر البیان" اور پیام ساوتری سے نہیں کیا جا سکتا لیکن پھر بھی یہ مثنوی ادبی حلقوں میں مقبول ہے۔ ہنومان جی سیتا جی کی تلاش میں اشوک واٹکا میں گھوم رہے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

ہر گل سے حال کو پوچھا — ہر درہ کی وسعتوں میں ڈھونڈا
نرگس سے نظر ملا کے پوچھا — سوسن کو تبسم دلا کے پوچھا
بلبل نے ہزار کی رسائی — نکہت نہ کہیں کی بات آئی
غنچہ نہیں کوئی کہ کھلاتا — پتا بھی نہیں پتہ بتاتا
ہر پھول ہے خاک جو بیان ہو — تب بھی چمن کا پاسبان ہو
آسان نہیں ہے جبہ سائی — مشکل ہے خیال کی رسائی

منشی جواری لال شعلہ نے مریادا پرشوتم بھگوان رام چندر کے حالات کو اپنے ایک مسدس "جنگ سندری" میں اس خوب صورتی کے ساتھ نظم کیا ہے کہ ان کا یہ مسدس اردو ادب میں ایک شعری شاہکار ہے۔ سیتا جی رام چندر جی کے ساتھ بن جانے کے لیے اصرار کرتی ہیں شعلہ نے کیا خوب فرمایا ہے

ہر دم رہے گا نقش کف پا نگاہ میں — آنکھیں بچھاتی جاؤں گی [illegible]

رام چندر جی لکشمن جی اور سیتا جی بن جانے کے لیے اجودھیا سے رخصت ہو رہے ہیں تو ان کی ماؤں کے دل پر کیا گزرتی ہے۔

سینے بدن ضعف سے گر کے رہ گئیں
نکلی نہ جان پتلیاں پھر پھر کے رہ گئیں

دسرتھ کی قلبی کیفیات کی آئینہ داری دیکھیے۔

پتروں کو دیکھ آتما آشتہ ہو گئی
آشیرباد کے زباں بند ہو گئی

بن باس کے زمانے کے رام چندر جی سیتا جی اور لکشمن جی کی جو تصویر کھینچی گئی ہے اسے ملاحظہ کیجیے۔

رام اور لکشمن کے ساتھ میں سیتا جی یوں رواں
جس طرح برہما وشنو کے مایا ہو درمیاں
یوں پہ یہ جانکی تھیں مہ نور کے بیچ میں
جیسے ہو پریم بھگت اور ایشور کے بیچ میں

شری رام چندر جی لکشمن جی اور سیتا جی کو سریو ندی کو پار کرنا ہے اور کشتی کا انتظار ہے شعلہ صاحب نے اس منظر کو یوں بیان کیا ہے:

بے تاؤ کر رہے ہیں جو برہما نڈ بھر کو پار
اپنے لیے ہے آج انھیں کشتی کا انتظار
پل مارتے ہی ناؤ کنارے پہ آ لگی
ابرو کی طرح کشتی اشارے پہ آ گئی

بن باس میں سیتا جی سے بن کی باسی عورتیں ان کا حال دریافت کرتی ہیں اور پوچھتی ہیں کہ یہ دو جواں مرد جوان کے ہمراہ ہیں کون ہیں سیتا جی فرماتی ہیں ؎

دیور لکشمن کو رشتے میں بتلا کے رہ گئیں
رگھبیر کا نام پوچھا تو مسکا کے رہ گئیں

جنگل کے رہنے والوں نے شری رام چندر جی سیتا جی اور لکشمن جی کا استقبال بڑے زور و شور کے ساتھ کیا تھا۔ ؎

تل بھر جگہ نہ پائی کہیں گرد راہ نے
چرنوں کو ڈھک لیا تھا ہجوم نگاہ نے

ہمارا لال بہادر برق جدید اردو ادب میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے رامائن کے کئی سین نظم کیے تھے پریم کا تحفہ یا بھیلنی کے بیر ان کی شاہکار نظم ہے جس کا ترجمہ ہندوستان کی کئی علاقائی زبانوں میں ہو چکا ہے۔ شری رام چندر جی اچھوت بشری کے جھونپڑے پر پہنچتے ہیں اور بشری عقیدت کے ساتھ ان کو بیر پیش کرتی ہے اس واقعہ کو شاعر نے یوں نظم فرمایا ہے۔

بھگوان نے اخلاص و مدارات کو دیکھا
وارفتۂ دیدار کے جذبات کو دیکھا
کچھ ذات کو دیکھا نہ کچھ اوقات کو دیکھا
دیکھا تو فقط پریم کی سوغات کو دیکھا
ڈوبے ہوئے تھے سر محبت کے جوش میں
خود پریم کے ساگر بھی ہوئے پریم کے بس میں

ہے رسم محبت کی زمانے سے نرالی   بھگتی کبھی تاثیر سے رہتی نہیں خالی
مسطور کیا رام نے یہ تحفۂ عالی"   بنیاد جہاں میں بھگتی اور دھارکی ڈالی
اے کاش اچھوتوں کو گلے ہم بھی لگائیں
اس پریم کے افسانے کو آدرش بنائیں

رواں امادی کا شمار صف اول کے شعرا میں کیا جاتا ہے۔ ہندوستانی فضا اور ہندی ماحول سے ان کی نظمیں بھرپور ہیں۔ اس میں "رحلت بال"، "چترکوٹ" اور "شکتی بان" ان کی قابل ذکر نظمیں ہیں۔ شری رام چندر جی، لکشمن جی اور جانکی جی کے ساتھ جنگل کو روانہ ہوتے ہیں اور چترکوٹ پہنچ کر ایک جگہ مقیم ہیں دور سے کچھ غبار اٹھتا ہوا نظر آتا ہے لکشمن جی رام چندر جی سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں ؎

گرد و غبار دیکھ رہے ہیں حضور کچھ   نزدیک آگئی نہیں اب فوج دور کچھ
شک ہے مجھے کہ آج خطر ہے ضرور کچھ   نیت میں آگیا ہے بھرت کی فتور کچھ
اس کا سوائے جنگ کے انجام کچھ نہیں
اس قافلہ کا دستہ یہاں کام کچھ نہیں

شری رام چندر جی لکشمن جی کو جواب دیتے ہیں کہ آپ کا خیال غلط ہے۔

جگنو سے جیسے آگ کا جلنا محال ہے   اہلِ وفا کے قول کا ٹلنا محال ہے
مغرب سے آفتاب نکلنا محال ہے   لچھمن اُونہی بھرت کا بدلنا محال ہے

بھائی کہاں جہاں میں ایسے وفا شعار
یوں ہو کے بدگمان نہ ہو تم گناہ گار

بھرت جی کا سمیت ہوا تا ست اور وہ چتر کوٹ میں لے بھائی کے قریب آتے ہیں اور انھیں بن باسیوں کے روپ میں دیکھتے ہیں تو سخت بے چین ہو جاتے ہیں۔ بھائی کو بھائی سے کیسی محبت و الفت ہوتی ہے اسے کیفی نے ان اشعار میں کس شدت اثر کے ساتھ بیان کیا ہے ملاحظہ ہو ں

دیکھ کر بھرت کو وہ بیکس و بد حال   تیوا اٹھے کہ حال ہو گیا ہے جان
دیکھیے دو رتے ہوئے ملنا ہے یک جان   اور ہو عرق کیا تختہ و نقصان

الفت سے ... ماں کے واسطے
نقش یہ حاکم ... کے لئے

یہ دو غم ہوئے ... کے ... بیٹال کلے سے برادر کو دوڑ کر
سطوہ ... تھی ... نقش الم ... و تصویر غم ...
کلفت جو تھی دلوں ... ہوتی
... ہو گی

حضرت منور لکھنوی نے والمیکی رامائن کا اردو منظوم ترجمہ سنت سنگھ اینڈ سنز لاہور کے لئے کیا تھا جو ۱۹۳۱ء میں شائع ہو چکا ہے۔ ترجمہ میں منور صاحب نے اسلوب اور زبان کا خاص خیال رکھا ہے اس لئے یہ ترجمہ بے حد کامیاب ہو گیا ہے۔ منور صاحب نے رام کتھا کے نام سے منظوم رامائن لکھنا شروع کیا تھا لیکن یہ ان کی زندگی میں مکمل نہ ہو سکی۔

جناب برملوی کی ایک تصنیف امر کہانی کے نام سے ۱۹۵۰ء میں آکاش بانی آفس بہاری پور بریلی سے شائع ہوئی ہے — امر کہانی میں واقعات تو رامائن ہی کے ہیں لیکن ان کی ترتیب اور تکنیک مصنف کی اپنی چیز ہے۔ یہ منظوم افسانہ تکنیک کے اعتبار سے جدید افسانوی ادب میں ممتاز مقام کا حامل ہے۔ امر کہانی کی سب سے بڑی خوبی اس کا غیر معمولی اختصار ہے

رامائن جیسے طویل قصہ کو بے کم و کاست چند صفحات میں بیان کر دینا بجائے خود ایک ادبی معجزہ ہے۔ دریا کوزہ میں بند کر دیا ہے اور اس خوبی کے ساتھ کہ تمام لہریں اپنی جگہ پر ثابت و برقرار ہیں منظر نگاری تو جیسے جناب کا حصہ ہی ہے مگر اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ کوئی سطر مقامی رنگ سے عاری نہیں ہے "پاتال وجے" کے دو بند ملاحظہ ہوں:

وہ ساہ ... تھا ... آب   ہوتی تھی جو بہار پسینہ سے آب آب
... پردۂ سحاب   ہو جاتا تھا آفتاب کو شرمندۂ حجاب

... تیر کی طرح
... کی طرح

... رستے کے   ... دریائے ... عجم
... کی تیغ   ... تو تکبیر ... تسلم

... حضور کا
... آسماں کی سمت ... سیلاب نور کا

... نے سوامی رام تیرتھ "اگرو ... نک" اور ... "اردو شاعری میں ہمیشہ ... رہے گی۔

... رامائن میں پوری شاگرد ... نے رامائن منظوم ... کو دو حصوں میں ۱۹۲۲ء میں مطبع جگدیش پریس میں پوری سے شائع کرایا تھا۔ ان کی یہ رامائن بہت مقبول ہوئی چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

کوئی ... کہتا تھا وہ جان اجودھیا تھے
کوئی سر پھوڑ کر کہتا تھا وہ مان اجودھیا تھے
کوئی گھبرا کے کہتا تھا وہ جاتے ہیں چلو دیکھو
کوئی بھیتا کے کہتا تھا نہ جانے دو ذرا دیکھو
کوئی کہتا تھا اب دنیا میں جینے کا مزہ کیا ہے
جو یہ جان حزیں تن سے نکل جائے تو اچھا ہے
کوئی کہتا تھا وہ شاہ اودھ کو دل سے پیارے تھے
کوئی کہتا تھا کوشلیا کے بھی آنکھوں کے تارے تھے
شہنشاہ اودھ کے دل کو اب چین آئے گا کیونکر
جگر آرام کوشلیا کا کیسے پائے گا کیونکر

دکھائی خوب پیدا ہماکے پردوا لوں نے کیفیت
سمجھ میں کیکئی رانی کے بھی اب آگئی حکمت

راے سدھ ناتھ علی فراقی دریابادی مرحوم نے ۱۹۳۵ء میں "مریادا پرشوتم بھگوان رام چندر کی خدمت میں" نذر فراقی" کے نام سے ایک کتاب اعلیٰ پریس دہلی سے شائع کرائی تھی۔ اس مجموعہ میں رام بھگتی رباعیات اور مخمس ہیں۔ تلسی داس کی رامائن کا منظوم ترجمہ بھی آپ نے مسدس میں تلمیح کے رنگ میں لیا تھا۔ رام بھگتی پر ایک رباعی ملاحظہ فرمایئے

ہے سر ساکے ساتھ استادہ کا ساتھ | ہاتھی کو کہتے ہیں ہیت و پناہ کا ساتھ
لاتی دشرتھ کے ہیں خلوت و جلوت | میرے جلووں سے تو کس جلوہ گاہ کا ساتھ
وہی پوچھے سروں آنکھوں پہ بیٹھ گئے ہم | نام دیتا ہوں سب پہ ۱۰۵ کا ساتھ
لے فراقی ربط کی صورت نظر آتی نہیں

راہ میری اب ہے اور راہ ۹ ساتھ

حضرت جگر بریلوی کا شمار ہندوستان کے صف اول کے اساتذہ سخن میں ہوتا ہے اور اردو کی کلاسیکل شاعری کی آبرو آپ سے قائم ہے۔ آپ کی شاہکار مثنوی پیام ساوتری شائع ہوچکی ہے جس کو ہمارے نقادوں اور ادیبوں نے ادب میں ایک گراں قدر اضافہ تسلیم کیا ہے۔

رنگ و بو کے نام سے آپ کی تین مثنویات کا مجموعہ ۱۹۵۴ء میں نظامی پریس بدایوں سے شائع ہوا ہے۔ اس میں "پریم کہانی" کے نام سے آپ نے شبری بھیلنی کے حالات کو مثنوی میں نظم کیا ہے۔ بڑی سلاست اور روانی ہے شبری کو بھگوان رام چندر نے خود جاکر درشن دیے تھے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے

ہوا محبوب جاں کا جب دیدار | تھی بے انبساط سے سرشار
نہ رہا ہوش تن بدن کا اُسے | نہ رہا ہوش پیرہن کا اُسے
دھوم انھیں دیکھ کر مچانے لگی | ناچنے گانے کھلکھلانے لگی!
منتظر تھے دیکھ کر یہ رام | امرتوں کا چھلک رہا تھا جام
کہا لچھمن نے اس سے اے شبری | ناچتی ہی رہے گی کیا یوں ہی

جلوہ فرما ہیں سامنے بھگوان | دیکھ تو تو کہاں ہے تیرا دھیان

منشی منی لال جوان سندیلوی شاگرد رشید آرزو لکھنوی نے رام بن باس کے نام سے اپنا اردو مسدس دو سال پہلے ہندی زبان میں شائع کرایا تھا۔ جوان صاحب کا مسدس رام بن باس اردو شاعری میں ایک یادگار کارنامہ ہے۔ اسی کتاب ابھی تک اردو میں شائع نہیں ہوئی ہے۔

تلسی داس جی کے رام چرت مانس کو اردو کے قابل ذکر مصنف منشی تیلو رتن لال درشن نے لاہور سے اردو نثر میں شائع کیا تھا۔ حضرت صبا لکھنوی نے اس ترجمہ کے بارے میں رسالہ صبح دہلی میں اظہار خیال کرتے ہوئے اسے ایک عدیم المثال اور جاودانی شہرت رکھنے والا کارنامہ بتایا ہے۔

منشی بانکے لال بہار نے ۱۸۹۶ء میں مطبع نول کشور پریس لکھنؤ سے رامائن کا اردو نظم میں خلاصہ پیش کیا ہے۔ شاعری کی خوبیاں اس نظم میں قابل داد ہیں

بلھو تلوک چند محروم نے رامائن کے کئی سین نظم کیے تھے جن سے استادانہ شان ٹپکتی ہے۔

ڈاکٹر منوہر سہائے انور نے رام کی عظمت پر کئی نظمیں لکھی ہیں جو ہمارے ادب میں ایک عمدہ اضافہ ہیں نظم "رام کی عظمت" کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے

مدار اے رام تیرے راج پر ہے تیری عظمت کا
وہ کس سے ہوسکا جو ہوگیا تیرے زمانے میں
کہیں تاریخ عالم میں نظیر اس کی نہیں ملتی
زمانے کا بھلا جتنا ہوا تیرے زمانے میں
بڑی راحت بڑے آرام سے سب لوگ رہتے تھے
کوئی فتنہ بپا ہوتا نہ تھا تیرے زمانے میں
زبردستوں کے ہاتھ اٹھتے نہیں تھے زیردستوں پر
نہیں ہوتا تھا ظلم ناروا تیرے زمانے میں
نہ الفاظ دگر اک وقت میں شیر اور بکری نے
بہم اک گھاٹ پر پانی پیا تیرے زمانے میں



ہندستان کی آزادی کے پچیس سال

محمد ہاشم قدوائی

پونے دو سو سال کی طویل، جاں گسل اور روح فرسا غلامی کے بعد ہندستان کو دنیا کی سب سے بڑی استعماری طاقت یعنی برطانوی استعمار کے پنجۂ غضب سے مہاتما گاندھی کی قیادت میں گلو خلاصی حاصل ہوئی۔ آزادی کی اس منزل تک پہنچنے میں ملک کو بے شمار قربانیاں دینا پڑیں اور نہ معلوم کتنے سرفروشان وطن نے آزادی کے لیے اپنی جانیں تک نچھاور کر دیں۔

جس وقت ملک آزاد ہوا ان گنت اور بے شمار مسئلے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ایک طرف لاکھوں پناہ گزیں تھے جو پاکستان کی نوزائیدہ مملکت سے بھاگ کر ہندستان آ گئے تھے۔ دوسری طرف ضبط و نظم کا زبردست مسئلہ تھا۔ تیسری طرف احیا پرست (REVIVALIST) فرقہ پرست جماعتوں نے سر اٹھایا اور مذہبی حکومت کے قیام کا مطالبہ کر رہی تھیں۔ چوتھی طرف ہندستانی ریاستوں کا مسئلہ تھا۔ ان میں سے بعض مکمل آزادی کا خواب دیکھ رہی تھیں۔ انتظامی مشنری کا حال بھی بہت ابتر تھا۔ یہ فرقہ وارانہ ذہنیت سے پوری طرح سے مسموم ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ ہندستانی معیشت (ECONOMY) کو بھی بحال کرنا تھا کیونکہ بغیر معاشی استحکام کے سیاسی آزادی بے معنی تھی۔ سب سے بڑا اور اہم مسئلہ یہ تھا کہ ملک میں ایک مستحکم حکومت قائم کی جائے جو ملک کی وحدت کو برقرار رکھ سکے، قوم پروری کو مضبوط کیا جا سکے اور ملک کا ایسا دستور مرتب کیا جائے جو سارے ملک کو ایک رشتے میں پرو سکے اور ہندستان کی اس امتیازی خصوصیت کے باوجود مذہبی، نسلی، لسانی اور تمدنی اختلافات کے ملک کے سارے باشندے ہندستانی قومیت کا جزو لاینفک ہیں اور ہندستان میں پوری طرح قائم اور برقرار رکھا جائے۔

ملک کی بدقسمتی تھی کہ آزادی کے چند ہی مہینوں کے بعد یعنی ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو اسے اپنے سب سے بڑے رہبر گاندھی جی سے محروم ہونا پڑا۔

ملک کی خوش قسمتی تھی کہ آزادی کے بعد ۱۷ برس تک اس کی قیادت جواہر لال نہرو کے ہاتھ میں رہی جن کی سی عظیم، متنوع صلاحیتوں والی شخصیت کہیں جا کر صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ ان کی قیادت میں ملک نے بہ حیثیت ترقی کی اور آج تک اس ترقی کا سلسلہ جاری ہے۔

دستور ساز اسمبلی نے نومبر ۱۹۴۹ء میں غیر مذہبی جمہوری دستور کو منظوری دی جس کا نفاذ ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء سے ہوا جس کی رو سے دنیا کی سب سے بڑی پارلیمنٹری جمہوریت کا قیام عمل میں آیا اور جمہوریہ ہند، انڈین یونین کے نام سے معرض وجود میں آئی۔ دستور نے سارے ہندستانیوں کو بلاتمیز یا تخصیص یا تفریق مذہب و ملت، جنس و زبان ہندستانی قومیت اور شہریت کے یکساں حقوق عطا کیے۔ اور ان کو انتظامیہ یا مقننہ کی چیرہ دستیوں اور زیادتیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے بنیادی حقوق دیے اور ان کو اس کا بھی حق عطا کیا کہ ان کے ان حقوق پر کسی قسم کی کوئی آنچ آئے تو وہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں اس کے خلاف چارہ جوئی کر سکتے ہیں۔ اس طرح جملہ ہندستانی شہریوں کی شہری اور سیاسی آزادی کا مکمل تحفظ کیا گیا۔

دور غلامی میں ہندوستان دو حصوں میں منقسم تھا۔ آبادی کے لحاظ سے ملک کا تقریباً ایک چوتھائی حصہ مطلق العنان اور مستبد راجاؤں اور مہاراجاؤں کے زیرنگیں تھا اور ہندوستان کے اس حصے کے بدنصیب باشندوں کو شہری آزادی مطلق حاصل نہ تھی۔ آزادی کے حصول کے چند مہینوں کے دوران تمام ریاستوں کو بڑے تدبر کے ساتھ یا تو سابق برطانوی ہند کے صوبوں کے ساتھ ضم کر دیا گیا یا متعدد ریاستوں کو ملا کر یونین بنائی گئی مثلاً راجپوتانہ کی سب ریاستوں کی یونین راجستھان اور کاٹھیاوار کی ریاستوں کی یونین سوراشٹر کے نام سے قائم کی گئی اور چند بڑی ریاستوں کو علاحدہ انتظامی وحدت کی شکل دی گئی۔ مثلاً حیدرآباد اور کشمیر۔ اس طرح سے دور غلامی کی اس دوئی کو دور کیا گیا اور سارا ملک سیاسی اعتبار سے ایک کر دیا گیا۔ راجاؤں مہاراجاؤں کی مطلق العنانی کا خاتمہ کر دیا گیا اور ان ریاستوں میں بھی جمہوری نظام حکومت قائم کر دیا گیا۔ چونکہ برطانوی عہد حکومت میں صوبے تمام تر انتظامی مصلحتوں کی بنا پر قائم کیے گئے تھے اس لیے ان کی بنا سائنٹفک نہ تھی اور ان میں بہت زیادہ اختلاف پایا جاتا تھا۔ اس خرابی کو ۱۹۵۶ء کو ریاستی تنظیمی ایکٹ کی رو سے جو بڑی حد تک ریاستی تنظیمی کمیشن کی سفارشوں پر مبنی تھا دور کیا گیا اور زبان کی بنیاد پر ریاستیں قائم کی گئیں۔ اس قسم کی تنظیم کا سلسلہ بعد تک جاری رہا۔ چنانچہ اب ملک میں ۲۱ ریاستیں ہیں۔ انتظامی وحدتیں قومی اتحاد کو استوار کرنے میں بہت زیادہ معین ہوئی ہیں۔

دستور کے ماتحت ۱۹۵۲ء میں دنیا کا سب سے بڑا جمہوری انتخاب ہوا اور ہندوستانی پارلیمنٹ کے ایوان زیریں یعنی لوک سبھا اور ریاستی اسمبلیوں کے ہزاروں ممبر منتخب ہوئے۔ آزادی کے ان ۲۵ برسوں میں اب تک ۵ عام انتخابات ہو چکے ہیں اور بہ حیثیت مجموعی یہ سارے انتخابات بڑے پرامن ہوئے۔

ہندوستانی معیشت (Economy) کو بحال کرنے کے لیے ملک کو معاشی اعتبار سے مضبوط کرنے اور اسے سرمایہ داری کے نظام کے مفاسد سے محفوظ رکھنے کے لیے پنج سالہ منصوبے بنائے گئے۔ پلاننگ کمیشن کا تقرر عمل میں آیا اور اب پانچواں منصوبہ زیر غور ہے۔ ان منصوبوں کی وجہ سے ملک کی پیداوار میں بے پناہ اضافہ ہوا اور قومی دولت و خوشحالی میں بھی اضافہ ہوا۔ صنعتی اعتبار سے ملک میں اتنی زیادہ ترقی ہوئی ہے کہ اس کا دور غلامی سے مقابلہ کیا ہی نہیں جا سکتا۔ دور غلامی میں مشین کے معمولی یا چھوٹے پرزے تک باہر کے ملکوں سے منگوائے جاتے تھے اور اب ۲۵ سال کی اس قلیل مدت میں بھاری بھاری دیو پیکر مشینیں، ہوائی جہاز، بحری جہاز، ریلوں کے ڈبے، مال گاڑیوں کے انجن، موٹر کاریں، سارا جنگی سامان، بجلی کا سامان سب ملک میں تیار ہونے لگا ہے۔

جواہر لال نہرو کی قیادت میں جمہوریہ ہند نے امن و آشتی اور غیر جانبداری کے اصولوں پر عمل پیرا ہو کر امتیازی پوزیشن حاصل کر لی۔ اس نے اپنے کو روسی اور امریکن بلاکوں سے الگ رکھا اور اس طرح سے دنیا کو تیسری عالمی جنگ سے محفوظ رکھا۔ اس کی قیادت میں ایشیا اور افریقہ کی نئی آزاد قوموں کے بلاک کا قیام ادارہ اقوام متحدہ میں عمل میں آیا جو عمل کے ساتھ ساتھ غیر جانب داری کا قائل ہے۔ نہرو کے بعد موجودہ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی قیادت میں جمہوریہ ہند اسی بنیادی پالیسی پر گامزن ہے کہ دوسرے ملکوں کی آزادی اور علاقائی سالمیت کا احترام کیا جائے، ان کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دیا جائے، بقائے باہم کے اصولوں پر عمل کیا جائے اور مظلوموں کے ساتھ ہمدردی کی جائے۔ چنانچہ جب پچھلے سال بنگلہ دیش میں پاکستانی فوجوں نے مظالم ڈھائے اور وہاں ایک کروڑ سے زیادہ مظلوم افراد پناہ لینے ہندوستان آئے تو ہندوستانی حکومت نے ان مظلوموں کے ساتھ پوری پوری ہمدردی کی اور جب پاکستانی مظالم کی حد نہ رہی تو ہندوستان نے بنگلہ دیش کی عملاً مدد کی اور بالآخر بنگلہ دیش آزاد ہو گیا اور اس طرح سے ہندوستان کے ہاتھوں استعماریت کو زبردست شکست اٹھانا پڑی۔

ان پچیس برسوں میں ہندستان نے جو ہمہ جہتی ترقی کی اس کا بہت ہی سرسری جائزہ ان اعداد و شمار سے لیا جا سکتا ہے۔

دورِ غلامی میں ہندستانیوں کی اوسط عمر ۲۳ سال تھی۔ ۱۹۶۱ء کی مردم شماری میں یہ ۴۲ سال ہو گئی اور اب یہ تقریباً ۴۸ سال ہے۔

انگریزی عہدِ حکومت میں شرحِ اموات ۲۷،۴ فی ہزار تھی لیکن ۷۰-۱۹۶۹ء میں یہ شرح گھٹ کر ۱۴ فی ہزار رہ گئی یعنی بقدر نصف کے رہ گئی۔

دورِ غلامی میں ملک میں خواندگی کا اوسط ۱۰ فی صد سے زیادہ نہ تھا یعنی پورے دو سو سال کی حکومت میں برطانوی حکومت ۱۰ فی صد سے زیادہ ہندستانیوں کو خواندہ نہ بنا سکی لیکن آزادی کے صرف ۲۵ برسوں میں خواندگی کا اوسط بڑھ کر ۲۹،۴۶ فی صد ہو گیا۔ آزادی کے ۴ سال بعد یعنی ۵۱-۱۹۵۰ء میں سارے ملک میں تعلیمی اداروں کی کل تعداد ۲۸۶۸۶۰ تھی۔ ۶۶-۱۹۶۵ء میں یعنی ۱۵، ۱۶ سال میں یہ تعداد دگنی سے زیادہ یعنی سات لاکھ پچیس ہزار چورانوے ہو گئی۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں طلباء کی کل تعداد دو کروڑ تئیس لاکھ سینتالیس ہزار تھی۔ ۶۷-۱۹۶۶ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۷ کروڑ چھپن لاکھ اکہتر ہزار ہو گئی یعنی ان میں تگنی سے زیادہ کا اضافہ ہوا۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں اساتذہ کی کل تعداد ۸ لاکھ چار ہزار تھی لیکن ۶۶-۱۹۶۵ء میں یہ تعداد تقریباً تگنی یعنی بائیس لاکھ بائیس ہزار ہو گئی۔ اسی طرح ۵۱-۱۹۵۰ء میں ہائر سکنڈری اسکولوں کی تعداد بیس ہزار آٹھ سو چوراسی تھی جو ۱۹۶۶ء میں بڑھ کر ایک لاکھ آٹھ ہزار سات سو چھیالیس ہو گئی۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں سارے ملک میں کل ستائیس یونیورسٹیاں تھیں۔ ۱۹۷۰ء میں یہ تعداد تگنی ہو گئی یعنی اکیاسی ہو گئی۔

آزادی کے ۴ سال بعد یعنی ۵۲-۱۹۵۱ء میں اعلیٰ صنعتی تعلیم کے اداروں کی کل تعداد ترپن تھی اور ڈپلوما دینے والے اداروں کی تعداد نواسی تھی لیکن ۱۹۷۰ء میں ڈگری دینے والے اداروں کی تعداد بڑھ کر ۱۳۶ اور ڈپلوما دینے والے اداروں کی تعداد ۲۷۰ ہو گئی۔

۱۹۵۱ء میں ڈگری لے کر نکلنے والے طلباء کی تعداد دو ہزار چھ سو ترانوے اور ڈپلوما پانے والوں کی تعداد دو ہزار چھ سو اڑتیس تھی۔ یہ تعداد ۱۹۶۵ء میں بڑھ کر بالترتیب سترہ ہزار سات سو اور پچیس ہزار ساڑھے سات سو ہو گئی۔

آزادی پر صحتِ عامہ کے سلسلے میں بہت بڑی کمی ڈاکٹروں اور دواؤں کی محسوس کی جاتی تھی۔ چنانچہ اس کمی کو فوراً دور کرنے کے لیے جو اقدامات کیے گئے ان کے نتیجے میں ۱۹۶۹ء میں سارے ملک میں ڈاکٹروں کی تعداد بڑھ کر ایک لاکھ نو ہزار اور نرسوں کی تعداد تقریباً ساٹھ ہزار ہو گئی۔ اس طرح میڈیکل کالجوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور ۱۹۷۰ء میں ملک بھر میں ترانوے میڈیکل کالج اور ستاون دندان سازی کے کالج تھے۔

تقسیم کے بعد ہندستان کو زبردست غذائی بحران کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ بعض زرخیز علاقے تقسیم کی بدولت پاکستان میں چلے گئے اور مغربی اور مشرقی علاقے پاکستان میں چلے گئے۔ ادھر آبادی میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا تھا جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے اس لیے مجبوراً کروڑوں روپے باہری ملکوں سے غلہ منگوانے پر صرف کیا جاتا تھا چنانچہ امریکہ سے لاکھوں ٹن غلہ منگوایا جاتا تھا۔ اس دشواری پر فوری طور سے قابو پانے کے لیے باہری ملکوں سے کافی مقدار میں غلہ منگوایا گیا۔ لیکن اسی کے ساتھ ملک کو غذائی اعتبار سے خود کفیل بنانے کی بھرپور کوششیں جاری رہیں اور پنج سالہ منصوبوں میں زراعت اور غذائی پیداوار بڑھانے پر زور دیا جاتا رہا۔ اسی کے ساتھ کاشتکاری کے جدید ترین اور سائنٹفک طریقے اختیار کرنے اور عمدہ بیج، ٹریکٹر اور اچھی کھاد فراہم کرنے کی جانب خصوصی توجہ کی گئی۔ اسی ضمن میں کھاد تیار کرنے کے کئی بڑے کارخانے حکومت نے قائم کیے ہیں۔ چنانچہ ٹریکٹر ہزاروں کی تعداد میں استعمال کیے جا رہے ہیں۔ ان سب تدبیروں کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ پیداوار میں بہت زیادہ اضافہ ہوا ہے اور بعض اشیاء کی پیداوار میں خود کفیل ہو گیا ہے یا خود مکتفی ہونے کے قریب آ گیا ہے اس لیے اب دوسرے ملکوں سے غلہ

کم مقدار میں منگوایا جاتا ہے سنہ ۱۹۶۴ء میں چونسٹھ لاکھ پچاس ہزار ٹن چاول باہر سے منگوایا گیا تھا۔ سنہ ۱۹۷۰ء میں یہ مقدار ۲۰ لاکھ ۶۰ ہزار ٹن رہ گئی۔

سنہ ۱۹۶۴ء میں ۵ کروڑ باسٹھ لاکھ دس ہزار ٹن گیہوں اور آٹا منگوایا گیا تھا لیکن سنہ ۱۹۷۰ء میں ۳ کروڑ ساڑھے بیالیس ہزار ٹن منگوایا گیا۔ سنہ ۱۹۵۰-۵۱ء میں چاول کی کل پیداوار ۲ کروڑ چھتر ہزار ٹن تھی۔ سنہ ۱۹۶۹-۷۰ء میں یہ بڑھ کر ۴ کروڑ ۴ لاکھ تیس ہزار ٹن ہو گئی۔ گیہوں کی پیداوار بڑھ کر ۲ کروڑ تر انوے ہزار ٹن ہو گئی۔ اسی طرح سے اس مدت میں جوار، باجرہ اور چنے کی پیداوار علی الترتیب ۵۴ لاکھ پچانوے ہزار ٹن سے بڑھ کر ۹۰ لاکھ ۲۱ ہزار ٹن، ۲۵ لاکھ ۹۵ ہزار ٹن سے بڑھ کر ۵۳ لاکھ ۲۷ ہزار ٹن ہو گئی اور ۳۶ لاکھ ۱۵ ہزار سے بڑھ کر ۵۵ لاکھ ۶۴ ہزار ٹن ہو گئی۔ چائے اور کافی کی پیداوار علی الترتیب سنہ ۱۹۵۰-۵۱ء کی ۲ لاکھ چھتر ہزار اور پچیس ہزار ٹن سے بڑھ کر ۳ لاکھ چھیانوے ہزار ٹن اور ۶۳ ہزار ٹن ہو گئی۔

سنہ ۱۹۵۱ء میں دس ہزار سے کم آبادی والے جن قصبوں میں بجلی پہنچی ان کی تعداد تین ہزار سات سو پچیس تھی۔ مارچ سنہ ۱۹۷۰ء میں یہ تعداد بڑھ کر نوے ہزار تین سو تراسی ہو گئی۔ دس ہزار سے زیادہ اور ۵۰ ہزار سے کم آبادی والے جن شہروں میں بجلی پہنچی ان کی تعداد سنہ ۱۹۵۱ء میں چھ سو اٹھانوے تھی۔ مارچ سنہ ۱۹۷۰ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۲ ہزار چھتیس ہو گئی۔

سنہ ۱۹۵۰-۵۱ء میں کوئلہ کی پیداوار ۳ سو اٹھائیس لاکھ ٹن تھی۔ سنہ ۱۹۶۹ء میں یہ دو گنے سے زیادہ ہو گئی۔ اس سال لوہے کی پیداوار تیس لاکھ ٹن تھی۔ سنہ ۱۹۶۹ء میں یہ بڑھ کر ۲ کروڑ سات لاکھ ٹن ہو گئی۔ سنہ ۱۹۵۰-۵۱ء میں فولاد کی پیداوار ۱۴ لاکھ ۲ ہزار ٹن۔ سنہ ۱۹۶۹ء میں اس میں بعد ساڑھے چار گنا اضافہ ہوا یعنی اب ۶۳ لاکھ تین ہزار ٹن ہو گئی۔ المونیم کی پیداوار سنہ ۱۹۵۰-۵۱ء میں ۴۰ ہزار ٹن تھی۔ سنہ ۱۹۶۹-۷۰ء میں یہ بڑھ کر ۱ لاکھ ۳۵ ہزار ٹن ہو گئی۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں ملوں میں تین سو نو ملین میٹر سوتی کپڑا تیار

ہوا۔ سنہ ۱۹۶۹-۷۰ء میں اس کی مقدار بڑھ کر ۳ ر ۷۷۵ ہو گئی۔

سنہ ۱۹۴۵-۴۶ء میں شکر ملوں کی تعداد ایک سو تیس تھی۔ سنہ ۱۹۶۹-۷۰ء میں یہ بڑھ کر دو سو سات ہو گئی۔ سنہ ۱۹۴۵-۴۶ء میں شکر کی پیداوار ۹ لاکھ اڑتیس ہزار ٹن تھی۔ سنہ ۱۹۶۹-۷۰ء میں اس میں چوگنے سے زیادہ کا اضافہ ہوا یعنی یہ بڑھ کر ۴۲ لاکھ ۶۱ ہزار ٹن ہو گئی۔

سنہ ۱۹۴۷ء میں ملک میں سیمنٹ کی پیداوار ۱۴ لاکھ ۹۹ ہزار ٹن تھی۔ سنہ ۱۹۷۰-۷۱ء میں یہ بڑھ کر ایک سو ۴۳ لاکھ ٹن ہو گئی یعنی ۲۵ برسوں میں اس کی پیداوار میں دس گنا اضافہ ہوا۔

سنہ ۱۹۴۳ء میں کاغذ کے کارخانوں کی تعداد ۱۵ تھی اور یہ کارخانے ایک لاکھ تین ہزار آٹھ سو چار اسی ٹن کاغذ سالانہ تیار کرتے تھے اب ان کارخانوں کی تعداد ۵۷ ہے اور اب کاغذ کی پیداوار بڑھ کر ۷ لاکھ ۶۸ ہزار ٹن سالانہ ہو گئی یعنی اس میں تقریباً ۷ گنے کا اضافہ ہوا۔

سنہ ۱۹۵۰-۵۱ء میں ہندستانی ریلیں ۵۲ ہزار ۲ سو چھیانوے کیلو میٹر لمبی تھی۔ تقسیم کی وجہ سے مشرقی اور شمالی مغربی حصوں کی ریلوے لائن پاکستان کے حصہ میں جا چکی تھی اور اس طرح سے کئی ہزار کیلو میٹر کی کمی واقع ہوئی تھی لیکن سنہ ۱۹۶۹-۷۰ء میں ہندستانی ریلیں ۵۹ ہزار ۴۶۸ کیلو میٹر لمبی یعنی ان میں تقریباً ۷ ہزار کیلو میٹر کا اضافہ ہوا۔

دور غلامی میں ریلوے انجن سواری یا مال گاڑی کے ڈبے ریلوے انجنوں اور ویگنوں کو اٹھانے والے کرین اور دوسری ساری مشینیں دوسرے ملکوں سے منگوائے جاتے تھے اور ان پر زر کثیر صرف ہوتا تھا لیکن اب ریلوے کا سارا سامان ملک میں تیار ہونے لگا ہے۔ بنگلور اور چترنجن میں اس سامان کی تیاری کے لیے عظیم الشان کارخانے تیار ہیں۔

سنہ ۱۹۵۰-۵۱ء میں بھاپ سے چلنے والے ریلوے انجنوں کی تعداد آٹھ ہزار ایک سو بیس تھی سنہ ۱۹۶۹-۷۰ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۹ ہزار سات سو ہو گئی اس سال ڈیزل سے چلنے والے انجنوں کی کل تعداد ۱۰ تھی

لیکن ۷۰-۱۹۶۹ء میں یہ تعداد بڑھ کر ایک ہزار ایکیانوے ہو گئی یعنی تقریباً ۲۰ برسوں میں ساٹھ گنا اضافہ ہوا۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں بجلی سے چلنے والے انجنوں کی تعداد ۱۷ تھی۔ تقریباً ۲ قرنوں کی قلیل مدت یعنی ۷۰-۱۹۶۹ء میں ۵ سو ۵۲ ہو گئی یعنی آٹھ گنے کا اضافہ ہوا۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں ریل کے ڈبوں کی تعداد ۲ لاکھ ۵ ہزار ۹۶ تھی۔ ۷۰-۱۹۶۹ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۳ لاکھ ۸۳ ہزار آٹھ سو ایکیانوے ہو گئی۔ ۵۱-۱۹۵۰ء میں ۱۲ کھرب ۸۴ کروڑ افراد نے ریلوے ٹرینوں پر سفر کیا لیکن ۲۰ برس کی مدت یعنی ۷۰-۱۹۶۹ء میں مسافروں کی تعداد ۲۲ کھرب ۳۸ کروڑ ہو گئی۔

۱۹۴۷ء میں ہوائی جہاز سے سفر کرنے والوں کی تعداد ۲½ لاکھ تھی۔ ۱۹۷۰ء میں یہ تعداد بڑھ کر ۲۷½ لاکھ تک پہنچ گئی یعنی ۲۳ برس میں ہوائی جہاز کے مسافروں میں ۱۱ گنا اضافہ ہوا۔

اسی طرح سے ڈاک اور تار کے محکموں میں بے پناہ توسیع ہو گئی۔ ۴۹-۱۹۴۸ء میں ڈاک سے لائی ہوئی کل چیزوں کی تعداد ۲۲۶۰۰ ہم کروڑ تھی۔ ۷۰-۱۹۶۹ء میں اس کی میزان ۱۷۹۱ ۲۲ کروڑ ہو گئی۔ ۴۹-۱۹۴۸ء میں سارے ملک میں ٹیلیفون کی کل تعداد ایک لاکھ ۲۰ ہزار تھی۔ ۱۹۶۹ء میں اس میں تقریباً بارہ گنا اضافہ ہوا اور ان کی تعداد ۱۲ لاکھ ۱۷ ہزار ہو گئی۔ ۴۹-۱۹۴۸ء میں ڈاکخانوں سے دو کروڑ ۱۷ لاکھ تار بھیجے گئے۔ ۱۹۷۱ء میں ان کی تعداد بڑھ کر ۴ کروڑ ۹۳ لاکھ ہو گئی۔ ۱۹۵۰ء میں ملک بھر میں ۳۶ ہزار ۴۹ ڈاک خانے تھے۔ ۷۰-۱۹۶۹ء میں اس تعداد میں بقدر ۳ گنے کا اضافہ ہوا یعنی ان کی تعداد بڑھ کر ۱ لاکھ ۴ ہزار ۹ سو چھپن ہو گئی۔

جمہوریہ ہند اس پر سختی سے عامل ہے کہ دنیا میں امن و امان رکھنے کی کوششوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے اور کسی ملک کے اندرونی معاملہ میں مداخلت نہ کرے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ہندستان کی علاقائی سالمیت پر آنچ نہیں آنے دیتی اور ملک کی سرزمین کی ایک ایک انچ کی حفاظت کے لیے کمربستہ رہتی ہے اسی لیے ملک کے دفاع پر خاصی توجہ کی گئی ہے اور دوسرے ملکوں پر بھروسہ کرنے کے بجائے خود اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے اصول پر عمل درآمد ہے اسی لیے جنگی سامان ملک ہی میں تیار کیا جانے لگا ہے دفاعی مسئلوں پر ماہرین فن کی تحقیقات سے پورا فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور جنگ کے جدید ترین طریقوں کو اپنایا جاتا ہے اور ہندستانی فوجوں کو جدید ترین اسلحوں سے مسلح کیا جاتا ہے اور یہی وجہ تھی کہ بنگلہ دیش کی جنگ کے موقع پر پاکستان کے مقابلے میں اتنی نمایاں کامیابی حاصل کی۔

پنڈت نہرو اور ان کے بعد ان کی لائق جانشین مسز اندرا گاندھی کو اس کا پورا احساس ہے کہ ملک کی ساری معاشی و صنعتی ترقی بے معنی ہو کے رہ جائے اگر اس سے ہندستانی عوام کو فائدہ نہ پہنچے اسی لیے پنڈت جی کی زندگی میں ہی کانگریس نے اپنے سالانہ اجلاس منعقدہ آواڈی جنوری ۱۹۵۵ء میں یہ فیصلہ کیا کہ اس کا نصب العین ہندستان میں اشتراکیت کا قیام ہے اور اس کے بعد حکومت کی ساری پالیسیوں کا یہی محور قرار پایا تاکہ ہندستانی عوام کو معاشی خوش حالی کے فائدے حاصل ہوں اور وہ سرمایہ داروں کے استحصال سے محفوظ رہیں۔

مسز اندرا گاندھی کی قیادت میں کانگریس جمہوری اشتراکیت لانے کے لیے کوشاں ہے اسی لیے وزیر اعظم نے غریبی ہٹاؤ کا پروگرام ملک کے سامنے رکھا اور سرمایہ دارانہ نظام کے مفاسد کو دور کرنے کے لیے اس قسم کے اقدامات کیے تاکہ ملک میں اشتراکیت آئے لیکن یہ اشتراکیت جمہوری ہو۔ چنانچہ بینکوں کو قومیا یا گیا اور اب شہری و دیہی جائدادوں پر حد بندی کی جا رہی ہے۔ پنڈت نہرو کے زمانہ میں یہ فیصلہ پہلے ہی کیا جا چکا تھا کہ کلیدی صنعتیں نجی ملکیت میں نہیں بلکہ حکومت کے ہاتھ میں رہیں گی۔ اندرا حکومت کے مزید اشتراکی اقدامات سے جمہوری اشتراکیت کے لیے میدان اور زیادہ صاف ہو گیا ہے۔ امید ہے کہ ان اقدامات سے ملک سے غریبی دور ہو گی اور ملک سے دوسری لعنتیں بھی جلد دور ہوں گی جو ترقی کے راستے میں زبردست رکاوٹ اور غیر مذہبی جمہوریت کے لیے زبردست خطرہ ثابت ہو رہی ہیں۔



آج ہم ہر رنگ کے انسان کو ہم رنگ کرو

ہزار لکھنوی

اک نئے دور کا پھر آج سوال آیا ہے
ذہنِ انساں میں پھر اک نیک خیال آیا ہے
پھر نئے ڈھنگ سے تبلیغ وفا کرنا ہے
حق نئے تازہ تقاضوں کا ادا کرنا ہے
پھر تڑپ لانا ہے یک جہتی و یک رنگی کی
چھاپ باقی ہے ابھی ذہنوں میں افرنگی کی
دل کے آئینوں میں مٹی ہے کدورت اب بھی
عظمتِ صدق و صفا کی ہے ضرورت اب بھی
رنگ اور نسل ہے کیا چھوٹا بڑا کیا شے ہے
دولت و غربت و ثروت کی بلا کیا شے ہے
دہر میں پیدا کچھ اس طرح کا آہنگ کرو
آج ہر رنگ کے انسان کو یک رنگ کرو
صاف دل ہو کے گلے مل کے رہو اچھا ہے
کام اچھا ہو تو کھل ڈل کے کہو اچھا ہے
آج بھی قلت و کثرت کا سوال آتا ہے
شیشۂ دل میں ابھی بات سے بال آتا ہے
وقت کے ساتھ تو ہر ایک کو چلنا ہوگا
صرف ہم ہی نہیں ہم سب کو بدلنا ہوگا

گیت نئے دور کا

حیات وارثی

ساتھیو، دوستو، اپنے خیالوں کے رُخ کو اب موڑ دو
آزادی کے پھول کھلے ہیں جشن بہاراں کی رُت ہے
ارمانوں کے دیپ سجے ہیں جشن بہاراں کی رُت ہے
سماج واد کا سورج چمکا اندھکار کو چھوڑ دو
ساتھیو، دوستو!
امن و محبت کے دیپک پر جس سے داغ نظر آئیں
جس میں عداوت کی چھایا ہو اور نفرت کی باتیں
جو انساں کا روپ بگاڑے اس درپن کو توڑ دو
ساتھیو، دوستو!
دکھ کا اندھیارا چھٹ جائے، سکھ کا اُجیالا چھا جائے
تاج اٹھیں شہروں کی سڑکیں گاؤں کا گلشن کھل جائے
اپنی ہمت اور محنت سے بیرن کا رخ موڑ دو
ساتھیو، دوستو!
آشاؤں کی کلیاں مہکیں، ارمانوں کے پھول کھلیں
الگ الگ راہوں کے راہی آ کے اک منزل پہ ملیں
دل کے رشتے ٹوٹ گئے ہیں ان کو پھر سے جوڑ دو
ساتھیو، دوستو!
سورگ بنے یہ اپنی دھرتی سکھ کے پرچم لہرائیں
جو پیاسے ہیں اک مدت سے جام خوشی کے چھلکائیں
عزم و عمل کی تنویروں سے رخِ ظلمت کا موڑ دو
ساتھیو، دوستو!
سماج واد کا سورج چمکا اندھکار کو چھوڑ دو!

پچیسواں دور

وشو ناتھ پرشاد ماتھر لکھنوی

روشنی پھیل گئی آ گئی گلشن میں بہار
دیکھو پورب سے نکلتے ہوئے سورج کا نکھار
سارے عالم پہ فضا چھا گئی آزادی کی
کلیاں چٹکیں تو مہک آ گئی آزادی کی
جب ہوا سنکی تو گل ریز ترانہ آیا
پھول کے لب پہ محبت کا فسانہ آیا
زندگی ایک نئے روپ میں لہرا کے اٹھی
قوم بھی عظمتِ قومی کی قسم کھا کے اٹھی
بکھرے بکھرے ہوئے بادل جو فضا پر چھائے
گنگا اور جمنا نے الفت کے ترانے گائے
خوں میں ڈوبے ہوئے برباد چمن یاد آئے
سج گئی بزم تو احباب وطن یاد آئے
باپو کی یاد میں آتی ہوئی آوازِ وفا
وہ بھگت سنگھ کا انجام وہ آغازِ وفا
وہ ہمالہ کی بلندی میں حقیقت کا چلن
وہ نگاہوں کی تجلی میں جواہر کی کرن
ناؤ طوفانوں کی آغوش میں کھینے والے
یاد آتے رہے قربانیاں دینے والے

رنگ مے خانے پہ نکھرا ہوا اور آیا ہے
مے کشو دیکھو تو پچیسواں دور آیا ہے

عشق اور رنگ میں ڈوبی ہوئی راہیں ٹھہریں
آج چھلکے ہوئے ساغر پہ نگاہیں ٹھہریں
جب ترقی کا قدم اٹھا تو آہٹ بدلی
ملک نے اک نئے انداز میں کروٹ بدلی
زندگی رشک بنی سارے زمانے کے لیے
چپے چپے سے غریبی کو ہٹانے کے لیے
قوم بڑھنے لگی قسمت کا ستارہ چمکا
چاندنی پھیل گئی چاند کا چہرہ چمکا
زندگی ردیف محبت کی خریدار ہوئی
قافلہ بڑھنے لگا تیز جو رفتار ہوئی

متحد قوم رہے قلب ہر اک شاد رہے
یہ تمنا ہے کہ ماتھر وطن آباد رہے

تراونڈرم ۱۹۷۲ء اشک

یومِ آزادی

وشنو کمار شوق

ہر ایک سمت چمن میں بہار آئی ہے
کلی چٹک کے پیامِ [illegible] لائی ہے

شگفتہ سی [illegible] کے ماتھے پر
[illegible] میں ڈولی ہوئی حنائی ہے

[illegible] ایک پھول ستاروں کا [illegible]
[illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible] طرف سے چلی ہے [illegible]
ہر کلی سے گلستاں کی مسکرائی ہے

ہر ایک قید سے آزاد ہو گئیں سانسیں
بہار اہلِ گلستاں کو راس آئی ہے

زمانے بھر کی نگاہیں ہیں کس لیے مشکوک
ہزاروں اشک پیے تو ہنسی بھی آئی ہے

نہ پوچھ کاٹی ہیں آنکھوں میں کتنی راتیں شوق
سکوں کی نیند زمانے کے بعد آئی ہے

سوادِ منزل

درشن سنگھ

[illegible]

ایک دست سے [illegible] پھوٹ بہے
فضا میں [illegible] نظر آتی [illegible]
قدم بڑھا کہ [illegible]
[illegible] ناروائی
اٹھو وطن کے لیے کام ہم کو کرنا ہے
کہ [illegible] امن و مسرت [illegible] انسانی
نثار ہو گئے کتنے ہی اہلِ دل درشن
بھلا سکے گی یہ دنیا نہ جن کی قربانی

[illegible]

ہمارے عزائم

اختر بستوی

ملی تھی ہم کو آزادی جو چوتھائی صدی پہلے
اُسے ہم نے سنوارا بھی سنوارا بھی نکھارا بھی
[illegible] ہو کر [illegible] سے آگے
[illegible] عزت سے [illegible]
کھلا کر [illegible]
ترقی کے سنہرے خواب سوتے جاگتے دیکھے
جیالوں حوصلوں کی [illegible]
کہ [illegible] دیکھئے
ہمارا قافلہ ہے گامزن [illegible]
ہماری [illegible] خوش قسمتی [illegible]
نہیں [illegible]
ہمارے قلب میں [illegible]
[illegible] خوشحالی کے [illegible]
یہ آزادی کے [illegible] کی [illegible] ساعت
بجا ہے ہم اگر اس وقت [illegible] مسرت ہوں
کہ اب معلوم ہے ہم کو کبھی از [illegible] راحت
مگر یہ عہد بھی ہم کو جیالوں کی اس ساعت میں کرنا ہے
کہ اپنی منزلوں کی سمت ہم بڑھتے ہی جائیں گے
ابھی ہیں نامکمل سارے منصوبے ترقی کے
انھیں تکمیل کی حد تک ہر اک قیمت پہ لائیں گے
جو اپنے زور بازو سے، خود اپنے ہی وسائل سے
وطن کے واسطے حاصل کریں گے عزت و عظمت
عطا کر دیں گے سارے ملک کو ہم ایسی زیبائش
کہ دنیا کہہ اٹھے "ہندوستاں ہے واقعی جنت"

آزادی کے دن

[illegible]

[illegible] کی بات کرتے ہیں — [illegible] کی بات کرتے ہیں
[illegible] کی بات کرتے ہیں — [illegible] جہاں کی بات کرتے ہیں
[illegible] کی بات کرتے ہیں

[illegible] آزادی — [illegible] جہاں [illegible] آزادی
[illegible] آزادی — [illegible] آزادی
[illegible] آزادی

[illegible] — [illegible]
[illegible] — [illegible] رنگ نکھارا ہے
[illegible] کا رنگ نکھارا ہے

[illegible] آئینہ — [illegible] آئینہ
[illegible] — [illegible] آئینہ
[illegible] آئینہ

[illegible] میں دیکھا — [illegible] میں دیکھا
[illegible] میں دیکھا — [illegible] قوم کی تعمیر میں دیکھا
محبت کا مرقع جنت کشمیر میں دیکھا

ہمالہ کے [illegible] تاریخ شاہد ہے — شہیدوں کے ہر اک [illegible] تاریخ شاہد ہے
[illegible] تاریخ شاہد ہے — [illegible] تاریخ شاہد ہے
[illegible] تاریخ شاہد ہے

[illegible] جشن آزادی منانا ہے — ہمیں اہل جہاں کو [illegible]
[illegible] نغمہ سنانا ہے — [illegible]
[illegible] لہرانا ہے

آزادی سے آزادی تک

احمد جمال پاشا

آزادی کی ۴۵ویں سالگرہ کے مبارک موقع پر مجھے [illegible]
[illegible] سے پہلے کا زمانہ یاد آرہا ہے۔ آج یاد کر کے حیرت ہوتی ہے [illegible]
ایک وہ بھی دور تھا اور وہ بھی دن [illegible]
اس وقت تک یہی سبق پڑھایا گیا تھا کہ [illegible]
[illegible] ایسے مائی کے لال [illegible]
[illegible] گاندھی جی [illegible]
[illegible] جیسے جلے کا [illegible]
[illegible] کام ہوتے تھے میری سمجھ [illegible]
[illegible] ایک اونچی سی [illegible] رہی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سب سے پہلے [illegible] سائیکل تیار
ہوئی تو [illegible] لڑکوں کو یقین نہ آیا تھا [illegible]
[illegible] اس کا مذاق اڑاتے تھے کسی نے کہا
"اماں [illegible] یہ بچہ ہیں تمہاری سائیکل رکھ لی"
کوئی بولا:
"[illegible] کا بچہ پہلی بیٹھ سے ہی [illegible]"
"[illegible] گھنٹے [illegible] ایک ایک پتیاں [illegible]"

اس کے بعد لوگوں نے ڈرتے ڈرتے دیسی سائیکل خریدی پھر
عام جنتا دیسی سائیکل استعمال کرنے لگی۔ اس کے بعد تو سائیکل
[illegible] ولائتی سائیکلیں اس کے آگے بھول گئے۔

آزادی کے ساتھ ہماری قومی حکومت نے ملکی صنعت و حرفت
پر [illegible] توجہ دی اس کے نتیجے میں ولائتی چیزوں کا طوفان
نکل گیا اور ملکی اور دیسی اشیاء کا اچھا خاصا سیلاب سا آگیا

[illegible] تمام [illegible]
[illegible] آیا کرتی نہیں [illegible]
[illegible] صرف ملک میں لوگوں کو [illegible] بلکہ دوسرے
ملکوں کو بھی اس طرح جانے لگیں جیسے پہلے کبھی یہاں آتی تھیں
[illegible] ہوائی جہاز اور ریل
[illegible] کے انجن سے لے کر [illegible] تک بننے لگے۔
[illegible] تقریباً یہ صورت ہے کہ [illegible] رہ گئی
ہے۔ اس کے باوجود [illegible] ڈاکٹروں اور صنعت [illegible]
کی ایجاد و ترقی کی گاڑی طوفان میل کی رفتار سے بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

آزادی کے بارے میں جب میں سوچتا ہوں [illegible]
میں آزادی کی سلور جبلی کے موقع پر تو سب سے زیادہ خوشی مجھے
اس بات پر ہوئی ہے کہ ہم آزاد ہوتے ہی اپنے پیروں پر کھڑے
ہو گئے اور اس قدر مضبوطی سے کہ اب قدم جمائے ہوئے [illegible]
بجائے کسی کا سہارا لینے کے اب دوسروں کے لیے سہارا بنے ہوئے ہیں۔

آزادی کے ان پچیس برسوں میں ملک ہر میدان میں ترقی
کر کے کہاں سے کہاں پہنچ چکا ہے اس کا اندازہ صرف ان دو
آنکھوں والوں کو ہو سکتا ہے جنھوں نے دور سامراج کی ظلمت میں دیکھی تھی۔

[illegible] اور [illegible] ہماری [illegible]
[illegible] جیسے [illegible] اور [illegible] وغیرہ انھیں چھوڑیے
اور کسی چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں چلے جائیے، وہ گاؤں جہاں
آزادی سے پہلے زمیندار اور جاگیردار رہا کرتے تھے اور باقی
سب ان کی پرجا، جن کا کام بیگار کرنا، جوتے کھانا اور تقریباً

جو کام بڑا ہوا کرتا تھا اب ایسی مواصلات ہیں جا بجا تو جہاں
دھول اڑتی تھی وہاں اب کھیتیاں لہلاتی ہیں۔ ہر جگہ رہٹ
ٹیوب ویل اور نہر سے سینچائی ہوتی ملے گی۔ ملک کی جانب سے
بیج اور کیمیاوی کھاد وغیرہ کی سپلائی کا انتظام ملے گا اس کے
علاوہ گرام سبھا میں کھیتی کو نئے سائنسی طریقے سے بہتر بنانے
کے بارے میں معلومات بہم پہنچانے کے لیے جو جلسے ہوتے ہیں کھیت
کھیت میں زراعت کے ترقی یافتہ طریقوں کے جو عملی مظاہرے
کیے جاتے ہیں [illegible] ان طریقوں کی جو نشر و اشاعت
ہوتی رہی ہے [illegible] ان کے اسے یہ نتیجے ملتے ہیں کہ اب
کسان اپنے کھیت، ان کی مٹی اور فصل کے بارے میں سب
کچھ جانتا ہے وہ کھیت کے [illegible] کیڑوں سے کیمیاوی ادویات
کی مدد سے اسی طرح لڑتا ہے جیسے سپاہی میدان جنگ میں

گاؤں میں اب آپ [illegible]
اور پکے مکانوں کے علاوہ بجلی کی [illegible] ملیں گے کھیتوں
پر ٹریکٹر پہنچے اور کسان سائیکل پر راستے طے کرتے ملیں گے۔
چوپال میں [illegible] آپ کو باقاعدہ اخبار
[illegible] پڑھتے اور [illegible] سیاسی، اقتصادی اور
سماجی مسائل پر بحث کرتے دکھائی دیں گے

گاؤں میں آپ کو کھیتوں کی طرف جاتے ہوئے صرف بیل
ہی نہیں اب ٹریکٹر بھی نظر آئیں گے [illegible] منڈی اناج
ترکاریاں لے جانے والے کسان اب بیل گاڑی کے علاوہ ٹرک
پر بھی منڈی مال لے جاتے دکھائی دیں گے یہ وہ بے حساب
ترقی ہے جس کا ہم آزادی سے پہلے تصور تک نہیں کر سکتے تھے۔
گاؤں میں ترقی کی یہ ایک بہت ہی ہلکی جھلکی جھلک ہے ورنہ
ہمارے دیہات نے صنعتی میدان میں بھی ترقی کی ہے ہر گاؤں
میں جیسے جیسے گھریلو صنعت سے بھی آپ کو نظر آ جائیں گے کہیں چٹائیاں
بنی جا رہی ہیں، کہیں رسی بٹی جا رہی ہے، کہیں ٹوکرے بنائے جا رہے
ہیں، کہیں شہد کی مکھی، بکری اور مرغی پالی جا رہی ہے غرض کھیتی کے

علاوہ فاضل اوقات میں بھی کسان کوئی نہ کوئی صنعتی دھندا کرتے ہوئے
نظر آ جائیں گے ہر گاؤں میں گاؤں یا قصبے کے درمیان آپ کو ایک
آدھ بینک بھی اب مل جائے گا۔ اور اب تو ہم نے ایک قدم اور بڑھایا
ہے اور دیہی عوام کے لیے ٹیلی فون مہیا کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ تجربے
کے طور پر کئی گاؤں میں ٹیلی فون نصب کیے جا چکے ہیں۔ غرض یہ کہ یہ
آزادی کی برکت ہے جو آپ کسی بھی گاؤں میں دیکھ سکتے ہیں۔
آزادی میں جو خوشحالی اور ترقی کی جھلک شہروں خصوصاً صنعتی
شہروں میں [illegible] ان ترقیوں کو دیکھ کر یہی
خیال آتا ہے کہ پہلے کے مقابلے میں اب ہم کتنے عظیم ہیں اب ہمارے پاس کیا نہیں ہے؟
اس کے ساتھ خوشی کی بات یہ بھی ہے کہ ترقی برابر جاری ہے
[illegible] کی رفتار بڑھ رہی ہے۔ میں اس رفتار کو دیکھتا ہوں اور تھوڑا پیچھے
[illegible] نظر دوڑاتا ہوں تو خیالات جھنجھلا اٹھتے ہیں
غلامی سے آزادی تک اور آزادی سے آزادی کی پچیسویں
سالگرہ کے جشن تک کے اس چوتھائی صدی کے سفر کو آپ بھی
دیکھیے [illegible] تو دم بخود محسوس کریں گے۔
لیکن آزادی کی ایک منزل ابھی باقی ہے جس کی جانب
ہماری پیش قدمی شروع ہو چکی ہے وہ ہے غریبی سے آزادی۔
جب میں اپنی قومی آزادی پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے یقین آ جاتا
ہے کہ ہم غریبی سے بھی اسی طرح آزادی حاصل کریں گے جس طرح
ہم نے غلامی سے آزادی حاصل کر لی تھی۔ غلامی سے آزادی ناممکن
معلوم ہوتی تھی جیسے کہ ہم غلامی کا پٹہ لکھا کر لائے ہیں اسی طرح
غریبی سے آزادی بظاہر ناممکن معلوم ہوتی ہے لیکن ہماری
تاریخ خود اس کی گواہ ہے کہ ہم ناممکن کو ممکن بنا سکتے ہیں۔
اس لیے یقین ہے کہ ہمیں غریبی کی غلامی سے بھی آزادی مل کر
رہے گی۔ ضرورت ہے کہ ہم عزم و استقلال سے کام لیں، طرح طرح کے نئے
پیداواری طریقوں کو بروئے کار لائیں، اشتراک و تعاون کریں اور سب سے
بڑھ کر یہ کہ ضبط و نظم برقرار رکھیں۔ بد نظمی اور بد امنی ترقی کی راہ میں [illegible]
دیں اور اتحاد میں ملاپ اور ایک جٹ ہو کر کسی قیمت پر [illegible]



امتحاں اور بھی ہیں

علامہ احمد شرقی ـ کاکوروی

پندرہ اگست ۱۹۷۲ء کو ہندوستان کی آزادی کو پورے پچیس سال ہو جاتے ہیں اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس ربع صدی میں ہندوستان نے زندگی کے مختلف شعبوں مثلاً معاشیات، صنعت و حرفت، تجارت، تعلیم، رسل و رسائل اور تعمیرات میں جو ترقی کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ممکن ہے بعض لوگ اس رفتارِ ترقی سے مطمئن نہ ہوں اور ان کو ترقی کے فوائد بھی عام ہونے کی بجائے محدود نظر آتے ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو فوری اور ہمہ گیر نتائج کے متمنی ہو سکتے ہیں۔ لیکن یہ نقطۂ نظر حقیقت پسندانہ نہیں کہا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ جن حالات میں ملک نے آزادی حاصل کی ان کے باوجود گذشتہ پچیس سال میں جو ترقیاں ہوئی ہیں ان کی مثال کوئی دوسرا ملک پیش نہیں کر سکتا ہے۔

آزادی کی اس باسٹھ سالہ تحریک میں، جس کا باقاعدہ آغاز ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام سے شروع ہو کر ۱۹۴۷ء میں حصولِ آزادی پر ختم ہوا، ہمارے ملک کے سیاسی رہنماؤں نے جو جانی اور مالی قربانیاں دی ہیں اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے کیونکہ اس دور میں محبانِ وطن کو قدم قدم پر ایسے ہفت خواں طے کرنا پڑے جن کی ہیبت بڑے بڑے پہاڑوں کو ہلا دینے کے لیے کافی تھی۔ لیکن آزادیِ وطن کے متوالوں نے راہ کی دشواریوں کی چنداں پرواہ نہ کی اور ـــ

[illegible] کفن بر دوش داریم

کہہ کر جنگِ آزادی میں کود پڑے اور اس عزم و استقلال کے ساتھ کہ ان کا جو قدم آگے بڑھ چکا تھا اسے انھوں نے پیچھے نہیں ہٹنے دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برطانوی سامراج کو "بیک بینی و دو گوش" ہندوستان کو چھوڑتے بن پڑا۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد آزادی کو برقرار رکھنا بہت زیادہ مشکل کام ہے کیونکہ آزادی کے بعد جو ملک کی حالت ہوتی ہے وہ ٹائیفائیڈ بخار اترے ہوئے ایک مریض کی ایسی ہوتی ہے اور یہی وہ موقع ہے جس میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ جب انگریزی سامراج کو ہندوستان چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا تو اس نے زچ ہو کر ایسے حالات پیدا کر دیے جس سے ملک کی آزادی کا برقرار رہنا ہی خطرہ میں پڑ گیا۔ وہ ہندو مسلم منافرت کا جو بیج اپنے پونے دو سو سال کے قیام میں بوتا رہا تھا، اس نے چلتے وقت اس سے پورا فائدہ اٹھا کر ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم پر رضامند کر دیا اور ایسے مسائل کھڑے کر دیے کہ دونوں ملکوں کے لیے اب تک دردِ سر بنے ہوئے ہیں۔

تقسیم کے بعد فریقین کے درمیان انتقالِ آبادی کے سلسلے میں جو واقعات پیش آئے ان کے باعث دونوں ملکوں کے درمیان تنفر اس منزل پر پہنچ گیا کہ دونوں کے درمیان تین مرتبہ مسلح تصادم کی نوبت آگئی۔ ان تصادموں کی ابتدا ہمیشہ پاکستان کی جانب سے ہوئی۔ پہلی بار آزادی کے فوراً بعد کشمیر میں مسلح حملہ ہوا۔ پھر ۱۹۶۵ء

میں باقاعدہ دوسرا حملہ ہوا۔ اور اب تیسری بار بھی ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستان ہی حملہ آور ہوا۔ ان لڑائیوں میں سب سے بڑا ہاتھ ان غیر ملکی طاقتوں کا تھا جن کو دونوں ملکوں کی ترقی ایک آنکھ نہیں بھاتی اور جو دونوں ملکوں میں میل ملاپ دیکھنا پسند نہیں کرتے۔

کشمیر پر حملے اور ۱۹۶۵ء کی جنگ کے درمیان چین کا حملہ بھی ملک کے لیے کچھ کم نقصان رساں نہ تھا۔ یہ ساری کی ساری آفتیں اسی پچیس سال کے عرصے میں ملک پر اس وقت ٹوٹیں جب کہنا چاہیے کہ ملک آزادی حاصل کرنے کے بعد اطمینان کی سانس بھی نہ لے سکا تھا مگر ملک کے ذمے داروں نے پوری تیاری سے حالات کا مقابلہ کیا اور اس موقع پر سب سے زیادہ قابل ستائش کام یہ دکھایا کہ ملک کے نظم و نسق میں کوئی فرق نہ آنے دیا اور فرقہ وارانہ فسادات سے ملک کے دامن کو بچائے رکھا۔ ملک کی تعمیر کے لیے پنج سالہ پروگرام پر عمل ہوتا رہا۔ چنانچہ اب سے پچاس برس پہلے کا مقابلہ اگر آپ موجودہ ہندوستان سے کریں تو ہر شعبۂ زندگی میں آپ کو زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ آج ہندوستان کے شہروں اور دیہاتوں کی شکلیں بدل گئی ہیں اور جہاں تاریک جنگلات اور دلدلیں تھیں وہاں آج بڑے بڑے پر رونق شہر نظر آ رہے ہیں اور اب سے پچاس برس پہلے خود وہاں کے رہنے والوں کو وہم و گمان بھی نہ تھا کہ ان کے جھونپڑے محلوں میں بدل جائیں گے اور ان کی تیرہ و تار رہائش گاہیں برقی روشنی سے جگمگ جگمگ کرنے لگیں گی۔ وہ کسان جس کی پشتہا پشت زمینداروں کے رحم و کرم پر زندگی گزارتی تھی اور جس کے بچے افلاس کی زندگی بسر کرتے تھے آج ان بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے دیہاتوں میں تعلیمی ادارے قائم ہیں اور اب ہر دیہات کے رہنے والے کے چہرے پر بشاشت برستی ہے۔ جدید قسم کے وہ آلات جن کے استعمال سے ہندوستانی کسان بالکل نا آشنا تھے آج جگہ جگہ دیہاتوں میں نظر آتے ہیں اور ان پچیس سال کے عرصے میں ہمارے ملک میں کھیتی باڑی نے غیر معمولی ترقی کی ہے۔ بہت سی اور زمینیں جو ناقابل کاشت تھیں انھوں نے غلہ اگلنا شروع کر دیا ہے۔

ان پچیس سال کے عرصے میں پنڈت نہرو، لال بہادر شاستری اور اندرا گاندھی نے ملک کو اتنی بلندی پر پہنچا دیا کہ آج دنیا کی [illegible] شدہ ہیں۔

مگر ان تمام ترقیوں کے باوجود بعض لوگ مطمئن نہیں ہیں اور انھیں شکوہ ہے کہ ملک سے بیروزگاری اور غریبی دور نہیں ہوئی ہے۔ سوچیے تو کہ اتنے وسیع ملک میں جس کی حیثیت حصول آزادی کے وقت ایک کھنڈر کے مانند ہو اس کو از سر نو خوش حال بنانا اور اس کی پرانی عظمت واپس لانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ تعمیر کے لیے ایک طویل مدت درکار ہوتی ہے۔ اس میں ہتھیلی پر سرسوں نہیں جمائی جا سکتی۔ چنانچہ ان معترضین کو سوچنا چاہیے کہ جس ملک کو پونے دو سو برس تک غلامی اور محکومی کی زندگی بسر کرنی پڑی ہو جس کی دولت کو بری طرح لوٹا گیا ہو جس کی ہر رعنائی اور دلکشی کو خاک میں ملا دیا گیا ہو اس کو دوبارہ بنانے اور سنوارنے اور اس میں پچھلی سی دلکشی پیدا کرنے کے لیے طویل عرصہ بھی کم ہے نہ کہ پچیس سال کی مختصر مدت۔

ان پچیس سال کے مختصر عرصے میں ہندوستان نے جو ترقی کی ہے اس کو اگر انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو ملک کا بدترین دشمن بھی اس کا اعتراف کیے بغیر نہیں رہ سکے گا۔

ملک کی صنعتی ترقی، آبادی کو روزگار، ملک کے رہنے والوں کو خود کفیل بنانا، غریبی اور بے روزگاری کو دور کرنے کے لیے جگہ جگہ کارخانوں کی تعمیر، شہروں اور دیہاتوں میں بیماروں کی جدید ہسپتالوں کو قائم کرنا، قوم کی فلاح و بہبود کے لیے نئے نئے قانون بنانا، دیہاتوں میں کو آپریٹیو بینک اور کو آپریٹیو سوسائٹیاں قائم کرنا، غرض کون سا ایسا تعمیری کام ہے جو حکومت نے انجام نہیں دیا۔

اندرا گاندھی نے برسر اقتدار آتے ہی ملک میں ایک سوشلسٹ نظام قائم کرنے کے جو منصوبے بنائے ہیں جب وہ سارے کے سارے پایۂ تکمیل کو پہنچ جائیں گے تو ایک بار پھر ہندوستان سونے کی چڑیا کہا جانے لگے گا لیکن ان منصوبوں کے پروان چڑھنے کے لیے یہاں کچھ مدت درکار ہے اور اسی کے ساتھ ملک کے ہر فرد کے اشتراک، تعاون، خلوص اور لگن اور سب سے بڑھ کر اتحاد اور ضبط و نظم کی ضرورت ہے۔



ترادنر ۴۹۰۱ اشک

جشنِ آزادی

ودود قمر

ذرہ ذرہ ہے چمن کا مہ و اختر جیسے
ہر طرف پھیلی ہو اک نور کی چادر جیسے

آج ہر خارِ مغیلاں ہے گلِ تر جیسے
جاگ اٹھا ہے گلستاں کا مقدر جیسے

سب کے ہاتھوں میں ہے صہبائے طرب کا ساغر
سب کی نظروں میں ہو میخانے کا منظر جیسے

ایک ایک لمحہ کچھ اس طرح کھنک جاتا ہے
رقص فرما ہوں یہاں شیشہ و ساغر جیسے

ہر گھڑی عزم ہے کوئی تو ہر اک گام عمل
موج زن سینوں میں ہو کوئی سمندر جیسے

یوں ہر اک سمت مسرت ہے ہر اک فرد ہے خوش
فرش پر لائے ہوں جنت کو اڑا کر جیسے

وہ بھی دن تھا کہ اندھیرا ہی اندھیرا تھا یہاں
یہ بھی دن ہے کہ ہر اک ذرہ ہے خاور جیسے

ایک اک ہاتھ میں کھینچی ہے آہن کی کماں
ایک اک فرد بنا نیو و حیدر جیسے

پھر چٹانوں سے نکل آئے ہزاروں اصنام
پھر سے بیدار ہوئی صنعتِ آذر جیسے

نکہت و نور کا سیلاب امڈ آیا ہے
ٹوٹ کر برسی گھٹا میرے وطن پر جیسے

دم بہ دم تیز قدم لوگ بڑھے جاتے ہیں
رہنما بن گئے ہیں راہ کے پتھر جیسے

دیکھیے ارضِ ہمالہ پہ ہمالہ کا سماں
فخر سے دھرتی اٹھائے ہوئے ہو سر جیسے

کچھ اس انداز سے جشن مناتے ہیں عوام
ہوئے محمود و ایاز آج برابر جیسے

لبِ ہر غنچہ پہ ہیں امن و اماں کے نغمے
پتی پتی ہو گلستاں کی سخن ور جیسے

ارضِ بھارت پہ کچھ اس طرح نکھار آیا ہے
ہار مانے ہوئے ہو چرخِ ستمگر جیسے

ہم میں وہ جذبۂ تعمیر و ترقی جاگا
اپنے ہاتھوں ہی میں ہو اپنا مقدر جیسے

آج کے دور میں ہے یوں مرا محبوب وطن
کرۂ ارض پہ الفت کا پیمبر جیسے

جشنِ آزادیِ بھارت میں قمر کیا کہیے
عیش و عشرت لٹے جاتے ہیں نچھاور جیسے

جنت نظارہ

ساحل سلطانپوری

(ہندستان میری پہلی سیاحت کی نظر میں)

میں نے احباب سے تعریف سنی تھی جس کی
آج وہ ارض مقدس ہے مرے پیش نظر
واقعی جنت نظارہ ہے بھارت کی زمیں
ذرہ ذرہ ہے یہاں دلکش و صد شمس و قمر

شہر دلی ہے روایات گزشتہ کا امیں
جس کا ہر گوشہ ہے تاریخ کی عظمت کا ستوں
ہو لال قلعہ کی عمارت ہو کہ مینار قطب
اس کی عظمت کی بھلا کن لفظوں میں تعریف کروں

سرخ پتھروں سے یہ گلدستہ بنا ہو جیسے
جامع مسجد کی یہ پُرنور مقدس تعمیر
مسکراتی ہوئی اک حور لطافت جیسے

یہ اجنتا و ایلورا کے [illegible] جمال
حسن فطرت کا ہر اک نقش [illegible] یہاں
عہد ماضی کے صنم خانوں میں تیکھے صنم
فن صناعی کے پائندہ و جاوید نشاں

سنگ مرمر کا یہ شہکار حسیں تاج محل
جس کی تخلیق نے بخشا ہے محبت کو دوام
میری آنکھوں میں سما جاتا ہے خوابوں کی طرح
بعد از مرگ ہوا ہے کاش یہیں میرا مقام

گنگا جمنا کی یہ لہریں یہ ہمالہ کا شکوہ
اور یہ وادیٔ کشمیر کی شاداب فضا
واقعی جنت نظارہ ہے بھارت کی زمیں
پھر کبھی دیکھنے آؤں گا اگر زندہ رہا

[illegible]

قطعات

تابش صدیقی

(۲۵ ویں جشن آزادی کے موقع پر)

(۱)

آج ہندوستاں پہ ہے خوشیوں کی کرن
آج ختم ہوئی یہ تاریکی کی گھٹن
ربع صدی آزادی کی ہے یہ تابش
پھر سے اک بار [illegible]

(۲)

ربع صدی مسرت کی یوں گزر گئے
ہو رہی کا ایک ایک منظر
یاد آتا ہے آج اے تابش
ہم کو خود اپنے ہی مقدر پر

(۳)

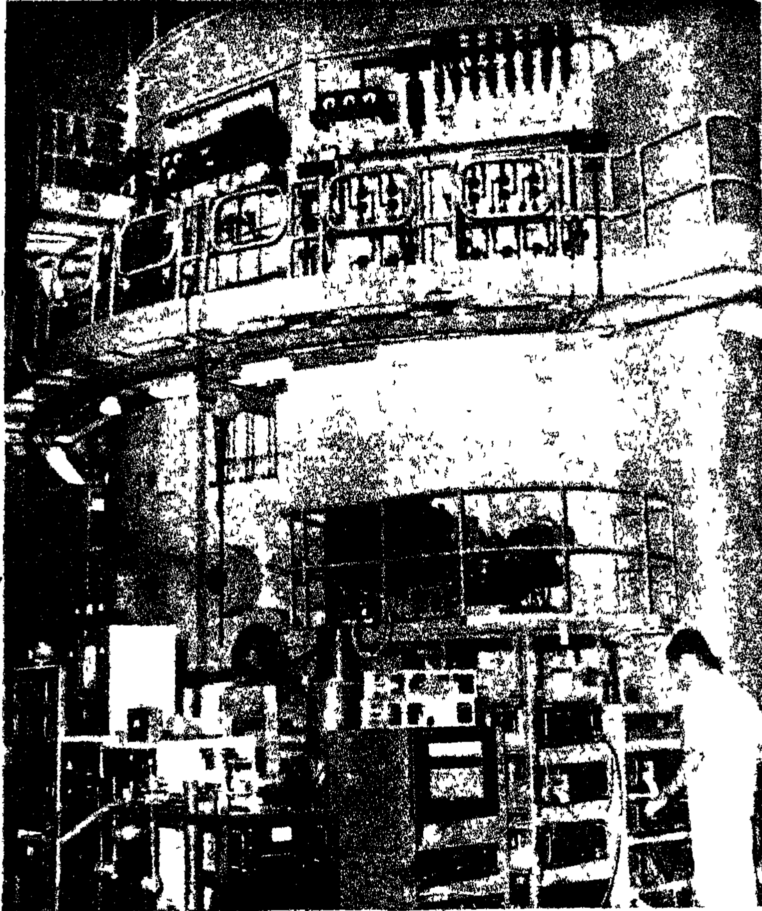
اب سب عہد آج کرنا ہے
زندگانی میں رنگ بھرنا ہے
وقت تعمیر دے کے ہر دل کو
جادۂ زیست سے گزرنا ہے

(۴)

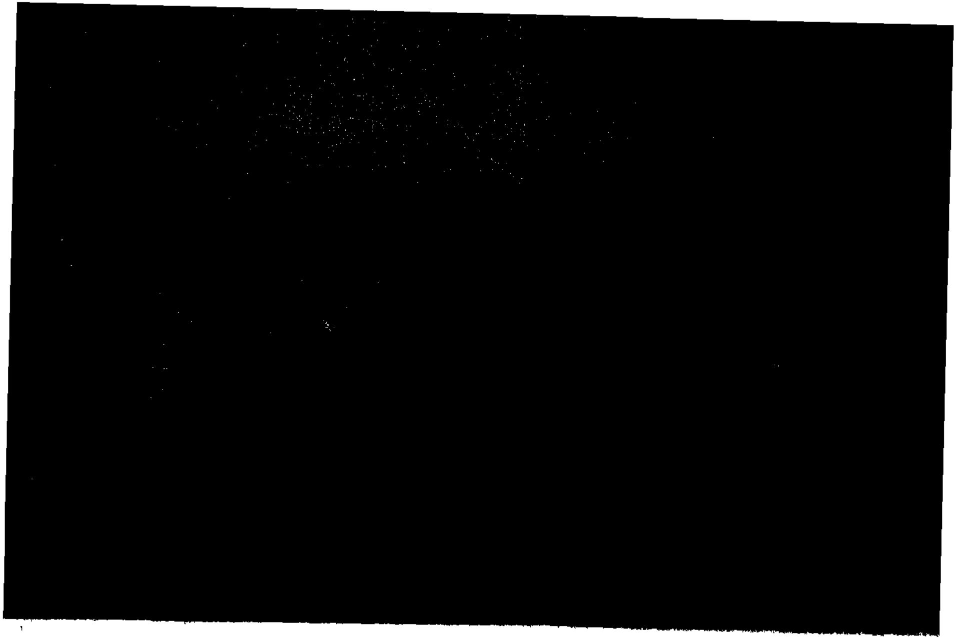
ملک کی شان کو بڑھائیں گے
سب کی نظروں میں اس کو لائیں گے
ہم نگہبان اس چمن کے ہیں
جان بھی اس کے لیے گنوائیں گے

(۵)

ایک ایک فرد کی دعا ہے یہی
اپنی آزادی پہ نہ آنچ آئے
اور جو بھی نیا قدم اٹھے
کھینچ کے منزل قریب آ جائے



بھابھا ایٹمی تحقیقی مرکز ٹرامبے (بمبئی) کا
ری ایکٹر ہال



نیا دور



28 (6)

ستمبر ۱۹۶۲ء
بھادر ۱۸۹۴ شک

۵۰ پیسے

جلد | نمبر

چندہ سالانہ ... روپے

فی پرچہ ... پیسے

ایڈیٹر

خورشید احمد

پبلشر

اپنی بات

آزادی کی پچیسویں سالگرہ کے موقع پر نیا دور کا جو خصوصی نمبر پیش کیا گیا تھا اسے ارباب ادب نے جس قدر پسند کیا ہے اور اسے جس طرح سراہا ہے اس کا اظہار ان بے شمار خطوں سے ہوتا ہے جو اس سلسلے میں ہمیں موصول ہوئے ہیں اور جن کا سلسلہ جاری ہے۔ خصوصی نمبر کے بارے میں یہ تاثرات انتہائی مسرت و طمانیت کا باعث ہیں کہ ہماری سعی رائیگاں نہیں گئی اور آزادی کی ۲۵ ویں سالگرہ کے مبارک موقع پر شمع حریت کے پروانوں اور جنگ آزادی کے مجاہدوں کے تئیں نیا دور کا نذرانۂ عقیدت قبول ہو گیا۔ اگر اسے خود ستائی سے تعبیر نہ کیا جائے تو یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ نیا دور کے خصوصی نمبر اردو صحافت میں ہر اعتبار سے ایک تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں نیا دور کے بعض خصوصی نمبر مثلاً جواہر لال نہرو نمبر، غالب نمبر، جعفر علی خاں اثر لکھنوی نمبر، گاندھی جینتی صد سالہ جشن نمبر خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اب تازہ ترین آزادی نمبر (شمارہ اگست ۱۹۷۲ء) کا استقبال قدردانوں اور ادب دوستوں نے جس فراخدلی کے ساتھ کیا ہے وہ اس سابقہ نمبروں پر سبقت لے جانے کا ثبوت آپ ہے۔ زیر نظر شمارہ میں کسی صفحہ پر "حسن نظر" کے عنوان سے چند ادب دوستوں اور کرم فرماؤں کے تاثرات درج کیے جا رہے ہیں۔ بہرحال اس حقیقت پسندانہ اور انصاف پسندانہ حوصلہ افزائی کے باوجود ہمیں اس کا پورا احساس ہے کہ موجودہ خصوصی نمبر ہو یا سابقہ نمبر ہوں، ان کی کامیابی اور دل پذیری کا سہرا در حقیقت ان قلمی معاونین کے سر ہوتا ہے جو ہماری استدعا پر بلا تامل قلمی اعانت کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اس لیے اگست ۱۹۷۲ء کے آزادی نمبر کی کامیابی پر جو تہنیتیں ہمیں موصول ہوئی ہیں یا ہو رہی ہیں ان میں ہم اپنے قلمی معاونین کو بھی شریک کرنے کی مسرت حاصل کر رہے ہیں۔

● ہندوستان کی آزادی ان بے شمار جانبازوں اور سرفروشوں کی مرہون منت ہے جنھوں نے صبح آزادی پر جان دینا اور سب کچھ ہار دینا گوارہ کیا لیکن یہ گوارہ نہ کیا کہ ملک پر غیروں کا تسلط رہے اور ہندوستان غلام ملک کہلائے۔ ان فدایان ملک و قوم اور آزادی کی خاطر مصائب جھیلنے، بربادیوں کو دعوت دینے اور "ستائش کی تمنا" اور "صلہ کی پروا" کیے بغیر آزادی کی لڑائی میں حصہ لینے والوں کی خاصی تعداد ابھی بقید حیات ہے۔ شہرت اور پبلسٹی سے بے نیاز ان بے لوث خدمت کرنے والوں کا ہمارے اوپر قرض ہے۔ اس قرض کو کسی حد تک چکانے کے خیال سے نیا دور میں ایک سلسلہ "مجاہدین آزادی" کے عنوان سے شروع کیا جا رہا ہے جس میں ہم ایک سال تک نیا دور کے ہر شمارہ میں جنگ آزادی میں حصہ لینے والوں کی خواہ وہ اس جنگ میں کام آگئے ہوں یا بقید حیات ہوں، حیات اور کارناموں پر مضامین شائع کریں گے۔ امید ہے کہ اہل قلم حضرات ہماری اس آواز پر آواز دیں گے اور اس سلسلے کو کامیاب بنانے میں ہماری مدد کریں گے۔

● علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۷۲ء سے متعلق جولائی کے شمارے میں ان سطور میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔ یہ ایکٹ برابر موضوع بحث بنا ہوا ہے اور اس کے بارے میں مخالف و موافق رائیں اخبارات و رسائل میں ظاہر کی جا رہی ہیں۔ مراسلے شائع ہو رہے ہیں جن میں اکثریت ایسے مراسلوں کی ہوتی ہے جن میں ایکٹ کی مخالفت کی جاتی ہے۔ ان تحریروں میں مدلل انداز فکر اختیار کرنے اور ایکٹ کے ان مضمرات و نتائج سے بحث کرنے یا ان پر روشنی ڈالنے کے بجائے جذبات سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔ اس ایکٹ کا تعلق ملک کی ایک عظیم درسگاہ سے ہے جس کا اپنا ایک تاریخی کردار ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ ایکٹ مذکور کے سلسلے میں موافق یا مخالف جو بھی رائے دی جائے یا اظہار خیال کیا جائے وہ جذبات سے بلند ہو کر کیا جائے تاکہ اس کے بارے میں صحیح رائے قائم کرنے میں آسانی ہو اور کوئی ناگوار صورت بھی پیدا نہ ہو سکے جیسی کہ بدقسمتی سے کچھ عرصہ پہلے پیدا ہو چکی ہے۔ اس مقصد سے ہم نیا دور میں ایک سلسلہ شروع کرنے جا رہے ہیں اور اہل علم و اہل الرائے حضرات کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ مسلم یونیورسٹی (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۷۲ء کے بارے میں اپنی رائے خواہ مخالف ہو یا موافق ہمیں لکھیں جسے ہم بخوشی نیا دور میں شائع کریں گے۔ اس ضمن میں صرف یہ کہنا ہے کہ یہ سلسلہ خالص علمی بحث" (ACADEMIC DISCUSSION) کی حیثیت رکھے گا اور کوئی ایسا مضمون اس سلسلے میں شائع نہ کریں گے جس میں واقعات سے ہٹ کر جذبات سے کام لیا گیا ہو، شخصیت زیر بحث لائی گئی ہو، ذاتیات سے بحث کی گئی ہو، جماعتی یا طبقہ وارانہ سوال اٹھانے کی کوشش کی گئی ہو یا اکثریت اور اقلیت کا مسئلہ اٹھا کر کسی فرقہ کو مورد الزام ٹھہرایا گیا ہو۔ جس آن یہ محسوس ہوگا کہ بحث اپنے مقصد سے ہٹ رہی ہے اور اس میں ذاتیات اور شخصیات کی تلخی پیدا ہونے لگی ہے اسی آن اس بحث کو نیا دور میں بند کر دیا جائے گا۔ اس سلسلے کا آغاز ہم اکتوبر ۱۹۷۲ء کے شمارے سے کر رہے ہیں اور اس میں ایکٹ کی موافقت میں ایک مضمون شائع کر رہے ہیں۔ امید ہے کہ اس سلسلے کو "صحت مند بحث" تک محدود رکھنے میں ہمارے لکھنے والے ہماری اعانت کریں گے۔

—— ایڈیٹر

ہندستان کی آزادی میں اُردو ادب کا حصّہ

عبدالصبیر نعیمی

کسی ملک میں جب انقلاب جنم لیتا ہے تو اس انقلاب کو لانے میں اس ملک کے ادب کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ روس اور چین کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ ان ملکوں کے انقلابات کی پشت پر ملکی ادب تھا جس نے قوم کے سوتے ہوئے ذہنوں کو جھنجھوڑا اور انقلاب کے لیے زمین ہموار کی۔ صرف ان دو ملکوں میں ہی نہیں بلکہ دنیا کے تقریباً ہر ملک کے انقلاب میں وہاں کے ادب کا نمایاں ہاتھ رہا ہے۔

ہندستان کی جنگ آزادی میں بھی منجملہ دیگر ہندستانی ادب کے اُردو ادب کا بھی بہت بڑا حصّہ ہے۔ اس وقت جبکہ قوم کے دل سے زیاں کا احساس ختم ہو گیا تھا، غلامی کے بوجھ نے سر اٹھانے کی قوت ختم کر دی تھی، قوم نہ صرف غلام تھی بلکہ پیروں کی زنجیر کو بدیسی حاکم کے جادو کی تاثیر سے "سازِ دلبری" سمجھ رہی تھی اور ہندستانی عوام روایتی شتر مرغ کی طرح اپنی گردنوں کو غلامی کے ریت میں چھپائے خاموش تھے، اس وقت اردو ادب نے قوم کے سوئے ہوئے ذہنوں کو جھنجھوڑنا شروع کیا، پھر بغاوت کی ایک لہر اٹھی۔ بغاوت کی یہ لہر جو غلام ہندستان کی پہلی جنگ آزادی تھی اور جس کو غیر ملکی حاکموں نے غدر کا نام دیا تھا، ایک غیر منظم کوشش تھی جو ایک طاقت ور حاکم کے مقابلے میں ناکام ضرور ہو گئی لیکن اس خاکستر میں ایسی چنگاری دبی رہی جس نے بدیشی ایوانِ حکومت کے لیے برق و شرر کا کام کیا۔

تاریخ صحافت اردو کے مصنف کی نظر میں "ہندستان کے اخبارات میں اردو کے اخبارات بھی مجموعی اعتبار سے آزاد خیال تھے اور بہت بے باکی سے اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے۔ بدیسی حکومت کے خلاف جس قدر جذبہ پیدا کر سکتے تھے وہ انھوں نے پیدا کیا۔ ۱۸۵۷ء میں ہندستانیوں نے انگریزی حکومت کے خلاف جو بغاوت کی تھی اس کی زیادہ تر ذمے داری گارساں دتاسی نے ان اخبارات پر عاید کی ہے۔" (تاریخ صحافت اردو صفحہ ۲۹۶)۔

اس دور کے اردو اخباروں میں خصوصیت کے ساتھ صادق الاخبار اور اردو اخبار وطن پرستی کی دعوت دینے میں سب سے آگے تھے۔ جب جنگ آزادی ختم ہوئی اور بدیسی حاکموں نے تمام ملک کو انتقامی شعلوں کی نذر کر دیا تو اس وقت "صادق الاخبار کے مہتمم کو اس جرم میں کہ وہ سرکار کی بدخواہی کی خبریں جھوٹی گڑھ کر لکھا کرتا تھا، تین برس کی قید ہوئی۔"

(بغاوتِ ہند صفحہ ۳۸۵)

دہلی اُردو اخبار کے مالک و مدیر محمد حسین آزاد کے والد محمد باقر تھے۔ محمد باقر کو ہندستانیوں کو ورغلانے اور "حاکم" سے جنگ کے لیے آمادہ کرنے کے جرم میں پھانسی دے دی گئی۔ آزاد کے نام وارنٹ گرفتاری جاری ہوا مگر وہ کسی طرح بچ کر کہیں جا چھپے۔ اس طرح ہندستان کی پہلی جنگ آزادی میں اُردو کے ادیب و شاعر دار و رسن کی آزمائش سے مسکرا کر گزر گئے۔

انقلاب ۱۸۵۷ء کے بعد ہر سمت ایک سکوت سا طاری ہو گیا۔ مگر یہ سکوت دراصل طوفان سے پہلے کا سکوت و سکون تھا۔

باہر سے پرسکون نظر آنے والی قوم کے دل اندر ہی اندر تڑپ رہے تھے۔ اس تڑپ کا اظہار اردو ادب نے اس طرح کیا:

"۔۔۔۔۔ اپنے مکان میں بیٹھا ہوں۔ دروازہ سے
باہر نکل نہیں سکتا، سوار ہونا اور کہیں جانا تو بڑی بات ہے۔
رہا یہ کہ کوئی میرے پاس آوے۔ شہر میں ہے کون؟ گھر کے گھر
بے چراغ پڑے ہیں۔" (غالب کا خط تفتہ کے نام)

ایک اہلِ درد نے سنسان جو دیکھا قفس   یوں کہا آتی نہیں اب کیوں صدائے عندلیب
بال و پر دو چار دکھلا کر کہا صیاد نے   یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب
(غالب)

کیونکہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو   قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو
(آزردہ)

بجائے زمزمہ ہر جائے شیون و غم ہے   محل عیش تھا اب سرائے ماتم ہے
(سالک)

پڑی ہیں آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی   خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی
(داغ)

رات دن گریہ ہے اور سنگ ہے اور سینہ ہے   اور ظہیر جگر افگار رہے یاں دہلی
(ظہیر دہلوی)

مگر نہ کہیں کہ یہ دہلی ہے تو ہر گز نہ پڑے   دلی والوں کو بھی دہلی پہ گمانِ دہلی
(شیفتہ)

موجزن دل میں ہیں یاں کے دریائے خشم   دیکھنا اس سے آنکھیں نہ چرانا ہرگز
(حالی)

اے وطن! اے مرے بہشت بریں!   کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں؟
(حالی)

پہلی جنگ آزادی کے بعد جب ہندوستان اپنی تمام قوتیں کھو چکا تھا اور ہر طرف مایوسی اور قنوطیت چھائی ہوئی تھی اس وقت اردو ادب نے ایک نیا موڑ لیا۔ سر سید احمد خاں نے تعلیمی اور اصلاحی تحریک کی آواز بلند کی۔ اس میں شک نہیں کہ ۱۸۵۷ء کی تباہی و بربادی پر سب سے زیادہ جس انسان کا دل تڑپا وہ سر سید کے ساتھی حالی تھے۔ انھوں نے اس ہنگامہ کو "دریائے عتاب ذوالجلال کی موج زنی" اور "قہر عالم گیر" سے تعبیر کیا۔ حالی سب سے پہلے شاعر ہیں جن کا دل ہندوستان کی غلامی پر رو دیا۔ "شعر الہند" کے مصنف کے الفاظ میں "حریت اور آزادی کا لفظ آج بچہ بچہ کی زبان پر ہے لیکن اس زمانے میں جبکہ یہ لفظ جرم خیال کیا جاتا تھا، سب سے پہلے حالی ہی نے ہندوستان کی غلامی کا ماتم کیا۔" (شعر الہند جلد اول صفحہ ۴۰۵)

حالی ہی ہندوستان کا وہ پہلا شاعر تھا جس نے بآواز بلند قوم کو دعوت دی۔ ؎

بیٹھے بے فکر کیا ہو ہم وطنو!   اٹھو اہلِ وطن کے دوست بنو
چھوڑو افسردگی کو جوش میں آؤ   بس بہت سوئے اٹھو ہوش میں آؤ

اس دور میں بھی عوام میں بیداری پیدا کرنے میں اردو اخباروں نے نمایاں حصہ لیا۔ اودھ پنچ (لکھنؤ) نے اس وقت میں جبکہ اخباروں کو آج کی طرح آزادی حاصل نہ تھی، انگریزی حاکموں پر زبردست تنقید کی: "حکام کہتے ہیں کہ ہندوستان کی حالت سرسبز ہے۔ ہندوستان کے گدھے کی پیٹھ کا گوشت نوچو جہاں تک ناخنوں میں طاقت ہو یہ گوشت اصلی گوشت نہیں بلکہ بدگوشت ہے۔ اس کا نوچنا مضر نہیں بلکہ انجام کار راحت رساں ہوگا۔ گدھا فربہ ہے اس پر بار بھی لادو اور جب منزل پر پہنچو تو اس کا گوشت نوچو۔ اس کی کھال جلا کر اس کی کھال کی ہانڈی بنا کر پکاؤ اور کھاؤ — یہ دودھ بھی دیتا ہے کباب کھا کر دودھ پیو اور صبح کو بار بھی لادو اور آپ بھی سوار ہو جاؤ۔ تیز نہ چلے تو پھٹڑے سے خبر لو۔ لطف یہ ہے کہ کاٹھ کا گدھا ہے، نہ کھانے کی حاجت نہ پینے کی ضرورت۔ اس برنہ مشغانہ منہ زور" (اودھ پنچ۔ لکھنؤ)

دوسرا اخبار اپنچ ہند تھا جو اودھ پنچ کی طرح مزاح کا سہارا لے کر ایسے چرکے لگاتا تھا کہ عوام بے قرار ہو اٹھتے۔ سوال: ہندوستانی دن میں کتنی دفعہ کھاتے ہیں؟ اور انگریز دن میں کتنی دفعہ کھاتے ہیں؟ جواب: امیر ہندوستانی دن میں ایک دفعہ کھاتے ہیں کیونکہ اس سے زیادہ بے چاروں کو میسر ہی نہیں اور غریب بے چارے کبھی

[illegible] ان میں ایک مرتبہ کہا گیا ہے۔ انگریز دل میں [illegible] بیٹھے۔

اخبار صادق لاہور، ہندوستانیوں کو پیغام دیتا ہے ۔

اے ملک اپنے حفظ ہندوستان ہوشیار ہو — لے نکل گئے ہیں بہت کاروان ہوشیار ہو

اودھ پنچ (لکھنؤ) کے مضمون نگاروں اور شاعروں کی فہرست کافی طویل ہے۔ ان میں منشی سجاد حسین کے علاوہ سید محمد حسین آزاد، چکبست اور اکبر الہ آبادی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ان کی نظموں اور غزلوں میں حب الوطنی کی گونج کے ساتھ ساتھ غیر ملکی حکومت پر تنقید بھی ہوتی تھی۔

اے آفتاب حب وطن! تو کدھر ہے آج — تو ہے کدھر کہ کچھ نہیں آتا نظر ہے آج
تجھ بن جہاں ہے آنکھوں میں اندھیر ہو رہا — اور انتظام دہر ہے زبر زیر ہو رہا
ہر جوشِ حب وطن سب کے جام ہوں — سرشار ذوق و شوق دلِ خاص و عام ہو

(محمد حسین آزاد)

اے صور حب وطن! اس خواب سے جگا دے — بھولا ہوا فسانہ کانوں کو پھر سنا دے
مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹا دے — اٹھتے ہوئے شرارے اس راکھ سے گرا دے

(چکبست)

بہت ہی عمدہ ہے اے ہم نشیں! برٹش راج — کہ ہر طرح کے ضوابط بھی ہیں اصول بھی ہیں
جو چاہے کھول لے دروازۂ عدالت کو — کہ تیل ناچ میں ہیں ڈھیل اس کی چول بھی ہیں
جب اتنی نعمتیں موجود ہیں یہاں اکبر
تو حرج کیا ہے جو ساتھ اس کے کچھ فضول بھی ہیں

(اکبر الہ آبادی)

بیسویں صدی کی ابتدا میں اردو ادب نے ایک زبردست کروٹ لی اور وطن کی آزادی کی جد و جہد میں چند نئے ادیب و شاعر شامل ہو گئے۔ حسرت موہانی، لالہ لاجپت رائے، ظفر علی خاں، پریم چند، اقبال، سرور جہان آبادی، آنند نرائن ملا وغیرہ وغیرہ نے نظم و نثر کے ذریعے احساس غلامی بڑھایا اور لوگوں کو آزادی کی لڑائی میں بے خوف ہو کر شریک ہونے اور بدیسیوں کے بھگانے میں یگانگت و اتفاق سے کام لے کر منزل کی طرف بڑھتے رہنے کی تلقین شروع کی۔

پریم چند نے وطن دوستی کے مضامین پر مشتمل کہانیاں لکھنے کی ابتدا کی۔ ان کی کہانیوں کی منزل آزادی اور صرف آزادی ہی ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"...... اگر تو مسافر ہے تو آ اور میرے خون سے تر پہلو میں بیٹھ جا کیونکہ یہی دو انگل زمین ہے جو میرے پاس باقی رہ گئی ہے اور جو سوائے موت کے کوئی مجھ سے نہیں چھین سکتا۔ افسوس کہ تو یہاں ایسے وقت آیا جب ہم تیری مہمان نوازی کرنے کے قابل نہیں۔ ہمارے باپ دادا کا دیس آج ہمارے ہاتھ سے نکل گیا اور اس وقت ہم بے وطن ہیں۔ مگر (پہلو بدل کر) ہم نے حملہ آور اور غنیم کو بتا دیا کہ راجپوت اپنے دیس کے لیے کیسی بے جگری سے جان دیتا ہے۔ یہ آس پاس جو لاشیں دیکھ رہا ہے یہ ان لوگوں کی ہیں جو اس تلوار کے گھاٹ اترے ہیں (مسکرا کر) اور گو کہ میں بے وطن ہوں مگر غنیمت ہے کہ حریف کے حلقے میں نہیں مر رہا ہوں (سینے کے زخم سے چیتھڑا نکال کر) کیا تو نے یہ مرہم رکھ دیا؟ خون نکلنے دے۔ اسے روکنے سے کیا فائدہ؟ کیا میں اپنے ہی وطن میں غلامی کرنے کے لیے زندہ رہوں؟ نہیں ایسی زندگی سے مرنا اچھا۔ اس سے بہتر موت ممکن نہیں .... یہ کہہ کر اس نے ایک مرصع صندوقچہ منگایا اور اس میں سے ایک لوح نکالی۔ جس پر آب زر سے لکھا ہوا تھا "وہ آخری قطرۂ خون جو وطن کی حفاظت میں گرے دنیا کی سب سے بیش قیمت شے ہے" (پریم چند "دنیا کا سب سے انمول رتن")

حب الوطنی کے مرکزی خیال کو لے کر پریم چند کی پانچ کہانیوں کا ایک مجموعہ سوز وطن شائع ہوا جسے انگریزی حکومت کے لیے خطرناک سمجھا گیا اور اس کی تمام کاپیاں بحکم سرکار ضبط کر لی گئیں۔

دوسری طرف شعرا اپنے فرض کو نبھا رہے تھے۔ شاعری کا نیا انداز جو حالی اور آزاد نے شروع کیا تھا، ملک میں مقبول ہو رہا تھا۔ شعرا اپنے کلام کے ذریعے حب الوطنی، اخوت و محبت اور بھائی چارے کا درس دے رہے تھے اور دلوں میں آزادی کا جوش و خروش بھر رہے تھے۔

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے
دھرتی کے باسیوں کی مکتی پریت میں ہے

(اقبال ۔ نیا شوالہ)

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
کچھ بات ہے کہ ہستی مٹتی نہیں ہماری — صدیوں رہا ہے دشمن دورِ زماں ہمارا

(اقبال)

رنگ لایا دورِ سحر تا دریچۂ غم چھا گئی — نیر اقبال ڈوبا، شام ماتم چھا گئی
پھر بھی اے خاکِ وطن اف رے وفاداری تری
چار سو ہے دیر میں ہنسہ کرم جاری تری

(سرور جہان آبادی)

غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

(چکبست)

ترا حسن ایک تماشہ ہے — تری پھیلی گود بانجھ ہے
تو غلاموں کی دلیل ہے — تری لاج شرم کا داغ ہے

(عظمت اللہ خاں دہلوی)

کہاں ہیں ترے سورما صف شکن — ترے اہلِ دانش ترے اہلِ فن
کہاں ہے ترا اقتدارِ کہن — ترے رام، لچھمن، بھرت، شترگھن
زمینِ وطن! اے زمینِ وطن!

(آنند نرائن ملا)

اقبال کی "ہمالیہ" "نیا شوالا" "تصویر درد" "ترانۂ ہندی" "ہندوستانی بچوں کا قومی گیت" اسی دور کی یادگار ہیں۔ چکبست کی "خاکِ وطن" سرور جہان آبادی کی نظم "پھولوں کا کنج" کافی مقبول ہوئیں۔ آگے چل کر اقبال کی "شعاعِ امید" آنند نرائن ملا کی "زمینِ وطن" اور حامد اللہ افسر اور ساحر کی نظموں نے جادو جگانا شروع کر دیا۔

اس دور میں کئی اخبار جیسے الہلال، ہمدرد، ہمدم اور مدینہ وغیرہ منظرِ عام پر آئے۔ الہلال مولانا ابوالکلام آزاد کا اخبار تھا۔ ایک اعتبار سے یہ اردو کا پہلا اخبار تھا جس نے ہندوستانیوں

لگے اور خاص طور پر مسلم ہندوستانیوں کے جمود کو توڑا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی شبلی نے الہلال کے ذریعہ اپنی انقلابی تحریروں سے قومی بیداری کی نشر و اشاعت کی وجہ سے اردو ادب میں ایک خاص مقام حاصل کیا۔ ہمدرد محمد علی کا اخبار تھا جس میں ظفر علی خاں، محمد فاروق دیوانہ اور ولایت حسین وغیرہ کے انقلابی مضامین شائع ہوتے تھے۔ ان اخباروں کے علاوہ وحید الدین سلیم کی ادارت میں "مسلم گزٹ" بھی شائع ہونے لگا۔ اس اخبار کی پشت پر شبلی کا دماغ تھا۔ یہ تمام اخبارات انگریز دشمن اور سخت قسم کے وطن پرست تھے۔ انگریزی حکومت شروع میں خاموشی کے ساتھ ان کی جولانیاں دیکھتی رہی لیکن جب ان اخباروں کی آواز بلند سے بلند تر ہونے لگی — اور ہندوستانی اس آواز سے بیدار ہونے لگے تو بدیسی حکومت اسے برداشت نہ کر سکی اور الہلال و ہمدرد پر پابندی عائد کر دی۔ شبلی کے نام وارنٹ گرفتاری جاری ہوا۔ اس سے پہلے کہ ان کی آواز کو اسیر کر لیا جاتا، وہ قیدِ حیات سے آزاد ہو گئے۔ اس وقت تک قوم خوابِ گراں سے جاگ چکی تھی اور بدیسی حاکم کے ساتھ آمادۂ پیکار تھی۔ بقول ڈاکٹر اشرف "عام لوگوں کے جوش اور انگریز دشمنی کا یہ عالم تھا کہ مولانا محمد علی کا اعتدال آمیز رویہ بھی ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا اور خواجہ حسن نظامی جیسے زاویہ نشینوں نے "کھو تکبیر" جیسے مضامین لکھے جو چھپتے ہی ضبط کر لیے گئے۔"

("جوہر" جامعہ ملیہ جوبلی نمبر)

تحریک ترکِ موالات کی ابتدا ہو چکی تھی۔ سارے ملک میں ایک طوفان سا آ گیا۔ نئے نئے اخبار وجود میں آئے۔ ڈاکٹر اشرف کے الفاظ میں "غلام بھیک نیرنگ، جوش، محمد ناظر، آغا حشر، بیدار، فرید آبادی جیسے جمہوریت پسند اور انقلاب آشنا شبلی، حسرت اور اقبال سے بڑھ کر شرر فشانی کیا کرتے تھے اور ان کا یہ کلام ہماری انقلابی شاعری میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔"

("جوہر" جامعہ ملیہ جوبلی نمبر)

اس دور میں محمد علی، ابوالکلام آزاد، ظفر علی خاں، حسرت موہانی اور ڈاکٹر اقبال خصوصیت کے ساتھ سب سے آگے تھے

[illegible] میں ان کی آزادی کی گونج سنائی دے رہی تھی۔
اقبال نے آزاد اور محکوم کے فرق کو اس طرح واضح کیا تھا:

آزاد کی اک آن ہے محکوم کا اک سال — کس درجہ گراں سیر ہیں محکوم کے اوقات
آزاد کا ہر لحظہ پیام ابدیت — محکوم کا ہر لحظہ نئی مرگ مفاجات
آزاد کا اندیشہ حقیقت سے منور — محکوم کا اندیشہ گرفتار خرافات
محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

(اقبال)

نئے اخبارات جیسے حقیقت۔ لکھنؤ۔ زمیندار۔ لاہور۔ پرتاپ۔ لاہور۔ بندے ماترم۔ لاہور۔ ملاپ۔ لاہور۔ خلافت۔ بمبئی۔ انقلاب۔ لاہور۔ الجمعیۃ۔ دہلی۔ مسلم۔ دہلی وغیرہ نے تحریک آزادی کو اور ہوا دی۔ انگریزی حکومت کے خلاف تند و تیز مضامین لکھے، پرجوش نظمیں شائع کیں۔ حکومت نے ان کے مدیران کو تنبیہ کی، ضمانتیں طلب کی گئیں، ضمانتیں ضبط ہوئیں اور مالکان و مدیران اخبار کو سیاہ قید خانوں میں ڈال دیا گیا۔ لیکن انقلاب کی آواز بلند ہو چکی تھی، نہ یہ آواز بند ہوئی اور نہ تحریک آزادی روکی جا سکی۔

وقت گزرتا رہا، تحریک آزادی بڑھتی رہی، اردو ادب کی آواز بلند تر سے بلند ترین ہوتی گئی۔ اردو کے ادیب و شاعر دار و رسن سے بے پرواہ قوم کے لہو کو گرم کرتے ہی رہے۔ شمع آزادی کی لگن میں ان پروانوں نے قوم سے کہا:

وقت آ پہنچا کہ برپا ہو نیا اک انقلاب
اور یہ نظم زندگی بار دگر منظوم ہو

(ظفر علی خاں)

کیا ہند کا زنداں کانپ رہا ہے گونج رہی ہیں تکبیریں
اکتائے ہیں شاید کچھ قیدی اور توڑ رہے ہیں زنجیریں
بھوکوں کی نظر میں بجلی ہے توپوں کے دہانے ٹھنڈے ہیں
تقدیر کے لب کو جنبش ہے دم توڑ رہی ہیں تدبیریں

(جوش ملیح آبادی)

غیر کی مہر وفا پر تکیہ ناکرکب ہے گناہ — کوشش دست غاصب پر نازکرنا ہا دکر

(حسرت موہانی)

نقد جاں نذر کر دو سوچتے کیا ہو جوہر — کام کرنے کا یہی ہے، تمہیں کرنا ہو یہی

(محمد علی جوہر)

سر اگر ہم کو دیا ہے سرفروشی بھی سکھا — گر عنایت کی تو سیر وارفتہ ہستی بھی سکھا

(نیاز فتحپوری)

حکومت ہم پہ ہو سکتی ہے دل پر ہو نہیں سکتی
کوئی روکے تو کیونکر چشم دل کی گریہ وزاری

(مہدی لکھنوی)

جو راہ میں پہاڑ ہوں تو بے دریغ اکھاڑ دو
اٹھاؤ اس طرح نشاں فلک کے دل پہ گاڑ دو

ہے کھیل دار اور رسن، بڑھے چلو بڑھے چلو
مجاہدین صف شکن، بڑھے چلو بڑھے چلو

(احسان دانش)

اٹھو ہند کے باغبانو اٹھو — اٹھو انقلابی جوانو اٹھو
اٹھو کھیلتے اپنی زنجیر سے — اٹھو خاک بنگال و کشمیر سے
اٹھو برق کی طرح ہنستے ہوئے — کڑکتے، گرجتے، برستے ہوئے
غلامی کی زنجیر کو توڑ دو
زمانے کی رفتار کو موڑ دو

(سردار جعفری)

ذہن انساں پہ جو چھایا ہے اندھیرا یارب — اس اندھیرے کی کبھی کوئی سحر بھی ہوگی؟
اسی امید پہ بیٹھا ہوں سر راہ گزر — ہجر کی رات ہوئی ہے تو سحر بھی ہوگی

(آل احمد سرور)

دریا میں تلاطم برپا ہے، کشتی کا فسانہ کیا معنی
گرداب سے جب لڑنا ہے تمہیں، تنکے کا سہارا کیا معنی
ہر نوحہ کشتی بند کرو، خود موج طوفاں بن جاؤ
پیروں کے تلے ساحل ہوگا، ساحل کی تمنا کیا معنی

(وامق جونپوری)

تڑپ کے گرنے ہی والی ہے برق زنداں پر
کھڑے ہیں در پہ اسیر آسرا لگائے ہوئے
(کیفی اعظمی)

مٹا دو دل کے مٹا دو نشاں غلامی کا زمین چھوڑ چکا کارواں غلامی کا
(کیفی اعظمی)

ملبس تار کتاں میں اپنے حال زار پر اور گریباں چاک ہیں گل بھی یہ حالت دیکھ کر
ایک بیار و رہا ہے اپنی بیکسی دیکھ کر اپنی حالت کی مگر ہم کو نہیں کچھ بھی خبر
(حفیظ لدھیانوی)

ہم تم کو بسر کرنا ہے یہیں جینا ہے یہیں مرنا ہے یہیں
اٹھو یہ چمن شاداب کرو اب غاصب خود مر جاتا ہے
(اقبال سہیل)

پھر امنگیں، آرزوئیں ہیں دلوں میں بے قرار
قوم کو یاد آگیا ہے اپنا گم گشتہ وقار
(جگن ناتھ آزاد)

ایک سمت اردو نظم قوم کی رگوں میں آتش بھر رہی تھی اور دوسری طرف اردو نثر تحریک آزادی کو تیز کر رہی تھی۔ چنانچہ حسرت موہانی لکھتے ہیں: "یہ صحیح ہے کہ بعض اخبار اعلیٰ درجے کے نہیں ہیں لیکن بمقابلہ سابق آج وہ ملک کی ترقی پر بہت بڑا اثر ڈالتے ہیں۔ آپ کانگریس میں تجویزیں منظور کرتے ہیں وہ ہمارے تعلیم یافتہ گروہ تک پہنچتی ہیں اور وہ کسی نہ کسی طرح اخبار کے کالموں میں حکام اور رعایا تک ہر وقت پہنچائی جاتی ہیں۔"

عوام کو متحد کرنا، انھیں حالات و مسائل حاضرہ سے باخبر رکھنا اور آزادی کی لڑائی کے لیے ان کو تیار کرنا اردو اخباروں کا خاص کام تھا۔ یہاں اس زمانے کے اخبارات کے چند اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں:

"ہم کو پہلے سے یقین تھا کہ جس وقت ہندستانیوں نے اپنے حقوق طلب کرنے کی کوشش کی اور اپنے آپ کو قومی رشتہ میں منسلک کرنے کا ارادہ کیا تو فوراً حکام وقت کی طرف سے ان کی مخالفت ہوگی اور اگر ضرورت ہوئی تو جبر و تشدد سے بھی کام لیا جائے گا ..... جو لوگ قومی خدمت کرنا چاہتے ہیں ان کو ہر جبر و ظلم کے لیے تیار رہنا چاہیے۔" (لالہ لاجپت رائے: حب وطن کی منزل)۔

"شاید دیکھیے کہ ہندوؤں کے لیے ملک کی آزادی کے لیے جد و جہد کرنا داخل حب الوطنی ہے مگر آپ (مسلمانوں) کے لیے ایک فرض دینی اور جہاد فی سبیل اللہ۔ آپ کو اللہ نے اپنی راہ میں مجاہد بنایا ہے ... آج جو لوگ ملک کی آزادی کے لیے اپنی قوتوں کو صرف کر رہے ہیں یقین کیجئے وہ بھی مجاہدین ہیں۔ ..

..... پس اٹھ کھڑے ہو کہ خدا اب تم کو اٹھانا چاہتا ہے اور اس کی یہی مرضی ہے کہ مسلمان جہاں کہیں ہیں بیدار ہوں اور اپنے فراموش کردہ فرض جہاد کو زندہ کریں۔" (ابوالکلام آزاد: ہندستان کی آزادی اور مسلمان)

"اب ہم اس متحدہ طاقت کے ساتھ اپنے ہاتھ بڑھائیں اور مستقبل کے چہرے سے جو ہمارے ذہنی گمراعلیٰ تخئیل کے ساتھ وابستہ ہے، نقاب اٹھانے کی خلوص دل سے کوشش کریں۔" (حکیم اجمل خاں۔ ہندستان کا مستقبل)۔

"ہندستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو جن کو خدائے تعالیٰ نے کسی پراسرار معجزہ سے اس طرح متحد کر دیا ہے کہ اس سے پہلے کبھی نہ تھے، لازم ہے کہ اس ہیبت ناک حقیقت کو سمجھیں اور متحد ہو کر ان ناپاک منحوس طاقتوں کا مقابلہ کریں جو ان دونوں کی تہذیب و تمدن اور ان کے شاندار زمانۂ ماضی کے آثار کو تباہی و بربادی میں ڈھکیل دینا چاہتی ہیں۔"
(ظفر علی خاں: متحدہ ...)

"پیاری بہنوں! تمھارے درمیان میں سیتا اور حضرت زینب کے نقوش قدم پر چلنے والی خواتین موجود ہیں جن کے شوہر یا شہید کر دیے گئے ہیں اور یا تو قید خانوں میں ڈال دیے گئے ہیں ..... تمھیں قرآن پاک اور شاستروں کے احکامات کا پابند رہنا چاہیے۔ یاد رکھو کہ جب ہمارے کل مرد جیل خانوں میں چلے جائیں گے تو اس وقت آزادی کے پھریرے کو تمھی کو بلند کرنا ہوگا۔"

[ان بانوں والدہ علی برادران)، خطبہ صدارت]

اس سرسری جائزے سے اندازہ ہوگا کہ تحریک آزادی میں اردو ادب کا کتنا حصہ رہا ہے بقول علی سردار جعفری "اردو والوں نے آزادی کی جدوجہد کو قومی دائرے تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس کے دائرے بین قومیت سے ملائے اور اس طرح ایک زیادہ جان دار اور ہمہ گیر شعور کو عام کیا ۔۔۔۔"

(صبا حیدر آبادی)

اور پھر وہ صبح نمودار ہوئی جس کے لیے کتنے ہی شاعر و ادیب دار و رسن کی کڑی آزمائش سے گزرے، برسوں جیلوں میں بند رہے اور جب وہ صبح نمودار ہوئی تو شاعر بے اختیار کہہ اٹھا،

بصد غرور، بصد فخر و ناز آزادی
محل کے کھل گئی زلف دراز آزادی

مہ و نجوم ہیں نغمہ طراز آزادی
وطن نے چھیڑا ہے اس طرح ساز آزادی

زمانہ رقص میں ہے، زندگی غزل خواں ہے

(مجاز)

اردو ادب جس کے سیکڑوں سال عشق و محبت اور گل و بلبل کی حکایات دہرانے میں گزرے ہیں، وقت پڑنے پر اس نے شیشے کی بجائے تلوار اٹھانے اور بزم آرائیوں کی بجائے میدان جنگ میں کود پڑنے کی تلقین کی ہے۔ شمیم کرہانی کہتے ہیں:

ناگنوں نے کالے کالے بال لہرائے بہت
مہ وشوں نے گورے گورے گال دکھلائے بہت
منچلوں نے کورے کورے جام چھلکائے بہت
جا بجا تو دیدہ و دل خود بھی للچائے بہت
سب کو ٹھکرا کر تمہیں آ گیا میدان میں

پھر جب آزادی حاصل ہوئی تو شاعروں نے دل کھول کر آزادی اور فتح و کامرانی کے نغمے گائے۔ اقبال سہیل فرماتے ہیں:

گلزار وطن کی کوئی دیکھے تو پھبن آج ۔۔۔ سرشار ہے خوشبو سے ہر اک دشت و چمن آج
غنچوں کا صبا آ کے بھی تقبیل دہن آج ۔۔۔ ہر برگ گلستاں کی زباں پہ ہے سخن آج
صد شکر کہ ٹوٹا در زندان محن آج

رخصت ہوئی شب تار غلامی کا اندھیرا ۔۔۔ وہ سامنے ہے صبح سعادت کا سویرا
بھاگا ہے بدبختی کا اکھڑنے لگا ڈیرا ۔۔۔ لہرائے نہ کیوں عظمت قومی کا پھریرا
آزاد ہوا قید غلامی سے وطن آج

آزادی کے گن گانے اور خوشیاں منانے کے ساتھ ساتھ ہمارے شاعر اور ادیب یہ کبھی نہیں بھولے کہ وطن کی آزادی اور سالمیت کو خطرہ پیدا ہونے کی صورت میں بھی ان پر ہم وطنوں کا حوصلہ بڑھانے متحد ہو کر دشمن کا مقابلہ کرنے کا جذبہ پیدا کرنے اور رجز خوانی کے فرائض انجام دینے کی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ چنانچہ جب کبھی یہ موقع آیا اور آزادی کو خطرہ لاحق ہوا ہمارے شاعر اور ادیب کبھی پیچھے نہیں رہے اور پکار اٹھے:

اس طرف رقصاں نگاہوں میں تری جام و سبو
اس طرف اک دشمن ایمان طلب گار لہو
وہ نشیمن! رام کی جو آنکھ کا تارا رہا
وہ نشیمن! کرشن کو جو جان سے پیارا رہا
وہ نشیمن! جس کو گوتم نے سجایا تھا کبھی
جس کے تنکے سے گاندھی نے چھڑایا تھا کبھی
وہ نشیمن! جس میں نانک نے ترانے گائے ہیں
اور چشتی کے جہاں نغمات حق لہرائے ہیں
وہ نشیمن! سرمد و ٹیپو نے جس میں جان دی
شاہ عبد الحق نے جس کو تابش ایمان دی
اس نشیمن ہی سے ہے رنگینی و کیف حیات
یہ نشیمن جل اٹھا تو جل اٹھے گی کائنات

(حفیظ میرٹھی بمبئی)

غرض ہندستان کی جدوجہد آزادی کا کوئی موڑ ایسا نہیں جس میں اردو ادب نے اس کا ساتھ نہ دیا ہو اور ہر تحریک میں بھرپور حصہ نہ لیا ہو۔



جشنِ بہاراں

طلعت مسعود انصاری

منزلِ نو کا پیامی، عالمِ ایجاد ہے — عصرِ حاضر زندگی کی اک حسیں رُوداد ہے
آج کا یہ جشنِ زریں ہند کی تاریخ میں — فتحمندی کی علامت امن کی بنیاد ہے

دیکھنا اہلِ چمن، اب رنگ ہی کچھ اور ہے
آج اپنے دیس میں محنت کشوں کا دور ہے

آفتابِ کامرانی داغِ دل دھونے کو ہے — رشکِ جنت یہ جہانِ آب و گل ہونے کو ہے
آج یہ محسوس ہوتا ہے، اے چارہ گری — زخمِ تقسیمِ وطن کا، مُندمل ہونے کو ہے

دل سے اب اندیشۂ سود و زیاں مٹ جائیگا
ملک سے افلاس کا نام و نشاں مٹ جائیگا

اپنا صوبہ وادیٔ گنگ و جمن کی سرزمیں — ڈس رہے تھے جس کی رنگینی کو مارِ آستیں
جو ہمیشہ ایک پسماندہ علاقہ ہی رہا — بن گیا ہے آج پھر وہ رشکِ فردوسِ بریں

آگئی فصلِ بہاراں غنچۂ دل کھل گیا
اب نشانِ منزلِ مقصود ہم کو مل گیا

ننگ ہے بغض و ریاکاری پہ جمہوریت — سامراجی ذہنیت ہے دشمنِ انسانیت
علم کی دنیا میں قائل ہے سائنسی حقیقت — ظلم کرنا بیکسوں پر بزدلوں کی خاصیت

تنگ نظری کچھ نہیں، فرقہ پرستی کچھ نہیں
ایک ہیں ہم ایک ہیں، صوبہ پرستی کچھ نہیں

ایکتائے قوم کی ہے عظمتِ ہندوستاں — جز محبت کچھ نہیں ہے دولتِ ہندوستاں
ہم سدا انصاف کی خاطر رہے سینہ سپر — ساری دنیا پر عیاں ہے جرأتِ ہندوستاں

آج گاندھی اور نہرو کے مقدس خواب کی
مل گئی تعبیر چھٹکی چاندنی مہتاب کی

رُباعیات

تاراچرن رستوگی

معلوم نہیں اور نہ جانے کیا ہو
تازہ ستم و جور نہ جانے کیا ہو
ہر ایک کو اب خوف یہی رہتا ہے
آئندہ نیا دور نہ جانے کیا ہو

کس خواب کی تعبیر نہیں ہو سکتی
کس درد کی تدبیر نہیں ہو سکتی
ہمت سے ذرا کام تو لے اے طاہر
کس ہاتھ میں شمشیر نہیں ہو سکتی

تحقیر و ملامت کے سبب ہوتے ہیں
آماج گہِ قہر و غضب ہوتے ہیں
ہر بات پہ کھائیں جو قسم اللہ کی
وہ لوگ بھی دنیا میں عجب ہوتے ہیں

بے آب کہیں سلکِ گہر ہوتی ہے
ہر شام اُدھر رشکِ سحر ہوتی ہے
بھر آتے ہیں جب اشکِ ندامت طاہر
اس وقت نظر رشکِ نظر ہوتی ہے

سرلا دیوی — تحریک آزادی کی ایک ممتاز مجاہدہ

مرزا سجاد علی خاں اختر

•

صنف نازک کی ملکی خدمات اور ان کے ولولہ انگیز قومی جذبات سے ہندستان کی تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔ کون ایسا فدائے ملک و قوم ہے جس کے دل پر رانی لکشمی بائی (جھانسی کی رانی) اور بیگم حضرت محل کے کام اور نام دونوں نقش نہ ہوں۔ یہ دونوں ہیں تاریخ برسہا برس سے ان کی زندگیوں کو اجاگر کرتا چلا آرہا ہے۔ یہ اس لیے نہیں کہ ان کے سوانح فنا ہو جائیں گے۔ وہ تو امر ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ ہماری آنے والی نسلیں ہر دور میں ان کی انمول زندگیوں کو دہراتی رہیں اور ان سے ملک کی محبت کا سبق حاصل کرتی رہیں۔ انھوں نے ہندستان کو غیر ملکی تسلط سے نجات دلانے میں سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ وقت پڑا تو میدان جنگ میں تلوار بھی چلائی، وطن پر مال و دولت بھی نچھاور کیا اور جانیں بھی دے دیں۔ ان خواتین کے یہ جرأت مندانہ اقدام تو انیسویں صدی عیسوی کی تاریک فضا میں روشن تارے بن کر چمکے لیکن بیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی بھیانک دور میں بھی جب پورا ہندستان بدیسی حکمرانوں کی مضبوط گرفت میں آچکا تھا، چند دلیر، شیر دل اور قوم پرست خواتین ایسی پیدا ہوئیں جنھوں نے ملک کو آزاد کرانے میں اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ تاریخ ان کے کارنامے بھی دہراتی رہے گی تاکہ ہمارے ملک کی خواتین ملکی خدمت کے سلسلے میں ان کی سوانح سے سبق حاصل کرتی رہیں۔

مؤرخات بتاتے ہیں کہ تحریک آزادی کی ابتدا ہوتے ہی متعدد خواتین میدان عمل میں نظر آنے لگیں جو تحریک کو آگے بڑھانے اور اس کو کامیاب بنانے میں پیش پیش تھیں۔ بلبل ہند سروجنی نائیڈو، شریمتی اوشا دیوی، شریمتی کرتار دیوی، مس حاجی یوسف ثوبانی، مسز بے بیسنٹ، شریمتی رنجیت کور وغیرہ کے نام جنگ آزادی کے سپاہیوں کی فہرست میں شامل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا ذکر تاریخ آزادی کا ایک مستقل باب ہے۔ فی الحال شریمتی سرلا دیوی چودھری بی اے کی زندگی اور ان کے کارناموں کے ذکر پر اکتفا کی جاتی ہے۔

یہ فخر وطن خاتون ۱۸۷۲ء میں مسٹر جانکی ناتھ گوسال کے گھر بہ مقام کلکتہ پیدا ہوئیں۔ ان کے ننہال میں ادب کا دور دورہ تھا۔ ڈاکٹر رابندر ناتھ ٹیگور ان کے ماموں تھے جن کی وطن پرستی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ موصوف نے مظالم پنجاب پر اظہار ناراضگی کرتے ہوئے ۱۹۱۹ء کا گراں قدر خطاب انگریز سرکار کو واپس کر دیا۔ ان کی شہرت ان کی بلند پایہ شاعری کی وجہ سے یورپ اور امریکہ پر اپنا سکہ بٹھا چکی تھی اور ایک لاکھ بیس ہزار روپے کا نوبل پرائز حاصل کرکے انھوں نے زبان خلق سے ملک الشعراء کا خطاب بھی حاصل کیا تھا۔ سرلا دیوی کی والدہ بنگلہ زبان کی ایک نامور مصنفہ تھیں۔ ماڈرن ریویو میں ان کے مضامین شائع ہوا کرتے تھے۔ وہ عرصے تک رسالہ "بھارتی" کی اڈیٹر بھی رہ چکی تھیں۔ ایسی قابل، تعلیم یافتہ ماں کی زیر تربیت سرلا دیوی اپنی ذہنی اور دماغی قابلیتوں کو جلا دیتی رہیں۔ ہوتے ہوتے ۱۸۹۰ء میں جبکہ وہ صرف سترہ سال کی تھیں کلکتہ یونیورسٹی سے بی۔ اے کی

ڈگری حاصل کرلی۔

طالب علمی کے زمانے میں سرلا کے مضامین مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ آخر رسالہ بھارتی کی ایڈیٹری کا قرعۂ فال بھی ان ہی کے نام نکلا۔ اس طرح آپ اپنے ماموں ٹیگور اور ماں کی جانشین قرار پائیں۔ بنگلہ، انگریزی، سنسکرت اور ہندی زبانوں پر ان کو کافی عبور تھا۔ اردو میں بھی صفائی کے ساتھ گفتگو کرسکتی تھیں۔ اردو شاعری سے کافی دلچسپی تھی۔ دیہی علاقوں میں آپ کی تقریریں اکثر اردو ہی میں ہوا کرتیں۔ مشہور ہے کہ دوران تعلیم اور تعلیم کے بعد بھی رابندر ناتھ ٹیگور کی قومی نظمیں اور بنگال کے مشہور ناولسٹ بنکم چندر چٹرجی کے ناول ان کے قلب پر آہستہ آہستہ اور نامعلوم طریقے پہ انقلاب انگیز اور تغیر پذیر اثر کرتے رہے۔

آپکے ایک رشتہ دار ستیندر ناتھ ٹیگور بمبئی پریسیڈنسی میں بحیثیت آئی۔ سی۔ ایس افسر کے ایک بڑے عہدے پر فائز تھے۔ سرلا جب اُن سے ملنے گئیں تو ان کو شولاپور، پونا اور ستارہ بھی جانے اور اکثر مرہٹوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ان ملاقاتوں کے تاثرات موصوفہ نے اس طرح بیان کیے: ”میں نے مرہٹوں میں حیرت انگیز قومی جذبہ دیکھا۔ ان میں کا ہر ایک ملکی ہیرو بننے کے نشہ میں سرشار نظر آیا۔ میں نے ان کی قومی روح میں تازگی پائی۔ مجھ پہ مہاراشٹر کے اس سفر کا ایسا اثر پڑا کہ میں اپنے وطن بنگال سے جو سیاسی جذبہ لے کر چلی تھی اس پر خاص جِلا ہوئی۔ ملک کا حال و مستقبل دونوں مجھ پر چڑھتے ہوے دن کی طرح روشن ہو گئے اور میری زندگی ایسے سیاسی موڑ پر آگئی کہ میری منزلیں قریب تر نظر آنے لگیں۔“ موصوفہ جب وطن واپس آئیں تو ان کو سر رڈیارڈ کپلنگ، جو کبھی لاہور کے سول ملٹری گزٹ کے اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی رہ چکے تھے، ان کی نظموں کے مطالعے کا موقع ملا۔ بنگالی چونکہ فطرتاً ذہین اور زیرک ہوتے ہیں، انگریز ان سے ہمیشہ خائف رہے اور فرضی قصوں اور بے بنیاد نظموں کے ذریعے بنگالیوں کو رسوا اور ذلیل کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ کپلنگ اس پروپیگنڈے کے روحِ رواں تھے۔ ان کی نظموں نے محب وطن سرلا دیوی کے زخم خوردہ دل کے ساتھ وہ کیا جو جلتی آگ کے ساتھ تیل کرتا ہے۔ جو جذبات و احساسات وہ مہاراشٹر سے لے کر آئی تھیں وہ یکبارگی بھڑک اٹھے۔ قومی غیرت و حمیت نے تقاضا کیا کہ اس قسم کی ملعون زندگی کب تک بسر ہوتی رہے گی۔ ہمارے ملک اور ہماری قوم پر اس طرح کے جو ناروا حملے کیے جاتے ہیں کیا اُن کا دندان شکن جواب نہ دیا جائے گا؟ یہ سوچ کر سر رڈیارڈ کپلنگ کو بالواسطہ کوئی جواب دینے کی بجائے انھوں نے اپنے اسلاف کے کارناموں سے برادران وطن کو آگاہ کرنا شروع کیا۔ جگہ جگہ سبھائیں قائم کیں۔ لکچر دیے اور لوگوں میں کام کرنے، ملک کا نام روشن کرنے اور عملی زندگی اختیار کرنے کی روح پھونک دی۔ اخبارات اور رسائل میں ایسے مضامین لکھنے شروع کیے جن سے ملک کی موجودہ نسلوں کے دلوں میں حرارت و حرکت پیدا ہوجاے۔ ”بھارتی“ نام کے رسالہ میں جن کی وہ ایڈیٹر تھیں، مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا جن کا عنوان تھا ”انگریزی گھونسا بنام دیسی مکا“۔ آخر ان کی اس محنت شاقہ کا یہ نتیجہ ہوا کہ شادی بیاہ میں جہاں ناچ مجرے ہوتے تھے، اب قومی اکھاڑے ہونے لگے اور اس طرح اس دیش بھگت معزز خاتون نے وطن کے ایک بڑے گروہ کو قومی رنگ میں ایسا رنگ دیا کہ دو سال کی مختصر مدت میں بنگال میں ایک انقلاب پیدا ہوگیا۔ ایک بار دسہرہ کے موقع پر آپ نے ویر اشٹمی کی تشریح کرتے ہوے حاضرین جلسہ کو بتایا کہ دسہرہ دراصل ہمارے بہادروں کی یادگار ہے اور ہم سب ان ہی بہادروں کے خون اور نسل سے ہیں اس لیے بہادری اور شجاعت کا دامن ہمیں کسی عالم میں کبھی چھوڑنا نہ چاہیے۔ اگر یہ دامن چھوٹا تو ہماری روایتی دیرینہ پر کلنک کا ٹیکہ لگ جائیگا اور اپنے سماج کو جو انقلاب کی موڑ پر آچکا ہے منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔“

اکتوبر ۱۹۰۵ء میں بنگال کی ادبی اور قومی ہیرو ئن سرلا کی شادی پنجاب کے قانونی اور سیاسی ہیرو پنڈت رام بھجدت چودھری بی۔ اے، ایل ایل بی کے ساتھ ہوئی۔ سرلا نے اپنے

[illegible] میں بھی آزادی اور بیداری کا [illegible]
[illegible] ان عورتوں میں بھی قدرت کا جذبہ پیدا کرنے کے علاوہ
ہمارے معاشرے کے باشندوں میں آزادی حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کے
ولولے پیدا کر دیے سکتے تھے۔ اب اس شادی کے بعد پنجاب میں ملکی
شعور کی بیداری پیدا کرنے کے لیے ان کو موقع مل گیا اور انھوں
نے یہاں کی عورتوں اور مردوں کے کردار کا نفسیاتی جائزہ لینا
شروع کیا۔ پنجاب میں جس بات نے آپ پر سب سے زیادہ اثر کیا وہ
یہ تھی کہ پنجابیوں میں جسمانی طاقت موجود ہے ان کی قوی
مضبوط ہیں اُن میں حرارت اور گرمی بھی ہے مگر روحانی جذبہ ان
میں نفی کے برابر ہے۔ اور یہ وہ کمی ہے جس نے ان کو ایک پہلوان
صفت ہونے کے باوجود بزدل بنا رکھا ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے
وہاں کی عورتوں میں تعلیم کا پرچار شروع کیا۔ جلسوں اور جھونپڑیوں
میں پھر پھر کر تقریریں کیں۔ زنانہ مدرسے قائم کیے اور اپنی صنف
کو بھی بیدار کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ بعض ایسے مدرسے بھی تھے جن
کے اخراجات جزو کل ان کے ذمے تھے۔ اس سلسلے میں ان کی
دلچسپیاں اس لیے زیادہ تھیں کہ ان پر نفسیات کے اس اصول نے
بہت زیادہ اثر کیا تھا کہ ماؤں کی گود آنے والی نسلوں کے لیے قدرت
کی جانب سے عطا کیا ہوا ایک موثر مدرسہ ہے جس میں تربیت پا کر افراد
ایک بہتر سماج کی تعمیر کر سکتے ہیں۔ اس شعبے میں موصوفہ کو کافی
کامیابی حاصل ہوئی اور پنجاب کی عورتوں نے بعد میں ایسے ایسے
کارنمایاں انجام دیے جو یادگار زمانہ ہے اور زبان زد خلائق
ہو کر رہے۔

خدمت خلق میں سرلا چودھری کا وقت گزرتا گیا۔ ملک بھی
کروٹیں بدلتا رہا۔ یہاں کے عوام میں انقلاب کے شعلے بھڑکتے رہے
اور ان میں سامراجی طاقتوں کے خلاف نبرد آزمائی کا جذبہ بڑھتا
رہا۔ یہاں تک کہ اپریل ۱۹۱۹ء میں ڈائر اور اوڈائر کے جابرانہ
حکم سے جلیانوالہ باغ کا انسانیت سوز المیہ رونما ہوا جس پر
[illegible] کے سلسلے میں ان کے شوہر چودھری صاحب گرفتار
کر لیے گئے [illegible] اس حادثہ عظیم نے سرلا دیوی کے دل میں درد

[illegible] کر دیا تھا۔ شوہر کے گرفتار ہونے کے بعد [illegible]
کا کام بھی کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ مارشل لا کی صعوبتوں میں
انصاف کا فقدان ہے اور جس طرح بے کس و بے بس پنجابیوں کے
ساتھ جابرانہ سلوک کر کے انصاف کا خون کیا گیا ہے اسی طرح
ان کے شوہر کے ساتھ بھی بے انصافیاں برتی جائیں گی اور
ایسا ہی ہوا۔ مقدمہ کی جواب دہی کی مہلت دیے بغیر ہی [illegible]
کو سزا دے دی گئی اور جائیداد بھی ضبط کر لی گئی۔ جب سرلا صاحبہ
سے کہا گیا کہ اب تو کوٹھی سے علیحدہ ہونا پڑے گا تو آپ نے کہا
"کوئی پرواہ نہیں میں راوی کے کنارے کٹیا بنا کر رہوں گی اور
اپنے مشن کو پورا کروں گی۔"

چودھری صاحب کے مقدمے کے دوران پنجاب کی خواتین نے لاہور
کے ایک بہت بڑے اجتماع میں جس میں ہزاروں عورتیں شریک
ہوئی تھیں۔ جلیانوالہ باغ کے قیامت خیز اور لرزہ براندام
کر دینے والے حادثہ کا ذکر اس انداز میں کیا اور [illegible]
جاگتی تصویر کشی کی کہ عورتوں میں کہرام مچ گیا اور [illegible] دھاڑیں مار
مار کر رونے لگے۔ انھوں نے عورتوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا
"ڈائر اور اوڈائر کی جابر حکومت کا یہ سیاہ کارنامہ ہندوستان
کی تاریخ میں خون سے لکھا جائے گا اور آنے والی نسلیں کلیجہ
پکڑ لیں گی جب وہ پڑھیں گی کہ جلیانوالہ کی تپتی ہوئی [illegible]
پر [illegible] رینگ [illegible]
پیٹ کے بل [illegible] چلائے گئے [illegible]
[illegible]
اور سنگینوں سے [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

اپنی بے پناہ اور پُر اثر تقریر ختم کی۔

قریب ہے یارو روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

اپنے معزز اور بے قصور خاوند اور دوسرے ناکردہ گناہ لیڈروں کی گرفتاریوں، مارشل لا کے ظلم آفریں ایام کی سختیوں اور خلافت کے ساتھ ناانصافیوں کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ۱۰ اگست ۱۹۲۰ء کو آپ نے وائسرائے ہند کو ایک خط بھیجا جو یہ تھا:

"جناب والا مجھ کو آپ کی گورنمنٹ سے بنگالی رجمنٹ میں رنگروٹ بھرتی کرانے کے صلہ میں ایک آویزا عطا کیا گیا تھا جو کبھی میرے لیے باعث افتخار تھا۔ مگر اب اس پر ناز کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ میں تحریک خلافت کے حشر کو دیکھ رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ ہندوستان کے مسلمان زن و مرد اس بے انصافی سے کس درجہ بے چین و مضطرب ہیں۔ اگرچہ میں ایک ہندو عورت ہوں مگر میں نے اپنی قسمت کو اپنے مسلمان بھائیوں اور بہنوں کی قسمت کے ساتھ جو اپنے مذہب کے اقتدار کو خطرے میں دیکھ رہے ہیں وابستہ کر دیا ہے۔ لہٰذا میں تحریک عدم تعاون پر عمل پیرا ہو کر جو خلافت کمیٹی کی جانب سے نافذ ہوئی ہے نہایت افسوس کے ساتھ آپ کی حکومت کے عطیہ (آویزے) کو واپس کرتی ہوں۔ مزید برآں اس افتخار و عزت سے دست کش ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں ایک پنجابی لیڈر کی بیوی ہوں جس کی معصومی و بے گناہی پر مجھ کو کماحقہ یقین ہے۔ مگر میرے شوہر کو بغیر کسی جرم کے مجھ سے چھین لیا گیا۔ مارشل لا کے ایام میں میں لاہور ہی میں مقیم تھی۔ میں مضطرب اور غم خوردہ دل کے ساتھ اپنی ان بہنوں سے ملا کرتی تھی جن کے خاوند، بھائی یا باپ اُن سے بلا وجہ علیحدہ کر دیے گئے تھے۔ میں ان فریادیوں کو تسلی دیا کرتی تھی۔ میں نے اس مضحکہ خیز کارروائی کو بھی دیکھا جو لاہور کی عدالتوں نے جاری کر رکھی تھی جو فوجی قانون کے تحت قائم کی گئی تھیں۔ میں ان بھیانک اور مصائب سے لبریز ایام میں خاموش بیٹھی رہی۔ وہ مظالم میری آنکھوں میں پھرتے تھے اور ان مناظر کی یاد آج بھی میرے دل کو ہلا دیتی ہے۔ [illegible] نہایت موزوں ہے کہ خلافت کے [illegible] مگر افسوس ہے کہ آپ نے بھی کوئی اعتنا نہیں کیا [illegible] کہ اسے خلافت اور مارشل لا کی [illegible] تحریک کی [illegible] تلافی ہو جائے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت ہند اور حکومت برطانیہ انصاف اور صداقت دونوں چیزیں بھول گئی ہیں۔ جب تک بے انصافی کے یہ دو نمونے میری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں اور ان کی یاد تازہ ہے، میں گورنمنٹ کے ساتھ ہر اتحاد سے انکار کرتی ہوں۔" (سرلا دیوی چودھرانی)

سودیشی کی تحریک۔

جنوری ۱۹۲۱ء میں جب مہاتما گاندھی کانگریس کے اجلاس میں شرکت کے لیے لاہور میں موجود تھے، چودھرانی صاحبہ نے اپنا بڑا لڑکا ان کی نذر کر دیا۔ کبھی یہ لڑکا راجہ مہاراجہ کے لڑکوں کی طرح اونچے اونچے مدرسوں میں تعلیم پاتا، انگریزی کھانے کھاتا اور انگریزی پوشاک استعمال کرتا۔ مہاتما کی سرپرستی میں آتے ہی بالکل بدل گیا۔ اب وہ کھدر پوش ہے اور بجائے فرسٹ کلاس میں سفر کرنے کے تھرڈ کلاس میں سفر کرتا اور ملک کی سیوا کرنا اپنا دھرم سمجھتا ہے۔ لڑکے کو تو "باپو" کے حوالے کر ہی دیا تھا، فروری ۱۹۲۱ء سے پانچ یا چھ ماہ تک خود بھی مہاتما کے ہمراہ بمبئی، پنجاب، یوپی وغیرہ کا دورہ کرتی رہیں اور اس طرح ان کی ہمراہی میں سیاسی ٹریننگ حاصل کرتی رہیں جس کے بعد ان کے قومی معتقدات اتنے پختہ ہو گئے کہ سندھ، کراچی، حیدرآباد وغیرہ میں جہاں بھی خلافت کے سلسلے میں کی جانے والی ناانصافی پر تقریر کی وہاں ایک ہلچل مچا دی۔

سرلا دیوی چونکہ میدانِ عمل کی ایک باعمل فرد تھیں لہٰذا انھوں نے اپنے امیرانہ ٹھاٹ کو یک لخت بدل دیا اور کھدر پوش ہو گئیں۔ لاہور کی عورتیں ان کی کھدر کی ساڑھی دیکھتیں اور کہتیں "[illegible] ابھی چند روز پہلے آپ [illegible] کی بہن اور نازک [illegible] بنی ہوئی ریشمی ساڑھی پہنتی تھیں، آج ہاتھ کی بنی ہوئی [illegible]

[illegible]
[illegible] کا [illegible] ہوا ہے جن
[illegible] کے ہاتھ [illegible] ہماری دستکاری کا بازار چھینا ہوا
[illegible] مجھے بڑا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی تیاری
[illegible] ہنروں اور بھائیوں کی محنت شامل ہے۔"

جلیانوالہ باغ لاہور میں ۸ جولائی ۱۹۲۰ء کو ہوم رول لیگ کی طرف سے ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس کی صدارت چودھرانی صاحبہ نے کی اور وہاں بھی سودیشی کا پرچار کیا۔ اس سے پہلے بھی جالندھر کے ایک جلسے میں جس کے صدر مہاتما گاندھی تھے موصوفہ کھدر کی افادیت پر ایک مدلل اور موثر تقریر کر چکی تھیں۔ دسمبر ۱۹۲۰ء کو ناگپور میں انڈین نیشنل کانگرس کا ہنگامہ خیز اجلاس ہوا جس میں ہندوستان کے قابل ترین دماغ والے موجود تھے۔ سرلا دیوی نے ایک نشست میں زبردست تقریر کی اور فرمایا "اس وقت دو مخالف خیالات کی جنگ ہو رہی ہے۔ ایک طرف برطانوی حاکموں کی حرص و آز اور دوسری طرف محکوموں کی قومیت۔ اس جنگ میں اپنے بچاؤ کے لیے جو طریقہ ہم اختیار کر سکتے ہیں وہ صرف ترک موالات ہے۔ بدیشی کپڑوں کا بائیکاٹ کیا جائے۔ ہماری عورتیں چرخہ کاتیں اور ہاتھ کا بنا ہوا کپڑا استعمال کریں۔ مجھے یقین ہے کہ اس آسان طریقہ کار سے ہماری بہنیں سوراج کا ایک مضبوط ستون ثابت ہوں گی۔"

اپریل سنہ ۱۹۲۱ء میں آپ نے بمبئی کے مختلف جلسوں میں تقریریں کیں۔ ان تقریروں میں ہندو مسلمانوں کا وہ عظیم الشان جلسہ بھی تھا جو ۱۲ اپریل ۱۹۲۱ء کی شام کو ہوا اور جس میں مسٹر ہارنی مین سابق ایڈیٹر "بمبئی کرانیکل" کی جلاوطنی پر اظہار ناراضگی کیا گیا، برطانیہ کے منصفانہ رویے پر روشنی ڈالی گئی اور سودیشی کی ہمت افزائی اور [illegible] کے مصیبت زدگان کی امداد کے لیے اپیل کی گئی۔ اس میں آپ نے اپنی تقریر میں فرمایا ..."ہندوستان ہر سال [illegible] روپیہ دیتا ہے۔ آج سے ایک سو سال پہلے [illegible] یہاں کپڑا سازی کی صنعت بڑے عروج پر تھی لیکن [illegible] نے اس کو کچلنے اور برطانوی صنعتوں کو رواج دینے کے [illegible] جب [illegible] اس کو کامیابی ہوئی تو [illegible] دارانہ طریقے استعمال کیے گئے اور آخر ان طریقوں سے کمپنی کامیاب ہوگئی۔ اب جب تک ہندوستانی اس ساٹھ کروڑ روپے کی نکاسی کو بند نہ کریں گے اس وقت تک ہمیں سوراج حاصل نہیں ہو سکتا۔"

جون کی کسی ابتدائی تاریخ کو بدایوں (یو۔پی) میں مولانا [illegible] صاحب کے مکان پر خواتین کا ایک جلسہ عام ہوا جس میں حسب دستور چودھرانی صاحبہ نے کھدر کے استعمال، چرخہ کاتنے کے فوائد، خلافت کے مسئلے اور پنجاب کے مظالم پر ایک درد انگیز تقریر کی جس کا اثر حاضرین جلسہ پر بہت کچھ ہوا۔ تقریر میں ہندو مسلم اتحاد پر زیادہ زور دیا گیا تھا۔ اختتام جلسہ پر اکرام صاحب کی بیگم نے حاضرین کی شربت سے تواضع کی۔ ایک ہندو عورت نے چودھرانی صاحبہ سے سوال کیا، "کیا آپ مسلمان عورت کے ہاتھ سے شربت پی لیں گی؟" چودھرانی نے جواب دیا، "سب لوگ خدا کی مخلوق ہیں [illegible] ذات پات، چھوت چھات یہ ساری بندشیں اب [illegible] رکھتے ہوئے باقی نہ رہنا چاہیے۔ خدا کے نزدیک تمام انسانوں کا درجہ مساوی ہے۔ اگر ایک بھنگن بھی صاف ستھری ہے اور وہ باتیں اس میں نہیں ہیں جن سے کراہت پیدا ہوتی ہے تو اس کے ہاتھ سے بھی کھانا لینا چاہیے...." اس دلیل [illegible] سے تمام ہندو عورتوں نے مسلمان عورتوں کے ہاتھ سے شربت پی لیا۔

اس زمانے میں شریمتی سرلا جی نے اپنا تمام زیور یعنی کانوں کی بالیاں، جڑاؤ گلے کا چین، ہاتھوں کی ہیرے کی چوڑیاں اتار کر سوراجیہ تلک فنڈ کے لیے مہاتما گاندھی کے پاس بھیج دیں۔ صرف موتیوں کا ایک ہار رکھ لیا جو ان کے بزرگ [illegible] سنگھ نے ان کو تحفتاً دیا تھا۔ ان تمام زیوروں کی قیمت جو سرلا جی نے تلک فنڈ میں دیے تھے اس وقت کے لحاظ سے تقریباً پانچ ہزار روپے تھی۔ ایسی بے مثال قربانی اور ایسی فیاضی [illegible] کی بہت کم ملتی ہے۔ کاش ہمارے ملک کی خواتین اس جذبہ ایثار

...ہیں اور وطن کی خدمت کے لیے اپنے مال و دولت سے دریغ نہ کریں۔

اصولِ تعلیم کا نظریہ

جلسہ میں ۲۷ ر، ۲۸ ر اور ۲۹ ر جون ۱۹۲۱ء کے ایام بڑی چہل پہل کے تھے۔ ان دنوں قومی خالصہ ہائی اسکول کی بنیاد رکھی جا رہی تھی۔ ایک زبردست خالصہ دیوان منعقد ہوا جس میں چودھرانی صاحبہ نے فرمایا: "قومی تعلیم کے فرائض ادا کرنے میں درسگاہوں کی ذمہ داریاں ہیں۔ عام تعلیم کے علاوہ قومی اسکولوں کی ابتدائی تعلیم میں صنعت و حرفت کا خاص خیال رہنا چاہیے تاکہ طلبا کم سے کم اپنی تعلیم کے سلسلے میں خود کفیل بن سکیں۔ طلبا کو اس قسم کی تعلیم دینا چاہیے کہ ان میں مذہبی برداشت پیدا ہو سکے، وہ ایک دوسرے کے مذہب میں عیب جوئی کے عادی نہ بن سکیں، ان میں ملک کی خدمت کے ساتھ رواداری اور مساوات پیدا کی جانی چاہیے تاکہ ہندوستان ایک متحد قوم کا ملک کہے جانے کے قابل ہو سکے۔ ہماری تعلیم کا مقصد صرف روزی پیدا کرنا نہ ہو بلکہ نصاب میں وہ موضوع بھی رکھے جائیں جن سے انفرادی ترقی کے ساتھ ساتھ سماجی ترقیوں کے اسباق بھی مل سکیں اور جن سے طالب علموں کے کردار کی تعمیر میں مدد مل سکے اور پاکیزگیِ خیال، جذبۂ الفت و اتحاد کی منزلیں ان کے سامنے نمایاں رہیں۔ تعلیمِ نسواں نہایت ضروری ہے کیونکہ تعلیم یافتہ ماؤں کی گود میں پرورش پا کر زندگی میں داخل ہونے والے افراد ہی سے ہم مستقبل کی حب الوطنی پر مبنی سماج کی بنیادیں ڈال سکتے ہیں۔"

یہ ہے مختصر سوانحِ حیات اُس خاتون کی جس نے وقت کے توپ ضربوں کی صدا پر لبیک کہی اور واقعات کی سنگینوں پر پھول

[illegible] کو [illegible] تحریک [illegible] بلکہ [illegible] ان کا مقصد [illegible] جاتے رہے لکھی ہے۔ آپ نے خود بھی ہندوستانی پوشاک پہننے یا [illegible] کا زبانی پرچار نہیں کیا بلکہ خود ہزاروں روپے کی لاگت کے اپنے ولایتی کپڑوں کی قومی ہولی میں نذرِ آتش کر دیے۔ اسی طرح گاؤں اور محلوں میں جا کر خود چرخہ چلایا جس کا اثر یہ ہوا کہ جو عورتیں اور لڑکیاں چرخہ کو پہلے حقارت کی نظر سے دیکھتی تھیں، اب خوشی خوشی سے چلانے لگیں۔ چرخہ کے موضوع پر ایک مضمون میں آپ نے فرمایا: "زمانہ کی ہوا اس تبدیلی کا باعث ہے۔ اگر روپے کے نقطۂ نگاہ سے چرخہ کی خدمات کا لحاظ کیا جائے تو وہ ملک کے ساٹھ کروڑ روپے کا محافظ ہے۔ پاکیزگی کے خیال سے وہ ان عورتوں کی عزت کا بچانے والا ہے جو مزدوری کر کے کارخانوں میں کام کرتی ہیں۔ بے فائدہ ادھر اُدھر پھرنے والی عورتوں کے لیے ایک ایسا رفیق ہے جو ان کے خیالوں کو منتشر نہیں ہونے دیتا، بلکہ ہر وقت ان کا ایک دل بہلانے والا ساتھی ہے۔۔۔"

اب ہمارا ملک آزاد ہو چکا ہے۔ ملک میں اتحاد و اتفاق کے عمل پرچار کی آج بھی اسی طرح ضرورت ہے جس طرح چودھرانی سرلا دیوی کے زمانے میں تھی۔ اس وقت تو ہندوستان کو آزاد کرانا تھا، اب حاصل کی ہوئی آزادی کی حفاظت کی ضرورت ہے۔ اُس وقت سامراجیوں کے خلاف جنگ کرنا تھی آج ملک دشمن عناصر سے جنگ آزما ہونا قومی مفاد کا ایک اہم تقاضا ہے۔ آج بھی سرلا جیسی دیویوں کی ملک کو ضرورت ہے جن کی گود میں پلے بڑھے نسل کے بچے جو مشقتوں سے حاصل کی ہوئی آزادی کی حفاظت کے استحکام و ترقی کے لیے نہ صرف تن من سے منہمک رہے بلکہ وقت آ جائے تو جان کی بازی لگانے سے بھی دریغ نہ کرے۔



غزل

شعور بریلوی

فطرتِ دل غم شناس، دیکھیے کب تک رہے
ذوقِ جنوں بدحواس، دیکھیے کب تک رہے

عزمِ جواں مضمحل، تاب و تواں منفعل
زیست کا چہرہ اداس، دیکھیے کب تک رہے

دیر و حرم کا یقیں، کش مکشِ کفر و دیں
زندگی دور از قیاس، دیکھیے کب تک رہے

دورِ خزاں کا خطر، خدشۂ برق و شرر
قلبِ چمن میں ہراس، دیکھیے کب تک رہے

سوزشِ زخمِ دروں، کاوشِ دستِ جنوں
عشق دریدہ لباس، دیکھیے کب تک رہے

فطرتِ طبعِ سلیم، مرکزِ امید و بیم
نت نئے وعدوں کی آس، دیکھیے کب تک رہے

وعدۂ سحر آفریں، اور شعورِ حزیں
عالمِ امید و یاس، دیکھیے کب تک رہے

فکر و فن

اخگر مشتاق رحیم آبادی

سرکار ہی جہاں میں مرا آسرا نہ تھے
بت ہی تو آپ تھے کوئی میرے خدا نہ تھے

اب اُن کو اختلاف ہے مجھ سے تو کیا علاج
پہلے تو میرے اُن کے مسائل جدا نہ تھے

اک اور ہی خیال سے کھاتے رہے فریب
وعدے تو ان کے ایسے کوئی خوشنما نہ تھے

اظہارِ مدعا سے جو ہیتی وہ کیا کہیں
اپنا یہی قصور ہے بے مدعا نہ تھے

امیدِ التفات بھی اپنا ہی جرم تھا
ظاہر ہے ورنہ آپ ہماری رضا نہ تھے

یہ شکوہ ہائے تلخ کلامی بجا، مگر
سچ کہیے آپ بھی کبھی شیریں نوا نہ تھے

دنیا کی ہر خوشی کا جہاں ساتھ چھٹ گیا
شاید وہاں حضور سے رہ نما نہ تھے

سرکار نے مزاج ہی ایسا بنا دیا
ہم ورنہ تلخ گوئی پہ مائل ذرا نہ تھے

اخگر جو واقعاتِ محبت تھے چشم دید
کچھ دن گزر گئے تو وہی اب فسانہ تھے

ایک حقیقت ایک کہانی

نجم الدین نقوی

بزرگوں نے بیان کیا کہ اورنگ زیب جب دکن کی مہم میں مصروف تھا تو اودھ کی ایک بہت قدیم بستی کے ایک سید زادے جن کا مردانہ حسن نہ صرف ان کے زمانہ میں بلکہ ان کے بعد بھی پشت در پشت اس خاندان کے لیے باعثِ فخر رہا، دہلی میں علوم مشرقیہ کی تحصیل کے لیے مقیم تھے۔ وہ ایک دن کسی گزرگاہ پر جا رہے تھے کہ ان کی شکل و شمائل دیکھ کر کہ پڑوں مدتوں بعد ایک شاہ مل گیا۔ ایک مخدرۂ عصمت بے تحاشہ دل دے بیٹھیں۔ نامہ و پیام شروع ہوئے اور حریم ناز میں شرفِ باریابی ملا۔ صاحب زادے ناتجربہ کار نوآموز اور اندیشے تھے، پھر وطن سے سینکڑوں میل دور، مسافرانہ زندگی گذار رہے تھے، کچھ ڈرے، کچھ سہمے، کچھ ہمت باندھی — کرم خصت گستاخی لیے پاکی دیتا رہا مگر بجز خجلت تقصیر کچھ ہاتھ نہ آیا۔ قصہ مختصر وطن واپس آئے مگر چلتے وقت قمیص کا پچھلا دامن یہ کہہ کر پھڑا یا کہ اگر تم میرے وطن آجاؤ تو بچھڑے ہوئے مل جائیں اور ایسے ملیں کہ تا قیامت جدا نہ ہوں۔ رخصت ہوئے اور دل حسرت پرور دہ کو بڑی مشکل سے سنبھالا۔ سفر میں سوچتے جاتے تھے کہ کہاں دہلی اور کہاں اُن کا کور دیہہ۔ ناز و نعم میں پلی ہوئی یہ بانوئے تخت صفات اپنے کو کیسے منزلوں کی صعوبات کی نذر کر سکے گی۔

وطن پہنچے، والدین سے ملے مگر کھوئے کھوئے سے بہتے بھولے بھولے سے محسوس ہوتے ؏

وہ کبھی زمیں کی تو کبھی آسماں کی

قصبے سے چھ میل کے فاصلے پر آبائی زمینداری کا ایک گاؤں بہادر گنج تھا، عین گنگا کے کنارے۔ یعقوب نے جب اپنے یوسف کی یہ حالت دیکھی تو دل بہلانے اور مصروف رکھنے کے لیے گاؤں کے انتظامی امور سپرد کر دیے مگر شرط یہ رکھی کہ ہر روز نماز صبح باپ کے ساتھ ادا کریں۔ لائق فرزند تعمیل حکم کرتے رہے۔ روزانہ علی الصباح شرنگ گھوڑے پر سوار ہو کر آنا، باپ کو سلام کرنا، نماز صبح کے بعد کچھ کھا کر پھر گاؤں کو واپس چلے جانا مدتوں جاری رہا۔

"گرہ کشایانِ سلسلۂ سخن و تازہ کنندگانِ فسانۂ کہن" سے معلوم ہوا کہ جب سید زادے دہلی چھوڑ کر وطن آ رہے تھے تو اُن کے حبیب نے وہ راستہ دریافت کیا جو اُن تک پہنچنے کی سبیل بن سکے۔ راستہ بتایا گیا مگر اس یقین کے ساتھ کہ وہ ناطورۂ ناز آفریں اتنی سخت منزلیں طے کر کے کیسے پہنچے گی۔ بتایا گیا کہ دہلی سے براہ جمنا الٰہ آباد تشریف لائیں اور قصبہ الٰہ آباد سے آتی گنگا بہاتی ہوئی کڑہ، مانک پور اور تحصیل سرائے کرتی ہوئی بہادر گنج تشریف لائیں جو عین گنگا کے کنارے واقع ہے۔

یہ صاحب زادے تو راستہ بتا کر چلتے بنے مگر اُس جانب دل کی لگی نے بے چین اور مضطرب رکھا۔ کہتے ہیں کہ زخموں کو مندمل کرنے میں وقت بہت مددگار ثابت ہوتا ہے مگر اس معاملے میں وقت کا مرہم زخم کو مندمل نہ کر سکا اور دونوں جانب آگ برابر لگی رہی۔ اس طرف مایوسی، بے دلی اور دل باختگی طاری تھی اور اُس طرف آتشِ شوق تیز تر ہوتی جاتی تھی۔

بزرگ جب داستان کی اس منزل پر پہنچتے تھے تو اگرچہ اُن کی عمر پچھتر سال سے متجاوز ہو چکی تھیں ان کی...

[illegible] کی ایک جھلک [illegible] جب [illegible] اللہ [illegible] نوجوان [illegible] گھوما کرتے تھے اور ہمیں [illegible] مرحوم کی خوش نصیبی پر رشک آنے لگتا تھا۔ ہم میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو خود بھی اقتصادیات کی منزلوں سے گذر رہے تھے۔ مگر مولوی مدن والی بات سے منزلوں سے دور رہے۔

بات ایک رات کی ہے بلکہ ایک شام کی جب آفتاب عالم تاب جمال شان کا مظہر بنا ہوا افق پر شفق بکھیر رہا تھا، ساون کی بر ہوائیں، کوئل کی کوک، پپیہے کی پی کہاں میر کا شعر یاد دلا رہے تھے۔ ؎

چلتے ہیں تو چمن کو چلیے سنتے ہیں کہ بہاراں ہے
ڈالی ڈالی پھول کھلے ہیں کم کم باد و باراں ہے

مگر ان کیفیات کا اثر مرحوم سید زادے پر کیا ہوتا۔ اس لیے وہ تو اُس کیفیت میں کھوئے ہوئے تھے جسے خواجہ میر درد نے اپنے اس شعر میں کیا خوب بیان کیا ہے۔ ؎

خلوتِ دل نے کر دیا اپنے حواس میں خلل
حسن بلائے چشم ہے، نغمہ وبالِ گوش ہے

دفعتاً اُسی شام کو وہی جانی پہچانی ہوئی صورت نظر آئی۔ وہی وردی، وہی چاندی کا عصا اور وہی چکردار زرتار پگڑی والا عمامہ سامنے تھا۔ نظریں ملیں مگر یقین نہ آیا۔ کئی بار آنکھوں کو ملا اور رومال سے صاف کیا اور پھر دیکھا تو وہی ہیولیٰ، وہی پیکر سامنے تھا۔ بے ساختہ منھ سے نکلا "تم کیسے" جواب ملا۔ ع

میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں

بیگم صاحب تشریف لائی ہیں۔ وہ دیکھیے سنہرا بجرا شفق پر طنز کر رہا ہے۔ سید زادے دیوانہ وار، سر برہنہ بھاگ کر گھاٹ پر پہنچے، قدموں پر سر رکھ دیا۔ اس پذیرائی کے جواب میں اُس طرف موتی سے چند آنسو اور مسکراہٹ بھرے کانپتے ہوئے ہونٹ سامنے تھے۔

جب قصہ اس منزل پر پہنچا تو ہم لوگ کہتے "بابا" کمال ہے یہ جذبۂ شوق، یہ کشش! اور بابا مزے لے لے کر فارسی کا یہ شعر پڑھنے لگتے تھے۔ ؎

عشق از این بسیار کرد است و کند
سبحہ را زنار کرد است و کند

اور بابا یہ شعر کیوں نہ پڑھتے آخر انھیں کے متعلق تو وطن کے ایک منچلے نے کہا تھا۔ ؎

وضع داری کے یہ معنی ہیں کہ پیری میں بھی
نہیں رکتے درِ دلدار کے جانے والے

اور بابا کی یہ وضع داری آخر وقت تک قائم رہی۔ اُن کے بعد "صحبتِ شب کی جلی ہوئی" شمع رہ گئی تھی سو کافی دن ہوئے وہ بھی خموش ہو گئی۔

ہاں تو بات آگے بھی ہے۔ سید زادے نے اپنے عالی شان مگر کچے مکان میں اُس انگبیں کو اُتارا اور عقد کر لیا۔ مگر یہ معمول رہا کہ صبح کی نماز اپنے باپ کے ساتھ پڑھتے تھے۔ یہ پابندی بھی تا بہ کے چلتی۔ سبحہ کو زنار ہونا تھا۔ باپ کے ساتھ صبح کی نماز کی پابندی میں خلل [illegible] میں شامل ہوتے اور کبھی غیر حاضری [illegible] کر کے باپ کو مطمئن کر دیتے تھے۔ مگر مشک کی خوشبو کون روک سکتا تھا۔ وطن والوں تک پہنچی۔ جن کے شستے لطیف تھے انھوں نے مزہ لیا اور جو تنگ ظرف اس خبر کو برداشت نہ کر سکے انھوں نے باپ کے کان بھرے۔ باپ نے حقیقت حال دریافت کی۔ بیٹے کو سچ بولنے کی تعلیم ملی تھی، سر جھکا کر شرمندگی کے انداز میں جرم محبت کا اقرار کیا۔ باپ کا چہرہ غصہ سے سُرخ ہو گیا اور کہتے ہیں کہ مدتوں بات نہ کی۔ آخر وقت بہت عذر خواہ نے قدموں پر سر رکھ کر رفع ملال کر دیا۔ باپ نے سینے سے لگایا اور بہو کو بھی سامنے بلا کر دعا دی۔

بڑے میر صاحب کا جب انتقال ہوا تو ان کی آبائی ملکیت میں صرف وہی ایک گاؤں تھا جس کا اوپر ذکر آیا۔ بہو صاحب حسب وطن آئیں تو انھوں نے ایک سنگین دیوان خانہ بنوایا اور ایک پختہ حرم سرا تعمیر کی جو اب بھی موجود ہیں۔ بہادر گنج میں جہاں وہ پہلے پہل اُتری تھیں ایک عالی شان مسجد تعمیر کرائی جو آج بھی باقی ہے۔ وطن کو مرکز بنا کر پچھم میں چاروں طرف اپنی دولت سے بیالیس ۴۲ نمبری گاؤں ٹھیکے

شوہر کے نام خریدے چنانچہ آج بھی جب قدرے ٹوٹ چکا ہے اور ساقی بھی باقی نہیں، اس خاندان میں جب بھی کوئی شادی ہوتی ہے تو بستی کا گھاٹ بیالیسی کی کھوا ہٹ کا ذکر برابر کرتا ہے۔

بزرگوں نے اُن بانوئے نجستہ صفات کا اسم گرامی ماہ پرور یا ماہ پرویں بتایا ہے۔ بہدبند مرحومہ کو مغل شاہزادی بتاتے تھے اور حاسد مجہول النسب ٹھہراتے تھے۔

ماہ پرور کے شوہر کا انتقال پہلے ہوا۔ بیوہ ہونے کے بعد اس نیک بخت نے محل چھوڑ کر ایک گوشہ میں کنج خانہ آباد کیا جو آج بھی موجود ہے اور عرف عام میں کنج خانہ کہا جاتا ہے۔ بزرگوں نے بتایا کہ مرحومہ نے بیوگی کی زندگی آسیہ گردانی اور قرآن سرائی میں گذاردی اور مرنے کے بعد یہ زلیخا قصبے سے باہر اپنے یوسف سے ہمیشہ کے لیے مل گئی۔ اُن کا مقبرہ اگرچہ آج منہدم ہوگیا ہے لیکن مقبرہ کی ہر خشت عشق کی عظمت اور اس کی پائندگی کی شاہد عادل بن کر زبانِ حال سے بار بار یہ شعر سناتی ہے۔ ؎

ہرگز نہ میرد آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

بظاہر بات یہیں پر ختم ہوگئی مگر نہ یہ دنیا کبھی ختم ہوگی اور نہ اُس کے قصّے۔ اس کہانی کا ایک دوسرا ٹکڑا بھی ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام ہو یا جاگیردارانہ، زمانے کا ظالم ہاتھ کسی کو نہیں بخشتا۔ پھر ان دونوں نظاموں کی تعمیر میں تو خرابی کی صورت بھی مضمر تھی۔ جب دولت آتی ہے تو اپنا مزاج بھی ساتھ لاتی ہے۔ اُس کے اپنے مخصوص تقاضے ہوتے ہیں۔ یہ خاندان جس کا قصّہ میں نے سنایا بڑے فسانے کو اپنی تاریخ کے دامن میں بہت کم جگہ دیتا ہے، البتہ مشرقی تہذیب، تمدن اور اُس کی صالح روایات کا اب تک حامل ہے۔ اس خاندان میں علماء، فضلاء، شعراء، ادیب، ایڈوکیٹس، صحافی اور وزیر مملکت پیدا ہوتے رہے ہیں اور ملک کی قومی زندگی میں اپنی حد تک یہ خاندان پورا تعاون دیتا آیا ہے۔

★ یہ داستان جس قصبے سے متعلق ہے وہ شہر لکھنؤ سے کل ۱۰ کلو میٹر

میل کی دوری پر واقع ہوا ہے۔ اس قصبے میں مغلیہ تہذیب اور معاشرت کے اثرات یہاں تک پہنچ کر رہے۔ یہاں بڑے بڑے مشاعرے منعقد ہوئے، مجلسیں ہوئیں، شادیاں رچیں۔ میر تقی میر، میر علی محمد صاحب عارف، دولہا صاحب عروج، محمد حسن صاحب فائق، شمس العلماء مولانا سید ناصر حسین صاحب قبلہ، مولانا سید سبط حسن صاحب، صفی لکھنوی، محشر لکھنوی وغیرہم نے اس بستی کو اپنے قدوم سے شرف بخشا۔ یہاں بٹیر لڑائے گئے، مرغ پالے گئے، پالیاں ہوئیں، کبوتر اڑائے گئے اور کنکوے بازی ہوئی۔ غرض یہ بستی مدتوں دن عید، رات شب برات مناتی رہی۔

یہاں تک کہ زمانے نے کروٹ بدلی اور وہ دور بھی آگیا جب اس خاندان کی ملکیت میں وہی ایک آبائی گاؤں رہ گیا جو ماہ پرور کے تشریف فرما ہونے سے پہلے تھا۔ عین اسی وقت اس گھر میں ایک فرزند کی ولادت ہوئی۔ باپ نے شگون لے کر اپنے بزرگ کے نام پر اس کا نام رکھا۔ اس امید کے ساتھ کہ تاریخ اپنے کو دہرائے گی۔ صاحبزادے جب جوان ہوئے تو بقول اُن کے ایک مرحوم بزرگ کے "جس طرف سے نکلتے ہو انگلیوں کے چٹخنے کی آوازیں آتی ہیں" کے مصداق ہوئے اور اگر یہ بات عملاً ظہور پذیر نہ ہوئی ہو تو اتنا تو یقینی ہے کہ ان صاحبزادے کی جوانی کو دیکھ کر کچھ دلوں سے آہیں ضرور نکلتی تھیں اور کچھ لوگ ع

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

پڑھنے لگتے تھے۔

باپ نے بزرگ کے نام پر اس فرزند کا نام رکھ کر امید کی تھی کہ اس خاندان سے جو شاندار ماضی وابستہ ہے وہ حال کی شکل پکڑے گا مگر مرحوم کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔

جہاں تک اُن کے حسن و جمال کی بات ہے اب یہ حال ہے کہ جب وہ آئینہ کے سامنے جاتے ہیں تو بے ساختہ زبان پر یہ شعر جاری ہو جاتا ہے۔ ؎

ناوکِ نازِ دہر کبھی ہوں گے
اُتری ہوئی اب تو کمان ہیں ہم

جشن آزادی

نصر قریشی

اُڑے چلو یونہی اے طائرانِ آزادی
بلا رہا ہے تمھیں آسمانِ آزادی
قدم قدم پہ سجاؤ دیارِ حسن و یقیں
سرابِ زیست میں اے رہروانِ آزادی
بکھیرو فتح کے نغمے، کھلاؤ جشن کے پھول
ڈگر ڈگر پہ اڑاؤ نشانِ آزادی
یہی چمن ہے بہاروں کا دل نشیں مرکز
ہر ایک سمت ہے خنداں دہانِ آزادی
مہک رہی ہیں فضائیں شمیمِ جسم لیے
نکل پڑے ہیں گھروں سے بتانِ آزادی
فضائے تاج و اجنتا لٹاتی ہے نغمے
سہانے گیت سنائے زبانِ آزادی

تمھارا عہد ہے تاریخ کا حسیں پہلو
تمھارے دم سے ہے قائم جہانِ آزادی
سبق اخوت و الفت، پیامِ امن و اماں
یہ ارضِ پاک ہے اک سائبانِ آزادی
وقارِ زیست، وقارِ وفا، وقارِ جہاں
تمھارے نام کی عظمت ہے جانِ آزادی
نہ جانے کتنے سوالات لے کے آئی ہے
تمھارے واسطے یہ امتحانِ آزادی

ہزار بارشِ افکار جسم و جاں پہ سہی
سجاؤ پھولوں سے اپنی دکانِ آزادی
نئے جزیرے، نئی منزلیں، نئے جادے
ہوا کی سمت رکھو بادبانِ آزادی
تمھارے عزم کی شمعیں فروزاں ہوں ہر سو
نظر نہ آئے دور ہو کے وادیانِ آزادی
نظر نواز نظارے سلام کرتے ہیں
زمانہ دیکھے ذرا آج شانِ آزادی

نظم آزادی

کلیم تسنیم

رات ڈھلی اور صبح ہوئی
کیسی، روشن روشن صبح
اُجلی اُجلی، صاف، معطر
منزل منزل حسنِ گلِ تر
دفتر، مکتب اور محنت گھر
جگمگ جگمگ کرتے منظر
آزادی کی ایسی کہانی
ایسی حقیقت، ایسا فسانہ
کس نے سنا اور کس نے دیکھا
اُتر، دکھن، پورب، پچھم
چار دِشا سے آواز آئی:
ہم نے سنا تھا، ہم نے دیکھا
دنیا دیکھ رہی ہے منظر
اپنا گھر ہے حسنِ گلِ تر
ہندستاں ہے رشکِ معبر

نامہ بر سے

حمید عظیم آبادی

مرا حال پریشاں جا کے نزدِ خوبرو کہیو
مگر اے نامہ بر کہیو تو سب کچھ ہو بہو کہیو
لیے پھرتا ہے شوقِ دید اب تو کو بکو کہیو
نگاہیں ڈھونڈھتی رہتی ہیں ان کو چار سو کہیو
گھٹا جاتا ہے دم اپنا جو ضبطِ غم سے فرقت میں
تو ممکن ہے دلِ مضطر کے اب ہاؤ ہو کہیو
بھلانے پر بھی یاد ان کی بھلائی جا نہیں سکتی
لبوں پر ذکر ان کا ہے انھیں کی گفتگو کہیو
میں اپنی بدنصیبی پر ادھر آنسو بہاتا ہوں
اُدھر ناکامیِ الفت پہ ہنستے ہیں عدو کہیو
رقیبِ بدسیہ خوش ہے تو طعنہ زن بھی ہے
نہ ہونے دیں گے وہ اور کچھ بھی بے آبرو کہیو
وفا کی [illegible] میں اب جان کی بازی لگی ہے
کہ ہوتا ہے محبت میں مجھے بھی سرخرو کہیو
خدارا اب کریں وہ [illegible] فرمائی
کہ دیکھوں اک نظر میں بھی جمالِ رنگ و بو کہیو
[illegible] غیر ہو کی بات اتنی [illegible] سن لو
کہ کہنا ہے تمھیں جو بھی وہ ان سے دوبدو کہیو

پدماوت تنقید کی روشنی میں

کاظم علی خاں

ملک محمد جائسی ہندی شاعری کی بھگتی تحریک کے پریم مارگی سلسلے کے اہم ترین شاعر ہیں۔ پدماوت ان کا منظوم شاہکار ہے جو شیر شاہ سوری کے عہد حکومت میں وجود میں آیا۔ ہندی شاعری کے پریم مارگی سلسلے میں پدماوت سے قبل کم از کم مرگاوتی، مدھو مالتی، مگدھاوتی اور پریماوتی نام کی چار مشہور نظموں کا وجود خود پدماوت سے ثابت ہے۔ پدماوت کو بخوبی سمجھنے میں ان تمام نظموں کے اہم خصوصیات کا اجمالی جائزہ مفید معلوم ہوتا ہے۔ ان نظموں کے بنیادی خصوصیات کی مدد سے ہم اس ادبی مذاق و مزاج کا اندازہ لگا سکتے ہیں جس میں پدماوت لکھی گئی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ ہمیں ان عصری رجحانات و فکری میلانات کی نوعیت کا بھی پتہ لگ سکے گا جن سے پدماوت معنوی طور پر متاثر ہوئی ہے۔

پدماوت کی طرح یہ تمام نظمیں بھی دراصل منظوم کہانیاں ہیں۔ پریم مارگی ہندی شاعری کی یہ منظوم داستانیں مسلمان صوفیا پر ہندو تہذیب کے اثرات کا نتیجہ ہیں۔ مسلمان صوفیا جب ہندو تہذیب و فلسفہ سے متاثر ہوئے تو انھوں نے صوفیانہ تصورات کو تمثیل پیرائے میں ان کہانیوں کے کردار و واقعات کے پردے میں پیش کیا۔ ان منظوم تمثیلوں کے واقعات، کردار بلکہ ساری فضا ہندو تہذیب اور ہندو سماج کی عکاسی کرتی ہے۔

یہ منظوم کہانیاں عام طور پر بیان، وگڑی یعنی کسی شہزادے یا راجکمار اور صاحب جمال راج کماری کے عشق و ہجر و وصل کی داستانیں لیکن دراصل محبوب یا مقصود تک رسائی حاصل کرنے میں عاشق کے مشکلات و مصائب کی تمثیل میں طریقت و معرفت کے منازل کی دشواریوں کو پیش کیا ہے۔

پریم مارگی سلسلے کی یہ منظوم داستانیں اپنی پیشرو بھگتی یا شری سلسلے کی نظموں کے مقابلے میں فنی اور لسانی اعتبار سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں ان کی زبان عام طور پر اودھی ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن رقمطراز ہیں:

"اس میں شک نہیں کہ ادبی حیثیت سے پریم مارگی صوفیانہ شاعری ایک ارتقا کا پتہ دیتی ہے۔ مسلمان شعرا نے ہندو تمدن کو اپنایا اور ہندو دھرم کی تلمیحات اور اصطلاحات لے کر محبوب ازل کو انسانی پیکر کی تمثیل میں پیش کیا۔ برج شاعری ... [کی] روایت [کے] بموجب کہیں عورت بن کر مرد (یعنی محبوب ازل) کے لئے گا کہیں برہن کے روپ میں جدائی کا راگ الاپا"۔[1]

یہ منظوم کہانیاں طبع زاد ہونے سے زیادہ قدیم روایتی قصوں پر مبنی ہیں۔ ان میں بعض تاریخی واقعات یا تاریخی شخصیتوں کے نام ضرور ملتے ہیں۔ لیکن یہ نظمیں دراصل تاریخ سے زیادہ تخیل پر مبنی ہیں تاریخ کے نقطۂ نظر سے ان کہانیوں کی اہمیت زیادہ نہیں البتہ ادبی اور تہذیبی اعتبار سے ان پریم مارگی منظوم قصوں کی کافی اہمیت ہے۔

پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

"... مرگاوتی ... اور پدماوت کا تفصیلی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ محض زبان ہی کے لحاظ سے نہیں خیالات اور جذبات کے لحاظ سے بھی ان میں ہندوستانی کلچر کے بہترین عناصر موجود ہیں"۔[2]

ہندی ادب میں پریم مارگی سلسلے کی یہ تمام کہانیاں اہم ہیں لیکن ملک محمد جائسی کی پدماوت شہرت و مقبولیت میں ان سب پر فوقیت رکھتی ہے۔ پدماوت ملک محمد جائسی کا فنی اور ادبی شاہکار ہے۔

---

[1] ہندی ادب کی تاریخ: ڈاکٹر محمد حسن۔ طبع اوّل ۱۹۵۵ء ص ۸۲۔ [2] ذوق ادب اور شعور: سید احتشام حسین۔ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ۔ ۱۹۶۳ء۔ ص ۹۹

پدماوت کے تجزیاتی مطالعے سے پہلے ضروری ہے کہ ملک محمد جائسی کے حالات زندگی کے بارے میں اشارے کیے جائیں۔ کسی ادبی فن پارے کو سمجھنے کے لیے مصنف کی حیات و شخصیت کا جائزہ لینا ضروری ہوتا ہے۔ پدماوت کا کامیاب مطالعہ اس کے مصنف کی حیات و شخصیت کی روشنی میں ہی کرنا چاہیے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ان تہذیبی، فکری، سماجی اور تاریخی عوامل و محرکات کا بھی جائزہ لینا چاہیے جن کے نتیجے میں پدماوت وجود میں آئی۔ سائنٹفک تنقید ادب کے "کیا" اور "کیسا" کے ساتھ ساتھ ادب کے "کیوں" کے جوابات بھی فراہم کرتی ہے۔

سید ملک محمد جائسی شیر شاہ سوری کے ہمعصر تھے۔ وہ موجودہ اتر پردیش کے ضلع رائے بریلی کے مشہور مقام جائس کے باشندے تھے۔ اسی نسبت سے انھیں جائسی کہا جاتا ہے۔ ہجری سن کے مطابق ان کا دورِ حیات سنہ ۱۵۵۱ سے سنہ ۱۵۹۹ کی درمیانی مدت پر محیط ہے۔[1] قاعدے کے مطابق بجری سن میں سے ۵۶ یا ۵۷ برس گھٹا دیے جائیں تو عیسوی سن کے لحاظ سے ان کی مدتِ حیات تقریباً ۱۴۹۴ء تا ۱۵۴۲ء متعین ہو سکتی ہے۔ ہجری سن کے مطابق ملک محمد جائسی کا سالِ وفات قاضی نصیر الدین جائسی نے ۹۴۹ھ بتایا ہے۔

(ہندی ادب کی تاریخ ص: ۸۵)

ملک محمد جائسی نے پدماوت میں رانی ناگ متی اور پدمنی کے جسمانی اور ظاہری حسن کو ایک بے وقعت شے قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ اس سے دل نہ لگانا چاہیے۔ رانی ناگ متی اپنے حسن ظاہری پر غرور کرتی ہے ملک محمد اسے "دنیا دھندا" قرار دیتے ہیں۔ علاء الدین خلجی کا پدمنی کے ظاہری حسن پر فریفتہ ہونا ان کے نزدیک مایا موہ کے مترادف ہے جو قابلِ تعریف نہیں۔ ظاہری حسن اور جسمانی خوبصورتی کی جانب ملک محمد جائسی کا یہ مخالفانہ رویہ عجب نہیں کہ ان کی بدصورتی کے پیچیدہ نفسیاتی ردِ عمل کا نتیجہ ہو۔ اس لیے کہ بچپن ہی میں چیچک نے ان کے چہرے کو داغدار بنا دیا تھا اور انھیں ایک آنکھ سے محروم کر دیا تھا۔

ملک محمد جائسی مشہور صوفی شیخ محی الدین کے شاگرد بتائے جاتے ہیں۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن ان کی پرورش زیادہ تر فقرا کے درمیان میں ہوئی اور وہ فقرا کے بڑے معزز سلسلے سے متعلق رہے ہیں انھوں نے صوفیوں کی طرح زندگی بسر کی ہے۔ وہ امیٹھی سے دو میل دور ایک جنگل میں رہا کرتے تھے۔ شہر کی بجائے جنگل میں قیام کرنا ان کے صوفیانہ میلانِ طبع کا ہی نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ ان کی وفات بھی اسی جنگل میں ہوئی۔ امیٹھی کے راجہ ان کے کشف و کرامات کے قائل تھے۔ راجہ کا خیال تھا کہ ملک محمد ہی کی دعاؤں کے اثر سے وہ صاحبِ اولاد ہوا اسی لیے راجہ ان کی کافی قدر و منزلت کرتا تھا۔ جائسی کی حیات و شخصیت کے یہی اثرات ان کی ادبی تخلیقات میں تصوف کے اظہار و بیان کے اہم محرکات قرار دیے جا سکتے ہیں۔

ملک محمد جائسی سے تین کتابیں منسوب ہیں (۱) پدماوت (۲) اکھراوٹ اور (۳) آخری کلام۔ پدماوت تمثیلی پیرائے میں متصوفانہ تصورات پیش کرتی ہے۔ اکھراوٹ میں بھی تصوف کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ آخری کلام اسلامی تعلیمات سے متعلق ہے۔ ملک محمد جائسی کی کتابوں میں تصوف کا یہ غلبہ جن اسباب کا نتیجہ ہے ان کے پیچھے ملک محمد جائسی کے عہد کی فکری، تہذیبی اور سماجی تاریخ میں تلاش کیے جا سکتے ہیں۔

عرب کی سامی تہذیب کا زائیدہ اور عجم کی آریائی تہذیب کا پروردہ یہی تصوف جب ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد و قیام کے نتیجے میں ہندوستانی ویدانت فلسفہ سے دوچار ہوا تو اسلامی تصوف اور ہندو ویدانت فلسفے نے ایک دوسرے کو کافی متاثر کیا۔ ہندو ویدانت فلسفہ بھی آریائی تہذیب میں رنگا ہوا تھا۔ اسلامی تصوف اور ہندو ویدانت فلسفہ کے مشترک آریائی عناصر تصوف اور ویدانت کی قربت کا سبب بنے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان صوفیا ہندو تہذیب و فلسفہ کے اثرات قبول کرتے رہے اور ہندو فلسفیوں نے تصوف کے اثرات کو قبول کیا۔

---

[1] ہندی ادب کی تاریخ: ڈاکٹر محمد حسن۔ طبع اول ۱۹۵۵ء ص ۸۸

[2] " " " : ڈاکٹر محمد حسن۔ " ص ۸۵ [3] امیٹھی ایک پرانا چھوٹا قصبہ ہے جو لکھنؤ سے چند میل کے فاصلے پر واقع ہے (کاظم علی خاں)

ڈاکٹر تارا چند نے ہندو فلسفہ پر اسلامی اثرات کی نشاندہی اور ڈاکٹر اعجاز حسین نے تائید کی تھی۔[1][2]

اسلامی تصوف اور ہندوستانی ویدانت فلسفہ کا یہی باہمی اختلاط اور تبادلۂ فکری اور تہذیبی سرچشمہ ہے جس سے ہندی شاعری کے بھگتی کال میں کبیر، ملک محمد جائسی اور قطبن وغیرہ کی شعری تخلیقات موضوع اور مواد حاصل کرتی رہیں۔ ہندی شاعری کے پریم مارگی مسلمان صوفی شعرا کی نظموں میں ہندو تہذیب و فلسفہ کا غلبہ انھیں عوامل و محرکات کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ ہندی ادب میں کبیر، ملک محمد جائسی اور دوسرے پریم مارگی مسلمان صوفیا کی شاعری میں ہندو ویدانت اور اسلامی تصوف دونوں کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں۔ ان حقائق کے پیش نظر ظہیر الدین احمد علوی کے حسب ذیل نظریے کو تسلیم کرنے میں ہمیں تامل ہوتا ہے:

"صوفیانہ شاعری زیادہ تر فارس کے خیالات سے متاثر تھی۔ اس کا پودا ہندوستان کی سرزمین [اور] آب و ہوا میں بار آور نہ ہو سکا۔ اسی وجہ سے ہندی ادب میں صوفیانہ شاعری نمایاں نہ ہو سکی۔"[3]

پدماوت کے داخلی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ یہ شیر شاہ سوری کے عہد حکومت میں لکھی گئی تھی۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے پدماوت کا سن تصنیف سنہ ۹۲۷ھ تحریر کیا ہے[4] جو کسی طرح صحیح نہیں۔ کافی بحث و تحقیق کے بعد پنڈت رام چندر شکل نے پدماوت کا سن تصنیف سنہ ۹۴۷ھ بتایا ہے جو درست معلوم ہوتا ہے۔[5] ڈاکٹر گیان چند جین نے بھی یہی سن صحیح تسلیم کیا ہے۔[6]

پدماوت میں راجہ رتن سین اور سنگلدیپ کی راجکماری پدمنی کے عشق کی داستان بیان کی گئی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سنگلدیپ کی حسین راجکماری پدمنی کے پاس ایک طوطا تھا جو [illegible] اتفاق سے وہ ایک روز کسی چڑیمار کے ہاتھ لگ گیا جس نے اسے ایک برہمن کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ اس برہمن نے یہ طوطا چتوڑ گڑھ کے راجہ رتن سین کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ ایک دن رتن سین کی رانی ناگ متی نے خوب بناؤ سنگار کیا اور طوطے سے اپنے حسن کی داد چاہی۔ طوطے نے اپنی اصل مالک راجکماری پدمنی کے حسن کی تعریف کی۔ رتن سین پدمنی کے حسن سے آگاہ ہوا تو اس پر نادیدہ عاشق ہو گیا۔ طوطے کی رہنمائی میں رتن سین بھیس بدل کر سنگلدیپ پہنچا اور پدمنی کو بیاہ لایا۔

ادھر دہلی کے سلطان علاؤ الدین خلجی کو راگھو چیتن پنڈت نے پدمنی کے حسن کا حال سنا کر پدمنی کا گرویدہ کر دیا۔ سلطان ایک مرتبہ آئینہ میں پدمنی کی جھلک بھی دیکھ چکا تھا۔ سلطان نے حیلے سے راجہ رتن سین کو قید کر لیا اور پدمنی کو کٹنیوں کے ذریعے پھسلانا چاہا مگر پدمنی رضامند نہ ہوئی۔ رتن سین کے زمانۂ اسیری کے دوران دیوپال نے بھی پدمنی کو اپنے قبضے میں کرنا چاہا۔ پدمنی نے ہوشیاری سے رتن سین کو قید سے آزاد کرا دیا۔ رتن سین نے چتوڑ گڑھ آ کر دیوپال سے جنگ کی۔ اس جنگ میں دیوپال مارا گیا لیکن رتن سین بھی زخموں سے جانبر نہ ہو سکا۔ رتن سین کی چتا میں جب آگ دی گئی تو پدمنی بھی اپنے شوہر اور محبوب کے ساتھ ستی ہو گئی۔ سلطان علاؤ الدین جب چتوڑ گڑھ پہنچا تو وہاں اسے حسین و جمیل پدمنی نہ مل سکی البتہ پدمنی کی بجائے راکھ کا ڈھیر ملا۔

پدماوت کی یہ کہانی تمام تر تمثیلی ہے۔ اس کے کردار و واقعات کے پردے میں تصوف کے مسائل (مثلاً درد ہجر۔ لذت وصل۔ منزل عرفان کی راہ کی دشواریاں وغیرہ) بیان کیے گئے ہیں۔ اس کی تمثیلی

---

1 اے شارٹ ہسٹری آف دی انڈین پیپل: ڈاکٹر تارا چند۔ میک ملن اینڈ کمپنی لمیٹڈ (سنہ ۱۹۶۳ء) ص ص ۱۶۱-۱۶۲۔

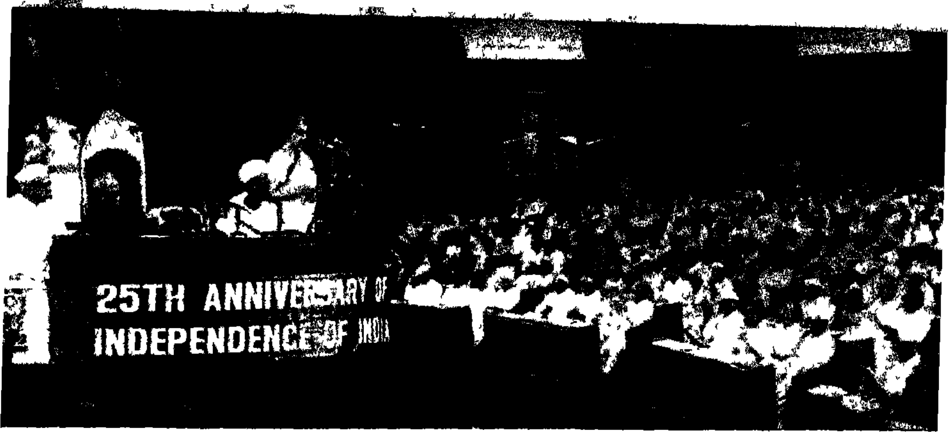
2 اردو شاعری کا سماجی پس منظر: ڈاکٹر سید اعجاز حسین۔ کاروان پبلشرز الہ آباد (سنہ ۱۹۶۲ء) ص ص ۱۲۸/۱۲۹

3 تاریخ ادب ہندی: ظہیر الدین احمد علوی۔ شائع کردہ رام نرائن لال الہ آباد (سنہ ۱۹۶۲ء) ص ۵۶

4 ہندوستانی لسانیات: ڈاکٹر محی الدین قادری زور۔ نسیم بک ڈپو لکھنؤ (مارچ سنہ ۱۹۶۱ء) ص ۴۳

5 بحوالہ ہندی ادب کی تاریخ: ڈاکٹر محمد حسن (سنہ ۱۹۵۵ء)

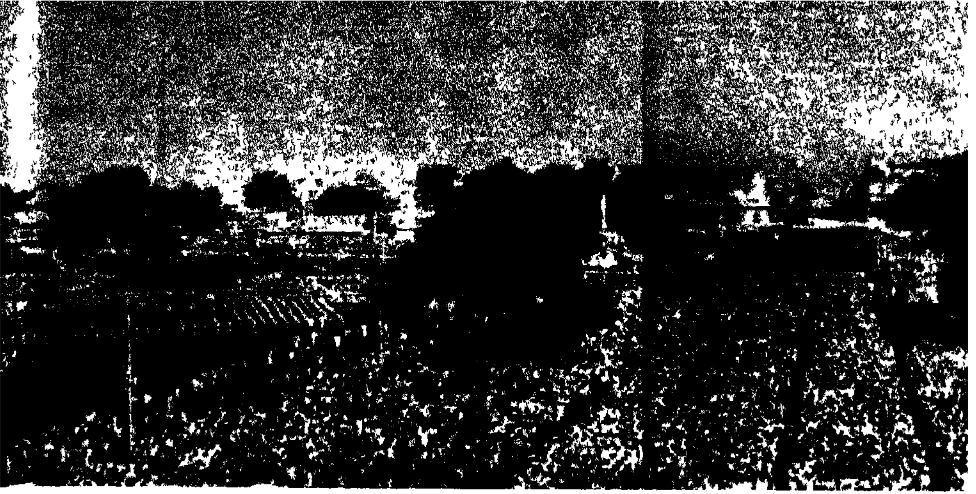
6 [illegible]، ڈاکٹر گیان چند جین۔ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ۔ (سنہ ۱۹۶۳ء) ص ۲۲۳



آزادی کے ۲۵ سال مکمل ہونے پر ۱۴ اگست ۱۹۷۲ء کو نئی دہلی میں پارلیمنٹ کے مرکزی ہال میں جو تقریب منعقد ہوئی اسے وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی خطاب کر رہی ہیں۔ ڈائس پر صدر شری وی۔ وی گری، نائب صدر شری جی۔ ایس پاٹھک اور لوک سبھا کے اسپیکر شری جی۔ ایس ڈھلوں بیٹھے ہیں



جنگ آزادی میں حصہ لینے والوں کے اعزاز میں ایک تقریب دہلی کے لال قلعہ میں ۱۵ اگست ۱۹۷۲ء کو منعقد ہوئی جس کا افتتاح صدر جمہوریہ شری وی۔ وی۔ گری نے کیا اور ایک ہزار سے زیادہ مجاہدین آزادی کو جو اس موقع پر مدعو کیے گئے تھے وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے تامر پتر (اعزازی سند) دیے۔ (سائیں) تصویر میں وزیر اعظم ہریانہ کے شری گلاب سنگھ کو تامر پتر پیش کرتے ہوئے



وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی آزادی کی ۲۵ ویں سال گرہ کے موقع پر ۱۵ اگست ۱۹۷۲ء کو لال قلعہ دہلی :

گورنر اترپردیش شری شستی کانت ورما ۱۴ اگست ۱۹۷۲ء کی
حصہ





گورنر اتر پردیش تسری تشی کا ست
ورما آزادی کی ۲۵ ویں سال گرہ
کے موقع پر ۱۵ اگست ۱۹۷۲ء کو
راج بھون لکھنؤ میں پرچم کشائی کرتے
ہوئے



ب کر رہی ہیں

وھان بھون لکھنؤ کے ودھان سبھا ہال میں مجالس قانون ساز کے ارکین کے
کو حطاب کرتے ہوئے





دہلی میں آزادی کی ۲۵ ویں سال گرہ کی تقریبات میں شرکت کرنے والے اتر پردیش کے مجاہدین آزادی وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کے ساتھ

وزیراعلیٰ شری کملاپتی ترپاٹھی مجاہدین آزادی کو اس خصوصی تقریب میں تامر پتر دے رہے ہیں جو ودھان بھون لکھنؤ میں ۱۵ اگست ۷۲ء کو منعقد ہوئی تھی۔ تامر پتر حاصل کرنے والوں میں بلیا کے ۱۱۶ سالہ مجاہد آزادی شری رامیشور مصر (دائیں) اور نینی تال کے شری پورنانند تیواری شامل تھے



ایک صوفیانہ علامات کے اثبات میں ملک محمد جائسی کا بیان ہے

تن چتوڑ من راجہ کینہا | ہیا سنگھل بدھی پدمنی چینہا
گرو سوا جیہہ پنتھ دکھاوا | بن گرو جگت کو نرگن پاوا
ناگ متی یہ دنیا دھندا | باچا سوئی نہ ایہہ چت بندھا
راگھو دوت سوئی سیطانو | مایا علاء الدین سلطانو

جائسی کے مطابق پدمنی عرفان الٰہی کی علامت ہے، ناگ متی دنیا دھندا ہے، راگھو چیتن شیطان کا بہروپ ہے اور سلطان علاء الدین مایا کا پرتو۔

ڈاکٹر محمد حسن نے پدماوت کے مرکزی خیال کے بارے میں لکھا ہے:

"پدماوت گویا اس خیال کو ظاہر کرنے کے لیے نظم کی گئی ہے کہ جب تک جسم اور مادی دنیا کی ہوس اور موہ حائل ہے اس وقت تک نور الٰہی یعنی پدمنی تک رسائی ممکن نہیں۔ جب انسان کا عشق صادق ہوتا ہے اور وہ دنیا دھندے اور مادی زندگانی کے پھندے سے نکل جاتا ہے تبھی وہ نور الٰہی تک پہنچ سکتا ہے۔"[1]

جائسی نے ان متصوفانہ تصورات کو پدماوت میں تمثیلی طور پر بڑی فنکارانہ چابک دستی سے پیش کیا ہے۔ چتوڑ انسانی جسم کی علامت قرار دی گئی ہے۔ رتن سین اس کی روح ہے۔ پدمنی عرفان الٰہی ہے۔ طوطا گرو کا اور ناگ متی مایا موہ ہے۔ رتن سین جب مایا موہ (ناگ متی) سے منھ موڑتا ہے تو عرفان حقیقی (یعنی پدمنی کو) حاصل کرتا ہے۔ اس کے برخلاف سلطان علاء الدین مایا موہ میں الجھا رہتا ہے یعنی وہ پدمنی کے ظاہری حسن اور جسمانی خوبصورتی کی لالچ میں اسے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسی لیے وہ کامیاب نہیں ہوتا۔

ملک محمد جائسی کی پدماوت جس کی زبان ہندی اور رسم خط فارسی (اردو) ہے ہندو تہذیب کے عناصر کو بڑے دل کش انداز سے پیش کرتی ہے اور ہندوستان کی مشترک ہندو مسلم تہذیب کی شاندار یادگار ہے۔ ملک محمد جائسی جیسے مسلمان صوفی کا ہندی زبان میں پدماوت اور اس میں ہندو تہذیب و فکر کو موثر طور پر پیش کرنا اصل ... اور ہندو مسلم ثقافت کے بیچ باہمی اختلاط اور ربط زیادہ واضح معلوم ہوتا ہے جس کی تفصیل سطور گزشتہ میں بیان کی گئی۔

ہندو مسلم میل ملاپ کی یہ فضا صرف ہندی شاعری تک محدود نہیں بلکہ مسلمانوں پر ہندو تہذیب و روایات کے اثرات ہمیں دکنی زبان (جسے کسی حد تک اردو کی ابتدائی شکل کہا جا سکتا ہے) میں لکھی جانے والی مشہور کتاب نورس میں بھی نظر آتے ہیں۔ نورس بیجاپور کے مسلم حکمراں ابراہیم عادل شاہ ثانی کی فن موسیقی سے متعلق کتاب ہے۔ اس کے گیتوں میں ہندو دیوتاؤں مثلاً اندر، سرسوتی، گنیش، لکشمی، تراچن [شیو] وغیرہ کا ذکر بڑے ادب و احترام کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو گیت نمبر ۲۵، ۲۷، ۲۸، ۳۹، ۴۴، ۴۶، ۴۹، ۵۰ وغیرہ۔ اس کے ساتھ ساتھ کتاب میں مسلمان بزرگوں کا بھی ذکر عقیدت کے ساتھ کیا گیا ہے۔[2] یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ کتاب نورس بقول ڈاکٹر نذیر احمد ۱۰۰۷ ہجری اور ۱۰۲۰ ہجری کے درمیان لکھی گئی ہے جبکہ پدماوت کا سن تصنیف ۹۴۷ ہجری ہے گویا نورس اور پدماوت کے سن تصنیف میں نصف صدی سے کچھ زیادہ عرصہ کا فرق ہے۔ یہ دونوں کتابیں اپنے عہد کے ہندو مسلم میل ملاپ کی شاندار روایات کی امین نظر آتی ہیں۔ ان دونوں کتابوں کا مطالعہ دور حاضر میں قومی یکجہتی کی فضا کو قائم و برقرار رکھنے میں مفید ثابت ہو سکتا ہے۔

ظہیر الدین احمد تاریخی اعتبار سے پدماوت کے متعدد اجزا کو درست نہیں مانتے۔[3] بہرحال ادبی لحاظ سے پدماوت اپنی پیشرو ہندی نظموں سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ فکری اعتبار سے اس کی اہمیت مسلم ہے۔ فنی نقطۂ نظر سے بھی پدماوت ملک محمد جائسی کے ادبی شعور کی پختگی کی روشن دلیل ہے۔ اس میں نہ صرف صنائع بدائع کا فنکارانہ استعمال کیا گیا ہے بلکہ انداز بیان کے بھی حسین نمونے ملتے ہیں۔ پدمنی کے وطن سنگلدیپ (لنکا)

---

1. عہد وسطی میں اردو شاعری کا فکری اور تہذیبی پس منظر، ڈاکٹر محمد حسن (۱۹۶۶ء) ص ۱۳۲
2. کتاب نورس مصنف ابراہیم عادل شاہ ثانی۔ مرتبہ: ڈاکٹر نذیر احمد۔ سرفراز قومی پریس لکھنؤ (اپریل ۱۹۵۵ء) ص ۲۰
3. تاریخ ادب ہندی، ظہیر الدین احمد۔ رام نرائن لال الہ آباد (۱۹۶۲ء) ص ۱۲۷

غزل

سیف بجنوری

ڈال دی ہے غم الفت نے پناہوں کی طرح
مطمئن تیرے گدا ہو گئے شاہوں کی طرح

ہر نفس محفلِ امید سجائے رکھیے
کس لیے زیست ہو ویران سی راہوں کی طرح

یہ مری خوبیٔ تقدیر نہیں تو کیا ہے
مجھ پہ ناز ہے بیگانہ نگاہوں کی طرح

شوق دیدار کی حد ہے کہ سر راہ گزر
منتظر بیٹھا ہوں میں چشم براہوں کی طرح

عشق خوددار کی یہ شان ہے اللہ اللہ
حسن مغرور ملا خود بھی خواہوں کی طرح

گردشِ وقت بھی یک رنگ نہیں ہے اے دوست
رخ بدل لیتی ہے یہ تیری نگاہوں کی طرح

ایک بے مہر پہ فریاد اثر کیا کرتی
بے اثر ہو گئی فریاد بھی آہوں کی طرح

دیکھ کر سیفؔ بدلتا ہوا رنگ ماحول
منہ سے اشعار نکلتے ہیں کراہوں کی طرح

غزل

جمیل سحر

خرد کا پاس جنوں نے کیا کیا نہ کیا
کہ کام جذبِ وفا سے لیا لیا نہ لیا

تمہارے ظلم و ستم ہی کی پردہ داری میں
مریض عشق کا کیا ہے جیا جیا نہ جیا

لکھا تو ہے دلِ مضطر کا حال ڈر ڈر کے
جواب نامہ کا اس نے دیا دیا نہ دیا

جنونِ عشق بڑھا ہے زلفِ مشکیں سے
تری بلا سے گریباں سیا سیا نہ سیا

دل شکستہ لیے جا رہا ہوں محفل میں
قبول اس نے یہ تحفہ کیا کیا نہ کیا

ہمارے بعد ترے میکدے میں اے ساقی
کسی نے جام اجل کا پیا پیا نہ پیا

سحرؔ سلام محبت میں احتیاط ہے شرط
سلام اس نے تمہارا لیا لیا نہ لیا

(افسانہ)

ملاقات

گربچن چندن

وہ ساون کی ایک ایسی شام تھی جب طبیعت آپ ہی آپ مسکرانے لگتی ہے۔

صبح آنکھ کھلتے ہی آسمان پر ٹہلتے ہوئے بادل نظر آئے جیسے برفانی بچے روئی کی وردیاں پہنے گشت لگا رہے ہوں۔ ان کے ڈر سے سورج کو سامنے آنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ دوپہر سے قبل موسلادھار بارش ہوئی جیسے شریر بچوں نے ہزارہا آبشاروں کو حملہ کرنے کا حکم دے دیا اور دوپہر کے بعد یہ آبشار فضا کے ہم دوش رہے اور دو ڈھائی گھنٹے رم جھم کا سماں بندھا رہا۔ اب مطلع صاف ہو گیا تھا۔ برفانی بچے کہیں اور چلے گئے تھے اور سورج کی تپش اپنے ساتھ ہی لے گئے تھے۔

اگر میں بچہ ہوتا تو باہر لان کے برساتی تالاب میں نہانے نکل جاتا۔ لڑکا ہوتا تو درختوں سے جامنیں توڑتا۔ کالج کا طالب علم ہوتا تو اپنے دوست مدن کے یہاں جا کر اس کی کزن سرلا سے کالج اور ملک کی سیاست پر باتیں کرتا اور اگر میں نوجوان شوہر ہوتا تو اپنی بیوی کو ساتھ لے کر پارک میں جاتا۔ لیکن میں تو ایک تھکا ہوا بوڑھا تھا جس کی بے بسی کو شام کے سہانے پن نے کچھ اور بھی بڑھا دیا تھا۔ مجھے تو ماحول اور مزاج میں سمجھوتہ کرنا تھا چنانچہ میں نے باہر برآمدے میں کرسی لگا لی۔ بیوی کو چائے بنانے کا حکم دیا۔ رباعیات کی اپنی محبوب جلد نکالی اور عمر خیام سے راز و نیاز کی باتیں کرنے لگا۔ ایک رباعی پر تو توجہ جم کے رہ گئی:

تم فکر و امیر کیوں پریشان ہیں ۔۔۔ پہلا اٹل قسمتوں کے پیمانے

چار دن ہیں گزارنے ہنس کر ۔۔۔ عاقبت کی خبر خدا جانے

ہیں اٹل قسمتوں کے پیمانے۔ رموز کے بھید پینے والے خیام نے کتنی پتے کی بات کہی ہے۔ سرلا اور میں نے زندگی بھر کا تعلق قائم کرنے کی تمنا کی لیکن ایسا نہ ہو سکا حالانکہ اس کی دادی مجھے بے حد پسند کرتی تھی۔ ہم دونوں کو اکٹھے باتیں کرتے، چائے پیتے اور ہنسی مذاق کرتے دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھی۔ مدن سے دن رات میری تعریف کیا کرتی تھی۔ اتفاق دیکھیے کہ شروع شروع میں جب وہ گاؤں سے سرلا کو لے کر آئی تو میرا مدن کے ہاں جانا بھی پسند نہ کرتی تھی۔ اسے تو اپنی نواسی کی پاسبانی کرنا تھی لیکن جب میں نے سرلا کو اپنے کالج میں داخلہ دلوا دیا اور کتابیں وغیرہ حاصل کرنے میں اس کی بھرپور مدد کی تو وہ میری مداح ہو گئی۔ صبح و شام مجھے دعائیں دیتی اور بات بات میں سرلا کو مجھ سے مشورہ کرنے کے لیے کہتی۔ یہ بزرگ لوگ کتنے اچھے ہوتے ہیں۔ ان جانوں کے بھی خواہ اور جان پہچان والوں پر مہربان ہو جاتے ہیں۔

لیکن مدن کی والدہ کو سرلا سے میرا بڑھتا ہوا میل جول ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ وہ سرلا کا رشتہ اپنی برادری کے ایک لڑکے سے کرنا چاہتی تھی۔ چنانچہ وہ ہماری راہ میں کوئی نہ کوئی روڑہ اٹکا دیتی۔ جب تک دادی وہاں رہی اس کی کوئی دال نہ گلی لیکن جب دادی واپس گاؤں چلی گئی تو مدن کی والدہ خود ہی سرلا کی نگرانی کرنے لگیں۔ وہ مدن کے کان بھی میرے خلاف بھرتیں لیکن سرلا مجھ سے اس قدر مانوس ہو چکی تھی کہ ہم ملاقات کے لیے کوئی

نکوئی تدبیر کر ہی لیتے تھے۔ ہمارا اعتقاد تھا کہ ہم ایک دوسرے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے اور خواہ کیسی بھی مخالفت ہو ہم ایک ساتھ زندگی بسر کرنے کا پیمان پورا کریں گے۔ دادی گاؤں سے سرلا کو جو بھی خط لکھواتی اس میں میرا ضرور حال پوچھتی۔ اور ہم سمجھتے تھے کہ دادی کی دعائیں ہماری ہر مشکل کو دور کر دیں گی۔ وہ گاہے بگاہے آ بھی جاتی اور ہر بار مجھے جتا دیتی "تمھیں دیکھے بہت دن ہو گئے تھے اس لیے چلی آئی۔"

بی۔ اے۔ کرنے کے بعد میں نے ایم۔ اے کا امتحان دیا لیکن فیل ہو گیا۔ سرلا بی۔ اے میں فرسٹ ڈویژن لے کر کامیاب ہوئی۔ دادی گاؤں سے شہر آئی اور ایک بڑا پر لطف جشن منایا گیا۔ کئی دوست بار بار مجھے مبارک باد دے رہے تھے۔ مجھے اپنی ناکامی کا دکھ بھول گیا تھا اور میں ان مبارک بادوں سے مسرور ہو رہا تھا۔ مجھے ایک اور خوشی ہو رہی تھی کہ سرلا میرے ہی کالج میں ایم۔ اے میں داخل ہونے کا ارادہ رکھتی تھی۔ لیکن ــــ بیچ میں اٹل قسمتوں کے پیلنے ــــ سرلا کا ایک غیر ملکی وظیفے کے لیے انتخاب ہو گیا اور مدن کی والدہ کے مجبور کرنے پر وہ امریکہ چلی گئی۔ اس کا نصاب دو سال کا تھا لیکن اس میں نہایت اچھی کامیابی پانے کے سبب اسے وہاں پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کا وظیفہ مل گیا اور وہ تین سال کے لیے اور رک گئی۔ اس دوران میں والد پر میرے رشتے کے لیے تقاضے ہونے لگے جو ہم کسی نہ کسی طرح جھیلتے رہے لیکن والد کو ایک ہارٹ اٹیک ہو گیا جس کے بعد وہ ہر معاملے میں عجلت پسند ہو گئے۔ سب احباب و اقارب کے سمجھانے پر میری ایک اور گھر میں شادی ہو گئی۔

شادی کے ایک سال بعد میرے والد چل بسے۔ عین اسی دن سرلا امریکہ سے واپس لوٹی۔ آتے ہی اسے سب باتیں معلوم ہو گئیں۔ وہ فوراً میرے ہاں آئی تعزیت ادا کی۔ جنازے میں شریک ہوئی۔ کئی ہفتوں تک میرے سوگ میں شریک رہی۔ پھر ایک دن میرے ہاں آئی اور بولی "میں نے عہد کیا ہے کہ ساری عمر شادی نہیں کروں گی۔ کنواری رہ کر ہی پروفیسری کے اپنے نئے منصب کو نبھاؤں گی۔

اس کے لیے میں کل ہی بمبئی جا رہی ہوں۔ امید ہے تم مجھے رخصت کرنے آؤ گے۔"

میں انھیں یادوں میں غرق تھا کہ میرے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو مدن وہاں کھڑا تھا۔

"اماں کس طرح گم سم بیٹھے ہو۔ کسی آنے گئے کی خبر ہی نہیں۔" اس نے ڈانٹ سی پلائی اور میں بدستور چپ بیٹھا رہا۔ "ابھی جائی نے بتایا کہ اچھے بھلے چائے پی رہے تھے کہ یکایک اونگھنے لگے اور وہ یہاں سے اٹھ کر چلی گئی۔ اٹھو ہوش میں آؤ۔ دیکھو موسم کس قدر سہانا ہے۔ چلو ذرا گھومنے چلیں۔" مدن نے مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

"یار یہیں بیٹھو۔" میں نے عاجزی سے کہا "تمھاری بھابی کو بھی بلاتے ہیں اور چائے کا ایک اور دور چلاتے ہیں۔"

"مجھے منظور نہیں۔ آج مجھے ضرور جانا ہے۔" مدن نے کہا۔

"کہاں" میں نے پوچھا۔

"چھوٹے چوک میں ایک یوگی راج آئے ہیں جن سے مجھے ضرور ملنا ہے۔"

"کون یوگی راج" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہاں چل کر دیکھو۔ سنا ہے بڑے غیب داں ہیں ہر مشکل کا حل بتا سکتے ہیں۔" مدن نے اعتماد سے کہا۔

"تم پر کیا مشکل آ پڑی ہے" میں نے پوچھا۔

"ارے ایک مقدمہ آیا ہے جس کے لیے بڑی بھاری رقم پیش کی گئی ہے۔ لیکن مقدمے میں زیادہ جان نہیں۔ پوچھنا ہے کہ لوں یا نہ لوں۔ بھئی اپنی شہرت کا بھی تو خیال رکھنا ہوتا ہے۔"

"یار تم وکیل ہو کر ایسے وہمی ہو مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

"وہمی نہیں ہوں لیکن بلکہ معاملے کے سب پہلو دیکھ کر آگے چلنے میں یقین رکھتا ہوں۔ اپنے مستقبل کو جاننے کی کوشش کرنا دور اندیشی ہی تو ہے۔"

"یہ علم کسی کام نہیں آتا۔"

مجھ تو ترے تجربوں سے اگر ہو نصیب کی ... بھی تو بے
نصیب کی باتیں بیشتر درست ثابت ہوئی ہیں۔ یار چلو آج تمہارے بارے میں بھی پوچھیں گے۔"

"کیا پوچھو گے؟"

"یہی کہ تمہاری قسمت میں کیا لکھا ہے۔ کوئی نیا باب شروع ہوگا یا نہیں۔"

"پھر لکھے کو تو کوئی ٹال نہیں سکتا۔"

"یار چلو تو۔" اس نے مجھے ساتھ لے لیا۔

چھوٹے چوک میں ایک زینہ چڑھ کر ہم اوپر چلے گئے۔ یوگی راج گاؤ تکیہ لگائے بیٹھے تھے۔ ماتھے پر تلک کی تین دھاریاں تھیں۔ بدن اور سر سے ننگے تھے لیکن کندھوں پر دھوتی کا کنارہ پڑا ہوا تھا۔ آگے ایک چوکی رکھی تھی جس پر ایک پیلے رومال میں بہت سارے اوراق کی ایک کھلی پوتھی رکھی تھی۔ ساتھ ہی ایک جنتری تھی۔

"مدن نے آگے بڑھ کر اپنا معاملہ پیش کیا اور دیر تک اُس سے باتیں کرتا رہا۔ یوگی راج بھی اس قدر بھروسے سے باتیں کر رہے تھے جیسے سب کچھ جانتے ہوں پھر مدن نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ میرے دوست ہیں۔"

یوگی راج بڑی دل چسپی اور شفقت سے میری طرف دیکھتے رہے۔

"ان کے بارے میں کچھ بتائیے۔" مدن نے درخواست کی۔

یوگی راج مسکرائے: "کیا پوچھنا چاہتے ہو؟" انھوں نے مجھ سے پوچھا۔

میں چپ رہا۔

"آپ ہی بتائیے" مدن نے کہا۔

یوگی راج نے میرا نام اور تاریخ پیدائش پوچھی۔ اپنی پوتھی کی ورق گردانی کی۔ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ ماتھے پر ہاتھ پھیرا اور کہا "بقدر چاہیے۔"

ہم دونوں ان کی طرف متوجہ تھے۔

یوگی راج نے گھمبیر انداز میں نتھ بھری اپنی ٹھوڑی ہلاتے ہوئے کہا: "آپ راہو کی گرفت سے نکل رہے ہیں۔ بر ہسپت شروع ہونے والا ہے۔ سرکاری کاموں میں کامیابی ہوگی۔ نئی خوش خبری ملے گی۔ طبیعت رنگین ہوگی۔ دیر سے بچھڑے سجن سے ملاپ ہوگا۔ ملاقات دوست کے گھر ہوگی جس کا نام م سے شروع ہوتا ہے۔ آپ کی ذات سے کسی کا بھلا ہوگا۔ کسی بات پر اخراجات بڑھیں گے۔ لیکن راہو کا اثر پوری طرح ختم نہیں ہوا۔ جلدی رکاوٹ بھی آ رہی ہے۔ ملاپ ہو کر پھر جدائی ہونے کا ڈر ہے۔"

"دیر سے بچھڑے سجن سے ملاپ ہوگا" یہ اشارہ دل میں چٹکیاں لینے لگا۔ یہ سجن کون ہو سکتا ہے۔ مجھے جیوتش شاستر پر کوئی یقین نہیں تھا لیکن یہ سوال سر پر سوار ہو گیا۔ مدن کی باتیں پہلو بدل بدل کر ذہن میں اترنے لگیں۔ پھر ایک اور سوال پیدا ہوا۔ اس کے سوا یہ کون ہو سکتا ہے۔ بچا کو اس سے جدا ہوئے ستر ہ سال ہو گئے ہیں اور وہ اگر مجھے بھول نہیں گئی ہوگی تو ٹھنڈے دماغ سے سوچنے کے بعد بدل ضرور گئی ہوگی۔ اپنی زندگی کے لیے کوئی نئی راہ چن چکی ہوگی۔ لیکن دھن کی تو پکی تھی۔ جوانی میں ایسی راہ سے انکار کیا تو اب کیسے اسے اختیار کرے گی۔" میں سوچتا رہا۔ "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس کے ذہن میں میری یاد پھر بیدار ہو گئی ہو۔ زندگی میں کوئی جذبات کو کب تک دبا سکتا ہے اور اگر اس کی یادیں اور جذبات عود کر آئے ہیں تو میں ہی کس طرح پتھر دل ہو سکتا ہوں۔ لیکن وہ ملے گی کہاں۔ یوگی راج کے ارشاد کے مطابق تو اس کا مقام مدن ہی کا گھر ہو سکتا ہے اور وہ آ بھی کہاں سکتی ہے۔ میں بھی عجیب بدھو ہوں ایک واضح اور صاف اشارہ بھی نہیں سمجھ سکتا!" میں نے خود کو بہت کوسا۔ "اور میرا وہاں جلد از جلد جانا بھی ضروری ہے۔ یوگی راج نے کہا ہے کہ اگلے ہفتے اڑچن پیدا ہو رہی ہے۔ اور پھر فراق میں جلنا ہوگا۔ میں تو پہلے ہی جل کر راکھ ہو چکا ہوں۔ کیوں نہ اب اس سے بچنے کی تدبیر کروں۔"

میں خراماں خراماں مدن کے گھر پہنچا۔

پہلے تو داخل ہونے سے جھجکا۔ پھر ذرا ہمت باندھ کر آگے بڑھ گیا۔ دل میں کئی سارے خیالات امڈ آئے۔ اس سے معافی مانگوں گا میری وجہ سے اسے تنہائی اختیار کرنا پڑی۔ اس سے کہوں گا کہ یہ جدائی بڑی جان لیوا ہے۔ ٹھیک ہے ہم ایک گھر میں نہیں رہ سکتے لیکن ایک شہر میں تو رہ سکتے ہیں۔ وہ بمبئی چھوڑ کر یہاں چلی آئے۔ اس جیسی ماہر تعلیم کے لیے یہاں بیسیوں آسامیاں مل سکتی ہیں۔ یہاں آجائے گی تو ایک دوسرے کو دیکھ لیا کریں گے کبھی کبھی مل لیا کریں گے۔ تقدیر نے شادی تو نہ ہونے دی لیکن تدبیر سے ایک دوستی کا، غم گساری کا، چارہ سازی کا تعلق تو روا ہو سکتا ہے

مدن گھر میں نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔

میں ان کے بیڈ روم میں چلا گیا۔ سرلا سے اکثر یہیں ملاقات ہوا کرتی تھی۔

مدن کی والدہ سے سامنا ہو گیا۔ وہ بڑے تپاک سے ملیں "آؤ۔ آؤ تمھارا تو یہاں انتظار ہو رہا ہے"

میں اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔

یوگی راج کی پیشینگوئی کس قدر سچ نکلی۔ مدن ٹھیک ہی کہتا تھا۔ بڑا غیب دان ہے۔ میں دل ہی دل میں اسے دعائیں دے رہا تھا ہم عقبی صحن میں پہنچ گئے۔

سامنے چارپائی پر دادی بیٹھی تھی۔ پشت ہماری طرف تھی مدن بھی پاس بیٹھا تھا۔ اس کی والدہ نے پاس جا کر کہا "ملنے کے لیے کہہ رہی تھیں نا۔ یہ لو آگیا تمھارا بیٹا"

میں نے بڑھ کر دادی کے پاؤں چھوئے اور سر جھکائے اس کے پاس بیٹھ گیا۔



پدماوت تنقید کی روشنی میں — (صفحہ ۲۵ کا بقیہ)

کی تصویر کشی جائسی کی منظر نگاری کی اعلیٰ صلاحیتوں کی نشاندہی کرتی ہے۔

بہ لحاظ ہیئت پدماوت سات چوپائیوں کے بعد ایک دوہے کی شکل رکھتی ہے۔ تلسی داس کی رامائن بھی اسی شکل میں لکھی گئی ہے —

پدماوت کی منظوم داستان مرگاوتی اور مدھومالتی سے زیادہ طبع زاد اور پر تاثیر ہے۔

اپنے انھیں محاسن کی بدولت پدماوت جہاں پر برادگی ہندی شاعری کی سب سے اہم اور مقبول نظم ثابت ہوتی ہے وہاں ملک محمد جائسی کو ہندی ادب میں ایک بلند مقام عطا کرتی ہے۔



نیا دور اپنے قارئین کے مفید مشوروں کے لیے شکر گزار ہوگا

پیامِ آزادی

مہدی پرتاپ گڑھی

بڑھے ہیں یوں تو ترقی میں جب بشر کے قدم — بلند ہو گیا ہے حیات کا پرچم
ملا ہے اوجِ ثریا ہر ایک پستی کو — جہاں جہاں سے بھی گزرے ہیں آدمی کے قدم
پہنچ [illegible] وہ وقت آیا جب مشیت نے — لٹا دی لوحِ بشر پہ متاعِ جود و کرم
نفس نفس سے ابلتی ہے زندگی کی شراب — ہر ایک گام پہ جاری ہے چشمۂ زمزم
سکون و امن کی صہبا چھلک رہی ہے یہاں — حیات آج نہیں ہے شکارِ درد و الم
فلاح دی ہے وہ منصوبوں کی ترقی نے — نکھر گئی ہے ہر اک شاہ راہ لے ہمدم
ہمارے عزم پہ حیران ہو کے دیکھے ہے — کبھی کیا تھا زمانے نے ہم پہ مشقِ ستم
رہی ہے شیخ و برہمن میں اب کوئی تفریق — کہ آج ایک ہوئی ہے ہوائے دیر و حرم
گرا دیا ہے ارادوں نے ظلم کی دیوار — کیا جنوں نے ہر اک سنگِ راہ کا سر خم
چمن رہا نہیں منت گزارِ فصلِ بہار — ہمارے حسنِ یقیں نے بدل دیے موسم
جواب اس کا زمانے میں مل نہیں سکتا — جو بابِ زیست کا ہم کرتے ہیں آج رقم
[illegible] میں مٹے ہیں وہ کارِ نمایاں — بلند ہوا ہے حیات کا پرچم
ہمیں عزیز نہیں صرف اپنی آزادی — جہانِ امن و مسرت کے [illegible] ہیں ہم

اب اس مقام پہ پہنچا ہے کارواں اپنا
زمانہ ڈھونڈ رہا ہے ہمارے نقشِ قدم

یہی صحیح ہے مگر یہی منزلِ آرام — ابھی قریب نہیں آیا عیش کا ہنگام
ابھی بہت سے مسائل ہیں زیرِ غور ابھی — ابھی ہیں راہ میں اپنا سفر ہے ناتمام
ابھی نگاہ میں پہنچی نہیں کوئی منزل — ابھی نگاہ میں ہیں اور بھی بلند مقام
اٹھو عزیزو! دنیا دوں میں یکجہتی لے کر — یہ صبح لائی ہے اپنے لیے نئے پیغام
[illegible] کی نظر کے پاسبان ہیں — عطا کریں گے کیف و سرور و حسنِ دوام
[illegible] — اجالا یہ مہر و محبت کا ایک ماہِ تمام

دلوں میں پیار و محبت کا جذبِ خلوص
جہاں میں عام کریں امن و آشتی کا پیام

رشکِ فردوس

پورن سنگھ ہنر

خندہ زن خونگن
ہے حسینِ وطن
بج رہی ہیں ہر اک سمت شہنائیاں
وقت ہے اور مسرت کی انگڑائیاں
ماہ و خورشید ہے
ہر حسینِ وطن
رشکِ فردوس ہے سرزمینِ وطن

یہ وطن وہ ہے جس کی بڑی شان ہے
اس وطن کا ہمالہ سا دربان ہے
ہے مکانِ اماں
ہر مکانِ وطن
رشکِ فردوس ہے سرزمینِ وطن

اک نیا باب گلشن میں کھلنے لگا
کانٹا پھولوں کے کانٹے میں تلنے لگا
شانِ رفعت ہے
ہر نگینِ وطن
رشکِ فردوس ہے سرزمینِ وطن

کہکشاں جس کے ماتھے کا قشقہ بنا
لوحِ محفوظ کا نقش نقشہ بنا
اللہ اللہ شانِ
حسینِ وطن
رشکِ فردوس ہے سرزمینِ وطن

تفرقے جو پڑے تھے وہ اب مٹ گئے
نقشِ باطل جو ابھرے تھے سب مٹ گئے
اب نہ ہے داغ
ہر مبینِ وطن
رشکِ فردوس ہے سرزمینِ وطن

ساری بنجر زمیں آج ہے زرفشاں
دشت و صحرا نظر آتے ہیں گلستاں
ہے مگن ہی مگن
ہر مکینِ وطن
رشکِ فردوس ہے سرزمینِ وطن

اس کا ہر طفلِ مکتب بھی لقمان ہے
ہر گدا ذرّوں میں خورشید کی شان ہے
ہر کہ و مہ ہے
بالانشینِ وطن
خندہ زن خونگن ہے حسینِ وطن

ڈاکٹر بی گوپال ریڈی
ترجمہ : عطیہ بانو

اتر پردیش میں عوامی حکومت کا آغاز

اتر پردیش کی سیاسی اور انتظامی مشینری کی ہیئت اور کردار میں پچھلے کچھ عرصے کے اندر بڑی تیزی کے ساتھ تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ وہ علاقہ جو آج اتر پردیش کہلاتا ہے اس کا بیشتر حصہ سنہ ۱۸۳۴ء میں بنگال پریسی ڈنسی سے الگ کر لیا گیا۔ سنہ ۱۸۳۶ء میں شمالی مغربی صوبے کے نام سے اس علاقے پر مشتمل ایک باضابطہ صوبہ بنایا گیا اور اسے ایک لفٹیننٹ گورنر کی ماتحتی میں دے دیا گیا۔ سنہ ۱۸۷۷ء میں اودھ کے بارہ اضلاع اس شمالی مغربی صوبے میں شامل کئے گئے۔ کچھ عرصے بعد یعنی سنہ ۱۹۰۲ء صوبے کا نام بدل کر صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ رکھا گیا اور سنہ ۱۹۵۰ء میں دستور ہند کی رو سے اس کا نام اتر پردیش ہوا۔

اتر پردیش میں پہلی بار ۳ رجنوری سنہ ۱۹۲۱ء کو دو اگزیکٹیو کونسلروں اور دو وزرا کا تقرر عمل میں آیا اور ساتھ ہی لفٹیننٹ گورنر کو ترقی دے کر گورنر بنا دیا گیا۔ ۱۹۲۱ء تک لفٹیننٹ گورنر صوبے کا نظم و نسق بغیر اگزیکٹیو کونسلروں و وزیروں کے صرف محکمے کے سکریٹری کی مدد سے چلاتا تھا۔

یہ تبدیلیاں ریاست کی آئینی ترقی کا ایک اہم وسیلہ ثابت ہوئیں جس میں حکومت کے عوامی کردار کی شگفتگی اور بالیدگی کے بھرپور امکانات تھے۔ پہلے گورنر اور ان کے اگزیکٹیو کونسلروں اور وزیروں کی حلف برداری ۳ رجنوری سنہ ۱۹۲۱ء کو انجام پائی۔ وہ ایک یادگار موقع تھا اور آج ہم اسی یادگار موقع کی یاد تازہ کرنے اور اس درمیان میں ہم نے جو ترقیاں کی ہیں ان کا جائزہ لینے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ غالباً ریاست میں یہ پہلا موقع تھا جب عوام کے منتخب نمائندوں کو حکومت میں شامل کیا گیا اور انھیں الگ الگ محکمے دیے گئے لیکن مجموعی کنٹرول بہرحال گورنر کا رہا۔

انسان کی زندگی میں تو پچاس سال کی مدت طولانی کہی جا سکتی ہے لیکن کسی ملک کی تاریخ میں نہیں۔ پھر بھی ان پچاس برسوں میں بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ ذمے دار حکومت کا آغاز جیمس فورڈ اصلاحات سے ہوا۔ ریاستی نظم و نسق کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا اور اہم شعبے مثلاً قانون اور ضبط و نظم، مال، مالیات، آبپاشی اور بجلی "ریزروڈ" قرار دے کر اگزیکٹیو کونسلروں کو سونپے گئے جو عوام کے منتخب نمائندے نہیں ہوتے تھے۔ لوکل سلف گورنمنٹ، صحت، تعلیم، زراعت وغیرہ کے محکمے "ٹرانسفرڈ" محکمے کہلاتے تھے اور ان سیاسی لیڈروں کے حوالے کیے گئے جو ان قانون ساز کے جسے اس وقت لیجس لیٹیو کونسل کہتے تھے منتخب اراکین ہوا کرتے تھے۔ "ریزروڈ نصف" اور "ٹرانسفرڈ نصف" کی تقسیم یکم اپریل ۱۹۳۷ء تک باقی رہی۔

لفٹیننٹ گورنر ہارکورٹ بٹلر نے ۳ رجنوری سنہ ۱۹۲۱ء کو صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ کے پہلے گورنر کی حیثیت سے حلف لیا۔ راجہ صاحب محمود آباد اور مسٹر ایل۔ سی۔ پورٹر آئی سی ایس کو لیجس لیٹیو کونسلر کی حیثیت سے حلف دیا گیا۔ خری سی ما[illegible]

لہ "یوپی میں گورنری نظام کے پچاس سال" تقریبات کے افتتاح کے موقع پر ۳ رجنوری سنہ ۱۹۷۱ء کو گورنر ڈاکٹر بی گوپال ریڈی کا خطبۂ صدارت۔

یہاں میں ۱۹۲۱ء میں اتنا [illegible] سے ہوئی [illegible] کی بات ہو
کر آج ان کی تعداد ۲۲ ہے۔

۱۹۲۱ء میں حق رائے دہی بھی بہت محدود تھا۔ حق رائے دہی اسی کو حاصل تھا جس کے پاس جائداد ہوتی اور وہ حکومت کو کچھ نہ کچھ ٹیکس ادا کرتا ہو۔ لہٰذا اس طرح عوام کا بہت بڑا طبقہ خصوصاً عورتیں ووٹروں کی فہرست سے خارج ہو گئی تھیں۔ آج صورت حال بالکل مختلف ہے اور غیر محدود بالغ رائے دہی کا طریقہ رائج ہے جس کی رو سے ہر شہری جو ۲۱ سال کا ہو جاتا ہے ریاستی مجالس قانون کے انتخابات میں حصہ لینے کا مستحق ہو جاتا ہے۔ اب یہ نہیں دیکھا جاتا کہ کسی کے پاس جائداد ہے یا نہیں، کوئی تعلیم یافتہ ہے یا نہیں یا کوئی حکومت کو کچھ ٹیکس دیتا ہے یا نہیں۔ بغیر کسی تحفظ یا استثنا کے مردوں اور عورتوں دونوں کے لیے یکساں طور پر ہم نے غیر محدود بالغ رائے دہی کا طریقہ اپنا لیا ہے۔

ہاں تو میں ۱۹۲۱ء کے واقعات کا ذکر کر رہا تھا۔ غالباً بدلے ہوئے سیاسی حالات کا پہلا ثمرہ تھا لکھنؤ یونیورسٹی کا قیام۔ یونیورسٹی کورٹ کا پہلا جلسہ مارچ ۱۹۲۱ء میں ہوا اور یونیورسٹی میں باقاعدہ طور سے کام جولائی ۱۹۲۱ء میں شروع ہوا۔ لکھنؤ ریاست کی دوسری یونیورسٹی تھی اور اس وقت یہاں ۹ ریاستی یونیورسٹیاں اور بنارس اور علی گڑھ کی دو مرکزی یونیورسٹیاں ہیں۔

تعلیم میں ہر سطح پر سریع ترقی ہوئی ہے چنانچہ پردیش میں ہائی اسکول، انٹرمیڈیٹ کالجوں، ڈگری کالجوں اور [illegible] کالجوں کی تعداد بہت بڑھ گئی ہے جن میں گریجویٹ سے آگے تعلیم ہوتی ہے لیکن ہماری آبادی کے مقابلے میں فیصد خواندگی اب بھی بہت کم ہے۔ اس لیے ضرورت اس کی ہے کہ خواندہ اور تعلیم یافتہ افراد کی تعداد بڑھانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔

زراعت، چھوٹی آبپاشی اور بجلی کے معاملے میں بھی ہم نے آزادی کے بعد سے خاطر خواہ ترقی کی ہے۔ البتہ ہمیں [illegible] رسائل اور صنعتی ترقی کی جانب زیادہ دھیان دینے کی ضرورت ہے۔ ہندستان کے ۱۹۲۱ء کے سیاسی نقشے کو دیکھیے اور اس

[illegible] ۱۹۲۱ء [illegible] حکومت [illegible] ہوئی [illegible] اس طرح سے ہندستان میں رفتہ رفتہ ذمے دار حکومت کے قیام کی برطانوی حکومت کی پالیسی کو بروئے کار لانے کا آغاز ہوا۔

قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء نے صوبائی نظم و نسق کی تمام تر ذمہ داری منتخب نمائندوں کو سونپ دی۔ فروری ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں کانگرس پارٹی کو مدراس، بمبئی، صوبہ جات متوسط، [illegible] اڑیسہ، بہار، آسام اور اتر پردیش میں بھاری اکثریت حاصل ہوئی۔ ان صوبوں کے گورنروں نے انھیں یکم اپریل سے وزارت قبول کرنے کے لیے مدعو کیا۔ لیکن انھوں نے اس بنا پر اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ قانون حکومت ہند نے گورنروں کو غیر معمولی اختیارات اور خصوصی ذمے داریاں دے رکھی تھیں۔ البتہ جب برطانوی حکومت نے یقین دلایا کہ یہ اختیارات عام طور سے استعمال نہیں کیے جائیں گے اور گورنر وزیروں کے مشورے کے مطابق کام کریں گے تب کہیں جولائی میں انھوں نے عہدے قبول کیے اور اس طرح صوبائی نظم و نسق مکمل طور سے عوام کے نمائندوں کے ہاتھ میں آگیا۔ لیکن مرکز میں عوامی نمائندگی ۱۹۴۶ء تک نہیں ہو پائی۔ چنانچہ دہلی میں مرکزی نظم و نسق ۲ ستمبر ۱۹۴۶ء تک جب پنڈت جواہر لال نہرو، سردار ولبھ بھائی پٹیل اور بابو جگ جیون رام کو حکومت میں شریک کیا گیا تمام تر ایگزیکٹیو کونسلروں کے ہاتھ میں تھا۔

ہماری سیاسی تاریخ کا اہم ترین موڑ ۱۹۴۷ء میں آیا۔ بدقسمتی سے ملک کا بٹوارہ ہو گیا لیکن ہندستان آزاد ہوا اور مرکز میں بھی عوامی نمائندوں نے عنان حکومت سنبھال لی جو عوام کے سامنے جواب دہ تھے۔ دستور ساز اسمبلی نے اپنے مذاکرات جو دسمبر ۱۹۴۶ء میں شروع ہوئے تھے ختم کیے اور ایک دستور مرتب کیا جو ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء سے نافذ ہوا۔ اب ہندستان ایک جمہوریہ تھا اور برطانوی اقتدار ہمیشہ کے لیے تاریخ کے اوراق میں درج ہو گیا۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ واقعات کی رفتار خصوصاً ۱۹۲۱ء کے بعد کس قدر تیز ہو گئی تھی۔ گورنروں کا عہدہ آئینی گورنروں کا ہے اور ریاستوں کے نظم و نسق کی ساری ذمہ داری عوام کے نمائندوں پر ہے۔

مقابلہ آج کے نقشے سے کیجیے تو آپ دیکھیں گے کہ تقریباً ہر ریاست
میں کس قدر زیادہ تبدیلیاں ہو گئی ہیں۔ بنگال کا زیادہ حصہ
پاکستان[1] میں چلا گیا ہے۔ سندھ ۱۹۳۶ء میں بمبئی سے الگ کر دیا گیا اور بعد
میں دوسرے حصے میسور، مہاراشٹر اور گجرات میں ملا دیے گئے۔ مدراس کے
علاقے آندھرا پردیش، تامل ناڈو، میسور اور کیرالا میں آ گئے ہیں۔ اڑیسہ
کو بہار سے الگ کر دیا گیا۔ آسام کا سلہٹ ضلع مشرقی پاکستان[2] میں چلا گیا۔
وسطی صوبہ (سی۔ پی) اور صوبہ برار کے بھی ٹکڑے ہو گئے۔ چنانچہ ناگپور
اور امراوتی ڈویژن مہاراشٹر کے حصے میں پڑے اور جبل پور
مدھیہ پردیش کے حصے میں آیا۔ پنجاب کو بھی تقسیم کی وجہ سے بہت
نقصان پہنچا۔ بعد میں اس کی مزید تقسیم ہوئی اور ہریانہ اور پنجاب
کے صوبے بنے۔ بہر حال بعض رجواڑے مثلاً پٹیالہ اور کپورتھلہ
پنجاب کے حصے میں آئے۔ اتر پردیش البتہ تقریباً جوں کا توں رہا۔
اس سے کوئی علاقہ نکالا نہیں گیا بلکہ اس کے برعکس آزادی کے
بعد سابق دیسی ریاستوں کے ہندستان میں ضم ہونے کے نتیجے
میں کچھ علاقہ یو۔ پی میں شامل ہی ہوا مثلاً پوری ریاست رامپور
اتر پردیش میں شامل کی گئی۔ اسی طرح ٹہری۔ گڑھوال کی ریاست میں
ضم ہوئی اور ریاست بنارس کا علاقہ بھی یو۔ پی کے ضلع بنارس
(اب وارانسی کے نام سے موسوم ہے) میں شامل کیا گیا۔

۱۹۴۷ء میں اتر پردیش میں کل ۴۸ ضلعے تھے اور اب ۵۴ ضلعے
ہیں۔ ان میں دیوریا، رامپور، ٹہری گڑھوال، پتھورا گڑھ، چمولی
اور اتر کاشی نئے اضلاع ہیں۔ دیوریا پہلے گورکھپور ضلعے میں شامل
تھا لیکن ۱۹۴۶ء میں اسے گورکھپور سے نکال کر علیحدہ ضلع بنا دیا
گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سابقہ ضلع گورکھپور اپنی وسعت کے
باعث انتظامی نقطۂ نظر سے پریشانی کا باعث بنا ہوا تھا حقیقۃً
گورکھپور اور دیوریا کی علاحدگی سے قبل گورکھپور ہندستان کا سب سے
زیادہ گنجان آباد ضلع مشہور تھا۔ ملک کی شمالی سرحدوں کو محفوظ اور
مستحکم بنانے کے مقصد سے الموڑہ، پوڑی، گڑھوال اور ٹہری گڑھوال
ضلعوں کو کاٹ کے پتھورا گڑھ، چمولی اور اتر کاشی کے نئے ضلعے
بنائے گئے۔ [illegible]
دس سال بعد ۱۹۶۹ء میں [illegible]
کی تنظیم ہوئی اور کمایوں اور گڑھوال کے دو ڈویژن بنائے گئے۔
اول الذکر میں نینی تال، الموڑہ اور پتھورا گڑھ کے اضلاع اور [illegible]
میں پوڑی گڑھوال، ٹہری گڑھوال، چمولی اور اتر کاشی کے اضلاع شامل ہیں۔

جب سر ہارکورٹ بٹلر یو۔ پی کے گورنر ہوتے تو اعلیٰ عہدوں پر
بیشتر انگریز افسران رکھے جاتے تھے۔ انڈین سول سروس [illegible]
اور انڈین پولیس میں ہندستانی خال خال تھے۔ حتیٰ کہ محکمۂ جنگلات
اور محکمہ آب پاشی میں بھی انگریز افسروں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔
بعض کالجوں میں پرنسپل بھی انگریز ہی تھے۔ سکریٹریٹ میں تو آئی
سی۔ ایس افسروں کی بھاری اکثریت تھی۔ آج یہ صورت حال
نہیں ہے بلکہ تمام بڑے بڑے عہدوں پر ہندستانی فائز ہیں۔

ہمارے سارے بڑے بڑے منصوبے خواہ آب پاشی سے
متعلق ہوں یا بجلی سے، خود ہمارے انجینیر تیار کرتے اور پایۂ تکمیل
تک پہنچاتے ہیں۔ ہندستانی افسروں نے بالعموم اپنے آپ کو
ہر طرح کی ذمے داریوں کا اہل ثابت کیا ہے اور انہیں انگریزوں کے
چلے جانے سے کوئی کمی محسوس نہیں ہو رہی ہے۔ اس ضمن میں بھی
جس تیزی کے ساتھ تبدیلیاں ہوئی ہیں ان کے باعث ہندستانی
افسروں کو ذمے داریاں اٹھانے اور تجربہ حاصل کرنے کے بہترین
مواقع حاصل ہوئے ہیں۔

سر ہارکورٹ بٹلر لکھنؤ کی دلکشی سے اس قدر مسحور ہوئے اور
سیاسی ماحول نے انہیں اپنی جانب اتنا کھینچا کہ انہوں نے اپنا
دارالحکومت الہ آباد سے رفتہ رفتہ لکھنؤ منتقل کر دیا۔ اب یہاں گورنر،
ایوان حکومت اور ایوان قانون ساز لکھنؤ میں ہیں۔ الہ آباد میں
صرف ہائی کورٹ، اکاؤنٹنٹ جنرل کا دفتر، پبلک سروس کمیشن
اور بعض دیگر محکمہ جاتی دفاتر [illegible]
رہ گئے ہیں۔ [illegible]
[illegible] ۱۹۲۱ء [illegible]

---

[1] مشرقی پاکستان سے مراد ہے جو اب آزاد بنگلہ دیش بن چکا ہے۔ [2] اب آزاد جمہوریہ بنگلہ دیش ہے (ایڈیٹر)

[illegible]
[illegible]
میں [illegible] پنڈت مدن موہن مالوی اور پنڈت موتی لال نہرو
نہ صرف [illegible] بلکہ وہ قومی لیڈر تسلیم کر لیے گئے۔ ۱۹۲۹
میں پنڈت جواہر لال نہرو کانگریس کے صدر ہوئے اور رفتہ رفتہ
ہندوستانی سیاسیات پر اس طرح چھا گئے کہ مہاتما گاندھی کے
بعد سب سے بڑے لیڈر وہی مانے جاتے تھے۔ گاندھی جی کی
۱۹۴۸ء میں وفات کے بعد وہ ہندوستان کے متفقہ لیڈر ہو گئے اور
مئی سنہ ۱۹۶۴ء میں اپنی وفات کے وقت تک ہندوستان کے مسلم الثبوت
لیڈر رہے۔ اپنی سربراہی کے زمانے میں انھوں نے ہندوستان
منضبط منصوبہ بندی اور ترقی کے دور میں پہنچا دیا۔ یہ انھیں کی ذات
تھی جس نے ہندوستان کو بین الاقوامی معاملات میں دلچسپی لینا
سکھایا۔ یہی نہیں بلکہ انھوں نے ہندوستان کو سائنس اور ٹکنالوجی کی
جدید دریافتوں اور ترقیوں سے پورا پورا فائدہ اٹھا کر مسائل کے حل
میں سائنسی نقطۂ نظر اپنانے کی بھی تعلیم دی۔ ملک کے مختلف مقامات پر اعلیٰ
تحقیقی کاموں میں مصروف قومی تجربہ گاہوں کا قیام بھی بہت کچھ نہرو جی ہی کا
مرہون منت ہے۔ اسی طرح صنعتی میدان میں ہم نے جو ترقی کی ہے اس کے
محرک بھی بڑی حد تک وہی تھے۔

ان کے بعد لال بہادر جی نے ان کی جگہ لی۔ اگرچہ وہ کل ۱۹ مہینے
وزیر اعظم رہے لیکن پاکستانی جارحیت کے مقابلے میں ان کے
جرأت مندانہ عمل نے انھیں عوام میں بہت ہردلعزیز بنا دیا۔ شریمتی
اندرا گاندھی بھی جو جنوری سنہ ۱۹۶۶ء میں لال بہادر جی کی جگہ وزیر اعظم
ہوئیں مختلف دشواریوں اور رکاوٹوں کے باوجود ملک کی کشتی بڑی
ہوشیاری اور بے باک دستی کے ساتھ کھے رہی ہیں۔ خوش قسمتی سے
اب تک تینوں وزرائے اعظم یو۔ پی ہی کے ہوئے ہیں۔
ہمارے نائب وزیر اعظم شری جی۔ ایس۔ پاٹھک بھی اسی
پردیش کے سپوت ہیں جو دیش کے ایک جانے [illegible]
[illegible] اس وقت جمہوریہ کے صدر ہیں۔

اس طرح آپ دیکھیں گے کہ اس پورے عرصے میں اتر پردیش
نے نہایت شاندار رول ادا کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ آئندہ
بھی یہ صوبہ اگلی صف میں نظر آئے گا۔

ذاتی طور سے جنوری سنہ ۱۹۲۱ء ہی وہ تاریخ ہے جس نے میری
زندگی کا رُخ موڑ دیا۔ یعنی ۲۸ جنوری سنہ ۱۹۲۱ء کو نان کوآپریشن کی آواز
پر لبیک کہتے ہوئے میں نے اسکول چھوڑ دیا جس کو سرکاری امداد مل رہی
تھی اور پھر کبھی کسی سرکاری اسکول کی طرف میں نے رُخ نہیں کیا۔ البتہ میں نے
مچھلی پٹم کے نیشنل کالج میں نام لکھوایا اور وہاں سے شانتی نکیتن چلا گیا۔

اتر پردیش کے ایک گورنر کی حیثیت سے میں تصور ہی تصور
میں تاریخ کے اوراق سے گزرتا ہوا ٹیکسلا سے دائی تک اور شریمتی
سروجنی نائیڈو سے شری میوا نند داس تک سبھی گورنروں سے
پر لطف باتیں کرتا ہوا اپنے گورنر سر ہارکورٹ بٹلر تک پہنچ جاتا ہوں۔ ان
کے جانشین کی حیثیت سے میں ان کی انتظامی صلاحیت، سیاسی
سوجھ بوجھ اور اتر پردیش کے عوام کی فلاح و ترقی سے ان کی دلچسپی
کے لیے ان کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔

شری سی وائی چنتامنی اور پنڈت جگت نرائن کے جانشین کی
حیثیت سے ہمارے وزرا کا یہ فرض ہے کہ وہ افلاس اور جہالت
کے خلاف عوام کی جد و جہد کی قیادت کریں اور قومی ترقی کے میدان
میں اتر پردیش کی شہرت کا پرچم پیش پیش رکھیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا
کہ آئندہ پچاس برسوں میں یعنی سنہ ۲۰۲۰ء تک عوام کو کیسی کیسی تبدیلیاں
دیکھنے کا موقع ملے گا۔ میری دعا صرف یہ ہے کہ باوجود دشواریوں
اور مشکلوں کے ہماری جمہوریت مستحکم ہو اور عوام زیادہ خوش حال،
زیادہ تہذیب یافتہ اور زیادہ محنتی بنیں۔ میری آرزو ہے کہ وندھیا
ہماچل، یمنا، گنگا کی یہ سرزمین ہندوستان کی ہمہ گیر ترقی کا محور رہے

★

آزادی کا گیت

دی۔ کے۔ جین

اے مرے پیارے وطن ہم بے ضرر بندے ترے
سرنگوں ہیں تیرے آگے بے خطر بندے ترے
بندگی تیری ہمارا دین بھی ایمان بھی
تیرے آگے سر بہ سجدہ جسم بھی ہے جان بھی
ہم پجاری ہیں ترے کرتے ہیں تجھ سے عاجزی
خاک میں تیری نمو، روئیدگی، بالیدگی
ہے چمن اندر چمن تیری حسیں آغوش میں
ڈھل رہے ہیں گیت۔ تیری وادیِ خاموش میں
جان کتنی قیمتی ہے، کتنی پیاری زندگی
روپ کتنے ہی بدلتی ہے ہماری زندگی
جان تیری شان ہے، ہم شان لے سکتے نہیں
جان دے سکتے ہیں، لیکن جان لے سکتے نہیں
ارتقا کا راز پنہاں ہے ترے ذرّات میں
معرفت ہے نور افشاں صرف تیری ذات میں
آج ہے جشنِ بہاراں اے مرے پیارے وطن
جاگ اٹھے ہیں دل کے ارماں اے مرے پیارے وطن
سربلندی سے تری، ہم شادماں ہیں کس قدر
تیری آزادی سے خوش پیر و جواں ہیں کس قدر
اے مرے پیارے وطن، مٹی تری اکسیر ہے
تو، ہماری زندگی کے خواب کی تعبیر ہے
بخت کی خوش اختری سے ہم کو سب کچھ مل گیا
ذوقِ دل کی رہبری سے ہم کو سب کچھ مل گیا

تقسیمِ بوئے گل

حمید الماس

اپنے لہو سے سینچ کے گلشن سجائیں گے
گلہائے رنگ رنگ کی رونق بڑھائیں گے
کہتے ہیں یوں تو خار بھی ہیں پاسبانِ گل
اچھا ہے خار زار سے دامن بچائیں ہم
تقسیمِ بوئے گل ہو سدا وصفِ باغباں
دیوارِ گلستاں کی نہ ہرگز بڑھائیں ہم
ہندوستاں کی روح میں شامل ہو صبر و ضبط
دل کو جنوں کی آگ میں کیسے جلائیں ہم
محفل میں جذب و کیف کا اک سلسلہ رہے
دل جن سے شاد ہو وہی نغمے سنائیں ہم
سایہ بہ سایہ فکر و عمل ساتھ ساتھ ہوں
اس منزلِ حیات کا رستہ دکھائیں ہم
دیکھیں ہر ایک چیز کو ایقاں کی آنکھ سے
وہم و گماں کو دل میں نہ ہرگز بسائیں ہم
بیٹھی ہے انتظار میں فردا کی نازنیں
آؤ شبِ دراز کا پردہ اٹھائیں ہم
ٹوٹے کبھی نہ سلسلۂ ربطِ باہمی
الماس یہ ہنر بھی جہاں کو سکھائیں ہم

شری اروند کا مرتبہ سماجی نظام

کرپا بیت جوشی

(شری اروند کی صد سالہ پیدائش کی تقریب ۱۵ اگست ۱۹۷۲ء کو تھی۔ تاخیر کے ساتھ موصول ہونے کے باعث یہ مضمون اگست کے شمارے میں شامل نہ ہو سکا۔ اب اسے شایع کیا جا رہا ہے۔

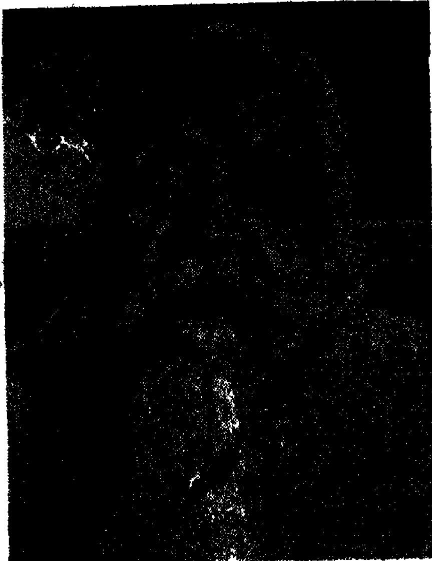
——— ایڈیٹر)

دورِ جدید کو غیر معمولی تغیرات اور انقلابات کا دور کہا جاتا ہے۔ شری اروند اس دورِ جدید کے صفِ اول کے رہنما ہیں۔ انھوں نے اپنی تمام زندگی بنی نوع انسان کو انہی تغیرات سے نکال کر اس مرکزی منبع علم تک پہنچانے میں گزار دی جو تسخیر کی قوت کا سرچشمہ ہے۔ کہا گیا ہے کہ شری اروند نے اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے تمام تر کوششیں کیں، محنت کی، قربانیاں دیں، اور آخر کار اسے حاصل کر لیا۔

شری اروند نے انسانی تاریخ کی موجودہ حالت کو منطقی دور کہا ہے۔ منطق اپنے اصولوں اور نظریات کے ذریعے طرح طرح کے تجربات کرتی ہے اور کچھ منطقی نتیجے اخذ کرنے کے بعد بھی خود کو مجبور اور محدود تسلیم کر لیتی ہے یعنی وہ بھی مکمل نہیں ہے۔ منطق انسان کی نجات کے لیے کوشاں ہونے کے باوجود ابھی تک حیاتِ انسانی کو صرف مشینی بنانے اور اس کو بے حقیقت اور کمزور بنا دینے میں کامیاب ہوئی ہے اور اس کے سامنے یہ سوال پیدا کر دیا ہے کہ انسان بالآخر مختار ہے یا مجبور؟

موجودہ بحران

اپنی دو گراں مایہ تصانیف "دی آئیڈیل آف ہیومن یونٹی" اور "دی ہیومن سائیکل" میں شری اروند نے موجودہ بحران کی نہایت غیر معمولی انداز میں بصیرت افروز تشریح کی ہے۔ آج چونکہ ہم ایسے ہی پیچیدہ مرحلے سے گزر رہے ہیں لہٰذا میں اس موضوع پر ذرا تفصیل سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ ہمیں اس حقیقت سے واقف ہونے کی ضرورت ہے کہ خود کو موجودہ ابتری، تباہی اور بربادی کے خطرے سے نکالنے کے لیے شری اروند کے بتائے ہوئے روحانی انقلاب کا سہارا لینے کے علاوہ اور کوئی دوسرا چارہ کار نہیں ہے۔



شری اروند کے خیال کے مطابق اس منطقی دور کی اصل کشمکش محض جمہوریت، سماجی جمہوریت، سوشلزم یا سرکاری کیمونزم اور نراج کے بڑھتے ہوئے رجحان

کے درمیان پائی جاتی ہے۔ دنیا کا طاقت کے دو بڑے بلاکوں میں تقسیم ہو جانا اسی کشمکش کا نتیجہ ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ اس کشمکش کو ختم کیسے کیا جائے؟ سمجھوتے کا ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مخالف رجحانات اور طاقتوں کے درمیان پُر امن بقائے باہم کا تصور قائم کیا جائے۔ شری اروند کا قول ہے کہ ان دونوں نظریات کے ساتھ ساتھ پہنچنے سے کچھ اقتصادی لین دین ہو سکتا ہے اور یہ ایک دوسرے کے نزدیک آسکتے ہیں۔ ویسے دنیا اس وقت سماج پر حکومت کے کنٹرول کے اصول کی جانب بڑھ رہی ہے۔ ایک جانب جمہوری ممالک اور دوسری طرف مزمہ سرمایہ دار ملکوں کے بلاک ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں اور ان میں آپس میں دوستانہ تعلقات بھی قائم ہو سکتے ہیں۔

"شری اروند ایکشن" نامی تنظیم کے ذریعے اس ضمن میں جو کام کیا گیا ہے وہ قابلِ تحسین تصور کیا جاتا ہے۔ شری اروند نے مستقبل کے کچھ امکانات ہی کا اندازہ نہیں لگایا بلکہ انھوں نے یہ بھی بتا دیا کہ انسان کو کس سمت میں جانا چاہیے۔ انھوں نے ایک لازمی قوت کی تخلیق کے لیے بھی کام کیا ہے جس کی مدد سے مناسب اقدامات کیے جا سکتے ہیں۔ "شری اروند ایکشن" کا مقصد لوگوں کو صحیح حل کی جانب صحیح سمت میں پیش قدمی کے لیے تیار کرنا ہے۔

صحیح حل

لیکن شری اروند کا پیش کردہ صحیح حل ہے کیا؟ ہمیں اس سلسلے میں قطعی غلط فہمی نہیں ہونا چاہیے کہ یہ حل آسان ہے یا اتنے بڑے اور عالمی مسئلے کا حل کسی محدود نظریہ یا 'ازم' کی شکل میں ہوگا۔ دراصل شری اروند کسی اصول، نظریہ یا مذہب کے نمائندے نہیں ہیں۔ انھوں نے روحانی طور پر مکمل قلب ماہیت کی صورت میں ایک حل پیش کیا ہے جو تمام مذاہب، تمام سیاستوں اور محدود اور اصرار پسند انسانی خود پسندی کے مطالبات کے ساتھ سمجھوتے کرنے سے کہیں بلند ہے۔

شری اروند کی نظر میں موجودہ بحران ارتقائی کشمکش ہے جو ایک نوع کے دوسرے نوع میں تبدیل ہونے کے ہر مرحلے پر پیدا ہوتا ہے۔ انسان منطقی دور سے گزر کر اپنی تمام انسانی صلاحیتوں کے نقطۂ عروج پر پہنچ چکا ہے اور اب اسے اپنی اس حد سے آگے بڑھنے کے لیے خود کو تیار کرنا چاہیے۔ شری اروند کے قول کے مطابق 'انسان ایک تغیر پذیر مخلوق ہے

سبب اس کا ارتقاء ایک روحانی فوق البشری شکل میں ہوتا ہے۔'

انسان کے مسائل کے حل کے لیے ہمیں اپنی تہذیب کے اصل عیوب کو دور کرنا ہوگا۔ شری اروند نے لکھا ہے "ہمارے ہر نظام میں بنیادی عیب یہ ہے کہ انھیں تشکیل دیتے وقت روحانی عنصر یعنی انسان میں موجود روح کو جو کہ اصل حقیقت ہے، نظر انداز کیا گیا ہے۔"

ان کا قول ہے کہ انسانیت کے روحانیت پرست بنتے ہی صورتِ حال ایک دم بدل جائے گی۔ لیکن کیا ایسا نہیں لگتا کہ اس کا حل نکالنے میں ہمیں کافی لمبا عرصہ لگ جائے گا۔ کیا یہ حل ہماری موجودہ ضرورتوں سے بے جوڑ نہیں معلوم ہوتا؟

شری اروند نے خود اپنی کتابوں "دی لائف ڈیوائن" اور "دی ہیومن سائیکل" میں یہ سوال اٹھایا ہے۔ آخر الذکر کتاب میں انھوں نے لکھا ہے کہ یہ حل ایسا ہے جس کے بارے میں یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ اس طرح بہتر انسانی سماج کی مرتبے کا معاملہ مستقبل میں ہونے والے نسلِ انسانی کے ارتقاء پر منحصر ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ منطق کے ذریعے تشکیل دیا گیا کوئی بھی نظام فرد یا سماج کو مکمل نہیں بنا سکتا، صرف انسانی فطرت میں ایک داخلی تبدیلی ہی سے ایسا ممکن ہے۔ لیکن تبدیلی کا یہ عمل بھی اتنا دشوار ہے کہ اس سے بہت کم لوگ متاثر ہو سکتے ہیں۔ اور یہ یقینی بھی نہیں ہے۔ بہرنوع اگر یہ حل نہیں ہے تو انسان کے لیے کوئی اور راہِ نجات ہو ہی نہیں سکتی۔ ...... یہ کوئی منطقی دلیل نہیں کہ پوری طور پر اگر تکمیل ممکن نہیں ہے تو تبدیلی کا عمل بھی شروع ہی نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے کہ ابتدا میں چند عظیم افراد ہی بلند درجات تک پہنچ سکیں اور دیگر افراد منزل سے دور رہیں۔ لیکن انسان کا روحانی آدرش کی جانب مائل ہونا مطلقاً ناممکن نہیں کہا جا سکتا۔ اس آغاز سے انسانی ذہن پر چھائے ہوئے ناامیدی کے بادل چھٹ جائیں گے اور انسان کی پوری زندگی بدل جائے گی اور اس میں اپنے اندر رفعت پیدا کرنے کا خیال پیدا ہوگا۔

روحانیت کی شرطیں

شری اروند کے قول کے مطابق اگر یہ کام شروع کرنا ہے تو دو شرطوں کا پورا کرنا ضروری ہے۔ ایسے افراد کا ہونا لازمی ہے جو خود کو روحانیت سے متصف کر چکے ہوں اور جو عوام تک اپنی یہ روشنی پہنچا سکے ہوں۔ دوسری شرط

ہے کہ انسان اثر قبول کرنے کے لیے تیار ہوں۔ دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ یہ دو نوں شرطیں دنیا میں کبھی بھی بیک وقت پوری نہیں ہو پائیں۔ یہی صورت حال ماضی کی ہماری تمام ناکامیوں کا اصل سبب ہے۔

لیکن کیا ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اگر مذکورہ مقصد ماضی میں حاصل نہیں ہو سکا تو مستقبل میں بھی نہیں ہو سکے گا یا اب ہونا ممکن نہیں ہے؟ دراصل اگر ہم اس مقصد کا جائزہ لیں جس کو لے کر شری اروند پانڈیچری گئے اور انھوں نے یوگ سادھنا کی تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہ ان دو حالتوں میں تال میل پیدا کرنے کی ہی کوشش تھی۔ انھوں نے جو طاقت حاصل کی، جس مافوق الفطرت قوت کو وہ زمین پر اتار لائے، وہ درحقیقت پہلی لازمی شرط کو پورا کرتی ہے۔ ابھی گزشتہ سال ہی شری اروند انٹرنیشنل سنٹر کے تعلیمی مرکز سے شائع ہونے والے بلیٹن میں ہمیں 'ماں' کا یہ اعلان پڑھنے کو ملا کہ "کام مکمل ہو گیا، کام مکمل ہو گیا، کام مکمل ہو گیا"۔ لیکن کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسانیت اس اثر کو قبول کرنے کے لیے تیار ہے؟ اس بات میں تو کوئی شک نہیں کہ تمام عالم انسانیت یا کم سے کم بھارت شدید غیر روحانی بحران کی حالت میں ہے اور ہر جگہ صحیح حل کو جاننے کی خواہش پائی جاتی ہے۔ لوگ 'ازم' کے چکر میں الجھائے گئے ہیں اور وہ جاننا چاہتے ہیں کہ کیا ان 'ازموں' کے علاوہ بھی کوئی مشرب اور جادہ ہے۔

شری اروند کا طریقۂ کار

اس کے باوجود ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ انسانیت پوری طرح تیار ہے۔ سماج اب بھی بالکل بے پروا ہے، اب بھی جھوٹ اور مفروضات کی پستیوں میں کھوئی ہوئی ہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اندھیری رات کے پردے میں صبح نو کا جلوس نمودار ہونے کے لیے تیاریاں کر رہا ہو۔ ممکن ہے ایک نئی کوشش سے اس نئی صبح کے سورج کے رخ پر چڑھا ہوا غلاف اتر جائے اور اس کی تابانیاں پھوٹ پڑیں۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں اس قسم کی کوشش ہی شری اروند کے طریقۂ کار کا مقصد رہی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بھارت پر اس روحانی حل کا انکشاف ہو جائے۔ عظیم روحانیت بھارت کی وراثت رہی ہے اور بھارت نے امتحان کے دشوار مراحل میں بھی ناکامی کا منہ نہیں دیکھا ہے۔ ہم پر امید ہیں کہ اس ہنگامی صورت حال میں بھی بھارت ناکام نہیں ہوگا۔

ایک نئی روحانی قیادت، نئے اوصاف، نئے مظاہر آنے والے وقت کا مطالبہ ہیں۔ مستقبل کو ان کی ضرورت ہے۔ ان نئے اوصاف کی نشاندہی کرنا ہے اور انھیں نئے اوصاف کو فروغ دینا ہے۔ مستقبل کے قائدوں کا ذکر کرتے ہوئے شری اروند نے ہمیں آئین اپنی کتاب "دی ہیومن سائیکل" میں لکھی ہیں۔ میرے خیال میں یہ تشریح ہمارے لیے اس سلسلے میں معاون ہوگی کہ مجوزہ "یونٹو کیمپ" کن خطوط پر منظم کیے جائیں۔ شری اروند لکھتے ہیں: "مستقبل کی تعمیر میں معاون ہونے والے افراد وہ ہوں گے جو روحانی ارتقا کو اپنی تقدیر سمجھیں گے اور اس لیے اس کو انسانیت کی اشد ضرورت مانیں گے۔ وہ اس طرح کا طرز حیات اپنانے کو بے حد ضروری تصور کریں گے۔ وہ خاص طور سے یہ سوچنے کی غلطی نہیں کریں گے کہ یہ روحانی تغیر مشینوں اور خارجی اداروں کے اثرات میں ملوث ہو سکتا ہے۔ وہ مشرق کے اس داخلی طرز فکر کو اپنائیں گے جو فرد کو اس کی تقدیر اور اس میں پوشیدہ نجات کے راز کو جاننے کی تحریک پیدا کرتا ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ اس بات کو بھی مختلف شکل میں قبول کریں گے کہ مغربی طرز زندگی میں سب ہی کے لیے زندگی اور علم کی اہمیت ہے۔ وہ اس اصول میں یقین نہیں کریں گے کہ زیادہ تر لوگ یقیناً زندگی کی نچلی سطح پر ہی رہیں اور صرف تھوڑے سے لوگ زندگی کی آزاد ہوا اور روشنی سے لطف اندوز ہوں، بلکہ وہ ان عظیم روحانی شخصیتوں کے نقطۂ نظر سے آغاز کریں گے جنھوں نے روئے زمین پر زندگی کو حیات نو سے ہمکنار کیا ہے۔

"اے قادر مطلق، اے ابدی حقیقت!
ہمیں اپنی اطاعت کرنے کی صلاحیت عطا فرما اور سچائیوں پر چلنے کی قوت دے۔"

——— جے ہند



غزل

ویدو رما راز

میں تنہائی میں خود سے پوچھتا ہوں
خدا ہوں نا خدا ہوں بول کیا ہوں

چمن سے یوں نہ خالی ہاتھ جاؤ
ادھر آؤ میں خوشبو بانٹتا ہوں

مسلسل زندگی ہے نام میرا
لہو بن کر رگوں میں دوڑتا ہوں

مذاقِ عشق ہے میرا مقدر
ہمیشہ دار پر چڑھتا رہا ہوں

یہ سب دیکھے ہوئے چہرے ہیں میرے
میں ان سب کی حقیقت جانتا ہوں

لیے پتھر نظر آتے ہیں اپنے
میں کیسے موڑ پر اب آ گیا ہوں

جہاں تک ہے مقید فکر تیری
میں اُس دُنیا سے آگے بڑھ گیا ہوں

مجھے بدنام کرنا ہے تو کر لے
مگر یہ سوچ تیرا آئینہ ہوں

نظر آتے ہو اکثر سامنے تم ہی
جب اپنے دل کے اندر جھانکتا ہوں

بھادرپد ۱۸۹۴ شک

غزل

احترام اسلام اشک

فسردہ غنچہ و گل ہیں صبا پریشاں ہے
یہ کس کے سوگ میں ڈوبا ہوا گلستاں ہے

سبھی پہ اس کی نظر ہے مگر نہ جانے کیوں
زمانہ میرے مقدر پہ اتنا حیراں ہے

مجھے زمانہ کی تاریکیوں کا غم کیا ہو؟
چراغِ عشق مرے قلب میں فروزاں ہے

ترا جمال مبارک رہے تجھے ہمدم
مجھے خلوص کی چاہت وفا کا ارماں ہے

غمِ حیات کو ہنس ہنس کے ٹال دیتا ہوں
مرا نصیب مرے حوصلوں پہ حیراں ہے

خود اپنے واسطے جینے کو سب ہی جیتے ہیں
جیے جو اوروں کی خاطر عظیم انساں ہے

تمام رنج و غمِ دل کا رازدار ہے اشک
وہ ایک قطرہ جو نوکِ مژہ پہ لرزاں ہے

ستمبر ۱۹۷۲ء

فن کار کا نذرانہ

اخلاق حسین عارف

روز صبح ضروریات سے فارغ ہو کر وہ اپنے گھر سے نپے تلے قدموں سے چل کر، جو اس راہ پر چلتے چلتے اس قدر سدھ گئے تھے کہ بھول کا گمان بھی نہ تھا، شہر آ جاتا اور شاہراہ کے قریب کسی گوشہ میں بیٹھ کر ذرا دم لیتا، پھر اپنے مشغلے کی طرف متوجہ ہو جاتا۔

یہی اس کا روز کا معمول تھا۔ اور یہی تھا اس کا ذریعہ معاش ــــ!

کبھی کبھی تو آ کر جیسے ہی وہ بیٹھتا اور ٹھیک طرح سے دم بھی نہ لینے پاتا کہ ان لوگوں میں سے جو ماضی قریب میں اس کی موسیقی سے لطف اندوز ہو چکے تھے، کوئی سوال کر بیٹھتا:

"منشی ــــ! آج کچھ سناؤ گے نہیں ــــ؟"

"ضرور سناؤں گا ــــ آیا ہی اسی لیے ہوں۔"

"تو پھر سناؤ ــــ!"

"اور وہ الٹا سوال کر بیٹھتا "کیا سناؤں ــــ؟"

"وہی، جزیرے کی پری والا گیت۔"

اور منشی کے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ دوڑ جاتی۔ جس مقام وہ بیٹھا ہوتا، کاندھے سے اتار کر وہیں سامنے اپنی میلی سی چادر پھیلا دیتا۔ اس کے ایک گوشہ پر بیٹھ جاتا۔ دوسرے کاندھے سے ساز اتار کر تاروں کو درست کرتا اور فرمائشی گیت کی دل نواز دھنیں نکالتا پھر اس کی انگلیاں ساز پر متحرک ہو جاتیں۔ ادھر ساز کی مدھم اور سبک رفتار کے ساتھ نغمہ فضا میں گونجتا ادھر مجمع میں بتدریج اضافہ ہوتا چلا جاتا۔ لوگ اس کا نغمہ سننے کے لیے اور قریب سمٹ آتے۔ گیت نغمہ کے احساسات پر اور منشی پر محویت کا عالم طاری ہو جاتا۔

گیت کے ... تک یہی کیفیت رہتی۔ پھر ایک ساز پر چلتی ہوئی انگلیوں اور لبوں پر گیت کا آخری بول ختم ہوتا کہ ایک ساتھ ساکت ہو جاتے۔ منشی ہاتھوں سے ساز رکھ کر چپ چاپ سی بے نور آنکھیں مجمع پر دوڑاتا۔ مجمع سے تحسین و آفرین کی صدائیں بلند ہوتیں، ساتھ ہی پھیلی ہوئی میلی چادر پر مختلف سکے بکھرتے چلے جاتے یہاں تک کہ چادر کی سطح سکوں سے ڈھک جاتی۔

تھوڑی دیر بعد وہ چادر کے چاروں پلو پکڑ کر احتیاط سے سمیٹتا، اس میں سے سکے اس طرح سے ٹٹول کر نکالتا جیسے ماہی گیر جال سے مچھلیاں پکڑ پکڑ کر باہر نکالتا اور اپنی تھیلی میں رکھتا جاتا ہے۔ جب وہ اس کام سے فراغت پاتا تو چادر کو جھاڑ کر دوبارہ اسے کاندھے پر اسی جگہ پہنچا دیتا جہاں سے وہ اتاری گئی تھی۔ سکوں کو ناف سے لٹکتے ہوئے چھوٹے جھولے میں ڈال کر وہ ساز اٹھاتا اور نپے تلے قدموں سے یا کبھی کسی ہمدرد کی مدد سے وہ وہاں سے ہٹ کر اپنی نشست بدل لیا کرتا۔

دن بھر میں وہ مختلف جگہیں بدلتا اور جب سہ پہر ڈھلتی، تو وہ گھر کی راہ لیتا ــــ یہی اس کا روز کا معمول تھا ــــ!

شروع شروع میں جب وہ گاؤں سے شہر اپنی روزی کمانے جانے لگا تھا تو اسے دوسروں کے سہارے کی محتاجی ہوتی، کیوں کہ اس کے بغیر وہ ان نامانوس راہوں پر ایک قدم بھی نہ چل سکتا ــــ اس وقت لاشعور میں خوابیدہ اس کی خواہش بیدار ہو جاتی کہ کاش اس کی آنکھوں میں روشنی کی کوئی ایسی کرن سما جائے کہ وہ دوسروں کے رحم و کرم سے بے نیاز ہو کر اپنی راہ خود طے کر لیا کرے ــــ اس کی آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی لامتناہی ظلمت ــــ اف، یہ لامحدود بے کراں اندھیرے ــــ!

مگر اس کے لاشعور میں جس تمنا نے کروٹ لی تھی، اس کی تکمیل میں قدرت نے اسے روشنی کی کوئی کرن تو نہ عطا کی البتہ اس کی قوت حس میں ضرور اضافہ کر دیا اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جس طرح وہ اپنے گاؤں کی گلیوں اور راستوں سے واقف تھا اور بلا کسی سہارے کے جہاں چاہتا چلا جاتا، حتیٰ کہ گاؤں کا ہر گھر اس کے ذہن میں محفوظ تھا اور جب جس کے یہاں چاہتا، بے تکلف چلا جاتا، ٹھیک اسی طرح وہ شہر بھی بغیر کسی کے سہارے کے آنے جانے لگا تھا۔

گاؤں سے لے کر شہر کا نیا تا، راستہ اس کے قدموں تلے اس طرح محفوظ ہو گیا تھا جیسے اس کا ایک ایک ذرہ اس سے مانوس ہو ... ،

زمین کا دل جب پردہ گام زن ہوتا ہے اس طرح دھڑکتا ہے جیسے ازل سے وہ اس پر چلتا رہا ہے ـــــ اور ابد تک چلتا رہے گا ـــــ!

لیکن اس کے باوجود روشنی کی تمنا کو وہ اپنے شعور سے محو نہ کر سکا۔ اور کر بھی کیسے سکتا تھا جبکہ وہ اسی روشنی میں سانس لیتا، چلتا پھرتا اور اپنے ساز و نغمہ کی بزم کو اسی تنویر میں سجایا کرتا تھا جو اس کے چاروں طرف محیط تھی ـــــ!

اور اس کی یہ آرزو اس کے لاشعور کی نوزائیدہ نہیں، بلکہ برسوں پرانی تھی ـــــ اس نے اپنی ماں سے ہی تو سنا تھا کہ پیدا ہونے کے بعد اس کی آنکھوں میں روشنی تھی، نور تھا اور وہ کافی دنوں تک باقی رہا بھی، جبکہ وہ ہر چیز کا مشاہدہ کرتا تھا۔ اپنا کمرہ، اپنا گھر، اس کا کشادہ صحن، گھر کی تمام چیزوں کو وہ دیدے گھما گھما کر دیکھتا مگر چونکہ اس سن میں قدرت قوت نطق ودیعت نہیں کرتی) وہ مشاہدہ کی جانے والی چیزوں پر اظہار رائے سے قاصر تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب اس کی شفیق ماں اسے سلانے کے لیے راتوں کو اس کے گہوارہ کے پاس بیٹھ کر اسے حرکت دیتی رہتی زیر لب مسکراہٹ کے ساتھ کبھی اس کی پیشانی تو کبھی لب چومتی، جیسے کلی کو مسکرانا سکھلا رہی ہو۔ ایک ایک لفظ کہہ کر بولنا سکھاتی۔ آہستہ چلنے کے لیے اس کی ننھی سی انگلی پکڑ کر اسے پاؤں پاؤں چلنا سکھاتی۔ پیار سے چمٹا کر کہتی، ننھے ـــــ تیرا وجود در اصل میرے وجود ہی کا تو ایک حصہ ہے ـــــ! اور اس کے یہ الفاظ حقیقت میں ڈوبے ہوئے ہوتے۔

اور اس کی ماں نے سچ ہی تو کہا تھا کہ پیدا ہونے کے بعد اس کی آنکھوں میں نور تھا، بینائی تھی ـــــ اگرچہ وہ اس نعمت بے بہا سے اب محروم ہو گیا تھا مگر ماں کے تیکھے نقوش، اس کا شیریں تبسم، رنگ روپ، اس کا پیکر اس کے ذہن کے پردوں میں اب تک محفوظ تھے۔ یہاں تک کہ اس کے حافظہ میں وہ علامت بھی ہنوز تازہ تھی، ان کے چمپئی رخسار پر داہنی طرف وسط میں ایک سیاہ تل ہے ـــــ!

ایک بھیانک رات جب گھنگھور گھٹا ہر طرف چھائی ہوئی تھی، موسلا دھار بارش بڑے زور و شور سے کئی دنوں سے ہو رہی تھی، بادلوں کی گرج کے بعد بجلی کی کڑک جو تیز شعاع آتشیں اگلتی، پھر گھپ اندھیرا چھا جاتا، اس رات جانے کس طرح روشنی کی

بات چلی تو اس کی ماں نے رُندھے ہوئے گلے سے بتایا ... انکشاف کیا تھا کہ کبھی اس کی آنکھوں میں بھی روشنی تھی نور تھا ... مگر بچپن میں تیز بخار کے ساتھ چیچک کے شدید حملے نے اسے آدبوچا۔ خدا خدا کر کے کافی دنوں کے بعد بخار سے نجات ملی مگر قدرت کا وہ عطیہ جسے بینائی کہتے ہیں اس سے چھن گیا اور باوجود مسلسل دوڑ دھوپ، سعی و کاوش، علاج و معالجہ اس کے والدین لُٹے قدرت کا وہ عطیہ واپس نہ دلا سکے ـــــ اور یہ دل فریب دنیا اس کے لیے ایک گھٹا ٹوپ غار کے مانند ہو گئی!

جب وہ ذرا سن تمیز کو پہنچا تو اس کے والدین نے ایک شفیق استاد کی سپردگی میں اسے دیدیا جو اسے اپنی اولاد کی طرح پیار کرنے لگا اور اپنے فن کا سبق اسے دینا شروع کر دیا۔ رفتہ رفتہ لگن سے فن کی طرف اپنی تمام تر توجہ مبذول کرتے رہنے اور برسوں ریاض کرتے رہنے کے صلہ میں ایک وقت ایسا بھی آیا کہ وہ ایک اچھا فنکار بن گیا اور خود اس کے استاد نے اس کی تعریف و توصیف میں موتی رولنے شروع کر دیے ـــــ اب فن پر تجھے اتنی دسترس ہو گئی ہے کہ تیرے سامعین تیرا نغمہ و ساز سنکر سرشار ہو جائیں گے۔ اب پہلے کا سا زمانہ نہیں رہا ورنہ اپنے بعد تاریخ میں رودکی اور تان سین کی طرح اپنا نام چھوڑ جاتا۔ لیکن اس کے باوجود میری دعا ہے کہ تو کبھی بھوکا ننگا نہ رہے گا بلکہ چار کو کھلا کر خود کھائے گا ـــــ یہ تھے اس کے استاد کے الفاظ جو اس نے اس کے بارے میں کہے تھے ـــــ اور جواب میں حسن عقیدت کے طور پر اس کے دو زانو ہو کر اپنے استاد کے قدم چوم لیے تھے۔

فن پر اس درجہ دسترس حاصل کر لینے کے باوجود کبھی کبھی وہ راتوں کی تنہائیوں میں ساز اٹھا کر کسی غمگین دھن کی مشق کرنے لگتا اور اس طرح کئی غمگین نغموں کو اس نے محفوظ کر لیا تھا جنھیں وہ خاص خاص موقعوں پر یا فرمائش کیے جانے پر سنایا کرتا ورنہ زیادہ تر وہ ان سے احتراز کرتا کیونکہ ان نغمات کے بجانے کے بعد احساس نامرادی کا لاوا اس کے دل سے امنڈ کر پھوٹ پڑتا اور اس کے گرد و پیش محیط ہو کر اس کے وجود کو جلا کر خاکستر کر ڈالتا۔

ایک روز اپنی روزی کما کر وہ گاؤں واپس ہو رہا تھا اور

یہ کہہ کر وہ جھیل کی طرف سے کچھ ہی دور آیا تھا کہ ایک بچی کی آواز نے اسے اپنی جانب متوجہ کر لیا۔

"اپنے گاؤں ہی جا رہے ہو نا ــــ!"

"جی ہاں۔ گھر ہی جا رہا ہوں۔ ورنہ رات ہو جائے گی۔"

"نہیں نہیں۔ ابھی کافی دن ہے ــــ تم پسند کرو تو میرے ساتھ کوٹھی چلو۔ وہاں لوگ تمہارا گانا سنیں گے اور تمہیں بخشش دیں گے ــــ"

"کون کون ہے وہاں؟"

"ہاں جی، بچے اور بڑی بیٹیا، جو میوزک کالج میں پڑھاتی ہیں۔ آج کل چھٹیوں میں آئی ہوئی ہیں۔"

میوزک کالج کا نام سنتے ہی اسے اپنے فن کی عظمت کا احساس ہوا۔ وہ بولا:

"ضرور چلوں گا..... کتنی دور چلنا ہوگا ــــ؟"

"ارے یہ کیا، داہنے ہاتھ پر پیلی کوٹھی ہے۔ یہاں سے کوئی چار پانچ سو قدم ہوگی۔"

"واپسی پر آپ مجھے اسی جگہ لا کر چھوڑ دیں گے نا، تاکہ میں گاؤں کے راستے سے نہ بھٹک جاؤں؟"

"ہم تمھیں بٹیا کی موٹر میں گاؤں پہنچا دیں گے ــــ ہمارے یہاں دو موٹریں ہیں، ایک صاحب کی، دوسری بڑی بٹیا کی۔"

موٹر کی سواری کے خیال سے مسرت کی لہر اس کے چہرے پر دوڑ گئی۔ وہ بولا:

"اچھا تو چلیے۔"

دونوں ساتھ ساتھ چلتے باتیں کرتے پیلی کوٹھی پہنچ گئے۔ اندر لے جا کر اسے موٹے نرم قالین پر وسط میں بٹھا دیا گیا جو بڑے کمرے میں بچھا ہوا تھا اور جس کے چاروں طرف قیمتی صوفہ سیٹ لگے ہوئے تھے اور آرائش کی دوسری چیزیں قرینے سے سجی ہوئی تھیں۔ نرم و گداز قالین پر بیٹھتے ہی مختلف قسم کے خیالات اس کے دماغ میں چکر لگانے لگے۔ وہ ابھی انہی خیالوں میں گم تھا کہ ایک سریلی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔ ابھی تک یاد ہے ایسی مترنم ادا سے آج تک کسی نے مخاطب نہیں کیا تھا۔

"سنا ہے تم بہت خوش گلو ہو..... اور ساز بھی اچھا بجاتے ہو!"

"آپ کی ذرہ نوازی ہے ورنہ میں.....؟"

"ہمیں اس وقت کچھ سناؤ گے ــــ؟"

"ضرور ــــ"

"تو پھر سناؤ ــــ!"

"جو فرمایئے وہ سناؤں ــــ!"

"تم اپنی من پسند کوئی چیز ــــ"

بہت اچھا کہہ کر اس نے ساز کے تاروں کو جنبش دی اور ابھی یہ طے نہ کر پایا تھا کہ کون سی دھن نکالے کہ یکایک اس کی انگلیاں غیر ارادی طور پر اس کی پسندیدہ دھنوں میں سے ایک پر بے اختیار پھسلنے لگیں..... یہ وہ دھن تھی جسے وہ خوابوں کی پری کے تصور کو دل میں بسا کر بجایا کرتا تھا۔ ایک انداز میں اس کی انگلیاں تاروں پر مچلتی رہیں، تھرکتی رہیں، بہاروں کے شگوفے چٹکتے رہے، مسکراتے رہے۔ لالہ کے پھول کھلتے اور وجد میں آتے رہے۔ لطیف و خنک ہوا کے ہلکے ہلکے تھپیڑوں سے گلشن ہائے دیار مہکتا چلا گیا۔ ظلمتیں دور ہوتی گئیں اور اجالا پھیلتا گیا، دنیا رنگین سے رنگین تر ہوتی چلی گئی جس میں پریوں کی شہزادی مقام بلند و بالا پر جلوہ فگن اس کا نغمہ سنتی رہی ــــ!

بڑی دیر تک ساز نغمہ بار رہا ــــ کائنات ساکت رہی، دنیا کا وجود نغمہ و ساز میں سمٹ کر مرکوز ہو گیا ــــ آج سچ مچ جیسے فنکار کی انگلیاں جادو جگا رہی تھیں، ساز کا سینہ نافۂ مشک کی طرح چاک ہو گیا تھا اور اس کی مہک چاروں طرف بکھر رہی تھی ــــ!

نغمہ کے ختم ہونے پر ایک ہاتھ اس کی طرف بڑھا جس میں سرسراتے ہوئے چند نوٹ تھے جو اس کی ہتھیلی میں منتقل ہو رہے تھے۔ ساتھ ہی وہی مترنم آواز پھر اس نے سنی جو کچھ دیر پہلے سن چکا تھا۔

"ہم سبھوں کو تمہارا گانا بہت پسند آیا ــــ کبھی کبھی ادھر ہو لیا کرو۔ اچھا!"

"جب یاد فرمایئے گا، حاضر ہو جاؤں گا۔"

گھر پہنچ کر ساز کو اس کی جگہ اس نے لٹکا دیا۔ ماں کو نوٹوں والی ہتھیلی سونپی اور نوٹوں کو لے کر ایک دوست کے گھر پہنچا۔ ایک کاغذ پر کچھ لکھوایا، نوٹوں سمیت ایک منقش ڈبہ میں رکھ کر اسے سرخ

(باقی صفحہ ۴۸ پر)

حسنِ نظر

[نیا دور بابت اگست ۱۹۷۲ء (آزادی نمبر) کے بارے میں قارئین نیا دور نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان میں چند درج ذیل ہیں ——— ایڈیٹر]

پروفیسر ہارون خاں شیروانی ——— حیدرآباد

نیا دور کا آزادی نمبر ملا۔ خوب صورتی اور خوب سیرتی دونوں میں یکتا ہے۔ مضامین کے تنوع، مضمون نگاروں کی شخصیت اور حیثیت، رسالے کی ضخامت اور ادارت کی یکجائی یہ سب دل کی کشش کا باعث ہیں۔ ٹیپ ایک چیز ایسی ہے جو مجھ جیسے پیرانہ سال ناظرین کے لیے دقت کا باعث ہوگی، اور وہ رنگین طباعت ہے۔

عرش ملسیانی ——— دہلی

آپ کا اگست کا شمارہ ہمیشہ قابل رشک ہوتا ہے اور اس بار تو بڑے اچھے اچھے مضامین اور منظومات آپ نے جمع کر ڈالے۔ ہر لحاظ سے آزادی کی پچیسویں سال گرہ کی شان کے شایان ہے۔ اتر پردیش میں اس اچھے شمارے کو دیکھ کر اور وہ بھی حکومت کے گھر سے بڑی خوشی ہوئی۔

ساغر نظامی ——— نئی دہلی

خاص نمبر ملا شکریہ، نہایت شان دار ہے۔ مطالعہ کے بعد رائے بھی دوں گا۔

نشور واحدی ——— کانپور

آزادی نمبر آپ کی محنت، خلوص اور کمال سلیقہ مندی کا آئینہ دار

ظہور رضوی ——— فرخ آباد

اس عظیم اشاعت کی افادیت، ترتیب و تحسین کی بے پناہ سلیقہ مندی اور مضامین و منظومات میں فکری صلاحیتیں اور ادبی رعنتیں لائق صد مبارکباد ہیں۔ بلاشبہ یہ سب آپ کے ذوق سلیم اور کاوش فکر و نظر کا نتیجہ ہے۔ یقینی واثق ہے کہ یہ ادبی شاہکار نہ صرف آزادی کے پچیس سال پر مفید ترین معلومات کی باقی رہنے والی یادگار ثابت ہوگا بلکہ اس دور کے ادبی جائزوں کے صحت گراں قدر میں شمار کیا جائے گا اور نیا دور آپ کی ادارت اور نگرانی میں یوں ہی ترقی کی بلند ترین حدوں تک پہنچ کر علم و ادب کے لیے سرمایۂ افتخار رہے گا۔

شوکت پردیسی ——— جونپور

نیا دور کو پڑھ کر دلی مسرت ہوتی ہے۔ آپ اپنی عہد میں اردو ادب کی جو خاموش خدمت کر رہے ہیں وہ نہ صرف لائق ستائش ہے بلکہ اردو ادب کے لیے باعث فخر ہے۔ بلاشبہ اردو ادب میں نیا دور کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے اور یہ نیا دور کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

اظہر انسر ——— حیدرآباد

آزادی کی پچیسویں سال گرہ کا اسپیشل نمبر نیا دور ملا۔ آزادی پر نظمیں اور تصاویر خوب ہیں۔ مضامین میں آزادی اور اردو شاعری، آزادی میں تحقیق، ضبط شدہ مطبوعات، اردو نا ول اور آزادی کے پچیس سال لاجواب ہیں۔ اس قدر کم مدت میں ایسے شاندار نمبر کے اجرا پر میری جانب سے دلی مبارک باد قبول کیجیے۔

جگدیشور ناتھ وما آپ ——— بریلی

آپ کا خاص نمبر یقیناً بعض دیگر اشاعتوں پر فوقیت رکھتا ہے اور خاصا کامیاب ہے۔ مبارک!

بی بیگم ——— جنرل سکریٹری پبلک لائبریری بودھا (بہرائچ)

آزادی نمبر جس حسن و خوبی سے شایع ہوا، وہ آپ کی اعلیٰ ادبی صلاحیت اور تخلیقی حس کا روشن ثبوت ہے۔ آپ کی کامرانی اور نیا دور کی حیات دوام کی نیک خواہشات عرض ہیں۔ اپنی جانب سے لائبریری کے ممبران اور قارئین کی جانب سے شکریہ اور مبارک باد پیش ہے۔

حسن مقصود صاحب ——— فرینڈس لائبریری، بھاگل پور

نیا دور کا اسپیشل نمبر ٹھیک ۱۵ اگست کو ملا جس سے ۱۵ اگست کی خوشیاں دوبالا ہو گئیں۔ واقعی آپ نے بڑا ہی خوبصورت پرچہ بنا کر شایع کیا۔ طبیعت خوش ہو گئی۔ غالباً اس سے قبل نیا دور کا کوئی بھی شمارہ اتنا خوبصورت شایع نہیں ہوا۔ میری طرف سے نیز لائبریری کے کل ممبران کی طرف سے ہدیۂ مبارک باد قبول فرمائیے۔



اترپردیش میں

ترقیوں اور سرگرمیوں کی رفتار

ایک خوش و خرم قوم آج اپنی آزادی کی ۲۵ ویں سال گرہ منا رہی ہے۔ ہندستانی عوام نے ۱۹۴۷ء[1] میں ۱۵ اگست کو مہاتما گاندھی کی قیادت میں ایسے ذرائع سے جن کا استعمال اس سے پہلے تاریخ میں کبھی نہیں کیا گیا تھا عہد حاضر کی عظیم ترین سامراجی طاقت سے اپنی تقدیر کے خدوخال مرتب کرنے کا حق چھین لیا تھا۔ انگریز تو چلے گئے لیکن ہمارے لیے ایک کرم خوردہ سماجی نظام اور ایک فرسودہ اور انحطاط پذیر معاشی نظام چھوڑ گئے۔ ہمیں اپنے سماجی اور معاشی نظام کی نو تعمیر کرنے کے لیے کوئی راستہ بتانے والا نہ تھا۔ چنانچہ ہمیں ابتدا ہی سے ٹٹول ٹٹول کر خود اپنا راستہ تلاش کرنا پڑا لیکن ہماری مستعدی اور خلوص کے باعث بتدریج ہماری رفتار تیز ہوتی گئی اور اب ہم نے ایک طویل فاصلہ طے کر لیا ہے۔ ایک ملک جو صرف ۲۵ سال قبل نیم بیماری اور غلامی کی حالت میں تھا اور قسمت کا تابع تھا، آج بامقصد اور تعمیری سرگرمیوں کا گہوارہ ہے اور بے انصافیوں سے پاک ایک خوش حال اور مستحکم سوشلسٹ سماج کی تشکیل کرنے کا قطعی اور مصمم عزم کر چکا ہے۔

آزادی کا پچیسواں ۲۵ سال

- عام آدمی کی زندگی میں انقلاب
- اصلاحات آراضی کے اقدامات
- ریاست کے آبپاشی کے وسائل کی صلاحیت کے دوگنی ہو جانے
- غلہ کے معاملے میں خودکفالتی
- بجلی میں دس گنا اضافے
- صنعتوں کی تیز رفتار ترقی
- ہریجنوں کے لیے امید کے نئے دور
- ابتدائی تعلیم کے فروغ کا سال رہا

اترپردیش میں آزادی کی بنیاد مستحکم ہو چکی ہے اور اب ایسا نظام تیزی سے وجود میں آ رہا ہے جو صرف چند مراعات یافتہ طبقوں کی نہیں بلکہ غریب اور سہولتوں سے محروم طبقوں کی ضرورتوں، تمناؤں، امنگوں اور ولولوں کو پورا کر سکے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ آبادی میں زبردست اضافہ ترقی کے فوائد کو بے اثر بنا دیتا ہے۔ عام آدمی کی زندگی میں انقلاب لانے اور اس کا معیار زندگی بلند کرنے کے سلسلے میں ناقابل تردید ثبوت موجود ہے کہ ہریجنوں اور دیگر پسماندہ طبقوں کو جن کی سماج میں کوئی قدر و منزلت نہ تھی، اب اس قابل بنایا جا رہا ہے کہ وہ قومی ترقی کے عام دھارے میں مل سکیں۔

[1] ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء

اصلاحات آراضی کے سلسلے میں اتر پردیش نے جو پہلا بڑا قدم اٹھایا وہ زمینداری نظام کو ختم کرنا اور زمین پر کسانوں کی ملکیت قائم کرنا تھا جس کے نتیجے میں کاشتکار اور حکومت کے درمیان براہ راست رابطہ قائم ہوگیا۔ زمین جوتنے بونے والے شخص کو زمین پر حق ملکیت دے کے خواہ وہ اصل کاشتکار رہا ہو یا شکمی کاشتکار حکومت نے زراعتی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لیے تحریک پیدا کی۔ اس ایکٹ کے تحت تقریباً ۱۱۵ لاکھ ایکڑ غیر مزروعہ آراضی حاصل ہوئی جو مختلف اداروں اور بے زمین افراد میں تقسیم کردی گئی۔ چونکہ اس کے بعد بھی بڑی بڑی جوتیں سابق درمیانی اشخاص اور کمپنیوں کے قبضے میں رہیں لہذا ۴۰ ایکڑ کی انتہائی حد مقرر کردی گئی اور حاصل رقبہ مختلف زمروں کے بے زمین افراد میں تقسیم کردی گئی اور اس سلسلے میں ہریجنوں کو اولیت دی گئی۔ بدلے ہوئے سماجی اور سیاسی حالات میں ۴۰ ایکڑ کی انتہائی حد کو بھی زیادہ تصور کیا گیا چنانچہ اب زمین کی انتہائی حد گھٹا کر ۱۸ ایکڑ کرنے کے لیے ایک نیا بل پیش کیا گیا ہے۔ مجوزہ تبدیلی کے نتیجے میں تقسیم کے لیے مجموعی طور پر مزید تین لاکھ ایکڑ آراضی کی دستیابی متوقع ہے۔ اصلاحات آراضی کے سلسلے میں دوسرا اہم قدم جوتوں کی چک بندی ہے۔ منتشر جوتوں کو ایک مقام پر یکجا کر دینے سے کسان اپنے وسائل اور محنت کا بہتر استعمال کر سکتے ہیں اور زیادہ منفعت حاصل کر سکتے ہیں۔

کاشتکاروں کو ناسازگار قدرتی حالات سے محفوظ رکھنے اور پہاڑی علاقوں، بندیلکھنڈ اور مشرقی اضلاع جیسے پسماندہ اور نیم ترقی یافتہ علاقوں کو آب پاشی کے لیے پانی مہیا کرنے کے سلسلے میں جہاں اس کی بے حد کمی ہے، بڑی درمیانی اور چھوٹی آب پاشی کی اسکیموں پر ۱۳۳۱٫۶۸ کروڑ روپے کی رقم خرچ کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں نہروں کی لمبائی ۲۰۰۸۷ کلو میٹر سے بڑھ کر ۴۸۲۳۰ کلو میٹر اور سرکاری ٹیوب ویلوں کی تعداد ۵۰۰ سے بڑھ کر ۱۱۲۳۰ ہو گئی۔ اس کے نتیجے میں آب پاشی کے سرکاری وسائل کی صلاحیت ۲۷٫۵ لاکھ ہیکٹر سے بڑھ کر ۵۹٫۵ لاکھ ہیکٹر ہو گئی اور واقعی آب پاشی شدہ رقبہ ۴۲ لاکھ ہیکٹر سے بڑھ کر ۸۱٫۴۸ لاکھ ہیکٹر ہو گیا۔ ایک آب پاشی کمیشن بھی قائم کیا گیا ہے جو علاوہ دیگر امور کے کسانوں کو آب پاشی کی زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرنے کے سلسلے میں اقدامات کا مشورہ دے گا۔

مختلف اقدامات کے نتیجے میں گزشتہ ۲۵ سال کے دوران زراعتی پیداوار دوگنی ہو گئی۔ ان اقدامات میں اصلاحات آراضی، آب پاشی کی سہولتوں کی توسیع، زراعتی ضروریات کی بروقت اور یقینی فراہمی، زیادہ پیداوار والی اقسام کی کاشت، زراعتی آلات کی کرایہ پر فراہمی، ان کی مرمت کے لیے خدمتی مراکز کا قیام اور زمین تحفظ سے متعلق اسکیمیں شامل ہیں۔ گیہوں کی پیداوار ۲۳٫۱۵ لاکھ ٹن سے بڑھ کر تین گنی اور چاول کی پیداوار ۲۰٫۷۱ لاکھ ٹن سے بڑھ کر ۳۶٫۰۵ لاکھ ٹن ہو گئی۔ گنے کی پیداوار گڑ کی شکل میں ۴۲٫۴۸ لاکھ ٹن سے بڑھ کر ۵۴٫۶۷ لاکھ ٹن ہو گئی جبکہ مکئی اور باجرہ کی پیداوار بالترتیب ۷٫۶۵ لاکھ ٹن سے ۱۷٫۹۶ لاکھ ٹن اور ۴٫۷۶ لاکھ ٹن سے بڑھ کر ۸٫۸۲ لاکھ ٹن ہو گئی۔

بجلی کو جو زراعتی اور صنعتی پیداوار کے لیے اشد ضروری ہے، سب سے زیادہ اولیت دی گئی ہے۔ متعدد بجلی گھر قائم کیے گئے ہیں جس کے نتیجے میں بجلی کی پیداواری صلاحیت ۱۵۷ میگاواٹ سے بڑھ کر ۱۵۷۴ میگاواٹ ہو گئی ہے۔ بجلی کی ترسیلی لائنوں کی لمبائی ۲۳۶۰۰ سرکٹ کلو میٹر سے بڑھ کر ایک لاکھ سرکٹ کلو میٹر سے زیادہ ہو گئی جب کہ بستیوں، ٹیوب ویلوں اور پمپ سیٹوں کو بجلی کی فراہمی میں ۱۶ گنا اضافہ ہوا ہے۔ متعدد پراجیکٹوں کی تکمیل کے نتیجے میں، جن کے لیے یا تو مرکزی حکومت نے منظوری دے دی ہے یا جو منظوری کے مرحلے میں ہیں، امید کی جاتی ہے کہ ریاست کی بجلی پیدا کرنے کی صلاحیت ۲۵۲۰ میگاواٹ ہو جائے گی۔

صنعتی ترقی کی رفتار تیز رہی ہے۔ آزادی کے بعد سے ۴۶۰٫۵۰ کروڑ روپے سے زیادہ کی سرمایہ کاری سے بڑے اور درمیانہ پیمانہ کے ۴۴ صنعتی واحدوں کا قیام عمل میں آیا اور ۱۸۱٫۴۹ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کے ۶۷ لائسنسوں پر عمل درآمد کیا جا رہا ہے۔ نجی زمرہ میں رجسٹرڈ صنعتی واحدوں کی تعداد جن میں بڑے درمیانہ اور چھوٹے پیمانہ کے واحدے شامل ہیں جو سنہ ۱۹۵۰ء میں ۱۱۳۷ تھی سنہ ۱۹

میں انجمنوں ۲۰۰ ہوگئی۔ ریاستی حکومت نے ۱۹۵۰-۵۱ء اور ۱۹۷۰-۷۱ء کے درمیان مجموعی طور پر ۱۱۷ء۰۵ کروڑ روپے کی رقم خرچ کی جس میں بڑی اور درمیانہ صنعتوں پر ۲۸ء۱۱۲ کروڑ روپے اور چھوٹی صنعتوں پر ۱۰ء۲۹ کروڑ روپیہ خرچ کیا گیا۔ مرکزی زمرہ میں ۱۹۷۰-۷۱ء کے آخر تک کل ۲۷۸ء۱۹ کروڑ روپے کی سرمایہ کاری کی گئی۔ ریاست کی برآمدات جو ۱۹۶۱ء میں ۳۸ء۲۸ کروڑ روپے کی مالیت کی تھیں ۱۹۷۰-۷۱ء میں بڑھ کر ۴۰ء۷۰ کروڑ روپے ہوگئیں۔

حصول آزادی کے بعد ہریجنوں اور دیگر پسماندہ طبقوں کے لیے امید کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ ریاستی حکومت نے مہاتما گاندھی کی مہم کو آگے بڑھاتے ہوئے ان کی ترقی اور سماج میں ان کو جائز مقام دلانے کے لیے ایک پروگرام شروع کیا۔ چھوت چھات برتنے والے اشخاص کے خلاف پولیس کو قانونی کارروائی کرنے کا اختیار دینے کے لیے قانون وضع کیا گیا۔ تب سے تعلیم اور دیگر فلاحی پروگراموں پر کئی کروڑ روپے کی رقم خرچ کی جا چکی ہے اور اس سلسلے میں مالیاتی سال رواں کے دوران ۴ء۴ کروڑ روپے خرچ کرنے کی تجویز ہے۔ ہریجن بستیوں کو پینے کے پانی اور بجلی کی سہولتیں فراہم کرنے پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ آزادی کے ۲۵ویں سال کے دوران ہر ضلع میں روزانہ ایک بستی کو بجلی فراہم کرنے کی تجویز ہے۔ ہریجنوں کو ان کی بستیوں کے قریب تعمیر شدہ ٹیوب ویلوں سے مفت پانی فراہم کیا جائے گا۔ اقوام وقبائل مندرجہ فہرست کے افراد کو ان کی بستیوں اور مکانات کی تعمیر کے لیے زمین محفوظ کرنے کے واسطے خاتمہ زمینداری ایکٹ میں ترمیم کی گئی ہے۔ رہائشی ضروریات کا جائزہ لینے بستیوں کے لیے گاؤں سبھا کی زمین اور سرکاری زمین کی دستیابی اور زمین حاصل کرنے کے سلسلے میں ایک سروے شروع کیا گیا ہے۔ آج سے ایک مہم شروع کی جائے گی جس کے تحت ہر ترقیاتی بلاک میں کم سے کم دس مواضعات میں ہریجنوں اور دیگر پسماندہ طبقوں کو مکانات کی تعمیر کے لیے مفت جگہیں الاٹ کی جائیں گی۔

منصوبہ بندی

ریاست میں منظم معاشی ترقی کا دور اپریل ۱۹۵۱ء میں شروع ہوا جب پہلا پنج سالہ منصوبہ شروع کیا گیا۔ اس کے بعد دوسرے تیسرے اور چوتھے پنج سالہ منصوبے اور تین سالانہ منصوبے شروع کیے گئے۔ پہلے پنج سالہ منصوبہ کے لیے ۱۵۳ء۴۷ کروڑ روپے کے مصارف کا بندوبست کیا گیا تھا۔ ریاست میں ۱۹۶۶-۶۷ء، ۱۹۶۷-۶۸ء اور ۱۹۶۸-۶۹ء کے سالانہ منصوبوں پر بالترتیب ۱۵۰ء۹۵ کروڑ روپیہ، ۱۵۱ء۲۳ کروڑ روپیہ اور ۱۴۹ء۳۹ کروڑ روپیہ کی سرمایہ کاری کی گئی۔ چوتھے پنج سالہ منصوبہ کے تخمینی مصارف ۹۶۵ کروڑ روپے کے ہیں۔

منصوبہ بندی کے فوائد کا اندازہ فی کس آمدنی، ریاستی آمدنی، فی کس پیداوار میں اضافہ اور تعلیم، تکنیکی ٹریننگ، صحت اور دیگر شعبوں میں بچت، سرمایہ کاری اور اصلاح سے لگایا جا سکتا ہے۔

ریاست کی آبادی ۱۹۵۱ء میں جب اس کی منصوبہ بندی کے دور کا آغاز ہوا، ۶ء۳۲ کروڑ تھی جو ۱۹۷۱ء میں بڑھ کر ۸ء۸۳ کروڑ ہوگئی۔ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ چھٹے منصوبہ کے اختتام تک ریاست کی آبادی ۹ء۱۳ کروڑ تخمینہ تک پہنچ جائے گی۔ آبادی میں اس اضافہ کی روک تھام کے لیے اترپردیش میں ۱۹۶۳ء میں خاندانی منصوبہ بندی پروگرام شروع کیا گیا اور اس کے اثرات چوتھے منصوبے تک محسوس کیے جانے لگے جب منصوبہ کے پہلے دو برسوں کے دوران معاشی ترقی کی شرح ۴ء۹ فی صد ہوگئی جبکہ آبادی کی شرح ۱ء۸ فی صد تھی۔ ریاستی آمدنی بھی جو ۱۹۶۰-۶۱ء میں ۱۷۹۹ کروڑ روپیہ تھی ۱۹۶۹-۷۰ء میں ۴۵۲۳ کروڑ روپیہ ہوگئی۔ اسی مدت کے دوران ریاست میں فی کس آمدنی ۲۴۶ روپیہ سے بڑھ کر ۵۱۵ روپیہ ہوگئی۔

منصوبہ بندی کو اور زیادہ موثر اور مفید بنانے کے لیے مسلسل کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اس مقصد کے پیش نظر وزیر اعلیٰ کی صدارت میں ایک اعلیٰ اختیاری ریاستی منصوبہ بندی کمیشن قائم کیا جا رہا ہے۔ بہتر منصوبہ سازی اور جائزہ کے لیے ادارۂ منصوبہ بندی تحقیق وعمل نظامت جائزہ اور معاشیات وشماریات نظامت کو ریاستی منصوبہ بندی ادارہ میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اب تک ۵۲ اسکیموں

اور پراجیکٹوں کا جائزہ لینے کا کام مکمل ہو گیا ہے اور اب یہ کام جاری ہے۔

اب ریاست کے پانچویں منصوبہ کی تشکیل کے لیے کام جاری ہے۔ منصوبہ بندی کی لامرکزیت کے ذریعہ ریاست میں معاشی ترقی کی رفتار تیز تر ہو جائے گی۔ وزیر اعلیٰ خود وقتاً فوقتاً اسکیموں کی رفتار ترقی کا جائزہ لیں گے۔ ہر ضلع کو ایک وزیر کی نگرانی میں دے دیا گیا ہے جو اس کی مجموعی ترقی کے لیے ذمہ دار ہوگا۔

× × ×

ریاستی حکومت نے مستقبل میں پھر خشک سالی کے حالات پیدا ہونے کی صورت میں قحط سے مستقل تحفظ کے پیش نظر ۱۵۴ کروڑ روپے کی لاگت کی اسکیمیں اور دیہی علاقوں میں بڑے پیمانے پر روزگار کے مواقع فراہم کرنے کے لیے ۱۵ کروڑ روپے کی لاگت کی اسکیمیں ایک مرکزی ٹیم کے سامنے پیش کی ہیں جس نے حال ہی میں لکھنؤ کا دورہ کیا تھا۔

مرکزی وزیر زراعت شری فخر الدین علی احمد کے زیر قیادت مرکزی ٹیم کو بات چیت کے دوران جو اتوار کو ہوئی خشک سالی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی سنگین صورت حال سے باخبر کیا گیا اور خشک سالی کے اندیشہ کا مستقل طور سے سدباب کرنے کے لیے اسکیمیں شروع کرنے کی فوری ضرورت پر زور دیا گیا۔ ٹیم کے ممبران سے کچھ اضلاع میں پینے کے پانی کی قلت اور ریاست کے بڑے علاقوں میں ہیضہ اور چیچک کے پھیلنے کا بھی ذکر کیا گیا۔

ان اسکیموں میں جن پر ۱۵۴ کروڑ روپے کی لاگت آئے گی فرخ آباد کے قریب گنگا ندی کے کنارے ایک باندھ اور لوور گنگا نہر کی کانپور شاخ کو ملانے کے لیے ایک ۲۰ میل لمبی معاون نہر کی تعمیر نرورا باندھ سے خریف کی فصلوں کی آب پاشی کے لیے پانی فراہم کرنے کے واسطے مزید ۵۰۰ کیوسکس پانی کے اخراج کے لیے خاص لوور گنگا نہر کے متوازی نہر کی تعمیر راپتی ندی پر سکٹریب گھاٹ کے کنارے ایک باندھ کی تعمیر، ضلع مرزاپور میں سون ندی سے پانی اٹھا کر آب پاشی کا بندوبست اور شاردا سہایک پروجیکٹ کے کام کی رفتار تیز کرنا شامل ہیں۔

ان اسکیموں کے تحت عام پروگراموں کے علاوہ ۳۰ کروڑ روپے کی لاگت سے ۲۰۰۰ ریاستی ٹیوب ویلوں کی تنصیب بھی شامل ہے۔

یہ اسکیمیں ۲۱ لاکھ ایکڑ کے لیے آب پاشی کی سہولتیں مہیا کر کے نہ صرف آئندہ ربیع کے لیے مفید ہوں گی بلکہ مستقبل میں خشک سالی کے حالات کا مقابلہ کرنے کے سلسلہ میں بھی معاون ہوں گی۔

اس سلسلہ میں باقی سال رواں کے دوران کام شروع کرنے کے لیے ۷۵ کروڑ روپے کی رقم درکار ہوگی۔

پینے کے پانی کی فراہمی سے متعلق ۱۶ کروڑ روپے کی لاگت کی اسکیموں کا مقصد ان ۴۴ اسکیموں کو بروئے کار لانا ہے جو مرزاپور۔ الٰہ آباد۔ جھانسی۔ جالون اور ہمیرپور اضلاع کے ۱۵۰۰ مواضعات کا احاطہ کرتی ہیں۔ قلت زدہ علاقوں میں کنوؤں کی تعمیر کے لیے بھی دو کروڑ روپے کی رقم درکار ہے۔

دیہی علاقوں میں روزگار فراہم کرنے کے لیے امدادی کام شروع کرنے کے واسطے دس کروڑ روپے اور محکمہ تعمیرات عامہ کے ذریعے کاموں کو پورا کرنے کے لیے پانچ کروڑ روپے کی رقم کا بھی مطالبہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ اس پروگرام میں مزید دس اضلاع کو شامل کرنے کی بھی درخواست کی گئی جو مرکزی حکومت نے اکثر خشک سالی سے متاثر ہونے والے علاقوں کے لیے شروع کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ان اضلاع کے لیے ۲۰ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کرنے کی درخواست بھی کی گئی۔

ہیضہ اور چیچک کی روک تھام کے لیے بڑے پیمانے پر ٹیکے لگانے کی مہمیں شروع کرنے کے لیے ۱۳۱ء۲ کروڑ روپے کی رقم کی ضرورت ہوگی۔

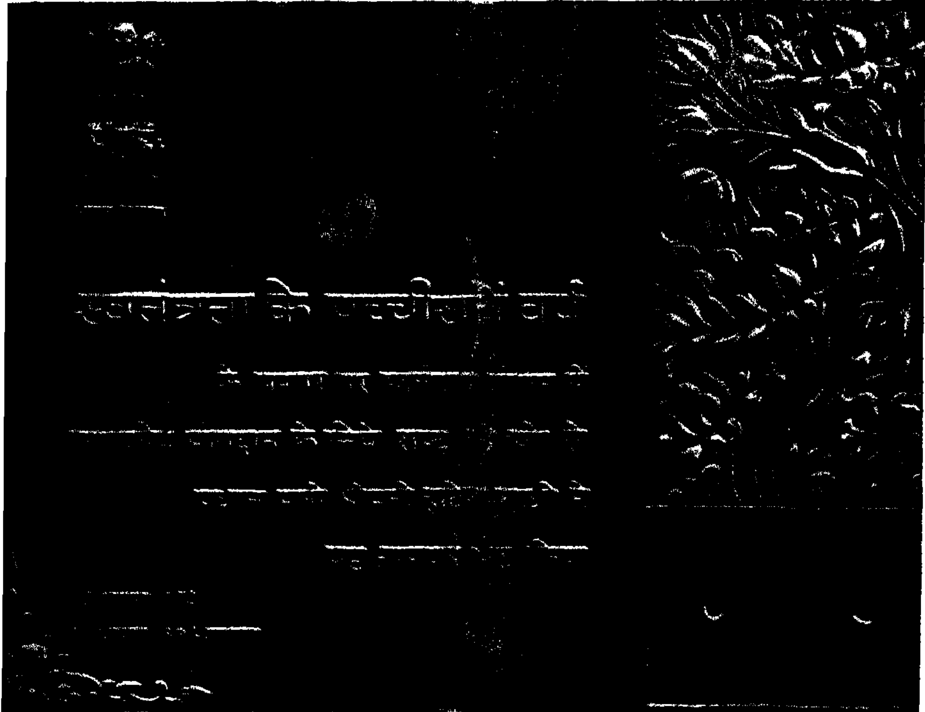
فن عمارت کا منزل مقصد —— (صفحہ ۴۲ کا بقیہ)

فیتہ سے باندھا اور اسی کے ہاتھ منڈپ میں بھجوا دیا جو اس دن ماڈل اسکول کی داغ بیل ڈالے جانے کی افتتاحی رسم ادا کیے جانے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔

معزز حاضرین کے سامنے ماڈل اسکول کی پرنسپل نے ڈبہ کھولی تو اس میں سے دس دس کے پانچ نوٹ نکلے جن کے گرد لپٹے ہوئے کاغذ پر لکھا ہوا تھا ... "فنکار کا نذرانہ"

★

Regd No L 319



اس تامر پتر کی فوٹو کاپی جو وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ۱۵ اگست ۱۹۷۲ء کو نئی دہلی میں مجاہدین آزادی کو دیے



عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اترپردیش ان سے بہرحال متفق ہو



جلد ۲۸ | نمبر ۷

اکتوبر ۱۹۷۲ء

آشون ۱۸۹۴ شک

چندہ سالانہ پانچ روپے۔

فی پرچہ پچاس پیسے

ایڈیٹر

خورشید احمد

پبلشر

شرومنی شرما

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

پرنٹر

اشوک در

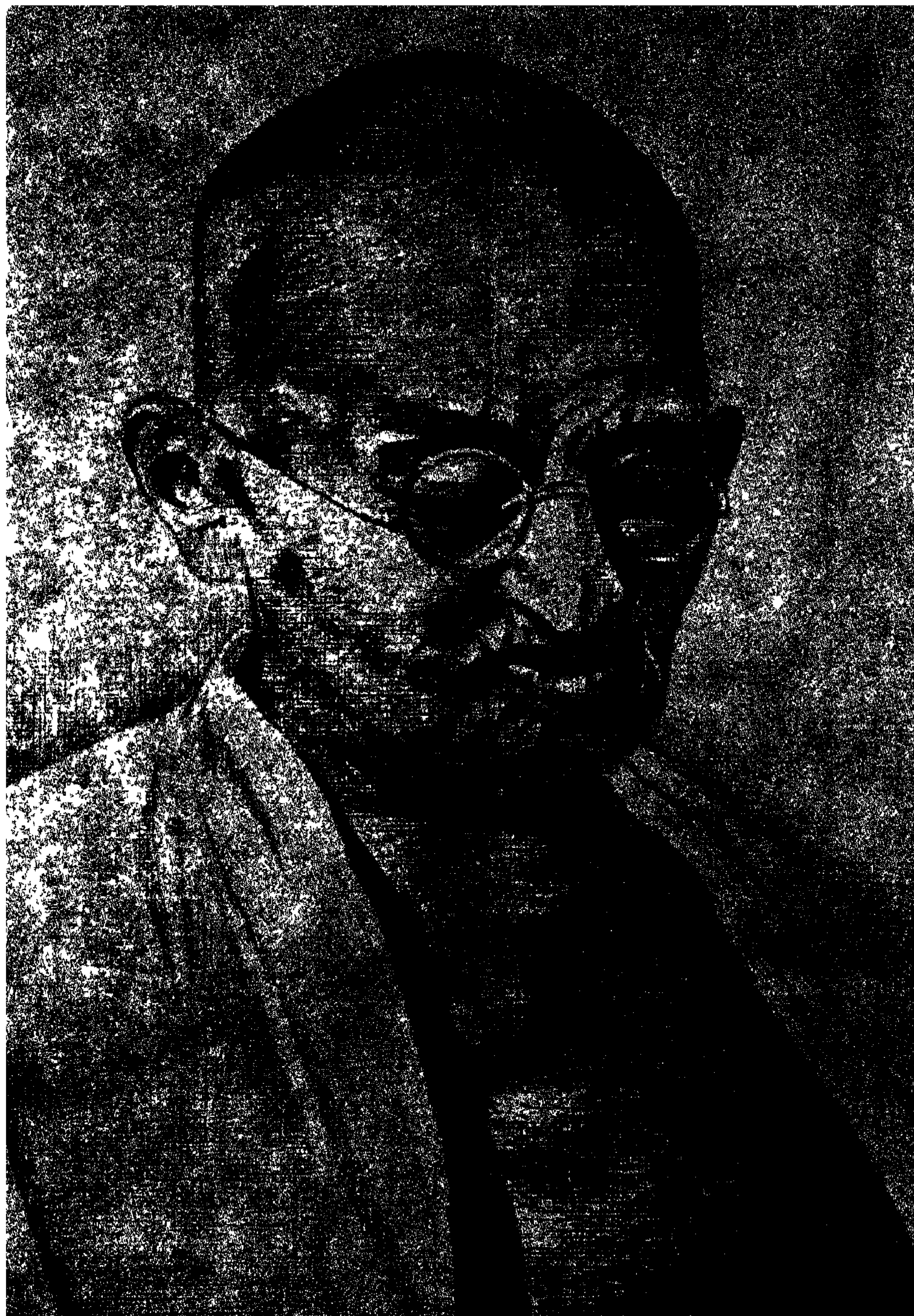
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری۔ یو۔پی

مطبوعہ

نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ

محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش



اپنی بات

قوموں کی زندگی میں کوئی نہ کوئی تاریخ اپنی غیر معمولی اہمیت اور خصوصیت کے باعث قومی تہوار کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ ہندوستان میں یومِ آزادی ۱۵ اگست، یومِ استقلالِ جمہوریہ ۲۶ جنوری کے ساتھ ساتھ ۲ اکتوبر کو بھی قومی دن ہونے کا مرتبہ حاصل ہے۔ اس دن وہ جلیل القدر ہستی پیدا ہوئی تھی جو نہ صرف تمام ہندوستانیوں کی نجات دہندہ تھی بلکہ ایسے صفات کی مالک، ایسے افکار و خیالات کی حامل اور ایسے طریقۂ کار پر عامل تھی جن کے باعث وہ سیاسی رہنماؤں اور سماجی مصلحوں میں منفرد نظر آتی ہے۔ مہاتما گاندھی کے بارے میں اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور ابھی بہت کچھ لکھا جائے گا، اس لیے کہ بقول مرحوم صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین "گاندھی جی کی تعلیمات اُس وقت کے لیے نہایت مناسب اور قابلِ قبول تھیں لیکن ان میں ایک دنیا فلسفۂ زندگی بھی ہے جو ہر زمانے اور ہر قسم کے حالات کے لیے باموقع اور حسبِ حال ہے۔" (مہاتما گاندھی کا پیغام، مولفہ ایس موہن راؤ)

انسانیت کے لیے مہاتما گاندھی کی سب سے بڑی دین اہنسا اور عدم تشدد کا فلسفہ ہے جو آفاقی ہے۔ اس میں نہ زمان کی قید ہے، نہ مکان کی، نہ رنگ و نسل کی قید ہے نہ مذہب و فرقے کی۔ یہ ہر زمانے، ہر جگہ اور ہر مذہب و ملت کے لیے یکساں طور پر درست اور زندگی اور اس کے مسائل کے حل کا کامیاب اور موثر ذریعہ ہے۔ یہی وہ انوکھا ہتھیار تھا جس کی مدد سے انھوں نے برطانیہ جیسی طاقت ور سلطنت کو جھکنے اور ہندوستان کو آزادی دینے پر مجبور کر دیا۔ اہنسا کے بارے میں گاندھی جی کا قول تھا کہ وہ "ایک کامل نصب العین ہے۔ تمام بنی نوعِ انسان اسی واحد مقصد کی جانب فطرتاً لیکن غیر شعوری طور پر رواں دواں ہے۔" اس کی وضاحت کرتے ہوئے اور اس کے ارتقا پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے ایک جگہ کہا کہ "اگر ہم قدیم زمانے سے موجودہ زمانے کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ انسان نے بتدریج اہنسا کی طرف قدم بڑھایا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ ہمارے آبا و اجداد آدم خور تھے۔ اس کے بعد وہ آدم خوری سے تنگ آگئے اور انھوں نے شکار پر گزر بسر شروع کی۔ پھر ایک منزل وہ آئی کہ انسان کو ایک خانہ بدوش شکاری کی سی زندگی بسر کرنے میں ندامت محسوس ہونے لگی اور انسان نے کھیتی باڑی شروع کر دی اور اپنی خوراک کے لیے زیادہ تر زمین کی پیداوار پر انحصار کرنے لگا۔ اس طرح خانہ بدوشی کی زندگی ترک کر کے اس نے ایک جگہ آباد ہو کر مہذب زندگی شروع کی، گاؤں اور قصبے آباد کیے۔ محض ایک کنبے کا رکن ہونے کی بجائے وہ ایک فرقے اور پھر ایک قوم کا فرد بن گیا۔ یہ تمام باتیں اہنسا کی ترقی اور ہنسا (تشدد) کی کمی کی علامتیں تھیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اب تک نسلِ انسانی بھی بہت سی نسلوں کی طرح ختم ہو گئی ہوتی۔" دوسری جگہ انھوں نے کہا کہ "انسان بطور ایک حیوان کے تشدد کرنے کا رجحان رکھتا ہے۔ لیکن چونکہ روح عدم تشدد کی قائل ہے، اس سے انسان کے لیے تشدد کی راہ پر چلتے رہنا ممکن نہیں۔ اسے یا تو اہنسا کی طرف قدم بڑھانا ہوگا یا اپنی تباہی کی طرف۔ اسی لیے پیغمبروں اور اوتاروں نے سچائی، یگانگت، بھائی چارے، انصاف وغیرہ کا درس دیا ہے اور یہ تمام اوصاف اہنسا کے لوازم ہیں۔" ایک اور جگہ کہتے ہیں "میرا پختہ عقیدہ ہے کہ تشدد پر کوئی پائدار عمارت کھڑی نہیں کی جا سکتی۔ وحشیانہ پن کا جواب وحشیانہ پن سے دینا اپنے اخلاقی اور ذہنی دیوالیہ پن کا ثبوت دینے کے مترادف ہے اور اس سے بدی کا چکر شروع ہو جاتا ہے۔"

یہ بڑی ستم ظریفی ہے کہ سچائی کے اس پرستار اور اہنسا کے اوتار کی اس روح کو ہم سے جدا ہوئے ابھی کچھ کم ۲۵ برس ہی ہوئے ہیں لیکن ہم نے ان کی تعلیمات کو جن میں اہنسا اور عدم تشدد پر کاربند ہونے کو سب سے اولیت حاصل ہے، بھولنا شروع کر دیا ہے۔ گاندھی جی نے اہنسا اور تشدد کے نقصانات، خطرات اور دور رس اثرات کو بار بار اور مختلف طریقوں سے سمجھایا اور بتایا ہے لیکن آج ہم دیکھتے ہیں یہ رجحان ہے کہ قوم کے باپو کے نظریے اور تعلیم کو پسِ پشت ڈال کر تشدد کا راستہ اپنایا جاتا ہے اور اپنے مقاصد کے حصول اور اپنی مانگوں کی تکمیل کے لیے تشدد آمیز تحریکیں چلائی جاتی ہیں، دفتروں اور بازاروں کا گھیراؤ کیا جاتا ہے، سرکاری اور نجی املاک کو توڑ پھوڑ اور آتش زنی کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور اس طرح ایک عام بدنظمی پیدا کی جاتی ہے۔ جمہوریت میں اپنی شکایتوں اور مانگوں کے لیے احتجاج کرنا جائز اور درست ہے۔ لیکن یہ طریقہ پرامن اور ایسا ہونا چاہیے کہ مسائل کے حل ہونے کی بجائے مشکلات بڑھ نہ جائیں، ملک کے ترقیاتی پروگرام ٹھپ نہ ہونے پائیں اور قوم اختلافات اور بدنظمی کا شکار ہو کر کمزور نہ ہو جائے۔ افسوس یہ ہے کہ اس تشدد آمیز طریقۂ کار میں ملک کے نوجوان اور طلبا پیش پیش نظر آتے ہیں جب کہ گاندھی جی نے انھیں خاص طور سے مخاطب کر کے کہا تھا کہ "میں نے اپنی تمام امیدیں ملک کے نوجوانوں سے وابستہ کر رکھی ہیں۔ انھیں اپنے اندر یہ احساس پیدا کرنا چاہیے کہ مکمل طور پر ڈسپلن کی زندگی ہی انھیں اور ملک کو تباہی سے بچا سکتی ہے۔" طالب علموں سے مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ "گڑبڑ پیدا کرنا، ہڑتال کرنا اور اس قسم کی دیگر کارروائیاں سراسر تشدد کے مترادف ہیں۔ طلبا کو اپنے افکار اور قول و عمل میں اہنسا برتنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ میں سیاسی ہڑتالوں کی حمایت نہیں کرتا۔ طلبا کو جب وہ زیرِ تعلیم ہوں عملی سیاست میں حصہ لینے کی اجازت نہیں ہونا چاہیے۔ ایک طالب علم سرگرم سیاست داں ہو کر اپنی تعلیم جاری نہیں رکھ سکتا۔ ان کی زندگی کا مقصد تعلیم حاصل کرنے کے بعد قوم کے خدمت گار بننے کا ہونا چاہیے۔"

اب بھی زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ نسلِ انسانی بھی دوسری کئی نسلوں کی طرح ختم نہ ہو جائے، ہم اپنی تباہی کی طرف قدم نہ بڑھائیں، اپنے اخلاقی اور ذہنی دیوالیہ پن کا ثبوت نہ دیں اور "بدی کا چکر" جو تشدد آمیز طریقۂ کار کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے، شروع نہ ہونے دیں تو ہمیں ضبط و نظم سے کام لینا ہوگا اور تشدد کے راستے کو ترک کر کے اہنسا کے طریقے کو اپنانا ہوگا ورنہ اس سے ملک کو جو نقصان پہنچے گا اس کے لیے آئندہ نسلیں ہمیں کبھی معاف نہ کریں گی۔

آزادی کی ۲۵ویں سال گرہ کے سال میں گاندھی جینتی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ آئیے اس موقع پر ہم قوم کے باپو کی تعلیمات کی روشنی میں اپنے قول و فعل اور عمل و کردار کا جائزہ لیں اور ان تعلیمات کو نہ صرف اپنے لیے مشعلِ راہ بنائیں بلکہ ان کی نشر و اشاعت میں سرگرمی دکھائیں تاکہ نئی نسل جو ابھر رہی ہے وہ اپنی زندگیوں کو ان تعلیمات کے سانچے میں ڈھال سکے۔

● "نیا دور" کے شائقین اور خریدار حضرات سے پرچہ نہ ملنے کی شکایتیں موصول ہوتی رہتی ہیں۔ ان شکایتوں کا لب و لہجہ بعض وقت انتہائی درشت اور کبھی کبھی جنگ آمیز ہوتا ہے۔ بسا اوقات ان تحریروں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ خریداروں کو پرچے "انڈر سرٹیفیکیٹ آف پوسٹنگ" بھیجے جاتے ہیں۔ اس سے زیادہ احتیاط برتنے کا اور کوئی طریقہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ پھر بھی اگر کاپی موجود ہوئی تو دوبارہ بھیج دی جاتی ہے۔ نیا دور کا زرِ بدل صرف پانچ روپیہ ہے۔ اس قیمت میں ہر پرچہ بذریعہ رجسٹری بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خریدار حضرات اگر سارا غم و غصہ ایڈیٹر یا منتظمین پر اتارنے کی بجائے اپنے ڈاک خانہ کو نیا دور کی گم شدگی یا عدم وصولی کی جانب متوجہ کریں تو شاید زیادہ بہتر ہو۔

——— ایڈیٹر

مہاتما گاندھی علی گڑھ میں



۱۹۱۷ء کا ایک واقعہ

ہارون خاں شروانی

دسمبر سنہ ۱۹۱۶ء میں شہر لکھنؤ میں ہندوستان کے سیاسی رہنما جمع ہیں؛ کانگریس اور مسلم لیگ کے پس پردہ ہندو مسلمانوں کے باہمی سمجھوتے کی بات چیت ہو رہی ہے تاکہ انگریزوں کے پاس اس چیلنج کا جواب بھیجا جا سکے کہ ہندوستانی کسی متفقہ دستور کو پیش نہیں کر سکتے۔ آخر کار سمجھوتا ہو جاتا ہے اور ہندو مسلمان شیر و شکر ہو جاتے ہیں۔ اس روح پرور جلسوں میں جن لوگوں کو شرکت کا موقع ملا تھا انھیں یاد ہوگا کہ کس طرح مہاراجہ صاحب محمود آباد سر محمد علی محمد خاں نے ہندو مسلمان نیتاؤں کو، جو لکھنؤ میں جمع تھے، ایک بڑے پیمانے کی ضیافت پر مدعو کیا اور اس میں سب ہی نے شرکت کی۔ انھیں شاید یہ بھی یاد ہوگا کہ مہاراجہ محمود آباد کے محل کے بالکل متصل شاہی زمانے کی جو نفیس بارہ دری ہے، اس میں کل ہند مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا، اور اس کی صدارتی کرسی کے لیے کانگریس کے ممتاز ترین رہنماؤں میں سے ایک کو چنا گیا جن کا نام محمد علی جناح تھا۔ اس جلسے کے مدعوین میں کانگریس کے تقریباً تمام چوٹی کے رہنما تھے جو صدر کے دائیں بائیں لیگ کے ممتاز ممبروں میں گھلے ملے نظر آ رہے تھے۔ اس زمانے کے رواج کے بموجب صف اول کے کانگریسی اور صف اول کے لیگی بہترین انگریزی کپڑوں میں ملبوس ہوتے تھے، اور ان کے چمکدار کالر اور کف سیاہ یا دوسرے کسی گہرے رنگ کے سوٹوں میں دور سے نظر آ سکتے تھے۔ لیکن لیگ کے اس جلسے میں شہ نشین کے ایک گوشے میں ایک شخص خاموش بیٹھا ہوا اس میل جول کی فضا کا گویا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے کپڑے، اس کی رنگ ڈھنگ، اس کا طور طریق باقی سب سے جداگانہ تھا۔ سر پر گجراتی وضع کی ذرا اونچی پگڑی، بدن پر دیہاتی قسم کی انگرکھی جو کمر سے صرف تین چار انچ نیچے تک جاتی تھی اور موٹے کپڑے کی دھوتی، یہ اس کی پوشش تھی۔ یہ کپڑے بہترین سوٹوں اور شیروانیوں کے جمگھٹ میں کچھ عجیب سے معلوم ہوتے تھے۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ یہ وہی موہن داس کرم چند گاندھی ہیں جنھوں نے جنوبی افریقہ میں ایک تہلکہ مچا دیا ہے۔ اور جن کے کاری ہتھیاروں یعنی حق پسندی ایمان داری، انکساری اور عدم تشدد نے جنوبی افریقہ کے سفید فام وزیر اعظم جنرل اسمٹس کو جھکنے پر مجبور کر دیا ہے۔ دیکھنے والوں کو تعجب ہوا کہ ایک بیرسٹر اور ایک ایسے شخص کو بھیس بدلنے کی کیا ضرورت تھی جس نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ یوروپی طرز کی بود و باش میں بسر کیا تھا۔ لیکن ان میں عالم الغیب نہیں، انھیں کیا معلوم تھا کہ یہ کم رو نحیف شخص ہندستان میں سلطنت برطانیہ کی جڑیں ہلا دے گا اور اس کا اقتدار ملک سے ختم کر کے دم لے گا۔

ہندی مسلمانوں کا سب سے بڑا تعلیمی اور ثقافتی مرکز علی گڑھ تھا۔ سنہ ۱۸۵۷ء کے شدید مصائب کے بعد یہیں سے ان کی زندگی میں ایک نئی لہر دوڑی تھی، یہیں سے سید احمد خاں نے اپنے عمل سے یہ دکھا دیا تھا کہ مسلمانوں اور ان کے ہندو بھائیوں میں کسی طرح کی تفریق نہیں ہونی چاہیے، لیکن ساتھ ہی مسلمانوں سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ تمھیں ابھی سیاست کی منجدھار میں پڑنے کی نہ قابلیت ہے نہ سکت، اور سیاسیات میں عملی حصہ لینے سے تمھارا اور ملک بھر کا نقصان ہی ہوگا۔ تمھیں ضرورت اس بات کی ہے کہ تم سب سے پہلے تعلیم کی طرف متوجہ ہو جاؤ ورنہ تم اپنے

پاؤں پر کھڑے نہ ہو سکوگے اور کیا حقہ، ملک کی خدمت نہ کر سکوگے۔
الغرض ملک میں علی گڑھ کی اہمیت کا صحیح اندازہ کرنے کے بعد گاندھی جی نے وہاں جانے کا ارادہ کرلیا، لیکن ان کے اس ارادے کی کسی کو خبر بھی نہ ہوئی۔

اگست سنہ ۱۹۱۷ء کی کوئی تاریخ تھی۔ ملک کیا، پوری سلطنت برطانیہ میں (جس میں سورج کبھی ڈوبتا ہی نہ تھا) لکھنؤ سمجھوتے کا چرچا تھا۔ ڈاکٹر انصاری نے کانگریسی اور لیگی قوم پروروں کا جلسہ دہلی میں طلب کیا تھا۔ علی گڑھ کے مندوب، جن میں عبدالمجید خواجہ اور میرے والد حاجی محمد موسیٰ خاں صاحب شامل تھے، ایک روز پہلے ہی دہلی پہنچ گئے تھے۔ علی گڑھ کی کیفیت یہ تھی کہ ایم اے او کالج کے طلبا (ابھی مسلم یونی ورسٹی نہیں بنی تھی) قوم پرورانہ جذبے میں ڈوبے ہوئے تھے، لیکن یوروپی اسٹاف میں استبدادیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ یوروپی پروفیسروں اور ٹرسٹیوں کے سابق سکریٹری نواب وقار الملک کے درمیان چند سال پہلے سخت کشمکش ہوئی تھی، لیکن وقار الملک کے استعفے کے بعد حالات نے پلٹا کھایا تھا اور یوروپی پروفیسر از سر نو حاوی ہو گئے تھے۔
میں علی گڑھ ضلع کانگریس کمیٹی اور ہوم رول لیگ شاخ علی گڑھ کا معتمد تھا۔ دس بجے کے قریب ڈاکٹر انصاری کا میرے پاس تار آیا کہ مہاتما جی چھ بجے کی ریل سے علی گڑھ آرہے ہیں۔ میں نے فوراً مقامی کانگریس کمیٹی کی مجلس عاملہ طلب کی، ساتھ ہی عوامی ربط کے تمام طریقوں کو متحرک کیا اور گاندھی جی کے استقبال کی جیسی بھی تیاری ہو سکی وہ پوری کی۔ اس وقت تک گاندھی جی کے طریق کار کا پھیلاؤ کافی ہو چکا تھا۔ کالج تو ہماری تحریک سے گویا بارہ پتھر باہر تھا، اور ہم نے شہر ہی میں ایک عظیم الشان جلسے کا انتظام کیا تھا۔ شہر کے شمالی کنارے پر اسٹیشن کے قریب ایک عوامی کتب خانہ تھا اور اس کے ایک رخ پر ایک بڑا احاطہ تھا اسے صاف کرا دیا گیا۔ اس کے ایک گوشے میں ایک بڑا تخت رکھا گیا، اس پر ایک میز اور ایک کرسی مہاتما جی کے لیے رکھی گئی۔ تخت پر چڑھنے کے لیے دو سیڑھیوں کا انتظام کیا گیا۔ میز کے سامنے چالیس پچاس کرسیاں رکھ دی گئیں اور ان کے پیچھے دریوں اور شطرنجیوں کا فرش کر دیا گیا۔ یہ سب انتظام آناً فاناً مکمل ہو گیا۔ ریل آنے سے پہلے ہی اسٹیشن پر سیکڑوں کی تعداد میں عوام گاندھی جی کے درشن کے لیے جمع ہوگئے تھے۔ گاندھی جی حسب معمول تیسرے درجے کی گاڑی میں سفر کر رہے تھے۔ وہ اترے تو حاضرین نے "مہاتما گاندھی کی جے" "ہندو مسلمان کی جے" کے فلک شگاف نعروں سے ان کا سواگت کیا، اور بیسیوں نے پرنام کرنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے مہاتما جی کو کافی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ اب سے پچپن برس پہلے علی گڑھ میں موٹریں اکا دکا ہی نظر آتی تھیں اور جن راجاؤں، نوابوں کے پاس موٹریں تھیں، ان کے ایوانوں کے سوا وہ ہم لوگوں کے لیے گویا بند تھے۔ ہم نے کسی نہ کسی طرح ایک رئیس سے ایک عمدہ فٹن اور مشکی گھوڑوں کی جوڑی مانگ لی تھی۔ ہم بڑی مشکل سے ہجوم کو چیرتے ہوئے گاندھی جی کو گاڑی تک لائے اور انھیں جلسہ گاہ تک پہنچایا۔ یہ معلوم کرکے کہ انھیں شہر لے جایا جا رہا ہے گاندھی جی برابر احتجاج کرتے رہے کہ میں کالج دیکھنے اور بانی کالج کی قبر کا درشن کرنے کے لیے آیا ہوں، آپ مجھے شہر کیوں لے جا رہے ہیں۔ بہرحال ہم جلسہ گاہ پہنچ گئے۔ میدان ہزاروں سے بھرا ہوا تھا۔ مہاتما جی کو سہارا دے کر تخت پر پہنچایا گیا، ان کے کرسی پر بیٹھتے ہی لوگوں نے تالیاں بجائیں اور جیکارے لگانے شروع کیے۔ بڑی مشکل سے انھیں خاموش کیا گیا۔
گاندھی جی نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے کہا کہ "بھائیو اور بہنو، میں اس وقت کوئی بھاشن نہیں دوں گا، میں بھاشن دینے نہیں بلکہ کالج دیکھنے آیا ہوں۔" یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔ لوگوں نے تقریر کرنے پر اصرار کیا، مگر گاندھی جی کہاں ماننے والے تھے، وہ کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور ہم لوگوں نے سہارا دے کر انھیں مصنوعی شہ نشین سے اتار لیا۔ مجھ سے کہنے لگے کہ کالج چلیے۔

اب رات ہو گئی تھی، فٹن تیار تھی۔ مہاتما جی بیٹھے، مجھے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سامنے کی سمت پر مہادیو ڈیسائی اور ان کی دھرم پتنی دونوں بیٹھ گئے۔ سنہ ۱۹۱۷ء کی فضا ایسی تھی کہ یہ ناممکن تھا کہ کوئی بڑا سیاسی رہنما علی گڑھ آئے، اس کی باتیں سننے کے لیے جلسہ ہو اور اس میں کالج کے طالب علم موجود نہ ہوں۔ گویا ایسے جلسوں میں کالج کے طالب علموں کا جانا ممنوع تھا۔ اس جلسہ میں بھی بیسیوں طلبہ تھے۔ جلسہ گاہ سے کالج بمشکل ڈیڑھ میل ہوگا، لیکن گاڑی کے کالج پہنچنے میں ایک گھنٹے

سے دیا ہو لگ گیا۔ گاڑی کے جلوس میں کچھ طالب علم تھے۔ گاندھی جی نے یہ دیکھ کر طلبہ گاڑی کے ساتھ پیدل جا رہے ہیں یہ ہدایت کر دی کہ گاڑی آہستہ چلائی جائے۔ چنانچہ کوچوان گھوڑوں کو تھام کر چلانے پر مجبور ہو گیا۔ سرسید کورٹ کے (جو اس وقت بھی بارگ کہلاتا تھا) صدر دروازے وکٹوریہ گیٹ پہنچے تو وہاں چند طلبہ استقبال کے لیے کھڑے ہوئے نظر آئے۔ معلوم ہوا کہ صدر شعبۂ انگریزی ٹول کی صدارت میں انجمن اتحاد کا ہفتہ وار جلسہ ہو رہا ہے، اور جو طلبہ وہاں جمع ہیں ان کو گاندھی جی کے کالج میں آنے کا مطلق علم نہیں۔

گاندھی جی نے خواہش ظاہر کی کہ طلبہ کے جو کمرے کھلے ہوئے ہوں وہ انھیں دکھائے جائیں۔ بچی بارگ کے کمرے نہایت شاندار ہیں۔ اور سرسید کے زمانے میں بلکہ ان کی نگرانی میں تعمیر ہوئے ہیں۔ ان کے اکثر مکین انجمن اتحاد کے جلسے میں گئے ہوئے تھے، جو طلبہ ہمارے ساتھ تھے ان میں چند ہی اس اقامت خانے میں رہتے تھے۔ انھوں نے فخریہ انداز میں اپنے اپنے کمرے کھول کر دکھا دینے چاہے۔ اس اقامت خانہ میں سب سے بارونق دار سجا یا کمرہ روایتی اعتبار سے وہ ہوتا ہے جس میں کرکٹ ٹیم کا کپتان رہتا ہے۔ اتفاقاً یہ کمرہ کھلا ہوا ملا۔ مہاتما جی اسے دیکھ کر حیران ہو گئے اور مجھ سے پوچھنے لگے کہ کیا اس کمرے میں بھی طالب علم رہتے ہیں۔ میں نے اس کا اثبات میں جواب دیا اور ساتھ ہی اس کی توجیہ کر دی کہ کالج کی تاریخ میں کرکٹ کو ایک خاص تفوق حاصل رہا ہے، اور کالج کی بازی گاہ میں کرکٹ کے کھیل نے چار چاند لگا دیے ہیں، اسی لیے کرکٹ کپتان کے کمرے کو ایک خاص اہمیت دی جاتی ہے۔ چار پانچ کمرے دیکھنے کے بعد مہاتما جی کا حکم ملا کہ ان مجھے انجمن اتحاد کے جلسے میں لے چلئے۔ اول تو بغیر پرنسپل کی اجازت کے میرا مہاتما جی کو کالج لانا، پھر لڑکوں کے کمرے کھلوا کر ان کا معائنہ کرانا، اور سونے پہ سہاگا یہ کہ انھیں انجمن اتحاد کے جلسے میں لے جانا، کچھ ایسی باتیں تھیں جن کا ردعمل ہونا لازم تھا۔ لیکن اول تو یہ سب کارِ زیاں خود سب کے لیے دل رُبا بات کے مطابق تھی، دوسرے گاندھی جی کی ان ہدایتوں سے کون سرتابی کر سکتا تھا؟ بہرحال مہاتما جی، مہادیو ڈیسائی اور مسٹر ... ڈیسائی کو لے کر ہم بچی بارگ کے پچھلے دروازے سے

جلسہ گاہ یعنی اسٹریچی ہال کی طرف روانہ ہوئے۔ اُدھر پرنسپل ٹول کو جو جلسے کی صدارت کر رہے تھے، کسی طرح سے ہم لوگوں کی کالج میں آمد کی خبر ہو گئی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مہاتما جی یونین کی طرف آ رہے ہیں۔ انگریز تو بلا کے ذہین ہوتے ہیں اور بہت جلد اپنا چولا بدل دیتے ہیں۔ پرنسپل ٹول نے کرسی چھوڑ کر انجمن اتحاد کے مستقل صدر کو صدارت کی کرسی پر بٹھا دیا اور خود تیز قدمی سے ہم لوگوں کی طرف آتے ہوئے نظر آئے۔ آدھا راستہ طے ہوا تھا کہ وہ ہماری چھوٹی سی جماعت سے آ کر مل گئے۔ میں نے ٹول صاحب کا گاندھی جی سے اور ان کے ساتھیوں سے تعارف کرایا اور ہم سب نہایت خندہ پیشانی سے ایک ساتھ اسٹریچی ہال پہنچے۔ گاندھی جی کے ہال میں داخل ہوتے ہی طلبہ میں جو جوش و خروش پیدا ہوا وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ ہال پہنچتے ہی پرنسپل نے اعلان کیا کہ ہندوستان کے عظیم رہنما مسٹر گاندھی کو خوش آمدید کہنے میں وہ بڑا فخر محسوس کرتے ہیں۔ ہال میں شہ نشین کے عین اوپر چھت پر ایک بڑا روشن دان ہے۔ لڑکے نہ جانے کس بیچ میں بلا مبالغہ سیروں گلاب کے پھول لے آئے تھے۔ اور جونہی پرنسپل نے گاندھی جی سے تقریر کرنے کی درخواست کی اور وہ تقریر کرنے کھڑے ہوئے، اوپر سے گلاب کی پنکھڑیوں کی گویا موسلا دھار بارش ہونے لگی اور گاندھی جی ان پنکھڑیوں میں آدھے ڈھک گئے۔

لڑکوں کی چیرز کی کوئی حد نہ تھی۔ جب چیرز کی آواز ذرا مدھم پڑی تو گاندھی جی نے اپنی تقریر شروع کی۔ انھوں نے اپنے خاص انداز سے ذرا رک رک کر طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ "مجھے اس کالج میں آنے اور آپ سب سے ملنے سے بڑی خوشی ہوئی ہے" اور راقم الحروف کا نام لے کر کہا کہ ان کی وجہ سے مجھے یہاں آنے میں بہت سہولت ہوئی ہے۔ میں نے ابھی آپ میں سے بعض کے کمرے دیکھے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ جو معیار ان کمروں کی سجاوٹ کا ہے، کیا اس معیار کو قائم رکھ کر اس ملک کے کروڑوں مسلمانوں کی تعلیم کا انتظام کیا جا سکتا ہے؟ ایسے کمرے اور ان کی زیبائش تو ہندوستان کے بڑے بڑے دولت مندوں کے بچوں کو بھی میسر آنا دشوار ہے۔ میں نے قرآن مجید کا ترجمہ پڑھا ہے، حضرت محمدؐ کی زندگی کے حالات کا مطالعہ کیا ہے، خلفا کی زندگی

سے سبق لیا ہے، جو جھوٹی زینت ان کے گھروں میں دیکھی وہ نہ قرآن سے ثابت ہے نہ خلفائے راشدین کے طور طریقے سے۔ میں پوچھتا ہوں کہ اس کرّ و فر کے ساتھ آپ ایک سال میں نہیں دس سال میں نہیں بلکہ ہر سال میں پانچ سو سال میں کتنے عمر اور کتنے علی پیدا کر سکتے ہیں؟ میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ اپنی زندگی کو رسول اور ان کے تابعین کی طرح سادہ بنا لیجیے ورنہ اس کرّ و فر کا نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا۔"

یہ گاندھی جی کی آدھے گھنٹے کی تقریر کا ملخص ہے جو راقم الحروف کو یاد رہا ہے۔ وہ خاموش ہوئے تو ہال سیکڑوں تالیوں کی آواز سے دوبارہ گونج اٹھا۔ صدرِ جلسہ نے گاندھی جی کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتے ہوئے وعدہ کیا کہ معزز مہمان نے جن اصولوں کو سراہا ہے ان پر ہم سب عمل کرنے کی کوششیں کریں گے۔

جلسہ ختم ہوا تو بے شمار لڑکوں نے گاندھی جی کے ساتھ چلنا چاہا، مگر انھوں نے یہ پسند نہیں کیا بلکہ انھیں اپنے اپنے کمروں کو واپس جانے کی ہدایت کی۔ اب ہماری مختصر سی جماعت سیدھی کالج کی مسجد کی طرف چلی جس کے ایک طرف سرسید اور ان کے رفقائے کار آسودہ ہیں۔ میں وہ سماں کبھی نہیں بھولوں گا۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی ہے، مسجد میں عشا کی نماز ابھی نہیں ہوئی، مؤذن ایک قاری اذان کا انتظار کر رہے ہیں، تین غیر مسلم سید احمد خاں کے مزار کے سامنے بالکل خاموش آنکھیں بند کیے کھڑے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ دو منٹ کیا پانچ منٹ تک مہاتما گاندھی اور ان کے ساتھی اسی طرح خاموش کھڑے رہے۔ مسجد سے لگا ہوا سرسید کورٹ کا دروازہ باب الرحمۃ ہے، وہاں گاندھی جی کی فوٹو اتار لی گئی تھی۔ ہم سب خاموشی کے ساتھ تیز تیز کے عالم میں اس میں بیٹھ گئے اور وہاں سے سیدھے عبدالمجید خواجہ کی کوٹھی پہنچے جہاں مہاتما گاندھی کے قیام کا انتظام کیا گیا تھا۔ پسا ہوا میوا اور بکری کا دودھ حاضر تھا۔ چند گھنٹے آرام کرنے کے بعد مہاتما جی صبح چار بجے کی ریل سے واپس دہلی چلے گئے۔

اس واقعے کو نصف صدی سے زیادہ مدت گزر چکی ہے لیکن اس کے بعض گوشے اب تک ذہن میں محفوظ ہیں۔ اس کی اہمیت میری زندگی میں اس لیے اور بھی زیادہ ہے کہ اس کے بعد جب تک انگریزی اسٹاف کا کالج پر غلبہ رہا، اس وقت تک میری مادرِ علمی میرے لیے شجرِ ممنوعہ بنی رہی، اور اس کا تھوڑا بہت اثر ان کے تخلیے کے بعد بھی مدت تک جاری رہا۔



"میں پھر اپنے اس یقین کا اعادہ کرتا ہوں کہ جب تک بڑی طاقتیں جنگ کے موثر ہونے اور جنگ کے ساتھ لازم و ملزوم سب دھوکے بازی میں اپنا یقین نہ چھوڑ دیں اور تمام قوموں اور تمام نسلوں کی مساوات اور آزادی پر مبنی حقیقی امن کے قیام کی سرگرم کوشش نہ کریں، اس وقت تک دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔"

——— مہاتما گاندھی

آزادی کے پچیس سال

نذیر بنارسی

آہ ستھر سے اگر کی تو ڈانٹا گیا   کتنی مٹی سے سامان چھانٹا گیا
کس بلا کی تھی قاتل فرنگی ادا   جسم تک دھرتی ماتا کا بانٹا گیا

سامنے آئی مشکل بڑی سے بڑی   اٹھ کے طوفاں لڑا آکے آندھی لڑی
ساتھی کا سفینہ بھنور میں پڑا   اس بھنور میں بھی بنیادِ ساحل پڑی

تفرقے ہر قدم پر مٹاتے چلیں   ساتھ قدموں کے دل بھی ملاتے چلیں
اپنا جیون بنانا ہے سندر اگر   سب کی جیون سبھائیں سجاتے چلیں

کوئی مختار اور کوئی مجبور ہے   اصل منزل ابھی منزلوں دور ہے
کارناموں پہ کرتے چلیں اک نظر   آگے بڑھنے کا اک یہ بھی دستور ہے

کتنی تعمیر ابھی زیرِ تعمیر ہے   اوج تقدیر محتاجِ تدبیر ہے
گر امنگیں نہ ہوں دل میں تعمیر کی   آدمی ایک کاغذ کی تصویر ہے

ٹوٹتے ہیں ہزاروں چٹانوں کے سر   جب کہیں جاکے ملتی ہے اک رہ گزر
لاکھوں فرہاد دل کر رہے ہیں جہاں   تب یہ شیریں کہیں ہوتی ہے جلوہ گر

حسن کے ساتھ سڑکیں نکالی گئیں   دھرتی ماتا کی مانگیں نکالی گئیں
زندگی ہر طرف لہر لینے لگی   اتنی خوبی سے نہریں نکالی گئیں

کتنے کھیتوں کے سینے ابھارے گئے   کتنے پودوں کے گیسو سنوارے گئے
تھا نہ پانی جہاں سیکڑوں میل تک   ہم وہاں لے کے دریا کے دھارے گئے

ہم نے گودیں پہاڑوں کی [illegible]   ہنس پڑیں پربتوں کی حسیں بیٹیاں
آبشاروں نے چھیڑے [illegible] ساز   موج میں آ کے گانے لگیں ندیاں

ہم نے دوڑائیں اس حسن سے بجلیاں   مر گئیں اپنی موت آپ تاریکیاں
بے زبانوں کو ہم سے زبانیں ملیں   توڑ دیں ہم نے جنگل کی خاموشیاں

اپنے بھارت کو جب ہم سجانے لگے   ہنس کے آئینہ جھرنے دکھانے لگے
چاند انگڑائی لینے لگا جھیل میں   جل ترنگوں پہ جل گنگنانے لگے

شہر بن بن کے بن جگمگانے لگے   دوسروں کے دلوں کو لبھانے لگے
مادرِ ہند کو یوں سنوارا گیا   غیر ملکی بھی درشن کو آنے لگے

ٹینک اپنا ہے گن اپنی اپنے جہاز   کیوں نہ ہو اپنے کل کارخانوں پہ ناز
دھن کے پکے ہیں راگ اپنا اپنی ہے رگ   سب یہ گا لیں گے ہم چھیڑ دیجے ساز

انکساری بھی فطرت میں ہے ناز بھی   پر شکن ہے پرندے کی پرواز بھی
ساتھی دوست بھی ہے شکاری بھی ہے   اپنا ہر خیش کبوتر بھی ہے باز بھی

دولتِ زندگی دی ہے بنگال کو   کیوں دعا دوں نہ پچیسویں سال کو
لہلہانے لگیں دھان کی کھیتیاں   یوں سنوارا گیا ارضِ بنگال کو

بنگلا دیش انگڑائی لینے لگا   زندگانی کے سندیش دینے لگا
جو تڑپتا تھا کل مچھلیوں کی طرح   آج وہ دیس کی ناؤ کھینے لگا

جتنے پورے ہوئے ان پلانوں کی جے   سب مشینوں کی کل کارخانوں کی جے
جن سے پائی وجے اپنے آدرش نے   ان مشینوں کی کل کارخانوں کی جے

سائنس جیون نے لی کال کی چھاؤں میں   زندگی بس گئی موت کے گاؤں میں
ست ساون جھما جھم برسنے لگا   آئی رُت گھونگھرو باندھ کر پاؤں میں

اردو شاعری میں

ہندو دیومالائی عناصر

ابوالفیض سحر

اس سے پہلے کہ ہم اردو شاعری میں ہندو متھالوجی (MYTHO LOGY) کے استعمال اور اس کی بازیافت کے سلسلے میں پیش رفت کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ متھالوجی (MYTHOLOGY) کے مستند اور مسلمہ معنی و مفہوم ذہن نشین کر لیں۔ متھالوجی جس بنیادی لفظ سے بنا ہے وہ جیسا کہ سب جانتے ہیں 'MYTH' ہے اور "THE RANDOM HOUSE DICTIONARY OF THE ENGLISH LANGUAGE" جیسی مستند لغت میں MYTH کا حسب ذیل مفہوم درج ہے

A TRADATIONAL OR LEGNDARY STORY, USUALLY CONCERNING SOME SUPER HUMAN BEING OR SOME ALLEGED PERSON OR EVENT WITH OR WITHOUT A DETERMINABLE BASIS OF FACT OR A NATURAL EXPLANATION ESPACIALLY A TRIDITIONAL OR LEGENDARY STORY THAT IS CONCERNED WITH DEITIES OR DEMIGODS AND THE CREATION OF THE WORLD AND ITS INHABITANTS"

علم الاصنام کی اس مختصر وضاحت و تشریح کے بعد اب ہم اصل موضوع کی طرف آتے ہیں۔ علم الاصنام کے آغاز اور ابتدا کی تفصیل دراصل انسان کی فطرت، اس کے احساس اور شعور کی نشوونما کے اجدائی احوال کی تاریخ ہے۔ کائنات، قسم قسم کے موجودات اور طرح طرح کی مخلوقات سے مزین اور مناظر

قدرت کے عجیب و غریب اور ہوش ربا جلووں اور مناظر سے آراستہ ہے۔ اس جہان در جہان وسیع اور عظیم کائنات میں جب انسان کے معصوم ذہن نے اپنے وجود اور کائنات کے دیگر موجودات اور مخلوقات اور مظاہر قدرت سے اپنے تعلق اور اپنی نسبت کو سمجھنے کی کوشش کی ہوگی تو اس وقت کے احساسات اور تجربات کے ارتعاشات کا کیا عالم رہا ہوگا اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ تاہم ایک عالم تحیّر، اور خوف کے احساس، وہم و گمان کی فضا اور حیات و کائنات کے رموز سربستہ کو سمجھنے اور سمجھانے کی ذہنی اور تصوراتی کوششوں کے درمیان انسان نے اپنی دانست کے مطابق جو کچھ سمجھا سیکھا، اسے دوسروں تک منتقل کرنے کی فکر بھی کی، اپنے وقت اور ماحول کی عکاسی بھی کرنی چاہی چنانچہ انسانی احساسات و جذبات کے وسیلۂ اظہار کے طور پر زبان اور پھر ادب کی تخلیق ہوئی۔ ساتھ ہی ساتھ مختلف علائم، تشبیہات اور تلمیحات و فکر و فن کے تخلیقی سرمایہ کے لوازمات حسن و بیان کا ذخیرہ ملتا گیا۔ دراصل یہی وہ زمانہ تھا جب کہ دنیا کے مختلف ابتدائی تہذیبی مراکز میں فوق البشر عناصر کی پوجا اور پرستش اور مختلف اعتقادات اور اعتبارات کی صورت میں مختلف اصنامی روایات نے جنم لیا۔ ظاہر ہے اولاً تو یہ غیر منضبط ہی رہی ہوں گی پھر بعد کو دھیرے دھیرے یہ انسانی عقل، علم اور فلسفہ کی اساس پر منظم ہوتی گئیں۔ مختلف مراحل مدارج سے گزر کر تکمیلیت کے آستانے تک پہنچتے پہنچتے انھوں نے مختلف مذاہب کی شکلیں بھی اختیار کر لیں۔ اصنامی روایات کی ابتدا اور عناصر یونان، مصر، عرب اور ہندستان وغیرہ تقریباً ہر پرانے خطۂ ارض میں ملتا ہے جو

آثار قدیمہ کی ابتدائی تہذیب، تاریخ اور علم الاصنام کا گہرا مطالعہ ہے۔ صاحب طرز ادیب دانشور مرحوم نیاز فتح پوری کے خیال کے مطابق علم الاصنام کی تخلیق کے تین مدارج ہوتے ہیں۔ پہلا درجہ تخیل محض کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد دوسری منزل وہ ہے جبکہ واہمہ انسانی اپنے تصرفات سے کام لیتا ہے اور تیسرا درجہ اس ارتقا کا ہے جبکہ اس میں گہرائی اور معنویت پیدا ہو جاتی ہے۔

علم و ادب اکثر مشاہیر بشمول نیاز فتح پوری کا خیال ہے کہ یونانی اور رومی اصنامی روایات کی طرح ہندو اساطیر میں تفریحی یا تعیش کے پہلو نہیں ملتے۔ مگر اس خیال سے پوری طرح اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ ہندو دیومالا میں ایک گہری معنویت اور فلسفیانہ ربط و تسلسل ملتا ہے۔ غالباً اسی لیے امرسن کو ہندو علم الاصنام میں "SUBLIMITY OF ETHICAL THOUGHT" نظر آئی تھی۔ ڈاکٹر اکمل ایوبی نے بھی اپنی تصنیف اردو سے ہندوؤں کا تعلق میں اس خیال کی ہمنوائی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ہندوستانی دیومالا (غالباً یہاں ہندو دیومالا کی طرف ہی اشارہ ہے) دنیا کی سب سے زیادہ دلکش اور عظیم دیومالا ہے۔"

یوں تو یہاں ہندو دیومالا کا شمار نہ تو ممکن ہی ہے اور نہ ہی مقصود ہے مگر ان کی ماہیت اور نوعیت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ بیشتر ہندو اصنامی روایات کنائی و تمثیلی نظر آتی ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ہے بعض تو مناظر قدرت اور کرشمات فطرت، خیر و شر کی قوتوں کے مطالعے اور مشاہدے کا نتیجہ ہیں اور بعض انسانی احساسات و جذبات، اچھے اور برے دونوں کی تفہیم اور تبلیغ کے سلسلے میں ظہور پذیر ہوئی ہیں۔ بعض ایسی روایات بھی ہیں جو طبعی اور جغرافیائی ماحول، معاشی اور تمدنی زندگی میں نصب العین اور آدرش وضع کرنے کے سلسلے میں رواج پا گئیں اور بعض ایسے قصے اور کہانیاں بھی ہیں جو یا تو صرف شاعرانہ طرز فکر کی اختراع ہیں یا پھر فلسفۂ حیات و موت کے سلسلے کی کڑی ہیں۔

اردو شاعری میں ہندو دیومالا کا دو طرح سے استعمال ہوا ہے، ایک تو براہ راست دیوی دیوتاؤں کے قصے کہانیاں وغیرہ دوسرے ان دیوی دیوتاؤں کی تمثیلات، تلمیحات اور بعض مذہبی اعتقادات کے علاوہ اور استعاروں وغیرہ کی صورت میں۔ اردو کے ہندو شعرا کے یہاں ہندو دیومالائی عناصر کا موجود ہونا بالکل ایک فطری امر ہے اس لیے اپنے موضوع اور دعویٰ میں زیادہ وثوق و وزن پیدا کرنے کی غرض سے زیر نظر مضمون میں کوشش کی گئی ہے کہ اردو کے مسلم شعرا سے ہی مثالیں پیش کی جائیں۔

ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب اپنی ایک اہم تصنیف "اردو شاعری اور مذاہب" میں اردو شاعری میں ہندو اساطیر کی نمایندہ مثالوں کے تعلق سے فرماتے ہیں: "ہندوؤں کے مذہبی امور و کردار جن کے اشارے غزل میں پائے جاتے ہیں عام طور پر حسب ذیل ہیں۔ بت پرستی، خدا پرستی، گنگا اشنان، ہولی، دیوالی، بسنت، جنم اشٹمی، رام لچھمن، کرشن، سیتا، برہمن، جوگی، زنار وغیرہ۔ اگرچہ اس مختصر سی توضیح سے ہندو اساطیر کا کامل احاطہ نہیں ہوتا مگر پھر بھی اس کی روشنی میں پیش رفت کرتے ہوئے جب ہم اردو شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر سلطان محمد قلی قطب شاہ کا کلام بھی ہندوستانی مذہبی، ثقافتی، وطنی اور فطری عناصر سے مزین و مرصع ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

سبھی راگاں کے گل پھول ہار بایا ہے سو لہارا
جو گاوے رام کیرے رام کرداراں ریجھاتی ہے

شاہ کے مندر سعادت کا خبر لیایا بسنت
نین پتلیاں کے چمن میں پھول پھل لیایا بسنت
شکرانے ذکر سعانی رات دن آنند سوں
ترے مندر میں خوشیاں آنند سوں آیا بسنت

آرتی تارے وارے
ابھمائی مدن موہن پیارا ہر دم سو کھینچتا آنچل کنارا

کلیات قلی کے بعد اس خصوص میں سب سے اہم کتاب کا ذکر کیا جا سکتا ہے وہ ابراہیم عادل شاہ ثانی کی مشہور شعری تصنیف کتاب نورس ہے۔ ہندو دیومالائی عناصر کے تعلق سے اسے اردو کے دکنی عہد کی نمائندہ شاعری قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کے بیشتر گیت ہندو دیومالا سے بھرے ہیں۔ شیو، پاروتی، سرسوتی، گنیش اور اندر وغیرہ جیسے دیوی دیوتاؤں کا ذکر اس میں بڑے ادب و احترام کے ساتھ بار بار آتا ہے

ذیل میں چند مثالیں درج کی جاتی ہیں:

نورس، سوتر حک جک جوتی آنند سر و گھی
یوست سرستی ماتا ابراہیم پرساد بھگی دونی
گیسی مورت ہست بیکھ مد پر کھت پانی
ونت داسی گھنٹ گھو گھو رگور منڈاں بھال تھویا

اور شیو جی کا سراپا دیکھیے کس طرح کھینچا گیا ہے۔

بھبرو کر پور گورا بھال تنکت جندرا
تری میترا جٹا مکٹ گنگا دھرا
ایک ہست انڈیزا ترسول جگل کرا
باہیں، بلیو ر دیت مات گسائیں ایورا
گینتی تم روپ کی تنک جوت نا نو سو رجگے رت لینت
بھور کنچن تھال موتیا بھر اندر پچھایو بچھا درو دار

اس طرح سارے دکنی عہد میں ہندو اساطیر کے تعلق سے بے شمار مثالیں ملتی ہیں جیسے:

سورج گیران چھوٹے لگ

(کسر المومنین۔ عادل شاہ)

موحان تے پالی سیت کا ڈھل جاوٗں رامیری

(علی نامہ۔ نصرتی)

کھیاتے کوں راکس اس کھٹاریہ

(قطب مشتری۔ ملا وجہی)

دوا چند ہم کا ستارے پتنگ
تھی اموا س لگ داں تھے اندھار ہاک

(ھوگ بل۔ قریشی بیدری)

بھا گیرتی سو مانگ ہے مس پھول برہمن

(کلیاتِ شاہی۔ شاہی)

جنت کے ترجگ جیں سو یک چمن تج باغ کا
کر گوپن کے من دو تن لگی ہے کان کی جا گے

(کلیاتِ بحری۔ محمود بحری)

ولی دکنی کو جس کے اثر سے شمالی ہند میں بھی اردو شاعری کی ابتدا ہوئی، دراصل دکنی عہد اور معیاری اردو کے درمیان قائم کرنے والے کی حیثیت سے تعبیر کیا جا سکتا ہو۔ اس کے کلام میں بھی زیر بحث موضوع کی جھلکیاں نظر آتی ہیں جیسا:

زلف ہے تیری موج جمنا کی
تل نزدیک اس کے اک سناسی ہے
کشن سوں جب کہ رام رامی ہے
گنگا رواں کیا ہے نین سے آپس ستی

آ اے صنم شتاب ہے روزِ نہاں آج
کفر کوں توڑ دل سوں دل میں رکھ کر نیت خالص

ہوا ہے رام بن حسرت سوں جا چھمن سوں رام اس کا

دکنی لوگ گیتوں میں بھی کہیں کہیں ہندو اصنامی روایات کے اشارے ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو:

آتیں آتیں بول کو سچ بولو پنڈت
راجت کے پاؤں کو لگاؤں گی ٹکٹکٹ
بھایاں مرے بھینیں، تولا یور کی گھوڑی
اللہ صاحب جیو رام لچھمن کی جوڑی
میں بن جاؤں گی دیول کی دیوی، ہاں رے سیّاں
پجاری س بن کر پوجا کروں گا، دیوی کو جانے نہ دوں گا

اردو کو شروع سے ہی مسلمانوں اور غیر مسلموں دونوں کا خلوص و پیار اور باہمی اتحاد و یگانگت کی روح ملی ہے صدیوں سے۔ یہ ایکتا رشتۂ اتحاد بھی بنی ہوئی ہے۔ عام زندگی کی طرح شاعری میں بھی ایک دوسرے کی تہذیب، مذہب اور اعتقادات کا احترام ملتا ہے۔ چنانچہ امرت راؤ جو مرہٹی کے شاعر تھے، انھوں نے دکنی میں بھی شاعری کی تھی مثنوی سدامہ چرتر میں کرشن جی کے بچپن کے ایک ساتھی سُدامہ کی زندگی کی ایک جھلک پیش کی ہے۔ خوبی یہ ہے کہ مثنوی کی ابتدا انھوں نے حمد سے کی ہے — ابتدائی چند شعر پیش ہیں:

عجب ہر گرو جی تو ہی کارساج
خلق بیچ میانے وہی کارساج
وہی ہے کرم بخش صاحب دھنی
اسی کو کہے کل عالم غنی

اس نے بنایا زمیں آسماں
یوں آب، آتش، بنایا مکاں
مرگ، مرتیو پاتال بیہر بی تیتو
ہری ہر جو بیہ ہا جو کلاتے تینو

شمال میں اردو شاعری کے آغاز کے بعد شمالی ہند کے ان اہم شعرا میں جنھوں نے ہندو دیومالا کو بھرپور طریقے پر برتا ہے نظیر اکبرآبادی اپنی نظیر آپ ہیں۔ اردو میں عوامی شاعری کے داعی و نقیب نظیر اکبرآبادی کے ہاں جسے ترقی پسند بھی اپنا باوا آدم تسلیم کرتے ہیں' ہندو دیومالائی عناصر اور ہندو مذہبی تہواروں کا ذکر و بیان صرف تشبیہ و استعارے کی صورت میں ہی نہیں بلکہ ایک طرح کے عقیدے اور طرز زندگی کے طور پر ملتا ہے۔ حد یہ ہے کہ انھوں نے دکنی شعرا کی طرح حمد و نعت میں بھی ہندو اساطیر کا دامن نہیں چھوڑا ہے۔ حمد کا ایک بند ملاحظہ ہو۔

کوئی خالق باری رب مولا رحمان رحیم اللہ تنگری
کوئی ایک روپ کرتار کہے نرکال کہے نرگن نردھاری
کوئی رام رام کہہ کر سمرے کوئی بولے شیو شیو ہری ہری
کوئی داتا دینت دیال کوئی راجیس دیوت جن پری
کل عالم تیری یاد کرے تو مالک سب کا سچا ہے

نظیر کا ہندو عقائد، تہواروں اور مذہبی اوتاروں وغیرہ سے گہرا لگاؤ ان کے مزاج میں پوری طرح سے رچ بس گیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس سلسلے کے ہر ممکن موقع پر نظمیں کہی ہیں۔ جیسے 'جنم کنھیا جی کا' "کنھیا جی کی شادی" "بالپن بانسری بجیا" "رسم کتھا" "ہر کی تعریف میں" "درگا جی کا درشن" "مہادیو کا بیاہ" وغیرہ وغیرہ۔ ہر کی تعریف کا ایک بند پیش ہے:

میں کیا کیا وصف کہوں یارو اس شیام برن اوتاری کے
شری کشن کنھیا مرلی دھر من موہن کنج بہاری کے
گوپال منوہر سانولیا گھنشیام اٹل بنواری کے
نندلال دلارے سندر چھب برج چند مکٹ جھلکاری کے
بانسری اور ہولی کے تعلق سے ایک ایک بند ملاحظہ ہو:

جب مرلی دھر نے مرلی کو اپنی ادھر دھری
کیا کیا پریم پریت بھری اس میں دھن بھری
لَے اس میں رادھے رادھے کی ہر دم بھری کھری
لہرائی دھن جو اس کی ادھر اور ادھر ذری
سب سننے والے کہہ اٹھے جے جے ہری ہری
ایسی بجائی کرشن کنھیا نے بانسری

ہر آن خوشی سے آپس میں سب ہنس ہنس رنگ چھڑکتے ہیں
رخسار گلالوں سے گلگوں کپڑوں سے رنگ ٹپکتے ہیں
کچھ رنگ اور راگ جھمکتے ہیں کچھ مے کے جام چھلکتے ہیں
کچھ کودے ہیں کچھ اچھلے ہیں کچھ ہنستے ہیں کچھ بکتے ہیں
یہ طور یہ نقشہ ہولی کا ہر آن بنایا ہولی نے

اس سے قبل کہ شمالی ہند کی معیاری اردو کی شاعری کا ذکر کیا جائے جان صاحب کی ریختی سے بھی جو اردو کا ایک خاص اسلوب اظہار رہا ہے ہندو اساطیر سے متعلق چند مثالیں پیش کر دینا یقیناً تو بے محل نہ ہوگا:

سوم کے گھر میں میاں کی دال بھی گلتی نہیں
برم راکس جان لے گا' آنکھ لے گی کالا لکا
گو شکل میری اچھی ہے پر کیا کروں بھی
تقدیر تو بد تر ہے مری بھاگ بھری ہے
نام کیا لکا میں کرتی ساحری سے میں سوا
مجھ سی جادوگرنیاں ہوتیں اگر راون کے ساتھ
ایک ایک نقطے پہ موئے لڑتے ہیں مردوے
محفل شاعروں کی اکھاڑا ہے بھیم کا
تل نہیں مانگ میں زنانی کی
یہ کنھیا کھڑا ہے گوکل میں

اردو شاعری کا مزاج میں ایک مقام پر ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے اور بہت صحیح لکھا ہے کہ انیسویں صدی میں اردو گیت کی ابتدا امانت کی اندر سبھا سے ہوئی اور اندر سبھا کی فضا اس ہندوستانی فضا کا عکس ہے جس میں بت پرستی کا عمل اور بوقلمونی اور تنوع کی صفات ہمیشہ سے عام رہی ہیں۔ اندر سبھا پر سحرالبیان اور گلزار نسیم کے پرتو کے آثار بھی ملتے ہیں۔ ذیل میں دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

لاج رکھو شیام ہماری میں چیری ہوں تمہاری
[illegible] کے گارق
تم جاتر بھل کے کھلیا ہم ڈرپوک انا ری
تاک بھانک کٹ [illegible] جاؤں تورے بلہاری
[illegible] کر موہے جان سے ماری

کسی بھی زبان کی شاعری کا کسی قسم کا جائزہ اس وقت کے علمی، ادبی، سیاسی، سماجی، مذہبی اور معاشرتی حالات کے پس منظر کے مطالعے کے بغیر نامکمل ہی نہیں بلکہ ناقص بھی ہوتا ہے۔ یہ موقع نہیں کہ ان تمام حالات سے بحث کی جائے مگر مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہماری سماجی اور تہذیبی تاریخ میں مذہبی رنگ اور فالبی رواداری کے نتیجے میں عقائد و تقاریب، رسم و رواج میں تہذیبی یکجہتی دین کے مظاہرے اور باہمی عزت و احترام کا عکس اس وقت کی شاعری میں بھی بھرپور طریقے سے جھلک آیا ہے۔ افراتفری، ہیجان اور مصائب و آلام، انتشار، خلفشار کے زمانے میں فطری طور پر اس کا رنگ پکڑ پھیکا ہوتا گیا ہے۔ مختلف تحریکوں اور مختلف انقلابوں کے زیر اثر اردو شاعری کے مزاج میں ایک خاص قسم کی دھوپ چھاؤں بھی ملتی ہے۔ اب آئیے شمالی ہند کے معیاری اردو کے عہد کے بعض اہم شعراء کے ہاں ہندو دیومالائی عناصر دیکھیں کہ کس طرح اور کس رنگ اور روپ میں نکھرے ہیں۔ ذیل کی مثالوں سے اس حقیقت کی پھر ایک بار تصدیق ہو جاتی ہے کہ اردو شاعری کسی زمانے میں بھی اپنے ماحول کے اثر، اپنے وطن کی فضا اور اس کی تہذیبی قدروں حتیٰ کہ اصنامی روایات و حکایات کے دل آویز اور جاذب نظر نقوش سے یکسر عاری نہیں رہی۔

نہا نکلے یہ بس رشخ [illegible] زور کا پایا
خیرات برہمن کو ملی چاند گہن سے (شاہ حاتم)

سانولے تن پہ غضب کی دھج ہے بسنتی شال کی
جی میں ہے کہہ بیٹھیے اب جے کنھیا لال کی

تیری کمال بچھا اور لگا تن پہ بھبھوت
گاہ جوگی کی طرح رہتے ہیں آسن مارے (انشا)

درد دل اس بت بےدرد سے کہئے تو کہے
جا سکے یہ رام کہانی تو سنا ؤ اور نہیں (جرأت)

کرشن الیند حسینہ ماں کا پچھان مارا
[illegible] سے تیرے پلک [illegible] بان مارا (مصحفی)
ڈر کے میری شب جدائی سے
کالکا رام رام کوتی ہے

سانولی دیکھ کے صورت کسی متوالی کی
ہوں مسلمان مگر بول اٹھوں جے کالی کی
سانولے تن پہ قبا ہے جو ترے بھاری ہے
لالہ کہتا ہے چمن میں کہ یہ گردھاری ہے (امانت)

اردو شعر و ادب میں صرف لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد، وامق و عذرا اور یوسف و زلیخا کے عشق کے افسانے ہی نہیں ملتے بلکہ ایسے افسانوی رنگ کے شعری تخلیقات میں بیشتر دکنی مثنویوں کی طرح، شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد مرزا یار علی بیگ نجحت کی تصنیف مثنوی مل و دمن، حافظ رحمت خاں روہیلہ کی سسی اور پنوں اور خود میر کا ایک ہندو پرسرام کی داستان عشق کے تعلق سے ایک مثنوی تصنیف کی ہے۔ اس کے علاوہ محمد تقی میر کے ہاں اس قسم کی مثالیں بھی ملتی ہیں:

سنا ہوگا واعظ یہ جو کچھ ہوا نل اس عشق میں کس طرح سے موا
جو لیلیٰ پہ گزری سو مشہور ہے دمن کا بھی احوال مذکور ہے
جشن نوروز ہند ہولی ہے راگ رنگ اور بولی ٹھولی ہے

ہماری متصوفانہ شاعری کی روایات نہ صرف اردو شاعری کا قابل قدر ورثہ ہیں بلکہ ہمارے غیر مذہبی اور جمہوری قومی نظام زندگی میں ہندو مسلم طرز معاشرت اور سماجی میل جول، تہذیبی دھاروں کے سنگم یکجہتی اور یک جہتی کی بنیادوں کو ابتدا ہی سے مضبوط بنانے والی امیٹیں، پتھر اور گارا ہیں۔ بعض مسلمان صوفی شعرا نے ہندو مذہب، رسوم و عقائد میں بھی وہ گہرائی اور ہم مزاجی پائی جو اسلامی روحانیات کی تعلیمات سے بڑی حد تک ہم آہنگ ہو۔ اس لیے خیال درست ہو سکتا ہے کہ ان کے اسی احساس اور ادراک کی بدولت اردو شعر و حکمت کے اظہار کا انداز اسلوب گرو، کافر، بت خانہ، ناقوس اور زنار وغیرہ جیسے الفاظ و تراکیب تلازمات و تلمیحات کی شوخ اور وجد آگیں کیفیت سے مملو ہو کر معنی خیز و معنی آفریں، دل پذیر و دل نشین بن گیا ہے۔ انہیں اگر اردو کی متصوفانہ شاعری

سے خارج کر دیا جائے تو وہ اصل بے کیف و بے رنگ ہو جائیں گی۔ مثلاً "مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا" کی اقبال کی فکری منزل سے پہلے خود تیرتھ نے کہا تھا ؎

تیرتھ کے دیر و مذہب کو اب پوچھے کیا ہو اُن سے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

ہم ہیں جتنے کہ مت دیر و حرم کی راہ چل
اب یہ جھگڑا حشر تک شیخ و برہمن میں رہا

کفر کچھ چاہیے اسلام کی رونق کے لیے
حسن زنار ہے تسبیح سلیمانی کا

اور اس روایت کا سلسلہ غالبؔ تک جا ملتا ہے ؎

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

دیوانگی سے دوش پہ زنار بھی نہیں
یعنی ہماری جیب میں اک تار بھی نہیں

اس تصوفانہ مسلکِ انسانی، وسیع النظری اور عالی مشربی کے عشق پیچاں کی بیل کے پیچھے ہندوستان کی سرزمین رنگ رنگ کی سرسوں کے زرد کھیت اور لالہ کے لالہ زار بھی لہلہا رہے تھے۔ مگر وقفے وقفے سے مختلف محرکات و عوامل، روایت و بغاوت، شکست و ریخت کے جھگڑے بھی چل رہے تھے۔ اس انحطاط اور انتشار کے اثرات کے شہر آشوب سے اردو شاعری کیسے خالی رہ سکتی تھی۔ چنانچہ اکبر الٰہ آبادی اپنے مخصوص رنگ میں فرماتے ہیں ؎

کہاں کے مسلم کہاں کے ہندو بھلائی ہیں سب نے اگلی رسمیں
عقیدے سب کے ہیں تین تیرہ نہ گیارھویں ہے نہ اشٹمی ہے

اور سبحہ و زنار اٹھا جاتا ہے	خیر ہندو کی مذاہب ہر نہ مسلمان کی خیر
ہنسے سے آپ کو سیرت ہو مبارک اکبر	ہم تو گنگا ہی پہ اب مار کے آسن بیٹھے

اس مرحلے پر بھی حالی کا دامن اخلاقیات و مذہبیات کے تار و پود سے خالی نہیں ؎

عشق ہے پاک ہونا اگر دل نہیں ہے پاک
زمزم میں غسل کیجیے کہ گنگا نہائیے

غالباً اسی احساسِ فکر کے زیرِ اثر اقبال نے "مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا" کی بنیاد پر ایک نیا شوالہ دلوں کے رہنے کا مقام تعمیر کرنے کی دعوت دی تھی اور گوتم، گرو نانک اور سوامی رام تیرتھ کو بھی نذرِ عقیدت پیش کی تھی ؎

چشتی نے جس زمیں پہ پیغامِ حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا

گوتم کا جو وطن ہے جاپان کا حرم ہے
عیسیٰ کے عاشقوں کا چھوٹا یروشلم ہے

ان کے ہاں بھی رام چندر جی پر ایک مستقل نظم ملتی ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند

اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی
روشن تر از سحر ہے زمانے میں شامِ ہند

تلوار کا دھنی تھا شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں، جوشِ محبت میں فرد تھا

یہی نہیں انیسؔ کے مرثیوں کی طرح جن میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت کا رنگ نمایاں ہے، مشہور نعت گو محسن کاکوروی کے ایک مشہور نعتیہ قصیدے کی تشبیب بھی سراسر اسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے ؎

سمت کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل	برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل
گھر میں اشنان کریں سرو قدانِ گوکل	جا کے جمنا پہ نہانا بھی ہے اک طولِ امل
دیکھیے ہوگا سری کرشن کا کیونکر درشن	سینۂ تنگ میں دل گوپیوں کا ہے بیکل
ڈوبنے جاتے ہیں گنگا میں بنارس والے	نوجوانوں کا سنیچر ہے یہ بڑھوا منگل
راکھیاں لے کے سلونوں کی برہمن نکلیں	تار بارش کا تو ٹوٹے کوئی ساعت کوئی پل



پیغمبرِ امن

آپ کا پیغام امن آشتی عزم و یقین

رضا امروہوی

آج سے کچھ سال پہلے اس زمیں کی خاک پر
اک مجاہد، اک عظیم انساں ہوا تھا جلوہ گر
یعنی گاندھی، اس زمیں کی عظمتوں کے ترجماں
سچ کے رکھوالے، اہنسا کے محافظ بے گماں
وادیِ امن و اماں میں آپ کی تنویر ہے
زندگی کے ہر ورق پر آپ کی تصویر ہے
آپ کا پیغام، پیغامِ محبت کا امیں
آپ کا پیغام، امن و آشتی، عزم و یقیں
آپ کی دانش وری ہندوستاں کی آرزو
آپ کی ہستی جہادِ زندگی کی آبرو
سرزمینِ ہند کو روحِ تجلّی پاش دی
آپ نے رجعت پسندوں کو شکستِ فاش دی
آپ نے انسانیت کی قدر کو بالا کیا
خون کا اپنے جلا کر دیپ اجالا کیا
آپ کی یہ روشنی ظلمت مٹا سکتی نہیں
آپ کی اس شمع کو دنیا بجھا سکتی نہیں

رعنائیِ افکار

مہاتما گاندھی

مفتون کوٹوی

جمہوریت ملک پہ ہے فخر ہمیں آج — ہر اہلِ وطن کے لیے زینت دہ سرِ تاج
صد شکر کہ اپنا ہی ہوا ملک میں اب راج — ہاں کس کی بدولت ہوا انگریز کا اخراج
وہ مخلص و خوددار و وفادار تھے گاندھی

وہ راہ دکھائی کہ وطن ہو گیا آزاد — سرشار ہر اک روح ہوئی قلب ہر اک شاد
ڈالی گئی جمہوریت ملک کی بنیاد — ہر گوشۂ ملک اب ہے اسی جشن سے آباد
اس ملک کے خواہانِ طلبگار تھے گاندھی

عیسائی ہو، سکھ ہو کہ مسلمان و برہمن — مزدور ہو، دہقاں ہو کہ پیس ماندہ ہریجن
کشمیر میں گھر ہو کہ ہو پنجاب میں مسکن — بنگال ہو مدراس ہو گجرات ہو مامن
ہر اہلِ وطن کے بڑے دلدار تھے گاندھی

آزادیِ ملک اور خیالات ترقی — ہیں مدِ نظر اپنے، روایات ترقی
خواہش سے اُبھر آتے ہیں جذبات ترقی — کوشش سے ہیں مشروط حالات ترقی
یہ نشہ وہ ہے جس سے کہ سرشار تھے گاندھی

آزادیِ ملک اہلِ وطن سب کو مبارک — جمہوریتِ شانِ چمن سب کو مبارک
یہ غنچہ و گل، سرو و سمن سب کو مبارک — اب اوجِ ترقی کا چلن سب کو مبارک
کیا پیکرِ رعنائیِ افکار تھے گاندھی



حافظِ صاحب

سید حامد

جون ۱۹۴۳ء کا ذکر ہے میں ملازمت کے سلسلے میں الہ آباد سے بجنور کے لیے روانہ ہوا۔ جہاں میرا پہلا تقرر ہوا تھا۔ بجنور پہنچتے ہی حافظ صاحب کا ذکر کانوں میں پڑنے لگا۔ معلوم ہوا کہ وہ ۱۹۴۲ء کی تحریک میں گرفتار ہوئے تھے ابھی چھوٹ کر آئے ہیں۔ زبانِ خلق پر ان کی تعریف تھی۔ ایک دو دن میں ان سے ملاقات بھی ہو گئی۔ از رہ غریب نوازی ایک دن وہ مجھ سے ملنے چلے آئے۔ میں اسٹیشن کلب کے ایک کمرے میں مقیم تھا۔

یہ پہلی ملاقات تھی، اور آخری ملاقات جون ۱۹۶۵ء میں ہوئی اس وقت وہ پنجاب کے گورنر تھے۔ گوگو سے واپسی میں ہم لوگ دو روز کے لیے ان کے ساتھ ٹھہرے۔ اس وقت ان کے مزاج ناساز تھے، سانس پر زور تھا، آکسیجن لینے کی ضرورت پڑتی تھی۔ پہلی اور آخری ملاقات کے درمیان کئی بار حافظ صاحب کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا۔ اس اثنا میں وہ کبھی حکومت کے باہر تھے اور کبھی اس کے رکن رکین۔ لیکن اس ۲۲ سال کے عرصے میں ان کے رویے میں سر مو تبدیلی نہیں ہوئی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا انھوں نے وقت کے چیلنج کو قبول کر لیا تھا۔ گردشِ ایام نے لاکھ سر مارا حافظ محمد ابراہیم کی روش میں کوئی بڑی تبدیلی نہ کر سکی۔ وہی وضع قطع، وہی اندازِ نشست و برخاست، وہی آداب و اطوار، احباب کے ساتھ وہی خصوصیت، عوام کے لیے وہی صلائے عام جس کا جی چاہے دسترخوان پر بیٹھ جائے جس کے دل میں آئے ان کا مہمان بن جائے جو چاہتا خود کو دعوت دے دیتا۔ وضعداری حافظ صاحب کی خو تھی۔ جس طرح ٹہنیوں سے کونپلیں پھوٹتی ہیں، ان کی بے تکلف اور دل پذیر شخصیت سے وضعداری پھوٹتی تھی۔ زمانے نے لاکھ زور لگایا اس بندۂ خدا کی وضع میں فرق نہ آیا۔ تخت و تختہ کے مراحل سے وہ کئی بار گزرے آج زنداں میں تو کل ایوانِ وزارت میں۔ آج عدالت میں بحث کر رہے ہیں تو کل مجلس قانون ساز میں۔ خواہ ملزم کو زنداں سے بچانا ہو یا خود زنداں میں جانا ہو، قانون توڑنا ہو یا قانون بنانا ہو، حافظ صاحب کے رویے، ان کے انداز، ان کے سکون و طمانیت، ان کی جانفزا انسانیت اور ان کی دلربا گفتگو میں کوئی فرق نہ آیا۔ ان کے چہرہ پر چشم اعدا نے کبھی گھبراہٹ کی لکیریں نہیں دیکھیں۔

بجٹ پیش خواہ پارلیمنٹ کا ہو خواہ اسمبلی کا، ایک عجیب ہنگامہ خیز ہوتا ہے۔ جو لوگ سکرٹیریٹ میں کام کرتے ہیں انھیں ان دنوں کے لیے بڑی تیاریاں کرنا پڑتی ہیں جب ان کے محکمے کی گرانٹ ایوان میں پیش کی جاتی ہے۔ ایک سال کا ذکر ہے حافظ صاحب یو پی میں منجملہ کئی اور محکموں کے صنعت و حرفت کے وزیر بھی تھے۔ میں اسی محکمے سے متعلق تھا۔ ہم سب رفقائے کار نے بجٹ گرانٹ کی بحث کے لیے جی بھر کر تیاریاں کیں۔ ان طالب علموں کی طرح جو متوقع سوالات کے جواب تیار کرتے ہیں ہم نے بھی جستجو کے گھوڑے دوڑائے اور ان سوالات کا تصور کیا جن کی بوچھاڑ کا ہمارے وزیر باتدبیر کو سامنا کرنا پڑے گا۔ ان سوالات کے جواب تیار کیے، جواب الجواب کو قیاس کی گرفت میں لا کر اس کا جواب بھی قلم بند کیا گیا۔ ایوان کی تقاریر میں جو سوالات اٹھائے جاتے ہیں، جو اعتراضات کیے جاتے ہیں وہ سب آفیشل گیلری میں بیٹھے ہوئے عہدہ دار قلم بند کرتے ہیں۔ ان کے جوابات کا مسودہ اذان کے متعلق مسالہ جلد جلد تیار کر کے وزیر کے پاس پرزے بھیج دیے جاتے ہیں۔ صنعت و حرفت کا محکمہ یوں بھی اہم ہے، پھر اس کے پھیلاؤ اور مرتبیانہ امکانات کے درنظر ارکین مجلس نے محکمہ کے طرز عمل پر خوب لے دے کی۔ طرح طرح کے پریشان کن اعتراضات کیے۔ ٹیڑھے سوالات کیے۔ آفیشل گیلری میں بیٹھی ہوئی فاختائیں پھڑپھڑا گئیں۔ جوابات و تشریحات کے پرزوں پر پرزے بھیجے گئے۔ حافظ صاحب ان پرزوں کو ہیں میز پر جاتے گئے۔ نہ چہرہ پر تشویش کے آثار نہ ہمارے برجستہ شاہکاروں کو پڑھنے کی کوشش۔ لیجیے جواب دینے کا وقت آ گیا۔ فرماتے ہیں:

"فارسی میں ایک مثل ہے 'کردن صد عیب نہ کردن یک عیب'۔ یعنی کیجیے تو سو برائیاں، نہ کیجیے تو ایک برائی۔ اس ممتاز ایوان کے فاضل اراکین نے کتنی طویل تقریریں ہمارے محکمہ صنعت و حرفت کی کارگزاری سے متعلق کیں، کتنے عیب نکالے، کتنے نقائص ڈھونڈے، کتنی برائیاں دریافت کیں۔ اس سے کیا ثابت ہوتا ہے، یہی نا کہ ہم نے بہت کچھ کیا۔ ہمارے محکمے نے کارہائے نمایاں کر دکھائے، تبھی تو ہمارے نکتہ چینوں کو اعتراض کرنے کا موقع ہاتھ آیا۔ ہم کچھ نہ کرتے، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے، صنعت و حرفت کو فروغ دینے کے لیے نئی اسکیمیں نہ بناتے، نئے قدم نہ اٹھاتے تو انھیں حرف گیری اور نکتہ چینی کا موقع کیسے ملتا۔

"حرف گیری اور نکتہ چینی حزب مخالف کا حق ہے اور یہی جمہوریت کی اساس ہے۔ لیکن آپ میری مایوسی کا اندازہ لگا سکتے ہیں جب آج میں نے یہ دیکھا کہ فاضل حزب مخالف نے حرف گیری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا لیا۔ اس کی تقریر میں نہ کوئی کارآمد تجویز ملی نہ کوئی تعمیری سمجھاؤ۔ میں امید کر رہا تھا کہ اسکیموں کو بہتر بنانے اور صنعتی ارتقا کے پروگرام کو مضبوط کرنے کے لیے میرے فاضل نکتہ چیں کوئی کارآمد تجاویز اس ایوان کے سامنے رکھیں گے لیکن میری مایوسی کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے اپنی کوششوں کو عیب جوئی تک محدود رکھا اور کوئی بات ایسی نہ کہی جس سے ہمارے صنعتی پروگرام کو مزید فروغ ہو سکے۔

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا"

اتنا کہا اور حافظ صاحب بیٹھ گئے۔ مخالفین کی ساری کاوشوں کا بیک بدیہہ گوئی سے مسمار کر گئے۔ ایک کہاوت سے تقریر کا آغاز ہوا اور ایک شعر پر اختتام۔ حافظ صاحب ایوان کی نس نس کو پہچانتے تھے، جب چاہتے فنون بیان سے اسے گرما اور بذلہ گوئی سے اسے لاجواب کر دیتے۔ اعتراضات کو چٹکلوں میں اڑا دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

شعر کا ذکر آ ہی گیا تو لگے ہاتھوں اس انہماک کا تذکرہ بھی کر دیا جائے جو موصوف کو شعر و شاعری سے تھا۔ دن بھر کے ہنگاموں اور جھمیلوں سے فارغ ہو کر رات کا کھانا کھانے کے بعد حافظ صاحب یکسو ہو کر بیٹھتے، ارد گرد چند احباب ہوتے جو بیشتر ان سے زیادہ تھے اور جہاں کم عقل تازہ ہو کر آتا اور نیم شب تک شعر و شاعری اور لطائف و ظرائف اور حرف و حکایات کا دور چلتا۔ حافظ صاحب حقہ پیتے جاتے، خشخشی داڑھی کو کریدتے رہتے اور مناسب شعر سے سرور اندوز ہوتے۔ ان صحبتوں کو چشم فلک صدیوں تک ترستی رہے گی۔ مشاعرہ کی صدارت کرتے تو کمال کر دیتے۔ دوسروں کی طرح صدارت پانی نہ کرتے گویا ایک فرض ادا کرنا ہے جس سے جتنی جلد سبکدوش ہو جائیں بہتر ہے۔ ان کی سخن فہمی کا ایک زمانہ قائل تھا اور ان کی داد ہی گویا خوش مذاقی اور تنقید کا بہترین معیار تھی۔ حافظ صاحب بیانات اور شاعری کا ایک دوسرے کے قریب لے آئے۔ ان عنوان سے کہ شاعری کا تعلق براہ راست زندگی سے جوڑ دیا

میں نرمی اور لطافت آگئی۔

آزادی کے بعد یو۔پی اور مرکز میں جو مسلمان وزرا ہوئے ہیں ان میں مولانا آزاد کو چھوڑ کر سخن فہمی میں حافظ ابراہیم کا کوئی حریف نہ تھا۔ مولانا آزاد کو بلندیٔ معیار اور احساس برتری نے خلوت نشین بنا دیا تھا اور وہ رفعت تخیل اور بلندیٔ ذوق کے دام میں اسیر ہوگئے تھے۔ ان کے اور عوام کے درمیان خواہ وہ سیاست کی دنیا ہو خواہ شعر و ادب کی، فاصلہ دن بدن بڑھتا گیا۔

حافظ صاحب عوام کے اپنے فرد تھے۔ ان کے ساتھ گھل مل کر شیر و شکر ہوکر رہتے۔ وضع قطع، نشست برخاست، اطوار و آداب میں وہ سولہ آنے عوام کے آدمی تھے۔ سول لائن میں زندگی گزارنے والے سطحی طبقہ سے جو کہ ہوا میں معلق رہتا ہے، انھیں کوئی سروکار نہ تھا۔ انھوں نے محلّہ کی زندگی سے اپنا ناتہ کبھی نہ توڑا۔ مغرب کے تمدن نے ان کی نگاہیں کبھی خیرہ نہ کیں۔ علم و خرد کی نام نہاد موشگافیوں نے ان کے ذہن گیرادراک اور حقیقت آشنا فہم کو کبھی گمراہ نہ کیا۔ یہی راز تھا نگینہ کے اس فرزند کی مقبولیت سادگی، اعتماد اور سکون کا۔

سیاست میں حافظ صاحب نے اپنی سادگی کی وجہ سے بارہا دھوکے کھائے لیکن انھیں کوئی گزند نہ پہنچا۔ ان پر چھینٹے ڈالے گئے، کیچڑ اچھالی گئی تاہم ان آزمائشوں سے وہ بے داغ نکلے۔ وہ ہمارے رہنماؤں کی صف اول میں رہتے۔ سیاست عالیہ میں شاید انھیں دخل کا موقع بھی نہ ملا ہو۔ شعر و ادب میں انھوں نے کوئی یادگار نہ چھوڑی پھر بھی ایوان سیاست میں یو۔پی کے تمدن کے وہ آخری ترجمان تھے۔ ان کی شخصیت دلنواز اور دلپذیر تھی، ان کی سیرت بے تصنع، ان کی گفتگو بے تکلف، ان کا دسترخوان وسیع، ان کا توکل اَلَم نَشرَح، ان کی انسان دوستی ضرب المثل تھی۔ ان کی طاقت کا راز یہی تھا کہ وہ ایک عام انسان تھے۔ ان کی ذات میں عام انسانیت کے بے شمار دل کش پہلو جمع ہوگئے تھے، اور اس کی بعض کمزوریاں بھی۔ ترقی نے ان کی فروتنی میں اضافہ کیا، زمانے کے نشیب و فراز نے لاکھ سر مارا ان کی وضعداری میں کوئی تبدیلی نہ آسکی۔ یہی ان کی عظمت کا بڑا پہلو ہے۔ اختیار اور اقتدار کا نشہ انھیں کبھی نہ ہوا۔ ان کی عالی ظرفی نے غریب اور امیر کے درمیان کبھی امتیاز روا نہ رکھا۔ وہ جانتے تھے کہ انسان کی بڑائی کا صحیح اس کا کردار ہے اور کردار کی بنیاد ہے سادگی اور انسان دوستی پر۔

باغبان کبھی اس پودے کو جس کی جڑیں زمین میں دور تک پھیل گئی ہوں، اکھاڑ کر دوسری جگہ نہیں لگاتا، وہ جانتا ہے کہ وہ پودا نئی زمین میں جڑ نہیں پکڑ سکے گا، کمھلا جائے گا۔ حافظ صاحب کو اواخر یو۔پی سے اکھاڑ کر مرکز میں بٹھا یا گیا۔ دلّی میں آکر وہ پنپ نہ پائے، لکھنؤ کو وہ بھلا نہ سکے۔ ان کی جڑیں مرکزی زمین کو پکڑ نہ پائیں۔ انھیں یو۔پی کی معاشرت، وہاں کا گھریلو پن، وہاں کی صحبتوں کی یاد ستانے لگی۔ پارلیمنٹ میں انھیں انگریزی میں تقریریں کرنا پڑیں جو وہ روانی سے کرسکتے تھے لیکن ان میں وہ بات کہاں ہوتی جو لطائف و ظرائف سے بھری ہوئی خطابت اور بذلہ سنجی سے سنواری ہوئی اردو میں تھی۔ دلّی میں وہ کمھلانے لگے۔ دلّی نے ان کی شخصیت کی آب و تاب کو دیکھا ہی نہیں۔ دہلی سے ہٹے تو چندی گڑھ کے راج بھون میں اسیر کیے گئے۔ وہاں کی فضا انھیں کیا راس آتی؟

برعکس نہند نام زنگی کافور۔ آخر میں حافظ صاحب کا یہی عالم ہوگیا تھا۔ جس کے حافظہ نے کبھی قرآن مجید کا احاطہ کیا تھا زندگی کی آخری دہائی میں اُسے نسیان کا عارضہ لاحق ہوگیا۔ اور بات بے جا نہ تھی۔ کلام اللہ کو بھول جانے کے بعد پھر یاد رکھنے کے لائق کون سی چیز تھی۔ حافظ صاحب کے حافظہ سے جو سہو سرزد ہوتے ان پر چہ میگوئیاں ہونے لگی تھیں لیکن وہ دوسروں کے اعتراضات سے اسی حد تک بے نیاز تھے جیسے اپنی کوتاہی سے۔ چھوٹے دماغوں کی چھوٹی باتیں ان کے لیے کبھی درخور اعتنا نہ ہوئیں۔ حافظ صاحب کا عارضہ نسیان ڈاکٹر ضیا الدین مرحوم کی نسیان سے مختلف تھا۔ موخرالذکر بزرگ نے جان کر بھولنے اور بھول کر یاد کرنے کو فن لطیف کا مرتبہ عطا کیا تھا حافظ صاحب کی بھول میں آورد کا شائبہ نہ تھا۔ وہ سراسر آمد تھی۔

حافظ صاحب کے انداز گفتگو میں خوش خرامی کی ادائیں تھیں۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا کہ ذہن سرعت کے ساتھ کسی بات کی طرف منتقل ہونے کے لیے تیار ہی نہیں۔ وہ بات آہستہ آہستہ کرتے تھے اور اطمینان سے جیسے کھانا کھاتے وقت کوئی ہر لقمہ کا لطف اٹھائے۔ دوسروں کی باتوں کو ان کا ذہن بظاہر اسی رفتار سے گرفت میں لاتا تھا۔ بات کہنے یا بات سمجھنے میں بوکھلائی ہوئی تیز روی کو وہ شاید معیار تہذیب سے ساقط

سکتے تھے۔ شرفاء کو کسی نے سرِ راہ دوڑتے دیکھا ہے؟ ایک سوال کو وہ ایک سے زاید بار پوچھتے۔ گویا خود سے کہہ رہے ہوں مکرر ارشاد۔ آپ کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ کسی دوسرے سے مخاطب ہو جاتے۔ لیکن پھر آپ کی طرف واپس آتے مقصد یہ تھا کہ حاضرین محفل میں سے ہر شخص مورد التفات رہے۔ چنانچہ جب حافظ صاحب گفتگو میں خوش خرامی فرماتے تو حاشیہ نشین حاضرین چوکنا رہتے کہ کب کوئی بات حافظ صاحب کی زبان سے ایسی ادا ہو جائے جس میں روئے سخن ان کی طرف ہو اور جو اس سلسلۂ تخاطب کی ایک کڑی ہو جس کا آغاز ان کی آمد سے ہوا تھا۔ افراد محفل سے بسا اوقات ان کا تخاطب جگنو کی روشنی کی طرح ہوتا جو جلتی بجھتی رہتی ہے۔ اس گفتگو کا لہجہ روہیل کھنڈی تھا۔ اس زبان کی کرختگی پر اہل لکھنؤ چیں بہ چیں ہوں تو ہوں زیادہ نہیں لیکن اس میں لکھنؤ کی ہموار چکنی اور لطیف زبان سے توانائی کہیں زیادہ ہے۔ اس زبان کی سرحدیں ایک طرف سہارنپور کی مشدّد زبان سے ملتی ہیں تو دوسری طرف دلّی کی عوامی زبان سے۔ حافظ صاحب کے سوالات میں بسا اوقات شوخی کے عناصر چھپے ہوتے۔ انھیں لطف آتا تھا چھیڑنے میں اور زیرِ لب اور بالائے ریش مسکرانے میں۔ ان کی آنکھوں میں شوخی کی وہ چمک میں نے اکثر دیکھی ہے جسے انگریزی میں MERRY TWINKLE کہا جائے گا۔

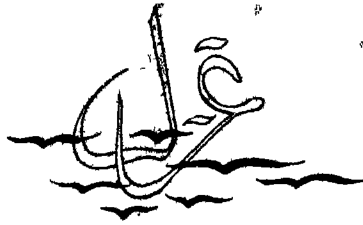
حافظ محمد ابراہیم کی رحلت کو ابھی صرف چھ سال کے قریب ہوئے ہیں، لیکن ہماری محفلیں ان کے ذکرِ جمیل سے محروم ہو چکی ہیں۔ یہ ہماری محرومی بے حسی اور قدر ناشناسی ہے۔ ان کے بڑے صاحبزادہ عتیق الرحمٰن (افسوس کہ وہ بھی اب اس دنیا میں نہیں ہیں) مرحوم سے، جو اس وقت یو پی کابینہ کے رکن تھے میں نے برسبیلِ تذکرہ کہا تھا کہ کسی اہلِ قلم کو حافظ صاحب کے سوانح حیات لکھنے پر مامور کیا جائے جس میں بالخصوص اس تمدن کی عکاسی ہو جس کے وہ ترجمان تھے، اور شعر و ادب کی ان محفلوں کا تذکرہ ہو جن کی وہ جان تھے۔ عتیق الرحمٰن مرحوم نے ایک حد تک میری تجویز سے اتفاق کیا لیکن انفرادی زندگی اور شعر و ادب کے بجائے تجویز کا رُخ انھوں نے اجتماعی زندگی اور سیاست کی طرف موڑ دیا۔ اور زمانہ نے انھیں اس کی مہلت بھی نہ دی کہ اپنے والد گرامی کی سوانح عمری کو ترتیب دے سکیں یا دلا سکیں۔ مرحوم کی بات چیت کے انداز پر اپنے والد ماجد کے طرزِ گفتگو کی گہری چھاپ تھی۔ میں حیرت میں رہ گیا۔ وہی لب و لہجہ، وہی اوقاف، وہی اسلوبِ فکر، وہی طرزِ ادا، وہی آداب، وہی اطوار۔ نسلوں کے فاصلے کی جگہ میں دو نسلوں کے قرب کا منظر دیکھ رہا تھا۔ میرا ذہن اس دل کش مماثلت کی طرف گیا جو رشید صاحب[1] اور احسان رشید کے اسالیبِ گفتگو میں ہے۔

گردشِ ایام نے ہزارہا سرافرازوں کے سر کو جھکا دیا۔ وقت نے نہ معلوم کتنی ہمتوں کو پست اور کتنے حوصلوں کو کھوکھلا کر دیا۔ ماہ و سال کے ظالم سلسلے نے کتنے قویٰ کو مضمحل، کتنے ارادوں کو متزلزل کر دیا اور کتنے حریت پرست آتش آشام انقلاب پسندوں کو عافیت طلب اور آسائش پسند بنا دیا۔ حافظ صاحب بھی اس شکنجے سے مستثنیٰ نہ تھے۔ وزارت سے دو ایک بار انھوں نے اصول اور آن کی خاطر استعفیٰ دیا اور عافیت کے خاطر اسے واپس لے لیا۔ لیکن حافظ صاحب کچھ بھی ہوں ابن الوقت نہ تھے۔ جو وضع انھوں نے شروع میں اختیار کی اس پر آخر دم تک قائم رہے۔ شرافت ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی۔ کوئی چھوٹی بات ان سے سرزد نہ ہو سکتی تھی۔ چالاکی ان سے کوسوں دور تھی۔ نخوت، تکبّر، تلوّن اور تصنّع سے انھیں کوئی واسطہ نہ تھا۔ حافظ صاحب نے سیاست کے سمندر میں ایک عمر گزاری تاہم ان کی پشت ہمیشہ پانی کے اوپر رہی۔ سیاست کے داؤں پیچ اور فریب سے وہ معصوم تھے۔ حلقۂ انتخاب کے ہندو مسلمانوں میں ہردلعزیز تھے۔ چنانچہ اس حلقہ میں ان سے مقابلہ کرنا کسی کے بس کی بات نہ تھی۔ مختلف وقتوں میں ضلع بجنور کے دو سیاستدانوں نے جو حافظ صاحب کے سایۂ عاطفت میں پلے تھے اپنی فرقہ پرست ذہنیت کی وجہ سے انھیں دھوکا دیا اور ان سے سرتابی کی لیکن وہ نہ تو حافظ صاحب کو اپنی جگہ سے ہلا سکے، نہ ان کا سکون برہم کر سکے اور نہ ان کے لب و لہجہ میں تلخی لا سکے۔ حافظ صاحب فرقہ پرستی سے نفور تھے خواہ وہ اکثریت کی ہو خواہ اقلیت کی۔ سیاست کے میدان میں وہ اس اعلیٰ تہذیب کے آخری نمائندہ تھے جو تیزی

(باقی صفحہ ۲۴ پر)

---

[1] پروفیسر رشید احمد صدیقی



قضا ابن فیضی

خزاں زدوں کو متاعِ بہار بھی دے دو — دیا ہے غم تو ہمیں اپنا پیار بھی دے دو
صلیبِ عصر سجاؤ، مگر ذرا اس کو — بہارِ قامتِ رعنائے یار بھی دے دو
یہ چاندنی بھی ذرا دھوپ کا مزا چکھ لے — قمر وشوں کو غمِ روزگار بھی دے دو
میں آئینہ ہوں، کدورت کو جذب کر لوں گا — مجھے تو اپنے دلوں کا غبار بھی دے دو
یہ اور بات ہے میں راستے کا پتھر ہوں — غریبِ شہر کو کچھ اختیار بھی دے دو
یہ بانکپن ہے اب اہلِ خرد پہ اک الزام — جنوں کو تاجِ سرِ شہریار بھی دے دو
کچھ آنچ تیز تو ہو، وقت کی شرابوں کو — مرے جوان لہو کا خمار بھی دے دو
سلگتی دھوپ کا صحرا ہوں میں کہاں جاؤں — مجھے کوئی شجرِ سایہ دار بھی دے دو
یہی ہے سہل کہ یارانِ رشک پیشہ کو — مرا قلم بھی قلم کا نکھار بھی دے دو
بھٹک رہی ہے خرد خانہ ساز اندھیروں میں — اسے مری نگہِ ہوشیار بھی دے دو
دبے دبے سے یہ تیور نہ مجھ سے شعور — سخن وروں کو ہنر کا وقار بھی دے دو

گلہ ہے تم سے قضا بے کلاہیِ فن کو
غزل کے عہد کو اک تاجدار بھی دے دو

میں بھی فسانہ تم بھی کہانی

(افسانہ)

اقبال متین

تمہاری آنکھیں تو وہ آئینہ تھیں جن میں جھانک کر میں اپنے خد و خال ہی نہیں اپنی روح کا عکس بھی دیکھ سکتا تھا لیکن اب یہ آئینہ خانہ ایک ایسا حیرت کدہ بن گیا ہے جس میں جھانکتا ہوں تو اپنی صورت تک پہچانی نہیں جاتی۔ ہم کبھی اتنے اجنبی تو نہ تھے۔ اس وقت بھی نہیں جب ہم نے پہلی بار ایک دوسرے کو دیکھا تھا ـــ جنم جنم کا ساتھ دینے کی قسمیں کھانے والے ہم لوگ اپنی محبتوں کو زندگی کے دکھ درد سے بچا کر اور کتنی دور لے جا سکتے ہیں اب تو ہمیں اس کی بھی خبر نہیں ـــ اور پھر سچ پوچھو تو ہمارے پاس اس کے سوا تھا بھی کیا ـــ لیکن کیا تم آج بھی مجھے چاہتی ہو؟ ـــ کیا میرے لیے آج بھی تم میں وہی دل کشی ہے؟ ـــ اگر ہے تو پھر یہ دوری کیا ہے ـــ ایسا کیوں ہے کہ وہ جو تم ہو، تم نہیں ہو ـــ وہ جو میں ہوں، میں نہیں ہوں۔

ہم سر جھکائے ایک ہی ڈگر پر اس طرح چل رہے ہیں جیسے منہ اٹھائے مخالف راستوں پر چل رہے ہوں ـــ میں جو باتیں تم سے کرنا چاہتا ہوں ان کا تعلق نہ گھر کے کرائے سے ہے جس کا تقاضہ ہم پر ہو رہا ہے، نہ گوالن کی تنک مزاجی سے کہ اس نے کل سے منے کا دودھ بند کر دینے کی دھمکی دی ہے۔

میں تو تم سے جسم و جان کی باتیں کر رہا ہوں ـــ منہ بند سیپ میں چھپے ہوئے اُس سچے موتی کی باتیں کر رہا ہوں جو تم نے اپنے سینے سے میرے سینے میں منتقل کیا تھا۔ روح کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی التجاؤں اور دعاؤں کی باتیں کر رہا ہوں ـــ ایسی باتیں کر رہا ہوں جنھیں ہم بھولتے جا رہے ہیں ـــ تمھیں یاد ہے ـــ کبھی تم نے مجھے لکھا تھا ـــ کیا لکھا تھا تم نے مجھے بھی تو پوری طرح یاد نہیں ـــ شاید ـ تم نے معصومیت سے یہ بھی لکھا تھا کہ جب میں دفتر سے تھکا ہارا گھر لوٹوں گا تو تم مجھے آرام کرسی پر گرا دو گی ـ ـــ بڑے چاؤ سے میرے جوتے کی ڈوریاں کھولو گی ـــ میرے کوٹ کے بٹن کھولو گی ـــ ان مخروطی حنائی انگلیوں سے جن سے میری زندگی کی گتھیاں سلجھ سکتی تھیں، تم نے جوتے کی ڈوریاں اور کوٹ کے بٹن کھولنے کا پیمان کیا تھا ـــ تم نے تو پھر اسی زمین پر رہ کر بات کی تھی، شاید اسی لیے عورت ستاروں کی طرف ہاتھ بڑھاتی بھی ہے تو اپنے پیروں کو زمین سے اٹھنے نہیں دیتی ـــ لیکن میں تو زمین کی پستیوں سے اتنا بلند ہو گیا تھا کہ ستارے میری نظر میں سنگریزوں کی طرح ماند پڑ گئے تھے ـ شفق کی سرخیاں دل پر خون کا عکس بن گئی تھیں جو آنکھوں میں اتر اتر کر آنسو بن جاتی تھیں۔ لیکن ہاتھ نہ سنگریزے ہی آتے تھے نہ آنسو ـــ اور نہ میں چلتے پھرتے افسانوں کے جنگل میں تمھارے نرم و نازک وجود سے شیفتگی کا گراں بار بوجھ اٹھائے تنہا تنہا دبا جا رہا تھا، لیکن اس واماندگی کے باوجود مجھ میں دنیا بھر پر چھا جانے کا حوصلہ تھا۔

اسی حوصلہ کے سہارے جب میں نے ہاتھ پکڑ کر تمھیں زمین سے اوپر اٹھا لیا تو ہماری محبت زندگی کا بوجھ سہار نہ سکی اور ہم اپنی زمین پر لوٹ آئے ـــ یہ واپسی تو مبارک اور مسعود تھی ـ ہم چاہتے بھی تو یہی تھے تا کہ چمن کا پھول بن کر مہکیں ـ صبا کی رفتار

بن کر چلیں۔ اوس کے موتی بن کر سورج کی کرنوں میں زندگی کو گم کر دیں۔ لیکن میرے کوٹ کے بٹن سرے سے ٹوٹے ہوئے تھے۔ تمھیں فرصت یک نگاہ بھی کہاں تھی۔ ہم نے یہ کب سوچا تھا کہ یہ دھرتی جس پر ہم ساتھ ساتھ قدم اٹھانے کے لیے لوٹ آئے ہیں، یوں بھی ہوگا کہ ہمارے پیروں تلے سے سرک جائے گی۔

اب یہ سب کچھ کیا ہو گیا ہے۔ جب میں دفتر سے گھر لوٹتا ہوں تو ہم ایک دوسرے کو کیسے اجنبی اجنبی سے لگتے ہیں۔ جیسے جانتے تو ہوں لیکن پہچان نہیں پا رہے ہوں — ابھی کل ہی کی تو بات ہے — میں نے تم سے کہا تھا کہ تم سارے گھر کی صفائی کے بعد چہرے اور بالوں پر اَٹے ہوئے گرد و غبار کو اُبٹن اور غازہ سمجھ کر اس طرح مطمئن ہو جاتی ہو کہ مجھے تمھارے چہرے کی یہ بیوگی اچھی نہیں لگتی — اس بات کی تلخی شاید تمھیں کھل گئی تھی۔ تم نے دوسرے دن بناؤ سنگھار کیا — اور جب میں گھر لوٹا تو مجھے اپنے گھر میں اجالے اجالے سے نظر آئے — لیکن تم بہت جلد بھول بھال گئیں کہ میرے لیے تمھیں یہ اہتمام زندگی بھر کرنا ہے۔ خواہ گھر کا سارا بوجھ سمیٹتے سمیٹتے تمھارے ہاتھ شل کیوں نہ ہو گئے ہوں۔

پھر میں یہ سوچ کر رہ گیا ہوں کہ چلو، تم نے ٹھیک ہی کیا ورنہ کہیں اس اجالے کا تصور کبھی مٹ جاتا تو — کیونکہ تمھارے کنوارے الھڑ پن کو سہاگ کی سپردگی عطا کرنا تو میرے بس میں تھا لیکن تم کو اس سہاگن بیوگی کو چھین لینا خود میرے بس میں کہاں ہے۔ جی چاہتا ہے، اس سے پہلے کہ تم اس معاشرہ کے ہاتھوں ایک چلتی پھرتی کہانی بن جاؤ، اور میں ایک جیتا جاگتا افسانہ تم سے جی بھر کے محبت کی باتیں کر لوں — ایسی باتیں جن کا اسکول کی فیس نہ دے سکنے کے باعث ننھے منے کے امتحان میں عدم شرکت سے کوئی تعلق نہیں ہے — نہ ہی ان باتوں کا تعلق تمھارے ننگے ہاتھوں سے ہے جن میں چوڑیاں نہیں کھنکتیں نہ سونے گلے سے جس میں کالی پوت کا لچھا تم کبھی ضروری سمجھتی تھیں — ہم شاید زندگی کی ان مہملات سے بہت آگے نکل آئے ہیں، کیوں کہ ہم لوگ پڑھے لکھے لوگ ہیں، سمجھ دار لوگ ہیں، میں تم سے ان چھوٹی چھوٹی آرزوؤں کی بات بھی نہیں کرنا چاہتا ہوں جن کو کبھی تم نے اور کبھی میں نے قتل کر دیا ہے — مجھے تو تم سے محبت کی باتیں کرنی ہیں — تم سے صرف اتنا پوچھنا ہے کہ کیا ہمیں اپنے سن و سال کی ساری پونجی کھو کر ایک دوسرے کو سمجھے بغیر ہی اس دنیا سے گزر جانا ہے؟

مجھے تو تم سے اتنا پوچھنا ہے کہ اس دن، جب تم اپنے دور افتادہ بھائی کو کوسنے دے رہی تھیں کہ اس نے تمھاری زندگی تباہ کر دی، اس لیے کہ وہ تمھاری اور میری محبت کے پروان چڑھانے میں ایک وسیلہ رہا تھا، مجھے بتاؤ کیا تم یہ سچ کہہ رہی تھیں؟ اگر یہ سچ ہے تو اتنا بھیانک سچ تمھیں نہیں کہنا چاہیے تھا۔ اس لیے کہ سچائی اگر موت کی طرح سفاک ہو تو زندگی کے خوب صورت جھوٹ میں اسے چھپا لینا چاہیے۔

ہم انسان ہیں، لے کر تو کچھ آئے نہیں تھے نہ کچھ لے کر جائیں گے ہی۔ لیکن ایک دوسرے کو کچھ دینے لینے میں کیوں بخل سے کام لیں۔

اسی لیے تو میں تم سے آج صرف محبت کی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ فی الوقت تم بھی اس حقیقت کو بھول جاؤ میں بھی اس حقیقت سے آنکھیں چرا لوں کہ ہم اپنی محبت کی باتیں ختم کر لیں تو مجھے دانے دانے کی تلاش میں سرگرداں ہو جانا ہے۔ اور تمھیں ننھے منے جھرمٹ میں بیٹھ کر روٹیاں بیلنی ہیں اور انھیں جھوٹی سچی کہانیاں سنانی ہیں کہ پرستان کا شہزادہ ٹھنڈے میٹھے پانی کو دودھ سمجھ کر پی جاتا تھا۔

مجھے تو تم سے صرف اتنا کہنا تھا کہ نہ تم کو مجھ سے نفرت ہے نہ مجھے تم سے۔ بات اتنی سی ہے کہ تم میری جیب کو پہچان لو میں تمھارے آنسوؤں کا راز جان لوں۔ ہم ایسی کٹھ پتلیاں ہیں کہ جن کی ریشمی ڈوریاں ہمارے معاشرے نے اپنی انگلیوں پر لپیٹ رکھی ہیں۔ لیکن بدنصیبی یہ ہے کہ ان کٹھ پتلیوں کا ذہن ہے، جذبہ ہے، احساس ہے اور جب تک یہ سب کچھ رہے گا نہ ہم مل جل کر خوش رہ سکیں گے نہ بچھڑ کر زندہ، اس وقت تک جب تک کہ یہ ریشمی ڈوریاں کٹ نہیں جاتیں۔

میری جیب سے تمھارے آنسوؤں تک جو راستہ جاتا ہے

آشون ۱۸۹۴ تک۔

وہ ایک ایسا پل صراط ہے کہ ہم پار اتر لیں تو پھر کوئی پرسش نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ تلوار کی دھار پر چلنا خشک آنسوؤں کے نیزے کی انی کو دل میں اتار کر لینے سے زیادہ مشکل نہیں ہے۔

جی چاہتا ہے کہ تمھارا ہاتھ تھامے ماضی کے ایک ایک چمن زار میں گھوم پھروں، کچی کلیاں پھر سے تمھارے راستہ میں بچھاؤں اور جب تم انھیں روند کر گزر جاؤ تو میں چن کر اپنے دامن میں محفوظ کر لوں کہ ان پر تمھارے نقشِ کفِ پا ہیں۔ اور اگر ایسے میں اپنی موٹر سائیکل پر سرپٹ بھٹا تا غلط والا سیٹھیا اس چمن زار میں در آئے اور میرا راستہ روک لے تو نہ تم کچھ پروا کرو نہ میں کچھ برا مانوں کہ اس عزت و توقیر کی میت کے اٹھ جانے سے ہماری محبت کو کیا لینا دینا ہے۔

کبھی کبھی سوچتا ہوں ہم لوگ کیسے پاگل سے لوگ ہیں! زندگی سے کچھ بھی تو نہیں مانگتے صرف اتنا حسنِ سلوک مانگتے ہیں کہ ہمارے بعد زندگی پر یہ حرف نہ آئے کہ اس نے ہم سے اچھا سلوک نہیں کیا۔

تمھیں یاد ہے کہ ایک سہانی شام کو ہم اپنی ساری اداسیاں سمیٹے چل پڑے تھے کہ شاید کہیں بہل جائیں۔ تم اس کوشش میں تھیں کہ مجھے خوش نظر آؤ۔ میں تمھیں یہ جتلانا چاہتا تھا کہ واقعی شام کتنی ـــ خوب صورت ہے کیونکہ مجھے ایک کہانی کا بہتر مواد میسر ملا تھا۔ جب ہم بستی چھوڑ کر اتفاقاً اس باغ کے قریب آ گئے جہاں کہ ہماری محبت کی ابتدا ہوئی تھی تو میں نے گفتگو کا موضوع بدل دینے کی کوشش کی تھی کیونکہ اس وقت تم مجھ سے اس قرض کی بات چیت کا آغاز کر چکی تھیں جو مجھ سے میری انا چھین رہا تھا اور تم سے تمھارا حسن۔ میں نے تم سے کہا تھا ـــ بتاؤ بھی ـــ دیکھو شفق کیسی پھول رہی ہے اور وہ حد نظر پر کون کس سے مل رہا ہے۔ کیا وہ بھی ہم ہی تو نہیں؟ لیکن کوئی چور تھا جو اس وقت بھی میرے دل میں گھسا میری محبت کی نگری لوٹ رہا تھا۔ یہاں تک کہ ہم اپنی اپنی سوچوں میں گم سم اس باغ میں داخل ہو گئے تھے جس کے پھول مرجھا چکے تھے جس کے گملے ٹوٹ گئے تھے جس کی کیاریاں اجڑ گئی تھیں جس کی روشیں خار دار جھاڑیوں میں الجھ چکی تھیں اور وہ مکان جس کے محراب میں

دیا جلا کر تم مجھے اپنے دل میں اترتا ہوا محسوس کرتی تھیں کیسا بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ مجھے اتنا یاد ہے بھی تو بالکل اسی مکان کی طرح لگا جیسے ایک کھنڈر دوسرے کھنڈر کے مقابل کھڑا ہو اور تم حیران حیران نظروں سے دونوں کو تک رہی تھی۔

یہ کیسا دکھ درد ہے کہ ہم ہجر کی لمبی راتوں کا کرب آج وصال کے لمحے میں محسوس کرتے ہیں۔ تم نے تو یہ سوچ کر میری جانب ہاتھ بڑھایا تھا کہ میرا ہاتھ تھام لوگی تو میں خود کو فاتحِ مکان و زماں سمجھنے لگوں گا اور میں نے یہی کچھ سمجھا بھی۔

لیکن اگر تمھارے ہاتھ جن میں پھولوں کی کومل تھی اب اتنے کھردرے ہو گئے ہیں کہ میرے اپنے ہاتھوں کی بے حسی اس لمس کے فرق کو بھی محسوس نہیں کر سکتی ہے تو بتاؤ میں کہاں قصوروار ہوں، تمھارا کہاں دوش ہے۔ محبت تو انسانی عظمت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ تمھاری عرقِ عرق پیشانی سے اگر محبت مرجھا جاتی ہے میرے ذہن کی تابانی سے اگر سینے میں اندھیرے سے جنم لیتے ہیں تو نہ تم محبت کو بدو عا دو نہ میں اپنے شعور کے اجالوں کو قتل کروں۔ بعض اوقات کیسی چھوٹی چھوٹی مصلحتیں زندگی کے سمندر کی اتھاہ گہرائی کی چغلی کھاتی ہیں۔ ہم اپنے مجروح احساسات کو چھپا لینا چاہتے ہیں تو مسکراہٹ میں بھی یہ جراحتیں بکھر جاتی ہیں اور یہ تبسم کیسا زخمی دکھائی دیتا ہے۔

میں نے تمھاری خوشی کو اپنی خوشی اور تمھارے دکھ کو اپنا دکھ سمجھنے کی جو باتیں کی تھیں کیا میں وہ سب بھول گیا ہوں؟ ـــ پنجرے سمیت اڑ جانے کی سوچنے والا میں پر کٹے پرندے کی طرح زمیں ناپ رہا ہوں۔

میں ایک جینے کی ڈگر سی پڑ گئی ہے جس کو میں عادت کا نام دے کر اپنی شکست خوردگی کے احساس کو نرم کر لیتا ہوں۔ اور تم مصلحتاً اسی کو میری محبت سمجھ لیتی ہو۔

میری کہانیوں کا پہلا مجموعہ جس دن چھپ کر اپنے گھر آیا تھا میں نے پہلی کاپی تم کو نذر کی تھی۔ میں کتنا مطمئن مطمئن سا تھا جیسے کوئی باپ اپنی بیٹی کا گھر بستا ہوا دیکھ رہا ہو۔ لیکن تمھارے

دل میں دور دور تک ماتا کی کوئی کرن نہیں تھی۔ تم نے مسکرا کر یہ کتاب قبول کر لی۔ میں نے اس مکان میں زخموں کا ایک چمن دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔ ہم نے اپنا آبائی گھر بیچ دیا تھا۔ ناقابل برداشت قرض کی ادائیگی کے بعد جو کچھ بچ رہا تھا وہ اس کتاب میں لگ گیا تھا۔ تم تو ماں ہو تم نے یہی سوچا ہوگا کہ کہانیوں نے تو گھر بنا لیا پر حقیقتوں کا گھر نیلام ہو چکا ہے۔ تم نے ٹھیک ہی سوچا تھا۔ میں نے انھیں چھیڑنے کے لیے کہا تھا ـــــ اپنی کہانیاں مجھے بڑی پیاری ہیں کیوں کہ میں نے انھیں جنم دیا ہے۔ وہ میری معنوی اولاد ہیں لیکن ان سے تمھارا سلوک سوتیلی ماؤں کا سا کیوں ہے؟ تم مسکراتے ہوئے ایک دم سنجیدہ ہوگئی تھیں۔ پھر آبدیدہ ہوگئیں اور تمھارے آنسو میرے پہلے مجموعے کی پہلی کاپی پر گر پڑے جو تمھارے ہاتھوں میں تمھاری نظروں کے سامنے کھلا ہوا تھا اور میں نے تمھارے ہاتھ سے اپنی یہ کتاب واپس لے کر بڑے جتن سے بک شیلف میں سجا دی کہ اس میں میرا خونِ جگر بھی شامل ہے تمھارے آنسو بھی۔

تم ہی بتاؤ کہ اپنی محبت میں اس بات سے تو کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے کہ میں ایک ایسی عظیم زبان کا ادیب ہوں جس کی موت کے بعد مستقبل کو اس کی تحریر کا ایک حرف ہی ملتا ہے اور نہ اس کی قبر کا نشان لیکن اپنی نسل کے بہت سے دیوانوں میں اگر میں بھی شامل ہوں اور ہم اپنے اپنے خون سے دیے جلا کے ایک دوسرے ہی کو راستہ سمجھانے چلے ہیں تو کیا تمھیں اس دیوانگی پر پیار نہیں آتا جو مستقبل سے آس لگائے بغیر ہی اپنے حال میں مست ہے۔



حافظ صاحب (صفحہ ۱۸ کا بقیہ)

کے ساتھ مٹ رہی ہے، جو کہ عبارت تھی شرافت، بھلمنساہت، خلق، نرم روی، سادگی، وضعداری اور غمخواری سے۔ ایک دفعہ اندوہناک حیرت کے ساتھ ذکر کر رہے تھے زمانہ کی بے حسی کا۔ ایک صاحب کی رحلت کی خبر پاکر جو نئی دہلی کی ایک سرکاری کالونی موتی باغ میں رہتے تھے، حافظ صاحب تعزیت کے لیے گئے۔ انتقال کو چند گھنٹے ہو چکے تھے لیکن ہمسائے یہ بھی نہ بتا سکے کہ مرنے والے کا گھر کون سا ہے۔

حافظ صاحب کی پرواز بلند نہ تھی، میانہ روی و پیادہ روی کا دامن انھوں نے کبھی نہ چھوڑا لیکن ان کی پیادہ روی ان کے رسوخ و طاقت کی ضامن تھی، اور ان کے حسنِ کردار کی عماز مشہور یونانی ہیرو کی طرح زمین پر ان کا جو قدم پڑتا ان کی طاقت میں اضافہ کرتا تھا۔ ان کا حلقۂ انتخاب ان کی تحویل میں تھا، چنانچہ ان کے صاحبزادہ کو اسی نے مجلس آئین ساز میں بھیجا۔ حافظ صاحب اپنے حلقۂ انتخاب کو چھوڑ کر دلّی کیا آئے گوشت ناخن سے جدا ہوگیا۔ چند سال کے بعد انھیں الیکشن کے اکھاڑہ میں پچھاڑا گیا، ایک اجنبی حلقۂ انتخاب سے۔ جاتے جاتے انھوں نے چناؤ میں ہار کر بھی سیکھ لیا۔ لیکن یہ ان کا دورِ اضمحلال تھا اور کسی دوسرے کا حلقۂ انتخاب۔

وزارت سے پہلے نگینہ اور بجنور میں حافظ صاحب نے کامیاب وکالت کی۔ ان کی گفتگو کی دلآویز جرح کو اسی دور کی یادگار سمجھیے۔ وکالت سے انھوں نے جو کمایا اور وزارت میں جو کچھ پایا اس کا ایک بڑا حصہ سیاست میں گنوا دیا۔ سیاست نے ان کے تجربے میں اضافہ کیا اور ان کے سرمایے میں تخفیف لیکن ان کی وضع میں ترمیم نہ کر سکی۔ وہی شیروانی، وہی علی گڑھ قطع کا پائجامہ، میانہ قد، گداز جسم کی طرف مائل، دم فکر دلکش و تامل کا وہی ارتباط، وہی جمہوری دربار، وہی ایک تاریخ میں جاگنا اور دوسری تاریخ میں سونا، وہی انسانیت، وہی ظرافت، وہی ہمدردی، وہی غم خواری، وہی حسنِ اطوار، وہی گلفشانیٔ گفتار۔



آفتاب کی پہلی کرن

عشرت دھولپوری

(باپو کے تئیں نذرِ عقیدت)

اے ہم نشیں نہ دورِ غلامی کا حال پوچھ
لب بند تھے کہ درد کا اظہار بھی نہ ہو
زنداں کے پاسبانوں کا فرمان تھا یہی
زنجیر پاؤں میں رہے جھنکار بھی نہ ہو

تھے باغباں کے بھیس میں گلچین و گل فروش
پھولوں کا گلستاں میں کوئی پاسباں نہ تھا
بگڑا ہوا نظامِ چمن تھا کچھ اس قدر
محفوظ بجلیوں سے کوئی آشیاں نہ تھا

جس وقت ماں کی گود میں تو نے جنم لیا
باپو! وہ ایک لمحہ بڑا دل نواز تھا
جس طرح ایک لفظ میں پنہاں ہو داستاں
پوشیدہ ایک لمحے میں صدیوں کا راز تھا

آزادیِ وطن کی لڑی جنگ اس طرح
تو نے مخالفوں کو اصولوں سے دی شکست
تیر و سنان و خنجر و تلوار کی جگہ
سچائی اور صبر کے پھولوں سے دی شکست

تو ہے وہ روشنی جو اندھیروں کو چیر کر
منزل کا رہ نوردوں کو پیغام دے گئی
تو ہے وہ آفتاب کی پہلی کرن کہ جو
نکلی تو ظلمتوں کا سحر نام دے گئی

شملہ سمجھوتہ

جوہر ہاشمی

بات چیت کے ذریعہ
مسائل کے
یکسوئی سے
متاثر ہو کر

افسانۂ ماضی کو فراموش کرو اب
بگڑے ہوئے حالات کو حکمت سے سنوارو
نظروں میں لیے پیار کا مستقبلِ رنگیں
آواز دو خوشیوں کو بہاروں کو پکارو

فانوس جو روشن ہوا ایوانِ طرب کا
اس دیپ سے اب سیکڑوں تم دیپ جلاؤ
دل جس نے ہو مسرور نظر جس سے منور
وہ پیار کا دنیا کو نیا گیت سناؤ

لہرانے لگے پرچمِ نو امن و وفا کے
اب پھر سے در و بام ہوئے جاتے ہیں روشن
جس پیار کی خوشبو کی ضرورت ہے جہاں کو
اس پیار کی خوشبو سے مہکنے لگا گلشن

اب جذبۂ الفت سے جہاں ہو گیا مسرور
ہم پیار کا دنیا میں چلن عام کریں گے
آپس میں ہم اک دوسرے پہ ہو کے مہرباں
انساں کی بھلائی کے لیے کام کرینگے

اب دونوں ممالک ہیں رواں راہِ وفا پہ
دونوں ہی کا ہے منزلِ الفت کا ارادہ
اک جان دو قالب نہ ہوں کیوں سب کی نظر میں
منزل وہی دونوں کی وہی دونوں کا جادہ

سمجھوتہ ہے شملہ کے لیے قلب و نظر صاف
اخلاص ہر اک فعل میں اب ہو گیا شامل
ہم منزلِ ہستی کے طلبگار رہے ہیں
مل جائے گی اک روز بالآخر ہمیں منزل

دو دیشوں میں پھیلے گا محبت کا اجالا
سمجھوتہ ہے شملہ کا بلندی میں ہمالہ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ

حقائق کی روشنی میں

پروفیسر بشیر الدین

تقریباً ۵۰ سال کی ملازمت کے اپنے تجربے کے بعد جو کئی لحاظ سے اہم ہے اور جس میں ۱۸۷۷ء میں سرسید احمد خاں کے قائم کردہ کالج کے، جسے ۱۹۲۰ء میں یونی ورسٹی کا درجہ دے کر علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے نام سے موسوم کیا گیا دو سال بھی شامل ہیں اور اسی قدر مدت تک یونی ورسٹی سے قریبی رابطے کی زندگی گزارنے کے بعد مجھے اس بات کا یقین ہے کہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی ترمیمی ایکٹ کے مضمرات اور اثرات کا اندازہ اس ادارے کے ماضی پر نظر ڈالے بغیر نہیں لگایا جا سکتا۔ چنانچہ زیر نظر مضمون میں میری یہی کوشش ہے کہ اس پس منظر کو موٹے طور پر واضح کر دوں کیوں کہ درج کے اعتبار سے یونی ورسٹی، کالج ہی کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

مجھے اکثر اس بات پر حیرانی ہوئی ہے کہ سرسید کی سوانح حیات لکھنے والوں میں سے، جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے شمالی ہندوستان میں سرسید احمد خاں کی مذہبی اور معاشرتی اصلاحات کی تحریک کو مسلمانوں کے احیاء کی تمہید بتایا ہو۔ یہ تحریک ۱۸۵۷ء کے المیہ کے بعد بے حسی کے عالم میں سرد بازار کی نذر ہو گئی ایک طرح سے یہ تحریک راجہ رام موہن رائے (۱۸۳۳ - ۱۷۹۲) کی طرف سے چلائی گئی تحریک ہی کے سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ راجہ رام موہن رائے نے انیسویں صدی کے آغاز میں ہندو سماج کو بیدار کرنے اور اس میں نئی روح پھونکنے کے لیے بنگال میں ایک تحریک چلائی تھی۔

مشترکہ باتیں

راجہ رام موہن رائے نے ویدوں اور اپنشدوں کی نئی تشریح کی سرسید احمد خاں نے بھی جدید علوم کی روشنی میں قرآن کریم کی تفسیر لکھی تاکہ تعلیم یافتہ طبقے کو اسلامی تعلیمات سے متاثر کیا جا سکے اور زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ گمراہی اور ظلمت پسندی کی جو تہہ چڑھی ہوئی ہے اسے دور کیا جا سکے۔ راجہ رام موہن رائے نے اس بات کی پرزور حمایت کی کہ مغربی تعلیم کے حصول کے ذریعہ سے ہی سماجی اصلاح ممکن ہے۔ انھوں نے اندرون بنگال ایسے اسکول قائم کیے جن میں انگریزی زبان کے ذریعہ تعلیم دی جا سکے۔ ان کے پرستاروں میں سے ایک شخص ڈیوڈ ہیئر نے راجہ رام موہن رائے کی پرجوش قیادت کے زیر سایہ کلکتہ میں ۱۸۱۷ء میں گویا کہ سرسید احمد خاں کے سال ولادت میں ہندو کالج قائم کیا جو اب پریسیڈنسی کالج کے نام سے مشہور ہے۔ اسی طرح سرسید نے بھی مراد آباد، بریلی اور دارالسلطنت میں اسکول قائم کئے اور اس کے بعد علی گڑھ ایم اے او کالج کی بنیاد ڈالی۔ راجہ رام موہن رائے نے بنگالی نثر کو ایک نیا طرز عطا کیا۔ سرسید احمد خاں نے بھی اردو میں سہل نگاری کی بنیاد ڈالی اور اردو نثر کو ایک نیا انداز عطا کیا جس سے اردو میں ایک نئی جان پڑ گئی۔ راجہ رام موہن رائے کی طرح سرسید نے بھی انگریزی زبان کے ذریعہ تعلیم دیتے جانے والے اسکولوں اور کالجوں کی جگہ محض مشرقی علوم کے مدارس کھولے جانے کے لیے برطانوی دباؤ کی مخالفت کی۔ سرسید احمد خاں اور راجہ رام موہن رائے دونوں ہی پرزور خطیب ہونے کے علاوہ مصنف بھی تھے اور سماجی برائیوں کے خلاف صف آرا تھے۔ اپنے اپنے خیالات کے باعث دونوں ہی کو برا کہا گیا اور بدنام کیا گیا۔ جس طرح راجہ رام موہن رائے کو ہندو سماج میں کٹر قسم کے ہندوؤں کی طرف سے ذات سے خارج کر دیا گیا اسی طرح مسلمانوں میں سخت اور کٹر قسم کے مذہب کے ٹھیکیداروں کی طرف سے سرسید پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا۔ سرسید اور راجہ رام موہن رائے دونوں ہی انگلینڈ گئے تھے اور دونوں ہی واپسی پر برطانوی ثقافت سے بے حد متاثر تھے۔ ایک سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ دونوں ہی فارسی کے ماہر تھے۔

میں جس بات کو واضح کرنے کی کوشش کر رہا ہوں وہ یہ کہ اگرچہ دونوں کے مقاصد اور ان کے حصول کے تئیں انداز نظر میں قریبی یکسانیت تھی تاہم ان میں سے ایک کامیاب ہوا اور دوسرا ناکام رہا۔ صاف صاف

لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ راجہ رام موہن رائے بنگال میں ہندو سماج میں نئی بیداری اور ان میں نئی روح پھونکنے کے مقصد میں کامیاب ہو گئے جبکہ سر سید احمد خاں کا شمالی ہندوستان کے مسلمانوں میں اس طرح کی بیداری لانے کا خیال محض ایک خواب ثابت ہوا۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ سر سید کے اسلاف کی نویں اور دسویں صدی کے بغداد، قاہرہ اور قرطبہ (اسپین) کے اسلامی تہذیب کے زریں عہد کی نشاۃ ثانیہ کی کوششیں بے کار ثابت ہوئی تھیں۔

معاملے کی حقیقت یہ ہے اور یہی اس مضمون کی کلیدی بات ہے کہ راجہ رام موہن رائے کے کاز کی حمایت کرنے والے تو بنگال کے روشن خیال طبقوں میں کئی لوگ تھے مثلاً ٹیگور وغیرہ جنھوں نے ہندوؤں کے احیاء کے لیے راجہ رام موہن رائے کا پورا پورا ساتھ دیا تاہم سر سید احمد خاں کے ساتھ معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا حتیٰ کہ ان کے اندرونی حلقہ احباب میں بھی کوئی ایسا نہیں تھا جو مغربی تعلیم اور سماجی اصلاح کے ذریعے مسلمانوں کی بہبود و بہتری کے سلسلے میں ان کے ترقی پسند خیالات و نظریات سے متفق ہوتا۔ ان کے ساتھیوں میں زیادہ تر اس وجہ سے ان کے ساتھ تھے کہ وہ برطانوی حکمرانوں کی نظر میں ایک پسندیدہ شخصیت تھے۔ ان کے رفقائے کار میں سب سے سب ان کی اس کوشش میں کھلے دل سے ان کے ساتھ نہ تھے جو وہ اسلام کو بہت سی ایسی فرسودہ بدعات سے پاک و صاف بنانے کے لیے کر رہے تھے جو زمانہ گزرنے کے ساتھ ساتھ اسلام میں داخل ہو گئی تھیں۔ سر سید کو ایک اور عظیم قربانی یہ دینی پڑی کہ انھیں اس رسالے کی اشاعت بند کر دینا پڑی جس کے ذریعے وہ اپنے ترقی پسند خیالات عوام تک پہنچاتے اور ان کی بابت خواہشات اور مالی امداد حاصل کیا کرتے۔ ان کے حامیوں میں زیادہ تر ایسے تھے جن کا تعلق امراء کے طبقے سے تھا اور جو علی گڑھ کے آس پاس بستے تھے اور جو ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد انگریزوں کی بیڑاوار تھے۔

اس حلقے کی طرف سے اپنے کاز کو شدید خطرہ محسوس ہوتے دیکھ کر سر سید نے اپنے ذہین صاحبزادے کو جو الٰہ آباد ہائی کورٹ کے مشہور و معروف جج تھے، اپنا جانشین اور لائف سکریٹری نامزد کرنا چاہا کیونکہ وہی ایک ایسی شخصیت تھے، جو سر سید کے خیالات کے ہمنوا تھے اور سر سید کو ان پر اعتماد بھی تھا۔ کالج کے ٹرسٹیوں و متولیوں کی کمیٹی نے جس میں کہ جاگیردار بھرے تھے، سخت اور کٹر قسم کے لوگ تھے، اس غیر سنجیدہ الزام کی بنا پر سر سید کی بات مسترد کر دی کہ ان کے بیٹے سید محمود شراب کے عادی ہیں۔ سید محمود نے عالم مایوسی میں ۱۸۹۸ء میں وفات پائی جبکہ ان کی یہ خواہش پہلے ہی نامنظور کی جا چکی تھی کہ ان کے بعد ان کے بیٹے سید محمود کو کالج کا سکریٹری بنا دیا جائے۔

میدان صاف پا کر کالج کے منتظمین پر ایسے لوگوں کا غلبہ ہو گیا جو ظلمت پسندی کے باعث اعلیٰ تعلیم کے خلاف تھے۔ بعد میں یہی لوگ یونیورسٹی کے منتظم ہوئے جس کی ۱۹۲۰ء میں اس کی بنیاد پڑی۔ یہ سب کے سب سلطنت انگلشیہ کے منظور نظر تھے اور انھوں نے اپنے معمولی ذاتی فائدوں اور اغراض کے تحت ادارے کو سلطنت انگلشیہ کے آلہ کاروں کے سپرد کر دیا تھا چنانچہ یونیورسٹی کے اسٹاف میں انگریز کلیدی مقامات پر فائز تھے اور انھوں نے مسلمان نوجوانوں کو بڑی ہوشیاری سے اس مشہور درس گاہ کی چار دیواری کے باہر بدلتی ہوئی فضا سے بیگانہ رکھا۔ اس کے لیے انھوں نے مختلف طریقے اپنائے چنانچہ ان میں سے ایک یہ تھا کہ روشن خیال طلباء کی حوصلہ شکنی کی جائے اور پسماندہ طلباء کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ اس کام میں انھیں کالج کے غیر تعلیم یافتہ جاگیردار سکریٹری کی پوری حمایت حاصل تھی۔

۱۹۱۹ء میں برطانوی عملے کے چلے جانے کے بعد کالج کا انتظام جس شخص کے ہاتھ میں آیا اس نے انگریز کی بنائی ہوئی پالیسی کو پوری طرح نبھایا اور اسے برسر اقتدار جاگیرداروں کی حمایت حاصل رہی

تعلیم کے شعبوں میں گویا گوں تجربے کے مالک اور انتہائی ذہین شخص کی قیادت میں یونیورسٹی نے ۱۹۲۰ء کے اواخر میں جنم لیا۔ نتیجے کے طور پر اس وقت کی یوپی سرکار نے علی گڑھ کے گریجویٹوں کو اپنے تعلیمی محکمے میں ملازمتوں کے لیے درخواست دینے کے لیے ناموزوں قرار دیا

۱۹۲۹ء میں ان سے اختیارات لے لیے گئے اور ۱۹۲۵ء میں وہ دوبارہ اپنے عہدے پر فائز ہوئے۔ اس وقت کے وائسرائے لارڈ ولنگڈن کی نظر عنایت سے انھیں نائٹ کا خطاب ملا اور کچھ مزید اختیارات حاصل ہوئے تاکہ ان ترقی پسندانہ رجحانات کو دبایا جا سکے جو یونیورسٹی میں ان کے عہد میں تقویت پا رہے تھے۔ یونیورسٹی کے قیام کے بعد وہ صحیح معنوں میں تعلیمی شخصیت کے حامل وائس چانسلر ہوئے تھے اور وہ تھے سر سید کے پوتے جنھوں نے یونیورسٹی کیمپس میں آزادانہ اظہار فکر کی ابتدا کی۔

اس طرح یونیورسٹی میں اب اس طرح کے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ وہاں مسلم لیگ کا خیر مقدم کیا جا سکتا اور مسٹر جناح اور ان کے ساتھی مثلاً مسٹر لیاقت علی

چودھری خلیق الزماں اور ناظم الدین احمد بیت سے دیگر اکابرین کو خوش آمدید کہا جا چکے۔ علیگڑھ ڈسٹرکٹ کے لیے ایک گڑھ بن گیا اور صرف مشکل سے بارہ سرگرم مخالفوں کو چھوڑ کر علی گڑھ پر مسلم لیگ کا قبضہ ہو گیا۔ اس موقع پر جاگیردارانہ نظام نے جو کہ یونیورسٹی کی قسمت کا مالک بن بیٹھا تھا اور جس کے ہاتھ میں اختیارات تھے، لیگ کے رہنماؤں کو خوش آمدید کہا۔ لیاقت علی نے گرج کر یونیورسٹی میں طلباء کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وہ اپنی کتابیں جلا دیں اور ملک کا دورہ کر کے مسلم لیگ کے پاکستان کے مطالبے کی آواز گھر گھر پہنچائیں۔ جن نظمی بھر افراد نے مخالفت کی انھیں سخت نتیجہ بھگتنے کی دھمکی دی گئی۔ اس تحریک میں مقامی زمیندار پیش پیش تھے۔

۱۹۴۷ء کے بعد بھی یونیورسٹی کی صورت حالات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ "مسلمانوں کی نفسیاتی بحالی" کی پالیسی پر عمل پیرا ہونے کے لیے حکام نے کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں سمجھی۔ جس شخص نے بھی استادوں اور طالبعلموں میں ظلمت پسندی اور رجعت پسندی کے بڑھتے ہوئے رجحانات سے نپٹنے کی کوشش کی اسے ادھر ادھر کر دیا گیا۔ آج یہی قوتیں استادوں اور طالبعلموں کے ذہنوں میں ڈیرہ ڈالے ہوئے ہیں مختصراً یہ کہ یونیورسٹی تحقیق اور مطالعے کا مرکز نہ رہ کر ایک ایسا ادارہ بن گئی جہاں سیکولرزم کو مقبولیت حاصل نہ ہو سکی

مخالفت کی کوئی وجہ نہیں

لہٰذا یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ کوئی ایسا اقدام نہیں ہے جو بہت عجلت میں کیا گیا ہو اور یہ بات سمجھ سے باہر ہے کہ بھارت میں بدلے ہوئے حالات کی روشنی میں مسلمانوں کی بہبود کے لیے فکرمند کوئی بھی شخص کس طرح اس اقدام پر نکتہ چینی یا اس کی مذمت کر سکتا ہے۔ یونیورسٹی کا نام تبدیل نہیں کیا گیا ہے۔ یونیورسٹی کے اقامتی کردار کو جوں کا توں رہنے دیا گیا ہے۔ شتی اور شعبہ دینیات کے شعبوں اور شعبۂ علوم اسلامی کو نہیں چھیڑا گیا ہے۔ میڈیکل اور انجینئرنگ کالجوں میں نشستوں کی نصف تعداد کو علی گڑھ کے طلباء کے لیے مخصوص کر دیا گیا ہے۔ مختلف اکیڈیمک تنظیموں میں استادوں کو پہلے سے زیادہ موثر مقام دیا گیا ہے۔ ملک میں کسی بھی یونیورسٹی کی تاریخ میں یہ پہلا موقع ہے کہ طلبا کی تنظیم کو کورٹ میں نمائندگی دی گئی ہے اور اس طرح ان کے مفادات پر اثرانداز ہونے والے معاملات میں ان کو موثر رول ادا کرنے کو کہا گیا ہے۔ یہ سچ ہے کہ نئے ایکٹ کی رو سے وائس چانسلر کے اختیارات کو بڑھا دیا گیا ہے لیکن یہ کیمپس کے خصوصی حالات کے پیش نظر ضروری تھا۔ اس طرح کے اختیارات کی عدم موجودگی میں موثر اور فوری اقدامات ممکن نہ ہوتے۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں جس قدر بھی اعتراضات ہوئے ہیں ان کا کوئی اصولی جواز نہیں ہے۔ یونیورسٹی میں ہمارا واسطہ خالصتہً علمی ترقی سے ہوتا ہے چنانچہ اس مقصد کے حصول کے ضمن میں پردھان منتری نے صحیح ہی کہا ہے کہ "جب تک مسلمان عوام کی صف میں ان کے دوش بدوش نہیں کھڑے ہو جاتے تب تک وہ ترقی کی راہ پر گامزن عوام سے قدم ملانے کے لیے آگے نہیں بڑھ سکتے۔"

ہلکا اشارہ

"اگر پردھان منتری کے مندرجہ بالا قول کی وضاحت کی جائے تو یہ علیحدگی پسندی کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ ہے اور اس ایکٹ کے نافذ کرنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ اس کمی کو دور کیا جائے۔ ہم نے اس عادت سے ماضی میں بھی بھاری نقصان اٹھایا ہے۔ اگرچہ یہ زندگی کے دیگر شعبوں میں بہت زیادہ سنگین نتائج ظاہر نہ کرتی ہو تاہم تعلیم کے معاملے میں تو یہ مسلّم قاعدہ ہے سیکولرازم کی فضا میں پنپنے کے لیے خود کو مقابلے کے لیے تیار کرنا ضروری ہے۔ تاہم اس عادت کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم میں مقابلے کا جذبہ پیدا نہیں ہوگا۔ یونیورسٹی میں اسی قسم کی پالیسی کو دیکھ کر بڑے دکھ ہوتا ہے۔ اگر ہم اس طرح کی پالیسی کے خطرناک نتائج سے سبق لینے کے لیے تیار نہیں ہیں تو یہ اقدام خودکشی کے مترادف ہوگا۔ کوئی شخص خواہ کچھ بھی کیوں نہ کہے مجھے اس کے کہنے میں ذرا تامل نہیں کہ پردھان منتری نے یونیورسٹی کو ایک اقلیتی ادارہ سانے کی مانگ پر کان دھر کر مسلمانوں کی زبردست خدمت کی ہے۔ مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ اس انداز نظر کو زیادہ وسیع پیمانہ پر توسیع نہیں دی گئی ہے۔

دوسرے یہ کہ بھارت کے وزیر تعلیم یہ اعلان کرنے میں حق بجانب ہیں کہ مسلم یونیورسٹی کے سامنے جو مقصد ہے وہ ہے جدید تعلیم کو فروغ دینا" اس طرح سے وہ سرسید کے اس مقصد کو یاد دلا رہے ہیں جو انھوں نے مسلمانوں کو جدید تعلیم سے روشناس کرانے کے لیے اپنایا تھا۔ دوسرے الفاظ میں اس ایکٹ کا مقصد یہ ہے کہ اس ادارے سے رجعت پسندانہ اور ظلمت پسندانہ سرگرمیوں کو خارج کر کے اسے جدید تعلیم کے فروغ کا ذریعہ بنایا جائے۔

(انگریزی مضمون سے تلخیص و ترجمہ)



سعید عارفی

کربِ احساس جو اس دل پہ قہر ہے یارو
یہ صحیفہ انھیں نظروں کا کرم ہے یارو

یہ پسند اپنی ہے یہ ذوقِ نظر ہے اپنا
وصل کا مجھ کو نہیں ہجر کا غم ہے یارو

درد کی دھوپ بھی ہے سایۂ محرومی بھی
شوق ہر حال میں شایانِ ستم ہے یارو

کتنا دشوار ہے انسان کی خاطر جینا
کیوں عبث کشمکشِ دیر و حرم ہے یارو

اُف وہ غم لب پہ جو آتا ہے تبسم بن کر
ہائے وہ درد جو عنوانِ کرم ہے یارو

سر وہی سر ہے جو سودائے جنوں رکھتا ہے
دل وہی دل ہے جو شائستۂ غم ہے یارو

رنج و اندوہ سے باقی ہے مسرت کا وجود
ظلمتِ شب سے اُجالے کا بھرم ہے یارو

روشنی روز نگل جاتی ہے اپنے پیکر
ہم پہ ہر روز اندھیروں کا ستم ہے یارو



ویدیہ پرکاش جوہر بجنوری

بہارِ شام نہ رنگینیِ سحر سے مجھے
نشاطِ دل ہے میسر تری نظر سے مجھے

قدم قدم یہ جبینِ نیاز جھکتی ہے
ہے ایک ربطِ نہاں تیری رہگذر سے مجھے

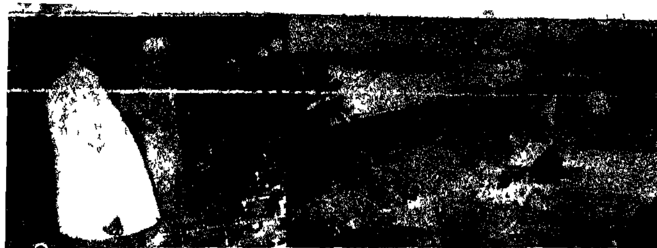
شعورِ عشق، شعورِ وفا، شعورِ حیات
ملی ہیں نعمتیں کیا تری نظر سے مجھے

ابھی اجل کو پیامِ حیات دینا ہے
ابھی ہیں کام بہت عمرِ مختصر سے مجھے

گزر گئے ہیں وہ جس راہ سے کبھی اک بار
ہزار بار گزرنا پڑا ادھر سے مجھے

جنوں سے بڑھ کے نہیں کوئی رہنما جوہر
ملا ہے درس یہ اک صاحبِ نظر سے مجھے

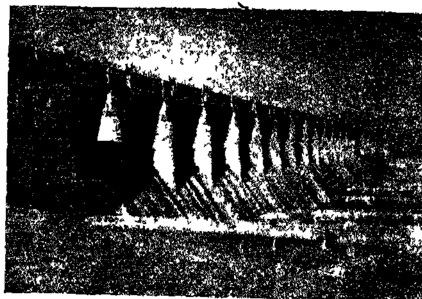
یوپی میں آزادی کے بعد کی ترقیاں



پنڈت جواہر لال نہرو کے ہاتھوں ریہاند باندھ کا افتتاح



چندر پربھا باندھ (ضلع وارانسی)



ماتا ٹیلا باندھ (جھانسی)

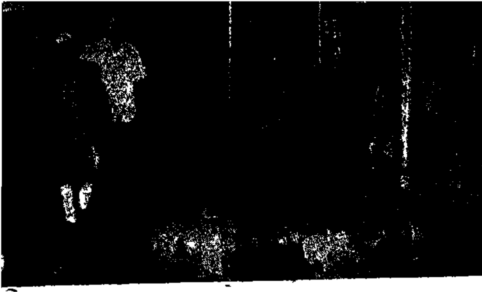
تصویروں کے آئینے میں



بان گنگا نہر



ڈلمئو پمپ نہر

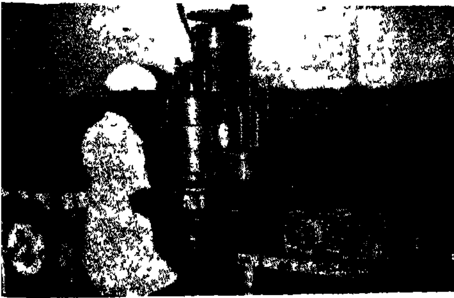


پنڈت جواہر لال سرو باز پور شکر مل
کا افتتاح کرنے کے بعد
شکر کی تیاری کا عمل دیکھ رہے ہیں



نائلون فیکٹری مودی نگر

یوپی کی ترقی

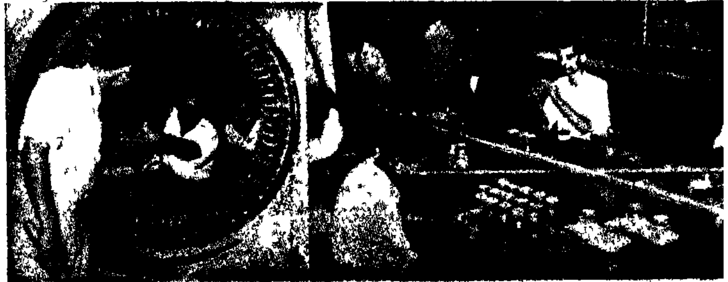


بے بی فوڈ فیکٹری، مراد آباد



امداد باہمی دودھ ڈیری، کان پور

کے آئینے

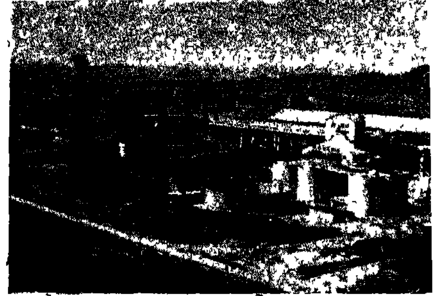


(داہنے) پری سیزن انسٹرومنٹ فیکٹری
(بائیں) بھارت ہیوی الیکٹریکل رانی پور

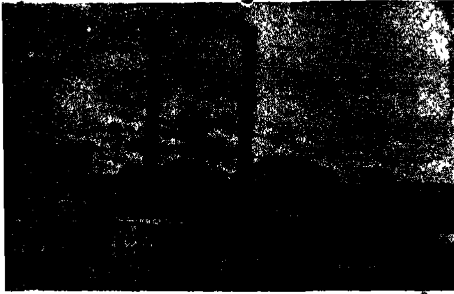
یوپی کی ترقی



وزیر اعلیٰ شری کملاپتی ترپاٹھی امداد باہمی شکر مل پلیا (ضلع لکھیم پور) کا افتتاح کرتے ہوئے۔

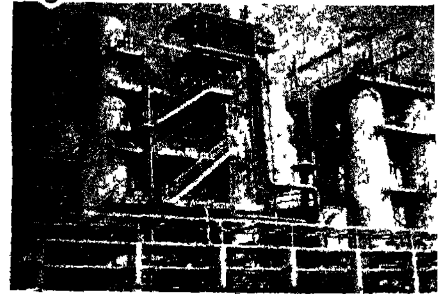


سرکاری ڈالا سیمنٹ فیکٹری، مرزاپور



سرکاری سیمنٹ فیکٹری چُرک ضلع مرزاپور

کے آئینے



ہندستان المونیم کارخانہ، مرزاپور



ڈیزل لوکوموٹیو کارخانہ، وارانسی

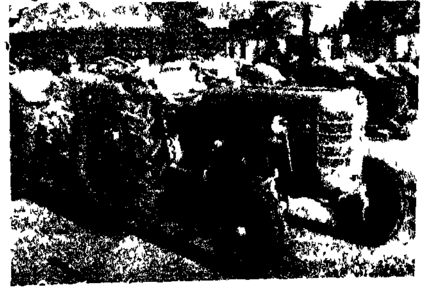
یوپی کی ترقی



وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کیمیاوی کھاد کے کارخانہ (گورکھپور) کا افتتاح کرنے کے بعد تقریر کرتے ہوئے (اپریل ۱۹۶۹ء)



وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی بیکی کھلی گھر کا افتتاح کرتے ہوئے



ایگرو انڈسٹریل کارپوریشن، تال کٹورہ لکھنؤ سے متعلق ٹریکٹر کارخانہ



ہردوا گنج تھرمل پاور اسٹیشن

ماتا ٹیلا پاور اسٹیشن کا سوئچ یارڈ



کے آئینے

مجاہدینِ آزادی

لال پدم دھر سنگھ

ہندستان چھوڑو تحریک کا ایک شہید

آر۔ سی۔ دوبے

ہندستان کی جنگ آزادی میں ۹ راگست ۱۹۴۲ء کا دن ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ اس دن کانگریس کمیٹی نے اپنے بمبئی اجلاس میں ایک اہم تجویز پاس کی جس کے مطابق انگریزوں سے ہندستان چھوڑنے کا پرزور الفاظ میں مطالبہ کیا گیا۔ تجویز کے پاس ہوتے ہی مہاتما گاندھی نیز دوسرے تمام لیڈروں کو گرفتار کرکے قید کر دیا گیا۔ لیڈروں کی گرفتاری کی خبر ملک کے گوشے گوشے میں آندھی کی طرح پھیل گئی اور ہر جگہ موضوع گفتگو بن گئی۔ اس خبر نے ملک میں غم و غصہ کی ایک عام لہر دوڑا دی اور عوام میں برطانوی حکومت سے نمٹ لینے اور اس کے خلاف سب کچھ کر ڈالنے کا جذبہ اور جوش اور بھی بڑھ گیا۔

ایک ہفتہ قبل یعنی ۲ راگست کو الہ آباد میں مسلسل بارش ہو رہی تھی۔ لیکن اس کے باوجود پرشوتم داس ٹنڈن پارک لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ پنڈت جواہر لال اس موسلا دھار بارش میں کھلی تقریر کر رہے تھے۔ ان کے قریب کھڑے ہوئے جب ایک شخص نے ان کو بارش سے بچانے کے لیے چھتری لگانے کی کوشش کی تو انھوں نے اپنے ہاتھ سے اس کو ہٹا دیا اور چھتری کی پیش کش کو کسی طرح قبول نہیں کیا۔ پنڈت نہرو کی اس معرکۃ الآرا تقریر کے دوران جب لوگوں نے ان سے یہ تاریخی الفاظ سنے کہ "کل میں بمبئی جا رہا ہوں۔ کانگریس کمیٹی کے فیصلے کے بعد میں واپس آسکوں گا یا نہیں، یہ میں نہیں جانتا۔ اگر ہم لوگ گرفتار کر لیے گئے تو کانگریس کمیٹی اور اس کا بوجھ آپ ہی لوگوں پر دیش کے نوجوانوں پر ہوگا" تو ان کے دلوں میں دبی ہوئی چنگاری شعلہ بن کر بھڑک اٹھی۔ پنڈت نہرو کی اس موثر اور جوشیلی تقریر سننے والوں میں زیادہ تر الہ آباد یونیورسٹی اور مقامی کالجوں کے طالب علم تھے۔ ان میں جوانی کا خون جوش مارنے لگا۔ جگہ جگہ جلسے ہونے لگے، اسکیمیں بننے لگیں، جلوس نکالے جانے لگے اور ہر طرف انقلاب زندہ باد کے نعرے بلند ہونے لگے۔

علم اور سیاست کا مرکز اور گنگا جمنا کے سنگم کا شہر الہ آباد بغاوت کی تیاریاں کر رہا تھا۔ غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لیے طالب علم اپنی جانوں کو ہتھیلی پہ لیے نکل پڑے۔ انھوں نے جانیں ہنس ہنس کے آزادی کی قربان گاہ پر چڑھا دینے کا جیسے فیصلہ کر لیا تھا۔ ہندستانی عوام کو ڈرانے اور ان کو دہشت زدہ بنانے کے لیے لیڈروں کو اندھا دھند گرفتار کرکے نامعلوم مقامات پر بھیجا جا رہا تھا۔ اس میں چھوٹے بڑے لیڈروں کا امتیاز نہیں تھا۔ لیکن لوگوں میں آزادی کی لگن اتنی بڑھ چکی تھی کہ ان استبدادی کارروائیوں کا ان پر کچھ بھی اثر نہ ہوا اور انھوں نے برطانوی سامراج کے اس چیلنج کو خوشی خوشی قبول کر لیا۔

یونیورسٹی کے طلبا نے ۱۱ راگست کو یونین ہال میں ایک زبردست جلسہ کرکے اپنے لیڈروں کی فہرست تیار کی۔ اس کے بعد جلوس کی شکل میں روانہ ہوئے جب جلوس جھا ہوسٹل اور بنرجی ہوسٹل کی درمیانی سڑک سے ہو کر گزرا تو پولیس کے سپاہیوں کو جو لاٹھیوں سے لیس سڑک کے دونوں طرف قطار باندھے کھڑے تھے، جلوس کو منتشر کرنے کا حکم ہوا لیکن طالب علموں کے اس بڑے مجمع نے پولیس کی آگاہی کے باوجود منتشر ہونے سے صاف انکار کر دیا اور انتہائی جوش کے عالم میں بلند آواز سے "انقلاب زندہ باد" کے نعرے لگانے لگے۔ پولیس کو لاٹھی چارج کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس وقت ایک بڑا ہی عجیب منظر

دیکھنے میں یہ آیا کہ لاٹھیاں تانے ہوئے ہاتھ اوپر اٹھائے ضرور گئے لیکن وہ ہاتھ اٹھے کے اٹھے ہی رہ گئے اور طالب علموں پر ایک بھی لاٹھی کا وار نہ ہوا۔ ہزاروں طلبا کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا یہ جلوس پولیس کے سپاہیوں کی قطاروں کو چیرتا ہوا، روکے اور لاٹھیاں تانے کھڑی تھیں کائی کی طرح چیرتا اور گاتا ہوا آگے نکل گیا:

"سر باندھ کفنوا ہے شہیدوں کی ٹولی نکلی"

اس وقت میں ہندو بورڈنگ ہاؤس کے کمرہ نمبر ۱۰ میں رہتا تھا۔ لال پدم دھر سنگھ جو بی۔ ایس سی کے طالب علم تھے، انھیں جب کسی ہوسٹل میں جگہ نہ ملی تو میری استدعا پر وہ بھی میرے ہی کمرے میں رہنے لگے تھے۔ ان سے میرا تعارف آگرہ میں دو سال پہلے ہوا تھا۔ وہ میرے بہنوئی کے دوست تھے اور جب دسمبر سنہ ۱۹۴۰ء میں آگرہ کی مشہور تاریخی عمارتیں دیکھنے آئے تو انھیں کے مہمان ہوئے۔ میں بھی ان دنوں وہیں مقیم تھا۔ میری ان کی یہ رسمی ملاقات رفتہ رفتہ دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ وہ بندیلکھنڈ کے ایک معزز اور با اثر راجپوت گھرانے میں ۱۴ اکتوبر سنہ ۱۹۱۳ء کو پیدا ہوئے تھے اور ۱۲ اگست سنہ ۱۹۴۲ء کو مادر وطن پر قربان ہو جانے کی سعادت حاصل کی۔ ان کی بے لوث اور سچی دوستی کے سب ہی معترف تھے۔ جو بھی ان کے قریب آتا بہت جلد ان کا گرویدہ ہو جاتا۔ ہم سب لوگ ان کو 'لال صاحب' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔

لال صاحب ہندو بورڈنگ ہاؤس میں میرے ساتھ بند رہ بیس دن ہی رہ پائے تھے کہ اگست سنہ ۱۹۴۲ء کی تحریک شروع ہو گئی۔ وہ شروع سے ہی متاثر خیالات کے تھے۔ آزادی کی لڑائی میں شامل ہونے کا یہ سنہری موقع ملا تو آیا تو ان کو بے انتہا خوشی ہوئی۔ انھوں نے اس سلسلے میں بہت سی اسکیمیں تیار کیں اور ان کو عملی جامہ پہنانے میں تن من دھن سے لگ گئے۔ ہم لوگ بھی ان کے ساتھ ہو گئے۔

ہندوستان چھوڑو تحریک نے ملک بھر میں ہلچل مچا دی تھی۔ ۱۲ اگست کا دن تھا اور صبح کا وقت۔ ہم لوگ نیشنل ہیرالڈ اخبار پڑھ رہے تھے۔ مختلف مقامات پر آزادی کے جانباز سپاہیوں کی برطانی سامراج سے مڈبھیڑوں، نہتوں پر گولیوں کی بارش، اور آندولن میں شریک ہونے والوں کے گھروں کو تاراج کرنے، مال و اسباب کو لوٹنے اور کھڑی فصلوں کو تباہ و برباد کیے جانے کی، خون کھولا دینے والی خبریں شائع ہوئی تھیں۔ اگرچہ برطانی حکومت کا ظلم و جور اور بربریت اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا لیکن ملک کے جاں نثاروں کے قدم آزادی کی منزل کی جانب بے خوف و خطر بڑھتے ہی چلے جا رہے تھے۔

ملک کے مختلف مقامات پر برطانی حکومت کی جانب سے بربریت کا جو ننگا ناچ ہو رہا تھا اس کی خبریں برابر آ رہی تھیں۔ الہ آباد یونیورسٹی کے ہم طالب علموں اور شہریوں کے دل اپنے خون سے آزادی کے افسانے کی سرخی لکھنے کے لیے بیتاب تھے۔ لیکن یونیورسٹی کے علاقے میں جب پولیس کی لاٹھیاں فضا میں بلند ہو کر ہمارے سروں تک نہ آئیں، مسلح پولیس کی سنگینیں اور گولیاں ہمارے کلیجوں کو چھیدنے اور سینوں کو چھلنی کرنے کے لیے آگے نہ بڑھیں تو ہمیں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ مادر وطن ہمارے خلوص اور جذبۂ قربانی سے مطمئن نہیں۔ حالانکہ اس دن ہم سنگینوں اور گولیوں کا استقبال کرنے کے لیے تیار ہی نہیں بلکہ بے چین تھے ___ مگر یہ ہمارا وہم ہی تھا۔ اس لیے کہ شہر کا چکر کاٹتے کاٹتے جب ہماری ٹولی ضلع کچہری کے سامنے پہنچی تو ہم نے دیکھا کہ ہماری آرزو پوری ہونے میں کچھ زیادہ دقت نہیں لگے گا۔ لاٹھیوں، ریوالوروں اور بندوقوں سے لیس برطانی حکومت کے محافظ یہاں ہمارا استقبال کرنے کے لیے پوری طرح تیار کھڑے تھے۔

جلوس جس میں شہر کے کونے کونے سے طلبا کی ٹولیاں "انقلاب زندہ باد" کے نعرے لگاتی ہوئی شامل ہوتی گئی تھیں اب ہزاروں کی تعداد پر مشتمل ہو چکا تھا۔ اس پر جوش ہجوم کے کچہری کے قریب پہنچتے ہی اس پر لاٹھی چارج شروع کر دیا گیا۔ ساتھ ہی دھمکی بھی دی گئی تھی "بھاگ جاؤ ورنہ بھون دیے جاؤ گے"۔ لیکن آزادی کے پروانے بھلا جلنے سے کب ڈرتے؟ لاٹھیوں کی بارش اور بھون دینے کی دھمکی بھی جب مجمع کو آگے بڑھنے سے روک نہ سکی تب بندوقوں کے بولٹ کھٹ کھٹانے لگے۔ شروع میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ تو ایسی معلوم ہوئی گویا پٹاخے چھٹائے جا رہے ہیں لیکن جیسے جیسے ہم آگے بڑھتے گئے گولیوں کی بوچھار صاف دکھائی دینے لگی۔ کچھ لوگ جھک جھک کر گولیوں کی زد سے بچنے اور کچھ ٹوٹے پیروں بھاگنے بھی لگے۔ یکایک مجمع سے لعنت و ملامت کی

اوازیں بلند ہوئیں جن میں لال صاحب کی آواز سب پر غالب تھی۔ "بزدلو! تھو ہے ایسی زندگی پر۔ لڑکیاں آگے بڑھ رہی ہیں اور تم بیٹھ دکھلا رہے ہو!"

بھاگنے والوں نے جب دیکھا کہ لڑکیاں بال کھولے اور ترنگا جھنڈا لیے بپھری ہوئی آگے بڑھتی چلی جا رہی ہیں تو ان میں سے بہت سے لوگ واپس لوٹ آئے اور آگ اگلتی ہوئی بندوقوں کی جانب بڑھنے لگے۔ لال پدم دھر کبھی جوش میں آگے بڑھتے کبھی مڑ کر ساتھیوں کو للکارتے اور مادر وطن کی آزادی کی خاطر جان قربان کر دینے کی تلقین کرتے۔ کچھ ہی دیر میں ہم لوگ کچہری کے احاطے میں پہنچ گئے اور نیم کے پیڑ سے ملحق ایک مثلث نما بڑے کٹہرے میں ہو گئے جس کے تین طرف لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔

آزادی کے یہ نڈر سپاہی 'انقلاب زندہ باد' 'بھارت ماتا کی جے ہو' 'انگریزو! بھارت چھوڑ دو' 'سامراج شاہی مردہ باد' وغیرہ نعرے لگا رہے تھے۔ دفعتاً لال صاحب کی گرجدار آواز سنائی دی۔ "لیٹ جاؤ، لیٹ جاؤ!" ہم سب پیٹ کے بل لیٹ گئے۔ جب تک گولیوں کی بوچھار ہوتی رہی ہم لوگ لیٹے رہے۔ گولیوں کی بارش ختم ہوتے ہی ہم سب اٹھ کر کھڑے ہو جاتے اور نعرے لگانے لگتے۔ اس طرح کئی بار گولیاں چلیں کئی بار ہم لوگ لیٹے اور اٹھ کر کھڑے ہوئے۔ مگر ہر حال میں زبان پر وہی نعرہ تھا — "انقلاب زندہ باد" "انگریزو بھارت چھوڑو"! بعض جوشیلے جوانوں نے عدم تشدد کا طریقہ ترک کر کے نزدیک پڑے ہوئے پتھروں، اینٹوں اور گٹوں کو پولیس والوں پر پھینکنا شروع کر دیا۔ یہ دیکھ کر لال صاحب نے چیخ کر کہا: "اینٹیں مت پھینکو، اینٹیں مت پھینکو۔" گولیوں کی بوچھار پھر ہونے لگی اور قریب

قریب سبھی لوگ زمین پر لیٹ گئے۔ اسی لمحہ لال صاحب کو محسوس ہوا کہ ان کا جو ساتھی جھنڈا لیے ہوئے ہے وہ چاروں طرف سے گھر گیا ہے اور سخت خطرے میں ہے۔ وہ تیزی سے اٹھے، تیر کی طرح پھلانگ لگا کر اس کے پاس پہنچ گئے اور جھنڈا اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اچانک ایک گولی لال صاحب کے سینہ کو پار کرتی ہوئی نکل گئی اور وہ زمین پر آ رہے۔ ان کے کچھ ساتھیوں نے اپنے محبوب شہید ساتھی کا خون اپنے ماتھوں پر لگایا اور لاش کو "یونین ہال" میں لے جا کر رکھ دیا گیا۔

۱۳ اگست کی صبح کو جب ترنگے میں لپٹے ہوئے ان کے جسد خاکی کو نذر آتش کرنے سے پہلے یونیورسٹی کے احاطے کے مشہور برگد کے درخت کے سامنے والے برآمدے میں لٹایا گیا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فوج کا فاتح کمانڈر میدان جنگ سے تھکا ہوا واپس آ کر آرام کر رہا ہے۔ ان کی آنکھیں ادھ کھلی تھیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ آنکھوں میں آنسو بھرے اور دل میں مادر وطن کے ایک سچے سپوت کے ساتھی ہونے کا فخر محسوس کرتے ہوئے ہم نے ان کے ذری [illegible] کے حوالے کیا۔

آج اپنے ایک پیارے دوست اور جنگ آزادی کے ایک عظیم سورما سے بچھڑے ہوئے تیس برس بیت گئے لیکن ان کی جب بھی یاد آتی ہے تو سارے واقعات آنکھوں کے سامنے آ جاتے ہیں۔ قومی جھنڈے کی سلامی کے لیے میں جب بھی کھڑا ہوتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مسکراتا ہوا چہرہ آکاش سے جھانک رہا ہے۔

مجھے جب بھی الہ آباد جانے کا موقع ملتا ہے میں یونیورسٹی یونین ہال کے نزدیک نصب ان کے مجسمہ کا درشن ضرور کرتا ہوں۔ کاش اس کی اس شاندار موت میں مادر وطن کے لیے ان کی اس عظیم قربانی میں میرا بھی ان کا ساتھ [illegible] سکا ہوتا۔



(خاکہ)

بڑے میاں

رشید الدین

اصل نام تو اُن کا ماں باپ نے کیا رکھا تھا مگر میں نے جب سے ہوش سنبھالا وہ گھر میں اسی نام سے مشہور تھے۔ لمبا چھریرا جسم، منہ پہ گھنی کھچڑی داڑھی، کالا سانولا رنگ، ہاتھ میں ایک ڈنڈا جیسے وہ منٹ بھر اپنے سے جدا نہیں کرتے تھے، تنگ موری کا پاجامہ اور ایک ڈھیلی ڈھالی اچکن — بس یہی اُن کا حلیہ تھا۔ جب میں نیا نیا اسکول جانے لگا تھا اس وقت بھی بڑے میاں بڑے میاں ہی تھے اور اب جب میں کالج جاتا ہوں تب بھی بڑے میاں بڑے میاں ہی ہیں۔ جب سے لے کر اب تک کئی انقلابات آئے، زمانے بدلے، حکومتیں بدلیں مگر کیا مجال جو بڑے میاں کی روش، بات چیت یا عادات و اطوار میں ذرہ برابر بھی فرق آیا ہو۔ جب بھی بڑے میاں صبح اٹھ کر سودا سلف لانے جاتے تھے اور اب بھی جاتے ہیں۔ جب بھی بڑے میاں ہر روز جاتے جاتے کلو پان والے سے تو تو میں میں کرتے تھے اور آج بھی کرتے ہیں۔ جب بھی بڑے میاں بات بے بات قسمیں کھاتے تھے اور آج بھی کھاتے ہیں۔ جب بھی بڑے میاں کا سارے گھر میں سکہ تھا اور آج بھی ہے۔ فرق پڑا تو صرف اتنا کہ پہلے وہ ہر روز دوپہر میں باورچی خانہ میں جا کر ہر چیز کا مزہ چکھتے تھے اور مہری ماما صاحبہ سے منٹھار منٹھار کر باتیں بناتے تھے مگر اب ماما سے ان کی کچھ اَن بن ہو گئی ہے۔

گھر میں چاہے کتنی ہی گڑبڑ کیوں نہ ہو، کتنے ہی مہمان کیوں نہ جمع ہوں، بڑے میاں کے ٹائم ٹیبل میں ذرا بھی فرق نہ آئے گا۔ وہی اپنے وقت پہ آٹھ بجے اٹھیں گے، منہ ہاتھ دھو کر باورچی خانہ میں جا کر دو تین بلکہ چار چھ پیالیاں چائے پی جائیں گے اور پھر کہیں آہستہ سے بازار کا راستہ لیں گے۔ بازار بھی جائیں گے تو سیدھی طرح سے نہیں بلکہ جاتے جاتے خواہ مخواہ ہی کلو پان والے کی دکان سے ہو لیں گے اور ایک زردے کا پان کھانے کے بعد باتیں کرتے کرتے اتنی بے تکلفی پر اتر آئیں گے کہ توبہ ہی بھلی! بعض دفعہ تو نوبت گالی گلوج تک بھی پہنچ جاتی ہے۔

وہاں سے بازار جائیں گے۔ گھوم پھر کر زیادہ اور سودا سلف لے کر کم دو گھنٹے کے بعد ایسے کمرے میں داخل ہوں گے جیسے بازار سے سودا نہیں لائے کوہ قاف سے پری اٹھا لائے ہوں۔ گھر میں داخل ہوتے ہی وہ برآمدے میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور انھیں دیکھتے ہی ہم سب بچے ان کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔

"ہاں بڑے میاں! آج کی کیا خاص خبر ہے" شریر خالہ زاد بھیا کرکٹ کا بیٹ ہوا میں گھماتے ہوئے پوچھتا ہے۔

اور بڑے میاں حسب معمول اپنے خاص انداز میں بڑی سنجیدگی سے خبریں سنانے لگتے ہیں (جن میں سے ایک آدھ صحیح ہوتی ہے اور باقی کا اللہ ہی علیم!) اس اثناء میں امی کو آتے دیکھ کر ہم سب تو دو گیارہ ہو جاتے ہیں اور بڑے میاں پورے خشوع و خضوع کے ساتھ انھیں حساب دینے لگتے ہیں:

"چار آنے کے آلو — دو آنے کے بینگن — ایک آنے کی بھاجی — آدھ آنے کی کوتھمیر —"

غرض ایک گھنٹہ اس حساب میں صرف ہو جاتا ہے۔ پھر وہ معمول

کے مطابق اطمینان سے کھانا کھاتے ہیں اور پھر گھر کی تنقیح کو نکل جاتے ہیں:

"یہ چیز یہاں کیوں رکھی ہے — وہ چیز وہاں کیوں رکھی ہے — نیا نوکر آج پھر کہاں غائب ہے، منّی آج اسکول کیوں نہیں گئی — خالد محلے کے آوارہ لڑکوں میں کیوں کھیلتا ہے" وغیرہ وغیرہ۔

بس پھر دوپہر سے لے کر شام تک بڑے میاں کو یہی کام ہے اور رات میں وہ اپنا مخصوص تاریخی اونی کوٹ پہنے نوکروں کے کمرے میں جا کر اپنے بچپن اور جوانی کے قصّے سنایا کرتے ہیں جہاں کبھی کبھی ہم لوگ بھی پہنچ جاتے ہیں۔ اپنے کوٹ کے بارے میں بڑے میاں یہ روایت بیان کرتے ہیں کہ پہلے وہ ایک بلانکٹ (کمبل) ہوا کرتا تھا جسے ان کی والدہ محترمہ کو اُن کی والدہ محترمہ نے جہیز میں دیا تھا تاکہ وہ سرما کے زمانے میں اس گرم اونی کپڑے کو استعمال کر کے سردی سے بچا کریں۔ اُن کے والد مرحوم کی اس اونی بلانکٹ پر بڑی نظر تھی مگر وہ مرتے مر گئے یہ بلانکٹ ان کے ہتھے نہ چڑھ سکا۔ آخر ان کے مرنے کے بعد ان کی والدہ نے اس کا کوٹ بڑے میاں کو سی دیا تھا۔

دراصل انھیں اپنے بچپن کے قصّے سنانے میں بڑا لطف آتا ہے۔ جہاں بھی وہ کوئی واقعہ سُن لیتے ہیں فوراً اسے اپنے نام سے منسوب کر کے سُنا دیتے ہیں۔ ہرکولیس کے متعلق مشہور ہے کہ جب وہ بالکل چھوٹا تھا تو دو سانپ اس کے قریب آ گئے جنھیں اس نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اس زور سے دبایا کہ اُن کی جان نکل گئی۔ بڑے میاں نے یہ قصّہ کہیں سن لیا اور فوراً اپنے نام سے منسوب کر کے ایک رات نوکروں کے کمرے میں سُنا دیا اتفاق سے منّی اور خالد بھی وہاں موجود تھے۔ منّی نے جب بڑے میاں کی بہادری کا یہ قصّہ سنا تو ششدر رہ گئی اور حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہنے لگی:

"سچ مچ بڑے میاں آپ اتنے بہادر تھے؟"

بس اتنا سننا تھا کہ خالد کی آنکھیں شرارت سے چمک اٹھیں:

"ارے یہ تو معمولی واقعہ ہے منّی۔ بڑے میاں کے اپنے بچپن میں تو چوہے جیسے چالاک جانور بھی اُن کی زد سے بچ کر نہ جا سکتے تھے۔

کیوں بڑے میاں؟"

خالد نے سوالیہ نگاہوں سے بڑے میاں کی طرف دیکھا اور بڑے میاں نے اپنے مخصوص انداز میں کوٹ کے بٹن کھولتے ہوئے سینہ پھلا کر وہ قصّہ چھیڑ دیا کہ جب وہ چھوٹے تھے تو اُن کے ایک پڑوسی (جن کے گھر میں چوہے بہت تھے) روز رات کو محلے کے میونسپلٹی کے چپراسی سے ایک آنے کرائے کا چوہا پکڑنے کا پنجرہ لاتے تھے۔ پھر صبح ہی اٹھ کر دیکھتے تو پنجرے میں چوہوں کی یلغار ہوتی جنھیں وہ دور میدان میں لے جا کر چھوڑ دیتے تھے تو یہی بڑے میاں ایک چوہے کو بھی زندہ بچ کر نہیں جانے دیتے تھے۔ ابھی یہ قصّہ ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ خالد نے انھیں دوسرا واقعہ یاد دلایا:

"کیوں بڑے میاں! اور آپ نے اپنی جوانی میں ایک مست ہاتھی کو کس طرح مار بھگایا تھا"

"ارے وہ تو معمولی واقعہ ہے ورنہ میں نے تو اپنی جوانی میں ایک بار پوری اُلٹی ہوئی بس کو سیدھا کر دیا تھا۔"

"وہ کیا قصّہ ہے بڑے میاں سنایئے نا۔ ہمارے نئے نوکر کریمو نے لجاجت سے کہا۔

"چل ہٹ بے۔ گدھے کو زعفران کی کیا قدر۔" بڑے میاں نے اُسے ڈانٹ پلائی۔

آخر میں منّی کے کہنے پر اور کریمو کی سفارش کرنے پر پورا واقعہ سُنایا۔

جھوٹ بولنا تو ان کے نزدیک کوئی خاص بات ہے ہی نہیں اور پھر طرفہ یہ کہ جھوٹ بولنے کے بعد قسمیں کھا کھا کر اسے سچ بھی ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ باتیں کرتے کرتے وہ قسمیں یوں کھاتے ہیں جیسے کوئی پان کھاتے کھاتے زردہ کھاتا ہو۔ جھوٹ بات کرنے اور قسمیں کھانے کی ان کی یہ عادت اب معمول کی چیز بن گئی ہے۔ ایک دن ابّا جان اپنے چند مخصوص دوستوں کے ساتھ بیٹھے تھے کہ بڑے میاں چائے لے کر پہنچ گئے اور بات ہی بات میں ایک عدد قسم کھالی۔ ابّا جان نے انھیں سمجھایا کہ قسمیں کھانا ٹھیک نہیں ہے۔ اس عادت کو ترک کرنا چاہیے۔ بڑے میاں نے فوراً وہیں کھڑے کھڑے پختہ وعدہ کر لیا کہ وہ آ ب

بالکل قسم نہیں کھائیں گے چاہے ان کے گلے پر چھری کیوں نہ چل جائے۔ بڑے میاں سے بخوبی واقف ابا جان کے ایک دوست نے (جو ذرا خوش طبع واقع ہوئے تھے) بڑے میاں سے پوچھا۔

"کیا بڑے میاں اب آپ نے قسمیں کھانا چھوڑ دی ہیں؟"

"ہاں" ہاں! بالکل چھوڑ دی ہیں۔ "بڑے میاں نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

"بالکل؟" اُن صاحب نے لفظ بالکل پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"بالکل، خدا کی قسم بالکل۔ بڑے میاں نے انھیں یقین دلاتے ہوئے بے ساختہ کہا اور دوسرے ہی لمحہ سارا کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔

اس کے بعد جب میں نے اس واقعہ کے متعلق پوچھا تو کہنے لگے:

"ارے میاں قسمیں نہ کھائیں تو کیا کریں۔ یہاں تو کسی کو ہماری بات پہ اعتبار ہی نہیں آتا۔ جیسے ہم انسان نہیں کیوڑے مکوڑے ہیں۔"

"سچ بڑے میاں، آپ کی بات پر کوئی اعتبار نہیں کرتا" میں نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا

"صحیح میاں! خدا کی قسم کوئی اعتبار نہیں کرتا۔" بڑے میاں نے حسب معمول قسم کھا کر کہا۔

کوئی بات انھیں معلوم ہو جائے اور پھر وہ صیغہ راز میں رہے یہ ناممکن ہے۔ کوئی بھی بات انھیں معلوم ہوئی (خواہ وہ کتنی ہی سازکی کیوں نہ ہو) وہ اس کی فوراً تشہیر شروع کر دیتے ہیں۔ جیسے انھیں اپنے دل کی بات دوسرے کو بتائے بغیر کھانا ہی ہضم نہ ہوتا ہو۔ ایک دفعہ باجی وغیرہ پکچر جانے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ باتوں باتوں میں گفتگو مرد عورت تک پہنچ گئی۔ باجی مجھ سے تنک کر کہنے لگیں ہم لوگ تو تمھارے مردانہ کمپارٹمنٹ میں بیٹھ سکتے ہیں لیکن تم لوگ باوجود ہزار کوشش کے زنانہ کمپارٹمنٹ میں قدم نہیں رکھ سکتے۔"

مجھے بھی تاؤ آ گیا اور میں نے کہا "نہیں یہ غلط ہے۔ ہم لوگ خود ہی وہاں بیٹھنا پسند نہیں کرتے ورنہ ہم برابر بیٹھ سکتے ہیں۔"

باجی بھلا اتنی بھولی کہاں تھیں کہ ہمارے اس سیدھے سادے

استدلال پر خاموش ہو جاتیں۔ خوب خوب بحث ہوئی۔ فیصلہ شرط پر چھوڑا گیا۔ باجی نے فوراً دس روپے کی شرط باندھ لی اور ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب پکچر ختم ہونے کے بعد میں نے ماما کے میلے کچیلے برقع کی نقاب اٹھائی اور انھیں سلام کیا۔ باجی اپنی شکست پر بہت نادم تھیں۔ انعام حاصل کرنے کی تقریب کو صبح کے لیے اٹھا رکھنے کا فیصلہ ہو جانے کے بعد میں فتح کی خوشی میں سرشار سو گیا۔ لیکن اتفاق سے صبح ہی صبح بڑے میاں کے کان میں اس واقعہ کی بھنک پڑ گئی۔ بس پھر کیا تھا ناشتہ کر کے ہم باجی سے دس روپے وصول بھی نہ کر پائے تھے کہ رات کی ساری روداد بڑے میاں نے امی جان کو سنا دی۔ اس طرح ہمارے دس روپے کے دس روپے گئے اور ڈانٹ الگ سننا پڑی۔

جب کبھی بڑے میاں باہر سے سودا سلف لے کر آتے ایک نہ ایک نئی اور سنسنی خیز خبر ضرور ساتھ لاتے۔ ایک دن جب وہ دروازے میں سے نمودار ہوئے تو چیخ چیخ کر سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔ دراصل وہ ہماری ماما کو پکار رہے تھے۔ اسے دیکھتے ہی فوراً کہنے لگے:

"اری نگوڑی تو یہاں کیا کر رہی ہے۔ تیرا بیٹا موٹر سے ٹکرا گیا ہے۔"

ماما نے جب اپنے اکلوتے بیٹے کے حادثے کی خبر سنی تو پچھاڑیں کھاتی ہوئی گھر پہنچی۔ وہاں جا کر جو دیکھا تو اس کا بیٹا ہشاش بشاش بیٹھا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اُسی محلہ کا کوئی لڑکا حادثے کا شکار ہوا تھا۔ اب ماما نے واپس آ کر بڑے میاں کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ حسب معمول وہ نوکروں کے کمرے میں مصروف تکلم تھے۔ ماما نے ان کے قریب جا کر بڑی ہی سنجیدگی سے پوچھا۔

"بڑے میاں! ایک بات کہوں؟"

"ہاں، ہاں! کیوں نہیں۔" بڑے میاں نے اپنا ڈنڈا سنبھالتے ہوئے کہا۔

"اچھا یہ بتائیے آپ بڑے ہیں یا آپ کی یہ ڈاڑھی؟" ماما نے پوچھا۔

"ارے بس ذرا سی بات" بڑے میاں نے چٹکی بجاتے ہوئے

(باقی صفحہ ۴۸ پر)



ایس۔ ایم۔ عبّاس رضوی

انسانی زندگی جذبات کا مجموعہ ہے۔ یہ جذبات کچھ خوشی کے ہیں کچھ غم کے۔ کچھ حمیت و رواداری کے۔ کچھ غیرت و خودداری اور آن کے۔ جب کبھی انسانی عظمت و وقار کو ٹھیس لگی ہے، زندگی کی آن تک کوئی بات پہنچی ہے تو اس کے اندر ایک ہیجان برپا ہوا ہے۔ اس کے خیالات نے انگڑائیاں لی ہیں اور ایک جذبے نے کروٹ بدلی ہے۔ اسی جذبہ کا نام آزادی ہے۔

یقیناً وہ نہایت ہی مبارک ساعت رہی ہوگی جب انسان کی سرشت میں آزادی کے اس عظیم، پاکیزہ اور مقدس جذبے نے جنم لیا ہوگا۔ ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک ہر دور میں یہی جذبہ انسان کی پشت پناہی کرتا رہا ہے۔ ظلمت سے نور کی سمت، شر سے خیر کی جانب اور بغض و حسد، تعصب و نفرت کی گہری کھائیوں سے حق و انصاف و صداقت کے مہکتے لالہ زاروں تک یہ جذبہ کشاں کشاں آدمی کو آگے ہی بڑھاتا رہا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جب کبھی انسان ظلم کے گرداب میں گھرا ہے، انسانوں سے انسانی طور و طریقہ کے ساتھ زندہ رہنے کے حقوق چھیننے کی بات ہوئی ہے، زندگی کے بنیادی اصول، انسانیت کی اعلیٰ قدریں جبر و استبداد کی بھاری چکیوں تلے پیسی ہیں، انسان کی شرافت و اعتدار مٹانے کی کوشش ہوئی ہے، زندگی کی عظمت و شان پر دھبہ لگا ہے، بہیمیت اور درندگی کی آہنی زنجیروں میں معصوم انسانوں کو جکڑ کر خوں ریزی اور غارت گری کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں زندگی کا اساسہ لوٹ لینے کی سازش ہوئی ہے تو انسان اپنے ہاتھوں میں حریت اور آزادی کا پرچم لے کر ابھرا ہے اور ظلم کی بڑی سے بڑی طاقتوں کو اس نے یہ کھلا چیلنج دیا ہے کہ ؎

لاکھ تخریب ہو تعمیر نہیں رک سکتی
زندگی موت کے قدموں پہ نہیں جھک سکتی

تاریخ شاہد ہے۔ ہم پر بھی ایسا ہی ایک وقت گزرا ہے۔ ہم "طوق و سلاسل میں مسلسل" کر دیے گئے تھے۔ ہماری زبان بند کی جا رہی تھی۔ فکر و نظر پر پہرے بٹھا دیے گئے تھے۔ ہمیں مجبور اور مجبورِ محض بنا کر ہماری کس مپرسی کا کھلے عام مظاہرہ کیا جا رہا تھا۔ نگاہوں پر بھاری پردے ڈال کر ہماری تہذیب و تمدن، ہمارے علوم و فنون کی صدہا سال پرانی عظیم الشان تاریخ یکسر نیست و نابود کی جا رہی تھی۔

یہی نہیں، انسانی اور اخلاقی قدریں کھلے عام پامال ہو رہی تھیں۔ عزت کے ساتھ زندہ رہنا محال تھا۔ محض طاقت کے زعمِ باطل کی وجہ سے مصلحتِ وقت ہم سے "ہر گام" پر "سجدہ" کی طلب گار تھی۔ اس انتہا پر پہنچ کر جب حیات موت کے قدموں پر جھکنے کے لیے مجبور ہوئی تو کچھ سرفروشانِ وفا کو ملک و قوم کی اس حالتِ زار کو دیکھ کر جلال آ گیا۔ حریت کا جذبہ بیدار ہو اٹھا اور اپنے سر سے کفن باندھ کر انھوں نے وطن کو آزاد کرانے کا بیڑا اٹھا لیا۔

اف آزادی! تیرے جاں نثاروں نے بھی دنیا میں کتنے بھیانک ظلم برداشت کیے۔ کتنوں کے سینے دہکتی ہوئی گولیوں سے چھلنی کر دیے گئے۔ کتنوں کو پھانسی کے تختے پر لٹکا کر ان کے

لہو کے چھینٹوں سے "منظرِ دار" کو رنگین بنایا گیا۔ کتنوں کے گلے کاٹے گئے۔ کتنی بستیاں ویران کر دی گئیں۔ کتنے گھر ہمیشہ کے لیے اُجڑ گئے۔ کتنی ماؤں نے اپنی ساری زندگی کی کمائی لُٹا دی۔ کتنی سہاگنوں نے اپنی نازک کلائیاں سونی کر لیں، مانگ کے سیندور پونچھ ڈالے۔ کتنے بھائی سے بھائی اور باپ سے بیٹے بچھڑ گئے۔ یہ طویل، سادہ اور رنگین داستاں آج تک یہ کہہ رہی ہے کہ ؎

کرن کرن کو بھگویا گیا ہے اشکوں میں
کہ جاوداں تو بنے عہدِ نو بہار کا پھول

آخر جب "ہزاروں غنچے" پامال ہو گئے، "لاکھوں کلیاں" موت کی بھیانک آگ میں جھلس گئیں تو "شبِ ظلمات" نے گھبرا کر اپنا دم توڑ دیا۔ روشنی نے تاریکی پر فتح حاصل کی اور ہمیں ایک "پیغامِ نو" ملا۔ ہم دنیا کے سامنے سرخرو ہوئے اور ہم نے دنیا کو صلح و آشتی، امن و سلامتی، انصاف و صداقت کی دعوت دی۔

پھر صبحِ 'جمہور' آئی اور اپنے ساتھ مسرت و شادمانی کا پیغام لائی۔ ہم نے "جشنِ بہاراں" کیے اور ہمیشہ ہمیشہ اس جشن کی خوشبو قائم رہنے کی دعائیں مانگیں بقول کسی کے ؎

میں نے اس کہہ تمدن کے سہارے میں | اک نئی جوت جلانے کی قسم کھائی تھی
میرے احساس و تخیل کے انوکھے پیکر | حسن ہی حسن تھا رعنائی ہی رعنائی تھی
میرے خوابوں کے حسین روپ میں ڈھلنے کیلیے | زندگی خود مرے قدموں میں چلی آئی تھی

آج ہم آزادی کی فضا میں سانس لے رہے ہیں۔ ہم نے خود اپنے دستور مرتب کیے اور اس دستور کو ہم نے کچھ اس ڈھنگ کا رکھا جس میں ہمیں زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم ہوں۔ ہم قانون کی نگاہ میں برابر ہیں۔ ہمارے حقوق یکساں ہیں۔ اگر کچھ فرق ملے گا تو وہ خاص حلقے، مخصوص حالات اور ماحول و حیثیت کے باعث ہے۔ یہ ہمارے دستور کی ایک غیر معمولی بات ہے یعنی عوام کو جو حقوق دیے گئے ہیں وہ کناڈا، نیوزیلینڈ اور برطانیہ کے باشندوں کو بھی نہیں ملے ہیں۔ ان حقوق کا اولین مقصد عوام کی خوشحالی اور پورے ملک میں امن و مساوات اور آزادی کی بحالی ہے۔

آج ہم دوسرے کے ناجائز دباؤ اور استحصال سے محفوظ ہیں۔ علمی و ادبی معاشرتی و تمدنی اور اخلاقی و مذہبی تعمیر و ترقی کا ہمیں پورا حق ہے۔ ہم جگہ جائیداد خرید سکتے ہیں، رکھ سکتے ہیں اور اسے فروخت کر سکتے ہیں۔ بلا کسی ضروری قانون کے عمل میں آئے ہوئے ہم اپنی ملکیت سے محروم نہیں کیے جا سکتے ہیں۔ قانونی طور پر بلا تفریق مذہب و ملت، قوم و جماعت، رنگ و نسل، جنس و جائے پیدائش ہم سبھی یکساں ہیں۔ سبھی کو سرکاری نوکریاں حاصل کرنے کے لیے مساوی حقوق حاصل ہیں۔ فوجی یا علمی اعزازات کے علاوہ کسی کو کوئی خطاب نہیں دیا جائے گا۔ سبھی کو تحریر و تقریر اور اظہارِ رائے کی آزادی ہے —— جیسے جلوس، یونین، تنظیم سازی، جماعت پر کوئی پابندی نہیں بشرطیکہ نقصِ امن کو کوئی خطرہ نہ ہو۔ ہر آدمی اپنی خواہش کے مطابق کوئی بھی روزگار، پیشہ و کاروبار چن سکتا ہے۔ مختصر یہ کہ ہر شخص کو اسی حیثیت کے دائرہ میں وہ سارے حقوق دیے گئے ہیں جس سے وہ زیادہ سے زیادہ ترقی کر سکے اور پُرامن، پُرمسرت اور خوشگوار زندگی گزار سکے۔

لیکن آزادی اور 'جمہوریت'، جہاں ہمیں کچھ حقوق دیتی ہے وہاں ہمارے اوپر کچھ فرائض بھی عائد کرتی ہے۔ "جمہوریت" جیو اور جینے دو" کے اصول کی زبردست حامی ہے۔ اس کی اساس ہی آزادی اور مساوات پر رکھی گئی ہے۔ جہاں ہمارے دوسروں سے کچھ مطالبات ہیں، سماج سے ہمیں کچھ ملنا ہے وہاں ہماری بہت کچھ ذمہ داریاں بھی ہیں، سماج کو ہمیں کچھ دینا بھی ہے۔ بلا اس لین دین کے سماج سے ہمارا رشتہ قائم نہیں رہ سکتا ہے۔ کسی نے کتنی اچھی بات کہی ہے کہ:

"یہ حقوق و فرائض بالکل ایک سکے کے دو پہلو ہیں۔ جو ہمیشہ ساتھ رہتے ہیں اور کبھی ایک دوسرے سے الگ نہیں ہوتے۔"

اسی طرح ہمیں قانونی برابری کا حق دیا گیا ہے۔ لیکن یہ برابری کس بات کی ہوگی؟ کس نوعیت کی ہوگی؟ یہ بات ہر وقت ذہن نشین رکھنے کی ہے۔ ہم برابر ضرور ہیں لیکن ہماری برابری، 'برابری کی حیثیت' میں ہی ممکن ہے۔ بالکل یہی صورت آزادی کی ہے۔ ہم بہت سے معاملات میں آزاد ہیں۔ لیکن کیا ہماری آزادی لامحدود ہے۔ اس پر کوئی پابندی

نہیں ہے۔ اس کے دائرہ عمل کی کوئی حد متعین نہیں ہے، وایسی بات نہیں ہے۔ دراصل آزادی پابندیوں میں رہ کر اپنی حقیقی منزلوں کو تلاش کر سکتی ہے۔ آزادی پر پابندی نہ عائد کی گئی تو سماج میں جس کی لاٹھی اس کی بھینس (MIGHT IS RIGHT) کی فضا پھیل جائے گی۔ پھر یہ منزل اتنی خطرناک ہوگی کہ ہر کمزور شخص اپنے سے زیادہ طاقت ور سے یہ خطرہ محسوس کرے گا کہ کہیں وہ اُسے پیس نہ دے اور اس حالت میں محض تھوڑے سے لوگ پورے سماج کے غم اور ہر شخص کی خوشی کے مالک بن جائیں گے۔

جمہوری معاشرہ کو اس نازک صورت حال سے بچانے کے لیے کسی نے آزادی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ "ہم اپنے ہاتھ وہیں تک پھیلائیں جہاں وہ دوسرے کی ناک کو چوٹ نہ پہنچا سکیں۔ یعنی سماج میں امن وسلامتی، ہم آہنگی و یکسانیت قائم رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ جہاں ہم اپنے حقوق کا استعمال کریں وہیں فرائض کا بھی لحاظ رکھیں۔ دوسرے یہ کہ ہم اپنے حقوق کا استعمال اسی حد تک کریں جہاں وہ دوسرے کی آزادی میں کوئی خلل یا توڑ نہ پیدا کریں۔ اس سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ آزادی کا استعمال حدود کو مدِ نظر رکھ کر کرنا بہتر ہے۔ تبھی سماج کا توازن برقرار رہ سکے گا۔ جیسے ہی ہم پابندیوں سے الگ ہو کر محض حقوق کے لیے دوڑیں گے، حقوق سے محروم ہو جائیں گے۔ اسی لیے ولوبی نے کہا ہے: "آزادی کا وجود اسی وقت ممکن ہے جب کہ پابندیاں بھی ساتھ ہوں۔" اسی خیال کی ترجمانی ہربرٹ اسپنسر نے یوں کی ہے:

"ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے کے لیے آزاد ہے
صرف شرط یہ ہے کہ اس کا کام کسی دوسرے شخص کی آزادی میں
کوئی رکاوٹ نہ پیدا کرے۔"

اب یہاں پر ایک سوال اور پیدا ہوتا ہے۔ آخر ہمارے حقوق کے استعمال کی حدیں کون متعین کرے گا۔ یہ بات کیسے طے ہوگی کہ ہم اپنے کسی حق کا استعمال کس دائرہ میں کر سکتے ہیں؟ اس کا جواب بہت آسان ہے یعنی جہاں سے ہمیں آزادی ملی ہے، وہیں سے پابندی عائد ہونا چاہیے۔ قانون نے ہمیں آزادی بخشی ہے، حقوق سے روشناس کرایا ہے، اس لیے قانون پر ہی یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ سماجی رشتوں کو مستحکم بنانے کے لیے، غریب کو امیر اور کمزور کو طاقت ور کی کھلی ہوئی جبرو دستیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک روشن حال ہی نہیں ایک خوش آئند مستقبل کے لیے آزادی کے حقوق کے استعمال کی حدیں مقرر کر دے۔ یہ قانونی سرحدیں بھی قانون ہوں گی۔ اسی لیے جان لاک نے بہت پہلے کہا تھا۔ جہاں قانون نہیں وہاں آزادی کا وجود بھی ناممکن ہے۔

یہیں سے آزادی اور قانون کا رشتہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہی رشتہ ہماری سمجھ میں کم آتا ہے۔ ہم اکثر یہیں پہنچ کر بہت سی غلط فہمیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ آزادی اور قانون کے باہمی تعلق کو لے کر مفکرین میں بھی طویل بحثیں رہی ہیں۔ چند مفکرین نے قانون کو آزادی کے لیے مضر بنایا ہے۔ لیکن یہ خیال زیادہ درست نہیں۔ دراصل قانون، آزادی کا معاون ہے۔ وہ آزادی کے راستے میں جتنی بھی پابندیاں عائد کرتا ہے وہ وقت اور حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے، مفادِ عامہ کی بقا و تحفظ کے لیے اور ایک پُرسکون معاشرہ کی تعمیر کے لیے۔

یہ بات واضح کر دینے کی ضرورت ہے کہ جمہوریت میں آزادی کا مطلب 'کھلی ہوئی چھوٹ' یا من مانی کرنا' ہرگز نہیں بلکہ حق و انصاف، امن و سکون کے ساتھ زندگی کی تعمیر و ترقی ہے۔ اسی طرح 'مساوات' کا یہ مفہوم کہ 'ہر شخص برابر ہے' بالکل غلط ہے۔ بلکہ ہر وہ شخص برابر ہے جو برابر کی حیثیت اور برابر کی صلاحیت رکھتا ہے۔ برابر کی حیثیت والوں کو ہی برابر کے حقوق و سہولتیں دی گئی ہیں۔

آج ہمارے سامنے جو گوناگوں پیچیدگیاں ہیں اس کی یہی وجہ ہے کہ ہم آزادی و مساوات کا محض ڈھنڈورا پیٹتے ہیں۔ اس کی گہرائیوں تک نہ جا کر محض لفظوں کی پوجا کرتے ہیں۔ بس ہمیں اپنی فکر ہے۔ دوسرے کی پرواہ نہیں۔ ہر جگہ ہم حقوق ہی کی بات کرتے ہیں فرائض کی جستجو نہیں۔ ہم مساوی ہونے کی تو بات کرتے ہیں لیکن انسانی و اخلاقی

قدریں ہیں متاثر نہیں کرتیں۔ پنڈت نہرو نے کتنی اچھی بات کہی ہے۔
"آزادی صرف سیاسی آزادی نہیں بلکہ روح وضمیر کی آزادی ہے نفس وشعور کی آزادی ہے۔" اصل آزادی دماغ اور دل کی آزادی ہے۔ اگر دل وسیع نہ ہوا، نظر بلند نہ ہوسکی، دماغ میں شگفتگی، سلیقگی اور پاکیزگی پیدا نہ ہوسکی تو آزادی تلخ ہوجاتی ہے۔"

آج جب کہ ذرا ذرا سی بات پر زبردست ہنگامہ آرائیاں شروع ہوجاتی ہیں، چھوٹی سی بات کو لے کر زبردست طوفان برپا ہوجاتے ہیں، ایک ذرا سی غلطی پر فرقہ واریت کی فضا پھیل جاتی ہے، ایک مانگ کے لیے بڑی بڑی ہڑتالیں ہوجاتی ہیں اور غم وغصہ کے اظہار میں جشم زدن میں اچھی خاصی عمارتیں نذر آتش کردی جاتی ہیں، بسیں برباد کردی جاتی ہیں، اسکول اور کالج ہنگاموں کے محاذ بن جاتے ہیں، استادوں اور شاگردوں کے درمیان کھلی ہوئی آویزشیں شروع ہوجاتی ہیں تو شاید اس وقت ہمارے شہیدان حریت کی آزادی کی پاکیزہ روحوں کو عظیم صدمہ پہنچتا ہوگا اور آزادی اشکبار آنکھوں سے یہ سرگوشی کرتی ہوگی ؎

وقت کی نبض پہ تم ہاتھ تو رکھ کر دیکھو
قافلے امن و ترقی کے کہاں تک پہنچے
فرض اب بھی جو تمھارا ہے وہ تم بھی جانو
"میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہنچے"

بلاشبہ ہم آزاد ہیں۔ یہ آزادی ہمارے بزرگوں کی بے پناہ قربانیوں کی دین ہے۔ انھوں نے جان ودل کی بازی لگا کر اسے حاصل کیا ہے۔ اس لیے آزادی ہماری عظیم ترین امانت ہے اور ہمیں اس امانت کو اگلی نسلوں تک پہنچانا ہے۔ ہم نے اس کی کتنی قدر کی، ہم نے شہیدوں کے خون وپسینہ کی کیا قیمت ادا کی اور اپنے آپ کو کس حد تک اس امانت کا اہل بنایا، ہمیں اس کا حساب دینا ہوگا۔ اس لیے ہمارا یہ فریضہ ہے کہ ہم اس امانت کی زیادہ سے زیادہ قدر کریں، آزادی کی راہوں کو استوار کریں، مساوات کی فضا کو خوشگوار بنائیں، خود بھی سکون، اطمینان اور عزت کے ساتھ زندگی بسر کریں اور دوسرے کو بھی امن وسلامتی کیساتھ جینے کا موقع دیں۔ اسی میں ہمارا بھلا ہے اور سارے عالم کا بھلا ہے اور یہی حقیقی آزادی کہی ہے۔



بڑے میاں ۔(صفحہ ۴۴ کا بقیہ)

کہا: "پہلے میں پیدا ہوا اور میرے پیدا ہونے کے کوئی بیس برس بعد یہ ڈاڑھی نمودار ہوئی ہے۔" انھوں نے مزے سے ڈاڑھی پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "اس طرح میں اپنی ڈاڑھی سے بہت بڑا ہوں۔ سمجھیں بوا؟"

اب تو ماما کے ضبط کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور وہ چیخ اٹھی :

"تمھاری ڈاڑھی نے تو اپنا رنگ بدل دیا ہے۔ تم کب اپنا رنگ بدلوگے؟ قبر میں ٹانگیں لٹک رہی ہیں نا! اللہ قسم حشر کے دن تمھارا منہ کالا ہوگا۔ یہ بڑھاپا، یہ ڈاڑھی اور یہ جھوٹ!"

یہ کہہ کر ماما کمرے سے نکل گئی۔ وہ دن اور آج کا دن، بڑے میاں اور ماما میں اَن بَن چلی آرہی ہے اور امی جان بھی دونوں میں صفائی نہ کرا سکیں۔

اُس دن خدا جانے بڑے میاں کس کا منہ دیکھ کر اٹھے تھے۔ سارا گھر ان کے خلاف ہوگیا تھا۔ ماما نے تو ان کا منہ بھی دیکھنے سے انکار کردیا تھا۔ باجی جان بڑے میاں پر اس لیے غصہ تھیں کہ ماما کے چلے جانے کی وجہ سے دوپہر کا کھانا انھیں پکانا پڑا اور امی جان تو ہمیشہ ہی بڑے میاں سے نالاں رہتی تھیں اور سب سے زیادہ ہمارے ٹیچر ڈوکر کو بیکی جاگیں۔ کھلی ہوئی تھیں کیونکہ بڑے میاں کبھی انھیں خاطر ہی میں نہیں لاتے تھے۔

رات میں دس بجے میں پڑھتے پڑھتے اکتا گیا تھا سوچا چلو دیکھیں بڑے میاں کس حال میں ہیں۔ نوکروں کے کمرے کے سامنے سے گزرا تو دیکھا کہ حسب معمول محفل گرم ہے اور بڑے میاں سب کے بیچ میں بیٹھے لہک لہک کر یہ شعر پڑھ رہے ہیں ؎

یادگار زمانہ ہیں ہم لوگ — یاد رکھنا فسانہ ہیں ہم لوگ ★

غزل

احساس گونڈوی

لے کے دیوانگی کی کرن آگئے
کہہ دو ظلمت سے ظلمت شکن آگئے

ڈوب کر غم کے دریا سے اُبھرے تو کیا؟
ہم لہو میں ڈبو کر بدن آگئے

ہم کو یادوں نے تنہا نہ چھوڑا کبھی
راہبر جب گئے راہزن آگئے

وہ ہمیں تھے کہ جو مقتلِ وقت سے
زندگی کا لیے بانکپن آگئے

اصل میں حاصلِ جستجو تھے وہی
مرحلے پیش جو دل شکن آگئے

عقل کو دیکھ کر آج ننگِ وجود
ہم جنوں کا لیے پیرہن آگئے

تبصرہ دوستوں کی نوازش پہ تھا
یاد کیوں دشمنوں کے چلن آگئے

ان سے بہتر ہیں احساس تنہائیاں
دیکھ کر ایک اک انجمن آگئے

غزل

پریم واربرٹنی

پہلے تو بہت گردشِ دوراں سے لڑا ہوں
اب کس کی تمنا ہے جو مقتل میں کھڑا ہوں

گو قدر مری بزمِ سخن میں نہیں لیکن
ہیرے کی طرح فن کی انگوٹھی میں جڑا ہوں

خیرات میں بانٹے تھے جہاں میں نے ستارے
خود آج وہیں کاسۂ شب لے کے کھڑا ہوں

ہوتا کوئی پتھر بھی تو کام آتا جنوں کے
ٹوٹا ہوا شیشہ ہوں، سرِ راہ پڑا ہوں

آفاق کی تسخیر تو آسان تھی لیکن
اے جانِ جہاں تیرے لیے خود سے لڑا ہوں

طوفاں سے کہو میرے قریب اور نہ آئے
بہہ جاؤں گا دریا میں کہ مٹی کا گھڑا ہوں

سمٹوں تو کسی سیپ کے سینے میں سما جاؤں
اے پریم جو پھیلوں تو سمندر سے بڑا ہوں

آزادی کے بعد

آر۔ ایس۔ بیرمار

عہدِ آزادی کی اقتصادی ترقی کے ساتھ تعلیم کے فروغ اور صحت عامہ کی سرکاری سرپرستی اور نگہبانی کے طفیل کئی موذی امراض مثلاً ملیریا، پلیگ، ہیضہ اور چیچک کی بیخ کنی پر زور دینا شروع ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آزادی سے پہلے اوسط میعادِ عمر جو ۳۲،۱ سال تھی، سنہ ۱۹۶۹ء میں عمر کا یہ اوسط ۵۲،۶ تک پہنچ گیا۔ شرح اموات ۲۷،۴ فی ہزار سے گر کر ۱۴ فی ہزار تک آ گئی۔

۱۹۵۱ء میں ملیریا کے مریضوں کا شمار ہندوستان میں دس کروڑ تک پہنچ گیا تھا۔ اس ملیریا کی وجہ سے لاکھوں افراد ہر سال ہمارے ملک میں موت کے منہ کا نوالا بن جایا کرتے تھے۔ لیکن اب ملیریا کا موذی مرض قریب قریب ختم ہو چکا ہے۔ پلیگ اور ہیضہ تو ہماری شہری زندگی میں اب گاہے ماہے کی بات بن چکے ہیں۔ ہمارے دیہات میں اشاعتِ تعلیم کے فیض سے اب وہ اگلی سی بے علمی اور جہالت نہیں رہی۔ اب ہمارے دیہات میں گندگی کے انبار کم نظر آتے ہیں۔ اس کا نتیجہ بہتر صحت اور بلند تر معیارِ زندگی کی صورت میں نمودار ہوا ہے۔

ملیریا کے خلاف جو مہم ۱۹۵۱ء میں شروع کی گئی تھی ۱۹۷۳ء کے قریب پایۂ اختتام تک پہنچ جائے گی۔ چیچک کا تو بہت حد تک انسداد ہو چکا ہے۔ تپ دق جو ہمارا سب سے پرانا اور خونی دشمن تصور کیا جاتا تھا۔ اب بی۔ سی۔ جی (B. C. G) کے ٹیکوں کے طفیل بڑی حد تک قابو میں لایا جا چکا ہے۔

اتنے بڑے ملک میں ڈاکٹروں اور اسپتالوں کی سخت قلت تھی چنانچہ ۱۹۴۷ء میں ہمارے یہاں ۴۷،۵۰۰ ڈاکٹر تھے، ۷،۰۰۰ نرسیں اور ۵،۰۰۰ دائیاں تھیں لیکن اب اُمید کی جاتی ہے کہ چوتھے پنج سالہ منصوبے کے خاتمے تک ہمارے یہاں ۱۳۷،۹۳۰ ڈاکٹر ہوں گے، ۸۸،۰۰۰ نرسیں اور ۷۰،۰۰۰ دائیاں ہوں گی۔ یہ بھی امید کی جاتی ہے کہ ڈاکٹر اور مریضوں کا تناسب ۳۰۲۴ : ۱ ہو جائے گا جو کبھی ۵۲۰۰ : ۱ تھا۔ میڈیکل کالج اب چار گنا زیادہ ہو چکے ہیں۔ ۱۹۴۷ء میں ہمارے یہاں ۲۵ میڈیکل کالج تھے اور اب ۹۵ ہیں جن میں ۲۰۰۰ طلبا کی بجائے ۱۱۸۰۰ طلبا طبی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ ان میڈیکل کالجوں کے علاوہ ۱۵ ڈنٹیل کالج اور ۱۱ دوسری نوعیت کے طبی ادارے بھی ہیں جن میں ڈاکٹری کی تربیت دی جاتی ہے۔

پچھلے بیس سال میں نئے اسپتالوں اور ڈسپنسریوں کی تعداد ۱۵۰۰۰ تک پہنچ چکی ہے۔ اب ملک کے اسپتالوں میں بیماروں کے بستروں کی تعداد ۱۱۳،۰۰۰ سے ۲۶۱،۰۰۰ ہو گئی ہے۔ سارے ملک میں ایسے مرکزوں کی تعداد اس وقت ۵۰۰۰ ہے جو ہمارے کروڑوں دیہی باشندوں کی خدمت کا کام سر انجام دے رہے ہیں۔ کوشش یہ ہے کہ بوقتِ ضرورت ہر شہری کو اپنے گھر سے معمولی فاصلے پر طبی امداد فراہم ہو سکے اور کوئی بیمار بے علاج پڑا نہ رہنے پائے۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ایک طرف تو شرح اموات میں کمی اور صحت عامہ میں ترقی ہوئی ہے لیکن دوسری طرف آزادی سے پہلے تقسیم شدہ ہندوستان کی آبادی جو ۳۴ کروڑ کے لگ بھگ تھی بڑھ کر اندازاً ۵۴ کروڑ ہو چکی ہے۔ آبادی اگر اسی رفتار سے بڑھتی گئی تو اس کا انجام بڑا بھیانک ہوگا۔ لہٰذا افزائشِ آبادی کی رفتار کو روکنے کے لیے

خاندانی منصوبے عمل میں لائے جا چکے ہیں۔

پچھلے بیس سال میں ایک مدت تک پیدائش کی شرح ۴۱ فی ہزار تھی لیکن اب خاندانی منصوبوں اور امتناعِ حمل کے طریقوں کی بدولت اب شرح پیدائش ۳۵ فی ہزار ہو گئی ہے۔ لیکن منتہائے مقصود فی ہزار ۲۵ رکھا گیا ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی مرکزوں کی تعداد اس وقت ۲۷۰۰۰ ہو چکی ہے اور امید ہے کہ پانچ سال اور گذر جانے سے پہلے ان کی تعداد ۴۰۰۰۰ تک پہنچ جائے گی۔

بہت سے امراض ایسے ہیں کہ اگر پینے کو صاف پانی دستیاب ہو اور حفظانِ صحت کے قوانین سے واقفیت ہو جائے تو اُن سے لوگ بڑی حد تک محفوظ رہ سکتے ہیں۔ اس کو مدنظر رکھتے ہوئے ہماری سرکار نے نیشنل واٹر سپلائی اور حفظانِ صحت کے پروگرام ۱۹۵۴ء میں شروع کیے۔ چوتھے پنج سالہ منصوبے کے شروع ہونے تک دس لاکھ پینے کے کنوئیں اور تین لاکھ سے زائد ہینڈ پمپ لگائے جا چکے ہیں۔

تعلیم

قومی ترقی کے لیے تعلیمی ترقی بہت ضروری ہے۔ آزادی سے پہلے ہمارے دیہات ناخواندہ لوگوں کی بستیاں کہلاتے تھے جب کہ ہماری کل آبادی کا ۸۵ فی صد دیہات ہی میں رہتا ہے۔

انگریزوں نے جب ہندستانیوں کو تعلیم دینا شروع کی تو انھوں نے دیہات اور نچلے طبقے کے لوگوں کو بالکل نظرانداز کر دیا تھا۔ تعلیم شہروں کے اونچے درجے اور امیر لوگوں کے بچوں کا حق اور مشغلہ سمجھا جاتا تھا۔ ٹیکنیکل تعلیم دینے سے تو پوری طرح احتراز کیا گیا تھا۔ یہ حالت تقریباً آزادی کے آغاز تک قائم رہی۔ لیکن ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ء کو جب ہمارا ملک جمہوریہ بن گیا اور نیا دستور عمل میں آ گیا تو جہاں ہر بالغ شہری کو ووٹ دینے کا حق دار قرار دیا گیا وہاں یہ بھی اعلان کیا گیا کہ دس سال کے اندر اندر چھ سے چودہ سال تک کی عمر کے بچوں کو مفت اور لازمی پرائمری تعلیم دی جائے گی۔ چنانچہ ۱۹۶۹ء تک چھ سے گیارہ سال کی عمر تک کے ۶۲ فی صد بچے ہمارے اسکولوں میں پرائمری تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں ایسے طلبا کی تعداد ایک کروڑ چالیس لاکھ تھی۔ مگر اب یعنی ۱۹۶۹ء میں ان کی تعداد پانچ کروڑ پینسٹھ لاکھ ہو گئی ہے۔ مڈل کے اسکولوں میں طلبا کی تعداد اب بیس لاکھ کی بجائے ایک کروڑ پینتیس لاکھ ہے۔ اور ہائی اسٹینڈرڈ میں طلبا کی تعداد ۱۹۴۷ء میں دس لاکھ سے کم تھی مگر اب چھیاسٹھ لاکھ ہو گئی ہے۔ ۱۹۵۱ء تک ہمارے کالجوں میں طلبا کی تعداد صرف تینتیس لاکھ تھی مگر اب اس سے پانچ گنا زیادہ ہے یعنی ایک کروڑ ستر لاکھ۔

ان سب سے زیادہ شاندار نتائج ٹیکنیکل تعلیم میں ظاہر ہوئے ہیں۔ اقتصادی ترقی کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کی تعلیم بہت ضروری ہے۔ اس ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمارا ملک آج تک ڈھائی لاکھ گریجویٹ انجینئر اور ڈپلوما ہولڈر پیدا کر چکا ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ہمارے یہاں صرف ۳۸ انجینئرنگ کالج تھے جن میں ۳۰۰۰ طلبا تعلیم حاصل کرتے تھے لیکن ۱۹۶۸ء تک انجینئرنگ کالجوں کی تعداد ۱۳۸ ہو گئی اور ان میں ۲۲۰۰۰ طلبا زیر تعلیم تھے۔ اسی طرح پالی ٹیکنک اسکولوں کی تعداد ۲۸۴ ہو گئی جن میں ۲۴۰۰۰ طلبا تربیت حاصل کرتے ہیں۔ انجینئرنگ اداروں کی اس شاندار ترقی کے فیض سے ہماری صنعت و حرفت میں زبردست ترقی ہوئی ہے۔ اس وقت ہمارے کارخانوں کی بنی ہوئی چیزوں کی بیرونی ممالک کی منڈیوں میں کافی مانگ بڑھ رہی ہے۔

اچھے تعلیمی اداروں کے دروازے ہمارے نام نہاد اچھوتوں کے لیے صدیوں سے مسدود چلے آتے تھے۔ لیکن ہمارے دستور نے چھوت چھات کو ملک بدر کر دیا ہے اور پس ماندہ طبقے کے دوسرے لوگ بھی شاہراہِ ترقی پر گامزن ہو چکے ہیں۔ قومی زندگی کا ایک بڑا عضو جو صدیوں سے مفلوج اور معطل پڑا تھا، از سرِ نو زندہ ہو چکا ہے۔

چوتھے اور پانچویں منصوبوں کی تکمیل کے لیے ہمیں اونچے درجے کے تربیت یافتہ کاریگروں کی بڑی ضرورت ہے۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے مناسب سہولتیں اور ضروری وسائل پیدا کرنے کی انتہائی کوشش کی جا رہی ہے۔

ہریجنوں اور دیگر پس ماندہ قوموں کے بچوں کے لیے خصوصاً پرائمری تعلیم مفت دی جا رہی ہے۔ یہی نہیں بہت سی دوسری مراعات بھی دی جا رہی ہیں۔ یعنی طلبا کے لیے وظیفے، ان کی دیکھ بھال اور

اچھی خوراک کا بندوبست بھی کیا جا رہا ہے۔ ۱۹۵۶ء میں دیہات میں پرائمری کے بعد کی تعلیم کی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے نیشنل کونسل برائے ہائر ایجوکیشن قائم کر دی گئی ہے جس کا فرض منصبی حکومت کو تعلیم کے ضمن میں ضروری اور کارآمد مشورے دینا ہے۔

اقتصادی ترقی صنعتی اور زرعی ترقی کے بغیر ناممکن ہے۔ اس وقت ہماری فیکٹریوں میں ۰۰۰۰۰۵ مزدور کام کر رہے ہیں۔ مزدوروں کی اتنی بڑی فوج کو اپنے حالات سے مطمئن رکھنا اشد ضروری ہے۔ سب سے بڑا اور اہم سوال شرح مزدوری ہے۔ اس کے لیے گورنمنٹ نے مختلف صنعتوں کے واسطے الگ الگ اجرت (ویج) بورڈ قائم کر رکھے ہیں جن کے مشوروں پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔

ایمپلائز اسٹیٹ انشورنس اسکیم ۱۹۴۸ء میں شروع کی گئی اور فروری ۱۹۷۰ء تک ۳۷۰۸۰ لاکھ مزدوروں کا بیمہ اس اسکیم کے ذریعے ۱۳۴ سینٹروں میں کیا گیا۔ مزدور عورتوں کو ایام زچگی میں زر امداد دیا جاتا ہے۔ مزدوروں کے اہل عیال اور بچوں کی فلاح و بہبودی کا ہر طرح خیال رکھا جاتا ہے۔

مزدوروں کو ٹریڈ یونین بنانے کی مکمل آزادی ہے۔ ۱۹۶۶ء میں ہمارے یہاں ۱۴۲۵۱ ٹریڈ یونینیں تھیں اور ان یونینوں کے ممبروں کی تعداد ۲۲۳۸۱۵۴۸ ہو چکی تھی

اسی طرح زرعی مزدوروں کے مفاد کو بھی ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ ۱۹۵۱' ۵۷-۱۹۵۶ اور ۶۵-۱۹۶۳ء میں نیشنل سیمپل سروے کی وساطت سے زرعی مزدوروں کے حالات کی تحقیقات کی گئی اور اس کی روشنی میں اُن کی آمدنی خرچ اور قرضوں وغیرہ سے متعلق معلومات حاصل کی گئیں۔ ایک نئے قانون کے تحت جو ۱۹۴۸ء میں نافذ کیا گیا تھا' کئی صوبوں میں زرعی مزدوروں کی کم سے کم شرح اجرت مقرر کر دی گئی۔ نہ صرف یہ بلکہ معافیوں' جاگیروں اور زمینداریوں کی منسوخی بھی کئی صوبوں میں کر دی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ...... ۲ زرعی مزدور اس زمین کے مالک بن گئے جس پر وہ کاشت کاری کیا کرتے تھے۔

ہریجنوں اور دیگر پس ماندہ اقوام کی حالت زار اس بات کی متقاضی تھی کہ ان کی ترقی کے لیے خاص وسائل پیدا کیے جائیں۔ اس لیے ہمارے دستور اور پنج سالہ منصوبوں میں اس کام کو ایک اہم قومی فریضہ سمجھ کر بہت اہمیت دی گئی۔ اس کار خیر پر آج تک ۱۴۵ کروڑ روپے خرچ ہو چکے ہیں۔ صوبائی حکومتیں بھی اس پر کافی روپیہ خرچ کر رہی ہیں۔ ہمارے چوتھے پنج سالہ منصوبے میں اس مقصد کے لیے ۱۳۵ کروڑ کا تعین کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مزید ۲۵ کروڑ روپے غیر پنج سالہ منصوبے کے خرچ کے طور پر مخصوص کیا گیا ہے۔ یہ رقم اس پس ماندہ اقوام کے بچوں کے تعلیمی وظیفوں اور دیگر فلاحی کاموں پر خرچ ہو گی۔

مرکزی حکومت نے ان لوگوں کے لیے سرکاری ملازمت ۱۲ فی صد کر دی ہے اور ہریجنوں کے ضمن میں یہ شرح ۵ فی صد سے ½ ۷ فی صد کر دی گئی ہے۔

انسان کی خوش حالی اور بہبودی کے لیے خوراک اور صحت کے علاوہ ایک تیسری اور چیز کی بھی اشد ضرورت ہے۔ اور وہ ہے رہنے کے لیے مکان۔ دیہات میں ۹۴ فی صد لوگوں کے رہنے کے لیے اپنے نجی مکانات ہیں اور شہروں میں ۴۶ فی صد۔ لیکن گاؤں میں مکانوں کی اکثریت کچے مکانوں پر مشتمل ہے اور یہ کچے مکان نہایت گھٹیا درجے کے ہوتے ہیں اور یہی حالت اکثر قصبوں اور شہروں میں پائی جاتی ہے۔ چوتھے پنج سالہ منصوبے میں ...... ۸۳۷ رہائشی واحدوں کی کمی کا اندازہ تھا۔ اس لیے صوبائی اور مرکزی حکومتوں نے اپنے ملازموں کو رہائشی مکان مہیا کرنے پر توجہ کی۔ پاکستان سے ہجرت کر کے آئے ہوئے لوگوں کے لیے مکان بنانے کی مہم کے ساتھ پہلی دفعہ سرکاری ملازموں کے علاوہ دوسروں کے لیے تعمیرات کا پروگرام اپنایا گیا۔ ۱۹۵۲ء میں ہاؤسنگ کے ایک الگ محکمے کی تخلیق کی گئی جس کے وجود میں آنے کے ساتھ لوگوں کو مکانات بنانے کے لیے آسانیاں پیدا ہو گئیں۔ کئی قصبے اور شہرانی اسکیموں کی مدد سے بسا دیے گئے ہیں ان میں چندی گڑھ کا نام بھی آتا ہے۔

تیسرے اور چوتھے پنج سالہ منصوبے کے دوران ۲۹۰۰۰۰ رہائشی مکانوں کے تعمیر ہو جانے کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ اور ان پر ۵۵۰۰ کروڑ کے خرچ کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ پہلے پنج سالہ منصوبے کے دوران میں ۷ لاکھ مکان تعمیر کیے گئے۔ تیسرے منصوبے میں پبلک سیکٹر اور پرائیویٹ سیکٹر کے مکانوں کی تعمیر پر ۱۵۶۵ کروڑ روپیہ خرچ کیا گیا تھا اور تقریبا

۴ لاکھ مکان تعمیر ہوئے

چوتھے منصوبے کے دوران ۱۹۱،۳۲ کروڑ روپے کے خرچ کرنے کی تجویز ہے۔ لائف انشورنس کارپوریشن بھی اس کام پر روپیہ لگا رہی ہے۔

قلیل تنخواہ پانے والے کارخانوں کے مزدوروں کے لیے رہائشی مکان تعمیر کرنے کے سلسلے میں ۱۹۵۲ میں ایک اسکیم تیار کی گئی۔ اس کے مطابق ستمبر ۱۹۶۹ تک ۱۶۰،۳۲ گھروں کی تعمیر مکمل ہو چکی ہے۔ اسی طرح کی ایک اور اسکیم اقتصادی اور مالی طور پر کمزور افراد کے واسطے مکانوں کی تعمیر کے لیے بنائی گئی۔ اس اسکیم کے ذریعے ستمبر ۱۹۶۹ تک ۱۹۴۲۷ مکان تعمیر ہو چکے ہیں۔ دسمبر ۱۹۶۹ تک مرکزی حکومت نے مکانوں کی تعمیر کے لیے اپنے ملازموں کو ۴۴۹ کروڑ روپے کے قرضے دیے ہیں۔

دیہات میں مکان بنانے پر خاص توجہ دی گئی ہے۔ ۱۹۵۷ میں ویلیج ہاؤسنگ پروجیکٹ اسکیم کا اجرا ہوا۔ یہ اسکیم امداد اور خود اعتمادی پر مبنی تھی۔ اس کے مطابق مکان کی تعمیر کے لیے ...۳ روپے یا کل قیمت کا ۸۰ فیصد امدادی قرضہ دیا جاتا ہے (دونوں میں جو بھی کم ہو)۔ ۱۹۶۹ تک .....۹۲۱ روپیہ قرض دیا جا چکا ہے اور ۹۲۴۳۴ گھروں کی تعمیر مکمل ہو چکی ہے۔

صنعتی بستیوں اور کارخانوں کی تعداد بڑھنے کی وجہ سے جھگی جھونپڑیوں کا سوال زیادہ اہم شکل اختیار کر رہا ہے اس کے حل کے لیے مئی ۱۹۵۶ء میں ایک اسکیم بنائی گئی —— اس اسکیم کے مطابق صوبائی حکومتوں کو مالی امداد دی جاتی ہے تاکہ جھگی جھونپڑیوں کو منہدم کرنے کے بعد جو لوگ ان میں رہتے تھے ان کے لیے رہائش کا بندوبست کیا جا سکے۔ اس اسکیم کے تحت صوبائی حکومتوں کو .....۴۴۳۰ روپے مارچ ۱۹۶۹ تک ادا کر دیا گیا ہے۔ اس عرصہ میں اس اسکیم کے مطابق ۴۸۵۲۷ مکان تعمیر کیے جا چکے ہیں۔ ایسی ہی ایک اسکیم دہلی میں ۱۹۶۰ء سے چل رہی ہے۔

سنٹرل ہاؤسنگ اور شہری ترقی کو مالی امداد دینے کے مقصد سے

ایک کارپوریشن کی بنا اپریل ۱۹۷۰ میں رکھی گئی۔ اس غرض سے دو سو کروڑ روپے کا جو فنڈ مخصوص کیا گیا ہے اس سے توقع ہے کہ رہائشی مکانوں کی تعمیر کے سلسلے میں خاصی مدد ملے گی اور یہ نیا قدم اس مسئلے کو حل کرنے میں بہت مفید ثابت ہوگا۔

اب رہا سوال بے روزگاری کا تو آزادی سے پہلے کبھی کسی نے اس بات کی پروا نہیں کی تھی کہ ملک بھر میں بے روزگاری کا مسئلہ کیسے حل ہو سکتا ہے۔ آزادی کے بعد اس بے روزگاری کے مسئلے کی وسعت پر پوری طرح غور و خوض کیا گیا۔ مزدوروں کی مردم شماری کی گئی اور وہ صنعتی امور آب پاشی سبز زراعت وغیرہ میں کس قدر استعداد رکھتے تھے اس کے جاننے کی کوشش بھی کی گئی تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ انھیں قومی تعمیر کے معاملے میں کس کس کام پر لگایا جا سکتا ہے۔

روزگار دفتر (امپلائمنٹ ایکسچینج) اور دوسرے ادارے جو اس مطلب کے لیے کھولے گئے ہیں، ہر وقت اس بات کی کوشش میں رہتے ہیں کہ ہر شخص کو اس کی قابلیت کے مطابق کام مہیا کیا جائے۔ لیکن سب کے لیے بہ یک وقت کام مہیا کرنا فوراً آسان نہیں ہے۔ ابھی ہمارے صنعتی زرعی اور دوسرے اداروں میں کئی طرح کی توسیع عمل میں لانا ہے۔ گاؤں گاؤں میں بجلی پہنچا دینے کے کام کی ابھی تکمیل کرنا ہے۔ ابھی بہت سی نئی سڑکیں پل اور نہریں بنانا ہیں۔ ان کاموں کی تکمیل کے بعد یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ بیشتر آبادی کے لیے روزگار اور کام مہیا ہو سکے گا۔

بالآخر ہمیں اس بات کا فخر ہے کہ آزادی کے ۲۵ سال کے اس قلیل عرصے میں ہم نے صنعتی، زرعی، سائنسی، تعلیمی، میڈیکل وغیرہ میدانوں میں کافی ترقی کر لی ہے اور امید ہے کہ ملک اس راہ پر تیزی سے گام زن رہ کر خوش حال اور خود کفیل سوشلسٹ سماج کے قیام کا نصب العین پورا کر لے گا جو اس نے آزادی کے بعد اپنے لیے متعین کیا تھا اور جس کی تکمیل کے لیے وہ مسلسل کوشاں ہے۔



آزادی کے لیے سختیاں

جھیلنے والوں کے لیے اعزازات

وزیر اعلیٰ اتر پردیش شری کملا پتی ترپاٹھی نے ۱۵ راگست کو یہاں منعقدہ ایک خصوصی تقریب میں مدعو ۲۴۹ مجاہدین آزادی میں سے ۱۹۹ کو تامر پتر پیش کیے گئے۔ اس تقریب میں ۴۰ مجاہدین آزادی کو مرکزی حکومت کی جانب سے اور ۵۹ کو ریاستی حکومت کی جانب سے تامر پتر پیش کیے گئے۔ مرکزی حکومت کی طرف سے حسب ذیل ۴۰ مجاہدین آزادی کو تامر پتر پیش کیے گئے۔

علی گڑھ: سرو شری روپ کشور اور تلسی رام۔ الموڑہ: سرو شری ریوادھر پانڈے اور درگا دت پانڈے۔ آگرہ: سرو شری چندر سنہہ اور شیو شنکر۔ اعظم گڑھ: سرو شری کیدار ناتھ لال سنتوش آنند عرف گھونیا سنگھ اور سہدیو رام حجام۔ اٹاوہ: سرو شری شیو داس پانڈے عرف کیشو دیو پرشاد اور سونے لال حشر ما۔ الہ آباد: سرو شری ہر چرن لال ورما اور دیوی پرشاد بھٹناگر۔ اتر کاشی: شری نتھا سنگھ کشیپ۔ اناؤ: سرو شری رام دت اوستھی رگھو نندن اور رام آدھار مسرا۔ ایٹہ: شری کندا سنگھ کانپور: سرو شری حمید خاں 'اقبال'، کرشن کچور اور چھیل بہاری۔ غازی پور: سرو شری بینی مادھو رائے۔ بل روپ شرما۔ اندر دیو سنگھ۔ رام سروپ ابادھیائے۔ شنکر دیال رائے اور متھرا پرشاد عرف بلدا پانڈے۔ گونڈہ: سرو شری ایشوری پرشاد۔ پرمیشور مسر اور رام پیارے لال تیواری۔ گورکھپور: سرو شری گنیش اور مہادیو۔ گھوسی: سرو شری باگھ سنگھ راوت اور کلیانند ڈماری جالون: سرو شری پربھو دیال اور رامیشور دیال۔ جھانسی: سرو شری من پت سنگھ پرہار۔ کالکا پرشاد اگروال اور رام گوپال شاستری۔ ٹہری گڑھوال: سرو شری منبیرال اونیال اور خوشحال سنگھ دیوریا: شری چندر سنگھ۔ دہرہ دون: سرو شری اگیا رام اور دیویندر ناتھ پانڈے۔ نینی تال: شریمتی سنگھاسنی دیوی۔ سرو شری بان سنگھ اور پورنانند تیواری۔ پوڑی گڑھوال: سرو شری گوپال سنگھ اور بھگوادت پنت۔ پیلی بھیت: سرو شری چھوٹے لال اگنی ہوتری اور نصیر الدین خاں۔ گڑھوال: سرو شری پیری رام۔ پرتاپ گڑھ: سرو شری رام چرن شرما اور دلاج سنگھ فتح پور: سرو شری دیا شنکر مسرا اور وشوناتھ پرشاد۔ فرخ آباد: سرو شری دیوی سہائے اور جگت نارائن۔ فیض آباد: سرو شری محمد نصیر۔ سریندر ناتھ اور دیو دیو داس برہمچاری۔ بدایوں: سرو شری تاراچند اور سوہن لال۔ بریلی: سرو شری رام سروپ گپتا اور دینا ناتھ گپتا۔ بلیا: سرو شری رامیشور مشرا اور حاضر بخش انصاری بستی: سرو شری ٹھاکر پرشاد اور ہردوار ترپاٹھی۔ بہرائچ: سرو شری سری رام ترپاٹھی اور بیدناتھ۔ باندہ: شری گوردین شرما۔ بارہ بنکی: سرو شری امبیکا شکلا اور براتی لال۔ بجنور: سرو شری امراؤ سنگھ اور ستیہ پرشاد پاٹھک۔ بلند شہر: شری رام سنگھ متھرا: سرو شری راج پال سنگھ اور برہمانند شرما۔ مرزا پور: شری رام ادھار سنگھ۔ مظفر نگر: شریمتی شیو دیوی اور شری سری چند۔ مراد آباد: سرو شری رادھے شیام اور بنارسی داس مین پوری: شری امر ناتھ۔ رام پور: شری ناتھو سنگھ رائے بریلی: سرو شری شیو راج سنگھ اور شیتلا شنکر۔ لکھنؤ: شری گنیش دت پانڈے۔ لکھیم پور کھیری: سرو شری بابو رام اور بنارسی لال اوستھی۔ وارانسی: شری مہادیو سنگھ۔ شاہجہاں پور: شری نظیر سہارنپور: سرو شری آشا رام اور چھیپن لال۔ سیتا پور: سرو شری سندر لال دھون۔ گرجا پرشاد اور پرین سنگھ۔ سلطان پور: سرو شری متھرا پرشاد اور بھگوتی پرشاد دیا۔ ہمیر پور: سرو شری بدری پرشاد بجاج اور بھگوان داس بالمیکی۔ ہردوئی: سرو شری شیام چرن ورما اور بہاری بہادر سریواستو۔

اس کے علاوہ حکومت ہند کی طرف سے جن ۱۲ مجاہدین آزادی کو تامر پتر دیے جانے والے تھے اور جو اس موقع پر نہ آ سکے ان کے نام حسب ذیل ہیں:

شری رگھبیر سنگھ (ایٹہ)۔ سرو شری مسر جیا اور شری

دگورکھپور) سروشری ادیا پرشاد سنگھ اور ماتو دھیا پرشاد (جونپور)۔ شری نگیندر دت (گڑھوال) شری کلیشر سنگھ (بلیا) شریمتی کشیری شکلا (بستی)، شری چندر بھوشن سنگھ (باندہ) شری بدری پرشاد (بلند شہر) شری بسنت لال (مرزاپور)، سروشری پھول سنگھ اور چھپال سنگھ تیاگی (میرٹھ) شریمتی پریم کلا دیوی (اُناؤ) شری گردھاری سنگھ (رامپور)۔ شری مادھو کرشن (لکھنؤ) مسٹر شری وندا بن سنگھ۔ بدری شری پاٹھک اور گوری شنکر مسرا (وارانسی) شری رام لال (شاہ جہاں پور)۔ شری رگھو نندن شرما (ہردوئی)

ریاستی حکومت کی طرف سے جن ۹۵ مجاہدین آزادی کو تامرپتر دیے گئے ہیں ان کے نام حسب ذیل ہیں:

علی گڑھ: سروشری دیویندر پال سنگھ اور پرشادی سنگھ الموڑہ: شریمتی بھگوتی اور گرلش چند رتوہانی۔ آگرہ: سروشری رام سروپ جاہر پرشاد اور سام سنگھ۔ اعظم گڑھ: سروشری تردک رائے شرما۔ رام چندر یادو جگنا تھ رائے۔ پاٹھ شری سروا ستوا اور ستیا رام سنگھ اٹاوہ: سروشری دین دیال راجپوت۔ رستم اور مرلی دھر دویدی۔ الہ آباد: سروشری رام کشور۔ رام اوتار گپتا۔ لکھپت رائے اور شریمتی کلاوتی مصرا۔ اناؤ: سروشری نکھو سنگھ۔ شیو پال۔ وشو ناتھ سنگھ برج ناتھ اور چھیدی لال۔ اٹہ: سروشری متی رام۔ بدن سنگھ۔ لال من اور رام چرن۔ غازی پور: سروشری ہری شنکر سنگھ۔ چھیدی رائے۔ سامارائے۔ رام شنکر اور جنا مدن سنار۔ گونڈہ: شری جگدمبکا پرشاد۔ گورکھپور: شری رام سبھاگ کلوار۔ جونپور: سروشری سالک رام گپتا۔ گنگا دین شریمتی اور شیتلا پرشاد۔ جالون: سروشری گنگا دین اور سکھ رام تیواری۔ جھانسی: سروشری بھاؤ سنگھ مہر پرشاد اور گلاب چندر۔ دیوریا: شری مدن موہن عرف پورن ماسی۔ ڈیرہ دون: سروشری بھیم سین بھاٹیا اور دیش پال بھاٹیا نینی تال: شری ریوادھر شرما۔ پرتاپ گڑھ: شری گنگا دت شرما پیلی بھیت: شری دند رام۔ پوڑی گڑھوال: شری نگی رام۔ پرتاپ گڑھ: سروشری جگن ناتھ۔ بیگ شیر اور شمشیر بہادر سنگھ۔ فتح پور: شری گورکھ ناتھ پانڈے۔ فرخ آباد: شری رامیشور دیال

فیض آباد: سروشری رام نگینہ اور رپا نند پانڈے۔ بدایوں سروشری امراؤ سنگھ اور شو ناتھ شرما۔ دیبیدی شریملیہ۔ بلیا شریمتی کرپا دیوی بلیا۔ شری بھگوت پانڈے۔ بہرائچ: سروشری ستیا رام۔ بدری پرشاد اور بھگوتی پرشاد۔ باندہ: شریمتی کملا دیوی بجنور: سروشری لال سنگھ اور رام سرن داس۔ بلند شہر: شری کیشو رام۔ متھرا: شری ہیت رام۔ مرزاپور: سروشری بیج سنگھ کرشنا پرشاد۔ رام سکھا۔ جے نارائن سنگھ۔ دیاس جی آباد دھیائے رام اجاگر شرما اور شریمتی نتیہ کور۔ مظفر نگر: شری شیل سنگھ۔ مراد آباد: شری بھرت سنگھ اور شریمتی بھگوتی۔ میرٹھ: سروشری جتی سنگھ۔ جگل کشور شرما رامانند تیاگی اور جنشی لال شرما۔ مین پوری: شری کرتار سنگھ۔ رامپور: شری کاشی رام۔ لکھنؤ: شریمتی چندرا اپادھیائے۔ شری آتما رام پانڈے وید۔ شریمتی انار کلی اور شری کشوری لال اگروال۔ شاہجہاں پور: شری فتح الدین۔ سیتاپور: سروشری سری پال سنگھ اور ببلو پرشاد سلطانپور: شری میشر ٹھی پاٹھک۔ ہردوئی: سروشری کرن سنگھ اور بچے لال۔

ریاستی حکومت کی طرف سے تامرپتر پانے والے ان ۲۹ مجاہدین آزادی کے نام حسب ذیل ہیں جو اس موقع پر نہ پہنچ سکے۔

شریمتی سرسوتی دیوی (اناؤ)۔ شری سکھواسی لال۔ شری ستیہ نارائن شری کالی چرن۔ شری سوہن لال اور سکتی کاکا۔ شری رادھے تیاگی (کانپور)۔ شری پریم ہنس رائے (غازی پور)۔ شری سوامی ناتھ (گونڈہ)۔ شری سردمن سنگھ (جالون)۔ شری شنکر دت دوٹیال شری اندر سنگھ۔ شری بھیرو دت اونیال۔ شہری گڑھوال۔ شری رنجیت سنگھ (پوڑی گڑھوال)۔ شری بچو لال۔ شری نکھوا (فرخ آباد) شری بدری پرشاد اپادھیائے (فیض آباد)۔ شری ہیمندر پانڈے (بلیا) شری عبدالرحمٰن (بستی)۔ شری سیوک رام۔ شری مکھن لال۔ (بارہ بنکی) شری بھیچ مالویہ۔ شری نبس راج۔ شری بھگوت سنگھ۔ شری بے نارائن سنگھ۔ شری ادیا پرشاد (مرزاپور)۔ شری بابو رام (میرٹھ)۔ شری تارا دت اوجھا (وارانسی) شری ہرشے رام (سہارنپور) اور شری گنگا دین مکھیا (ہمیرپور)۔



ہندستان کی آزادی کی پچیسویں سالگرہ

ہاشم صہبا جمیلی

آج پندرہ[1] اگست کو ہم ملک کی آزادی کی پچیسویں سالگرہ منا رہے ہیں۔ عمر کا پچیسواں سال بہت ہی اہم ہوتا ہے جس میں طفلی بہت دور پیچھے رہ جاتی ہے مگر دور سے جوانی کی امنگوں، حوصلوں اور بہاروں کو دیکھتی ہے۔ ایک بچہ جوان ہو کر زندگی کی تلخیوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتا ہے اور زندگی کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح آج ہمارا دیش ترقی کی اس منزل میں ہے جس میں داخل ہونے کے بعد ایک ملک خود کفیل کہلاتا ہے۔ ہندستان آج خود کفیل ہے۔ ترقی کی شاہراہیں اس قول کی نشان دہی کر رہی ہیں —— صدیوں پرانا فن زراعت آج بالکل بدل چکا ہے۔ ہندستان کا کاشتکار نئی سائنسی تکنیک استعمال کر رہا ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ پیداوار ہو سکے۔ "سبز انقلاب" (GREEN REVOLUTION) اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ہم اپنی آنکھیں ان فرٹیلائزر کارخانوں کی غیر معمولی ترقیوں کی طرف سے نہیں بند کر سکتے جو "سبز انقلاب" کی ضامن اور ذمے دار ہیں مثلاً بہار میں سندری، پنجاب میں ننگل، تامل ناڈ میں نیوَیلی، اڑیسہ میں رورکیلا، مغربی بنگال میں درگاپور، مدھیہ پردیش میں کوربا، آسام میں نامروپ، یوپی میں گورکھپور، کیرالا میں کوچین اور گجرات میں کنڈلا۔ چار دیوزاد اسٹیل کارخانے رورکیلا، بھلائی، درگاپور اور بوکارو میں قائم کیے گئے ہیں۔ بمبئی میں تاراپور، راجستھان میں رانا پرتاپ ساگر، تامل میں کالپکم مشہور و معروف ایٹمی توانائی گھر ہیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے عالمگیر شہرت کے حامل ہیں —— بمبئی کے نزدیک ٹرامبے میں نیوکلیائی ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی تکمیل عمل میں آئی جو ایٹمی اور نیوکلیائی سائنس میں ایک نمایاں ترقی کا علمبردار ہے۔ جودھپور میں ایئر فورس فلائنگ کالج، رڑکی میں سنٹرل بلڈنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، لکھنؤ میں سنٹرل ڈرگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، بنگلور میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف سائنس اور کانپور میں انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ ہمارا آج کا ہندستان کس قدر سائنسی اور ایٹمی ترقی اور ایجادات کے راستے پر آگے جا چکا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمسایہ ملک چین اور پاکستان برابر درپے آزار رہے۔ چنانچہ سب سے پہلے آزادی ملتے ہی پاکستان نے ۱۹۴۷ء میں حملہ کیا اور کشمیر تک گھستا چلا آیا۔ پھر ۱۹۶۲ء میں چین ہندستان پر حملہ آور ہوا۔ ۱۹۶۵ء میں پاکستان نے ہندستان کے خلاف اعلان جنگ کیا —— ۳ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستان نے پھر ہندستان پر جارحانہ حملہ کیا —— "اہنسا" کی راہ پر چلنے والا ہندستان کبھی بھی اپنے اصولوں سے ہٹا نہیں اور سیکولرازم کی امانت کو سینے سے لگائے اپنے روایتی اصولوں اور آدرشوں کے ساتھ ان حالات کا مقابلہ کرتا رہا —— یہ بات بلا کسی مبالغے کے کہی جا سکتی ہے کہ اگر اس طرح آزاد ہندستان پر دشمنوں کے متواتر حملے نہ ہوتے تو آج ہندستان ترقی کی منزل میں کہیں زیادہ بلندی پر ہوتا۔ دوسری جنگ عظیم ۱۹۳۹ء میں لڑی گئی اور تاریخ عالم شاہد ہے کہ تباہ شدہ ممالک کو پنپنے میں کافی عرصہ لگا —— ہندستان پر متواتر جارحانہ حملے ہوتے رہے اس کے بعد بھی آج وہ تر و تازہ ہے، شاداب ہے، جوان ہے اور اس کے حوصلے بلند ہیں —— پاکستان کے جارحانہ حملے کے جواب میں حال ہی میں جو جنگ لڑی گئی وہ ایک فیصلہ کن جنگ

[1] یہ مضمون اگست کے شمارہ کے لیے لکھا گیا تھا۔

کہی جاسکتی ہے جس کے نتیجے میں بنگلہ دیش وجود میں آیا تاریخ عالم میں ہندوستان کی یہ شاندار کامیابی سنہرے حرفوں میں لکھی جائے گی۔

ہندوستان میں قدرتی اور معاشی وسائل کی کمی کبھی نہیں رہی۔ قدرت نے ہندوستان کو ہر قسم کی نعمتوں سے بہرہ مند کیا ہے۔ یہاں خام اشیا بڑی افراط سے پیدا ہوتی ہیں۔ مگر یہ ضرور ہے کہ ہم غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے اور ہم پر ایک غیر ملکی حکومت مسلط تھی جس کے باعث ہم ان نعمتوں سے اپنے دامن کو خالی پا رہے تھے اور یہ نعمتیں قومی دولت نہیں بن رہی تھیں۔ لیکن آزادی حاصل کرنے کے بعد ہم نے تجارت کی منڈی میں فروغ پایا اور ہم ملک کی ترقی و خوشحالی کی طرف چل پڑے۔ زمینداری جو ایک لعنت تھی آزادی کے فوراً ہی بعد خاتمۂ زمینداری بل پاس کر کے ختم کر دی گئی اور اس طرح ایک "سامنت شاہی نظامِ حیات" نے دم توڑ دیا۔ آزاد ہندوستان نے "سماج واد" نظامِ حیات کی بنیاد ڈالی اور اس "نظریۂ حیات" کے ترویج و بقا کے سلسلے میں وہ تمام پرانی روایتیں اور اصول جو اس "تصورِ حیات" کے منافی تھے ایک ایک کر کے ختم کر دیے گئے۔ تاریخ آپ کو آگے بڑھ کر آواز دے گی کہ "ہندو سماج" میں عورتوں کے سلسلے میں وراثت کا مسئلہ نہ تھا — ایک سے دو بیوی بیک وقت رکھنے پر قانونی پابندی نہ تھی۔ ایک فرقہ دوسرے فرقے کے افراد سے ازدواجی تعلقات قائم نہیں کر سکتا تھا۔ افلاس، جہالت، بیماری، معاشی نابرابری، قدامت پرستی، ذات پات، اونچ نیچ اور چھوت چھات کا جذبہ ہندوستان کی ملی و قومی جڑوں کو کھوکھلا کر رہا تھا — ان

حالات کے پیش نظر ہندوستانی سماج میں سدھار کی کوششیں کی گئیں۔ عورتوں کو برابری کا حق ملا، ہندوستان کے آئین میں ہندو عورتوں کو طلاق کا حق دیا گیا۔ "ضبط تولید" کے سلسلے میں خاندانی منصوبہ بندی اسکیم چلی تاکہ ملک کی حد سے بڑھتی ہوئی آبادی کو اوسط منزل میں لایا جا سکے — والیان کی کفالت کے سلسلے میں جو "پریوی پرس" (مشاہرۂ خاص) مقرر کیا گیا تھا اس کا خاتمہ ہوا — بینک کو عوام الناس کی بہتری اور خوشحالی کے واسطے "قومیا" گیا — اونچ نیچ، چھوت چھات کی لعنت کو ختم کیا گیا اور سب کو برابری کا حق ملا —

آج کا ہندوستان ایک ترقی یافتہ ملک ہے جس کی گود میں بڑی بڑی نہریں بجلی پیدا کرنے کے کام آ رہی ہیں۔ دریا آبپاشی کر کے کھیتوں کو لہلہا رہے ہیں، باغات اور جنگلات قومی سرمایہ بن رہے ہیں، چمکتا ہوا سورج، بہت صاف ستھری ہوا، برف، پہاڑ اور ہمیشہ بہنے والے طوفانی پہاڑی چشمے ہندوستان کی عظمتِ گذشتہ کو واپس لا رہے ہیں جو غیر ملکی دورِ حکومت میں ماند پڑ گئی تھی اور ہندوستان کھوکھلا ہو گیا تھا۔ مختصر یہ کہ آج سے پچیس سال پہلے آزادی حاصل کرنے کی مہم سر کر لی گئی تھی، مگر سخت ترین مہم اس آزادی کو برقرار رکھنے، ملک کو مستحکم بنانے، سوشلزم کے راستے سے اسے ترقی کی اعلیٰ منزلوں تک پہنچانے کی باقی ہے۔ اس لیے آیئے آج اس مقدس موقع پر ہم عہد کریں کہ اس کے لیے ہم ہر قربانی پیش کرنے کو تیار رہیں گے اور ہم سب مل کر پورے اتحاد کے ساتھ اس کام کو انجام دیں گے۔ ہم رہیں یا نہ رہیں ہمارا ملک قائم رہے گا، ہماری داستان باقی رہے گی۔



"تشدد کا جواب تشدد سے نہ دینا بلکہ اپنے ہاتھ کو روک کر اور اس کے ساتھ ہی ساتھ (جارح کے) مطالبے (جس کی پشت پر طاقت ہے) کے آگے جھکنے سے انکار کر کے تشدد کو بے اثر بنا دینا ہی دنیا میں آگے بڑھنے کا واحد راستہ ہے۔"

— مہاتما گاندھی

(مخصوص تاثرات)

حسنِ نظر

[نیا دور بابت اگست ۱۹۷۲ء (آزادی نمبر) کے بارے میں قارئین نیا دور نے جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان میں سے چند درج ذیل ہیں ——— ایڈیٹر]

بالمیشور پرتاپ گولائی ——— پرتاپ گڑھ

گزشتہ کئی برسوں سے رسالوں کے صفحات پر خطوط باری کی وبا جس کے ساتھ پھیلی ہوئی ہے جن میں یا تو اپنے گروہ کے شعراء کی تعریف و توصیف ہوا کرتی ہے یا پھر رسالہ اور مدیر رسالہ کی شان میں قصیدہ خوانی۔ مگر کسی بھی رسالے میں آپ کو میرا کوئی خط نظر نہ آئے گا۔ میں شروع ہی سے تعریف و توصیف کے معاملے میں بے حد احتیاط برتتا رہا ہوں اور "جھوٹ" تو خیر مجھ سے کبھی بولا ہی نہیں گیا۔ اس کے باوجود آپ کا آزادی نمبر دیکھنے کے بعد بے اختیار میرے منہ سے کلمۂ تحسین نکل ہی گیا۔ میرے پاس بہت سے ماہناموں اور بہت روزناموں کے آزادی نمبر آئے ہیں لیکن مضامین کی فراہمی پھر ان کی ترتیب و تدوین میں آپ نے حسن محنت، لگن، شعور اور سلیقے کا ثبوت دیا ہے وہ کسی دوسری جگہ نظر نہیں آتا۔ اس مکمل، خوبصورت اور کارآمد سرکاری اشاعت پر میں آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

ظہیر غازی پوری ——— آرہ بہار

کئی روز قبل "صدائے عام" پٹنہ میں نیا دور کے خاص نمبر آزادی نمبر کی تشہیر نظر سے گزری نیا دور کے متوقع اور روایتی شان کے حامل اگست نمبر کے لیے منتظر ہی تھا کہ کل ٹھیک یوم آزادی کے روز ہی ڈاکیہ یہ شان دار نمبر دے گیا اور مسرتوں میں اضافہ ہوا۔

پیش نظر شمارہ اپنے تمام محاسن صوری و معنوی کے ساتھ آپ کے حسن ادارت کا مظہر ہے۔ یوں تو "آج کل" کو مرکز کی سرپرستی حاصل ہے مگر اہل نظر خوب جانتے ہیں کہ نیا دور کا مقام کتنا بلند ہے۔

یہ شمارہ میں بغور دیکھ رہا ہوں اس میں کیا نہیں ہے؟ جیسا کہ آپ کے شگفتہ اداریے سے ظاہر ہے اکثر چیزیں بوجوہ شامل اشاعت نہ ہو سکیں تاہم معیاری ادب تاروں کی کہکشاں بچی ہے۔ اسے پڑھ رہا ہوں اور رشک ہو رہا ہے کہ کاش میں بھی اس میں شریک ہوتا

ڈاکٹر تارا چرن رستوگی ——— شاگلا آسام

آپ نے اگست کا شمارہ بڑا شاندار نکالا ہے۔ خوب بہت خوب

یوسف اعظمی ——— حیدرآباد

نیا دور نے آزادی کی ۲۵ ویں سال گرہ کے موقع پر قوم کے لیے جو ادبی سوغات مرتب کی ہے وہ انمٹ نقش چھوڑ جائے گی۔ مضامین، شعری انتخاب اور ترتیب ہر لحاظ سے ایک نمایاں مثال ہے۔ اس طرح ایک سرکاری ماہنامے نے ادبی دنیا میں جو مقام پیدا کیا ہے اور دلوں میں اس کے لیے جو جگہ بن گئی ہے وہ مبارک اور لائق تحسین ہے۔

سیف بجنوری ——— بجنور

آزادی کی پچیسویں سالگرہ پر نیا دور کا اسپیشل نمبر باصرہ نواز ہوا۔ مضامین اور دوسرے تمام معاملات کے لحاظ و اعتبار اور آپ کی خصوصی پیش ترتیب نے تو اور بھی اسے اونچے معیار پر پہنچا کر قابل مبارک باد بنا دیا ہے اس خاص موقع پر اور اتنے معیاری شمارے میں اپنی عدم شرکت کا افسوس ہے۔

حفیظ نصا ——— حیدرآباد

محترم خورشید بھائی۔ سلام و نیاز

آپ کی ادارت میں ماہ بماہ رسالہ کا معیار نکھرتا جا رہا ہے۔ یہ سب آپ کی سعی جمیل کا نتیجہ ہے۔

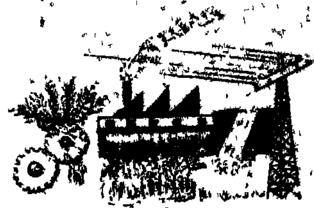
آفاق حسین صدیقی ——— اجین

گزشتہ چند ماہ سے نیا دور کے صوری و معنوی معیار میں قابل قدر اضافہ ہو رہا ہے اور ہر نیا شمارہ گزشتہ سے بہتر ہو کر آ رہا ہے۔ خدا کرے کہ یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے۔ اس سلسلے میں آپ کی کاوشیں اور محنت قابل مبارک باد ہیں۔



اتر پردیش

کا راہِ ترقی پر



غلہ کی پیداوار کے لیے جنگی پیمانے پر کام کرنے کی ضرورت ••• خشک سالی کا مقابلہ کرنے کے لیے اتر پردیش کو مرکز سے مالی امداد ••• قیمتوں کے اضافے کی روک تھام کے سلسلے میں اڑن دستوں کا قیام ••• مجاہدینِ آزادی کے لیے تعمیر مکانات کی سہولتیں ••• جوانوں اور ان کے والدین کو نقد انعامات ••• سینئر بیسک اسکولوں کی امداد کے قواعد میں ترمیم ••• بیسک تعلیمی بورڈ کا قیام ••• بڑی صنعت، سینما گھروں اور انجینئرنگ وائعدوں کے مزدوروں کی اجرتوں میں اضافہ ••• کسانوں کو دیئے جانے والے قرضوں کے قواعد میں ترمیم ••• زراعتی صنعت کارپوریشن اسٹامپ فیس کی ادائیگی سے مستثنیٰ ••• اعظم گڑھ میں ہریجنوں کی زراعتی صنعتی بستی کا قیام ••• اتر پردیش ترقی سیاحت کونسل کی تشکیل ••• چھوٹی ذہنی (ادب) بچوں کے لیے پرمٹوں کا فیاضانہ اجراء ••• بے گھر افراد کو مکانات کے پلاٹوں پر واقعی قبضہ دلانے کی ہدایت ••• لکھنؤ میں بچوں کی پرورش گاہ کا قیام ••• زمین اور پانی کے وسائل کے بہتر استعمال کے لیے دو ضلعوں میں رہبر منصوبے ••• پسماندہ علاقوں میں آبپاشی کی سہولتیں ••• یومِ آزادی کے موقع پر ۱۱۲ قیدیوں کی سزا معاف ••• متفرقات

اتر پردیش کے وزیر زراعت شری رام لکھن نے محکمہ زراعت کے فیلڈ افسروں کو ہدایت کی ہے کہ بارش میں تاخیر اور اس کی غیر یقینی صورت حال کی وجہ سے ملک کو زیادہ غلہ پیدا کرنے کا جو چیلنج درپیش ہے وہ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے بھرپور کوشش کریں اور اس سلسلہ میں کسی قسم کی تساہلی نہ برتیں۔ خریف کی پیداوار میں کمی کے امکان کے پیش نظر ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کمی کی تلافی کرنے کے لیے بڑے پیمانہ پر ربیع کی مہم شروع کی جائے اور ۵۰ لاکھ ایکڑ کے کل آبپاشی شدہ رقبہ کو گیہوں کی زیادہ پیداوار والی اقسام کے زیر کاشت لایا جائے۔ اس پروگرام میں تالابوں اور موسم گرما کے دھان کی فاضل پیداوار شامل ہوگی۔

شری رام لکھن کل لکھنؤ میں کرشی بھون میں تمام اضلاع کے زراعت افسران، ڈپٹی ڈائرکٹروں اور پراجکٹ افسروں کے ایک جلسہ میں تقریر کر رہے تھے۔

وزیر موصوف نے ایسے سرکاری فارموں کو سخت ناپسند کیا جو نقصان پر چل رہے ہیں اور مشورہ دیا کہ اگر مستقبل میں یہ فارم نقصان پر چلیں تو انھیں ختم کر دیا جائے۔ وزیر زراعت نے کہا کہ زراعت افسران اور سبھی کارکنوں کو چاہیئے کہ وہ وقت کی ضرورتوں کے مطابق کام کریں اور کسانوں سے قریبی رابطہ رکھیں جن کے فائدہ کے لیے محکمہ زراعت کثیر مصارف برداشت کرتا ہے۔

شری رام لکھن نے کہا کہ اگر چھوٹے کسان کو نظر انداز کیا گیا اور صرف مٹھی بھر کاشتکاروں کو "سبز انقلاب" کے میدان میں اتارا گیا تو زراعتی ترقی کی کوئی اسکیم کامیاب نہیں ہوگی۔

وزیر موصوف نے کہا کہ زراعت افسروں کو اپنے اپنے علاقوں کی آب پاشی کی ذمہ داری بھی قبول کرنا چاہیئے کیوں کہ پانی کے بغیر زراعتی پیداوار میں رکاوٹ پیدا ہونا ناگزیر ہے۔

وزیر ریاست برائے زراعت شری شیام سورت اپادھیائے نے مقامی حالات کے مطابق گاؤں اور بلاک کی سطح پر زراعتی منصوبے تیار کرنے کی ضرورت پر زور دیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ اسکیم محض خانہ پری کے لیے نہ ہو بلکہ موسم اور زمین کی صلاحیت پر مبنی ایک حقیقت پسندانہ اسکیم ہو۔ شری اپادھیائے

تاکہ زراعتی ساز و سامان مثلاً بیج اور کیمیاوی کھاد کی فراہمی بروقت ہو جائے اور انھیں مہیا کرنے کی ذمہ داری محکمہ زراعت کی ہونا چاہیئے

زراعتی کمشنر شری بی ڈی سانیال محکمہ زراعت کے اسپیشل سکریٹری شری راجیندر ناتھ آزاد اور ڈائرکٹر زراعت شری ڈم کرتن نے بھی فیصلوں سے خطاب کیا۔

٭ ٭ ٭

مرکزی حکومت نے ریاست میں بڑے پیمانہ پر حالیہ خشک سالی کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے حالات پر قابو پانے کے لیے اتر پردیش کو ۱۳ کروڑ روپیہ خصوصی امداد منظور کی ہے۔

مرکزی وزیر زراعت شری فخر الدین علی احمد نے اتر پردیش کے وزیر مالیات شری نارائن دت تیواری کو جنھوں نے ان سے کل دہلی میں ملاقات کی تھی یقین دلایا کہ اس مرکزی ٹیم کی سفارشات موصول ہونے پر جس نے اس ہفتہ نقصانات کا اندازہ لگانے کے لیے ریاست کا دورہ کیا اتر پردیش کو مزید امداد دی جائے گی۔

اس خصوصی امداد کو خشک سالی کے خلاف اقدامات مثلاً چھوٹے پیمانہ پر آبپاشی کی اسکیموں پر عملدرآمد (جن میں ڈیزل پمپنگ سیٹوں کی تنصیب ٹیوب ویلوں کی نالیوں کی تعمیر شامل ہے) اور غلہ کی پیداوار میں اضافہ سے متعلق پروگراموں کی رفتار تیز کرنے پر خرچ کرنے کی تجویز ہے

دریں اثنا ریاستی حکومت کے سینئر افسروں نے مرکزی حکومت کی ایک ٹیم سے جو لکھنؤ آئی ہوئی تھی ریاست میں خشک سالی اور خریف کی فصل کو پہنچنے والے زبردست نقصان کے پیش نظر مرکزی حکومت کی امداد کے سلسلہ میں تبادلہ خیالات کیا۔ مرکزی ٹیم کی قیادت شری بی۔ بی اگروال رکن منصوبہ بندی کمیشن اور ریاستی ٹیم کی قیادت چیف سکریٹری شری ایم لال نے کی تھی۔

مرکزی ٹیم نے اس سے قبل خشک سالی سے متاثر وارانسی مرزا پور۔ پرتاپ گڑھ اور رائے بریلی اضلاع کا دورہ کیا تاکہ وہاں نقصان کا اندازہ لگایا جاسکے۔

ریاستی حکومت نے ۱۵۹٫۹۱۲ کروڑ روپیہ کی مرکزی امداد کی درخواست کی ہے جس میں ۵۴٫۱۶۵ کروڑ روپیہ زراعت ۱۵٫۲۰ کروڑ روپیہ آبپاشی ۹۹ کروڑ روپیہ خشک سالی کے خلاف امدادی اقدامات اور ۴۰ کروڑ روپیہ ٹیوب ویل اور پمپنگ سیٹ لگانے اور انھیں بجلی فراہم کرنے کے لیے ہے بقیہ ۸۰٫۰ کروڑ روپیہ کی رقم پینے کے پانی کے کنووں کی تعمیر، چھوٹے پیمانہ پر آبپاشی سڑکوں اور صحت سے متعلق اقدامات کے لیے مانگی گئی ہے۔

٭ ٭ ٭

حکومت اتر پردیش نے قیمتوں میں اضافہ پر نظر رکھنے اور منافع خوروں اور ذخیرہ اندوزوں کے خلاف فوری طور پر سخت کارروائی کرنے کے مقصد کے پیش نظر ہدایات جاری کی ہیں کہ ہر ضلع میں قیمتوں سے متعلق شعبے اور الرٹ دستے قائم کیے جائیں۔

یہ بندوبست ان اقدامات کا ایک جز ہے جو حکومت نے بارش میں تاخیر کے نتیجہ میں غذائی اجناس اور ضروری اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ کی روک تھام کے لیے کیے ہیں۔

قیمتوں سے متعلق شعبہ غلہ۔ دالوں، شکر، نمک، بناسپتی، مونگ پھلی کے تیل اور دیگر ضروری اشیاء کی یومیہ خوردہ قیمتوں کے بارے میں معلومات جمع کرے گا اور ان کی قلت یا قیمتوں میں اضافہ پر نظر رکھے گا۔ ضلع کی سطح کی قیمتوں کا شعبہ حکومت کو روزانہ رپورٹ پیش کرے گا تاکہ حکومت صارفین کے مفاد میں ضروری اقدامات کرسکے۔

الرٹ دستہ سے امید کی جاتی ہے کہ ناجائز منافع حاصل کرنے والوں اور ذخیرہ اندوزوں کے خلاف موثر کارروائی کرے گا۔

صارفین کو مقررہ قیمتوں پر غلہ، شکر، مٹی کا تیل اور دیگر ضروری اشیاء فراہم کرنے کے لیے نظام تقسیم میں بھی اصلاحات کی گئی ہیں۔

٭ ٭ ٭

زمین کے حصول اور ترقی سے متعلق اسکیم کے تحت ترقی دیئے ہوئے پانچ فیصد قطعات آراضی اور ایسے مکانات جو کم اور متوسط آمدنی والے طبقوں کے لیے "نہ فائدہ اور نہ نقصان" کی بنیاد پر براہ راست یا قسطوں پر فروخت کے لیے تعمیر کیے گئے ہیں اب اتر پردیش کے لیے مجاہدین آزادی یا ان کے زیر کفالت افراد کو الاٹ کرنے کے لیے محفوظ کر دیئے جائیں گے جن کے پاس ریاست میں کہیں بھی اپنا ذاتی مکان نہیں ہے

ریاستی حکومت نے ایک گشتی مراسلہ میں ریاست کے تمام ضلع

مجسٹریٹوں کو ہدایت کی ہے وہ اپنے اضلاع میں حکومت کے اس فیصلہ سے لوگوں کو مشتہری اور فوری کارروائی کے لیے مطلع کر دیں۔

* * *

ریاستی حکومت نے ایسے والدین کو بھی پانچ سال تک فی ۱۰۰ روپیہ سالانہ کی رقم دینے کا فیصلہ کیا ہے جن کی اولاد میں ایک ہی اکلوتا بیٹا ہو اور اس اکلوتے بیٹے نے فوج کی ملازمت اختیار کر لی ہو۔

یہ نقد انعام ایسے والدین کو جن کے تین یا تین سے زیادہ بچوں نے ایسی عورتوں کو جن کے شوہر اور دو بچوں نے نیز ایسے والدین کو جن کے اکلوتے بچے نے ۲۶ اکتوبر ۱۹۶۲ء کو ہنگامی حالات کا اعلان ہونے کے بعد سے فوج کی ملازمت اختیار کر لی ہو پہلے سے ہی دستیاب ہے۔ گزشتہ ہند۔ پاک جنگ سے لے کر اب تک تقریباً ۔۔ افراد اس سہولت سے مستفید ہو چکے ہیں۔

* * *

ریاستی حکومت نے ویر چکر کا اعزاز پانے والے سکنڈ لیفٹیننٹ منوہر سنگھ چوہان نئی دہلی سکنڈ لیفٹیننٹ جیندر پال۔ علی گڑھ اور کیپٹن پرشانت کمار گھوش۔ الہ آباد کو تین تین ہزار روپیہ کا نقد انعام دیا ہے ان سورماؤں نے ہند۔ پاک جنگ کے دوران غیر معمولی دلیری کا مظاہرہ کیا تھا

* * *

ریاستی حکومت نے غیر امداد یافتہ مستقل تسلیم شدہ سینئر بیسک اسکول کو امداد حاصل کرنے والے تعلیمی اداروں کی فہرست میں شامل کرنے کے لیے شرائط اور قواعد میں جزوی طور پر ترمیم کی ہے۔

ان قواعد کے تحت اسکولوں کو جونیر ہائی اسکول کے امتحان کے نتیجہ کی تقابلی بنیاد پر امدادی فہرست میں شامل کرنے میں اولیت دی جائے گی۔ ان اسکولوں کو امدادی فہرست میں پہلے شامل کیا جائے گا جن کا جونیر ہائی اسکول امتحان کا نتیجہ کم سے کم ۵۰ فیصد ہوگا۔ جونیر ہائی اسکول کی سطح پر گھریلو امتحان لینے والے اسکولوں کو بعد میں امدادی فہرست میں شامل کیا جائے گا۔

پہاڑی علاقوں کے جونیر ہائی اسکولوں کا کم سے کم نتیجہ ۳۰ فیصد سے زیادہ ہونا چاہیئے ایسی صورت میں وہ مالی امداد کے مستحق سمجھے جائیں گے۔

* * *

ریاستی حکومت نے ۸ رکنی بیسک تعلیمی بورڈ کی تشکیل کی ہے۔ بہ اعتبار عہدہ ممبروں کے علاوہ بورڈ کے دیگر ممبروں کی مدت تین سال ہوگی۔ بیسک تعلیم کے ڈائرکٹر بورڈ کے چیرمین ہیں۔

بورڈ کے دیگر ممبران یہ ہیں۔ شری جاگیشور پرشاد میئر میونسپل کارپوریشن کانپور۔ شری لکشمن پرشاد سکسینہ۔ صدر میونسپل بورڈ۔ بریلی۔ شریمتی ایس۔ بی سکھیا پرنسپل ڈی ایس ٹریننگ کالج دیال باغ آگرہ اور شری بلونت سنگھ سیال سابق ڈائرکٹر تعلیم۔ اترپردیش۔

حکومت اترپردیش کے مالیات سکریٹری۔ پرنسپل اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن الہ آباد اور ابتدائی تعلیم کے ڈپٹی ڈائرکٹر بورڈ کے بہ اعتبار عہدہ ممبران ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے ڈپٹی ڈائرکٹر بورڈ کے ممبر سکریٹری ہیں۔

بیسک تعلیم کے ڈائرکٹر کا کیمپ آفس بیرہ لور۔ ہاؤس تلک مارگ (ریٹلر روڈ) لکھنؤ میں کھول دیا گیا ہے۔

* * *

حکومت اترپردیش نے بیڑی کی صنعت کے ۲۰۵۰ لاکھ سے زیادہ مزدوروں کی اجرتوں میں فوری طور پر اضافہ کر دیا ہے۔ ایسے سینما گھروں اور انجینئرنگ وحدوں کے ملازمین کی اجرتوں میں بھی پہلی بار اضافہ کیا گیا ہے جہاں پچاس سے کم افراد کام کر رہے ہوں۔ اگر کسی وحدہ میں اجرت کی مروجہ شرحیں حکومت کی اعلان شدہ شرحوں سے زیادہ ہیں تو وہاں مزدوروں کو بدستور زیادہ اجرتیں ملتی رہیں گی۔

بیڑی صنعت سینما گھروں اور انجینئرنگ وحدوں کے ملازمین کو اپنی کم سے کم اجرت میں ۲۵ فیصد کا اضافہ ملے گا۔ اس سلسلہ میں سرکاری احکام جاری کر دیے گئے ہیں۔

اعلانیہ کے مطابق بیڑی صنعت میں کام کرنے والے مزدوروں کی کم سے کم اجرت کی موجودہ شرح ۲۔۶۰ روپیہ فی ہزار بیڑی سے

بڑھاکر ۲،۲۵ روپیہ فی ہزار بیڑی کردی گئی ہے۔اس صنعت کے دیگر زمروں کے ملازمین کی کم سے کم اجرتوں میں بھی اضافہ کیا گیا ہے۔

کانپور شہروں پہاڑی علاقوں اور بریلی، گورکھپور اور میرٹھ میں سینما گھروں کے ملازمین کو اب کم سے کم ۱۰۰ روپیہ ماہانہ کی اجرت ملے گی اور دیگر مقامات کے سینما گھروں کے ملازمین کو ۹۰ روپیہ ماہانہ ملے گا۔

حکومت نے ایسے انجینئرنگ واحدوں اور اداروں کے معاملہ میں جن میں پچاس سے کم ملازمین کام کررہے ہیں ایک غیر ہنرمند مزدور کے لیے کم سے کم ماہانہ اجرت ۱۱۰ روپیہ۔ ایک نیم ہنرمند مزدور کے لیے ۱۴۰ روپیہ اور ایک ہنرمند مزدور کے لیے ۱۷۰ روپیہ ماہانہ مقرر کی ہے۔

ریاستی حکومت نے چھوٹے اور بڑے پیمانہ کے ایسے صنعتی واحدوں دوکانوں کاروباری اداروں اور ٹرانسپورٹ کمپنیوں کے لیے جو فیکٹریز ایکٹ کے تحت ہوں اور جن میں دس سے زیادہ افراد کام کررہے ہوں مستقل احکام نافذ کردیے ہیں۔

ریاستی حکومت سوتی اور اونی ملوں اور جوٹ اور ریان کی ملوں میں عیوضی پر کام کرنے والے مزدوروں کی مستقلی اور بیٹھکی بھتہ کے لیے بھی احکام جاری کرنے کا ارادہ رکھتی ہے جس سے عیوضی پر کام کرنے والے تقریباً ۱۰۰۰ مزدور مستفید ہوں گے۔

* * *

وزیر ریاست برائے امداد باہمی شری گوپی ناتھ دیکشت نے بتایا کہ امداد باہمی ترقی آراضی بینک کی طرف سے اس سال چھوٹے پیمانے پر آبپاشی کے آلات کے لیے کسانوں کو ۲۲ کروڑ روپیہ کے قرضے تقسیم کیے جارہے ہیں جو اب تک تقسیم شدہ رقموں میں سب سے بڑی رقم ہے۔ اس رقم میں سے ۲۰ کروڑ روپیہ صرف پمپنگ سیٹ لگانے کے لیے دیے جائیں گے۔

شری دیکشت نے کہا کہ اس مقصد کے پیش نظر کہ کسان رقم کے ایک ایک پیسہ کا پورا فائدہ اٹھاسکیں اور اپنی پسند کے آبپاشی کے آلات خرید سکیں قرضہ کی تقسیم کے موجودہ نظام میں بنیادی تبدیلی کی گئی ہے۔ حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ ترقی آراضی بینک آبپاشی کے آلات فروخت کرنے والوں کے نام چیک جاری کرنے کے موجودہ طریقہ کار کو ختم کرکے کسانوں کو براہ راست قرضہ کی رقم ادا کرے۔

وزیر امداد باہمی نے کہا کہ اس طرح کا فیصلہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ شکایتیں موصول ہورہی ہیں کہ آبپاشی کے آلات فروخت کرنے والے کسانوں سے بازار کی مروجہ قیمتوں سے بہت زیادہ قیمت وصول کرتے ہیں اور کبھی کبھی تو زیادہ قیمت کی یہ رقم ایک ہزار روپیہ سے لیکر ڈیڑھ ہزار روپیہ تک پہنچ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ شکایتیں بھی موصول ہوئی تھیں کہ ان کے فراہم کردہ آلات اعلیٰ درجہ کے نہیں ہوتے ہیں۔

وزیر امداد باہمی نے کہا کہ کسانوں کو اپنی جوتوں کے لیے مشینی پمپنگ سیٹ صحیح قیمت پر فراہم کرنے کے لیے ان کی تقسیم کا انتظام ریاستی امداد باہمی فیڈریشن کے ذریعہ کیا جارہا ہے۔

انھوں نے بتایا کہ ریاستی امداد باہمی فیڈریشن آبپاشی کے آلات کی فروخت کے بعد بھی ان کی دیکھ بھال کے لیے خصوصی سروس کا بندوبست کررہا ہے۔

شری دیکشت نے کہا کہ کسانوں کو بینک سے جلد قرضے دلانے کے لیے بھی اقدامات کیے گئے ہیں ترقی آراضی بینک کی شاخوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ قرضوں کی منظوری کے لیے ہر ماہ جلسے منعقد کرنے کے بجائے ہر ہفتے کے منعقد کریں اور قرضوں کے پرانے معاملات کو بھی پہل کرکے جلد سے جلد نپٹائیں۔

* * *

ریاستی حکومت نے اتر پردیش رواجی صنعت کار بورڈ کو اسی رقم کے اقرارناموں پر اسٹامپ فیس کی ادائیگی سے مستثنیٰ کرنے کا فیصلہ کیا ہے جو حکومت اسے تکنیکی طور پر اپنی صنعت کاروں کو قرضے دینے کے لیے منظور کرے۔ یہ فیصلہ کل یہاں وزیر اعلیٰ شری کملاپتی ترپاٹھی کی صدارت میں منعقدہ کابینہ کے ایک جلسے میں کیا گیا۔

ریاستی حکومت تکنیکی سند یافتہ افراد کو روزگار فراہم کرنے کی اپنی اسکیم کے تحت نجی صنعت کاروں کو ریاستی زراعتی صنعت کارپوریشن کے توسط سے قرضے دیتی ہے۔

ریاستی حکومت ساڑھے پانچ فیصد کی شرح سے سود وصول کرتی ہے جبکہ زراعتی صنعت کارپوریشن ان صنعت کاروں سے ۹ فیصد کی شرح سے سود لیتا ہے اس طرح کارپوریشن کو سود میں اپنے حصے کے طور پر صرف نصف فیصد ملتا ہے جو وہ قرضوں کی تقسیم، ریکارڈ رکھنے اور قرضوں کی وصولیابی وغیرہ پر خرچ کرتا ہے۔ چنانچہ کارپوریشن نے اسٹامپ فیس کی ادائیگی سے استثنا کی درخواست کی تھی۔

٭ ٭ ٭

ضلع اعظم گڈھ میں ہریجنوں اور بے زمین مزدوروں کو رہائشی سہولتیں اور روزگار کے مواقع فراہم کرنے کے لیے مستقبل قریب میں ایک زراعتی صنعتی بستی کے قیام کی تجویز ہے۔

آزادی کی ۲۵ ویں سالگرہ کے سلسلہ میں سماج کے کمزور طبقوں کے لیے یہ بستی بطور تحفہ پیش کی جائے گی جو ۱۷ لاکھ روپیہ کے ابتدائی اخراجات سے قائم کی جائے گی اس بستی میں صنعتی اور زراعتی زمرہ میں ۱۰۰ خاندانوں کو روزگار فراہم کرنے اور رہائش کی سہولتیں مہیا کرنے کا بندوبست کیا جائے گا۔ یہ اسکیم مرکزی حکومت کی طرف سے چلائی جا رہی ہے۔

اس بستی میں آباد ہونے والوں میں سے جو شخص زراعت کا پیشہ اختیار کرے گا اسے بستی کے اندر زمین سے چار ایکڑ تک زمین اور کاشت شروع کرنے کے لیے ضروری مالی اور مادی امداد بھی دی جائے گی۔ گھریلو صنعتیں قائم کرنے کے خواہشمند افراد کو سستے کاروباری سرمایہ اور خام مال فراہم کیا جائے گا۔

ضلع کی لال گنج تحصیل میں موضع مند ہوکا انتخاب بستی کی جائے وقوع کے طور پر کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ضلع کی ہریجن بستیوں میں چار لاکھ روپیہ کی ایک اسکیم کے تحت۔ اکتوبر تعمیر کیے گئے ہیں اور ۵۰ کنووں کی تعمیر جلد ہی مکمل ہونے والی ہے

٭ ٭ ٭

حکومت اترپردیش نے ریاست میں سیاحت کی ترقی کے لیے ۲۵ ممبران پر مشتمل ایک کونسل کی تشکیل کی ہے۔ وزیر اعلیٰ شری کملاپتی ترپاٹھی کونسل کے سربراہ وزیر سیاحت نائب صدر اور محکمہ سیاحت کے ڈپٹی سکریٹری ممبر سکریٹری ہوں گے۔

کونسل کے دیگر ممبران یہ ہیں۔ وزیر مالیات، سیاحت اطلاعات اور پہاڑی علاقوں کی ترقی کے وزرائے ریاست، حکومت اترپردیش کے چیف سکریٹری اور مالیات، منصوبہ بندی سیاحت، صحت اور لوکل سیلف گورنمنٹ محکموں کے سکریٹری، صدر ریاستی بجلی بورڈ، ٹرانسپورٹ سیاحت کے ڈائرکٹر جنگلات کے چیف کنزرویٹر، تعمیرات عامہ پینے کے پانی سے متعلق اسکیم اور آبپاشی کے محکموں کے چیف انجینئر۔ حکومت ہند کے محکمہ سیاحت کے ڈائرکٹر جنرل، حکومت ہند کے محکمہ آثار قدیمہ کے ڈائرکٹر جنرل، حکومت ہند کے شہری جہازرانی کے ڈائرکٹر جنرل اور پہاڑی ترقیاتی کارپوریشن اترپردیش کے مینجنگ ڈائرکٹر اور روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن اترپردیش کے جنرل منیجر۔

٭ ٭ ٭

اترپردیش میں مستقبل میں ریاستی ٹرانسپورٹ اتھارٹی کے جاری کردہ کنٹریکٹ کیریج پرمٹوں پر کسی بھی ساخت کی ایسی چھوٹی بسیں چلانے کی اجازت دی جائے گی جن میں سات سے کم اور بیس سے زیادہ نشستیں نہ ہوں۔

اس سلسلہ میں ریاستی ٹرانسپورٹ اتھارٹی کے جاری کردہ ایک پریس نوٹ میں کہا گیا ہے کہ ان راستوں کو چھوڑ کر جن پر اترپردیش ریاستی روڈ ٹرانسپورٹ کی نقل و حمل سے متعلق خدمات کا اعلان کیا جا چکا ہے پوری ریاست کے لیے منی بس کنٹریکٹ کیریج پرمٹ فیاضی کے ساتھ جاری کیے جاتے رہیں گے

پریس نوٹ میں یہ وضاحت کر دی گئی ہے کہ چھوٹی بسوں میں لازمی طور سے آرام دہ گدے دار نشستیں ہونا چاہئیں اور

ان لبسوں کے ٹھیک حالت میں ہونے کا ایک جائزہ سرٹیفکیٹ پیش کیا جانا چاہیئے۔

* * *

مواضعات میں بے گھر افراد کو جنھیں مکانات کی تعمیر کے لیے زمین الاٹ کی گئی ہے زمین پر واقعی قبضہ دلایا جانا چاہیئے اور اس قبضہ کو قانونی بنانے کے لیے مال کے کاغذات میں فوراً اندراج کیا جانا چاہیئے۔ اس خیال کا اظہار وزیر لوکل سیلف گورنمنٹ شری بینی سنگھ نے کل یہاں کیا۔

وزیر موصوف آزادی کے ۲۵ ویں سال کے پروگراموں پر عملدرآمد سے متعلق کمیٹی کے جلسہ کی صدارت کر رہے تھے۔ اس جلسہ میں وزیر ریاست شری راج بہاری سنگھ چیف سکریٹری زرعی پیداوار کمشنر داخلہ آبپاشی اطلاعات مال لوکل سیلف گورنمنٹ صحت اور منصوبہ بندی کے محکموں کے سکریٹری اور متعدد محکموں کے سربراہوں نے شرکت کی۔

شری بینی سنگھ نے کہا ہے کہ بے گھر افراد کو زمین تقسیم کرنے کی اسکیم کے تحت پہلے زمین کو ترقی دینے اور تب اسے پلاٹوں میں تقسیم کرنے اور متعلقہ احکام کے تحت انھیں بے زمین افراد کو الاٹ کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا الاٹمنٹ کی توثیق کرنے کے لیے مال کے کاغذات میں اندراج کیا جانا چاہیئے۔

انھوں نے ایک رابطہ کمیٹی کی فوری تشکیل کا مشورہ دیا جس میں مال اجتماعی ترقی اور لوکل سیلف گورنمنٹ محکموں کے سکریٹری شامل ہوں جو دیہی علاقوں میں مکانات کی تعمیر کے لیے زمین کی تقسیم کے سلسلہ میں واضح احکام جاری کریں۔

مذاکرات میں حصہ لیتے ہوئے وزیر ریاست برائے آبپاشی شری راج بہاری سنگھ نے مشورہ دیا کہ اس بات کا پورا خیال رکھا جانا چاہیئے کہ مواضعات میں ہریجنوں اور سماج کے کمزور طبقوں کے افراد کو با اثر افراد کے مکانات سے متصل پلاٹ الاٹ نہ کیے جائیں۔ اگر یہ احتیاطی تدبیر اختیار نہ کی گئی تو ہریجنوں اور دیگر افراد کے لیے الاٹ شدہ زمین پر واقعی قبضہ حاصل کرنا مشکل ہو جائیگا۔

چیف سکریٹری شری ایم لال نے الاٹ کی ہوئی زمین نیز مستقبل میں الاٹ کی جانے والی زمین کا نقشہ بنانے پر زور دیا انھوں نے کہا کہ اس اسکیم کو واقعی کارآمد اور موثر بنانے کے لیے ہر قدم اٹھایا جانا چاہیئے۔

شری بینی سنگھ نے ہریجن فلاح اور صنعت کے محکموں سے خاص طور پر کہا کہ وہ زیادہ حوصلہ مندانہ پروگرام وضع کریں جنھیں آزادی کے ۲۵ ویں سال کے دوران بروئے کار لایا جا سکے۔

* * *

لکھنؤ میں بچوں کی ایک پرورش گاہ قائم کی گئی ہے جو ریاست میں اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ ہے۔

یہ ادارہ ۲۱۰۰۰ روپیے کی لاگت سے قائم کیا گیا ہے اور اس میں ۱۴ سال تک کے ایسے پچاس بچے داخل کیے جائیں گے جو اپنے والدین کے تغافل یا کسی اور وجہ سے اپنے خاندان سے بچھڑ گئے ہوں۔ اس ادارہ میں سات بچے داخل کیے جا چکے ہیں مکینوں کو مفت قیام وطعام اور تعلیم کے ساتھ دیگر سہولتیں بھی فراہم کی جاتی ہیں۔

ادارہ میں قیام کے دوران ان بچوں کے والدین کو تلاش کرنے کی کوشش کی جائے گی اور انھیں اپنے بچوں کو واپس لینے کی ترغیب دی جائے گی۔ ایسے معاملات میں جبکہ والدین اپنے بچوں کو واپس لینے سے انکار کریں تو ان کی پرورش کی ذمہ داری قبول کرنے والے والدین کو انھیں سپرد کرنے کا بندوبست کیا جائے گا۔ یہ ادارہ اس وقت نیو حیدرآباد میں واقع ہے۔

* * *

زراعتی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لیے دستیاب زمین اور پانی کے وسائل کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے اور اس طرح دیہی ترقی کی رفتار تیز تر کرنے کے لیے ریاست کے دو اضلاع میں متعدد فصلوں کے دو پروجیکٹ منظور کیے گئے ہیں۔ یہ پروجیکٹ ضلع دیوریا کے دو ترقیاتی بلاکوں یعنی رودرپور اور گوری بازار اور

تیادوسا

ضلع الہ آباد کے دو بلاکوں پھول پور اور پرتاپ پور میں بروئے کار لائے جائیں گے۔

امید کی جاتی ہے کہ آئندہ چند برسوں میں جب ریاست میں کسان بڑے پیمانے پر غلہ کی زیادہ پیداوار دینے والی اقسام کی کاشت کو اپنالیں گے زراعتی پیداوار کے سلسلہ میں متعدد فصلوں یعنی زیادہ سے زیادہ اور منفعت بخش فصلوں کی حکمت عملی کو اختیار کیا جائے گا

رہبر منصوبے زمین۔ پانی کے مسائل اور کسانوں کے ذرائع کا استعمال کر کے مختلف قسم کی آب و ہوا کے حالات میں متعدد فصلوں کے پروگرام کو آگے بڑھانے کے لیے بنیاد فراہم کریں گے جن کے لیے تمام ضروری ساز و سامان قرضے اور خرید و فروخت کی سہولتیں مہیا کی جائیں گی۔ پراجیکٹ کے علاقوں میں کسانوں کی معاشی حالت بہتر بنانے کے علاوہ زراعت ڈیری باغبانی مرغبانی۔ سور پالنے کو ترقی دینے اور بجلی فراہم کرنے کا کام شروع کیا جائے گا۔

اس پروگرام کے تحت چاروں ترقیاتی بلاکوں میں سے ہر بلاک پر مالیاتی سال رواں کے دوران ۴۸ء۲۲ لاکھ روپے کی رقم خرچ کی جائے گی۔ ہر پراجیکٹ کی تکمیل پر ۸۳ء۱۸ لاکھ روپے کی لاگت آئے گی جو مرکزی حکومت برداشت کرے گی۔

گونڈہ۔ علی گڑھ۔ بدایوں اور رائے بریلی اضلاع میں متعدد فصلوں کے پراجیکٹ پہلے ہی جاری ہیں۔

اگرچہ یہ پراجیکٹ ابتدائی مرحلہ میں ضلع میں ایک ہی منتخب بلاک میں شروع کیا جائے گا لیکن بعد میں مرحلہ وار طریقہ سے اس کی توسیع پورے ضلع میں کر دی جائے گی۔ پہلے سال میں ہر بلاک میں دس مواضعات کا انتخاب کیا جائے گا اور ان کو زراعت کی ترقی کے واسطے ضروری مسائل مہیا کیے جائیں گے۔ ہر بلاک میں اوسط درجے کے کاشتکار طبقے کی نمائندگی کرنے کے لیے کم سے کم ایک گاؤں میں مظاہرہ سے متعلق مراکز قائم کیے جائیں گے۔ مظاہرہ سے متعلق کھیتوں میں کسانوں کو معلومات فراہم کرنے کے لیے اور یکے بعد دیگرے فصلوں کے نظام میں مناسب تبدیلیوں۔ آب پاشی گندے پانی کی نکاسی کیمیاوی کھاد پودوں کے تحفظ اور زمین کو مناسب شکل دینے سے متعلق طریقوں کا مظاہرہ کیا جائے گا۔ ان کھیتوں کے ارد گرد ترقی یافتہ زراعتی طریقوں اور ترتیب کے تحت یکے بعد فصلیں پیدا کرنے کے طریقوں کی کسانوں کو ٹریننگ بھی دی جائے گی۔

* * *

ریاستی حکومت نے ریاست کے پسماندہ علاقوں میں آب پاشی کی سہولتوں کی توسیع کے لیے ایک جامع پروگرام وضع کیا ہے۔

یہ پروگرام نو اسکیموں پر مشتمل ہے اور تقریباً ۱۷ کروڑ روپے کی تخمینی لاگت سے ۵۴۵۷۰ ایکڑ اراضی کو آب پاشی کی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ یہ اسکیمیں مالیاتی سال رواں کے دوران اولیت کی بنیاد پر بروئے کار لائی جائیں گی۔

ان نو اسکیموں میں رائے بریلی اور پرتاپ گڑھ اضلاع میں ۲ء۰۲ لاکھ ایکڑ سے زیادہ اراضی کی آب پاشی کرنے کے لیے ڈلمؤ پمپڈ نہر مرحلہ دوم۔ ضلع باندہ میں ۱۹ ہزار ایکڑ سے زیادہ زمین کی آب یاری کے لیے چلیا پمپڈ نہر پراجیکٹ، ضلع بہرائچ میں ۲۰ ہزار سے زیادہ ایکڑ اراضی کے لیے آب پاشی کی سہولتیں مہیا کرنے کے لیے سرجو پمپڈ نہر پراجیکٹ ضلع غازی پور میں ۲۵ ہزار ایکڑ اراضی کی سینچائی کے لیے دیم کالی پمپڈ نہر پراجیکٹ اعظم گڑھ اور بلیا اضلاع میں ۱ء۱۳ لاکھ ایکڑ اراضی کی آب پاشی کے لیے دھری گھاٹ مسائک پراجیکٹ۔ ضلع الموڑہ میں ۱۴۸۳ ایکڑ اراضی کی آب پاشی کے لیے رام گنگا واری آب پاشی اسکیم ضلع نینی تال میں ۱۴۴۹ ایکڑ اراضی کی آب پاشی کے لیے ٹکسی ندی آب پاشی اسکیم۔ ضلع الہ آباد میں دوآبہ علاقہ میں ۵۱۲۰۰ ایکڑ اراضی کی آب پاشی کے لیے کشن پور پمپڈ نہر پراجیکٹ اور خشک سالی سے متاثرہ ضلع مرزاپور میں ۳۱۵۰۰ ایکڑ اراضی کی آبپاشی کے لیے ادوا باندہ پراجیکٹ شامل ہیں۔

اس کے علاوہ ریاست کے مختلف حصوں میں پانی اٹھا کر آبپاشی کے لیے متعدد چھوٹی نہروں کی تعمیر کی تجویز ہے۔

زیر نظر سال کے دوران ۸۴۲ ٹیوب ویلوں کی تعمیر کی بھی

تجویز ہے۔ تبہ ٹلکھنڈ میں خاص طور پر باندہ۔ ہمیر پور۔ جالون ضلعوں میں ٹیوب ویلوں کی تعمیر کا کام شروع کیا گیا ہے۔

متفرقات

۲۱۱ قیدیوں کی سزا معاف۔ حکومت اتر پردیش نے آزادی کی ۲۵ ویں سال گرہ کے موقع پر ۲۱۱ قیدیوں کی سزا معاف کردی ہے۔ یہ قیدی جو اس وقت ریاست کی آٹھ مختلف جیلوں میں مختلف مدت کی سزا کاٹ رہے ہیں ۱۵ راگست کو دوپہر سے قبل آزاد کر دیئے گئے۔

مرکزی جیلوں سے رہا کیے جانے والے قیدیوں کی تعداد حسب ذیل ہے۔ نینی ۱۷۔ بریلی ۳۲۔ وارانسی ۱۴۔ فتح گڑھ ۳۳۔ اس کے علاوہ ماڈل جیل لکھنؤ سے آٹھ، ضلع جیل سلطان پور سے تین، سمپورنا نند کیمپ ستار گنج (نینی تال) سے تین اور لکھیا (مرزا پور) سے تین قیدی آزاد کیے گئے۔

ریاستی بجلی بورڈ اسٹامپ ڈیوٹی کی ادائیگی سے مستثنیٰ۔ اتر پردیش ریاستی بجلی بورڈ کو مالیاتی سال رواں کے دوران زندگی بیمہ کارپوریشن سے ملنے والے تین کروڑ روپیے کے قرضے کے رہن نامہ پر وصول کی جانے والی اسٹامپ ڈیوٹی اور رجسٹریشن فیس کی ادائیگی سے جو ۱۱۔۵ ، ۹ روپے ہوتی ہے مستثنیٰ کر دیا جائے گا۔ یہ فیصلہ کل یہاں کابینہ کے ایک جلسہ میں کیا گیا۔

جنگ کے سورماؤں کو نقد انعامات۔ ریاستی حکومت نے گزشتہ ہند۔ پاک جنگ میں غیر معمولی دلیری کا مظاہرہ کرنے والے اتر پردیش کے ۲۲ سورماؤں کو ۲۹۲ ۲ لاکھ روپے کے نقد انعامات دیئے ہیں۔ ان میں سے ۱۱ کو مہاویر چکر اور ۱۱ کو ویر چکر کا اعزاز ملا ہے

کوئلہ اور اینٹ بھٹوں کے لیے کارپوریشن۔ ریاست میں آئندہ ۱۵ ستمبر تک کوئلہ اور اینٹ بھٹوں سے متعلق ایک کارپوریشن قائم کیا جائے گا۔ یہ فیصلہ کل یہاں وزیر مالیات شری نارائن دت تیواری کی صدارت میں منعقدہ افسروں کے ایک جلسہ میں کیا گیا۔

جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے وزیر موصوف نے کہا کہ اینٹوں اور سیمنٹ کی قلت کی وجہ سے محکمۂ تعمیرات عامہ، محکمۂ آب پاشی اور بجلی کے پراجکٹوں سے متعلق تعمیرات کا کام رک گیا ہے۔ مختلف محکمہ جاتی پروگراموں کو چلانے کے لیے اینٹوں کی تیاری بہت ضروری ہے چنانچہ اس معاملہ کو سب سے زیادہ اولیت دینا ضروری ہے۔

مجاہدین آزادی کے زیر کفالت افراد کے لیے عمر کی حد میں رعایت۔ محکمۂ تقرری کے جاری کردہ ایک اعلانیہ کے مطابق ریاستی حکومت کے تحت ملازمتوں میں بھرتی کے لیے درخواست دینے والے مجاہدین آزادی کے زیر کفالت افراد کی عمر کی بالائی حد میں مزید ایک سال کی چھوٹ دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

اس زمرہ کے درخواست دہندگان کے لیے اب تک عمر کی بالائی حد چار سال زیادہ تھی۔



بڑی طاقتوں کے لیے یہ موقع کھلا ہوا ہے کہ وہ کسی بھی دن اس چیز (عدم تشدد) کو اختیار کرلیں اور آیندہ نسلوں کی ابدی ممنونیت حاصل کریں۔ لیکن اس صورت میں ان بڑی طاقتوں کو سامراجی عزائم اور دنیا کی نام نہاد غیر متمدن یا نیم متمدن قوموں کے استحصال کو ترک کرنا ہوگا اور اپنے طرز زندگی پر نظر ثانی کرنی ہوگی۔ اس کا مطلب ہے ایک مکمل انقلاب۔ ——— مہاتما گاندھی



وزیر اعلیٰ اتر پردیش شری کملاپتی ترپاٹھی ریاستی سبزی نمائش جو قیصر باغ بارہ دری لکھنؤ میں ۔ اگست ۱۹۷۲ء
کو منعقد ہوئی تھی دیکھ رہے ہیں



عنوانات

سرورق: عظمت اللہ آرٹسٹ

جلد ۲۸ نمبر ۸



نومبر ۱۹۷۲ء
کارتک ۱۸۹۴ اشک

چندہ سالانہ پانچ روپے
فی پرچہ ۵۰ پچاس پیسے

ایڈیٹر
خورشید احمد

پبلشر
شرومنی شرما
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

پرنٹر
اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری۔ یوپی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

اپنی بات

نومبر کے مہینے کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس میں ہم دو قومی رہنماؤں کا یوم پیدائش یکے بعد دیگرے مناتے ہیں۔ ان میں سے ایک عظیم قومی رہنما پنڈت جواہر لال نہرو کا یوم پیدائش ہے جو ۱۴ نومبر کو ہر سال "یوم اطفال" کی شکل میں منایا جاتا ہے۔ جواہر لال نہرو کی عظمت کے مختلف اور متعدد پہلو تھے۔ لیکن ان کی عظمت کا غالباً سب سے نمایاں پہلو تھا ان کی انسان دوستی، انسانیت کے لیے ان کی انتہائی محبت، دل گدازی اور بے پناہ صبر و تحمل۔ اسی لیے وہ دوسروں کی ذرا سی تکلیف پر دل گرفتہ ہو جاتے، ناانصافی انھیں بے چین کر دیتی، ظلم و تشدد جہاں کہیں بھی ہوتا انھیں تڑپا دیتا۔ ان کو صرف اپنے ملک کے لوگوں کی آزادی سے محبت نہ تھی بلکہ وہ بلا تفریق طبقہ، فرقہ یا ملک سب کی آزادی میں یقین اور آزادی کی تحریکوں سے ہمدردی رکھتے تھے۔ ان کی رنگا رنگ شخصیت کا جادو عام انسانوں پر ان کی زندگی میں بھی چلتا تھا اور آج بھی جب وہ ہمارے درمیان میں نہیں ہیں ان کا سکہ لوگوں پر بیٹھا ہوا ہے۔ بچوں سے انھیں بے پناہ محبت تھی۔ لیکن اس محبت کو انھوں نے کبھی خوردی و بزرگی کا شکار نہیں ہونے دیا بلکہ بچوں کے ساتھ ان کا سلوک دوستوں کا سا تھا۔ ان کی خواہش پر ان کی سالگرہ کا دن یوم اطفال کی حیثیت سے منایا جاتا ہے تاکہ بچوں کے لیے سال میں ایک ایسا موقع فراہم کیا جائے جب اجتماعی حیثیت سے انھیں اپنے وجود کا اور ہماری آئندہ قومی زندگی میں ان کی کیا اہمیت اور کیا درجہ ہے اس کا احساس نیز مستقبل کے لیے ان میں ایک مقصد اور ایک جذبہ پیدا ہو۔

ایسے عظیم اور محبوب رہنما کا یوم پیدائش منانے جانے کا بہترین طریقہ یہ ہوگا کہ اس روز ہم اس کا جائزہ لیں کہ جو نصب العین انھوں نے ملک و قوم کے سامنے رکھا تھا اسے ہم نے کہاں تک پورا کیا اور پھر عہد کریں کہ ہمارے لیے انھوں نے جو راہ روشن کی تھی اس پر بے جھجک چلتے رہیں گے اور ان کے آدرشوں کی تکمیل میں جو کسر رہ گئی ہے اسے پورا کریں گے ـــــ یہ آدرش ہیں پارلیمانی جمہوریت، لا مذہبی اور غیر فرقہ وارانہ ریاست، منصوبہ بند ترقی، بین اقوامی معاملات میں بیدار مغزی اور مفاہمت کا جذبہ، قوموں میں دوستی، عالمی امن اور بقائے باہم۔

دوسری نامور شخصیت ہماری موجودہ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی ہے جن کا یوم پیدائش ۱۹ نومبر کو شہریوں کے دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ اندرا جی نے ملکی قیادت کے سلسلے میں جس حوصلہ مندی، دلیری اور عزم و استقلال کا مظاہرہ کیا ہے اور بین اقوامی معاملات میں جس بیدار مغزی اور سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا ہے اس نے نہ صرف انھیں عظیم رہنما بنا دیا ہے بلکہ دنیا میں ہندستان کی ساکھ بڑھا دی ہے اور قوموں کی برادری میں اس کا درجہ بلند کر دیا ہے۔ اندرا جی بھی لا مذہبی جمہوریت اور سوشلزم کا نصب العین اپنے سامنے رکھتی ہیں۔ البتہ ان کا پختہ یقین ہے کہ سوشلزم کا مقصد ملک سے غریبی اور نابرابری ختم کیے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اس ضمن میں وہ متعدد دلیرانہ قدم اٹھا چکی ہیں اور سوشلزم کو وقت کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ بنانے کے لیے ان کی قیادت میں نئی معاشی پالیسی مرتب کی گئی ہے۔ ان کی سالگرہ کے موقع پر سب سے بہتر تحفہ اور ہماری شکر گزاری کا سب سے اچھا ثبوت یہ ہوگا کہ ہم ہنگامہ آرائیوں، بدنظمیوں اور تشدد آمیز مظاہروں سے الگ رہ کر فرقہ وارانہ اتحاد برقرار رکھ کر اور ضبط و نظم سے کام لے کر معاشی پالیسی کو بروئے کار لانے اور غریبی ہٹاؤ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے میں اندرا جی اور ان کی حکومت کے ساتھ ساتھ اپنے پردیش کی حکومت کا ہاتھ بٹائیں اور مفاد پرست عناصر کو بہ حیثیت مجموعی ملک کے مفاد سے کھیلنے کا موقع نہ دیں۔

● وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ۳ اکتوبر کو بوکارو (بہار) میں فولاد کے کارخانے کی پہلی انجن بھٹی کا افتتاح کیا۔ بوکارو فولاد کارخانہ روس کے تعاون سے قائم کیا جا رہا ہے۔ اس کارخانے کی تکمیل پر ۷ ارب روپے خرچ ہوں گے۔ اس کارخانے کی اندرونی صلاحیت کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ امید ہے کہ آگے چل کر یہ ایشیا کا فولاد تیار کرنے کا سب سے بڑا انتظام بن سکتا ہے۔ ملک کی آزادی کے بعد بھلائی، درگاپور اور رورکیلا میں بالترتیب روس، برطانیہ اور جرمنی کی مدد سے تین فولاد کارخانے قائم ہو چکے ہیں۔ اب یہ چوتھا اور سرکاری زمرے میں اب تک کا سب سے بڑا صنعتی پروجیکٹ ہے جو قائم کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ کارخانہ ہندستان کی اپنی کوششوں سے قائم ہوا ہے۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس میں استعمال ہونے والے ۹۰ فی صد عمارتی ڈھانچے، ۶۵ فی صد مشینی ساز و سامان، ۸۴ فی صد بجلی کا ساز و سامان، ۸۰ فی صدی آلات اور ۶۰ فی صد دوسرے ساز و سامان دیسی ہیں۔ اس سے جہاں ایک طرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہمارا ملک غیر ملکی محتاجی سے بہت بڑی حد تک آزاد ہو چکا ہے وہاں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ کارخانہ ہندستان کی اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی پرعزم کوشش اور جدید ہندستان کی تعمیر کی جانب ایک درست قدم ہے۔

● ہم نے ستمبر کے شمارے میں اہل علم و اہل الرائے حضرات کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ کے سلسلے میں "خالص علمی بحث" (ACADEMIC DISCUSSION) کی حیثیت سے موافق یا مخالف رائے زنی کی دعوت دی تھی اور یہ عرض کیا تھا کہ اظہار رائے جذبات سے بلند ہو کر کیا جانا چاہیے۔ مطلب یہ تھا کہ اظہار رائے کرنے میں اس قانون کے "اصعاف"، مؤیدین اس کے منظور کرنے والوں اور ارباب حکومت کی نیتوں پر حملے کیے بغیر اور دفعات قانون کو مخصوص نقطۂ نظر سے معنی پہنائے بغیر رائے زنی کی جائے خواہ وہ ترمیمی ایکٹ کی مخالفت ہی میں کیوں نہ ہو۔ اسی کے ساتھ ہم نے یہ امید ظاہر کی تھی کہ اس "خالص علمی بحث" کو "صحت مند بحث" تک محدود رکھنے میں ہمارے لکھنے والے ہماری اعانت کریں گے۔ افسوس ہے کہ ہماری اس دعوت کے جواب میں جو تین چار مضامین موصول ہوئے ان میں ہماری گزارشات ملحوظ نہیں رکھے گئے اور یا تو ترمیمی قانون سے متعلق شخصیتوں کی نیتوں کو صاف نہیں بتایا گیا یا پھر قانون کی متعدد دفعات کو کسی نہ کسی "مقصد خاص" کے حصول کا ایک وسیلہ قرار دینے کی کوشش کی گئی اور خاتمہ پر ایک فریق بن کر قانون کو واپس لینے کی تلقین بھی کی گئی۔ مجبوراً ہمیں اس مجوزہ بحث کو ہمیں ختم کر دینے کا فیصلہ کرنا پڑا۔ اس لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ کی مخالفت یا موافقت میں کوئی مضمون نیا دور کو بھیجنے کی زحمت نہ کی جائے کیونکہ یہ سلسلہ اب ختم کیا جاتا ہے۔

ـــــــ ایڈیٹر

بچوں کے چاچا نہرو



عظیم رہنما جواہر لال نہرو کی ۸۳ ویں سالگرہ جشن سابق اس سال بھی ۱۴ ر نومبر کو یوم اطفال کی شکل میں منائی جائے گی۔

اندرا — ایک نئے دور کی تمہید حسینی



شریمتی اندرا گاندھی کی ۵۵ ویں سالگرہ ملک بھر میں ۱۹ نومبر کو منائی جا رہی ہے

نہرو

ایک اصول پرست انسان

★ ڈاکٹر رادھا کرشنن

دوستو! ڈاکٹر ذاکر حسین نے ابھی آپ سے بتایا ہے کہ کس طرح ان جلدوں کو مرتب کرنے کا خیال پیدا ہوا اور کیسے یہ اب شائع ہوئیں۔ انھوں نے مجھے یہ موقع دیا ہے کہ میں ان جلدوں کا اجرا کر دوں۔ ان میں سے ایک تصویروں کا البم ہے جس میں جواہر لال نہرو کو بچپن سے لے کر ان کے آخری لمحہ تک کے مختلف منازل حیات میں پیش کیا گیا ہے۔ دوسری جلد میں ابھرتے ہوئے عالمی سماج کا ذکر کیا گیا ہے۔

عام طور پر تاریخ انسان کو بناتی ہے اور پھر انسان تاریخ بناتا ہے۔ جواہر لال نہرو پر ان کی زندگی کے ابتدائی برسوں میں جو اثرات پڑے انھوں نے ان کی زندگی کے نظریے اور سلیقے کو ڈھالنے میں بہت کچھ کیا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ جب وہ ہیرو میں تھے تو انھیں خوش اطواری کے لیے ایک کتاب بطور انعام ملی تھی۔ یہ کتاب تھی گیری بالڈی کے متعلق جو ٹریویلین نے لکھی تھی تب نہرو نے محسوس کیا کہ گیری بالڈی کیسا انقلابی ہیرو تھا اور اس کی شخصیت کتنی عظیم اور پُرکشش تھی کس طرح اس نے مظلوموں کے لیے جدوجہد کی اور کیسے اٹلی کو آزاد اور متحد کیا۔ انھوں نے سوچا کہ میں بھی کچھ ایسا ہی کیوں نہ کروں۔ گیری بالڈی کے سوانح حیات نے ان کے تخیل کے لیے مہمیز کا کام کیا اور ان میں یہ احساس پیدا کیا کہ ہندوستان کے غریبوں بھوکوں اور کنگالوں کو ان کی



مصیبت سے نجات دلائی جائے۔

جب وہ اس نظریہ کے ساتھ ہندوستان واپس آئے تو انھوں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ ایسی سیاسی تحریکیں کون سی ہیں جنھیں اس ملک کے آزاد کرانے میں دلچسپی ہے۔ ایسی تحریکیں تو کئی تھیں لیکن اُن کے لیے گاندھی جی کی ہستی بہت پُرکشش تھی۔ انھوں نے سوچا کہ یہ ہے وہ انسان جس کے پیش نظر ملک کو آزاد کرانے کا عظیم کام ہے اور جس نے وہ شریفانہ طریقے بھی وضع کر لیے ہیں جن کے ذریعہ یہ آزادی مل سکتی ہے۔ نہرو کے خیال میں یہ وہ انسان تھا جو زمانہ دراز سے دکھ سہتے ہوئے اور ستائے ہوئے قدیم ملک کی نمائندگی کرتا

۱۴ نومبر ۱۹۶۴ء کو وگیان بھون نئی دہلی میں نہرو کی دو یادگاری جلدوں کے اجرا کے موقع پر تقریر۔

کارنگ ۸۹۱۵ اسٹک

تھا جو اس ملک کی عظمت کو سمجھے اور اس کی حالیہ پستی کی بھی نمائندگی کرتا ہے یہ دونوں باتیں گاندھی جی میں سموئی ہوئی تھیں۔ نہرو فوراً ان کے وفادار پیرو اور پرجوش شاگرد بن گئے۔ جب وہ پہلے پہل میدان میں آئے تو ایک جلد باز اور غصیلے نوجوان تھے لیکن گاندھی جی نے انھیں سادھ لیا۔ انھیں اپنے طریقوں پہ لے آئے۔ پھر تو نہرو نے بڑی طویل مدتیں جیل میں کاٹیں۔ کوئی بات انھیں گاندھی جی سے الگ نہ کر سکی۔ خود گاندھی جی نے کہا: "ہم میں ذہنی اختلافات ہیں مگر ہمارے دل ایک ہیں۔"

زمانہ قبل تاریخ سے تیاگ اس ملک کا وطیرہ رہا ہے۔ جن بڑے آدمیوں کا ہم احترام کرتے ہیں عزت کرتے ہیں وہ بادشاہ نہیں، بڑے بڑے کارخانوں کے مالک نہیں اور نہ وہ فوجی سورما ہیں۔ وہ لوگ تو ہمارے سادھو سنت ہیں جنھوں نے تیاگ دیا اور اپنے لیے زندگی کی بنیادی ضرورتیں بھی روا نہ رکھیں۔ اگر آج کی دنیا میں کچھ سلیقہ مندی ہے، اگر کچھ آن باقی رہ گئی ہے۔ اگر سچائی کے لیے کچھ عزت ہے اور اگر ہم ایسے لوگوں سے آج بھی عقیدت رکھتے ہیں تو وہ اس لیے ہے کہ انھوں نے اس ملک میں کچھ کارنامے دکھائے اور دنیا کو تیاگ دینے والے ان مہان لوگوں نے کچھ حاصل کر کے دکھایا۔ پس نہرو نے گاندھی جی کی رہنمائی میں سخت جدوجہد کا کام کیا۔ انھیں یقین ہو گیا کہ گاندھی جی کے تیاگ کا طریقہ سامراج کو ہلا سکتا ہے ظالموں کو لرزہ بر اندام کر سکتا ہے اور آزادی دلا سکتا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ حاصل کر لینا ہی آخری منزل نہیں ہے نہرو نے ملک پر نظر ڈالی۔ ملک تو قدرت کی فیاضیوں سے مالا مال ہے مگر یہاں بسنے والے انسان غریب ہیں۔ آخر یہ کروڑوں آدمی بھوکے ننگے کیوں ہیں؟ یہ اتنے کنگال کیوں ہیں؟ انھوں نے محسوس کیا کہ مجھے لازماً ان لوگوں کی حالت بہتر بنانا ہے۔ اگر آزادی کو واقعی آزادی ہونا ہے تو وہ ایسی آزادی ہونی چاہیے جو افراد کو حقیقی آزادی دے یعنی سیاسی برابری کے ساتھ ساتھ معاشی اور سماجی آزادی۔ انھوں نے یہ بھی سوچا کہ سائنس کا طریقہ ہی ایک ایسا طریقہ ہے جس سے ہم اپنے ملک کی کایا پلٹ سکتے ہیں۔ اسی لیے

انھوں نے یونی ورسٹیوں سے کہا کہ سائنس پر زیادہ توجہ دی جائے اور ان کے سامنے جو بھی مسئلے آئے انھوں نے ان کے حل کے لیے سائنس کے طریقے استعمال کیے۔ یہ تھا ان کے کام کرنے کا طریقہ۔ سائنس محض زیبائش کے لیے نہیں ہے۔ وہ کوئی بیرونی چیز بھی نہیں ہے بلکہ جوہر طبع میں اور انداز فکر میں سائنس کو داخل کرنا ہے۔ ملک اتنی طویل مصیبت کیوں برداشت کرے۔ اس کی صرف ایک وجہ ہے یعنی لوگوں کے ذہنوں کی نفسیاتی رکاوٹیں۔ ہم ذات پات کے بندھنوں، مذہبی تعصب اور بہت سے دیگر سماجی عدم مساوات کا شکار ہیں۔ ہم نے اپنے آدمیوں کو طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا کر رکھا ہے اور ان سب باتوں کی ہم کو بھاری قیمت ادا کرنی پڑی ہے۔ اگر ہمیں ان سے چھٹکارا پانا ہے تو ہمیں اپنے سماجی تعلقات میں سائنس کی اسپرٹ کو داخل کرنا ہوگا۔ اپنے ذہنی عادات میں سائنس کی اسپرٹ کو لانا ہوگا۔ اسی لیے نہرو یہ کہتے تھے کہ میں سائنس کا معتقد ہوں۔ سائنس صرف حقیقت کی تلاش ہی نہیں وہ انسانوں کو بہتر بھی بناتی ہے اسی لیے نہرو سائنس اور ٹکنالوجی پر اتنا زور دیتے تھے۔

کیا آج ہماری حالت بالکل درست ہے؟ کیا ہم نے اپنا مقصد پا لیا ہے؟ کیا ہم اپنی موجودہ حالت سے مطمئن ہو سکتے ہیں۔ غذا کی کمی کو دیکھیے، مختلف میدانوں میں جو سنکٹ آئے ہوئے ہیں انھیں دیکھیے، اُن سیاسی اختلافات کو دیکھیے جو ہماری عوامی زندگی کو تباہ کر رہے ہیں۔ ان طریقوں کو دیکھیے جن کی وجہ سے ہمیں اپنے ملک کے مقابلے میں اپنے فائدے کی زیادہ فکر رہتی ہے اگر نکمے پن، بد انتظامی اور بے ایمانی کی جڑ اکھاڑ پھینکنا ہے تو پھر نہ صرف اپنے ماحول کے سدھار بلکہ اپنے سدھار کے لیے بھی ذہن کو سائنسی سانچے میں ڈھالنا ہوگا۔ اسی لیے نہرو سائنس اور روحانیت کو بروئے کار لانے پر زور دیتے تھے۔ روحانیت سے مراد ہے ہماری زندگی کی ایک دوسری حد جو محض مادی حد سے آگے ہے۔ انھوں نے ہمیں یہ سب کرنے کو کہا۔ اگر ہم باقی دنیا پر نظر ڈالیں تو آج بھی ہم پیچھے ہیں۔ تو یہ ان سماجی مجبوریوں کی وجہ ہے جو ہم نے اپنے اوپر عائد کر رکھی ہیں۔ دنیا کے عظیم ترقی یافتہ

ملک، ذات پات یا فرقہ اور طبقہ کی بات نہیں کیا کرتے پھرتے۔ وہ ایک ہی رہتے ہیں۔ جاپانی ہوں یا چینی یا کوئی اور ہوں۔ وہ یہ نہیں پوچھتے پھرتے کہ آپ کا مذہب کیا ہے۔ گاندھی جی کا گیت —

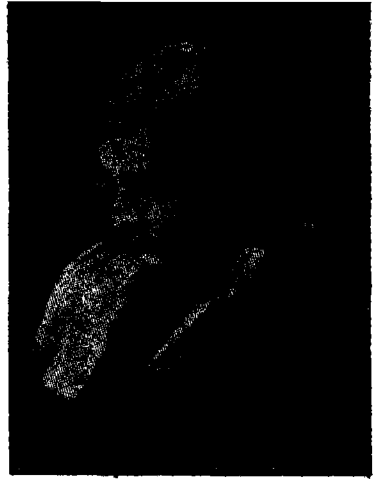
ایشور اللہ تیرے نام ہمیں یہ بتاتا ہے کہ اس سے کوئی مطلب نہیں کہ ہم پرماتما کو کیا نام دیتے ہیں۔ جب تک ہم سچے دھرم پر قائم ہیں حق تعالےٰ کو کوئی بھی نام دے سکتے ہیں جہاں تک عوام کی خدمت کا تعلق ہے مذہب سے اس میں کیا فرق پڑتا ہے جواہر لال نہرو نے گاندھی جی کے اصول کو عملی جامہ پہنانے کی بھرپور کوشش کی اور ہم سے یہ کہا کہ ہمارے ایسے دماغوں کے اندر جو رکاوٹیں ہیں ان سے ہوشیار رہیں کیونکہ یہ ہماری ترقی کی راہ میں حائل ہیں

اس کے بعد وہ اپنے آپ کو دنیا کا ایک شہری محسوس کرتے تھے۔ آج ہم نے جس کتاب کا اجرا کیا ہے اس کا نام ہے "ابھرتی دنیا" ایک نئی دنیا ابھر رہی ہے۔ وہ دنیا جس سے ہمارے بزرگ اب سے سو پچاس برس پہلے آشنا نہ تھے آج ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف مقامات پر سب قومیں مل رہی ہیں اور ساتھ کام کر رہی ہیں اور نہرو نے ناطرفدار رہنے کی پالیسی اختیار کی۔ یہ ناطرفداری اتباتی ہے، یہ تعصب کو ختم کرتی ہے، لوگوں کو اپنے ساتھ لاتی ہے اور انھیں اس قابل بناتی ہے کہ ایک دوسرے کو سمجھیں۔ ناطرفداری کے صحیح معنی یہی ہیں نہرو نے پنچ شیل کو رواج دیا اس سے ان کا مطلب یہ تھا کہ عوامی معاملوں میں بھی ضبط نفس کی ضرورت ہے۔ وہ باندونگ کانفرنس میں شامل ہوئے۔ بلگریڈ کی کانفرنس میں شمولیت کی اور جہاں تک انڈو چائنا کے معاہدوں کا تعلق ہے انھوں نے ان میں نمایاں حصہ لیا۔ تمام معاملوں میں انھوں نے یہ محسوس کیا کہ انسانیت تمام قوموں سے بالاتر ہے۔ ہماری نسل کے لیے جو کام ہے وہ محض اپنی قوم کے بنانے کا نہیں ہے تمام دنیا کے بنانے کا سوال ہے کیسی ایک سانچے میں ڈھل کر نہیں بن سکتی۔ کوئی قوم یہ یقین نہیں کر سکتی کہ اسے اپنے تصور کے مطابق تمام دنیا کو ڈھالنے کا حق ہے ہر قوم کا اپنا جوہر ہے، اپنی روایات ہیں انھیں مٹانا نہیں ہے انھیں محفوظ رکھنا ہے اور دنیا کی رنگارنگی اور اسے مالامال بنانے کے لیے بروئے کار لانا ہے۔ ہمیں ابھی اپنے آپ کو اس منزل تک پہنچنے والا راہ رو اور کام میں حصہ دار سمجھنا چاہیئے ہمیں ہر فرد کو مدد دینی چاہیئے کہ وہ 'پرم' تک پہنچے۔ نہرو نے اپنی کتاب "تلاشِ ہند" میں دو سنسکرت شلوکوں کے حوالے دیئے ہیں اور انھیں دنیا کے نئے نظام کا بنیادی اصول قرار دیا ہے۔

ایک یہ تھا — کہ اپنے کنبہ کو فرقہ کے لیے چھوڑ دو، فرقہ کو قوم کے لیے چھوڑ دو، قوم کو دنیا کے لیے چھوڑ دو اور دنیا کو بھی اپنی پوتر آتما کے لیے چھوڑ دو۔ شخصی آزادی انفرادی حقے کی پاکیزگی ہے۔ اگر آپ نے اپنی روح کو کھو دیا تو پھر اگر ساری دنیا کو پا بھی لیا تو کیا ہے — اپنی آتما کی پراپتی سے بڑھ کر کچھ نہیں ہے جس کے لیے سب کچھ کھلا چھوڑ دینا چاہیئے۔

دوسرا سنسکرت کا شلوک جس کا انھوں نے ترجمہ بھی کیا ہے اور جو گاندھی جی اکثر پڑھا کرتے تھے مطلب یہ ہے — میں دنیوی راج نہیں چاہتا۔ میں مکتی (نجات) یا سورگ (بہشت) بھی نہیں چاہتا۔ میں ان لوگوں کا دکھ کم کرنا چاہتا ہوں جو مصیبت میں پڑے ہیں۔ میرے لیے یہی کافی ہے۔ سماجی برابری اور انفرادی آزادی ہی کسی پاکیزہ عالمگیر نظام کے بنیادی اصول ہو سکتے ہیں — سچائی اور محبت یہ اصول ہیں (ابھیے اور اہنسا) نہرو ایک بااصول انسان تھے۔ انھوں نے ہمیں یہ باتیں سکھائیں اور اپنی زندگی میں بھی ان پر عمل کیا۔ ہمارے لیے یہ بڑی بات تھی کہ ہم میں ایک ایسی آتما موجود تھی جو ہمیں نسلاً بعد نسلاً حوصلہ دلاتی رہے گی۔





اندرا گاندھی

مسعود اختر جمال

(جشن سیمیں (سلور جبلی) کی تقریب میں ایک شاعر کا نذرانۂ عقیدت)

اندرا، ایک نئے دور کی تمہید حسیں
صفِ اعدا میں غریبوں کے لیے سینہ سپر
کارواں کے لیے، اک شمعِ سرِ راہگذر
ایک تابندہ کرن، تیرگیِ شب کے لیے
ارضِ مشرق پہ بہاروں کی شفق رنگِ سحر
مطلعِ شوق پہ، تابانیِ خورشیدِ حسیں
اندرا، ایک نئے دور کی تمہید حسیں

آج کے دن یہ تب و تاب اُسی کے دم سے
فکر کو قوتِ پرواز دیا ہے جس نے
سازِ سے شعلۂ آواز لیا ہے جس نے
حال و مستقبل و ماضی کا بنا کر سنگم
اک نئے عہد کا آغاز کیا ہے جس نے
آج کا لمحۂ نایاب اُسی کے دم سے
آج کے دن یہ تب و تاب اُسی کے دم سے

اندرا فہم و فراست میں یگانہ سب سے
دولتِ عزم و یقیں، سوزِ تکلم اُس کا
بیش از لعل و گہر، ایک تبسم اُس کا
کہکشاں زیرِ قدم، قوسِ قزح آنچل میں
خوشہ چیں، جلوۂ مہر و مہ و انجم اس کا
اندرا حسنِ قیادت میں یگانہ سب سے
اندرا فہم و فراست میں یگانہ سب سے

اے کہ، اک زندہ حقیقت ہے حکایت تیری
حرفِ زریں میں لکھی جائے گی رُوداد تری
مژدۂ فتح و ظفر، منزلِ افتاد تری
جادداں تو ہے، دنیا ہے آباد تری
ہے دعا میری کہ ہر دل میں رہے یاد تری
فاتحِ گردشِ دوراں ہے محبت تیری
اے کہ، اک زندہ حقیقت ہے حکایت تیری

رومانیت کیا ہے!

ڈاکٹر طلعت رضوی برق

رومانی تحریک (ROMANTIC MOVEMENT) یورپ کی ادبی تاریخ کا ایک دلکش باب ہے یہ تحریک کچھ وقفہ سے انگلینڈ، فرانس اور جرمنی میں شدت اختیار کیے ہوئے تھی۔ ہر سہ ممالک میں اس تحریک کے تحت رومانیت ROMANTICISM کا تصور کسی حد تک مماثل اور بعض جہتوں سے مخالف و متبادل رہا۔ انگریزی، فرانسیسی اور جرمن ادبیات میں لفظ رومانی (Romantic) ایک مبسوط صفت اور اصطلاح بن گیا ہے مزاج و ماحول کے اختلاف نے ان میں سے ہر جگہ اس لفظ کی معنوی سمتیں بدل دیں اور متضاد مفاہیم بھی پیدا ہوتے گیے۔

اس میں قطعی مبالغہ نہیں کہ ادب کی کوئی اصطلاح 'رومانی' کی طرح بے اندازہ وسعت معنی نہیں رکھتی۔ جے۔ برزون (J Barzun) نے 'رومانی' کے مستعمل جدید مرادفات کے لیے حسب ذیل الفاظ لکھے ہیں۔

"دلکش، بے غرض، وافر، آرائشی، مصنوعی، حقیقت پسند، مادی، غیر جذباتی، سبک، شاندار، مترنم، روایتی، پراسرار، روحانی، ادنیٰ، انقلابی، مطولانی، منظری، بے ہیئت، ظاہر بیں، جذباتی، تصوراتی، بے عقل۔"

اور لطف یہ کہ ابھی یہ فہرست بہ آسانی ایسی مثالوں سے طویل ہو سکتی ہے جن سے ذہن دو چار رہتا ہے۔ اس تنوع معنوی کو ہم اس پر محمول نہیں کر سکتے کہ ابھی تک اس کی صحیح تعریف بیان کرنے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ مفاہیم آپس میں کچھ اس حد تک متضاد ہوتے گیے ہیں کہ ابہام کا پیدا ہونا ناگزیر ہو گیا۔ مشہور ادیب اے۔ او۔ لو جوائے (A. O. Lovejoy) رومانیت سے متعلق لکھتا ہوا اس نتیجہ پر پہنچا کہ:

" the word "romantic" has come to mean so many things that, by itself, it means nothing It has ceased to perform the function of a verbal sign so that the whole sale use of the word has led to a good deal of unconcious falsyfication of the history of ideas'

حقیقت یہ ہے کہ ادبی تنقید میں جب سے اس لفظ کا استعمال شروع ہوا ہے، غلط فہمیوں اور نارسائیوں کا ایک مستقل باب کھل گیا ہے۔ ۱۷۹۶ء میں فریڈرک شلیگل (Friedric Schlegel) نے تقریباً سوا سو صفحات میں اس لفظ کی تشریح کی تھی۔ مگر وہ بھی اس لفظ کے کسی ایک قطعی معنی کا تعین نہ کر سکا اس پوری تشریح میں لفظ رومانی کا مفہوم نہ صرف یہ کہ جدا جدا ادبی تخلیقات میں بدلتا رہا بلکہ اکثر ایک ہی نظم کے مختلف حصوں میں متضاد پایا گیا۔ جرمن ادیب و شاعر اسٹنڈال (Stendhal) نے شیکسپیر کا مطالعہ کر کے لکھا تھا کہ رومانیت عوام کے سامنے ایسے ادبی شہپارے پیش کرنے کا فن ہے جو انھیں عصری میلانات، عقائد اور رسوم کا احترام کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ مسرت بہم پہنچائے۔ اس کے برعکس کلاسکیت وہ ادب پیش کرتی ہے جس نے اسلاف کو خاطر خواہ مسرت بخشی تھی۔

اسی درمیان فرانس میں پیرس کے ذہین طبقہ نے شاعری

میں خاکہ نویسی، منظر نگاری، عہد وسطیٰ کے احیا اور تاریخ کے استعمال کو رومانیت سے تعبیر کیا MUSSET لکھتا ہے کہ حسن و قبح، مضحک و سنجیدہ، سادہ و رنگیں ہیئت و طمانیت بلکہ آسان لفظوں میں المیہ و طربیہ کے امتزاج کے علاوہ رومانیت کوئی دوسری چیز ہو نہیں سکتی۔ اور مختصراً یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ اس وقت کلاسیکی ادب صرف رومن شاعری کی نقل اور رومانی سراسر جرمن، انگریزی اور اسپینی شاعری کا جزو تھا۔ مُوسیتؔ کا یہ شدید طنز اس ابہام پر بہت صاف روشنی ڈالتا ہے جو اس اصطلاح کو ایسے اندر ریشم کے کیڑے کی طرح ستر کر لیتا ہے۔ انگریز شعرا اس معاملے میں کافی دور اندیش تھے کہ انھوں نے اس کی تشریح بھی انھوں کو سمجھتے ہوئے خود کو محتاط رکھا اور اٹھارہویں صدی اور اوائل انیسویں صدی عیسوی کی انگریزی شاعری رومانی اصطلاح کے پھیروں سے الگ رہ کر بہ آسانی سمجھی اور پرکھی جا سکتی ہے۔ یہ لفظ بلیکؔ، ورڈسورتھ، کالرج، شیلی اور کیٹسؔ کی شاعری میں بہت کم استعمال ہوا ہے بہ نسبت جرمن اور فرانسیسی شعرا کے جن کے یہاں اس کا استعمال کثرت سے نظر آتا ہے۔ اس عہد کے انگریز نقاد جرمنوں کی طرح اس تحریک کی فلسفیانہ بنیادوں سے کما حقہ متعارف نہ تھے۔ فرانس کی طرح انگلینڈ میں رومانی اور کلاسیکی کی تعریق اتنی اہم تھی۔ مگر توانا، تجرباتی اور غیر جانبدار انگریزی تنقید نے اس کی چند اصولی تعریفیں کیں حتیٰ کہ کالرج نے جو انتہائی فلسفیانہ طور پر اس تحریک سے ملوث و منسلک تھا، اپنی دریافتوں کی بنیاد عام سطح پر رکھی اور کوئی قطعی اصول وضع نہ کیا لہٰذا رومانی "(ROMANTIC) کی مختلف تعبیریں جرمنی، فرانس اور انگلینڈ کی ادبی رومانی تحریکوں کی گیرائی اور ان کے درمیان مخصوص اختلافات پر کافی روشنی ڈالتی ہیں ہر زبان میں یہ لفظ چند خاص معنوں کا حامل رہا جو غیر مقامی شعرا کے لیے قابل قبول نہ تھا ان متضاد معنوں اور مختلف مفاہیم کے پیش نظر ہر سہ ممالک کی رومانی تحریکوں کا اکثر و بیشتر تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے اور تجسس و تلاش کے بعد ایک ایسی تعریف (DEFINITION) اور اس کے اجزا و مشترک متعین کیے گئے ہیں جس پر سب کا اتفاق ہے۔ ان باتوں کے باوجود یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ ہر ملک کا اپنا جداگانہ

اور مخصوص رومانٹک اسکول ہے جس سے واضح قومی خصوصیات وابستہ ہیں ان اسکولوں کے تقابلی مطالعے میں ایک بڑی دقت اور ہے۔ بہرچند کہ بلیکؔ اور بائرن عام طور پر رومانی گروہ میں سمجھے جاتے ہیں مگر ان دونوں کی متفرق شاعری پڑھ کر یہ کہنے کا خطرہ کون مول لے گا کہ انگلینڈ میں بھی کوئی رومانی اسکول ہے اس طرح کی مثالیں فرانس میں بھی ملیں گی جن کے پیش نظر فرانس کے رومانی اسکول کی تعیین دشوار معلوم ہوگی۔ فرانس میں ESSAI SUR LES REVOLUTIONS اور ATALA کے بعض حصے رومانی کہے جا سکتے ہیں بعض نہیں تو کلاسیکی ڈرامہ کے خاص مخالف ہیوگو "HUGO" جس کی تصنیفیں CROM WELL اور HARNANI ہیں اور ODESET BALLADES کا مصنف بالغوں کی سماجی اور اخلاقی ذمے داریوں کا قائل ہے ان تبدیلیوں اور تغیرات کے پیش نظر بڑی آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ کسی ملک میں بھی معمولی اوسط، مخصوص، تسلیم شدہ بلکہ علامتی رومانی انداز شاید کبھی نہیں رہا

ایسا لگتا ہے کہ یہ ساری دشواریاں رومانیوں کی دقت پسندی، اختلافِ ہئیت اور نادرہ کاری کی عجلت سے پیدا ہوئی ہیں اس کے باوصف نظریات کی تبدیلی کے سنجیدہ اسباب موجود تھے مثلاً شلیگلؔ کا ATHENAUM کے مطالعہ کے بعد یہ مطالبہ کہ رومانی شاعری کو ہمیشہ ترقی پذیر (PROGRESSIVE) ہونا چاہیے شاید اس پر واضح تھا کہ جرمنی میں یہ ترقی پسندی دو قطعی مختلف گروہوں FRUHROMANTIC اور HOCH ROMANTIC سے ابھرے گی پہلا گروہ عموماً موسوم بہ جینا رومانٹک (JENA ROMANTIC) لازمی طور پر فلسفیانہ، مابعد الطبیعاتی، متفکرانہ اور داخلی دلچسپیوں کا حامل ہے جبکہ دوسرا گروہ موسوم بہ HADELBERG RO-MANTIC) زیادہ تخلیقی، خارجی اور جرمن کے قومی ورثہ (مثلاً لوک گیت، لوک کہانیاں وغیرہ) کو ہی توانائی سمجھنے والا ہے جرمن رومانٹکس ایسے اس تاریخی، ادبی اور لسانی اتحاد کے ساتھ تیزی سے قومی و سیاسی اتحاد کی طرف گامزن ہیں دوسری طرف فرانسیسی رومانٹکس انقلابی دور کی علیحدگی پسندی اور جوشش غلبہ سے

الگ ہو کر زیادہ سے زیادہ عالمی اثرات قبول کرتے گئے۔ یہ رومانی دور کم از کم پچاس سال پر حاوی رہا۔ اس کے بعد بتدریج ترقی کے بیے خاصا وقت ملا جس نے صورت حال کو اور بھی گنجلک کر دیا

یورپ میں رومانی تحریک کے پیچ و خم اور اس اصطلاح کے تعدد معنوی سے بحث کے دوران مختلف ادبیات کے باہمی تعلقات رکھنے والوں اور ناوسائیوں کی ایک طویل فہرست پیش کرتے ہیں، کیونکہ جرمنوں نے رومانیت کو جیسا اور جو کچھ سمجھا اس سے فرانسیسی اور انگریز متاثر نہ ہو سکے رومانیت فرانسیسیوں کی نگاہ میں جیسی تھی وہ انگریزوں اور جرمنوں کی نظر میں نہ تھی۔ علیٰ ہذا القیاس

غرض ہر جگہ کے ادیبوں نے غیر ملکی ادب پاروں میں دبی ہوئی رومانیت کبھی جو ان کے اپنے خیالات سے قریب تھی یہاں تک کہ ایسی نادرست توضیحیں پیدا ہوئیں جنھیں بغیر دوسرے معتقدات کی عینک لگائے سمجھا ہی نہ جا سکے مثلاً گوئٹے کی WERTHER اور GOTZVON BERLICHINGEN جو جرمنوں کے لئے حالات کے قطعی داخلی اور خارجی پہلو ہیں مگر فرانسیسیوں کے لیے خاص جرمن رومانیت کی مظہر ہیں لہٰذا انیسویں صدی کے فرانسیسی نقاد جب جرمن رومانیت کے متعلق لکھتے ہیں تو گوئٹے، شلر اور بورجر کا نام لیتے ہیں، کہیں بھی شلیگل، نووالس، واکن راڈر کا تذکرہ نہیں آتا جیسے یہ لوگ اس وقت بالکل گمنام رہے ہوں اسی طرح بائرن اس وقت بھی جرمنی اور فرانس میں ایک رومانی شاعر سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ انگلینڈ میں اس کی حیثیت اس نہج سے محض حاشیائی ہے وہ رومانیوں سے برائے نام ہی تعلق رکھتا ہے، اس کا رشتہ اٹھارہویں صدی کے پوپ کی روایتی شاعری سے زیادہ مضبوط و مربوط ہے۔

ورڈسورتھ کی کتاب "لیریکل بیلیڈس" اور اس کا اہم "پیش لفظ" انگلینڈ کے رومانٹک اسکول میں کسنے کے پتھر کی حیثیت رکھتا ہے اسکے معاصرین اور ہم وطن رومانیت کی اس تشریح کی ندرت پر چونک اٹھے تھے ممکن ہے جرمنوں نے ورڈسورتھ کے بیلیڈ میں اپنے تئیں شعری صداقت کی بہترین مثال پائی ہو مگر فرانسیسیوں کے نزدیک یہ سب اتنا کھوکھلا ہے سست، تبلیغی اور خلوص سے معرا ہے کہ اسے رومانی کہا ہی نہیں جا سکتا۔ ورڈسورتھ وضاحت، تجزیہ، تحلیل، تشریح اور تفسیر کرتا ہے مگر اس کے فرانسیسی مخالفین تعصب، جوش، شور و ہنگامہ، نمائش اور مبالغہ آرائی کرتے ہیں یہ بات واضح ہے کہ انگلش، فرنچ اور جرمن رومانی تحریکوں کے درمیانی رشتے، جس حد تک محسوس کیا جاتا ہے، اس سے کہیں زیادہ مبہم اور پیچیدہ ہیں، یہ دشواریاں دراصل رومانیت کے مزاج سے پیدا ہوئیں اور سارے یورپ میں عام ہو گئیں۔ اس تصور کی وسعت و بینائی معنوی تغیر و تبدل کی ایک قابل لحاظ گنجائش کی متقاضی ہے ہم انھیں بجا طور پر مختلف رومانی اسکول کے درمیان اختلافات کی کڑیاں کہہ سکتے ہیں جو باہم مل جل کر یورپ کی رومانی تحریک سے عبارت ہیں

ان تمام دقتوں کے باوجود مختلف زبانوں کی رومانی تخلیقات کچھ نہ کچھ ایسے مشترک عناصر ادبیات ضرور رکھتی ہیں جن سے ہم تقابلی مطالعہ پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ بغور مطالعہ کرنے پر ان رومانی تحریکوں کے تین مشترک کلیدی اوصاف سامنے آتے ہیں۔ غلبۂ انفرادیت عظمت تصور اور احساسات پرور۔ یہ وہ خصوصیات ہیں جو رومانیت کی تقریباً ہر تعبیر میں بنیادی اور جبلی حیثیت رکھتی ہیں گویا یہ انفرادی تجربات و محسوسات کا آزادانہ تصوراتی اظہار پیش کرتی ہیں۔

رومانیوں کی بنیادی انفرادیت فن کو تہذیبی اور خارجی طور پر دو ٹوک طور سے الگ کرتی ہے ابتداً ادب کو فنی طور پر چند بندھے ٹکے اصولوں کا پابند اور اختراعی عنصر سے پاک سمجھا جاتا تھا اب کسی رومانی انتاج (CREATION) کی حیثیت ایک ایسے تجربے کی ہو گئی ہے جس میں فنکار کی حسیت براہ راست کارفرما ہو اور اس کے ذاتی تاثرات کے سوا کچھ نہ ہو یہ تبدیلی فنکار کی نئی بصیرت پر محمول ہے وہ اپنے علم و دانش کی نمائش نہیں کرتا، وہ سچے واردات قلبی اور احساسات و جذبات کو پیش کرتا ہے جس میں اس کی انفرادیت دخیل ہوتی ہے ایسے فن پارے پابندیٔ روایت و ہیئت کے قبول سے پاک اور فنکار کے ذاتی تاثرات کا آئینہ ہوتے ہیں۔ یہ شخصی انفرادیت ہی ہے جس میں رومانی بے ساختگی و برجستگی پوشیدہ ہے یہ انفرادیت کم و بیش ہر جگہ رومانیت کی تحریک سے نمایاں طور پر وابستہ رہی۔ خارجی ماحول سے

بھی رومانی شاعر اپنی داخلی دنیا کی انفرادیت کے تحت [illegible] جو تارہا۔ فطری اور منظری شاعری کے جو نمونے ملتے ہیں ان میں شاعر کی داخلی بصیرت کو بڑا دخل ہے اور یہی وجہ ہے کہ رومانی شاعری نے اس کے سہارے بہت جلد شہرت حاصل کی۔

رومانی دنیا میں جس طرح ایک فرد کی اہمیت جزو اعظم کی ہے اسی طرح تصور کو مرکزی نقطہ کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ تصور ہی کسی فرد کی قوت مشاہدہ ہے جس سے وہ اپنی داخلی بصیرت کے سہارے تجربات کے تاثرات کو نئے انداز کی شکل دیتا ہے۔ تصور کی یہ بالا دستی براہ راست فرد کی عظمت و انفرادیت کا ماحصل ہے۔ یہ تصور یقینی طور پر ذاتی احساسات کے ترکیبی عمل سے متعلق ہے ہر فرد میں ایک انا (ایگو) ہوتی ہے اور یہ انا اپنی قبولیت، حسیت اور رد عمل کے لحاظ سے بحیثیت کل کام کرتی ہے۔ اس انا کے ادراک و عمل کا واحد ذریعہ تصور ہی ہے لہٰذا رومانی نقطۂ نظر سے تصور بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ رومانیوں کے نزدیک انا کی اہمیت موضوع سے دہ چند زیادہ ہے کیونکہ اس سے وہ خارج کو اپنی ذہنی گرفت میں لاتا اور اپنے تصور کی مدد سے نئی شکلیں عطا کرتا ہے

کالرج اپنی مشہور کتاب "بایوگریفیا لٹریریا" میں رقمطراز ہے:

"THE PRIMARY Imagination I HOLD TO BE THE LIVING POWER AND PRIME AGENT OF ALL HUMAN PERCEPTION IN THE FINITE MIND OF THE ETERNAL ACT OF CREA-TION IN THE INFINITE"

ورڈسورتھ نے PREFACE میں اپنے کارناموں کو "WORKS OF IMAJINATION AND SENTIMEN" کہا ہے۔ کیٹس کا دعویٰ بھی کچھ ایسا ہی ہے اپنے بھائی جارج کو ایک خط میں لکھتا ہے:

"I DESCRIBE WHAT I IMAGINE"

شیلی نے "شاعری کی مدافعت" میں شاعری کو THE EX-PRESSION OF THE IMAGINATION کہا ہے،

تصور کے لیے کچھ یہی ایسا ہی نقطۂ نظر ہم جرمنی اور فرانس کے شعرا میں پاتے ہیں۔

ایک تیسرا عنصر جو رومانیت سے بہت گہرے طور پر وابستہ ہے "احساس" (FEELING) ہے عام طور پر ہم رومانی نظم یا رومانی انداز اسے کہتے ہیں جو بہت زیادہ احساساتی و جذباتی (SENTIMENTAL) یا رقت آمیز ہو احساس کا تعلق سراسر قلب انسانی سے ہے تصور، تخیل، شعور، ادراک، فکر، یہ سب ذہن و دماغ سے متعلق ہیں۔ اس کے برعکس احساس، جذبہ، رقت، جوش اور کیفیت کے رشتے دل سے استوار ہیں انسان کا دل احساسی کیفیات و جذبات کا منبع ہی نہیں رومانیت کی کلید ہے یہ درد و گداز قلب رومانیت کے "تصور" کو جلا بخشتا ہے اور حسیت کی یہ نعمت بغیر دل زندہ کے ممکن نہیں

روسو کنفیشن (CONFESSIONS) میں لکھتا ہے

"I FELT BEFORE I THOUGHT

THAT IS MAN'S LOT"

رومانیت کے لیے قلب کی اہمیت اس نقطۂ نظر سے ہیوگو کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

"THE HUMAN HEART IS LIKE THE EARTH, YOU CAN SOW, PLANT, CULTIVATE WHATEVER YOU PLEASE ON ITS SURFACE, IT WILL BRING-FORTH ITS NATURAL VEGETATION, ITS WILD FLOWERS AND FRUITS. .. .. IT IS THE FOUNDATION OF ART JUST AS THE EARTH IS OF NATURE"

فرانسیسی ادیب STAEL بھی قدیم و جدید ادب میں اسی انداز سے تفریق کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اسلاف کی شاعری خالص ادب (ذاتی [illegible])

یہ اجیالی رات

مسعود علی ذوقی

رات کھڑی ہے روپ نکالے　جوت کی مالا گلے میں ڈالے
اُجلی اُجلی رات سُہانی　گہری جھیل، روپہلا پانی
تیر رہی ہے بِنا کھویا　جھل جل میں چاند کی نیّا
گیت سناتیں چنچل لہریں　میٹھی میٹھی، مدھم لَے میں

ایک سہانا خواب ہے پیارے
یہ اُجیالی رات !!

لہریں مانو ترشے ہیرے　بہے ہے ندیا دھیرے دھیرے
مہکی مہکی، گیلی گیلی　کومل جھونکے، پَوَن رسیلی
دُوب کے تختے نکھرے نکھرے　اُوس کے موتی بکھرے بکھرے
اونگھ رہے ہیں نیند کے مارے　دوب کے اوپر ہرن چکارے

ایک سُہانا خواب ہے پیارے
یہ اجیالی رات !!

لہریں مل کر ناچیں باہم　چاند کی کرنیں برسیں چھم چھم
شیتل جل کو چوم کے جھکیں　پیڑ کی ڈالیں جھوم کے جھکیں
ہوا میں ناچیں، تھم تھم چمکیں　اُڑتے جگنو جھم جھم چمکیں
نیچے جگنو، اوپر تارے　جھوم رہے ہیں خوشی کے مارے

ایک سُہانا خواب ہے پیارے
یہ اجیالی رات !!

رقص لوح و قلم

★ ساغر مہدی

(آزادی کی سلور جبلی کے موقعہ پر)

زندگی رقص میں ہے رقص میں ہیں لوح و قلم

ذہن پر اب کوئی پہرہ نہ نگاہیں مجبور
پاؤں میں اب کوئی زنجیر نہ راہیں مجبور
نہ تو نغمے ہی مقید ہیں نہ آہیں مجبور
جبر و بیداد کے سب ٹوٹ چکے دستِ ستم
زندگی رقص میں ہے رقص میں ہیں لوح و قلم

ذرہ ذرہ ہے شہیدوں کے لہو سے گلنار
جن کا ہر قطرۂ خوں قول و قسم کا معیار
بات اپنوں کی نہیں جن کے ثنا خواں اغیار
یاد آتے ہیں تو ہو جاتی ہیں آنکھیں پُر نم
زندگی رقص میں ہے رقص میں ہیں لوح و قلم

پھر اجنتا و ایلورا کا ہنر رقص میں ہے
فکرِ ٹیگور کا انداز نظر رقص میں ہے
قلعہ سُرخ میں پھر رُوحِ ظفر رقص میں ہے
اپنے ہاتھوں میں لیے عظمتِ قومی کا علَم
زندگی رقص میں ہے رقص میں ہیں لوح و قلم

جس کی آہٹ سے اندھیروں کا بھرم ٹوٹ گیا
ظلم کی طاقتِ مغرور کا دم ٹوٹ گیا
جس کی خوشبو سے ہر اک حلقۂ غم ٹوٹ گیا
اسی احساس کی مشعل کے پرستار ہیں ہم
زندگی رقص میں ہے رقص میں ہیں لوح و قلم

ذہنِ گاندھی کی درخشانی تعبیر ہے یہ
مادرِ ہند کی جاگی ہوئی تقدیر ہے یہ
آرزوؤں کے حسیں خواب کی تعبیر ہے یہ
جس نے آنچل سے بنا ڈالے ہیں کتنے پرچم
زندگی رقص میں ہے رقص میں ہیں لوح و قلم

بجلیاں گرتی رہیں قافلے چلتے ہی رہے
رخ زمانے کے حوادث کا بدلتے ہی رہے
منزلیں پا کے بھی یہ پاؤں مچلتے ہی رہے
کیا اجالے سے کہیں رکتے ہیں راہی کے قدم
زندگی رقص میں ہے رقص میں ہیں لوح و قلم

آنند بھون

اقبال ماہر

یہ قصر علم بردارِ وطن
راحت کدۂ سالارِ وطن
فردوسیت گلزارِ وطن
صنعت گریِ معمارِ وطن
یہ فنکدۂ فنکارِ وطن
نہرو کا مکاں آنند بھون

یہ قلب و جگر ہے بھارت کا
کاشانہ ہے صاحب عظمت کا
ایوان ہے اہلِ سیاست کا
گہوارہ ہے حریت کا
یہ رزم گہہ سالارِ وطن
نہرو کا مکاں آنند بھون

یہ صدر مقام آبادی کا
دل گنگ و جمن کی وادی کا
ملبوس بدن پر کھادی کا
اک سمبل[1] ہے آزادی کا
عزت سے ہے یہ جینے کا چلن
نہرو کا مکاں آنند بھون

یہ گنبد و بام و در و روزن و در
ہر چیز یہاں فردوسِ نظر

یہ عزم کی پہلی منزل ہے
یہ امن و اماں کا ساحل ہے
یہ حالِ رخِ مستقبل ہے
ہر ذرّہ ادب کے قابل ہے
یہ درس گہِ تہذیبِ زمن
نہرو کا مکاں آنند بھون

شاداب کنول نوخیز جواں
دوشیزۂ گل ہے حورِ جناں
پھولوں کی روش ہے بزم بتاں
فوارہ مثالِ کاہکشاں
یہ باغ ہے یا چوتھی کی دلہن
نہرو کا مکاں آنند بھون

یہ تہذیبوں کا سنگم ہے
الفت کا نظام محکم ہے
اک شیر و شکر کا عالم ہے
آمیزشِ شعلہ و شبنم ہے
جیسے ہو وصالِ روح و تن
نہرو کا مکاں آنند بھون

خاموشی بہت کچھ کہتی ہے
ہر دل میں محبت رہتی ہے
اک پریم کی گنگا بہتی ہے
یہ انجمنِ یک جہتی ہے
قوموں کا یہاں ہوتا ہے ملن
نہرو کا مکاں آنند بھون

ہر ذرہ نجوم و شمس و قمر
ہر سنگ یہاں ہے لعل و گہر
ہر قطرۂ شبنم دُرِّ عدن
نہرو کا مکاں آنند بھون

---

[1] SYMBOL (علامت)

(افسانہ)

قسمت کی لکیر

صغرا مہدی

ایک عرصے تک تپتے ہوئے صحرا میں سفر کرتے رہنے کے بعد کوئی گھنا سایہ دار درخت مل جائے یا ریگستان میں چلتے چلتے اچانک کوئی چشمہ نظر آجائے تو ایسا ہی تو لگتا ہوگا مگر ریگستان چشمہ...... سراب...... کہیں یہ بھی تو کوئی سراب نہیں؟ کہیں یہ بھی تو پرچھائیں نہیں جو ہاتھ لگاتے ہی غائب ہو جائے گی اُف! یہ بدگمان دل! ہائے یہ زندگی کے تلخ تجربے جو اس سے اس خوشی کو بھی چھیننے پر مصر ہیں۔

بچپن میں آسمان پر اڑتے ہوئے جگنو اسے کتنے اچھے لگتے تھے۔ وہ ہمیشہ ان کا پیچھا کرتی مگر کبھی وہ ہاتھ نہ آتے اور زندگی بھر وہ اسی طرح خوشیوں کا پیچھا کرتی رہی تھی...... خوشی اطمینان اور سکون اس کی زندگی سے ہمیشہ ہی عنقا رہے تھے۔ مگر ایسا کیوں ہوا؟ قسمت؟ مگر اس کی قسمت تو بہت اچھی ہے۔ جس نے بھی اس کا ہاتھ دیکھا تھا یہی کہا تھا تمھاری قسمت بہت اچھی ہے۔ اس کے کانوں میں ان لوگوں کے جملے زندگی بھر گونجتے رہے جنھوں نے اس کو خوش قسمت کہا تھا۔

زندگی میں جو ہوا اس کی ذمے دار وہ خود بھی ہے — اس کی زود حسی، خود اعتمادی کی کمی۔ مگر یہ اس کے حالات ہی تو تھے جنھوں نے اسے کم گو، ریزرو اور ایک حد تک قنوطی بنا دیا تھا۔

اب وہ سوچتی ہے کہ آخر اس نے پاپا سے کبھی یہ کیوں نہیں پوچھا کہ روز ان کی اور ممی کی لڑائی کیوں ہوتی ہے؟ وہ دن بھر کہاں رہتے ہیں؟ رات بھر کہاں رہتے ہیں۔ اس نے ممی سے ہی پوچھ لیا ہوتا کہ آخر وہ کس کو ہر وقت برا بھلا کہتی ہیں۔ ان کو ہر وقت غصہ کیوں چڑھا رہتا ہے وہ اس کو جھڑکتی کیوں ہیں۔ خیر ممی سے تو اسے ڈر لگتا تھا تو آیا سے ہی پوچھا ہوتا کہ یہ گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ مگر اس نے کسی سے نہ کبھی کچھ پوچھا نہ کبھی بتایا کہ اس پر کیا بیت رہی ہے۔

اور جب ممی کہیں چلی گئیں اور پاپا نے گھر سے اتنی دور بورڈنگ بھیج دیا تو وہ باوجود شدید خواہش کے ان سے یہ نہ کہہ سکی کہ وہ اسے اپنے سے دور نہ کریں۔ وہ انھیں بہت چاہتی ہے۔ جب وہ کبھی پیار کرتے ہیں یا گلے سے لگاتے ہیں تو وہی لمحات اس کے لیے خوشی اور سکون کے ہوتے ہیں۔

بورڈنگ میں آکر کچھ عرصے وہ بہت اداس، پریشان اور گھبرائی ہوئی رہی مگر پھر سمجھ کر کہ اب یہیں رہنا ہے خود کو اس نے اسی زندگی کا عادی بنا لیا۔ ہوسٹل میں لڑکیوں نے اس سے بہت دوستی کرنے کی کوشش کی مگر وہ تو اپنی روم میٹ اور استانیوں سے بھی کم ہی بولتی۔ ہاں مسز ایلیون جو اسے ہسٹری پڑھایا کرتیں اسے بہت پسند تھیں اس لیے کہ وہ کبھی اس سے اس کے بارے میں کوئی سوال نہ پوچھتیں۔ وہ اکثر ان کے کمرے میں چلی جاتی تو وہ بہت محبت سے پیش آتیں۔ ادھر ادھر کی باتیں، کتابیں رسالے پڑھنے کو دیتیں۔ وہ اس کو پڑھنے میں بھی مدد دیا کرتیں۔ [illegible] وہ آپ ہی آپ مسز ایلیون کی طرف کھنچنے لگی اور کچھ

عرصے بعد اسے محسوس ہوا۔ وہ انھیں چاہنے لگی ہے۔ جی جان سے۔

دن گزرتے گئے۔ وہ ہر کلاس میں امتیاز سے پاس ہوتی رہی ایک کلاس سے دوسرے میں چڑھتی رہی۔ کبھی کبھی پاپا کا خط آ جاتا۔ ایک دو دفعہ وہ اس سے ملنے بھی آئے۔ مگر اسے گھر نہیں ملایا۔ گرمیوں کی چھٹیوں میں وہ مسز ایڈون کے ساتھ کسی ہل اسٹیشن پر چلی جاتی

ایک دن اسے پاپا کا خط ملا "میں نے امریکہ جا کر رہنے کا فیصلہ کر لیا ہے تم چاہو میرے ساتھ چلو چاہو یہیں مسز ایڈون کے ساتھ رہو۔" وہ ہفتوں سوچتی رہی۔ پاپا نے یہ کیوں نہیں لکھا کہ "تم میرے ساتھ امریکہ چلو"! اور پھر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ یہیں رہے گی۔ مسز ایڈون اس کے اس فیصلے سے بہت خوش ہوئیں۔ اس کے پاپا چلے گئے اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ۔ ان کے جانے کے بعد معلوم ہوا تھا کہ انھوں نے شادی کر لی تھی۔

وہ اسکول سے کالج میں آئی تو زندگی کا ایک نیا باب کھلا اسکول کے مقابلے میں کالج کی زندگی اسے زیادہ اچھی لگی یہاں اس کی زندگی میں دو شخصیتیں آئیں۔ ایک اس کا کلاس فیلو اروِن دوسرے انگلش کے پروفیسر بنرجی، جو ہفتہ میں صرف ایک دفعہ اس کے کلاس میں پڑھانے آتے تھے اور وہ اس دن کا بے چینی سے انتظار کرتی رہتی۔

چند دنوں بعد اسے محسوس ہوا کہ اروِن اسے پسند کرتا ہے۔ مسز ایڈون کو بھی پسند تھا۔ اب وہ اکثر گھر بھی آ جاتا۔ کبھی کبھی وہ اس کے ساتھ باہر بھی چلی جاتی۔ مگر اسے اروِن کی باتوں سے گھٹن کا احساس ہوتا اور بنرجی کی طرف وہ خود کو آپ ہی آپ کھنچتا ہوا محسوس کرتی۔ وہ ان کی قابلیت اور ذہانت سے بے حد متاثر تھی۔ موٹے موٹے شیشوں کے پیچھے جھانکتی ذہین اور سیاہ آنکھیں اسے بہت پیاری لگتیں جنھیں وہ گھنٹوں تکا کرتی۔ وہ بھی اس کے ساتھ بہت مہربانی سے پیش آتے۔ اس

کی ذہانت اور وسیع مطالعہ کی تعریف کرتے۔ انھوں نے اسے اجازت دے رکھی تھی کہ وہ جب چاہے ان کے کمرے میں اور جس موضوع پر چاہے گفتگو کر سکتی ہے۔ اگرچہ وہ باتیں زیادہ تر اپنے مضمون یا دنیا کے عام مسائل کے بارے میں ہوتیں مگر وہ حیران رہ جاتی کہ ان کے سامنے اس کی جھجک کہاں چلی جاتی ہے۔ وہ کس طرح ان کے سامنے بے تکان بولتی ہے، ان سے بحث کرتی ہے اور کبھی کبھی لڑ پڑتی ہے۔ اور وہ کس نرمی اور پیار سے اس کو سمجھاتے تھے۔

اس نے ایم اے میں یونیورسٹی بھر میں ٹاپ کیا تھا۔ یہ سن کر مسز ایڈون بے حد خوش ہوئی تھیں اور بنرجی بھی ۔۔۔ مگر اروِن! وہ کچھ زیادہ خوش نہ ہوا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ تھرڈ ڈویژن پاس ہوا تھا۔ بنرجی نے اسے مشورہ دیا تھا کہ اس کو باہر جا کر تعلیم حاصل کرنا چاہیے اور اس کو داخلہ اور اسکالرشپ دلوانے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ تین سال کے لیے وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے باہر جا رہے تھے۔ مگر مسز ایڈون کی خواہش تھی کہ وہ شادی کرے اور اس کے لیے اروِن سے زیادہ موزوں لڑکا ان کے خیال میں اور کوئی نہیں تھا۔ خوبصورت، کھاتا پیتا، اچھے خاندان کا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اس کو جی جان سے چاہنے والا۔ کیا کرے وہ اسی کشمکش میں تھی کہ مسز ایڈون چند دن بیمار رہ کر چل بسیں اور وہ اکیلی رہ گئی۔ مسز ایڈون جو اس کی دوست تھیں، محبوب تھیں، محافظ تھیں اور کیا نہیں تھیں؟ ان کے جانے سے اسے لگا تھا کہ دنیا خالی ہو گئی، مگر اروِن کی دل جوئی اور محبت نے اس کو زندہ رکھا اور جب اس نے اسے آفر کیا تو وہ انکار نہ کر سکی۔

شادی کے بعد چند دن تو اسے محسوس ہوا کہ زندگی میں سوائے محبت، پیار، آرام، سکون کے کچھ اور ہے ہی نہیں۔ اروِن کو اپنا کر اس نے سب کچھ پا لیا۔ مگر ۔۔۔ ایک دن اسے بنرجی کے خط سے یہ اطلاع ملی کہ اس کا داخلہ ہو گیا ہے اور اسکالرشپ بھی مل گیا تو اسے اپنے ہاتھ کی لکیر پہ

یقین سا ہونے لگا۔ شام کو یہ خبر اس نے جب اروِن کو سنائی "یونیورسٹی میں میرا داخلہ ہو گیا ۔ ۔ ۔ ۔ "

"داخلہ کس کا کہاں ؟" اس نے وہسکی کا بڑا سا گھونٹ لیتے ہوئے کہا تھا۔

۔ "میرا اروِن، میرا۔ میں باہر جا کر پڑھنا چاہتی ہوں نا۔"

"گولی مارو پڑھائی کو ۔ ۔ ۔ ۔ داخلے کو ۔ ۔ ۔ آؤ میری جان آؤ میری باہوں میں آجاؤ" اور یہ کہہ کر اس نے اس پر لاتعداد بوسوں کی بارش کر دی تھی "شوبھی ڈارلنگ تم میری ہو صرف میری اور ۔ ۔ ۔ ۔ " وہ بہت پی گیا تھا۔

صبح جب اس نے پھر اروِن سے اس کا ذکر کیا تو اس نے سختی سے اس کی مخالفت کی اور اس خیال کو چھوڑ دینے کا حکم دیا تھا۔ اس دن وہ دن بھر روتی رہی اور شام کو اس نے بنرجی کا خط پھاڑ دیا۔

اس کے بعد سے اس پر عجب بے دلی اور بے حسی کی کیفیت طاری رہتی اور جب بھی بنرجی کا کوئی خط آتا وہ اسے بغیر پڑھے پھاڑ ڈالتی۔

اروِن اس کا بہت خیال رکھتا۔ اکثر شامیں وہ باہر گزارتے کبھی کوئی پارٹی، کبھی فلم، کبھی ڈنر، وہ بہت چاؤ سے اس کا تعارف کرتا "مائی وائف"۔ دفتر سے ایک دو دفعہ فون کر کے اس کی خیریت پوچھتا۔ ہر ہفتہ اسے بازار لے جا کر شاپنگ کراتا جہاں سے وہ بغیر سوچے الم غلم چیزیں اٹھا لاتی۔

کبھی کبھی اروِن دکھی ہو کر اس سے پوچھتا "کیا بات ہے ڈارلنگ ؟ کیا تم خوش نہیں ہو ؟"

"نہیں تو اروِن" وہ مختصر سا جواب دیتی۔

"تمہارا یہ کھویا کھویا انداز، یہ اداس آنکھیں، یہ بے دلی بے زاری، آخر یہ سب کیا ہے تمہیں کیا تکلیف ہے ؟"

اس کا دل چاہتا کہ اروِن سے کہے "اروِن تم جن چیزوں سے مجھے خوش کرنا چاہتے ہو کسی انسان کو خوش کرنے کے لیے وہ کافی نہیں ہیں۔ تم مجھے ایک گڑیا سمجھتے ہو اپنے دل کا بہلاوا، تم کبھی یہ کیوں نہیں سوچتے کہ آخر میں بھی انسان ہوں میرے پاس بھی دل ہے، دماغ ہے، میری پسند و ناپسند ہے۔ تم کو کتابوں سے نفرت ہے تمہیں میرا کام کرنا بُرا لگتا ہے تم پڑھنے سے چڑھتے ہو کسی سنجیدہ موضوع پر نہ بات کرتے ہو نہ سنتے ہو۔ اروِن مجھے تمہاری باتیں، تمہارا ماحول، تمہارا پیار سب سطحی مصنوعی اور کھوکھلا لگتا ہے مگر وہ یہ سب کچھ صرف سوچتی رہ جاتی اور اروِن جھنجھلا کر چلا جاتا۔

اور پھر ان کے درمیان دوری پیدا ہونے لگی جو وقت کے ساتھ بڑھتی رہی۔ اب اروِن کبھی جھنجھلایا، خفا اور بیزار نظر آتا۔ وہ خود کو مجرم سمجھتی جس کی وجہ سے اس کی زندگی میں نہ خوشی ہے نہ اطمینان۔ وہ اب اکیلے ہی باہر چلا جاتا رات گئے واپس آتا۔ اس وقت وہ مطالعہ میں غرق ہوتی۔ وہ چپکے سے لیمپ بجھاتا، اس کی طرف سے کروٹ لیتا اور سو جاتا۔ اور وہ خود ؟ اس کے پاس نوجین کی مند سونے کا شعور بھی نہ رہا تھا۔

ایک دن شام کو وہ ریکارڈ پلیئر پر کوئی ریکارڈ سن رہی تھی کہ اروِن بپھرا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے آتے ہی چیخنا شروع کر دیا "تو اب نوبت یہاں تک پہنچ گئی اب ان بدمعاش سے چھپ چھپ کر خط و کتابت بھی ہونے لگی" وہ کچھ نہ سمجھ سکی کہ اروِن کیا کہہ رہا ہے "یہ کیا ہے" اس نے چند پرزے اس کی طرف پھینکے جو کمرے میں چاروں طرف بکھر گئے۔

"اروِن میں نے تو ان خطوں کو پڑھا بھی نہیں"

"تم نے کہا اور میں نے یقین کیا۔ اب بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کرو۔ میں تمہاری چال سمجھ گیا ہوں۔ مگر اب اس کی ضرورت نہیں۔ تم جہاں اور جس کے پاس جانا چاہتی ہو چلی جاؤ۔ اب میں اپنے گھر میں تم کو ایک منٹ برداشت نہیں کر سکتا۔"

شاید اروِن آخری جملہ نہ کہتا تو وہ اسے منا لیتی، اس کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کرتی۔ مگر آخری جملے نے اس

کی زبان بالکل بند کر دی اور وہ مسز اپنے دن کے گھسے آگئی اور دیر تک اپنی قسمت کی لکیر کو دیکھتی رہی۔

اس نے مقامی کالج میں پڑھانے کی ملازمت کر لی تھی ایک دن کالج سے باہر نکلی تو دیکھا بنرجی کار میں بیٹھے ہیں۔ وہ نظر بچا کر نکلنا چاہتی تھی کہ انھوں نے اسے روک لیا اور وہ ان کے ساتھ کار میں بیٹھ گئی۔

بنرجی نے ایک دفعہ اسے پھر زندگی سے پیار کرنے کا حوصلہ دیا، کچھ کرنے پر اکسایا۔ ان سے مل کر اسے محسوس ہوا کہ وہ اکیلی نہیں ہے۔ وہ روز شام کو آجاتے اور دونوں گھنٹوں دنیا بھر کی باتیں کرتے رہتے یہاں تک کہ نوکر آکر ان کو یاد دلاتا کہ کھانے کا وقت ہو گیا ہے۔ وہ چلے جاتے۔ اور وہ ان کا تصور لیے سو جاتی اور صبح اس امید کے ساتھ اٹھتی کہ شام کو بنرجی سے ملے گی۔

چند دن سے اس نے یہ محسوس کیا تھا جیسے بنرجی اسے اپنے سے قریب کر لینا چاہتے ہیں، اتنا قریب کہ وہ گھبرا جاتی۔ وہ اب اس سے باہر جانے کی فرمائش بھی کرتے مگر وہ ٹال جاتی۔ انھوں نے اس سے شملہ ساتھ چلنے کو بھی کہا تھا جہاں وہ اپنی کتاب کے لیے جانے والے تھے۔ اس کا ساتھ جانا اس لیے ضروری تھا کہ اس سے ان کو انسپریشن ملتا تھا۔ مگر اس نے سختی سے انکار کر دیا۔ آخر وہ کس حیثیت سے ان کے ساتھ جا۔

روز رات کو وہ اسے وہاں سے فون کرتے اس کی خوبصورت اور پیاری آواز سننے کے لیے۔ اور وہ خوشی سے پھولی نہ سماتی۔ شام سے ہی فون کا انتظار کرنے بیٹھ جاتی۔ انھوں نے اپنی کتاب اس کے نام ان الفاظ میں معنون کی تھی "اس خوشی کے نام جو مجھ سے گریزاں ہے۔" اور پھر اس نے دل کڑا کر کے ان کو سب کچھ بتا دیا، سب کہہ دیا۔ وہ اب ان کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ وہ ان کی ہونا چاہتی ہے۔ انھیں اپنا کہنا چاہتی ہے۔

کال بیل کی آواز نے اسے خیالات کی دنیا سے باہر لا پھینکا۔ شاید ان کا خط ہو۔ اف کن الفاظ میں انھوں نے اس کے خط کا جواب دیا ہوگا۔ وہ کتنے خوش ہوئے ہوں گے۔ فون پر تو صرف اتنا ہی کہا تھا: "میں آج ابھی ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ تمھارے خط کا جواب دے دیا ہے۔ تمھیں آج ہی مل جائے گا۔"

"میم صاحب چٹھی۔"

اس نے خط نوکر سے جھپٹ لیا۔ دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھوں سے اس نے خط کھولا۔ . . . "شوبھی! مائی لو ۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی تمھارا خط ملا۔ تم اتنے دقیانوسی انداز سے سوچو گی مجھے امید نہیں تھی۔ اور یہ بتاؤ کیا اب ہم ایک نہیں ہیں۔ کیا میں تمھیں جی جان سے نہیں چاہتا ہوں۔ شوبھی ڈارلنگ! تم ہی تو میری تنہا ویران زندگی میں ایک روشن منارہ ہو۔ میری زندگی میں وہی لمحے پُر مسرت اور پُر سکون ہوتے ہیں جو میں تمھارے ساتھ گزارتا ہوں۔ ہمارے درمیان جو آرٹسٹک رشتہ ہے اس کو دقیانوسی، ٹپیکل، بے رنگ بندھنوں میں باندھنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا یہ کافی نہیں ہے کہ ہم چند گھنٹے ایک ساتھ مل کر گزاریں۔ زندگی کی ساری تلخیاں، سارے ٹینشنز (TENSIONS) کو بھلا کر بہت کافی ہے اور یہی سب کچھ ہے۔ . .

اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ اسے لگا وہ جگنو جو بہت مشکل سے اس کی گرفت میں آیا تھا، وہ بھی اڑ گیا اور اب اس میں اس کے پیچھے دوڑنے کی سکت بھی نہیں ہے۔ وہ گھور اندھیرے میں کھڑی ہے، تھکی ہوئی تشنہ لب، برہنہ پا . . . .

اس نے اپنے ہاتھ کی لکیر دیکھی۔ وہ بہت خوش قسمت ہے۔ وہ لکیر دیکھتی رہی، دیکھتی رہی نہ جانے کب تک ! . . . . ایسے لگا جیسے وہ دھندلی ہو رہی ہو اور پھر —— وہ دھندلی ہوتے ہوتے غائب ہو گئی۔

★



حرمت الاکرام

دھڑکنوں میں بسی ہے تنہائی ساز دل چھیڑتی ہے تنہائی
اترا جاتا ہے دل میں سناٹا درد کی بانسری ہے تنہائی
دن ڈھلے آئے شام کی ڈولی راستہ دیکھتی ہے تنہائی
قمقموں کے اتر گئے چہرے بام و در میں سجی ہے تنہائی
کیسے پوچھوں بتائے گی بھی کیا کیوں سرہانے کھڑی ہے تنہائی
کاٹ لو رات کیوں زباں کھولو وقت کی سہ لگی ہے تنہائی
بات کرتی ہے صورتِ محبوب ہمہ تن جاگتی ہے تنہائی
جاگ اٹھتی ہے روحِ خوابیدہ رات کی زندگی ہے تنہائی
جسم سے ہے لگا ہوا سایہ ساتھ دل کے لگی ہے تنہائی
گھر سے نکلوں تو کس طرف جاؤں راہ روکے کھڑی ہے تنہائی
قربتیں ہیں کہ آستیں کی چھری یہ بھی اک قسم کی ہے تنہائی
راہزن بن گیا اک اک لمحہ مجھ سے ڈھہ کر لٹی ہے تنہائی
خوابِ امروز کا ہوں آئینہ میرا منہ دیکھتی ہے تنہائی
رابطوں نے بنائی ہے زنجیر جاں بجاں پل رہی ہے تنہائی
میری ہی طرح دیر سے حرمتؔ
جانے کیا سوچتی ہے تنہائی

نومبر ۱۹۷۰ء

شوکت پردیسی

چاروں طرف فضا میں اداسی بکھر گئی
تم کیا گئے کہ رونقِ شام و سحر گئی

میرا سلامِ شوق انھیں ہو گیا قبول!
نظروں کی احتیاط بڑا کام کر گئی

جب کچھ نہ بن پڑا تو یہ عذرِ شکستِ شوق
کوتاہیٔ عمل بھی مقدّر کے سر گئی

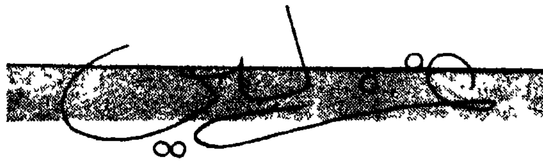
ناکام آرزو بھی بہت کامیاب تھی
کچھ دیر تو حیات کو آسودہ کر گئی

تھا جسم سے بلند مرا مرتبہ مگر
جب بھی کوئی نگاہ اٹھی جسم پر گئی

اٹھی تھی ایک موج ترے التفات کی
وہ بھی سرشکِ درد سے دامن کو بھر گئی

اوروں کا عیب سب کے گناتے پھرے مگر
خود اپنی خامیوں پہ نہ شوکتؔ نظر گئی

کارتک ۱۸۹۲ اشک



غلام مرتضیٰ راہی

نظر آتا ہوں، لیکن بے نشاں ہوں
اگر دیکھو تو میں بھی آسماں ہوں

اٹھایا ہے سوال اک ایسا میں نے
کہ خود میں بھی شریکِ امتحاں ہوں

مری شہرت کا اندازہ بھی کیا ہو
وہ پرچا ہوں کہ اپنے درمیاں ہوں

حقیقت کو مری محسوس کر لے
زباں پر آگیا تو داستاں ہوں

ابھی کچھ دیر پہلے میں یہیں تھا
مگر اس وقت میں جانے کہاں ہوں

مری تصویر کا اک اور رُخ ہے
کہ میں قطرہ ہوں لیکن بیکراں ہوں

بکھرتا جا رہا ہوں ہر قدم پر
میں اپنی کوششوں سے رائیگاں ہوں

بندھا لیتا ہوں ڈھارس تیرے جی کو
مگر اپنی طبیعت پر گراں ہوں

نصیر پرواز

ڈھکیل یاس کی غاروں میں کوہسار مجھے
میں آسماں ہوں زمیں پر ذرا اتار مجھے
یہاں حباب کے لمحے گنے نہیں جاتے
یہ خواہشوں کا نگر ہے یہاں نہ مار مجھے
یہ آئینہ مرے چہرے کو اور دھندلا دے
کسی طرح تو کرے کوئی شرمسار مجھے
بہت وسیع ہے محرومیوں کی انگنائی
اگر میں دور رہوں چیخ کر پکار مجھے
وہ حسن کے واسطے معصومیت کا دریا
اسی نظر نے کیا بارہا شکار مجھے
میں تیرا نام جو لوں گا حیات مہکے گی
رکھے گی ساتھ ہر اک گام پر بہار مجھے
ہر ایک شخص مجھے پائمال کر کے گیا
ہر ایک شخص سمجھتا تھا ہوشیار مجھے
جو ساتھ لائے ترے دستِ یار کی خوشبو
کوئی کرے اسی پتھر سے سنگسار مجھے
مرے یقیں مرے احساس کو جواں رکھا
بہت ہے عمر گزاراں یہ اعتبار مجھے
تری شکست میں اک تمکنت کا نور سہی
مگر خدا کے لیے اس طرح نہ ہار مجھے
اداس آنکھوں میں ٹھنڈی سی روشنی بھر کر
کبھی تو اشک کی مانند ہی ابھار مجھے
میں اپنے چہرے کی زردی پہ رو اٹھا پرواز
ہوا بکھیر چلی جیسے اک غبار مجھے

★

بشیر فاروقی

تذکرہ میں ترے اک نام یونہی جوڑ دیا
دوستوں نے مجھے شیشے کی طرح توڑ دیا

اب تو آجائیں مجھے چھوڑ کے جانے والے
میں نے خوابوں کے دریچوں کو کھلا چھوڑ دیا

زندگی نکلی تھی ہر غم کا مداوا کرنے
چند چہروں نے خیالات کا رخ موڑ دیا

عمر بھر اب تو وہ دھڑکے گا زمانے والو
تم نے سینے میں جو غم دل کی طرح چھوڑ دیا

قدرداں قیمتِ بازار سے آگے نہ بڑھے
فن کی دہلیز پہ فنکار نے دم توڑ دیا

یوں تو رسوائے زمانہ سہی لیکن اس نے
میرے ساتھ آ کے روایات کا رخ موڑ دیا

اس چمن میں بھی تمہیں چین میسر نہ ہوا
جس چمن کے لیے تم نے یہ چمن چھوڑ دیا

میں مسافر نہیں آوارۂ منزل ہوں بشیر
گردشِ وقت نے یہ دیکھ کے دم توڑ دیا

عالموں اور دانشوروں کو اعزازی اسناد

احمد رضا

جشنِ آزادی ۱۵ اگست ۱۹۷۲ء کے موقع پر صدر جمہوریہ ہند نے سنسکرت، عربی اور فارسی کے جن عالموں کو اعزازی سندیں دی ہیں ان میں مولانا امتیاز علی عرشی اور ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی کو بالترتیب عربی اور فارسی کے لیے یہ اعزازی اسناد دیے گئے ہیں۔ مولانا عرشی عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں کے ممتاز عالم ہیں وہ اپنے وطن رام پور میں علمی کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ ڈاکٹر عابدی دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کے صدر اور ماہر ادبیات تسلیم کیے جاتے ہیں۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن کو یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے اعزازی لکچرر (اردو) مقرر کیا ہے۔ شبلی کالج سے سبکدوش ہونے کے بعد آپ دارالمصنفین اعظم گڑھ سے وابستہ ہو گئے اور وہیں علمی اور تحقیقی کاموں میں مشغول ہیں

ایڈیٹر

امتیاز علی عرشی

مولانا امتیاز علی خاں عرشی اردو، عربی اور فارسی کے ایک متبحر عالم اور جید ادیب ہیں۔ ان کو علومِ مشرقیات کی چلتی پھرتی انسائیکلوپیڈیا کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ آپ کی بیش بہا ادبی خدمات اور علمی کارناموں کو پورے برصغیر میں شرفِ قبولیت کا درجہ مل چکا ہے۔ آپ کی پیدائش ۱۹۰۴ء میں رامپور (یو پی) میں ہوئی اور ابتدائی تعلیم مدرسہ مطلع العلوم، رامپور اور اس کے بعد اورینٹل کالج لاہور اور اورینٹل کالج، رامپور میں حاصل کی۔ آپ برسوں سے رضا لائبریری، رامپور کے لائبریرین ہیں۔ یہ لائبریری ہندستان میں اپنی نوعیت کی واحد لائبریری ہے جس میں مشرقی علوم اور اسلامیات سے متعلق ہاتھ کے لکھے ہوئے پندرہ ہزار سے زائد نادر مسودات موجود ہیں۔ مولانا عرشی اب تک ۴۰ کتابیں اور تقریباً سو تحقیقی مضامین لکھ چکے ہیں۔

آپ کو ۱۹۶۱ء میں دیوان عالب (نقوشِ عرشی) مرتب کرنے پر ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ دیا گیا۔ ۱۹۶۵ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم سابق نائب صدر جمہوریہ ہند نے آپ کی ادبی خدمات کے صلے میں "نذرِ عرشی" پیش کیا۔ سالِ رواں میں آزادی کی پچیسویں سالگرہ کے موقع پر ملک کے جن آٹھ مشہور و معروف ادیبوں کو صدر جمہوریہ ہند کی جانب سے اعزازی سند دی گئی ہے ان میں مولانا عرشی بھی ہیں۔ آپ نے غیر ممالک میں بھی مستشرقین کی کانفرنسوں میں ہندستان کی متعدد بار نمائندگی کی ہے۔

مولانا نیاز فتحپوری نے نگار بابتہ مارچ ۱۹۴۳ء میں مولانا عرشی کے بارے میں اپنے مخصوص انداز میں یہ لکھا تھا: "مولویوں کے طبقے میں مولانا عرشی کی واحد ذات ایسی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو اپنی محبت سے مجھے کافر بنا سکتے ہیں چاہے اس کفر کا نام ان کے یہاں اسلام ہی کیوں نہ ہو۔" اسلامیات اور عربی کے بین الاقوامی شہرت یافتہ عالم مسٹر منٹگمری واٹ جو اس وقت ایڈنبرا یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر ہیں۔ مولانا عرشی کی علمیت کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں

"یہ ایڈیٹر اپنی تحلیقات میں اتنی جانفشانی اور دیدہ ریزی سے کام لیتا ہے کہ یورپین ادیب اس سے متاثر بلکہ حیرت زدہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم فرماتے ہیں" مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ان کے متعدد تصنیفی کارنامے علمی اور ادبی حلقوں سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ پچھلے ۲۵۔۳۰ برس میں انھوں نے جو تحقیقی اور تنقیدی کام کیا ہے اس سے جہاں ہماری زبان کے خزانے میں بیش بہا اضافہ ہوا، وہیں ہمارے لکھنے والوں کو رہنمائی بھی ملی ہے کئی قیمتی اور قابل قدر کتابیں محض انھیں کی کوشش اور ذوقِ جستجو کی بدولت پہلی مرتبہ منظر عام پر آئی ہیں کئی پرانی کتابوں کو انھوں نے اپنے حسن ترتیب سے نئی زندگی بخش دی ہے خاص طور پر متنوں کے تحشیہ و تدوین کا جو بلند معیار انہوں نے قائم کیا ہے وہ کسی زبان کے لیے بھی باعث فخر ہو سکتا ہے۔"

سید امیر حسن عابدی

پروفیسر سید امیر حسن عابدی فارسی کے ایک مستند عالم اور بلند پایہ ادیب ہیں جو اپنے ادبی کارناموں کے لیے ہندستان کے علاوہ ایران میں بھی داد تحسین پا چکے ہیں۔ آپ یکم جولائی ۱۹۲۱ء کو غازی پور (یو پی)



میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم لکھنؤ اور وارانسی میں پائی۔ اس کے بعد سینٹ جانس کالج آگرہ میں داخلہ لیا اور آگرہ یونیورسٹی سے فارسی میں فرسٹ ڈویژن فرسٹ پوزیشن میں ایم۔ اے کیا۔ اسی یونیورسٹی نے آپ کو پی۔ ایچ۔ ڈی (فارسی) کی ڈگری دی۔ ۱۹۵۵ء میں آپ اعلی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ایران تشریف لے گئے اور تہران یونیورسٹی سے بھی پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی ۱۹۵۹ء اور ۱۹۶۰ء کے درمیان ایک فارسی ادبی رسالہ بھی آپ کے زیر نگرانی شائع ہوا۔ ۱۹۶۹ء میں ہند فارسی ادب کی تاریخ کا مواد جمع کرنے کے لیے کابل یونیورسٹی کے مہمان کی حیثیت سے آپ افغانستان بھی گئے۔ آپ ہندستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے فارسی اور عربی سے متعلق مشاورتی بورڈ کے ممبر رہیں۔ ۱۹۷۱ء میں ماہر ایرانیات کی ورلڈ کانگریس میں شرکت کرنے کے لیے آپ پھر ایران گئے۔ آزادی کی پچیسویں سالگرہ کے موقع پر آپ کو ادبی خدمات کے صلہ میں ہندستان کے صدر کی جانب سے اعزازی سرٹیفکیٹ دیا گیا ہے۔ عابدی صاحب کی اب تک سات کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور بہت سے تحقیقی مقالے ہندستان اور غیر ممالک کے متعدد رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ بیاد ورکی قلمی اعانت بھی عابدی صاحب فرماتے رہتے ہیں۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی اسکیم کے تحت دہلی یونیورسٹی نے آپ کی مزید تین کتابوں کو شائع کرنے کے لیے سفارش کی ہے۔

اس وقت عابدی صاحب دہلی یونیورسٹی میں فارسی اور عربی شعبے کے صدر ہیں۔

سید صباح الدین عبد الرحمان

سید صباح الدین عبد الرحمان ایم۔ اے بلند پایہ کے محقق اور مصنف ہیں۔ سید صاحب کے تحقیقی اور علمی کارہائے نمایاں کو اردو ادب میں ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ آپ دیسنہ ضلع پٹنہ (بہار) میں ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم پٹنہ اور علی گڑھ میں پائی۔ ۱۹۳۵ء میں ہی دار المصنفین شبلی اکیڈمی میں آگئے۔ درس و تدریس اور پڑھنے پڑھانے اور لکھنے میں موصوف کو ایسی لذت ملیں کہ اسی کو اپنی زندگی کا مشغلہ بنا لیا۔ چنانچہ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء تک شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ میں معلمی کے فرائض انجام دیتے رہے۔ اور کالج سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی کہیں اور جانا پسند نہ کیا۔ بلکہ دار المصنفین شبلی اکیڈمی میں ہی علمی، ادبی اور تحقیقی پیاس

(باقی صفحہ ۲۹ پر)

مثنوی کے چند اہم کردار

★ قاضی عبید الرحمان ہاشمی

کردار کے بغیر کسی کہانی کا تصور کرنا محال ہے۔ کہانی میں کردار بنیادی حیثیت رکھتا ہے جس طرح کوئی کہانی خلا میں جنم نہیں لے سکتی اسی طرح کردار کی شمولیت کے بغیر کسی کہانی کا وجود تقریباً ناممکن ہے۔ کہانی اپنی تکمیل کے لیے بھی کردار کی محتاج ہوتی ہے۔ اس کی نوعیت جو بھی ہو اور جس مقصد کے لیے بھی لکھی گئی ہو اس میں کردار جز و لازم کی حیثیت سے موجود ہوتا ہے بلکہ سچ تو یہ ہے کہ کہانی بیشتر کرداروں ہی کو پیش کرنے کے لیے لکھی جاتی ہے اس کے مختلف عناصر ترکیبی مثلاً جذبات۔ مکالمہ وغیرہ کردار کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرتے ہیں۔ اس کے ذہن اور اس کی زندگی کے نقوش کو اجاگر کرتے ہیں جس کے سبب کہانی زیادہ جاندار اور دلچسپ ہوجاتی ہے۔ کردار کے لیے یہ بات ضروری ہے کہ وہ کہانی میں جس مقام و منصب کی نمائندگی کرتا ہو اس میں وہ اپنی بے پناہ صلاحیتیں صرف کر سکتا ہے اور یہ ثابت کر سکتا ہو کہ وہ مذکورہ منصب کا حقدار تھا۔ کردار جامد بھی ہو سکتے ہیں اور ٹھوس بھی فعال بھی ہو سکتے ہیں اور غیر فعال بھی البتہ ظاہر ہے کہ چونکہ وہ حقیقی زندگی ہی کے نمایندہ ہو کر ایک تخئیلی سطح حیات پر ابھرتے ہیں اس لیئے ان کے اعمال کے مطابق ہی ہم ان پر کوئی حکم صادر کرتے ہیں اور ان کے اعمال سے ہم پر وہی ردِّ عمل اور کیفیات ظاہر ہوتی ہیں جن کا ہم واقعی اور اصلی زندگی میں ہر آن تجربہ کرتے ہیں۔ اب اگر یہ کردار کہانی میں فعالیت کا مظاہرہ کرتے ہیں تو ہم ان سے زیادہ محظوظ ہوتے ہیں لیکن اگر وہ بودے پن اور انفعالیت کا مظاہرہ کرتے ہیں تو ہمیں کبھی کبھی ان سے نفرت اور بعض اوقات ان کی ذات سے ہمدردی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس تناظر میں ہم ذیل کے تین کرداروں کا مطالعہ پیش کریں گے۔

(۱) سحر البیان میں وزیر زادی نجم النساء (۲) گلزار نسیم میں تاج الملوک اور (۳) زہر عشق میں مہ جبیں سحر البیان میں نجم النساء کی صحیح حیثیت کا تعین و اعتراف دونوں اس وقت تک محال ہوگا جب تک ہمارے سامنے تقابل و تضاد کے واسطے دوسرے کردار موجود نہ ہوں اس لیے کہ نجم النساء مجموعی طور پر انھیں کرداروں کے درمیان رہ کر ہم سے اپنی ہستی کا اعتراف کراتی ہے۔

ابتدا میں اس مثنوی میں بادشاہ کا کردار سامنے آتا ہے جس کے تصور سے ہم فطری طور پر اپنے ذہن میں بہت ساری امیدیں قائم کر لیتے ہیں لیکن وہ ہماری کسی بھی توقع کا زیادہ عرصے تک ساتھ دینے کی اپنے اندر سکت نہیں رکھتا۔ اس کی ذات ہر لمحہ تضادات کو جنم دیتی رہتی ہے اور بالآخر وہ زندگی کے کھوکھلے پن سے مجبور ہو کر اور بار حزن کی تاب نہ لا کر داستان کی افق سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو جاتا ہے۔

دوسرے ہی لمحے ہم مثنوی کے مرکزی کردار شاہزادہ بے نظیر سے متعارف ہوتے ہیں۔ اس کردار کی تخلیق میں مصنف کا عیش و آدرشی مزاج اس حد تک آزادی کا مظاہرہ کرتا ہے کہ یہ کردار حقیقت و واقعیت سے بہت دور چلا جاتا ہے۔ حد یہ ہے کہ اس پر حقیقت کا التباس تک نہیں ہوتا۔ اس کی نسوانیت اور نسائی حسن اس کے لیے ایک ایسا دام فریب بن جاتا ہے کہ وہ اسی میں گھٹ گھٹ کر فنا ہو جاتا ہے ممکن ہے کہ بے نظیر کے کردار میں اس درجہ انجماد اور انفعالیت اس معاشرتی اور تہذیبی روبہ زوال کا پیدا کردہ ہوس کے تحت آصف الدولہ کے سماج میں منفی صفات ایک نقطۂ محوری بن کر ابھری تھیں۔ کم و بیش انھیں صفات سے اس کی محبوبہ بدر منیر کا بھی

کردار عبارت ہے جو زندگی میں موجود روحانی خلا کو جنسی اتصال کی لذت ہی سے پر کرنے میں اپنی ساری صلاحیتیں صرف کرنا سب سے بڑا فن تصور کرتی ہے۔

ان کرداروں کے روحانی جمود کے سبب جب قاری خود کو ایک کابوس میں گھر جانے کا تجربہ کر رہا ہوتا ہے اس وقت اچانک نجم النسار کا "قیامت سر یہ چہرہ" اسے ایک غیر معمولی فرحت بخش تجربے سے دوچار کر دیتا ہے ؎

تھی ہمراہ اک اس کے دخت وزیر　　نہایت حسین اور قیامت شریر
رسن تھی ستارا سی وہ دلربا　　سے لوگ کہتے تھے نجم النسار

نجم النسار کی ذات وہ ذات ہے جو پہلی بار ایسی جولانی طبیعت کا مظاہرہ کر کے داستانوی سحر طلمات کے پیدا کردہ سکوت کو توڑنے کی سزاوار ہوتی ہے اور ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک مانوس، زندہ اور زندگی کی رعنائیوں سے معمور جہان میں سانس لے رہے ہیں۔ نجم النسار اپنے اعمال سے اس روحانی خلا کو بھی پر کرنا چاہتی ہے جو ماگیر دارانہ تہذیب کے پروردہ کرداروں کی زندگیوں کو رنگ آلود کرنے پر آمادہ ہے لیکن شاید ان کی بے حسی اور بے دلی اس درجہ بڑھ چکی ہے جو خود اس کے بھی ختم کرنے سے ختم نہیں ہو سکتی، اس کی ایک تصویر ملاحظہ ہو ؎

انھوں کے رکے بیٹھنے سے جفا　　ہوئی دل میں اپنے وہ نجم النسا
گلابی کو لا اس کے آگے دھرا　　پیالے کو پھر جلد اس سے بھرا
کہا شاہزادی کو مٹھی سے کیا　　یہ پیالہ تو اس بت کے منھ سے لگا

نجم النسار کی ذات اس وقت اور بھی زیادہ دلربا اور دلکش ہو جاتی ہے جب وہ اپنی سہیلی بدر منیر کے آلام کو کم کرنے کے لیے اپنی وفا شعاری اور جرأت کا مظاہرہ کر کے جوگن کا روپ دھار لیتی ہے اور بے نظیر کی جستجو میں صحرا نوردی اس کا مقدر ہو جاتی ہے ؎

سنا جبکہ نجم النسار نے یہ حال　　ہوئی بیقراری تب اس کو کمال
لگی کہنے وہ یوں نہ آنسو بہا　　ترے واسطے میں لے اب دکھ سہا
بس اب سر بہ صحرا نکلتی ہوں میں　　اسے ڈھونڈ لانے کو چلتی ہوں میں
جو باقی رہا کچھ مرے دم میں دم　　تو پھر آ کے یہ دیکھتی ہوں قدم
وگر مر گئی تو بلا سے موئی　　تو یوں جانیو تجھ پہ صدقے ہوئی

اس کردار میں ہمیں صرف تحرک ہی کا پتہ نہیں چلتا بلکہ اس روح کا بھی سراغ ملتا ہے جو ساز عشق پر محو ماتم ہے اور اس کے دل کش نغمے فضا میں بکھر جاتے ہیں۔ فیروز بخت ایک مری مخلوق ہونے کے باوجود اس ساز طرب سے ابلنے والے نغموں سے سرشار نظر آتا ہے ؎

کبھی خوش کیا اور کیا گہہ اداس　　کبھی دور بیٹھی کبھی آ کے پاس
کبھی منہ چھپا یا دکھایا کبھی　　کبھی مار ڈالا جلایا کبھی

ہمارے دل پر نجم النسار کے کردار کا نقش ہر لحظہ گہرا ہوتا رہتا ہے خصوصاً اس لیے بھی کہ اس کی ذات اس ماحول میں بھی اپنے فرائض سے تغافل نہیں برتتی جس میں زندگی کی ساری اقدار یکے بعد دیگرے ریزہ ریزہ ہو چکی ہیں اور جہاں ہر اصول اور نظم و ضبط کو جذبے کی صلیب پر آویزاں کر دیا جاتا ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف خود نجم النسار کی زبانی اگرچہ زیب نہیں دیتا لیکن چونکہ اس کے اعمال بھی اس کا ثبوت فراہم کرتے ہیں اس لیے اس کے اعتراف کی اہمیت بڑھ جاتی ہے ؎

میں نجم النسا اس کی دخت وزیر　　ہمیشہ سے ہمراز تھی اور مشیر
جدا ایک دم اس سے ہوتی نہ تھی　　سلانے بغیر اس کو سوتی نہ تھی
خوشی سے رہ کار عیش و فراغ　　برنگ چمن رہتی تھی باغ باغ

آخر میں اس امر کا اعتراف ضروری ہے کہ نجم النسار کے کردار کی گہرائی اور اس کا ذہنی و روحانی اضطراب اس کی ذاتی اور انفرادی خصوصیات ہیں جو کسی بھی زمانے، ماحول اور معاشرے میں کسی بھی انسان کی ذات میں یکجا ہو سکتی ہیں البتہ ان کے داخل و اشاعت کے لیے توفیق کی ضرورت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ رہا یہ مسئلہ کہ نجم النسار بھی بعض حالات میں جنسی گرم بازاری، برہنگی اور عیش و طرب کے مواقع ڈھونڈ لیتی ہے تو یہ چیزیں اسے اپنے معاشرے سے حاصل ہوئی ہیں اور وہ خود کو ان چیزوں سے محفوظ بھی نہیں رکھ سکتی تھی اس لیے کہ کوئی بھی فرد جو ذرا بھی حساس مزاج اور ذہن رکھتا ہوگا وہ نہ تو معاشرتی سطح پر پیدا ہونے والی حقیقتوں سے آنکھیں چرا سکے گا اور نہ ہی ان کی عطا کردہ لعنتوں یا نعمتوں سے ہی وہ سبکدوش ہو سکے گا۔ میرے پیش نظر یہاں وہ غیر معمولی ہستیاں نہیں ہیں جو اپنی صلاحیت اور استقامت کو بروئے کار لا کر زمانے کے سیل کو موڑ دیتی ہیں اور خود زمانے کے نقش کو قبول کرنے کے بجائے اپنی شخصیت کے دائمی نقوش کو زمانے پر ثبت کر دیتی ہیں۔ نجم النسار کے کردار کی تمام تر خوبیاں یا خامیاں ایک مخصوص معاشرہ میں

ابھرتی ہیں اس لیے ہمیں ان کے مطالعہ میں اس تناظر کو ضرور ملحوظ رکھنا چاہیئے۔

ہمارے سامنے دوسرا کردار گلزارِ نسیم میں تاج الملوک کا ہے۔ گلزارِ نسیم میں بہت سے کردار ہیں لیکن ہماری توجہ شدت کے ساتھ اپنی طرف منعطف کرانے میں صرف دو ہی کردار کامیاب ہوتے ہیں۔ تاج الملوک اور بکاولی۔ بکاولی مصنف کی ایک عظیم اختراع ہے لیکن چونکہ وہ ماورائی دنیا سے تعلق رکھتی ہے اس لیے وہ مرئی زندگی سے مطابقت پیدا کرنے کے باوجود کبھی کبھی ہماری عقل کی حدوں سے پرے چلی جاتی ہے اس لیے اس کی اہمیت کا اعتراف کرنے کے لیے ہمیں ماورائی معیار کا سہارا لینا پڑے گا جو ظاہر ہے کہ ہمارے لیے کچھ بہت زیادہ کارآمد نہیں ہو سکتا۔ یہ مسئلہ بالکل ہی دوسری نوعیت کا حامل ہے کہ مصنف مرئی اور غیر مرئی میں اتصال کی ضرورت کیونکر محسوس کرتا ہے اور اس کا منطقی جواز بھی اس کے پاس ہے یا نہیں۔ اس کا ایک سیدھا سادا جواز ہے کہ چونکہ ہمارے داستان گویوں پر ہمیشہ خود سری کا جذبہ طاری رہتا ہے اور وہ زندگی کو کلی طور پر تخیل ہی کے آئینے میں دیکھتے تھے اس لیے انھوں نے طلسم کو حقیقت بنا کر پیش کرنے کی جسارت کی لیکن اس پیش کش میں سائنسی اور تعقلی منطق کا گزر نہیں تھا اس لیے آج وہ حقیقت مشتبہ ہو کر رہ گئی ہے اور اس میں جگہ جگہ شگاف پڑ گئے ہیں۔

گلزارِ نسیم کی کہانی ابتدا تا انتہا ایک علامتی رنگ لیے ہوئے ہے چنانچہ اس کی اصل معنویت کا انحصار ان علامتوں کی عقدہ کشائی اور تفہیم پر ہے۔ یہاں کہانی بھی علامتی نوعیت رکھتی ہے اور کردار بھی۔

تاج الملوک کہانی میں زندگی کی افتاد سے نپٹنے، آلام زمانہ سے نبرد آزما ہونے کی علامت ہے جو زندگی کے ہر مرحلے میں اپنی خداداد صلاحیتوں اور مقاومت کی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اپنے لیے حالات کو سازگار بناتا ہے اور یہ بات آخر میں واضح ہو جاتی ہے کہ عزم مسلسل اور تدبر سے انسان دنیا کی تقدیریں بدل سکتا ہے۔ تاج الملوک اپنے بڈھے بادشاہ باپ کی پانچویں اولاد ہے۔ اس کے چار بھائی جن کے نام علامتی نوعیت کے حامل ہیں (دانا، عاقل، ذکی، خردمند) اپنی صفات کی ضد ہیں جن کا ارتقا اگرچہ کہانی میں فطری انداز میں ہوتا ہے لیکن چونکہ وہ اپنی بدباطنی شرست کا بار اٹھانے کے متحمل نہیں ہو پاتے۔ اس لیے بہت جلد جلد وہ فراموش گاری کی نذر ہو جاتے ہیں اور صرف تاج الملوک کی ذات رہ سہہ کر جو ہمارے شوقِ جستجو اور شوقِ نظارہ کے سامان فراہم کرتی ہے، اس کا نام جو علامتی حیثیت رکھتا ہے بالآخر وہ خود کو صحیح معنوں میں وارث تخت و تاج ثابت کرتا ہے۔

تاج الملوک اور اس کے چار بھائیوں کے درمیان کوئی موازنہ ممکن نہیں اس لیے کہ یہ اپنی فطرت کے لحاظ سے دو زمانوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ چار بھائی اپنے باپ کے مطیع اور ایک طور پر فرسودہ حالت میں ہیں اس کے برعکس تاج الملوک نئی نسل کی نمائندگی کرتا ہے، نئے اقدارِ حیات کا پجاری ہے، شاید یہی وجہ ہے کہ اس کی پیدائش کے ساتھ ہی معاشرہ کے عتاب و سرزنش کا سلسلہ اس پر شروع ہو جاتا ہے۔ اس کو دیکھ کر باپ کا اندھا ہو جانا خود اس بات کی علامت ہے کہ لاشعوری طور پر اس کے بیٹے کے تئیں اڈیپس کامپلیکس پیدا ہو جاتا ہے اور وہ نئی روشنی کو زیادہ عرصے تک دیکھ نہیں سکتا۔

پیارا ہے یہ دہی کہ دیکھ اسی کو
پھر دیکھ نہ سکے گا کسی کو

باپ کے اندر اس (COMPLEX) کا خاتمہ اس وقت ہوتا ہے جب بالآخر تاج الملوک ہی اس کے لیے گل بکاولی کو فراہم کرنے کا سبب بنتا ہے جس سے اس کی آنکھیں روشن ہوتی ہیں۔

تاج الملوک ماحول و معاشرہ کے جبر سے صحیح ردعمل قبول کرتا ہے اور مصائب اس کے لیے ایک حقیقی رہبر بن جاتے ہیں۔ وہ اپنے مقصدِ حیات کے حصول کی تمنا کو سینے سے لگائے زندگی کی مختلف منزلوں سے گزرتا ہوا اصل منزل تک پہنچتا ہے۔

تاج الملوک کو اصل مقصد سے سروکار ہے چنانچہ وہ خود اپنی ذات میں مستور تاریکیِ نفس تک کی مزاحمت کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ ارم کے ڈانڈے پر پہنچ کر دیو کو زیر کرنے کی علامتی حیثیت یہی ہے کہ وہ خود اپنے آپ سے نبرد آزما ہوتا ہے چنانچہ یہی دیو (تاریک نفس) اپنی بے بسی کا اعتراف کر کے اس کی رہبری کرنے لگتا ہے

پیارا ہے مرا یہ آدمی زاد — رکھیو اسے جس طرح مری یاد
انساں ہے جاہے جو کچھ سازش — مہماں ہے کیجیو نوازش

تاج الملوک باغ ارم میں پہنچ کر بالآخر گل بکاولی کو توڑ لیتا ہے۔ یہ

گل بکاولی خود بکاولی کی نرگسیت کی علامت بن جاتا ہے جس کی حفاظت بکاولی بڑے خلوص سے کرتی ہے۔ اس کا حسن و شباب اور رعنائی ایک ایسے پھول کی علامت ہے جو ابھی ناکتخدا ہے۔ اس پھول کی چوری سے مراد بکاولی کا وہ جنسی شعور ہے جو اب ایک غیر جنس کی موجودگی میں اچانک بیدار ہو گیا ہے۔ پھول کے غائب ہو جانے کے بعد بکاولی جو آہ و بکا کرتی ہے وہ اس کے احساس گناہ کے ساتھ اس کی لذت کی بھی غمازی کرتا ہے جو نرگسیت کے خاتمے کے وقت ایک فطری چیز ہے۔ البتہ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ نرگسیت کے جانے کا عمل بیک وقت دونوں میں ہو رہا ہے۔ خود تاج الملوک بھی نرگسیت سے اسی وقت ابھرتا ہے جب وہ پہلی بار ایک مخالف جنس سے اتصال کی لذت حاصل کرتا ہے اور اس جنسی فعل کی علامت خود بکاولی کی انگشتری ہے جسے وہ چلتے وقت بدل لیتا ہے۔

تاج الملوک کی زندگی سے کشمکش زمانہ اس طرح چمٹا ہوا ہے جو کسی طرح اس سے الگ ہونے کے لیے تیار نہیں۔ ہزار مصیبت اٹھا کر وہ اس قابل ہوا تھا کہ اسے پھول کی مدد سے اپنے باپ کی آنکھیں روشن کرے لیکن اس کے صبر و ضبط کا امتحان اس وقت ہوتا ہے جب اس کے بھائی بڑی جسارت اور بیدردی کے ساتھ اس سے پھول چھین لیتے ہیں جو اگرچہ ایک سانحہ ہے لیکن یہی چیز اس کے استقلال اور جد و جہد کو مستحکم کرنے میں معاون ہوتی ہے، وہ اس وقت کا انتظار کرتا ہے جب حقیقت خود بخود اس کے باپ پر روشن ہو جاتی ہے اور وہ اپنے باپ کا محبوب نظر بن جاتا ہے یعنی جو EDIPUS COMPLEX اس کے تحت الشعور میں تاج الملوک کے لیے ابتدا میں بیدار ہوا تھا۔ وہ اختتام پذیر ہوتا ہے

مسند سے شہ اٹھ کے بے محابا
بولا بیٹے سے جان و اسماں
روشن کیا دیدۂ پدر کو
مادر کے بھی چل کے آنسو پونچھو

تاج الملوک زندگی کی جراحتوں کے درمیان تلملا اٹھنے کے بجائے مسکراتا ہے وہ ہر نئی مصیبت کو اس انداز سے گلے لگاتا ہے گویا یہ چیزیں اس کا سرمایہ ناز ہیں۔ تاج الملوک کی زندگی میں ہمیں ایک وفادار بیوی اور بہادر عاشق کا بھی سراغ ملتا ہے یہاں پہنچ کر یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ عشق ہی پر شباب کی تکمیل کا انحصار ہے اور خود شخصیت بھی اپنی ارتقا کے لیے محتاج عشق ہے، ہمیں اس کے عشق میں ایک طرح کی طہارت کا احساس ہوتا ہے۔ بکاولی جس کا سراپا وہ پہلے دیکھ چکا ہوتا ہے اس کے جلوۂ صد رنگ کا نقشہ اس طرح پیش کرتا ہے؟

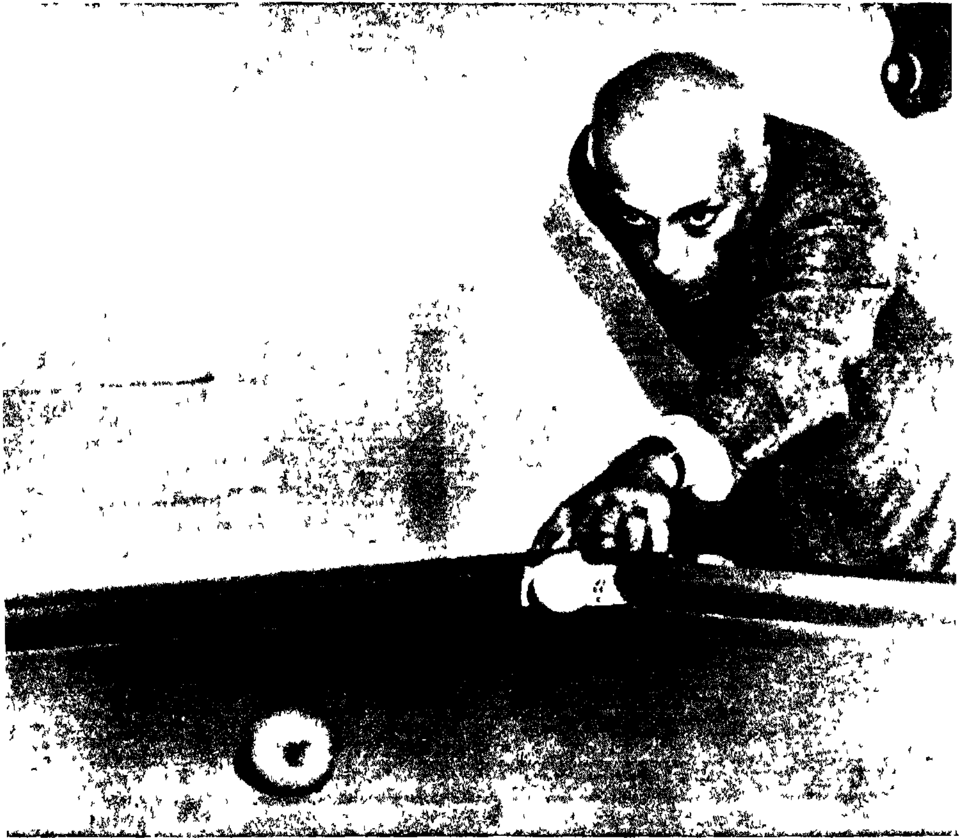
تجھ سے مری خاطر اب کہاں جمع تو شیشۂ شعلہ میں رگ شمع
تو جوشش یم میں نور بے پر میں نقش قدم تو باد صرصر

تاج الملوک کی شخصیت میں ہم جوئی کا بھی عنصر خاصا توانا ہے البتہ مصنف اس کے کردار میں جگہ جگہ غیر واقعیت کے بھی رنگ بھرنے میں کامیاب ہوا ہے۔ وہ اسی تخت کو جس پر بکاولی بیٹھی ہوئی ہے پیچھے سے پکڑ کر ماورائی دنیا کا اس انداز میں سفر کرتا ہے کہ خود بکاولی تک کو خبر نہیں ہوتی۔ اسے ہم مصنف کے حسن بیان پر محمول کر سکتے ہیں ورنہ تاج الملوک بھی اس قسم کا دعویٰ نہیں کرتا۔

تاج الملوک ایک وفا شعار شوہر کی بھی صفات اپنے کردار میں رکھتا ہے جس کا ثبوت وہ جا بجا اپنے اعمال سے فراہم کرتا رہتا ہے چنانچہ جب وہ ہزار افتاد سے گزر کر اس طلسمی بت خانے تک پہنچتا ہے جہاں بکاولی مقید ہے تو وہ اپنے ہمسفر کے حال زار کو دیکھ کر بے قرار ہو جاتا ہے

صدقے وہ بشر ہوا پری کے قدموں پہ گرا بکاولی کے
پاؤں اس کے چھوے تو چونک سی کر آنسو چھوڑے گھبرا اٹھا ہے

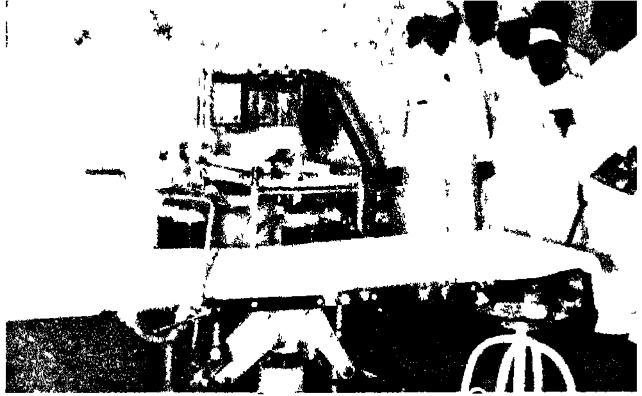
تاج الملوک کی بکاولی کے ساتھ وفا شعاری کا بھرم صرف حیات تک محدود نہیں ہے اس کا سلسلہ حیات و موت دونوں پر محیط ہے یہاں تک کہ جب وہ فنا کے گھاٹ اتر چکی ہوتی ہے اور دوبارہ دہقان کے گھر میں جنم لیتی ہے (یہ آواگون RE-INCARNATION) ہندو عقیدہ کا جزو ہے اور یہاں اس کی بھی علامتی حیثیت ایک خاص معنویت رکھتی ہے چونکہ دونوں کرداروں کو روح کا سفر درپیش ہے لہٰذا اس کی تطہیر ناگزیر تھی اور یہ اسی طرح ممکن تھا کہ جب زمین کا باشندہ تمام اذیتوں کو برداشت کرنے کے بعد ماورائی دنیا تک پہنچتا اور خود بکاولی کے لیے بھی ضرور تھا کہ وہ فنا ہو کر دوبارہ حیات میں آتی اور اب اس کا وجود غیر مرئی مخلوق کی حیثیت سے ہوتا اسی وقت دونوں کا جسمانی اور روحانی اتصال ممکن تھا)، اس وقت تک تاج الملوک اس کا انتظار گوارا کرتا ہے



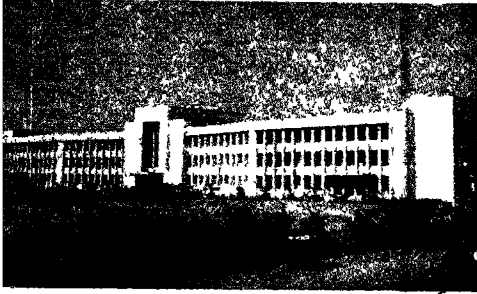
بچوں کے چاچا نہرو بلیرڈ کھیلتے ہوئے

پنڈت نہرو کھیل کود اور ورزش پر ہمیشہ بڑا زور دیتے تھے اور نہ صرف بچوں کو ہمیشہ
اس کی نصیحت کرتے تھے بلکہ اپنی بے پناہ مصروفیتوں کے باوجود خود بھی اس کے لیے تھوڑا
بہت وقت نکال لیا کرتے تھے اوپر کی تصویر اس کی بین مثال ہے

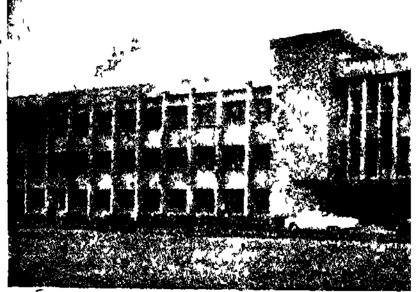
یوپی کی ترقی



کینسر انسٹی ٹیوٹ۔ کان پور جس کا افتتاح وزیراعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا تھا



گنیش شنکر ودیارتھی میڈیکل کالج۔ کان پور



ڈیکل کالج میرٹھ

کے آئینے



سنٹرل ڈرگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ
چھتر منزل لکھنؤ

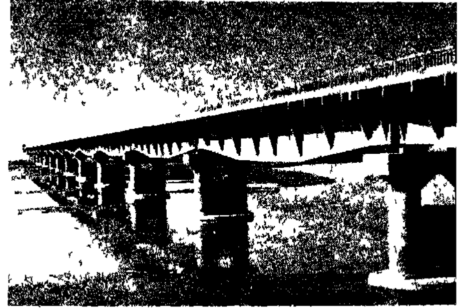
یوپی کی ترقی



وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی ۸ر دسمبر ۱۹۶۸ء کو ضلع بہرائچ میں گھاگرا کے پل کا افتتاح کر رہی ہیں۔

گنگا کا پل، گڈھ مکتیشور۔ میرٹھ





شاردا برج۔ لکھیم پور کھیری

کے آئینے

رشی کیش۔ بدری ناتھ سڑک پر نقل و حمل کا بندوبست



اترا کھنڈ میں موٹر سڑک۔ ضلع۔ پتھوڑا گڈھ



یوپی کی ترقی کے آئینے



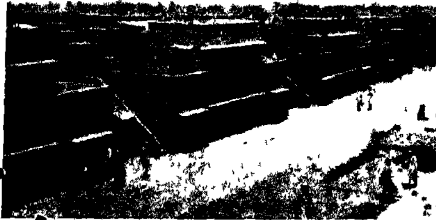


وزیراعلیٰ شری چندر بھان گپت ۲۳ دسمبر ۱۹۶۹ء کو لکھنؤ میں ریاستی آرکائیوز کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھ رہے ہیں (بائیں) اس عمارت کے ماڈل ملاس کی تصویر

وزیراعلیٰ شری کملاپتی ترپاٹھی ہند-پاک جنگ میں کام آنے والے جوانوں کے خاندانوں کے لیے تہذیب گھر کا افتتاح کر رہے ہیں



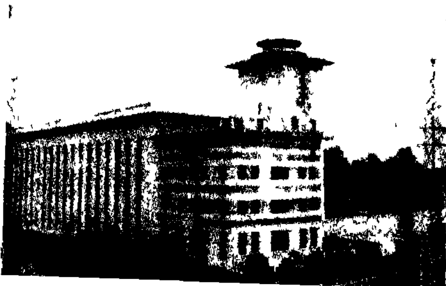
ایٹی بایوٹک کارخانہ۔ ضلع دہرہ دون



مزدور بستی۔ کانپور

دیہاتوں کے لیے پینے کے پانی کی اسکیم مرزاپور

شاردا بجلی گھر کھٹیما (نینی تال)





جاں ہوئی ان نگاہوں کو بے خار   سیر شب بدلت و صبح رخسار

ظاہر ہے کہ یہاں مصنف اپنے عقیدے کے مطابق تاج الملوک جو ایک مسلم کردار ہے اسے ایک ایسے رنگ میں پیش کرتا ہے جو صریحاً ناممکنات میں سے ہے، اس سے الگ بھی اس کی کیا ضمانت کہ یہ عقیدہ نقل کی بھی گرفت میں آسکتا ہے۔ اس سے اگر یہاں محض تاج الملوک اور بکاؤلی کی زبردست ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کا اظہار مقصود ہے تب تو اس کے گرد پھیلا ہوا اصلاحی خاکہ یقیناً بامعنی ہوجاتا ہے ورنہ کچھ عجیب سا لگتا ہے۔

زہر عشق میں مہ جبیں کا کردار اپنی فعالیت کے لیے یادگار ہوکر رہ گیا ہے۔ زہر عشق نام بجائے خود اس مثنوی کے موضوع اور مواد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ عشق کا فی بدنام زمانہ لفظ ہے البتہ اس پر ہر زمانے میں ایک مخصوص نقاب ڈال دیا جاتا ہے جس کے تحت اس کا اصلی روپ ہماری نظروں سے اوجھل ہوجاتا ہے۔ شاید پہلی بار اس مثنوی میں مرزا شوق نے اس گھونگھٹ کو چہرۂ عشق سے سرکانے کا فریضہ انجام دیا ہے۔ یہ فعل بذات خود مبتذل سہی اور عشق و عاشقی کا تصور جس پیمانے پر زہر عشق میں پیش کیا گیا ہے وہ تھوڑا سا غیر سنجیدہ سہی لیکن یہی داستان عشق اور کار نقاب کشائی ایک طور پر مصنف کی عظمت کا بھی ثبوت فراہم کرتا ہے، مصنف کے پیش نظر یہاں ہمیں ایک حقیقت کی واقعیت کا احساس دلانا ہے اور یہ دکھانا مقصود ہے کہ عشق بجائے خود اپنی اصلی شکل میں کن کن گوشوں سے ابھرتا ہے اور اس کا اظہار کیوں کر ہوتا ہے۔ یہاں نہ علمیت کی گرم بازاری ہے نہ طلسماتی گورکھ دھندے ہیں اور نہ ہی یہاں قاری کی تشکیک کسی جاتی ہیں۔ جو کچھ ہے واضح ہے، بین السطور کچھ بھی نہیں ہے۔ حق تو یہ ہے کہ یہی اس مثنوی کی خوبی بھی ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی خامی بھی ہے کہ وہ بالواسطہ کم سے کم ہے اور براہ راست بہت زیادہ۔

یہاں ابتدا میں (SENSUOUS NESS) ہے اور تدریجاً (SENSUALITY —) فروغ پانے لگتی ہے۔ مرد کا کردار خود مرزا شوق کی ذات بھی ہو سکتی ہے جو لکھنوی سماج کے پیدا کردہ سارے جراثیم سے معمور ہے۔ یہ ذات مستی و مسرت کی متلاشی اور صرف صحبت ہی کو زندگی کا سب سے بڑا انعام تصور کرتی ہے جس میں تخلیقی فعالیت کا سراغ نہیں ملتا۔ اس طور پر اس کا کردار اپنے اندر جاذبیت کے بھی آثار کم رکھتا ہے۔

طلائی (مہ جبیں) اس مثنوی کا دراصل وہ مرکزی نکتہ ہے جہاں ساری رعنائیاں سمٹ آئی ہیں۔ مہ جبیں بھی لکھنوی سماج ہی کا عطیہ ہے لیکن اس کی شخصیت پر جو نقوش اس تہذیب نے ابھارے ہیں وہ ان نقوش سے مختلف ہیں جو مرد کے کردار پر ثبت ہوئے ہیں۔ مرد کے کردار میں جبیں کے کردار میں جذبے اور وفور شوق کی ایک عجیب و غریب مماثلت پائی جاتی ہے لیکن مرزا شوق جو مرد کا کردار پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنی حیوانیت کے بار تلے دب کر بالکل کچل چکے ہیں اور ان کے اندر فعالیت اور توانائی اب۔ اس قدر بھی باقی نہیں ہے کہ وہ کاروبار عاشقی کا بھی فریضہ صحیح معنوں میں انجام دے سکیں لیکن مہ جبیں کا دل امنگوں اور آرزوؤں کا ایک ایسا سرچشمہ ہے جو ہمہ وقت ابلتا رہتا ہے۔ وہ پہلی ہی نظر میں دلبری اور دلداری کی منزلوں سے گزر جاتی ہے، یہ بات غیر فطری بھی نہیں ہے ایسے واقعات عورت کو بھی پیش آسکتے ہیں اور مرد کو بھی البتہ اس میں چند اور بھی اسباب ہو سکتے ہیں مثلاً کہ برٹرینڈ رسل کو کالج کی زندگی میں داخل ہونے کے ساتھ ہی ایک نظر ایک لڑکی سے عشق ہوگیا جو ظاہر ہے کہ برٹرینڈ رسل کی ہمسری اور برابری کی مدعی نہیں ہو سکتی تھی۔ یعنی ایک معمولی لڑکی تھی، وہ کسی بھی عظیم ترین لڑکی سے عشق کر سکتے تھے لیکن ایسا محسوس کیا جاتا ہے کہ چونکہ وہ ایک عرصہ تک کیتھولک مذہب کے رسم و رواج اور زنجیر جاتی چہار دیواری میں اس طرح جکڑے رہے کہ انھیں اپنی جنسی خود شعوری کا کبھی احساس بھی نہ ہو سکا اسی لیے اس حصار سے نکلنے کے بعد انھیں پہلی بار میں جو لڑکی نظر آئی اسے انھوں نے منتخب کر لیا، ممکن ہے کہ اس قسم کے کچھ معاملات مہ جبیں کے ساتھ بھی ہوئے ہوں۔ اس سماج میں عموماً رسم عاشقی کے بعض ایسے مطالبات رہے ہیں جو اتنی آزاد روی کے متحمل نہیں ہو سکے۔ عورت مرد بھی اس معاشرتی اصول کے تابع ہیں چنانچہ جب تھوڑی سی باگ دور ڈھیلی ہوتی ہے تو عام انسانوں کا ذہنی ردعمل سامنے آجاتا ہے اس کی سب سے دلچسپ مثال خود مہ جبیں کی ذات ہے ؎

موج الفت اسے ڈبونے لگی   ایک الجھن سی دل کو ہونے لگی

محبوب کے نام خط کی تحریر ملاحظہ ہو ؎

اس محبت پہ ہو خدا کی مار   جس نے یوں کر دیا مجھے ناچار
اب کوئی اس سے کیا ذلیل کرے   جس کو چاہے خدا ذلیل کرے

اس پیش روی کا خیال کر کے مہ جبیں پر حجاب بھی ہوتی ہے اور عشق کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ جواز بھی تراشنے پڑتے ہیں ؎

تم پہ میں مرتی کیا قیامت تھی   کیا مرے دشمنوں کی شامت تھی
مجھ کو ایسی تھی تیری کیا پرواہ   بام پر تو بلا سے آ کہ نہ آ

لیکن یہ باتیں محض رسمی ہیں ان میں کسی احساس گناہ کی قطعاً جھلک نہیں ملتی اس لیے کہ ؎

ہوئے اس گل سے ڈال کے اقرار   اٹھ گئی درمیاں سے سب تکرار
جو کہا تھا ادا کیا اس نے   وعدہ اک دن وفا کیا اس نے

مہ جبیں کی ذات درد عشق سے عبارت ہے جو عشق ہی کی پروردہ ہے اور بالآخر عشق ہی کی صلیب پر چڑھ جاتی ہے یہاں طہارت اور پارسائی عشق کے تابع ہے جو زندگی کی ہر قدر سے افضل ہے مہ جبیں کا یہ خیال کہ ؎

گو کہ عشقی میں رو سیاہ چلی
لیکن اپنی سی میں نباہ چلی

نصف حقیقت ہے اور نصف فسانہ ہے اس لیے کہ اسے معلوم ہے کہ عشق انسانی فطرت کا حقیقی اور جائز مطالبہ ہے لیکن چونکہ اس کے اظہار پر ہمیشہ کچھ پابندیاں رہی ہیں جس سے مہ جبیں کی بھی ذات آزاد ہے اس لئے وہ اپنی پیش قدمی کو گناہ کے مترادف سمجھتی ہے لیکن عشق چونکہ اس کی ہستی کا تقاضا ہے اور اس کا سب سے بڑا سہارا ہے اس لیے وہ خلوص دل سے اسی میں یقین رکھتی ہے اور بقیہ باتیں اس کے نزدیک ضمنی اہمیت کی حامل ہیں اس کی ذات نشۂ عشق سے سرشار ہے جس کے واگذاشت کی بہار اسے یہیں مل پا رہی ہے ؎

حسرت دل تھوڑی باقی ہے
اور یہاں رات تھوڑی باقی ہے

مہ جبیں سوز عشق میں جل مرنے ہی میں یقین رکھتی ہے جیسا کہ اسے اس بات کا شدید غم ہے کہ زمانے نے اسے لذت عشق سے صحیح معنوں میں سرشار ہونے نہیں دیا اور موت کا کھٹکا اس کے لیے اس راہ میں سب سے بڑا دکھ آزار اور سد راہ بن گیا ؎

حائے حسرت سرائے فانی ہے   مورد مرگ نوجوانی ہے

ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے   یہی دنیا کا کارخانہ ہے
پھل اٹھایا نہ زندگانی کا   نہ لیا کچھ مزا جوانی کا
دل میں لے کر تمہاری یاد چلے   باغ عالم سے نامراد چلے

اس پر نامرادی کے سائے کابوس کی مانند چھا جاتے ہیں اور اسے ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ ابھی چند لمحات میں وہ عشق کے اس جاں گسل اور خود سوز شعلوں میں جل کر اپنے وجود کا شیرازہ منتشر کرے گی۔ اس خیال سے وہ محبوب کو دعوت دیتی ہے ؎

پھر کہاں ہم کہاں یہ صحبت یار   کر لو پھر ہم کو بھینچ بھینچ کے پیار

اور کبھی کہتی ہے ؎

لہر پھر چڑھ رہی ہے کالوں کی
بو سنگھا دو تم اپنے بالوں کی

زندگی کے آخری لمحے میں اس کے کردار میں زندگی کی وہ اعلیٰ صفات یکجا ہو جاتی ہیں جو اسے حیات دوام بخشتی ہیں یہاں اس کی ذات ان خصوصیات سے معمور نظر آتی ہے جو اپنے اندر ایک آفاقی شان لیے ہوئے نظر آتی ہے مہ جبیں اپنے جن قلبی واردات کا اظہار کرتی ہے وہ صرف اس کی انفرادی شخصیت پر محیط نہیں بلکہ آفاقی مزاج کا ایک جزو ہے ؎

ضبط کرنا اگر ملال رہے   میری رسوائی کا خیال رہے
کہے دیتی ہوں جی نہ کھونا تم   ساتھ تابوت کے نہ رونا تم
میری میت کا دھیان رکھیے گا   بند اپنی زبان رکھیے گا
تذکرہ کچھ نہ کیجیے گا مرا   نام منہ سے نہ لیجیے گا مرا
آپ کاندھا نہ دیجیے گا مجھے   سب میں رسوا نہ کیجیے گا مجھے
ذکر سن کر مرا نہ رو دینا   میری عزت نہ یوں ڈبو دینا

ان اشعار کے ذریعے مہ جبیں کے کردار کی جو تصویر بنتی ہے وہ اپنے اندر ایک عجب بانکپن لیے ہوئے ہے مشرقی تہذیب کے خمیر سے تعمیر کی گئی مہ جبیں کی ذات جس دلکش معصومیت اور خلوص کی ملی جلی شان سے آراستہ ہے اس کی عکاسی صفحۂ قرطاس پر ممکن نہیں۔ مہ جبیں کا کردار ایسے عشق سے عبارت ہے جو پہلے تو زندگی کو حرارت بخشتا ہے پھر اسے خاک و خون میں لت پت کر دیتا ہے۔





مظہر امام

زندگی بن کے دلہن آج کرکے سنگار آئی ہے　　چھیڑتی عشرت فردا کا ستار آئی ہے
دل کی خوابیدہ امنگوں پہ بہار آئی ہے　　ہائے کیا شان ہے کیا رنگ جوبن آرائی ہے

جیسے دوشیزۂ تخیل کا آنچل ڈھلکے
جس طرح ساقی جذبات کا ساغر چھلکے

موسمِ حسن پراگندہ نقاب آیا ہے　　اپنی سانسوں میں لیے بوئے گلاب آیا ہے
اپنے ہونٹوں میں لیے رنگ شباب آیا ہے　　دل کے خاموش سوالوں کا جواب آیا ہے

آج ہر گام پہ جنت کا گماں ہوتا ہے
غم بھی دنیا میں ہو احساس کہاں ہوتا ہے

زندگی حسنِ فراواں کا پتہ دیتی ہو　　سرخی رنگ بہاراں کا پتہ دیتی ہے
مستیِ رقصِ غزالاں کا پتہ دیتی ہو　　سرفرازی گلستاں کا پتہ دیتی ہے

جشن آزادی بھارت کے کنول کھلتے ہیں
وقت وہ ہے کہ مہ و مہر گلے ملتے ہیں

مطرب دل ہے بانداز طرب نغمہ فشاں　　نشۂ شوق میں ہے جو رنگار امکاں
ہو رہا ہے مرے اشعار کی سرخی سے عیاں　　خون بن کر رگ ہر لفظ میں صہبا ہے رواں

نغمہ گردش کی رفتار ہوئی جاتی ہے
روح پازیب کی جھنکار ہوئی جاتی ہے

عارضِ وقت پہ ہے غازۂ رنگینیِ حال　　حسن امروز میں پوشیدہ ہے فردا کا جلال
میری نظموں کی جوانی، مری غزلوں کا جمال　　تم پہ قرباں مرے پیارے وطن کے سو سال

مہر آزادی بھارت کی ضیا اور بڑھے
عزم جمہور کی بیباک ادا اور بڑھے

زندگی خواب بھی ہے، عالم بیداری بھی ہے　　قد و گیسو بھی ہے یہ اور رسن دار بھی ہے
نغمۂ تار بھی ہے، روح کی للکار بھی ہے　　رزم میں ساز بھی ہے، بزم میں تلوار بھی ہے

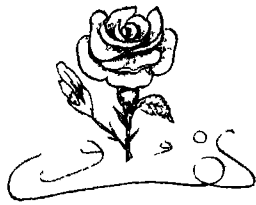
روپ بھی ہے یہی دنیا، یہی سروپ بھی ہے
یہ گھنا سایہ بھی ہے اور کڑی دھوپ بھی ہے

اپنے کردار کی قندیل جلانا ہے ہمیں　　نقش ٹھہری ہوئی ظلمت کا مٹانا ہے ہمیں
اپنے اس ملک کو فردوس بنانا ہے ہمیں　　دور منزل سہی لیکن وہیں جانا ہے ہمیں

عزم منزل بھی، شعور رہ منزل بھی ہے
عقل تنہا نہیں اب ساتھ بہاں دل بھی ہے

ہو مبارک ہمیں پچیس برس کا یہ سفر　　اپنی راہوں میں بکھیرا گہر و خورشید و قمر
سرخ کچھ اور ہوئے نخل تمنا کے ثمر　　اے زمیں اور اگل اور اگل لعل و گہر

اے وطن اپنے ترکی عظمت کا نشاں آزادی
جشن کا دن ہو کہ ہے آج جواں آزادی



رونقِ گنگ و جمن تھا نہرو
جلوۂ صبح وطن تھا نہرو

جانِ ہر سرو و سمن تھا نہرو
زینتِ صحنِ چمن تھا نہرو

تو کہے لعلِ یمن تھا نہرو
میں کہوں درِ عدن تھا نہرو

عزتِ آدمِ عہدِ حاضر
عظمتِ اہلِ وطن تھا نہرو

ایک پیغامبرِ امن و سلام
مہرِ الفت کی کرن تھا نہرو

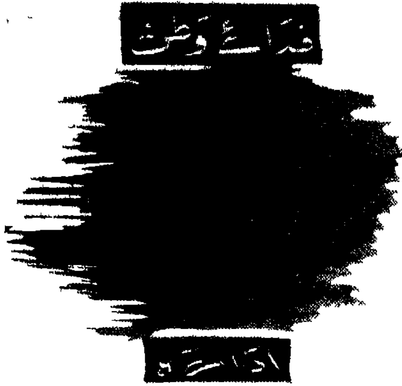
متفق سب ہیں وہ دشمن ہو کہ دوست
پاک دل، پاک چلن تھا نہرو

اے قمر یاد رکھے گی دنیا
اک یقیں، ایک لگن تھا نہرو



● یہ بات بڑی عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ ہندستان جیسا امن اور عدم تشدد کا حامی ملک ایک پستول کو عزت بخشے لیکن ہندستان آج جس پستول کو عزت و احترام سے نواز رہا ہے وہ تشدد کے ارتکاب کا کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ چندر شیکھر آزاد سے وابستہ ہو کر اس محب وطن انقلابی کے ہاتھ میں یہ پستول مادرِ وطن کی قربان گاہ پر عبادت کا ایک وسیلہ اور برطانوی سامراج کے استحصال اور ظلم و تشدد کے خلاف ہندستان کے احتجاج کی ایک علامت بن گیا۔ لہٰذا یہ امر چنداں تعجب خیز نہیں ہے کہ ایک ممنون قوم اس محب وطن اور اس کے پستول کو اس موقع پر یاد کرے جب وہ اپنی آزادی کی ۴۵ ویں سالگرہ منا رہی ہو اور ان تمام جاں نثاروں کو ہدیۂ ادب و احترام پیش کر رہی ہے جنھوں نے اس مقصد کے پیش نظر اپنی جانیں قربان کر دیں کہ ان کے بچے عزت و وقار کے ساتھ زندہ رہیں اور آزاد وطن کی فضا میں سانس لے سکیں۔

آزاد اپنے نام ہی کی طرح ملک کے آسمان انقلاب پر ایک آزاد فرد کی



حیثیت سے عرصہ دراز تک تابندہ رہے۔ انھوں نے ۱۹۲۱ء سے جب انھیں مہاتما گاندھی کی تحریک عدم تعاون میں حصہ لینے کی پاداش میں ۱۵ تازیانوں کی سزا ملی تھی ایک طویل راستہ طے کیا۔ وہ ۱۹۲۳ء تک انقلابی تحریک کی طرف مائل ہو گئے اور جلد ہی وہ اس تحریک کے روح رواں ہو گئے۔

آٹھ سال کی طویل مدت تک آزاد نے ہر قدم پر برطانوی سامراج کی طاقت کو للکارا اور پھر بھی پولیس ان کو گرفتار کرنے میں ناکام رہی۔ اس عرصہ میں انھوں نے نہ صرف ۱۹۲۵ء میں کاکوری ڈکیتی کیس میں نمایاں حصہ لیا بلکہ ہندستان سوشلسٹ ری پبلیکن آرمی کے پرچم تلے سردار بھگت سنگھ کے ساتھ انقلابی تحریک کو از سر نو منظم کیا اور اس کے کپتان کی حیثیت سے اس کے تمام بڑے اور دلیرانہ کارناموں سے وابستہ رہے جن میں ان کا وہ کارنامہ بھی شامل ہے جب لاہور میں ۱۹۲۸ء میں پنجاب کیسری لالہ لاجپت رائے کی موت کا بدلہ لینے کے لیے بھگت سنگھ اور راج گرو کے ہاتھوں پولیس افسر سینڈرس کے ہلاک ہونے کے بعد انھوں نے پولیس ہیڈ کانسٹبل چانن سنگھ کو اس وقت گولی مار کر ہلاک کر دیا جب وہ ان کے مذکورہ بالا دونوں ساتھیوں کا تعاقب کر رہا تھا۔

آزاد نے ۱۹۲۹ء سے ماؤزر پستول کے بجائے کولٹ پستول اپنے ہاتھ میں لیا اور اس سے ہیڈ کانسٹبل چانن سنگھ کو موت کے گھاٹ اتارا۔

اس وقت سے لے کر ۱۹۳۱ء میں ان کی شہادت کے دن تک کولٹ پستول ان کا مستقل رفیق رہا۔ چنانچہ ۲۷ فروری ۱۹۳۱ء کو بھی جب آزاد کو الٰہ آباد میں الفریڈ پارک میں جو اب آزاد پارک کہلاتا ہے چاروں طرف سے ایک پولیس پارٹی نے گھیر لیا جس کی قیادت سی۔ آئی۔ ڈی کا اسپیشل سپرنٹنڈنٹ ہے۔ ایچ۔ آر ناٹ باور کر رہا تھا کولٹ پستول ان کے پاس تھا۔ پولیس کے ہتھکنڈوں کی بو پاکر آزاد نے اس سے پہلے سکھ دیو سے جس کو انھوں نے پارک میں بات چیت کے لیے بلایا تھا فرار ہو جانے کے لیے کہا تھا۔

اس کے بعد امنٹ کی بندوق کی جنگ میں اس اعلیٰ درجہ کے نشانہ باز نے اپنے پستول کو ہاتھ میں لے کر سپرنٹنڈنٹ باور اور اس کی پارٹی کو بدحواسی میں اچھالتے رہنے پر مجبور کر دیا۔ آزاد نے جام شہادت نوش کرنے سے قبل باور کی کلائی پر گولی ماردی اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ وشیشور سنگھ کا جبڑا توڑ دیا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ جب آزاد کے پاس صرف ایک گولی رہ گئی تو انھوں نے پستول اپنی کنپٹی پر رکھ کر گولی چلادی اور اس طرح کبھی انگریزوں کے ہاتھ میں نہ پڑنے کے اپنے عہد کو پورا کر دکھایا۔ ان کی نشانہ بازی کی ایسی دہشت تھی کہ کسی پولیس والے کو ان کے قریب جانے کی اس وقت بھی جرأت نہیں ہوئی جب وہ زمین پر گر پڑے اور پارٹی نے اس بات کا یقین کرنے کے لیے وہ واقعی مردہ ہو چکے ہیں اپنی تمام گولیاں ان پر خالی کر دیں۔

قدرتی طور پر آزاد کا کولٹ پستول سر ناٹ باور کے لیے ایک انعامی ٹرافی بن گیا اور وہ اس کو اپنے ساتھ انگلینڈ لے گیا۔ برطانیہ میں مقیم ہندوستانی ہائی کمشنر کے توسط سے حکومت ہند کی وزارت امور خارجہ کی مسلسل کوششوں اور اتر پردیش کے وزیر اعلیٰ شری کملاپتی ترپاٹھی کی ذاتی درخواست کے بعد سی آئی ڈی کا سابق سپرنٹنڈنٹ اس پستول کو حکومت اتر پردیش کو بطور تحفہ دینے پر رضامند ہو گیا۔ اس پستول کو واپس کرتے ہوئے باور نے الٰہ آباد میں آزاد پارک میں اس انقلابی کے مجسمہ کی تصویر کے لیے درخواست کی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آزاد کے مخالفین بھی ان کی حب الوطنی اور شجاعت و دلیری کے لیے ان کی انتہائی عزت کرتے تھے۔

یہ امر باعث مسرت ہے کہ آزادی کی ۲۵ ویں سال گرہ کے مبارک موقع پر یہ پستول ریاست کی راجدھانی میں پہنچ گیا ہے۔

علی راجپور ریاست میں (جو اس وقت وسط ہند) میں تھی اس محب وطن کی پیدائش سے پانچ سال قبل ۱۹۰۱ء میں ۳۲ بور دس راؤنڈ کا یہ آٹومیٹک پستول امریکہ میں بنایا گیا تھا جس کو اب ایک قومی خزانہ کی حیثیت سے رکھا جائے گا جو برطانوی سامراج کے خلاف ہمارے ایام جہاد کی ایک یادگار ہے اور جو ہمیں چندر شیکھر آزاد کی جاں نثاری اور بے لوث اور دلیرانہ حب الوطنی کی یاد دلاتا ہے۔



(عالموں اور دانشوروں کو اعزازی اسناد صفحہ ۲ کا بقیہ)

بڑھانے کے لیے اس سے وابستہ ہو گئے۔ آپ شبلی کالج اور شبلی اکیڈمی کو اپنی زندگی کا قیمتی سرمایہ سمجھتے ہیں۔ دیوان اشرف علی خان فغاں، بزم تیموریہ، بزم مملوکیہ، بزم صوفیہ، ہندستان کے عہد وسطیٰ کی ایک جھلک، ہندستان کے عہد وسطیٰ کا فوجی نظام، ہندستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، ہندستان کے سلاطین علما و مشائخ، ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں عہد مغلیہ مسلمان اور ہندو مورخین کی نظر میں، ہندستان امیر خسرو کی نظر میں، آپ کی مشہور تالیفات و تصنیفات ہیں۔ آج کل آپ غالب، مدح و قدح کی روشنی میں کی تصنیف میں مصروف ہیں جو ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہوگی اور دو جلدوں میں شائع ہوگی۔

آپ کو حال ہی میں یونیورسٹی گرانٹس کمیشن کی جانب سے اعزازی لکچرر (اردو) مقرر کیا گیا ہے۔ آپ کے اس اعزاز پر ادارہ ماہ دور تہنیت پیش کرتا ہے۔





شریمتی میمو بائی

"نہیں میں کبھی ریٹائر نہیں ہوں گی۔ ابھی میں نے کیا ہی کیا ہے؟ ابھی تو میرا بہت کام باقی ہے۔"

جنگ آزادی میں حصہ لینے والی بہادر خاتون شریمتی میمو بائی نے یہ بات بڑی سادگی سے کہی۔ ان کی عمر اس وقت ۸۰ برس ہے۔ حال ہی میں انھیں تامر پتر دے کر ان کی عزت افزائی کی گئی ہے۔ ملک کو آزاد کرنے کی لڑائی میں حصہ لینے والی دُبلی پتلی چھوٹے سے قد کی ہنس مکھ شریمتی میمو بائی میں کام کرنے کا اتنا ہی جوش اور لگن آج بھی ہے جو کبھی جنگ آزادی کے زمانے میں تھی۔

شریمتی میمو بائی کا جنم دلّی کے ایک معمولی خاندان میں ہوا۔ ان کی پرورش ان کے نانا کے یہاں ہوئی۔ ان دنوں تعلیم نسواں کا سوال نہیں کے برابر تھا۔ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت زیادہ تر گھر ہی پر ہوتی تھی۔ اس قدامت پرست ماحول کے باوجود ان کے نانا نے انھیں مشری اسکول میں داخل کر دیا جہاں وہ صرف تیسری جماعت تک ہی پڑھ سکیں۔

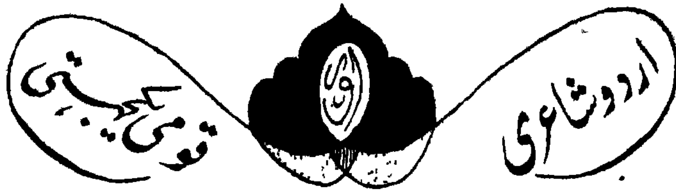
یہ پوچھنے پر کہ گھر گرہستی اور ملک کی خدمت دونوں کو وہ کس طرح بخوبی انجام دے سکیں، انھوں نے بتایا کہ ان کی شادی صرف نو برس کی عمر میں لاہور کے ایک متمول خاندان میں ہو گئی تھی لیکن بدقسمتی سے ان کی گھریلو زندگی بہت جلد ختم ہو گئی۔ صرف ۲۴ برس کی عمر میں ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا۔ بیوہ ہو جانے کے بعد وہ دلّی واپس آ گئیں۔

یہاں آکر انھوں نے اپنے بھائی شری رام پرساد کی حوصلہ افزائی کی بدولت گھر ہی میں لکھنا پڑھنا جاری رکھا اور کانگریس کی تحریک عدم تعاون میں حصہ لینے لگیں۔ "ہمارے یہاں شری رادھا رمن جی آیا کرتے تھے۔ بہن ستیہ وتی جی بھی آتی تھیں۔ میرا زیادہ تر وقت پوجا پاٹھ اور مذہبی موضوع کی کتابوں کے مطالعے میں گزرتا تھا۔ بھائی صاحب کو یہ اچھا نہیں لگتا تھا۔ ایک دن وہ بگڑ گئے اور کہنے لگے کہ دیش میں آگ لگ رہی ہے اور تم ہو کہ گھر میں بیٹھی پوجا کر رہی ہو۔" انھوں نے گزشتہ زندگی پر ایک نظر ڈالی۔ اس کے بعد انھوں نے دلّی کی دیگر خواتین کے ساتھ ۱۹۲۰ء کی لاہور کانگریس میں جانے کی خواہش ظاہر کی۔ مگر انھیں صرف اس لیے نہیں جانے دیا گیا کہ لاہور میں ان کی سسرال میں ان کی ساس موجود تھیں اور ممکن ہے وہاں ان کا خیر مقدم نہ ہوتا۔ لیکن بات ایسی نہ تھی یہ آگے چل کر معلوم ہوا انھیں دنوں نہرو خاندان سے ان کا تعارف ہوا اور دھیرے دھیرے خاندان کے افراد سے گہرے تعلقات قائم ہو گئے۔

آزادی کی تحریک اس وقت پورے زوروں پر تھی۔ جگہ جگہ غیر ملکی کپڑوں کی ہولی جلتی۔۔۔ اور قانون کی خلاف ورزی کی جاتی۔ سرکاری عمارتوں پر کانگریسی جھنڈے لہرائے جاتے تھے۔ بوا جی (شریمتی میمو بائی) اب پوری طرح سے تحریک میں شامل ہو چکی تھیں۔ اس سلسلے میں ۱۹۳۰ء میں پہلی مرتبہ انھیں جیل جانا پڑا۔ اس کے بعد جیل جانا تو روز کا معمول ہو گیا۔ ۱۹۳۰ء کے بعد۔ ۱۹۳۱ء، ۱۹۳۳ء، ۱۹۴۱ء، ۱۹۴۲ء، ۱۹۴۳ء میں وہ کئی کئی مہینے جیل میں رہیں۔ یہ اتفاق ہی کی بات ہے کہ سن بیالیس میں لاہور میں عورتوں کی جیل کے پھاٹک پر جھنڈا لہرانے کے الزام میں انھیں اسی جیل میں ٹھونس دیا گیا تھا۔ وہ ۱۵ اگست ہی کا دن تھا۔

اپنے ماضی کے اوراق پلٹتے ہوئے ان میں جوش امنڈ آیا۔ ان کا چہرہ پرانی یادوں سے چمک اٹھا، ایسا لگتا تھا جیسے ان کے سامنے ماضی مجسم ہو گیا ہے۔ بے ساختہ ان کے ہاتھ اوپر کی طرف اٹھے جیسے ابھی وہ جھنڈا لہرانے والی ہیں۔ ان کے بوڑھے ہاتھوں کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ انھوں نے زندگی میں کتنی مصیبتیں جھیلی ہیں۔ یہ سوال کرنے پر کہ تامر پتر دے کر موجودہ نسل نے ان کی قربانی اور خدمت قوم کا اعتراف کیا ہے۔ یہ تو عقیدت کا ایک چھوٹا سا پھول ہے۔ کیا اب وہ کام کاج کی ذمہ داریوں کے بوجھ سے

(باقی صفحہ ۲۲ پر)



ستاعمل ادیب

ہندستانی تہذیب کو دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں میں ایک بلند و نمایاں مقام حاصل ہے اور اس کا ارتقائی تسلسل اس کی اپنی اہم خصوصیت ہے۔ ہندستانی تہذیب کی نشو و نما، اس کے ارتقا اور اس کی بقا میں قوموں کے اشتراک، نسلوں کے اتحاد، فرقوں کی مساوات اور علاقوں کی ہم آہنگی کو بڑا دخل رہا ہے۔ مذہبی رواداری اور قومی یکجہتی کے اس عظیم کلچر کے استحکام و ارتقا میں دیگر عوامل کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب نے بھی اہم رول ادا کیا ہے

گو اردو زبان کے ماخذ، مقام پیدائش اور اس کے ادب کے آغاز کے بارے میں اختلافات بھی پائے جاتے ہیں، لیکن اس بات سے سبھی متفق ہیں کہ اردو ہندو مسلم تہذیبوں کے ارتباط ہندو اور مسلمانوں کے ایک دوسرے پر گہرے اثرات اور دونوں کی زبانوں کے اتحاد و اشتراک ہی کا نتیجہ ہے۔ اردو زبان بلا شبہ ہندستان کے مشترکہ کلچر ہی کی پیداوار ہے اور اسی لیے اس میں اشتراک، اتحاد اور قومی عناصر کا وجود شروع ہی سے ملتا ہے

ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب لکھتے ہیں "اردو کو ہندستان کی قومی یکجہتی، وطن پرستی اور انسان دوستی کے استحکام میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔" اردو نے اپنی ابتدا سے آج تک ہندستان کے قومی سنگم، حب الوطنی اور علاقہ واری، ہم آہنگی کی تشکیل و تعمیر میں ناقابل فراموش خدمت انجام دی ہے۔

اردو کے پہلے شاعر امیر خسرو (متوفی ۱۳۲۵ء) کو لیجیے۔ انھیں قومی یکجہتی اور وطن پرستی کے تعلق سے ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ ان کا کلام ہندستان کی محبت سے لبریز ہے جس میں مشترک تہذیب کے نمایاں خد و خال ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں "خسرو کے فکر کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ وہ سیاسی مخالفوں کے ساتھ سخت دشمنی کا سلوک کرتے ہیں۔ خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں لیکن اپنے ہم وطنوں کے مذہب اور مذہبی کا بلا تفریق مذہب احترام کرتے ہیں۔ ہندوؤں کے مذہب، ہندی زبان اور ہندو رسموں اور رواجوں کا بیان محض رواداری کی بنا پر نہیں بلکہ طرف دار کے نقطۂ نظر سے کرتے ہیں۔"

امیر خسرو صوفی شاعر تھے۔ اردو زبان کا صوفی لٹریچر مدہب سے زیادہ بھائی چارگی، صلح و آشتی اور انسان دوستی کا درس دیتا ہے۔ اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کو خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ ان کی اردو شاعری میں قومی یکجہتی اور انسان دوستی کے نادر نمونے ملتے ہیں۔ صوفیا کا کام بلا تفریق مذہب و فرقہ عوام کو انسانیت پیار اور خلوص و محبت کا درس دینا تھا۔ ان کے عقیدتمندوں میں سبھی مذاہب کے افراد شامل رہتے تھے۔ اس سلسلے میں خواجہ بندہ نواز، شمس العشاق، شاہ میراں جی اور ان کا خاندان، خواجۂ اجمیر، حضرت نظام الدین اولیا، حضرت شیخ فرید شکر گنج اور شیخ بہاؤ الدین باجن وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

اب اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کو لیجیے۔ ان کے یہاں قومی اتحاد اور حب الوطنی کی کئی عمدہ مثالیں

مل جاتی ہیں۔ دکن میں اُردو کی ترویج و ترقی کا ایک اہم سبب ہندو مسلم اتحاد بھی بتایا جاتا ہے۔ یہاں کے مسلم حکمرانوں کی فوجوں اور اہم دفاتر میں بہت سے ہندو بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے اور اپنی دکنی زبان جو اردو کی ابتدائی شکل تھی، استعمال کرتے تھے۔ دکن کے مسلم حکمرانوں نے دہلی سے ناتا توڑ کر اپنی الگ الگ حکومتیں قائم کر رکھی تھیں وہ حکومت، معاشرت اور زبان وغیرہ کے تعلق سے دہلی کے مقابلے میں ایک نئی طرز کو ترجیح دیتے تھے، اور اسی انفرادیت و جدت پسندی کے جذبے نے انھیں دہلی کی سرکاری زبان فارسی کے بالمقابل دکنی یا ابتدائی اُردو کے ارتقا پر اکسایا

سلطان محمد قلی قطب شاہ کے کلام میں ہندوستانی ماحول کی بھرپور عکاسی ملتی ہے اس کے کلام میں ہندوستانیت کا شدید غلبہ ہے۔ اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تیوہاروں اور شادی بیاہ کے رسم و رواج سب پر طبع آزمائی کی گئی ہے۔ اس کا کلام فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

قومی یکجہتی اور وطن دوستی کے اعتبار سے اُردو نظم میں نظیر اکبر آبادی کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ بقول کلیم الدین احمد اُردو شاعری کے آسمان پر نظیر اکبر آبادی کی ہستی تنہا ستارے کی طرح درخشاں ہے۔ قلی قطب شاہ کے بعد نظیر پہلے عوامی شاعر ہیں جنھوں نے ہندوستان، اس کے رسم و رواج، ہندوستانی تیوہاروں، ہندوستانی معاشرت اور اتحاد و یکجہتی کو تفصیل کے ساتھ اپنے کلام میں جگہ دی ہے۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر لکھتے ہیں "نظیر نے خالص ہندوستانی پہلوؤں پر زیادہ توجہ مرکوز نہیں کی بلکہ انھیں ذہنی لگاؤ اور جذباتی خلوص کے ساتھ پیش بھی کیا جس سے ان کی مذہبی رواداری اور میل ملاپ کے سچے جذبات کا اندازہ ہوتا ہے۔ نظیر کو عوامیت اور جمہوریت کا آئینہ دار کہنا غلط نہیں۔ وہ اپنے زمانے کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ایک عظیم الشان مرقع نگار تھے"

جھگڑا نہ کرے مذہب و ملت کا کوئی یاں
جس راہ میں جو آن پڑے خوش رہے ہر آں
زنار گلے میں کہ بغل بیچ ہو قرآں

عاشق تو قلندر ہے ہندو نہ مسلماں
کافر نہ صاحبِ اسلام رہے گا
آخر دہی اللہ کا اک نام رہے گا

نظیر اکبر آبادی بقول نیاز فتح پوری ایک بہت بڑے وطن پرست شاعر تھے۔ ان کے کلام میں ہندوستانی قومی اتحاد و اشتراک کے بہترین نمونے ملتے ہیں:

وہی دیکھا، وہی سمجھا وہی جانا وہی پایا
برابر ہو گئے سب ہندو مسلم گبر و نصرانی

غزل، اردو شاعری پر ہر دور، ہر زمانے میں حکمراں رہی ہے گو قدیم غزل معاملات حسن و عشق اور عاشق و معشوق تک ہی محدود رہی ہے، لیکن اس کے باوجود اس میں وطن دوستی، عوام سے دلچسپی اور انسان کے احترام اور عقیدت کے ان گنت نمونے بھی ملتے ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

تسبیح تری زلف کو کہتے ہیں اے صنم
یک تار دے کہ رشتۂ زنار کر رکھوں (ولی دکنی)

مدرسہ تھا کہ دیر تھا، کعبہ تھا یا بت خانہ تھا
ہم سبھی مہماں تھے واں، اک تو ہی صاحب خانہ تھا (درد)

ٹک دیکھ صنم خانۂ عشق آن کے اے شیخ
جوں شمعِ حرم رنگ جھمکتا ہے بتاں کا (سودا)

میر کے دین و مذہب کو پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا (میر)

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو (غالب)

گلزار نسیم کے مصنف دیا شنکر نسیم نے اپنی مثنوی کی ابتدا حمد باری سے کی ہے۔ حیدرآباد کی گنگا جمنی تہذیب کے شاعر، مہاراجہ کشن پرشاد نے رسول کریم کی شان میں ان گنت نعتیں قلم بند کی ہیں۔ دو شعر ملاحظہ کیجیے:

پیمبروں میں کوئی ایسا آفتاب نہیں
حضورِ احمدِ مختار کا جواب نہیں

زاہد کو ہے جنت کی تمنا تو مبارک
ہم کو بھی حسرت ہے کہ مل جائے یہ بیہ

منشی شنکر لال ساقی بھی جو ہر گوپال تفتہ کے بھتیجا زاد بھائی تھے ، بلا کے نعت گو تھے۔ ان کے یہاں تصوف کے اشعار کا انبار ملتا ہے:

میں اگر خاک نشینِ درِ احمد ہوں گا
رفعتِ عرش کی ہم سری ہستی ہوگی
پی گیا بھر کے جو جامِ مئے عشقِ احمد
اس کی مستی کو نہ ہرگز کبھی پستی ہوگی

مذکورہ بالا مثالوں سے واضح ہوجاتا ہے کہ ابتدا ہی سے اردو شاعری اور اردو ادب انسان دوستی ، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اتحاد و یگانگت ، امن و صلح جوئی اور وطن پرستی کی علمبردار رہی ہے

علامہ اختر علی تلہری مرحوم "انسانیت دوست ادب " میں لکھتے ہیں "ادب و شعر کا کام شانتی ، پریم کے گیت گانا اور امن و صلح کی فضا پیدا کرنا ہے اور اس طرح دنیا کو جہاں تک ممکن ہے جنت بنا دینا ہے۔ اس کا کام یہ نہیں کہ نفرت ، تشدد اور جنگ کے نعرے بلند کرتا ہے اور فتنہ و فساد کو ہوا دے کر دنیا کو جہنم بنانے کی کوشش کرے۔"

یہ صحیح ہے کہ اردو کے قدیم ادب میں قومی یکجہتی ، فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور ہندستانی وطنیت کا وہ مفہوم نہیں ملتا جو آج لیا جاتا ہے — یہ مفہوم اردو شاعری میں دہلی کی بربادی اور بادشاہی محلے کی تباہ کاری کے بعد سے واضح طور پر ملنے لگتا ہے۔ اس میں شدت ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد پیدا ہوتی ہے۔

اردو کی جدید شاعری میں حب الوطنی اور قومی اشتراک کے سلسلے میں حالی کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ملک کے مصائب کا احساس سبھی کو تھا لیکن معاشرے کی دکھتی رگ پر حالی کے سوا کوئی انگلی نہ رکھ سکا۔ حالی کی آواز وقت کی آواز تھی ، حال و مستقبل کی آواز تھی ، وہ صدا بہ صحرا نہ رہی۔ ان کی مثنوی حب وطن اپنی مثال آپ ہے۔ اس مثنوی میں انھوں نے اتفاق و اتحاد اور قومی یکجہتی کا پیغام دیا ہے اور بتایا ہے کہ اسی کی کمی کی وجہ سے ہم لوگ غلامی کا شکار ہیں:

ملک ہیں اتفاق سے آزاد / شہر ہیں اتفاق سے آباد
ہند میں اتفاق ہوتا اگر / کھاتے غیروں کی ٹھوکریں کیوں کر
قوم جب اتفاق کھو بیٹھی / اپنی پونجی سے ہاتھ دھو بیٹھی
جاگنے والے ، غافلوں کو جگاؤ / تیرنے والو ، ڈوبتوں کو بچاؤ
ہو مسلماں اس میں یا ہندو / بودھ مذہب ہو یا کہ ہو برہمو
سب کی میٹھی نگاہ سے دیکھو / سمجھو آنکھوں کی پتلیاں سب کو
ملک ہیں اتفاق سے آزاد / شہر ہیں اتفاق سے آباد

حالی جدید شاعری کے امام تھے۔ انھوں نے اپنے ہم عصروں اور بعد کے آنے والے شعرا کو بے حد متاثر کیا۔ حالی سے اس دورِ شاعری کا آغاز ہوتا ہے جس نے اقبال ، اکبر اور چکبست جیسے شاعر پیدا کیے۔

اقبال کی ابتدائی نظموں میں قومی رنگ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ اردو کی قومی نظموں میں اقبال کے "ترانۂ ہندی" اور "نیا شوالہ" کو ایک اہم اور نمایاں مقام حاصل ہے۔ ان کی قومی نظموں کے بارے میں کلیم الدین احمد لکھتے ہیں کہ "یہ نظمیں ان کے جذباتِ ذاتی کی صداقت ہیں جو جوش کے ساتھ محسوس بھی کی جاسکتی ہیں۔"

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدے کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے
پتھر کی مورتوں کو سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

اکبر طنز و مزاح کے معاملے میں واقعی اکبر و عظیم ہیں۔ انھوں نے مغربی تہذیب اور انگریزی تعلیم کی دلیرانہ مخالفت کی۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ لکھتی ہیں: "اکبر نے جدیدیت کے خلاف احتجاج

دسمبر ۱۹۹۶

تھی لیکن ان کے احتجاج کا انداز بجائے خود جدید تھا۔ اکبر نے مغربی تہذیب اور انگریزی حکومت کے زیر اثر پیدا ہونے والے تفرقے اور ابتری سے ہندستانی قوم کو متنبہ کیا اور اتحاد و یکجہتی کی ضرورت پر زور دیا۔

"ہندو و مسلم کیا ہیں دونوں یعنے یہ دونوں ایشیائی ہیں
ہم وطن ہم زباں و ہم قسمت کیوں نہ کہدوں کہ بھائی بھائی ہیں
کہتا ہوں ہندو مسلماں سے یہی اپنی اپنی روش پہ نیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دہر پانی بن جاؤ
موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

چکبست کی شاعری کا بنیادی آہنگ قوم پرستی اور سماجی اصلاح ہے۔ وہ قوم پرستی، وطن دوستی اور جدید دور کی روشنی کے شدت سے مؤید تھے:

گوتم نے آبرو دی اس معبد کہن کو سرمد نے اس زمیں پہ صدقے کیا بدن کو
اکبر نے جام الفت بخشا اس انجمن کو
سینچا لہو سے اپنے راناؔ نے اس چمن کو
سب سور بیر اپنے اس خاک میں نہاں ہیں
ٹوٹے ہوئے کھنڈر ہیں یا ان کی ہڈیاں ہیں

قومی اتحاد و فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے ذکر میں منشی درگا سہائے سرور کو بھی کبھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ان کی نظم "گلزار وطن" کا ایک بند ملاحظہ فرمایئے:

پھولوں کا کنج دلکش بھارت میں اک بنائیں
حب وطن کے پودے اس میں نئے لگائیں
اک اک گل میں پھونکیں روح شمیم وحدت
اک اک کلی کو دل کے دامن سے دیں ہوائیں
مل جل کے ہم ترانے حب وطن کے گائیں
بلبل ہیں جس چمن کے گیت اس چمن کے گائیں

سیاسی اور قومی شاعری میں ظفر علی خاں کا نام بہت نمایاں ہے۔ ملاحظہ ہو:

ناقوس سے غرض ہے نہ مطلب اذاں سے ہے
مجھ کو اگر ہے عشق تو ہندوستاں سے ہے

تہذیب ہند کا نہیں چشمہ اگر ازل
یہ موج رنگ رنگ پھر آئی کہاں سے ہے

جدید غزل کے احیاء میں حسرت موہانی کو اولیت حاصل ہے۔ ان کی غزل ادب و سیاست کا ایک حسین امتزاج ہے ملاحظہ ہو:

چمن ہے گل کے لیے اور گل چمن کے لیے وطن ہے تیرے لیے اور میں وطن کے لیے
اب آ کہ رشتۂ الفت کو استوار کریں یہ تفرقے ہیں فقط شیخ و برہمن کے لیے
یہی ہے ایک مرے دل کی آرزو حسرت
جیوں وطن کے لیے اور مروں وطن کے لیے

قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی آج کا اہم تقاضا ہے۔ اس تقاضے کو پورا کرنے میں اردو شاعری ملک کی دوسری زبانوں کے شعری ادب سے پیچھے نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو:

تیری چھاتی دھرم سمندر جس کی موجیں مسجد مندر
دونوں کی ہے گونج برابر اللہ اللہ ایشور ایشور
ماتا کو پرنام، اے ماں اے ماں تجھ کو سلام
(آرزو لکھنوی)

وطن اور قوم کی سو جان سے خدمت کرے گا یہ
خدا کی اور خدا کے حکم کی عزت کرے گا یہ
ہر اپنے اور پرائے سے سدا الفت کرے گا یہ
مرا ننھا جواں ..... ہوگا۔
(اختر شیرانی)

مذہب کچھ ہو، ہندی ہیں ہم سارے بھائی بھائی ہیں
ہندو ہیں یا مسلم ہیں یا سکھ ہیں یا عیسائی ہیں
پریم نے سب کو ایک کیا ہے پریم کے ہم متوالے ہیں
بھارت کے نام کے عاشق ہیں ہم بھارت کے شیدائی ہیں
بھارت پیارا [illegible] سب [illegible]
(اختر [illegible])

ہم دوش شیخ و برہمن اٹھے ہیں تیری گود سے
پروانۂ شمع وطن اٹھے ہیں تیری گود سے

غازی، مجاہد، صف شکن اٹھے ہیں تیری گود سے
جن کا غبارِ کارواں ہے آج حصرِ کارواں
اے کشورِ ہندوستاں اے کشورِ ہندوستاں
(روش صدیقی)

اخوت کا پھر ہاتھ میں جام لے، مساواتِ انساں کا پھر نام لے
روایاتِ ماضی سے پھر کام لے، وطن کو بنا در حقیقت وطن
زمینِ وطن، اے زمینِ وطن
(آنند رائن ملّا)

ہند میں جس کو نہیں منظور جمہوری نظام
ہند سے کیا اس کو مطلب ہند سے کیا اس کو کام

فرقہ واری سے ہے بالاتر ہماری سرزمیں
تنگ ہوگی فرقہ واری پر ہماری سرزمیں
(محشر دوم)

وقت ہے اب بھی سنبھل جاؤ بھٹکنے والو
توڑ دو تفرقہ پرستی کو
چھوڑ دو باعثِ تفریق لسانی جھگڑے
پھر مرا خواب
حقیقت میں بدل جائے گا (سلیمان ادیب)

ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب نے بجا فرمایا ہے کہ "آج ہمارے ادب میں قومی عناصر و وطن دوستی کا ایسا بڑا اور شاندار ذخیرہ موجود ہے جس پر ہم فخر و ناز کر سکتے ہیں۔"



رومانیت کیا ہے — (صفحہ ۱۰ کا بقیہ)

کا نمونہ ہے جبکہ عصرِ نو کی شاعری ہمیں رقت و اشک ریزی پر مجبور کرتی ہے۔
جرمن شاعر شینیر CHENIER کا قول ہے کہ

"THE HEART ALONE CREATES POETRY"

اس طرح یہ بات بھی سامنے آجاتی ہے کہ احساس کا عنصر بھی یورپ کی رومانی تحریکوں میں ایک قدرِ مشترک رہا ہے۔ احساس کا منبع و مصدر قلب ہے اور صرف قلب اسی لیے HUGO نے احساس کو شاعری کا نام دیا ہے۔

اس کے بعد صف جرمن ادیب و شاعر VIGNY نے کیا پتہ کی بات کہی ہے:

"THE HEART CERTAINLY EXISTS AS A MORAL FACTOR. ITS JOYS AND SORROWS ARE FELT; BUT IT IS A DARK ROOM, AND ITS LIGHT IS THE INTELLECT."

یہ "انٹلکٹ" (ذہانت و ذکاوت، سوجھ بوجھ یا آگہی) ہی زندگانی قلب سے عبارت ہے۔ غرض کہ دل اگر مردہ ہے تو تجربہ و مشاہدہ کوئی احساس پیدا نہ کر سکے گا۔ احساس نہ ہوگا تو جذبہ بھی ناپید ہوگا۔ جذبہ بیدار نہ ہوگا تو تصور کو پرواز نہ ہوگی، نہ تصور کو جولانی ہوگی نہ فرد کی انا اسکو اپنا خاص رنگ دے سکے گی ؎

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

یہیں پر شاعری کو عرفانِ ذات اور تخلیقی دردوں سے تعبیر کیا جائے گا۔ یہ وہ منزل ہے جہاں شاعری سے متعلق ایک قدرِ مطلق پیش کی گئی ہے۔ رومانیت شاعری کا ایک رخ ہے جس کی تشریح، تعبیر اور تنقید ہر دور میں ہوتی رہی اور حقیقت یہ ہے کہ بقول ایف شلیگل رومانی شاعری ابھی تک اپنے دورِ حرکت و نمو میں ہے اور یہ حرکت و نمو ہی دراصل اس کی روح ہے، یہ ہمیشہ تغیر پذیر رہے گی، اس کی تکمیل شاید کبھی نہ ہو۔



مری خوشی ہے مری آبرو ہے میرا وطن

اعجاز فاطمہ

مری خوشی ہے مری آبرو ہے میرا وطن
مرا وطن ہے تمنا، مرا وطن ہے لگن

مرا وطن ہے جمالِ حیات کا درپن
مرا وطن ہے تمدن کا بے مثال چمن
مرا وطن ہے محبت کا شان دار گگن
مرا وطن ہے سکون و قرار کا دامن

مری خوشی ہے مری آبرو ہے میرا وطن
مرا وطن ہے تمنا، مرا وطن ہے لگن

مرے شعور، مری آگہی کا دفتر ہے
مرے خلوص، مری آرزو کا محور ہے
دل و نظر کے تصور کا ایک پیکر ہے
خیال و فکر و تخیل سے بھی حسیں تر ہے

مری خوشی ہے مری آبرو ہے میرا وطن
مرا وطن ہے تمنا، مرا وطن ہے گگن

عظیم تاج اسی خاک پر ہے جلوہ نشیں
ہے جس کے حسن سے تابندہ تر جہاں کی جبیں
اجنتا اور ایلورا بھلا ہیں اور کہیں
زمین تو ہے مگر آسماں سے کم بھی نہیں

مری خوشی ہے مری آبرو ہے میرا وطن
مرا وطن ہے تمنا، مرا وطن ہے گگن



ھادی مصطفیٰ آبادی

کتنے ہادی وقت پر دیکھے ہیں کیا کیا آشنا
کوئی آئے منزلِ الفت میں دل سا آشنا

روبروئے حسن غائب ہو گئے صبر و قرار
کوئی بھی میرے سوا ٹھہرا نہ میرا آشنا

سیکڑوں دامِ توجہ میں اُلجھ کر رہ گئے
ایک میں نکلا تمہاری بے رخی کا آشنا

شیخ جی ایسے تو اسیرِ معصیت ٹھہرا مگر
آپ کی ذات مقدس ہے خطا نا آشنا

جز مرے کوئی نہ پہنچا اس تکلف کے قریب
وہ برنگِ اجنبیت کس قدر تھا آشنا

کوچۂ الفت میں کی ہے ہر قدم پر رہزنی
رہبری کا اپنے سر باندھیں گے سہرا آشنا

کثرتِ غم دل کو اس درجہ حقارت سے نہ دیکھ
یہ سمجھ رکھنا کہ یہ قطرہ ہے دریا آشنا

سوچتا ہوں زندگی کے اس بھرے بازار میں
کتنی سستی دشمنی ہے کتنا مہنگا آشنا

شرط یہ ہے کوئی ہونا چاہیے حسنِ کمال
زندگی کیا موت بھی کرتی ہے پیدا آشنا

اس قدر ہے دوستی پر آج موسم کا اثر
جب ہوا پلٹی ہوا کے ساتھ پلٹا آشنا

آج اسی سادگی پر دیر تک ہنسنا پڑا
کتنا بیگانہ تھا وہ حسن کو میں سمجھا آشنا

فرق کو دستِ طلب کے جاننا تو چاہیئے
ورنہ گلچیں کو بھی کہہ دیجیے گلوں کا آشنا

رنگ و بو تو اُڑ لیے بادِ خزاں کو دیکھ کر
پھول سے پوچھا ہے کوئی اور تیرا آشنا؟

اک زمانہ یوں تو دم بھرتا ہے الفت کا مری
کاش تو بھی جانتا ہے کون کتنا آشنا

آج تو خوش ہوں کرم فرما کسی کو دیکھ کر
کاش ہو جائیں مری آنکھیں مکرر آشنا

آپ ان بکھرے ہوئے جلوؤں کے انداز کیا
ہو چکی ہے اب نگاہِ شوق پردہ آشنا

جادۂ دیر و حرم میں اتنے پیچ و خم نہ تھے
جاننے والے بھی ھادی اب ہوئے نا آشنا

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ

نئے امکانات

از سید ممتاز الحسنی
چیف اڈیٹر
ندیم بھوپال

میرا شروع ہی سے یہ خیال رہا ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ ۱۹۷۲ء کو کچھ افراد یا پارٹیوں کی جانب سے ایک خاص مقصد، بلکہ اگر میں یہ کہوں کہ سازش کے تحت ہدف لعنت و ملامت بنایا جا رہا ہے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔ کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جو نادانی یا دانستگی یا عدم واقفیت کا شکار ہو کر اس ایکٹ کے خلاف موہوم اندیشوں اور مفروضہ وسوسوں میں مبتلا ہیں۔ میں ایکٹ کو بہ حیثیت مجموعی اس کی تمام دفعات کے ساتھ حرف آخر نہیں سمجھتا نہ کوئی دنیوی قانون اتنا جامع اور مکمل ہو سکتا ہے کہ وقت اور زمانے کی تبدیلی کے باوجود اس میں لقطہ رکھنے کی گنجائش نہ رہے مگر جہاں تک اس ایکٹ کے مقاصد اور اس کی غرض و غایت کا تعلق ہے میں اسے روح عصر کی آواز سے تعبیر کرتا ہوں۔

میں یہاں تک کہنے کے لیے تیار ہوں کہ آج اگر سر سید زندہ ہوتے تو وہ بغیر کسی تذبذب اور تامل کے اس قانون کے مقصد پر صاد ہی نہیں کرتے بلکہ اسے اپنے خوابوں کی سچی تعبیر بھی سمجھتے۔ یہ قانون کیا جا چکا ہے اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو علمی اور تعلیمی نقطہ نظر سے کتنا آگے لیے جا رہا ہے اس کا جواب صرف یہ ہے کہ یہ علیگڈھ یونیورسٹی کی نشاۃ ثانیہ، اس کے احیاء، بقا، اس کی ترقی اور بلندی کی طرف ایک بڑھا ہوا قدم ہے۔ وہ مسلمان جو یہ سمجھ رہے ہیں یا جنہیں یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ پہلے ایک مسلم یونیورسٹی رہ گئی تھی اس پر بھی حکومت نے ہاتھ صاف کر دیا اور ایسا قانون نافذ کر دیا کہ آگے چل کر یہ نام کی مسلم یونیورسٹی غیر مسلم یونیورسٹی بن جائے گی جبکہ حقیقت حال یہ ہے کہ اس قانون کی منشا کے تحت مسلمان طلباء پر بہترین تعلیم و تعلّم کے وہ دروازے کھولے جا رہے ہیں جو اس سے پہلے ان پر کبھی نہیں کھلے تھے۔ اب صحیح معنوں میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے متعلم علم کی روشنی سے کمر نکلیں گے، لعنت تعصب اور تنگ دلی کے اندھیرے لے کر باہر نہیں آئیں گے ہم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ زمانہ بدل گیا ہے اس کا انداز و کردار بدل گیا ہے۔ ہم سوشلزم کی جانب بڑھ رہے ہیں جہاں انفرادی ملکیت اور حق حقوق کا قدیمی تصور اجتماعیت کے ہمہ گیر احساس میں ضم ہوتا جا رہا ہے۔ اس لیے ایک ترقی پسندی اور روشن خیالی وسیع النظری اور کشادہ قلبی کے دور میں پرانی لکیروں کو پیٹنے سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ یہ تو حکومت کی مسلمانوں سے دشمنی ہوتی کہ وہ مسلم یونیورسٹی کے اقلیتی کردار کے مطالبہ کے نام پر اس ابھرنے والی یونیورسٹی کو ایسے مسلمانوں کے حوالے کر دیتی جو ہنوز بسم اللہ کے گنبد میں بند ہیں اور یونیورسٹی پر اپنا حق جتانے کو ہی مسلمانوں کی سب سے بڑی اور اہم خدمت سمجھتے ہیں۔ علم و فن کسی فرقے اور ملت کی میراث نہیں ہے

اس لیے اگر مرمّمہ قانون کے تحت یونیورسٹی کے نظم و نظام میں اس کی بہتری، ترقی اور بہبودی کی خاطر کچھ ایسے اصحاب بھی اس میں شامل کیے جا سکتے ہیں جو مسلمان نہ ہوتے ہوئے بھی ماہر تعلیم اور اسکالر ہیں تو کسی باشعور انسان کو اس سے اختلاف یا انحراف کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے میں پوچھتا ہوں کہ ایکٹ کے خلاف تحریک چلانے والے چند گنتی کے مسلمانوں کو یہ کہلوانا مقصود ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی ہمارے بزرگوں کی متاع ہے اور اس متاع پر ہمارا حق میراث تسلیم کیا جانا چاہیے چاہے ہم اسے برباد کر کے ہی کیوں نہ رکھ دیں یا یہ بات اچھی ہے کہ

ہم یہ سوچیں کہ یونیورسٹی کا اقلیتی کردار باقی رہے یا نہ رہے ہم کو اس سے بحث نہیں ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ اس یونیورسٹی سے مسلمان طلبا علوم اسلامیہ اور جدید فنون میں تعلیم و تربیت پانے کے وسیع امکانات حاصل کر سکیں جس سے وہ ایک اچھے اور قابل مسلمان بننے کے علاوہ ایک عمدہ انسان بھی بن سکیں جو صرف اپنے فرقہ کے لیے ہی نہیں بلکہ پورے عالمِ انسانیت کے لیے مفید اور کارآمد ثابت ہوگا۔

اس لیے ہم کو آج یہ فیصلہ کرنا ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا یہ ایکٹ ان اعلیٰ مقاصد کو پورا کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے جن کے پیشِ نظر سرسید نے اس یونیورسٹی کی ایم۔ اے۔ او کالج کی شکل میں بنیاد ڈالی تھی اور جس سے مسلمان طلباء کا زریں مستقبل وابستہ تھا اور جسے گزشتہ کئی سالوں سے ایک معقول قانون نہ ہونے کے باعث گھن لگا جا رہا تھا۔



مزاحیہ



بی۔ اے شاہد

اپنی نظر نہ ہند پہ مرکوز کیجیے
پیرس میں جا کے حُسنِ جہاں چوز کیجیے

دل دیکھیے نکالتا ہوں کس صفائی سے
زلف دوتا کی آپ گرہ لوز کیجیے

چُپ چُپ سی شمع اور پتنگے مرے مرے
کل رات کیا ہوا تھا بیاں نیوز کیجیے

مرغِ شباب اسیر ہے ٹیڈی لباس میں
للہ اس قفس کو ذرا لوز کیجیے

روشن ہے شمع حسن تو پروانے آئیں گے
بیوٹی کا بلب آپ ذرا فیوز کیجیے

قاشیں نہیں، یہ میرا دلِ لخت لخت ہے
غیروں کو پیش شوق سے تربوز کیجیے

شاہد پسند آپ کو بھنگڑا ہے یا ٹوئسٹ
ظاہر جناب اپنے ذرا ویوز کیجیے

مزاحیہ

اے بسا آرزو

علی عباس امید

جب میرا ایم۔ اے کا رزلٹ آیا تو گھر میں خوب خوب خوشیاں منائی گئیں۔ پاس پڑوس کے سبھی مردوں نے ڈٹ کر مبارک باد پیش کی اور عورتیں اسی بہانے سے اکٹھا ہو کر کئی دنوں تک ایک دوسرے کی غیبت کرتی رہیں کچھ دوستوں اور رشتہ داروں نے تو چھوٹے موٹے بے ضرر قسم کے تحفے بھی پیش کیے اور خواہ مخواہ مجھے اپنی اہمیت کا احساس دلایا۔ اس روز تو مجھے اپنی کامیابی پر واقعی غرور ہوا جس دن بھوپال والی خالہ نے میرے پاس ہونے کی خوشی میں گڑ کی جلیبیاں تقسیم کر ڈالیں۔

کئی مہینے اسی نشہ میں گزر گئے اور جب خمار ٹوٹا تو پتہ چلا کہ دراصل ایم اے کرنے کا مطلب ہے ایسا لائسنس حاصل کر لینا جسے دکھا کر اپنے گزر بسر کا بندوبست کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہم نے بھی سرکاری اور غیر سرکاری دفتروں کے چکر لگانے شروع کر دیے۔ جب کئی ماہ بھٹک چکا تو معلوم ہوا کہ ڈگری تو سبھی حاصل کر لیتے ہیں لیکن اس سے صحیح فائدہ کچھ ہی لوگ اٹھا پاتے ہیں۔ مقامی طور پر ناکام ہونے کے بعد میں نے بیرونی طور پر مہم شروع کی اور دور دور رشتہ داروں، دوستوں، دوستوں کے رشتہ داروں اور پھر ان کے رشتہ داروں سے رجوع کیا۔

دو ماہ گزرے ہوں گے کہ بھوپال سے خالو نے لکھا کہ "فوراً آ جاؤ ملازمت طے ہو گئی ہے"۔ بھوپال کی گاڑی میں چونکہ دیر تھی اس لیے میں بس ہی سے چل پڑا۔ میرے بھوپال پہنچنے پر خالو، خالہ اور ان کے تمام بچوں نے عید جیسی خوشی منائی اور مجھے احساس ہوا کہ اب بھی دنیا سے محبت ختم نہیں ہوئی ہے اور اپنائیت کی روایت برقرار ہے۔ گھر اگرچہ چھوٹا تھا لیکن رہنے والوں کے دل بڑے تھے۔ میں بالکل گھر کی طرح رہنے لگا۔ چند ہی دنوں بعد ایک سرکاری دفتر میں کام کرنا شروع کر دیا زندگی ایک ڈگر پر لگ گئی اور دن گزرنے لگے۔ سردیاں ختم ہو گئیں اور گرمی کا موسم شروع ہو گیا۔

گرمی آتے ہی ایک الجھن پیدا ہو گئی۔ خالو کا مکان چھوٹا تھا اور رہنے والے زیادہ۔ سردیوں میں تو کسی طرح گزر ہو جاتا تھا لیکن اب چھوٹے سے آنگن میں سب کا سونا کسی طرح ممکن نہ تھا۔ دن تو اچھا بھلا آفس میں گزر جاتا لیکن رات مصیبت بن کر نازل ہوتی۔ شام کو دفتر سے واپس آنے پر میں دیکھتا کہ اس مختصر آنگن میں بڑے فنکارانہ طریقے سے خالو، خالہ، میاں جاوید، بی شگفتہ، ننھے خاں بھوپالی اور پہلوان آپا کے بستر لگے ہوتے۔ ان کے ساتھ ہی شبنم حیدر، تسنیم اور بڑی بی گڈ مڈ ہو کر رہتیں۔ اس کے بعد اتنی گنجائش بھی نہ رہتی کہ ان کے درمیان سے چل کر کمرے میں جایا جا سکے۔ مجھے کسی نہ کسی طرح باورچی خانہ کی بغل والی کوٹھری تک پہنچنا ہی پڑتا تھا کیونکہ رات تو بہر حال اسی میں گزارنا ہوتی تھی۔ مجھے خالو یا خالہ سے کوئی شکایت نہیں تھی کیونکہ ان کی محبت پر مجھے کسی قسم کا شک نہیں تھا۔ ان کے خلوص کا آئینہ اب بھی پہلے

ہی جیسا تھا، بس مکان کی تنگی نے اسے غبار آلود کر دیا تھا۔ کچھ راتیں میں نے باورچی خانہ کی بغل والی کوٹھری میں گزاریں لیکن جب گرمی زیادہ بڑھی تو وہاں سونا ناممکن ہو گیا۔

وہ رات بہت گرم تھی۔ شاید اس پر سورج کچھ زیادہ ہی خفا ہوا تھا۔ گیارہ بجتے بجتے کوٹھری بھٹی میں تبدیل ہو گئی اور میں گھبرا کر باہر سڑک پر آ گیا۔ یہاں کچھ سکون تھا۔ کافی دیر تک ٹہلنے کے بعد نیند کا غلبہ ہوا لیکن گھر میں جانے کی ہمت نہ پڑی۔ میں ریلوے اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر گھومتا رہا پھر پلیٹ فارم ٹکٹ خرید کر سیکنڈ کلاس کے ویٹنگ روم کا رخ کیا۔ ابھی میں سونے کے لیے کوئی مناسب جگہ تلاش کر ہی رہا تھا کہ چوکیدار نے رجسٹر کی خانہ پری کے لیے ٹکٹ طلب کیا۔ میں نے کمال لاپرواہی سے پلیٹ فارم ٹکٹ اس کے ہاتھوں پر رکھ دیا۔ ٹکٹ دیکھ کر وہ مجھے اس طرح گھورنے لگا جیسے اچانک میرے کان سینگھوں میں تبدیل ہو گئے ہوں یا پھر ناک نے بڑھتے بڑھتے سونڈ کی شکل اختیار کر لی ہو۔ جب اس کی حیرت کچھ کم ہوئی تو اس نے ٹکٹ میرے ہاتھ پر رکھ کر انگلی سے پلیٹ فارم کی جانب اشارہ کیا۔ میں نے یہی غنیمت جانا کہ اس نے اپنی زبان کو قصیدہ خوانی کے لیے زحمت نہیں دی اور سر جھکا کر باہر نکل آیا۔ مسافروں کی نشتری نگاہیں دیر تک چبھتی رہیں اور میں ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ اب دو بج چکے تھے، گھر تین میل دور تھا۔ نیند غالب آ رہی تھی اور صبح کو آفس بھی جانا تھا۔ کافی سوچ بچار کے بعد میں نے اسٹیشن کے سامنے والے پارک میں کھلی رات بسر کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہاں پہنچا تو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی جوتا بنانے والی کمپنی میں پہنچ گیا ہوں کیوں کہ پورے پارک میں گھاس پر لوگ اسی طرح پڑے ہوئے تھے جس طرح ڈبوں کے اندر جوتے الٹے کر کے رکھے جاتے ہیں۔ میں بھی ایک کونے میں چپلیں سر کے نیچے دبا کر پڑ رہا، پاؤں کی طرف جگہ اتنی کم تھی کہ وہ مڑے ہی رہے۔ کئی ماہ بعد کھلے آسمان کے نیچے سویا تھا، پاؤں کے سکڑے ہونے اور آس پاس جسموں کی شدید گرمی کے باوجود مجھے نیند آ گئی۔ میں نہ جانے کب تک سوتا رہتا لیکن صفائی کرنے والوں نے بڑی بے دردی سے پانی کے چھینٹے ڈال کر اٹھنے کے لیے مجبور کر دیا۔ اٹھنے پر معلوم ہوا کہ اور تو سب خیریت ہے سوا اس کے کہ سر کے نیچے دبا ہوا چپلوں کا اکلوتا جوڑا کوئی صاحب اپنا سمجھ کر اٹھا لے گئے ہیں۔ مجبوراً ننگے پاؤں گھر لوٹنا پڑا۔

اس دن آفس میں اس پریشانی کا ذکر کیا تو سنگھ صاحب نے دوسرا مکان لینے کا مشورہ دیا۔ دفتر سے اٹھ کر وہ میرے ساتھ مکان ڈھونڈنے نکلے تو یوں محسوس ہوا جیسے ہم حاتم طائی کے سات سوالوں میں سے ایک کا جواب تلاش کرنے کے لیے چل پڑے ہیں۔ جہاں جاتے لوگ ہمیں اس طرح دیکھتے جیسے ہم کوئی ناقابل یقین بات کر رہے ہوں۔ "آپ کو مکان چاہیے؟ خوب! ارے بھائی اب مکان کہاں ملتے ہیں۔" "کمرہ تو کہیں ملتا نہیں اور آپ پورے مکان کی بات کر رہے ہیں۔" "شاید آپ حال ہی میں کہیں دیہات سے آئے ہیں اسی لیے یہ بے فائدہ کوشش کر رہے ہیں۔"

رات کو گیارہ بجے جب ہم ناکام لوٹ رہے تھے تو ہمارا مشترکہ شناسا لیاقت موچی مل گیا۔ اس نے بتایا کہ آج ہی شام کو ایک مکان اس کے پڑوس میں خالی ہوا ہے۔ اس کے مالک بڑے والے بابا جی سے اس کے اچھے تعلقات ہیں لہذا صبح ہونے سے پہلے ہی وہ ہمیں دلا دے گا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا جس نے اتنی آسانی سے ہماری مشکل کو سہل بنا دیا تھا۔ ہم اس کے ساتھ مکان دیکھنے کے لیے چل پڑے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ [illegible] نالے کے دائیں جانب تین دیواریں کھڑی تھیں۔ ان کے اوپر [illegible] کی دو ایسی چادریں پڑی تھیں جن میں سے بغیر کسی خاص زحمت کے آسمان کے بدلتے ہوئے رنگوں کا دیدار ہو جاتا تھا۔ میں نے لیاقت موچی سے دریافت کیا کہ وہ مکان کہاں ہے تو وہ گمبھیرتا سے بولا "یہی تو ہے۔ ابھی آپ لے لیجیے بعد میں بابا جی سے اجازت دلا دوں گا تو اسے اپنی مرضی سے درست کرا لیجیے گا۔ بابا جی تو سادھو آدمی ہیں انھیں کسی چیز کا لالچ تھوڑے ہی ہے۔ اگر آپ ہر ماہ کرائے کے نوّے روپے پیشگی دیتے رہے تو جب تک جی چاہے رہیے گا وہ کچھ [illegible] نہیں کہیں گے۔" پھر وہ ذرا رک کر دھیمے لہجے میں

پولا دست ٹکرا دیجیے کہ یہ شام کو خالی ہوا ورنہ اب تک تو اٹھ چکا ہوتا۔" ہم نے کافی سوچنے کے بعد باورچی خانہ کی بغل والی کوٹھری ہی کو غنیمت جانا۔

دوسرے دن آفس جاتے ہوئے بس میں سہگل جی مل گئے انھوں نے بتایا کہ ان کے ایک دوست ہیں منظور صاحب۔ اردو کے بہت بڑے ادیب ہیں۔ انھوں نے خالی مکان کا تذکرہ کیا تھا۔ میں نے اور سنگھ صاحب نے دفتر سے چھٹی لی اور منظور صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ وہ بہت بااخلاق انسان ثابت ہوئے۔ اندر ڈرائنگ روم میں بٹھایا، شربت پلایا، سگریٹ پیش کیا اور تین گھنٹے تک اپنی تازہ کہانیاں سناتے رہے۔ جب کافی دیر ہو گئی تو سنگھ صاحب نے پہلو بدلا اور دھیرے سے منمنائے "منظور صاحب ہم آپ کے پاس ایک ضرورت سے حاضر ہوئے تھے۔" وہ بڑی خوش اخلاقی سے بولے "فرمایئے فرمایئے" سنگھ صاحب نے جھجھکتے جھجھکتے کہا "وہ ۔ وہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خالی مکان ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اور منظور صاحب کھل اٹھے "اچھا اچھا میں سمجھا۔ وہ جو کسی نے کہا ہے نا "قدرِ گوہر شاہ داند ۔ ۔ ۔" تو صاحب یہ حقیقت ہے۔ واقعی آپ دونوں حضرات ملکِ ادب کے بادشاہ ہیں۔ آپ ہی جیسے قدردانوں کی وجہ سے اس بدتریں دور میں بھی ادب زندہ ہے۔ ابھی حاضر ہوا۔" وہ اندر چلے گئے۔ سنگھ صاحب بولے "استاد کام بن گیا۔ اب دعوت کرنا ہوگی۔ ہوٹل میں نہیں نے گھر میں۔" میں نے قسم کھا کر انھیں یقین دلایا کہ مکان ملنے کے بعد کرایہ نکال کر بقیہ تنخواہ ان کے حوالے کر دوں گا۔ اتنے میں منظور صاحب برآمد ہوئے ان کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ انھوں نے سنگھ صاحب کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا "آپ پہلے قدردان ہیں جو اس طرح گھر آ کر اسے لے رہے ہیں۔" میں نے دیکھا کتاب پر لکھا تھا "خالی مکان" یہ ان کا پہلا جاسوسی ناول تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے چھوٹے بڑے دائرے گھومنے لگے۔ ان میں کسی کا رنگ سرخ تھا، کسی کا سیاہ، کوئی زرد تھا اور کوئی آسمانی۔ پھر مجھے کچھ خبر نہیں۔ آنکھ کھلی تو میں باورچی خانہ کی بغل والی کوٹھری میں تھا اور خالہ سرہانے بیٹھی رو رہی تھیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ سنگھ صاحب نے ساڑھے چار روپے دے کر وہ ناول لے لیا تھا۔

صبح کے اخباروں میں ایک اشتہار تھا "دنیا کا سب سے عجیب ناول۔ ادب کی تاریخ میں تہلکہ۔ صرف سرورق دیکھ کر ایک شخص بیہوش ہو گیا۔ آج تک ایسا خوفناک ناول نہیں لکھا گیا۔ ہاتھوں ہاتھ بک رہا ہے۔ آپ بھی فوراً اپنی جلد حاصل کر لیجیے ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔"

دو دن چھٹی پر رہنے کے بعد دفتر پہنچا تو یہ خوف تھا کہ لوگ مذاق اڑائیں گے لیکن وہاں حالات معمول سے کچھ کچھ تھے۔ یوں محسوس ہوا جیسے میرے درد کو سب سمجھتے ہیں۔ اسی روز معلوم ہوا کہ میرے ساتھیوں میں سے تقریباً نصف دھرم شالاؤں یا مندروں میں رہتے ہیں کچھ لوگ اپنے بال بچوں کو اس لیے ساتھ نہیں رکھ پاتے کہ وہ خود مسافر خانوں اور مسجدوں کے حجروں میں گزر کرتے ہیں۔ جن کے پاس فیملی ہے ان کے مکان بھی ہمارے مکان سے مختلف نہیں ہیں۔ ان اطلاعات نے میرے زخم پر مرہم کا کام کیا۔

ڈاکٹر اگروال میرے قریبی دوست ہیں، جب انھیں میری زبوں حالی کا پتہ چلا تو وہ مجھے اپنے ایک قریبی دوست کے پاس لے گئے۔ ان حضرت کے ماموں زاد بھائی کے سالے کے چچا دولت رام کا مکان خالی تھا۔ جب ہم لوگ دولت رام کے پاس پہونچے تو انھوں نے ایک سوالنامہ دیتے ہوئے کہا: "آپ اطمینان سے اسے بھر کر دے جایئے گا ہمارے پاس اور بھی کافی سوالنامے آئے ہیں۔ اگلے ہفتہ ان سب پر غور کیا جائے گا۔ اگر آپ ہمارے معیار پر پورے اترے تو مکان آپ کو مل جائے گا۔" میں نے ہر پہلو کی نزاکت اور ہر مسئلے کی اہمیت کو ذہن میں رکھتے ہوئے نہایت ہی احتیاط کے ساتھ ان کے اکیس سوالوں کے جواب بھر کر ان تک پہنچا دیے۔ مکان کافی اچھا تھا اور کرایہ بھی معقول تھا۔ اس لیے صبح و شام انھیں سلام کرنے کی غرض سے ان کے در پر حاضری دینے لگا۔ آج کل سفارشوں کا زمانہ ہے لہذا پتہ

لگانا شروع کیا کہ ایسے کون لوگ ہیں جن کی بات دولت رام مان سکتے ہیں۔ بڑی دوڑ دھوپ کے بعد ایسے دو اشخاص کا نام معلوم ہوا جو مکان حاصل کرنے میں میری مدد کر سکتے تھے۔ پہلے صاحب سے ملاقات کی تو انھوں نے کہا کہ "آپ دو گزیٹیڈ افسران کا تصدیق شدہ کیرکٹر سرٹیفکیٹ اور کسی مقامی باعزت شخص کی ضمانت لائیے پھر میں اس سلسلے میں سوچوں گا۔" دوسرے حضرت سے ملا تو وہ دیر تک بڑے خوشگوار موڈ میں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے پھر بولے "آپ شام کو ہوٹل رنجیت میں آ جائیے پھر تفصیل سنوں گا۔" ہوٹل میں عالمی سیاست سے لیکر مکان کے مسئلے تک گفتگو کر کے رات کے دس بجے جب ہم اٹھے تو بیرے نے اکیاون روپے کا بل میری جانب بڑھا دیا۔ باہر نکل کر انھوں نے بڑی لاپرواہی سے ٹیکسی کو آواز دی اور مجھ سے کہا "پیدل کہاں جائیے گا آئیے مجھے چھوڑتے ہوئے اسی سے آپ بھی گھر نکل جائیے گا۔" ٹیکسی والے کو چار روپے ستر پیسے دے کر جب میں باورچی خانہ کی بغل والی کوٹھری میں داخل ہوا تو اس سے میرا رابطہ ٹوٹ چکا تھا تیسرے روز پتہ لگانے پھر ان کے پاس پہنچا۔ وہ اسی خوش اخلاقی سے پیش آئے "آئیے آئیے حضرت! کہئے مزاج تو بخیر ہیں آپ کے! ابھی معاف کیجئے گا اس قدر مصروف رہا کہ آپ کے کام کے لیے وقت ہی نہ نکال سکا۔ آج شام کو طے سمجھئے، بالکل پکی رہی۔" میں کافی دیر تک بادل نخواستہ چھوٹی چھوٹی باتوں اور چٹکلوں سے انھیں خوش کرتا رہا۔ جب اٹھ کر چلنے لگا تو وہ بڑی بے تکلفی سے بولے "بھئی سید صاحب میں شام کو مرور گفتگو کروں گا، آپ سویرے آ جائیے ... اور ہاں آپ کو زحمت تو ہو گی لیکن آپ کی بھابی کی دوا ہے اس لیے صبح آتے تو ایک گلو سیب کا مربہ لیتے آئیے۔ کئی دنوں سے وہ کہہ رہی ہیں لیکن مجھے فرصت نہیں تھی۔ آج شام کو لانے کا ارادہ تھا لیکن آپ کے کام سے چلا جاؤں گا اور ان کے مزید ناراض ہو جائیں گے ___" قہر درویش برجان درویش کے مصداق سویرے ہی سویرے سیب کا مربہ لے کر ان کے گھر پہنچا تو انھوں نے بہت ہی خوش خوش

یہ مژدہ سنایا کہ دولت رام بہت اصولوں کے آدمی ہیں انہوں نے کسی طرح کی سفارش ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ آپ مطمئن رہیے انصاف کی جیت ہو گی، میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔" اپنی خالی اور خستہ جیب کی اشک شوئی کرتے ہوئے ان کے نیک اپنی خالی اور خستہ جیب کی اشک شوئی کرتے ہوئے ان کے نیک خواہشات وہیں چھوڑ کر میں چلا آیا۔ چند دنوں بعد دولت رام سے ملا تو اس نے بتایا کہ ویسے تو میں ہر طرح ان کے مقررہ معیار پر پورا ہوں لیکن چونکہ ابھی میری شادی نہیں ہوئی ہے اس لیے مکان مجھے نہیں مل سکتا۔ میں نے مودبانہ عرض کیا کہ میں ضرور غیر شادی شدہ ہوں لیکن میرے ساتھ میرے خالو بھی ہیں جن کی بارات پندرہ سال قبل ہمارے اپنے مکان سے گئی تھی۔ اس کے ثبوت کے طور پر مختلف سائزوں کے پون درجن بچے ان کے روبرو پیش کیے جا سکتے ہیں ___ دولت رام نے اس دلیل کو قبول کرنے سے انکار کر دیا تو میں نے انھیں یقین دلانا چاہا کہ اگر انھوں نے مکان مجھے دے دیا تو اسی ماہ کے اندر اسے اپنی شادی کا ما حضر تناول کرا دوں گا لیکن ان کی گردن کانوں کی سمتوں میں ہل کر تھم گئی۔

دولت رام کی نفی کا بار اٹھائے ہوئے تین ہفتے گزر چکے تھے۔ ایک سہ پہر کو مسعود صاحب ملنے آئے تو بولے کہ جہانگیر آباد مرغی بازار میں یوسف پہلوان کے چائے خانہ کے سامنے ایک مکان خالی ہے اپنے غمگسار بھائی احسان کو لے کر وہاں پہنچا تو معلوم ہوا کہ ایک بیوہ اپنا مکان کرایہ پر دینا چاہتی ہیں۔ ہم ٹاٹ کے پردہ والے اس مکان کے دروازے پر پہنچے تو ایک نسوانی آواز آئی "بیٹے ذرا منی کو آواز تو دینا۔" میں نے وہیں ٹہلتی ہوئی ایک بچی کو پکارا تو پتہ چلا کہ منی دراصل بڑی بی کی اس مرغی کا نام ہے جس کے سفید پروں پر سرخ رنگ کے چھینٹے ہیں۔ میں اور بھائی احسان اس کی تلاش میں چلے۔ کوئی آدھ گھنٹہ کی محنت کے بعد وہ گھورے پر نظر آئی۔ ایک طرف سے میں نے اور دوسری جانب سے بھائی احسان نے اسے گھیرنا شروع کیا۔ جب قریب پہنچ کر ہم نے اس پر ہاتھ مارا تو وہ کڑکڑاتی ہوئی اڑ گئی اور اس

کی پرواز کے ساتھ ہی میری بچی کھچی عزت نے بھی پر تول لیا کیونکہ اس محلّے کے کوئی نصف درجن باعزت اور بے عزت لوگوں نے ہمیں اپنے گھیرے میں لے لیا تھا اور اس حصار کے باہر ان کے زندۂ مستقبل تالیاں بجا بجا کر "مرغی چور، مرغی چور" کی آوازیں لگا رہے تھے۔ ہم نے لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ ہم مرغیاں پکڑنے والے نہیں ہیں بلکہ اس مرغی کی مالکہ کی درخواست پر اسے پکڑ رہے تھے لیکن مونچھوں والے ایک صاحب برابر ہمیں برا بھلا کہے جا رہے تھے۔ بعد میں پتہ چلا کہ جس مرغی کو ہم بڑی بی کی ملکیت سمجھ کر پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے، دراصل وہ انھیں حضرت کی تھی۔ بہرحال ایسے حادثاتی مواقع پر کچھ شریف لوگ بھی پہنچ جاتے ہیں یہاں بھی تھے اور انھوں نے معاملہ کو سمجھ کر ہماری جان بچائی۔ ایک بزرگ نے کہا کہ "چلیے میں آپ کا مسئلہ طے کرا دوں گا۔" ہم پھر وہیں پہنچ گئے۔ مکان دیکھا، ایک کمرہ اور برآمدہ تھا۔ بڑی بی نے کہا کہ برآمدہ میں وہ خود رہیں گی اور کمرہ کرائے پر اٹھا دیں گی۔ کرایہ دار کے لیے کوئی شرط بھی نہ تھی سوا اس کے کہ اس کے بیوی بچے نہ ہوں، ان کی مجبوریوں کا خیال کرکے ان کے کام آئے اور اپنی عاقبت سنوارے۔ کام بھی کوئی خاص نہیں بس یہی کہ دونوں وقت پانی بھر دے، بازار سے سودا وغیرہ لا دے اور ان کی مرغیوں کی نگرانی کرے۔ مرغیوں کا ذکر آتے ہی میری وہی کیفیت ہونے والی تھی جو منظور صاحب کا

ناول دیکھ کر ہوئی تھی۔ لیکن بھائی احسان نے خلاف توقع عقل سے کام لیا اور میرا بازو پکڑ کر بے تحاشہ سڑک پر دوڑنا شروع کر دیا۔ کافی دور پہنچ کر جب ہم دم لینے کے لیے رکے تو احساس ہوا کہ تقریباً بے دم ہو چکے ہیں۔ پھر بھی خداوند عالم کا شکر ادا کیا کہ دل نے اپنا کاروبار جاری رکھا تھا۔

مکان تلاش کرتے ہوئے مجھے دس ماہ ہو چکے ہیں۔ برسات کی آمد آمد ہے اور میں باورچی خانہ کی بغل والی کوٹھری میں سوتا ہوں۔ جب بارش ہوتی ہے تو پوری رات چھت پر آنکھیں ٹنگی رہتی ہیں کیونکہ باران رحمت کا ایک قطرہ بھی باہر گر کر ضائع نہیں ہوتا۔ شاید یہ اس حبس کا بدلہ ہے جو گزشتہ تین ماہ میں میرا رفیق رہا ہے۔ سنا تھا کہ صبر اور محنت کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ مجھے اس مقولہ کی صداقت پر قطعی اعتبار نہیں ہے کیونکہ دائمی صبر اور مسلسل محنت کے باوجود میں میٹھے تو کجا کھٹے پھل سے بھی محروم ہوں۔ اب تو یہ صورت ہو گئی ہے کہ جب بھی کسی سے ملتا ہوں تو بجائے اس کی اور اس کے بال بچوں کی خیریت دریافت کرنے کے کسی خالی مکان کا پتہ پوچھتا ہوں۔ کاش کبھی یہ معجزہ ہو جائے کہ میں ایک ایسا مکان ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاؤں جس میں پیٹ بھر کے لوگ اپنی مرضی کے مطابق الگ الگ چارپائیوں پر لیٹ کر سو سکیں۔ امید پر دنیا قائم ہے اور میں بھی اسی امید کے سہارے دن اور بالخصوص راتیں گزار رہا ہوں۔



"مجھے ابھی بہت کچھ کرنا ہے" (صفحہ ۲۰ کا بقیہ)

عہدہ برآ ہونا چاہیں گی؟۔

اس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ "نہیں۔ میں کبھی ریٹائر نہیں ہوں گی۔ مجھے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ میرے چاروں طرف ابھی بھی جہالت اور قدامت پرستی موجود ہے اور برے رسم و رواج کے بندھنوں میں جکڑا ہوا سماج کے نچلے درجے کا وہ طبقہ ہے جس کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔"

اس کے بعد انھوں نے اپنے مہیلا وکاس کیندر کے بارے میں بتایا جو بنیادی طور پر بنارس میں خواتین کے لیے کھولا گیا ہے۔ یہاں مرچ مسالے وغیرہ اور گھریلو استعمال کی اشیاء ہاتھ سے بنا کر فروخت کی جاتی ہیں جن کی آمدنی سے نچلے طبقے کی عورتوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔

بوا جی آج بھی جلسوں اور تقریبات میں حصہ لیتی ہیں۔ مہیلا وکاس کیندر کی مصنوعات کی فروخت کے لیے انھیں جگہ جگہ جانا پڑتا ہے۔ وہ غریبوں کی بستیوں میں پابندی سے جاتی ہیں اور وہاں کی خواتین کو صحت صفائی، خاندانی منصوبہ بندی وغیرہ کے بارے میں بتاتی ہیں۔ وہ قربانی ایثار اور خدمت خلق کی جیتی جاگتی علامت ہیں۔

غزل

قدیر چشتی

اک گرہ ہوں عبسیم امید کی کھولو مجھ کو
میں کہ خود ہی میں چھپا ہوں ذرا ڈھونڈو مجھ کو

اختلافات کی وادی میں اندھیرا ہے بہت
دیکھنا ہے تو ذرا بڑھ کے ہی دیکھو مجھ کو

میں اسی شہر کا گمنام سا باشندہ ہوں
ذرا انجان نگاہوں سے ٹٹولو مجھ کو

ایک موہوم بھروسے پہ یقیں ٹھیک نہیں
کوئی امید نہیں مجھ سے تو چھوڑو مجھ کو

طنز کرنا بہت آسان ہے لیکن یارو
وقت مل جائے اگر تم کو تو سوچو مجھ کو

سامنے ایک شناسا سا کوئی چہرہ ہے
اجنبیت کا ہے احساس لگا ہوا مجھ کو

دامنِ شوق پہ ناکامی کا دھبہ ہوں قدیرؔ
ہو جو ممکن تو کسی طور ہی دھولو مجھ کو

غزل

مظفر النساء نازؔ

نظر ملائیں تو کس طرح بے سہاروں سے
لہو ٹپکتا ہے بجھتے ہوئے چراغوں سے

یہ رہبری تو فقط منزلوں کا دھوکہ ہے
گزر رہے سبھی اپنی اپنی راہوں سے

اکیلے پن میں میں یکسانیت سے ڈرتی ہوں
حیات نکھری حوادث کے تیز دھاروں سے

جہاں بھی دیکھا تبسم نواز لوگوں کو
بڑے خلوص سے ملتے ہیں اشکباروں سے

جنوں پسند مزاجوں کو کون سمجھائے
مرا بھی ربط ہے روٹھی ہوئی بہاروں سے

کروں میں شکوۂ اغیار کس زباں سے نازؔ
لگے ہیں زخم تو اپنے ہی خیر خواہوں سے

"شیشے کی فصیلیں"

محمد ہارون صابر

پگھلے ہوئے لمحوں سے یہ چلتا ہے پتا بھی
اس شہر میں رہتا ہے کوئی شعلہ نوا بھی
ڈرتا ہوں کہ قسمت اسے "پتھر" نہ بنا دے
اپنے لیے میں نے جو کوئی "پھول" چنا بھی
کیا جانے، کہاں کھو گئے خوشبو کی طرح وہ
میں چار قدم ان کے تعاقب میں چلا بھی
ماحول کے زخموں کی کسک دیکھنے والو
حالات کے دھاگوں سے کوئی زخم سیا بھی
رائل نہ ہوئے جسم سے ظلمات کے دھبے
راتوں کا بدن چاند کی کرنوں سے دھلا بھی
ہر شب کی سیاہی ہے تری آنکھ کا کاجل
ہر صبح کا پرتو ہے ترے رخ کی ضیا بھی
ہاتھوں میں تو پہنا دیے زنجیر کے کنگن
ممکن ہو تو محصور کرو دل کی صدا بھی
لفظوں سے تراشا ہے ترے حسن کا پیکر
شعروں میں سموئے ہیں ترے ناز و ادا بھی
پتھر کی چٹانیں بھی تو ہیں راہ میں صابرؔ
شیشے کی فصیلوں کو اگر توڑ دیا بھی



خشک سالی سے متاثر علاقوں کے باشندوں کے لیے مرکزی امداد اور ریاستی اقدامات ●● مرزا پور میں سوکھے کا مقابلہ کرنے کے لیے عالمی بنک کی مالی امداد ●● دیہی انجینیرنگ سروس کے لیے روزگار کی فراہمی ●● اتر پردیش میں مزید ۲۲ لاکھ ایکڑ آراضی کے لیے آبپاشی کی سہولتیں ●● پانی ٹنکیوں میں مختلف نصاب کا اجرا ●● نئے ترقیاتی بلاکوں میں ۲ اکتوبر سے کام کا آغاز ●● تقسیم کے لیے تقریباً ۴ لاکھ ایکڑ آراضی دستیاب ●● پانی اٹھا کر آبپاشی کی نئی شرحیں ●● یوم جمہوریہ ۱۹۷۳ء تک ۲۴۶ نئی ڈسپنسریاں قائم کرنے کی تجویز ●● مجاہدین آزادی کو مکانات اور پلاٹوں کی فراہمی ●● جہازوں سے متعلق کنٹرول حکم نافذ ●● متفرقات

وزیر اعلیٰ شری کملاپتی تریپاٹھی نے حال ہی میں اس امر کا انکشاف کیا کہ اتر پردیش میں خشک سالی سے متاثرہ افراد کی امداد اور دیگر اقدامات کے لیے مرکزی حکومت نے اتر پردیش کو ۹۴ کروڑ روپے کی مالی امداد فراہم کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

انھوں نے بتایا کہ مذکورہ رقم میں سے کیمیاوی کھاد کے لیے ۳۰ کروڑ روپیہ، ضلع آگرہ میں سیلاب سے متاثرہ عوام کی امداد کے لیے ۲۵ر۲ کروڑ روپیہ اور بقیہ رقم متاثرہ عوام کو بیج کی خریداری اور امدادی کام شروع کرنے اور مفت امداد دینے اور دیگر مقاصد کے لیے قرضے فراہم کرنے کے واسطے ہوگی۔

وزیر اعلیٰ لکھنؤ میں اعلیٰ سطح کے ایک جلسہ میں ریاست کی خشک سالی کی صورت حال کا بالعموم اور اکثر و بیشتر خشک سالی سے متاثر ہونے والے علاقوں امدادی پروگراموں کا بالخصوص جائزہ لے رہے تھے۔ شری تریپاٹھی نے اکثر و بیشتر خشک سالی سے متاثر ہونے والے اضلاع میں علاقائی پروگراموں کی سست رفتاری پر اظہار تشویش کیا جو مرزا پور۔ وارانسی الہ آباد۔ باندہ۔ ہمیر پور اور جھانسی کے چھوٹے اضلاع میں جاری ہیں۔ وزیر اعلیٰ کو مطلع کیا گیا کہ مرکزی حکومت کی طرف سے چلائے ہوئے پروگراموں کے کل مصارف ۲۱ کروڑ روپیہ میں سے اب تک صرف ۲ کروڑ روپیہ کی رقم خرچ کی جا سکی ہے۔

انھوں نے آبپاشی۔ تعمیرات عامہ۔ جنگلات اور زمین کے تحفظ سے متعلق محکموں کے افسران کو ہدایت کی کہ وہ جنگی پیمانہ پر پروگراموں کو بروئے کار لائیں۔ انھوں نے افسروں سے کہا کہ اس سلسلہ میں کسی قسم کے عدم لگن کو برداشت نہیں کیا جائے گا اور انھیں اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ ۱۰ کروڑ روپیہ کی بقیہ رقم مناسب طور پر مصرف میں لائی جائے اور پروگراموں کے تحت کام مقررہ مدت یعنی آئندہ ڈیڑھ سال کے اندر مکمل ہو جائیں۔

وزیر اعلیٰ نے سینیئر افسروں کو خبردار کیا کہ اگر آئندہ پندرہواڑہ میں بارش نہ ہو تو وہ کسی بھی ہنگامی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے چوکنا رہیں۔ انھوں نے کہا کہ ایسی صورت میں آئندہ تین یا چار مہینے سماج کے کمزور طبقوں کے مشکل ہوں گے۔ انھوں نے کمزور طبقوں کو کام اور روزگار مہیا کرنے کے لئے افسروں سے کہا کہ وہ تیز رفتار پروگراموں اور دیہی علاقوں میں بیروزگاری دور کرنے سے متعلق دیگر اسکیموں کو تیزی سے عملی جامہ پہنائیں۔ وزیر اعلیٰ نے محکمہ مال کے افسروں کو ہدایت

کی کہ وہ جہاں کہیں بھی ضرورت ہو غریب اور حاجت مند افراد کو روزگار فراہم کرنے کے لیے امدادی کام شروع کریں۔ انھوں نے کہا کہ منصوبہ جاتی اسکیمیں اور تیز رفتار اور دیگر پروگرام عوام کو آئندہ ربیع فصل کی کٹائی تک مشکل حالات کا سامنا کرنے کے لیے مواقع فراہم کریں گے۔

جلسہ میں دیگر افراد کے علاوہ وزیر اجتماعی ترقی شری پی۔ ایس آریہ وزیر مال شری ایس شرما۔ وزیر آبپاشی شری ایم۔ اے۔ خان وزیر ریاست کور اشرف علی اور نائب وزیر شری کے سی شرما نے شرکت کی۔ اس کے علاوہ جلسہ میں چیف سکریٹری شری ایم۔ لال۔ زراعتی پیداوار کمشنر شری بی۔ ڈی سانیال مختلف ڈویژنوں کے کمشنر اور محکموں کے سربراہ بھی موجود تھے۔

عالمی بینک خشک سالی سے اکثر و بیشتر متاثر ہونے والے ضلع مرزا پور میں خشک سالی سے متعلق علاقائی پروگرام کے لئے چار کروڑ روپے کی مالی امداد دینے پر رضامند ہو گیا ہے۔ یہ فیصلہ عالمی بینک کی ٹیم نے ریاست کے خشک سالی سے متاثر ہونے والے اضلاع کا دورہ کرنے کے بعد کیا ہے جو اس نے کچھ عرصہ قبل کیا تھا۔

یہ پروگرام ۲۱ کروڑ روپے کی لاگت کے اس مرکزی پروگرام کے علاوہ ہے جو ریاست کے خشک سالی سے سب سے زیادہ متاثرہ چھ اضلاع وارانسی، مرزاپور، الہ آباد، باندہ، ہمیر پور اور جالون میں جاری ہے۔ مرکزی پروگرام کے تحت جسے مارچ سنہ ۱۹۷۴ء تک مکمل کرنے کی تجویز ہے، ۳۵ء۷ کروڑ روپے آبپاشی کی اسکیموں پر خرچ کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ان اضلاع میں ۴۹۰ کلو میٹر لمبی سڑکوں کی تعمیر کے لیے ۴۴ء۲ کروڑ روپے کی رقم مخصوص کی گئی ہے۔ شجرکاری اور زمین کے تحفظ سے متعلق اسکیموں پر ۲۲ء۷۲ لاکھ روپے کے مصارف آئیں گے۔

عالمی بینک نے جس پروگرام کے لیے امداد کی پیش کش کی ہے وہ ضلع مرزاپور میں اس وقت شروع کیا جائے گا جب اس کی متعدد اسکیموں کے خاکے مرکزی حکومت منظور کر دے گی۔ پروگرام کا بنیادی مقصد کم و بیش مستقل طور پر قلت کی صورت حال کو ختم کرنا، زراعت کو ترقی دینا اور سماج کے تمام طبقوں خاص طور پر چھوٹے کسانوں اور بے زمین مزدوروں کو روزگار کے مواقع فراہم کرنا ہے۔

اس سلسلے میں ریاستی حکومت نے ایک ماسٹر پلان تیار کیا ہے جس میں متعدد مربوط اسکیمیں شامل ہیں۔ یہ پلان منظوری کے لیے مرکزی حکومت کو بھیج دیا گیا ہے۔

ریاستی حکومت نے چھوٹے پیمانے کے تعمیراتی کاموں کی رفتار تیز تر کرنے کے لیے گزشتہ جولائی میں قائم کی گئی دیہی انجینیرنگ سروس کے تحت ۱۰۸ اسسٹنٹ انجینیر اور ۲۲۴ اوورسیروں کی تقرری کی ہے تاکہ دیہی علاقوں کی پسماندگی کو دور کیا جا سکے۔

ضلع مجسٹریٹ کی نگرانی اور رہنمائی میں دیہی انجینیرنگ ایک لاکھ روپے کی لاگت سے تعمیراتی کام جس میں دیہی علاقوں میں معاون سڑکوں، پینے کے پانی کے کنوؤں، بلاک کی عمارتوں، پنچایت گھروں اور ابتدائی صحت مرکزوں کی تعمیر سے متعلق کام شامل ہے، مکمل کرے گی۔ دیہی انجینیرنگ سروس ہر سال تقریباً ۷۵۰۰ افراد کو روزگار فراہم کرے گی جس میں ریاست کے ۶۰۰۰ غیر ہنرمند مزدور بھی شامل ہیں۔

ریاستی حکومت کے صدر مقام پر موصولہ اطلاعات کے مطابق مالیاتی سال رواں کے اول چار ماہ میں ۹۵۸۷ ٹیوب ویل ۲۸۰۶ پمپنگ سیٹوں اور ۴۰۱۸ رہٹوں کے لگ جانے اور ۱۰۰۵۱ پختہ کنوؤں کے تعمیر ہو جانے سے اتر پردیش میں مزید ۲ء۷۰ لاکھ ایکڑ آراضی کی آبپاشی کے لیے سہولتیں مہیا ہو گئی ہیں۔

ترقی آراضی بینک نے مذکورہ مدت کے دوران ۵ء۷۰ کروڑ روپے کے قرضے دیئے جبکہ اس کا مالیاتی سال رواں کے لیے قرضے دینے کا نشانہ ۳۲ کروڑ روپیہ ہے۔

زراعتی پیداوار کمشنر شری بی۔ ڈی۔ سانیال نے ایک گشتی مراسلہ میں ضلع مجسٹریٹوں سے کہا ہے کہ وہ چھوٹے پیمانے کے آبپاشی کے نجی پروگراموں کی رفتار تیز تر کر دیں تاکہ آئندہ مارچ تک ۷۰۰۰۰ نجی ٹیوب ویلوں اور پمپ سیٹوں کی تنصیب کا نشانہ پورا کیا جا سکے۔

ریاستی حکومت نے تکنیکی تربیت اور انجینیرنگ کے مخصوص

شعبوں میں روزگار کے نئے مواقع فراہم کرنے کے لیے کچھ پالی ٹیکنیکوں میں مختلف قسم کے متعدد ڈپلوما نصاب شروع کیے ہیں۔ یہ نصاب مقامی ضروریات اور ریاست کی صنعتی ضروریات کو ملحوظ رکھ کر تیار کیے گیے ہیں۔

نئے تربیتی نصابوں میں بی۔ ایم۔ بی۔ پالی ٹیکنیک متھرا میں تین سال کی مدت کا آٹو موبائیل کورس (جس میں تیس طلبا کے داخلہ کا بندوبست ہے) ایس۔ جی۔ ایس۔ جے۔ پالی ٹیکنیک خورجہ میں سیرامیکس، شیشہ اور پلاسٹک ٹکنالوجی سے متعلق سہ سالہ نصاب (جس میں تیس طلبا کے داخلہ کا بندوبست ہے) سرکاری ویمنس پالی ٹیکنیک لکھنؤ میں ملبوسات کی ڈزائن اور تیاری سے متعلق دو سالہ نصاب (جس میں تیس طالبات کے داخلہ کی گنجائش ہے) اور نینی تال پالی ٹیکنیک نینی تال کاروباری طریقوں سے متعلق دو سالہ تربیتی نصاب شامل ہیں۔ موخرالذکر نصاب کے لیے تیس نشستیں ہیں۔

نئے پوسٹ ڈپلوما نصابوں میں نینی تال پالی ٹیکنیک نینی تال میں بلند مقامات پر انجینیرنگ سے متعلق ایک سال کی مدت کا نصاب (دس نشستیں) سرکاری پالی ٹیکنک مرزاپور میں ایک سال کی مدت کا صنعتی انجینیرنگ کورس (دس نشستیں) اور گورنمنٹ پالی ٹیکنک گورکھپور میں ایک سال کی مدت کا ریفریجریشن اور ایرکنڈیشنگ کورس (دس نشستیں) شامل ہیں۔ اس کے علاوہ گورنمنٹ پالی ٹیکنک جھانسی میں الکٹرانکس میں ایک سہ سالہ نصاب بھی شروع کیا گیا ہے جس میں تیس طلبا کے داخلہ کی گنجائش ہے

٭ ٭ ٭

اترپردیش میں ۹۷۰ ترقیاتی بلاک جو سنہ ۱۹۶۶ء میں ختم کر دیے گئے تھے اب چھ سال بعد ۲، اکتوبر سنہ ۱۹۷۲ء سے دوبارہ کام کرنے لگیں گے۔ تمام ترقیاتی بلاکوں میں جن کی تعداد اب بڑھ کر ۸۷۰ ہو گئی ہے کی تو تنظیم کرنے کے لیے ضروری کارروائی مکمل ہو گئی ہے۔ بلاک کی سطح پر نظم و نسق کی اس غرض سے اصلاح کی جا رہی ہے کہ متعدد ترقیاتی اسکیموں کو تیزی سے بروئے کار لایا جا سکے اور مکمل کیا جا سکے۔ ڈویزنل کمشنروں سے کہا گیا ہے کہ وہ اسسٹنٹ ڈولپمنٹ افسروں اور متعدد ترقیاتی محکموں کے افسروں میں سے نئے ترقیاتی بلاک افسروں کا انتخاب کریں۔

ریاست میں نو تنظیم شدہ ہر بلاک کے دائرۂ عمل میں تقریباً ۸۰۰۰۰ دیہی آبادی آ جائے گی جبکہ بیس سال قبل ان بلاکوں کے قیام کے وقت یہ تعداد ۶۶۰۰۰ تھی۔ نو تنظیم شدہ بلاکوں کے صدر مقامات دیہی باشندوں کی سہولت کے لیے بلاک میں کسی بھی گاؤں سے ۸ سے ۱۰ کلومیٹر کے اندر واقع ہوں گے۔

٭ ٭ ٭

اترپردیش کے انتہائی حد آراضی قانون سنہ ۱۹۶۰ء میں مجوزہ ترمیم کی مجالس قانون ساز سے منظوری حاصل ہونے پر مختلف زمروں کے بے زمین افراد میں جن میں ہریجن بھی شامل ہیں تقسیم کے لیے ۴۰ر۳ لاکھ ایکڑ زمین کی دستیابی متوقع ہے۔ اس تقسیم سے ۱۵ر۱ لاکھ دیہی کنبے مستفید ہوں گے۔

مجوزہ ترمیم سے نہ صرف جوتوں کی انتہائی حد کم ہو جائے گی بلکہ مذکورہ بالا قانون کی خامیاں دور کرنے میں بھی مدد ملے گی جس کا فائدہ اٹھا کر سماج کا ایک خاص طبقہ اپنے مفاد کو پورا کر رہا تھا۔ اس سلسلے میں جو متعدد اہم اقدامات کیے گیے ہیں ان میں مذکورہ قانون کے تحت فراہم کردہ متعدد مراعات کا خاتمہ شامل ہے جس کا سہارا لے کر کھاتیدار جوت کی انتہائی حد سے زیادہ زمین پر قابض رہتے ہیں۔ اس امر کے پیش نظر کہ قانون کو پچھلی تاریخوں سے نافذ کرنے میں کوئی دشواری نہ ہو زمین سے دست بردار ہونے کا اختیار کم کیا جا رہا ہے۔ خاندان کے ارکان کی زمینیں بھی کھاتیدار کی جوت میں شامل کی جائیں گی تاکہ وہ اپنی بیوی یا نابالغ بچوں کے نام پر انتہائی حد سے زیادہ زمین اپنے قبضہ میں نہ رکھ سکے۔

٭ ٭ ٭

حکومت اترپردیش نے مفت آبپاشی نہروں سے آبپاشی پر دو عملی محصول نظام کو ختم کرنے اور ان نہروں سے آبپاشی کے لیے شیڈول اول کی شرحیں نافذ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ فیصلہ آئندہ یکم اکتوبر سے نافذ ہوگا۔ اس سلسلے میں محکمہ آبپاشی کے جاری کردہ پریس نوٹ میں کہا گیا ہے۔ اس وقت ریاست

میں لفٹ آبپاشی نہروں سے آبپاشی پر دو عملی محصول نظام نافذ ہے اس بنیاد پر مذکورہ شرحیں نہروں کے لیے رائج شیڈول اول کی شرح سے زیادہ ہیں۔ چنانچہ آبپاشی کی صلاحیت کا پورا پورا استعمال کرنے کے لیے حکومت نے اس پیچیدہ نظام کو ختم کرنے اور ایسی لفٹ نہروں سے آبپاشی پر شیڈول اول کی شرحیں وصول کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان شرحوں کا اطلاق یکم اکتوبر ۱۹۷۲ء سے ہوگا

جولائی سے اکتوبر تک ہر ۱۲۰۰۰ گیلن پانی کے لیے ایک روپیہ وصول کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے جبکہ اس وقت ریاستی ٹیوب ویلوں سے پانی کی فراہمی پر ہر ۸۰۰۰ گیلن پانی کے واسطے ایک روپیہ وصول کیا جاتا ہے سال کے بقیہ حصہ کے لیے ہر ۶۰۰۰ گیلن پانی کے واسطے ایک روپیہ کی شرح مقرر کی گئی ہے۔ ان شرحوں کا نفاذ بھی یکم اکتوبر ۱۹۷۲ء سے ہوگا۔

آزادی کی ۲۵ ویں سالگرہ کے سلسلے میں گذشتہ ۱۵ ار اگست کو شروع کیے گئے ایک خصوصی پروگرام کے تحت ریاست میں ۵۴ ایلوپیتھک اور ۱۲ آیورویدک ڈسپنسریاں قائم کی گئی ہیں۔

محکمہ علاج کی تیار کردہ ایک فہرست کے مطابق ریاست بھر میں ۲۵ جنوری ۱۹۷۳ء تک مجموعی طور پر ۱۰۲ ایلوپیتھک ۲۶ آیورویدک اور ۲۰ ہومیوپیتھک ڈسپنسریاں قائم کی جائیں گی۔ گاندھی جینتی۔ پنڈت نہرو کے یوم پیدائش وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے یوم پیدائش اور یوم جمہوریہ کے موقعوں پر ان ڈسپنسریاں کھولنے کے نشانے مقرر کیے گئے ہیں۔

ریاست میں ہاؤسنگ کارپوریشن کی جانب سے مکانات کی تعمیر سے متعلق مختلف اسکیموں کے تحت تیار کیے گئے پانچ فیصد پلاٹ اور تعمیر شدہ مکانات مجاہدین آزادی کو الاٹ کرنے کے لیے محفوظ کر دیے جائیں گے۔

مجاہدین آزادی کو یہ پلاٹ اور مکانات نیلام کرنے کے بجائے بغیر نفع و نقصان کی بنیاد پر دیے جائیں گے۔

یہ سہولت صرف ایسے مجاہدین آزادی اور ان کے پسماندگان کو حاصل ہوگی جن کے پاس رہنے کے لیے اپنا کوئی مکان نہیں ہے۔

حکومت اترپردیش نے ریاست بھر میں مہمانوں سے متعلق کنٹرول حکم ۱۹۷۲ء نافذ کر کے عام تقریبات شادی بیاہ اور تجہیز و تکفین جیسے خصوصی موقعوں پر محض نمود و نمائش کی خاطر بے جا مصارف کے پیش نظر غذائی اجناس کے استعمال اور مہمانوں کی تعداد پر پابندی عائد کر دی ہے۔

یہ نیا حکم غذائی اجناس کے استعمال پر پابندی سے متعلق حکم ۱۹۶۶ء کی جگہ پر ۱۹ ستمبر ۱۹۷۲ء سے نافذ کیا گیا ہے۔

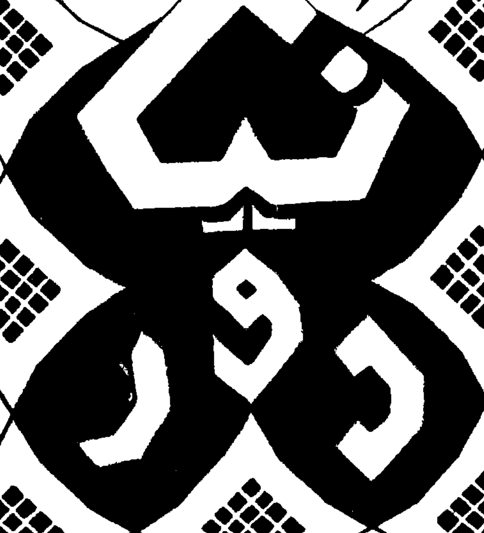
اس حکم کے تحت عام تقریبات کے موقع پر ایک دن میں ۲۵ سے زیادہ مہمانوں اور شادی اور تجہیز و تکفین سے متعلق خصوصی موقعوں پر ۱۰۰ سے زیادہ مہمانوں کو اناج اور دالوں سے بنی ہوئی غذائی اشیاء اور تمام قسم کی مٹھائیاں کھلانے پر پابندی عائد کر دی گئی ہے۔

متفرقات

امدادی پروگرام میں سڑکوں کی تعمیر۔ ریاست کے خشک سالی سے متاثرہ ۴۲ اضلاع میں امدادی پروگرام کے تحت دیہی علاقوں میں مجموعی طور پر ۱۵۲۹ کیلومیٹر کچی سڑکوں کی تعمیر پر غور کیا جا رہا ہے۔ اس پروگرام کے تحت جس پر تقریباً ۵ کروڑ روپیہ کی لاگت آئے گی ہر ضلع میں ۳۲ کیلومیٹر لمبی دیہی سڑکوں کی تعمیر کی تجویز ہے۔ ہر ضلع میں ان سڑکوں کی تعمیر کے نتیجے میں دیہی مزدوروں کو ۱۵۲۵۷۶ کام کے دنوں کا روزگار فراہم کیا جائے گا۔

واجبات کی وصولی میں رعایت۔ اترپردیش ریاستی بجلی بورڈ نے ناکافی بارش کے پیش نظر اپنے سپرنٹنڈنٹ انجینئروں اور ایگزیکیوٹیو انجینئروں کو ہدایت کی ہے کہ وہ نجی ٹیوب ویلوں یا پمپنگ سیٹوں کے بجلی کے کنکشن بجلی واجبات کی عدم ادائیگی کی بنا پر آئندہ ۳۰ نومبر ۱۹۷۲ء تک نہ کاٹیں۔

ان ہدایات کا اطلاق بہرحال ایسے ٹیوب ویلوں اور پمپنگ سیٹوں پر نہیں ہوگا جن کے کنکشن واجبات کی عدم ادائیگی کی وجہ سے پہلے ہی کاٹے جا چکے ہیں۔



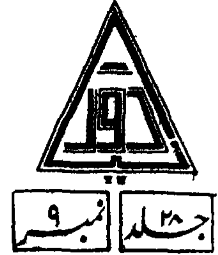
دسمبر ۱۹۷۲ء

اگر ہانمبر ۱۸۹ اشک

قیمت

۵۰

پیسے



جلد ۲۸ | نمبر ۹

اگرہائن ۱۸۹۴ شک
دسمبر سنہ ۱۹۷۲ء

چندہ سالانہ پانچ روپے
فی پرچہ ۵۰ پچاس پیسے

ایڈیٹر
خورشید احمد

پبلشر
شرومنی شرما
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

پرنٹر
اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری۔ یوپی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ، لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

عنوانات

سرورق: علی عطا آرٹسٹ

اپنی بات

اتر پردیش کے سابق گورنر ڈاکٹر بی گوپال ریڈی کے مدت گورنری ختم ہونے پر اپنے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد جناب اکبر علی خاں صاحب نے یو پی کے گورنر کی حیثیت ۱۴ نومبر ۱۹۷۲ء کو اپنا عہدہ سنبھال لیا ہے۔

مسٹر اکبر علی خاں ۲ نومبر ۱۸۹۹ء کو حیدرآباد کے ایک خوش حال جاگیردار خاندان میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اور ثانوی تعلیم حیدرآباد میں حاصل کی۔ ہائی اسکول کا امتحان پاس کرنے کے بعد آپ علی گڑھ یونیورسٹی میں داخل ہوئے۔ اسی یونیورسٹی میں ۱۹۲۰ء میں مہاتما گاندھی اور علی برادران سے متاثر ہوکر تحریک عدم تعاون میں شامل ہوگئے۔

اس کے بعد آپ عثمانیہ یونیورسٹی میں داخل ہوئے اور وہاں سے بی اے کی ڈگری حاصل کرکے اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن چلے گئے، جہاں انھوں نے لندن یونیورسٹی سے ایل ایل۔ بی (آنرس) کا امتحان پاس کیا پھر مڈل ٹمپل سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کی اور ۱۹۲۷ء میں آپ حیدرآباد واپس آگئے۔ اور مولوی احمد شریف، راے شیو ناتھ، سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر ٹی سری راس آئنگر جیسے مشہور وکیلوں کے ساتھ کام کیا

مسٹر خان ملکی تحریک کے روح رواں رہے ہیں۔ آپ حیدرآباد میونسپل کارپوریشن کے میئر بھی رہ چکے ہیں اس کے علاوہ آپ ۱۰ سال تک ہارورسوسائٹی آف یونین ایمڈ پرڈکریس کے صدر بھی رہے۔ حیدرآباد میں پہلی بار جب ۱۹۴۰ء میں کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا تو آپ کو نائب صدر منتخب کیا گیا۔ ۱۹۵۲ء میں آپ عثمانیہ یونی ورسٹی کی سینیٹ کے ممبر منتخب ہو، اس وقت بھی آپ علی گڑھ یونی ورسٹی، جامعہ ملیہ اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی سینیٹ کے ہیں۔ آپ نے ۱۹۵۵ء میں حیدرآباد میں پالی ٹیکنیک قائم کی جو گزشتہ ۱۶ سال سے بہ خوبی کے ساتھ کام کر رہی ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے انتقال کے بعد اس پالیٹکنیک کا نام جواہر لال نہرو پالی ٹیکنک رکھ دیا گیا ہے۔

مسٹر اکبر علی خاں اقوام متحدہ میں شرکت کرنے والے اس ہندستانی وفد کے رکن تھے جس کے سربراہ مسٹر کرشنا مینن تھے۔ آپ مسٹر اننت سایم آینگر کی قیادت میں ایک خیرسگالی مشن کے رکن کی حیثیت سے چین بھی تشریف لے گئے اس کے علاوہ موصوف نے ماسکو، مشرق وسطیٰ، ایشیا اور افریقہ کے متعدد ملکوں کا بھی دورہ کیا۔ آپ ۱۸ سال تک راجیہ سبھا کے ممبر اور ۱۲ سال تک اس کے اعزازی وائس چیرمین رہے۔ آپ کو کانگریس پارلیمانی پارٹی کا ڈپٹی لیڈر بھی منتخب کیا گیا تھا۔

مسٹر اکبر علی کا خاص کارنامہ ہندو مسلم اتحاد کو مستحکم بنانا ہے آپ سیکولر نقطۂ نظر میں پختہ یقین رکھتے ہیں۔ آپ اس وقت بھی ثابت قدم رہے جب کہ مرحوم مسٹر محمد علی جناح اور نواب بہادر یار جنگ نے آپ کو اتحاد المسلمین میں شرکت کرنے کی ترغیب دی۔ موصوف نے حیدرآباد کی وزارت عظمیٰ کا عہدہ قبول کرنے سے بھی انکار کر دیا جب کہ وہ صرف مسلم لیگ کے فارم پر دستخط کرکے ایسا کر سکتے تھے۔

گورنری کا عہدہ سنبھالنے کے بعد ہی سے آپ نے یہاں کی سماجی زندگی میں گہری دلچسپی لینا شروع کر دی ہے ہمیں یقین ہے کہ آپ کی اس دلچسپی سے نہ صرف ریاست کی سماجی اور شہری زندگی میں صالح اقدار کا اضافہ ہوگا بلکہ ہندو مسلم اتحاد جو ہندستان کا امتیاز رہا ہے اور جو سامراجی سازشوں کی نذر ہوگیا، جس کے اثرات اب تک چلے جا رہے ہیں، از سر نو مستحکم بنیادوں پر قائم ہوگا۔

آہ احتشام حسین صاحب

ہمارے رہبر سہارہ کی اشاعت میں بعض ناگزیر اسباب کی بنا پر تھوڑی سی تاخیر ہوگئی تھی اور اس کی آخری کاپی پریس میں پہنچ گئی تھی کہ پروفیسر سید احتشام حسین صاحب کے سانحۂ ارتحال کی خبر بجلی بن کر گری۔ پہلی دسمبر کا وہ منحوس دن تھا جب احتشام صاحب دنیائے علم و ادب، دنیائے شرافت و انسانیت، دنیائے خلوص و محبت، دنیائے انکسار و مروت کو تاریک بنا کر چلے گئے یقین نہیں آتا کہ یہ گرامی ذات اب ہمارے درمیان نہیں رہی اور بار بار دل میں یہ سوال اٹھتا ہے کیا اب احتشام صاحب سے کبھی ملاقات نہ ہوگی؟

احتشام صاحب کی ہمہ گیر شخصیت میں ایسی کشش تھی، ایسا جذب تھا کہ جو بھی ایک بار ان سے قریب ہوتا ہمیشہ کے لیے ان کا گرویدہ ہو جاتا یہ گرویدگی ان کی علمی، ادبی، تحقیقی اور تنقیدی قابلیت، سوجھ بوجھ، دور بینی اور معاملات و مسائل کو انتہائی خوبی کے ساتھ حل کرنے کی زبردست قابلیت کے باعث تو ہوتی ہی اس سے بڑھ کر ان کے خلوص محبت، انکسار، مروت، فراخ دلی، ہمدردی اور پاس وضعداری کی بنا پر ہوتی۔ موجودہ دور میں شاید ان کی واحد ذات تھی جس سے کسی کو شکایت نہیں پایا گیا۔ وہ سب کے بیابیہ تھے اور ان کو سب سے پیار تھا۔ یہ ان کی شہرت، عظمت اور مقبولیت کی ادنیٰ دلیل ہے کہ کوئی جلسہ ہو، کوئی کمیٹی ہو، کوئی سیمینار ہو، اکیڈمی ہو ان کے بغیر نامکمل سمجھی جاتی تھی کئی اجتماعات احتشام صاحب کے انتظار میں ملتوی ہوتے کہ وہ آلیں تو انجام پائیں۔ ان کے ساتھ اس طرح کے اجتماعات بھی مر گئے۔ ان کی اچانک ابدی جدائی کا جو زبردست دھچکا لگا ہے اس کے باعث اظہار تاثر کے لیے الفاظ بھی نہیں مل رہے ہیں۔ یہ حال راقم الحروف ہی کا نہیں ہے بلکہ سبھی کی یہ حالت ہوگی۔ ایسی عظیم ہستی کے اٹھ جانے سے جو خلا پیدا ہوگیا ہے اس کا صحیح احساس ابھی نہیں شدت غم میں رفتہ رفتہ کمی کے ساتھ ہوگا اور اس وقت اندازہ ہوگا کہ بے رحم موت نے ہمارے ساتھ کیا ظلم کیا ہے۔ بقول ملکی شاعر اقبال ؎ ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے؛ بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

لیکن احتشام صاحب کے ایسا دیدہ ور پیدا ہونا "بڑی مشکل" نہیں ناممکن ہے ادارہ بیاد احتشام صاحب کے پس ماندگاں کے غم میں اسے اپنا بھی غم سمجھ کر شریک ہے۔ — ایڈیٹر

دسمبر ۱۹۷۲ء

اگرہا ٹھ ۱۸۹۴ شک

[illegible]

★ ———— ابراہیم یوسف

اردو یکبابی اسٹیج ڈراما وہ صنف (صنفِ ادب) ہے جس کی طرف نہ تو خاطر خواہ توجہ دی گئی اور نہ اس کو وہ اہمیت حاصل ہوئی جو فنونِ لطیفہ کی دوسری اصناف کو حاصل ہے۔ اس کی وجہ ہمارے کچھ تعصبات ہیں جو اس فن کے مقابلے میں ہمیں زیادہ عزیز ہیں۔ بقول ڈاکٹر محمد حسن "جس وقت اردو ڈرامے اسٹیج پر نہ کھیلے جا رہے تھے اس وقت ہمارے ادیب اور نقاد ڈرامے کو ادبی صنف تو کیا فن تسلیم تک قرار دیتے ہوئے ہچکچاتے تھے"[1]۔ کچھ اس سے ملتی جلتی بات وقار عظیم نے بھی کہی ہے کہ "جن لوگوں نے ڈرامے کو ایک صنفِ ادب تسلیم کیا ہے ان کا انداز معذرت کا ہے۔ ایسے لوگوں کا کہنا ہے کہ ادبی اوصاف ڈرامے کے لیے بنیادی حیثیت نہیں رکھتے"[2]۔ منظر حسین دسنوی نے ڈرامے کے متعلق جو انکشافات فرمائے ہیں وہ بھی خالی از دلچسپی نہیں، فرماتے ہیں (۱)۔ "کلیم الدین کے اس مشہور جملے میں جو انھوں نے گل نغمہ کا تعارف لکھتے ہوئے غزل کے متعلق تحریر کیا ہے کہ غزل ایک نیم وحشیانہ صنفِ شاعری ہے ذرا تصرف کر کے ڈرامے کو ایک نیم وحشیانہ صنفِ ادب نہ بھی کہیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ ادنیٰ قسم کا فن ہے جو غیر ترقی یافتہ اقوام یا نیم خواندہ افراد اور کم عمر نوجوانوں کی ضرورتوں کو مدِ نظر رکھ کر لکھا اور پیش کیا جاتا ہے[3]" (۲) "ابتدائی انسان کی طرح بچوں کو بھی ایسے تجربات کے اظہار کے لیے اپنے مافی الضمیر کو موثر اور دل نشیں انداز میں پیش کرنے کے لیے اشارات، حرکات و سکنات سے کام لینا پڑتا ہے اس لیے اگر یہ سچ ہے کہ "ڈرامے کا فن ڈراما نگار کا نہیں بلکہ اداکار کا فن ہے تو دراصل یہ بچوں کا فن ہے یا ابتدائی انسان کا"[4] (۳)" اس میں شک نہیں کہ موجودہ دور میں بھی ڈرامے اور تھیٹر کی بہت مانگ ہے اور کسی تھیٹر میں تماشائیوں کی کمی نہیں ہوتی۔ لیکن ان تماشائیوں میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جو اپنے ذہنی ارتقا میں نامکمل تعلیم یا کسی نفسیاتی وجہ کی بنا پر پیچھے رہ گئے ہیں اور ان میں فنونِ لطیفہ کی اعلیٰ قسموں سے محظوظ ہونے کی صلاحیت موجود نہیں[5]"۔ ان تمام بیانوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اسٹیج ڈراما خواہ وہ پورے وقت کا ہو خواہ یکبابی، مختلف قسم کے تعصبات کا شکار ہے۔ خاص طور پر یکبابی اسٹیج ڈراما شاید سب سے زیادہ نظر انداز کیا گیا ہے جس کے باعث اس کے متعلق کبھی کوئی واضح تصور پیدا نہ ہو سکا۔ پروفیسر احتشام حسین تو یکبابی اسٹیج ڈرامے کو موردِ عتاب گردانتے ہیں۔ فرماتے ہیں "جس طرح بعض صورتوں میں مختصر افسانہ ناول کی راہ میں اور غزلیں نظموں کی راہ میں کھڑی ہو گئی ہیں اسی طرح یکبابی تمثیلیں اچھے مکمل ڈرامے کے راستے میں حائل ہیں۔ یہ تمثیلچے واقعی ڈراموں کا بدل نہیں بن سکتے[6]"۔

جب یک بابی اسٹیج ڈرامے کے سلسلے میں صورت حال یہ ہو تو ظاہر ہے کہ اس صنف کی ترقی کے راستے محدود ہو جاتے ہیں اور ہر

---

[1] محمد حسن اردو ڈراما آزادی کے بعد ماہنامہ آج کل، دہلی ڈراما نمبر، سوری ۱۹۵۹ء ص ۶۳ [2] بحوالہ منظر حسین دسنوی ادب میں ڈرامے کا مقام، ماہنامہ شاعر بمبئی، ستمبر ۱۹۶۶ء ص ۳۶ [3]، [4] [5] منظر حسین دسنوی ادب میں ڈرامے کا مقام، ماہنامہ شاعر مئی ستمبر ۱۹۶۶ء ص ۲۶، ص ۲۷، ص ۲۸ [6] احتشام حسین جدید اردو ڈراما اور اس کے مسائل، ماہنامہ آج کل، دہلی ڈراما نمبر جنوری ۱۹۵۹ء ص ۸

الم غلم چیز جو مکالموں میں لکھ دی جاتی ہے یکبابی اسٹیج ڈراما تسلیم کر لی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر "شمع منزل"[1] جو ڈرامے کے عنوان سے شائع ہوا ہے، اسٹیج ڈراما تو خیر وہ کسی بھی نقطۂ نظر سے نہیں ہے اسے ادبی مکالمے کا نام دینا بھی محل نظر ہے مگر اس کو ڈراما کہا گیا ہے۔ اس طرح یہ صنف بار بار غلط فہمیوں کا شکار ہوتی چلی جا رہی ہے اور اب تو یہ عالم ہے کہ ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کر رکھی ہے جس کا جو جی چاہا مکالموں میں لکھ دیا یا صرف مکالمے لکھ دیے اور بضد ہو گئے کہ اسے ڈراما تسلیم کرو۔ کبھی اس صنف کے فنی پہلو پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا گیا۔ جن لوگوں نے یکبابی اسٹیج ڈرامے سنجیدگی سے لکھے بھی تو صرف منھ کا ذائقہ بدلنے کے لیے۔ جب منھ کا ذائقہ ہی بدلنا ہے تو پھر فن کے متعلق غور کرنے کا زیادہ سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے اردو یکبابی اسٹیج ڈراما کا نہ تو کوئی صحیح روپ ہی واضح ہے اور نہ اس کا کوئی علاحدہ وجود۔ ادھر کچھ حضرات نے ریڈیو ڈرامے اور اسٹیج ڈرامے کو کچھ اس طرح گڈمڈ کر دیا کہ اسٹیج یکبابی ڈرامے کا مفہوم و مقصد اور صورت مسخ ہو کر رہ گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہر شخص کے ذوق پر منحصر ہے کہ جسے چاہے اسٹیج ڈراما کہہ دے اور جسے چاہے ریڈیو ڈراما بلکہ عافیت اسی میں ہے کہ اس جھنجھٹ ہی میں نہ پڑا جائے بلکہ صرف چھپنے چھپانے کے شوق کو پورا کرنے کے لیے صرف ڈراما کہلائے۔

یہ بات تو تسلیم نہیں کی جا سکتی کہ ہمارے یہاں یکبابی اسٹیج ڈراموں کو پرکھنے والوں کی کمی ہے مگر یہ ضرور ہے کہ وہ مصلحت پسندی کا شکار ہیں اور احتساب کرنے کی ذمہ داری قبول کرنے سے کتراتے ہیں کیونکہ یہاں آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے اور اسے سدھارنے کی کوشش بڑے دل گردے کی بات ہے۔ یکبابی اسٹیج ڈراموں کے مجموعے مشکل ہی سے شائع ہوتے ہیں اور یہ ڈرامے زیادہ تر رسائل کی زینت بن کر رہ جاتے ہیں۔ اس لیے ادبی سیاست اور اس کی مصلحت پسندی سے ہٹ کر آرام پسندی کی مصلحت ہے کہ کون ہزاروں رسائل کی ورق گردانی کرتا پھرے۔ اگر کوئی نقاد کسی مجبوری یا ریڈیو کی فرمائش پر کچھ لکھتا بھی ہے تو وہ پرانے ڈراموں کا جائزہ لے کر اپنی عزت بچا لیتا ہے۔ غزل، نظم، افسانہ اور ناول کی تو باقاعدہ تاریخیں مرتب ہیں۔ سال میں متعدد مضامین ان اصناف پر لکھے جاتے ہیں اور ان تجربات اور تبدیلیوں کی جانب نشاندہی کی جاتی ہے جو ان اصناف میں ہوئی ہیں مگر یکبابی اسٹیج ڈراما کی طرف سے مجرمانہ بے اعتنائی برتی جا رہی ہے کہ اس نے ترقی کی کون سی منزلیں طے کی ہیں یا وہ تباہی کے کس راستے پر گامزن ہے۔ پورے وقت کے ڈرامے پر تو کبھی کوئی لکھ بھی دیتا ہے مگر یکبابی اسٹیج ڈراما کار بیکاراں کے مصداق ہے جس پر رم اور گرم نگاہ ڈالنا وقت برباد کرنے کے مترادف ہے۔ کم از کم اب وقت تو نہیں رہا ہے کہ لوگ اسے "فن شریف" قرار دیتے ہوئے ہچکچاتے ہوں مگر یہ ضرور ہے کہ اسے شاعری، افسانہ نگاری یا ناول نویسی کے مقابلے میں کمتر درجے کا ہی سمجھا جاتا ہے اور اس کی ادبی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں کیونکہ اس بات کو تسلیم کر لیا گیا ہے کہ اس کا تعلق صرف اسٹیج سے ہے ادب سے نہیں۔

آج کل متعدد رسائل ڈرامے چھاپتے ہیں مگر تجربہ یہی بتلاتا ہے کہ قارئین ڈرامے کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ دنیا کی ہر بڑی زبان میں درسی نصاب میں ڈرامے کو شامل کیا جاتا ہے لیکن بدقسمتی سے اردو ہی ایسی زبان ہے جس کے نصاب میں ڈرامے کی کوئی جگہ نہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ بمبئی یونیورسٹی کے ایم۔ اے کے نصاب میں ڈرامے کا ایک پرچہ شامل ہے مگر دوسری

اردو یکبابی اسٹیج ڈراما کن کن مشق ہائے ستم کا نشانہ بنا ہے اس پر نظر ڈالنا بے جا نہ ہوگا۔ ڈاکٹر سید حامد حسن قادری فرماتے ہیں کہ "اردو میں مختصر ڈرامے کا رواج اسٹیج کی ضروریات کی بنا پر نہیں بلکہ ادبی صنعت کی حیثیت سے ہوا جسے مغرب میں خاص مقبولیت حاصل ہے۔ اردو میں مختصر ڈراما خالص ادبی چیز بن گیا۔"[2] ڈاکٹر صاحب موصوف کے خیال کا پہلا حصہ کہ "اردو میں مختصر ڈرامے کا رواج اسٹیج کی ضرورت کی بنا پر نہیں بلکہ ادبی حیثیت سے ہوا" حقیقت سے بعید ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس عام غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں کہ یکبابی ڈراما اور ادبی مکالمے دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔

ادبی مکالموں کو ڈرامے کا نام دینا ایک مرض سا بن گیا ہے جس سے

---

[1] اظہر افسر: شمع منزل، شاعر بمبئی کا سہ ماہی حصہ اکتوبر، نومبر، دسمبر ۱۹۶۲ء ص ۱۹۱ تا ۱۹۶ [2] ڈاکٹر سید حامد حسن، اردو میں مختصر ڈراما: ماہنامہ شاعر بمبئی، ڈراما نمبر ۱۹۶۲ء ص ۱۶

ایسی غلط فہمیاں پیدا ہوتی جا رہی ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح انگریزی میں مختصر یا یکبابی ڈرامے کی ابتدا کرٹین ریزر (CURTAIN RAI-ZERS) سے ہوئی جو ڈراما شروع ہونے سے پہلے ان تماشائیوں کی دلچسپی قائم رکھنے کے لیے دکھلائے جاتے تھے جو وقت سے پہلے تماشا گاہ میں آجاتے تھے اسی طرح اردو یکبابی اسٹیج ڈرامے کی ابتدا ان چھوٹے چھوٹے کامکس سے ہوئی جو پارسی تھیٹر میں ڈرامے کے شروع یا آخر میں دکھلائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ انگریزی کے پھیلاؤ نے بھی لوگوں کو اس جانب مائل کیا۔ اس کے علاوہ ان کالجوں اور اسکولوں میں جو انگریز مشنریوں کے ذریعے چلائے جاتے تھے انگریزی کے یکبابی ڈرامے اسٹیج کیے جاتے تھے ان کو دیکھ کر اردو والوں کو بھی اس صنف میں دلچسپی پیدا ہوئی اور یکبابی اسٹیج ڈرامے نے جنم لیا۔ اس لیے یہ خیال کہ یکبابی یا مختصر ڈرامے کی ابتدا اور اسٹیج کی صورت سے نہیں بلکہ ادبی حیثیت سے ہوئی حقیقت سے بعید ہے۔ ڈاکٹر حامد حسن کے بیان کا دوسرا حصہ بھی کہ مختصر ڈراما خالص ادبی چیز بن گیا محل نظر ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اسے خالص ادبی چیز گردانتے ہیں جبکہ وقار عظیم کو ڈرامے کی ادبی حیثیت پر ہی شک ہے۔ اس قسم کے متضاد بیانات نے ڈرامے اور یکبابی ڈرامے کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔ ڈاکٹر حامد حسن کو اس کے خالص ادبی ہونے کا شک اس وجہ سے ہوا ہے کہ ابتدا میں کچھ بزرگوں نے ڈرامے کے لوازمات سے قطع نظر کر کے مکالمے لکھے اور ان میں ادبی چاشنی ہی کو ضروری سمجھا مگر جوں جوں یکبابی ڈرامے کے متعلق علم بڑھتا گیا یہ رجحان بھی ختم ہونے لگا۔ ممکن ہے آج بھی کچھ لوگ ایسے نکل آئیں جو صرف مکالمے ہی کو ڈراما سمجھیں۔ مگر اب یکبابی ڈرامے پر قطعی طور پر یہ حکم نہیں لگایا جا سکتا کہ وہ محض ادبی مکالمہ ہی بن کر رہ گیا ہے۔ اسی طرح وقار عظیم کے اس خیال سے بھی اتفاق نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ڈرامے کا تعلق ادب سے ہے ہی نہیں۔ درحقیقت پورے وقت کا ڈراما ہو یا یکبابی۔ وہ بیک وقت اسٹیج اور ادب سے اپنا رشتہ جوڑے ہوئے ہے جیسا کہ پروفیسر احتشام حسین فرماتے کہ "ڈراما ادب اور اسٹیج کی یکجائی سے تخلیق کے پیکر میں ڈھلتا ہے اس لیے عالمی ادب میں وہ ڈرامے کامیاب ہیں جو دونوں کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوں"[۱] اس طرح پورے وقت کا ڈراما ہو یا یکبابی وہ اسٹیج اور ادب دونوں سے اپنا رشتہ قائم کیے ہوئے ہے۔ اگر ڈراما نگار ان دونوں میں توازن برقرار رکھنے میں ناکام ہو جاتے ہیں تو اس سے ڈرامے کی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اردو کا کوئی ایسا باقاعدہ اسٹیج نہیں ہے۔ اگر سال میں دس پانچ ڈرامے کالجوں اور اسکولوں کے اسٹیج پر کھیل لیے جاتے ہیں یا کچھ شوقین مزاج لوگ ایک دو ڈرامے اسٹیج کر لیتے ہیں یا کچھ پیشہ ور لوگ ایک دو ڈرامے دکھلا دیتے ہیں تو اس کو اسٹیج کا وجود تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ اور چونکہ اسٹیج نہیں ہے اس لیے صنف ڈراما کو بالکل نظر انداز کر دینا اس صنف کے ساتھ انصاف نظر نہیں آتا۔

اس طرح ڈرامے کی دو حیثیتیں ہیں، ایک اس کا ادبی ہونا اور دوسری اس کا فنی ہونا۔ فنی سے مراد اس کی وہ تکنیکی حیثیت ہے جو اس کو دوسری اصناف سے جدا کر کے اسٹیج پر پیش کیے جانے کی صلاحیت پیدا کرتی ہے۔ ادبی سے مراد زبان و بیان کے ساتھ اس کا زندگی اور اس کی پیچیدگیوں کو پیش کرنا ہے۔ ڈراما زندگی سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ زندگی کی عکاسی افسانے اور ناول میں کی جاتی ہے۔ اگر انسان کے جذبات و احساسات کا اظہار شاعری میں کیا جا سکتا ہے تو یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ ڈرامے کو ادب سے کیوں خارج کر دیا جاتا ہے یا اس کی ادبی حیثیت کو قبول کرنے میں کون سا امر مانع ہے جبکہ ڈراما زندگی کی پیچیدگیوں، انسان کے احساسات و جذبات، اس کے غموں اور مسرتوں کو جس انداز سے پیش کرتا ہے اس میں واقعیت اور تاثر زیادہ ہوتا ہے اس لیے اسے قطعی ادب سے خارج کر دینا یا تو مصلحت پسندی ہے یا پھر ڈرامے کی طرف سے تعصب۔ ا مارکلی اسٹیج ڈراما نہیں ہے مگر اس کی ادبی حیثیت مسلم ہے بلکہ اب تو وہ قطعی ادبی شاہکار ہی بن کر رہ گیا ہے۔ شیکسپیر کے ڈرامے اگر اپنے اندر اسٹیج پر کھیلے جانے کی صلاحیت رکھتے ہیں تو وہ انگریزی ادب کے بھی شاہکار ہیں۔ پروفیسر مجیب کے زیادہ تر ڈرامے اپنی چند فنی کمزوریوں کے ہوتے ہوئے بھی ادب پارے ضرور ہیں۔ پھر ہم ڈرامے کو ادب میں شامل کرنے سے کیوں ترملتے ہیں اور اسے بطور ادب قبول کرنے میں کون سی قباحت ہے۔

---

[۱] پروفیسر احتشام حسین جدید ڈراما اور اس کے مسائل ماہنامہ آج کل دہلی ڈراما نمبر جنوری ۱۹۵۹ء ص ۵

اسے بہرحال صنفِ ادب سے خارج کر دینے کا کوئی معقول جواز سمجھ میں نہیں آتا۔ ممکن ہے ایک بڑا طبقہ میرے اس خیال سے متفق نہ ہو لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ریڈیو پر ڈرامے کو سن کر لطف اندوز ہوا جا سکتا ہے اگر مرتے ہوئے کو سن کر لوگ بدحال ہو جاتے ہیں تو پڑھ کر بھی کچھ کم بدحال نہیں ہوتے۔ پھر ڈراما کو پڑھنے میں کون سی قباحت ہے مانا کہ ڈرامے کو اسٹیج سے علاحدہ نہیں کیا جا سکتا مگر جہاں تک اس کے ادبی پہلو کا تعلق ہے اس کے لیے ڈرامے کو پڑھنا کوئی غیر ادبی بات نہیں ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ڈرامے کی طرف سے جو تعصب ذہنوں میں پیدا ہو گیا ہے اس کا دور ہونا بہت مشکل نظر آتا ہے۔

ایک اور عام اعتراض آج کے یکبابی ڈرامے کے متعلق کیا جاتا ہے وہ یہ کہ "ان ادبی نقطۂ نظر سے لکھے جانے والے مختصر ڈراموں پر مختصر افسانے کا فن غالب نظر آتا ہے"[1]۔ اس میں شک نہیں کہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے اس اعتراض میں بڑا وزن ہے اور اعتراض بھی حقیقت سے بہت قریب ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے۔ درحقیقت ڈراما ہو پورے وقت کا ہو یا یکبابی بڑی حد تک وہ ایک فارمولائی فن ہے اور جب بھی اس فارمولے کو نظرانداز کیا جاتا ہے ڈراما اپنا جولا اتار پھینکتا ہے اور کوئی دوسری چیز بن جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جناب مسعود صاحب نے میرے ایک ڈرامے "داغ اور دھبے" پر ماہنامہ شاعر بمبئی بابتہ ماہ مارچ ۱۹۶۲ء میں بحث کرتے ہوئے ڈرامے میں کشمکش کو ضمنی شے قرار دیا ہے اور چونکہ ضمنی شے کو نظرانداز بھی کیا جا سکتا ہے اس لیے ایسے ڈرامے جس میں کشمکش کو نظرانداز کر دیا جائے گا ڈراما نہیں رہے گا بلکہ افسانے سے قریب ہو جائے گا۔ ایسے ہی ڈراموں پر ڈاکٹر حامد حسن کو افسانے کا فن غالب نظر آتا ہے اور ان کا اعتراض حق بجانب ہے۔ دوسری وجہ جیسا کہ میں نے اوپر عرض کیا ہے ریڈیائی ڈرامے اور اسٹیج ڈرامے کو گڈمڈ کر کے کوئی نئی چیز پیدا کرنے کی کوشش ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اسٹیج ڈرامے کے بارے میں ایسی سیکڑوں غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ اگر ہم اسٹیج ڈراما اور ریڈیو ڈرامے کا فنی مقابلہ کریں تو ہم کو دونوں میں بنیادی اور بیّن فرق نظر آئے گا۔ ریڈیو ڈراما زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے جبکہ اسٹیج ڈراما جغرافیائی حدود اربعہ کا پابند اور زمان کی قید میں جکڑا ہوا ہے جو وحدتِ تاثر کے لیے لازمی ہے۔ ریڈیو ڈراما مکالموں اور آواز کا کھیل زیادہ ہے جبکہ اسٹیج ڈراما عمل و حرکت پر زیادہ زور دیتا ہے اور مکالمے ثانوی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ عمل و حرکت اسٹیج ڈراما میں بے بولے مکالمے ہیں جو زبان سے نکلے ہوئے الفاظ سے کہیں زیادہ متاثر کرتے ہیں۔ اس طرح اسٹیج ڈرامے میں حسِ نگاہ اور فردوسِ گوش کا عمل ساتھ ساتھ چلتا ہے جبکہ ریڈیو ڈراما میں صرف فردوسِ گوش کا عمل ہے۔ ریڈیو ڈرامہ نگار ان تکنیکی بندشوں سے آزاد ہے جس میں اسٹیج ڈرامہ نگار جکڑا ہوا ہے۔ چونکہ ریڈیو ڈراما افسانے کی طرح زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔ اس لیے یہ غلط فہمی کہ مختصر ڈراما جس میں ریڈیو اور اسٹیج ڈراما دونوں شامل ہیں افسانویت کا شکار ہے پیدا ہونا غلط نہیں ہے اور چونکہ ریڈیو ڈرامے اور اسٹیج ڈرامے کو گڈمڈ کرنے کا رجحان عام ہے اس لیے ریڈیو ڈرامے کو اسٹیج ڈراما سمجھ کر یہ الزام لگایا جاتا ہے۔ اگر دونوں کو علاحدہ علاحدہ کر کے دیکھا جائے اور ڈرامہ نگار بھی واضح طور پر یہ لکھ دیں کہ یہ ریڈیو ڈراما ہے تو یہ غلط فہمی بڑی حد تک دور ہو سکتی ہے۔

ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ اکثر کسی ضرورت کے تحت ریڈیو ڈرامے کو اسٹیج ڈرامہ میں تبدیل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے مثال کے طور پر "تیلھٹ"[2] ریڈیو کے لیے لکھا گیا تھا مگر بعد میں اسے چند تبدیلیوں کے بعد اسٹیج ڈراما کا روپ دیا گیا۔ بیدی ایک بڑے فنکار ہیں اور اس میں اسٹیج ڈراما کے لوازمات پیدا کرنے میں تو کامیاب ہو گئے مگر تصادم کی وہ شدت نہ دے سکے جو اسٹیج ڈراما کے لیے ضروری ہے۔ اس طرح کی اور بھی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں اور ایسے ڈراموں پر افسانویت کا شک پیدا ہوتا ہے۔

اس سلسلے میں ایک بات اور بھی غور طلب ہے اگر ہم اردو یکبابی اسٹیج ڈراموں کا غور سے مطالعہ کریں تو ہم کو ان میں دو طرح کے ڈرامے نظر آئیں گے۔ ایک ایسے ڈرامے جن کی بنیاد خالص خارجی تصادم پر ہوتی ہے اور دوسرے ایسے جن میں تصادم داخلی ہوتا ہے۔ جن ڈراموں میں تصادم

---

1. ڈاکٹر سید حامد حسن: اردو میں مختصر ڈراما، ماہنامہ شاعر بمبئی ڈراما نمبر ۶۲ء ص ۱۶۔ 2. راجندر سنگھ بیدی ماہنامہ قندھاراں جلد ۲ شمارہ نمبر ۳، ۴ ڈراما نمبر ۱۹۶۰ء ص ۱۴۶ تا ۱۶۲، ۱۶۵

کی بنیاد خارجی حالات یا کسی مضحک سچوایشن پر ہوتی ہے اس میں ڈرامائی عنصر بہت واضح اور حالات کی الٹ پھیر بہت تیزی سے ہوتی ہے جیسے ڈراما "کاد توس"[1] جو اگرچہ صرف دس منٹ کا ڈراما ہے مگر واقعات کی تیزی ڈرامے کو برق بداماں بنا دیتی ہے۔ یا جیسے "جیود کا سواگت"[2] اور "مفت خور"[3] ہیں جن کی بنیاد مضحک سچوایشن پر ہے۔ حالات تیزی سے بدلتے ہیں اور کبھی کبھی تو اسٹیج پر دھما چوکڑی کا گمان ہونے لگتا ہے مگر ڈرامائی کیفیت برابر قائم رہتی ہے۔ دوسری قسم کے ڈرامے وہ ہیں جن میں ایک انسان دوسرے انسان سے یا ایک تصور دوسرے تصور سے نہیں ٹکراتا بلکہ انسان خود اپنے آپ سے دست و گریباں نظر آتا ہے۔ ایسے ڈراموں پر بھی افسانویت کا الزام عائد کیا جا سکتا ہے۔ بیدی کے ڈرامے "تلچھٹ" میں ماں اپنے ہی جذبات سے متصادم نظر آتی ہے یا "شکست"[4] "حسن" میں ڈاکٹر خود اپنے آپ سے متصادم ہے۔ میں نے خود بھی ایسے کچھ ڈراموں میں ایسے ہی تجربے کیے ہیں جیسے "خاموشیاں"[5]، "قدم قدم اداس موڑ"[6]، "موسمی پرندے"[7] اور ڈاکٹر تمکین کی "الجھن"[8] جن میں کوئی خارجی تصادم نہیں ہے بلکہ کردار اپنے آپ سے متصادم نظر آتے ہیں اور انہیں بھی ایک دوسرے سے نہیں ٹکراتے۔ اس سلسلے میں معذرت کے ساتھ یہ عرض ہے کہ ہم نے ڈرامے کا مقصد اسٹیج پر دھما چوکڑی سمجھ رکھا ہے۔ اپنے آپ سے ٹکرانے والے آہستہ رو کرداروں کی ذہنی دنیا کو دیکھنے میں لطف نہیں آتا۔ اگر آئی۔ایس جوہر کا ڈراما "بدھو کام تندھو (جوتش)"[9] اور بیدی کا ڈراما تلچھٹ بیک وقت اسٹیج کیے جائیں تو "بدھو کام تندھو" کامیاب رہے گا اور تلچھٹ ناکام ہو جائے گا جبکہ تلچھٹ زندگی سے بہت قریب ہے۔

ایک اور ظلم جو کیا جا رہا ہے وہ ریڈیو ڈرامے اور اسٹیج ڈرامے کا مقابلہ ہے جبکہ نوعیت کے اعتبار سے دونوں قطعی علاحدہ علاحدہ چیزیں ہیں۔ ڈاکٹر سید حامد حسن فرماتے ہیں "ریڈیو ڈراما زیادہ آسانی سے کرداروں کی ذہنی دنیا میں اتر کر اس کی کشمکش سے ایک دلچسپ و اتفاقی ترتیب عمل میں لا سکتا ہے۔ ریڈیو ڈراما بعض اوقات خارجی ماحول کو نظر انداز بھی کر سکتا ہے"[10]۔ ریوتی سرن شرما فرماتے ہیں "ریڈیائی ڈراما تکنیکی اعتبار سے بے حد ترقی یافتہ، مواد کے اعتبار سے زندگی کے تئیں بے حد وفادار ہے اور خیال کے نقطۂ نظر سے اس قدر صحت مند ہے جس قدر کہ موجودہ دور کے ادیبوں کا تخلیقی شعور"[11]۔ ڈاکٹر محمد حسن کا خیال ہے کہ "اسٹیج ڈراما فردوس گوش اور جنت نگاہ دونوں سامان بہم پہنچاتا ہے۔ آنکھیں اسے دیکھتی بھی ہیں اور کان سنتے بھی ہیں لہٰذا اس میں بہت سے ایسے عناصر کام کرتے ہیں جن کا مجموعہ زندگی کی بہت کچھ عکاسی کرتا ہے۔ ریڈیو کی آنکھیں نہیں ہوتی ہیں صرف کان ہوتے ہیں اور اس طرح اس میں روشنی اور سائے کا استعمال، اداکار کے چہرے کا اتار چڑھاؤ اور اس کی حرکات و سکنات اور نظر سے تعلق رکھنے والے بہت سے عناصر سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا۔ اس لیے ظاہر ہے کہ ریڈیائی ڈرامہ وقت اور فن دونوں کی حد بندیوں کے پیش نظر اسٹیج ڈرامے کی سطح پر نہیں رکھا جا سکتا اور اسے کمتر درجے کا فن ہی کہا جائے گا"[12]۔

مندرجہ بالا تینوں بیانوں میں کس قدر اختلاف ہے، یہ اہل نظر غور فرما سکتے ہیں گویا دونوں اقسام کے ڈراموں کا مقابلہ کرنے میں کوئی فنی اور تکنیکی معیار نہیں ہے بلکہ صرف وجدانی کیفیات ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ریڈیو ڈراما زمان و مکان کی پابندیوں سے آزاد ہے اور اپنے تکنیکی عناصر کے باعث اس جگہ بھی کامیابی سے گزر جاتا ہے جہاں اسٹیج ڈراما ناکام ہو جاتا ہے۔ مگر اس سے اسٹیج ڈراما کی شان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اسٹیج

---

[1] حبیب تنویر ماہنامہ آج کل دہلی ڈراما نمبر اگست ۱۹۶۶ء ص ۱ تا ۱۲ [2] رام لعل، ماہنامہ شاعر بمبئی ڈراما نمبر ۱۹۶۲ء ص ۱۷ تا ۷۶، ۸۱ [3] پرکاش پنڈت ماہنامہ آج کل دہلی ڈراما نمبر اگست ۱۹۶۶ء ص ۴۵ تا ۵۲، ۸۴ [4] ڈاکٹر محمد حسن ماہنامہ آج کل دہلی ماہ جون ۱۹۶۲ء ص ۳۴ [5] ابراہیم یوسف، ماہنامہ صبح نو پٹنہ ستمبر ۱۹۶۷ء ص ۳۹ [6] ابراہیم یوسف ماہنامہ آج کل دہلی اپریل ۱۹۶۹ء ص ۳۳ [7] ابراہیم یوسف، ماہنامہ شاعر بمبئی اگست ۱۹۶۹ء ص ۵۸ [8] ابراہیم یوسف ماہنامہ شاعر بمبئی جلد ۴۲ شمارہ ۴ ص ۵۵ [9] آئی۔ایس جوہر قدم قدم پر ڈراما نمبر ۱۹۶۱ء ص ۱۶۳ [10] ڈاکٹر سید حامد حسن اردو میں مختصر ڈراما۔ ماہنامہ شاعر بمبئی ڈراما نمبر ۱۹۶۲ء ص ۱۶ [11] ریوتی سرن شرما ریڈیائی ڈراما اور اس کی تکنیک ماہنامہ آج کل دہلی ڈراما نمبر جنوری ۱۹۵۹ء ص ۶۲ [12] محمد حسن (ڈاکٹر) اردو ڈراما آزادی کے بعد ماہنامہ آج کل دہلی ڈراما نمبر جنوری ۱۹۵۹ء ص ۲۸

ڈراما زمان و مکان کا پابند ہے اور اسٹیج کی جغرافیائی حدود سے باہر نہیں نکل سکتا مگر یہی اس کی سب سے بڑی خوبی بھی ہے کیونکہ زمان و مکان کی پابندی اس کو وحدت تاثر عطا کرتی ہے۔ نیز اس کی جنت نگاہی اس کی وہ خوبی ہے جو ریڈیو ڈرامے کو حاصل نہیں۔ اسٹیج ڈراما صرف آوازوں اور مکالموں کا کھیل نہیں ہے بلکہ کچھ بے بولے مکالموں کا بھی کھیل ہے جس کو عمل و حرکت کہا جاتا ہے اور یہ بے بولے مکالمے کسی کردار کی ذہنی کشمکش کو جس طرح ظاہر کرتے ہیں وہ بولے ہوئے مکالمے نہیں کر سکتے۔ نیز اسٹیج کی سٹنگ ماحول میں جو رنگ آمیزی کرتی ہے اور آج کے ترقی یافتہ اسٹیج پر رنگوں کا جو کھیل کھیلا جاتا ہے اس سے صرف ماحول کا بیک گراؤنڈ ابھارنے میں مدد ملتی ہے بلکہ یہ رنگ کرداروں کی ذہنی کشمکش کو ظاہر کرنے میں بھی بڑا اہم رول ادا کرتے ہیں۔ اس لیے یہ خیال کہ ریڈیو ڈرامے کرداروں کی ذہنی دنیا میں زیادہ آسانی سے اتر جاتے ہیں یا ریڈیو ڈرامے مواد کے اعتبار سے زندگی کے تئیں زیادہ وفادار ہیں، کچھ حقیقت سے اس قدر زیادہ قریب نہیں معلوم ہوتا جتنا کہ ڈاکٹر محمد حسن کا یہ خیال کہ ریڈیو ڈراما اسٹیج ڈراما کی سطح پر نہیں رکھا جا سکتا۔

یکبابی ڈرامے کے عناصر ترکیبی یقیناً وہی ہوتے ہیں جو پورے وقت کے ڈرامے کے ہوتے ہیں لیکن پلاٹ کی اکائی، کشمکش کی شدت اور تاثر کی وحدت یکبابی ڈرامے کے لیے ضروری اجزا ہیں۔ پورے وقت کے ڈراموں میں پلاٹ کی وحدت کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور ضمنی پلاٹ مرکزی پلاٹ کی مدد اور مرکزی خیال کی وضاحت کے لیے استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ مگر یکبابی ڈراما ضمنی پلاٹ کا متحمل نہیں ہو سکتا کیونکہ یکبابی ڈرامے کا اختصار اور قصہ کی اکائی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ دوسرے ضمنی پلاٹ کی موجودگی یا غیر ضروری واقعات کا ڈرامے میں شامل کرنا یکبابی ڈرامے کی شدت کشمکش کو کم کرتا ہے۔ مثال کے طور پر "غالب"[1] کو لیجیے۔ اول تو اس میں ڈرامے کا بنیادی پہلو کشمکش سرے ہی سے معدوم ہے اور عمل و حرکت کی کوئی گنجائش پیدا نہیں کی گئی ہے۔ دوسرے واقعات کی ترتیب اس طرح ہے کہ ایک کا دوسرے سے کوئی تعلق نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف بارہ مسالے کی چاٹ تیار کر رہا ہے جس میں لطیفوں سے لے کر موت تک سب کچھ ہے مگر ڈراما نہیں۔ اس کے مقابلے میں "کوچ"[2] کو لیجیے جس میں لاتعداد کرداروں کے باوجود کشمکش کی واضح صورت موجود ہے اور بنیادی مقصد کہیں نظروں سے اوجھل نہیں ہوتا۔ داخلی اور خارجی کشمکش کے توازن نے ڈرامے کو بڑا جاندار بنا دیا ہے یا پھر "جو ٹوٹے نکڑے"[3] میں داخلی اور خارجی کشمکش کا اعلیٰ نمونہ ہے قصہ کی اکائی کہیں مجروح نہیں ہوتی۔

پروفیسر احتشام حسین نے وحدت تاثر کو چوتھی وحدت قرار دیا ہے۔ لیکن اگر ہم تینوں وحدتوں پر غور کریں تو اس کا حاصل یہی ہوگا کہ یہ تینوں وحدتیں چوتھی وحدت پیدا کرنے کے لیے ہی وجود میں آئی ہیں۔ گویا چوتھی وحدت وہ مرکز ہے جس کے حصول کے لیے باقی وحدتیں گردش کرتی ہیں، خاص طور پر وحدت زمان و مکان۔ رہی تیسری وحدت یعنی وحدت عمل جس کے متعلق احتشام صاحب فرماتے ہیں کہ "دراصل اس کا (وحدت عمل) مقصد یہ ہے کہ جو روداد بیان کی جا رہی ہے اس میں کئی قصے ملا کر پیچیدگی نہ پیدا کی جائے اور نہ المیہ اور طربیہ کو گڈمڈ کیا جائے"[4] احتشام صاحب نے وحدت عمل کے دو ضروری اجزا قرار دیے ہیں۔ پہلا قصہ کی اکائی اور دوسرا المیہ و طربیہ کو گڈمڈ نہ کرنا لیکن وحدت عمل اور وحدت تاثر میں میرے نزدیک بنیادی فرق ہے۔ قصہ کی اکائی کا تعلق وحدت تاثر سے ہے نہ کہ وحدت عمل سے۔ ایک پورے وقت کے ڈرامے میں قصہ کی اکائی پر عمل کیا جانا ضروری نہیں بلکہ مرکزی خیال کو ابھارنے یا اس کو توانائی بخشنے کے لیے ضمنی پلاٹ لائے جا سکتے ہیں جو اصل قصے سے مربوط ہوں اور اس کو غیر مستحسن نہیں کہا جا سکتا۔ قصہ کی اکائی کا تعلق صرف یکبابی ڈرامے کے لیے مخصوص کیا جا سکتا ہے۔ رہا وحدت عمل کا دوسرا جز، المیہ و طربیہ کو گڈمڈ نہ کرنا، تو یہی وحدت عمل کا صحیح مفہوم ہے۔ مگر انسان کی نفسیات اس قدر

---

[1] اطہر افسر: غالب: ماہنامہ شاعر بمبئی غالب نمبر فروری ۱۹۶۹ء ص ۳۴ [2] انور عظیم: کوچ، ماہنامہ شاہراہ دہلی سالنامہ ۱۹۵۸ء ص ۱۰۵
[3] کرتار سنگھ دگل: جو ٹوٹے نکڑے فنکار دہلی شمارہ نمبر ۳، ۴ ص ۲۱۷ [4] سید احتشام حسین: ڈرامے میں وحدتوں کا مفہوم، ماہنامہ شاعر بمبئی خاص نمبر ۱۹۶۳ء ص ۱۵۷

پیچیدہ ہیں کہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ کسی شخص پر ایک ہی موڈ ہمیشہ طاری رہ سکتا ہے۔ یا زندگی کے واقعات اس قدر سپاٹ ہیں کہ وہ ایک وقت حسن ڈگر پر چلائے ہمیشہ اسی پر چلتے رہیں گے۔ بعض وقت غم و خوشی ایک دوسرے سے اس طرح گڈمڈ ہو جاتے ہیں کہ انھیں الگ الگ خانوں میں نہیں رکھا جاسکتا۔ اس لیے میں وحدت عمل کو ڈرامے کی لیے لازمی وحدت تصور نہیں کرتا۔ اگر آج ڈرامے میں اُسے حذف کہہ ماجاسے تو ڈرامے کی تشکیل پر کوئی منفی اثر مرتب نہیں ہو سکتا۔ رہیں باقی دو وحدتیں تو ان کا وجود یکبابی ڈرامے کا بھی وجود ہے۔ ان دونوں کی عدم موجودگی وحدت تاثر کو بری طرح مجروح کر دیتی ہے۔

ویسے تو یکبابی ڈرامہ اگر ایک ہی سین پر مشتمل ہو تو بہت ہی مستحسن ہے۔ لیکن اگر بہ ضرورت اسے کئی سینوں یا مناظر میں بانٹا جائے تو مقام ایک ہی ہونا بہت ضروری ہے تاکہ ماحول کا جو تاثر شروع میں قائم ہوا ہے وہ آخر تک برقرار رہے۔ ہر سین کا ایک نئے مقام پر ہونا تاثر پر بری طرح اثر انداز ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر "سنگریزے"[1] کو لیجیے جس میں سات مناظر ہیں اور یکے بعد دیگرے دو الگ الگ مقامات پر وقوع پذیر ہوتے ہیں حالانکہ ڈراما ایک پلاٹ کی وحدت کے باعث یکبابی کہا جاسکتا ہے۔ مگر واقعات کا الگ الگ جگہوں پر ہونا تاثر کو بری طرح مجروح کرتا ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ ناظر یا قاری کو ہر دو چار منٹ کے بعد اپنے ذہن کو ایک نئے سین کے لیے تیار کرنا پڑتا ہے۔ بار بار پردے کا گرنا اور اٹھنا اور پھر ایک نئے سین کا سامنے آنا ناظر کو ایک اکتاہٹ میں مبتلا کر دے گا اور جو تاثر ڈرامے کا پیدا ہونا چاہیے وہ اکتاہٹ اور جھنجھلاہٹ کی نظر ہو جائے گا اسی طرح "شیر افگن"[2] ہے جو چھ مناظر پر مشتمل ہے اور چھ کے چھ مناظر چھ الگ الگ جگہوں پر ہوتے ہیں جو شہنشاہ اکبر کے خلوت خانے سے لے کر بنگالے میں شیر افگن کی خواب گاہ اور دیوان خاص تک پھیلے ہوئے ہیں۔ شاید ڈاکٹر صاحب نے غور نہیں فرمایا کہ انھیں اسٹیج کرنے کے لیے کس کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور کیا اس کا اسٹیج کیا جانا ممکن بھی ہے یا نہیں۔ اگرچہ شیر افگن کے کردار پر خاصی محنت کر کے قرون وسطیٰ کے KNIGHT کی خصوصیات کو بڑے ستھرے ڈھنگ سے اجاگر کیا گیا ہے مگر اسی کے ساتھ اکبر کا کردار انارکلی کے مقابلے کا سُتلی سن کر رہ گیا ہے۔ ایکشن کی کمی اور بعض جگہ طویل درباری مکالموں نے ڈرامے کو بڑا بوجھل بنا دیا ہے۔ آخری سین غیر متوقع طور پر شروع ہوتا اور غیر متوقع طور پر ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ان کا ایک اور ڈراما "شکست"[3] ہے جو باوجود پانچ مناظر پر مشتمل ہونے کے وحدتِ تاثر پر پورا اترتا ہے۔ ڈاکٹر کی داخلی کشمکش نے ڈرامے میں بڑی جان ڈال دی ہے۔ کاش ڈاکٹر محمد حسن اس میں اسپتال کا منظر شامل نہ کرتے تو ڈرامے کے اندر جو سقم پیدا ہو گیا ہے وہ نہ ہوتا اور اس سے ڈرامے کے پلاٹ پر بھی اثر نہ پڑتا۔

قصّہ کی اکائی، وحدت تاثر اور وحدتِ زمان و مکان کے علاوہ یکبابی ڈراما عمل و حرکت کا سب سے زیادہ متقاضی ہوتا ہے۔ فطری طور پر انسان ایک ہی چیز لمبے عرصے تک نہیں دیکھ سکتا، اور اگر وہ دیر تک اپنی آنکھیں ایک ہی چیز پر جمائے رہے تو وہ تھک جاتی ہیں اور انسان بے چینی محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس لیے اسٹیج پر کرداروں کا جامد ہو جانا ناظر میں اکتاہٹ پیدا کر دیتا ہے۔ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ہے کہ کرداروں کے عمل و حرکت اور چہرے کا اتار چڑھاؤ ڈرامے کے بولتے مکالمے ہیں جو صرف کرداروں کی ذہنی حالت کو ظاہر کرتے ہیں بلکہ ناظر کی توجہ بھی اپنی جانب مبذول رکھتے ہیں۔ اسی لیے اسٹیج ڈراما زیادہ سے زیادہ عمل و حرکت چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی غور طلب ہے کہ یکبابی ڈراما زیادہ کرداروں کا متحمل نہیں ہو سکتا مگر کرداروں میں کمی کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ ہم صرف دو کرداروں پر ہی ڈرامے کی بنیاد رکھ دیں۔ دو کرداری ڈراموں میں اوّل تو تصادم کی شدت پیدا ہونا مشکل ہے دوسرے اگر تصادم کی کوئی صورت پیدا کر بھی لی جائے تو مکالموں کی زیادتی اور پورے وقت میں صرف دو

---

[1] اطہر انسر سنگریزے شاہکار (ادبی ڈائجسٹ) دار السی جنوری ۱۹۶۱ء ص ۱۲۹ [2] محمد حسن (ڈاکٹر) شیر افگن ماہنامہ آج کل دہلی اگست ۱۹۶۲ء ص ۴ [3] ڈاکٹر محمد حسن شکست، ماہنامہ آج کل دہلی بابتہ ماہ جون ۱۹۶۲ء ص ۳۴ [4] اطہر انسر تیرھویں شب کا چاند ماہنامہ کتاب۔ لکھنؤ۔ افسانہ نمبر حصّہ دوم دسمبر ۱۹۶۶ء ص ۲۸

کرداروں کا نظروں کے سامنے رہنا ناظر میں بددلی اور اکتاہٹ پیدا کر دیتا ہے۔ مثال کے طور پر "تیرھویں شب کا چاند"[۱] صرف دو کرداروں پر مشتمل ہے جو ایک موٹر میں بیٹھے دوڑتے پھر رہے ہیں۔ ممکن ہے ڈرامہ نگار موٹر کو اسٹیج پر کسی طرح اسٹیج کی محدود جغرافیائی حدود میں دوڑاتا پھرے مگر کرداروں کو موٹر کے اندر بٹھلا کر عمل و حرکت کے لیے کون سی گنجائش پیدا کر سکے گا سوائے اس کے کہ مکالمے، مکالمے اور مکالمے۔ یہی حال "خیال کی دستک"[۲] اور "اعتبار نظر"[۳] کا ہے۔ 'اعتبار نظر' میں نہ تو عمل و حرکت ہے اور نہ تصادم کی شدت اور پھر کردار نگاری بھی اس قدر ڈھیلی ڈھالی ہے کہ دونوں کرداروں میں فرق کرنا اور دونوں کی ذہنی ساخت کا تعین کرنا ناممکن ہے۔ اگر بالفرض محال ڈرامہ دو ہی کرداروں پر مبنی ہو تو پلاٹ کی ترتیب پر خاص دھیان دیا جانا ضروری ہے۔ مکالموں کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ ہر مکالمہ تجسس اور تحیر پیدا کرتا رہے۔ مثال کے طور پر "کلنک کا ٹیکہ"[۴] جو مراٹھی سے ترجمہ کیا گیا ہے، ہر ہر قدم پر تحیر و تجسس پیدا کرتا ہے۔ کہیں بھی ناظر یا قاری تھکتا ہوا محسوس نہیں ہوتا ہے بلکہ ہر قدم پر کسی نئے واقعہ یا انکشاف سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہتا ہے۔

اردو کے یکبابی ڈراموں میں ضرورت اس بات کی ہے کہ ماحول اور کرداروں کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ وہ کسی تہذیبی اکائی کی نمائندگی کرتے ہوں، کرداروں کا کوئی عمل اور مکالمہ ایسا نہ ہو جس سے کسی مخصوص تہذیب یا کرداروں کے منصب کی نفی ہوتی ہو۔ اکثر یکبابی ڈرامے اس خوبی سے خالی نظر آتے ہیں۔ مثال کے طور پر "کہ ہر خواہش پہ دم نکلے"[۵] میں باپ اپنی بیٹی کے منگیتر یا عاشق کو مجبور کرتا ہے کہ وہ وہی جملہ اس کے سامنے دہرائے جو وہ اس کی عدم موجودگی میں کہہ رہا تھا یعنی:

جمیل۔ اچھا ہوا جو تم نے انکار کر دیا۔ تم نہیں جانتیں مگر دراصل تمہیں خبر نہیں کہ میں تمہیں کس قدر چاہتا ہوں۔ سچ کہتا ہوں ان موٹے اور بھدّے ہونٹوں کو حسن کی بہار سے تمہارے رستے دار کوئی قدر و قیمت نہیں جانتے میں انھیں ایک بار چومنے کے لیے اپنی ساری زندگی قربان کر سکتا ہوں۔"

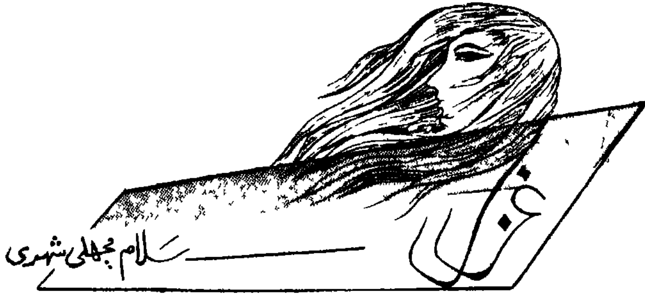
بھلا کون ایسا باپ ہوگا جو ایک مرد کو مجبور کرے کہ وہ اس کے سامنے اس کی بیٹی سے ایسے الفاظ کہے جو تہذیب سے گرے ہوئے ہیں۔ اور اگر کوئی ایسا شخص ہندستانی سماج میں ہے تو وہ باپ نہیں اور کچھ ہوگا۔ مختصر یہ کہ اس قسم کے مکالمے لکھنا یا ایسی سچوایشن پیدا کرنا جو کسی جانی پہچانی تہذیب اور کلچر کے خلاف ہے ڈرامے میں شامل نہ کی جانا چاہیے کیونکہ اس سے ڈرامے کی تہذیبی قدریں کم ہوتی ہیں۔

غرض یہ چند خامیاں اور غلط فہمیاں ہیں جو اردو یکبابی ڈرامے کے متعلق پھیلی ہوئی ہیں۔ اگر ہمارے نقاد اس جانب توجہ کریں اور اردو یکبابی ڈرامہ کا احتساب کریں تو اردو یکبابی اسٹیج ڈراما بلندیوں کو چھونے کی اپنے اندر صلاحیت پیدا کر سکتا ہے۔



---

۱ ساگر سرحدی "خیال کی دستک" ماہنامہ افکار کراچی جولائی ۱۹۶۱ء ص ۴۶ ۲ منو قمر: اعتبار نظر ماہنامہ شاعر بمبئی ستمبر ۱۹۶۱ء ص ۱۱ ۳ ش۔ ل۔ نور (ترجمہ یوسف ناظم) "کلنگ کا ٹیکہ" ماہنامہ شاعر بمبئی آزادی نمبر اگست ۱۹۶۱ء ص ۶۹ ۴ اظہر افسر "کہ ہر خواہش پہ دم نکلے" ماہنامہ شاعر بمبئی جنوری ۱۹۶۲ء ص ۵۵



اسے بھی اپنے مسائل میں مبتلا نہ کرو
اُداس ہو تو کسی دوست سے ملا نہ کرو

بجھے تو اتنے پریشان، اتنے افسردہ
چراغ بن کے کہا تھا کبھی جلا نہ کرو

کلی کھِلے گی، ستارے ضرور چمکیں گے
یہ اور بات کہ تم شکریہ ادا نہ کرو

گنہ کی راہ میں اک روشنی کا موڑ بھی ہے
مرے لیے ابھی اے دوستو دعا نہ کرو

نئے رفیقو! مرے حال پر ترس کھا کر
ابھی سے ترکِ تعلق کی ابتدا نہ کرو

جو حسن کار ہو ساری فضا تمھاری ہے
اگر نہیں ہو تو پھر شکوۂ فضا نہ کرو

یہ کم نہیں ہے کہ اس دَور میں بھی زندہ ہو
سلامؔ! صورتِ حالات کا گِلا نہ کرو

انشائیہ

ہیرو

حسنین محمد اسلم

مرزا غالب کو آم بہت پسند تھے۔ اچھے آم کی تعریف انھوں نے یوں کی تھی کہ بہت سے ہوں اور خوب میٹھے ہوں ——— آپ کی پسند اور ناپسند مجھے نہیں معلوم مگر آپ جانتے ہوں گے کہ آم پسند کرنے والوں کو غالب گدھا سمجھتے تھے۔ اپنی ہیرو پسندی کا اظہار کرکے مجھے اس وقت اپنی یا آپ کی شامت مطلوب نہیں ——— تو کھٹے اور میٹھے آم کی طرح ہیرو بھی خالصتاً دو ہوتے ہیں، مثالی اور موسمی۔ اسے اپنے ملک کی خوش قسمتی کہیے کہ ہمارے پھلوں میں جتنی شکل اور سواد کے آم ملتے ہیں، اتنی ہی قسم کے ہیرو بھی۔ مثال کے طور پر، فلمی ہیرو اور قومی ہیرو، کلاس کا ہیرو اور بازار کا ہیرو، محلّہ کا ہیرو اور میچ کا ہیرو وغیرہ وغیرہ ——— یہ ہیرو کسی جگہ اداکاری کرتا ہے، کہیں سوداکاری، کہیں یہ کامریڈ کہلاتا ہے، کہیں رنگ دار، کہیں یہ سرداری کرتا ہے اور کہیں سواری، کہیں اس کا شغل پہلوانی ہوتا ہے اور کہیں عاشقی ——— جہاں زندگی کی علامت ہے، وہاں ہیروازم کی علت، جہاں زندگی کا سوز و ساز ہے وہاں ہیروازم کی تب و تاب۔ کوئی جگہ ہیرو سے خالی نہیں۔ ہر دل میں ہیرو بننے کا جذبہ اور شوق موجود ہے۔

الغرض، ہیرو طبعاً دو ہوتے ہیں، مثالی اور موسمی ——— مثالی ہیرو کتابی دنیا میں نشو و نما پاتا ہے اور عموماً یہ تراشیدہ خیال ہوتا ہے۔ نامی شعرا اور کہانی کار اس کے خالق ہوتے ہیں اور اسی ہیرو کے دم سے وہ مقامِ ابد حاصل کرتے ہیں۔ نیرنگیٔ زمانہ سے مثالی ہیرو اگر کبھی اس عالمِ رنگ و بو میں نمودار ہو جاتا ہے تو اس کا قیام اور قیاد معاشرہ کے لیے پُرخطر ہو جاتی ہے۔ اس کی سرفرازیاں، جو اس کی ہیروازم کو نادرالوجود بنا دیتی ہیں، اس کے اقوال و اعمال کی تزئینی ہوتی ہیں۔ مرنے کے بعد اس کی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے اور اتباع و توقیر کے نام پر اس کی قدریں بے قدر کی جاتی ہیں۔ "پیراں نمی پرند مریداں می پرانند" کے مصداق اس مردِ آہن کے کردار سے زیادہ اس کی ذات کو مرکزِ رکوع و سجود بنا لیا جاتا ہے ——— مثالی ہیرو اللہ کو پیارا ہو جاتا ہے اور پیچھے دیکھیے اس کے معتقدین و تابعین خرافات کے ظلمات میں ذرۂ نور تلاش کرتے رہتے ہیں ——— بعض مثالی ہیرو ایسے بھی ہوتے ہیں جو بے وقت یا قبل از وقت صفحۂ ارض پر نمودار ہو جاتے ہیں، اور اپنے فکر و شعور کے عرفان کی نافہمی اور بلاخیز دشمنیٔ طبع کی وجہ سے وہ خود آپ شکار ہو جاتے ہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ایسے حبیب اور چہیتے ہیرو کو اربابِ قضا و قدر جلد از جلد عالمِ ہستی سے عالمِ نیستی میں واپس کر دیتے ہیں۔ مثالی ہیرو کا انجام، خواہ وہ زائیدۂ قلم کار ہو یا پروردۂ قدرت، عموماً المیہ ہوتا ہے مگر اپنی المناکی کے باوجود یہ دستِ فنا سے محفوظ رہتا ہے۔ یہی مثالی ہیرو کے المیہ کا طربناک اور درخشاں پہلو ہے جس کی وجہ سے اس کی ہیروازم کلاسیکی بن جاتی ہے۔

عصرِ جدید کا ہیرو کلاسیکی ہیرو سے زیادہ حوصلہ مند اور فعال ہوتا ہے۔ اس کی وجہ اس کے مزاج اور ماحول کی ہم رنگی ہے ——— لڑکپن سے پہلے اس میں عاشقی کا مادہ اور جوانی سے پہلے حسینوں پر مرنے کا حوصلہ آ جاتا ہے اور چلتے پھرتے ایجاب و قبول کی خاطر ہمہ وقت وہ آمادۂ کشتہ بنا رہتا ہے۔ اظہارِ عشق کا مرحلہ ہو یا ترسیلِ عشق کی مہم، وہ ہمیشہ ترقی پسند انداز سے سوچتا ہے اور غیر روایتی طریقۂ کار کو اپناتا ہے۔ وہ تیشہ زنی یا غزل گوئی نہیں کرتا۔ وہ کبوتر یا ملازمہ کا سہارا نہیں لیتا۔ وہ چٹھی یا چھٹی کا بھی قائل نہیں ہوتا۔ رہی مصوّری اور افسانہ نگاری، تو ان وسیلوں کا استعمال اس کے لیے امرِ محال ہے کہ اب افسانہ اور تصویر دونوں تجریدی آرٹ ہو گئے ہیں۔ لازماً سرخ روئی یا زرد روئی کے نتائج سے بے پروا ہو کر آتشِ عشق میں وہ بے خطر چھلانگ لگا تا ہے کہ میر صاحب فرما گئے ہیں؛

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور

عصرِ جدید کے ہیرو کے سفلا پن پر غصّے کے عوض مجھے ترس آتا ہے اور آپ بھی میرے ہم خیال ہونگے کہ اس کی ہیروازم کی نامعقولیت دراصل ہمارے نظامِ تعلیم اور طریقۂ تربیت کا ثمرہ ہے ——— غور فرمائیں، نہ اب مکتبی اور مذہبی تعلیم ہے، نہ درس گاہوں میں چٹائی اور دری۔ مخلوط تعلیم اور سیکولرزم کا دور دورہ ہے۔ ابتدائی تعلیم کے آغاز سے بہت پہلے بچّہ کی دنیائے مشاہدہ میں وہ چمکدار رنگین تصویریں داخل ہو جاتی ہیں جو والدین کے ذوق اور کمروں کی زینت کا ثبوت دیتی ہیں بچّہ کی تجسس پسند نظریں ان ماہ پیکر کے عریاں جسم کے جغرافیہ کا جائزہ لیتی رہتی ہیں گھر اور باہر، بازار یا تقریب کی کوئی قید نہیں مرشّے کی دعوت اسے ہر جگہ ملتی ہے۔ وہ جنسی کہانیاں دیکھتا اور پڑھتا ہے۔ پڑھتا بہت کم ہے کہ دیکھنے سے ہی اسے فرصت نہیں ملتی ——— عمر آتے ہی کالج کی کھلی فضا میں اس کی ہیروازم تازہ دم ہو جاتی ہے اور حو دل پر گدرتی ہے، حیوانی عوامل سے اس کا مظاہرہ شروع ہو جاتا ہے ——— آخرش، بداقبال والدین اور نامراد اولاد بعد از خرابی بسیار، ایک ہی انجام پر جا پہنچتے ہیں یعنی، آپ کی ہمدردی پر ہائے دل اور ہائے گل کا واسوخت دونوں سناتے ہیں ——— !

خدا بخشے، لکھنؤ کے اگلے کیسے روشن دماغ اور دور بیں تھے! ان کی نفاست پسندی اور جدّت پرستی کا جواب نہیں ادب اور تہذیب کو اس لکھنؤی رندہ دلی سے کیا کچھ نہ ملا؟ ——— ریختہ کو ریختی اور قیصر باغ کو راجا اندر کا دربار سا کر اور بلبل کو مدکر ماندھ کر انھوں نے دلداروں کو نئے مقاماتِ آہ و فغاں سے روشناس کرایا ——— اور لوادر، نہایت دور افتادہ ماضی کے ایک تہذیبی مشغلہ کو انھوں نے یوں اپنایا کہ نقل اصل سے دو ہاتھ آگے بڑھ گئی ——— قدیم روم اور یونان کے ان جری سورماؤں کے قصے آپ نے پڑھے ہوں گے جو خونخوار اور گرسنہ درندوں سے کشتی لڑنے اور پینترے بدل بدل کر اپنی فولادی شجاعت کے مظاہرے کرتے ——— حیات و موت کی کشمکش کا یہ روح فرسا تماشا رومی اور یونانی فرماں رواؤں کا ایک محبوب مشغلہ تھا اس کشتی سے جانبازی کا جیسا بھی مظاہرہ ہوتا ہو، بہر یہ مشغلہ کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری، والا یک طرفہ معاملہ تھا۔

تو جناب، لکھنوی مذاق نے اُس رومی روایت کی احیا رکھی اور اس کشتی میں نفاست اور جدّت دونوں پیدا کی ایک طرف انھوں نے انسان اور درندوں کی بجائے بٹیر اور مرغ کی پہلوانی رائج کی۔ دوسری جانب دو پہلوانوں کو اکھاڑے میں اتارے کے عوض انھیں بیٹھے ہی بیٹھے جو پنج لڑانے کا سلیقہ سکھایا ——— بھلا درندہ اور دو پایہ کا مقابلہ ہی کیا؟ حیوان دونوں ہی ٹھہرے مگر لکھنؤ کے اگلوں نے ایسے سورما تیار کیے جو پہلوان سے "بانکے" ہو گئے ان کی لنگوٹ اتر گئی اور مونچھ اٹھ گئی پہلوانی جسم نہ رہا پر کس بل آ گیا دیکھا آپ نے؟ لکھنؤ کے یہ بانکے بھی دراصل ہیرو کی ایک قسم تھے یا اس عہد کی تنبیح جاہ و حشمال کی مجسم تصویر تھے۔ ان کی ہیروازم سے مجمع اور محفل میں جان آ جاتی!

کہتے ہیں، لکھنؤ اسٹیشن سے دو بانکے بغرضِ سفر یکے بعد دیگرے ایک ہی ڈبے میں داخل ہوئے۔ ان کی نظریں ملیں۔ جو بیٹھ چکا تھا، جانے سکا اور جو آیا وہ واپس نہ ہوا کہ ہر فریق کو اپنا بانکپن عزیز تھا۔ ٹرین روانہ ہوئی۔ مسافر خوش ہوئے کہ ان بانکوں کی آمد سے اچھی خوش وقتی نصیب ہوئی، دالوبیر رالو رکھے آمنے سامنے سیٹ پر باطمینان بیٹھے دونوں بانکوں نے اپنی لن ترانی شروع کر دی مسافروں سے مخاطب ہو کر یہ اپنے اپنے مربی کے بےحس اعزاز و افتخار پر ڈوں کی لینے لگے، اور مکالمہ میں نہلے پر دہلہ اور دہلے پر یکہ کی باری شروع ہو گئی۔ کچھ دیر بعد، کسی اسٹیشن پر ٹرین رکی — اتفاقِ وقت، دونوں بانکوں کو اسی جگہ اترنا تھا۔ اپنی مرصع چھڑی لیے یہ پلیٹ فارم پر آ گئے۔ ادھر اُدھر قلی گھوم رہے تھے۔ ایک بانکے نے پلے دار آواز سے قلی کو پکارا۔ دوسرے بانکے نے دزدیدہ نظروں سے دیکھا کہ سامان ندارد، پھر قلی چہ معنی؟ وہ نہ دیکھنے کے انداز سے اس کا جائزہ لینے لگا پہلے بانکے نے نہایت تمکنت کے ساتھ قلی کی طرف اپنی چھڑی بڑھائی اور کہا "" دیکھتا کیا ہے؟ لے یہ چھڑی اٹھا" ——— بانکپن کا یہ مظاہرہ دوسرے بانکے کو زک دے گیا۔ دل ہی دل میں وہ تلملا اٹھا جیسے اس کی کور دب گئی ہو۔ اچانک پھپھٹی حس نے اسے سہارا دیا اس نے بھی قلی قلی کی صدا لگائی۔ ایک قلی دوڑا آیا پاس آ کر بولا "نواب صاحب، سامان کہاں؟" ——— بانکے نے کا مدار صدری

کی جیب میں نہایت نخرے سے انگلی ڈالی اور اپنا ٹکٹ نکالتے ہوئے قلی کو حکم دیا۔ "نواب کے بچے" اے' یہ ٹکٹ اٹھاؤ"

آج کا ہیرو بانکا سجیلا نہیں ہوتا اور نہ اس کی ہیروازم کو دیکھنے یا سننے کو جی مچلتا ہے۔ نہ مثالی ہوتا ہے اور نہ کتابی۔ یہ فصلی ہوتا ہے اور ہر موسم میں تولد ہوتا ہے۔ میں یہ مشاہدہ نہ کر سکا ہوں کہ موسمی ہیرو کی بھی فصل نامناسب فضا کا نتیجہ ہوتی ہے یا مناسب فضا سے اس کی فصل لہلہا اٹھتی ہے۔ پر اتنا وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ عصری بحران اور انتشار موسمی ہیرو کے لیے نہایت سازگار ہیں اور کسی محتسب کیلیے معاملہ تولید میں آبرو آور دکا امتیاز دشوار ہوگا۔

موسمی ہیرو کوڑے اسٹیم انجن کے بھبکتے دھوئیں کی طرح اچانک ابھرتا ہے۔ اس کی ہیروازم کے کارناموں سے ستر فنا گھر کے اندر اور سعلا گھر کے باہر آجاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اسے بلا درد سر اکثریت کی حمایت حاصل ہو جاتی ہے اور نامراد ہونے سے پہلے وہ یوں اینٹھنے لگتا ہے جیسے نیا ملازم نیا لنگر پہن کر ملکیت کے ساتھ بازار کو نکلا ہو۔

موسمی ہیرو کدو کریلے کی لتوں کی مانند تیزی سے بڑھتا ہے، اور زیادہ دن تک ہرا بھرا نہیں رہتا کامرانیاں سر ہوں یا سینکڑوں یہ علدلپے رنگ بدل دیتا ہے۔ توبہ استغفار کر کے اور لعنۃ دفتور کی دیلے سے منہ موڑ کر وہ خیر و صدمت کی دنیا میں داخل ہوتا ہے اس لیے روایتی رسوم کے اجراء و چلتے پھرتے حقائد کی راستی پر اس کا یقینِ نہایت کامل اور پختہ ہوتا ہے محلہ برادری کے ان روشن خیال طلبہ کی عقل پردہ دست تاسف ملا کرتا ہے جو کارخانۂ قدرت کو اندھے کی لاٹھی تصور کرتے ہیں ان کینۂ دل اور جگر سوختہ روشن خیال طلبہ کے اس منفیانہ نقطۂ نظر سے شرعی ہیرو کو اختلاف رہتا ہے۔ اعتراف اسے بھی ہوتا ہے کہ تمام آفاق پُر از فتنہ و شر ہے' پر اسے یقین ہوتا ہے کہ قیامت قریب ہے۔ نماز پڑھو۔ اللہ کو یاد کرو۔ سب ٹھیک رہے گا — یہ ایمان پرور اور ایمان سوز تقابلی بحثیں بڑی دلچسپ ہوتی ہیں۔ مداخلت کیے بغیر اس تماشائی مناظرے سے لطف اندوز ہونے کا مجھے موقع ملا ہے اور ایسا محسوس ہوا جیسے سنا رہے اقبال کا "شکوہ" اور محمد رفیع "جواب شکوہ" خود رقت ہو کر سنا رہے ہوں —!!





کے انتظار میں

(منظوم خط)

ملکتے کوکب (کلکتہ)

بندہ پرور! آپ کو کچھ یاد ہے
کس طرح، کس حال میں ناشاد ہے
ہم نے مانا آپ ہیں غمخوار بھی
اپنے دل کے مالک و مختار بھی
چھوڑیے طرز تغافل چھوڑیے
رشتۂ الفت دوبارہ جوڑیے!
قید خانے کی طرح گھر ہو گیا
ہجر میں جینا بھی دوبھر ہو گیا
تاجداروں کی محبت دیکھ لی'
چاندنی کی رسم الفت دیکھ لی'
چاہیے تھی اک نگاہِ التفات
کھو گئی حسنِ تکلف میں یہ بات
مے کے بدلے خوں ٹپکا جام سے
شام ہجراں مل گئی انجام سے
روز و شب رہتا ہے دل کو انتظار
آپ کی تحریر دنیا ستار
ڈھونڈتا ہے دل وہی باتیں تپاک
پڑھ کے پیشانی ہو عرق سے آب آب
کاش ہوں ماضی کی باتیں خوشگوار
وقت نے جس کو بنایا دلفگار
یہ طلسم بے وفائی — یہ ستم'
حلقۂ دام محبت کی قسم؟
توڑ کے آجائیں ہم ہر آن کو
آپ کے قدموں میں رکھ دیں جان کو
دل دھڑکتا رہتا ہے مہلت کہاں؟
انتظار خط میں ہیں اب نیم جاں!
بے مروت آپ ہیں۔ ہم تو نہیں؟
کیا بدل سکتی ہے فطرت بھی کہیں؟
یا اب حسنہ کی صورت آپ کو
"خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو"

عدالتوں اور سرکاری دفتروں سے فارسی کا اخراج

ڈاکٹر حکم چند نیّر

عدالتوں اور سرکاری دفتروں سے فارسی زبان کے اخراج اور اس کی جگہ پر ہندستانی زبانوں کی نام نہاد ترویج کی تحریک کا آغاز کیوں، کیسے اور کب ہوا؟ اس تحریک کے آغاز کے اسباب و علل، اغراض و مقاصد اور عواقب و نتائج کیا اور کتنے دور رس تھے، اس موضوع کے متعلق پورا مواد سیکڑوں صفحات پر پھیلا ہوا ہے اور اس مضمون میں ان تمام امور اور مباحث کی گنجائش نہیں۔ یہاں اس مسئلے کے اہم پہلوؤں پر مختصراً روشنی ڈالنے پر اکتفا کی جاتی ہے۔

دستیاب مواد کی بنیاد پر بخوبی کہا جا سکتا ہے کہ اس تحریک کا آغاز سامراجی مفادات کے تحفظ کے لیے انگریزوں کی حکمت عملی سے ہوا تھا۔ سامراجی حکومت نے خود کو غیر جانب دار اور معصوم رکھنے کے لیے اس تحریک اور اپنے فیصلے کو پورا پورا جمہوری رنگ دے دیا تھا اور فارسی کے اخراج کا فیصلہ حکام وقت اور اہم سرکاری اداروں سے تقریباً دس برس تک گفت و شنید، صلاح و مشورہ اور خط و کتابت کے بعد کیا تھا۔ حکام مفروضہ متعدد اور مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک گروہ فارسی کو سرکاری اور عدالتی زبان کی حیثیت برقرار رکھنے کا حامی تھا۔ دوسرا گروہ فارسی کی جگہ پر ہندوستانی زبانوں کو رائج کرنے کے لیے عوام کی فلاح و بہبودی کی دہائی دیتا تھا۔ اس کا ایک ذیلی گروہ فارسی کی جگہ پر ہندستانی (اردو) بخط فارسی کو شمال مغربی صوبے میں رائج کرنے کے لیے فارسی رسم خط کی خوبیاں چیخ چیخ کر گنتا تھا۔ بعض افسران ہندستانی بخط دیوناگری کی ترویج کے لیے اکثریت کی حق تلفی اور پسماندگی کا نام لے لے کر آنسو بہاتے تھے۔ جتنے منہ تھے اتنی بلکہ ان سے بھی زیادہ باتیں تھیں۔ ان باتوں میں فکر و خیال کی کجی اور دل و زبان کا تضاد ہر جگہ نمایاں تھا، کیونکہ بباطن یہ لوگ فارسی کو دفتروں اور سرکاری عدالتوں سے بہر حال خارج کرنے پر متفق تھے۔

فارسی کے عدالتوں اور دفتروں سے اخراج سے ایک تیر بیک وقت دو نشانوں پر کارگر وار کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ مدراس، بمبئی اور بنگال وغیرہ میں انگریزی کا جادو چل چکا تھا۔ سرکاری کاروبار چلانے کے لیے ان علاقوں میں انگریزی کا چلن کافی تھا۔ مزید برآں ان علاقوں میں فارسی کی بجائے کسی ایک ہندستانی زبان کو رائج کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ یہاں تامل، تلگو، مراٹھی، گجراتی، اڑیا اور بنگالی وغیرہ کتنے دعوے دار موجود تھے، اور ان زبانوں میں انگریزی کے منہ آنے کی ہمت بھی نہیں تھی۔ اس کے علاوہ ان علاقوں میں پادری، اینگلو انڈین اور نئے عیسائی کافی تعداد میں موجود تھے جن سے بیک وقت تلوار اور ڈھال دونوں کا کام لیا جا سکتا تھا۔ یہ مجاہدین اپنے تازہ ترین جوشِ ایمانی کی بدولت ہر ہندستانی فکر کی تحقیر و توہین اور ہر ولایتی خیال کی توصیف و تحسین کے لیے کمربستہ رہتے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان علاقوں پر سامراجی حکومت کی گرفت کافی مضبوط اور مستحکم ہو چکی تھی۔

اس کے برعکس برصغیر کے ایک بہت بڑے اور سیاسی حیثیت سے اہم ترین خطے یعنی شمال مغربی ہندستان (مشتمل بر موجودہ اتر پردیش، مدھیہ پردیش، دہلی، ہریانہ، پنجاب اور پاکستان) پر اگرچہ انگریز قابض

سے ان لوگوں کو معاشی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ صوبہ بنگال میں دوسری زبانوں کے مقابلے میں فارسی کا چلن زیادہ ہے۔ اس لیے انگریزی یا ہندستانی زبانوں کے مقابلے میں فارسی کو عدالتی زبان کی حیثیت سے جاری رکھنے میں کم اخراجات برداشت کرنے پڑیں گے اور ایک معیاری اور عدالتی زبان کی حیثیت سے فارسی ہندستانی زبانوں کے مقابلے میں یقیناً بہتر ہے۔[۱]

گورنر جنرل کی کونسل کے ممبر مسٹر شکسپیئر نے اس رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ "سرکاری اور مراسلاتی زبان کی حیثیت سے فارسی کو دیگر تمام ہندستانی زبانوں پر فوقیت حاصل ہے کیونکہ ہندستان کے اس کونے سے اس کونے تک سبھی تعلیم یافتہ لوگ اسے بآسانی سمجھتے ہیں۔"[۲]

شمال مغربی صوبے کی صدر دیوانی عدالت اور نظامت عدالت نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ "مقامی زبان سرکاری اور عدالتی زبان کے لیے ناموزوں ہے کیونکہ تمام اضلاع بلکہ ہر ضلع کے مختلف طبقات کی بولیوں میں اختلاف پایا جاتا ہے۔" اسی عدالت کے ایک جج مسٹر ڈِک اگرچہ ہندستانی بخط دیوناگری کو رائج کرنے کے حامی تھے لیکن اس کے معترف تھے کہ "فارسی کی جگہ پر ہندستانی بخط دیوناگری کو رائج کرنے میں اصطلاحات کی تشکیل، بولیوں کے اختلافات اور ناگری رسم خط کو بآسانی صحت کے ساتھ نہ پڑھ سکنے کی سلسلہ دقتیں وغیرہ متعدد دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔"[۳] شمال مغربی صوبے کی صدر دیوانی عدالت اور نظامت عدالت کے تحت کام کرنے والے ۶۲ ججوں میں سے ۲۹ جج مروجہ طریق کار میں کسی قسم کی تبدیلی کے خلاف تھے اور ۳۳ جج فارسی کی جگہ پر ہندستانی بخط فارسی کو رائج کرنے کے حق میں تھے۔[۴]

پٹنہ سٹی کورٹ کے جج مسٹر مورس نے فارسی کی جگہ پر ہندستانی (اردو) کو رائج کرنے کے سلسلے میں لکھا کہ "ہمیں تمام عملی امور کے لیے عدالتی زبان کی حیثیت سے فارسی کو برقرار رکھنا پڑے گا کیونکہ عدالتی کارروائیاں اور تجویزیں لکھنے کے لیے ترکیبیں، بندشیں اور اصطلاحیں فارسی سے مستعار لینا پڑیں گی۔ ہندستانی کو رائج کرنے سے صرف فقروں کی نحوی ترکیب اور تصرف بدل جائے گی یا پھر فقروں کا خاتمہ فارسی افعال کے بجائے ہندستانی افعال پر ہوگا۔"[۵]

دوسری طرف فارسی زبان اور رسم خط کو غیر ملکی کہا گیا۔ "فارسی پڑھنے میں لوگوں کو زیادہ خرچ برداشت کرنا پڑتا ہے اور دوسری کئی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ آج کل ہندستان میں ایک فرقے کے مخصوص لوگوں کے سوا فارسی کوئی نہیں پڑھتا، فارسی تمام مقامی اصوات کو ادا نہیں کر سکتی" وغیرہ اعتراضات کے ساتھ تمام سرکاری کارروائیوں بالخصوص محکمۂ انصاف کی کارروائیوں کو مقامی زبانوں میں سرانجام دینے کی ضرورت پر بہت زور دیا گیا۔ بقول مسٹر شور:

"عدالتوں میں فارسی کی ترویج کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ تمام سرکاری آسامیاں دوسرے صوبوں کے غاصبوں سے بھرنا پڑتی ہیں۔ ان میں سے بیشتر لوگوں کی تقرری اپنے صوبے میں کسی اسامی پر ہرگز نہ ہو سکتی۔ اگر بہ فرض محال ان میں سے کچھ لوگوں کی تقرری ہوتی تو وہ صرف چھوٹی چھوٹی ملازمتوں ہی پر ہوتی، اور ملک کے اس حصے کے مقامی لوگوں کو اس طرح نظر انداز نہ کیا جاتا۔"[۶]

مسٹر شور قائم مقام کمشنر نہ بادہ سالہ کمشنری کا مراسلہ عام راجی حکومت کی حکمت عملی کی بخوبی وضاحت کرتا ہے۔ بہرحال بہت کچھ خط و کتابت

۱؎ محکمہ امور داخلہ (بنیادی مشورات متعلقہ عدالتی امور) نمبر ۱ تا ۵۵ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۸۳۶ء ۲؎ ایضاً ۳؎ مراسلہ ۲۹ جولائی ۱۸۳۶ء منجانب صدر دیوانی و نظامت عدالت شمال مغربی صوبہ بنام لفٹننٹ گورنر شمال مغربی صوبہ بحوالہ عدالتی مشورات (دیوانی) ۲۹ نومبر ۱۸۳۶ء نمبر ۸ ۴؎ تجویز ۲۳ جولائی ۱۸۳۶ء منجانب مسٹر ایس شور، ایضاً ۵؎ محکمہ امور داخلہ، بنیادی مشورات (عدالتی امور) نمبر ۱ تا ۵۵، مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۸۳۶ء ۶؎ مراسلہ ۹ جنوری ۱۸۳۶ء منجانب مسٹر مورس منسلکہ مراسلہ ۴ مارچ ۱۸۳۶ء منجانب رجسٹرار صدر دیوانی عدالت، فورٹ ولیم، بنام سکریٹری محکمۂ انصاف بنگال بحوالہ عدالتی مشورات (دیوانی) ۱۱ مارچ ۱۸۳۶ء نمبر ۲۲ ۷؎ مراسلہ مورخہ ۲۹ اکتوبر ۱۸۳۶ء منجانب ایف۔ جے۔ شور بنام سکریٹری محکمۂ مال و انصاف، شمال مغربی صوبہ بحوالہ روداد اجلاس لفٹننٹ گورنر مورخہ ۱۵ نومبر تا ... نمبر ۱۶۱ مورخہ ۱۲ ستمبر تا ۱۷ دسمبر ۱۸۳۶ء۔

کے بعد گورنر جنرل ہند نے شمالی مغربی صوبے کے لیفٹننٹ گورنر سر چالس مٹکاف کے مشورے کو قبول کرتے ہوئے اپنی تجویز مورخہ ۲۵ ستمبر ۱۸۳۶ء میں لکھا کہ "جو افسران عدالتوں میں فارسی کی جگہ پر ہندستانی (اردو) کو رائج کرنا چاہیں کر سکتے ہیں"۔۱

حکومت ہند (گورنر جنرل باجلاس کونسل) نے ۲۰ نومبر ۱۸۳۷ء کو ایکٹ نمبر ۲۹ پاس کیا جس کے ذریعے گورنر جنرل کو مجاز کیا گیا کہ "وہ بنگال کوڈ کے ایسے دفعات کو منسوخ کر دے جن کے تحت کمپنی کے مقبوضات ہند کے محکمۂ انصاف اور محکمۂ مال کی کارروائیوں کو لکھنے کے لیے فارسی زبان کا استعمال ضروری ہے۔ مزید برآں اُسے فارسی کی جگہ پر کوئی مقامی زبان اور کوئی رسم خط رائج کرنے کا اختیار حاصل ہوگا"۔۲

اس ایکٹ کے پاس ہونے کے تقریباً دو مہینے بعد ۲۳ جنوری ۱۸۳۸ء کو صوبہ بنگال کے ڈپٹی گورنر نے گورنر جنرل کے محولہ بالا اختیار کے تحت فیصلہ کیا کہ "فورٹ ولیم پریسیڈنسی کی بنگال کمشنری (مشتمل بر موجودہ صوبجات بنگال، اڑیسہ، بہار و بنگلا دیش) کے تمام اضلاع کے محکمہ مال کے دفتروں اور عدالتوں کی کارروائیاں فارسی کے بجائے مقامی زبانوں میں قلم بند کی جائیں اور اس فیصلے پر یکم جنوری ۱۸۳۸ء سے بارہ مہینوں میں بتدریج عمل کیا جائے"۔۳

اس فیصلے سے بنگال پریذیڈنسی کے دفتروں اور عدالتوں میں ایک خلفشار پیدا ہوگیا کہ کس ضلع میں کونسی زبان استعمال کی جائے اور کس رسم خط میں لکھی جائے۔ یہ ایک بڑا پیچیدہ لسانی مسئلہ تھا اور رسم خط کے قضیے نے اسے پیچیدہ تر بنا دیا تھا۔ اس لیے اس فیصلے پر عمل کی رفتار سست رہی۔ فورٹ ولیم پریذیڈنسی کی صدر دیوانی عدالت نے ۹ فروری ۱۸۳۸ء کو ماتحت عدالتوں کے نام ایک سرکلر میں کہا کہ وہ اپنے اپنے ضلع میں عدالتی کارروائیاں جلد از جلد فارسی کے بجائے مقامی زبانوں میں قلم بند کرنا شروع کر دیں۔۴

صوبہ بنگال میں فارسی کی بجائے بنگالی کی ترویج کی کوششیں کی گئیں تو ڈھاکا کے رئیسوں، زمینداروں اور وکیلوں نے سرکار کے اس اقدام کے خلاف زبردست اور موثر احتجاج کیا جس کے نتیجے میں حکومت بنگال نے ۱۹ اپریل ۱۸۳۹ء کو ایک سرکلر جاری کیا جس کے ذریعے سابقہ احکامات کو نرم کرتے ہوئے فارسی کو ایک متبادل زبان کی حیثیت سے عدالتوں اور دفتروں میں برقرار رکھنے کی اجازت دی گئی۔۵

اسی سلسلے میں کورٹ آف ڈائرکٹرز نے ۵ اگست ۱۸۳۹ء کو ایک تجویز پاس کی جس میں ۱۹ اپریل ۱۸۳۹ء کے محولہ بالا سرکلر میں یہ اضافہ کیا گیا کہ "جہاں کہیں ناگری رسم خط کا چلن ہو، وہاں اردو کو ناگری رسم خط میں لکھا جاتے تھے۶ یہ فیصلہ پہلے کیا جا چکا تھا کہ "صدر دیوانی اور نظامت عدالت کی زبان اردو بخط فارسی ہوگی۔ اس طرح ۵ اگست ۱۸۳۹ء کے فیصلے کا مطلب یہ تھا کہ صدر عدالتیں اردو کے لیے فارسی رسم خط استعمال کریں اور ضلاعی عدالتیں بنگالی، اڑیا اور اردو بخط فارسی کے علاوہ اردو بخط ناگری بھی استعمال کر سکتی ہیں جہاں کہیں موخرالذکر رسم خط مروج ہو اور بنگال میں فارسی کو ایک متبادل زبان کی حیثیت سے استعمال کیا جا سکتا تھا۔

بنگال پریذیڈنسی میں صوبۂ بہار ہی ایک ایسا علاقہ تھا جہاں اردو کے لیے دیوناگری رسم خط کا چلن تھا یا بالفاظ دیگر جہاں اسے مروج کیا جا سکتا تھا۔ ترہٹ کے لوگوں کے احتجاج سے بھی اسی امر کی توثیق ہوتی ہے۔ باشندگان ڈھاکا کی طرح ترہٹ (بہار) کے زمینداروں، رئیسوں، وکیلوں اور مختاروں نے حکام بالا کو ایک احتجاجی عرض داشت پیش کی۷ جس کے نتیجے میں صدر دیوانی عدالت نے نومبر ۱۸۳۹ء کو ایک سرکلر جاری کر کے حکام کو ناگری رسم خط کو بتدریج رائج کرنے میں احتیاط اور آہستگی سے کام لینے کا مشورہ دیا۸

شمال مغربی صوبے کے محکمۂ مال میں فارسی کی جگہ اردو بخط فارسی و دیوناگری کی ترویج کا کام صوبۂ بنگال کے مقابلے میں پہلے شروع ہوگیا تھا۔ مسٹر برڈ

---

۱ محکمہ امور داخلہ، بنیادی مشورات (عدالتی امور) نمبر ۱۳۰ تا ۱۳۹، ۱۰ اکتوبر ۱۸۳۶ء ۲ مشورات عدالتی امور (دیوانی) نمبر ۸ مورخہ ۲۰ مارچ ۱۸۳۸ء ۳ مشورات عدالتی امور (دیوانی) نمبر ۱۵ مورخہ ۲۰ مارچ ۱۸۳۸ء ۴ مشورات عدالتی امور (دیوانی) نمبر ۱۶ مورخہ ۲۰ مارچ ۱۸۳۸ء ۵ مشورات عدالتی امور (دیوانی) نمبر ۱۲ مورخہ ۲۰ مئی ۱۸۳۹ء ۶ مشورات عدالتی امور (دیوانی) نمبر ۱ مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۸۳۹ء ۷ مشورات عدالتی امور (دیوانی) نمبر ۱ مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۸۳۹ء۔

اگر بانڈرم ۱۰۹ ٹک

نے شمالی مغربی صوبے کی آگرہ کمشنری کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد ۳۱ اکتوبر ۱۸۳۲ء کی رپورٹ میں "سرکاری عدالتوں اور دفتروں میں فارسی کے بجائے ہندستانی رائج کرنے کا مشورہ دیا تھا[۱] اور اسی صوبے کے نربدا اور ساگر (ملحقہ ۱۸۱۷ء بہ شمالی مغربی صوبہ) کے علاقے میں حکومت نے ۲۱ نومبر ۱۸۳۵ء کے حکم کے ذریعے "عدالتوں اور دفتروں میں فارسی کے بجائے ہندستانی کو رائج کرنے کی اجازت دے دی تھی"[۲] شمال مغربی صوبے کے صدر بورڈ مال نے ۲۹ جولائی ۱۸۳۶ء کے سرکلر کے ذریعہ حکم دیا کہ "محکمہ مال کی تمام کارروائیاں فارسی کے بجائے ہندستانی میں قلم بند کی جائیں"[۳]۔ اسی سرکلر میں حکام محکمہ مال کو ہدایت کی گئی کہ "وہ خود بخوبی سمجھ لیں اور اپنے ماتحت افسران کو بھی سمجھا دیں کہ اس تبدیلی کا مقصد یہ نہیں کہ صرف تصریفات، سابقے، لاحقے اور افعال بدل دیں جبکہ محاورے، ترکیبیں اور دوسرے الفاظ ہو بہو فارسی کے رہیں۔ صدر بورڈ مال کی یہ خواہش ہے کہ تمام کارروائیاں ایسی زبان میں لکھی جائیں جسے فارسی سے بالکل نابلد ایک معزز اور معتبر ہندستانی بآسانی سمجھ سکے"۔

"بورڈ کو اعتماد ہے کہ یورپی حکام اور بالخصوص ہندستانی ڈپٹی اس پر بڑی نظر رکھیں گے کہ عملہ ایک فراموش شدہ اور ناقابل فہم زبان (فارسی) کو برقرار رکھنے کی کوشش میں کامیاب نہ ہو اور وہ بہر حال عملے کو روزمرہ کی بات چیت کی زبان استعمال کرنے پر مجبور کریں گے"۔[۴]

یہاں اس بات کو مدنظر رکھنا چاہیے کہ شمال مغربی صوبے کے لفٹنٹ گورنر سر چارلس مٹکاف نے گورنر جنرل ہند کے مراسلہ مورخہ ۳ مارچ ۱۸۳۵ء کے متعلق صدر عدالت و نظامت اطلاعات کی رپورٹ مورخہ ۵ اگست ۱۸۳۵ء گورنر جنرل کے پاس بھیجنے سے پہلے شمال مغربی صوبے میں فارسی کی جگہ پر اردو اور ناگری کی ترویج کے احکام جاری کر دیے تھے۔ گورنر جنرل کی اہم تجویز مورخہ ۲۵ ستمبر ۱۸۳۶ء بھی سر چارلس مٹکاف ہی کی کوششوں اور مشورے کا نتیجہ تھی۔ صدر بورڈ مال شمال مغربی صوبہ نے ۳۰ مئی ۱۸۳۷ء کو اس ضمن میں ایک اہم سرکلر جاری کیا جس میں کہا گیا کہ "انگریزی اور مقامی زبانوں کو فارسی کی جگہ لینی ہے۔ یورپی اور کچھ باستعداد ہندستانی افسران اول الذکر (انگریزی) زبان استعمال کریں گے جبکہ عوام سے رابطے کی زبان مؤخر الذکر (ہندستانی) ہوگی"۔[۵]

شمال مغربی صوبے کے محکمۂ انصاف نے آغاز کار میں اس لسانی تبدیلی میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ صدر دیوانی عدالت نے اس ضمن میں سب سے پہلا سرکلر ۱۹ اپریل ۱۸۳۷ء کو جاری کیا کہ "تمام دیوانی امور سے متعلق روئدادوں، مسلوں اور تجویزوں میں فارسی کی جگہ پر ہندوستانی استعمال کی جائے اور اگر کوئی شخص کسی دستاویز کا فارسی ترجمہ بھی ساتھ داخل کرنا چاہے تو کر سکتا ہے"۔[۶]

شمالی ہندستان میں اس وقت فارسی کی جگہ لینے کی مستحق اگر کوئی زبان تھی تو وہ صرف اردو تھی، اردو نظم و نثر کی روایت کافی استوار تھی۔ فارسی سے تعلق اور تواتر کی وجہ سے عدالتی اور دفتری اصطلاحوں، ترکیبوں اور بندشوں کا ایک وافر ذخیرہ اس میں موجود تھا۔ سرکاری اور مراسلاتی زبان بننے کے لیے اردو ہر لحاظ سے موزوں ترین زبان تھی۔ لیکن ایک طرف انگریزوں نے اسے اس کے معیاری اور مسلّم نام "اردو" کے بجائے ہمیشہ "ہندستانی" کے مبہم نام سے موسوم کیا اور دوسری طرف اس کے مقابلے میں "ناگری" کا نام لیا۔ "ناگری" کسی زبان کا نام نہ تھا بلکہ ایک رسم خط کا نام تھا۔ تھامسن اور ڈنکن جیسے اس کے انتھک حامی بھی اسے ہندستانی بخط ناگری سے پکارتے تھے۔ تربت کے ضلع جج نے اسے ناگری کے علاوہ "ہندوی" کے نام سے موسوم کیا تھا جو یقیناً اردو معروف بہ ہندستانی ہی کا ایک اور نام تھا۔ ہندی والوں نے اپنی زبان کو ہندوی کے نام سے کبھی موسوم نہیں کیا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت تک ہندستانی بخط دیوناگری کے لیے "ہندی" کا نام وجود پذیر نہیں ہوا تھا۔ حالانکہ پچیس تیس برس قبل فورٹ ولیم کالج میں گلکرسٹ اور اس کے رفقا کی کوششوں اور کاوشوں سے کھڑی بولی بخط ناگری میں کچھ کتابیں چھپ کر شائع ہو چکی تھیں لیکن اگلے ساٹھ ستر برسوں (۱۸۴۷-۵)

(بقیہ صفحہ ۴۴ پر)

---

۱ مشورات عدالتی امور (دیوانی) مسلہ مورخہ ۱۲ دسمبر ۱۹۳۶ء ۲ بحوالہ مراسلہ ۲۹ اکتوبر ۱۸۳۵ء صاحب مسٹر شور بنام سکریٹری محکمۂ مال و انصاف، شمال مغربی صوبہ، مشمولہ روداد اجلاس لیفٹننٹ گورنر در صدر بورڈ مال ۱۳ مورخہ ۲ ستمبر تا ۱۴ ستمبر ۱۸۳۶ء ۳ ایضاً ۴ روداد اجلاس لفٹننٹ گورنر در صدر بورڈ مال ۵۵ مورخہ ۱۹ جولائی تا ۲ اگست ۱۸۳۶ء ۵ ایضاً ۹۹ ۶ بارش مین: رہنمائے قانون دیوانی ص ۱۴۸



کچھ نہ مانا، دل نثارِ حُسنِ جانانہ ہوا
ایک اپنا رہ گیا تھا وہ بھی بیگانہ ہوا

آنسوؤں پر ختم سوزِ دل کا افسانہ ہوا
خاک سے پیدا ہوا تھا خاکِ پروانہ ہوا

چھوڑ کے پھولوں کو کانٹوں کو لگانے ہوں گلے
ہوش میں آیا تو سب کہتے ہیں دیوانہ ہوا

انقلاب ایسے بھی آئے ہیں ہمارے سامنے
دم زدن میں بستیوں کا نام ویرانہ ہوا

رند پیاسا ہو تو پیمانے کی کچھ قیمت نہیں
چھو گئے ہونٹوں کو میرے پیمانہ پیمانہ ہوا

دل کے اندر بس گئیں کچھ ایسی ایسی صورتیں
اچھا خاصہ گھر خدا کا اک صنم خانہ ہوا

اُس حسین لب کے تبسم کی قسم کھاتا ہوں میں
تھا اشارہ آپ کا بدنام دیوانہ ہوا

سوچتے ہی سوچتے کٹتا گیا دورِ حیات
دیکھتے ہی دیکھتے لبریز پیمانہ ہوا

چاک ہیں سب کے گریباں اک ہمیں تنہا نہ تھے
کس کو فرصت ہے جو پوچھے کون دیوانہ ہوا

کچھ نہ واعظ کر سکا کچھ ان آنکھوں کا خمار
بارہا شائب تہِ جام و پیمانہ ہوا

شہید آزادی

ڈاکٹر فضل امام رضوی

ہندستان کی تاریخ میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا اور انوکھا واقعہ ہے کہ جس آدمی کو پھانسی کی سزا سنائی جانے والی ہو، وہ انتہائی سکون اور یکسوئی کے ساتھ قید خانے کی کوٹھری میں بیٹھا ہوا، اپنی آپ بیتی لکھتا رہے اور صرف اسے قلم بندہی نہ کرے بلکہ اسے تین حصوں میں تقسیم کرکے قید خانے کی چار دیواری کے باہر بھی بھیج دے۔ برطانوی سامراج کی سختی کا اندازہ کرنا آج کے دورِ آزادی میں مشکل ہے۔ لیکن پھانسی کے قیدی پر کس قدر زبردست پہرہ رہتا ہے اس کا تصور یقیناً آسان ہے۔ اس پر ہر طرف سے ہر طرح کی نگرانی اور نگہبانی کا مضبوط انتظام ہوتا ہے۔ لیکن سب کی نگاہوں سے بچ کر حکومت برطانیہ کی سخت گیریاں اور آلام و مصائب برداشت کرکے، انتہائی طمانیت قلب اور خاموشی کے ساتھ اپنی سوانح حیات کو مرتب کر لینا، جو آزادی کی تحریک کا ایک اہم باب ہو، اسے اس کی جرأت مندی، بلند حوصلگی، گہری حب الوطنی اور تائید غیبی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟

اس طرح کی قوم و ملک کی حقیقی اور عملی محبت کا جذبہ پیش کرنے والے کو ہندستان کی تاریخ آزادی میں پنڈت رام پرساد بسمل کے نام سے یاد کیا جاتا ہے —— رام پرساد بسمل کی پیدائش ۱۸۹۷ء میں ہوئی تھی اور ۱۹۲۷ء میں وہ پھانسی کے تختے پر جھول گئے۔ اس طرح ان کی حیات مختصر کل تیس سال کی تھی جس میں انھوں نے گیارہ سال، اغیار ذہنیت کے گزارے کیونکہ انیس سال کی عمر کے بعد انھوں نے مادرِ ہند کی آزادی کی تحریک میں سرگرم طور پر حصہ لیا اور اپنی زندگی کے انیس سال پورے کرتے کرتے انھیں اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ ملک غلامانہ ذہنیت سے اس قدر پست اور ذلیل ہو گیا ہے کہ اب اس میں حریت اور غیرت کا جذبہ پیدا کرنا مشکل ہے۔ لیکن انھیں ذلت و خواری کی زندگی بسر کرنا نہ آتا تھا اور ان کا دل مادرِ ہند کی غلامی سے ہر وقت بے قرار اور مضطرب رہتا تھا۔ اس لیے اپنی زندگی کے گیارہ سال انھوں نے ملک کی آزادی کے لیے وقف کر دیے اور وہ کارہائے نمایاں انجام دیے کہ جسے ہندستان کی تاریخ آزادی کبھی فراموش نہیں کر سکتی:

بسمل جرأت و حق گوئی، پامردی و جواں مردی کی ایک عملی مثال تھے۔ جب انھیں پھانسی کا حکم سنایا جا چکا تو بھی ان کے چہرے پر اضمحلال، پژمردگی اور ہراس نہیں تھا، بلکہ اس حکم نے ان کے جذبۂ وطنیت کو اور بھی مہمیز کیا۔ اور جب ۱۶ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو گورکھ پور جیل میں انھیں پھانسی کا حکم ہوا تو اس واقعہ کو بھی انھوں نے اپنی آپ بیتی میں بخوشی تحریر کر دیا۔ اس وقت کی ان کی اس تحریر میں کوئی بھی ہیجان نظر نہیں آتا، بلکہ اس میں کافی وقار، عزم اور سنجیدگی جھلکتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی واقعہ ہی نہیں ہوا ہے۔ یہی نہیں جب انھیں پھانسی کے تختے پر لے جایا جاتا ہے تو بھی اس پیکرِ صبر و استقامت کے پاؤں میں لغزش نہیں آتی اور وہ خود ہی بڑھ کر ایک عاشق کی طرح اپنے گلے میں پھانسی کے پھندے کو "وندے ماترم" اور "بھارت ماتا کی جے" کا نعرہ لگاتے ہوئے ڈال لیتا ہے اور زیرِ لب تبسم کرتے ہوئے مندرجہ ذیل اشعار گنگنانے لگتا ہے ؎

دل فدا کرتے ہیں قربان جگر کرتے ہیں پاس جو کچھ ہے وہ ماتا کی نذر کرتے ہیں
خانہ ویران کہاں دیکھیے گھر کرتے ہیں
خوش رہو اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

ہندستان ری پبلکن ایسوسی ایشن کی بنیاد

۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد حکومت برطانیہ نے ہندستانیوں پر طرح طرح کے ظلم و جور ڈھانے شروع کر دیے اور اس بات کی کوشش میں لگی رہی کہ کسی نہ کسی طرح ان کے جذبۂ حریت کو پامال کر دیا جائے۔ اس وقت کانگریس میں " نرم دل" اور "گرم دل" دو طرح کے نظریات ابھر کر ہو گئے تھے۔ "گرم دل" طبقے کے افراد انقلاب میں یقین رکھتے تھے اور "انقلاب زندہ باد" کا نعرہ ہندستان میں سب سے پہلے انھیں بغاوت پسندوں نے بلند کیا اس طرح "گرم دل" کے افراد انگریزوں کے لیے ایک کھلا ہوا چیلنج تھے۔ اس گروہ نے "بندے ماترم" اور "بھارت ماتا کی جے" کے دو نعرے اپنی تحریک کی علامت کے طور پر اپنائے تھے اور اس تحریک کا نام "ہندستان ری پبلکن ایسوسی ایشن" تھا جس کے بانی رام پرساد بسمل تھے۔ اس تحریک کے قواعد و ضوابط "پیلے کاغذ" کے نام سے مرتب کیے گئے تھے، جس میں قدیم بغاوت پسند عناصر اور جدید باغیانہ رجحانات کے امتزاج سے ایک نیا آئین مرتب کر کے پیش کر دیا گیا تھا۔ جب کاکوری کا حادثہ پیش آیا اور پرانے باغیوں کی گرفتاریاں اور انھیں پھانسی کی سزائیں ہوئیں تو اس تحریک کی قیادت چندر شیکھر آزاد اور سردار بھگت سنگھ کے ہاتھ آئی اور ان لوگوں نے تحریک کا نام بدل کر "ہندستان سوشلسٹ ری پبلکن ایسوسی ایشن" رکھا۔ اس وقت تک ہندستان میں سوشلسٹ پارٹی کی داغ بیل نہیں پڑی تھی اور کمیونسٹ پارٹی کا وجود تو کاغذ پر بھی نہیں تھا۔ اس لیے یہ تحریک ۱۹۰۸ء کے علی پور جیل میں پستول منگا کر مخبر نریندر گوسوامی کا کام تمام کرنے والے کنھائی لال کو پھانسی دی جانے سے لے کر ۱۹۲۶ء (کاکوری حادثہ) تک کافی شدت اختیار کر چکی تھی اور سردار بھگت سنگھ کے قتل یعنی ۱۹۳۱ء کے بعد سے ۱۹۴۲ء تک پہنچتے پہنچتے یہ تحریک مدھم پڑتی گئی اور "کانگریس" کے نرم دل کا اثر بڑھتا گیا، جس سے تورشش پسندی کے بجائے "ستیہ گرہ" جیسی تحریکات نے جڑیں پکڑ لیں۔

بسمل کا ماحول اور خاندانی حالات

ریاست گوالیار میں تومر گار کے علاقہ کے نام سے ایک مقام دریائے چمبل کے کنارے واقع ہے۔ وہاں کے باشندے بڑے دلیر اور بہادر ہیں۔ ان پر حکومت برطانیہ اور مہاراج گوالیار کے دبدبہ کا بھی ذرہ برابر اثر نہ تھا۔ وہ جب بھی چاہتے بندوقیں اٹھا کر دریا سے پار کر کے میدانی علاقے میں آ جاتے اور اپنی بہادری کا مظاہرہ کر کے اپنے مواضعات میں واپس چلے جاتے تھے۔

اس علاقے کے افراد نے ایک بار مہاراج گوالیار کی فوج کے ساٹھ اونٹ چرا کر چھپا دیے۔ اونٹوں کی گمشدگی پر کافی پریشانی اور دوا دیلا مچ گئی۔ تلاش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ آخر میں جب اس بات کا علم ہوا کہ فلاں گاؤں میں اونٹ ہیں تو مہاراج گوالیار کو اس کی خبر دی گئی۔ انھوں نے حکم دیا کہ یا تو وہ لوگ اونٹ واپس کر دیں یا وہ موضع توپ لگا کر اڑا دیا جائے۔ گاؤں کے چاروں طرف توپیں لگوا دی گئیں اور حکم پر عمل ہونے ہی والا تھا کہ کچھ با اثر لوگوں نے گفت و شنید کا سلسلہ جاری کیا اور مہاراج کو مشورہ دیا کہ ایسے بہادر لوگوں کو برباد کر دینا دانشمندی نہ ہوگی۔ مہاراج نے توپ دم کر دینے کے احکام واپس لیے اور گاؤں والوں نے اونٹ واپس کیے۔

اس واقعہ کو بیان کرنے کا صرف اتنا مقصد تھا کہ بسمل جس ماحول کی پیداوار تھے اس میں کتنے دلیر، جیالے اور بہادر لوگ ہوتے تھے۔ جرأت و ہمت اس علاقے کی روایت ہے۔ ایسے بہادرانہ ماحول میں اس طرح کے انقلابی رہنما کا پیدا ہونا کوئی زیادہ تعجب خیز نہیں ہے۔ خود بسمل کے دادا شری نرائن لال جی بھی بڑے ہی جیوٹ والے تھے۔ اس علاقے میں ان کی قوت و دلیری کا ہر شخص قائل تھا۔ لیکن کچھ عرصے بعد خانگی معاملات میں تنازعہ پیدا ہو جانے کے باعث یہ اپنے دونوں لڑکے مرلی دھر اور کلیان مل جی کو لے کر شاہجہاں پور آ گئے۔ یہاں پر کچھ دنوں تک بہت ہی عسرت کی زندگی بسر کی، لیکن کچھ عرصے بعد نرائن لال جی نے شاہجہاں پور میں ہی ایک عطار کی دوکان پر تین روپیہ ماہوار پر نوکری کر لی تھی۔ اس زمانے میں قحط بھی پڑا تھا۔ اس لیے چاروں طرف اور بھی معاشی بدحالی کا دور دورہ تھا۔ گرانی اگرچہ آسمان پر پہنچ چکی تھی، لیکن وہ اس قلیل رقم میں ہی گزر بسر کرتے رہے۔ اس کا سہرا بسمل کی دادی کے سر تھا جو بڑی ہی سلیقہ مند اور منتظم خاتون تھیں۔ وہ اس مختصر رقم میں بھی کسی نہ کسی طرح اپنے خاندان والوں کو روٹی کھلاتی رہیں۔ خود آدھا پیٹ کھاتیں اور کبھی کبھی تو کئی کئی

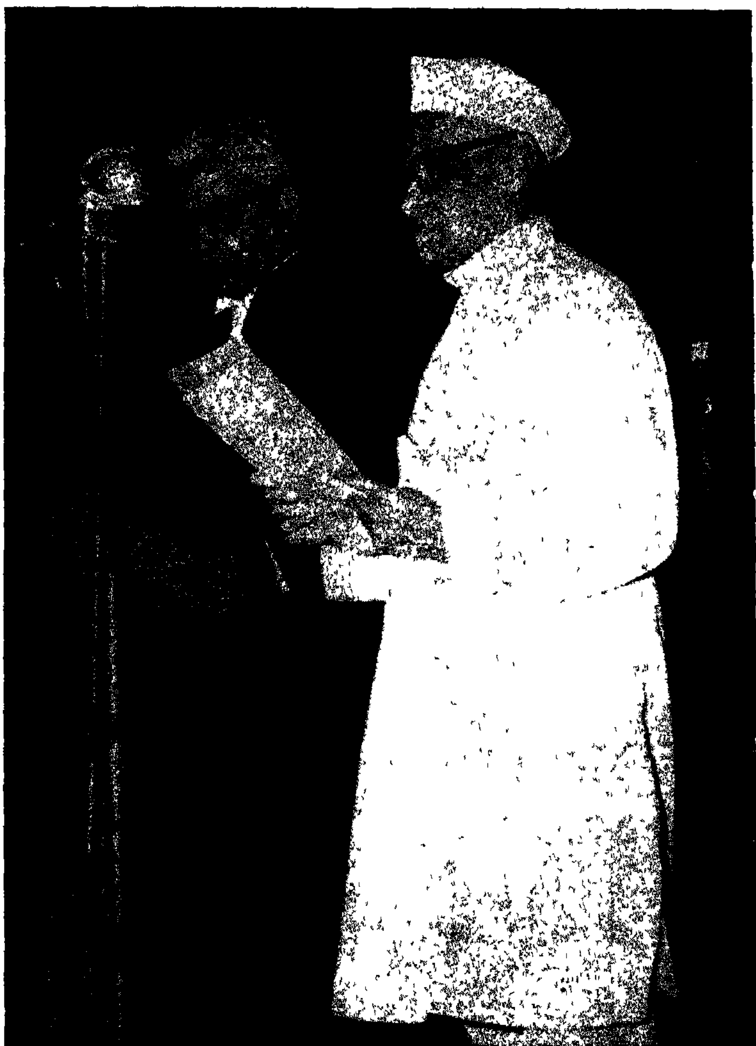
رو رہتیں اچنا اور مٹر کا ساگ کھا کر رہ جاتیں، لیکن بچوں کے لیے چھٹا جوار، باجرے وغیرہ کی روٹی کا ضرور انتظام کرتیں۔ جب ان پریشانیوں کی تاب نہ لا کر ان کے شوہر بزاتن لال جی کہتے کہ "اس قدر تلخ زندگی گزارنے سے اچھا ہے کہ واپس گھر ہی چلے چلیں" تو کبھی وہ واپسی کے لیے نہ راضی ہوتیں اور بہت ہی پر عزم لہجے میں کہتیں کہ ——— "جب ایک بار کسی سے رشتہ توڑ چکے تو پھر اس کو قائم کرنا بزدلی اور بے غیرتی ہے" ———

یہ تھے وہ خاندانی حالات جن کے پس منظر میں بسمل پروان چڑھے۔ ان کی رگ رگ میں حمیت اور غیرت کا لہو دوڑ رہا تھا۔ اسی لیے خودداری کے تحفظ کے واسطے جان کی بازی لگا دینا آسان سمجھتے تھے لیکن غلامی کی قید و بند میں رہ کر وہ ذلت کی زندگی بسر کرنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے برطانوی سامراج سے اپنی غیرت، شرافت، تہذیب، ثقافت اور عزت کا سودا کرنا کبھی بھی نہیں پسند کیا۔

بسمل کی پیدائش کا شرف شاہ جہاں پور کو حاصل ہے۔ جب بسمل کی عمر سات سال کی ہوئی تو ان کی باقاعدہ طور پر تعلیم کا آغاز ہوا کیونکہ ان کے والد مرلی دھر جی کو تعلیم و تربیت کا بہت خیال رہتا تھا۔ اس وقت کی رسم کے مطابق رام پرساد جی کی بھی تعلیم کی ابتدا اردو، فارسی سے ہوئی۔ پھر وہ ہندی کی طرف رجوع ہوئے اور رفتہ رفتہ اچھی استعداد حاصل کر لی۔ کچھ عرصے بعد آریہ سماج کی تحریک سے متاثر افراد نے انھیں آریہ سماج کے نظریات سے واقف کرایا اور بسمل کٹر آریہ سماجی ہو گئے، اگرچہ ان کے والد سناتن دھرم میں یقین رکھتے تھے۔ جب ان کے والد کو علم ہوا تو انھوں نے رام پرساد بسمل کو بلایا اور سخت انداز میں تنبیہ کرتے ہوئے کہا کہ "تم یا تو آریہ سماج چھوڑ دو یا میرا گھر چھوڑ دو۔" رام پرساد بسمل نے اپنے اصولوں کے آگے گھر کو چھوڑنا پسند کر لیا اور فوراً باپ کے چرن چھو کر گھر سے رخصت ہو گئے۔ دو ایک روز بعد ان کے والد کو اپنے غصے پر ندامت محسوس ہوئی اور بسمل کو تلاش کر کے گھر لے آئے۔ اس واقعہ کو بھی بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ بسمل اچانک بغاوت کی طرف نہیں متوجہ ہوئے بلکہ وہ بچپن ہی سے اصولوں کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ جس شخص نے اپنے اصول و نظریات کے سامنے اپنے حقائق و نظریات کو ٹھکرا دیا وہ برطانوی سامراج کے توہین آمیز اصولوں سے کیسے سمجھوتہ کر سکتا تھا۔

تحریک بغاوت کی ابتدا

اسی زمانے میں لکھنؤ میں کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا تھا جس میں کچھ ایسے بھی افراد شامل ہوئے تھے جو ملک میں منظم اور مسلح فوج کی تشکیل کر کے عملی طور پر بغاوت کے حامی تھے۔ انھوں نے ایک خفیہ اجلاس کا بھی اہتمام کیا تھا جس کا مقصد ایسے افراد سے رابطہ قائم کرنا تھا جو ان کے موقف کی تائید میں ہوں۔ جب بسمل کو اس طرح کے خفیہ اجلاس کی خبر ملی تو انھوں نے اس کو کامیاب بنانے کی جان توڑ کوشش کی، اور جب اس اجلاس کے سرگرم اراکین نے دیکھا کہ بسمل بہت ہی مخلص اور سنجیدگی سے اس تحریک کی حمایت میں ہیں تو ان لوگوں نے انھیں باقاعدہ طور پر اس تحریک کا رکن بنا لیا۔ اس کمیٹی کو مالی دشواریوں کا سامنا تھا کیونکہ اس تحریک کو عملی صورت دینے کے لیے اسلحوں کی فراہمی کی ضرورت تھی۔ ان کے پاس اپنے اسلحے تو بہت ہی مختصر تھے۔ بسمل نے یہ رائے دی کہ ایک کتاب شائع کی جائے، اس سے جو آمدنی ہو اسے کمیٹی کے خزانہ میں داخل کر دیا جائے اور اس سے اسلحوں کی خریداری کی جائے۔ کمیٹی کے اراکین نے کہا کہ لیکن کتاب کی اشاعت کے لیے روپے کہاں سے آئیں گے؟ کچھ دنوں اسی غور و فکر میں رہنے کے بعد بسمل کو ایک تدبیر سوجھی ——— انھوں نے اپنی والدہ سے کہا ——— ماں! میں کچھ روزگار کرنا چاہتا ہوں۔ اس میں اچھا منافع ہوگا، اگر آپ روپیہ دے سکیں تو بڑا اچھا ہوگا۔ ان کی ماں نے جواب دیا کہ گرچہ کل میرا ہاتھ بہت تنگ ہے کہیں خسارہ کا سامنا کرنا پڑے اس لیے سمجھ بوجھ کر روزگار شروع کرنا ——— اتنا کہہ کر انھوں نے دو سو روپے دے دیے ——— اور بسمل نے "امریکہ کو آزادی کیسے ملی؟" نامی کتاب شائع کی۔ اس کی اشاعت کے وقت دو سو روپیوں کی اور ضرورت پڑی اور ان کی والدہ نے اس رقم کو بھی دیا۔ کتابوں کی جلدیں فروخت ہونا شروع ہو گئیں۔ اس کے منافع سے دو سو روپے کی پہلی قسط بسمل نے اپنی والدہ کو ادا کر دی۔ ابھی اس کی اور کاپیاں فروخت ہونے کو باقی تھیں کہ اس تحریک کے سرگرم رکن شری گیندا لال جی دکشت گوالیار میں قید کر لیے گئے اور صوبائی حکومت نے اس کتاب کو بھی ضبط کر لیا۔ اب پھر یہ فکر دامن گیر ہوئی کہ روپے کہاں سے فراہم کیے جائیں تاکہ زیادہ تعداد میں اسلحہ جات خریدے

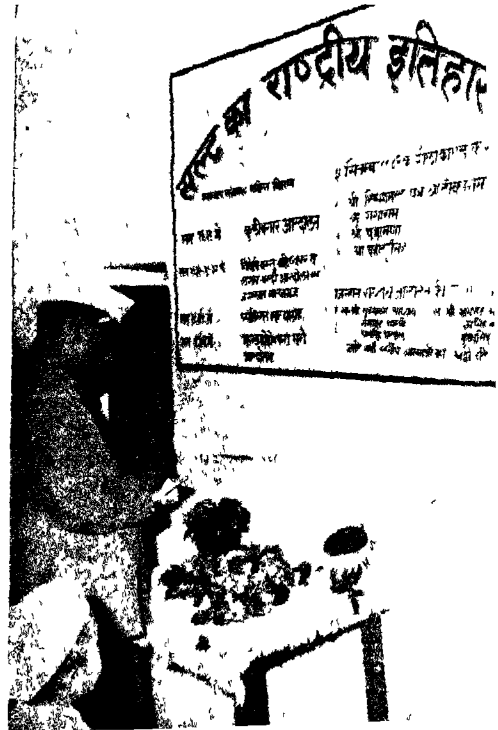


شری اکبر علی خاں

اترپردیش کے گورنر کی حیثیت سے ۱۴ر نومبر ۱۹۷۲ء کو راج بھون میں حلف لے رہے ہیں



گاندھی جینتی کے موقع پر تلک ہال کونسل ہاؤس لکھنؤ میں وزیر اعلیٰ شری کملاپتی ترپاٹھی بہترین خدمات کے لیے افسروں اور
سرکاری ملازموں کو نقد انعام اور توصیفی سرٹیفکٹ عطا کرتے ہوئے
بائیں سے دائیں شری جوگیندر سنگھ ٹرک ڈرائیور پی ڈبلیو ڈی، شری اے ان کول ایس ایس پی لکھنؤ شری ڈی ڈی
جوشی ڈپٹی کمشنر لکھنؤ اور شری شری لال سکلا ڈپٹی سکریٹری





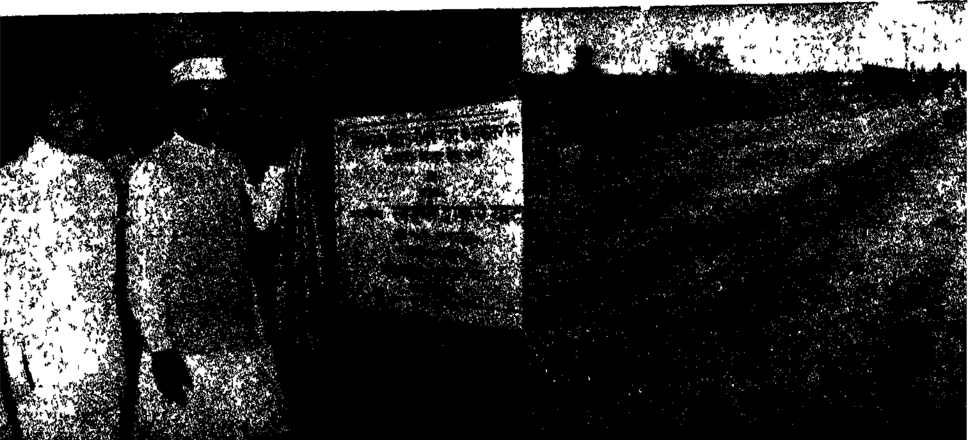
وریہ مالیات
شری نرائن دت تیواری
سلٹ (ضلع الموڑہ) میں شہیدوں کی
یادگار پر ان شہیدوں کو نذرانۂ عقیدت
پیش کر رہے ہیں جو
۱۹۴۲ء کے
ہندوستان چھوڑو اندولن میں مادر وطن
پر نثار ہوئے تھے۔

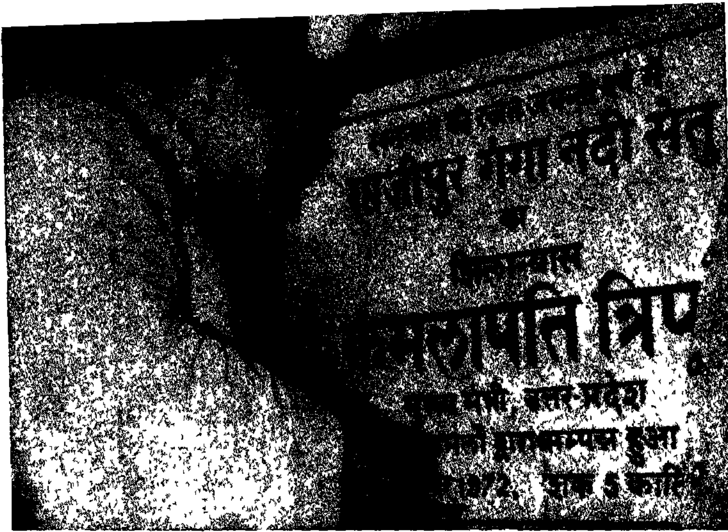




کملا پتی تریاٹھی ۱۵ ر نومبر ۱۹۷۲ء کو سیتا پور میں پی۔ اے سی
مقابلے میں ۲۷ ویں بٹالین کے کپتان شری آر۔ ایل پانڈے ◄
کو ٹیم چیمپین کی ٹرافی عطا کرتے ہوئے

آزادی کی ۲۵ ویں سالگرہ کی تقریبات کے سلسلے میں وزیر تعمیرات عامہ شری لکشمی شنکر یادو
تعمیر جیہٹ دیوا سڑک کا ۸ ر اکتوبر ۱۹۷۲ء کو افتتاح کرتے ہوئے





وزیر اعلیٰ شری کملاپتی ترپاٹھی آزادی کی ۲۵ویں سالگرہ کی تقریبات کے سال میں شروع کیے جانے والے ترقیاتی کاموں کے
سلسلہ میں غازی پور کے دریائے گنگا کے مجوزہ پل کا ۲۶؍اکتوبر ۱۹۷۲ء کو سنگ بنیاد رکھتے ہوئے۔

جواہر جینتی کے موقع پر ۱۴؍نومبر ۱۹۷۲ء کو سنٹرل اسپورٹس اسٹیڈیم میں یوم اطفال جوش وخروش سے منایا گیا۔ تصویر میں وزیر اعلیٰ شری ترپاٹھی
یوم اطفال میں حصہ لینے والے بچوں اور بچیوں کی کامیاب زندگی کے لیے اپنی دلی تمنا کا اظہار کرتے ہوئے۔



جا سکیں۔ بسمل نے بہت ہی کوششوں سے کچھ مزید بندوقیں وغیرہ اکٹھا کیں اور مجوزہ پروگرام کے تحت کاکوری ریلوے اسٹیشن پر سرکاری خزانے کو لوٹنے کی تیاری میں مشغول ہو گئے۔ پھر ۹ اگست ۱۹۲۵ء کو کاکوری میں سرکاری خزانہ لوٹ لیا گیا۔ اس جرم میں منجملہ اور لوگوں کے بسمل اور اشفاق اللہ خاں بھی گرفتار ہوئے اور برطانوی حکومت نے انھیں سخت ترین سزا دی اور ۱۶ دسمبر ۱۹۲۷ء کو انھیں پھانسی کے تختے پر چڑھا دیا گیا۔ بسمل کی پھانسی کی خبر سارے ملک میں آگ کی طرح پھیل گئی اور ملک کے طول و عرض میں گہرے رنج و غم کا اظہار کیا گیا۔ لاکھوں افراد نے متحد ہو کر "رام پرساد بسمل زندہ باد" کا نعرہ لگایا، عورت، مرد، بوڑھے، جوان اور بچوں نے "بھارت ماتا کی جے" اور "وندے ماترم" کے مخصوص نعرے لگائے، جس کے بسمل موجد تھے۔ سبھی نے ایک زبان ہو کر بسمل کا مندرجۂ ذیل شعر روتے ہوئے گلے سے گنگنایا ؎

شہیدوں کی چتاؤں پر لگیں گے ہر برس میلے
وطن پر مرنے والوں کا یہی باقی نشاں ہوگا

(۳)

بسمل بنیادی طور پر اردو کے طالب علم تھے، اس لیے اردو شاعری سے بھی انھیں فطری مناسبت تھی اور اسی خصوصی نسبت نے ان سے شعر بھی کہلوائے ہیں۔ درحقیقت ہندوستان کی جنگ آزادی میں اردو شعر و ادب کا اہم رول رہا ہے اور بسمل کے اشعار نے بھی اور حقیقی وطنی محبت کا ثبوت دیا ہے۔ اس وقت کی آزادی کی ادبی فضا میں بسمل کے نغمے گونجتے رہتے تھے لہٰذا بسمل کی شاعری ایک تاریخی اہمیت کی مالک ہے۔ جب ۱۹۴۴ء میں راج نرائن مصرا کو پھانسی کی سزا ملی تو وہ پھانسی کے تختے پر بسمل کے مندرجہ ذیل اشعار والہانہ عقیدت سے گنگنا رہے تھے ؎

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے — دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے
رہرو راہِ محبت رہ نہ جانا راہ میں — لذت صحرا نوردی دوریِ منزل میں ہے
آج مقتل میں یہ قاتل کہہ رہا ہے بار بار — اب کہاں شوقِ شہادت بھی کسی کے دل میں ہے
وقت آنے دے بتا دیں گے تجھے اے آسماں — ہم ابھی سے کیا بتائیں کیا ہمارے دل میں ہے
اے شہیدِ ملک و ملت ہم تیرے اوپر نثار — اب تری ہمت کا چرچا غیر کی محفل میں ہے
اب نہ اگلے ولولے ہیں اور نہ ارمانوں کی بھیڑ — ایک مٹ جانے کی حسرت اب دلِ بسمل میں ہے

یہ وہی نغمۂ حریت و جواں مردی ہے، جسے کاکوری کے واقعے میں پھانسی کی سزا سنائی جانے سے قبل مجاہدین آزادی نے عدالت سے باہر زمین پر بیٹھ کر جھوم جھوم کر گایا تھا اور ان کے عزم و استقلال کو دیکھ کر عدالت کو بھی تعجب ہوا تھا۔

اس وقت کے رسائل اور اخبارات میں بسمل کا کلام شائع ہوتا تھا۔ "پربھا" اور "رام" نامی ماہنامہ رسالوں میں ان کی تخلیقات مستقل شائع ہوتی تھیں لیکن افسوس ہے کہ انتہائی تلاش و تحقیق کے باوجود بھی ان کی نظمیں دستیاب نہیں ہو سکی ہیں اس لیے ان کا مکمل کلام اہل نظر کے سامنے نہیں آسکا ہے۔ ایک مختصر انتخاب کلام پیش خدمت ہے ؎

مٹ گیا جب مٹنے والا پھر سلام آیا تو کیا — دل کی بربادی کے بعد ان کا پیام آیا تو کیا
کاش اپنی زندگی میں ہم یہ منظر دیکھتے — یوں سرِ تربت کوئی محشر خرام آیا تو کیا
مٹ گئیں جب سب امیدیں مٹ گئے سارے خیال — اس گھڑی پھر نامہ بر لے کر پیام آیا تو کیا
اے دلِ ناکام مٹ جا اب کوئے یار میں — پھر مری ناکامیوں کے بعد کام آیا تو کیا

آخری شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم گر چہ کوئی بالائے بام آیا تو کیا

ہم شہیدانِ وفا کا دین و ایماں اور ہے — سجدے کرتے ہیں ہمیشہ پاؤں پر جلاد کے

ہے تمنا میں جلد یار لاش بسمل کی — کہ جو کی مچھلیاں ہیں دستِ شمشیر قاتل کی

وفا پر دل کو صدقے جان کو نذر جفا کیجیے — محبت میں یہ لازم ہے کہ جو کچھ ہو فدا کیجیے

سمجھ کر پھونکنا اس کو ذرا اے داغِ ناکامی — بہت سے گھر بھی ہیں آباد اس اجڑے ہوئے دل میں

مالک تری رضا رہے اور تو ہی تو رہے — باقی نہ میں رہوں نہ مری آرزو رہے

جب تک کہ تن میں جان رگوں میں لہو رہے — تیرا ہی ذکر اور تری جستجو رہے

کیا ہی لذت ہے کہ رگ رگ سے یہ آتی ہے صدا — دم نہ لے تلوار جب تک جان بسمل میں رہے

(بقیہ صفحہ ۴۲ پر)



بتائیں معتبر مکرم مجھے یہ بعد سلام
کہ یہ کہاں کا ہے طرز و طریقۂ اسلام
کیا ہے درہم و برہم تو زندگی کا نظام
ہمارے خلق و محبت کا ہے یہی انعام

سمجھ میں آیا نہ بھارت سے دشمنی کا سبب
بلا وجہ تو مناسب نہیں، یہ غیظ و غضب

یہی زمیں، تمھاری بھی جنم داتا ہے
اسی زمیں کی فضاؤں نے تم کو پالا ہے
اسی زمیں پہ کبھی بچپنا گذارا ہے
اسی زمیں پہ تمھارا شباب آیا ہے

وہی زمیں جہاں اگتے تھے آرزو کے چمن
وہی زمیں جہاں بہتے ہیں سندھ و گنگ و جمن

اسی وطن پہ کبھی تم بھی فخر کرتے تھے
دم اس کی عظمت و حرمت کا تم بھی بھرتے تھے
ترانے گاتے تھے اسکے جہاں گذرتے تھے
نہ بھولو اسکے تقدس پہ تم بھی مرتے تھے

کہاں چھپاؤ گے اقبال کے ترانے کو
مذاق اڑانے کا موقع نہ دو زمانے کو

شعور بریلوی

رہیں جو پیشِ نظر امن و آشتی کے اصول
ہم آپ سے ہوں کبیدہ نہ آپ ہم سے ملول
یہ عصر نو ہے، حریفانہ ذہنیت ہے فضول
یہ دشمنوں کی ہیں چالیں انھیں نہ کیجے قبول

یہ ایک مشورۂ نیک ہے، اگر مانیں
مگر نہ اس کو کہیں آپ بزدلی جانیں

مسافرت کا نتیجہ تمھیں نہیں معلوم
مآلِ ظلم و جفا کیا تمھیں نہیں معلوم
شعارِ حبِ وطن کیا تمھیں نہیں معلوم
ہمارا فرض ہے کیا، کیا تمھیں نہیں معلوم

ہم اس زمیں کے تقدس پہ سر کٹا دینگے
پہاڑ راہ میں آئیں تو ہم ہٹا دینگے

کریں جو آپ بھی شملہ معاہدے پہ عمل
فضائے امن ہو قائم تو مسئلے ہوں حل
بگڑ چکے ہیں جو حالات خود ہی جائیں سنبھل
تو دونوں دیشوں میں کھل جائیں آرزو کے کنول

جفا شعاروں کی سازش جو کامیاب نہ ہو
تو پھر جہاں میں ہمارا کوئی جواب نہ ہو





سستاکی زندگی ایک خواب پریشاں کی طرح ہوگئی تھی وہ دن کتنے خوشگوار تھے جب وہ صبح جاگ جانے کے باوجود سوتی بنی رہتی جتنی کہ اس کے ڈیڈی پہلے آواز دیتے پھر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے تب کہیں وہ اٹھا کرتی اسے ان کی پیار بھری ڈانٹوں میں لطف ملتا تھا جس کی وہ عادی ہو چکی تھی۔

اُس منحوس دن بھی سویرے ہی اس کی آنکھ کھل گئی تھی مگر وہ حسب عادت انتظار کرتی رہی کہ ڈیڈی آئیں تو اٹھے مگر جب دیر تک ڈیڈی نہیں آئے تو ناامید ہو کر اور کچھ جھلا کر وہ خود ہی اٹھ بیٹھی اور سیدھی ان کے کمرے میں شکایت کرنے پہنچی۔ ڈیڈی کا چہرہ اترا اترا سا تھا پھر بھی انھوں نے سستا کو دیکھا تو مسکرانے لگے

"آپ کی طبیعت خراب ہے کیا؟ آج آپ مجھے جگانے بھی نہیں آئے"

"ہاں بیٹی آج پھر تکلیف ہو گئی ہے۔ تمھاری ممی سے جگانے کے لیے کہا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ تم بے خبر سو رہی ہو تو میں نے منع کر دیا کوئی گہری نیند سو رہا ہو تو اسے آرام کرنے دینا چاہیے۔"

سستا نے انکی پیشانی چھو کر دیکھی وہ بالکل ٹھنڈی ہو رہی تھی جیسے برف۔

"آپ کو بخار تو نہیں معلوم ہوتا۔ سر میں درد ہے کیا؟ لایئے دبا دوں"

اور منع کرنے کے باوجود وہ دھیرے دھیرے ان کا سر سہلانے لگی جیسے وہ خود اس کو جگانے کے لیے سہلایا کرتے تھے

ڈاکٹر صاحب ایک بار پھر آئے کچھ نئی دوائیں تجویز کیں اور یقین دلا گئے کہ اس کے ڈیڈی جلد اچھے ہو جائیں گے۔

وہ دیر تک ان کے پاس بیٹھی رہی۔ ہر شخص بالکل خاموش تھا۔ اس سکوت سے اسے دہشت ہونے لگی کہ اتنے میں اس کی آیا نے اسے اشارے سے پاس بلا کر کہا کہ "چلیے چائے پی لیجیے۔"

کھانے کی میز تک وہ بادل ناخواستہ پہنچی آج کوئی بھی اس کے ساتھ نہیں تھا آیا نے بتایا کہ سب لوگ ناشتہ کر چکے ہیں۔ اسے تعجب ہوا کہ آج اتنی جلدی ناشتہ کیسے ہو گیا کسی نے اس کا انتظار بھی نہ کیا۔ اس کے ڈیڈی کبھی ایسا نہیں کرتے تھے اور شام کو آفس سے لوٹ کر تو وہ اسے دم بھر کو بھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے تھے۔

اُس دن سستا کھیلنے کے لیے باہر نکلی تو اس کا جی نہ لگا وہ بار بار گھر لوٹ آتی تھی کسی نہ کسی طرح دن کٹ گیا۔ رات کو وہ بستر پر لیٹی تو اسے بے اختیار رونا آ گیا اور وہ روتے روتے ہی سو گئی

دوسرے دن سویرے وہ اٹھی تو عجب طرح کا شور تھا! اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ وہ چپ چاپ ڈیڈی کے کمرے کی طرف بڑھی راستے میں اسے خیال آیا کہ وہ سوئٹر نہیں پہنے ہے ڈیڈی ناراض ہوں گے۔ وہ لوٹ کر سوئٹر تلاش کرنے لگی بیماری کی حالت میں وہ انھیں پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی

ڈیڈی کے کمرے میں خلاف معمول بہت سے رشتے دار جمع تھے اس نے دیکھا کہ اس کے ڈیڈی اپنا چہرہ چادر سے ڈھکے ابھی تک سو رہے ہیں۔

سستا ان کے پلنگ کے قریب جانے لگی تو اس کو منع کر دیا گیا۔ وہ وہیں جگہ گم گئی۔ ٹھیک ہی تو ہے ڈیڈی نے ابھی کل ہی تو اسے بتایا تھا کہ کوئی گہری نیند سو رہا ہو تو اسے جگانا نہیں چاہیے آرام کرنے دینا چاہیے وہ گہری نیند سو رہے ہیں تبھی تو اسے قریب جا کر جگانے سے روک دیا گیا۔

شام کو اسے بتایا گیا کہ اس کے ڈیڈی کو ڈاکٹر صاحب نے نیند کی دوائیں دی ہیں اور علاج کے لیے وہ انھیں اپنے ساتھ لے جائیں گے۔

ان کے چلے جانے کے بعد وہ ان کا انتظار کرتی رہی سب سے پوچھتی رہی کہ اس کے ڈیڈی کب آئیں گے کوئی بھی اس کے سوال کا جواب نہ دے پاتا آخر ایک دن اسے بتایا گیا کہ اس کے ڈیڈی کا تبادلہ کہیں بہت دور ہو گیا ہے اور وہ جلدی نہیں آ سکیں گے۔

شروع شروع میں کئی دن اس کی ممی نے اسے جگایا لیکن اس نے انھیں یہ کہہ کر منع کر دیا کہ وہ خود ہی سویرے اٹھ جایا کرے گی۔

اب دن کسی طرح کاٹے نہ کٹتا وہ صبح سے شام تک پورے گھر میں بھٹکتی پھرتی۔ کوئی سہیلی آ جاتی تو خیر ورنہ اسے کسی کا انتظار نہیں رہتا تھا۔ شام کو ایک ماسٹر صاحب آ جاتے تھے جن کی ٹھوڑی غائب تھی۔ وہ اس کے اسکیل سے بار بار قمیص کے اندر سے اپنی پیٹھ کھجایا کرتے تھے ماسٹر صاحب کی اس حرکت سے اسے چڑ تھی ان کے جانے کے بعد اسے اسکیل اٹھاتے بڑی کراہت محسوس ہوتی یہ ماسٹر اس کے ڈیڈی سے کتنے مختلف تھے ہر وقت ناک بھوں چڑھی ہوئی۔

اکثر راتوں کو وہ اپنے ڈیڈی کو خواب میں دیکھتی اور ہر بار یہ یقین کر لیتی کہ پچھلی بار کی طرح یہ خواب نہیں ہے اس کے ڈیڈی سچ مچ واپس آ گئے ہیں اور اب اسے چھوڑ کر کہیں نہ جائیں گے۔ اس کے گزرے ہوئے پر مسرت دن ایک بار پھر لوٹ آئے ہیں۔

صبح اب پہلی سی صبح نہیں رہ گئی تھی۔ وہ بے رحمی کے ساتھ اس کا سکون درہم برہم کر دیتی تھی اب اسے گھر سے بھی الجھن ہونی تھی۔ اس کا زیادہ وقت قریب کے ایک تالاب کے کنارے گذرا کرتا تھا اس تالاب میں ایک پتھر کا ستون گڑا ہوا تھا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ کبھی کوئی بنجارا یہیں کہیں آس پاس اپنا خزانہ دفن کر کے نشاندہی کے لیے یہ پتھر نصب کر گیا ہے۔

تالاب کے کنارے کہیں سے روز ایک بگلا سویرے ہی آ جایا کرتا تھا۔ وہ سوچا کرتی تھی کہ طوطے والی کہانی کی طرح کسی جادوگر نے اس بنجارے کو کہیں بگلا تو نہیں بنا دیا ہے۔

سے اب اپنا خزانہ کبھی نہیں مل سکتا پھر بھی بے چارا یہاں آس لگائے دن دن بھر کھڑا رہتا ہے

برسات کے بعد جب تالاب کا پانی ذرا کم ہو جاتا تو اس پتھر کے قریب پہنچنے کا ایک پتلا سا راستہ ابھر آتا دوپہر کو جب ہر طرف سناٹا چھا جاتا تو وہ اس پتھر کے پاس بیٹھا کرتی تھی۔

تالاب کی چھوٹی چھوٹی لہریں جب ایک جانب سے دوسری جانب تیزی سے بھاگتی ہوئی سامنے سے گزرنے لگتیں تو اسے محسوس ہوتا جیسے وہ جگہ جہاں وہ بیٹھی ہوئی ہے ایک کشتی کی طرح چل پڑی ہے اس احساس سے اسے بڑی آسودگی ملا کرتی تھی وہ زندگی سے فرار کی خواہاں تھی۔

جوانی میں قدم رکھنے کے بعد بھی فرار کی خواہش جوں کی توں قائم رہی اس کے دل کے سونے بن میں کوئی فرق نہ آیا آخر کار اسی لیے اسے جینا سکھا دیا وہ کیا چاہتی ہے کیا نہیں اسے کیا پسند ہے کیا ناپسند؟ یہ سب ایک معمہ بن گیا وہ سب کچھ چاہتی تھی اور کچھ بھی نہیں اسے سب پسند بھی تھا اور ناپسند بھی۔

غم اور عارضی سکون کی دھوپ چھاؤں میں وقت بے پاؤں گذرتا رہا بے کیفی کے اس دور میں انل نے اس کا ساتھ دیا۔ اور کچھ نہیں تو اس کے احساس تنہائی میں یک گونہ کمی ضرور واقع ہو گئی۔

انل نے اس کو الجھے ہوئے خیالات کی دنیا سے باہر نکال لیا جہاں وہ ریشم کے کیڑے کی طرح پناہ گزیں تھی پھر بھی کوئی چیز اس کے اور انل کے درمیان دیوار کی طرح استادہ تھی۔ انل اس کی دل جوئی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھتا پھر بھی سشما کو ہر دم ایک گمنام سی خلش کا احساس ہوا کرتا۔ انل سے مل کر اسے سکون تو ملتا مگر یہ بڑا عارضی ثابت ہوتا اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ سوچنے لگتی کہ انل چلا جائے اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دے تو اچھا ہو۔

آخر ایک دن انل چلا گیا اس کو کہیں دوسرے شہر میں نوکری مل گئی تھی ایک عرصے تک خط و کتابت جاری رہی پھر یہ سلسلہ منقطع ہو گیا سشما کو اس سے تکلیف پہنچی یا نہیں یہ بھی اس پر ٹھیک سے واضح تک نہ ہو سکا اس کے بعد ایک مدت تک اس نے تنہائی میں بیشمار خواب دیکھے۔ وہ ایک تصویر بناتی پھر خود ہی اس کو مٹا بھی ڈالتی۔ اسی دوران ایک ایسی تصویر بنی جو ضدی اور سرکش تھی۔

ستیش سے اس کی باقاعدہ ملاقات ایک کلب میں ہوئی جہاں اس دن نئے سال کے استقبال میں جشن منایا جا رہا تھا ہال

کے چکنے فرش کو اور بھی چکنا کرنے کے لیے اس پر فراخدلی سے پاؤڈر چھڑکا گیا تھا تاکہ رقص کرتے ہوئے جوڑوں کے قدم موسیقی کی تیز سے تیز دھنوں پر بھی اپنے جوہر دکھا سکیں اور جسم ہر زاویے سے جھک سکیں، سمٹ سکیں لہرا سکیں۔

ستشا نے سادہ سی ہلکی نیلی ساری پہن رکھی تھی اور اسی رنگ کی بندی بھی لگائی تھی لپ اسٹک کا رنگ بھی کھلتا ہوا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے یہاں آنے کی تیاری بڑی بے دلی سے کی ہو۔

"تم جاؤ" اس نے ایک گوشے میں رکتے ہوئے اپنی سہیلی سے کہا "دور سے آتی ہوئی آرکسٹرا کی آواز بہت پیاری معلوم ہوگی میں کچھ دیر یہیں بیٹھوں گی۔" وہ کسی خیال میں غرق بیٹھی تھی کہ تنیش پھرتا پھرتا ادھر آنکلا دونوں میں سرسری دو ایک ملاقاتیں پہلے بھی ہو چکی تھیں اور کسی حد تک اجنبیت دور ہو چکی تھی۔

"تم سب سے الگ تھلگ کیوں بیٹھی ہو اندر کیوں نہیں گئیں" ؟ تنیش نے اس سے پوچھا

"یہاں سکون ہے اندر بھیڑ بھاڑ سے الجھن ہوتی ہے۔"

"میں خود بھی پرسکون جگہ کی تلاش میں تھا تم کو اعتراض نہ ہو تو یہیں بیٹھ جاؤں۔"

"ضرور بیٹھو مگر تم ڈانس میں حصہ کیوں نہیں لیتے۔"

"اس طرح کی تفریحی تقریبیں مجھے پسند نہیں۔ آؤ بلیرڈ روم کے پاس والے کمرے میں چل کر بیٹھیں وہاں اور بھی عافیت ہوگی۔"

اس کمرے میں شور برائے نام پہنچ رہا تھا۔ آرکسٹرا کی دھیمی دھیمی لے کے ساتھ بلیرڈ کی گیندوں کے ٹکرانے کی آواز تھوڑی تھوڑی دیر بعد شامل ہو جاتی تھی۔ خالی میز پر رکھی ہوئی ایش ٹرے میں کسی بجھے ہوئے سگریٹ کا دھواں چھت کی جانب بلند ہو رہا تھا ہوا کے جھونکے سے دھوئیں کی یہ کمزور لکیر کانپ کانپ جاتی تھی۔

"تم تنہا کیوں بیٹھی تھیں ؟"

"یوں ہی" ستشا نے تنیش کے سوال کا جواب دیا۔

"تنہائی میں تمہارا جی نہیں گھبراتا ؟"

"نہیں ـــــ مجھے تنہائی پسند ہے۔"

"میں مخل تو نہیں ہو رہا ہوں ؟"

"نہیں تو۔"

"تنہائی پسند لوگوں میں تخلیقی صلاحیتیں اچھی ہوا کرتی ہیں۔"

"مجھ میں کوئی صلاحیت نہیں ہے۔"

"تعجب ہے۔ خیر اس موضوع کو چھوڑو کل نیا سال شروع ہوگا آؤ ہم بھی اس کا استقبال کریں۔"

"کیا یہ ضروری ہے کہ ہم ہر نئے سال کا استقبال کیا کریں اس سے بھی کہیں کوئی فرق پڑتا ہے ؟"

"نہیں ضروری تو نہیں لیکن کیوں نہ زندگی کے ہر موڑ پر ہم کسی بہانے تھوڑا سا خوش ہو لیا کریں۔ اس میں آخر حرج ہی کیا ہے؟"

"لیکن ہمارے اختیار میں کچھ ہو تب نا ! کیا ہم شب و روز کے اس سیل رواں پر خشک پتوں کی طرح نہیں ہیں ؟ لہروں کے تھپیڑے ہمیں جدھر چاہتے ہیں لے جاتے ہیں ان کے رحم و کرم پر ابھرتے ڈوبتے گھومتے چکراتے ایک دن کہیں گم ہو جائیں گے۔"

"تم تقدیر پرست ہو گئی ہو کیا ؟"

"اور تم ؟"

"میں کچھ بھی نہیں ایک تھکا ہارا انسان ہوں کبھی گھنٹوں مستقبل کا سراغ لگانے کے لیے تاش کے پتوں کو اپنے سامنے پھیلا کر ان کی پیش کردہ تعبیریں دیکھا کرتا ہوں۔ مستقبل کی یہ جھلک کبھی یاس انگیز ہوتی ہے کبھی امید افزا جب تک جی چاہتا ہے یہ کھیل کھیلتا رہتا ہوں زندگی کے رنگا رنگ روپ دیکھتے دیکھتے جب اکتا جاتا ہوں تو بند کر دیتا ہوں خدا جانے بے بس ہوں یا صاحب اختیار۔"

ستشا بالکل خاموش کسی سوچ میں ڈوبی رہی۔

"آج کی تقریب میں تم کوئی حصہ لینا نہیں چاہتیں تو نہ لو کچھ دیر میرا ساتھ تو دے سکتی ہو پھر چلی جانا یہاں میں اس وقت تک رکوں گا جب تک گرجے کے گھنٹے بج کر نئے سال کے آغاز کا اعلان نہ کر دیں اس وقت چپ چاپ کھڑا ہو کر سوچوں گا کہ خدا سے دنیا سے آخر کیا مانگوں"۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر کبھی دکھ نظر آنے لگتا تھا کبھی اطمینان سا۔ "انجام کو دیر ہو رہی

ہوگی۔ تم جاؤ مگر کل بھی میں تمہارا انتظار کروں گا۔" شنیش نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

دوسرے دن شنیش کا چہرہ پچھلے روز کے مقابلے میں بشاش تھا۔

"تم آج بہت خوش ہو" سشما نے اس سے پوچھا۔

"میری شکل ہمیشہ بسورتی ہوئی نہیں رہی۔"

"کیا میری شکل بسورتی ہوئی ہے؟"

"اور نہیں تو کیا اتنے دنوں میں میں نے تم کو صرف ساڑھے چھ بار مسکراتے ہوئے دیکھا ہے۔"

"یہ ساڑھے چھ کا کیا مطلب ہے؟"

"ایک بار تم مسکرانے کا محض ارادہ کر کے رہ گئی تھیں اس کا نصف شمار ہوگا۔"

سشما ہنس پڑی شنیش نے کہا "کل میرا جی چاہ رہا تھا کہ کلب میں جو لوگ مسرت کی تلاش میں جھوٹے قہقہے لگا رہے ہیں ان سب کو چمگادڑوں کی طرح الٹا لٹکا دوں صرف دو کو چھوڑ کر۔"

"کس کو، کس کو؟"

"ایک تم کو، ایک بلیرڈ روم کے مارکر کو جو ہنسنے سے ایک منٹ پہلے پورا منہ کھول لیا کرتا ہے اور ہنس چکنے کے بعد ایک منٹ تک کھولے رکھتا ہے۔ اس دنیا میں اتنے اہتمام سے ہنسنے والے کی ہمیں قدر کرنا چاہیے۔ آج تم آ گئی ہو اس وجہ سے میں بہت خوش ہوں یہ سن کر تم جھوٹ موٹ شرما جاؤ۔ تمہیں چھوئی موئی بننے کا اچھا موقع مل گیا ہے ہر عورت سوچتی ہے کہ وہ شرماتے وقت بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔"

"اور تم یہ سوچتے ہو کہ گھوڑے کی طرح منہ لٹکا کر سنجیدہ بننے کی کوشش کرتے ہوئے تم بہت خوبصورت معلوم ہوتے ہو۔"

"آج کے دن بھی وہی تو تو میں میں، اسے تو غنیمت گذر جانے دو نا۔" شنیش نے مسکراتے ہوئے اس سے کہا۔

مزاج کی یکسانیت نے دونوں کو جلد ہی ایک دوسرے کے قریب کر دیا شنیش کے ساتھ نے سشما کو بہت کچھ دیا تھا مگر کبھی صورت اس کی یاسیت اس کا پیچھا چھوڑتی۔ وہ سوچا کرتی کہ وہ اپنا مطلب ہو گئی ہے۔ تنہائی اس کے لیے ناقابل برداشت تھی اور کسی کا ساتھ بھی اسے غیر معتبر معلوم ہوتا ہے۔

اس کی ہنسی اور آنسو گڈ مڈ ہو کر ایک ناقابل برداشت بوجھ بن گئے ہیں۔ اس کا کیا علاج ہے اگر کبھی وہ یہ سوچنے لگتی تو اس کے ذہن پر گہرا کہرا چھا جاتا جس میں کچھ تلاش کرنا بے سود ہوتا تھا انہیں خیالوں میں وہ الجھی بیٹھی تھی کہ شنیش آ گیا۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" اس نے آتے ہی دریافت کیا۔

"کچھ نہیں، دماغ خود بخود سوچنے لگتا ہے۔ تنہائی میں تم بھی اسی طرح سوچا کرتے ہوگے۔"

"ہاں سوچتا تو میں بھی ہوں۔"

"کیا سوچتے ہو بتاؤ۔"

"میں سوچتا ہوں کہ تم مجھے بھلا تو نہ دوگی؟"

"عورت اپنا پیار کبھی نہیں بھلا سکتی۔"

"یہ تو بہت گھسی پٹی بات ہے مگر عورت اپنا پہلا پیار سب سے آخر میں کیا کرتی ہے۔" شنیش نے ہنستے ہوئے مذاقاً کہا۔

"اور مرد کی محبت لافانی ہوتی ہے؟" سشما نے طنزاً کہا "انسان صرف اپنی ذات کی پرستش کیا کرتا ہے اور اپنے ہی در پہ بھینٹ چڑھنے کے لیے سارے اہتمام کرتا ہے کسی کو ٹھوکر لگا کر مسرت حاصل کرتا ہے، کسی کو خوشی کی تلاش میں سجدے کیا کرتا ہے اس کا ہر فعل خود اس کی اپنی ذات پر ایک احسان ہوتا ہے۔"

"آج پھر تم پر وحشت کا دورہ پڑا ہے۔"

"مجھ پر کوئی دورہ نہیں پڑا۔ کیا تم اس وقت مجھ کو میرے حال پر نہ چھوڑ دوگے؟"

"تم کہتی ہو تو ضرور چلا جاؤں گا۔"

"ہاں چلے جاؤ۔ ابھی چلے جاؤ۔" سشما کا دل بھر آیا تھا وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگی تھی۔

"پاگل ہو گئی ہو کیا؟ تمہاری کوئی حرکت میری سمجھ ہی میں نہیں آتی ہے۔ تم جتنی دیر جی چاہتا ہے خوش رہتی ہو پھر خواہ مخواہ

(بقیہ صفحہ ۱۴۴ پر)

عہدِ سیمیں

وشیہ عبدالسمیع ملیح

خوشا کہ وادیٔ گنگ و جمن چہک اٹھی
شعاعِ نور سے ارضِ وطن چمک اٹھی

فصیلِ شب کے جھروکوں سے صبحِ آزادی
چمکتی جھومتی گاتی ہوئی اتر آئی
چمن چمن سے بہاروں کے قافلے لے کر
نشاطِ روح کے سامان رنگ و بو لائی
نزاکتوں کا وہ عالم کہ دیکھتے رہیے
لطافتوں کی وہ شبنم کہ پھول پھول نثار
حیاتِ عشق کی خاطر کھلا ہے بابِ جنوں
حجابِ ناز نے بخشی ہے جراتِ دیدار

فسوں طراز ہے ہر لمحہ جشنِ سیمیں کا
نگاہ دیکھ سکے رنگ عہدِ زریں کا

شمیمِ وقت سے مہکی ہے رہگذارِ حیات
نشاط و کیف کا پیغام دے رہی ہے سحر
دلوں میں مشعلِ آزادیٔ وطن روشن
ہجومِ شوق سے رقصندہ کائناتِ نظر
فرازِ کوہ ہمالہ ہے باعثِ تعظیم
کہ آج مشرق و مغرب ہیں جس کے زیرِ اثر
سفیرِ شب نے جسے بارہا سلامی دی
مرے وطن کا محافظ نشانِ فتح و ظفر

چلو کہ آج زمانے کو ہم نوا کر لیں
بنامِ ہند محبت کی ابتدا کر لیں

وطن کے برج پہ ہے پھر وقت کا حسین آنچل
ہوا کے دوش پہ اڑتے ہیں امن کے بادل
دعا بلب ہیں تقاضے حیاتِ نو کے لیے
ہر ایک منزلِ دوراں ہر ایک شام و سحر
سرشکوں کے خزانوں سے ہم کنار رہے
گذر کے آئے جو پچیس سنگ کوں سے سحر
نفس نفس میں رہے تازگی بہاروں کی
تمام راہ تکے ہند کے ستاروں کی

[redacted]

(شملہ معاہدے کی روشنی میں)

شباب گورکھپوری

بناؤ ایسا نشیمن کہ شاہکار رہے
نگاہِ برق پڑے بھی تو شرمسار رہے
قدم اٹھانے سے پہلے رہے خیال اس کا
معاہدہ جو ہوا ہے وہ برقرار رہے
چراغِ امن بجھا دیں گے یہ خرد دشمن
جو اُن کی چالوں سے ہم تم نہ ہوشیار رہے
خلوصِ دل سے جو جمہوریت کے سانچے میں
تم اپنے دیش کو ڈھالو تو اقتدار رہے
چمن تو خیر چمن ہی ہیں لطف تو جب ہے
خزاں نصیب گلستاں میں بھی بہار رہے
نہ بھولو امن پرستی ہی دیش بھگتی ہے
اسی پہ ملک کا ملت کا انحصار رہے
کہ اب تو ایک حقیقت یہ بنگلہ دیش بھی ہے
کرو وہ بات کہ ماحول خوشگوار رہے
سبھی نے اس کو سراہا اور اس سے پیار کیا
مگر ضمیر نے یہ چاہا کہ افتخار رہے
بڑھاؤ ہاتھ تم اس سے بھی دوستی کے لیے
یہی ہے شان کہ وہ بھی سدا بہار رہے
رہے نہ کام اجالوں ہی سے شباب مجھے
اندھیری راتوں سے بھی دل کو تیرے پیار رہے

ایشیا ۷۲



ادارہ

ہندستان میں ۳ نومبر سے تیسرے ایشیائی عالمی تجارتی میلے کا آغاز ہوگیا ہے۔ فن تعمیر کے لحاظ سے ایشیائی میلہ بھارتی نمائشوں کی تاریخ میں ایک اہم باب کا اضافہ ہے۔ یہ اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ بھارت کا فن تعمیر اپنی بالیدگی اور پختگی کے لحاظ سے ایک نئے دور میں داخل ہوگیا ہے۔ ملک میں پہلی مرتبہ ایک مستقل نمائش گاہ کی تعمیر بھارت کو تجارتی میلوں کی بین الاقوامی انجمن کی رکنیت کا مستحق بنادیتی ہے۔

ایک سو ساٹھ ایکڑ کے رقبے میں پھیلی ہوئی ایشیا ۷۲، نمائش کے لیے جگہ کی فراہمی ایک اہم مسئلہ تھا۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے نمائش کی موجود جگہ کا انتخاب کرکے یہاں پہلے کی بنی ہوئی متعدد تعمیرات کو زمیں بوس کیا گیا اور موجودہ مستقل نمائش گاہ تعمیر کی گئی۔ یاد رہے کہ اس سے قبل بھارتی صنعتوں کا میلہ، زرعی میلہ، ریلوے کی صد سالہ تقریبات اور کم لاگت کے مکانوں کی نمائش اسی مقام پر لگائی گئی تھیں۔

ایشیا ۷۲، کی مرکزی تعمیرات چالیس ایکڑ رقبہ زمین کا احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ نمائش کی باقی عمارتیں اس کے چاروں طرف تعمیر کی گئی ہیں۔ نمائش میں داخل ہونے کے چار دروازوں میں سے تین مرکزی عمارتوں سے براہ راست جڑے ہوئے ہیں۔ مرکزی عمارتوں کا کمپلیکس "ہال آف نیشنز"۔ "ہال آف انڈسٹریز" اور "ہمیم پویلین" پر مشتمل ہے۔ ہال آف نیشنز بلند ترین عمارت ہے جس کی تعمیر میں بعض نئی تعمیراتی تکنیکیں بھارت میں پہلی مرتبہ بروئے کار لائی گئی ہیں۔

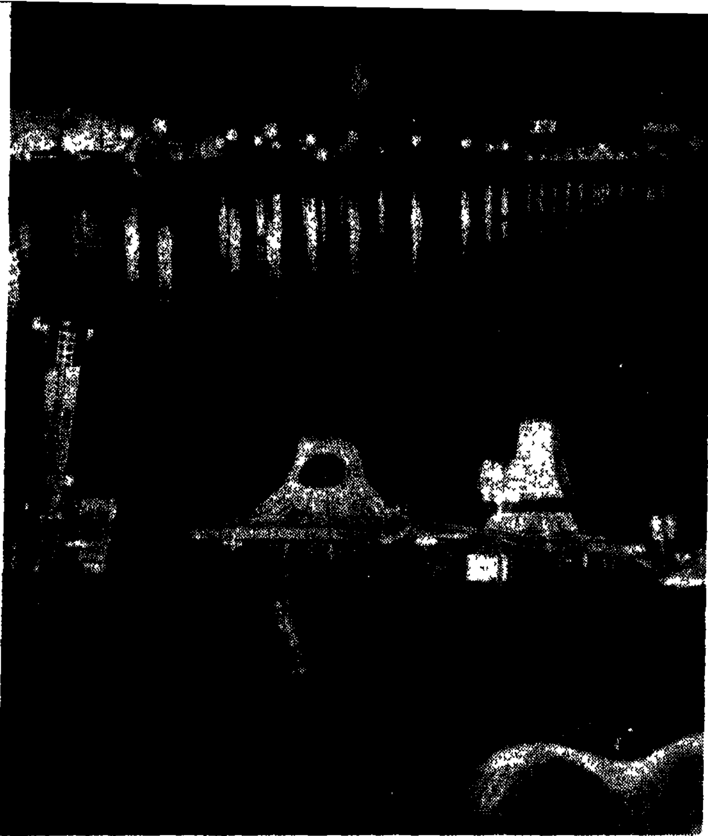
ہال آف نیشنز ۲۵۶ فٹ × ۲۵۶ فٹ رقبے میں تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ ایک سو دو فٹ بلند عمارت ہے جو دیواروں اور ستونوں کے سہارے کے بغیر تعمیر کی گئی ہے۔ یہ اہرام کی شکل کی ایسی عمارت ہے جسے وسط ہی میں مسطح کر دیا گیا ہے۔ دراصل یہ ساری عمارت آر۔ سی۔ سی کے سہ رخی فریم والے ڈھانچہ پر کھڑی کی گئی ہے۔

ہال کے اندر ڈیزائن کی گئی کلیدی پویلین کی چوڑائی ۵۰۲ فٹ ہے۔ اس کی اونچائی دس فٹ سے نوے فٹ تک ہے تاکہ طیارے، ارتھ موونگ مشینری اور دیگر طویل الجثہ مصنوعات کی بآسانی اور خاطر خواہ نمائش کی جاسکے۔ پوری عمارت آر۔ سی۔ سی کے سولہ فٹ طویل تکونوں پر مشتمل ایک چھت ہے۔ اپنی قسم کی پہلی عمارت ہونے کے سبب ماہرین تعمیر اور انجینیروں نے اپنے تخمینوں اور حساب کتاب کی صحت کو جانچنے کے لیے ایک کمپیوٹر کی بھی مدد لی۔

ہال آف انڈسٹریز، ہال آف نیشنز کے قریب ہی تعمیر کیا گیا ہے۔ اگرچہ اس عمارت کا ڈیزائن اسی جیسا ہے لیکن یہ نسبتاً چھوٹے پیمانے پر بنائی گئی ہے۔ یہ تین یونٹوں پر مشتمل ہے اور اس کا فرشی رقبہ ۱۵۰ فٹ × ۱۵۰ فٹ ہے۔ یہ عمارت ۶۰ فٹ اونچی ہے۔

دیگر مستقل تعمیرات میں ہمیم پویلین، ایک سنیما ہال نیز تھیٹر، ایک ریستوران اور ایک کھلا ہوا چوک ہے یہ سب اسی کمپلیکس کے حصے ہیں۔ ہمیم پویلین میں دو بڑے آڈیٹوریم ہیں جن میں کمپیوٹروں پر مبنی سماعی و بصری ذرائع سے بھارت کی دور جدید میں داخل ہونے کی کہانی بیان کی جائے گی۔ سنیما گھر میں چار سو افراد کے لیے جگہ فراہم کی گئی ہے۔

گیٹ نمبر دو کے نزدیک ایڈمنسٹریشن بلاک کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ یہ ساری عمارت، جو کہ ملک میں اپنے قسم کی پہلی عمارت ہے،



نئی دہلی کے تیسرے ایشیائی بین الاقوامی تجارتی میلہ کا ایک منظر

پوری طرح آر سی سی کے کھمبوں کے سہارے کھڑی ہے۔

میلہ میں شرکت کرنے والے ممالک

ایشیا۔ ۲) میلہ میں ۵ برّاعظموں کے ممالک حصہ لے رہے ہیں۔ ان برّاعظموں کے نام ہیں ایشیا، افریقہ، یوروپ، شمالی اور جنوبی امریکہ اور اوشینیا۔ میلہ میں شرکت کرنے والے ممالک کے نام یہ ہیں

ایشیا۔ (۱) افغانستان (۲) بنگلادیش (۳) بھوٹان (۴) برما (۵) انڈونیشیا (۶) عراق (۷) جاپان (۸) ری پبلک آف کوریا (۹) کویت (۱۰) ملائیشیا (۱۱) نیپال (۱۲) عوامی جمہوریہ منگولیا (۱۳) فلپائن (۱۴) سری لنکا (۱۵) عمان (۱۶) ترکی اور (۱۷) تھائی لینڈ

افریقہ۔ (۱) الجیریا (۲) گنی (۳) کینیا (۴) لیبیا (۵) موریشس (۶) سوڈان (۷) تنزانیہ اور (۸) زمبیا

یوروپ۔ (۱) آسٹریا (۲) بلجیم (۳) بلغاریہ (۴) سائپرس (قبرص) (۵) چیکوسلوواکیہ (۶) جرمنی کی وفاقی جمہوریہ (۷) فرانس (۸) جرمن ڈیموکریٹک ری پبلک (۹) ہنگری (۱۰) اٹلی (۱۱) پولینڈ (۱۲) رومانیہ (۱۳) اسپین (۱۴) سویڈن (۱۵) روس اور (۱۶) یوگوسلاویہ

شمالی اور جنوبی امریکہ۔ (۱) برازیل (۲) کنیڈا اور (۳) پیرو

اوشینیا۔ (۱) آسٹریلیا (۲) فجی اور (۳) نیوزی لینڈ

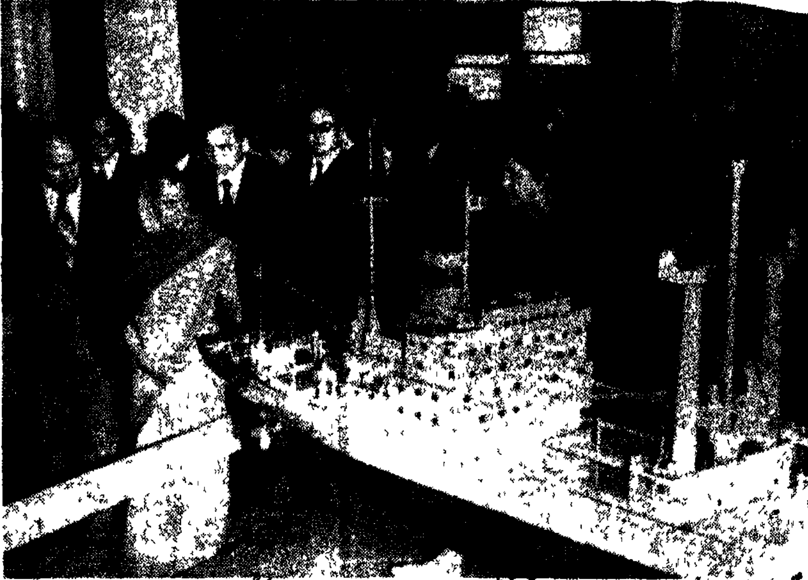
پویلینوں کے ڈزائن

غیر ملکی پویلینوں میں سب سے زیادہ جاذب نظر آسٹریلیا، جمہوریہ کوریا اور کینیڈا کی پویلینس ہیں۔ آسٹریلیا کی پویلین کے سامنے کے حصے پر المونیم کی چادریں جڑی ہوئی ہیں جو نومبر کے روشن دنوں میں خوب چمکے گا۔ اس سے ملحق جمہوریہ کوریا کی پویلین مخروطی شکل کی ہے اور یہ بھی المونیم پوش ہے۔

بغیر کھڑکیوں والی مجسوی شکل کی ۵۵ فٹ بلند کسیڈا کی پویلین اپنی مثال آپ ہے۔

جاپانیوں نے اپنی پویلین کو ڈھکنے کے لیے کریپ کا استعمال کرکے اپنی جدت طرازی کا اظہار کیا ہو۔ یہ مستطیل نما ہے اور سارا پنڈال نو ستونوں پر قائم ہے۔ نمائشی علاقے کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے لیے ایک پتلی سی نہر ہے جس پر جاپانی طرز کے تین خوبصورت پل بنائے گئے ہیں۔

سوویت یونین اور دیگر مشرقی یورپ کے ممالک نے جو بڑے پیمانے پر شرکت کر رہے ہیں، اپنی پویلینوں کی تعمیر کے لیے یکسں نما ڈھانچے استعمال



کیے۔ میں ہنگری کی پویلین ایک استادہ جو کام فولاد اور تجارتی ادارہ پر تعمیر کی گئی ہے۔

متعدد سرکاری اور پبلک پویلینوں کی ڈیزائن سازی اور تعمیر میں کافی غور وفکر، جاں فشانی اور ندرت کا مظاہرہ کیا گیا ہے۔ انڈین اسٹیل پویلین اس کی امتیازی مثال ہے۔ وہ شاندار گنبدوں کی شکل کی ہے۔ اس پویلین میں داخلے کے لیے جو راستہ بنایا گیا ہے وہ بھی فن تعمیر کے لحاظ سے کافی دل کشی رکھتا ہے۔

جہازرانی اور نقل وحمل کی پویلین تیرتے ہوئے جہاز کی یاد دلاتی ہے۔ اس کا چھت نارنجی رنگ کے سیل کلاتھ کا بنایا گیا ہے۔ ٹریڈ ڈیولپمنٹ اتھارٹی کی پویلین کو ایک نئے اہرام کی شکل دی گئی ہے۔ شہری ہوابازی کی پویلین، ایر گارڈن، ماگنس اڈیان، ایک جدید ترین تعمیر ہے جو فضائی سفر میں اعتماد اور تحفظ کے تصور پر مبنی ہے۔

ہیوی الیکٹریکلز پویلین کا ڈیزائن اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے میں کامیاب ہے یعنی بجلی اور انجینیری کا بھاری سازوسامان۔ اس میں تین تعمیرات ہیں۔ وہ واٹر ٹربائنیں ہیں جو ایک باندھ کے ذریعے ایک دوسرے سے علیحدہ کی گئی ہیں۔

پرائیویٹ سیکٹر نے خود کو پوری طرح "ایشیا ۷۲" کے پویلینوں کی تیاری کا اہل ثابت کیا ہے۔ بہت سی فرموں نے اپنے پویلینوں کے ڈیزائن کے لیے نمایاں شہرت رکھنے والے ماہرین تعمیرات کے خدمات حاصل کیے ہیں۔ ایک فرم نے بالکل نئے انداز کا ایک پویلین تیار کیا ہے جو چاند پر خلائی اسٹیشن کے مشابہ ہے۔ اس بات کو واضح کرنے کے لیے ایک کونے میں ایک راکٹ رکھ دیا گیا ہے۔

اگر ہائنز ۱۹۷۲ء ۸ واشنگ

ایک اور فرم نے ایک نہرو طلبی پولین تیار کیا ہے۔ یہ عام انداز کے پولینوں سے ہٹ کر اس طرح بنایا گیا ہے کہ پولینوں کے عام شرائط پورے نہیں کرتا۔ یہ ایک بالاب کے گرد عام سطح زمین سے تھوڑا اوپر ایک راستہ معلوم ہوتا ہے۔

ریاستی پولین فن تعمیر کے مختلف موڈوں کا امتزاج پیش کرتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر ہر ریاست کے فن تعمیر کا خوب اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پنجاب اور ہریانہ نے چنڈی گڑھ کے طرز تعمیر کو سامنے رکھ کر تعمیر کی جدید ترین طرز کو اپنانے کی کوشش کی ہے۔ جنوبی ریاستوں میں میسور نے روایتی امارت سے ہٹ کر ایسا پولین تیار کیا ہے۔ میسور کا پولین ہشت پہل ایک عمارت ہے اور اس کی چھت بغیر کسی سہارے کے قائم ہے۔

کارکنوں کی اہمیت

اس انسانی میں اقوامی بھارتی میلے کے لیے تعمیراتی کام انجام دینے والے کارکن ہی سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں جنھوں نے اس عظیم الشان اور زبردست پروجکٹ کو مثالی مدت میں مکمل کرنے کے لیے اپنے دن رات ایک کر دیے۔ یہی وجہ ہے کہ میلے کی تمام تعمیراتی تقریبات میں انھیں وزرا اور اعلیٰ سرکاری افسروں پر فوقیت حاصل رہی۔ ترقیاتی کام کے آغاز کا اعزاز اترپردیش کے ایک چھوٹے سے قصبے کے رہنے والے ایک سیدھے سادے مزدور تمری ھگوتی پرساد کو حاصل ہے۔ انھوں نے ایک ڈلیا مٹی جو ان کی بیوی اپنے سر پر ڈھو کر لائی تھی ایک مقام پر ڈالی اور اس طرح ترقیاتی کام شروع ہو گیا۔

نمائش گاہ کی تعمیر کی تقریبات کے موقع پر جو سادگی اور مقصدیت سے بھرپور تھیں نہ تقریریں کی گئیں اور نہ ہی فیتہ کاٹنے کی رسم ادا کی گئی۔ شاید روایتی لال فیتہ شاہی کو ختم کرنے کا یہ سب سے بہترین طریقہ تھا۔

بھارت کی آزادی کی ۲۵ ویں سالگرہ کے موقع پر ۱۵ اگست کو دس برس کی عمر سے بھی کم کے ایک لڑکے اور ایک لڑکی نے میلہ گاہ میں قومی جھنڈا لہرایا۔ ان کے والدین اس پروجکٹ میں کام کرنے والے غیر ہنرمند مزدور ہیں۔

طرح طرح کی آوازوں اور مشینوں کے شور و غل کے درمیان تعمیراتی کام اسی طرح جاری رہا جیسے کہیں اور ہوتا ہے۔ میلہ گاہ میں گزشتہ دس مہینوں کے دوران ۴۲ بچے پیدا ہوئے مختلف تعمیراتی سرگرمیوں میں مصروف لگ بھگ ۴۰ ہزار عورتوں اور مردوں کی زبردست تعداد کو دیکھتے ہوئے یہ تعداد شاید زیادہ نہیں ہے۔

پہلے پانچ بچوں کی ولادت پر میلے کے حکام نے ہر ایک کے والدین کو دو دو سو روپے پیش کیے جبکہ اگلے سات نومولود بچوں کو سو سو روپے حاصل ہوئے۔ نومولود بچوں کے اعزاز میں پرشکوہ ہال آف نیشنز میں ۱۹ جولائی کو ایک خصوصی تقریب منعقد کی گئی۔

میلے کا جس دن افتتاح ہوا نومولود بچوں میں سے ایک چھ ماہ کا ہو گیا تھا۔ یہ ۲۴ سالہ مادھو سنگھ اور اس کی بیوی امرتی کا بیٹا ہے۔ یہ بچہ ۲ اپریل کو پیدا ہوا تھا اور اس کا نام ایشیا سنگھ رکھا گیا ہے۔ اس کی ہندی عرفیت ہے ایشیا سنگھ۔

غیر ملکی پولینوں کی خصوصی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کچھ کارکن غیر ممالک سے بھی آئے ہیں۔ آسٹریلیا کی پولین میں لکڑی پر نقاشی کرنے کے لیے لگ بھگ ایک درجن چینیوں کو سنگاپور سے لایا گیا ہے۔ کچھ روسی کارکنوں نے سوویت پولین کی تعمیر میں جو کہ دیگر غیر ملکی پولینوں میں سب سے بڑی ہے، اپنے کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے۔

اس پروجکٹ کی وسعت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک لاکھ پچاس ہزار مربع میٹر زمین کو مسطح کیا گیا ہے، لگ بھگ ایک لاکھ مربع میٹر رقبے پر کنکریٹ کی چھت ڈالی گئی ہے، ۱۵ ہزار ٹرکوں میں عمارتی سامان نمائش گاہ تک پہنچایا گیا ہے، اس کے علاوہ خاص طور پر تعمیر کی گئی ریلوے لائن پر ویگنوں کے ذریعے جو سامان لایا گیا اس کی تعداد بھی بہت زیادہ ہے۔

فولاد کی سپلائی کم تھی اس لیے اس کا حاصل کرنا کبھی کبھی ایک شدید مسئلہ بھی بن گیا۔ دلی میں موجود ہندوستان اسٹیل لمیٹڈ کا سارا ذخیرہ بھی اپنا ۲۰، کی ضروریات کو پورا کرنے میں ناکام رہا۔ اس ذخیرے میں سے فولاد کا ایک بھی ٹکڑا گزشتہ اگست اور ستمبر میں دیگر لوگوں کے ہاتھ فروخت نہیں کیا گیا۔

مرکزی کابینہ نے اگرچہ اس میلے کی منظوری جنوری ۱۹۷۰ء میں دے دی تھی لیکن انجینئرنگ سے متعلق کام جولائی ۱۹۷۱ء تک جا کر مکمل ہوا۔ اس کی وجہ سے تعمیراتی کام کو پورا کرنے کے لیے بمشکل ایک سال کا وقت ملا۔

(بقیہ صفحہ ۴۸ پر ہے)

غزل — قمر سنبھلی

کچھ تو دنیائے تمنّا کو سجایا جائے
ورقِ دِل پہ کوئی نقش بنایا جائے

ان کی پلکوں پہ ستارے اُبھر آئے تھے جہاں
پھر اسی موڑ سے افسانہ سُنایا جائے

حُسن کا کوئی مقابل نہ مماثل نہ بدل
کیسے آئینہ کو آئینہ دکھایا جائے

تیرگی وقت کی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے
اب چراغوں میں لہو دل کا جلایا جائے

عشرتِ زیست کے ساحل سے تو کچھ بھی نہ ملا
غم کے طوفاں سے ہی اب ربط بڑھایا جائے

یوں تو ہم شام و سحر چلتے رہے ہیں لیکن
سوئے منزل تو قدم کوئی بڑھایا جائے

وادیٔ ذہن میں کچھ دن سے اندھیرا ہے قمرؔ
فکر کی جوت کو اب کیسے جگایا جائے

قطعات

متین فتح پوری

ماحول میں آلودہ ہے، رنجور ہے انسان
خود اپنے ہی افکار میں محصور ہے انساں
چاہے تو بدل سکتا ہے تقدیر زمانہ
اس قوتِ تسخیر سے معمور ہے انسان

قسمت نے ستم کئے ہیں اکثر
تنہائی میں رو لیے ہیں اکثر
غیروں کا گلہ عبث ہے اے دل
اپنوں ہی نے دکھ دیے ہیں اکثر

بے سود امید کامرانی
دو دن کی بہار ہے جوانی
بے کار جہاں سے لو لگانا
ہر چیز یہاں کی آنی جانی

کلی کلی کی زباں پر اسی کا نام رہا
اسی کی یاد میں کھلنا گلوں کا کام رہا
قرار دل میں کہاں عشق کے مقدر میں
ازل سے گلشنِ ہستی کا یہ نظام رہا

آدمی آدمی کے کام آتا
سب کے لب پر ترا ہی نام آتا
تیرے لطف و کرم سے اے ساقی
ہر رند کے ہاتھ میں دورِ جام آتا

عُشّاق کا طریقۂ آہ و فغاں الگ
لطفِ زباں کے ساتھ ہے طرزِ بیاں الگ
جو بات دل سے نکلی وہ دل میں اتر گئی
ان صاحبانِ دل کے ہیں تیر و کماں الگ

مزاحیہ

شادی خانہ آبادی

• ـــــ سلیم مقصود

کسی نے شادی کو "پھانسی کا پھندا" کہا، کسی نے ایک ایسا "قلعہ" کہا کہ جس میں داخل ہو جانے والے باہر نکلنے کی اور باہر والے اندر داخل ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہماری بیگم صاحبہ اگر ہمیں اجازت دیں تو ہم بھی کچھ کہیں۔ آخر ہم بھی اس تجرباتی دور سے گذر رہے ہیں۔ ہمیں بھی کچھ کہنے کا حق ہے۔ ہم شادی کے متعلق ایک ایسی بات کہنا چاہتے ہیں جسے ساری دنیا سمجھ جائے لیکن ہماری بیوی نہ سمجھ سکیں، ورنہ مصیبت یہ ہوگی کہ وہ چونکہ علم ریاضی کی گریجویٹ ہیں، شروع کر دیں گی کہ ہماری شادی کو کتنے سال، کتنے ماہ، کتنے ہفتے، کتنے دن، کتنے گھنٹے اور کتنے منٹ اور کتنے سیکنڈ ہوئے ہیں۔ اس دوران انھوں نے ہمارے گھر آ کر کتنی خوشیاں اور کتنے غم اٹھائے ہیں۔ خوشیوں اور غموں میں الحمد للہ ہمیشہ تناسب معکوس رہے گا یعنی غم ہمیشہ خوشیوں سے زیادہ ہی رہیں گے۔ مزید بیگم صاحبہ ٹوکن ہڑتال شروع کر دیں گی۔ اس پر بھی اگر ہم نے چپ سادھ لی تو "دس کر دن" یوم احتجاج منایا جائے گا۔ یوم احتجاج میں عدم تعاون (NON CO OPERATION) اور بائیکاٹ بھی شامل رہیں گے۔ بچے جب دیکھیں گے کہ دونوں میں سمجھوتے کی کوئی صورت نہیں نکلتی تو وہ فوراً دونوں کا گھیراؤ کر دیں گے۔ نتیجتہً ہمیں ایک دن کی "ہنگامی چھٹی" (CASUAL LEAVE) لینا پڑے گی۔ فریقین میں سمجھوتے کی کوششیں شروع ہو جائیں گی۔ چند بچے ہماری طرف، چند بیگم صاحبہ کی طرف اور کچھ غیر جانبدار ہو جائیں گے۔ پھر اچھا خاصا یو۔ این او بن جائے گا۔ بچے جو غیر جانبدار رہیں گے وہی ثالث کے بھی فرائض انجام دیں گے۔ اس طرح صلح ہو جائے گی۔ بیگم صاحبہ ہمیشہ کی طرح وہی ایک سوال دہرائیں گی "اگر آپ کو مجھ سے کوئی تکلیف ہے تو آپ کوئی دوسری شادی کیوں نہیں کر لیتے؟" انکار انکار طلب سوال سن کر ہم کسی فرمانبردار اور سعادت مند فلمی ہیرو شوہر کی طرح دل پر ہاتھ رکھ کر کہیں گے ؎

چھوڑ کے تیرے پیار کا دامن

تو ہی بتلا دے ہم کدھر جائیں

شادی کے بعد بیچارہ شوہر علی الحساب کئی بار مرتا ہے مثلاً پہلی بار اس وقت جب بیگم صاحبہ ایسا گھونگھٹ الٹ کر لیتی ہیں گویا کمرے کس کر جملہ حقوق "اپنے نام کر لیتی ہیں۔ دوسری بار اس آن جب بیگم صاحبہ جلوۂ کثرت اولاد" دکھانے لگتی ہیں علیٰ ہذا القیاس

دنیا کے تقریباً ہر عقلمند آدمی نے شادی کی مخالفت کی ہے۔ اور دنیا کا تقریباً ہر عقلمند آدمی ہی اچھا اور سعادت مند شوہر ثابت ہو سکا ہے۔ ہر عقلمند آدمی زندگی میں ایک بار شادی کر کے ضرور بے وقوف بنا ہے اور بعض عقلمند تو بار بار بے وقوف بنتے رہتے ہیں۔ پھر کچھ لوگ ہر سال اپنی اس بے وقوفی کی سالگرہ بھی بڑے شاندار پیمانے پر مناتے ہیں۔ شادی میں سوائے آپ کی مرضی کے، سب کی مرضی اہم سمجھی جاتی ہے حتیٰ کہ بعض اوقات پڑوسیوں اور نوکروں سے بھی اس سلسلے میں مشورہ لے لیا جاتا ہے۔ ایسا ہونا بھی چاہیے تاکہ آئندہ پڑوسی کسی قسم کی شکایت نہ کر سکیں اور اس طرح ہمیشہ کے لیے ان کا منھ بھی بند ہو جائے۔

شادی کی دو بڑی قسمیں ہیں (۱) ایک تو والدین کی پسند کی شادی اور (۲) دوسری اپنی پسند کی شادی یعنی "لو میرج"۔ والدین کی پسند کی شادی میں آپ کو فائدہ یہ ہے کہ آپ زندگی بھر والدین کو کوس سکتے ہیں اور شادی کے بعد ہونے والی تمام باتوں کا ذمہ دار والدین کو ٹھہرا سکتے ہیں۔

لیکن "لومیرج" میں بیوی سے آپ کا راست یعنی (DIRECT) مقابلہ رہتا ہے۔ (ویسے عوام الناس کے لیے "لومیرج" میں زیادہ عبرت ہے) لَو میرج کی ابتدا فلم سے ہوتی ہے اور فلم پر ہی ختم ہوتی ہے جیسا کہ ہمارے ایک دوست نے "لومیرج" فلم دیکھ کر لومیرج کی اور "طلاق" فلم دیکھ کر اپنی بیوی کو جو عمداً محبوبہ تھی طلاق دیدی۔ فلم زدہ لڑکے، لڑکیاں فلمیں دیکھ دیکھ کر شادی کرتے ہیں اور فلموں کی طرح ان کی زندگی بھی "فلاپ" ہو جاتی ہے۔

شادی سے پہلے آدمی شادی کے بارے میں آزادی سے لکھ سکتا ہے لیکن شادی کے بعد جب وہ کافی تجربہ کار ہو جاتا ہے تو اسکی لکھنے اور کچھ کہنے کی آزادی سلب کرلی جاتی ہے۔ اس لیے ہماری شادی سے متعلق بہت سی چیزیں پردۂ راز میں رہ گئیں۔ ہمارے اس دوست کی طرح جس کی شکل شادی کے بعد کسی نے بھی نہیں دیکھی خدا خیر کرے ع

زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے

اس میں ہم نے یہ آزما کر دیکھا ہے کہ شادی شدہ "حضرات آسانی بڑے صاحب کی گھڑکیاں سہہ جاتے ہیں۔ ایک بات اور شادی کے بعد آپ کی بیوی کو آپ کے سوا دنیا کی سب عورتوں کے شوہر اچھے معلوم ہونگے کیونکہ وہ اپنی بیویوں کی فرمائشیں پوری کرتے ہونگے، بیگم صاحبہ کے لیے ناشتہ تیار کرتے ہونگے، بچوں کی دیکھ بھال کرتے ہونگے، جس قدر شوہر "الو کے پٹھے" ہوں گے آپکی بیوی اسی قدر ان کی تعریف کریگی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شادی سے پہلے آپکی بیوی یہ چاہتی ہے کہ لوگ آپ کو عقلمند سمجھیں لیکن شادی کے بعد وہ چاہتی ہے کہ آپ عقل استعمال کرنا چھوڑ دیں اور واقعہ بھی یہی ہے کہ شادی کے بعد عقل استعمال کرنے کے بہت ہی کم مواقع نکلتے ہیں۔ ویسے شادی کی بعد والی زندگی کے لیے آپ کی عقل کی ضرورت نہیں رہتی بلکہ آپ کو اپنی بیوی کی "ناقص عقل" کے سہارے زندگی گذارنا پڑتی ہے اس لیے یہ خانہ خالی ہی رہے تو مناسب ہے عورت آپکی عقل کو اپنی "سوکن" سمجھتی ہے۔ عورت کو زباں نہ دی جاتی تو بیچارے شوہر کے لیے عقل استعمال کرنے کے کافی مواقع نکل سکتے تھے لیکن۔ شاید قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ اس لیے شادی کے بعد عورت کی زباں کو کچھ اور "طوالت" عطا کر دی جاتی ہے

یورپ اور جاپان کی عورتوں نے مردوں کو نیچا دکھانے کے لیے ہتھیار رکھے اور "جوڈو" کے داؤ پیچ سیکھنے شروع کر دیے ہیں۔ وہاں کے مردوں کے لیے یہ انتہائی تشویشناک خبر ہے۔ ان کے کانوں پر جوں ضرور رینگنی چاہیے لیکن ہماری عورتوں کو ہتھیار رکھنے یا "جوڈو" سیکھنے کی چنداں ضرورت نہیں کیونکہ ان کے پاس ایک ایسی زبان ہے جو دنیا کے ہر ہتھیار سے مہلک اور زہریلی ہے لیکن بعض عورتیں ایسی بھی ہیں جو زبان اور داؤ پیچ دونوں سے لیس ہیں۔ مثلاً ہماری پڑوسن جس نے ایک بار مار مار کر اپنے شوہر کو بے ہوش کر دیا تھا۔ ہم نے فوراً وہ مکان خالی کر دیا کیونکہ اس پڑوسن کا ہمارے ہاں بھی آنا جانا تھا ہماری بیگم صاحبہ اس میں کچھ دلچسپی بھی لینے لگی تھیں۔ اب ہم جس مکان میں ہیں اس سے ملے ہوئے مکان میں معاملہ بالکل برعکس ہے۔ شادی کے بعد پہلی بار ہماری "انا" کو اس منظر سے تسکین پہنچی ہے۔ اپنی بیوی صاحبہ کے کافی اصرار کے باوجود بھی ہم جیتے جی اس مکان کو چھوڑنے پر تیار نہیں۔ ہماری بیگم صاحبہ پر اس ماحول کا خاطر خواہ اثر ہوا ہے۔ اب انھوں نے اپنی زبان کو کم اور آنکھوں کو زیادہ استعمال کرنا شروع کر دیا ہے

کسی فلاسفر نے کہا ہے "آپ اپنے آپ کو ان لوگوں میں سمجھیے جنہیں بعض اوقات بے وقوف بنایا جا سکتا ہے" غالباً یہ بات اس دانشور نے شادی کے بعد کہی ہوگی۔ جسے کوئی بے وقوف نہیں بنا سکتا اسے بیوی ضرور بے وقوف بنا دیتی ہے۔ وہ لطیفہ تو آپ نے سنا ہی ہوگا کہ ایک بڑے ہی وضعدار اور عقلمند قسم کے کسی صاحب کا بھانجہ گدھے پر بیٹھنے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ ان صاحب نے بہت چاہا کہ بچہ یہ نامعقول فرمائش ترک کردے لیکن انھیں کامیابی نہ ہوئی بچہ آخر کار رونے لگا۔ ان کی بیوی سے دیکھا نہ گیا۔ بیوی صاحبہ نے شوہر نامدار سے فرمایا "تھوڑی دیر کے لیے بیٹھ کر بٹھا لیجیے ورنہ بچہ مچل جائے گا"

ہمارے ایک دوست صاحب جو اپنی بیوی سے بہت ڈرتے ہیں ایک دن فرمانے لگے "یار! آج کل میں بہت ہی ایڈونچر سے بھرپور یعنی مہم جویانہ واقعات سے پُر خواب دیکھ رہا ہوں" ہم نے پوچھا "وہ کیسے" کہنے لگے "آج کل میں خوابوں میں کبھی یہ دیکھتا ہوں کہ اپنی ساس کو بری طرح ڈانٹ رہا ہوں وہ ہاتھ جوڑے میرے آگے کھڑی ہیں کبھی یہ دیکھتا ہوں کہ میں انھیں سر دبانے کے لیے کہہ رہا ہوں اور وہ سر دبا رہی ہیں کبھی یہ دیکھتا ہوں کہ میری بیوی جسے میں بطور خود "ٹرسٹ" سمجھتا ہوں وہ کانپنے لگتی ہیں"

(بقیہ صفحہ [illegible] پر)

گیہوں کی کھیتی

سبز انقلاب

کی طرف قدم

اندر جیت لال

ہندستان میں بونی قسم کے گیہوں کی کاشت زمانہ قدیم سے کی جارہی ہے اس وقت سے جب کہ سندھ وادی کی تہذیب کا زمانہ تھا "ٹریٹی کم سفیروکوکم" قسم کے بونے گیہوں کے بیج موہن جوداڑو کی کھدائی سے دستیاب ہوئے ہیں۔ جو اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ بونی قسمیں اس زمانے میں بھی معمول تھیں لیکن اس کے بعد یہ قسمیں گوشہ گمنامی میں چلی گئیں اور سیکڑوں سال تک ان کی تاریخ میں سراغ نہیں ملتا البتہ ہندستان نے دس بارہ سال پہلے یہ محسوس کیا کہ خوراک کے مسئلہ کو حل کرنے کیلئے ایسی قسموں کو دریافت کر کے اس ملک میں مقبول کیا جائے۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟ اس کی داستان یوں ہے

انڈین ایگریکلچرل انسٹیٹیوٹ نے جسے عام طور پر پوسا انسٹیٹیوٹ کہتے ہیں سنہ ۱۹۶۳ء میں محسوس کیا کہ ہندستانی گیہوں کی قسموں سے جو پیداوار حاصل ہورہی ہے۔ اسے آبپاشی کے ذریعہ کاشت کر کے اس سے زیادہ پیداوار حاصل کی جاسکتی ہے۔ اس کے لیے "نورن جین" والی گیہوں کی بونی قسموں کی کاشت ضروری تھی۔ چنانچہ ہندستان نے راک فیلر فاؤنڈیشن سے کہا کہ ہندستان میں ایسی قسموں کے بیج بھیجے جائیں۔ دوسرے اس نے کہا کہ ڈاکٹر این۔ ای۔ بورلاگ (جنھیں گیہوں کے موضوع پر دو سال ہوئے نوبل پرائز مل چکا ہے) کو ہندستان بھیجا جائے۔



ڈاکٹر بورلاگ سنہ ۱۹۶۳ء میں ہندستان آئے اور انھوں نے ہندستان کے گیہوں پیدا کرنے والے علاقوں کا دورہ کیا۔ گیہوں کی چار بونی اور نیم بونی قسموں کا ایک ایک سو کلوگرام بیج اور ان کے علاوہ دو تہائی قسموں کے پیکٹ حاصل کیے گئے — اس بیج کو دلی، لدھیانہ، پوسا، کان پور، پنت نگر، بھوالی اور ولنگٹن میں بویا گیا اور اس کے ساتھ ساتھ ان کے پودوں کی نشو ونما کا مطالعہ کیا گیا۔

سنہ ۱۹۶۴ء میں میکسیکو سے "لرما روہو" اور "سونورا-۶۴" کی قسموں سے دلی۔ لدھیانہ۔ پوسا اور کان پور میں فی ہیکٹر ۴ ٹن کی پیداوار حاصل کی گئی۔ اس سال ہندستان بھر میں گیہوں پر ایک ساتھ تجربات کیے گئے۔ اس غرض سے ربیع کے موسم میں بونی قسموں کو ۱۵۵ جگہوں پر بویا گیا۔ سنہ ۱۹۶۵ء میں ملک بھر میں کیے گئے تجربات کی بنا پر "لرما روہو" اور "سونورا-۶۴" کی کاشت کی اجازت دی گئی۔ ایسی قسموں کی کاشت سے پوری پوری پیداوار حاصل کرنے کی غرض سے ان کی کاشت کے طریقے بھی مقرر کر دیے گئے۔ سائنس والوں نے لگ بھگ ایک سو جگہوں پر خود کاشت کرنے کے طریقے عملی مظاہرے کے ذریعے لوگوں کو دکھائے۔ اس سے کسانوں کو گیہوں کی کاشت کے نئے طریقوں سے

اچھی طرح واقفیت ہوگئی اور انھیں یہ پتہ چل گیا کہ اگر گیہوں کی آبپاشی کی جائے تو اس سے فصل کو کیا فائدہ ہوتا ہے۔ بھارت سرکار نے "لرما روہو" اور سونورا۔۶۴ کا ۲۵۰ ٹن بیج درآمد کیا، جسے ۵ ہزار کسانوں میں تقسیم کیا گیا۔

بونی قسموں کی کاشت سے ۱۹۶۶ء میں کسانوں کو تسلی بخش پیداوار حاصل ہوئی۔ چنانچہ آئندہ ربیع کے موسم میں اس بیج کو زائد پیداوار دینے والی قسموں کے پروگرام کے تحت چار لاکھ ہیکٹیر کے رقبے میں بویا گیا۔ اس بار کھاد کا بھی پورا پورا استعمال کیا گیا۔ ۱۹۶۷ء میں پوسا انسٹیٹیوٹ، لدھیانہ اور پنت نگر کے گیہوں پیدا کرنے والوں نے گیہوں کی میکسیکو کی قسموں میں سے سنہرے بیجوں والی، زائد پیداوار دینے والی اور رتوا بیماری سے بچنے والی جن قسموں کا انتخاب کیا ان میں سے چار قسموں کی کاشت کی اجازت دے دی گئی۔ ان قسموں کے نام تھے "کلیان سونا"، "سونالیکا"، "سفید لرما" اور "چھوٹی لرما"۔ سیکڑوں جگہوں پر زرعی سائنس دانوں نے عملی طور پر ان کی کاشت کا طریقہ کسانوں کو بتایا۔

بدقسمتی سے ۱۹۶۸ء میں رتوا بیماری کے لگنے کیلئے حالات موافق تھے اس کے باوجود بونی قسموں کی فصلوں پر اس بیماری کا اثر بہت کم ہوا اور سارے ملک میں گیہوں کی کافی اچھی پیداوار حاصل ہوئی۔ اس طرح ہندستان میں گیہوں کی پیداوار پچھلے چند برسوں کے مقابلے میں لگ بھگ دوگنی ہوگئی۔ اس اہم کامیابی کی یادگار کے لیے وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی نے گیہوں کی کھیتی اور پیداوار میں انقلاب کا ایک ڈاک ٹکٹ بھی جاری کیا۔ پچھلے چند برسوں میں بونی قسمیں ہندستان بھر میں خوب کامیاب ثابت ہوئیں۔ کامیاب بونی قسموں کے نام ہیں "شربتی سونورا"، "سونورا۔۶۴"، "سونالیکا"، "کلیان سونا"، "لرما روہو"، "ہیرا"، "موتی"، "بوسا لرما" وغیرہ وغیرہ۔ خصوصاً سبز جمہوریہ نے "ہیرا" اور "موتی" قسموں کی راشٹرپتی بھون میں کاشت کرائی جس سے اچھی فصل حاصل ہوئی۔ دراصل اس بات کی ضرورت ہے کہ ہندستان کی زراعت میں سائنس کا زیادہ سے زیادہ استعمال کیا جائے اور آئندہ مستقبل میں خوراک کی ملکی ضرورتوں کو پورا کرنے کا ارادہ و ترقی منصوبہ کامیاب کرکے دکھایا جائے۔ اسی میں ملک کی بھلائی اور خوشحالی ہے۔ ہندوستان میں سونورا۔۶۴، سونالیکا اور شربتی سونورا سب سے جلدی تیار ہونے والی قسمیں ہیں۔ ان فصلوں کو جب دسمبر کے پہلے ہفتہ میں بویا گیا، تب بھی ان کی پیداوار کم نہیں ہوئی۔ ان قسموں کے گیہوں میں جو جلدی تیار ہونے کی خوبی ہے اسکی بدولت انھیں مختلف فصلوں کے ہیر پھیر کے ساتھ بویا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ ایک کھیت میں سے ہرا مونگ، دو غلی مکئی اور توریے کے بعد گیہوں بوکر ایک ہی سال میں چار فصلیں پیدا کی جاسکتی ہیں۔ اس طرح ایک فصل کی بجائے ایک سال میں چار فصلیں حاصل کرنے سے ایک ہیکٹیر کے کھیت سے اناج، پروٹین سے بھری دال، پھلی دار ہرا تازہ چارہ اور تلہن حاصل کیے گئے۔ فصلوں کا یہ چکر بہت ہی فائدہ مند ثابت ہوا ہے۔

بونی قسموں کی ایک خوبی قابل ذکر ہے کہ اس کے پتے سیدھے اوپر کو بڑھتے ہیں اور بالیاں لمبی ہوتی ہیں۔ دوسری اوپر کو بڑھنے والی لمبی قسموں سے بونی قسمیں بڑھیا ثابت ہو چکی تھیں کیونکہ ایک تو بونی قسمیں زمین پر گرتی نہیں، دوسرے یہ کھلی کاشت میں زیادہ پیداوار دینے کی خاصیت رکھتی ہیں۔ غذائیت کے اعتبار سے مطالعہ کیا گیا ہے کہ گیہوں کی پرانی فصلوں میں لگ بھگ دس فی صدی پروٹین ہوتی تھی۔ یہ پروٹین بونی قسموں میں ۱۲ سے ۱۷ فی صدی تک ہوسکتی ہے۔ جانچ کرنے سے پتہ چلا ہے کہ پروٹین غذائیت میں بھی بڑھیا ہے۔ ان قسموں کے گیہوں کے سو گرام میں ۲۸۶ سے لے کر ۴۸۶ ملی گرام تک امینو ایسڈ لائسین کی مقدار ملتی ہے جو غذائیت میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ آٹے میں لائسین کی اتنی مقدار باقی قسموں کی نسبت شربتی سونورا میں سب سے زیادہ ہوتی ہے۔

ہندوستان میں گیہوں کی ۹۰ فی صدی کھپت چپاتیاں بنانے میں ہوتی ہے۔ اس لیے یہاں بوئی جانے والی بونی قسموں میں بڑھیا چپاتی کی خوبیاں ہونی چاہئیں۔ بڑھیا چپاتی کے لیے ایسا آٹا چاہیے جو زیادہ پانی جذب کرسکے اور گوندھنے کے بعد ہاتھوں کو نہ لگے۔ اتنا مضبوط اور لچکدار ہو کہ بیلا جاسکے۔ دوسرے چپاتی کا رنگ ملائی کا سا ہو، چپاتی یکساں ہو اور اندر سے پھٹے۔ چپاتی نرم ہو اور ۶ گھنٹے تک نرم رہے۔ شربتی سونورا ان سب خوبیوں کو پورا کرتی ہے۔

ان بونی قسموں کے گیہوں میں ڈبل روٹی بنانے کی خاصیت بھی موجود ہے۔ اس طرح یہ بسکٹ بنانے کے کام میں اچھی ثابت ہوئی

ہیں۔ بسکٹ اس آٹے سے اچھے ہے ہیں جو نرم اور کمزور ہو کر حاذب ہو اور ایسی چیپ کا مالک ہو جس میں نمک کی نسبت بلاسٹک جیسی لوچ زیادہ ہو۔ بسکٹ اگر بڑھیا قسم کے تیار کیے جاسکیں تو ہندستان بسکٹ کی برآمد میں کافی ترقی کرسکتا ہے۔ نئی قسموں کے آٹے کو گوندھنے پر کافی کھینچا جاسکتا ہے بعد میں اتنی جلدی سکڑتا بھی نہیں اور پکانے کے بعد بسکٹ اوپر سے پھٹتے بھی نہیں۔ دوسرا ان قسموں کے آٹے سے بنائے گئے بسکٹ منہ میں ڈالتے ہی فوراً گھل جاتے ہیں۔

آج کل نئی قسموں کے گیہوں کے بیجوں کو زیادہ مقدار میں پیدا کیا جارہا ہے تاکہ اس کی بدولت کسان اس سے پورا فائدہ اٹھا سکیں۔ زرعی سائینس والوں کے پیش نظر یہ اصول ہے کہ کسان صرف نئی قسموں ہی کو مقبول نہ بنائیں بلکہ اپنے کاشت کاری کے ڈھنگوں میں ایک نیا پن اور تبدیلی لائیں۔ اس ضمن میں کافی کامیابی ہوئی ہے کیونکہ ہندستان کی اس تحقیق سے متاثر ہو کر پڑھے لکھے شہری لوگوں کا ایک طبقہ گیہوں کی کاشت کی طرف رجوع ہو رہا ہے اور ایک نیا سماجی اور ذہنی ماحول تیار ہو رہا ہے جو اس بات کی کھلی نشاندہی کر رہا ہے کہ گیہوں کی کاشت میں آئندہ برسوں میں ایک انقلاب برپا ہوگا۔



شہید آزادی ـــــ (صفحہ ۲۵ کا بقیہ)

دل فدا کرتے ہیں قربان جگر کرتے ہیں
پاس جو کچھ ہے وہ ماتا کی نذر کرتے ہیں

خانہ ویران کہاں دیکھیے گھر کرتے ہیں
خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

نوجوانو یہی موقع ہے اٹھو کھل کھیلو
خدمت قوم میں جو آئے بلا وہ جھیلو

دیس کے صدقے میں ماتا کو جوانی دے دو
پھر ملیں گی نہ یہ ماتا کی دعائیں لے لو

بات تو جب ہے کہ اس بات کی ضدیں ٹھانیں
دیس کے واسطے قربان کریں سب جانیں

لاکھ سمجھائے کوئی ایک نہ اس کی مانیں
کہتا ہے خون سے مت اپنا گریباں سانیں

ناصحا آگ لگے تیرے اس سمجھانے کو

بسمل کے مختصر انتخاب کلام سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ ان کی شاعری نہیں بلکہ مادر ہند کا درد ہے۔ ہر ہر شعر سرفروشانہ جذبات سے بھرپور ہے۔ اس میں گل و بلبل، جام و پیمانہ کی محفل طرب نہیں اس میں نامہ بر و وصال یار کی خبر نہیں لاتا ہے بلکہ الفت وطن میں پھانسی کا پروانہ نظر آتا ہے۔ ان اشعار میں ایک سچے عاشق وطن اور سر بکف مجاہد کی بیقراریاں اور اضطراب ہے جو دشمن وطن کے ناپاک ارادوں کو متزلزل کیے دے رہا ہے۔ اسی لیے آج بھی بسمل کے نغمات آزادی، رگوں میں حمیت اور غیرت کا لہو دوڑاتے ہیں۔ درحقیقت ہندستان کی جنگ آزادی کی تاریخ اس وقت تک مکمل ہی نہیں ہوسکتی جب تک کہ بسمل اور ان کے نغمات کا ذکر نہ ہو۔



آبگینہ ـــــ (صفحہ ۳۰ کا بقیہ)

تم بڑنکوک کے دورے پڑنے لگتے ہیں تم بے وجہ لڑنے پر آمادہ ہوجاتی ہو بات بات پر رونے لگتی ہو ذرا دماغ کو ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کیا کرو۔ ستیش نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "تمھیں آرام کی ضرورت ہے۔"

ستیش کے ہاتھوں کے لمس نے اس کے دل کی دنیا بدل دی۔ اسے بچپن کا وہ دور یاد آگیا جب اسے بے انتہا پیار ملا تھا

آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے وہ ستیش کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی



شادی خانہ آبادی ـــ (صفحہ ۳۸ کا بقیہ)

ہم نے کہا، یہ خواب نہیں ہیں تمہارے تحت الشعور میں دبی ہوئی خواہشیں ہیں جو اس طرح پانے تم میں تک پہنچ رہی ہیں یعنی ع
کوئی حسرت کہیں نکلی کوئی حسرت کہیں نکلی

والا معاملہ ہے۔

بعض اوقات ہم آدمی کے سر کے متعلق سوچتے ہیں کہ غالباً آدمی کا سر صرف شادی کے سہرے کے لیے بنایا گیا ہوگا۔ کیونکہ اس کے بعد اس کا کوئی مصرف نہیں رہتا اور شادی کے وقت سہرے سے دولہا کا منہ جو چھپا دیا جاتا ہے تو اس کی وجہ غالباً یہ ہو کہ اس کے بعد وہ کسی کو منھ دکھانے لائق نہیں رہتا۔



مراسلات

(ایڈیٹر کا مراسلہ نگار سے متفق ہونا ضروری نہیں)

کچھ "کلامِ انیس میں تغزل" کے بارے میں

★ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری

"نیا دور" لکھنؤ مطبوعہ جولائی ۱۹۷۲ء کے شمارہ میں جناب مسیح حسن نقوی[1] کا مضمون "کلامِ انیس میں تغزل" راقم الحروف کی نظر سے گزرا۔ موصوف صفحہ ۳۶ اور صفحہ ۳۷ پر میر مہدی حسین احسن مولف واقعات انیس اور مولوی احمد علی اشہری صاحب حیاتِ انیس کے حوالے سے رقمطراز ہیں،

" میر مہدی حسین احسن نے جو خود میر انیس کے بڑے فرزند میر نفیس کے شاگرد اور جن کے والد میر انیس کے دوستوں میں سے تھے واقعات انیس میں ایک روایت نقل کی ہے جس کی تائید تھوڑے سے تغیر کے ساتھ مولوی اشہری نے حیاتِ انیس میں کی ہے کہ ایک مرتبہ نواب واجد علی شاہ کی والدہ ملکہ کشور جہاں نے مرزا دبیر اور میر انیس دونوں کو مجلس پڑھنے کی دعوت دی۔ میر انیس نے صاف صاف کہہ دیا کہ ذاکری کی حالت میں درباداری کا حفظِ مراتب مجھ سے نہ ہو سکے گا چنانچہ انھیں اپنی وضع پوشاک میں مجلس پڑھنے کی اجازت مل گئی۔ مرزا دبیر درباری قبا و عمامہ باندھے ہوئے تھے۔ انھوں نے منبر پر پہنچ کر پہلے بادشاہ کی شان میں کچھ اشعار مدح کے پڑھے اور اس کے بعد مرثیہ شروع کیا۔ بعد ازاں انیس کی باری آئی۔ انیس نے اول ایک سلام پڑھا جس کا مطلع یہ تھا ؎

غیر کی مدح کروں شہ کا ثنا خواں ہو کر
مجرئی اپنی ہوا کھوؤں سلیماں ہو کر

اور اس کے بعد جب میر انیس نے سلام کا تیسرا شعر پڑھا ؎

زلفِ اکبر کو جو دیکھا سرِ نیزہ پہ ہوں
موئے سر کھول دیے ماں نے پریشاں ہو کر

تو جلس اٹھا کر بادشاہ باہر نکل آئے اور بیساختہ فتح الدولہ برق سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ کیوں فتح الدولہ میں نہ کہتا تھا کہ میر انیس لکھنؤ میں ایک ہی شاعر ہیں۔ دیکھا تم نے یہ زبان انھیں کے لیے خاص ہے۔ بعد ختمِ مجلس علی نقی خاں کو حکم دیا کہ میر صاحب کو دروازے تک رخصت کر کے کی رسم پوری کریں۔"

معلوم ہونا چاہیے کہ انیسیوں نے دبیریوں کو نیچا دکھانے کے لیے یہ "افسانہ" اختراع کیا ہے۔ دبیریوں کو اس سے قطعی انکار ہے۔ اور وہ اس بیان کو بے بنیاد سمجھتے ہیں۔ چنانچہ سید افضل حسین ثابت لکھنوی اس کی تردید میں لکھتے ہیں کہ

" اگر یہ واقعات صحیح ہوتے تو ضرور میر صاحب کے کمال اور مرزا صاحب کے نقص پر دال ہوتے۔ مگر لکھنؤ میں بڑے بوڑھے آدمیوں سے تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ سب محض عیب اور غلط ہے۔ مرزا صاحب مدت العمر کبھی کسی رئیس یا بادشاہ کے یہاں لباس درباری سے نہیں گئے۔ مجلس عزا کا تو کیا ذکر ہے۔ ملکہ کشور کے یہاں مرزا صاحب کبھی مجلس میں نہیں پڑھے۔"

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ کسی تاریخ یا تذکرہ سے یہ کہیں نہیں ثابت ہوتا ہے کہ کسی شاہی مجلس میں دبیر اور انیس یکے بعد دیگرے بادشاہ کے حکم سے پڑھے ہوں ــــ اول تو یہ دیکھنا ہے کہ جو سلام میر انیس سے منسوب کیا گیا ہے وہ واقعی ان ہی کی تخلیق ہے یا اور کسی کی۔ راقم کی نظر سے یہ سلام میر انیس کے مطبوعہ یا غیر مطبوعہ مرثیوں اور سلاموں میں

---

[1] افسوس ہو کہ حال ہی میں جناب مسیح حسن صاحب نقوی رحلت فرما گئے۔ یہ مراسلہ مرحوم کی حیات میں موصول ہوا تھا۔ اس میں ارباب تحقیق کے لیے دعوتِ فکر ہے اس لیے شائع کیا جا رہا ہے (ایڈیٹر) "ملکہ" بادشاہ" ہونا چاہیے (حیدری)

ہمیں گزرا ہے۔ جناب مہاراجکمار محمد امیر حیدر خاں آف محمود آباد نے انیس کے غیر مطبوعہ سلاموں کو بڑی محنت اور عرق فشانی سے ترتیب دیا ہے۔ راقم نے سلاموں کا یہ مجموعہ دیکھا اس میں "شاہی مجلس" والا سلام بالکل نہیں ہے۔ دراصل یہ میر مونس کی تصنیف ہے اور اسے میر انیس کا تسلیم کرنا نہ صرف غلط ہو بلکہ گمراہ کن بھی۔ اس سلسلے میں حسب ذیل شہادتیں راقم کے پاس ہیں جن کی بنیاد پر اس غلط اور بے بنیاد واقعہ کی تردید ہو جاتی ہے۔

(۱) مرثیہ میر مونس جلد اول صفحہ ۴۹ مطبع نول کشور لکھنؤ مطبوعہ ۱۹۱۲ء میں یہ سلام میر مونس کے نام درج ہے۔ اس میں کل ۲۸ شعر ہیں۔ پہلے دو شعر یوں ہیں ؎

مجرئی بہتے ہیں آنسو دُرِ غلطاں ہوکر
آبرو بائی ہے کیا چشمِ گریاں ہوکر
غیر کی مدح کریں سہ کے ثناخواں ہوکر
مجرئی ایسا ہے خاتم کھوئیں سلیماں ہوکر

(۲) میر مونس کے سلاموں کا مجموعہ "دیوان فصاحت عنوان" کے نام سے ۱۹۱۳ء میں مطبع شاہی میں مسند عبد الحسین تاجر لکھنؤ محلہ درگاہ سردار باغ کے اہتمام سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں صفحہ ۹۷ پر یہ سلام ۲۸ شعر میں درج ہے۔

(۳) میر مونس کا یہ سلام جناب سید مسعود حسن رضوی کے کتب خانے میں مخطوطہ کی صورت میں محفوظ ہے۔ اس میں دوسرے شعر کا مصرعہ ثانی یوں ہے ع

مجرئی اپنی ہوا کھوئیں سلیماں ہوکر

(۴) جناب سید مسعود حسن رضوی کے ذخیرۂ مراثی میں اردو کے مشہور مرثیہ گو کے سلاموں کا ایک نادر اور کمیاب ضخیم مطبوعہ مجموعہ موجود ہے۔ غالباً یہ واحد نسخہ ہے اور اس کا کوئی دوسرا نسخہ کہیں نہیں ملتا ہے۔ مجموعۂ سلام کا نام "شمع تعزیت" ہے۔ شمع تعزیت کتاب کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۹۷ ہجری نکلتے ہیں۔ یعنی یہ کتاب میر مونس کی وفات[1] کے پانچ سال بعد شائع ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنی ضخیم کتاب کی ترتیب، کتابت اور طباعت میں بھی کافی وقت صرف ہوا ہوگا۔ کتاب کی تفصیل یہ ہے۔

سائز ۸ × ۱۱، صفحات ۵۰۸، سلاموں کی تعداد ۵۰۸، مخمسات ۲۹، اس کے علاوہ سراپا کے کئی سہ بھی ہیں۔ ابتدا ناور کے سلام سے ہوتی ہے:

لکھ سلامی وصف ابرو بے شہ ذی جاہ کا
ہو سر دیوان پہ جلوہ مد بسم اللہ کا

صفحہ ۵۰۸ پر فرحاں کی کہی ہوئی تاریخ طباعت درج ہے ؎

غم سے شیکیا ہے پڑا مصموں سے — جو سلام اس میں ہے نادر وہ بہت عالی ہے
کلک فرحاں سے یہ تاریخ رقم کی اس کی — بس یہ مجموعۂ تالیف متین زیبا ہے

"شمع تعزیت" کا یہ مجموعۂ کلام سید محمد عنایت حسین تخلص متین سہارنپوری نے ترتیب دیا تھا۔ آخر میں "خاتمۃ الطبع" کے تحت یہ عبارت درج ہے ؎

"الحمد للہ والمنۃ کہ نسخہ ہذا مسمّی بہ شمع تعزیت تالیف سید محمد عنایت حسین صاحب متخلص بہ متین ساماں سہارنپوری سپرنٹنڈنٹ چونگی بریلی بہ تصحیح و سعی بلیغ مؤلف تاریخ ۳۰ ماہ نومبر ۱۸۸۰ء کو طبع ہو کر فرحت بخش مشتاقان باوقار و ناظرین اولی الابصار ہوا۔"

میر مونس کا تذکرہ مالا سلام "شمع تعزیت" میں صفحہ ۱۵۸ پر درج ہے اس میں ۳۵ شعر ہیں۔ دوسرے شعر کا مصرعہ ثانی یوں ہے ع

مجرئی اپنی ہوا کھوئیں سلیماں ہوکر

مندرجہ بالا حوالوں میں سلام کے مقطع میں "مونس" تخلص درج ہے۔

ذیل میں مونس کا یہ سلام جسے لوگ غلطی سے میر انیس کے کلام سے منسوب کرتے ہیں درج کیا جاتا ہے تاکہ آئندہ کسی قسم کی غلط فہمی نہ ہو سکے۔

مجرئی بہتے ہیں آنسو دُرِ غلطاں ہوکر — آبرو پائی ہے کیا چشم نے گریاں ہوکر
غیر کی مدح کریں شہ کے ثناخواں ہوکر — مجرئی اپنی ہوا کھوئیں سلیماں ہوکر
اہلبیاں نے جو دیکھا کرمِ دستِ حسین — پائے اقدس پہ لگا لوٹنے داماں ہوکر
حشر لعلِ لبِ شاہ کا جب دھیان آیا — اشک خوں گرنے لگے لعلِ بدخشاں ہوکر
شہ کے مرنے سے مدینہ کی ہوئی بربادی — مل گیا خاک میں وہ شہر گلستاں ہوکر
کس سے دریافت کریں حال عدم والوں کا — کوئی پیدا نہ ہوا خاک میں پنہاں ہوکر

---

[1] میر مونس کا انتقال ۱۲۹۲ھ میں ہوا۔

کہیں ملتا نہیں تصویرِ سکندر کا پتا — سب کے منہ دیکھتا ہو آئینہ حیراں ہوکر
چمنِ دہر میں توام ہیں سدا شادی و غم — کون سا گل ہو جو رویا نہیں خنداں ہوکر
کہتی تھی دیکھ کے دہر کے مرقع کو قضا — یہ ورق جمع نہ پھر ہوں گے پریشاں ہوکر
قدرداں داد بھی دیتے نہیں سبحان اللہ — کیا چھلے پلے ہیں دنیا میں سخنداں ہوکر
دی یہ سائل نے صدا لے کے علی سے خاتم — لو گدا جاتا ہو مسجد سے سلیماں ہوکر
شاہ دریا نے بھی کیا قہر ہوا نہرِ فرات — ہم رہے جاتے ہیں پیاسے ترے مہماں ہوکر
شاملِ آلِ محمد ہوئے اللہ اللہ — پایا کیا مرتبہ سلماں نے مسلماں ہوکر
دھوپ میں سر کا جو نورِ رخِ روشن چمکا — رہ گیا مہرِ چراغاں تہِ داماں ہوکر
وصفِ رخسار کیا بعد ثنائے لبِ شاہ — جانبِ شہرِ حلب آئے بدخشاں ہوکر
گر پڑا تیر نے جسے چشمِ غضب سے دیکھا — دل میں ہر موئے مژہ گڑ گیا پیکاں ہوکر
جلد بھی حُر نے لیا جو بھی لی کو نہ بھی — پڑ گیا لوٹ میں تکبیر کا مہماں ہوکر
جا بسے خاک میں سب تیر کے کھانے والے — سارے گھر ڈھ گئے سادات کے ویراں ہوکر
کیا شہادت کی خوشی تھی پسرِ زہرا کو — شکرِ خالق کیا ہر زخم نے خنداں ہوکر
ہوگیا کعبہ و بطحا و مدینہ برباد — بستیاں لوٹ لیں جنگل نے گلستاں ہوکر
ذبح کے بعد بھی شہ کی نہ ہوئیں آنکھیں بند — عیدِ قرباں ہوئی معشوق پہ قرباں ہوکر
شاہ جب کہتے تھے بتلاؤ تو تقصیر مری — سر جھکا لیتے تھے بے درد پشیماں ہوکر
فوجِ اعدا سے کہا حُر نے نہ ہے دینداری — قتل کرتے ہو مسلماں کو مسلماں ہوکر
عیسیِ آلِ محمد کی رحیمی کے نثار — دینِ احمد کو جلا دے گئے بےجاں ہوکر
سینۂ شہ پہ رکھا شمر نے زانو ہیہات — پاسِ قرآں نہ کیا قاتلِ قرآں ہوکر
لاشِ شبیر پہ یہ دھوپ نے قتل کے بعد — جم گئے قطرۂ خوں جسم میں پیکاں ہوکر
کہتی تھی بانوئے بےکس کہ بتاؤ لوگو — صبر کیوں کر غمِ اکبر میں کروں ماں ہوکر
اُمتِ احمدِ مرسل کے گنہ ڈھانپ دیے — دھوپ میں لاشۂ شبیر کے عریاں ہوکر

تشنگی باپ کی سجاد کو بھولی نہ کبھی — جو پیا گھونٹ بھی پانی کا تو گریاں ہوکر
لاشِ اکبر سے کہا ماں نے کہ مشتاق تھی میں — واہ صدقے گئی آئے بھی تو بےجاں ہوکر
بانو کہتی تھی برس دن بھی تو اصغر نہ جیے — ہوئے بےجاں چھ مہینے کے مری جاں ہوکر
فاتحہ دودھ پہ بھی دے نہیں سکتی واری — قید سے آئی ہوں ماں بےسروساماں ہوکر
زلفِ اکبر کو جو دیکھا سرِ سینہ پرخوں — سب سر کھول دیے ماں نے پریشاں ہوکر
لبِ شبیر پہ رکھی جو چھڑی حاکم نے — لوگ رونے لگے انگشت بدنداں ہوکر
تھا یہ اس گھر میں اندھیرا کہ عزادارِ حرم — سر کو ٹکرانے لگے داخلِ زنداں ہوکر
شمر سے کہتے تھے شہ ذبح کریگا جو مجھے — ابھی دوڑیں گے نبی چاک گریباں ہوکر
حشر کردے گی بپا تیرِ خدا کی فریاد — قہر لائے گا سرِ فاطمہ عریاں ہوکر

رہبری کی جو مقدر نے تو ہم بھی مونس
روضۂ شاہ پہ جائیں گے خراساں ہوکر

یہ کہنا غلط اور بے بنیاد ہے کہ دبیر نے مذکورہ بالا شاہی مجلس میں مرثیہ سے قبل بادشاہ کی تعریف میں کوئی نظم پڑھی تھی۔ اگر فی الواقع دبیر کوئی ایسی نظم مجلس میں پڑھتے تو امیٹھیوں نے اس کا خوب چرچا کیا ہوتا اور وہ نظم کہیں نہ کہیں محفوظ ہوتی۔ برعکس اس کے جب میر انیس مارچ ۱۸۷۱ء میں حیدرآباد مجلس پڑھنے گئے تو انھوں نے نظامِ دکن اور ان کے وزیر کی تعریف میں یہ دو رباعیاں کہی تھیں؛

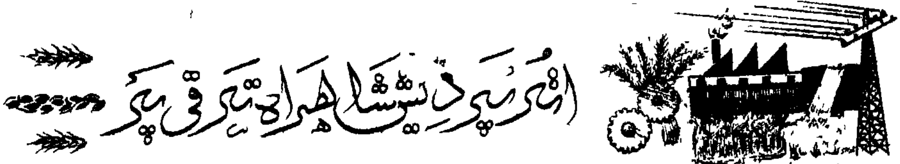
اللہ و رسولِ حق کی امداد رہے — سرسبز یہ شہر فیض بنیاد رہے
نواب ایسا رئیسِ اعظم ایسے — یارب آباد حیدرآباد رہے

موجود جو کچھ جسے منظور ہے یاں — علم و فضل و عطا کا دستور ہے یاں
مختار الملک و بندگانِ عالی — رحمت رحمت پہ نور پر نور ہے یاں[1]

★

---

[1] واقعاتِ انیس ص ۱۲۱



سائنسی اور ٹکنیکل تعلیم حاصل کرنے کے لیے وزیر تعلیم کی اپیل ●● جھانسی ڈویژن میں بے زمین افراد کے لیے مکانات کے واسطے پلاٹوں کی فراہمی ●●● چاول کی خریداری پر لیوی میں اضافہ ●●● بے روزگار انجینئروں کو روزگار کی فراہمی ●●● پندرہ سال کے اندر تمام تندرست افراد کو روزگار فراہم کر دینے کی توقع ●●● پنچائت سیوکوں کے مہنگائی بھتوں میں اضافہ ●●● خریف کے اناجوں کی خریداری قیمت کا تعین ●●● مجاہدین آزادی کو پنشن ●●● اتر پردیش میں بجلی کی کمی کو دور کرنے کے اقدامات پر غور و خوض ●●● سنسکرت کے اساتذہ انگریزی کی استعداد کی شرط سے مستثنیٰ

وزیر اطلاعات و ثقافتی امور و وزیر ریاست برائے اعلیٰ تعلیم مسز ٹی پی ڈی ٹنڈن نے آج شام کو لال باغ گرلس کالج لکھنؤ میں خواتین اور لڑکیوں کی تعلیم سے متعلق مشاورتی کونسل کے جلسہ میں تعلیم نسواں کے مسائل پر تبادلۂ خیالات کرتے ہوئے کہا کہ ماضی میں تعلیم نسواں کو کافی نقصان پہنچا ہے لیکن آج بھی لڑکیوں میں سائنسی یا ٹکنیکی تعلیم کے لیے بہت زیادہ جوش و خروش نہیں پایا جاتا ہے یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس پر سنجیدگی سے توجہ دی جانا چاہیے اور خواتین کو زیادہ سے زیادہ سائنسی اور ٹکنیکی تعلیم حاصل کرنا چاہیے۔" بیگم قدسیہ اعجاز رسول ایم ایل سی نے اس جلسہ کی صدارت کی۔

مسز ٹنڈن نے کہا کہ ملک میں دس سائنس گریجویٹوں میں سے صرف ایک لڑکی سائنس گریجویٹ ہوتی ہے اور ان میں سے ہر پانچ میں سے چار لڑکیاں تدریس کا پیشہ اختیار کرتی ہیں ان میں سے زیادہ لڑکیاں دیگر پیشے کیوں نہیں اپناتی ہیں یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر ماہرین تعلیم اور حکومت کو تبادلہ خیالات کرنا چاہیے

آزادی کی پچیسویں سالگرہ سال کے دوران جھانسی ڈویژن میں دیہی علاقوں کے بے زمین ہریجنوں اور سماج کے دیگر کمزور طبقوں کو مکانات کے لیے جگہ فراہم کرنے کے لیے ایک پروگرام شروع کیا جا چکا ہے اس پروگرام کے تحت جھانسی باندہ اور جالون اضلاع میں ۳۴۴ مواضعات کے ۴۱۰۵ خاندانوں کو ۱۲۳/۶۳ ایکڑ سے زیادہ زمین مکانات کی تعمیر کے لیے فراہم کی گئی ہے ان میں سے بیشتر خاندان ہریجن اور اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے ہیں۔

ضلع جھانسی میں ۱۳۹ مواضعات کے اقوام و قبائل مندرجہ فہرست دیہی دستکاروں اور زرعی مزدوروں کے ۱۹۶۰ خاندانوں کو ۵۹/۷۵ ایکڑ سے زیادہ زمین تقسیم کی گئی اسی طرح ضلع باندہ میں مکانات کی تعمیر کے لیے ۱۲۱ مواضعات میں اقوام مندرجہ فہرست اور ہریجنوں کے تقریباً ۱۲۷۵ خاندان کو ۱۳۹ ایکڑ سے زیادہ زمین دی گئی ضلع جالون میں ۸۴ مواضعات کے ۸۷۰ خاندانوں کو مکانات کے لیے ۲۴/۰۸۸ ایکڑ زمین تقسیم کی گئی ان میں سے ۷۵۰ خاندان اقوام مندرجہ فہرست کے اور بقیہ دستکاروں اور زرعی مزدوروں کے ہیں

حکومت اتر پردیش نے لائسنس یافتہ بیوپاریوں اور چاول ملوں پر لیوی عائد کر کے موجودہ خریف سے چاول خریدنے کا فیصلہ کیا ہے۔ سب سے جلد کی دوکانوں کی بڑھتی ہوئی ضروریات کی تکمیل کے پیش نظر زیادہ سے زیادہ مقدار میں چاول خریدنے کے لیے امسال لیوی کے عام فیصد میں ۶۰ سے ۷۰ تک اضافہ کیا گیا ہے۔ گورکھپور خدائی منطقہ اور جھانسی ہمیرپور اور جالوں کے قلت زدہ اضلاع کے لیے لیوی کا فیصد صرف ۳۵ ہوگا۔

کسانوں کو امدادی قیمت کا فائدہ پہنچانے کے لیے درمیانی اشخاص

کو ہٹانے اور وہاں کے تھوک بیوپاریوں تدریج اپنے ہاتھ میں لینے کے لیے حکومت نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ امدادی قیمت اسکیم کے تحت محکمہ غذا اتر پردیش امداد باہمی فیڈریشن اور ہندوستانی غذائی کارپوریشن کے توسط سے کھلے بازار میں کسانوں سے براہ راست دھان خریدا جائے

ریاستی حکومت نے کسانوں کے لیے کم سے کم امدادی قیمت کی فراہمی کا بندوبست کرنے کے لیے زراعتی قیمت کمیشن کی سفارشات اور مرکزی حکومت کی رضامندی سے مختلف قسم کے باسمتی دھان کی قیمت خرید ۷۵ روپیہ فی کوئنٹل مقرر کی ہے باسمتی کے علاوہ دیگر اقسام کے دھان کی فی کوئنٹل قیمت خرید درجہ اوّل کے لیے ۶۸ روپیہ۔ درجہ دوم کے لیے ۶۲ روپیہ درجہ سوم کے لیے ۵۶ روپیہ درجہ چہارم کے لیے ۵۳ روپیہ اور درجہ پنجم کے لیے ۴۹ روپیہ ہوگی

❖ ❖ ❖

وزیر لوکل سلف گورنمنٹ شری مینی سنگھ نے ضلع کان پور میں بیروزگار انجینیروں اور ہنرمند مزدوروں کو روزگار کی فراہمی سے متعلق اسکیم کے تحت دو سڑکوں کی تعمیر کے کام کا افتتاح کیا یہ دو سڑکیں کانپور سے تقریباً ۴ کلومیٹر دور ماری پال چاند پور اور کانپور سے تقریباً ۲۵ کلومیٹر کے فاصلہ پر گھاٹم پور گھیر ہیں ماری پال چاند پور سڑک ضلع کان پور کو ضلع فتح پور سے ملاتی ہے ان دونوں سڑکوں کی تعمیر محکمہ تعمیرات عامہ کرے گا اور یہ آئندہ ۱۵ اگست سے قبل بن کر تیار ہو جائیں گی

اس اسکیم کے تحت ضلع کانپور میں ۲۳ کلومیٹر سے زیادہ لمبائی کی پانچ پختہ سڑکیں تعمیر کی جائیں گی سڑکوں کی تعمیر پر ۷۰ روپیہ فی کلومیٹر کے حساب سے لاگت آئے گی اور اس سلسلہ میں نصف اخراجات مرکزی حکومت برداشت کرے گی۔

❖ ❖ ❖

ریاستی حکومت ریاستی منصوبہ بندی کمیشن کے ۱۵ سالہ منصوبہ کے لیے متعین کردہ مقاصد کے تحت ریاست میں سنہ ۷۴-۱۹۷۳ء سے سنہ ۸۹-۱۹۸۸ء تک کی مدت کے دوران تمام بے روزگار افراد کو روزگار فراہم کرنے کے قابل ہو گی۔ ریاستی حکومت نے چوتھے منصوبہ کے دوران بیروزگاری کے مسئلہ سے نپٹنے کے لیے خصوصی کوششیں کی ہیں۔ دیہی علاقوں میں بیروزگاری دور کرنے کے لیے تیز رفتار پروگرام شروع کیے گیے ہیں پرائمری اسکولوں میں مزید ٹیچروں کی تقرری کی گئی اور دیہی پروگراموں کو جاری رکھا گیا ہے

ریاستی حکومت نے سال رواں کے دوران اتر پردیش میں تقریباً ۸۶۴ کروڑ روپیہ کے مصارف سے تقریباً ۱۰۱۱ لاکھ افراد کو روزگار فراہم کرنے کے لیے ایک خصوصی پروگرام شروع کیا ہے ریاستی منصوبہ بندی کمیشن کے اندازہ کے مطابق ان تمام کوششوں کے باوجود جو حکومت روزگار فراہم کرنے کے لیے کر رہی ہے اتر پردیش میں پانچویں پنج سالہ منصوبہ کے آغاز میں بے روزگار تکنیکی افراد کی تعداد ۹۹۷ ہوگی ان میں سے ۴۶۰ ڈگری ہولڈر انجینیر اور ۴۴۱ ڈپلوما ہولڈر انجینیر ۱۲۹۸ ایگریکلچر ڈگری ہولڈرس اور ۲۱۲ ڈگری ہولڈر تربیت یافتہ ٹیچر ہوں گے

اتر پردیش میں پنچایت سیوکوں کو پہلے ہیں اکتوبر ۱۹۷۱ء سے سرکاری ملازم قرار دیدیا گیا ہے اب اسی شرح سے مہنگائی بھتہ ملے گا جو دیگر سرکاری ملازموں کو ۷۵-۱۱۵ روپیہ کی شرح تنخواہ میں مل رہا ہے یہ فیصلہ آج یہاں وزیر اعلیٰ شری کملاپتی ترپاٹھی کی صدارت میں منعقدہ ریاستی کابینہ کے ایک جلسہ میں کیا گیا۔ اس فیصلہ پر یکم مارچ ۱۹۷۲ء سے عمل درآمد ہوگا جس کی رو سے پنچایت سیوکوں کو ۳۷٫۵ روپیہ کے موجودہ مہنگائی بھتہ کے بجائے ۵۶ روپیہ کی شرح سے اضافہ شدہ مہنگائی بھتہ ملے گا

ریاستی حکومت محکمہ پرائمری اسکولوں کے لیے جلد ہی ۹ ٹیچروں کی تقرری کرے گی یاد ہوگا کہ ان اسکولوں کو حکومت نے حال ہی میں اپنے دائرہ اختیار میں لیا ہے ان ٹیچروں کے انتخاب سے متعلق قواعد وضوابط کا بھی اعلان کیا جا چکا ہے

ضلع کمیٹیوں سے کہا گیا ہے کہ ٹیچروں کے انتخاب کے وقت تربیت یافتہ اور بیروزگار بی ٹی سی اور ایچ ٹی سی ٹیچروں کو اولیت دی جائے اس کے علاوہ ان میں سے ایسے ٹیچروں کو بھی اولیت دی جائے جنھوں نے پہلے تربیت مکمل کرلی ہو لیکن بیروزگار ہوں۔ دیگر زمروں کے معاملات میں اسی صورت میں غور کیا جائے گا جب کسی خاص ضلع میں بی ٹی سی اور ایچ ٹی سی کے ٹیچر دستیاب نہ ہوں بنیادی تعلیم کے ڈھانچہ کو منظم کرنے کے لیے حکومت نے اتر اکھنڈ

کے تین اضلاع کو چھوڑ کر ریاست کے تمام اضلاع میں ضلع بیسک ایجوکیشن افسروں کی تقرری کر دی ہے۔ ان افسروں نے کام سنبھال لیا ہے اور ضلع میں بیسک تعلیم سے متعلق کام بھی شروع ہو گیا ہے۔ بقیہ تین اضلاع میں جلد ہی افسروں کی تقرری کر دی جائے گی۔

: . :

حکومت اتر پردیش نے لائسنس شدہ بیوپاریوں اور چاول ملوں پر لیوی عائد کر کے ۷۳-۱۹۷۲ء کی خریف فصل کا چاول خریدنے کا فیصلہ کیا ہے اس کے علاوہ باجرہ اور مکئی کی جزوی طور پر خریداری ہندستانی غذائی کارپوریشن کے سپرد کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا ریاستی حکومت اپنی ضروریات کی تکمیل کے پیش نظر براہ راست کھلے بازار سے ۲۵۰۰۰ ٹن مکئی بھی کسانوں سے خریدے گی

خریداری کے سلسلہ میں کسی قسم کی دشواری پیش نہ آنے پائے اس کے لیے دھان اور چاول کے لیے ریاست کو ایک الگ منطقہ کی شکل میں قرار رکھتے ہوئے یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ دھان اور چاول کے موجودہ آٹھ بلاکوں کو ۲۴ چھوٹے بلاکوں میں تبدیل کر دیا جائے تاکہ اسمگلنگ کو روکا جا سکے اور خریداری میں اضافہ ہو سکے

زراعتی قیمت کارپوریشن نے تیسرے زمرہ کے دھان اور چاول کے لیے جن قیمتوں کی سفارش کی تھی اسے حکومت نے منظور کر لیا ہے اور بالترتیب ۵۶ روپیہ فی کوئنٹل کی شرح سے انکی قیمت مقرر کی گئی ہے باجرہ کی قیمت ۶۰ روپیہ فی کوئنٹل اور جوار اور مکئی کی قیمت ۵۸ روپیہ فی کوئنٹل مقرر کی گئی ہے۔

: . .

جو مجاہدین آزادی اور ان کے خاندان کے ارکان سے کہا گیا ہے کہ وہ پنشن اور مالی امداد کی منظوری کے لیے اپنی درخواستیں مقررہ فارموں پر جو ضلع مجسٹریٹ کے دفتر سے حاصل کیے جا سکتے ہیں زیادہ سے زیادہ ۲۶ جنوری ۱۹۷۳ء تک پیش کر دیں

اس سلسلہ میں جو لوگ پہلے کسی اور فارم یا معمولی کاغذ پر درخواستیں دے چکے ہیں ان سے بھی استدعا کی گئی ہے کہ وہ اس مقصد کے لیے مقررہ فارم پر اپنی درخواستیں دوبارہ پیش کر دیں۔ دیکھا گیا ہے کہ درخواستوں کے فارموں کی مناسب طور سے خانہ پری نہیں کی جاتی ہے اس سلسلہ میں سزا کی مکمل تفصیلات اور قید کی پوری مدت واضح طور سے درج کی جانا چاہیے۔

قید کی مدت کے بارے میں ضلع افسر یا جیل سپرنٹنڈنٹ کا سرٹیفکیٹ دستیاب نہ ہونے کی صورت میں درخواست دہندہ اس سلسلہ میں دو ممبران مجالس قانون ساز یا ممبران پارلیمنٹ یا سیاسی پنشن پانے والے مجاہدین آزادی کا سرٹیفکیٹ پیش کر سکتے ہیں جن لوگوں نے معافی مانگ لی ہو وہ کسی پنشن کے حقدار نہیں ہیں لہٰذا درخواست کے فارم میں یہ واضح طور سے درج ہونا چاہیے کہ درخواست دہندہ نے معافی مانگی ہے یا نہیں اس امر سے متعلق فارم کے کالم ۱۲ کو خانہ پری کے بغیر نہ چھوڑا جائے

. : :

وزیر بجلی شری نارائن دت تیواری نے دھان کھون کے تلک ہال میں اتر پردیش ریاستی بجلی بورڈ کے طلب کردہ ایک جلسہ میں کارخانہ داروں سے اپیل کی کہ وہ اتر پردیش میں بجلی کے موجودہ بحران کا مقابلہ کرنے کے لیے ایسے عملی مشورے دیں جس سے پیداوار کا کم سے کم نقصان ہو اور مزدوروں کو کم سے کم دقت ہو وزیر موصوف نے ان سے اپنے مشورے دس دن کے اندر بورڈ کو بھیجنے کے لیے کہا

اس جلسہ میں بڑے اور چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کے نمائندوں جملہ ممبران مجالس قانون ساز اور آبپاشی زراعت اور گنا ترقی کے محکموں کے افسران نے شرکت کی۔ وزیر موصوف نے جلسہ میں کہا کہ تمام صارفین کو اس امر کو ملحوظ رکھ کر بجلی کی قلت کا یکساں طور سے سامنا کرنا چاہیے کہ نہ تو صنعتی پیداوار کو اور نہ زراعتی پیداوار کو نقصان پہنچے۔ وزیر موصوف نے کہا کہ مدھیہ پردیش اور کیرالا کو چھوڑ کر دیگر تمام ریاستیں بجلی کی قلت سے دوچار ہیں اور کچھ ریاستوں مثلاً ہریانہ پنجاب میں صورت حال اتر پردیش کے مقابلہ میں کہیں زیادہ خراب ہے دیگر ریاستوں میں بعض مقامات پر بجلی کی فراہمی میں ۶۰ فیصد تک کی کمی کر دی گئی ہے۔

ریاستی حکومت نے تسلیم یافتہ ہائی اسکولوں اور انٹرمیڈیٹ کالجوں کے ایسے تمام سنسکرت ٹیچروں کو جو مطلوبہ شرقی علوم کی استعداد کے حامل ہوں لیکن اتر پردیش کے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے تعلیمی بورڈ کے

نصاب میں درج انگریزی کی استعداد نہ رکھتے ہوں سرا ایسے ٹیچروں کو جو لے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس نہ کیا ہو گزشتہ تاریخوں سے اس تعلیمی استعداد سے مستثنیٰ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ فیصلہ انٹرمیڈیٹ ایجوکیشن ایکٹ کی دفعہ ۹ (۴) کے تحت کیا گیا ہے۔ جس کے نتیجہ میں سنسکرت ٹیچروں کی تقرری اور مستقلی کے فوائد حاصل ہو جائیں گے اور وہ متعلقہ گریڈوں کے حقدار ہو جائیں گے خواہ وہ انگریزی کی مطلوبہ استعداد کے حامل نہ ہوں۔



عدالتوں اور سرکاری دفتروں سے فارسی کا اخراج — (صفحہ ۲ کا بقیہ)

تک اس میں کوئی قابل قدر اضافہ نہیں ہوا تھا۔ اس ضمن میں یہ بھی خاطر نشین رہنا چاہیے کہ ڈھاکہ اور ترہت (بہار) کے عوام نے فارسی کے اخراج اور ہندستانی بخط ناگری کی ترویج کے خلاف احتجاجات کیے تھے۔ ہندستانی بخط ناگری کی حمایت میں ایک بھی ہندستانی نے اپنے لبوں کو جنبش دینے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ عوامی سطح پر اس کی حمایت انگریزوں کی مزید حکمت عملی کی محتاج تھی اور حقائق کے مطابق یہ اس سے بعد کی بات ہے۔

ابتدا میں بتایا جا چکا ہے کہ ۱۸۳۷ء تک انگریز اگرچہ شمالی ہندستان پر قابض ہو چکے تھے لیکن انھیں اپنی گرفت کی کمزوری کا احساس تھا اور ان کے دلوں میں بالخصوص مسلمانوں کی طرف سے شکوک و شبہات بنے ہوئے تھے۔ گورنر جنرل ہند لارڈ کیننگ نے ۱۸۵۶ء میں کہا کہ "میں اپنے عہد حکومت میں امن چاہتا ہوں۔ میں اپنے ذہن سے اس بات کو نہیں نکال سکتا کہ ہندستان کے بظاہر خاموش اور پرسکون افق پر بادل کا ایک ٹکڑا ابھرے جو دیکھنے میں آدمی کی ہتھیلی سے بڑا نہ ہو مگر بڑھتے بڑھتے پھٹ جائے اور ہمیں تباہی اور بربادی کی دھمکی دینے لگے"[1] اور اگلا سال ۱۸۵۷ء ہی انگریزوں کی تباہی اور بربادی کی دھمکی بن کر آیا۔ بہرحال اس قیامت کے گزر جانے کے بعد ہندستان کے متعدد بڑے بڑے شہروں میں رؤسا اور شرفا نے اصلاحی انجمنیں قائم کیں۔ دس سات برسوں میں دلی سوسائٹی، بنارس انسٹی ٹیوٹ، مینی تال انسٹی ٹیوٹ، انجمن مباحثہ الہ آباد، مراد آباد، میرٹھ، شاہ جہاں پور، بہار، لاہور، گجرانوالہ، بمبئی، انجمن تہذیب لکھنؤ وغیرہ بہتیری اصلاحی انجمنیں دیکھتے دیکھتے نمودار ہو گئیں۔ انگریز حکام شروع شروع میں ان انجمنوں سے دور رہے (حالانکہ یہ انہی کی ایما پر بنائی گئی تھیں) لیکن رؤسا و شرفا کے اصرار پر "بادل نخواستہ" شریک ہونے لگے اور دو چار مہینوں میں صدر اور سکریٹری کی کرسیوں پر جلوہ فرما ہو گئے۔ انہی انجمنوں کے جلسوں میں انگریزوں نے ہندستانی بخط ناگری کو "ہندی" کے نام سے موسوم کیا اور عوامی سطح پر "اس" کی حمایت کے لیے میدان تیار کیا۔

عدالتوں اور سرکاری دفتروں سے فارسی کے اخراج کے ساتھ ساتھ "ہندوی" یعنی "ہندستانی" یعنی "اردو" کو لکھنے کے لیے فارسی، ناگری اور رومن رسم خط کا جھگڑا کھڑا کر دیا گیا۔ ہر رسم خط کی خوبیوں اور خرابیوں کو خوب اچھالا گیا اور اگلے سو برسوں تک انہی خوبیوں کا کم اور خرابیوں کا زیادہ تذکرہ ہوتا رہا ہے۔ زبان اور رسم خط کے اس قضیے نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نفاق و نفرت کا بیج بو دیا جس نے ایک طرف ہماری قومی سالمیت کو پاش پاش کر دیا اور دوسری طرف اس کا کوئی موزوں حل نہ نکل سکا۔



ایشیا ۷۲ — (صفحہ ۳۵ کا بقیہ)

تعمیرات عامہ کے مرکزی محکمے کے چیف انجینئر شری دوراے راج نے ایک ملاقات میں بتایا کہ کبھی کبھی ایسا لگتا تھا کہ مسائل کو حل کرنا ممکن ہی نہیں ہے۔ تقریباً دس ماہ قبل ایک ڈپلومیٹ نے جو اپنے ملک کے لیے میلے میں جگہ مخصوص کرانے آیا تھا۔ موصوف سے کہا کہ بھارت جیسے ملک کے وسائل کو دیکھتے ہوئے اتنے بڑے پروجیکٹ کو مکمل کر لینا دشوار معلوم ہوتا ہے۔ اس نے کہا کہ "جناب آپ خواب دیکھ رہے ہیں، اسے بھول جائیے۔" لیکن وہی ڈپلومیٹ جب اکتوبر میں شری دوراے راج سے ملا تو اسے اعتراف کرنا ہی پڑا کہ خواب حقیقت میں بدلا جا چکا ہے۔



---

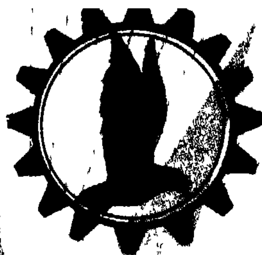
[1] ملاحظہ ہو رجنی پام دت، "آج کا ہندستان" ص ۱۶



Regd. No L. 319



ھندوستان اسٹیل لمیٹڈ کے ۵ لاکھ ٹن کے بھلائی فولاد کارخانہ کا ایک منظر



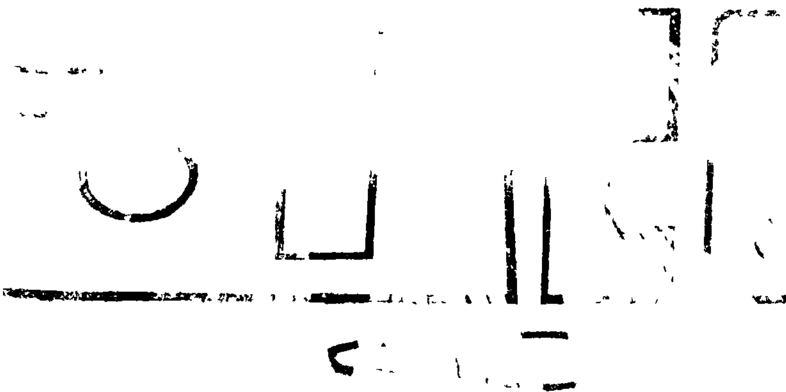
ویت نمبر



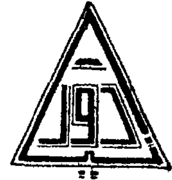
آجکل







عنوانات



جلد ۲۸ نمبر ۱۱

۲۶ جنوری ۱۹۷۳ء

۶ ماگھ ۱۸۹۴ تک

چندہ سالانہ پانچ روپے

فی پرچہ پچاس پیسے

ایڈیٹر

خورشید احمد

[illegible]

شرومنی شرما

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش

پرنٹر

اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری۔ یو۔ پی

مطبوعہ

نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ

محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش

اپنی بات

جمہوریہ ہند کے استقلال کو ۲۳ برس ہو چکے ہیں اور ہم ۲۶ جنوری کو جمہوریت کے ۲۴ ویں سال میں قدم رکھنے جا رہے ہیں۔ ایسے لیے ہم نے جو دستور وضع اور قبول کیا اس کا مقصد ہندستان میں ایک ایسے غیر طبقہ وارانہ سماج کا قیام ہے جس میں شہریوں کے درمیان کسی قسم کی تفریق و امتیاز نہ پایا جاتا ہو۔ ہر شخص کو خوش حال زندگی بسر کرنے اور ترقی کرنے کے مساوی مواقع فراہم ہوں۔ ملک سے جہالت، غریبی، امراض وغیرہ کا خاتمہ ہو۔ ان ۲۳ برسوں میں اس مقصد کے حصول کے لیے متواتر اور منظم کوشش کرتے آئے ہیں۔ ہمارے پنج سالہ منصوبے ہمارے اسی عزم و ارادے کا ثبوت ہیں۔ ہماری راہ میں دشواریاں بھی آتی رہی ہیں۔ بعض وقت حالات اتنے سنگین ہوتے کہ ہماری آزادی اور سالمیت ہی خطرے میں پڑ جاتی۔ لیکن ہم ان پر قابو پاتے اور آہستہ آہستہ مگر ہمت و استقلال کے ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ پچھلا سال (جمہوریت کا ۲۳واں سال) بھی بڑے تناؤ اور اقتصادی بوجھ کا سال رہا ہے۔ ہندستان اور پاکستان کی جنگ ۱۷ دسمبر سنہ ۱۹۷۱ء کو ختم ہوئی۔ اس جنگ کے نتیجہ میں تقریباً ایک لاکھ پاکستانی جنگی قیدیوں کا بوجھ ہندستان کے سر پر آ پڑا جو اب بھی برقرار ہے۔ اسی کے ساتھ ملک کے وسیع علاقے میں خشک سالی کی وجہ سے زراعت اور اناج کی پیداوار کو نقصان پہنچا۔ ایسے ملک میں جہاں کی ۸۰ فی صد آبادی کا انحصار اب بھی زراعت پر ہو اناج کی پیداوار کو نقصان پہنچنے کا مطلب بہت سے پیچیدہ مسئلے پیدا ہو جانا اور ترقی کے کاموں میں رکاوٹ پڑ جانا ہوتا ہے۔ اسی کے ساتھ بڑھتی ہوئی آبادی ایک چیلنج بنی ہوئی ہے۔ اس کے باوجود نہ پنج سالہ منصوبہ روکا گیا نہ ترقیاتی کام بند کیے گئے۔ اور زراعت، بجلی کی فراہمی، صنعت کو بڑھانے، اقتصادی نابرابری کو دور کرنے، امن اور مفاہمت کو فروغ دینے اور روزگار کے مساویانہ مواقع فراہم کرنے کے سلسلے میں ٹھوس اقدامات کیے گئے۔

اترپردیش بھی غیر معمولی خشک سالی کا شکار رہا۔ پھر بھی اس نے معیشت کے تمام شعبوں مثلاً زراعت، صنعت، آب پاشی، بجلی وغیرہ کی پیداوار و فراہمی میں نمایاں ترقی کی۔ توقع کی جاتی ہے کہ خشک سالی سے اناج خصوصاً خریف کی فصل کو جو نقصان پہنچا وہ اس سال ربیع کی پیداوار سے بہت کچھ پورا ہو جائے گا۔ اس لیے کہ سال گزشتہ کی ربیع کے مقابلے میں اس سال ۲۰ سے ۲۵ لاکھ ٹن زائد پیداوار ہونے کی امید ہے۔ اسی طرح ریاست میں مزید ۲٫۲۰ لاکھ ہیکٹر اراضی کے لیے آبپاشی کی سہولتیں فراہم کی گئیں۔ ریاست کی بجلی کی پیداواری صلاحیت میں بھی ۵۵ میگاواٹ کا اضافہ ہوا۔ صنعتی زمرے میں مرکزی (سرکار) سیکٹر کے پراجیکٹ ریکارڈ تعداد میں پردیش کے لیے حاصل کیے گئے اور سرمایہ کاری کو بھی فروغ دیا گیا جو ریاست کی صنعت کاری کے روشن امکانات کا آئینہ دار ہے۔

اس کے علاوہ جمہوریت کا تیئیسواں سال دیگر متعدد امور کے لحاظ سے ایک قابل ذکر سال تھا۔ یہی وہ سال تھا جب آزادی کی ۲۵ ویں سالگرہ نہایت شان و شوکت اور تزک و احتشام کے ساتھ پردیش میں بھی منائی گئی۔ اس موقع پر خاص طور سے ہریجنوں اور دیگر پسماندہ طبقوں کی ترقی کے لیے اور انھیں سماج میں باعزت مقام دلانے کے لیے کئی اسکیمیں شروع کی گئیں۔ پانچویں پنج سالہ منصوبے کے مقاصد کے تعین کے لیے ابتدائی کارروائی کے طور پر چوتھے منصوبے کی کامیابیوں اور کمیوں کا بھی بھرپور جائزہ لیا گیا۔ پانچویں پنج سالہ منصوبے کے سلسلے میں ایک بنیادی خاکہ مرتب کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی سنہ ۷۴-۱۹۷۳ء کے لیے سالانہ منصوبے کا مسودہ تیار کیا گیا۔

اس طرح یہ دیکھا جائے گا کہ ہر اعتبار سے خود کفیل ہونے کے لیے ہماری کوششیں مسلسل جاری ہیں اور ہماری سرگرمیوں کا رخ اس نئے ہندستان کی تعمیر ہی کی جانب ہے جو فرقہ واریت، نسل پرستی اور علاقائی تنگ نظری سے پاک ہو جس میں ہر شخص کو خصوصاً سماج کے کمزور اور پس ماندہ طبقوں کو ترقی کے یکساں مواقع حاصل ہوں اور جہاں اونچ نیچ ذات پات اور امیر غریب کا کوئی امتیاز اور سوال نہ ہو۔ لیکن اس میں بھی دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ اس طرح کے ہندستان کی تعمیر ضبط و نظم کی پابندی، ڈسپلن اور جمہوری طریقوں ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ تشدد، لاقانونیت اور قومی املاک کی تباہی سے کسی مقصد کو تقویت نہیں پہنچ سکتی بلکہ اس کا اثر الٹا ہی پڑ سکتا ہے۔ اس لیے آیئے جس طرح ہم نے ہندستان کو خود کفیل، ترقی یافتہ اور باوقار بنانے کا عہد کیا ہے اسی طرح یوم جمہوریہ کے اس مبارک موقع پر یہ بھی عہد کریں کہ ہم اپنے مقصد کی تکمیل کے لیے آئینی اور جمہوری طریقے ہی اختیار کریں گے اور قومی املاک کی تباہی و بربادی کا باعث نہ بنیں گے۔

آہ فرقت کاکوروی

ابھی پروفیسر احتشام حسین صاحب کے غم میں آنسو تھمے بھی نہیں تھے کہ فرقت صاحب کے سانحۂ ارتحال کی خبر نے پھر تڑپا دیا۔ جس وقت یہ خبر میں نے اپنے کانوں سے ریڈیو پر سنی ایک سکتہ سا طاری ہو گیا۔ ریڈیو سے یہ خبر سنتے ہی آتش لکھنوی کا ایک مصرعہ بے اختیار زبان پر آ گیا جو انھوں نے اپنے بھائی ظریف کی موت پر کہا تھا۔ "ستم ظریفی تو کوئی دیکھے ہنسانے والا رلا کے اٹھا"۔ اس سے پہلے یہ تصور بھی نہیں ہوا تھا کہ ایسا باغ و بہار اور زندہ دل آدمی جس نے کبھی کسی کو رنج نہ پہنچایا، کسی کو شکایت کا موقع نہ دیا ہو سب کو اسی طرح رُلا کے جائے گا۔ ان کا انتقال جن حالات میں ہوا اس نے اس سانحہ کو اور بھی دردناک بنا دیا ہے۔

فرقت صاحب سے میری پہلی ملاقات سنہ ۱۹۳۵ء میں میرے چچا زاد بھائی اعظم حسین صاحب مرحوم ایڈیٹر سرفراز کے ہاں ہوئی تھی۔ دونوں میں بڑے گہرے روابط تھے۔ اس اعتبار سے فرقت صاحب کو بھی میں اپنا بڑا بھائی سمجھتا تھا لیکن ان کے مزاج کی سادگی، بے تکلفی اور سیمابیت نے خوردگی و بزرگی کی حد بندیوں کو توڑ دیا اور کبھی یہ محسوس ہی نہیں ہونے دیا کہ وہ بزرگ ہیں۔ اور یہ کیفیت تنہا میرے ساتھ نہیں بلکہ بوڑھا ہو یا جوان، بچہ ہو یا کمسن، فرقت صاحب کا ہم عمر نظر آتا تھا اور ہر شخص کے ساتھ وہ یکساں بے تکلف تھے۔ لیکن یہ بھی انھیں کے ساتھ مخصوص تھا کہ اس بے تکلفی میں کبھی انھوں نے تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ اگر کبھی کوئی موقع ایسا آ گیا کہ بات میں تلخی پیدا ہونے کا اندیشہ ہوا تو فرقت صاحب فوراً خاموش ہو جاتے اور چہرے کی کیفیت صاف بتاتی کہ سنجیدگی سے غور کرنے پر آپ محسوس کریں گے کہ غلطی پر میں نہیں ہوں۔

فرقت صاحب کی دائمی جدائی ان کے ملنے والے کا ذاتی غم تو ہے ہی، یہ ایک بہت بڑا ادبی سانحہ بھی ہے اس لیے کہ انھوں نے طنز و مزاح کے دامن کو جس طرح اپنی تحریر کے ذریعے مالا مال کیا اس طرح اب کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔ انھیں نظم و نثر پر یکساں قدرت حاصل تھی خصوصاً "پیروڈی" کے تو وہ بادشاہ تھے۔ کہنے کو وہ قدیم اعلیٰ نسل سے تعلق رکھتے تھے لیکن انھوں نے ہمیشہ اپنے گرد و پیش کے حالات اور روزمرہ کے واقعات سے مواد حاصل کر کے سماج کی خامیوں اور برائیوں کو اجاگر کیا۔ ان کے طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں جو اردو ادب میں یقیناً ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔

ایڈیٹر ——————

۲۶ جنوری سنہ ۱۹۷۳ء

۶ ماگھ ۱۸۹۴ شک

GOVERNOR



UTTAR PRADESH

RAJ BHAVAN
LUCKNOW

ملک کی طاقت اور عظمت کا راز قومی یک جہتی میں ہے

سماج کی خدمت کے لیے خود کو وقف کر دیجیے ــــ گورنر اتر پردیش

[جناب اکبر علی خاں صاحب گورنر اتر پردیش نے یوم جمہوریہ کے موقع پر عوام سے حسب ذیل اپیل کی]

ہماری جمہوریت کی تیئسویں سالگرہ کئی وجہوں سے خصوصی اہمیت رکھتی ہے۔ اول یہ کہ گھریلو محاذ پر مختلف آزمائشوں اور مشکلات کے باوجود جمہوریت کا ۲۲ واں سال امن و امان کا سال رہا ہے۔ ہماری وزیر اعظم نے پاکستان سے ۱۹۷۱ء کی جنگ کے ختم ہوتے ہی دونوں ملکوں کے درمیان دوستی اور امن کا ماحول پیدا کرنے کے لیے پہل کی۔ اس کے نتیجے میں تاریخی شملہ سمجھوتہ ہوا جس کے تحت دونوں ملکوں کی فوجیں اپنی اپنی سرحد میں واپس گئیں۔ یہ ہماری سب سے بڑی کامیابی رہی جس پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ شملہ سمجھوتے کے نتیجے میں امن کا جو دور شروع ہوا اس میں پڑوسی بنگلہ دیش کے لیے نہ صرف ایک جمہوری اور سیکولر سماج کی تعمیر کی جانب تیزی سے بڑھنے کا موقع ملا بلکہ بنگلہ دیش کے عوام کو سنہ ۱۹۷۱ء کے دل دوز مصائب کے بعد جس فوری سکون اور راحت کی ضرورت تھی وہ بھی انھیں میسر آ سکی۔

اتر پردیش نے زیر نظر سال میں ہماری معیشت کے تمام بنیادی شعبوں ــــ زراعت، صنعت، آبپاشی، بجلی وغیرہ میں اس سوکھے کے باوجود جس سے پردیش کا ایک بڑا علاقہ متاثر تھا، نمایاں ترقی کی۔ اس سوکھے سے خریف کی فصل کو جو نقصان پہنچا، توقع ہے کہ اس کی بہت کچھ تلافی ربیع کی زائد پیداوار سے ہو جائے گی۔ اسی طرح بجلی کی پیداوار میں ۵۵ میگا واٹ کا اضافہ ہوا اور پردیش کا سینچائی کا رقبہ ۲۰ء۲ لاکھ ہیکٹر کے بقدر بڑھ گیا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم ہر محاذ پر خود کفیل ہونے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں اس لیے کہ ہر شعبے میں خود اعتمادی پیدا ہونے سے ہی ہماری جمہوریت کی بنیادیں مضبوط ہو سکتی ہیں اور ہم قوموں کی برادری میں اپنا سر اونچا کر سکتے ہیں۔

جمہوریت میں تمام حقوق عوام میں مرکوز ہوتے ہیں اور ان سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے حقوق کا صحیح اور ذمے داری کے ساتھ استعمال کریں گے اور اسی کے ساتھ اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی نہ کریں گے اور ملک خصوصاً سماج کے کمزور طبقے کی خدمت کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیں گے۔ میں تمام لوگوں سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ یہ ذہن نشین کرنے کی کوشش کریں کہ ملک کی طاقت اور عظمت کا راز قومی یکجہتی اور بلا لحاظ ذات، عقیدہ اور مذہب عوام کی خدمت میں مضمر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ہماری لائق احترام وزیر اعظم کی صحیح رہنمائی میں ملک طاقتور سے طاقتور ہوتا جائے گا۔ میں اس مبارک موقع پر تمام لوگوں کو تہنیت پیش کرتا ہوں اور ان کی خوش حالی اور فارغ البالی کے لیے دعا گو ہوں۔

جے ہند

اکبر علی خاں

(ترجمہ)

۶ ماگھ ۱۸۹۴ شک

۲۶ جنوری ۱۹۷۳ء



سیّدہ حرمت الاکرام

یہ صبحِ روشن کہ زر فشاں ہے
افق پہ سو کج کلاہیوں سے
یہ ایک تلوار روشنی کی
حیات کی رزم کوشیوں میں
اصول کو سرخرو کرے گی
بتائے گی رازِ فتح مندی

یہ وقت کی شاہ راہ پر
مشعلیں جلاتی، کراہتی ساعتوں
کے زخموں پہ مسکراتی
اترتی جاتی ہے تیرہ
لمحات کے دلوں میں
جمالِ فردا کا نور لے کر

یہ روشنی جلوۂ درا ہے
بڑھو کہ کتنا سفر پڑا ہے

[redacted]

کامیابیاں اور امکانات

حسرت علی صدیقی

سوشلزم کو ہندوستان میں مقبول عام بنانے کا سہرا جواہر لال نہرو کے سر ہے۔ یوں تو ان سے پہلے بھی لوگ سوشلزم کی باتیں کرتے تھے مگر ان کی باتیں زیادہ تر کتابی یا علمی انداز کی ہوتی تھیں۔ جواہر لال جی نے عملی پہلو پر زور دیا، سوشلزم کے اصولوں کو عوام کی زبان میں بیان کیا اور ان اصولوں کی روشنی میں عوام سے متعلق مسئلوں کا حل تلاش کیا۔ ان باتوں میں نظریاتی کٹرپن نہیں تھا وہ نہ تو اصطلاحات کے جھمیلے میں پڑے اور نہ انھوں نے کسی ملک کی آنکھ بند کرکے تقلید کی، جیسا کہ ان کے زمانے کے اور اس سے پہلے اور بعد والے سوشلسٹ کرتے تھے۔ اسی لیے اپنے نام کے ساتھ سوشلسٹ کا لفظ جوڑنے اور سوشلزم کے نظریات کا پرچار کرنے والے ادارے اور افراد سوشلزم کو مقبول بنانے کے لیے اتنا کچھ نہیں کر سکے جتنا کچھ جواہر لال جی نے کیا۔

آج سوشلزم ایک بیتش سان گیا ہے۔ پڑھے لکھے اور بے پڑھے لکھے دونوں طرح کے لوگ مانتے ہیں کہ ملک جن مسئلوں سے دوچار ہے ان کا سب سے جلد اور سب سے اچھا حل سوشلزم ہی کے ذریعہ نکل سکتا ہے۔ بین اقوامی سطح پر بھی سوشلزم سے وہ نفرت یا عداوت نہیں پائی جاتی جو روس کے انقلاب کے بعد پائی جاتی تھی اور جس کی جھلک بعض حکومتوں کی پالیسیوں میں ابھی دو سال پہلے تک دکھائی دیتی تھی۔ دنیا میں غیر سوشلسٹ ملکوں میں بھی بعض سوشلسٹ طرز کے اقدامات ہوئے ہیں، اگرچہ سماجی ڈھانچہ کی نوعیت سرمایہ دارانہ ہونے کی وجہ سے ان اقدامات سے پورا فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا ہے۔ جن ملکوں میں صنعتی انقلاب پچھلی صدی میں آ گیا تھا اور جنھوں نے دوسرے ملکوں کے استحصال کا موقع پایا تھا ان میں بھی اگرچہ امیر غریب کا فرق اچھا خاصا ہے اور سوشلزم کے حق میں آوازیں بلند ہوتی رہتی ہیں لیکن وہاں عام معیار زندگی ہندوستان جیسے پسماندہ ملکوں سے بہتر ہے اور اسی لیے ابھی وہاں سوشلزم کا گیت مدھم سُروں میں گایا جاتا ہے۔ پسماندہ ملکوں میں جنھیں ترقی پذیر ملک بھی کہا جاتا ہے، اس گیت کے سُر خاصے بلند ہیں۔

[redacted] ہندوستان میں یہ گیت اتنا عام اور عوام میں اتنا مقبول ہو گیا ہے کہ جو پارٹیاں اپنی ساخت اور مقاصد کے اعتبار سے غیر سوشلسٹ ہیں وہ بھی سوشلزم کا نام لینے لگی ہیں اور اونچے طبقوں کے جو لوگ سوشلزم کو اپنے مفاد کے خلاف سمجھتے ہیں وہ بھی عام طور پر اس کی براہ راست مخالفت نہیں کرتے۔ یا پھر ہندوستان میں جو سوشلزم لایا جا رہا ہے اس سے ایسی باتیں منسوب کرتے ہیں جن کا اس میں شائبہ تک نہیں ہے۔ مثلاً کبھی سوشلزم کو فرد کی آزادی کے منافی قرار دیا جاتا ہے، کبھی اس کو مذہب کا مخالف کہا جاتا ہے، اور کبھی اس قسم کا پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ سوشلسٹ سماج میں کسی کو گھر رکھنے، جانور پالنے، کوئی کاروبار کرنے اور کوئی کارخانہ کھولنے بلکہ اپنے بچوں کو اپنی مرضی کے مطابق پرورش کرنے تک کی اجازت نہیں ہوگی۔ جمہوریت میں ہر شخص کو اپنی بات کہنے کی آزادی ہے اور چونکہ ہندوستان کا سوشلزم جمہوری وضع کا ہے اس لیے یہاں سوشلزم کی مخالفت پر کوئی پابندی نہیں لگائی جا سکتی ——— اور اسی لیے اگرچہ سوشلسٹ سماج کی تعمیر میں تاخیر ہو رہی ہے لیکن اس کی بنیادیں روز بروز زیادہ سے زیادہ مستحکم ہوتی جا رہی ہیں اور عوام کا عقیدہ اس وجہ سے پختہ ہوتا جا رہا ہے کہ وہ اپنے دکھوں کے علاج کے دوسرے طریقے آزما چکے ہیں اور سوشلزم کی سمت میں جو پیش رفت ہوئی ہے اس سے سوشلزم مخالف پروپیگنڈے کی تردید ہو چکی ہے۔

[redacted] سوشلزم کے مخالف اور اس کے بعض حمایتی بھی

اس بنیادی بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ہندستان میں ایک مخصوص قسم کا سوشلزم جو یہاں کے قومی مزاج سے مطابقت رکھتا ہے ایک ایسے طریقے سے لایا جا رہا ہے جو دنیا کے لیے نیا ہے لیکن جس کا تجربہ یہاں آزادی کی جدوجہد میں کیا جا چکا ہے۔ اس جدوجہد میں عدم تشدد کا انوکھا طریقہ اختیار کیا گیا تھا اور یہ تجربہ سو فیصدی کامیاب رہا۔ اب سیاسی جدوجہد کے اس طریقے کو معاشی جدوجہد میں اختیار کیا جا رہا ہے۔ دراصل سیاسی جدوجہد کو معاشی جدوجہد سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ معاشی قوتوں ہی سے سیاسی اور سماجی ڈھانچوں کی تعمیر ہوتی ہے۔ ہندستان کو برطانیہ نے بنیادی طور پر اپنے معاشی فائدوں ہی کی خاطر تقریباً سو برس تک محکوم بنائے رکھا۔ اور ہندستان میں چھوت چھات کا رواج ذات پات کے جس نظام کا نتیجہ ہے وہ معاشی اغراض ہی کے تحت قائم ہوا تھا۔ ان اغراض نے آگے چل کر استحصال کی شکل اختیار کر لی اور یہ کوئی اتفاقی بات نہیں تھی کہ حکومت کے خلاف سیاسی جدوجہد میں بدیسی مال کے بائی کاٹ کو ایک حربے کی طرح استعمال کیا گیا۔ اس جدوجہد کے دوران ہی معاشی اور سماجی استحصال کے خلاف جدوجہد کی طرح بھی پڑ گئی تھی۔ جن لوگوں کو اچھوت سمجھا جاتا تھا ان کو گاندھی جی نے ہریجن یعنی خدا کے خاص بندے کہا۔ اور آزادی کی جدوجہد کرنے والی قومی جماعت نے اپنے کراچی کے اجلاس منعقدہ ۱۹۳۱ء میں کلیدی صنعتوں کے قومی ملکیت اور کنٹرول میں رکھے جانے پر زور دیا۔ یہ سوشلزم تو نہیں پھر بھی اس کا ایک بنیادی اصول ہے اور ہندستان کی منصوبہ بندی — جس کی ابتدا آزادی سے پہلے قومی منصوبہ بندی کمیٹی کے ذریعے ہو چکی تھی آزادی کے بعد اسی اصول پر عمل کیا جا رہا ہے۔

[redacted] جمہوریہ ہند کے دستور کی تمہید اور اس کے ہدایتی اصول میں سوشلزم کا نام لیے بغیر سوشلسٹ مقاصد شامل کر لیے گئے تھے۔ انہی دنوں چین میں انقلاب ہوا تھا۔ یہ سرخ انقلاب خون خرابے کی وجہ سے بہت زیادہ سرخ ہو گیا تھا اور اسی وجہ سے چینی سوشلزم کی تعمیر میں بھی تشدد اور جبر کا عنصر نمایاں رہا۔ ہندستان نے اپنے مختلف مسلک کی بنا پر اس سے مختلف راستہ اختیار کیا اور چونکہ چین والے انقلاب کی کئی مثالیں دنیا کی تاریخ میں موجود تھیں جن سے چینی لیڈروں کو مدد ملی ہندستان میں جس طرز کا انقلاب آزادی کی شکل میں آ چکا تھا اور منصوبہ بندی کی شکل میں آ رہا تھا اس کی کوئی سابقہ مثال نہیں تھی۔ ایشیا کے نو آزاد اور نظریاتی اعتبار سے نا وابستہ ملک ان دونوں انقلابوں کی طرف دیکھ رہے تھے اور اس طرح ہندستان ایک آزمائش اور ایک مقابلے سے دوچار ہو گیا۔ چین بعض معاملوں میں ہندستان سے آگے نکل گیا ہے مگر انسانی جانوں کے نقصان، فرد کی آزادی کے خاتمے، گھریلو زندگی کے انتشار اور جمہوریت کی بربادی کی شکل میں اسے بہت مہنگے دام ادا کرنے پڑے ہیں۔ نو آزاد چین کی نسبت نو آزاد ہندستان کی حالت زیادہ خستہ اور وسائل نیز بیرونی امداد کے ذرائع بہت محدود تھے ——— اور جمہوری قدروں کی پابندی اس پر مستزاد۔ پھر بھی ہندستان میں سوشلزم کی گاڑی آگے بڑھی ہے۔ دنیا میں اس کا اعتراف کیا گیا ہے اور اگر مجموعی طور سے دیکھا جائے تو ہندستان کی پیش رفت ناکافی ہونے کے باوجود ناقابل لحاظ اور کسی شرمندگی کا باعث نہیں ہے۔

[redacted] جواہر لال جی نے کہا تھا کہ "ہم سوشلسٹ نمونے کا سماج اپنے طریقے سے تعمیر کریں گے۔ یہ پرامن طریقہ، امداد باہمی کا طریقہ اور ایسا طریقہ ہو گا جس میں ہمیشہ عوام کو اور ان لوگوں کو بھی، جن کے دلوں میں اس طریقے کے متعلق اندیشے یا عداوت ہے، ساتھ لے چلنے کی کوشش کی جاتی ہے۔" سوشلزم کے متعلق ان کا تصور یہ تھا کہ "ملک کے ہر فرد کو ترقی کے مساوی مواقع ملیں۔" سرمایہ دارانہ نظام میں ایسا ممکن نہیں ہے، کیونکہ اس نظام میں معاشی طاقت چند افراد کے ہاتھ میں مرکوز ہو جاتی ہے اور وہ اس طاقت کو اپنے نجی فائدے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اس نظام کے حامی جب فرد کی آزادی کی دہائی دیتے ہیں تو دراصل وہ استحصال کی آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس استحصال کی ایک صورت یہ ہے کہ بڑے پیمانے کی صنعتوں اور تجارتوں میں بڑے سرمایہ داروں کی اجارہ داری قائم ہو جائے اور ایسی صنعتیں اور تجارتیں چھوٹے پیمانے کی اور گھریلو صنعتوں اور تجارتوں پر حاوی ہو جائیں۔ ایسی صورت میں پیداوار کے بیشتر ذرائع پر چند افراد کا قبضہ ہو جاتا ہے اور وہ پیداواری نظام میں اپنے نجی منافع کو اولیت دیتے ہیں۔ اس طرح دولت کما کر وہ سیاسی اور سماجی میدانوں میں اپنا غلبہ قائم کر لیتے ہیں۔ ملک و قوم پر ان کی گرفت مستحکم ہو جاتی ہے اور نابرابری برابر بڑھتی جاتی ہے۔

[redacted] ہندستان جب آزاد ہوا ہے تب یہاں اسی قسم کے حالات پائے جاتے تھے۔ بدیسی راج کی سرپرستی میں سرمایہ دارانہ نظام کا تجربہ

بہت گہرائی تک پہنچ چکی تھیں اور دور دور تک پھیل گئی تھیں۔ ان کو ایکدم سے کھینچ کر اکھاڑ پھینکنا نہ صرف یہ کہ بے حد دشوار تھا بلکہ اس طرح چاروں طرف کی زمین بھی اتھل پتھل ہو جاتی۔ اور ملک اس وقت جن دوسری دشواریوں اور پریشانیوں سے دوچار تھا ان پر قابو پانا ناممکن ہو جاتا۔ پھر بھی حالات کو جوں کا توں نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ ان کو بدلنے کے لیے تدریجی طریقہ اختیار کیا گیا۔ اسی کو "ملی جلی معیشت" کہا گیا ہے جس میں ایک طرف صنعت و تجارت اور ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت کو برقرار رکھا گیا اور دوسری طرف قومی ملکیت اور سرکاری کنٹرول میں رفتہ رفتہ توسیع کی جانے لگی۔

آزادی کے بعد 'قومیانے' کی کارروائی امپیریل بنک سے شروع ہوئی اس لیے نہیں کہ اس کا نام 'امپیریل' یا شاہی تھا بلکہ اس لیے کہ اس کی شاخیں سب سے زیادہ تھیں۔ اس کو قومیانے کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ ملک کے مختلف حصوں میں پھیلی ہوئی چھوٹے پیمانے کی اور گھریلو صنعتوں کو امداد دی جائے اور سرکار کے ایک اہم سوتے کو محض یا زیادہ تر بڑے سرمایہ داروں کے لیے مخصوص رہنے سے روکا جائے۔ یہی مقصد زندگی کے بیمے کے کاروبار کو قومی ملکیت میں لینے کا بھی تھا۔ لیکن ان دونوں اقدامات کی حیثیت ابتدائی اور علامتی تھی۔ ان سے اسی قسم کے دوسرے اقدامات کے لیے راستہ ہموار ہوا مگر ان دوسرے اقدامات سے پہلے ان کی مزاحمت کی تیاریاں بھی شروع ہو گئیں۔ ۱۴ بڑے بنکوں کو قومی ملکیت میں لینے کی کارروائی اگرچہ ایک ہی جست میں کر لی گئی مگر اس میں تقریباً اتنے ہی سال لگ گئے جتنی ضروری یہ کارروائی تھی کم و بیش اتنی ہی ضرورت عام بیمے (جنرل انشورنس) کے کاروبار کو قومیانے کی بھی تھی۔ سرمایہ فراہم کرنے والے ان اداروں کے قومی ملکیت میں آجانے کے بعد ان کی طرف سے سرمایے کی فراہمی میں قوم کے وسیع تر مفاد اور سماجی انصاف کے تقاضوں کو اولیت ملنا ممکن اور آسان ہو گیا۔ اب قصبوں اور دیہاتوں میں کثرت سے بنکوں کی شاخیں کھل گئی ہیں اور ایسے لوگوں کو بھی بنک سے قرض ملنے لگا ہے جن کے پاس کوئی پونجی نہیں ہے یہاں تک کہ بہت سے لوگ جو پہلے کرایے کے رکشا چلاتے تھے اب بنک سے قرض لے کر اپنے رکشا چلانے لگے ہیں اور چھوٹی چھوٹی قسطوں میں قرض ادا کرتے جا رہے ہیں ہیڈلوم اور پاور لوم رکھنے والے بھی بنک سے قرض چاہتے ہیں ان کا مطالبہ حکومت نے تسلیم کر لیا ہے اور اگرچہ ابھی تھوڑے ہی بنکروں کو قرض مل سکا ہے مگر جو سلسلہ شروع ہو گیا ہے وہ بند ہونے والا نہیں ہے۔ اس لیے کہ اس کا تعلق ڈھانچے کی تبدیلی سے ہے۔

[redacted] جس طرح امپیریل بنک کا اسٹیٹ بنک بنا دیا جانا ایک علامتی اقدام تھا اسی طرح سابق والیان ریاست کے صرف خاص اور خصوصی مراعات کا ختم کیا جانا بھی اتنا سرکاری پیسہ بچانے کے لیے نہیں تھا جتنا کہ سماجی انصاف اور مساوات کے لیے فضا تیار کرنے کے لیے۔ سوشلسٹ ڈھانچے میں یہ مراعات بے جوڑ ہیں اور جب ایک بار یہ فیصلہ ہو گیا اور عوام نے اس کی توثیق کر دی کہ ہندستانی سماج سوشلسٹ ڈھنگ کا ہو گا تو اس کی راہ میں جو بھی رکاوٹیں آئیں انھیں دور کرنا ہو گا۔ ایک رکاوٹ سپریم کورٹ کے ایک اکثریتی فیصلے سے پڑی تھی جس نے دستور میں مندرج بنیادی حقوق سے متعلق دفعات میں ترمیم کے حق سے پارلیمنٹ کو محروم کر دیا تھا۔ یہ حق بعض سابقہ فیصلوں میں یہی عدالت تسلیم کر چکی تھی۔ مگر 'گولک ناتھ مقدمے' کے فیصلے کے بعد پارلیمنٹ کے ترمیمی حق کی بحالی کے لیے دستور میں ترمیم ضروری ہو گئی تھی۔ ایسی ترمیم پارلیمنٹ نے منظور کر لی ہے اور واضح کر دیا ہے کہ کوئی ایسا قانون جو دستور کے ہدایتی اصولوں پر عمل درآمد کے لیے پاس کیا گیا ہے اس بنا پر رد نہیں کیا جا سکے گا کہ اس سے کسی بنیادی حق کی خلاف ورزی ہوتی ہے۔ مگر اب ترمیمی ایکٹ کو بھی سپریم کورٹ میں چیلنج کیا گیا ہے اور اسی عدالت میں دو ترمیموں کا معاملہ بھی زیر سماعت ہے۔ ان میں سے ایک صرف خاص کے خاتمے سے متعلق ہے اور دوسری میں بحق سرکار حاصل کی جانے والی جائداد کے عوض دی جانے والی چیز کو "معاوضے" کے بجائے "رقم" کہا گیا ہے تاکہ "معاوضے" کا جھگڑا اٹھا کر قومیانے کی کارروائی کو روکا نہ جا سکے۔

[redacted] نابرابری میں کوئی بڑی کمی اور دولت کی منصفانہ تقسیم ایسی کارروائی کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ملک میں ابھی 'ملی جلی معیشت' کے تصور کو ترک نہیں کیا گیا ہے اور نہ مستقبل قریب میں اس کا کوئی امکان ہے مگر دوسرے بنیادی تصورات اور نظریات کی طرح یہ تصور بھی مطلق نہیں ہے اور حالات کی مناسبت سے بدلتا رہے گا۔ یہ تبدیلی بعض بڑی صنعتوں کے قومی ملکیت میں لے لیے جانے کے علاوہ درآمدی و برآمدی تجارت اور غلے کی تھوک تجارت کے سرکاری

انتظام میں نے لیے جانے میں جھلکتی ہے۔ بڑھتی ہوئی نابرابری اور گرانی سے عوام کو جو پریشانیاں لاحق ہیں انہوں نے ان اقدامات کو ناگزیر بنا دیا ہے۔ جو لوگ اب نجی زمرے کو اولیت دیتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ قومی زمرہ نجی زمرے کا مددگار بلکہ اس کا تابع رہے۔ یہ تاویل سوشلزم کے اصول اور منصوبے کی روح اور عوام کی صلاح و بہبود کے خلاف ہے۔ اور قومی زمرے کے عادی ہونے کی جو بات شروع ہی سے کہی جاتی رہی ہے وہ قومی مفاد کے مطابق ہے۔ نجی زمرے کی طرح قومی زمرے کے اداروں میں بھی بعض خامیاں ہیں لیکن یہ خامیاں عمل کی ہیں اصول کی نہیں اور عمل کی خامیوں کی گرفت اور اصلاح قومی زمرے میں جتنی آسان ہے اتنی نجی زمرے میں نہیں ہے۔ نجی زمرے کو ابھی تک جو امداد ملتی رہی ہے اس کا زیادہ تر فائدہ چند لوگوں کو ملا ہے۔ اس فائدے میں عوام کو شریک کرنا ضروری ہے اس لیے کہ حکومت یہ امداد عوام ہی سے وصول کیے جانے والے ٹیکسوں کی آمدنی سے دیتی ہے۔ فائدے میں عوام کی شرکت کی ضمانت انتظام میں حکومت کی شرکت سے مل سکتی ہے۔ اس لیے کہ جمہوریت میں حکومت عوام ہی کے ووٹوں سے بنتی ہے۔

[redacted] جمہوری سوشلزم جو ہندستان کی حکومت ہے سست رفتار ہونے کے باوجود اندر وسیع امکانات رکھتا ہے اس لیے کہ اس کی تعمیر عوام کے رضاکارانہ تعاون سے ہوگی اس پر نکتہ چینی ہونے رہنے سے اس کے ڈکٹیٹرشپ بن جانے کا امکان ختم ہو جائے گا اور اس میں کٹرپن نہیں آنے پائے گا۔ چونکہ سب لوگوں کو متبادل سماجی اور معاشی نظام عوام کے سامنے پیش کرنے کی آزادی حاصل رہے گی اس لیے سوشلزم پر عقیدہ رکھنے والوں کو لگاتار اس بات کی فکر رہے گی کہ وہ اسے عوام کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بنائیں۔ جمہوری سوشلزم میں جہاں ایک طرف فائدوں کے یہ امکانات ہیں وہاں دوسری طرف اس بات کا خطرہ بھی ہے کہ جمہوریت کی آڑ اتنے زور سے اٹھائی جائے کہ سوشلزم کا سر دب جائے سوشلزم کے مخالفوں نے بعض دوسرے ملکوں میں ایسا ہی کیا ہے اور ہندستان کو اگرچہ کسی ملک کی اندھی تقلید نہیں کرنا ہے مگر وہ دوسرے ملکوں کے حالات اور واقعات کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتا اور ان کی کامیابیوں اور ناکامیوں سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔





نغمۂ آزادی

عزیز بسملوی ✶ ✶

ہے رہبرانِ وطن کو سلامِ آزادی   انھیں سے ہم کو ملا ہے پیامِ آزادی
وہی جنھوں نے بہایا قدم قدم پہ لہو   انھیں کے نام سے روشن ہے نامِ آزادی
تمھیں سے پھونکی ہے ہر ایک دل میں روحِ عمل   شہید و تم ہو حیاتِ دوامِ آزادی
ہمارے ظرف کا اب امتحان ہوتا ہے   چھلکنے پائے نہ ہاتھوں سے جامِ آزادی
روش روش پہ سبھی ساکنانِ گلشن کو   سنا رہے ہیں گل تر یہ پیامِ آزادی
شفق فلک پہ گلستاں میں گل یہ کہتے ہیں   ہمارے دم سے ہے رنگِ دوامِ آزادی
چمن میں جذبۂ عیش و خوشی کو عام کرو   فسردہ دل کو سناؤ پیامِ آزادی
رہے نہ زاہد و بادہ گسار کی تفریق   ہر ایک لب پہ نظر آئے جامِ آزادی
حیاتِ نو کے ترانوں سے گونج اٹھی دنیا   فضا پہ چھا گیا حسنِ دوامِ آزادی
دیا ہے ہم نے زمانے کو درسِ بیداری   ہمارے نام سے زندہ ہے نامِ آزادی
انھیں وطن کے شہیدوں نے آبرو رکھ لی   انھیں کو کہتی ہے دنیا امامِ آزادی
الجھ رہے ہیں جو آپس میں نظمِ گلشن پر   سمجھ نہ پائے وہ درسِ نظامِ آزادی

عزیزؔ اہلِ وطن کو جگا رہا ہوں میں
ہے میرے شعروں میں روحِ کلامِ آزادی

غزل

★ صبا ابن فیضی

کسے خیالِ زیاں، منچلوں کی بستی میں
بنائے ہم نے تو گھر زلزلوں کی بستی میں

تمھارے شہر میں ہم سے اداشناس کہاں
خریدیں زخم، رسیلے پھلوں کی بستی میں

اداس اداس ملے گیسوؤں کے سائے بھی
کچھ ایسی دھوپ پڑی دل جلوں کی بستی میں

دھواں دھواں نہیں میرا وجود ہی تنہا
ہر ایک شخص ہے گم سانولوں کی بستی میں

یہاں تو سائے بھی دیوار و در سے گریزاں ہیں
چلو قیام کریں، جنگلوں کی بستی میں

دریچے خوابوں کے کھولو ذرا کہ شام ہوئی
شفق اترنے لگی آنچلوں کی بستی میں

زمین چھوڑے قدم تو کسی طرف نکلیں
ملا مکان ہمیں دلدلوں کی بستی میں

سحر کو شعلۂ نم خوردہ ہو کے اُٹھے ہم
وہ برف رات گری ولولوں کی بستی میں

کہیں لہو کی صلیبیں نہ آگ کی زنجیر
بجھا بجھا سا ہوں کم حوصلوں کی بستی میں

وہ لمحے ہائے جو اپنی تلاش میں بیتے
گزار آیا ہوں صدیاں پلوں کی بستی میں

جلا کے شمعِ بصیرت دھواں دھواں ہوئے لوگ
کبھی یہ دھند نہ تھی مشعلوں کی بستی میں

مثالِ آئنہ بے داغ رہنا مشکل تھا
کہ عمر اپنی کٹی کاجلوں کی بستی میں

ہمیں پہ پھینکے گئے سنگِ احتساب بہت
اکیلے ہم ہی بُرے تھے بھلوں کی بستی میں

اے نجدِ لکھنؤ! وہ بوریانشین تھا کون
جو سنگسار ہوا مخملوں کی بستی میں

نہیں تھی پرورشِ زہرِ آگہی آساں
میں سانپ بن کے رہا صندلوں کی بستی میں

تجھے ملیں گے کہاں اے شعورِ آوارہ
ہم ایسے اہلِ نظر پاگلوں کی بستی میں

فضا کو آس بھی کیا کیا نہ دوستوں سے مگر
یہ کھیت سوکھ گیا بادلوں کی بستی میں

ہندستانی مصوّری — اور قومی یکجہتی

عرش ملسیانی

ہندستانی مصوّری کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اس کے متعدد دور ہیں۔ قدیم فن مصوّری، مغل آرٹ، راجپوت یا راجستھانی مصوّری پہاڑی اسکول جس میں کانگڑہ، بسولی اور گڑھوال کے تینوں مکتبہ ہائے مصوّری آجاتے ہیں کشمیری اور دکنی مصوّری کے الگ الگ انداز اور دور ہیں۔ عوامی رقص اور لوک گیت کی طرح عوامی مصوری کا بھی جداگانہ مقام ہے۔ ان سب کا دور ارتقا اور ان کا انحطاط بھی مطالعہ طلب ہے۔ آخر میں جدید فن مصوری کا زمانہ آتا ہے۔ ہم دیکھیں گے کہ اس فن لطیف میں بھی ہندستان کے گوشے گوشے میں اس کے عوام نے ایک مشترک حصّہ لیا ہے اور یک جہتی کا ثبوت دے کر ہمہ رنگی میں یک رنگی کا ثبوت دیا یعنی اثر قبول کرنے میں ایک دور نے دوسرے دور کی پیروی سے گریز نہیں کیا

وادئ سندھ کی تہذیب موہن جوداڑو اور ہڑپا کے مقامات پر جو پانچ ہزار سے لے کر ۲۲۵۰ قبل مسیح کا ہے۔ ان مقامات کی کھدائی میں بے شمار مہریں دستیاب ہوئی ہیں جو تجارتی سامان پر لگانے کے لیے بنائی جاتی تھیں ان پر سانڈ اور دوسرے جانوروں کی تصویریں بنی ہیں لیکن ان کو چھوڑ کر برتنوں کے بے تعداد ٹکڑے ملے ہیں ان پر جا بجا نظر آتے ہیں جن سے مصوّری کا خوش آئند تصوّر اور ڈیزائن کا کمال ظاہر ہوتا ہے جیسے جالی، ہرن، بکری، گیدڑ، اور شیر کے علاوہ پتّوں، درختوں، پرندوں اور بعض اوقات موروں کو ظاہر کرتے ہیں۔

ویدوں میں تصویر کشی کے بہت سے اشارے ملتے ہیں۔ رگ وید میں چمڑے کی بنی ہوئی اگنی دیو کی تصویر کا ذکر موجود ہے۔ مہابھارت میں اوشا اور اس کی سہیلی چترلیکھا کا ذکر پایا جاتا ہے جس میں اوشا ایک خواب دیکھ کر کسی نوجوان راجکمار پر فریفتہ ہو جاتی ہے۔ چترلیکھا نے اسے بہت سے راجکماروں کی تصویریں کھینچ کر دکھائیں۔ اوشا کی نظر کرشن جی کے پوتے انیرودھ پر پڑی اور اس نے اسے پہچان لیا۔ پرانوں میں بھی اسی طرح تصویر کشی کا ذکر آتا ہے۔ پانینی نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ایک جاپانی دنیا نے تو بات ہی صاف کر دی ہے اس میں ویدک رشیوں کی تصویریں ہیں۔ وسشٹ کی اور اگستیہ رشی کی تصویر ہے اور اتریہ رشی کی تصویر اس کی اہلیہ کے ساتھ ہے۔ وسشٹ کی تصویریں ہیں۔ ایک میں وہ بیٹھا ہے اور ایک میں چل رہا ہے۔ بعد کے زمانے میں جوکس اور شلپ شاستر میں تصویر کشی پر دو مستند کتابیں لکھی گئی ہیں۔ واتسائن کے کام سوتر میں مصوری کے اجزا کا مکمل ذکر ہے۔

اس کے بعد بدھ مت کے دور کی مصوری کا ذکر ضروری ہے۔ بدھ بھکشو جب دوسرے ملکوں میں جاتے تو بدھ کے پہلے جنم کے قصے تصویری شکل میں لے جا کر لوگوں کو دکھاتے اور انھیں متاثر کرتے ان کے پاس اس کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ ہندستانی مصوری کا اثر جاپانی اور چینی مصوری پر بھی پڑا۔ روایت ہے کہ گوتم بدھ کے ہم عصر راجا بمبسار کے ایک درباری مصور نے بدھ کی پہلے پہل تصویر بنائی۔ سندھ کے ایک راجا کے تحائف کے بدلے میں کپڑے پر بنی ہوئی یہ تصویر بمبسار نے سندھی راجا کو بھیجی۔ یہ خاص طور پر بدھ کی ہدایت کے بموجب تیار کی گئی تھی اور اس میں بڑی ہنرمندی سے رنگ بھرے گئے تھے۔ تصویر سے سونے کی طرح کرنیں پھوٹتی تھیں اور ان پر بدھ دھرم کے اصول بھی لکھے ہوئے تھے۔ راجا اس تصویر کو پا کر بہت

خوش ہوا اور اس نے اس کی بڑی دھوم دھام سے تاج پوشی کی۔

اجنتا اور باگھ کے غاروں میں کوئی تصویر ایسی نہیں جس میں شہوانی عنصر ہو۔ البتہ اس دور کے معاشرے اور زندگی کی جھلکیاں ضرور ملتی ہیں بھکشوؤں کو ایسے غاروں میں جانے سے منع کیا گیا تھا جہاں تصویروں میں شہوانیت کا عنصر ہو۔

سنگ تراشی اور مصوری کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور اس کے مظہر ہمارے منقش غار ہیں جن میں اجنتا اور باگھ کے غاروں کا ذکر تو آہی چکا ہے ان کے علاوہ اور بھی بے شمار گپھائیں ہیں غار ہیں مثلاً ایلورا، کنہیری، دیدسا، بری، احسار، ایلیفنٹا۔ ایسی جادو کی ڈبیاں ہیں کہ انھیں کھولو تو ہیرے اور جواہر نکلیں گے۔ نقاشی اور سنگ تراشی کے جو خزانے ان میں جمع ہیں وہ کہیں نہیں۔ یہ فن ہندستان کی تہذیبی صورت حال کی آئینہ داری کرتا ہے یہاں کے لباس، رہن سہن، عورتوں کے چہروں کے اتار چڑھاؤ، جانوروں کی اچھل کود، پرندوں کا چہکنا، دریائی طوفانوں میں مچھلی کا رقص، عوامی اور قومی رقص کس چیز کو ظاہر نہیں کرتا۔ اجنتا نقاشی کا سب سے بڑا بھنڈار ہے۔

اجنتا کی تصویریں تو ہمارا لازوال مذہبی ورثہ ہے اٹالیہ میں فلورنس اور روم میں کے مشہور زمانہ نقاشوں نے بھی فن کے کمال کو عروج پر پہنچا دیا تھا۔ ہمارے یہاں بھی سانچی اور بھارہٹ میں فن کے محیر العقل مظاہرے ہوئے۔ لیکن اجنتا کے ماہروں نے تو اس جیتی جاگتی دنیا کی باتیں کیں انھوں نے تو کسی محیر العقل بات کو ہاتھ نہیں لگایا۔ ان کی ہر بات میں روزمرہ کی زندگی ہے۔ خواہ وہ مذہبی تقدس کی بات ہو خواہ دوسری۔ مبصرین ایک تصویر کا تو خاص طور پر ذکر کرتے ہیں جس کی رانی دم مرگ لیٹی ہوئی ہے اور زمانہ دار اس پر ہاتھ رکھے بیٹھے ہیں۔ سارے ماحول کا منظر اتنا غم ناک اور قدرتی طور پر تاسف انگیز بنایا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ عوام، اعزہ اور دوسرے جو مرد عورت جمع ہیں دل تھامے ہوئے اپنے چہروں پر غم کی کیفیت لیے ہوئے ہیں۔ کوئی دعا میں مصروف ہے اور کوئی پکار رہا ہے۔ الغرض یہ مرقع بے مثال ہے انسانی جذبات کا اظہار اس سے بہتر دنیا کی کسی تصویر میں نظر نہیں آتا یہیں سے ہماری قومی یک جہتی کی ابتدا ہوئی۔ ہر شخص، خواہ کسی نقطۂ نظر کا مالک ہو ان تصویروں میں جامد و ساکت یا متحرک کنال

موجود ہے۔ جانوروں اور پرندوں کی کائنات موجود ہے۔ ایک اختلاط ہے کہ جس کی قدرتی ابتدا ہوئی ایک معاشرہ ہے کہ جس کا نقشہ کھینچا گیا۔ بدھ، جین، آسک، ناستک کسی کی تمیز نہیں تھی۔ زندگی کا عکس جیسا کہ ذکر آچکا ہے ہزار رنگوں سے ہے پوجا ہے تماشا ہے اور ان کے نیچے اجتماع ہیں، پن گھٹ، کنوئیں، تالاب، بالوں کا سنوارنا، آئینہ، الغرض کیا کچھ نہیں اجنتا کا نقاش اس بات سے باخبر تھا کہ ہندستان کے قرب و جوار اور دور دراز کے ملکوں میں نقاشی نے کیا رنگ اختیار کیا ہے خیال آتا ہے کہ کیا اس نے یہ سب کچھ ریاضت کی تعلیم اور گیان دھیان کے لیے کیا تھا یا وہ تقدیس اور سیکولر عناصر کو ہم بغل کرنا چاہتا تھا۔ غالباً اس کے دونوں مقصد تھے اور دونوں عرفانی بھی ہیں اور ارفع بھی۔

دسویں گیارہویں صدی تک مصوری اپنے اس چلن پر چلتی رہی گو اس کے عروج و زوال کے دور بھی آتے رہے لیکن مسلمانوں کے آنے کے بعد ایرانی اثرات بھی ہمارے فنون لطیفہ میں داخل ہونے شروع ہو گئے۔ مالوے میں شادی آباد مانڈو، اتر پردیش میں جونپور جہاں کے شرقی خاندان موسیقی کے پرستار اور فن کار تھے، گجرات میں احمد آباد یہ سب ادبی اور تہذیبی مراکز تھے۔ اس زمانے میں خواص اور عوام کے لیے مصوری نے کچھ قابل قدر کوششیں کیں نعمت نامہ اور نورچند تو خواص کے سلسلے کی مثالیں ہیں۔ عوامی سلسلے میں بڑا یک جہتی کا کام ہوا۔ جین پستکوں کی نقاشی کے علاوہ مہابھارت، رامائن، گیت گووند اور دوسرے عشقیہ افسانے اور کچھ فارسی کی کلاسیکی کتابوں کے منقش و مصور نسخے تیار ہوئے۔

بابر بڑا صاحب ذوق بادشاہ تھا لیکن اسے ہندستان میں آئے کل چار سال ہوئے تھے کہ اس نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ ہمایوں کو شیر شاہ نے مار بھگایا اس کی شکست مصوری کے لیے ایک طرح سے آیۂ رحمت ہوئی۔ شیر شاہ کی مدت کے بعد ہمایوں شاہ عباس صفوی کی مدد سے ہندستان پر پھر فتح یاب ہو گیا۔ ہمایوں پہلے کئی سال کابل میں رہا اکبر اس کے ساتھ تھا۔ ہمایوں ایران کے دو مشہور مصوروں کو ساتھ لے آیا تھا جن کے نام ہیں میر سید علی اور عبدالصمد اکبر ان سے ملتا رہا اور یہ عمل مصوری کے لیے ہندستان میں فال نیک تھی۔

بابر فنونِ لطیفہ کا بڑا قدر شناس تھا مصوری میں اس نے بہزاد کی بہت تعریف کی ہے میر سید علی اور اس کا باپ تصور بہزاد ہی کے شاگرد تھے عبدالصمد شیریں قلم کے نام سے مشہور ہے میر سید علی اور عبدالصمد نے ایک چاول پر چوگان بازی کا نقشہ دکھایا تھا۔ اکبر نے ان کے ذمے حمزہ نامہ کو مصور کرنے کا کام سپرد کیا تھا اس میں ۱۳۷۵ تصویریں ہیں اور ان کی تکمیل میں ایرانی اور ہندوستانی دونوں قلم استعمال ہوئے ہیں۔ بخارا، مشہد اور شیراز کا اثر تو ان تصویروں میں قطعی طور پر ظاہر ہے لیکن مصوروں نے کشمیر اور میپال کے عناصر داخل کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ ان دو استادوں کے علاوہ قریب قریب پچاس اور مصور اس کام پر مامور تھے طوطی نامہ کی تصویریں جو ۱۵۶۶ء میں مکمل ہوئیں اس ایرانی اور ہندوستانی مصوری کے امتزاج کو ظاہر کرتی ہیں۔ اکبر چھوٹی چھوٹی تصویروں کا بڑا عاشق تھا۔ اس نے ۱۵۸۸ء میں دیوانِ انوری کا ایک مصور نسخہ تیار کروایا جو نہایت ہی نفیس اور باریک کام ہے اور جس پر جانوروں، پرندوں اور پھولوں کی سنہری تصویریں ہیں مصور اکبر نامہ بھی تیار ہوا تھا بہت سے مصوروں نے اس میں کمال دکھایا ہے۔ لیکن جہاں جہاں اکبر کی زندگی کا کوئی ڈرامائی واقعہ مصور کیا گیا ہے وہ بے مثال بھی ہے اور ایسی تصویروں میں صنعت کی یکسانیت بھی ملتی ہے۔ اکبر کو ہندو مذہب سے بڑی ہمدردی اور محبت تھی۔ اس لیے اس نے مہابھارت، رامائن اور ھری ونش کا فارسی ترجمہ کروایا اور ان میں بہت ہی انمول تصویریں ہوئیں ان سے ان رزم ناموں کی شان ہی نہیں دوبالا ہوئی بلکہ معاصرانہ رسم و رواج کا بھی پتہ چلتا ہے اکبر کے دور میں مصوری کا یہ امتزاج ایسے کمال کو پہنچ گیا۔ ابوالفضل نے آئینِ اکبری میں بہت سے مصوروں کے نام درج کئے ہیں جو حسب ذیل ہیں:

میر سید علی خواجہ عبدالصمد، فرخ قلم، مسکین، دسونت، بساون، کیشو لال، مکند، جگن ناتھ، مادھو، مہیش، کھیم کرن، تارا، سانولا، ہری ونش اور رام

دسونت عبدالصمد کے عزیز شاگردوں میں سے تھا وہ شاہی ٹکسال کا مہتمم بھی رہا تھا۔ بساون کے بارے میں ابوالفضل نے لکھا ہے کہ طراحی، چہرہ کشائی اور ماسد نگاری میں بے مثل ہے۔

کتابوں کی تزئین کاری بھی ہوئی۔ بابر نامہ کو بھیم، مسعود، مسکین اور بساون نے مزین کیا۔ اسی طرح تذکرہ نامہ، تیمور نامہ، بہارستان اور خمسۂ نظامی کی تزئین کاری بھی ہوئی جس پر ہندو اور مسلمان مصور مامور تھے۔

پھر مختصر شبیہ سازی کا دور چلا۔ اکبر نے اپنے امرا کی شبیہیں تیار کروائیں۔ امرا کو زریں لباس اور طلائی ہار پہنے ہوئے خوبصورت گھوڑوں پر سوار دکھایا گیا ہے۔ ایک تصویر میں فیضی اور تان سین کو اکٹھا دکھایا گیا ہے۔

جہانگیر کے زمانے کی تصویروں میں عورتوں کے حسین چہروں اور جام و مینا کی جلوہ گری زیادہ ہے۔ مختصر شبیہ سازی اور تزئین کاری کو بھی فروغ ملا منصور نے جانوروں کی بے مثل تصویریں بنائیں جہانگیر نے اسے نادر العصر کا خطاب دیا تھا۔ دریاؤں کے مناظر گھنگھور گھٹائیں اور پس منظر میں کنول کے پھولوں کی افراط نے ہندوستانی اثرات کی فراوانی کو ظاہر کیا۔ بشن داس اس زمانے میں شبیہ سازی میں یکتا مصور تھا جہانگیر کے زمانے میں مصوری میں یک جہتی اور ہمہ گیری نے عروج پایا راجپوت امرا اور دولت مند تاجروں نے مصوروں کو ملازم رکھنا شروع کر دیا اس سے کم سے کم فن کی سرپرستی تو ہوئی اس طرح مغل فن مصوری میں راجستھانی عناصر داخل ہونا شروع ہو گئے۔

شاہ جہاں کے دور میں تعمیرات پر زیادہ توجہ ہوئی لیکن مصوری میں بھی فقیر اللہ خاں ایسے استاد پیدا ہوئے۔ اس دور کی مصوری میں طلائی کام بہت ہے۔ شاہ جہاں کا بڑا بیٹا دارا شکوہ مصوری کا دلدادہ تھا۔ اس کا ذکر غلام محمد کی مشہور تصنیف تذکرۂ خوش نویساں میں ملتا ہے۔ دارا شکوہ کے مرقع میں ہند ایرانی آرٹ کی چالیس تصویریں ہیں۔ ان کی مکمل تصنیف بکرماجیت حسرت کی انگریزی کتاب دارا شکوہ میں ملتی ہے۔ اورنگ زیب فطرتاً مذہبی آدمی تھا۔ اس کے اجداد نے فنونِ لطیفہ کی جو قدر کی تھی اس نے جلد ہی بند کر دی۔ اس کے بعد صرف محمد شاہ رنگیلا ان فنون کا دلدادہ تھا جو نادر شاہ کی لوٹ کھسوٹ کے بعد اس قدر مجبور و قلاش ہو گیا کہ مرکزی سرپرستی ختم ہو گئی اور فن کا رجحان بائی دارالخلافوں کی طرف

بھاگنے لگے۔ اصل میں یوں کہیے کہ مغل آرٹ جو پہلے ہی مرنے لگا تھا، اب دم توڑنے پر آ گیا۔

راجپوت اسکول سولھویں صدی عیسوی کے آخر سے اٹھارہویں صدی کے آخر تک اپنے نصف النہار پر رہا بلکہ انیسویں صدی کے آغاز میں بھی یہ باقی تھا۔ مصوری کی یہ شاخ راجپوت شاہی خاندانوں کی سرپرستی سے عروج پذیر رہی مثلاً اودے پور، چاوند، چتوڑ، میواڑ، بیکانیر، جے پور، اور جودھ پور۔ اس کے ساتھ ساتھ راجپوتی رزم و بزم کی شاعری بھی تھی۔ یہ راجستھانی جاگیرداروں کے کلچر کے اظہار کا ایک ذریعہ تھی اور اس کا منبع قطعی نہیں تو زیادہ تر ویشنو دھرم کی گاتھائیں تھیں۔ مصوری میں درباروں کا شکوہ، عشق و محبت میں درباری تعوق، گھوڑے کی سواری، شکار، قلعے کا محاصرہ، اور لڑائی کا نقشہ عام تھا۔ اس کی صدائے بازگشت مشرق میں آسام بنگال اور اڑیسہ تک، مغرب میں گجرات اور سوراشٹر تک، شمال میں ہمالہ کے علاقوں میں اور جنوب میں دکن تک پہنچ گئی۔ کیونکہ اس زمانے میں ان علاقوں تک راجپوتی فوجوں اور تجارت نے راہ پیدا کر لی تھی۔

۱۶۰۵ء میں رانا پرتاپ کی سرپرستی میں رنگ مالا سلسلے کی تصاویر تیار ہوئیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان تصاویر کے فن کار 'حمزہ نامہ' جیسے رزمیہ کو مصور کر چکے ہیں لیکن راجپوتی فن یکساں طور پر ترقی پذیر معلوم نہیں ہوتا۔ فن کاری کے اعتبار سے ۱۶۲۸ء کی تصویریں ۱۶۳۴ء کی 'رسک پریہ' کے مقابلے میں بہتر ہیں۔ یوں تو سترہویں صدی میں بڑا کام ہوا لیکن اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں راجستھانی تصویروں کی تخلیق بہت زیادہ ہوئی۔ درباروں کے تفریحی مشاغل اور شکار وغیرہ کے علاوہ راجپوت رجواڑوں کی رقص و سرود کی محفلیں بھی ان تصویروں کا موضوع تھیں۔

رنگ مالا کی تصاویر پوری طرح قدیم جذباتی خصوصیت کی حامل ہیں۔ یہ میواڑ اسکول سے تعلق رکھتی ہیں جس کے عام موضوعات میں بھگوان کرشن کی زندگی کے واقعات، عصری شاعری کا نایک نائکہ بھید، راگ راگنیوں کا رمزیاتی روپ، مختلف موسم اور عشق و محبت شامل ہیں۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں ہاتھیوں، گھوڑوں اور کتوں کی تصاویر بھی ملتی ہیں۔

راجستھان قرونِ وسطیٰ میں سرداروں اور راجاؤں کی بہادری اور شجاعت کا زمانہ تھا۔ راجپوتوں نے میدانِ جنگ میں لڑ مرنا اور گھر پر تکلیف و مصیبت سہنے کے انداز سیکھے تھے۔ اس زندگی کو بھاٹوں کی رزمیہ نظموں اور روز روز کی لڑائیوں نے ایک اونچا عزم اور کردار عطا کیا تھا۔ وہ رام اور کرشن کے مثالی بھگت ہو گئے اور ان کی زندگی سے متعلق لاتعداد واقعات اور کیفیتوں کی تصویر کشی کرنے لگے۔ انھوں نے نایک اور نائکہ کو ہجر و وصال، عشق و محبت اور نہ جانے کس کس روپ میں پیش کیا۔

یہ کہنا غلط ہوگا کہ راجپوتی مصوری خالص ہندستانی رہی اور اس پر مغل آرٹ کا سایہ نہیں پڑا۔ زمانی اعتبار سے دونوں کا زمانہ قریب قریب ایک ہے۔ یہ درست ہے کہ قطعی طور پر ایک نے دوسرے کو تبدیل نہیں کر دیا لیکن دونوں میں مناسبت کے بڑے اجزا ہیں اور دونوں میں لین دین ہوا۔

سترہویں صدی کی راجپوتی مصوری میں بڑا رچاؤ اور آہنگ ہے۔ خاکے بالکل سادہ نہیں اور رنگ گو باگوں کے باوجود بھڑکیلے اور آنکھوں کو برا لگنے والے نہیں۔ ایک سادگی اور متانت کا اجتماع ہے۔ اس مصوری میں جذبات اور شاہانہ پن ہے لیکن پھر بھی تصویری انداز اس میں زیادہ ہے۔

اٹھارہویں صدی میں مغل دربار سے راجپوتوں کی وابستگی اور مغل آرٹ کے آرٹسٹوں سے راجپوت آرٹسٹوں کے میل جول نے یک جہتی کے لیے ایک نیا میدان پیدا کر دیا جس کے آثار بعد میں قطعی طور پر ظاہر ہو گئے۔ میواڑ، مارواڑ، بوندی اور کوٹا، بیکانیر، جیسلمیر، جے پور، کشن گڑھ اور مالوے کے الگ الگ انداز تھے۔ امتدادِ زمانہ سے یہ سب اپنا اپنا کمال دکھا کر زوال پذیر ہو گئے اور آج کل جو کچھ باقی ہے اس میں نہ انداز کا کلیہ سوتر رہا نہ سورن سنگھ اور جگت سنگھ کی مغل تکنیک رہی۔ بس تو درختوں، شیروں اور پہاڑیوں کے گہرے بھورے گلابی اور سبز رنگ رہ گئے ہیں جنھیں سستی مصوری کہنا چاہیے۔ لیکن راجپوت مصوری کی ہندستان کو دین ایک لازوال خزانہ

ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگا اور جس کا نقش بڑا پائدار ہے۔

یہی راجپوتی مصوری بالآخر گھر کرتی ہوئی ہندستان کے پہاڑی علاقوں میں پہنچ گئی جن میں بسوہلی اور کانگڑہ کی وادی کے علاوہ گڑھوال بھی شامل ہے۔ سترہویں صدی میں بسوہلی میں تصویروں کا ایک سیلاب آگیا اور یہ تصویریں میواڑ کی مصوری سے بہت مماثلت رکھتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو اورنگ زیب کے دربار سے موقوف شدہ یا مایوس مصور ادھر چلے گئے یا بسوہلی کے راجہ نے انھیں خود طلب کر لیا۔ بسوہلی جموں کے علاقے میں ایک چھوٹی سی ریاست تھی جو اب وہاں کی ایک تحصیل ہے

پہاڑی علاقے کے عوامی آرٹ اور مغل مصوری کی تکنیک کے امتزاج سے بسوہلی قلم وجود میں آیا اس اسلوب میں چہروں کی بناوٹ مقامی انداز کی ہے۔ مردوں کے لباس مغل انداز کے ہیں جن میں جامہ اور پٹکا بھی شامل ہے۔ اور عورتوں کے لباس میں چولی، ساری اور گھاگھرے کی طرح کا لہنگا ہے۔ اس طرح مقامی اسلوب کی خاصی نشان دہی ملتی ہے۔ بسوہلی کی تصویروں میں ایک خاص توانائی ہے۔ ان میں رس منجری اور گیت گووند کے موضوعات کو بڑی چابک دستی سے ظاہر کیا گیا ہے۔ بسوہلی تصویروں کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں بادل بجلی اور بارش کی واضح تصویر کشی کی گئی ہے۔ بارش کی ہلکی ہلکی بوندیں، بادلوں کے جھنڈ اور دریاؤں کی چکر دار لہروں کی ان تصویروں میں اچھی خاصی منظر کشی ہے۔ جھیلوں کے گرد جنگلوں اور کنول کے پھولوں سے آراستگی کی گئی ہے۔ شروع شروع میں تو ان تصویروں میں برج، گنبدوں والے دروازے جالی دار کھڑکیاں، پتھر کی جالیاں، روغن کیے ہوئے لکڑی کے کھمبے بنائے جاتے تھے یہ سترہویں صدی کی باتیں ہیں ان کا طرز مغل راجستھانی امتزاج والا طرز ہے۔ قالینوں سے سجے ہوئے کمرے، آرام گاہوں میں شراب کی بوتلیں اور سامانِ آرائش و نقش ہوتا تھا جہاں شہزادے معشوقاؤں کے ساتھ رنگ رلیاں مناتے تھے۔ ان تصویروں میں درخت اشارتی حیثیت رکھتے ہیں۔ بجز ان نصف محدود سیدھی جھکی ہوئی شاخوں کے پیچھے کھڑی دکھائی گئی ہے۔ یہ تمام عورت کے جسمانی گداز کی غماری کرتا ہے۔ ان تصویروں میں عورتوں اور مردوں دونوں کو زیوروں اور مالاؤں سے آراستہ دکھایا گیا ہے۔ ڈوگری انداز کا لباس تو خیر مقامی بات ہے، ماہر کے اثرات بھی لباس میں موجود ہیں۔ ایک راجہ کو مغلیہ دور کا گھیردار پاجامہ اور پیچھے کو جھکی ہوئی پگڑی پہنے دکھایا گیا ہے۔ عورتیں چست پاجامے میں نظر آتی ہیں۔ دھاری دار چولی اور ریشم یا ململ کی پشواز ہوتی ہے۔ جموں کے علاقے کی عورتوں کی بڑی بڑی بادامی آنکھیں ان کے جسمانی حسن میں اضافے کا موجب دکھانے میں مصوروں نے کمال کر دیا ہے۔

کانگڑہ کی مصوری کے تین مرکز گلیر، نور پور اور نرا سنگھ پور ہیں۔ اول الذکر دونوں میدانی علاقے میں ہیں۔ گلیر کی مصوری کی روایت بہت پرانی ہے۔ یہاں کے مختلف راجاؤں نے روپ چند، بلرام سنگھ، راج سنگھ اور دلیپ سنگھ کی شبیہیں موجود ہیں۔ راجہ گوردھن چاند کے زمانے میں سب سے زیادہ تصویریں بنائی گئیں مغل اسکول کے امتزاج سے کانگڑہ مصوری نمودار ہوئی۔ نرا سنگھ پور میں راجہ سنسار چند کی سرپرستی میں بہت تصویریں بنائی گئیں۔ یہ زمانہ ۱۷۷۳ء سے ۱۸۲۵ء کا ہے دریائے بیاس کے کنارے عالم پور اور نادون کے راجائی زودھ چند نے بھی مصوری کی بڑی سرپرستی کی حالانکہ اس کا زمانہ سکھوں کے ساتھ جنگ آزمائی کا زمانہ تھا۔

سرپرستوں کے مذاق کے مطابق اس میں تبدیلیاں آتی گئیں بالآخر اس مصوری میں ایک عنائیت آگئی خطوط اسجار اور خوش اسلوبی کے ساتھ کھینچے جانے لگے۔ عورتیں زیادہ دھان پان اور نازک نمائی جانے لگیں ان کی آنکھیں بڑی لانبی اور خمیدہ ہیں۔ گویا یہ حیا کی کرشمہ کاری ہے گہرے رنگ سے رنگی ہوئی انگلیاں بڑی لمبی ہیں اٹھارہویں صدی میں اس اسکول کی پیدائش اور انیسویں صدی میں اس کا دور انحطاط ایک بڑا المیہ ہے۔

کانگڑہ مصوروں کے عام موضوعات یہ ہیں

۱۔ اپنے سرپرستوں کی شبیہیں یا ان کے درباروں کے منظر
۲۔ اورچھا کے مشہور ہندی شاعر کیشو داس کی مشہور نظم "رسک پریہ" کے اشعار کی تصویریں جن میں محبوبہ کے ہجر و وصال کی کیفیات کا چابک دستی سے اظہار کیا گیا ہے۔
۳۔ بارہ ماسہ یعنی بارہ مہینوں کی کیفیات کی شاعرانہ عکاسی اور
۴۔ بنگال کے مشہور جے دیو کی معرکۃ الآرا نظم "گیت گووند" میں

مندرج رادھا کرشن کے محبت بھرے گیتوں کی تصویر کشی۔ اس کے ساتھ ہی بہاری کی ست سئی۔ بھاگوت پران اور مشہور رزم ناموں رامائن اور مہابھارت کے سین کی تصویر کشی بھی۔

اس وادی کے مصوروں کو فطرت سے بڑا لگاؤ تھا۔ دریائے بیاس کی وادی فطرت کے دلآویز مناظر سے بھرپور ہے خم کھاتی ہوئی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں ان کے اوپر شاخیں پھیلائے ہوئے نیم، برگد یا آم کے پیڑ۔ ان کی اوٹ میں چھپے ہوئے پہاڑی کسانوں کے گھر حد نظر تک دُور برفانی چوٹیوں کے منظر، برفانی پانی سے بھری ہوئی جھیلیں، ٹیڑھے میڑھے کھیتوں سے گزرتی ہوئی ندیاں، آبی جانور جن میں سارس یا بگلے بھی امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ سارا مقامی رنگ مغلیہ مصوری کے ساتھ مل کر بنی ہوئی ایک حسین و جمیل مصوری کے شاہکاروں میں نظر آتا ہے۔

قومی یک جہتی کی اس سے بڑی مثال کیا ہوگی کہ اُودھیا (بنگال) اور مدھیہ پردیش کے شاعروں کی رنگین نظموں کو کانگڑہ جیسے دور دراز علاقے میں مصور کیا گیا اور اس مصوری میں مغل ایرانی عناصر بھی ملے ہوئے ہیں۔ یہ تصویریں مسٹر ایم ایس رندھاوا کی کوششوں سے جمع ہوئیں اور وہی انھیں منظر عام پر لائے، ورنہ یہ بیش بہا خزانہ یونہی راجاؤں کی اولاد کے گھروں میں سڑ جاتا۔ ان کے قول کے مطابق یہ عشق و محبت کی نظمیں ہیں جنھیں خطوط اور رنگوں میں بدل دیا گیا ہے۔ ان تصویروں کا آرٹ زندگی اور محبت کا حسن بتاتا ہے اور ان کی پوجا کرتا ہے۔ اس آرٹ میں اداسی نام کو نہیں، نہ کہیں افسردگی ہے نہ کوئی روک ٹوک، محبت کے نیک اور والہانہ جذبے روحانیت سے ہم آغوش ہیں۔

گڑھوال کا بھی الگ پہاڑی اسکول ہے۔ اس کی کھوج مکندی لال صاحب کی ہے جو وہیں کے ممتاز باشندے ہیں۔ ان کے قول کے مطابق گڑھوال اسکول کے بانی دارا شکوہ کے لڑکے سلیمان شکوہ کے ساتھ سری نگر (گڑھوال) پہنچے تھے۔ ان کے نام تھے شام داس اور ہر داس۔ پانچ پشتوں کے بعد اس اسکول کا سب سے بڑا ماہر مولا رام منظر عام پر آیا۔ اس کا زمانہ ۱۷۴۳ء سے ۱۸۳۳ء تک کا ہے۔ ناقدین کا یہ قول برحق ہے کہ گڑھوال اور کانگڑہ کی مصوری میں بہت زیادہ مشترک قدروں کے باوجود یہ الگ الگ اسکول ہیں۔ اصل میں ایک ہی طرح کی فضا، سبزہ و برگ، جھومتی ہوئی شاخیں، درخت، بیلیں، آنکھوں کے سیدھے پوٹے، ارغوانی، بادامی اور بھورے رنگوں کا استعمال دونوں جگہ ملتا ہے۔ کانگڑہ کی وادی کی طرز عنائیت یہاں بھی موجود ہے۔ لیکن یہاں ایک مدہم سی خواب آلودگی اور سنجیدگی ہے اور یہ روایتی پابندیوں سے آزاد ہے۔ یوں کہیے کہ سعدی کی غزل ہے، جبکہ کانگڑہ کی مصوری حافظ کی غزل۔ مولا رام شاعر بھی تھا۔ اس کی رو میں تصویروں کا خود ذکر دل میں کیا جا رہا ہے۔ اس سے پورے گڑھوال اسکول کی روح سمجھ میں آ جائے گی۔

کرشن کی رادھا سے ملاقات : رادھا سنہرا گھاگھرا پہنے ہوئے ہے اور اسی رنگ کی چادر اوڑھے ہوئے ہے جس پر سنہرا کام بنا ہوا ہے۔ اس کے زیورات کی تصویر کشی بڑی دلکش اور نازک انداز کی ہے۔ کرشن ملتجی انداز میں کھڑے ہیں اور سنہری دھوتی میں ملبوس ہیں۔ سر پر مکٹ چمک رہا ہے۔ پھولوں سے لدے درخت لپٹ رہے ہیں۔ پس منظر میں چھوٹے چھوٹے مکان ہیں۔

ابھی ساریکا نایکا : محبوبہ رات کو محبوب سے ملنے جا رہی ہے۔ اڑتا ہوا شفاف گھاگھرا، چولی، دوپٹہ، حسین چہرہ، نازک ہاتھ، انگلیاں، پازیب اور زیورات سب کی تصویر کشی لاجواب ہے۔ اندھیری رات، کالے بادل، چمکتی ہوئی بجلی، یہ سب کیفیتیں مصوری کی جان بن گئی ہیں۔

دوسری نایکا کی تصویر کا نام ہے اتکا ستھیا۔ یہ محبوب کے انتظار میں محبوبہ کی تصویر ہے۔

دم پتی : (ایک جوڑا) میاں بیوی۔ گمان غالب ہے کہ راجہ رانی ہیں۔ مولا رام کا بڑا شاہکار ہے۔ جے دیو ورمن دیو سفید گھوڑے پر سوار محل کی طرف جا رہا ہے۔

پہاڑی اسکول کی ابتدائی تصویروں میں مغل اثرات آسانی سے پہچانے جا سکتے ہیں مگر بعد میں ان کا اپنا مقام اور اپنی روایت ہوگئی تھی۔ افسوس کہ وہ بھی مولا رام کے ساتھ ختم ہوگئی۔

دکنی اسکول کوئی واضح اسکول نہیں لیکن یہاں دو تہذیبوں کا سنگم ہوا جب شمال کے مسلمان بادشاہ دکن میں پہنچے تو اپنے جلو و حشم میں شاعر، مصور اور ہر طرح کے عالم اور فن کار ساتھ لے گئے۔ جب جہانگیر نے عادل شاہ کو شہزادہ خرم کے کہنے پر معاف کر دیا تو عادل شاہ نے جہانگیر سے اس کی تصویر مانگی جو اس نے اس پر ایک رباعی اپنے

ہاتھ سے لکھ کر دی۔
اے سرو تو دائم نظیر رحمت ما   آسودہ نشینی سایۂ دولت ما
سوے تو شبیہ نوشتن کردیم واں   تا معنی آنہ بینی از صورت ما
قلی قطب شاہ کے دیوان میں تصویریں موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس زمانے میں دکنی مصور کیمیاوی رنگ استعمال کرنے لگے تھے۔ سالار جنگ میوزیم حیدرآباد میں ایک سو دکنی تصویریں ایک کتابچہ کرنے میں جمع ہیں۔ لیکن زیادہ تر تصویریں امرا کی ہیں۔ تین بڑی تصویریں مشہور مصور ذکٹ جلیم کی ہیں محاصرۂ قلعۂ اسرار و محاصرۂ گولکنڈہ کی تصویروں میں زیادہ تر دکنی اثرات ہیں۔ ایک تصویر میں راجہ رام سنگھ اپنی محبوبہ سے ملنے کے لیے رسی کے ذریعے چھت پر چڑھ رہا ہے۔ شہزادہ کے شکار اور امرا کے ماہ نقاب کے مجرا سننے کی تصویریں بھی اچھی ہیں۔ ٹیپو اور اسی کے دربار کی تصویریں بھی ہیں۔ اب بات یہ ہے کہ دکنی اسکول تو قدیم زمانے سے قائم ہو چکا تھا جیسا کہ اجنتا کی تصویریں آج بھی اس کی شہادت دے رہی ہیں۔ سنگ تراشی اور مصوری ہم رکاب چلتے تھے اس حساب سے دکن میں یہ دونوں بڑے قدیم زمانے سے عروج پر رہے۔

ہندوستانی فن مصوری جب زوال پذیر ہوئی تو بیسویں صدی کے آغاز میں اس کی نشاۃ ثانیہ بنگال میں ہوئی اور اس کے قائد تھے ایک مائع نظر انگریز جس کا نام تھا ای بی ہیول انھوں نے کہا ہندوستانیو حواسے جو تم کوم حس آرٹ کی تلاش میں موجودہ پیرس اور لندن میں نہیں وہ تمہارے گھر میں ہے تمہارے مندروں تمہاری مسجدوں میں ہے۔ تم سے روٹھ کر روپوش ہو گیا ہے وہ تمہاری عمارتوں تمہارے دیہات اور تمہارے شہروں کی گلیوں میں ہے۔ وہ بڑا عظیم ہے، بڑا حسین و جمیل ہے اپنی روحانیت کو پھر سے اپناؤ"۔ چنانچہ اس آواز کے اثر سے ابنیندر ناتھ ٹیگور اور ان کے درجنوں ساتھی پیدا ہوئے۔ یہ لوگ ایک نیا انقلاب تو لائے لیکن رومانیت میں اتنے کھو گئے کہ مادے کو بھول گئے۔ بڑا کام ہوا۔ گگنیندر ناتھ ٹیگور، نندلال بوس، جیمنی رائے، مکل چندر ڈے اور کتنے اور تھے۔ ان کے ساتھ پنجاب میں ایک اور فن کار ابھرا تھا عبدالرحمٰن چغتائی جس نے دیوانِ غالب کے بعض اشعار کی تصویریں بنائیں اور وہ دیوان جرمنی میں چھپا۔

آخر وہ زمانہ بھی آیا کہ جدیدیت کا شور بلند ہے۔ اس مضمون میں اس کا جائزہ لینا مقصود نہیں لیکن یہ ضرور بتانا ہے کہ اس دور میں مذہب اور ذاتی عقائد سے الگ تھلگ پہلے تجریدیت آئی بعد میں ایکسپریشنزم اور فیوچرزم کا دور دورہ ہوا امرتا شیرگل جو ہندی سکھ ہنگرین والدین کی اولاد تھیں آرٹ کا ترقی پسندانہ اور جدید نظریے کو آئی تھیں انہوں نے یورپ اور ایشیا میں اشتراک پیدا کیا افسوس کہ ان کی عمر نے وفا نہ کی۔ اب تو فن کاروں کا سیلاب آ گیا ہے۔ حسین، اکبر، طیوٹی، سوزا اور ساونت وغیرہ سب اپنے اپنے فن کے ماہر ہیں۔ تجریدی گروہ اب آگے بڑھ گیا ہے۔ اور حقیقت پسندی اس کا شکار ہو گیا ہے۔ جب تک آرٹسٹ تخلیق کے ایک زبردست جذبے کے تحت مہارت کے ساتھ وسعت اور عمق نظر سے ماحول کے عناصر کو ایک دوسرے میں سمو نہ سکے وہ صحیح آرٹسٹ نہیں ہو سکتا اور یہی بات یک جہتی اور ہم آہنگی کی مترادف ہے ہندوستان کی تاریخ کو الٹیے ہر زمانے میں فن کار نے مذہب و ثقافت کے زیر اثر کوئی بھی عوامل ہوں تہذیبی امتزاج میں حصہ لیا ہے مصوری اس میں کسی طرح پیچھے نہ رہی اس میں نہ علاقائی تعصب تھا نہ لسانی عداوت اور نہ مذہبی رکاوٹ۔ یہ ایک ردعمل تھا جو ہوتا رہا اور ہوتا گیا ہندوستانی قومیت کی بنا مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی

مآخذ

۱. آج کل اردو۔ مصوری
2. Panorma of Indian painting
شائع کردہ ملکیتسر ڈودتری
3. Dara Shikoh - by Jit Hasrat
4. Kangra valley Painting
ار ایم۔ ایس رندھاوا
5. Basohli Paintings
ار ایم۔ ایس رندھاوا
6. Magazine March of India
7. The magazine art Bombay
8. آئین اکبری



اے ارضِ وطن

یوسف سرسوی

اے ارضِ وطن ، خُلدِ نظر ، جانِ تمنّا
ہر رنگ میں چاہا ہے دلِ زار نے تجھ کو
ہر حال میں ہم تیرے پرستار رہے ہیں
بدلے ہیں زمانے نے بہت رنگ مگر ہم
وابستۂ گیسوے طرح دار رہے ہیں
اے جان ترے عشق میں سرشار رہے ہیں

تابندہ تجھے دیکھ کے دل شاد ہوے ہیں
آنسو کبھی آنکھوں میں بھرے ہیں تری خاطر
اے بارگۂ گنگ و جمن ، بزمِ ہمالہ
صدیوں سے جیے اور مرے ہیں تری خاطر

اے جلوہ گۂ امن ترا حُسن سلامت
دے دے کے لہو اپنا نکھاریں گے تجھے ہم
قدموں میں بچھائیں گے ترے چاند ستارے
ہر طرح سے ہر طور سنواریں گے تجھے ہم

ہر ذرّۂ خوابیدہ کو بیدار کریں گے
تپتے ہوے صحراؤں کو گلزار کریں گے
عاشق ہیں تو پاسِ نگہِ یار کریں گے
پیکار ضروری ہو تو پیکار کریں گے
ہم زندہ رہیں گے تو تری شان کی خاطر
ہر چیز لٹا دیں گے تری آن کی خاطر

مصحفی کی زبان

نثار احمد فاروقی

ہمارے ایک محترم بزرگ کو اس زمانے کے نقادوں اور محققوں سے یہ شکایت ہے کہ وہ جب تاریخ ادب اردو کے کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو مولانا محمد حسین آزاد مرحوم کو دو چار صلواتیں سُنانا اور ان کی کتاب آبِ حیات کے پائہ استناد کو زیر بحث لانا من جملۂ واجبات تحقیق جانتے ہیں۔ یہ بات اس حد تک صحیح ہے کہ بعض لکھنے والوں نے اپنے محدود اور ناقص مطالعے کی بنا پر بے سر و پا اعتراض کر دیئے اور اس ذمّے داری کو محسوس نہ کیا کہ ایک اتنے مقبول مصنف اور مسلم الثبوت انشا پرداز کی کسی غلطی کا اعلان کرنے سے پہلے یہ بھی اطمینان کر لیا جائے کہ اُن کے حق میں جو دلائل مل سکتے ہیں، وہ بھی تو ہیں یا نہیں۔ لیکن اگر یہ شکایت اس نظر سے ہو کہ آزاد کی شخصیت کے گرد کوئی تقدس کا ہالہ کھنچا ہوا ہے، اور انھیں تنقید سے بلند و بالاتر قرار دے دینا چاہیے، تو تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جن شخصیات کو واقعی ایسا تقدس حاصل بھی رہا ہے انھیں بھی تنقید سے معاف نہیں رکھا گیا۔ یہ تو اس دَور کی بات ہے جب زندگی کے ہر شعبے کو ہدایات اخلاقیات سے ملتی تھیں اور یہ اخلاقیات مذہب کی ساختہ ہوتی تھی۔ آج کی رفتار یہ بتا رہی ہے کہ مذہب اور اخلاق دونوں اپنی گرفت کھو رہے ہیں، اس لیے لامحالہ کل رائج ہونے والے معیار بھی ہمارے قبضے میں نہیں ہوں گے۔ اگر ہم ان اخلاقی معیاروں کی ساکھ باقی رکھنا چاہتے ہیں تو اس کا صرف یہی راستہ ہے کہ ہم اس تنقید کا منصب بھی اپنے ہی اختیار میں رکھیں، اور خود احتسابی کی عادت ڈالیں۔

آزاد کے بعض نقادوں کی یہی کمزوری ہے کہ وہ اعتراض کرنے سے پہلے پوری طرح اطمینان حاصل نہیں کرتے، خواہ مخواہ چٹکی لیتے ہیں، تخیل کے بل بوتے پر نکتہ چینی کرتے ہیں، اور آزاد کو زبان اردو کے معماروں میں جو بلند اور لائق احترام درجہ حاصل ہے اُسے ملحوظ رکھ کر بات نہیں کرتے۔ مگر لطف یہ ہے کہ جن لوگوں کو آزاد سے جو جائز شکایات ہیں، ان کا کہنا یہی ہے کہ یہ ساری کمزوریاں ان مرحوم میں بھی موجود تھیں۔ پچھلی چوتھائی صدی میں آزاد کی کتاب آبِ حیات پر جو اعتراضات ہوئے ہیں، یہاں انھیں دہرانا یا شمار کرنا مقصود نہیں لیکن اس کا آغاز شاید مولانا شبلی نے کیا۔ زمانۂ مابعد میں کسی حد تک حافظ محمود شیرانی نے ان کی کوتاہیوں کی طرف توجہ دلائی اور آج سے چند سال قبل قاضی عبدالودود صاحب نے ایک مبسوط مضمون "آزاد بحیثیت محقق" لکھ کر گویا اس سلسلے کی تکمیل کر دی۔ انفرادی موضوعات پر جن حضرات نے کام کیا، انھوں نے اپنی تحقیقات کے نتائج پیش کرتے ہوئے علی العموم یہ ظاہر کرنا ضروری سمجھا کہ وہ اس موضوع پر آزاد کی رائے سے کہاں تک اتفاق نہیں کرتے، یا اُن کی فراہم کردہ معلومات پر کیا اضافہ کر رہے ہیں۔ ان سب متفرق تحقیقات کو اگر یکجا کر لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ شاید آبِ حیات کا ایک صفحہ بھی اعتراض سے نہیں بچا ہے۔ ان سب کوششوں سے دل گرفتہ ہونے کی بجائے، بہتر یہ ہوگا کہ آبِ حیات کا ایک تنقیدی ایڈیشن مرتب کیا جائے اور یہ سب معلومات، متقاطع بیانات، یا نئے انکشافات حواشی میں درج کر دیے جائیں۔

یہاں غیر متعلق مثالوں کا اندراج کر کے اس تمہید کو زیادہ طول

دینا مقصود نہیں۔ مگر جن حضرات کو یہ شکایت ہے کہ محمد حسین آزاد آبِ حیات کو موردِ طعن کیوں بناتا ہے، انھیں صرف ایک نکتہ ملحوظ رکھنا چاہیے؛ آبِ حیات کو تاریخ اور تذکرے کی کتابوں میں شمار کیا جاتا ہو: اگر اسے صرف قصہ کہانی کی کتاب یا زیادہ سے زیادہ "شاعروں کے خاکے" قرار دے دیا جائے تو ان میں سے اسّی فیصدی اعتراضات اپنی موت مر جائیں گے۔ مگر غالباً آزاد کے مدّاح اس تبدیلی کے لیے تیار نہ ہوں گے، کیونکہ آزاد خود اس کتاب کو "مشاہیر کے سوانح اور زبان کی تاریخ" کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں۔ سوانح بھی تاریخ کا ایک اظہار ہیں، اور تاریخ میں دو باتوں کو ہمیشہ تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے؛ ایک تو یہ کہ مورّخ اپنے تخیل کو اس میں شاہدِ عینی کی طرح پیش کرنے لگے، اور دوسرے یہ کہ وہ افراد یا حوادث سے اپنا جذباتی رشتہ قائم کر لے۔ پہلی بات کے بارے میں مارگولیتھ نے لکھا ہے کہ مورّخ کبھی کبھی غیب داں بھی بن جاتا ہے، یا کسی واقعہ کے بارے میں نہایت سنجیدگی اور دیانت سے یہ تصوّر کر لیتا ہے کہ یہ بات اس طرح ہوئی، کیونکہ ویسی باتیں عالمِ شہود میں اسی طرح ہوا کرتی ہیں۔

دوسری بات یعنی جذباتی وابستگی کے بارے میں، ہندستان کے ایک مشہور مورّخ سے میں نے ایک جلسے میں سوال کیا کہ: "آپ اپنی کتاب میں اتنے جذباتی کیوں ہو گئے ہیں"؟ اُن کے پاس اس کے سوا کوئی جواب نہ تھا کہ یہ راز کوئی ماہرِ نفسیات ہی سمجھ سکتا ہے۔ آزاد کے یہاں اتفاق سے دونوں طرح کی جذباتیت ہے، منفی بھی اور مثبت بھی۔ یعنی انھیں عقیدت ہوتی ہے تو ذوق کے چیچک کے داغ بھی گُل بوٹے نظر آتے ہیں، اور کسی سے چڑ ہوتی ہے تو مرزا مظہر جیسے بزرگ کے لیے لکھتے ہیں کہ "گھر میں دھوبن ڈال رکھی تھی"۔ ظاہر ہے کہ یہ وہ بیانات ہیں جن سے کوئی تاریخی معلومات نہیں ملتی، اس لیے اگر یہ باتیں فی الواقع درست بھی تھیں تو انھیں بآسانی نظر انداز کیا جا سکتا تھا۔ مگر اس اندازِ نظر کا ایک منطقی نتیجہ تضاد ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر آبِ حیات کا مطالعہ اس نظر سے کیا جائے کہ اس میں کہاں تک مربوط اور منضبط تنقید ملتی ہے، تو حیرت انگیز نتائج برآمد ہوں گے۔

میر حسن دہلوی کے ترجمے میں آزاد نے لکھا ہے کہ اُن کی زبان صاف، فصیح اور دلکش ہے — جو کچھ اُس وقت کہا صاف وہی محاورہ اور وہی گفتگو ہے جو آج ہم تم بول رہے ہیں۔" (آبِ حیات ۲۵۴-۲۵۵)

انہی میر حسن نے اپنے بیٹے میر خلیق کو مصحفی سے زبان سیکھنے کا مشورہ دیا تھا، اور یہ کہا تھا کہ اس زمانے میں ان کی نظیر نہیں ہے، جہاں تک ہو سکے ان سے کچھ حاصل کر لو۔ (تذکرۂ ہندی، طبع اول، صفحہ ۹)

چنانچہ میر خلیق بھی اپنے باپ کے ارشاد کی تعمیل میں زیادہ سے زیادہ وقت مصحفی کی خدمت میں گزارتے تھے۔

میر حسن جو بقول آزاد "خاص دہلوی" تھے اور جن کی استادی کا اعتراف تمام اہلِ لکھنؤ کو بھی ہے، وہ تو مصحفی کی زباندانی کے بارے میں محض لفظوں کی حد تک نہیں، بلکہ عملاً اس طرح معترف تھے کہ انھوں نے اپنے بیٹے سے تاکیداً کہا کہ ان کی خدمت میں رہ کر زبان اور فن کی تکمیل کرو، مگر آزاد نے مصحفی کے ترجمے میں جو کچھ لکھا ہے اُسے ذرا غور و تامل سے ملاحظہ فرمائیے تو مطلب یہ نکلتا ہے کہ زبان اور ضروریاتِ شعری سے باخبر تھے، اور یہ دلی کے بزرگوں کی صحبت میں حاصل کی تھی۔ خود دلی کے رہنے والے نہ تھے مگر اپنے دہلوی ہونے کا فخریہ اعلان کرتے تھے۔ شاعری میں کہیں میر کا انداز ہے، کہیں سوز کی نقل ہے، کہیں سودا کا چربہ ہے، اُن کا اپنا کوئی طرز نہیں: "غزلوں میں سب رنگ کے شعر ہوتے تھے کسی طرزِ خاص کی خصوصیت نہیں۔ بعض تو صفائی اور برجستگی میں لاجواب ہیں، بعض میں یہی معمولی باتیں ہیں جنھیں ڈھیلی ڈھیلی بندشوں میں باندھ باندھ کر پھُسر پھُسر کہتے چلے گئے ہیں۔ اس کا سبب یا تو پُرگوئی ہے جس کی تفصیل آگے آتی ہے، یا دلی اور امروہے کا فرق ہے۔" (آبِ حیات ۳۱۲)

دوسری جگہ پھر مصحفی کے امروہوی ہونے پر چوٹ کی ہے، اور کہتے ہیں:

"سید انشا ہمیشہ قواعد کے راستے سے ترچھے ہو کر چلتے ہیں، مگر وہ ان کا ترچھا پن بھی عجب بانکپن دکھاتا ہے۔ یہ بھی مطلب کو بہت خوبی اور خوش اسلوبی سے ادا کرتے ہیں، مگر کیا کریں وہ طبیعت کا امروہہ بن نہیں جاتا۔" (آبِ حیات ۳۱۳) یہ تعمیم کہ انشا ہمیشہ قواعد سے ترچھے ہو کر چلتے ہیں، مبالغے سے خالی نہیں اور آزاد نے اس بے جا کج روی کی کوئی

مثال بھی نہیں دی ہے۔ جتنہ داری اسی سے ظاہر ہے کہ ایک شاعر کی قواعد شکنی کی بھی تعریف ہو رہی ہے اور دوسرے کی پابندی فن کے لیے بھی یہ کہ "کہیں بھٹکے ہیں اور کہیں سیٹھے ہیں۔" (آبِ حیات ۳۱۳) مصحفی کی زباندانی پر اتنے سخت ریمارک دینے کے بعد یہ ضروری تھا کہ آزاد اس کی کچھ مثالیں بھی پیش کرتے کہ اُن کے محاورے میں کہاں بھول ہوتا ہے۔ چنانچہ آگے چل کر لکھا ہے کہ: "بعض جگہ اپنے وطن کا محاورہ یاد آجاتا ہے اور کہہ دیتے ہیں۔

سچ نے اُس کی کلیجا کھا لیا
آتے ہی اس نے مجھے سگو الیا

چمن میں چل کے کر اے مصحفی تو نالہ و آہ
جو جی چلا ہو ترا امتحانِ بلبل کا

نہ میں صحرا میں نہ گلشن میں سل جاؤں گا
جو گر شہر ہوں، ناں خاک میں رَل جاؤں گا

(آبِ حیات ۳۱۵)

ان مثالوں سے یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ

۱۔ سگوانا ۲۔ جی چلنا ۳۔ رَل جانا

یہ تینوں محاورے دہلی کے نہیں ہیں بلکہ امروہہ کے ہیں یا بالفاظِ دیگر ٹکسال باہر ہیں۔ ان میں پہلا محاورہ مصحفی نے جس سیاق میں استعمال کیا ہے وہ بظاہر سینتا، ٹھکانے لگاتا، یا قتل کر نا وغیرہ کے معنوں میں ہوسکتا ہے۔ یہ دہلی میں بولا جاتا تھا، اور شاعری سے قطعِ نظر اس کی سند اس دور کی نثر میں بھی مل سکتی ہے۔ سید جمیل الدین خاں "خاص دہلی" کے باشندے تھے اور "محلہ جمیل پورہ عرف چوڑی والان دہلی میں رہتے تھے۔ ان کا "صادق الاخبار" بہت مشہور ہے۔ اس نے ایامِ "غدر" میں انگریزوں کے خلاف زبردست تحریک چلا رکھی تھی۔ اس اخبار کی ۶ جولائی ۱۸۵۷ء مطابق ۱۳ ذیقعدہ ۱۲۷۳ھ کی اشاعت (جلد ۴ شمارہ اصفحہ ۴) میں ایک خبر درج ہے جس کا اتنا اقتباس مفیدِ مطلب ہوگا۔

"باشندے وہاں (لکھنؤ) کے اس فکر میں ہیں جس طرح بنے ان گورہ رنگوں کو سگوا لیجئے اور مصطفیٰ شاہ، برادر شاہ اودھ کو بادشاہ یہاں کا بنا دیجئے"

یہ جمیل الدین خاں امروہہ کے ہرگز نہیں تھے۔ آزاد کے لفظوں میں "خاص دہلوی" تھے اور آزاد سے نہ بہت زمانہ پہلے گزرے ہیں جو اس محاورہ کو متروک قرار دیا جائے نہ زمانہً بہت متاخر ہے بلکہ خاص ہمعصر ہیں اور قیاس چاہتا ہے کہ ان میں باہم ملاقات اور تعارف ضرور رہا ہوگا۔ آزاد نے اگر ایک محاورہ نہیں سنا تھا تو انھیں اس کی تصدیق کرنی چاہئے تھی کہ دہلی میں اس سے لوگ واقف ہیں یا نہیں۔

دوسرا محاورہ "جی چلنا" ہے۔ اس کا مفہوم بھی مذکورہ شعر سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ یعنی "خواہش پیدا ہونا" اور "تحریک ہونا"۔

نواب میرزا خان داغ دہلوی کی زبان کو تو آزاد بھی ضرور مستند مانتے ہوں گے۔ وہ ذوق کے شاگرد، "قلعۂ معلیٰ کے پروردہ یافتہ" اور محمد حسین آزاد کے خواجہ تاش تھے۔ اصولِ زبان کے بارے میں بھی اتنے سخت تھے کہ انھوں نے ایک روایت کے مطابق، جس کے ناقل مولوی عبدالرزاق کانپوری (مصنف البرامکہ) ہیں، فرہنگِ آصفیہ کے مؤلف مولوی سید احمد دہلوی کو بھی ناقابلِ استشہاد بتایا ہے کیونکہ سید احمد صاحب "خاص دہلی" کے نہیں تھے۔ ان کا خاندان ہمایوں کے مقبرے کے پاس عرب سرائے کا رہنے والا تھا۔ اس لیے داغ سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ عرب سرا کے باشندے کی زبان کو تو غیر مستند سمجھیں اور خود امروہہ کا محاورہ استعمال کرلیں۔ مگر انھوں نے کیا ہے

ناصح کا جی چلا تھا ہماری طرح مگر
اُلفت کی دیکھ دیکھ کے افتاد رہ گیا

یہ شعر گلزارِ داغ کا ہے۔ محاوراتِ داغ مرتبۂ ولی احمد خاں میں بھی مل سکتا ہے۔ اس محاورے کی حد تک بھی یہ طے ہوگیا کہ اہلِ دہلی اس سے واقف تھے۔

اب تیسرا اعتراض "خاک میں رَل جانا" پر رہا۔ اس کی متعدد اسناد جمع کرلی ہوں گی کیونکہ یہ میں خود بھی نہیں سمجھ سکا کہ آزاد کا بنیادی اعتراض اس محاورے کے سلسلے میں کیا ہے؟ اس کی چند صورتیں ہوسکتی ہیں:

۱۔ رَل جانا (بفتحِ اول) جیسا کہ مصحفی نے باندھا ہے۔

اناد بکسرِ اول؛ بروزن مِل جانا۔ سِل جانا۔
جانا (بضمِ اول) بروزن تُل جانا۔ گُل وتُل وغیرہ
ت کی صورت ہوئی۔ محاورے کے الفاظ پر بھی اعتراض ہوسکتا
، ان میں سے کون سی صورت صحیح ہے:
، میں رَل جا   ۲۔ خون میں رل جانا
ب رل جانا   ۴ قدموں میں رل جانا
ں میں رَل جانا
ہی ایک ہی شکل میں آتا ہے، تب تو اوپر لکھی ہوئی باقی سب
ط قرار پائیں گی۔ لیکن اگر یہ معلوم ہو جائے کہ ان میں سے ہر
ں استعمال ہوا ہے تو اس کا منطقی نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ اصل محاورہ
ا رُلنا ہے اور کسی بھی دوسرے لفظ سے مرکب ہو کر آسکتا ہے۔
، اس کا استعمال ثابت ہو جائے تو پھر رائے کی بحث رہے گی۔
، سے قدیم ترین دور سے تلاش کرتے ہیں
تم کے بارے میں آزاد نے لکھا ہے کہ "رہنے والے خاص شاہجہاں
آباد" (آبِ حیات ۱۱۲) اور ان کی زبان کو فصیح مانا ہے (صحفہ
کے دیوانِ قلمی (نسخہ انڈیا آفس لندن) کے ورق ۵۶ پر یہ

مت جاؤ چمن بیچ میاں عطر کو مل کر
اس دوستی حادث گئے گُل اب خاک میں رُل کو

لنا (بفتحِ اول) کی یہ سند غالباً کافی ہوگی۔ مگر حاتم کے وقت
ے الفاظ اور محاورے میر و مرزا کے عہد میں متروک ہو چکے
، خود مذکورۂ بالا شعر میں 'ستی' بمعنی 'سے' آیا ہے، جو عہد
ے کر دیا گیا تھا۔ مگر یہ محاورہ "خاک میں رُلنا" میر کے یہاں
ہے:

کہوں کیونکہ یک بار وہ جل گیا
کفِ خاک ہو خاک میں رَل گیا

(مثنوی شعلۂ شوق)

ر و ہوی ہونے کی تہمت کوئی بھی نہ لگائے گا۔ اور ان کی فصاحت
خود آزاد نے تسلیم کیا ہے کہ "زبان کے مالک تھے" (صفحہ

(۱۴) ہو سکتا ہے کہ میر ہی تنہا اس محاورے سے باخبر ہوں اور دوسرے
فصحا کو اس کا علم نہ ہو مگر ان کے معاصرین میں تقریباً سب کے کلام سے
اس کی سند مل جاتی ہے۔ مثلاً قائم چاند پوری:

اشک کی طرح تھی یاں مجھ کو ہر اک چشم میں جا
کب یہ معلوم تھا یوں خاک میں رَل جاؤں گا

(نوانی۔ مہَل مَجَل وغیرہ۔ انتخاب صفحہ ۳/)

قائم چاند پور کے رہنے والے تھے اور دہلی، رام پور، لکھنؤ سب شہروں میں
رہے تھے۔ خود رام پور میں بھی یہ محاورہ رائج تھا چنانچہ مولوی غلام جیلانی
رفعت جو پہلے بیدم تخلص کرتے تھے۔ ملا غیاث الدین مؤلفِ غیاث
اللغات کے استاد اور مولوی سید حیدر علی رام پوری خلیفہ حضرت سید احمد
شہید بریلوی کے داماد تھے، ان کا انتخاب قدرت اللہ شوق کے تذکرہ
طبقات الشعرا میں موجود ہے اور اس میں یہ شعر بھی ہے

میں خاکِ عزت میں رَل گیا ہوں برنگِ اشکِ دانِ بیدم
کسی کی آنکھوں کے شوق میں آہ، جب سے چھوٹا دیار میرا

(تذکرۂ طبقات الشعراء مرتبہ نثار احمد فاروقی
طبع لاہور۔ صفحہ ۵۱۳)

رام پور امروہے کے قریب ہے، ممکن ہے کہ وہاں تک یہ محاورہ پہنچ گیا
ہو۔ لیکن عارف الدین خاں عاجز دکن میں رہتے تھے، ان کا یہ شعر خود میر
نے نقل کیا ہے

مینھ کے برسے کی باؤ چلی ہو اب آنکھوں سے جان برآئی نو چلیں گے
درد کے نیساں کے گوہرِ غلطاں تو مٹی میں کنکر دیتے آہ رُلیں گے

(نکات الشعرا، طبع اول صفحہ ۱۳)

اشرف علی خاں فغاں، احمد شاہ بادشاہ کے دودھ شریک بھائی
تھے۔ ظاہر ہے کہ قلعۂ معلیٰ میں پرورش پائی تھی۔ آزاد نے لکھا ہے کہ ان
کے کمال کی سند اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی کہ مرزا رفیع جیسا صاحبِ
کمال اکثر ان کے اشعار مزے لے لے کر پڑھا کرتے تھے۔ (آبِ حیات
صفحہ ۱۲۴)۔ انھوں نے رلنا کا استعمال کیا ہے

بکھریں آپس میں اس طرح زلفاں   جس طرح لڑ رہی ہوں چھپکلیاں

(دیوانِ فغاں، مطبوعہ۔ صفحہ ۱۶۹)

خود سودا نے بھی یہ محاورہ استعمال کیا ہے:

خاک و خوں میں صورتیں کیا کیا نہ رُلیاں دیکھیاں
اے فلک باتیں تری کوئی نہ بھلیاں دیکھیاں

(کلیاتِ سودا - مرتبۂ عبدالباری آسی)

مگر یہ شعر مجموعۂ نغز (جلد ۲ صفحہ ۱۵۴) میں مجذوب کے نام سے منسوب ہوا ہے - یہ سودا کے مُنشی اور شاعری میں انہی کے شاگرد تھے - ان کا یہ شعر آزاد نے بھی نقل کیا ہے (آبِ حیات صفحہ ۱۸۰) مگر وہاں اسے امروہے کا محاورہ نہیں بتایا۔ میر و سودا کے ایک اور ہمعصر میر صابر دہلوی نے یوں باندھا ہے۔

حسرت کامت دو فرزدہ مجھ خاک میں رُلے کو
آرام وہاں بھی معلوم ایسے جلے سڑے کو

(نکات الشعرا طبع اول صفحہ ۱۵۲)

میر شیر علی افسوس عہد میر و مرزا کے آخر میں ہوئے ہیں - یہ فورٹ ولیم کالج سے وابستہ ہونے کی وجہ سے خاصی شہرت رکھتے ہیں - ان کے دیوان قلمی نسخہ انڈیا آفس لندن ورق ۵ ۲ (حوالہ ۱۵۹/۲۵۰۵) میں ایک مرثیہ کا یہ شعر بھی ملتا ہے۔

تیرا لاشہ ہے جنگل میں رُلتا، تیرا تن ہے لہو میں گلتا
زور میرا نہیں کچھ بھی چلتا، میرے پیارے ساد حسینا

مصحفی نے رَلنا (بفتحِ اول) کے علاوہ رُلنا (بضمِ اول) بھی باندھا ہے ان کا شعر ہے۔

گر اُس منہ سے برقع کبھی کھل گیا
تو دیکھو گے مہ خاک میں رُل گیا

(ابواللیث صدیقی، مصحفی ۱۶۴)

مگر یہ بھی بے سند نہیں ہے - اساتذۂ قدیم کے کلام میں اس کا استعمال بھی ملتا ہے - چنانچہ نواب آصف الدولہ کی ایک رباعی ہے:

دل آٹھ پہر تری طرف ڈھلتا ہے   تن شمع صفت غم سے پڑا گھلتا ہے
آصف سببِ عشق ہے، ورنہ کوئی   کوچے میں کسی کے خاک پر رُلتا ہے

(کلیاتِ آصف الدولہ قلمی، نسخۂ سالار جنگ)

انہی نواب آصف الدولہ کے "بیٹے" نواب وزیر علی خاں نے اسے بالفتح باندھا ہے۔

جیوں سبزہ رُند سے اُگتے ہی پیروں کے تلے ہم
اس گردشِ افلاک سے پھولے نہ پھلے ہم
جس گل پہ نگہ کرتے ہیں آتا ہو نظر خار
گلشن کے تلے جاتے ہیں کانٹوں میں رَلے ہم

(دیوانِ جہاں، صفحہ ۲۵۶)

غرض اس لفظ کے متعلق غالباً ہر نوع کی مثالیں فراہم ہو گئی ہیں اور ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ رَلنا دو طرح (بفتحِ اول و بضمِ اول) دہلی اور لکھنؤ ہی میں نہیں بلکہ دکن تک رائج تھا۔ بالکسر کی کوئی سند دستیاب نہیں ہے، اور یہ مصحفی نے کہیں لکھا بھی نہیں ہے۔ یہ مصدر کسی بھی دوسرے لفظ سے مرکب ہو کر آسکتا ہے چنانچہ مذکورۂ بالا مثالوں میں اتنی شکلیں ملی ہیں۔

۱ خاک میں رَلنا   ۲- مٹی میں رَلنا
۳- خاک و خون میں رَلنا   ۴- جنگل میں رَلنا   ۵- کانٹوں میں رلنا-

مصحفی نے اس محاورے کو جتنی صورتوں میں برتا ہے سب کی سندیں دوسرے شعراء کے کلام میں مل جاتی ہیں اور اتنا ضرور اندازہ ہوتا ہے کہ خود ان محاوروں کے وجود سے بے خبر تھے - اس لیے انھیں یہ امروہہ کی زبان معلوم ہوئی - اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ آزاد کو اس موقع پر تسامح ہوا ہے - انھوں نے یہ تو بجا طور پر محسوس کیا کہ اس محاورہ میں کچھ اجنبیت ہے، مگر اس فیصلے میں عجلت دکھائی کہ یہ امروہہ کا محاورہ ہے - واقعہ یہ ہے کہ ناسخ نے جن محاوروں کو منسوخ کیا تھا ان میں سے ایک یہ بھی ہے - ان کے زمانے تک "خاک میں رَل جانا" بولتے تھے، انھوں نے اسے متروک قرار دے کر "خاک میں مل جانا" کو فصیح بتایا (صفیر بلگرامی. جلوۂ خضر جلد ا صفحہ ۱۴۶)

ظاہر ہے کہ جو محاورہ ناسخ کے وقت میں متروک ہوا ہو، اُس کا مواخذہ مصحفی سے نہیں کیا جا سکتا۔

دوسرا محاورہ "جی چلنا" تو خود آزاد کے وقت تک دہلی میں بولا جاتا تھا - نواب الٰہی بخش معروف کے بارے میں آزاد نے لکھا ہے کہ ان کا دیوان جو "اب رائج ہے وہ تمام و کمال انھیں (ذوق) کا اصلاح

غزل

فنا نظامی

وہ آئے مگر اجنبی کی طرح
اُجالا ہوا تیرگی کی طرح

مرا دل فرشتوں سے ملتا نہیں
ملو مجھ سے تم آدمی کی طرح

مجھے دے گیا جو فریبِ وفا
وہ اک شخص تھا آپ ہی کی طرح

ہمارے مقدر میں لکھ دی گئی
کوئی اور شے زندگی کی طرح

میں مجبور ہوں میکشی کے لیے
مرا جرم ہے خودکشی کی طرح

کوئی شے دو عالم میں ملتی نہیں
محبّت کی پاکیزگی کی طرح

وہی جوش ہو اور وہی ولولہ
کرو دوستی دشمنی کی طرح

فنا آج کی میکشی دیکھ کر
مرا دل بجھا تشنگی کی طرح

۶ر ماگھ ۱۸۹۴ شک　　　　۲۶ر جنوری ۱۹۷۳ء

مکرّرات و ماخوذاتِ غالبؔ

● ڈاکٹر تارا چرن رستوگی

غالب کے کلام کو اگر زیادہ غائر نگاہ سے بھی دیکھیں تو بھی ایسے اشعار سامنے آجاتے ہیں جن کے مضامین نئے نہیں معلوم ہوتے بلکہ یوں احساس ہوتا ہے کہ شاعر نے کہیں اور کہی ہوئی بات کو مکرر ارشاد فرمایا ہے۔ غالب اپنے آپ کو اساساً فارسی شاعر سمجھتے تھے اور اپنے فارسی کلام کو فوقیت و اولیت دیتے تھے ؎

فارسی بیں تا ببینی نقش ہائے رنگ رنگ   بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است

ان کے اس "بے رنگِ من است" کلام میں بھی ان کے فارسی کلام کے "نقش ہائے رنگ رنگ" دعوتِ نظارہ دیتے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں ؎

— ۱ —

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد   یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے
آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد   مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ
اندراں روز کہ پرسش رود از ہر چہ گذشت   کاش با ما سخن از حسرتِ ما نیز کنند

— ۲ —

چاک مت کر جیب بے ایامِ گل   کچھ اُدھر کا بھی اشارہ چاہیے
بزبستاں کہ بہر نکتہ ادائے دارد   محرم آں است کہ رہ جز باشارت نبرد

— ۳ —

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے   نالہ پابندِ نے نہیں ہے
از نغمۂ مطرب نتواں لحنِ دل انداد   لے مادیریتاں رود سحار میاموز

— ۴ —

کرے ہے قتل لگاوٹ میں تیرا رو دینا   تری طرح کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے
گریہ کردار فریب درارم کشت   نگہ از تیغ آبدار تراست

— ۵ —

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے   آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا
توفیق بہ اندازۂ ہر حوصلہ ریزند   میخانۂ توفیق خم و جام ندارد

— ۶ —

لختِ جگر سے ہے رگِ ہر خار شاخِ گل   تا چند باغبانیِ صحرا کرے کوئی
آغشتہ ایم ہر سرِ خارے بخونِ دل   قانونِ باغبانیِ صحرا نوشتہ ایم

— ۷ —

یاد تھیں ہم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں   لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں
رنگہا چوں شد فراہم مصرفِ دیگر نداشت   خلد را نقش و نگارِ طاقِ نسیاں کردہ ایم

— ۸ —

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں   ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا
ہفت آسماں بہ گردش و ما در میانہ ایم   غالب دگر مپرس کہ بر ما چہ می رود

— ۹ —

شہیدِ عاشق سے کوسوں تک جو اُگتی ہے حنا   کس قدر یارب ہلاکِ حسرتِ پابوس تھا
لالہ و گل دمد از طرفِ مزارش پس مرگ   تا چہا در دلِ غالب ہوسِ روئے تو بود

— ۱۰ —

دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے   کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے
ننگ آں کہ نیست سر و برگِ دامن افشانی   بہ بندِ خویشتن فرو ماندہ ام بہ عریانی

— ۱۱ —

قدرِ سنگِ سرِ رہ رکھتا ہوں   سخت ارزاں ہے گرانی میری
ما کس زتنومندی ظاہر نشود کس   چوں سنگِ سرِ رہ کہ گراں است و گراں نیست

۹ ر ماگھ ۱۸۹۴ بک

۲۲ جنوری سنہ ۱۹۷۳ء

گناہوں کی پرسش میں اپنی حسرتوں کی یاد مرزا کے یہاں ایک خاص مضمون ہے۔ دیکھیے یہی خیال ذیل کے اشعار میں بھی نظم ہوا ہے:

اندوہ آں روز کہ پرسش رود از ہر چہ گذشت   کاش ما را سخن از حسرت ما نیز کنند

رباعی

اے آنکہ دہی مایہ کم و خواہش بیش   آں روز کہ وقت باز پرس آید پیش
بگزار مرا کہ من خیالے دارم   با حسرت عیش ہائے ناکردۂ خویش

اشعار بالا کو بغیر وقت نظر سے کام لیے چنا گیا ہے۔ اگر زیادہ تلاش و جستجو کی جائے تو مرزا کے فارسی اور اردو کلام میں اور بھی متحد ہم معنی اشعار مل سکتے ہیں۔ یہی نہیں غالب کے بعض اردو اشعار بھی جو دوسرے شعرا کے فارسی اشعار سے ماخوذ ہیں تلاش کیے گیے ہیں۔ مثلاً

بیدل: بوئے گل نالۂ دل دود چراغ محفل
هر کہ از بزم تو برخاست پریشاں برخاست

غالب: بوئے گل نالۂ دل دود چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا وہ پریشاں نکلا

(ظاہر ہے کہ غالب نے بیدل سے پہلا مصرع بغیر کسی تصرف کے لے لیا ہے اور دوسرے مصرع کا اردو ترجمہ نظم کر دیا ہے)

۱۲

صاف دردی کش پیمانۂ جم ہیں ہم لوگ   وائے وہ بادہ کہ افشردۂ انگور نہیں
ما داں حریف مستی غالب مشو کہ او   دردی کش پیالۂ جمشید بودہ است

۱۳

عشق و مزدوری عشرت گہ خسرو، کیا خوب   ہم کو تسلیم نکو نامیِ فرہاد نہیں
از جوئے شیر و عشرت خسرو نشاں نماند   غیرت ہنوز طعنہ بفرہاد می زند

۱۴

پی جس قدر ملے شب مہتاب میں شراب   اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے
غالب چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی   پیتا ہوں روز ابر و شب ماہتاب میں
فرصت از کف مدہ و فغنیمت پندار   نیست گر صبح بہارے شب ماہے دریاب

۱۵

خیقعی: نو شد ار دوے محبت را میرس اجزا کہ چیست
سودۂ الماس در زہر ہلاہل می کنند

غالب: نہ پوچھ نسخۂ مرہم جراحت دل کا
کہ اس میں ریزۂ الماس جزو اعظم ہے

بیدل: میروم از خویش و در اندیشۂ باز آمدن
بجو عمر رفتہ یارب بر نہ گرداند مرا

غالب: ستانہ طے کروں ہوں رہ وادی خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

(یہاں غالب نے بیدل کے شعر کا میادی میلان لے کر ترجمہ کر دیا ہی)

بیدل: ساز ہستی جیرآہنگ عدم چیزے نداشت
ہر نوائے را کہ وا دیدم خموشی می سرود
مطلع انسے پرستی تر رباعی ما نبود
یک دو ساغر آب دادم گریہ مستانہ را

بیدل کے ان دو شعروں کو غالب نے اردو کا لباس بالترتیب دو مختلف شعروں میں یوں پہنایا ہے ؎

غالب   نشو و نما ہے اصل سے غالب فروع کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے
مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

غالب نے زین العابدین خاں عارف کی موت پر جو غزل بطور مرثیہ کہی اس کا ایک شعر ہے ؎

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب قیامت کا بھی ہوگا کوئی دن اور

اس کا ماخذ راقم مشہدی کا یہ شعر معلوم ہوتا ہے ؎

می کند وعدۂ دیدار بفردا امروز   یار دانستہ کہ امروز مرا فردا نیست

اور یہ شعر ؎

ہم اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آئیں   گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

بیگ دختر علی حیدر کے ایک شعر کا مرہون منت معلوم ہوتا ہے بیگ کا شعر یہ ہے ؎

من اگر توبہ ز مے کردہ ام اے سرو سہی
تو خود ایں توبہ نہ کردی کہ مرا مے ندہی

غالب نے اس شعر کو ؎

تُو نے ہے بے کسیِ عشق پہ رونا غالبؔ — کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

عرفی کے مندرجہ ذیل شعر کے بنیادی خیال کو لے کر تخلیق کیا ہوگا ؎

چشمم نہ بہر خویشتن ِ دم زرع تر شود — ترسم کہ من بمیرم و غم دربدر شود

اسی طرح فارسی کے مندرجہ ذیل شعر پر غالب اور مومن دونوں نے اپنے اپنے انداز میں طبع آزمائی کی ہے:

ضعفِ تن عمے حال است بیمار محبت را — کہ نتواند کشید از ناتوانی بار صحت را

(نامعلوم)

مومن : اب تو مرجا بھی مشکل ہے ترے بیمار کو
ضعف کے باعث کہاں بیمار سے اٹھا جائے

غالب : ہو فشار ضعف میں کیا ناتوانی کی نمود
قد کے جھکنے کی بھی گنجائش مرے تن میں نہیں

جامی کا مشہور شعر ہے ؎

گفتی شبے بخواب تو آیم ولے چہ سود — چوں من بعمر خویش ندیدم کہ خواب ہست

غالب نے اکتساب مضمون اس طرح کیا ہے کہ جو کچھ جامی نے محبوب سے کہلوایا ہے انھوں نے فرض کر لیا ہے ؎

وہ آکے خواب میں تسکینِ اضطراب تو دے — ولے مجھے طپشِ دل مجالِ خواب تو دے

غالب نے آذری طوسی کے اس شعر کو ؎

جانے کہ داشت کرد خدائے تو آذری — شرمندہ ام تو گشت کہ جانِ دگر نداشت

اس انداز سے قدرے زیادہ سادہ اور پُر اثر کر لیا ہے ؎

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

وقوعی تبریزی کا شعر ہے ؎

می نمایم کہ سرِ عہد شکستن داری — ختم ایں بار تو چوں رنجش ہر بار تو نیست

غالب نے اسی مضمون کو اختصار کے ساتھ یوں نظم کیا ہے ؎

بارہا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں — لیکن اب کے سرگرانی اور ہے

نظیری نے کہا ہے ؎

نشاطِ رفتہ ز دوراں بہ صبر بستانم — کہ ہر معاملہ آزردہ از تقاضا نیست

غالب نے اسی مضمون کو لے کر یہ شعر تخلیق کیا ہے ؎

فلک سے ہم کو عیشِ رفتہ کا کیا کیا تقاضا ہے
متاعِ بردہ کو سمجھے ہوئے ہیں قرض رہزن پر

عرفی کے یہ تین اشعار ملحوظ رکھتے ہوئے۔

ہر کس نہ شناسندۂ راز است وگرنہ — ایں ہا ہمہ راز است کہ معلوم عوام است

کے لازم است بادہ کشیدن ز جامِ زر — مقصود تو گر امیت قصور سفال چیست

یار بادہ کہ جانم دمے ز نالہ بر آید — ہزار زمزمہ از دل بیک پیالہ بر آمد

غالب کے علی الترتیب یہ تین شعر ملاحظہ فرمایئے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا — ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

پھر دیکھیے اندازِ گل افشانیِ گفتار — رکھ دے کوئی پیمانۂ صہبا مرے آگے

آصفی شیرازی کے اس شعر پر ؎

تو ہم در آئینہ حیراں ز حسنِ خویشتنی — زمانہ ایست کہ ہر کس بخود گرفتار ایست

اضافہ کرتے ہوئے زانو کو اپنا مونس قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

شکوہ سنجِ رشکِ ہم دیگر نہ رہنا چاہیے — میرا زانو مونس اور آئینہ تیرا آشنا

فریدوں خراسانی کے اس شعر کو دیکھیے ؎

از ضعفِ دل مال فریدوں نہ کسی — مدار دل قوی کہ کسِ بیکساں خدا است

اور غالب کے اس شعر کو دیکھیے ؎

بے دل نہ ہو بیگانگیِ خلق سے غالبؔ — کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

غالب نے ضعفِ دل کی بجائے بیگانگیِ خلق کہہ کر دلکش معنویت پیدا کر لی ہے

اب غالب کے مندرجہ ذیل اشعار اور ان کے سامنے دیے ہوئے فارسی اشعار پر تقابلی نظر ڈالیے۔

غالب	فارسی شعراء
کرتے گئے تھے اس کے تغافل کا ہم گلہ کی ایک ہی نگاہ کہ بس خاک ہو گئے	گفتم جگر ربی کشی و زندہ می کنی از یک نگاہ کشت و نگاہِ دگر نہ کرد (امیر خسرو)
تالیفِ نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا	بہ ہیچ کار کتب خانہ نمی آید ز جمع خاطر خود نسخہ فراہم کن (میر درد)
۳ کہتے ہو کیا بتاؤں جہاں خراب میں	ز حضر عمر فزون است عشق بازاں را

شب ... ہو کو ہمی ... عتاب میں [illegible]	آمدہ ... روز ... ان را [illegible] (ہم گو کاشمیری)
۴	
بہرہ ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر	اے گوش نخستم کہ اعلی شدی چو چشم تا ہرچہ گفتی از تو مکرر شنیدمے (طالب آملی)
۵	
ترے وعدہ پہ جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا	یم ار وفا ندارد وعدہ کرمش از ذوقِ وعدۂ تو بفرداتمی رسم (نیلی)
۶	
جا لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو ہم تو عاشق ہیں تمہارے نام کے	خوش دلم زیں کہ بادنامہ نوسیم شدر در مقصدم نیست کہ مکتوب رسد یا نرسد (حسن بیگ رفیع)
۷	
ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے	راد چو میرسم آسودہ می شوم اردور دیدہ حال مرادتت بے قراری حیف (رسولی)
۸	
گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے بایں ہمہ ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے	ہست صد منت بجاں از غیبت بدگو مرا چوں بایں تقریب می آرد بیاد او مرا (اشرف قزوینی)

غرض کہ غالب کے کلام میں دوسرے شعرا کے کلام سے معنوی استفادہ کی مثال ڈھونڈنے پر مل سکتی ہیں مگر غالب نے اپنے اعجاز اسلوب اور شدت احساس سے ہر استفادے پر اپنی انفرادیت ثبت کردی ہے اور ہر اخذ کیے مضمون کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ یہ ماخوذات جہاں غالب کے وسیع المطالعہ ہونے کی نشاندہی کرتے ہیں وہاں غالب کے شعری مزاج اور شخصیت کو سمجھنے میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔ جہاں تک بیدل کے اس شعر سے

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل
ہر چہ از بزم تو برخاست پریشاں برخاست

کا سوال ہے جسے غالب نے دوسرے مصرع کا ترجمہ کرکے اپنا لیا ہے اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ غالب کے یہاں مال سروقہ برآمد ہو گیا غالب کے زمانے میں متداولہ نصاب میں فارسی ادبیات کو نمایاں اور ممتاز جگہ حاصل تھی لہٰذا غالب کے دوست احباب بیں قریب قریب سبھی بیدل کے کلام سے واقفیت بھی ضرور رکھتے ہونگے۔ غالب جیسا فن کار نہ تو اتنا سادہ لوح ہو سکتا ہے کہ وہ دوسروں کو محض بے وقوف سمجھ لے اور بیدل کے شعر کو اردو کے ملبوس میں پیش کر کے داد و تحسین حاصل کرنے کی کوشش میں خندہ ریش نظر آئے۔ بات صرف اتنی ہے کہ اس طرح کے ترجموں کو معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اس وقت تک کتابت کے لیے ایسی علامات وغیرہ وضع نہیں ہوئی تھیں کہ ترجمے کی نشاندہی کی جا سکے۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے اور چراغاں ہو جاتا ہے

غالب کے فارسی کلام سے دوسرے اردو شعرا نے بھی استفادہ کیا ہے۔ مثال کے لیے مندرجہ ذیل اشعار پر تقابلی نظر ڈالیے۔

امیر مینائی: تڑپا میں وقت ذبح تو مجھ سے خطا ہوئی
خنجر کیا یہ تیزی کس کا قصور تھا

غالب: نے خود بوقتِ ذبح تپیدن گناہِ من
دانستہ تیزیِ کردِ گناہ کیست

جگر مراد آبادی: نظر سے ان کی پہلی ہی نظر یوں مل گئی اپنی
کہ جیسے مدتوں سے تھی کسی سے دوستی اپنی

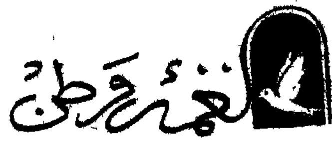
غالب: آشنا مے کند خار رہت دامن ما
گوئی ایں لوداریں متی یہ برا ہن ما

غالب کے مکررات و ماخوذات سے غالب کو سمجھنے میں خاصی مدد مل سکتی ہے۔ ایک ہی بات اگر دوسری مرتبہ ایک ہی طرح یا قدرے مختلف انداز سے کہی جاتی ہے تو اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہم کسی امر کو زور دے کر کہنا چاہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ع

شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

کے مصداق دوسروں کے مضامین کو اپنی طرفہ کاری کے ساتھ اپنا لینے سے بھی ہمارے خطوط فکر و تخیل کا مطالعہ اور نفسیاتی تجزیہ کیا جا سکتا ہے۔ اس استدلال کی روشنی میں مذکورہ بالا مکررات و ماخوذات سے اسی حقیقت کی وضاحت ہوتی ہے کہ غالب فدرادل کے خالق جمال اور ایک بہت بڑے فنکار تھے۔ روایت و تجربہ کا حسین و متوازن امتزاج، فن و زندگی کے گوشوں کی تلاش و جستجو، دل و دماغ کی رعنائیاں، مزاج میں بغاوت کے عناصر وغیرہ خصوصیات کی دلکش جلوہ گری یہاں بھی ملتی ہے۔





نغمۂ وطن

ساغر مہدی

اے مرے پیارے وطن سوچتا ہوں تجھے کیا نذر کروں

تیری ہر شام ہے بہکی ہوئی بدست بہار
تیری ہر صبح ہے دنیائے محبت کا خمار
تیری مٹی میں ہے آزاد امنگوں کی پکار
اسی مٹی سے کھلا ہے مرے دل کا گلشن

اے مرے پیارے وطن
سوچتا ہوں تجھے کیا نذر کروں

میرے عنوان کو کہانی اسی دھرتی پہ ملی
میرے بچپن کو جوانی اسی دھرتی پہ ملی
میرے گیتوں کو روانی اسی دھرتی پہ ملی
مری آواز میں ہے تیرے ہی دل کی دھڑکن

اے مرے پیارے وطن
سوچتا ہوں تجھے کیا نذر کروں

تیرے نغمات کا بکھرا ہوا سیمیں آنچل
جیسے ٹیگور کے گیتوں کی کھنکتی پائل
غالب و میر کی پیمانہ در آغوش غزل
جھوم اٹھتا ہے جسے سن کے ہر اک اہلِ سخن

اے مرے پیارے وطن
سوچتا ہوں تجھے کیا نذر کروں

گنگناتی ہوئی گنگا ہے تری باہنوں میں
مسکراتی ہوئی جمنا ہے تری باہنوں میں
تاج کا حسن دوبالا ہے تری باہنوں میں
یہ اجنتا و ایلورا کا ابھرتا ہوا فن

اے مرے پیارے وطن
سوچتا ہوں تجھے کیا نذر کروں

خون سے تیری بہاروں کو سجانے کے لیے
ایک آدرش ہے یہ سارے زمانے کے لیے
اپنی مانگوں کا یہ سیندور لٹانے کے لیے
کتنی اوشائیں اٹھا لائی ہیں اپنے کنگن

اے مرے پیارے وطن
سوچتا ہوں تجھے کیا نذر کروں

تیرے دامن کی ہواؤں میں ہے ماں کی ممتا
وقت کی دھوپ میں سر پہ ہے ترا ہی سایہ
تیری باہنوں کو کوئی غیر نہیں چھو سکتا
تجھ پہ جو آنکھ اٹھائے وہ ہمارا دشمن

اے مرے پیارے وطن
سوچتا ہوں تجھے کیا نذر کروں

۱۰ اگست ۱۹۹۲ء ناسک

۲۶ جنوری ۱۹۷۲ء



نقشِ محبت



- شاہجہاں
- ممتاز محل
- وزیرِ سلطنت
- کنیز
- یوسف آفندی

(حزنیہ موسیقی آہستہ آہستہ اُبھرتی ہے)

شاہجہاں۔ (انتہائی کرب اور غم کی کیفیت)۔ ہماری آنکھوں کے سامنے وقت کے بے رحم ہاتھوں نے ہم سے ہماری ممتاز چھین لی۔ ہماری ممتاز محل ہم سے جدا ہو گئی۔ وزیرِ سلطنت ہمارے دل کے سیہ خانہ میں اب کوئی شمع روشن نہ ہو گی۔ ہم کنگال ہو گئے۔ ہم اپنا سب کچھ ہار گئے۔ مغل سلطنت کا تاجدار اس کی عظمت و وجاہت اس کا رعب و جلال سر بہ زانو اور بے دست و پا کھڑے ہیں اور موت ہمارے پہلو سے ہماری زندگی چھین لے گئی۔ محل کی ساری شمعیں گُل کر دو، وزیرِ سلطنت، ورنہ یہ روشنی ہماری آنکھوں کی بینائی چھین لے گی۔

وزیرِ سلطنت۔ اعلیٰ حضرت! اس طرح غمگین نہ ہوئیے۔ خدائے برتر ہمارے سروں پر شہنشاہِ سلطنت کا سایہ ہزاروں برس تک قائم رکھے۔ آپ اتنے اداس نہ ہوں ورنہ ملکۂ عالم کی روح کو صدمہ پہنچے گا۔ حوصلہ کا دامن یوں نہ چھوڑیے عالی جاہ!

شاہجہاں۔ وزیرِ سلطنت، ہم تمہاری دلجوئی کے شکرگزار ہیں، لیکن ہم جانتے ہیں کہ اب ہم بہت دنوں حسرت و یاس میں گرفتار نہیں رہ سکیں گے۔ بس ہماری روح کو اب ایک ہی جستجو ہے، ایک ہی لگن۔ کاش ہم اپنی زندگی میں اپنی ممتاز کی دیرینہ آرزو پوری کر سکتے۔ اس نے ہم سے صرف ایک آرزو کی تھی، وزیرِ سلطنت لیکن ہماری انتھک تلاش اور جستجو کے بعد بھی زمین کے کسی حصہ پر بھی ایسا دماغ نہ ملا جو ہماری ممتاز کے خواب کی تعبیر بخش سکتا۔

وزیرِ سلطنت۔ عالم پناہ! تلاش برابر جاری ہے۔ انشاءاللہ ایک دن شہنشاہِ عالم کی مراد بر آئے گی۔

شاہجہاں۔ کاش! لیکن ہر نقشہ اور ہر تجویز ہمارے لیے مایوس کن ثابت ہوئی ہے۔ وزیرِ سلطنت! ہم کب تک یوں بھٹکتے رہیں گے۔ ذہن کے پردے پر جو تصویر دیکھ رہے ہیں، کاش ہم اسے کاغذ پر اُتار سکتے۔ کاش اسے ہم بیان کر سکتے۔ ایسا لگتا ہے وزیرِ سلطنت! جیسے ہمارے تخیل کا وہ چاند ہمارے دل کے آنگن میں جگمگا کر ڈوب جائے گا۔ اگر ایسا ہوا تو ہم پاگل ہو جائیں گے۔ ہم نے اپنی جان سے عزیز ممتاز سے عہد کیا ہے وزیرِ سلطنت، ہم نے اپنی ملکہ سے عہد کیا ہے۔ یا خدائے برتر!

وزیرِ سلطنت۔ شہنشاہ عالم، صبر کیجیے، جہاں پناہ!

شاہجہاں۔ تم جا سکتے ہو وزیرِ سلطنت۔ ہم کچھ دیر کے لیے تخلیہ چاہتے ہیں۔

وزیرِ سلطنت۔ جو حکم عالی جاہ۔

(وقفہ)

(غم انگیز موسیقی ابھرتی ہے)

شاہجہاں۔ تم یقین رکھو ممتاز! ہم اپنی زندگی کی آخری سانس تک جدوجہد کریں گے۔ ہمیں سب کچھ یاد ہے ممتاز، ہماری آنکھوں کے سامنے وہ دن آج بھی گھوم رہا ہے جب تمہاری طبیعت کچھ ناساز تھی اور تم حرم خاص میں آرام کر رہی تھیں۔ ہم تم سے ملنے کے لیے آئے تھے لیکن تمہاری کنیز نے ہمیں اندر جانے سے روک دیا تھا۔ اور ہم نے تم سے باریابی کی اجازت چاہی تھی۔

(موسیقی کی ایک تیز لہر کے ساتھ فلیش بیک شروع ہوتا ہے)

کنیز۔ ملکۂ عالم، شہنشاہ عالم حرم خاص میں باریابی کی اجازت چاہتے ہیں

ممتاز محل۔ اوہ! شہنشاہِ عالم تشریف لائے ہیں جلو گل رُخ ہم خود ان کی قدم بوسی کے لیے چلتے ہیں۔

(ہلکا وقفہ)

شاہجہاں۔ کیا ہم اپنی ملکہ ممتاز سے مخاطب ہونے کا شرف حاصل کر سکتے ہیں؟

ممتاز۔ بسر و چشم عالم پناہ۔ میں تو بہت دیر سے چشم براہ تھی۔ آئیے تشریف لائیے

شاہجہاں۔ ہمیں خبر ملی تھی کہ تمہاری طبیعت قدرے ناساز ہے۔ ہم نے تمہارے آرام میں خلل ضرور ڈالا ہے لیکن دل کی بےچینی جب برداشت نہ ہوئی تو ضبط کے باوجود ہمارے قدم تمہاری آرام گاہ کی جانب اٹھ گئے۔ لیکن تمہارے جاں نثاروں نے ہمیں دروازے پر ہی روک دیا۔

ممتاز۔ کیوں، کون تھا وہ گستاخ؟

شاہجہاں۔ گستاخ نہیں تمہاری وفادار کنیز تھی۔ کہہ رہی تھی ملکۂ عالم کا حکم ہے کہ ان کی عشرت گاہ میں کوئی بغیر اجازت داخل نہ ہو۔

ممتاز۔ لیکن شہنشاہ کے لیے یہ حکم نہ تھا جہاں پناہ!

شاہجہاں۔ ہم تمہارے فرمان کی بھی ویسی ہی عزت کرتے ہیں جو اپنے فرمان کی کر سکتے ہیں۔ ہم مغلیہ سلطنت کے تاجدار ہیں اور تم اس تاجدار کی ملکہ۔ ہم اتنے بےادب تو نہیں کہ مغلیہ سلطنت کی ملکہ کے حکم کی تعمیل نہ کریں۔ اسی واسطے پہلے ہم نے باریابی کے لیے درخواست گزاری تھی۔

ممتاز۔ شہنشاہ! (مسرت کے جذبات سے مغلوب ہو کر) میرے سرتاج! میری قسمت پر تو خالق قسمت بھی رشک کرتا ہوگا۔ اس ناچیز کے لیے اتنا پیار، میرے دامن میں اتنی وسعت نہیں ہے جہاں پناہ! کہ میں اعلیٰ حضور کی محبت کے بیش بہا پھولوں کو اپنی جھولی میں سمیٹ سکوں۔ مجھے میرے ظرف سے زیادہ مل گیا۔ جہاں پناہ! بہت زیادہ۔ میں کہیں خوشی سے پاگل نہ ہو جاؤں میرے سرتاج

شاہجہاں۔ ملکہ!

ممتاز۔ میرے آقا!

(پس منظر میں ہلکی ہلکی حزنیہ موسیقی ابھرتی ہے)

شاہجہاں۔ کاش ہماری محبت تمہیں کچھ دے سکتی ممتاز! کاش ہماری بادشاہی بس ایک بار حُسن کی بارگاہ میں کوئی ایسا ہدیہ پیش کر سکتی جس سے چند ہی لمحوں کے لیے ہمارا سر بلند ہو سکتا۔ کاش ہمارے سر پر مغلیہ تاج کے بجائے کھلا ہوا آسمان ہوتا۔ ہمارے پیروں میں جاہ و حشمت کی یہ بیڑیاں نہ ہوتیں تو ہم اپنی ممتاز کو وہ سینہ چیر کر دکھا دیتے جس کے ہر گوشہ میں اس کی محبت کی شمعیں روشن ہیں ممتاز، ہم کتنے بدقسمت ہیں کہ ہم اپنی محبوبہ کی محبت کا خاطر خواہ اظہار بھی نہیں کر سکتے۔ کاش ہم شاہجہاں نہ ہوتے ممتاز!

ممتاز۔ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں میرے آقا، یہ جملے شاہجہاں کے شایانِ شان نہیں ہیں۔

شاہجہاں۔ ہمیں احساس ہے ممتاز محل لیکن ہم اس وقت شاہجہاں نہیں ہیں۔ ہم مغلیہ سلطنت کے تاجدار نہیں ہیں ممتاز! ہم ایک کنگال ہیں جو حسن کی بارگاہ میں بےدست و پا کھڑے ہیں۔

ممتاز۔ میرے سرتاج، حسن تو اعلیٰ حضور کی پاپوش کا ایک حقیر موتی ہے جس کی تابندگی سلطنتِ مغلیہ کے دم قدم سے قائم ہے۔ خدا ہزاروں

سالوں تک شہنشاہ عالم کا سایہ ہم پر قائم رکھے۔ ستارے بھی قطرہ کے سامنے شرمسار نہیں ہوتا عالم پناہ ہ جب سرزمین ہند کا شہنشاہ اپنی کم مائگی کا اس طرح مذاق اڑا سکے گا تو سلطنت کے ستون ہل جائیں گے اعلیٰ حضور! ممتاز محل کی روح چھلنی ہو جائے گی عالم پناہ جب آنے والی نسلیں یہ کہیں گی کہ کسی محبت کی خاطر شاہجہاں سے اپنے آباؤ اجداد کی امانت نہ سنبھل سکی۔ اس محبت کے صدقے عالم پناہ، لیکن ممتاز محل پر یہ داغ نہ لگا دیجیے گا۔ میرے آقا۔

شاہجہاں۔ ممتاز محل!

ممتاز۔ میرے آقا!

شاہجہاں۔ ممتاز محل! شاہجہاں اس بے ادبی کی معافی چاہتا ہے۔ سلطنت مغلیہ کے ناموس سے کھیلنے والے کو تمہارا قانون جو سزا دینا چاہے، دے۔ مجرم حاضر ہے۔

ممتاز۔ ہم غور کریں گے۔

(دونوں ہنستے ہیں۔ ایک لمحہ خاموشی رہتی ہے پھر ممتاز محل سلسلہ کلام جاری کرتی ہے)

ممتاز محل۔ میرا دل اس وقت بہت گھبرا رہا ہے اعلیٰ حضور۔ جی چاہتا ہے کچھ دیر کے لیے باغ میں ہوا خوری کے لیے چلی جاؤں اور

شاہجہاں۔ اور کیا؟

ممتاز محل۔ اور اعلیٰ حضور بھی میرے قریب ہوں۔

شاہجہاں۔ تو ہمیں اپنے ساتھ لینا ہے؟

ممتاز محل۔ زہے نصیب۔

شاہجہاں۔ ہم انکار نہیں کریں گے گو کہ ہم مصروف تھے لیکن ہماری ممتاز محل کے فرمان سے زیادہ کچھ بھی ضروری نہیں۔

ممتاز محل۔ شکریہ میرے سرتاج۔

(موسیقی کی لہر ابھرتی ہے اور کچھ دیر تک قائم رہتی ہے)

ممتاز محل۔ وہ صنوبر کا درخت دیکھ رہے ہیں عالم پناہ! اس کے پیچھے وہ مسکراتا ہوا چاند، کتنا خوبصورت منظر ہے۔

شاہجہاں۔ سبحان اللہ! بہت خوبصورت۔ ہم تو ایک عرصے سے چاندنی کا مزہ ہی بھول گئے تھے۔ ہمیں تمہارا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ تم نے ہمیں ایک کے بجائے دو چاند اور دو چاندنیوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع دیا۔

ممتاز محل۔ دوسرا چاند کیسا عالم پناہ! صرف ایک ہی چاند تو ہے، وہ دیکھیے صنوبر کے پیچھے۔

شاہجہاں۔ ہم اتنے دور کے چاند کو کیوں دیکھیں، ہمارے پہلو میں بھی تو ایک چاند ہے اس سے زیادہ خوبصورت اور اس سے زیادہ روشن، جس کی چاندنی سے شاہجہاں کی زندگی میں اجالا ہے۔

ممتاز محل۔ بندی تسلیم عرض کرتی ہے عالی جاہ۔

شاہجہاں۔ ممتاز، ہمارے ہاتھوں میں اپنا ہاتھ دو۔

ممتاز محل۔ یہ لیجیے عالم پناہ۔ آیئے سامنے کی روش سے نکل کر اس سنگ مرمر کے تخت پر بیٹھیں گے۔

شاہجہاں۔ تمہیں سنگ مرمر سے عشق ہے ممتاز، کیوں؟

ممتاز محل۔ چاندنی اور سنگ مرمر، جہاں پناہ خود ہی ملاحظہ فرمائیں۔ وہ سامنے تخت رکھا ہے۔ کس قدر پاکیزگی اور تقدس ہے اس کے سفید رنگ میں، اور پھر اس پر چاندنی کی پھوار، کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے کہ . . .

(یکبارگی غم انگیز موسیقی کی لہریں ابھرتی ہیں اور پھر کچھ دیر خاموشی رہتی ہے)

شاہجہاں۔ کہو ممتاز، یکبارگی خاموشی کیسی؟ تم کہہ رہی تھیں کبھی کبھی تمہارا دل چاہتا ہے کہ . . .

ممتاز محل۔ جہاں پناہ! (سسکیوں کے ساتھ رونے لگتی ہے)

شاہجہاں۔ ممتاز، یہ کیا ممتاز! تمہاری آنکھوں میں آنسو، ایسا کیا غم ہے جانِ شاہ۔ خدارا جلد بتلاؤ ورنہ ہم اس صدمہ کو برداشت نہ کر پائیں گے۔

ممتاز محل۔ (مضمحل لہجے میں) عالم پناہ، یہ آنسو مسرت کے آنسو ہیں۔ ممتاز محل اپنی قسمت پر ناز کر رہی ہے میرے سرتاج، میرے مالک نہ جانے کیوں اب زندگی کا یقین روز بروز دھندلا ہوتا جا رہا ہے۔ ایسا لگتا ہے عالم پناہ، جیسے ممتاز محل اب چند دنوں سے زیادہ

اعلیٰ حضور کی خدمت نہ کر پائے گی۔ جیسے.... جیسے قافلہ تھک سا گیا ہے اور اس کی منزل اب زیادہ دور نہیں رہ گئی ہے لیکن عالم پناہ! میری موت کتنی خوبصورت موت ہوگی، وہ لمحہ کتنا عظیم اور مبارک لمحہ ہوگا جب میں اپنے آقا کے قدموں پر آنکھیں جھپکی لوں گی۔

شاہجہاں۔ ممتاز محل، یہ کیا کہہ رہی ہو تم، ملکۂ من۔

ممتاز محل۔ سچ میرے آقا۔ ممتاز محل کے بطن نے چودہ بچوں کو حضور کے حوالے کیا ہے۔ حال کی ولادت کے بعد سے میری صحت سنبھلنے کو نہیں آئی۔ شاہی طبیبوں کا قصور نہیں ہے جہاں پناہ، مجھے ایسا لگتا ہے جیسے میرے جسم میں جان نہیں رہ گئی ہے۔ میری آنکھیں موت کو بہت قریب سے دیکھ رہی ہیں عالی جاہ۔

شاہجہاں۔ ہمیں اس طرح ویران نہ کرو ممتاز، نہیں تو اس کے تصور سے ہی ہمارا سینہ پھٹ جائے گا۔ شاہجہاں سے اس کی ممتاز کو کوئی نہیں چھین سکتا۔

ممتاز محل۔ موت برحق ہے میرے سرتاج، اس کے لیے شاہ و گدا سب ایک ہیں لیکن مرنے سے پہلے چاہتی ہوں کہ اپنی ایک خواہش کا اظہار کر دوں ورنہ میری روح کو سکون نہ ملے گا۔ یقین دلایئے کہ آپ میری موت کے بعد میری ایک آرزو پوری کریں گے۔

شاہجہاں۔ ممتاز، میری روح، سلطنت مغلیہ کا بادشاہ اپنی زندگی کی ایک ایک سانس تمھیں دینے کو تیار ہے۔ ملکہ جہاں! ان رگوں میں دوڑتی ہوئی بابری خون کی ایک ایک بوند تم پر سے نثار ہے۔ بادشاہی اور تاجوری تمھارے ایک ادنیٰ سے اشارہ کی منتظر ہے۔ اپنے ان حسین لبوں کو جنبش دو۔ دونوں جہاں کے دھڑکتے ہوئے دل تمھارے قدموں میں لا ڈالے جائیں گے۔ شاہجہاں کو تمھاری صدا کا انتظار ہے۔ بولو راحتِ جاں!

ممتاز محل۔ آپ کو مجھ سے بہت پیار ہے نا، عالم پناہ!

شاہجہاں۔ ہمارے دل پر زخم نہ لگاؤ ممتاز۔

ممتاز محل۔ تو اس محبت کو امر بنا دیجیے میرے آقا۔ اس محبت کو لافانی بنا دیجیے۔ جاودانی جو کبھی نہ مٹ سکے۔ ممتاز محل اور شاہجہاں کے پیار کی داستان کا ایک ایسا مقبرہ جو انسانی تخیل کی معراج ہو۔ ایک ایسا خواب جسے انسانی ہاتھ سنگِ مرمر میں ڈھال دیں، جس کا فرش چاندنی کے پیروں سے میلا ہو جائے۔ جس کے دقار اور تقدس کے آگے کلیوں کی حیا ماند پڑ جائے۔ ایک ایسا مقبرہ جس کے پاس سے صدیوں کی گھن گرج ادب و احترام کے ساتھ دبے پاؤں گزر جائے۔ چمن زار میں شبنم رات بھر بدروں کے سرگوشی کرتی رہے "اے ہواؤ، یہاں سے آہستہ گزرو یہاں ممتاز محل اپنے محبوب کے ساتھ میٹھی نیند سو رہی ہے"۔ بولیے میرے آقا، کیا میری موت کے بعد ایسا مقبرہ ممکن ہے؟

شاہجہاں۔ ممتاز، میری روح، اگر ہماری ممتاز اپنی کسی کنیز کی خاطر یہ آرزو کرے وہ ستاروں کے بستر پر سونا چاہتی ہے تو قسم ہے مغلیہ جاہ و عظمت کی، قسم ہے خدائے برتر کی، شاہجہاں آسمان کے ستاروں پر شب خون مار سکتا ہے۔ زمین پر کہکشاں اتار سکتا ہے۔ ملکہ! ہم سے ہماری آنکھوں کی روشنی لے لو۔ ہم سے ہماری تلوار کا جوہر اور ہمارے بازوؤں کی طاقت لے لو۔ ہم سے کہو کہ ہم صحرا کے غبار زاروں میں اپنے گریباں کی دھجیاں بکھیر دیں لیکن خدا کے لیے ہماری ممتاز کو ہماری آنکھوں کے سامنے موت کے حوالے نہ کرو۔

ممتاز محل۔ میرے شہنشاہ!

(فیڈ آؤٹ)

وزیر سلطنت۔ عالی جاہ! وزیر سلطنت باریابی کی اجازت چاہتا ہے۔

شاہجہاں۔ کون؟ ... ہمیں کس نے مخاطب کیا۔ اوہ! تم ہو وزیر سلطنت ہم کچھ دیر کے لیے اپنی ممتاز سے ملنے چلے گئے تھے۔

وزیر سلطنت۔ عالم پناہ! یوسف آفندی نامی ایک شخص اعلیٰ حضور کی خدمت میں حاضر ہوا ہے۔ کہتا ہے ایک نقشہ حضور کی نگاہ سے گزارنا چاہتا ہے۔

شاہجہاں۔ ہم ضرور ملیں گے۔ اسے اجازت دی جائے

(وقفہ)

(چاپوں کی آواز)

یوسف۔ سلطان عالم! یہ غلام بادشاہ ہند حضور شاہجہاں کی خدمت

مبارک میں باادب تسلیم بجا لاتا ہے۔

شاہجہاں۔ خوش آمدی نوجوان خوش آمدی۔ ہم مشتاق ہیں تمہاری کاوشوں کو ایک نظر دیکھنے کے لیے۔

یوسف۔ عالم پناہ! مغلیہ سلطنت لازوال ہے۔ جب تک کائنات کے ایک ایک ذرّے کا دل دھڑکتا ہے۔ حضور شاہ کا اقبال بلند رہے۔ یوسف آفندی کے ان حقیر ہاتھوں نے ایک جرأت کی ہے عالم پناہ۔ ملکہ ممتاز محل کی آخری خواب گاہ کا ایک خاکہ تیار کیا ہے۔ مجھے یقین ہے عالی جاہ، عالم موجودات میں اس حسن و رعنائی کی مثال نہ ملے گی۔

شاہجہاں۔ ہمیں اور بے تاب نہ کرو نوجوان آفندی۔ ہماری روح مضطرب ہے۔

یوسف۔ شہنشاہ عالم! میں نے کتنی ہی بستیوں کی خاک چھانی ہے۔ کتنی ہی زندہ و پایندہ تہذیبوں اور معاشرتوں سے ان کے جگر پارے مانگے ہیں۔ قسم ہے خدائے پاک کی سلطان عالم! اس خاکے کے ایک نقش و نگار میں کتنی ہی قوموں کے خوں لطیف کے دل دھڑک رہے ہیں۔ ایران کی محرابوں کے خم کا حسن، عرب کے گنبدوں کی دلنواز گولائی، مصر کے میناروں کی فلک پیما استواری، طوس کی وادیوں کے لالہ و گل اور ہندستاں کی گود میں بہتی ہوئی جمنا کا لمس مطہر میرے سلطان!

شاہجہاں۔ بس، بس کرو یوسف آفندی! اب ہم اسے اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں۔

یوسف۔ ملاحظہ فرمائیے جہاں پناہ!

(اس کے ساتھ موسیقی ابھرتی ہے)

شاہجہاں۔ مرحبا! آفندی مرحبا! لیکن یہ خواب تو نہیں ہے آفندی؟ بخدا بالکل وہی، وہی محرابیں، وہی دیوار و در، وہی نقش و نگار، ہم سچ کہتے ہیں آفندی، تم نے ہماری ممتاز کے خوابوں کو تعبیر بخش دی۔ آؤ، ہندستان کا شہنشاہ تمہارے ہاتھوں پر بوسہ لینے کی اجازت چاہتا ہے۔ وزیر سلطنت!

وزیر سلطنت۔ عالی جاہ!

شاہجہاں۔ جاؤ اور ملک کے کونے کونے میں اعلان کر دو کہ شاہجہاں کو جس کا انتظار تھا وہ خواب شرمندۂ تعبیر ہوا۔ سلطنت مغلیہ کے خزانوں کا منہ کھول دو۔ سنگ تراشوں سے کہو کہ پہاڑوں کے سینے چیر کر سنگ مرمر نکالیں۔ ہمیں آج مراد مل گئی۔ ممتاز! میری ممتاز محل!

(یکبارگی موسیقی کی ایک تیز لہر ابھر کر ڈوب جاتی ہے)

ممتاز محل۔ اس محبت کو امر بنا دیجیے شہنشاہ! ممتاز محل اور شاہجہاں کے پیار کی داستان کا ایک ایسا مقرہ جو انسانی تخیل کی معراج ہو۔ ایک ایسا خواب جسے انسانی ہاتھ سنگ مرمر میں ڈھال دیں جس کا زرّیں چاندنی کے پیروں سے میلا ہو جائے۔ جس کے وقار و تقدس کے آگے کلیوں کی حیا ماند پڑ جائے۔ ایک ایسا مقبرہ شہنشاہ! جس کے پاس سے صدیوں کی گھن گرج ادب و احترام کے ساتھ دبے پاؤں گزر جائے"

(کرب کے ساتھ) ممتاز! ایک لمحہ کے لیے واپس آ جاؤ۔ دیکھو ہم تمہارے لیے کیا لائے ہیں۔ ممتاز!

(موسیقی کی تیز لہر ابھر کر آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہے)

(فیڈ آؤٹ)



جھانسی کی رانی



طویل رزمیہ نظم کا ایک حصہ

وہ بہادر شاہ اپنا تاجدارِ آخری — مغلیہ شاہنشہوں کی یادگارِ آخری
تیری امداد و اعانت کے لیے تیار تھا — حفظِ آزادی کی خاطر برسرِ پیکار تھا
وہ زمیں بام وہ مردِ دلیر و تیغ زن — وہ جری راجہ کنور سنگھ اپنا تیر آزما
نانا صاحب وہ رفیقِ کہنہ وہ عالی نظر — تیغ در کف تھا حفاظت کے لیے سینہ سپر
آہ کیسا باوفا تانتیا ٹوپی کو ترا پاس تھا — ایسے مشکل وقت میں تیری ہی اک آس تھا
چاہتے تھے سب کہ انگریزوں سے پائیں نجات — ہو نہ آزادی اگر حاصل تو کیا لطفِ حیات؟
سب کی خواہش تھی کہ ہندوستاں آزاد ہو — یہ زمیں آزاد ہو یہ آسماں آزاد ہو

تھا مگر بدکوش تھے جاں وہ غدارِ وطن — جس کے ہاتھوں ہو گیا پامال گلزارِ وطن
وہ سدا شو راؤ حاکم ہو سہ خاندیش کا — بن گیا دشمن کی دلجوئی کو گھاتک دیش کا
ہو گئے بدظن کچھ خود اپنوں سے رشتہ توڑ کر — بن گئے غدار انگریزوں سے ناطہ جوڑ کر
ان کمینوں نے دلایا تجھ کو باغی کا خطاب — کیا نہ تھا ان کے لیے نارِ جہنم کا عذاب
لشکرِ انگریز کے ہمراہ ہر دو لعیں — جانبِ جھانسی بڑھے باصد ہزار آئیں
اس طرف تو کیل کانٹے سے مگر تیار تھی — دشمنوں کے خون کی پیاسی تری تلوار تھی
پھر بس وہ ارغوانی سر پہ تاجِ زر نشاں — واہ وا وہ تیرا گھوڑا، واہ تیغِ خوں چکاں
وہ دہکتی آگ آنکھوں میں وہ رُخ پر جلال — اس بھیانک روپ میں بھی تجھ سے پیدا تھا جمال
دی صدا تو نے اٹھو اے جاں نثارانِ وطن — آؤ اب میداں میں ہو جاؤ قربانِ وطن
لے لو بدلہ یہی تو امتحاں کا وقت ہے — "ہمدمو یہ خدمتِ ہندوستاں کا وقت ہے"
اقتضائے غیرتِ قومی ہے دشمن سے لڑیں" — "آج صد ہا کر دیں ہماری فتح کے جھنڈے گڑیں"
"بڑھ رہی ہے دشمنوں کی فوج اس گڑھ کی طرف — کھول کر پھاٹک بڑھو دشمن کی جانب صف بہ صف
"دیش کی خاطر ہمیں قربان ہونا چاہیے — "یہ ہمارا دھرم یہ ایمان ہونا چاہیے"
رن میں نکلے سنگ ناموسِ وطن کے پاسباں — سورما، سادات، غازی مردِ میداں تیغ زن
شمعِ آزادی پہ جل مرنے کو پروانے بڑھے — جذبۂ شوقِ شہادت لے کے مستانے بڑھے
باندھ کر سر سے کفن نکلے جوانانِ وطن — پاسبانی کو چلے وہ پاسبانانِ وطن

سونت کر تیغوں کو یہ خیبر شکن آگے بڑھے — صورتِ شیرِ ژیاں لشکر شکن آگے بڑھے
دشمنوں کی صف پہ اس تیزی سے دھاوا کر دیا — جس طرف رخ کر لیا، اک حشر برپا کر دیا
تیغ رانی کی رواں برقِ شعلہ بار تھی — دشمنوں کی فوج اک گرتی ہوئی دیوار تھی
دندناتے توپ خانے آگ برسانے لگے — مورچے والوں کو خاک و خوں میں تڑپانے لگے
لیے ہوئے بارود کے پھٹنے سے ہلتی تھی زمیں — گرمیِ پیکار سے لرزے میں تھا چرخِ بریں
گولہ باری کا دھواں گھوڑوں کی ٹاپوں کا غبار — [illegible] تلواروں کے وہ بھرپور وار
جوشِ جاں کی توپچے گولے تھے پیغامِ اجل — پی رہے تھے دشمنانِ کینہ جو جامِ اجل
گولہ بارود کی پھرتی برق کو شرما گئی — پیش گامی کرنیوالوں کے جگر دہلا گئی
گھڑ سواروں کے پرے یک لخت پیچھے کر رہ گئے — آگ کے سیلاب میں دستوں کے دستے بہہ گئے
کٹ رہے تھے سر دھڑا دھڑ اڑ رہے تھے دست و پا — عرصۂ پیکار میں ہر سو بپا تھا زلزلہ
اس طرح اکھڑے قدم دشمن کے پھر جمنے نہ پائے — بہہ گئے سیلاب میں جوں خار و خس تھمنے نہ پائے
لگ گئے کشتوں کے پشتے، خوں کے دریا بہے — بھاگ نکلے عرصۂ پیکار سے جو بچ رہے

فتح کا سہرا محبانِ وطن کے سر رہا
جو بھی تھا غدار جا کر دشمنوں میں مر رہا

بابو کرشن گوپال مغموم



ستیہ نرائن سنہا

غیر ملکی اقتدار کے خلاف ہندستان کی سرفروشانہ جدوجہد جو ایک اعلیٰ اخلاقی سطح پر کی گئی، بہادری اور جانبازی کی ایک ایسی داستان ہے جس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ستیہ گرہ کی حکمت عملی نے جس پر عمل پیرا ہو کر لاکھوں افراد نے ناقابل بیان مصائب برداشت کیے اور جانیں قربان کیں، سیاسی جدوجہد کو صداقت اور عدم تشدد کے ایک بے مثل روحانی تجربے میں تبدیل کر دیا۔ مہاتما گاندھی کی حوصلہ افزا سیادت میں اس جدوجہد نے 'ادھرم کے خلاف دھرم'، ناانصافی کے خلاف انصاف اور ظلم پسند طاقت کے خلاف اخلاقی قوت کی شکل اختیار کر لی۔

جلیانوالہ باغ کا سانحہ

جلیانوالہ باغ میں غیر مسلح اور پر امن مردوں، عورتوں اور بچوں پر وحشیانہ فائرنگ نے اور مارشل لا کے تحت عوام پر ڈھائے گئے مظالم نے ہندستانی دل کو رلا دیا۔ قوم کو ناقابل بیان حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ غصے سے بھرے ہوئے لوگ ایک ملک گیر احتجاج کی شکل میں متحد ہو گئے۔

گاندھی جی قوم کے عزم و وقار کے لیے نئی قیادت کی علامت بن گئے۔ اس واقعے نے ان کو، جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے، تعاون کے ایک پکے حامی سے پکے مخالف میں تبدیل کر دیا۔ انھوں نے برطانوی سرکار کو شیطانی سرکار اور اس کے اقتدار کو ایک 'لعنت' کہہ کر قوم کے غم و غصے کا اظہار کیا۔ مہاتما جی نے اعلان کر دیا کہ بھارتی عوام "راون راج" کو اب مزید برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور اسے ختم کرنے کے لیے برمحل قدم اٹھائیں گے۔ انھوں نے عدم تعاون کی اپنی تاریخی تحریک شروع کی اور لوگوں سے کہا کہ وہ بیرونی حکومت سے جس کا رشتہ اب نہیں شیطان سے، تمام تعلقات منقطع کر لیں اور اپنے بیرانی قوم کے وقار کی حفاظت کریں۔ انھوں نے لوگوں سے کہا کہ وہ تمام خطابات واپس کر دیں اور کونسلوں، عدالتوں اور تمام سرکاری اسکولوں اور کالجوں کا بائیکاٹ کریں۔ تاہم ایسا کرنے میں، انھوں نے کہا کہ پوری طرح عدم تشدد پر قائم رہیں۔ گاندھی جی نے قیصر ہند کا تمغہ واپس کر دیا جو انھیں پہلی جنگ عظیم کے دوران شاندار خدمات انجام دینے کے سلسلے میں عطا کیا گیا تھا۔ مہاتما گاندھی کی عدم تعاون کی یہ تحریک ہماری جدوجہد آزادی کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن موڑ ثابت ہوئی۔

اس وقت تک سیاسی سرگرمیاں بہم خواہ آزادی حاصل کرنے کی سرگرمیوں کے علاوہ شہری علاقوں میں تعلیم یافتہ طبقوں کے لوگوں کے ذریعہ عموماً عرضداشتیں پیش کرنے تک محدود تھیں۔ گاندھی جی نے سیاسی سرگرمی کو ان محدود علاقوں سے نکال کر قصبوں اور دیہات میں عوام الناس تک پہنچا دیا۔ ستیہ گرہ اور عدم تشدد کے اس عقیدے کو پھیلانے کے لیے انھوں نے ملک بھر کا دورہ کیا۔ انھوں نے عوام میں بیداری پیدا کی۔ ان کے دلوں میں جوش بھر دیا۔ جلسے جلوس روز مرہ کا معمول بن گئے۔ لاکھوں طلبا نے اپنے اسکولوں اور کالجوں کا بائیکاٹ کیا، وکیلوں نے عدالتوں کی اور عام انسانوں نے ہر ممکن انداز میں غیر ملکی اقتدار کی مخالفت کی۔

قومی جدوجہد کے طریق کار میں جب ۱۹۲۱ء کے قریب یہ موڑ آیا تو میں پٹنہ میں بی اے کا طالب علم تھا۔ گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون نے میں ذاتی طور پر متاثر نہیں تھا۔ اسکولوں، کالجوں، عدالتوں اور کونسلوں کا بائیکاٹ کرنے کے طریقے نے مجھے متاثر نہیں کیا تھا۔ تعلیمی

جھانسی کی رانی



طویل رزمیہ نظم کا ایک حصہ

وہ بہادر شاہ ایسا تاجدارِ آخری — مغلیہ شاہنشہوں کی یادگارِ آخری
تیری امداد و اعانت کے لیے تیار تھا — حفظِ آزادی کی خاطر برسرِ پیکار تھا
وہ مُبیں بانفعہ مردِ دلیر و تیغ زن — وہ جری راجہ کنور سنگھ ایسا تیرا پاسباں
نانا صاحب وہ رئیسِ کہنہ وہ عالی نظر — تیغ در کف تھا حفاظت کے لیے سینہ سپر
آہ کیسا تانتیا ٹوپی کو تیرا پاس تھا — ایسے مشکل وقت میں تیری ہی اک آس تھا
چاہتے تھے سب کے سب انگریز سے پائیں نجات — ہو نہ آزادی اگر حاصل تو کیا لطفِ حیات؟
سب کی خواہش تھی کہ ہندوستاں آزاد ہو — یہ زمیں آزاد ہو یہ آسماں آزاد ہو

تھا مگر مدہوش تھے جاں وہ غدارِ وطن — جس کے ہاتھوں ہو گیا پامال گلزارِ وطن
وہ سداشیو راؤ حاکم صوبۂ حادلستیں کا — بن گیا دشمن کی دلجوئی کو گھاتک دیش کا
ہو گئے غیروں کے، خود اپنوں سے رشتہ توڑ کر — بن گئے غدار انگریزوں سے ناطہ جوڑ کر
ان کمینوں نے دلایا تجھکو ناحق کا خطاب — کیا نہ تھا ان کے لیے نارِ جہنم کا عذاب
لشکرِ انگریز کے ہمراہ یہ دونوں لعیں — جانبِ جھانسی بڑھے باصد ہزار آئیں
اس طرف تو کیل کانٹے سے مگر تیار تھی — دشمنوں کے خون کی پیاسی تری تلوار تھی
پیرہن وہ ارغوانی، سر پہ تاجِ زرفشاں — واہ وا وہ تیرا گھوڑا، واہ تیغِ خونچکاں
وہ دہکتی آگ آنکھوں میں وہ رُخ پُر جلال — اس بھیانک روپ میں بھی تجھ سے پیدا تھا جمال
دی صدا تو نے اٹھو اے جاں نثارانِ وطن — آؤ اب میدان میں ہو جاؤ قربانِ وطن
اے دلیرو! آئے تیاگ و امتحاں کا وقت ہے — "ہندیو! یہ خدمتِ ہندوستاں کا وقت ہے"
"اقتضائے غیرتِ قومی ہے دشمن سے لڑیں" — "یوں جدھر کر دیں ہماری فتح کے جھنڈے گڑیں"
"بڑھ رہی ہے دشمنوں کی فوج اب گڑھ کی طرف" — کھول کر پھاٹک بڑھو دشمن کی جانب صف بہ صف
"دیش کی خاطر ہمیں قربان ہو جانا ہے" — "یہ ہمارا دھرم، یہ ایمان ہونا چاہیے"
رن میں نکلے ننگِ ناموسِ وطن کے پاسباں — سورما، سادات، غازی، مردِ میداں، تیغ زن
شمعِ آزادی پہ جل مرنے کو پروانے بڑھے — جذبۂ شوقِ شہادت لے کے مستانے بڑھے
باندھ کر سر سے کفن نکلے جوانانِ وطن — پاسبانی کو چلے وہ پاسبانانِ وطن

سونت کر تیغوں کو یہ جیر تکس آگے بڑھے — صورت قیصریاں لشکر شکن آگے بڑھے
دشمنوں کی صف پہ اس تیزی سے دھاوا کر دیا — جس طرف رخ کر لیا، اک حشر برپا کر دیا
تیغِ رانی کی رُبائی برقِ شعلہ بار تھی — دشمنوں کی فوج اک گرتی ہوئی دیوار تھی
دندنانے توپ جانے آگ برسانے لگے — مورچے والوں کو خاک و خون میں تڑپانے لگے
یہ رہے بارود کے چھٹنے سے ہلتی تھی زمیں — گرمیِ پیکار سے لرزے میں تھا چرخِ بریں
گولہ باری کا دھواں، گھوڑوں کی ٹاپوں کا غبار — مار دو، تو تیغی تلواروں کے وہ بھرپور وار
موت جاں کی تو تڑپے گورے تھے پیامِ اجل — پی رہے تھے دشمنانِ کینہ خو جامِ اجل
گولہ بارود کی بھڑکی برق کو شرما گئی — پیش گامی کر سواروں کے جگر دہلا گئی
گھڑ سواروں کے کئے یک لخت پیچھے کر رہ گئے — آگ کے سیلاب میں دستوں کے دستے بہہ گئے
کٹ رہے تھے سر دھڑا دھڑ اٹھ رہے تھے سنیا — عرصۂ پیکار میں ہر سو بپا تھا زلزلہ
اس طرح اکھڑے قدم دشمن کے پھر جمنے نہ پائے — بہہ گئے سیلاب میں جوں خار و خس بچنے نہ پائے
لگ گئے کشتوں کے پشتے، خون کے دریا بہے — بھاگ نکلے عرصۂ پیکار سے جو بچ رہے

فتح کا سہرا محبانِ وطن کے سر رہا
جو بھی تھا غدار جا کر دشمنوں میں مر رہا

باوا کرشن گوپال مغموم



ستیہ نرائن سنہا

غیر ملکی اقتدار کے خلاف ہندستان کی سرفروشانہ جدوجہد، جو اخلاقی سطح پر کی گئی، بہادری اور جاں نثاری کی ایک ایسی داستان ہے جس کی مثال انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ستیہ گرہ کی حکمت عملی نے جس پر عمل پیرا ہو کر لاکھوں افراد نے ناقابل بیان مصائب برداشت کیے اور جانیں قربان کیں، سیاسی جدوجہد کو صداقت اور عدم تشدد کے ایسے مثالی روحانی تجربے میں تبدیل کردیا۔ مہاتما گاندھی کی حوصلہ افزا قیادت میں اس جدوجہد نے 'ادھرم' کے خلاف 'دھرم'، ناانصافی کے خلاف انصاف اور ظلم پسند طاقت کے خلاف اخلاقی قوت کی شکل اختیار کرلی۔

جلیانوالہ باغ کا سانحہ

جلیانوالہ باغ میں غیر مسلح اور بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں پر وحشیانہ فائرنگ نے اور مارشل لا کے تحت عوام پر ڈھائے گئے مظالم نے ہندستانی دل کو دہلا دیا۔ قوم کو ناقابل بیان حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ غصّے سے بھرے ہوئے لوگ ایک ملک گیر احتجاج کی شکل میں متحد ہوگئے۔

گاندھی جی قوم کے مجروح وقار کے لیے نئی قیادت کی علامت بن گئے۔ اس واقعے نے ان کو، جیسا کہ انھوں نے خود کہا ہے، تعاون کے ایک سچّے حامی سے پکّے مخالف میں تبدیل کردیا۔ انھوں نے برطانوی سرکار کو شیطانی سرکار اور اس کے اقتدار کو ایک 'لعنت' کہہ کر قوم کے غم و غصّے کا اظہار کیا۔ مہاتما جی نے اعلان کر دیا کہ بھارتی عوام "راون راج" کو اب مزید برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور اسے ختم کرنے کے لیے ہر ممکن قدم اٹھائیں گے۔ انھوں نے عدم تعاون کی اپنی تاریخی تحریک شروع کی اور لوگوں سے کہا کہ وہ بیرونی حکومت سے "جس کا رہنما خدا نہیں شیطان ہے" تمام تعلقات منقطع کریں اور اپنی قوم کے وقار کی حفاظت کریں۔ انھوں نے لوگوں سے کہا کہ وہ تمام خطابات واپس کردیں اور کونسلوں، عدالتوں اور تمام سرکاری اسکولوں اور کالجوں کا بائیکاٹ کریں۔ تاہم ایسا کرنے میں، انھوں نے کہا کہ پوری طرح عدم تشدد پر قائم رہیں۔ گاندھی جی نے قیصر ہند کا تمغہ واپس کردیا جو انھیں پہلی جنگ عظیم کے دوران شاندار خدمات انجام دینے کے سلسلے میں عطا کیا گیا تھا۔ مہاتما گاندھی کی عدم تعاون کی یہ تحریک ہماری جدوجہد آزادی کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن موڑ ثابت ہوئی۔

اس وقت تک سیاسی سرگرمیاں ہم خیال افراد کی حال حال سرگرمیوں کے علاوہ شہری علاقوں میں تعلیم یافتہ طبقوں کے لوگوں کے ذریعہ عموماً عرضداشتیں پیش کرنے تک محدود تھیں۔ گاندھی جی نے سیاسی سرگرمی کو ان محدود علاقوں سے نکال کر قصبوں اور دیہات میں عوام الناس تک پہنچا دیا۔ ستیہ گرہ اور عدم تشدد کے اپنے عقیدے کو پھیلانے کے لیے انھوں نے ملک بھر کا دورہ کیا۔ انھوں نے عوام میں بیداری پیدا کی ان کے دلوں میں جوش بھر دیا۔ جلسے جلوس روزمرہ کا معمول بن گئے۔ لاکھوں طلبا نے اپنے اسکولوں اور کالجوں کا بائیکاٹ کیا، وکیلوں نے عدالتوں کی اور عام انسانوں نے ہر ممکن انداز میں غیر ملکی اقتدار کی مخالفت کی۔

قومی جدوجہد کے طریق کار میں جب ۱۹۲۱ء کے قریب یہ موڑ آیا تو میں پٹنہ میں بی۔ اے کا طالب علم تھا۔ گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون نے میں ذاتی طور پر متاثر نہیں تھا۔ اسکولوں، کالجوں، عدالتوں اور کونسلوں کا بائیکاٹ کرنے کے نظریے نے مجھے متاثر نہیں کیا تھا۔ تعلیمی

سرگرمیوں کو جیسا دیکھنے کی گاندھی جی کی اپیل کا میں مخالف تھا۔ کانگریس کے ناگپور اجلاس کے بعد ملک گیر دورہ کرتے ہوئے گاندھی جی پٹنہ آئے۔ تو انھوں نے ایک عظیم اجتماع سے خطاب کیا جس میں میں بھی موجود تھا۔ جلسے کے آغاز میں میرے ایک کلاس فیلو مورکس پرساد نے جو اعلیٰ صلاحیت کا شاعر تھا' ایک بھوجپوری گیت سنایا جو مجھے آج بھی یاد ہے

کا کرے گاندھی اکیل' تلک پرلوک گئے

ہے ڈھیر لوک سنگے' آپسے ہو دیریت گئے

(گاندھی اکیلے کیا کریں، تلک تو پرلوک سدھار گئے اگرچہ ہمارے ہی جوان بہت ہیں لیکن وہ آپس میں تقسیم ہو گئے ہیں)

اس گیت نے مجھ پر گہرا اثر ڈالا اور میری فکر کے دھارے کو یکسر بدل دیا جلسہ گاہ سے ہوسٹل واپس آتے ہوئے میں نے پڑھائی چھوڑ کر عدم تعاون کی تحریک میں شامل ہو جانے کا اٹل فیصلہ کر لیا اس اچانک تبدیلی خیالات پر میرے ہوسٹل کے ساتھیوں کو خوشی بھی ہوئی اور حیرت بھی۔ اب ہم سب تحریک میں پوری طرح شامل ہو چکے تھے۔ لیکن ایک سال کے اندر اندر ان میں سے تقریباً سبھی لوگ پڑھائی کے لیے واپس آ گئے لیکن میں باہر ہی رہا انھوں نے خط لکھ کر مجھ پر زور دیا کہ میں بھی کالج میں داخلہ لے لوں میں نے ان سے کہہ دیا کہ میرے لیے اب واپس آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرے ضلع کے رہنما نے مجھ سے دیہی علاقوں میں کام کرنے کے لیے کہا میری خدمات کو دیکھتے ہوئے جلد ہی مجھے سب ڈویژنل کانگریس کمیٹی کا سکریٹری بنا دیا گیا بہار کے شہری علاقوں کے مقابلے میں دیہات کے عوام پر گاندھی جی کی تحریک کا اثر زیادہ گہرا تھا۔

گاندھی جی نے عوام سے رابطہ قائم کرنے کے لیے بھگوت گیتا رامائن اور کبیر، نانک، تلسی، بھگت اور میرابائی کی تعلیمات پر خاص توجہ مرکوز رکھی اور انھیں قوم کے کاز (مقصد) کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کی ترغیب دی۔ انھوں نے لنگوٹی پہنی اور خود کو سرتاپا غریبوں جیسا بنا لیا ان کے ملک گیر دوروں' پرارتھنا سبھاؤں' تقریروں اور تحریکوں نے آزادی کے لیے ایک نا پیدہ خواہش پیدا کر دی اور لوگوں کے دلوں میں زندگی کے لیے ایک امید جگا دی۔

یہ وہ لوگ تھے جو پسماندہ اچھوت تھے اور صدیوں پرانی ذہنی' اقتصادی اور سیاسی غلامی کے سبب ہمت ہار چکے تھے۔

ایک عظیم ترین شخصیت

آزادی حاصل کرنے کے لیے لاکھوں افراد کو صداقت اور عدم تشدد پر عمل پیرا ہونے کی تعلیم دینے کا کام تقریباً ناممکن تھا لیکن گاندھی جی نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا اور غریبی اور جہالت کے اندھیرے میں پڑے ہوئے مختلف ذاتوں' فرقوں اور عقائد کے لوگوں کو ایک زبردست جنگی قوت کی صورت میں متحد اور مجتمع کر دیا ان کے ذریعہ جو لسانی انقلاب آیا اس نے ایک قومی جذبے کی تشکیل کی اور ستیہ گرہ' لاٹھی چارج اور فائرنگ وغیرہ قومی زندگی میں آئے دن کا واقعہ بن گئی۔ ان کی شخصیت ہی کا اعجاز تھا کہ جو بھی ان کے قریب آیا ان کی قربت کے فیض نے اسے گوشۂ گمنامی سے نکال کر عوامی زندگی میں ہیرو بنا دیا۔ انھوں نے عوام کو جرأت اور بے خوفی عطا کی اور لوگوں کو تحریک عمل بخشی اور ملک کے لیے جیل جانے والے مردوں اور عورتوں کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہوتا گیا۔ یہی نہیں تختۂ دار کی طرف جاتے ہوئے بھی ان کے ہونٹوں پر 'بندے ماترم' اور 'بھارت ماتا کی جے' کے الفاظ ہوتے تھے۔

آزادی حاصل کرنے کے لیے عدم تشدد کو اپنانا کوئی آسان کام تھا تاریخ انسانی ایسی مثالوں سے بھری پڑی ہے جب ملکوں نے پُرتشدد ذرائع ہی سے آزادی حاصل کی۔ جب گاندھی جی اپنے ستیہ گرہ کے تصور کے ساتھ ہندوستانی سیاست کے منظرِ عام پر آئے تو بالخصوص سیاسی جد و جہد کے صفِ اول کے رہنماؤں نے انھیں شک و شبہ کی نظر سے دیکھا انھوں نے گاندھی جی کے ستیہ گرہ کے اخلاقی تصور کی' جس میں تشدد کا شائبہ نہ تھا' سیاسی افادیت پر شبہ کیا لیکن دھیرے دھیرے لوگوں نے ستیہ گرہ اور عدم تشدد کو اپنا لیا کیونکہ یہ بھارتی ثقافت اور ہماری روایتوں کے مزاج کے عین مطابق تھا۔ یہ امر اس وقت اور بھی مشکل ہو گیا جب گاندھی جی نے وسیلے اور مقصود کی پاکی پر زور دیا اور پوری قوم سے عدم تشدد کی راہ پر چلنے کے لیے کہا ہندوستان جیسے وسیع ملک میں اس پر عمل درآمد

ہونا غیر ممکن سمجھا گیا۔ یہ شبہ اس وقت پختہ ہو گیا جب چوری چورا میں تشدد کا مظاہرہ ہونے پر گاندھی جی نے ستیہ گرہ تحریک کو معطل کر دیا۔ پرانے رہنماؤں نے کہا کہ انھوں نے بہادر ہندوستانیوں کی قربانیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے پورے معاملے ہی کو بگاڑ کر رکھ دیا تاہم گاندھی جی نے اصرار کیا کہ ملک جد و جہد کے لیے پوری طرح تیار نہ تھا انھوں نے اعلیٰ ترین قربانی دینے اور اعلیٰ اخلاقی اقدار حاصل کرنے کے لیے لوگوں کو تیار کرنا جاری رکھا قومی بیداری کے لیے انھوں نے کھادی سے ہریجن سدھار تک ہر قسم کی سرگرمیوں کو فروغ دیا

سوراجیہ پارٹی

پرانے رہنماؤں نے اختلاف جاری رکھا اور گیا کانگریس میں کونسل کا بائیکاٹ کرنے کے فیصلے کو پلٹ دینے کی بھرپور کوشش کی۔ گاندھی جی موجود نہیں تھے۔ لیکن ڈاکٹر راجندر پرساد اور سی۔ راجگوپال آچاریہ نے "عدم تعاون" کے پروگرام کا ثابت قدمی سے مقابلہ کیا اور پارٹی نیز عوام نے اس میں اپنے یقین کا اعادہ کیا۔

گاندھی جی ایک سادھو تھے انھوں نے ہندوستانی ثقافت کی بھرپور نمائندگی کی لیکن وہ ایک عظیم سیاست داں بھی تھے اور انھوں نے ان دونوں صلاحیتوں سے موثر انداز میں کام بھی لیا۔

کونسل میں داخلے کے سوال نے کانگریس میں گروہ بندی کو جنم دیا۔ کونسل کے حامی گروپ نے سوراجیہ پارٹی کی تشکیل کی جس کا صدر دیش بندھو سی آر داس کو اور سکریٹری پنڈت موتی لال نہرو کو بنایا گیا حکیم اجمل خاں، وٹھل بھائی پٹیل، این۔ سی کیلکر، ایس ستیہ مورتی اور ایم آر جیکر اس پارٹی کے ممتاز رکن تھے۔ اس وقت ایک سنسنی خیز واقعہ یہ رونما ہوا کہ ایک دہشت پسند بنگالی گوپی ناتھ ساہا نے پولیس کمشنر پر ایک بم پھینکا جس سے ایک اور انگریز کی موت ہو گئی۔

سوراجیہ پارٹی کے لیڈروں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جوہو اجلاس میں ایک ریزولیوشن منظور کیا جس میں ساہا کی بہادری کو سراہا گیا اور اس طرح بالواسطہ تشدد کو ہوا دی گئی تھی۔ گاندھی جی نے بستر علالت سے ساہا کی تعریف کی لیکن کہا کہ یہ طریقہ ہمیں کہیں کا نہ رکھے گا۔ انھوں نے تشدد کو فروغ دینے کی کوشش کی پر زور مخالفت کی اور اعلان کیا کہ عدم تشدد محض ایک پالیسی نہیں بلکہ ان کے ساتھ اظہار عقیدت کی ایک شرط ہے۔ یہ ریزولیوشن پاس نہیں ہو سکا تو دیش بندھو اور پنڈت موتی لال نہرو نے اسے محسوس کیا لیکن گاندھی جی نے ان پرانے لیڈروں پر کامیابی حاصل کر لی ینگ انڈیا کے اگلے شمارے میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں گاندھی جی نے اپنے اس کرب کا اظہار کیا کہ وہ ان دانشور شخصیتوں کو عدم تشدد کے راستے پر گامزن کرانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ انھوں نے لکھا کہ اس ناکامی پر انھیں خود بہت شدید محسوس ہوئی ہے۔

عدم تعاون اور سول نافرمانی سے لے کر ۱۹۴۲ء میں "بھارت چھوڑو" تحریک تک ایک لمبا سفر ہے جہاں قدم قدم پر آزمائشوں اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا سماجی، اقتصادی اور سیاسی ہر طرح کے مظاہرے اور تحریکیں یکے بعد دیگرے رونما ہوئیں اور ہر ایک نے آزادی کی خواہش کو ہی طاقت اور گیرائی عطا کی اور آخر کار وہ نقطۂ عروج بھی آیا جب ۱۴ اور ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کی آدھی رات کو ہندوستان اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوا اور بھارتی عوام کی صحیح معنوں میں نمائندگی کرنے والی مجلس آئین ساز نے خود مختار حکومت کی باگ ڈور سنبھالی۔ اور جب صدیوں پرانے آزادی کے خواب کی تعبیر ملی تو سارے ملک میں جوش اور ولولے کی لہر دوڑ گئی۔ لوگوں کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا

پارلیمنٹ کے مرکزی ہال میں نصف شب کی اس شاندار اور تاریخی تقریب کی یاد جس میں مجھے کانگریس پارلیمانی پارٹی کے جنرل وہیپ کی حیثیت سے شرکت کا موقع ملا تھا، میرے حافظہ میں ہمیشہ تازہ رہے گی۔ لال قلعے کی پرعظمت فصیل پر جب وزیر اعظم نے قومی ترنگا لہرایا تو وہ منظر دراصل تمام ہندوستانی شہریوں کی مقدس خواہشات کی عکاسی کر رہا تھا۔ لیکن جب یہ تاریخی دن آیا تو وہ انسان جس نے اس دن کے حصول کو ممکن بنا دیا تھا بنگال میں تھا اور فرقہ وارانہ جنون کے نتیجے میں زخمی ہونے والوں کی دل جوئی کر رہا تھا

گاندھی جی کی شخصیت اس قدر عظیم تھی کہ ان کی شہادت پر بالکل بجا طور پر کہا گیا کہ "آئندہ نسلیں اس پر مشکل ہی سے یقین کریں گی کہ واقعی گوشت و پوست کے ایک ایسے انسان نے اس دھرتی پر جنم لیا تھا"





زرینہ ثانی

زندگی خار زار میں گزری
جستجوئے بہار میں گزری

کچھ تو پیمانِ یار میں گزری
اور کچھ اعتبار میں گزری

منزلِ زیست ہم سے سر نہ ہوئی
یادِ گیسوئے یار میں گزری

پھول گریاں تھے ہر کلی لرزاں
جانے کیسی بہار میں گزری

زندگانی طویل تھی لیکن
موت کے انتظار میں گزری

آپ سے مل کے زندگی اپنی
جستجوئے قرار میں گزری

جو بھی گزری بُری بھلی ثانی
آپ کے اختیار میں گزری

۱۰ اگہن ۱۸۹۴ شک



نجیب رامش

عقل کی گمراہیاں جب دینِ انساں ہو گئیں
جسم کی پرچھائیاں تک شعلہ ساماں ہو گئیں

کل ہی بے منزل سی خوشبو کی طرح آوارہ تھا
جسم میں اترا تو سمتیں دشمنِ جاں ہو گئیں

خشک لب پر پیاس کا کڑوا نمک بکھرا رہا
بہتی ندیاں گھر کے آنگن سے گریزاں ہو گئیں

کور کو بھٹکا رہا ہے بے یقینی کا مزاج
فلسفوں کی سازشیں جب ذہن سے عریاں ہو گئیں

یہ ملا ہے وقت کے ہمراہ چلنے کا صلہ
استخواں آباد ہیں، روحیں بیاباں ہو گئیں

اب بھی آسودہ کہے دنیا تو میرا کیا قصور
رخ پہ ہاتھوں کی لکیریں تک نمایاں ہو گئیں

یہ اندھیرا۔ اور یہ ذرات کا رقصِ دوام
اور یہ آہٹ جس سے سانسیں تک پریشاں ہو گئیں

۲۶ جنوری ۱۹۷۳ء



راٹھویں ۵ جنوری ۳ء کو یوم محمد علی جوہر منایا گیا اس موقع پر گورنر اتر پردیش
جناب اکبر علی خان صاحب نے جلسہ کو خطاب کیا اوپر کی تصویر اسی موقع کی ہے



آزادی کی ۲۵ ویں سالگرہ کے سلسلے میں انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یوپی کے زیر اہتمام حضرت محل پارک لکھنؤ میں ایک عظیم الشان
نمائش کا انعقاد ہوا۔ تصویر میں بائیں جانب وزیر اعلیٰ یوپی شری کملاپتی ترپاٹھی نمائش کا افتتاح کر رہے ہیں
داہنی جانب دستکاری سے متعلق اسٹال کا اندرونی منظر



اساتذہ اردو جامعات ہند کی چوتھی کانفرنس کا جو لکھنؤ یونیورسٹی کے زیر اہتمام ۳۱ دسمبر ۱۹۷۲ء اور یکم و
دو جنوری ۱۹۷۳ء کو منعقد ہوئی بیگم حامدہ حبیب اللہ وزیر ریاست و صدر اردو اکاڈمی افتتاح کر رہی ہیں



پروفیسر احتشام حسین کے سوگ میں ۱۱ دسمبر ۱۹۷۲ء کو گنگا پرشاد
لکھنؤ میں ہونے والے تعزیتی جلسہ کو گورنر یوپی جناب اکبر علی خان خطاب
کرتے ہیں

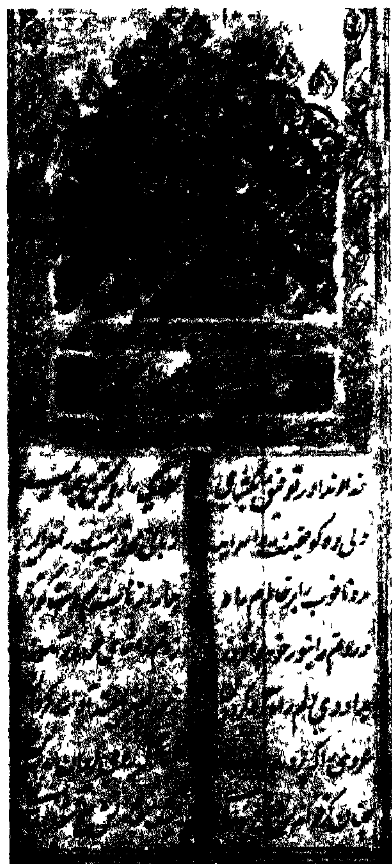
حال ہی میں پاکستانی یونیورسٹی لکھنؤ نے تیسیر ...
کا ایک نادر منظوم مخطوطہ حاصل کیا ہے یہ مخطوطہ مصور ہے۔
مصور صفحہ کی تصویریں دی جا رہی ہیں



← مدھوبنی مصوری کا ایک نمونہ











(بائیں جانب) ماہر سرود نواز سری رومی شنکر حضرت محل پارک لکھنؤ میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے
(داہنی جانب) ڈائرکٹر انفارمیشن یوپی شری تر ودیسی ترما، سنٹرل اسپورٹس اسٹیڈیم لکھنؤ میں یوتھ فیسٹول کے موقع پر
انعامات تقسیم کرتے ہوئے

تارا چودھری ٹھمری رقص میں کتھک اسٹائل پیش کرتے ہوئے



جشنِ جمہور

رہبر جونپوری

ہند ہے آج تصویر فردوس کی
ہے نگاہوں میں رقصاں نئی زندگی
آؤ دنیا کو دیں امن کی روشنی
ختم کر دیں زمانے سے ہر تیرگی
یومِ جمہوریہ کی منائیں خوشی

ذرے ذرے میں ہے آج اک بانکپن
نغمہ زن ہیں بہم آج گنگ و جمن
ایکتا کی ترنگے سے پھوٹی کرن
کیف و مستی میں ہر شے ہے ڈوبی ہوئی
یومِ جمہوریہ کی منائیں خوشی

ہو گئی سہل ہستی کی ہر رہ گزر
مل گیا ہے ہمیں رہبرِ معتبر
رہبری اب ہے اندرا کی ہر گام پر
کیوں نہ چومے قدم منزلِ آگہی
یومِ جمہوریہ کی منائیں خوشی

دیش میں کارخانوں کی بھرمار ہے
سبز و شاداب کھیتوں کی مہکار ہے
ہر طرف ڈیم کی شمع ضوبار ہے
قریہ قریہ میں ہے شہر کی دلکشی
یومِ جمہوریہ کی منائیں خوشی

آؤ زنجیرِ ظلم و ستم توڑ دیں
صلح کی سمت دنیا کا رخ موڑ دیں
نفرت و بغض کی ہر ادا چھوڑ دیں
شمع روشن کریں جگ میں ایثار کی
یومِ جمہوریہ کی منائیں خوشی

اس زمیں سے اہنسا کا آغاز ہے
تاج مرمر محبت کا غماز ہے
"شانتی" اپنے بھارت کی آواز ہے
امن کی راہ دنیا کو ہم سے ملی
یومِ جمہوریہ کی منائیں خوشی

۲۶ جنوری ۱۹۶۳ء

صبحِ جمہور

رضا امروہوی

تو ہر اک سال نئی شان سے آتی ہے مگر
مفلسوں کے لیے پیغام نئے لاتی ہے
فاقہ کش کے لیے لاتی ہے امیدِ فردا
ذرّے ذرّے کو عطا کرتی ہے ارماں کی کرن
تیری آمد ہو مبارک یہ دعا کرتا ہوں
آ، کہ تیرے لیے بیتاب رہا کرتا ہوں

تو مرے ہند کی عظمت کا حسیں پرچم ہے
صرف تیرے ہی تحفظ کے لیے دل والے
اپنی جانوں کی ہیں قدر سمجھتے کچھ بھی
یہ مسلّم ہے تقدس کی امانت تو ہے
تیری عظمت کے لیے جان فدا کرتا ہوں
آ، کہ تیرے لیے بے تاب رہا کرتا ہوں

تو مرے عزم و تمنا کا حسیں پیکر ہے
تو مرے خوابوں کی تعبیرِ حسیں شرحِ جمیل
قصرِ افکار میں رونق ہے ترے جلووں سے
تو مرے فن کا دمکتا ہوا اک ہیرا ہے
تیرے ہی عشق کے اشعار پڑھا کرتا ہوں
آ، کہ تیرے لیے بے تاب رہا کرتا ہوں

میں پرستار ہوں تو دیوی ہے اُس مندر کی
جس میں تہذیب و تمدن کے ہیں لاکھوں اصنام
ہند کی عظمت و رفعت کی نشانی تو ہے
عزم و ایثار کی محفل کا اُجالا تو ہے
تیری نصرت کے لئے عہدِ وفا کرتا ہوں
آ، کہ تیرے لیے بے تاب رہا کرتا ہوں

۶ر اگست ۱۹۶۳ء

اردو خطوط نگاری

محمد سمیع انصاری

خطوط نویسی ایک عوامی اور جمہوری عمل ہے۔ ہر وہ شخص جو تہذیب یافتہ یا نیم تہذیب یافتہ سماج میں رہتا ہے، خط ضرور لکھتا یا لکھواتا ہے۔ انسان جس سماج میں رہتا ہے اس سے اس کا گہرا ربط ہوتا ہے عزیز اقارب اور دوست احباب تو ہوتے ہی ہیں، اس کے علاوہ کاروباری رشتہ بھی ہوتا ہے جو اور بھی وسیع ہوتا ہے ہر شخص کو زندگی گزارنے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے، چاہے وہ زراعت اور دست کاری کرے یا نوکری اور تجارت۔ اس طرح پورے کا پورا معاشرہ اور اس کا ہر ایک فرد ایک دوسرے سے جڑا ہوتا ہے۔ انسانی ہمدردی کا جذبہ، دوست داری اور کاروباری زندگی نے ساری دنیا کے انسانوں میں ایک باہمی اور بہت گہرا رشتہ قائم کر دیا ہے۔ اس لیے پیغام رسانی کی ضرورت ہر انسان کو ضرور پیش آتی ہے۔

خطوط نگاری کے باب میں کوئی تحقیق اب تک ایسی نہیں ہوئی ہے جس سے پتہ چل سکے کہ اس کی تاریخ کتنی قدیم ہے لیکن اس کی تاریخی حیثیت اتنی ہی قدیم ہو سکتی ہے جتنی کہ تہذیب انسانی اور رسم خط کی ایجاد۔ رسم خط کی ایجاد تہذیب انسانی کی ابتدا کا لازمی جز تھی۔ سماج و معاشرے کی وسعت اور زندگی کی مصروفیات جب بڑھی ہوں گی تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ اپنی بات دوسروں تک بالمشافہ پہنچائی جائے۔ اس لیے تحریر کی ضرورت پیش آئی۔ جب انسان ابتدائی تمدنی دور میں جنگلی زندگی گزار رہا تھا تو اسے لکھنے پڑھنے کی ضرورت تھی اور نہ وہ اس سے واقف تھا لیکن انسان کا ذہن ترقی پذیر واقع ہوا ہے۔ اس نے بہت دنوں تک اس طرح کی زندگی گزارنا گوارا نہ کیا۔ ضرورتیں بڑھتی گئیں اور اسی کے مطابق وہ راہیں نکالتا گیا یعنی مائل بارتقا رہا۔ سماج و معاشرے کی تشکیل ہوئی۔ اپنی بات یا منہ سے نکلی ہوئی آواز کو پہچاننے کے لیے کچھ نشانات لکیروں کی شکل میں مرتب کیے گئے۔ یہی لکیریں رسم خط کہلاتی ہیں۔ رسم خط منہ سے نکلی ہوئی خالص یا مخلوط آواز کی مادی شکل ہے۔ رسم خط ہی کی مدد سے لفظ متشکل ہوتا ہے اور لفظوں کا بامعنی مجموعہ ایک پوری بات یا جملہ کہلاتا ہے مکمل جملے بذریعہ تحریر ہی ممکن ہیں۔ اس لیے کہ زبانی بات چیت میں ادائے مطالب کے واسطے اشارے کنائے اور حرکات و سکنات کا بھی دخل ہوتا ہے، اور پورا جملہ ادا بھی نہیں ہو پاتا کہ مخاطب مطلب و مفہوم سمجھ لیتا ہے۔ تحریر میں ان معاونین ادائے مطالب کا قطعی گزر نہیں معلوم ہوا کہ مخاطب کی غیر حاضری میں اس سے بات چیت کا ذریعہ تحریر ہی ہے۔ تحریر ابتدا سے آج تک پیغام رسانی ہی کے کام آتی رہی ہے۔ عربوں کے خیال میں تحریر کی ایجاد کا بنیادی مقصد (علم معلومات سے پہلے) محض پیغام رسانی اور جذبات یا معلومات کا ابلاغ تھا۔

جس طرح دیگر علوم و فنون کی ایجاد دنیا کے زیر سایہ ہوئی اسی طرح خطوط نگاری کی ابتدا بھی دنیا ہی کے سائے میں ہوئی۔ ہو سکتا ہے کہ قدیم تہذیب کے دوسرے مراکز میں بھی

مکتوب نگاری نے ترقی کی ہو لیکن اس کا پتہ اب تک نہیں چل سکا ہے۔ یہ بات کتنی حیرت انگیز ہے کہ روما میں خطوط نگاری کا آغاز تو ہوا لیکن وہاں اس فن کو عروج نہ حاصل ہو سکا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اہل روم شہری ریاستیں سیاسی اور جغرافیائی حالات کے تحت ٹکڑوں میں بٹ گئی تھیں۔ ہر ریاست ایک الگ دنیا سمجھی جاتی تھی۔ روم کا معاشرہ اور سماج اگرچہ ہر طرح سے ترقی کے نقطۂ عروج پر تھا لیکن معاشرت محدود تھی۔ عبادت گاہوں میں، کھیل کود اور ورزش کے میدانوں میں، دوستوں کی محفلوں میں لوگ آپس میں مل لیتے تھے اور دل کے غبار اور سر کے بوجھ کو ہلکا کر لیتے تھے۔ ایسے قریوں اور علاقوں کے علاوہ دوسروں کے وجود و عدم وجود کی انھیں فکر نہ تھی۔ خطوط نگاری کے لیے وسیع معاشرہ، زیادہ سے زیادہ لوگوں کو جاننے کی سہولت اور عملی زندگی سے واقفیت ضروری ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک ایسی زبان کی بھی ضرورت ہوتی ہے جس میں ہر طرح کے خیال کے اظہار کی صلاحیت ہو اور وہ زبان دور و نزدیک بولی اور سمجھی جاتی ہو۔ بہر حال یہ تمام خوبیاں اور خصوصیات سب سے پہلے روم ہی میں پائی گئیں۔ اس لیے مراسلت کی ایجاد کا سہرا بھی روم ہی کے سر بندھا۔ روم کی زندگی کا عکس اور اس کی معاشرت کی پرچھائیاں سسرو کے خطوط میں ملتی ہیں۔ ان خطوط میں سادگی جو خط کا اصل جوہر ہے، مفقود ہے۔ رومیوں کے مکاتیب کی زبان خطابت اور روزمرہ کی بول چال سے قطعاً مختلف ہے۔ اس زمانے میں خطابت کے اصول اور بلاغت کے قواعد خواص کی ذہنی تربیت کی پہلی منزل تھے۔ زندگی ایسے خاص ضابطے اور قوانین کی پابند تھی۔ اس لیے خطوط نگاری کے فن کو بھی اسی نہج پر مرتب کیا گیا۔

خطوط نگاری کی بہت سی قسمیں تھیں، جیسے مبارک باد کے خطوط، تعزیت نامے، تہنیتی خطوط، شاہی فرمان اور رقعات وغیرہ وغیرہ۔ ان تمام طرح کے خطوط اور تحریروں کے سلسلے آداب و القاب، ابتدا و انتہا کے اسالیب مقرر تھے۔ القاب و آداب کی کثافت ہی کیا کم تھی کہ بعد کی گفتگو بھی بلاغت کے تمام تر زیورات سے بوجھل ہوتی تھی۔

انگریزی ادب میں پندرہویں صدی عیسوی میں خطوط نگاری کی ابتدا کا پتہ ملتا ہے۔ اس سے پہلے انگلستان میں جو مکتوب لکھے گئے وہ لکھنے والوں کے ساتھ ہی دفن ہو گئے۔ صرف پندرہویں اور سولھویں صدی کے خطوط رقعات کی شکل میں موجود ہیں لیکن ان میں بھی القاب و آداب کا ہجوم حشر انگیز ہے۔ نشاۃ الثانیہ کے آغاز میں بہت سے اچھے خطوط نگاروں کا پتہ چلتا ہے لیکن ان کے مکاتیب بھی آغاز و انجام کے قاعدے میں جکڑے ہوئے ہیں اور ان میں وعظ و نصیحت کے سوا کچھ بھی نہیں۔ سترہویں صدی میں قدیم اطالوی خطوط کے ترجمے کیے گئے لیکن ان سے بھی خطوط نگاری کے باب میں کوئی قابل قدر اضافہ نہیں ہوا۔ جیمز ہاول، جو انگریزی میں خطوط نگاری کا پہلا امام مانا جاتا ہے، اسی دور کا آدمی تھا۔ اس کے خطوط میں بھی وہی ادبی تصنع کا التزام ہے۔ انھیں بجا ادبیت اور اصول و ضابطے سے اُدب کر لوگ آسان اور رواں دواں خطوط نگاری کی طرف مائل ہوئے اور آخر کار جون ہیرنگٹن، ولیم کوپر، گرے اور چارلس لیمب جیسے خطوط نگار منظرِ عام پر آئے، جنھوں نے آداب و القاب سے زیادہ نفس مطلب کی طرف توجہ دی اور خطوں کو دو افراد کے درمیان بے تکلف بات چیت کا ذریعہ بنا دیا۔

اردو خطوط نگاری کا جائزہ لینے کے سلسلے میں یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں نثر نگاری پر ایک طائرانہ نظر ڈال لی جائے۔ مجھے اس بات سے قطعی اختلاف ہے کہ کسی بھی زبان میں نثر سے پہلے نظم کا آغاز ہوا۔ کسی بھی زبان میں پہلے پہل بول چال، لین دین و نیز آپس میں گفتگو کا کام چلانے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور یہ سب باتیں نثر میں ہوتی ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد کا اپنی تصنیف "آب حیات" میں یہ لکھنا درست نہیں معلوم ہوتا کہ "یہ عجیب بات ہے کہ ایک بچہ پہلے شعر کہے پھر بات کرنا سیکھے"! اس جملے سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی زبان کو ابتدا ہی منطقی اور

موزوں کیسے بولا جا سکتا ہے جبکہ اس کے اجزا بکھرے پڑے ہوں۔ تاریخ شاہد ہے کہ ہندستان میں عربوں، افغانوں اور ایرانیوں کی آمد سے یہاں کی زبان میں ان کے الفاظ شامل ہو گئے اور یہ زبان سودا سلف کے لین دین کے کام آتی تھی۔ یقیناً اس کے لیے برجستہ مصرعہ یا شعر قطعی نہیں پڑھا جا تا رہا ہوگا۔ اصولاً ہر زبان کا آغاز معمولی الفاظ، آسان کاموں اور سہل باتوں سے ہوا کرتا ہے نہ کہ مقفّٰی اور مسجع عبارت یا موروں مصرعوں سے۔ البتہ یہ ایک مصدقہ امر ہے کہ ہر زبان میں نثر سے پہلے نظم ہی کی تصنیف و تالیف ہوئی اس کی وجہ یہ ہے کہ نظم، نثر کے مقابلے میں زیادہ موثر اور دل پذیر ہوتی ہے اور اس لیے لوگ اسے زیادہ پسند کرتے اور جلد ذہن نشین کر لیتے ہیں لہٰذا شاعری کی تخلیق پہلے منظر عام پر آ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زبان میں تاریخی اعتبار سے نظم ہی کو تقدیم حاصل ہے

اُردو کی پیدائش، یہ ضرور ہے کہ دہلی، آگرہ اور اس کے گرد و نواح میں ہوئی لیکن یہاں یہ زبان صرف بات چیت ہی کے کام آتی تھی، تحریر کے لیے فارسی ہی استعمال ہوتی تھی، جبکہ دکن میں اس زبان میں تصنیف و تالیف کا بھی کام شروع ہو گیا تھا۔ اردو کو پہلا صاحب دیوان شاعر قلی قطب شاہ دکن ہی کا تھا۔ ۱۳۴۷ء میں علاء الدین بہمنی نے دہلی کے پایۂ تخت سے بغاوت کر کے اپنی حکومت دکن میں قائم کر لی۔ یہ حکومت چونکہ بغاوت کر کے قائم ہوئی تھی اس لیے یہاں کے بادشاہ اور امراء نے دہلی سے الگ راہ اختیار کی۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں کی اردو میں اور دلّی کی اردو میں فرق پایا جاتا ہے۔ یہاں مقامی الفاظ کی زیادہ آمیزش تھی جبکہ دلی کی اردو میں عربی اور فارسی کے الفاظ زیادہ تھے

چنانچہ جب دہلی دربار میں فارسی کا دور دورہ تھا، اس وقت دکن کی نئی سلطنت میں اردو کا سرکاری طور پر دخل ہو گیا تھا۔ بہمنی سلطنت ایک اچھے نظام کے تحت چل رہی تھی اس لیے وہاں رفتہ رفتہ اچھے شاعر اور ادیب جو اردو میں لکھتے تھے دربار سے وابستہ ہونے لگے۔

اُردو کو ایک طرف سرکاری سرپرستی تو حاصل ہی تھی دوسری طرف صوفیوں اور مذہب کے مبلغوں نے جن کا زیادہ تر واسطہ عوام الناس سے ہوتا ہے، عوامی زبان میں اپنا تبلیغی کام سر انجام دینے لگے۔ اس طرح اُردو کو دوہری سرپرستی ملی، اُردو نثر کی پہلی کتاب معراج العاشقین ہے جسے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز (۱۳۲۶ – ۱۴۲۱ء) نے تصنیف کیا۔ کتاب کی تاریخ تصنیف معلوم نہیں۔ معراج العاشقین تصوف کا ایک مختصر رسالہ ہے۔ اردو نثر کی قدیم کتابوں میں میراں جی شاہ کی شرح مرغوب القلوب اور احکام الصلوٰۃ مشہور ہیں۔ اُردو کی پہلی ادبی کتاب وجہی کی سب رس ہے۔ جب بہمنی سلطنت آپس کے جھگڑوں سے ٹوٹ کر پانچ حصوں میں تقسیم ہو گئی تو ان پانچوں درباروں میں قطب شاہی دربار اور عادل شاہی دربار علم و فضل کی سرپرستی کرنے لگے۔ وجہی قطب شاہی دربار سے منسلک تھا۔ جب دکن کی حکومت کمزور ہو گئی تو اورنگ زیب نے دکن فتح کر لیا وہاں کے دربار ختم ہو گئے اور ادیبوں اور شاعروں کا اجتماع منتشر ہو گیا۔ مغل دربار کی زبان اب تک فارسی تھی لیکن دکن کی اردو نوازی دلّی کے شاعروں اور ادیبوں کو بھی اپنی طرف متوجہ کرتی رہی۔ لہٰذا شمالی ہند کی پہلی نثری تصنیف فضلی کی "دہ مجلس" ہے۔ دوسری اہم کتاب محمد حسین عطا خاں تحسین کی "نو طرز مرصع" ہے اس کے بعد فورٹ ولیم کالج کے تحت سلیس اردو میں کافی کتابیں لکھی گئیں۔ میرامن کی 'باغ و بہار'، حیدر علی بخش حیدری کی "آرائش محفل"، شیر علی افسوس کی "آرائش محفل" وغیرہ کتابیں ہیں۔ فورٹ ولیم کالج سے باہر سید انشا نے نثر میں "رانی کیتکی کی کہانی" تصنیف کی۔ اس کے بعد ۱۸۳۵ء میں اردو ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرکاری زبان ہو گئی۔ تب تو قوانین اور دوسرے سرکاری کاغذات بھی اردو میں جاری ہونے لگے۔ اردو کے اخبار بھی دہلی سے نکلنے شروع ہو گئے۔ لکھنؤ کے شاہان اودھ نے علوم و فنون پر بہت ساری کتابیں لکھوائیں۔ ماسٹر تارا چند نے طبیعات

(PHYSICS) اور کیمیا (CHEMISTRY)
پر کتابیں لکھیں۔ اس طرح اُردو میں علمی سرمایہ بھی اکٹھا ہوگیا۔

اردو خطوط نگاری کے سلسلے میں اردو نثر نگاری کا مختصراً جائزہ لینے کا مقصد یہ ہے کہ جب اتنے زمانے سے نثری تخلیقیں اور تصنیفیں وجود میں آتی رہی ہیں تو کیا وجہ ہے کہ اُردو میں خطوط نہیں لکھے گئے۔ دراصل اس وقت تک خط کو لوگ پڑھ کر پھاڑ دینے ہی کی چیز سمجھتے تھے۔ بادشاہوں کے فرمان اور خطوط ضرور محفوظ ہیں لیکن وہ ادبی مصرف کے نہیں ہو سکتے۔ اردو میں غالبؔ سے پہلے خطوط نگاری کا پتہ نہیں ملتا کہا جاتا ہے کہ اُردو میں غالبؔ نے سنہ ۱۸۵۰ء سے خط لکھنا شروع کیا۔ اُس وقت بہادر شاہ ظفرؔ نے انھیں خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے پر مامور کر دیا تھا۔ اور اسی مصروفیت کی بنا پر غالبؔ کو اُردو میں خط لکھنا پڑا۔ لیکن غالبؔ کے دو ایک خط سنہ ۱۸۴۸ء اور سنہ ۱۸۴۹ء کے لکھے ہوئے بھی مل گئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے بھی غالبؔ نے اُردو خطوط لکھے ہوں گے۔ غالبؔ کے اندر چونکہ قوت اجتہاد تھی اس لیے انھوں نے خطوط نویسی میں بھی اپنی ایک الگ "راہ" نکال لی اور اُردو خطوط کو ابتدا ہی میں ہر طرح کی خصوصیت سے معمور کر دیا۔ جس کی وجہ سے اُردو خطوط نگاری دنیا کی کسی بھی ترقی یافتہ زبان کی خطوط نگاری کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ اور اردو میں تو ایک صدی گزر جانے کے بعد بھی غالبؔ جیسا خطوط نگار پیدا نہ ہو سکا۔

"عود ہندی اور اردوئے معلیٰ ان ناموں سے دو مجموعے چھپ گئے ہیں جن میں مرزا غالبؔ کے خطوط بکثرت موجود ہیں۔ اس شہرت و اشاعت کے بعد ان کے مطبوعہ خطوط کی نقل تحصیل حاصل نہ سمجھنی چاہیے بلکہ اس حیثیت سے کہ اردو زبان میں خطوط نویسی کی ابتدا مرزا نے کی ہے، اس کتاب کے موضوع تاریخی۱؎ کو پیش نظر رکھ کر دیکھنا چاہیے کہ اس بلند خیال اور باکمال موجد نے ابتدا ہی میں وہ نمونہ دکھایا ہے جس سے بہتر اسّی برس کے بعد بھی آج ہم نہیں دکھا سکتے۔ ممکن ہے کہ تھوڑے بہت غور و تامل کے بعد چند لفظی متروکات کی فہرست پیش کی جا سکے مگر غیر ممکن ہے کہ ادائے مطلب کی خاطر نشینی اور طرز بیان کی دلکشی اس سے بہتر تو کیا برابر بھی لائی جا سکے۔ نتیجہ کلام یہ ہے کہ اس وقت تک ان کی تحقیقات میں مرزا غالبؔ اردو کے ایجاد مراسلت میں سب پر غالب ہیں۔"

اچھے خط اور اچھے خطوط نگار کی کیا خصوصیت ہونی چاہیے اور ادبی خطوط جو ایک مطالعہ کا اہم موضوع بن گئے ہیں، کیسے کہتے ہیں؟ انگریزی کی طرح اُردو میں بھی خطوط کی کمی نہیں۔ بہتیرے چھوٹے بڑے ادیبوں کے خطوط چھپ کر منظر عام پر آچکے ہیں مگر یہ سبھی خطوط مطالعے کی چیز نہیں۔ کیونکہ ادب کا مطالعہ جمالیاتی حس کو بیدار کرنے اور ذوق کی تسکین کے لیے کیا جاتا ہے "دو دو چار ہوتا ہے" یہ جان کر ہمیں کوئی مسرت یا رنج نہیں ہوتا۔ اسی طرح "ہم خیریت سے رہ کر آپ کی خیریت چاہتے ہیں" کا مطالعہ بھی ذہن و دماغ کو محظوظ نہیں کرتا۔ ذہن و دماغ اور روح کو مسرت بخشنے والا ادب ہی ہو سکتا ہے، اور خط بحیثیت خط ادب کی کوئی صنف نہیں کاروباری یا اخباری مراسلے ادب نہیں ہو سکتے۔ ان کے علاوہ وہ خطوط جو دو کے مابین گفتگو کے طور پر لکھے جاتے ہیں، ان میں خلوص اور بے تکلفی رہتی ہے، جو کسی شخص کی نفسیات کا مطالعہ کرنے کا موقع دیتی ہے اور "ہڈسن کے خیال کے مطابق "شخصی اور انفرادی تجربہ ہی ادب کی جان ہے" یہی اور پرائیوٹ خطوط ادب کی جان بن جاتے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالحق نے لکھا ہے۔

"خط دلی خیالات و جذبات کا روزنامچہ اور اسرار حیات۲؎

۱؎ تاریخ نثر اردو ص ۵۳ احسن مارہروی
۲؎ بحوالہ تنقیدی اشارے آل احمد سرور ص ۱۲

کا صحیفہ ہے اس میں صداقت وخلوص ہے جو دوسرے کلام میں نظر نہیں آتا خطوں سے انسان کی سیرت کا جیسا اندازہ ہوتا ہے وہ کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں ہوسکتا "

اس سے یہ ظاہر ہے کہ جب خط اشاعت کی غرض سے لکھے جائیں گے تو خلوص و بے ریائی جو خط کی جان ہے زائل ہو جائے گی اور اس کی جگہ تصنع اور تکلف لے گی آل احمد سرور کے الفاظ میں ۔

" اچھا خط وہ کہا جاسکتا ہے جس میں لکھنے والا اپنے مخاطب[1] سے باتیں کرتا ہوا نظر آئے جس میں بے تکلفی، بے ساختگی، خلوص، فطری رنگ، انفرادیت، ذاتی تاثرات کی جھلک ہو چنانچہ وہ خط جس میں جان بوجھ کر علمیت کی نمائش، انشا پردازی کی شان، تکلف کا اظہار، حماقت کا جوش دکھایا جائے خط نہیں مضمون ہیں "

بہرحال خطوط نگاری ایک ایسی صنف ادب ہے جو دوسری تمام صنفوں سے زیادہ انفرادی اور شخصی ہے ۔ اس میں خطوط نگار خود سے باتیں کرتا ہوا نظر آتا ہے ۔ بظاہر اس کا ایک مخاطب ہوتا ہے اور من و تو کے درمیان گفتگو شروع ہوتی ہے لیکن آخر میں من ہی من رہ جاتا ہے اور وہ اپنے دلی جذبات و کیفیات کا ہر ایک انداز سے بے تکلف ہو کر اظہار خیال کرتا ہے ۔ ایک تو خطوط نگار کو یہ احساس ہوتا ہی ہے کہ خط پڑھنے والا صرف اسی کا مخاطب ہے دوسرے درمیان خط لاشعوری طور پر وہ مخاطب کو بھول کر خود سے گفتگو کرنے لگتا ہے ۔ اسی لیے خط کو عبدالغنی صاحب نے " نقطۂ نظر " میں " بالواسطہ خود نوشت[2] سوانح عمری اور انانیتی ادب کی ہئیت " کہا ہے

یوں دیکھنے میں خطوط نگاری آسان ترین فن معلوم ہوتا ہے کیونکہ صرف گفتگو کو ضبط تحریر میں لانا کیا مشکل کام ہے، اگر زبان میں صلاحیت پیدا ہو چکی ہے لیکن بزبان قلم بات کرنا آسان نہیں تحریری زبان یا تو ادبی نفاستوں سے بوجھل ہو جاتی ہے یا پھر بالکل سپاٹ ہوتی ہے ۔ اس میں بہت کم لوگوں نے کامیابی حاصل کی ہے ۔ یوں تو ہزاروں لوگ روز ہی خط لکھا کرتے ہیں اور ان کے مخاطبین ان کے مطالب و مفاہیم آسانی سے سمجھ لیتے ہیں لیکن یہاں خطوط کی ادبی حیثیت سے بحث ہے اور وہ بھی ایسی کہ خط کو خط ہی ہونا چاہیے کوئی فن پارہ نہیں ۔ جہاں تک ادبی اور معیاری خطوط کا تعلق ہے ، یہ ایک مشکل ترین فن ہے ۔ یہ ادبی شیشہ گری اور آئینہ سازی سے کہیں مشکل ہے ۔ ڈاکٹر عبداللہ[3] لکھتے ہیں

" خط نگاری تو بذات خود ایک بڑا فن ہے اور اس میں کامیاب وہی ہوسکتا ہے جو قدرت کی طرف سے اس فن کا فیضان لے کر آیا ہو، خط نگاری کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے اس کے علاوہ اچھی خط نگاری ایک خاص شخصی ماحول پر بھی موقوف ہے، خط نگاری کے فن کی ایک عجیب خصوصیت یہ ہے کہ سب سے آسان فن ہے اور ہر اس شخص کے لیے سہل الحصول ہے جو اس کا قصد کرے لیکن تعجب انگیز بات یہ ہے کہ یہی آسان ترین فن، نازک ترین فن بھی ہے کیونکہ اس میں معیار تک پہنچنا کوئی آسان کام نہیں "

دراصل جو بھی علم یا فن بظاہر بہت آسان ہوتا ہے، اس میں معیار تک پہنچنا بہت مشکل ہوتا ہے ۔ سہل ممتنع اسی کو کہتے ہیں ۔ اس کی مثال یوں دی جاسکتی ہے کہ اردو شاعری میں غزل سب سے آسان، ہیئتی اعتبار سے معلوم ہوتی ہے اور اسی لیے اس صنف کو ہر شاعر نے اپنایا ۔ راہ چلتے قافیہ اور ردیف کے ساتھ مصرعے موزوں کر لیجئے، چلئے غزل کا ایک دو شعر ہو گیا

---

[1] تنقیدی اشارے آل احمد سرور صفحہ ۶۴

[2] نقطۂ نظر، عبدالغنی صفحہ ۳۷۲

[3] میر امن سے عبدالحق تک ۔ ڈاکٹر سید عبداللہ ص ۲۵۲-۵۳

۶ر اگست ۱۸۹۴ء انتقال

۲۶ر جنوری ۱۹۰۳ء

لیکن غزل کے معیار تک پہنچنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟ میر سے لے کر آج تک کے غزل گو شعراء کو پڑھو جائیے چند کے نام آئیں گے۔ میر، غالب، حسرت، جگر وغیرہ وغیرہ ویسے تو ہزاروں نے غزلیں کہی ہیں۔ اسی طرح خط ہر ایک انسان لکھتا ہے۔ لیکن اچھے خطوط نگاروں کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ یہ داخلی اور خارجی دونوں طرح کے خیالات کا ذریعۂ اظہار ہے۔ اس میں پورے معاشرے اور سماج کی حالت اور کیفیت واضح نظر آتی ہے۔ تاریخی، سیاسی، معاشی اور سوانحی امور کی حقیقت اس کی سطح آب پر موجزن ہوتی ہے۔ خط ہوتا تو ہے شخصی لیکن اس میں آفاقیت اور اجتماعیت کا جلوہ بھی ہوتا ہے اس کے مطالعہ سے معلومات کا خزانہ دستیاب ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کے معیار تک رسائی حاصل کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ لکھتے ہیں۔

" . . . خط بڑا نازک فن ہے یہ جگر گدازی بھی ہے اور آئینہ سازی بھی . . . . یہ مختصر اور محدود بھی ہے اور وسیع بیکراں بھی ہے یہ حد سے زیادہ شخصی بھی ہے مگر اس کے باوجود آفاقی اور اجتماعی بھی۔ اس میں دالش بھی ہے بینش بھی۔ بظاہر کچھ بھی نہیں مگر اس کا ہر ورق بیکراں تجربے معرفت کردگار اور معرفت انسانی دونوں کا یہ لکھنے والے کے لیے محض عرض سخن ہو تب بھی پڑھنے والے کے لیے گنجینۂ فن ہو سکتا ہے"[1]

غالب کے علاوہ سرسید، حالی، شبلی، اکبر الہ آبادی، مہدی افادی، منشی پریم چند وغیرہ کے خطوط کے مجموعے چھپ چکے ہیں۔ لیکن غالب کے خطوط سے ان کا قطعی مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں کچھ مجموعے تو ایسے بھی ملیں گے جو قصداً اشاعت کی غرض سے لکھے ہوئے خطوط کے ہیں۔ مثال کے طور پر ابو الکلام آزاد کے خطوط کا مجموعہ 'غبار خاطر' اور قاضی عبد الغفار کے "لیلیٰ کے خطوط" کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ پھر بھی اردو خطوط نویسی نے غالب سے کافی استفادہ کیا ہے اور یہ ادب کا ایک اہم موضوع بن گئی ہے ۔

---

[1] برامن سے عبد الحق تک ۔ ڈاکٹر سید عبد اللہ ص ۲۳۶



مصحفی کی زبان ——— (صفحہ ۲۲ کا بقیہ)

کیا ہوا ہے" (آب حیات صفحہ ۳۴۵) بلکہ آزاد نے اس طرح کے اشارے کیے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ معروف کا تو بس نام ہی ہے کلام تمام تر ذوق ہی کا ہے۔ بہر حال یہ اس بحث کا موقع نہیں معروف کے مستند ہونے میں تو آزاد کو شک نہ ہوگا۔ ان کا شعر ہے

دوستوں اول تو ہم کو وہ بلا سکتے نہیں
اور بلاتے بھی ہیں تو ہم جی چلا سکتے نہیں

یہ معروف کے اسی دیوان میں موجود ہے جو بقول آزاد تمام و کمال ذوق کا دیکھا ہوا ہے۔ ان سے بھی پہلے حکیم ثناء اللہ خاں فراق کہہ گزرے ہیں

آنکھ اس شوخ ستم گر سے لڑا بیٹھے ہیں
بس چلے یا نہ چلے، جی تو چلا بیٹھے ہیں

(تذکرۂ آزردہ (قلمی) کورپس کرسٹی کالج کیمبرج، عکس مملوکہ مختار الدین آرزو)

مصحفی کی زباندانی کے ذیل میں یہ اعتراضات کی تحقیق تھی جو محمد حسین آزاد نے آب حیات میں پیش کیے تھے۔ دوسرے معترضین کے اعتراضات سے آئندہ کسی موقع پر بحث کی جائے گی۔



غزل

کمال جائسی

اس سے ملے گا اگر دہن سا پایا جائے
سرحدِ شوقِ ملاقات یہ ٹھہرا جائے

آنچ بے کیفیِ حالات سے گزریں کیونکر
چل کے یہ شیخِ خرابات سے پوچھا جائے

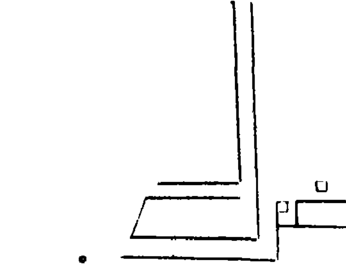
سمت و رفتار کے پابند نہیں اہلِ جنوں
وحشتِ دل کے تقاضوں سے نہ الجھا جائے

آ اداس چہرۂ گلنار کے جلووں کا سماں
نکہت و رنگ کے ماحول میں دیکھا جائے

ہر در و بام کو چھوتی ہوئی گزری ہے بہار
ہرا ہر زخم جگر کیوں نہ مہکتا جائے

کوئی پیغام کوئی حسنِ عمل پاس رہے
ڈوب کر سیلِ حوادث میں جو ابھرا جائے

دل کا ہر قطرۂ خوں نذر کروں گا میں کمالؔ
راہ میں سیلِ بہاراں کو نہ روکا جائے



کرنل۔ ایس۔ پی۔ سنگھ سوز

بہت اداس بہت بے قرار گزری ہے
خزاں کے رنگ میں ڈوبی بہار گزری ہے

رچی ہوئی ہے فضاؤں میں زلفِ یار کی بو
ابھی اِدھر سے نسیمِ بہار گزری ہے

جفائے یار سے گھبرا کے میری عمرِ عزیز
رہِ حیات میں بے اختیار گزری ہے

ہزار بار جلائے بجھائے میں نے چراغ
نہ پوچھ کیسے شبِ انتظار گزری ہے

مجھے نہ بھولے گی بزمِ نشاطِ مے خانہ
مری نگاہ سے کتنی ہی بار گزری ہے

نہ جانے کونسی وہ رہگذارِ الفت تھی
جہاں حیات بھی اے سوزؔ بار گزری ہے

ایک عظیم محب وطن

حضرت شاہ محمد اجمل الہ آبادی

اکمل اجملی

حضرت شاہ محمد اجمل الہ آبادی ہندستان کے مشہور و معروف خانوادہ شاہ افضل کے چشم و چراغ تھے جس کی بنیاد ہندستان میں عہد تغلق میں پڑی اور پھر رفتہ رفتہ یہ خاندان ترک وطن کرتا ہوا دہلی سے جون پور، وہاں سے سید پور بھتری ضلع غازی پور اور وہاں سے عہد شاہجہانی میں الہ آباد میں آکر اقامت پذیر ہوا۔ اس خاندان کے سب سے پہلے بزرگ مخدوم شاہ تاج الدین عربی سے ہندستان آئے اور سید پور بھتری ضلع غازی پور میں مستقل سکونت اختیار فرمائی۔ حضرت مخدوم شاہ تاج الدین کی دسویں پشت میں حضرت شاہ محمد افضل الہ آبادی شارح مثنوی مولانا روم کا نام سر فہرست ہے جنھوں نے سید پور بھتری ضلع غازی پور سے ترک سکونت فرمائی اور حسب الارشاد پیر و مرشد میر سید محمد کالپوی الہ آباد میں مستقل سکونت پذیر ہوئے۔ شاہانِ مغلیہ اس خاندان عالیشان کے زہد و تقویٰ علم و فضل سے واقف تھے۔ انھوں نے بڑی قدر و منزلت کی اور فرامین جاری کیے۔ بہت کافی زمینیں دیں اور زر سالانہ برائے خرچ درویشاں دائرہ مقرر کیا۔ حضرت شاہ محمد افضل الہ آبادی وصال گیارہ سو چوبیس ہجری (۱۱۲۴ھ) مطابق ۱۷۱۲ء، حضرت شاہ محمد یحییٰ معروف بہ شاہ خوب اللہ الہ آبادی وصال ۱۱۴۴ھ/۱۷۳۱ء اور حضرت شاہ محمد اجمل الہ آبادی کے نام شاہجہاں، عالمگیر، اورنگ زیب، شاہ عالم، فرخ سیر شاہان مغلیہ کے فرامین دائرہ شاہ اجمل کے سجادہ نشین حضرت مولانا حافظ شاہ سید احمد صاحب اجملی کے پاس موجود ہیں جن سے بادشاہوں کی نگاہ میں ان درویشان دائرہ کے رتبے پر روشنی پڑتی ہے۔ ان بزرگانِ دائرہ میں حضرت شاہ محمد افضل مختصر وصال ۱۱۲۴ھ/۱۷۱۲ء، حضرت شاہ خوب اللہ الہ آبادی وصال ۱۱۴۴ھ/۱۷۳۱ء، علامہ شاہ محمد طاہر شارح فصوص الحکم وصال ۱۱۴۲ھ/۱۷۳۰ء، علامۂ روزگار حضرت شاہ محمد فاخر زائرؔ محدث ہندی وصال ۱۱۶۴ھ/۱۷۵۰ء، علامہ دہر فرید العصر حضرت شاہ محمد ناصر افضلی مصنف جواہر خمسہ وصال ۱۱۶۳ھ/۱۷۴۹ء، علامہ شاہ غلام قطب الدین وصال ۱۱۸۷ھ/۱۷۷۲ء، حضرت شاہ محمد اجمل وصال ۱۲۳۶ھ/۱۸۲۰ء، حضرت شاہ ابو المعانی عالی وصال ۱۲۵۳ھ/۱۸۳۷ء، حضرت شاہ غلام اعظم افضل وصال ۱۸۵۸ء، حضرت سید شاہ علی رضا وصال ۱۱۹۳ھ/۱۷۷۸ء، حضرت سید شاہ علی جعفر وصال ۱۲۴۹ھ/۱۸۳۳ء، حضرت سید شاہ علی کبیر معروف بہ سید شاہ محمد میرن جان الہ آبادی مصنف جامع الشعراء وصال ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۷ء اور حضرت قطب الکبیر سید شاہ محمد بشیر الہ آبادی وصال ۱۹۱۸ء کے نام سر فہرست ہیں جنھوں نے علم و ادب کی خدمت کے ساتھ ساتھ قوم و ملک بلکہ عالم انسانیت کی خدمت کی ہے۔ ان تمام انفاس قدسیہ نے بلا قید مذہب و ملت ہر فرد کے زخم پر مرہم رکھا ہے۔ اس خانوادہ کا ہر فرد اپنے وقت کا عظیم صوفی، بلند پایہ مصنف، مشہور شاعر اور عظیم محب وطن گذرا ہے۔ ان تمام مشاہیر کرام کے حالات سے مشہور و معروف تذکرے بھرے پڑے ہیں۔

حضرت شاہ محمد اجمل الہ آبادی علامہ روزگار فرید العصر حضرت

شاہ محمد ناصر افضلی بن حضرت شاہ محمد یحییٰ معروف بہ حضرت شاہ خوب اللہ الہ آبادی برادر زادہ و داماد علامہ شاہ محمد افضل الہ آبادی شارح مثنوی معنوی "بین الجمہور" کے فرزند تھے نام محمد اجمل کنیت ابوالفضل اور لقب ناصر الدین تھا۔ ولادت آپ کی ۱۱ شوال سنہ ۱۱۶۱ھ ہجری مطابق ۱۷۴۸ء عیسوی بروز پنجشنبہ اسی دائرہ میں ہوئی جو آپ کے نام نامی و اسم گرامی سے منسوب ہے۔ حاکم الہ آباد نے آپ ہی کے نام نامی پر اس محلہ کا بھی نام دائرہ شاہ اجمل اور سڑک کا نام شاہ اجمل روڈ رکھا۔ آپ کی ذات والاصفات اسم بامسمیٰ تھی۔ فطرتاً نہایت ذہین اور صورتاً بہت حسین تھے والد بزرگوار زمانۂ طفولیت ہی میں داغ مفارقت دے گئے۔ مادر گرامی کی تعلیم و تربیت نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ ہم جنسوں میں فائق و ممتاز ہوئے اور مکتب ہی میں آپ کے جوہر نمایاں ہونے لگے ؎

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

آپ کے برادر عم زاد شاہ غلام قطب الدین مصیب بن شیخ المحدثین حضرت شاہ محمد فاخر محدث ہندی بن شاہ خوب اللہ الہ آبادی نے آپ پر شفقت بزرگانہ مبذول فرمائی اور تعلیم و ارشاد کی طرف توجہ دی۔ استاد کے فیوض و برکات نے چار چاند لگا دیے۔ گیارہ سال کی عمر میں مجالس و محافل میں تقریر کرنے لگے۔ چھبیس سال تک برادر موصوف کی خدمت بابرکت میں کسب کمالات و تحصیل علوم میں مصروف رہے۔ علوم فارسیہ و عربیہ، منطق و فلسفہ، معانی و بیان تفسیر و حدیث، فقہ و عروض غرض کہ جملہ علوم متداولہ آپ نے بدرجۂ اتم حاصل فرمائے۔ برادر موصوف کے علاوہ مولانا محمد فصیح جون پوری و مولانا محمد اسلم الہ آبادی مرید و خلیفہ جد بزرگوار خلیفۂ راستین حضرت مولانا محمد یٰسین جون پوری مرید و خلیفہ برادر عم زاد مولانا محمد ناصح مرید جد بزرگوار، قاضی القضاۃ محمد مسعود خاں شاگرد و مرید حضرت شاہ محمد ناصر افضلی والد بزرگوار حضرت موصوف، نواب محمد عاشق خاں مرید و خلیفہ والد بزرگوار سے بھی استفادہ کیا۔ کسب کمالات ظاہری و باطنی کے بعد سجادۂ مشیخت پر متمکن ہوئے اور اپنی کریم النفسی، سخاوت، دریا دلی، فیاضی، تبحر علمی سے مخلوق خدا کی خدمت کی۔ اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ جو فرامین شاہان مغلیہ کے بموجب ہوتی تھی، محتاجوں، غریبوں اور حاجت مندوں کو صبح سے شام تک تقسیم کرتے رہتے۔ دائرہ کا مدرسہ جو خلیفہ منڈی میں قائم تھا، اس کے تقریباً آٹھ سو طالب علموں کو دونوں وقت کا کھانا ناشتہ اور کپڑا ماہ بماہ آپ ہی کے ذمے تھا۔ تنور ہر وقت گرم اور غربا و مساکین کو کھانا تقسیم ہوتا رہتا۔ عرب و عجم سے علمائے کرام صوفیائے عظام اور مشاہیر انام آپ کی شہرت سن کر زیارت کی خاطر حاضر خدمت ہوتے اور آپ ہی کے مہمان ہوتے آپ کی ذات والاصفات مرجع خلائق تھی۔

حضرت شاہ صاحب موصوف کا زمانہ ہندوستان میں سیاسی اعتبار سے ایک نہایت پرشور زمانہ تھا۔ سلطنت مغلیہ میں انتشار و زوال کے آثار نمایاں تھے اور ہر طرف طوائف الملوکی پھیلی ہوئی تھی۔ فرنگیوں کے ہاتھ تیزی و سرعت سے سلطنت مغلیہ کی جڑ کھودنے میں منہمک و مصروف تھے۔ ان کی طاقت نے شاہ عالم ثانی کو بھی بے دست و پا کر دیا تھا۔ ہر فرد پر انگریزوں کا رعب و دبدبہ چھاتا جا رہا تھا مگر شاہ صاحب موصوف نے کبھی ان کی پرواہ نہیں کی اور تا زندگی غیر ملکی حاکموں کے خلاف صف آرا رہے۔ ایسے وقت میں جانثاران و فدایان وطن کا ساتھ دینا اور روز افزوں بیرونی اقتدار کے خلاف قدم اٹھانا مصیبتوں اور پریشانیوں کو گھر بیٹھے دعوت دینے کے مترادف تھا لیکن شاہ صاحب نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی اور مادر وطن کی محبت کو مادی خوشیوں اور راحتوں پر قربان نہیں کیا۔ شاہان اودھ میں سے نواب شجاع الدولہ نے بھی بعض اختلافات کی وجہ سے آپ کی معافی جو سلاطین مغلیہ نے دی تھی، ضبط کر لی لیکن آپ کی فیاضی، کریم النفسی اور دریا دلی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آپ نے اپنی معافی کی ضبطی کے سلسلے میں ایک قطع کی صورت میں شجاع الدولہ کو تنبیہہ کی ہے جس سے اس واقعہ کی صحت پر روشنی پڑتی ہے:

اے ضبط نمودہ تو دیہات مرا ہم ضبط شود دولت تو از قہر خدا

زیں شیوۂ ناصواب باز آ باز آ　　ورنہ تو سزائے خویش یابی با خدا

(اے میرے دیہاتوں (معافی) کو ضبط کرنے والے تیری سلطنت خدا کے قہر سے ضبط ہو جائے۔ اس برے کام سے باز آ ورنہ خدا کی قسم تو اپنی سزا کو پہنچے گا۔)

اس قطعہ کے رقم کرنے کے ایک ماہ بعد نواب شجاع الدولہ راہیِ ملکِ بقا ہوا اور آپ کے امتحان کا زمانہ ختم ہوا۔ نواب شجاع الدولہ کے جانشین نواب آصف الدولہ نے معافیاں واگذاشت کر دیں لیکن انگریزوں نے شاہ ابوالمعالی کے زمانے میں جو آپ کے بیٹے تھے وہ معافیاں حب الوطنی کے جرم میں ضبط کر لیں۔ معافی کے ضبط ہوتے ہی سارا انتظام درہم برہم ہو گیا۔ یہ واقعہ آپ کے خاندان عالی شان کی پریشانی کا باعث ہوا۔ مدرسہ ختم ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ دائرہ کا علم و فضل عروج و کمال سب کچھ ختم ہو گیا۔

حضرت شاہ محمد اجمل الہ آبادی علم و فضل، عرفان و کمال میں اپنی نظیر آپ تھے۔ ہر شخص آپ کی طرف کھنچا چلا آتا تھا جس میں شاہ و گدا، امیر و فقیر، عوام و خواص کی کوئی قید نہیں۔ شہنشاہ ہند شاہ عالم کو آپ سے کمال عقیدت تھی۔ جب بھی الہ آباد میں تشریف لاتے تو دورانِ قیام میں حضرت شاہ صاحب موصوف سے برابر ملاقات رہتی۔ کبھی شاہ صاحب قلعہ میں تشریف لے جاتے اور کبھی شاہ عالم خود درِ شاہ اجمل پر حاضر ہوتے۔ آپ کے برادر عم زاد حضرت شاہ غلام قطب الدین مصیب جب حج کی خاطر حرمین الشریفین جانے لگے تو شاہ عالم کی خواہش پر دہلی تشریف لے گئے اور وہاں شاہ عالم کے خصوصی مہمان رہے۔ شاہ اجمل صاحب موصوف کے بارے میں شاہ عالم نے بہت دیر تک گفتگو کی اور ان کی خیر و عافیت پوچھتے رہے جس کو آپ نے نظم فرمایا ہے۔

در عین حوادث زمانہ　　شد داخل دہلی آں یگانہ
چوں شاہ شنید مقدم او　　کردار پئے دیں اونگ و دو
لیکن از خوف کافراں دل　　در قلعہ نشستہ بود محزوں
در پیش طلب نمود ناچار　　اکرام ز حد نمود بسیار
برخاست ز جا و پیش آمد　　در لطف ز حد و بیش آمد

حرفے کہ گفت شاہ اول　　پرسید کہ ہاں کجاست اجمل
گو یک دم از یں جناب والا　　ہرگز گاہے نگشتہ تنہا

القصہ جناب شاہ بسیار
تا دیر زمن نمود تکرار

حضرت شاہ صاحب موصوف سے اور شہنشاہ شاہ عالم سے برابر خط و کتابت رہی۔ بہت سے خطوط نظم کی صورت میں دیوان میں موجود ہیں۔ نوابین اودھ سے بھی آپ کے تعلقات رہے اور خط و کتابت بھی رہی۔ چنانچہ دائرہ میں آپ کی زیارت و ملاقات کی خاطر نواب شجاع الدولہ، نواب آصف الدولہ، نواب حیدر بیگ خاں و دیگر نوابین اودھ، شاہانِ ہند، مشائخ ذوی الاحترام، صوفیائے عظام، علمائے اعلام و شعرائے کرام تشریف لاتے جن میں شاہ عالم، شجاع الدولہ، آصف الدولہ، حیدر بیگ خاں، مولانا سید احمد بریلوی، مولانا اسماعیل شہید، مولانا عبدالحی لکھنوی علامہ احمد یمنی شروانی کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، بحرالعلوم مولانا عبدالعلی، ارکانیِ ابن مولانا مدن لکھنوی، میر انشاء اللہ خاں مصدر، میر انشاء اللہ خاں انشاء، میر حسن، میر تقی میر، علامہ تفضل حسین کشمیری، امجد علی مرزا ولاد سلاطین صفویہ مرزا حاتم بیگ دانی، مولوی نورالعین واقف، مرزا حکیم بیگ خاں صاحب تذکرۂ مردم دیدہ، مرتضیٰ قلی خاں فراق مرزا اشرف علی فغاں، نواب احمد علی عشرت، مرزا فاخر مکین، مرزا افضل علی ذاکر، نواب محبت خاں شیفتہ، شیخ علی حزیں جیسے مشاہیر کرام سے آپ کے بہت اچھے تعلقات تھے۔ یہ حضرات جب الہ آباد تشریف لاتے آپ سے شرفِ ملاقات حاصل کرتے یا آپ ان کے دیار میں تشریف لے جاتے تو ان کے مہمان ہوتے۔ ان حضرات سے برابر خط و کتابت رہی۔ بہت سے مشاہیر کرام کے خطوط حضرت مولانا شاہ سید احمد صاحب اجملی سجادہ نشین دائرۂ شاہ اجمل کے پاس موجود ہیں جن سے شاہ صاحب موصوف اور مشاہیر عصر سے تعلقات قلبی و دلی پر روشنی پڑتی ہے۔

شاہ صاحب موصوف کو ہندستان جنت نشان سے بہت

محبت و عقیدت تھی۔ مادرِ وطن کی حفاظت کے لیے اور غیر ملکی
اقتدار پسندوں کے ناپاک ارادوں سے آپ بے حد متفکر ہی نہ
رہتے بلکہ ان کے ناپاک ارادوں کو خاک میں ملانے اور ان کے شکنجوں
سے ملک کو چھڑانے کے لیے آپ برابر کوشاں بھی رہتے۔ آپ نے عملی
طور پر ہندستان کی آزادی میں حصہ لیا۔ جب تک جسمِ ناتواں
میں جان باقی رہی اپنے پیارے وطن کی آزادی کے لیے سب کچھ
کر گزرے اور براہِ راست انگریزوں سے ٹکرائے۔ علی حزیں جیسے
مخلص دوست نے جب ہندستان کی ہجو لکھنی اختیار کی تو آپ
اسے برداشت نہ کر سکے اور آپ نے علی حزیں کی رباعیوں کا منھ
توڑ منظوم جواب دیا جس سے دونوں حضرات میں تلخی بڑھ گئی اور
تعلقات خراب ہو گئے۔ مگر آپ نے پرواہ نہ کی۔ آخر میں علی حزیں نے
ہندستان کی ہجو سے سکوت اختیار کیا اور آپ کے برادرِ عزیز
قطب الدین منیب کو ایک خط لکھا جس کا یہ فقرہ "آں جوان الہ آبادی
ناطقہ ام بند کردہ است و ارا منع باید کرد" بہت مشہور رہے۔ جب آپ
کی رباعیاں ہندستان کی مدح کی صورت میں علی حزیں تک پہنچیں
تو انھوں نے اپنے طرز کو بدلا اور شاہ صاحب موصوف سے طالب
معافی ہوئے اور ایک قصیدہ آپ کی شان میں لکھا جس کا یہ شعر
مشہور ہے ؎

یا حارلی تو صدقوے صدرت بجد   ذا اجمل الہدایا یا اکمل الکلامی

فریقین کی رباعیاں درج ذیل ہیں۔ حضرت شاہ اجمل الہ آبادی
کی رباعیاں اپنے اندر حب الوطنی، وسیع قلبی، اور مادرِ وطن سے
عقیدت و محبت کا جذبہ رکھتی ہیں۔ بیشک مادرِ وطن ایسے مایۂ ناز
سپوتوں پر ناز کرے گی اور حب الوطنی وطن پر کوئی وقت آئے گا
ان کی قربانیاں جو انھوں نے عملی اور قلمی کی ہیں وہ ہمارے
لیے مشعلِ راہ ثابت ہوں گی

رباعی علی حزیں

دیدم سوادِ ہند حسرت زار است   رو در یکہ دم چوں شامِ ہجراں تار است
بستہ است بکار ہمہ شاہ بحت گرہ   الا گرہے کشادہ در شلوار است

(ترجمہ۔ ہم نے دیکھا کہ ہندستان کے نظاروں پر حسرت برس رہی
ہے اور دن ایسے سیاہ ہیں جیسے ہجر کی شام۔ یہاں کے لوگوں کے
تمام کام قسمت کی گرہ سے بندھے ہوئے ہیں سوائے شلوار کی اس
گرہ کے جو کھلی ہوئی ہے۔)

رباعی شاہ اجمل

صبحِ طرب ہند چو روے یار است   شامِ خوش او کاکلِ دلدار است
ایں حالت کشادہ صد ہزاراں در فیض   جز اک گرہے کہ بستہ در شلوار است

(ترجمہ۔ ہندستان کی صبحِ طرب معشوق کے چہرے کی طرح ہے۔ اور اس
کی خوب صورت شام محبوب کی زلف کی مانند ہے۔ یہ جگہ ہندستان
لاکھوں فیوض کے ساتھ کشادہ ہے سوائے ایک شلوار کی اس گرہ
کے جو بندھی ہوئی ہے۔)

رباعی شیخ علی حزیں

ہجرت ز عقوبتم داد بہ ہند   از ہند جگر خارہ مکن یاد بہ ہند
عصیاں برہ جہنمی بردمرا   آدم ز فضاے خلد افتاد بہ ہند

(ترجمہ۔ ہجرت کی سزا کے واسطے مجھے ہندستان پہنچایا۔ ہندستان
کے فکر سے میں اپنے کلیجہ کو کھاتا ہوں۔ خدا کی نافرمانی مجھے جہنم کے
راستہ کی طرف لے جاتی ہے۔ آدم اپنی نافرمانی سے جنت کی فضا
سے ہندستان میں پھینکے گئے۔)

رباعی شاہ اجمل

اے ہاجیِ ہند باش دل شاد بہ ہند   شیراز و صفاہان را مکن یاد بہ ہند
ہند است کہ نعم البدل فردوس است   آدم ز فضاے خلد افتاد بہ ہند

(ترجمہ۔ اے ہندستان کو ہجرت کرنے والے یا اے ہندستان
کی ہجو کرنے والے ہندستان میں خوشی کے ساتھ رہ اور یہاں رہ کر
تو شیراز اور اصفہان کو نہ یاد کر۔ ہندستان جنت کا نعم البدل ہے
اسی لیے حضرت آدم فضاے جنت سے ہندستان بھیجے گئے تھے۔)

ہر کس کہ ز ملک خویش افتاد بہ ہند   برگشتہ نہ رفت ماند دلشاد بہ ہند
بیروں ز خلد کس نہ خواہد گروید   از آنجا ست کہ نیاید وطنش یاد بہ ہند

(ترجمہ: جو شخص اپنے ملک سے ہندستان میں آیا برگشتہ خاطر ہو کر
نہیں لوٹا اور ہندستان میں خوشی سے ٹھہر گیا۔ اس خلد یعنی ہندستان
سے کوئی جانا پسند نہیں کرے گا۔ اس لیے کہ ہندستان میں رہ کر

اسے اپنا وطن یاد نہیں آتا۔)

رباعی علی حزیںؔ

دہلی کہ ہوائے زیستش اخگر بیز است   باد خوش او چو تیز گرد آمیز است
بر دو دو تف است ہم چو دہلیز جحیم   آرے دہلی مخفف دہلیز است

(ترجمہ۔ دہلی جس کی آب و ہوا کانٹوں سے بھری ہوئی ہے اور اس کی اچھی ہوا بھی ناگوار بو سے بسی ہوئی ہے، اس پر دو بارہ تف ہے جس طرح جہنم کی دہلیز پر۔ بیشک دہلی دہلیز کا مخفف ہے۔)

رباعی شاہ اجملؔ

دہلی خاکش بخاک خلد آمیز است (۱)   ہر کوچہ سواد خوشش عنبر بیز است
پُر روح و ریاحین است چو دہلیز نعیم   بیشک دہلی مرخم دہلیز است

(ترجمہ۔ دہلی کی خاک جنت کی خاک سے ملی ہوئی ہے اس کا ہر کوچہ خوش منظر اور عنبر سے بسا ہوا ہے۔ اور یہ جنت کی دہلیز کی طرح زندگی بخش اور ریاحین کی خوشبو سے بسی ہوئی ہے۔ بیشک دہلی دہلیز کا مخفف ہے۔)

خاک دہلی بخاک خلد آمیز است   دہلیز نعیم است کہ عنبر بیز است
چو مرقد خاصان جنت آں جا ست   دہلی بیشک مخفف دہلیز است

(ترجمہ۔ دہلی کی خاک جنت کی خاک سے ملی ہوئی ہے اور یہ جنت کی دہلیز سے ملی ہوئی ہے اور یہ جنت کی دہلیز ہے جو خوشبو سے بسی ہوئی ہے۔ یہاں خاصان جنت کے مزار ہیں۔ دہلی بیشک دہلیز سے ترخیم ہے۔)

رباعی علی حزیںؔ

از ظلمت ہند سفلہ انگیز مترس   در تیرگیٔ شب اے سحر خیز مترس
ہرگز باکے ز خصمی ہند مدار   نامرد ز حملۂ ہمیر مترس

(ترجمہ۔ ہندستان کی اوچھے پن سے بھری ہوئی تاریکی سے نہ ڈر رات کی تاریکی میں اے صبح کے اٹھنے والے خوف نہ کھا۔ ہندستان کی دشمنی سے ہرگز خوف نہ کھا۔ بزدل تو نامرد کے حملہ سے نہ ڈر۔

رباعی شاہ اجملؔ

اے آمدہ در ہند تو مگریز مترس   ہر سو نورسے بہ بیں سحر خیز مترس
مہماں پرور ہند باشد بسیار   نان می یابد چہ مرد و چہ ہیز مترس

(ترجمہ۔ اے ہندستان کی طرف آنے والے تو بالکل خوف نہ کر اور نہ بھاگ۔ ہر طرف جادو جگانے والی روشنی کو دیکھ ہندستان بہت مہمان نواز ہے یہاں کیا مرد کیا نامرد سب ہی روٹی کھاتے ہیں)

دونوں حضرات کی رباعیوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں حضرات کی رباعیوں میں کیا فرق ہے۔ علی حزیں اہل زبان ہیں لیکن ان کی رباعیوں میں وہ زور بیان نہیں ہے جو شاہ صاحب موصوف کے یہاں موجود ہے تخیل کی بلندی کا اندازہ یہیں سے ہوتا ہے کہ علی حزیں کی اڑان سامنے کی ہے وہ بلند مضامین نہیں لاسکے لیکن شاہ صاحب موصوف کے یہاں بے ساختگی کے ساتھ ساتھ بلند مضامین بھی ہیں اور اسی کے ساتھ حب الوطنی کا جذبہ بھی غالب ہے ان رباعیات میں انھوں نے اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے۔ حضرت شاہ صاحب موصوف بڑے زود گو تھے چنانچہ برجستہ اور فی البدیہہ غزلیں کہنے کا اکثر اتفاق ہوا ہے۔ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں آپ شعر کہتے تھے آپ کی فارسی کی مشہور غزل جو لکھنؤ میں آپ نے برجستہ کہہ کر پڑھی تھی پیش خدمت ہے:

خورشید و سحر ہیچ شب تار ندارم   چوں تیغ زبانم غم زنگار ندارم
گر منزل کس نشود ہیچ غمم نیست   آں جنس گرانم کہ خریدار ندارم
دکانِ دلم ز آتش عشق است فروزاں   غم نیست اگر گرمیٔ بازار ندارم
کے حاجتِ حاجب بہ من دلِ خطرہ دربان   صحرا است مقامم در و دیوار ندارم
دردِ دلِ من عین علاج است دلم را   اندیشۂ دردِ دلِ بیمار ندارم
دارم سرِ زلف و تو کار بہ تو دارم   دیگر بہ کسے ہیچ سر و کار ندارم

آئینہ صفت در صف کوراں منم اجملؔ
معذورم اگر قیمت و مقدار ندارم

حضرت شاہ اجمل صاحب کی تمام تصنیفات و دیوان جناب شاہ سید احمد صاحب اجملی سجادہ نشین دائرہ شاہ اجمل کے کتب خانہ میں موجود ہیں جس سے آپ کے تبحر علمی پر اچھی روشنی پڑتی ہے حضرت شاہ صاحب موصوف کی ساری زندگی خدمت علم

(بقیہ صفحہ ۴۵ پر)



یادگار دن

ڈاکٹر ہرے کرشن مہتاب

رات کی سیاہی ختم ہو رہی تھی۔ مشرق میں شفق کی سرخی ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے دَور کے آغاز کا اعلان کرنے کے لیے مچل رہی تھی۔ شہر (کٹک) کی فضا آدھی رات ہی سے جلوسوں، قومی ترانوں اور سنکھ اور ڈھول کے نغموں سے گونج رہی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ وہاں کی ساری آبادی رات کی سیاہی کو جلد از جلد دور کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ باراستی قلعہ میں واقع اپنی سرکاری کوٹھی پر چند پچیس گھنٹے گزارنے کے بعد سورج نکلنے سے پہلے ہی میں گورنر کاٹجو سے ملاقات کے لیے نکل پڑا جو ایک دوسرے تاریخی مقام لال باغ میں سکونت پذیر تھے۔ ڈاکٹر کاٹجو برآمدے میں چہل قدمی کر رہے تھے اور جیسے ہی میں وہاں پہنچا انھوں نے میرا ہاتھ تھام لیا اور بغل گیر ہو گئے اور رقت آمیز آواز میں کہا۔ "مہتاب صاحب کتنی صدیوں کے بعد"۔ میں نے فوراً جواب دیا "تقریباً ہزار سال بعد"۔ انھوں نے دوبارہ میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ "آپ سچے تاریخ داں ہیں"۔

ہم دونوں بیٹھ گئے اور تاریخ کے اس دَور کے بارے میں بات چیت کرنے لگے جبکہ ہندوستانی عوام نے گیارھویں صدی کے لگ بھگ سیاست میں دلچسپی لینا بالکل ترک کر دیا تھا اور اگلی صدیوں میں یہ یقین ان کے دلوں میں جاگزیں ہو گیا تھا کہ انھیں سرکاری معاملات سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھنا ہے — اور وہ تعلق رکھ بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ صرف نوابوں اور راجاؤں کی رعایا تھے۔ گاندھی جی نے اپنے اعجاز سے اس عقیدے کو توڑا۔ یہ عوام ہی تھے نہ کہ کسی راجہ یا نواب کی فوج جنھوں نے آزادی حاصل کی۔ بحیثیت مجموعی ملک کا تعلیم یافتہ طبقہ بھی عوام کی اس جدوجہد سے الگ تھلگ ہی رہا۔ اور اس وقت جبکہ ہم ان تاریخی واقعات پر غور کر رہے تھے گاندھی جی کا خیال آتے ہی جنھوں نے ایک قلیل مدت میں تاریخ کے دھارے کو بدل کر رکھ دیا تھا، ہماری آنکھوں سے بے ساختہ آنسو اُبل پڑے۔

سارا دن شہر کے تقریباً ہر گھر میں جشن منائے جاتے رہے۔ عام آدمی کی خوشی بیان سے باہر تھی۔ شام کو مقامی تھیئٹر میں جو کھچا کھچ بھرا ہوا تھا ایک اچھوتا سا ناٹک پیش کیا گیا۔ اس ناٹک کا عنوان تھا "بھارت کے مختلف ادوار"۔ اس ناٹک کی تجویز میری اور شری سچن دتہ کے دماغ کی پیداوار تھی۔ ناٹک سچن دتہ کا ہی لکھا ہوا تھا۔ اس ناٹک کے اختتام پر مجھے اور گورنر صاحب کو تقریر کرنا تھی۔ آخری سین میں ایک چھوٹا سا لڑکا اسٹیج پر آتا ہے اور پوچھتا ہے۔

"کیا آپ مجھے پہچانتے ہیں؟ کیا میں آپ کو یاد آتا ہوں؟ آپ کو ضرورت بھی نہیں۔ میں نے کبھی اس کی توقع بھی نہیں کی۔ بغیر کسی صلے اور انعام کی توقع کے میں سولی پر چڑھا اور جان نثار کر دی۔ میں خودی رام ہوں۔ آپ کو میرا نام یاد رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں مگر میں آج بہت خوش ہوں کیونکہ میری جان بیکار ضائع نہیں ہوئی۔"

جس انداز میں یہ الفاظ کہے گئے تھے اس نے مجھے بیحد متاثر کیا اور مجھے وہ سب لوگ یاد آ گئے جنھوں نے آزادی کے مقصد کے لیے اپنی جانیں قربان کر دی تھیں۔ میرے آنسو بہنے لگے اور میں ہال سے باہر نکل آیا۔

تمام رات وہ الفاظ "کیا میں آپ کو یاد آتا ہوں؟" میرے کانوں میں گونجتے رہے۔ میں نے اپنے آپ سے سوال کیا — "کیا ہم ان کو یاد کرتے ہیں؟" اگلے ہی دن ہم نے سیاسی طور پر مصیبت زدہ لوگوں کو وظیفے دینے کا منصوبہ بنایا۔ ہم نے کٹک میں شہید میموریل ہال کی تعمیر کے لیے رقم منظور کی جہاں ان تمام لوگوں کے ناموں کی تختیاں دیواروں پر آویزاں کی جانا تھیں جو پولیس کی گولیوں سے ہلاک ہوئے تھے اور جنھوں نے جدوجہد آزادی میں اپنی جانیں قربان کر دی تھیں۔ لیکن کیا یہ سب کچھ کافی تھا؟

ہزاروں لوگوں نے اپنے ذریعۂ معاش کو تیاگ دیا تھا اور راستوں پر بھیک مانگنا گوارہ کیا تھا۔ ہزاروں نے اپنی املاک گنوائی

۶ اگست ۱۹۴۷ تک

۲۶ جنوری ۱۹۷۳ء

تھی اور خوشی خوشی اس دُکھ کو برداشت کیا تھا۔ سیکڑوں کو گولی مار دی گئی تھی اور آزادی کے خواب دیکھنے والوں کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا تھا۔ آبادی کے ایک بڑے حصے کو جو نئے دَور کو خوش آمدید کہتے ہوئے مسرور ہو رہا تھا، سیاست میں قطعی دلچسپی نہیں تھی۔ آزادی خود ایک انعام تھی جس کو ایسے کا انھوں نے تصور کیا تھا۔

ریاست کے دُور افتادہ دیہات سے ۔ خبریں موصول ہو رہی تھیں کہ وہاں بے ساختہ خوشیاں اور جشن منائے جا رہے ہیں۔ ضلع کوراپٹ میں بالکل الگ تھلگ بسے والے قبیلے کے لوگ بھی خوشی سے ناچ رہے تھے اور پکار پکار کر کہہ رہے تھے کہ گاندھی مہاراج اُن کے راجہ بن گئے ہیں اور اُن کی تمام صعوبتوں کا خاتمہ قریب ہے۔ حقیقت میں یہ سارے جذبات ان قبیلے والوں تک ہی محدود نہیں تھے بلکہ تمام آبادی اس سے متاثر تھی کہ ماضی کی تمام مصیبتوں کا خاتمہ گزری ہوئی رات کے ایک ناخوشگوار خواب کی صورت میں ہونے والا ہے اور یہ کہ نیا دن خوشیوں اور خوشحالی کا دن بن کر شروع ہونے والا ہے جس کی تمنّا ہر ایک نے

اپنی جدوجہد کے دوران کی تھی۔ اس وقت کوئی امید باندھنا ایسا ہی تھا جیسا کسی پہاڑ کو سر کرنا چنانچہ آزادی حاصل ہونے پر ہمیں محسوس ہوا کہ ہم نے کچھ حاصل کیا ہے۔ اب پچیس سال بعد جب میں ماضی پر نظر ڈالتا ہوں تو اپنے آپ سے سوال کرتا ہوں کہ کیا ہم عوام کی اُمیدوں اور عزائم کو پورا کرنے کے سلسلے میں پوری طرح عہدہ برآ ہوئے ہیں ــ؟ بیشک آزادی اپنی جگہ خود ایک انعام ہے۔ ان کروڑوں لوگوں کے لیے بے معنی ہے جو اپنی زندگی مایوسی کے ساتھ گزار رہے ہیں اور جنھیں اپنے اوپر بھروسہ نہیں رہا ہے۔ کیا وہ خود اعتمادی کے جذبے کو دوبارہ حاصل کر چکے ہیں ؟ کیا انھیں احساس ہوگیا ہے کہ یہ ملک ان کا اپنا ہے اور وہی اس کے مختار اور اپنی قسمت کے آپ معمار ہیں ؟ پچیس سالہ تاریخ کا فیصلہ مندرجۂ بالا سوالات کے جوابات پر مبنی ہے۔ بہت کچھ حاصل کیا گیا ہے مگر بہت کچھ حاصل ہونا باقی ہے۔ عوام کی خود اعتمادی اور یقینِ محکم اس کا پیمانہ ہیں کیونکہ یہ عوام ہی ہیں جنھوں نے آزادی حاصل کی ہے اور عوام ہی اس کو برقرار رکھیں گے اور وہی اسے پروان چڑھائیں گے۔



ایک عظیم محبِ وطن ــ شاہ محمد اجمل الٰہ آبادی ــــــــــــ (صفحہ ۵۲ کا بقیہ)

و ادب اور خدمت قوم و وطن میں گزری اور آخر اس عالم جلیل اور عظیم محبِ وطن نے یکم ذی الحجہ ۱۲۳۶ھ مطابق ۱۸۲۰ء بروز پنجشنبہ قبل نماز ظہر بعمر پچھتر سال دو ماہ دائرۂ مذکور میں اس عالمِ فانی سے عالمِ جاودانی کو رحلت فرمائی اور روضہ قطب الاقطاب حضرت شاہ محمد افضل الٰہ آبادی میں اپنے جد مادری کے پہلو میں دفن ہوئے۔ "دفن الاجمل جنب الافضل" تاریخ وفات ہے۔

صاحب مفتاح التواریخ آپ کے بارے میں رقم طراز ہیں "شاہ محمد اجمل الٰہ آبادی از اولاد شاہ خوب اللہ است و برادر خورد شاہ غلام قطب الدین مصیب ابن شاہ محمد فاخر زائر تخلص ابن شیخ خوب اللہ بزرگی خاندان ایشان عیاں است بصفات حمیدہ موصوف بود در سنہ یک ہزار و دو صد سی و شش ہجری درگزشت و ایں تاریخ در فوت او از مولوی فرد است (صفحہ ۳۷۹ ، ۳۸)

ازجہاں چوں محمد اجمل شاہ — رفت سوئے جناں چو تیر از قوس
سال تاریخ رحلتش از فرد — گفت ہاتف برفت در فردوس"

صاحب تذکرۂ روز روشن مظفر حسین صبا گوپاموی نے اپنے تذکرہ میں حالات شاہ اجمل پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے " شاہ محمد اجمل الٰہ آبادی از مقرباں بارگاہِ الٰہی بود ولادت باسعادت دی شب پنجشنبہ یازدہم شوال سنہ احدی و ستیں و مایہ والف است و وفاتش غرہ ذی الحجہ سنہ ہفت و ثلثین و مایتین والف بعمر ہفتاد و نہ سال" صفحہ ۲۹۔

اس کے علاوہ شاہ صاحب کے حالات سفینہ ہندی صفحہ ۱، تذکرۂ شعرائے اردو (میر حسن) صفحہ ۱۲، گلشن ہند صفحہ ۴، گلشنِ سخن صفحہ ۶۴، حادث الشعراء قلمی حرف الالف، سحر الاصفیا قلمی، سراج منیر قلمی، اور معارف شمارہ ۶ و ۷ جلد نمبر ۲۸ وغیرہ میں تفصیل سے مل سکتے ہیں۔ اجملی سجادہ نشین دائرہ شاہ اجمل معارف ۶ جلد ۲۸ قسط اول و دوم ۷ جلد ۲۸۔ وغیرہ میں بالتفصیل مل سکتے ہیں۔



افسانہ



سلام بن رزاق

بس کی کھڑکی میں، بس میں اور چلتے وقت ساتھ پر، ہر جگہ، ہر گھڑی پربھات کے الفاظ اُس کے کانوں میں گونجتے رہے۔ اور وہ اندر ہی اندر کسی گزرے ہوئے ان دیکھے خطرے کے تصور سے کانپ کانپ جاتی۔ وہ کبھی اپنی ساڑی کا پلّو درست کرنے کے بہانے، کبھی اپنا منی پرس سنبھالنے کے بہانے اُس کیکپی کو اپنے ہی اندر جذب کر لینے کی کوشش کرتی۔ اپنا حال بٹانے کے لیے پرس سے نکال نکال کر پیاری کے کتنے ہی ٹکڑے چبا ڈالے۔ بس میں بیٹھے بیٹھے آج ہی کسم سے لیے ہوئے فلمی میگزین کے سارے اوراق الٹ ڈالے مگر بے سود۔ پربھات کے الفاظ اور اس کی سرگوشی بس کی رفتار کے ساتھ اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ بس کی کھڑکی سے آتی ہوئی ہوا میں بھی پربھات ہی کی سی بھری آواز گھلی ہوئی تھی۔ اس کے جی میں آیا کہ کھڑکی کا شیشہ چڑھا دے مگر پھر محسوس ہوا کہ اس سرد ہوا کے باوجود جو کھڑکی سے آ رہی تھی، اس کی پیشانی پر پسینہ چھلک آیا ہے۔ اس نے ہتھیلی میں دبا اپنا چھوٹا سا رومال پیشانی پر پھیرا مگر ہتھیلی سے چھوتے پسینے کی وجہ سے رومال پہلے ہی سے کافی گیلا تھا۔ اُسے لگا آج بس بہت دھیرے چل رہی ہے۔ وہ چاہتی تھی بس اتنی تیز چلے کہ خود اُس کے خیالات بھی اُس سے پیچھے چھوٹ جائیں اور وہ بالکل ہلکی پھلکی ہو کر ہوا کے جھونکے کی طرح دور بہت دور نکل جائے، جہاں اُس کے خیالات بھی اُسے پکڑ نہ سکیں۔ کیوں کہ پربھات کے الفاظ، اُس کی پھسپھساہٹ انھیں خیالات کے کندھوں پر سوار ہو کر اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ مگر بس ہر اسٹاپ پر برابر رک رہی تھی۔ بس جب بھی رکتی وہ اضطراری طور پر پیچھے پلٹ کر دیکھنے لگتی۔ جیسے اُسے خطرہ ہو کہ کہیں پربھات اُس کا پیچھا تو نہیں کر رہا ہے۔ اُس کی نظریں ہر اسٹاپ پر بس میں چڑھنے والے مسافروں کے چہروں کا جائزہ لینے لگتیں کہ کہیں ان میں کوئی پربھات تو نہیں؟ ایک دفعہ اس نے اپنے مضطرب اور بے طرح پراگندہ ذہن کو کچھ راحت دینے کے خیال سے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنا سر کھڑکی کے شیشے سے ٹکا دیا۔ مگر اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ آنکھیں بند ہوتے ہی نہ صرف پربھات کے الفاظ کانوں میں گونجنے لگے۔ بلکہ ذہن کے پردے پر اُس کا سانولا ہیولا بھی اُبھر آیا۔ اُس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔ بس پھر کسی اسٹاپ پر رکی تھی اور مسافروں کا ریلا بھیڑ بکریوں کی طرح بس کے دروازے سے داخل ہو رہا تھا۔ بس کی ساری سیٹیں بھری ہوئی تھیں۔ نئے آنے والے مسافروں کے لیے بالکل جگہ نہیں تھی۔ کنڈکٹر کے منع کرتے کرتے بھی آٹھ دس مسافر گھس آئے اور کچھ مزید دروازے کا ڈنڈا پکڑے اندر گھسنے کی ناکام جدوجہد کر رہے تھے۔ کنڈکٹر نے جلدی سے گھنٹی بجا دی اور بس ایک دھچکے کے ساتھ چل پڑی۔ نئے گھس آنے والے مسافروں میں ایک نوجوان بالکل اُس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ بس کے دھچکوں سے نوجوان کا جسم بار بار اُس کے بائیں بازو سے چھو رہا تھا۔ اُس کے پورے جسم میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ وہ بار بار اندر کی طرف سمٹ رہی تھی مگر کوشش تھی کہ ہزار کوشش کے باوجود وہ اپنے بازو کو نوجوان کے جسم سے رگڑ کھانے سے نہ بچا سکی۔ اُس نے ایک بار گردن اٹھا کر نوجوان کی طرف دیکھا وہ ایک ہاتھ سے بس کی چھت میں لگے ڈنڈے کو پکڑے تھا اور دوسرے ہاتھ سے کنڈکٹر کو ٹکٹ کے پیسے دے رہا تھا۔ اُس کا دھیان اُس کے بازو کی طرف نہیں تھا۔ آخر تھک کر اُس نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ نوجوان کے بازوؤں کی رگڑ اُس کے بازو کے ذریعے اُس کے سارے جسم میں کرنٹ بھر رہی تھی۔ وہ روز گھر سے آفس اور آفس سے گھر آنے جانے بس سے سفر کرتی تھی۔ صبح شام اسی طرح کی بھیڑ ہوتی تھی۔ اُس کا جسم کئی ہی دفعہ اسی طرح مختلف جسموں سے رگڑ کھاتا تھا۔ مگر اُس رگڑ سے کبھی اُس کے جسم میں کسی قسم کا ارتعاش نہیں پیدا ہوتا تھا۔ پھر آج کیوں ایسا ہو رہا تھا؟ اُس نے محسوس کیا کہ آج پربھات کی باتیں سننے کے بعد سے ہی اُس کی جلد اس قدر حسّاس ہو گئی ہے کہ غیر جسم کا صرف چھو جانا بھی اُس کے سارے وجود میں ایک نرم گدگدی پیدا کیے دے رہا ہے۔ کملیش جب سے بس میں داخل ہوا تھا اس کے

پہلے ہی سے اُس نے اپنے جسم کو برف کی طرح سخت و سرد بنا لیا تھا۔ چھ مہینے بیت گئے مگر اُس کے جسم میں کبھی واسنا کی کوئی لہر نہیں اُٹھی، یا اُس نے اُٹھنے نہیں دی۔ مگر آج ــــ برجھات کی باتوں نے جیسے اُس کے احساسات پر جمی برف کو آنچ دکھا دی تھی۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا اُس کا دل اُس کے سینے میں کہیں بہت گہرائی میں ڈوبتا جا رہا ہے۔ اور جوں جوں دل گہرے پانی میں اُترتا جا رہا ہے ایک قسم کی لذت انگیز گدگدی اُس کے پورے سراپا میں ترتی چلی جا رہی ہے۔ اُس کے کانوں میں جلترنگ سے بجتے جا رہے ہیں اور نیم بے ہوشی میں اُسکی آنکھیں بند ہوتی جا رہی ہیں۔

بس پھر ایک دھچکے کے ساتھ رُکی اور اُس نے اپنی بوجھل پلکیں اُٹھائیں۔ اُس نوجوان کا جو اُس کے بازو سے لگ کر کھڑا تھا اب کہیں پتہ نہیں تھا۔ اُس نے کھڑکی کے باہر دیکھا۔ اسٹیشن روڈ مسجد کا مینار نظر آ رہا تھا۔ اگلے اسٹاپ پر اُسے اُترنا تھا۔ اُس نے ہڑبڑا کر پیروں کو سینڈلوں میں مضبوطی سے جمایا، جھک کر گھٹنوں پر ساڑی کی چُنٹ درست کی اور پرس سنبھالتی ہوئی سیٹ سے اُٹھ گئی۔

وہ گھر میں داخل ہوتے ہوتے بہت کچھ پُرسکون ہو چکی تھی۔ اُسے اُمید تھی کہ گھر میں قدم رکھتے ہی گُڈّو دوڑتا ہوا آ کر اُس سے لپٹ جائیگا۔ مگر گھر میں جب اُسے گُڈّو کی آواز سنائی نہ دی تو اُس نے اپنے کمرے میں جانے کے بجائے پہلے کچن میں جھانکا۔ اسکی بوڑھی ساس آٹا گوندھ رہی تھی۔

"گُڈّو ابھی اسکول سے نہیں آیا کیا؟"

"آکر پڑوس کی کملا اور اُس کے بچّوں کے ساتھ پارک میں گیا ہے۔" بڑھیا سر جھکا کر پھر آٹا گوندھنے لگی۔ اُس کے سفید کھچڑی بال اُس کے مرجھائے چہرے پر جھول رہے تھے اور وہ اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے آٹا گوندھنے میں مصروف تھی۔ صاف لگ رہا تھا کہ آٹا گوندھنے میں جس قوت کی ضرورت ہوتی ہے وہ بڑھیا کے ہاتھوں میں نہیں ہے۔ وہ چند سیکنڈ تک وہیں کھڑی ساس کی طرف دیکھتی رہی۔ جانے کیوں آج اُسے اپنی ساس پر کچھ ترس سا آ رہا تھا۔ بڑھیا نے اُسے وہیں کھڑا دیکھ کر پوچھا۔

"چائے بنی رکھی ہے، گرم کر دوں؟"

"میں گرم کر لوں گی، آپ جا کر آرام کیجئے۔ آج روٹیاں بھی میں سینک لونگی۔"

بڑھیا نے ایک لمحے کے لیے حیرت بھری خوشی سے اُس کی طرف دیکھا پھر کچھ رُک کر بولی۔ "نہیں، نہیں تم کپڑے بدل کر آ جاؤ میں جب تک چائے گرم کیے دیتی ہوں۔"

"میں کپڑے بدل لوں گی۔ مگر آپ سچ مچ آرام کیجئے۔ میرا آج روٹی بنانے کو جی چاہتا ہے۔ کتنے دن ہوئے مجھے چولہے کے پاس بیٹھے۔ آپ صبح سے شام تک کھپتی رہتی ہیں۔ اُٹھیے، آپ ہاتھ دھو لیجیے، میں بھی کپڑے بدل کر آتی ہوں۔" بڑھیا کے مرجھائے چہرے پر ایک تھکی تھکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اُس نے اُسی تھکے تھکے انداز سے کہا۔ "تم بھی تو تھکی تھکائی لوٹتی ہو۔ جاؤ کپڑے بدل کر آؤ، منہ ہاتھ دھو لو تب تک میں چائے گرم کیے دیتی ہوں۔ روٹی چاہے بعد میں تمہیں سینک لینا۔"

اُسے آج ساس کے لہجے سے شفقت ٹپکتی نظر آئی۔ معلوم نہیں کیوں اُسے آج اپنے اس گھر سے، اس کی ہر چیز سے اپنی بوڑھی ساس سے بے انتہا محبت پیدا ہو گئی تھی۔ اُسے لگا اس چھوٹے سے گھر کی ہر چھوٹی بڑی چیز اُس کے وجود سے بہت گہرائی تک جُڑی ہوئی ہے اور ہر شئے سے اُس کا اٹوٹ ناطہ ہے۔ بس کی بھیڑ میں بالس میں جس بے چینی یا اندرونی اضطراب کا اُسے احساس ہو رہا تھا اُس کا اب کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ اب وہ اپنے اس چھوٹے سے گھر میں اُس سپاہی کی سی راحت محسوس کر رہی تھی جو دشمنوں کے نرغے سے نکل کر کسی مضبوط قلعہ میں محفوظ ہو گیا ہو۔

وہ جلدی سے اپنے کمرے میں گئی، کپڑے بدل کر ایک معمولی سی ساڑی لپیٹ لی۔ نل کے نیچے جا کر اپنے چہرے پر ٹھنڈے پانی کے دو تین چھپاکے دیے۔ منہ پونچھتی آئینے کے سامنے آ کر کھڑی ہوئی۔ پیشانی اور گالوں پر دو تین جھولتی لٹوں کو درست کیا اور کچن میں ساس کے پہلو میں جا بیٹھی۔

بڑھیا نے چائے کا پیالہ اُس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ چائے کو دھیرے سِپ کرتی جلتے ہوئے اسٹوو کی طرف دیکھنے لگی۔ اسٹوو پر شاید سبزی اُبل رہی تھی۔ بڑھیا آٹا گوندھ چکی تھی اس نے جلدی سے چائے ختم کر لی اور بولی،

"ہاں جی! اب آپ جا کر آرام کیجیے۔ میں ابھی روٹیاں سینک لیتی ہوں۔ گُڈّو آتا ہی ہوگا۔ وہ آتے ہی کھانا مانگے گا۔" بڑھیا نے ایک لمبی سانس کھینچی اور چپ چاپ اُٹھ گئی۔ ایسی سانس کی سرد آہ کے پیچھے چھپے ہوئے پچھلے درد کی چُبھن کو اُس نے بھی محسوس کیا۔ مگر اب وہ درد

اُسے زیادہ مضطرب نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ پچھلے کئی مہینوں سے اُس نے اُس درد کو چپ چاپ سہنا سیکھ لیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ بڑھیا بھی زبان سے کچھ نہیں کہے گی کیوں کہ اب وہ ایک دوسرے کی آنکھوں کی زبان سمجھنے لگی تھیں۔ جب الفاظ اپنے معنی کھو دیتے ہیں تو شاید آنکھیں زبان بن جاتی ہیں۔

ساس کے کچن سے چلے جانے کے بعد اُس نے اسٹوو پر سے سبزی کا برتن اُتار لیا اور روٹیاں سینکنے لگی۔

اسے پھر کملیش کی یاد آنے لگی دل کی کسی گہری تہہ سے اداسی کی ایک ہلکی سی لہر اٹھی مگر جلدی ہی اس نے اس اداسی کی لہر کو اندر ہی اندر دبا دیا اتنے میں اسے پھر پربھات اور اُس کی باتیں یاد آنے لگیں۔ مگر اب اُن باتوں نے اُس کے اندر کسی قسم کی بے چینی نہیں پیدا کی۔ اُسے تعجب ہونے لگا کہ وہ صرف ایک گھنٹہ پہلے کتنی کمزور اور جذباتی ہو گئی تھی۔ اُس بات کو یاد کرکے اُسے اپنی جذباتیت اور کمزوری پر غصہ آنے لگا۔ اُسے افسوس بھی ہوا کہ اُس نے پربھات کی وہ بات چپ چاپ سہہ کیسے لی۔ اُس نے اُسے اُسی وقت پھٹکار کیوں نہیں دیا۔ مگر، اُس نے پھر سوچا کہ شاید اُس وقت واقعی وہ اُسے پھٹکار نہیں سکتی تھی۔ وہ بات کچھ اُتنی غیر متوقع اور اشتعال انگیز تھی کہ ایک لمحے کے لیے اُس کی ساری قوتیں سلب ہو کر رہ گئی تھیں۔ اُس کی حالت ایسے پیاسے شخص کی سی ہو گئی تھی جس کے سامنے پانی سے لبالب پیالہ رکھ دیا گیا ہو۔ پانی کو ہونٹوں سے اتنے قریب پا کر وہ بے قابو ہو گئی تھی اور پھر اسے پربھات سے ایسی امید نہیں تھی۔ وہ کملیش کی موجودگی میں اکثر گھر بھی آ چکا تھا۔ اور جب سے وہ اُس آفس میں کام کر رہی ہے شروع میں پربھات ہی نے اُسے سہارا دیا تھا۔ ورنہ دس بارہ اجنبی مردوں کے درمیان بیٹھ کر کام کرنا اُس کے لیے ایک عجیب گھبراہٹ پیدا کرنے والا تجربہ تھا۔ کملیش بار بار اپنے خطوط میں پربھات کا ذکر بڑے احسان مندانہ طریقے سے کرتا، اور آج تک وہ خود بھی پربھات کی ذات کو اپنے گھر والوں کے حق میں رحمت کا فرشتہ سمجھتی تھی کیوں کہ کملیش کے سینی ٹوریم میں داخل ہو جانے کے دو ماہ بعد ہی جب اُسے محسوس ہونے لگا تھا کہ صرف 'انشورنش' سے ملنے والی برائے نام رقم میں گھر کا خرچ چلانا ناممکن ہے تو ایک دن پربھات نے اُسے بتایا کہ اُس کے آفس میں ایک ٹائم کیپر کی ضرورت ہے اور کام زیادہ مشکل بھی نہیں ہے۔ اگر وہ نوکری کرنا چاہے تو وہ اُس کی مدد کر سکتا ہے کیوں کہ فرم کے منیجر سے اُس کے اچھے تعلقات ہیں۔ اُس نے دوسرے ہی دن کملیش کو چٹھی لکھی تھی شاید پربھات اُسے پہلے ہی خط لکھ چکا تھا۔ چار روز بعد کملیش کا خط اُسے ملا۔ اُس نے اُسے نوکری کرنے کی اجازت دیتے ہوئے لکھا تھا۔

" پربھات نے میرے حق میں وہ کام کیا ہے جو پچھلے دو مہینوں سے ڈاکٹروں کے انجکشن اور ٹانک بھی نہیں کر سکے تھے اب میں بہت جلد اچھا ہو کر اپنی منّی اور گڈّو سے آ ملوں گا"۔ خط پڑھ کر اُس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو چھلک آئے اور اُس نے دوسرے دن سے کام پر جانا شروع کر دیا۔ پربھات کا اُس فرم میں کافی وزن تھا اور سبھی اُس کی عزت کرتے تھے۔ ویسے وہ کمپنی کا 'فرسٹ گریڈ ریپریزینٹیٹو' تھا اور اکثر آؤٹ ڈور ڈیوٹی پر رہتا تھا۔ مگر ہر دو چار روز بعد منیجر سے مشورے کے لیے اُسے فرم کا چکّر لگانا پڑتا تھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ پربھات کی وجہ سے اسٹاف کے لوگ اُس کا کافی خیال کرتے ہیں ورنہ اسٹینو مس جونی اور ٹیلیفون آپریٹر مسز بھٹناگر کا تو فقرے بازی کی وجہ سے ناک میں دم رہتا ہے۔ اس نوکری کے بعد سے وہ گھر کے اخراجات کی طرف سے بالکل مطمئن ہو گئی تھی۔ ان تین چار مہینوں میں وہ کملیش سے چار پانچ دفعہ مل بھی آئی تھی۔ ساس اور گڈّو کو بھی دو ایک دفعہ ملا لائی تھی۔ اُدھر کملیش بھی روبصحت ہو رہا تھا۔ اور گھر کی طرف سے اطمینان ہو جانے کے بعد سے وہ بھی کافی خوش نظر آنے لگا تھا۔ اب اُس کے خطوط بھی بڑے طویل و طویل اور محبت اُمید اور زندگی سے بھرپور ہوتے تھے۔ وہ مایوسی پژمردگی اور بے کیفی غائب ہو چکی تھی، جو سینی ٹوریم میں داخل ہونے کے ابتدائی دنوں میں اُس کی تحریر میں نظر آیا کرتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس کی صحت یابی کے ساتھ ساتھ اُس کی تحریر میں بھی ایک قسم کی تازگی آتی جا رہی ہے۔ اُس کے خط پڑھ کر اُس پر کبھی کبھی ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی اِس یقین کے باوجود کہ اب کملیش بہت جلد اُس سے آ ملے گا، کبھی کبھی راتوں کی تنہائی اُسے بُری طرح ڈسنے لگتی۔ اُسے خود اپنا ہی بستر جلتی چتا کی طرح لگنے لگتا۔ کمرے کے در و دیوار سے اُداسی برسنے لگتی

ہوئی آتی اور اُس کے وجود کو چاروں طرف سے جکڑ لیتی۔ وہ لاکھ چھٹپٹاتی، ہاتھ پیر مارتی مگر وہ اُداسی اُس کے اندر اور گہرائی میں اُترتی چلی جاتی۔ ایسے وقت وہ اپنے آپ کو دُنیا کی ایک مظلوم ترین عورت سمجھنے لگتی۔ اُسے اپنی ذات پر ترس آنے لگتا۔ دھیرے دھیرے خود رحمی کا جذبہ اتنا شدید ہو جاتا کہ وہ تکیے میں منہ چھپا کر سسکنے لگتی اور پھر پتہ نہیں کب تک اسی طرح آنسوؤں کی بارش میں بھیگتی ہوئی وہ نیند کی آغوش میں کھو جاتی۔

کملیش اپنے ہر خط میں پربھات کا ذکر ضرور کرتا۔ کبھی کبھی وہ پربھات کو کملیش کے خطوط کے وہ پیراگراف پڑھ کر سناتی جس میں پربھات کا ذکر ہوتا۔ اور پھر دونوں دیر تک اُس کے بارے میں باتیں کرتے رہتے۔ آج بھی جب اُس نے پربھات کو وہ پیراگراف پڑھ کر جس میں کملیش نے سیبی ڈیریم بہت جلد چھٹی پا جانے کی اُمید ظاہر کی تھی تو اچانک پربھات نے کہا "اچھا بھابی! آج چھٹی کے بعد ذرا رُک جانا تھوڑا سا کام ہے۔" اتنا کہہ کر وہ منیجر کے کمرے میں چلا گیا۔ اور وہ سوچنے لگی آج وہ پربھات کو اپنے ساتھ ہی گھر لے جائے گی اور کملیش کے اُس خط کی خوشی میں اُسے اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر پلائے گی۔ یہ سوچ کر اُسے اچھا لگا اور وہ اپنے جوڑے کا کلپ درست کرتی ہوئی پھر فائل پر جھک گئی۔ آفس ختم ہونے سے پانچ منٹ پہلے ہی پربھات منیجر کے کمرے سے نکل کر اس کی میز کے پاس آیا۔ اس نے جلدی جلدی کاغذات سمیٹے، فائلیں لا کر میں رکھ دیں اور اپنا پرس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "پربھات چلیے" کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ وہ اس کے پیچھے پیچھے آفس سے نکل آئی۔ اس سے پہلے کہ وہ پربھات سے اپنے گھر چلنے کے لیے کہتی پربھات نے آواز دے کر ٹیکسی رکوالی تھی۔ وہ اس سے کہنا چاہتی تھی ٹیکسی کی کیا ضرورت ہے، بس سے چلے چلیں گے۔ مگر پھر یہ سوچ کر خاموش رہ گئی کہ ٹیکسی تو رکوالی ہی گئی ہے، اب کچھ کہنے سے کیا فائدہ۔ پربھات پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے اس کی طرف مُڑا تو وہ بغیر کچھ بولے ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ پربھات پچھلا دروازہ بند کر کے اگلی سیٹ پر جا بیٹھے گا مگر جب وہ بھی اسی کے برابر آکر بیٹھا تو اُسے کچھ بے چینی سی ہونے لگی۔ پھر جب پربھات نے ٹیکسی والے سے "نریمن پوائنٹ"

کہا تو وہ اپنے آپ کو روک نہ سکی:

"نہیں پربھات بھیّا! گھر چلیں گے، ممّا اور ماتا جی انتظار کر رہے ہوں گے۔ ماتا جی پریشان ہو جائیں گی۔" مگر ٹیکسی نریمن پوائنٹ کی طرف مُڑ چکی تھی۔ اس اثنا میں پربھات نے ٹیکسی کی کھڑکیوں کے پردے کھینچ لیے تھے۔ اس نے اپنے پورے بدن میں ایک سنسناہٹ سی محسوس کی اور کچھ کہنے کے لیے ہونٹ کھولے مگر الفاظ اس کے ہونٹوں تک آتے آتے بے آواز ہو گئے۔ پربھات اُس کے قریب کھسک آیا اور اس کے کان کے پاس جھک کر کہنے لگا:

"دیکھو سُمی! اب کملیش تو کچھ روز بعد آ ہی جائے گا۔ کیا میں تم سے اُس آگ کو بجھانے کی درخواست کر سکتا ہوں جو ایک عرصے سے میرے اندر سلگ رہی ہے۔ کیا میں تم سے تمہارے پیار کی بھیک مانگ سکتا ہوں ___"

اسے ایسا لگا جیسے کسی نے دھکا دے کر اسے نیچے گہرائی میں دھکیل دیا ہو اور وہ بہت گہرے میں کہیں گرتی جا رہی ہو۔ وہ اپنے آپ اتنی کمزور اور نڈھال ہو گئی تھی کہ جب پربھات نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو وہ اپنا ہاتھ تک نہ چھڑا سکی۔ اُسے پربھات کی آواز بہت دور سے آتی محسوس ہوئی۔ پربھات اس پر اتنا جھکا ہوا تھا کہ اس کی گرم گرم سانسیں اُس کے گالوں کو چھو رہی تھیں۔ مدہوشی کی سی حالت میں اس کی آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ ایک ایسی کپکپی اس کے سارے بدن میں سرایت کرتی جا رہی تھی جو اس نے صرف کملیش کی آغوش ہی میں محسوس کی تھی۔ اس کا ہاتھ پربھات کے ہاتھوں میں تھا، وہ دھیرے دھیرے اُسے سہلا رہا تھا اور نہ جانے کیا کیا کہتا جا رہا تھا۔ وہ اس کی آواز تو سُن رہی تھی مگر کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی! الفاظ پانی کے بُلبلوں کی طرح اس کے کانوں سے ٹکرا ٹکرا کر پھوٹ رہے تھے۔ وہ پربھات کو اس سب سے روکنا چاہتی تھی مگر نہ جانے کیا ہو گیا تھا کہ وہ لاکھ کوشش کے باوجود کچھ کہہ نہیں پا رہی تھی۔ پھر پربھات کا ایک ہاتھ اس کی کمر کے گرد لپٹ گیا تھا اور پربھات نے دھیرے سے اُسے اپنی طرف کھینچ کر سرگوشی کی تھی:

"سمی تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا ؟"

وہ پسینے میں ڈوبی آنکھیں بند کیے پڑی تھی۔ اس نے تب بھی پربھات کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ اس وقت اس پر ایسی کیفیت طاری تھی جہاں اقرار اور انکار کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ جب ہاں اور نہیں جیسے الفاظ اپنے معنی کھو دیتے ہیں۔ اُسے اچھی طرح یاد ہے شاید پربھات نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر اٹھایا تھا اور وہ اس وقت بھی آنکھیں بند کیے بے حس و حرکت پڑی تھی البتہ اس کا سینہ کسی دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ عین اسی وقت ڈرائیور کی آواز پر وہ دونوں چونک پڑے تھے۔ ڈرائیور شیشے میں سے گھورتا ہوا کہہ رہا تھا "بابوجی! انڈین پوائنٹ آگیا "۔

پربھات ہڑبڑا کر اس سے الگ ہو گیا تھا۔ اور وہ بھی چونک کر اپنے آپ میں لوٹ آئی تھی۔ اب اسے ہوش آگیا تھا لیکن وہی لمحہ تھا جب اس نے محسوس کیا کہ وہ ایک بھیانک حادثہ کا شکار ہوتے ہوتے بچ گئی ہے۔ پربھات نے ڈرائیور سے کہا "ماسیلی چلو"

ڈرائیور نے ایک بار پھر اُسے آئینے میں سے گھور کر دیکھا اور ٹیکسی موڑ دی۔ ڈرائیور نے جن نظروں سے اسے گھور کر دیکھا تھا وہ ان کا مطلب خوب سمجھتی تھی۔ وہ ان نظروں کی چبھن اور ان میں چھپی نفرت کو کبھی بھول نہیں سکے گی۔ وہ نظریں اس کے اندر بہت گہرائی میں اُتر گئی تھیں۔ اُسے اچانک ہی محسوس ہوا تھا کہ وہ فرش پر ننگی پڑی ہوئی ہے۔ مادر زاد ننگی اور ڈرائیور کی آنکھیں ان گنت جونکوں کا روپ دھارن کیے اُس کے برہنہ جسم سے چمٹ گئی ہیں۔ اس نے جلدی سے پرس کھولا اور اپنا چھوٹا سا رومال نکال کر اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھنے لگی۔ پھر ساڑی کے پلّو کو درست کرتی ہوئی ٹیکسی کی کھڑکی کا پردہ ہٹا دیا۔ ہوا کا سرد جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا۔ باہر زندگی اسی طرح رواں دواں تھی۔ طوفان تو صرف اس کے اندر اٹھا تھا۔ اچانک اس نے بلند آواز میں ڈرائیور کو مخاطب کیا۔ "ڈرائیور سامنے والے بس اسٹاپ پر گاڑی روک دو "۔ اتنا کہتے کہتے اس کی آواز ہانپ گئی تھی۔ ڈرائیور نے دوبارہ شیشے میں سے اس کی طرف دیکھا اور ٹیکسی میں بریک لگا دیے۔ ٹیکسی ایک چرچراہٹ کے ساتھ بس اسٹاپ کے قریب رک گئی۔ پربھات کچھ بوکھلائے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا: "ارے ارے کیا ہوا ؟ سمی! سنو تو . . . " اس نے جھپٹ کر گاڑی کا دروازہ کھولا اور اپنا پرس سنبھالتی ہوئی نیچے اتر گئی۔ اترتے اترتے اس نے پربھات کی آواز سنی وہ کہہ رہا تھا: "ارے سمی! کمال ہے بھئی۔ اچھا دیکھو میں کل پھر آؤں گا آفس میں اچھی طرح سوچ لینا۔" اس نے زبان سے ایک لفظ نہیں کہا اور نہ پلٹ کر پربھات کی طرف دیکھا۔ وہ سیدھی بس کے کیو میں جا کر کھڑی ہو گئی اور رومال سے اپنی پیشانی کا پسینہ پونچھتی رہی۔ پربھات کی ٹیکسی آگے بڑھ گئی تھی۔ وہ اس انجانے بس اسٹاپ پر کھڑی بس کا انتظار کرنے لگی اس کا دل اب بھی بری طرح دھڑک رہا تھا مگر ساتھ ہی وہ اس مسافر کا سا اطمینان بھی محسوس کر رہی تھی جو راستے میں لٹتے لٹتے بچ گیا ہو۔

یہ سب سوچتے سوچتے نہ جانے کب اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے سوتے پھوٹ نکلے تھے۔ اُسے کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ اچانک گڈو کی آواز پر وہ چونک پڑی تھی اور اس نے جلدی جلدی اپنے آنسو پونچھ ڈالے تھے۔ گڈو شاید پارک سے لوٹ آیا تھا۔ وہ سیدھا اس کے پاس دوڑا آیا اور "ممی، ممی! ہم لوگ گارڈن گئے تھے" کہتا ہوا اس سے لپٹ گیا اس نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے جلدی سے اس کی پیشانی چوم لی گڈو اس کی سرخ اور گیلی آنکھوں کی طرف دیکھ کر بولا: "ممی! تمھاری آنکھیں لال کیوں ہیں ؟ کیا آج تم روئی تھیں ؟ " اس نے اُسے دوبارہ پیار کرتے ہوئے کہا "نہیں بیٹا آج بہت دنوں کے بعد روٹی سینک رہی ہوں نا اس لیے گرمی سے آنکھوں میں پانی آگیا ہے۔" اس جواب سے گڈو فوراً مطمئن ہو گیا اور پارک میں کملا آنٹی کے بچوں کے ساتھ کھیلے ہوئے کھیلوں کی تفصیل بیان کرنے لگا۔ وہ مسکرا کر اس کی باتوں پر ہوں، ہاں کیے جا رہی تھی۔ ساتھ ہی وہ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ آج کھانے کے بعد وہ کملیش کو ایک لمبا چوڑا پیار بھرا خط ضرور لکھے گی اور آفس کو ایک ہفتے کی چھٹی کی عرضی بھی دے دے گی۔



غالب کی دقت پسندی اور فارسیت



از:- افتخار احمد "فخر" ایم اے [پروفیسر ایم جے کالج ملگاؤں]



غالب پر اتنا لکھا جا چکا ہے کہ اس پر اب مزید اضافہ کے امکانات بہت کم ہیں۔ اور مشکل ہی گنجائش نکل سکتی ہے۔ "غالب صدی" کے موقع پر جشنِ غالب مختلف صورتوں سے ہندوپاک میں منایا گیا۔ ہندوپاک کے متعدد جرائد میں اہلِ قلم حضرات نے اپنے مخصوص زاویوں سے غالب کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ جو "غالب نمبر" کی شکل میں محفوظ ہو چکا ہے۔ الغرض مختلف مکاتیبِ خیال کے ناقدین و محققین نے نئے نئے زاویوں سے اظہارِ خیال کیا ہے اور اتنا مواد جمع ہو چکا ہے کہ ایک اچھی خاصی لائبریری تیار ہو جائے گی۔ غالب پر نئی کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔ غالب کی زندگی میں زمانے نے ان کی وہ قدر نہیں کی جس کے وہ اپنے آپ کو مستحق سمجھتے تھے۔ اس کا انھیں زندگی میں احساس بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے اشعار میں کھلے طور پر شکوہ بھی کرتے رہے ہیں۔ اور موقعہ بموقعہ اپنی اہمیت پر بھی زور دیتے نظر آتے ہیں۔ ایسے ہی انھوں نے ایک موقعہ پر کہا تھا کہ ؎

در بزمِ غالب آے و شعرِ دلکش گرائے
خواہی کہ بشنوی سخنِ ناشنودہ

یا ـــ

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک نغز گو شاعر کی تمام خصوصیات اور صلاحیتیں لے کر آئے تھے جو ایک عہد ساز شاعر میں قدرت ودیعت کر دیتی ہے۔ آج یہ زمانہ ان کی جو قدر افزائی کر رہا ہے اور ان کی شاعری کی جو دھوم مچی ہوئی ہے اس کے پیشِ نظر غالب کی وہ پیش گوئی جو انھوں نے کبھی اپنے متعلق کی تھی، حرف بحرف درست اور صحیح ثابت ہو رہی ہے اور ان کی یاد کو تازہ کر رہی ہے۔ انھوں نے غلط نہیں کہا تھا کہ ؎

کوکبم را در عدم اوجِ قبولی دادہ است
شہرتِ شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

غالب نے جس وقت ہوش سنبھالا، اپنے گھر میں فارسی کا ذوق رچا ہوا پایا۔ ان کی پیدائش کے وقت ہی گویا عہدِ مغلیہ روبہ انحطاط تھا۔ بلکہ آخری سانسیں لے رہا تھا۔ فارسی ہی عام طور پر شاعری کی زبان تھی۔ ان کی شاعری کا آغاز ۱۱ برس کی عمر میں ہی فارسی شاعری سے ہوا اگرچہ اس وقت سب کی نگاہیں ریختہ کی جانب لگی ہوئی تھیں، جو ابھی گھٹنوں چلنا سیکھ رہی تھی مگر دلکشی، دلربائی و رعنائی میں آپ اپنا جواب تھی۔ تیور بتا رہے تھے کہ اس نوخیز کی نگاہوں سے کوئی دل والا بچ نہیں سکتا۔ غالب کو بھی چار و ناچار اس پر فریفتہ ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔ تاہم آخر دم تک انہیں اپنی فارسی شاعری پر فخر و ناز رہا۔ اس میں تامل نہیں کہ اگرچہ سعدی و حافظ فارسی شاعری کے بالخصوص غزل گوئی کے ابوالآبا تسلیم کیے جاتے ہیں۔ مگر بلحاظ فارسیت و جامعیت غالب کے ہمسر بھی دو چار ہی ملیں۔ یہی وجہ تھی کہ انھیں اپنی فارسی شاعری عزیز بھی اور وجہ ناز بھی۔ فرماتے ہیں ؎

فارسی بیں تا بہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگذر از مجموعۂ اردو کہ بے رنگِ من است

اور اپنے معصروں سے یہی کہتے رہے کہ ؎

راست میگویم و لے از راست سرنتواں کشید

ہیچ در گفتار فخرت نیست آں ننگِ من است

ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی غالب کی فارسی شاعری میں اشکال و مشکل پسندی پر بحث کرتے ہوئے اپنے مقالہ "نغمہائے رنگ رنگ" میں فرماتے ہیں لہ "عالی ظرفی اور مشکل پسندی اس آدم خاکی کا خاصّہ ہے راستہ کی دشواریاں اس کی ہمتوں کو بلند کرتی ہیں۔ ناکامیاں اس کے عزم و شوق پر تازیانہ کا کام کرتی ہیں یہ مشکل پسندی جو ہمیں مرزا کے کلام فارسی میں ان کے خاندانی طور پر ملتی ہے ان کی شاعری کا نہایت صحت مند اور دلکش پہلو ہے"۔ اور مثال کے طور پر یہ شعر پیش کیا ہے ؎

وادیٔ کہ دراں خضر را عصا خفت است

بسینہ می سپرم رہ اگرچہ پا خفت است

اور اس میں شک نہیں کہ ان کی مشکل پسندی ان کی عالی ظرفی کا تقاضا تھا جو ان کی فارسی شاعری سے ہوتے ہوئے اردو شاعری میں بھی در آیا ہے۔ ہمارا موضوع سخن ان کی فارسی شاعری نہیں ہے مگر یہ فارسی ہی کا اثر تھا کہ اوّل اوّل ان کی اردو شاعری بھی خدرجہ پیچیدہ اور مغلق تھی اور غالباً اس کا ایک اور سبب بہ تقاضائے فطرت مرزا کا طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا بھی تھا جیسا کہ وہ خود اعتراف بھی کرتے ہیں ؎

طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا اسد اللہ خاں قیامت ہے

مرزا غالب سے زیادہ تر تخیل میں مرزا عبد القادر بیدل سے استفادہ کیا ہے مندرجۂ ذیل اشعار میں خاصی بیدل کے رنگ کی جھلکیاں صاف طور پر نمایاں ہیں مثلاً یہ اشعار ملاحظہ کریں ؎

(۱) دے کے وقت مئے پئے ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ خدا کرے کہ یوں

(۲) تمہاری طرزِ ادا جانے ہیں ہم کیا ہے
رقیب پر ہے اگر لطف تو ستم کیا ہے

(۳) عشق کہتا ہے کہ اس کا عہد ہے اخلاص جیب
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا

بالآخر عرفی و نظیری کی پیروی نے مرزا غالب کو بیدل کی تقلید سے نکالا جس کی مقبول ترین خصوصیت معاملہ بندی ہے۔

مرزا بیدل کی تقلید پر غالب کو بڑا ناز و افتخار یوں بھی تھا کہ اکثر دقت پسندی نے غالب کو گرویدہ بنا لیا تھا اور وہ شاہراہ عام پر چلنے میں عار محسوس کرتے تھے وہ اپنا مسلک سب سے الگ بنانا باعث عز و ناز تصوّر کرتے تھے۔ بیدل کے تتبع کا اعتراف انہوں نے کئی جگہ کیا ہے مثلاً یہ اشعار دیکھیے ؎

(۱) مجھے راہِ سخن میں راہِ گمراہی نہیں غالب
عصائے خضر صحرائے سخن ہے خامۂ بیدل کا

(۲) مطرب دل نے مرے تارِ نفس سے غالب
ساز پر رشتے پے نغمۂ بیدل باندھا

اور ایک جگہ تو اس طرح کھل کر کہتے ہیں کہ ؎

اسدؔ ہر جا سخن نے طرحِ باغِ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگِ بہار ایجادیٔ بیدل پسند آیا

اپنے اسی مقالہ میں (نغمہائے رنگ رنگ) ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی آگے چل کر بیدل کے تتبع کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ "بیدل کے ہاں جو مشکل پسندی ہے وہ محض لفظی نہیں ان کے ہاں خیال بھی نہایت دقیق ہوتا ہے اور اسی دقتِ خیال کی وجہ سے کبھی الفاظ کا جامہ ان کے مضامین پر تنگ نظر آتا ہے یہی بات مرزا غالب کے یہاں بھی ہے۔ ان کی مشکل پسندی اکثر و بیشتر خیالات کی ندرت اور دقت سے پیدا ہوتی ہے اور کمتر اس لیے کہ انہیں اپنے اسلوبِ بیاں میں بھی اسی جدّت اور ندرت کی تلاش رہتی ہے جس کی فکر انہیں مضامین و موضوعات اور اسلوبِ بیاں میں دامن گیر رہتی ہے" ۲ہ

فارسی تراکیب کے علاوہ تخیل اور اسلوبِ بیان کی ندرت میں صوری و معنوی دونوں اعتبار سے وہ بیدل کے پہلے پہل اسیر رہے۔ مگر

لہ "احوال و نقدِ غالب" صفحہ ۳۰۲ و ۳۰۵ مکتبۂ اردو، کراچی۔ ۲ہ "احوال و نقدِ غالب" مرتبہ محمد حیات خاں سیال صفحہ ۳۴۳ و ۳۴۴ مکتبۂ اردو، کراچی

اس کے بعد ان کی نگاہیں دوسرے فارسی شعرا کے جانب بھی اٹھی ہیں جیسا کہ خود انہوں نے اپنے ایک خط میں اس خوشہ چینی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں[1] "شیخ علی حزیں نے مسکرا کر بے راہ روی مجھ کو جتلائی، طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادہ جو مجھ میں تھا۔ اس کو فنا کر دیا، ظہوری نے اپنے کلام کی گہرائی سے میرے بازو پر تعویذ باندھا۔ اور نظیری نے اپنی خاص روش پر مجھ کو چلنا سکھایا۔ اب اس گروہ والا شکوہ کے فیض تربیت سے میرا کلک رقاص، خیال میں کبک ہے تو راگ میں موسیقار، جلوے میں طاؤس ہے تو پرواز میں عنقا۔"

چنانچہ جب وہ اپنی فارسیت پر نازاں ہوتے ہیں تو عجب و غرور میں عرفی کا یوں دم بھرتے ہیں ؎

کیفیتِ عرفی طلب از طینتِ غالب ۔۔۔ جامِ دگراں بادۂ شیراز ندارد

اور ایک جگہ مندرجۂ بالا مشاہیر شعرا کو سمیٹتے ہوئے یوں معترف ہیں ؎

بازآمد در نفسِ ظہوری است در سخن ۔۔۔ روشِ شیوۂ نظیری و طرزِ حزیں شناس

ان کی یہ شاعرانہ تعلّی بھی قابلِ لحاظ ہے ؎

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ ۔۔۔ میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

اس سے قطع نظر کہ ان فارسی شعرا کی روش کی وجہ سے غالبؔ کے ہاں فارسیت اور دقت پسندی کا یہ میلان ان کی اردو شاعری کو بھی گرانبار بنا دیتا ہے یہ محض نقالی نہ تھی بلکہ منفرد انداز کی جستجو بھی۔ یہ بھی نہیں کہ اس وقت تک الفاظ و معانی کے صحیح ربط سے وہ واقف نہ تھے مگر انہیں اس کا احساس شاید نہیں تھا کہ روزمرہ کے عام الفاظ میں بھی بلند سے بلند خیالات کو ادا کیا جا سکتا ہے اور یہ کہ ان الفاظ میں بھی بے پناہ صلاحیتیں پوشیدہ ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اس وقت تک گہرے اور فلسفیانہ خیالات کو نرم اور مترنم الفاظ میں ادا کرنے کا گر نہ سیکھا تھا اور اس کی پرواہ انھیں اس وقت ہوئی جب کہ معترضین نے ان کا ناطقہ بند کر دیا۔ اگرچہ اس وقت بھی ان کو مرزا یہی کہہ کر ٹالتے رہے کہ ؎

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ ۔۔۔ گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

لیکن جیسے ہی ان کی نگاہ میں بلندی پیدا ہوتی ہے اور وہ اس رمز سے آشنا ہوتے ہیں ان کی آنکھوں سے یہ پردہ اٹھتا نظر آتا ہے۔ نسبتاً ان کی زبان میں سلاست اور روانی کے ساتھ صفائی آ جاتی ہے۔ مگر انھوں نے ابتدائی فلسفیانہ خیالات کو زبان کی سلاست و شائستگی کی قربان گاہ پر نہیں چڑھایا بلکہ ان کے خیالات اور تصورات اور بھی چمک اٹھے۔ چنانچہ انھوں نے مشکل تراکیب اور فارسی کے دقیق الفاظ اپنا اردو دیوان مرتب کرتے وقت نکال دیے۔ مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھیں ؎

بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغِ محفل ۔۔۔ جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

غالبؔ نے مصرعۂ ثانی اس شعر کا پہلے یوں کہا تھا ؎

"عشرتِ ایجاد چہ بوئے گل و چہ دودِ چراغ"

(۱۱) نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

اس شعر کا مصرعۂ اولیٰ غالبؔ نے بعد میں بدل دیا ورنہ پہلے شعر یوں تھا ؎

(۱۱) نہیں ہے بند زلیخا سے تکلف ماہِ کنعاں پر
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

تہذیب و تکدیر، ترمیم و تنسیخ کا یہ عمل ہر بڑے شاعر کا فطری خاصہ ہوتا ہے۔ ہر شاعر اپنی شعری تخلیق پر نظرِ ثانی کے بعد لطفِ زبان و بیان اور معنی آفرینی وغیرہ کے پیشِ نظر ردّ و بدل کرتا رہتا ہے۔ اسے خوب سے خوب تر کی تلاش رہتی ہے۔ ڈاکٹر علامہ اقبال نے بھی اپنی شعری تخلیقات کے ساتھ یہی کیا ہے اور حذف و اضافہ، حک و اصلاح سے اپنے کلام کو مزین کیا ہے۔ ان کی مشہور نظم "مرزا غالب"[2] جو ۵ بندوں پر مشتمل ہے اور "بانگِ درا" کی زینت ہے، پہلے اس کے چھ بند تھے "بانگِ درا" میں درج ذیل بند حذف کر دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

محرمِ کلکِ نقش کا ترا دیواں ہے یہ ۔۔۔ یا کوئی تفسیرِ رمزِ فطرتِ انساں ہے یہ
نازشِ موسیٰ کلامی ہائے ہندستاں ہے یہ ۔۔۔ نورِ معنی سے دلِ افروزِ سحر داماں ہے یہ
"نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا ۔۔۔ کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا"

[1] "یادگارِ غالب" ص ۱۹۵ [2] ملاحظہ فرمائیے "رختِ سفر" مرتبہ محمد انور حارث، کراچی ۱۹۵۲ء صفحات ۸، ۹ (بحوالہ "ہماری زبان" ۲۲ مئی ۶۹ء مرسلہ سید حامد حسین)

علاوہ ازیں دو شعر ایسے بھی ہیں جنھیں علامہ اقبال نے اپنی نظم میں باقی تو رکھا تاہم کچھ ترمیم کے بعد ملاحظہ ہو اصل شعر ؎

(۱) دید تیری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
صورت روحِ رواں ہر شے میں جو مستور ہے

مصرعۂ ثانی مگر "بانگ درا" کی نظم میں یوں ہے ؎

"بن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے"

(بند ۲ شعر ۳)

اسی طرح یہ شعر جو بانگ درا کی مشہور نظم "مرزا غالب" کا زبانِ زدِ خاص و عام ہے ؎

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے ‏ ‏ ‏ ‏ شمع یہ سودائی دلسوزیٔ پروانہ ہے

(بند ۲ شعر ۳)

پہلے یوں تھا ؎

گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے ‏ ‏ ‏ ‏ شمع یہ خوابیدہ دلسوزیٔ پروانہ ہے

حال ہی میں نو دریافت شدہ دیوانِ غالب کے نسخۂ امروہہ سے متعلق پروفیسر نثار احمد فاروقی نے اپنے ایک مضمون میں اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جس سے ہمارے اس نظریہ کی مزید توثیق و تائید ہوتی ہے [۱] پروفیسر موصوف فرماتے ہیں کہ "ایک اور عجیب نسخۂ امروہہ کی یہ ہے کہ اس سے نسخۂ حمیدیہ کی اولیت کا نظریہ ختم ہو جاتا ہے اس نسخہ میں جو کلام ہے وہ فارسی آمیز اغلاق اور مشکل پسندی کے اعتبار سے نسخۂ حمیدیہ پر بھی فوقیت رکھتا ہے۔ نسخۂ امروہہ کا غائر مطالعہ ثابت کرے گا کہ غالب فارسیت سے کس طرح دامن بچاتے گئے ہیں۔

متداول دیوان میں جو اشعار انھوں نے بطور نمونہ چھوڑ دیے تھے وہ بھی ابتدائی دور کے کلام کی اصلاح یافتہ شکل تھے۔ یہاں کچھ مثالیں پیش کرتا ہوں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ نسخۂ حمیدیہ کی ترتیب سے پہلے غالب نے کس طرح شعر کہے ہیں اور پھر انھیں کیا اصلاح کرنے کے بعد نسخۂ حمیدیہ میں شامل کیا۔ اشعار نسخۂ امروہہ سے لیے گئے ہیں اور ان کے سامنے قوسین میں وہ شکل لکھی گئی ہے جو نسخۂ حمیدیہ یا نسخۂ شیرانی میں ملتی ہے۔

(۱) (استغنا تمثال رماہ احتراق تال توجی)
تماشا کشورِ آئینہ میں، آئینہ بند آیا
(مژہ احترقتان کی بہر استقبال آنکھوں سے)

(۲) تغافل بدگمانی (بالظن) بر سخت جانی رہا [۲]
نگاہِ بے حجابِ ناز کو بیم گزند آیا
(تغافل بدگمانی بلکہ مری سخت جانی ہے)

(۳) (سوادِ چشمِ بسمل انتخابِ نقطہ آرائی) [۳]
خرام نازِ بے پروائی، قاتل پسند آیا
(روانی ہائے موجِ خونِ بسمل سے ٹپکتا ہے
کہ لطفِ بے تماشا) رفتنِ قاتل پسند آیا)

(۴) اگر آسودگی ہے مدعائے رنجِ کوشش ہا (بے باکی)

(۵) (نہیں در پردہ جز از کوششِ مشاطگی غافل) [۴]
[کرے ہے حسن خوباں پردے میں مشاطگی اپنی]

(۶) (شب کو باد صبا یار بے پیماں در حوائے دل) [۵]
(شب کو باد صبا حواب میں آنے کا غافل نے حباب)

(۷) (گویا) صحرا عیارِ دامن دیوانہ تھا [تو کہے]

(۸) جوشِ بے کیفیتی ہے اضطراب اندیش اسد [۶]
[اضطراب آرا اسد]۔

[۱] ماہنامہ "آجکل" دہلی ص۳
[۲] ایضاً (بحوالہ نسخۂ عرشی ص۱۱)
[۳] " (بحوالہ نسخۂ عرشی ص۱۲)
[۴] ماہنامہ "آجکل" دہلی جون ۶۹ء ص۳ (بحوالہ نسخۂ عرشی ص۲۳)
[۵] ایضاً "آجکل" دہلی جون ۶۹ء ص۳ (بحوالہ نسخۂ عرشی) ص۲۵
[۶] " " " " " " " (بحوالہ نسخۂ عرشی ص۲۵)

درد لبسمل کا اطپیدن ا لغزش ستانہ تھا

(ترجمہ)

یہ اشعار بلا شبہ ہمارے دعوے کی تصدیق کرتے ہیں کہ غالبؔ پر فارسیت اور دقت پسندی کا ابتدائی دور میں کتنا غلبہ رہا ہے۔ اپنے اسی مضمون مطبوعہ "آجکل" دہلی میں آگے چل کر پروفیسر نثار احمد فاروقی صاحب نے تجزیہ کرتے ہوئے بالکل درست فرمایا ہے کہ [1] "نسخہ امروہہ میں جو کانٹ چھانٹ ہے اسے دیکھیے پھر "نسخہ حمیدیہ" اور اس سے آگے بڑھ کر "نسخۂ شیرانی" اور "گل رعنا" کو دیکھیے بلکہ نسخۂ امروہہ سے لیکر نظامی پریس کانپور میں طبع ہونے والے ایڈیشن تک، جو غالبؔ کی زندگی ہی میں شائع ہونے والا آخری دیوان ہے، حک و اصلاح اور ترمیم و تبدیل کا عمل برابر جاری رہا ہے۔"

صرف اتنا ہی نہیں، مرزا کے ہاں ان کے موجودہ دیوان میں ایسے بیشتر اشعار ہیں جو نہ کہ صرف فارسیت پر دال ہیں بلکہ کہیں کہیں تو تمام و کمال اشعار ایسے بھی ہیں جو قطعاً فارسی ہی کے ہیں محض ردیف میں یا درمیان میں کوئی لفظ اردو کا آگیا ہے۔ اگر ہم اس اردو لفظ کی جگہ فارسی ہی کا کوئی ہم وزن اور ہم معنی لفظ رکھ دیں تو پورا کا پورا شعر فارسی شعر ہو جاتا ہے۔ ورنہ بحالتِ موجودہ ان کے اردو دیوان کے ایسے اشعار جن کی نشاندہی ذیل میں کی جارہی ہے ان کو ہم بزبردستی اردو کہہ لیں تو اور بات ہے۔ ملاحظہ ہوں ذیل کے چند ایسے ہی اشعار ؎

(۱) شمار سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

(۲) ہوائے سیرِ گل، آئینہ بے مہری قاتل
کہ اندازِ بخوں غلطیدنِ بسمل پسند آیا

(۳) جراحت تحفہ، الماس ارمغاں، داغِ جگر ہدیہ
مبارکباد اسدؔ غمخوارِ جانِ دردمند آیا

خط کشیدہ الفاظ ردیف کے "آیا" کی بجائے "آمد" پڑھے سے بالکل فارسی کے ہو جائیں گے۔ ذیل کے اشعار بھی اسی قبیل کے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں ؎

(۱) شب خمارِ شوقِ ساقی، رستخیز اندازہ تھا
تا محیطِ بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا

یہاں ردیف "تھا" کو "بود" کر دینے سے وہی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ ذیل کے اشعار میں بھی ردیف "ہے" کو "است" یا "ہست" کر دیجیے، فارسی شعر کے زمرہ میں چلے جائیں گے۔ انھیں بھی دیکھتے چلیے ؎

(۱) غنچۂ ناشگفتن ہا، برگِ عافیت معلوم
باوجودِ دلجمعی، خوابِ گل پریشاں "ہے" (است)

(۲) دیدار، بادہ، حوصلہ ساقی، نگاہ مست،
بزمِ خیال میکدۂ بے خروش "ہے" (ہست)

—— یا —— اسی زمین کا یہ مشہور شعر دیکھیں ؎

(۳) ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی،
مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش "ہے" (است یا ہست)

اور (۴) نشہ ہا شادابِ رنگ و ساز ہا مستِ طرب
شیشۂ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ "ہے"
عرضِ نازِ شوخیِ دنداں برائے خندہ "ہے"
دعوتِ جمعیتِ احباب جائے خندہ "ہے"
حسن بے پروا خریدارِ متاعِ جلوہ "ہے"
آئینہ، زانوئے فکرِ اختراعِ جلوہ "ہے"
تا کجا اے آگہی رنگِ تماشا باختن!
چشمِ وا گردیدہ آغوشِ وداعِ جلوہ "ہے" —— یا ——

یہ اشعار بھی غور طلب ہیں ؎

مستی بہ ذوقِ غفلتِ ساقی ہلاک "ہے"
موجِ شراب یک مژۂ خوابناک "ہے"
دل خوں شدۂ کشمکشِ حسرتِ دیدار
آئینہ بدستِ بتِ بدمستِ حنا "ہے"

---

[1] ماہنامہ "آجکل" دہلی صفحہ ۳۰ بابتہ ماہ جون ۶۹ء

مجبوری و دعوائے گرفتاریٔ الفت
دستِ تہ سنگ آمدہ پیمانِ وفا" ہے"

زبسکہ مشقِ تماشا جنوں علامت" ہے"
کشادہ بست مژہ سیلیٔ ندامت" ہے"

وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد
جنوں ساختہ و فصلِ گل قیامت" ہے"

اور یہ شعر ؎

یہ طوفاں گاہ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر تارِ بستر" ہے"

ان تمام اشعار کی ردیفیں ہی صرف اردو ہیں جنھیں "است - یا - ہست" کردینے سے یہ تمام فارسی ہو جائیں گے" دیوانِ غالب" میں "مانگے" کی ردیف میں تین ہی شعر ہیں۔ مگر ان میں سے یہ شعر دیکھیے ؎

نقشِ نازِ بتِ طناز، بہ آغوشِ رقیب — پائے طاؤس پئے خامۂ مانی "مانگے"

اگر مانگے کی بجائے "طلبد" پڑھا جائے تو کون اس شعر کو اردو کا شعر شمار کرے گا ؛

اب کچھ ایسے اشعار مرزا کے ملاحظہ فرمائیں جن کے مصاریع اولیٰ یا ثانی میں یا پھر دونوں مصرعوں میں ایک ایک لفظ اردو کی بجائے فارسی کا ہم معنی اور ہم وزن داخل کرنے سے وہ فارسی شعر بن جائیں گے مثلاً یہ شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

عشرتِ پارۂ دل، زخمِ تمنا "کھانا" — لذتِ ریشِ جگر، غرقِ نمکداں "ہونا"

مصرعۂ اولیٰ میں "کھانا" کی بجائے "خوردن" اور "ہونا" کی بجائے "بودن" پڑھ کر دیکھیں۔ اس طرح کا یہ شعر بھی ہے ؎

ذرہ ذرہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ "ہے" — گردشِ مجنوں، بہ چشمکہائے لیلیٰ آشنا

مصرعۂ اولیٰ میں "ہے" کو "است" یا "ہست" پڑھیے درج ذیل شعر کے مصرعۂ اولیٰ میں "فراہم کر" کو "فراہم کن" پڑھنے سے وہی بات پیدا ہوگی ؎

بہ نالہ حاصلِ دلبستگی "فراہم کر" — متاعِ خانۂ زنجیر جز صدا معلوم

ذیل کے شعر کے دونوں مصرعوں کے آخر میں لفظ "ہے" استعمال کیا گیا ہے۔ اور سوائے اس لفظ کے سب پورا شعر فارسی تراکیب اور فارسیت سے مملو ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

سرشکِ سر بہ صحرا دادہ، نور العینِ دامن" ہے"
دلِ بے دست و پا افتادہ، برخوردارِ بستر" ہے"

اور بھی اس قسم کی بیشتر مثالیں ڈھونڈنے سے مل سکتی ہیں۔ بخوفِ طوالت ان ہی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ قصائد کو چھوڑیے جن میں اردو اشعار کے درمیان ہی کئی کئی شعر فارسی کے بھی ہیں اس سے قطع نظر کہ قصیدہ میں شکوہِ الفاظ اور بلندیٔ افکار کی وجہ سے اس کی فضا ہی اس کی متقاضی ہوتی ہے پھر بھی قصائد میں مندرجہ ذیل قابل ملاحظہ ہیں۔ وہ قصیدہ جو کہ منقبت میں کہا گیا ہے۔ اور خاص طور پر شاہ ظفر کی شان میں جو قصیدہ غالب نے کہا ہے تو اس حقیقت سے پردہ اٹھتا نظر آئے گا یہی وجہ ہے کہ مولانا محمد حسین آزاد نے "آبِ حیات" میں مرزا کے بارے میں جو رائے دی ہے۔ دراصل وہ ان کی فارسیت کو ہی نشانہ بنایا ہے اور جہاں تک مرزا غالب کے دورِ اول کے کلام کا تعلق ہے آزاد کی رائے کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں اور اس میں قدرے صداقت نظر آتی ہے۔ اگرچہ وہ اپنی پہلودار تحریر دلکش و دلفریب اسلوبِ بیان اور چٹخارے دار زبان سے اپنے مبالغہ آمیز اعتراض کی شدت کو انشا کی رنگینی میں چھپا دیتے ہیں۔" آبِ حیات کی اصل عبارت یہ ہے [1]

"اس میں کلام نہیں کہ وہ اپنے نام کی تاثیر سے مضامین و معانی کے میدان کے شیر ہیں دو باتیں ان کے انداز کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں اول یہ کہ معنی آفرینی اور نازک خیالی ان کا شیوۂ خاص تھا۔ دوسرے چونکہ فارسی کی مشق زیادہ تھی اور اس سے ان کو طبعی تعلق تھا۔ اس لیے اکثر الفاظ اس طرح ترتیب دیے جاتے ہیں کہ بول چال میں اس طرح نہیں بولتے۔ لیکن جو شعر صاف نکل گئے ہیں وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں رکھتے۔"

مالک رام صاحب ایم۔ اے نے اپنے ایک مضمون

---

[1] "آبِ حیات" صفحہ ۴۳۲ بحوالہ "احوالِ نقدِ غالب" صفحہ ۱۵ مرتبہ محمد حیات خاں سیال اور ۵۵ وغیرہ

"آزاد بنام غالب" مطبوعہ ماہنامہ "آجکل" دہلی ۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے "احوال و نقد غالب" یا "آج کل" کی مذکورہ اشاعت) میں تجزیہ کے بعد اسی بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ (آزاد) یہی کہنا چاہتے ہیں کہ ــــ

(i) غالب دراصل اردو کے نہیں فارسی کے شاعر تھے

(ii) اردو میں ان کا اکثر کلام ناقابل فہم یا دوسرے لفظوں میں مہمل ہے۔

مگر حقیقت صرف اتنی سی ہے جیسا کہ اوپر کہیں بیان کیا گیا ہے کہ مرزا الفاظ کے در و بست اس کی غنائیت اور صوتیاتی ہم آہنگی سے بے خبر تھے ۔ مگر جیسے جیسے ان کے شعور کو ریختہ یا اردو کے مترادف الفاظ کو برتنے کا سلیقہ آگیا تو ان کے اشعار میں بلا کی روانی اور حسن پیدا ہو گیا اور ان کے اشعار میں ندرت اور شیرینی کے ساتھ ساتھ ایک قسم کی نشتریت اور دلربائی جو مرزا کے کلام کا خاص جوہر اور وصف ہے آ گئی ۔

ان کے فارسی کلام کو ایران و ہندستان میں وہ شہرت نہ مل سکی جس پر ان کو فخر و ناز رہا اور یہ عجیب سی بات ہے جسے وہ "نقش ہائے رنگ رنگ" ... "بے رنگ من است" کہتے رہے اور سمجھتے رہے وہی زبان اردو ہندستان میں ان کی شہرت اور مقبولیت کی اساس بنتی ہے ۔ انہوں نے اردو کے بیشتر اشعار اپنے دیوان سے نکال دیے ہیں اور قلم زد کر دیے ہیں جیسا کہ نسخہ حمیدیہ اور حالیہ نو دریافت شدہ نسخۂ امروہہ جو مرادآباد کے مولوی توفیق احمد صاحب کو بھوپال کے ایک کتب فروش شفیق الحسن نقشلی صاحب سے ملا ہے (اور اب جس کی ملکیت ان دونوں ایک مابہ النزاع امر بنی ہوئی ہے جیسا کہ بھوپال کے ایک جلسہ میں جو مجلس اردو بھوپال کے زیر اہتمام حال ہی میں منعقد ہوا تھا اس میں مولوی فضلی صاحب نے یہ اعلان کیا ہے کہ زیر بحث دیوان غالب کا وہ نسخہ جو کہ خود غالب کی تحریر ہے (اور جسے اب نسخۂ امروہہ کا نام دیا گیا ہے) انہوں نے مولوی توفیق احمد صاحب کو مستعار دیا ہے فروخت نہیں کیا ہے) اس کے تقابلی مطالعہ سے صاف عیاں ہے کہ مرزا غالب نے بیشتر اشعار میں حذف و اضافہ کیا ہے ۔ یا پھر قلم زد کر دیئے ہیں ۔ اور فارسی کے دقیق الفاظ نکال کر ان کی جگہ اردو کے الفاظ داخل کیے ہیں اور جو کچھ بھی دیوان غالب اردو مختصر سا ہمارے پیش نظر ہے یا منظر عام پر آیا ہے ۔ اہل ذوق حضرات اسی کو سرمۂ بصیرت بنائے ہوئے ہیں اور مرزا کا یہ دیوان نہ صرف شائقین اردو بلکہ خود زبان اردو کا قیمتی سرمایہ اور وجہ فخر و ناز بھی ہے ۔ حیرت تو یہ ہے کہ ایک صدی قبل اس زبان میں ان کے مرغ تخیل کی بلند پروازی اور فلسفیانہ عمق نے جذبات و احساسات کی زبان یعنی شاعری کی ایک نئی دنیا بسائی تھی ۔ اور فکر و فن کے امتزاج کے بعد بڑی چابکدستی سے ایسا حسین و دلکش اور جاں نواز مرقع پیش کیا کہ جس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ مکمل سو برس کے بعد کیا گیا ۔ اور اس وقت جس زبان کو غالب نے نخواہی نخواہی اپنے دلی جذبات کے اظہار کے لیے ذریعہ بنایا تھا ۔ بقول علامہ اقبال جو کہ ہنوز "منت پذیر شانہ" تھی اور غالباً اب بھی ہے بالیقین اردو زبان و شعر کے ساتھ ساتھ غالب کا کلام ملکہ دونوں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نقش جاوداں بن گئے ہیں ۔ دونوں کی آفاقیت، وسعت، جامعیت اور ہمہ گیری مسلم ہے ۔ اسی اردو دیوان کی وجہ سے مرزا غالب دنیا کے بڑے شاعروں میں شمار کیے گئے اور انھیں زندگی جاودانی ملی اور ایسا بڑا شاعر صدیوں بعد ہی پیدا ہوتا ہے ۔ بقول میر، ؎

پھرتا ہے فلک برسوں، تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

صہبائے شعر کے دو آتشہ یا سہ آتشہ ہونے کا انحصار اس کی کیفیت پر ہے نہ کہ کمیت پر اور قطع نظر اس کے کہ ؎

ڈیڑھ جز پر بھی تو ہے مطلع و مقطع غائب
غالب آسان نہیں صاحب دیوان ہونا

اسی مختصر سے دیوان کے خالق نے یہ بھی تو کہا ہے کہ ؎

ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

کیا غالب کی خوش نصیبی یہ کم ہے کہ "قبول عام" و "لطف سخن" دونوں سے قدرت نے انھیں نوازا ؎

"یہ مرتبہ بلند ملا جس کو مل گیا"

---

[1] ملاحظہ ہو "ہماری زبان" ۲۲ر جولائی ۶۹ء ص ۶



قطعات

عبدالغفار بخش

شام کے وقت سطح دریا پر
جھلملاتی ہیں اس طرح کرنیں
جیسے قیدی قفس میں گھبرا کر
توڑنا چاہتا ہو ـــــ زنجیریں

مسکراتے ہیں غم و رنج و محن
صحن گلزار میں چلتی ہے پَوَن
جب بھی دُہراتا ہے افسانہ کوئی
یاد آتی ہے بہت صبح وطن

سار کہتے تجھے کنول کہتے
ساغر بزم کا بدل کہتے
کچھ جو ملتی کبھی غموں سے نجات
ہم تجھے میر کی غزل کہتے

خواہشوں کو سدا اچھالا ہے
جذبۂ دل مرا نرالا ہے
بھول سکتا نہیں کبھی اس کو
میری باتوں کو جس نے ٹالا ہے

جتنی خوشیاں بھی اس کو مل جائیں
اس کا ہر غم خوشی پہ بھاری ہے
ٹمٹماتے دیوں کے سائے میں
جس نے بھی زندگی گذاری ہے

قطعات

ثاقب صدیقی

نئی امنگ نئے حوصلوں کو ساتھ لیے
مناؤ جشن مسرت مگر سلیقے سے
قدم قدم پہ جلاؤ محبتوں کے دیے
سجاؤ محفل عشرت مگر سلیقے سے

کہیں کسی بھی طرح کی کمی نہ رہ جائے
کہ تم کو صفحۂ تاریخ پہ ابھرنا ہے
سنوار دینا ہے امروز کو پسینے سے
لہو سے خاکۂ فردا میں رنگ بھرنا ہے

تم آنکھ کھول چکے ہو تو اب رہو بیدار
رخ زمانہ بہر آن دیکھنا ہوگا
جو ایک پل کو بھی غافل ہوئے تو ہوگا ستم
جو آنکھ جھپکی تو دشمن کا فائدہ ہوگا

ہزاروں ناگ ابھی رینگتے ہیں گلشن میں
ہزاروں خار ہیں پھولوں کا بھیس بدلے ہوئے
وطن پرستی کے پردے میں ملک دشمن ہیں
اجل چھپی ہے اصولوں کا بھیس بدلے ہوئے

قدم بڑھاؤ مگر تیشۂ نظر لے کر
کہ تم کو راہ کے روڑوں کو ختم کرنا ہے
سفیر امن و محبت، پیام صدق و وفا
عظیم ہو کے جہاں میں تمھیں ابھرنا ہے



سلطان سلیم (جہانگیر)

ایک باغی بادشاہ کی حیثیت سے

* جلال الدین

سلطان سلیم (جہانگیر) اکبر اعظم کے آخری ایام حکومت میں چند سال تک بحیثیت ایک باغی بادشاہ حکومت کرتا رہا۔ اس کا مرکز الہ آباد کا قلعہ تھا۔ اس کی باغیانہ سرگرمیوں کا تذکرہ مورخین نے کیا ہے لیکن بعض جزئی تفصیلات جیسے سلطان سلیم کی تخت نشینی کی تقریب، فرمان اور سکوں کے اجرا وغیرہ کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے۔ جہانگیر نے اپنی توزک میں ۵ ویں سال جلوس کے واقعات کے ضمن میں سنگ موسیٰ کے سیاہ تخت کو الہ آباد سے آگرہ لے جانے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن اس بات کا تذکرہ نہیں کیا کہ یہ تخت الہ آباد میں اس نے کب بنوایا تھا اور کس مقصد کے لیے۔ البتہ تخت خود ہی اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ یہ زمانۂ بغاوت میں بنایا گیا تھا اور اس کے بنوانے کا سال ۱۰۱۱ھ یا ۱۶۰۲ء ہے۔

اعلان بادشاہت کے ساتھ ہی تخت نشینی، فرمان اور سکوں کا اجرا بھی ضروری ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ سلطان سلیم نے بغاوت کے زمانے میں قلعۂ الہ آباد کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا کر یہاں سے متعدد فرمان جاری کیے تھے۔ یہ فرمان کم یاب اور خاصی اہمیت کے حامل ہیں۔

یو۔ پی کے سرکاری محافظ خانۂ دستاویزات (STATE ARCHIVES OF U.P.) میں سلطان سلیم کے عہدِ بغاوت کا ایک فرمان موجود ہے جس کے تفصیلی تذکرہ کے ساتھ یہاں اس تخت اور سکے کا بھی جائزہ لیا جا رہا ہے۔ یہ فرمان اکبر کے ۴۷ ویں سال جلوس یا ۱۶۰۲ء میں جاری کیا گیا تھا۔ اس فرمان کے مطابق شیخ ادریس کو ۲۲۰ بیگہ زمین پرگنہ صدرپور سرکار خیرآباد میں بطور "مدد معاش" دی گئی ہے جو ہر طرح کے ٹیکس سے معاف تھی۔ اصل فرمان کی نقل درج ذیل ہے۔

الملک للہ

حکم جہاں مطاع ابوالمظفر سلطان سلیم شاہ غازی

(مہر مدور)

مظفر الدنیا والدین
سلطان سلیم بادشاہ

دریں وقت فرمان عالیشان واجب الاطاعة والاذعان
از کمن لطف و احسان شرف صدور و رو عز ورود یافت کہ
موازی دو صد و بست و چہل بیگہ زمین افتادہ لائق زراعت گز الہی بطریق ابتدائی
از ابتدائی خریف پارس ئیل از پرگنہ صدرپور سرکار خیرآباد در وجہ مدد معاش
مشیخت مآب شیخ ادریس وغیرہ بتفصیل ضمن مقرر و مسلم باشد کہ حاصلات آں را
سال بسال صرف معیشت خود ساختہ بدعای دوام دولت قاہرہ اشتغال
نمایند می باید کہ حکام و عمال و جاگیرداران و کروریان حال و استقبال پرگنہ
مذکور آراضی مذکور را از محل یک بیمودہ و چک بستہ تصرف آنہا باز
گذاشتہ مدخل نمایند و بعلت مال و جہات و اخراجات و عوارضات چوں
قلبہ و پیشکش و سادری و دہ نیمی و مقدمی و گاو شماری و صد دہی و قانون
گوئے و حصہ و رسد و شکار و بیگار و تکرار زراعت و ضبط ہر سالہ بعد
تشخیص چک و کل تکالیف دیوانی و مطالبات سلطانی مزاحمت نرسانند
و ہر سال فرمان و پروانچہ مجدد طلب ندارند دریں باب قدغن تمام لازم
دانستہ از فرمودہ صدر در نگذرند۔

تحریراً فی التاریخ غرہ اسفندار مذ ماہ الہی سنہ ۴۷
در چوکی مقرب الحضرت الخاقانی لعل بیگ و رسالہ صدارت

پناہ افاضت دستگاہ شیخ نوراللہ و نوبت واقعہ نویسی عبدالسلیم روز دی ۲۴ ماہ ذی الہی سنہ ۴۶

پشت پر جو پانچ مہریں ثبت ہیں ان میں ذیل کی عبارت درج ہے:

(۱) "نوراللہ مرید است شاہ سلیم" (۲) "عاقبت محمود مرید است شاہ سلیم" (۳) "معین الدین مرید است شاہ سلیم" (۴) "۔۔۔ مرید است شاہ سلیم" (۵) "۔۔۔ مرید است شاہ سلیم"

ان مہروں سے قریب ہی متعلقہ حکام کے دستخط اور تاریخیں بھی درج ہیں۔ یہ فرمان گوناگوں اہمیت کا حامل ہے جس میں سب سے اہم بات یہ ہے کہ سلطان سلیم کی بغاوت کے فوراً ہی بعد یہ جاری کیا گیا ہے۔

فرمان کے اوپری حصہ پر اکبر بادشاہ کے نام کا کوئی طغریٰ نہیں ہے بلکہ صرف "سلطان سلیم شاہ" درج ہے حالانکہ اس زمانے میں عام دستور یہ تھا کہ تمام شہزادے بادشاہِ وقت کے نام کے طغریٰ کے بغیر کوئی حکم نامہ یا نشان جاری کرنے کے مجاز نہ تھے۔

سلیم کے نام کے ساتھ اس کی کنیت "ابوالمظفر" اور "غازی" کا خطاب درج ہے جس کو صرف مطلق العنان حکمران لکھتے تھے۔ پورا نام "ابوالمظفر سلطان سلیم شاہ غازی" درج ہے۔ "بادشاہ" خطاب کا درج کرنا اس کی آزادانہ و باغیانہ روش پر دلالت کرتا ہے۔

فرمان کے ابتدائی جملے ہیں "۔ فرمان عالیشان ۔ شرف صدور یافت" درج ہے جس سے ظاہر ہے کہ سلیم نے اس حکم کو خود ہی "فرمان" کا نام دے دیا ہے۔ اس فرمان کی عبارت اور دیگر شاہی فرامین کی عبارت میں فرق نہیں ہے۔ سائز بھی عام فرمانوں جیسا ہے۔

پشت فرمان پر مختلف حکام کی جو مہریں ثبت ہیں ان سب میں "مرید شاہ سلیم" درج ہے۔ اس سے ان حکام کی سلطان سلیم سے وفاداری اور ماتحتی کا اظہار ہوتا ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ یہ حکام اسی نے مقرر کیے تھے۔ اس فرمان کے اجراء سے دور دراز مقامات پر سلطان سلیم کے تصرف کا بھی پتہ چلتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ کہاں تک کا علاقہ اس کے زیرنگیں تھا۔

سلطان سلیم کے جو فرامین دستیاب ہوئے ہیں ان کی کم یابی اور نشر و اشاعت نہ ہونے سے اکثر مورخین کو بھی غلط فہمی ہو گئی۔ فرامین سلاطین مرتبہ مولوی بشیرالدین مرحوم کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ ان کو بھی سلطان سلیم کا ایک فرمان دستیاب ہوا مگر انھوں نے غلط فہمی کی بنا پر اسے اسلام شاہ سوری کا فرمان قرار دیا ہے۔ فرامین سلاطین کے صفحہ ۲۲ پر "سلطان سلیم شاہ" کے فرمان کا تذکرہ کرتے ہوئے مولوی بشیرالدین مرحوم رقمطراز ہیں:

"اسی بادشاہ کو اسلام شاہ بھی کہتے ہیں۔ یہ سنہ ۹۵۲ھ سے سنہ ۹۶۰ھ تک حکمراں رہا۔" اسی کتاب کے صفحہ ۴۰ پر فرمان کی نقل درج ہے جس کے ابتدائی جملے یہ ہیں:

"دریں وقت فرمان عالیشان واجب الاطاعت والاذعان از کمن لطف (و احسان) شرف صدور یافت کہ۔ ۔۔۔۔۔"

خاتمہ پر تاریخ درج ہے:

"تحریر فی التاریخ ۲ امرداد الٰہی سنہ ۴۹"

مذکورہ بالا فرمان کی عبارتیں صرف چند الفاظ مختلف ہیں جو معافی دار اور زمین کی جائے وقوع وغیرہ سے متعلق ہیں۔ ورنہ دیگر تفصیلات میں تطعاً فرق نہیں ہے۔ "الٰہی" سن تو اکبر کی ایجاد تھی۔ پھر سال جلوس صاف صاف ۴۹ لکھا ہوا ہے جو اکبر کے عہدِ حکومت کا سال ہے۔

سلطان سلیم کا تخت

سلطان سلیم کی بغاوت کے زمانے کا سنگ موسیٰ کا سیاہ تخت آگرہ کے قلعہ میں دیوان خاص کے صحن میں دریا کی طرف دیوار سے لگا ہوا رکھا ہے جو بیچ سے ٹوٹ بھی گیا ہے۔ اس کا تذکرہ جہانگیر نے اپنی تزک میں ان الفاظ میں ۲۵ویں سال جلوس کے واقعات میں کیا ہے:

"اور دولت خاں جو تخت سنگ سیاہ کو لانے کے واسطے الہ آباد کو گیا تھا چہارشنبہ چوتھی ماہ مہر کو اس کو ہمراہ لاکر باریاب ملازمت کا ہوا اور تخت کو کمال حفاظت سے لایا۔ عجیب عمدہ تخت ہے کہ نہایت سیاہی سے چمکتا ہے۔ اکثر لوگ کسوٹی کا کہتے ہیں۔ طول چھ گرہ کم چار گز ہے اور عرض دو گز ڈیڑھ طسو، حجم تین طسو کا۔ میں نے اس کے کناروں پہ سنگ تراشوں سے عمدہ اشعار کھدوائے اور پائے بھی اسی طرح کے پتھر سے بنوا کر

لگائے اور اکثر اس پر بیٹھا کرتا ہوں۔"

تخت کی لمبائی ۱ فٹ ۹ انچ، چوڑائی ۹ فٹ ۱۰ انچ اور موٹائی ۶ انچ ہے۔ اس کی موٹائی میں چاروں طرف نہایت خوشخط نستعلیق میں ذیل کے اشعار کندہ ہیں:

"بادشاہے کہ تیغ او سازد | چوں دو پیکر سر عدو بہ دو نیم
باشد ایں تختگاہ فرخندہ | تکیہ گاہ خدایگان کریم
تحت خسروان پائے ملک | مہر و مہ را عیار بہ زر و سیم
سند با صفا ز نور و ضیاء | گوہرے بہا چو دُرّ یتیم
بہر تاریخ او بفکر شدم | مژدۂ جستم از خدائے حکیم
تا فلک تختگاہ خورشید است | گفت ماند سریر شاہ سلیم
سریر حضرت سلطان سلیم اکبر شاہ | ہمیشہ باد منور بنور مہر الٰہ

تخت کے پایوں پر کافی چھوٹے حروف میں ذیل کی عبارت اور اشعار کندہ ہیں

"چوں شاہ سلیم وارث تاج و تخت | بر تخت نشست بہر گیتی آئین
شد ہم مبارکش چو ذات | در نور عدالت نقشش فروز الدین
سیم ساعی پیش از جلوس شاہ سلیم | و بعد از ان نور الدین محمد جہانگیر بادشاہ غازی

بلند مرتبہ باد از فلک بحکم الٰہ
سریر شاہ جہانگیر ابن اکبر شاہ"

مذکورہ بالا دونوں کتبے اس بات کے شاہد ہیں کہ یہ الگ الگ وقتوں میں تیار کیے گئے تھے۔ تخت کے چاروں طرف جو اشعار کندہ ہیں ان میں "سلطان سلیم شاہ" کا نام آیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ الہ آباد ہی میں کندہ کرائے گئے تھے۔[1]

تخت کے پایوں کی عبارت چھوٹے حروف میں منقش ہے اور اس میں جہانگیر کا نام بار بار آیا ہے اور یہ صراحت بھی ہے کہ جلوس سے قبل "سلطان سلیم" نام تھا۔ لہٰذا یہ طے ہے کہ یہ تخت بغاوت کے زمانہ ہی میں تیار ہوا تھا۔ اس کے اشعار میں تین مقامات پر "سلیم" کا نام بہ حیثیت ایک بادشاہ کے آیا ہے۔ یعنی

"سریر حضرت سلطان سلیم اکبر شاہ" ۔ "سریر شاہ سلیم" اور "بادشاہ"۔

سلطان سلیم کے سکے

تخت نشینی کے ساتھ ساتھ سلطان سلیم نے فرمان اور سکے بھی جاری کیے تھے۔ اس عہد کا ایک سکہ اسٹیٹ میوزیم لکھنؤ میں موجود ہے۔ تخت اور فرمان پر "سلطان سلیم" کا ایک ہی جیسا نام درج کیا گیا ہے لیکن سکے کا مطالعہ خاصی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس پر بھی فرمان اور تخت دونوں میں مندرج عبارتیں موجود ہیں۔ سکے پر نقش ہے

"مالک الملک سکہ زد بر زر
شاہ سلطان سلیم اکبر شاہ" (ضرب احمد آباد)

"مالک الملک" فرمان کے سرنامہ پر موجود ہے اور سکے کے ایک جانب بھی یہی عبارت منقش ہے۔ "سلطان سلیم اکبر شاہ" اور "شاہ سلیم" تخت پر کندہ ہے اور سکے کے دوسری جانب "شاہ سلطان سلیم اکبر شاہ" کا نقش موجود ہے۔

سکے میں ضرب احمد آباد بھی درج ہے جس سے ظاہر ہے کہ احمد آباد کے ٹکسال میں سلطان سلیم کا کوئی خاص معتمد علیہ موجود تھا۔ جہاں سے ڈھلنے کے بعد یہ سکے جاری ہوئے ہوں گے۔ اس بات کا امکان ہے کہ متعدد سکے عہد بغاوت کے موجود ہوں اور مغالطے کی بناء پر تحقیق نہ کی جا سکی ہو۔

بہر حال تخت، فرمان اور سکے کی مماثلت اور موجودگی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ سلطان سلیم نے عہد بغاوت میں باقاعدہ اور منظم حکمرانی کی تھی۔

★

---

[1] قلعہ الہ آباد میں سلطان سلیم نے اشوک کی لاٹ پر ایک تحریر نقش کروائی ہے جس میں کاتب کا نام عبداللہ مشکیں رقم درج ہے۔ یہ خطاط عہد اکبری کا مایہ ناز کاتب تھا۔ مشکیں رقم کا خطاب اکبر نے دیا تھا۔ تخت اور لاٹ کے کتبوں کے خط میں مماثلت ہے۔ دونوں کا خط انتہائی پاکیزہ ہے۔ گمان غالب ہے کہ اسی کاتب نے تخت کے کتبوں کو بھی لکھا ہوگا۔

آزادی کے بعد

ہندستان میں کرکٹ

وجے مرچنٹ

اس مضمون میں ہندستانی کرکٹ ٹیم کے سابق کپتان اور ممتاز کرکٹ کھلاڑی وجے مرچنٹ نے ۱۹۲۹ء سے لے کر اب تک ہندستان کے کھیلوں کا جائزہ لیا ہے اور ۶۲-۱۹۶۱ء سے ہندستانی کرکٹ کے بدلتے ہوئے معیار پر روشنی ڈالی ہے۔ قارئین نیا دور کی دلچسپی کے لیے یہ مضمون یہاں شائع کیا جا رہا ہے۔ (ایڈیٹر)

دوسری جنگ عظیم کے دوران یعنی سنہ ۱۹۳۹ء سے سنہ ۱۹۴۵ء تک ہندستان اور غیر ملکی کرکٹ ٹیموں کے دورے ایک دوسرے ملک میں نہیں ہوئے اور تمام ٹورنامنٹ اور میچ اندرون ملک ہی ہوئے۔ ان میں سے بعض حیرت انگیز تھے۔ مثال کے طور پر پنٹانگلر کرکٹ اور رنجی ٹرافی ٹورنامنٹ۔ ان میچوں اور ٹورنامنٹوں میں خاص کر بہتر بیٹنگ کا مظاہرہ کیا گیا۔ وجے ہزارے، روسی مودی اور راقم الحروف نے نہ صرف انفرادی طور پر بڑے بڑے سے نہ صرف انفرادی طور پر بڑے بڑے اسکور کیے بلکہ انھوں نے ایسی استقامت کا مظاہرہ کیا جس کی مثال مستقبل میں سوائے سنیل گواسکر کے اور کوئی کھلاڑی پیش نہ کر سکا۔ ان کھیلوں نے ہماری بیٹنگ کی صلاحیتوں کے بارے میں بڑا غلط نقش چھوڑا۔ بڑے بڑے انفرادی اسکور ان وکٹوں پر کیے گئے جو سب کے سب بلے بازوں کے موافق تھے۔ اس لیے میں ان کھیلوں کا ذکر نہیں کروں گا جو صرف ریکارڈ قائم کرنے کے لیے ہیں۔

بہرکیف ایک ریکارڈ کا تذکرہ ضروری ہے اس لیے کہ یہ نہ صرف ایک نمایاں ریکارڈ ہے بلکہ ہندستانی کرکٹ میں نہایت ہی انوکھا بھی۔ روسی مودی نے ۴۵-۱۹۴۴ء کے رنجی ٹرافی میچوں میں ۱۰۰۸ رن بنائے تھے۔ ان میچوں میں ان کا اسکور ۱۶۰، ۲۱۰، ۲۴۵ (آؤٹ نہیں ہوئے) اور ۳۱ (آؤٹ نہیں ہوئے) ۱۱۳، ۹۸ اور ۱۵۱ اور رنوں کا اوسط ۲۰۱.۶۰ رہا تھا۔ اس زمانے میں تمام میچ "ناک آؤٹ سسٹم" (KNOCKOUT SYSTEM) سے ہوا کرتے تھے۔ قومی کھیلوں میں لیگ سسٹم پر میچ نہیں کھیلے جاتے تھے۔

جنگ عظیم کے فوراً بعد لنڈسے ہیسٹ (LINDSEY HASSETT

سی کپتانی میں آسٹریلیا کی سروسز ٹیم ہندوستان آئی۔ اس میں دو ممتاز کرکٹ کھلاڑی، کیتھ ملر اور کیس میئر شامل تھے۔ اول الذکر نے بعد میں بڑا نام پیدا کیا اور آخر الذکر ایک عظیم لیگ اسپن ([illegible]) بالر ثابت ہوا۔ ملر ۳۰۰۰ سے زیادہ رن بنانے والا اور ۲۰۰ وکٹیں لینے والا بین اقوامی کرکٹ کھلاڑی تھا۔ لیکن ۱۹۵۶ء میں وہ قبل از وقت ریٹائر ہو گیا اور اس طرح کرکٹ کی دنیا میں سب سے زیادہ رن بنانے والے اور سب سے زیادہ وکٹ لینے والے کے اعزاز سے محروم رہ گیا۔ آسٹریلیا واپس ہونے کے بعد میئر آسٹریلین کرکٹ تنظیم اور وہاں کے سلوک سے نہایت بددل ہو کر انگلستان ہجرت کر گیا جہاں وہ برسوں تک لیگ کرکٹ کھیلا اور شہرت حاصل کی۔

آسٹریلیا کی متذکرہ بالا سروسز ٹیم نے ہندوستان میں تین غیر سرکاری ٹسٹ میچ کھیلے۔ پہلے دونوں میچ ہار جیت کے فیصلے کے بغیر ختم ہوئے۔ البتہ تیسرے میچ میں ہندوستانی ٹیم کو غیر متوقع کامیابی حاصل ہوئی۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ ممتاز کھیل کا مظاہرہ روسی مودی نے ڈبل سنچری بنا کر کیا، اور اسی میچ میں بنرجی اور سروٹے نے نہایت ہی عمدہ باؤلنگ کی۔

بعد ازاں ۱۹۴۶ء میں ہماری ٹیم انگلستان گئی جہاں ہمارا پرجوش استقبال کیا گیا۔ جنگ سے تھک کر اور مختلف طرح کی پابندیوں سے تنگ آ کر انگریز تفریح کے خواہاں تھے جسے ہندوستانی ٹیم نے خاطر خواہ طریقے سے بہم پہنچایا۔ ہم لوگوں کو انگلستان کے خلاف بہتر کھیل کو پیش کرنا چاہیے تھا اس لیے کہ انگریز کھلاڑی چھ سالہ جنگ کے نفسیاتی اثرات سے ابھی چھٹکارا حاصل نہیں کر سکے تھے اور ہمارے یہاں گو جنگ نہ تھا اور ممتاز کھلاڑی بھی موجود تھے مگر بدقسمتی سے ہم بحیثیت ایک ٹیم کے کھیل نہیں سکے اور یہ ہندوستان کی زبردست کوتاہی رہی۔

ہم نے عظیم کرکٹ کھلاڑی پیدا کیے ہیں اور نہایت ہی شاندار انفرادی کھیل کا مظاہرہ کیا ہے، لیکن ہم ایک ٹیم کی حیثیت سے اتحاد عمل، عزم صمیم اور جنگی اسپرٹ پیش کرنے سے قاصر رہے ہیں۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہندوستانی کھلاڑیوں میں ہم آہنگی نہیں ہے لیکن ٹیم اسپرٹ اور دوستی دو مختلف چیزیں ہیں۔ ہم یا تو جلد مطمئن ہو جاتے ہیں اور یا پھر اپنی سہل پسندی کی وجہ سے ایک اچھا آغاز ہونے پر بھی اپنی پوزیشن مضبوط نہیں کر پاتے۔

بدقسمتی سے ۱۹۴۶ء میں ہندوستانی کرکٹ ٹیم کے دورۂ انگلستان کا آغاز کپتان کے انتخاب کے سلسلے میں سخت اختلافات سے ہوا۔ راقم الحروف ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۵ء تک غیر سرکاری ٹسٹ میچوں میں ہندوستانی ٹیم کی قیادت کرتا رہا۔ اچانک ۱۹۴۶ء میں بورڈ کے چند ارکان نے نواب پٹودی (مرحوم) کو کپتان کے فرائض انجام دینے کی دعوت دی۔ بلاشبہ پٹودی ایک عظیم کھلاڑی تھے مگر وہ جنگ کے دوران اول درجے کے کرکٹ سے غیر منسلک رہے۔ انھیں آخری لمحوں میں کپتان منتخب کر کے ان کے ساتھ ناانصافی کی گئی۔ چنانچہ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں کہ وہ اس دورے میں ناکام رہے اور وہ اپنے معیار کو قائم نہ رکھ سکے۔ وہ صرف ۹۸۱ رن بنا سکے اور رنوں کا اوسط ۲۶٫۴۷ رہا جو توقع سے بہت کم تھا۔ علاوہ ازیں اس دورے میں وہ جسمانی طور پر بھی چست نہ رہ سکے۔

اس دورے میں مونکڈ پہلے ہندوستانی کھلاڑی تھے جنھوں نے ڈبل اسکور کیا۔ انھوں نے ۱۱۲۰ رن بنائے اور ۱۲۹ وکٹ لیے۔ یہ کارنامہ سر انجام دینے کے لیے کسی بھی کھلاڑی کو ایک عمر درکار ہوتی ہے۔

راقم الحروف نے کل ۲۳۸۵ رن بنائے جن میں سات سیکڑے شامل ہیں۔ رنوں کا اوسط ۷۴٫۵۳ رہا۔ یہ اعداد و شمار ہندوستانی کرکٹ میں ایک ریکارڈ کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ اب تک کوئی بھی اتنے رن نہیں بنا سکا ہے اور نہ کوئی سیکڑے (سنچری) کی اس تعداد تک پہنچ سکا ہے اور وہ بھی مرطوب موسم میں۔

ہندوستانی ٹیم اگرچہ ہار گئی مگر مجموعی طور پر یہ سفر کامیاب رہا کیونکہ ہمارے کھلاڑیوں نے عمدہ کھیل کا مظاہرہ کیا اور انگریز تماشائیوں کو کافی محظوظ کیا۔ وہ لوگ ہمارا کھیل دیکھنے کے لیے کثیر تعداد میں آئے اور ہماری ٹیم کو ہر طرح کا تعاون دیا اور ہمت افزائی کی۔

مانکڈ اور راقم الحروف کی غیر معمولی کامیابی سے قطع نظر اس دورے کی مزید دو چیزیں توجہ کی مستحق ہیں۔ چندو سروٹے اور شوٹے بنرجی نے اوول میں سرے کے خلاف آخری وکٹ پر ۲۴۹ رن بنائے۔ اس طرح

یہ سب سے زیادہ رن بنانے والوں میں دوسرے نمبر پر رہنے والی جوڑی ثابت ہوئی۔

اس ریکارڈ کا سب سے عظیم پہلو یہ تھا کہ جب دونوں نے پارٹنرشپ میں کھیلنا شروع کیا تو اس وقت دونوں میں سے کسی نے ایک بھی رن نہیں بنایا تھا۔

دورہ انگلستان کے بعد ۴۸-۱۹۴۷ء میں ہندستان کی ٹیم لالہ امرناتھ کی سرکردگی میں آسٹریلیا گئی۔ جب ٹیم کا انتخاب ہوا تھا اس میں سے راقم الحروف (بحیثیت کپتان)، مشتاق علی اور روسی مودی خرابیٔ صحت کے باعث نہیں جاسکے۔ فضل محمود کو تقسیم ہند کی وجہ سے اپنا دورہ منسوخ کرنا پڑا۔ اس طرح ہم لوگوں کو کڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ پانچ ٹسٹ میچوں میں ہم لوگ چار ٹسٹ میچ ہار گئے۔ مگر ایڈی لیڈ کے چوتھے ٹسٹ میچ میں ہزارے نے دونوں باری (اننگز) میں (۱۱۶ اور ۱۴۵) سنچریاں بنا کر وہ شاندار کارنامہ سرانجام دیا جس نے اس دورے میں ہمیں رسوائی سے بچالیا۔ ان ٹسٹ میچوں میں منکڈ نے بھی دو سنچریاں بنائیں۔ بریڈمین عروج کے عالم میں تھے اور انھوں نے ۳۹ برس کی عمر میں ۷۱۵ رن ۱۷۸ کے اوسط سے بنائے۔

دوسرے سال یعنی ۴۹-۱۹۴۸ء میں ویسٹ انڈیز کی ٹیم ہندستان آئی۔ راقم الحروف کو کپتان مقرر کیا گیا۔ مگر میں پھر اپنی صحت کی خرابی کے باعث نہیں کھیل پایا۔ خود اپنی سرزمین پر بھی ہم لوگ اچھے کھیل کا مظاہرہ نہیں کرسکے اور وہ واحد ٹسٹ میچ بھی ہار گئے جس کا فیصلہ ہوا۔ باقی چاروں میچ برابر رہے تھے۔

آخری ٹسٹ میچ میں ہم لوگوں کو اپنی جیت یقینی نظر آنے لگی۔ دو وکٹ باقی رہ گئے تھے اور ہم لوگوں کو صرف چھ رن بنانے تھے۔ ہزارے اور مودی نے بہترین کھیل کا مظاہرہ کیا اور ان دونوں نے ۶۷٫۸۰ کے اوسط سے ۵۴۳ رن اور ۵۶ کے اوسط سے ۵۶۰ رن بنائے۔ بیسیرز میں سب سے شاندار کارنامہ ایورٹن ویکس نے انجام دیا۔ انھوں نے ۱۱۱٫۲۸ کی اوسط سے ۷۷۹ رن بنائے۔ وہ یقیناً ایک شاندار کھلاڑی تھے اور بحیثیت گیند انداز ان کا کارنامہ آنے والے برسوں میں بین الاقوامی گیند اندازوں کے لیے مشعل راہ ثابت ہوا۔

پھر ۵۰-۱۹۴۹ء میں دولت مشترکہ کی ٹیم جوک اسٹون کی سرکردگی میں ہندستان آئی۔ راقم الحروف بھی تین سال کے تعطل کے بعد اول درجے کے کرکٹ کے لیے واپس آ گیا۔

میں نے بورڈ سے درخواست کی کہ مجھے آئندہ کھیلوں کے لیے ہندستانی ٹیم کا کپتان مقرر کیا جائے، کیونکہ میں اول درجے کے کرکٹ سے ۴۰ سال کی عمر میں ریٹائر ہوجانا چاہتا ہوں۔ اس کے باوجود بورڈ نے مجھے دولت مشترکہ کی ٹیم کے خلاف کھیلنے والی ہندستانی ٹیم کا کپتان منتخب کرلیا۔

ہندستان آنے والی دولت مشترکہ کی پہلی ٹیم کے خلاف ہم لوگوں نے بہت ہی عمدہ کھیل پیش کیا۔ تین میں سے دو میچ جیت کر ہم لوگوں نے ربر حاصل کرلیا۔ ہزارے نے غضب کی باؤلنگ کی اور ۲۱ وکٹ لیے انھوں نے ہر وکٹ پر اوسطاً ۲۳٫۲۸ رن دیے۔ پہلے میچ میں راقم الحروف زخمی ہوگیا۔ میری غیر موجودگی میں کپتان کے فرائض ہزارے نے انتہائی شاندار طور پر انجام دیے۔ میں پھر واپس آ گیا اور دوسرے میچ کی دو اننگز میں ۸۰ اور ۹۰ رن بنائے۔ میرے ہاتھ میں شدید چوٹیں آئیں اور میں آئندہ کھیلوں میں حصہ نہ لے سکا۔

دولت مشترکہ کی ٹیم کی طرف سے فرینک ووریل نے بہترین کھیل کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے ۹۷٫۷۱ رن کی اوسط پر ۶۸۴ رن بنائے۔ جارج ٹرائب نے بھی بہت ہی عمدہ کھیل پیش کیا اور انھوں نے ۲۵٫۵۸ رن کے اوسط پر ۴۲ وکٹ لیے۔

اس کے بعد دولت مشترکہ کی دوسری ٹیم مشہور انگریز بلے باز اور وکٹ کیپر لزلی ایمز کی سرکردگی میں ہندستان آئی۔ ہم لوگ یہ سیریز دو میچوں کے مقابلے میں صفر سے ہار گئے۔ ہزارے، امرسنگھ اور راقم الحروف نے سخت جدوجہد کی۔ ہزارے نے ۹٫۲۵ کی اوسط پر پھر ۶۳۴ رن بنائے۔ دوسری طرف جان ایکن جیسے اسٹار بلے باز نے ۸۹٫۲۸ کے اوسط پر ۶۲۴ رن بنائے۔ منکڈ ہماری ٹیم کا سب سے اچھے وکٹ لینے والے ثابت ہوئے۔ انھوں نے ۳۳٫۳۴ پر ۲۲ وکٹ گرائے۔ ہندستان کو یہ سیریز جیت لینا چاہیے تھی مگر ہم لوگوں کا کھیل جو اگرچہ انفرادی طور پر بہت ہی اچھا رہا مگر معیار پر پورا نہ اتر سکا۔

ایک سال کے وقفے کے بعد ۵۲-۱۹۵۱ء میں انگلینڈ کی کرکٹ ٹیم ہندستان آئی۔ یہ ان کی بہترین ٹیم نہیں تھی اور مدراس میں اسے ایک اننگ اور ۸ رن سے ہرا کر ہندستان نے سرکاری ٹسٹ میچوں میں پہلی فتح حاصل کی تھی۔ بیٹنگ میں پنکج رائے اور باؤلنگ میں وینو منکڈ نے کارہائے نمایاں انجام دیے۔ منکڈ نے ۱۶٫۷۹ کے اوسط پر ۳۴ وکٹ لیے۔ مدراس میں ۱۰۸ رن دے کر انھوں نے ۱۲ وکٹ لیے۔ اس طرح اس جیت میں ان کا زبردست ہاتھ رہا۔ مہمان ٹیم کی طرف سے ڈانکنسن اور گریونی نے شاندار بیٹنگ کی اور ٹیٹرسل نے عمدہ باؤلنگ کا مظاہرہ کیا۔ دہلی کے پہلے ٹسٹ کی اپنی واحد اننگ میں راقم الحروف نے ۱۵۴ رن بنائے۔ اس میچ کے دوران میرا شانہ زخمی ہو گیا اور میں اس سلسلے کے بقیہ میچوں میں حصہ نہ لے سکا۔ اس سیریز کے اختتام پر میں نے فرسٹ کلاس کرکٹ سے ریٹائر ہونے کا اعلان کر دیا۔

ہم نے سنہ ۱۹۵۲ء میں وجے ہزارے کی قیادت میں اپنی ٹیم انگلینڈ بھیجی۔ یہ دورہ نہایت مایوس کن ثابت ہوا۔ ہم تین ٹسٹ ہار گئے اور چوتھے ٹسٹ میں بارش کی وجہ سے ہار جیت کا فیصلہ نہ ہو سکا۔ ہزارے اس بار پھر ہمارے اسٹار بلے باز تھے۔ لیکن ان کے اسٹینڈرڈ کے لحاظ سے ان کا یہ سیزن نہایت خراب رہا۔ تمام میچوں میں غلام احمد نے شاندار باؤلنگ کی اور ۸۰ وکٹ حاصل کیے۔ لارڈز کے دوسرے ٹسٹ میں منکڈ نے باؤلنگ اور بیٹنگ دونوں میں شاندار کھیل کا مظاہرہ کیا اور دونوں اننگز میں بالترتیب ۷۲ اور ۱۸۴ رن بنائے۔ پہلی اننگ میں انھوں نے ۱۹۶ رن دے کر ۵ وکٹ لیے۔ ان کے شاندار کھیل سے انگریز کرکٹ عہدہ داران اور تماشائی اتنا متاثر ہوئے کہ اس میچ کو "منکڈ کا میچ" قرار دے کر انھیں "عظیم منکڈ" کا نام دیا گیا۔

پھر سنہ ۱۹۵۲ء میں پاکستان ٹیم نے ہندستان کا پہلا سرکاری دورہ کیا۔ ہندستان نے دہلی کا ٹسٹ میچ جیتا۔ دوسرے ٹسٹ میں جو لکھنؤ میں ہوا ہندستان کو شکست ہوئی اور بمبئی کا تیسرا ٹسٹ جیت کر ہندستان نے ایک کے مقابلے میں ۲ سے سیریز جیت لی۔ اس ٹسٹ میچ کے بعد سے آج تک ہندستان اور پاکستان کے درمیان جتنے بھی ٹسٹ کھیلے گئے وہ سب برابر رہے۔ اور کسی میں ہار جیت کا فیصلہ نہ ہو سکا۔

بیٹنگ میں کسی نے شاندار کھیل کا مظاہرہ نہیں کیا لیکن فضل محمود نے ۲۵٫۵۱ کے اوسط پر ۲۰ وکٹ اور وینو منکڈ نے ۲۰٫۵۶ کے اوسط پر ۲۵ وکٹ لیے۔ اس دورے سے لوگوں میں خاص ہماہمی پیدا ہوئی کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ کھلاڑی جو ہندستان کی طرف سے پہلے کبھی ایک ساتھ کھیل چکے تھے اب دو ملکوں کی طرف سے ایک دوسرے کے خلاف کھیل رہے تھے۔ پاکستان کی قیادت عبدالحفیظ کاردار اور ہندستان کی لالہ امرناتھ نے کی۔

وجے ہزارے کی کپتانی میں ہماری ٹیم سنہ ۱۹۵۳ء میں ویسٹ انڈیز کے دورے پر گئی۔ ہم یہ سیریز صفر کے مقابلے میں ایک میچ سے ہار گئے۔ یہی نہیں زیادہ تر میچ میزبان ٹیم کی موافقت میں ختم ہوئے امریگر اور آپٹے نے شاندار بیٹنگ کی اور بالترتیب ۵۶ (اوسط ۶۲٫۲۲) اور ۴۶ (اوسط ۵۱٫۱۱) رن بنائے۔ سبھاش گپتے ہمارے کامیاب ترین گیند انداز تھے۔ انھوں نے ۲۹٫۴۲ کے اوسط پر ۲۷ وکٹ لیے اور ویکس ہمارے سب سے بڑے حریف ثابت ہوئے۔ انھوں نے ۱۰۲٫۲۸ کے اوسط پر ۷۱۶ رن بنائے۔ ویلنٹائن نے سب سے زیادہ وکٹ لیے یعنی ۲۹٫۵۰ رن فی وکٹ کے عوض ۲۸۔ ہماری بیٹنگ ٹھیک تھی لیکن کمزور گیند اندازی کی وجہ سے ہم نے بہت زیادہ رن دیے۔ ہماری فیلڈنگ بہرکیف بین اقوامی سیریز میں پہلی بار نہایت عمدہ تھی اور اس میں ہمارے ملک کا کافی نام ہوا۔

ہم نے ۵۴-۱۹۵۳ء میں سلور جوبلی اوورسیز کرکٹ ٹیم پر جو چند میچ کھیلنے کے لیے ہندستان آئی تھی فتح حاصل کی۔ یہ غیر سرکاری سیریز تھی جو ہم نے ایک کے مقابلے میں دو میچوں میں کامیابی حاصل کر کے جیت لی۔ دونوں میں سے کسی ٹیم کے کھلاڑی نے کوئی نمایاں کارنامہ انجام نہیں دیا سوائے سبھاش گپتے اور غلام احمد کے جنھوں نے بالترتیب ۲۵٫۳ کے اوسط پر ۲۷ وکٹ اور ۱۴٫۳۰ کے اوسط پر ۲۳ وکٹ لیے۔

اس کامیابی کے بعد سنہ ۱۹۵۴ء میں وینو منکڈ کی قیادت میں ہماری ٹیم پاکستان کے دورے پر گئی۔ یہ انتہائی غیر دلچسپ دورہ تھا۔ پانچوں ٹسٹ ہار جیت کا فیصلہ ہوئے بغیر ختم ہوئے کسی ٹیم نے بھی جیتنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ دونوں ٹیموں کی توجہ کسی طرح شکست سے بچنے پر تھی۔

نتیجے میں یہ دورہ انتہائی غیر دلچسپ رہا۔ کسی کھلاڑی نے اچھا کھیل نہیں دکھایا۔ بس گپتے نے ۶۶ء۲۲ کے اوسط پر ۲۱ اور پاکستان کے خان محمد نے ۵۶ء۱۵ کے اوسط پر ۲۲ کھلاڑی آؤٹ کیے۔

کچھ عرصے کی خاموشی کے بعد ۵۶-۱۹۵۵ء میں نیوزی لینڈ کی ٹیم ہندستان آئی۔ یہ ہمارے مقابلے کی ٹیم نہیں تھی اور ہم نے صفر کے مقابلے میں دو میچوں سے یہ سیریز جیت لی۔ سٹ کلف اور ریڈ نیوزی لینڈ کے کامیاب ترین بلے باز ثابت ہوئے۔ سٹ کلف نے ۲۰ء۸۰ کے اوسط پر ۶۱۱ رن اور ریڈ نے ۴۴ء۰۷ کے اوسط پر ۴۹۳ رن بنائے۔ ہندستان کی طرف سے منکڈ نے ۲ء۱۰۵ کے اوسط پر ۵۲۶ رن بنائے جبکہ سبھاش گپتے اس سیریز کے واحد قابل ذکر گیند انداز تھے۔ انھوں نے ۷۶ء۱۹ کے اوسط پر ۳۴ وکٹ لیے۔ وکٹ کے اعتبار سے ان تمام سیریز میں کا کھیل نہایت عمدہ رہا۔ یہی وجہ تھی جو ہمارے کچھ بلے بازوں نے شاندار بیٹنگ کا مظاہرہ کیا۔ مثال کے طور پر منکڈ پہلے ہندستانی کھلاڑی تھے جنھیں ایک ہی سیریز میں دو بار ڈبل سنچری بنانے کا فخر حاصل ہوا۔ مجھے یاد نہیں کہ کسی اور کھلاڑی نے بھی یہ کارنامہ انجام دیا ہے۔

انگلینڈ سے ۱۹۵۶ء میں واپس ہوتے ہوئے آسٹریلیا کی ٹیم ہمارے یہاں ٹھہری اور اس سے تین ٹسٹ میچ ہوئے۔ پہلا میچ آسٹریلیا کی ٹیم آسانی سے جیت گئی۔ دوسرا میچ ہار جیت کے فیصلے کے بغیر ختم ہوا۔ اور تیسرا میچ آسٹریلیا کی ٹیم صرف ۹۴ رنوں سے جیت پائی۔ آخری میچ میں ہمارے جیتنے کے امکانات تھے لیکن یہ موقعہ ہم نے کمزور بیٹنگ کی وجہ سے کھو دیا۔ درحقیقت دونوں اننگز میں ہماری بیٹنگ حد سے زیادہ خراب تھی۔ اس کے بعد ۵۷-۱۹۵۶ء میں ہماری ٹیم سیلون کے دورے پر گئی۔ ہم لوگوں نے صرف تین میچ کھیلے۔ آخری میچ آل سیلون کے خلاف تھا۔ یہ میچ ڈرا پر ختم ہوا اور کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہ دیا جا سکا۔

ایک سال کے وقفے کے بعد ۵۹-۱۹۵۸ء میں ویسٹ انڈیز کی نہایت ہی مضبوط ٹیم ہندستان آئی۔ اس نے تینوں ٹسٹ میچ جیتے اور غیر مفتوح رہی۔ گارفیلڈ سوبرس عظیم کھلاڑی تھے۔ انھوں نے ۵۵۰ رن بنائے اور ان کے رنوں کا اوسط ۹۲ء۸۳ رہا۔ ہماری طرف بورڈے صرف چار رن کی وجہ سے دونوں اننگ میں سنچری بنانے کی سعادت حاصل نہ کر سکے۔

گیند اندازوں میں اُدھر ہال اور گلکرسٹ نے بالترتیب ۳۰ اور ۲۶ کھلاڑی آؤٹ کیے۔ اِدھر اس بار پھر سبھاش گپتے ہمارے کامیاب ترین گیند انداز تھے جنھوں نے ۲۲ وکٹ لیے۔ اس سیریز میں ہمیں سوبرس کی لاثانی بیٹنگ کا اندازہ ہوا۔ دیگر بلے بازوں نے بھی عمدہ بیٹنگ کی لیکن کوئی سوبرس کا مقابلہ نہ کر سکا۔

اسی سال ۱۹۵۹ء میں ہمارا انگلینڈ کا دورہ انتہائی مایوس کن رہا۔ ڈی کے گائیکواڑ کو ہندستانی ٹیم کا کپتان چنا گیا۔ لیکن ان کے فارم کا یہ حال تھا کہ وہ فرسٹ الیون میں شریک ہونے کے بھی مستحق نہ تھے۔ پچھلے ۱۶ ٹسٹ میچوں میں ہم نے آٹھ کپتان آزمائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مختلف لوگوں کی قیادت میں ہندستانی ٹیم متحد نہ رہ سکی۔ ہمیں یہ اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ ہندستانی کرکٹ میں کپتان وہی شخص ہو جس کا انتخاب ٹیم کے لیے ناگزیر ہو اور جس میں کھلاڑیوں کو کنٹرول کی صلاحیت ہو۔

ہم پانچوں ٹسٹ میچ ہار گئے اور وہ بھی نہایت عبرتناک طریقے سے۔ کسی ہندستانی کھلاڑی نے کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہیں دیا سوائے عباس علی بیگ کے جنھوں نے اپنے پہلے ٹسٹ میچ میں ہی سنچری بنائی۔ عباس کے علاوہ امریگر نے بھی مانچسٹر کے ٹسٹ میں سنچری بنائی۔ انگلینڈ نے نہایت عمدہ بیٹنگ کی۔ ٹرومین کے لیے یہ نہایت شاندار سیزن تھا۔ ۱۶ء۷۰ کے اوسط پر ۲۴ وکٹ لیے۔ یہ ہماری بدقسمتی تھی کہ سیزن کے آغاز میں ہی ونے منجریکر کے گھٹنے میں چوٹ آ گئی جبکہ وہ شاندار بیٹنگ کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ انھوں نے ۷۵۵ رن بنائے اور ان کے رنوں کا اوسط ۶۸ء۶۳ تھا۔ امریگر دوسرے ہندستانی کھلاڑی ہیں جنھوں نے ایک انگلش سیزن میں ۱۰۰۰ رن بنائے لیکن چوتھے ٹسٹ کے بعد زخمی ہو جانے کے بعد وہ بہت کم میچوں میں حصہ لے سکے۔ پہلا کھلاڑی راقم الحروف ہے جسے یہ اعزاز حاصل ہو چکا تھا۔ گپتے نے نہایت عمدہ گیند اندازی کی اور ۱۰۰ وکٹوں میں صرف ۵ کی کمی رہ گئی۔ انھوں نے ۲۶ء۵۸ کے اوسط پر ۹۵ وکٹ لیے۔

اگلے سال یعنی ۶۰-۱۹۵۹ء میں آسٹریلیا کی ٹیم پھر ہندستان کے دورے پر آئی۔ یہ دورہ ذرا طویل تھا اور اس مرتبہ ہم نے پہلی دفعہ کانپور کے ٹسٹ میں انھیں شکست دی تاہم وہ ایک کے مقابلے میں دو

میچوں میں برابر جیت گئے۔ ہندستان کی یہ فتح دراصل جسو پٹیل کی شاندار گیند اندازی کی مرہون منت تھی۔ دو اننگ میں ۱۲۴ رن دے کر ۱۴ وکٹ لیے۔ ان کی شاندار گیند اندازی کا اندازہ اس طرح لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے پہلی اننگ میں ½ ۳۶ اوور پھینکے۔ ان میں سے ۱۱۶ اوور میں سے کوئی رن نہیں بن سکا، باقی اوور میں انھوں نے صرف ۶۹ رن دیے اور ۹ وکٹ لیے۔ بلے بازی میں اگرچہ کوئی قابل ذکر مظاہرہ نہیں ہوا لیکن آسٹریلیا کی ٹیم کے گیند انداز ڈیوڈسن اور بنو (Benaud) نے بالترتیب ۱۷ء۱۵ اور ۵۸ء۱۹ رن دے کر ۲۹ وکٹ حاصل کیے۔

پاکستان کی ٹیم ۶۱-۱۹۶۰ء میں آخری مرتبہ ہندستان کے دورے پر آئی۔ اس بار بھی پانچوں میچ ڈرا رہے۔ دونوں ٹیمیں شروع ہی سے جیتنے کے لیے نہیں بلکہ میچ کو ڈرا کرانے کے خیال سے کھیلتی رہیں۔ اس طرح ۱۹۵۲ء کے بمبئی ٹسٹ کے بعد سے ہندستان اور پاکستان کی ٹیموں کے درمیان کوئی بھی ٹسٹ میچ ایسا نہیں تھا جو ہار جیت کے فیصلے پر ختم ہوا ہو۔ ہمارے کرکٹ پر ایک بدنما دھبہ ہے کہ دو عمدہ کرکٹ ٹیمیں شکست کے خیال سے اس قدر خوف زدہ ہوں گویا ہمارا قومی وقار خطرے میں ہے۔ یہ امر افسوس ناک ہے کہ سیاسی اسباب کی بنا پر دونوں ملکوں کی ٹیمیں ایک دوسرے کے یہاں دورے نہیں کر سکیں۔ یہ دورے نہ صرف کھیلوں کے نقطۂ نظر سے بلکہ باہمی تعلقات کے اعتبار سے بھی دونوں ملکوں کے لیے بہت سودمند ثابت ہوتے۔ یہ بھی افسوس ناک امر ہے کہ ہندستان اور پاکستان کی طرح آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ نے بھی کھیل کے میدان میں ہم آہنگی کا ثبوت نہیں دیا اور گزشتہ کئی برسوں میں دونوں ملکوں کی ٹیموں نے صرف ایک سرکاری میچ کھیلا۔ حالانکہ قدرتی طور پر یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ اتنی قربت کی بنا پر ان دونوں کو اکثر و بیشتر میچ کھیلتے رہنا چاہیے تھا۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ پاکستان کے ساتھ کھیلتے ہوئے ۸۲ء۵۰ کے اوسط پر ۳۲۹ رن بنا کر سب سے شاندار کارنامہ حنیف محمد نے بورڈ کے سر انجام دیا جب کہ رما کانت ڈیسائی نے ۲۹ء۷۶ رن پر ۲۹ وکٹ لیے۔ توقع ہے کہ دونوں ملکوں کی ٹیمیں جلد ہی پھر دونوں ملک کا دورہ کریں گی۔

ایم۔ سی۔ سی کی ٹیم نے ۶۲-۱۹۶۱ء میں ہندستان کا پھر ایک دورہ کیا۔ یہ پہلا موقع تھا جب ہندستان کی ٹیم برطانیہ کے خلاف سیریز جیتنے میں کامیاب ہوئی تھی۔ اس وقت ہندستان نے دو میچ جیتے تھے۔ ڈکسٹر (انگلینڈ کے کپتان) نے کرکٹ کے شائقین کو اپنی ٹیم کے حوصلہ مند کھیل سے بہت محظوظ کیا۔ بیرنگٹن نے ۵۹۴ رن بنائے اور ان کا اوسط ۹۹ رن تھا۔ ہماری طرف سے منجریکر نے ۵۸۶ رن بنائے اور ان کا اوسط ۸۳ رن تھا۔ گیند اندازوں میں ایلن اور لاک نے بالترتیب ۲۱ اور ۲۲ وکٹ لیے اور ہر وکٹ پر انھوں نے ۲۷ء۶ اور ۲۸ء۵۴ رن دیے جب کہ درانی نے ۲۳ وکٹ لیے اور فی وکٹ ۲۷ء۴۳ رن دیے۔ ہر ٹسٹ میچ میں تماشائیوں کا بے انتہا ہجوم ہوتا تھا۔ وہی دلچسپی لوگوں میں ابھی تک باقی ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ ٹیلیویژن کے آنے سے عوام میں کیا تبدیلی ہوتی ہے۔

ہم نے ۱۹۶۲ء میں ویسٹ انڈیز میں پورے پانچ ٹسٹ میچ ہار کر ایک انتہائی ناکام دورہ کیا۔ وارل، کنہائی اور سوبرس نے شاندار بیٹنگ اور ہال، گبس اور سوبرس نے بہت موثر گیند اندازی کی۔ کسی بھی موقع پر ہماری ٹیم جیتنے کی پوزیشن میں نہیں ہوئی۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہماری ٹیم کے بیرونی ممالک کے دونوں دوروں میں ہماری ٹیم کو دس بار شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

ایم سی سی کی ایک اور ٹیم ۶۳-۱۹۶۲ء میں ہندستان آئی۔ اس کے کپتان مائک اسمتھ تھے۔ ہندستانی کرکٹ کی تاریخ میں یہ سیریز بے حد اکتا دینے والی اور بے لطف رہی۔ دونوں ٹیموں نے جیتنے کی کوئی کوشش نہیں کی اور مائک اسمتھ ناکام کپتان ثابت ہوئے۔ اس دورے میں مہمان ٹیم کھلاڑیوں کے زخمی اور علیل ہونے کے باعث کمزور ہو گئی تھی۔ اس لیے کولن کاؤڈری کو جو ٹیم کے ساتھ نہیں آئے تھے برطانیہ سے بلایا گیا۔ کاؤڈری نے ان ٹسٹ میچوں میں دو بار سنچری بنائی اور ۱۰۳ کے اوسط سے ۳۰۹ رن بنائے۔ ٹٹمس نے بہت عمدہ گیند اندازی کی اور ۲۷ء۱۷ رن کے اوسط سے ۲۷ وکٹ لیے۔

ہماری ٹیم میں بدھی کندرن نے بے حد عمدہ کھیل کا مظاہرہ کیا۔ کندرن کی شاندار کامیابی اس بات کی ایک مثال ہے کہ کرکٹ میں قسمت کیا کردار ادا کرتی ہے۔ فاروق انجینیر کی انگلی زخمی ہو جانے پر وہ کھیل نہیں سکتے تھے، اس لیے کندرن کو بالکل آخری وقت پر ٹیم میں

شامل کیا گیا۔ مدراس میں پہلے ٹسٹ ہی میں کندرن نے ۱۹۲ رن سلے پھر تو انھیں تمام پانچ ٹسٹ میچوں میں انھیں کھیلنے کا موقع ملا جبکہ فاروق انجینیر کسی میں بھی کھیل نہ سکے۔

اس وقت ہندستانی کرکٹ کا معیار بے حد گر گیا تھا۔ میچ ہارنے یا برابر کرنے کے علاوہ کوئی اور صورت ہی نہ تھی جیت تو دور کی بات تھی اور جیتنے کا امکان بہت کم تھا۔

آسٹریلیا کی ٹیم ۱۹۶۴ء میں وطن واپس جاتے ہوئے ہندستان آئی اور تین ٹسٹ میچ کھیلے گئے۔ ان میچوں میں پہلا میچ آسٹریلیا نے جیت لیا اور دوسرا میچ ہار گئی۔ تیسرا میچ برابر رہا۔ اس طرح پہلی بار آسٹریلیا اور ہندستان کے درمیان سیریز برابری پر ختم ہوئی۔

بمبئی میں دوسرا ٹسٹ میچ چندو بورڈے کی دلیرانہ بیٹنگ کی وجہ سے جیتا گیا۔ کسی بھی بلے باز نے امتیاز حاصل نہیں کیا تاڈکرنی نے اوسطاً ۲۰ء۷۲ رن دے کر ۱۰ وکٹ لیے جو سب زیادہ تھے۔

سیلون کی ٹیم ۶۵-۱۹۶۴ء میں ہندستان کے دورہ پر آئی۔ اس نے دو غیر سرکاری ٹسٹ میچ ہارے اور احمد آباد میں کھیلا گیا آخری ٹسٹ میچ جیت لیا۔ سیلون کے باہمت کپتان نے پہلی اننگز ہندستان سے ۸۴ رن کم ہونے کے باوجود ڈکلیر کر دیا اور ہندستانی ٹیم کو دوسری اننگز میں صرف ۶۶ رن پر آؤٹ کر کے ۶ وکٹ سے نمایاں کامیابی حاصل کی۔ سیلون کی ٹیم کی ہندستان پر یہی ایک جیت ہے۔ سیلون میں غیر معمولی کرکٹ کھلاڑی پیدا ہوئے ہیں مگر وہاں کبھی بھی ایک عمدہ کرکٹ ٹیم نہیں بن سکی ہے۔

نیوزی لینڈ نے ۱۹۶۵ء میں ہندستان کا دورہ کیا۔ ہم نے ایک ہی ٹسٹ میچ جیتا اور بقیہ تین میچ برابری پر ختم ہوئے۔ وینکٹ راگھون نے بہترین گیند اندازی کی اور اوسطاً ۱۹ رن دے کر ۱۲ وکٹ لیے اور دلیپ سر دیسائی نے بمبئی میں اس وقت ڈبل سنچری بنائی جبکہ ہندستانی ٹیم کی حالت نازک تھی اور انھوں نے ہندستان کو یقینی ہار سے بچا لیا۔

ویسٹ انڈیز کی ٹیم ۶۷-۱۹۶۶ء میں دوبارہ ہندستان آئی اور ایک کے مقابلے میں دو میچ سے سیریز جیت گئی۔ پہلا ٹسٹ میچ بمبئی میں اور دوسرا کلکتہ میں جیتا تیسرا میچ برابر رہا۔ سوبرس بہترین بلے باز ثابت ہوئے۔ اس سیریز میں فاروق انجینیر نے مدراس میں لنچ سے پہلے ہی ۹۴ رن بنا لیے تھے۔ اگر دلیپ سر دیسائی نے انجینیر کو اور موقع دیا ہوتا تو مجھے یقین ہے وہ آسٹریلیا کے تین ممتاز کھلاڑی وکٹر ٹرمپر، چارلی میک آرتھی اور ڈان بریڈمین کی صف میں شامل ہو جاتے جنھوں نے ٹسٹ میچ کے پہلے دن لنچ سے پہلے سنچری بنائی ہے۔ سر دیسائی کے لیے رن کوئی چیز نہیں تھے۔ مگر فاروق انجینیر اگر ۶ رن اور بنا لیتے تو انھیں لافانی شہرت مل گئی ہوتی۔ چندر شیکھر اور گبس نے عمدہ گیند اندازی کی اور دونوں نے ۱۸ وکٹ حاصل کیے۔

اسی سال یعنی ۱۹۶۷ء میں ہم انگلینڈ کے دورے پر گئے۔ وہاں ہم تینوں ٹسٹ میچ ہار گئے۔ انگلینڈ کے دوروں پر کبھی بھی ہماری ٹیم بدلے ہوئے حالات سے ہم آہنگ ہونے میں کامیاب نہیں ہوئی صرف انفرادی طور پر کھلاڑیوں نے اچھی کارکردگی دکھائی مگر مجموعی طور پر نہیں ہندستانی ٹیم کی طرف سے صرف پٹودی نے سنچری بنائی اور چندر شیکھر نے تین ٹسٹ میچوں میں ۱۶ وکٹ حاصل کیے۔ برطانوی بلے بازوں نے ہماری اوسط درجے کی گیند اندازی کے مقابلے میں اچھے اسکور کیے۔

اگلے سال ۶۸-۱۹۶۷ء میں ہماری ٹیم پھر آسٹریلیا گئی اور چاروں ٹسٹ میچ ہار گئی۔ دوسرا ٹسٹ میچ جیتنے کا ایک شاندار موقع ہم نے غیر ذمہ دارانہ بلے بازی کی وجہ سے کھو دیا۔ اس میچ میں ہماری ٹیم کو جیتنے کے لیے صرف ۸۵ رن درکار تھے جبکہ ہمارا اسکور ۵ وکٹ پر ۳۱۰ رن تھا اور ابھی ۶ کھلاڑی باقی تھے۔ مگر ہم نے بقیہ چھے وکٹ کھو کر میچ بھی کھو دیا۔ جے سمہا نے، جو دوسرے کرکٹ کھلاڑیوں کے زخمی ہو جانے پر آسٹریلیا پہنچے تھے، اس میچ میں شاندار بیٹنگ کی اور دونوں اننگز میں ۷۴ اور ۱۰۱ رن بنائے پٹودی نے بھی بے حد عمدگی سے بیٹنگ کی اور رو سی سرتی نے آل راؤنڈ کھیل کا اچھا مظاہرہ کیا۔ مگر امتیازی کھلاڑی پرسنا تھے جنھوں نے اوسطاً ۴۴ء۲۷ رن دے کر ۲۵ وکٹ لیے۔

آسٹریلیا سے ہماری ٹیم نیوزی لینڈ پہنچی جہاں ہم نے ۳۵ برسوں میں پہلی بار دوسرے ملک میں ٹسٹ میچ جیتا۔ نیوزی لینڈ کو ہم نے ایک کے مقابلے میں تین میچ سے ہرایا۔ حالانکہ نیوزی لینڈ کی ٹیم بین اقوامی کرکٹ

میں سے کچھ بیچ تھی مگر ہماری کامیابیاں ہمارے لیے بے حد تسلی بخش تھیں
پھر ایک بار بیدی ہمارے غیر معمولی کھلاڑی ثابت ہوئے۔ انھوں نے اوسطاً ۱۸،۱۷ رن دے کر ۴۲ وکٹ لیے۔ اس طرح بیدی نے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے دورے میں ۹۴ وکٹ حاصل کیے۔ یقیناً یہ ایک امتیازی کھیل کا مظاہرہ تھا۔

پھر نیوزی لینڈ کی ٹیم ہندستان آئی۔ ہماری ٹیم بمبئی میں پہلا ٹسٹ جیت گئی اور احمد آباد میں دوسرا ٹسٹ ہار گئی اور حیدرآباد میں بہ مشکل تیسرا ٹسٹ برابر کر سکی۔ بارش نے ہمیں ممکنہ شکست سے بچالیا۔

تین مہینے بعد آسٹریلیا کی ایک ٹیم ہندستان آئی جس کے خلاف ہمارا کھیل اچھا رہا۔ تین کے مقابلے میں ایک جیت دونوں ٹیموں کے صلاحیت کا صحیح پتہ نہیں دیتی۔ ہماری ٹیم نے دلی کے ٹسٹ میچ میں نمایاں طور پر کامیابی حاصل کی۔ مدراس کے ٹسٹ میچ میں ہم ہی کو جیتنا چاہیے تھا جب کہ آسٹریلیا کی ٹیم دوسری اننگز میں ۶ وکٹ پر صرف ۲۴ رن بنا سکی تھی۔ مگر ہم نے کھیل پر اپنی گرفت کو کھو دیا اور آخر کار بری طرح میچ ہار گئے۔ اس سیریز کے دوران بیدی نے ایک بار پھر عمدہ گیندبازی کی اور اوسطاً ۸۵،۴۸ رن دے کر ۲۶ وکٹ لیے۔ آسٹریلیا کے آف اسپن گیند انداز میلٹ ایک قدم آگے تھے۔ انھوں نے اوسطاً ۱۰،۱۹ رن دے کر ۲۸ وکٹ حاصل کیے۔ وشواناتھ نے اپنے پہلے ٹسٹ میچ میں ایک سنچری بنا کر اپنی غیر معمولی صلاحیت کی نشان دہی کی۔

اس کے بعد ۱۹۷۱ء میں ہماری ٹیم نے ویسٹ انڈیز اور انگلینڈ کا دورہ کیا۔ پٹودی کی آٹھ سالہ کپتانی کے بعد اجیت واڈیکر کو کپتان بنایا گیا۔ واڈیکر نے ہندستانی ٹیم کی قسمت ہی بدل ڈالی اور ویسٹ انڈیز اور انگلینڈ میں "ربر" جیت گئے۔ یہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے واڈیکر نے اپنی ٹیم کے کھلاڑیوں کو بہترین کھیل کا مظاہرہ کرنے کے لیے اکسایا اور ہندستانی کرکٹ کی تاریخ میں پہلی بار ہماری ٹیم نے ایک اول درجے کی اور منظم ٹیم بن کر اچھے کھیل کا مظاہرہ کیا۔ کئی بار انھیں رکاوٹوں سے دوچار ہونا پڑا مگر ہمیشہ ان آزمائشوں سے وہ سرخرو ہو کر نکلے اور اپنی لیڈر کی کوششوں سے ویسٹ انڈیز میں بھی "ربر" جیت لیا۔

سنیل گاوسکر نے غیر معمولی عمدہ کھیل کا مظاہرہ کیا اور ۱۵۴۸ رن کے اوسط سے ۷۷،۴ رن بنا کر ہندستانی بلے بازوں کے پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیے۔ ادھر دلیپ سردیسائی نے اپنی حوصلہ مند بلے بازی سے ہندستانی بلے بازی کا احیا کیا۔ انھوں نے ۸۵،۲۵ رن کے اوسط سے ۶۴۲ رن بنائے۔ وینکٹ راگھون نے اگرچہ ۲۲ وکٹ لیے تھے مگر انھیں گاوسکر اور سردیسائی کے شاندار کھیل کے باعث کچھ اہمیت نہیں مل پائی۔ ہماری ٹیم کی فیلڈنگ بھی بہترین رہی۔

ویسٹ انڈیز میں اپنی کارکردگی کو ہم نے انگلینڈ میں دہرایا جہاں ہم نے پہلی بار ایک ٹسٹ میچ اور "ربر" جیتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہم خوش قسمت تھے مگر مجھے اس بات سے اتفاق نہیں ہے۔ ایسی سیریز میں جب میں بارش نے مداخلت نہیں کی تھی، ہماری ٹیم بہتر ٹیم ثابت ہوئی اور ہماری جو جیت ہوئی اس کے ہم مستحق تھے۔ امپائر کے کچھ اہم فیصلے ہمارے خلاف تھے مگر ہمارے کھلاڑیوں نے ناامید ہونے کی بجائے حوصلہ مندی سے کھیلا۔

یہ سال بھارتی کرکٹ کے لیے نمایاں کامیابی کا سال بن کر آیا اسی طرح ۱۹۷۱ء کو ہندستانی کرکٹ کھلاڑیوں کو دو مسلسل دوروں میں ان کی شاندار کارکردگی کے لیے ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

انتخاب کرنے والوں کی یہ پالیسی کہ نوعمر کرکٹ کھلاڑیوں کو موقع دیا جائے نہ صرف کامیاب رہی ہے اور میری پرخلوص امید ہے کہ اسی پالیسی پر آئندہ بھی عمل کیا جائے گا۔ ہم کو چاہیے کہ ہم تجربہ کار کھلاڑیوں کی بجائے نوجوانوں پر اعتماد کریں۔ مجھے اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر ہم اپنے نوجوان کھلاڑیوں کے ساتھ صبر و تحمل کے ساتھ کام لیں تو اس کے شاندار نتائج نکل سکتے ہیں۔

ہم ۱۹۷۱ء میں جس طرح کامیاب رہے ہیں اس کو انگلینڈ کے خلاف نہ صرف اس ملک آئندہ برسوں میں بھی دہرایا جا سکتا ہے۔ ہمارے کرکٹ کھلاڑی صرف یہ چاہتے ہیں کہ انھیں مسلسل ہمت افزائی اور مدد دی جائے، نئے باصلاحیت کھلاڑیوں کو موقع ملے اور تجربہ کار کہنہ مشق کھلاڑی خوش اسلوبی سے ریٹائر ہو کر نئے اور نوجوان کھلاڑیوں کو جگہ دیں۔ ہم کو چاہیے کہ نوجوانوں پر بھروسہ کریں اور مجھے یقین ہے کہ نوجوان ہمیں مایوس نہیں کریں گے



(مزاحیہ)

نہ بن سکے ادیب

ایم۔ اے حسّان

ایڈیٹر کے آداب اور معذرت کے ساتھ یہ وہ ناقابلِ مطالعہ الفاظ ہیں جو ہمارے ناقابلِ مطالعہ مضامین کے سلسلے میں ملک بھر کے تمام رسائل و جرائد اور اخبارات کے ایڈیٹروں کی جانب سے صبح، دوپہر یا شام کی ڈاک سے موصول ہوتے رہے ہیں اور اس بات کا کامل یقین ہے کہ ہمیں اس قسم کی تحریریں اس وقت تک موصول ہوتی رہیں گی جب تک ہمارے اس تین روپے پچاس پیسے والے قلم میں جان باقی رہے گی یا جب تک ہمارا سر تسلیم نہ ہو جائے گا یا پھر ہمارے دل اور دماغ کو تنِ عزیز سے جدا نہیں کر دیا جائے گا جو اس قسم کی ناقابلِ قبول نگارشات کو صفحۂ قرطاس سے چھ پیسے ناؤ کے صفحہ پر لانے کے ذمہ دار ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت ہم کو اس جائز حق سے محروم نہیں رکھ سکتی کیونکہ بقول بعض ؎

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے

ذرا آپ ہی انصاف کیجئے اور صدقِ دل سے کہیے کہ یہ کہاں کی شرافت ہے کہ یہ حضرات ہماری تخلیقات، رسائی سے قبل ہی، ایک زرِ کثیر خرچ کر کے چھپوا کر تیار رکھی گئی اظہارِ معذرت کی پرچیاں منسلک کر کے لوٹاتے چلے جائیں، اس احساس سے قطعی بے نیاز کہ کس عرق ریزی اور دماغ پاشی کے بعد یہ چند سطریں معرضِ وجود میں آتی ہیں۔ اور اس وقت تو صورتِ حال انتہائی سنگین ہو جاتی ہے جب ایک ایسے ادیب کی تخلیقات کو مسترد کر دیا جائے جو نہ صرف ادب سے "ایم اے" ہے بلکہ جس نے کافی سوچ سمجھ کر اور دیکھ بھال کر یہ قدم کیا ہے، جسے نہ صرف زبان پر عبور حاصل ہے بلکہ وہ اپنے اجداد کے سارے ادبی سرمایہ پر جابرانہ قبضہ بھی کر چکا ہے جس نے وسیع مطالعے اور عمیق مشاہدہ کی شرط پوری کرنے کیلئے نہ صرف اپنے پیشروؤں اور ہمعصروں کے دیوانوں کو کھنگال ڈالا ہے بلکہ دوسرے بے شمار ادیبوں کے لاتعداد ناولوں اور کتابوں کے تحت ناخیر" کے دیدار کا شرف حاصل کر چکا ہے جسے نہ صرف مغربی ادب سے آگہی حاصل ہے بلکہ وہ مشرقی، مغربی شمالی، جنوبی ادب سے فراغت پا کے اور شہر کے سارے کتب خانوں میں اپنے نقشِ قدم چھوڑنے کے بعد ادبی دنیا میں قدم رکھا ہے ـــ وہ بھی نئے سائنسی آلات کے مطابق کافی ناپ تول کر اور پھونک پھونک کر۔

اس طرح صرف نظم اور نثر کے انتخاب میں ہم نے عمرِ عزیز کے کئی قیمتی سال گنوا ڈالے پھر بھی اردو ادب کے مقناطیس کے پولس کی طرح یکساں کشش رکھنے والے اصناف میں سے کسی ایک کا انتخاب نہ کر سکے اور کرتے بھی کیسے؟ نثر کا انتخاب کرتے تو نظم کی ہمہ گیر مقبولیت، نغمگی اور دلکشی دامنِ دل کو جھنجوڑے نہیں چھوڑتی تھی نثر کو بھلا کر نظم کا انتخاب کرتے تو نثر کی اہمیت اور انفرادیت راستہ روکے کھڑی ہو جاتی تھی اس کے علاوہ عظیم "ناولسٹ" سے بے محروم رہ جاتے، اور ساتھ ہی فصاحت اور بلاغت کے دریا بہانے کی تمنا تشنہ رہ جاتی۔

جب ہماری عقل و فہم کسی ایک نتیجے پر پہنچنے میں سخت ناکام رہی تب ہم نے قرعہ اندازی کے ذریعہ (جو آج کا دھرم اور ایمان ہے) اس سرکش مسئلے پر قابو پانے کا فیصلہ کیا اور نظم و نثر وغیرہ کی چٹھیاں لکھ کر ایک معصوم کے ہاتھوں قرعہ نکلوایا۔ نثر کے حق میں فیصلہ ہوا اور نثر نگاری ہمارا مقدر بن گئی چنانچہ "قدرت" کے فیصلے کے عین مطابق ہم نے نثر نگاری کے ذریعہ اپنی ادبی زندگی کا باضابطہ آغاز کر دیا۔ اور ایک بار پھر اپنی انصاف پسندی اور رواداری کا ثبوت دیتے ہوئے ہم نے باعتبار حروفِ تہجی اندرونِ ملک کے تمام رسائل و جرائد کو کافی اہتمام کے ساتھ اپنی تخلیقات کو بغرضِ اشاعت روانہ کرنا شروع کر دیا اور اکثر

نے ان کو ناقابلِ اشاعت قرار دیکر واپس بھیجنا شروع کر دیا۔

پہلی ناکامی یعنی حروفِ تہجی کے اعتبار سے پہلے رسالہ کی جانب سے مسترد شدہ مضمون کی واپسی سے قطعی دل برداشتہ نہ ہوتے ہوئے اور اس ناکامی کو ایڈیٹر صاحب کی عدم توجہی اور تسامح قرار دیکر ایک اور رسالہ کو ہم نے ایسا دوسرا شہ پارہ بھیجا جو بہت جلد صحیح و سلامت واپس آگیا۔

ہم چونکہ ادبی دنیا میں نووارد تھے جان پہچان کسی سے نہ تھی' اس لیے یہ سوچ کر کہ ہماری علمی و ادبی صلاحیت اور بے پناہ قابلیت ان پر آشکار نہیں ہوئی ہے۔ اس حوصلہ شکن تحریر کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے ہم نے اپنی تیسری تخلیق ایک دوسرے درجہ کے میگزین کو روانہ کی' یہ "بیرنگ" خط کی طرح پھر ہم تک واپس آگئی۔ وہی ایڈیٹر کے آداب اور معذرت کی سلپ کے ساتھ۔ لیکن پھر بھی ہم نے ہمت نہ ہاری اور اپنی کوششیں پورے زور و شور سے جاری رکھیں یعنی ایسے رشحاتِ قلم کو کسی نہ کسی کے سپرد کرتے چلے گئے' جسکو وہ پھر ہمارے سپرد کر کے اپنی دے داریوں سے عہدہ برآ ہوتے رہے۔

پہلے پہل تو ہماری تخلیقات کی روانگی اور آمد کا ذتعہ مہینے دو مہینے کا ہوا کرتا تھا۔ اور ایک مضموں کی واپسی تک دوسری تخلیق پرواز کے لیے پر تولتی رہتی تھی۔ لیکن اس کے بعد تو یہ وقفہ تیزی سے گھٹنے لگا۔ دو مہینے کی جگہ ایک مہینے نے لی' ایک مہینہ پندرہ روز میں اور پندرہ روز ہفتہ عشرہ میں بدل گئے اور اب تو اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے والا معاملہ ہو گیا ہے۔ اُدھر بھیجا کہ ادھر واپس آگیا۔ اس کے بعد تو صورتِ حال اتنی بگڑ گئی کہ ایڈیٹر صاحبان اور ان کے ماتحتین کو ہمارا پتہ اس قدر یاد ہو گیا ہے کہ دوسروں کے مسترد شدہ تخلیقات اور غیر معیاری مضامین بھی دھڑا دھڑ ہمارے ہی پتہ پر بھیجے جانے لگے ہیں

اس نئی مصیبت سے سخت ہراساں اور بدحواس ہو کر جب ہم نے چند ادب نواز دوستوں سے راہ و رسم بڑھائی تو یہ حقیقت آشکار ہوئی کہ مضمون لکھنے سے قطع نظر مضمون بھیجنے کے بھی چند مخصوص آداب اور خاص طریقے ہیں اور ان اصولوں سے انحراف اور عدم واقفیت ہی ایسے دل شکن واقعات حالات کو جنم دیتی ہے۔ چنانچہ یہ انکشاف ہماری رہبری کا وسیلہ بنا کہ آئندہ سے ہم مضمون تحریر کرنے کے لیے بالکل سفید لیکن ذرا چکنے کاغذ کا انتخاب کریں۔ مناسب حاشیہ چھوڑ کر حاشیہ آرائی کریں اور ممکنہ حد تک خوشخط لکھنے کی کانتا

کوشش کریں وغیرہ وغیرہ۔ ہم نے اگلی بار ان ہدایات پر ہو بہو عمل کیا۔ لیکن نتیجہ صفر رہا اور پچھلے واقعات کی یاد تازہ کر گیا۔

ایک دوسرے قلمکار جو ایک غزل اور ایک نظم کے خالق تھے انہوں نے فرمایا کہ یوں سیدھے سادے مضامین بھیجنے سے کام نہ چلے گا ان ایڈیٹر حضرات کو مرعوب کرنا انتہائی ضروری ہوتا ہے انھوں نے جلد از جلد "نیم پیڈ" (NAME PAD) کے استعمال کا مشورہ دیا اور اسے ہم نے اپنے مضامین کے ساتھ "نیم پیڈ" پر خطوط تحریر کرنے کا لامتناہی سلسلہ شروع کیا۔ لیکن سارے "نیم پیڈ" جو کبھی ہماری میز کی زینت تھے ایک ایک کر کے ایڈیٹر حضرات کی نذر ہو گئے پھر بھی کسی کی نظرِ عنایت نہ ہوئی۔

ایک کرم فرمانے ڈگری رکھتے ہوئے اسے نام کے ساتھ شامل نہ کرنے کو ہماری نادانی اور ناتجربہ کاری پر محمول کیا اور کہا کہ یہ ان ایڈیٹر صاحبان کو زیر کرنے کا انتہائی موثر حربہ ہے۔ وہ ڈگری کے استعمال سے مرعوب ہوتے ہیں کیونکہ خود ان کے پاس کوئی ڈگری وگری نہیں ہوتی اور تخلیقات کی اشاعت یقینی ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس عظیم غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے ہم نے بھی اسے نام کے آگے نہ صرف لفظ "ایم اے" کا اضافہ کر دیا بلکہ اوّل سے ایم اے تک درجہ بدرجہ اچھی طرح سجھا دیا۔ لیکن یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا کہ انھوں نے بھی ہمارے نام کے آگے لفظ "ایم اے" کا اضافہ کر کے ہمارے مضمون کو بیرنگ ڈاک کر دیا تھا پھر بھلا اب ٹکٹ لگا اور پورا پتہ لکھا لفافہ ہم تک کیسے پہنچا!

اسی اثنا میں ہمارے ایک مخلص کی زبانی معلوم ہوا کہ اگر ہم کسی رسالہ کے خریدار بن جائیں اور مضامین کے ساتھ خریداری نمبر کا حوالہ دیں تو پھر ہمارا مضمون فہرستِ اشاعت میں سب سے پہلے نمبر پر ہوگا۔ اس سربستہ راز کے انکشاف پر ہم نے ان کا دلی شکریہ ادا کرتے ہوئے ان پرچوں کی خریداری نہ صرف سال دو سال کے لیے بلکہ بیس حیات قبول کرلی یہی نہیں کسی نہ کسی طرح منت سماجت کر کے سارے محلے والوں کے نام رسالے جاری کروا دیے لیکن یہ ایڈیٹر صاحبان تو بڑے ہی "نمبری" نکلے۔ انھوں نے اتنے قلیل عرصے میں ڈھیر سارے خریدار فراہم کرنے پر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے ہمارا شکریہ ادا کیا اور اس حد تک یہ جوشِ خیر مقدم کرتے ہوئے ہمارے نام دو سال کے لیے رسالہ مفت جاری کر دیا۔ لیکن مضمون نہیں چھاپا۔

ایک ہمدرد نے جب ہماری حالت زار نہ دیکھی گئی تو انھوں نے ایک

انتہائی اہم اور آزمودہ نسخہ بتلایا اور کہا کہ اگر آپ ناکامی کا منہ نہ دیکھنا چاہتے ہوں تو فوراً کسی خاتون کے نام سے لکھنا شروع کیجیے کیونکہ صنفِ نازک مرد کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ جو اسے نہ صرف زیر کر سکتی ہے بلکہ زیر و زبر کر سکتی ہے'

ہمارے مخلص خود بھی یہی کرتے ہیں اور آج کی کامیاب "ادیبہ" ہیں چنانچہ ہم نے بھی ان کے ایک ایک حرف پر ایمان لاتے ہوئے بلا سوچے سمجھے نسوانی نام سے لکھنا شروع کر دیا اور جب تیر نشانے پر لگ گیا تو ان حضرت کی صلاحیتوں کا قائل ہو جانا پڑا۔ چنانچہ پچھلی مرتبہ جہاں سے ہم کو نفی میں جواب موصول ہوا تھا اب کی بار انھوں نے اپنے دستِ مبارک کو زحمت دی تھی۔ مضمون کی پسندیدگی اور کسی قریبی اشاعت کی زینت بن جانے سے مطلع کیا تھا۔ یہ خبر پا کر ہم خوشی سے پھولے نہیں سمائے تھے کہ دوسری ڈاک نے تمام خوشیوں اور امیدوں پر پانی پھیر دیا ——— واقعہ یہ تھا کہ ایڈیٹر صاحب نے ہم ادیبہ سے ایک تازہ ترین تصویر بھیجنے کی فرمائش کر دی تھی۔ ان مخلص صاحب نے مشورہ تو بہت اچھا دیا تھا لیکن یہ نہیں بتلایا تھا کہ وہ مضمون کے ساتھ تصویر بھی شائع کرانا پسند فرمائیں تو ایسے میں ہمارا کیا رویہ ہونا چاہیے۔ یوں تو ہم بڑی آسانی سے کسی مرحوم خاتون کی نوجوانی کی تصویر خدمتِ عالیہ میں روانہ کر سکتے تھے لیکن نامہ خلوص کے والہانہ پن اور اندازِ تخاطب سے یہ شبہ گزرتا تھا کہ کہیں دل نہ دے بیٹھے ہوں۔ لہٰذا ہم نے ان کے لیے سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے والا جواب تحریر کیا۔ لکھ دیا کہ ہم پردہ نشیں خاتون ہیں اس لیے تصویر بھیجنے سے قاصر ہیں۔ اس کے علاوہ ہمارے شوہر شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ ان کی واپسی اور رضامندی پر ہی تصویر بھیجنے یا نہ بھیجنے کا انحصار ہے۔ ان کی واپسی دو ایک مہینے میں ہوگی اس لیے مضمون بغیر تصویر ہی کے شائع کر دیا جائے تو بے حد مناسب ہے۔ یہ لکھ کر ہم نے ان کے جواب کا لاکھ لاکھ انتظار کیا، جوابی خط لکھے، ٹیلیگرام کیا ——— یہاں تک کہ ٹرنک کال پر ربط پیدا کرنا چاہا لیکن آج تک ہمارے مضمون اور ایڈیٹر صاحب دونوں کی اطلاع نہ مل سکی۔ مسلسل خاموشی سے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ کچھ کر نہ بیٹھے ہوں ——— !

ان تمام بے ادبیوں کے مرتکب ہونے کے بعد اپنے آپ کو سزا یا اور مجھ گناہ پا کر ہم نے ایک اور گناہ کرنے کا قصد کر لیا اور وہ طریقہ آزمایا جو کبھی ہم نے کبھی کی زبانی سن رکھا تھا یا کسی مضمون ہی میں پڑھا تھا۔ وہ یہ کہ کسی خاص علاقے کے جغرافیائی حدود میں رہنے والے لوگوں میں ایک خاص قسم کا انس یا لگاؤ ہوتا ہے۔ وہ مشکل میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے دکھ درد کو "ففٹی ففٹی" بانٹ لیتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ اس نازک موقع پر ہم کو بھی جغرافیہ کے امتحان کی سوجھی۔ آئندہ سے ہم نے جس مقام سے نکلنے والے رسالہ کو اپنا مضمون ارسال کیا اس مقام کا نام اپنے نام میں شامل کر لیا۔ یعنی دہلی کو بھیجے جانے والے مضمون کے ساتھ ہم نے "دہلوی" لکھا۔ لکھنؤ کو بھیجے جانے والے مضمون کے ساتھ "لکھنوی" ہو گئے۔ حیدرآباد سے نکلنے والے رسالہ کو "حیدرآبادی" ہونا بتلایا اور مدراس سے نکلنے والے رسالہ کو "مدراسی"۔ لیکن جب اس کوشش میں ہندستان کے سارے شہر، اضلاع اور دیہات کام آ گئے اور ہمارے نام کے آگے بڑھانے کی کوئی گلی کوچہ نہ بچا تو بڑی خفت اٹھانا پڑی۔

آج کل ہم اپنے مضامین شائع نہ ہونے پر سخت بدحواس اور پریشان ہیں ہماری گھر والی اور گھر والے بھی ہمارے اس مضامین کے لکھنے لکھانے سے اتنے ہی فکرمند ہیں انھوں نے یہ جواز پیش کر کے اس شوق سے باز رہنے کا مشورہ دیا ہے کہ یہ بڑے لوگوں کا کام ہے اور صرف بڑے نام والوں اور مشہور لوگوں کے ہی مضامین شائع کیے جاتے ہیں اس لیے دوبارہ چھپنے چھپانے اور ادیب کہلانے کی کوشش ہمارے لیے خودکشی کے مترادف ہوگی جو ایک سنگین جرم بھی ہے۔ لیکن ہم اپنے فیصلہ پر اٹل اور بضد ہیں کہ اگر صرف مشہور لوگوں کے مضامین شائع ہوا کریں گے تو آخر ہم کب اور کیسے مشہور ہوں گے؟

ان حالات کے پیشِ نظر ہم نے اب بڑے ناموں ہی سے لکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے اور کسی عظیم شخصیت یا مشہور ہستی کے نام سے لکھنے والے ہیں۔ چنانچہ جب کبھی آپ کی نظر سے کسی مشہور ادیب یا نامور شخصیت کی تخلیق گذرے تو سمجھ لیجیے کہ یہ ہمارے ہی زورِ قلم اور زورِ بیاں کا نتیجہ ہے ——— !



ہمارا وطن

٭ وصف الرحمٰن واصف

تصدق جان و دل جس پر یہ وہ پاکیزہ نعمت ہے
نرالی شان ہے اس کی یہ اس دنیا میں جنت ہے
وطن سے پیار ہے ہم کو وطن سے ہم کو الفت ہے

یہاں کشمیر، رانچی اور نینی تال کا گلشن
برستا ہے یہاں پر گیسوئے بنگال کا ساون
یہاں کا پاسباں دیکھو ہمالہ جیسا پربت ہے

یہاں بہتی ہے گنگا اور جمنا، راوی و جہلم
ہیں تیرتھ گاہ کاشی اور الہ آباد کا سنگم
ہمارے دیس میں بکھرا ہر اک سو حسن فطرت ہے

اودھ کی شام اور صبح بنارس مالوے کی شب
اجنتا، الورا اور تاج، شالیمار، قلعہ سب
یہ وہ شہکار ہیں جن سے وطن کی شان و شوکت ہے

یہ آزاد و جواہر لال اور گاندھی کی دھرتی ہے
یہی نیتا ہیں وہ جن پر کہ دنیا ناز کرتی ہے
وطن کی آج بھی ان کے سبب دنیا میں عزت ہے

وطن یہ سرمد و چشتی کا گوتم اور نانک کا
یہیں پر چاند بی بی لکشمی بائی ہوئیں پیدا
سراج و پرتھوی نے بھی بڑھائی اس کی عظمت ہے

یہاں پر سور تلسی اور رحیمن نے کہے دوہے
ترانے مدرل و اقبال اور ٹیگور کے گونجے
فضا میں میر اور غالب کے نغموں کی حلاوت ہے

کسانو کھیت میں اپنے دل و جاں سے کرو محنت
تبھی شاداب یا روزہ سکے گا گلشن بھارت
تمہاری جانفشانی کی ابھی اس کو ضرورت ہے

ہوا مغرور جو کبھی ہم نے سر اس کا جھکا لیا ہے
جو لوٹنے کے لیے آیا اسے ہم نے ہرایا ہے
ہمارے نوجوانوں میں دلیری ہے شجاعت ہے

وطن ہے یہ ہمارا اس کی خاطر خوں بہا دیں گے
حمید و اصغر و عثماں کی صورت جاں لٹا دیں گے
سمجھتے ہیں کہ ہم پر فرض عین اس کی حفاظت ہے

مبارکباد آزادی

ناظمہ بیگم انجم

گلوں میں یاسمن میں نسترن میں جان آئی ہے
چمن والو مبارک ہو چمن میں جان آئی ہے

خوشا ان کے قدم جن سے چمن میں جان آئی ہے
کرن موتی کی پھوٹی یا کرن میں جان آئی ہے

یہی کہتی ہوئی گنگ و جمن میں جان آئی ہے
شہیدان وطن اٹھو وطن میں جان آئی ہے

وطن کے سرفروشوں کیلئے دست دعا اٹھے
انھیں کے خوں سے دار و رسن میں جان آئی ہے

شہید راہ آزادی ہوئے جو ظلم کے ہاتھوں
انھیں کے عزم سے اہل وطن میں جان آئی ہے

وطن کا بچہ بچہ اب بھگت ہے اور ہے ٹیپو
ہماری زندگی کے بانکپن میں جان آئی ہے

مبارک ہو وطن والو مبارک ہو چمن والو
چمن تو ہے چمن، ہر ایک بن میں جان آئی ہے

بچانا ہے وطن کو دشمنوں کی تند نظروں سے
بڑی مشکل سے ارباب وطن میں جان آئی ہے

رہے قسمت کہ انجم اندرا گاندھی کی کوشش سے
جواہر لال نہرو کے وطن میں جان آئی ہے

وطن کو ہم نے پایا ہے بڑی قربانیاں دے کر
ہمارے خون سے اس کے بدن میں جان آئی ہے

کلکتہ میں غالب کا مکان

ڈاکٹر ستاستی رنجن بھٹاچاریہ

کلکتے کو THE CITY OF PALACES یعنی عالی شان عمارتوں کا شہر کہا گیا ہے اور عہد غالب میں بھی یہاں کئی قابلِ دید عمارتیں تھیں۔ لیکن عام لوگوں کے لیے مکانات کی اس دور میں بھی کمی تھی۔ اکثر اردو داں حضرات کا خیال ہے کہ غالب کو کلکتہ میں ایک عالی شان مکان صرف دس روپے کرائے پر مل گیا، جس خیال کی بنیاد غالب کا ایک خط ہے جس میں انھوں نے کلکتہ والے مکان کو ہوادار اور اچھا قرار دیا ہے۔ اس بنا پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان دنوں کلکتہ میں مکانات کی قلت نہیں تھی اور نہایت کم کرائے پر بڑے بڑے مکانات آسانی سے مل جاتے تھے۔ یہ خیال جو سراسر غلط ہے محض اس وجہ سے ہے کہ اُن کے سامنے اُس عہد کے کلکتے کا واضح نقشہ نہیں ہے۔

غالب کے قیام کلکتے کے دنوں کلکتے کی آبادی کیا تھی درست طور پر کہنا ممکن نہیں ہے چونکہ اُن دنوں مردم شماری نہیں کی جاتی تھی۔ ۱۸۳۱ء یعنی غالب کے کلکتے سے چلے جانے کے تقریباً سال بھر بعد کی مردم شماری کے مطابق کلکتے کی آبادی ۲۹۰،۲ ۳۳۵ تھی۔ اس آبادی کے مقابلے میں کلکتے میں مکانات کی بڑی کمی تھی۔ اُن دنوں کلکتے میں دو منزلہ عمارتیں برائے نام ہی تھیں۔ متوسط طبقے کے لوگ کچے مکانات میں رہتے تھے اور اُن سے اوپری طبقے کے لوگ ایک منزلہ مکانات میں۔ گھر کو سجانے کے لائق اسبابِ آرائش کی بھی کمی تھی اور جو کچھ تھا وہ نہایت قیمتی تھا۔ اکثر انگلستان سے جو جہاز آتے، اُن کے کپتان یا پھر ملکِ چین سے آمدنی کرنے والوں سے آرائشی ساز و سامان نہایت اونچی قیمتیں ادا کر کے خریدے جاتے تھے۔ لہذا آرائشی سامان کا ہونا بھی ایک طرح کی عیاشی سے کم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ جن کے پاس اس طرح کا کوئی سامان ہوتا وہ اس پر فخر کرتے یا اُسے اپنی عزت، وقار و مرتبہ کا امتیازی نشان سمجھتے تھے۔ مکان کے دروازوں اور کھڑکیوں میں کہیں کانچ کا کام نہیں ہوتا تھا بلکہ کانچ کی جگہ بانس یا بید سے بنی ہوئی کھڑکیوں اور دروازوں کی جالیاں ہوتی تھیں۔ کانچ نہایت قیمتی تھے اور جن کے مکان میں کانچ کا کوئی کام ہوتا وہ رئیس کہلاتا۔ قدیم کلکتے کے مکانات کا ذکر پڑھنے پر ہم پاتے ہیں کہ لارڈ وارن ہیسٹنگس کے مکان کی کھڑکیوں میں کانچ لگے ہوئے تھے۔ رات میں گھروں کو چراغاں کرنے کے لیے آج کی طرح بجلی کے قمقمے ہونا تو دور کی بات ہے مٹی کے تیل کے لالٹین یا قندیل بھی نہیں تھے بلکہ عموماً انگریزوں یا رئیس ہندوستانیوں کے مکانات میں ناریل کے تیل سے چراغاں ہوتا یا پھر موم بتی (شمع) کا استعمال ہوتا تھا، جس کی لو کو باہر کی تیز ہوا سے محفوظ رکھنے کے لیے لمبی چمنیاں ہوتی تھیں۔ اٹھارویں صدی کے آخر اور اوائل انیسویں صدی میں ایک معمولی دو منزلہ مکان کا کرایہ اُس زمانے کے لحاظ سے بہت زیادہ رہا ہے جس سے قلتِ مکان کا مسئلہ سمجھ میں آ جاتا ہے۔ دو منزلہ پر ایک ہال اور دو چھوٹے کمروں والا ایک معمولی مکان کا کرایہ ماہانہ ایک سو پچاس روپے عام طور پر ہوتا اور اگر ایسا کوئی مکان دامنِ شہر میں ہو، یعنی ڈلہوزی یا اسپلانڈ کے علاقے میں ہو تو اس کا کرایہ کم از کم تین، چار سو روپیہ ہوتا۔ وارن ہیسٹنگس کے عہدِ حکومت میں کلکتے میں مکانات کا کیا حال تھا اس کا کچھ اندازہ کلکتہ ہائی کورٹ کے ایک انگریز بیرسٹر مسٹر انٹونی کی بیوی محترمہ فے۔ نامی کے ایک خط سے لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے انگلستان میں اپنے خاندان والوں کے نام لکھا ہے۔ وہ لکھتی ہیں :۔

"اب یہاں کی (کلکتہ) روزمرہ زندگی اور اپنے گھر کے اخراجات کا حال لکھتی ہوں تاکہ کچھ اندازہ ہو جائے۔ مکان کرایہ ۲۰۰ دو سو روپیہ ہے چونکہ ہمارا مکان شہر کے کسی مرکزی مقام یا درمیانِ شہر میں نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر تین سو، چار سو روپیہ کرایہ ادا کرنا پڑتا۔ ہاں ہم بہتر مکان کی تلاش کر رہے ہیں۔"

غالب سیر و تفریح کے لیے یا عیاشی کرنے کلکتہ نہیں آئے تھے۔

اُن کی مالی حالت اُن دنوں بے حد خراب تھی اور وہ قرض خواہوں کے تقاضوں سے مجبور ہو کر کلکتہ آئے تھے۔ کلکتہ آتے آتے بھی انھوں نے کافی لوگوں سے قرض لیا تھا۔ کلکتے میں ان کو مقدمہ کی پیروی کرنا تھی اور اُس عہد میں مقدمے کی فیس بہت زیادہ تھی۔ پچاسوں انگریزوں کو خوش کرنے، رشوت و تحفے پیش کرنے کے بعد ہی اُن کی درخواست پر غور کیا جا سکتا تھا۔ ان کاموں کے لیے غالب کو کافی روپیہ درکار تھا۔ کلکتہ میں اُن کی غربت کا حال اُن کے مختلف خطوط سے بخوبی معلوم ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک خط میں لکھتے ہیں[1] "تہی دستی کا حال یہ ہے کہ رمضان آ گیا ہے اور توشہ ختم ہو گیا ہے ..... روپیے انعام، عملا و خدام سکریٹری دگورنری میں صرف ہوئے، ہرچند کہ اس میں فراخ دستی و کشادہ دلی نہ تھی۔ چار پانچ ماہ کی اقامت کے لیے اسی قدر کافی ہو گا جو پہلے عنایت ہوا تھا۔ امید ہے کہ آپ یہ رقم روانہ فرمائیں گے" ۔ ایک اور خط میں لکھتے ہیں[2] "حق یہ ہے کہ یہ روپیے نہ آتے تو سخت مشکل کا سامنا ہوتا ..... گھوڑا ۵۰ میں بیچ دیا۔ ایک سائیس اور ایک خدمت گار کو برطرف کر دیا اور تین خدمت گار اور ایک کہار اس وقت میرے پاس ہے اور میں خود آدھا آدمی ہوں ..... فکر تھی کہ جاڑا آ گیا، کمبل وغیرہ کی ضرورت ہے۔ آپ کی دستگیری نے اس اضطرار سے رہائی دی۔ قیمت اسپ ساز و برگ سرما کی فراہمی اور ربیع الثانی کے چار حصوں تک کام آئے گی اور دو سو دیا ہوا سے زیادہ خرچ نہ کرنا طے کر لیا ہے۔"

مذکورہ خطوط سے ظاہر ہے کہ غالب کی مالی حالت زیادہ خراب تھی۔ اُن کے ہاں دولت کہاں کہ وہ کلکتہ کے مرکزی علاقے یعنی ڈلہوزی اسکوائر، اسپلانڈ، دھرمتلہ یا چورنگی کے کسی علاقے میں کوئی اچھا مکان حاصل کرتے لہٰذا انھوں نے مرکزی کلکتہ سے دُور ہٹ کر ایک مزدوروں کی بستی میں یعنی آزاد ہند باغ کے قریب مکان لیا جو ڈلہوزی اسکوائر یعنی کلکتہ کے دفاتر کے علاقے سے کم و بیش ۲½ میل کے فاصلے پر ہے۔ آج کے دَور میں آزاد ہند باغ سے ٹیکسی اور مقام سے جو دو تین میل کے فاصلے پر ہو، ڈلہوزی یا دھرمتلہ آنا آسان ہے چونکہ سواری کے لیے ٹرام بس ٹیکسی وغیرہ ہیں لیکن غالب کے زمانے میں یہ کام آسان نہیں تھا۔ تب زیادہ تر لوگ پیدل سفر کرتے تھے اور رئیس گھوڑا یا پالکی میں بیٹھ کر سفر کرتے تھے۔ غالب بھی ایک خط میں اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں — "بازار شملہ شہر اور بارگاہ حکام سے دُور ہے —" کلکتے میں مکان کا کرایہ زیادہ ہونے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ کلکتہ، ڈھاکہ یا مرشد آباد کی طرح کوئی پُرانا شہر نہیں تھا کہ وہاں کرایہ پر دینے کے لیے مکانات ہوں۔ کلکتہ تو اُن دنوں صرف ایک زیرِ تعمیر شہر تھا جہاں ہندوستان کے کونے کونے سے لوگ آ آ کر آباد ہوتے جا رہے تھے۔ ایسی حالت میں مکان کا ملنا مشکل ہی تھا اور حکومت بھی اس سے بے خبر نہیں تھی لہٰذا حکومت نے ایسا قانون بھی بنایا تھا کہ کوئی مکان خالی رکھنے نہ پائے اور کرایہ پر اگر نہ بھی دے تو مکان کا ٹیکس ادا کرے جس کی وجہ سے لوگ مکان خالی نہیں رکھا کرتے تھے چونکہ خالی مکانات پر بھی ٹیکس ادا کرنا ہوتا تھا اور اگر مکانات کرائے پر ہوں تو کرایہ دار سے مالک مکان ٹیکس وصول کر لیتے تھے۔

مالک رام صاحب نے مرزا غالب کے مکان کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے[3] "کارنوالس اسکوائر کے تالاب کے سامنے مانک ٹولہ (انگریزی میں ٹولہ MANICK TOLLA لکھا جاتا ہے اس لیے مالک رام نے بھی ٹولہ لکھا ہے، درست تلفظ "تلہ" ہے "تلہ" بمعنی منزل یا مقام) اسٹریٹ کی نکڑ پر ایک گرجا ہے جس کا نام کرائسٹ چرچ ہے۔ اسی گرجے کی پُشت پر ایک بازار ہوا کرتا تھا جو مانک ٹولہ اسٹریٹ سے شروع ہو کر شمال کو بیڈن اسٹریٹ کی طرف چلا جاتا تھا۔ اسی کا نام شملہ بازار تھا۔ بازار اس صدی کے شروع تک موجود تھا۔ اب اس کے کچھ حصہ میں تو عمارتیں بن گئی ہیں اور باقی میں بیتھون رو (BETHUNE ROW) ہے۔ مرزا علی سوداگر کا مکان غالباً اسی جگہ تھا جہاں اس وقت بیتھون رو کا مکان نمبر ۱۳۳ ہے۔ اس کے صحن کا کنواں ۱۹۳۵ء میں پاٹا گیا تھا۔"

غالب نے اپنے کئی خطوط میں احباب کو کلکتے کے مکان کا پتہ لکھا تھا

---

[1] مجموعۂ دہلی اور غالب — قاضی عبدالودود "غالب نمبر" رسالہ اردو کراچی ۱۹۶۹ء۔
[2] 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃
[3] ذکرِ غالب - از مالک رام

مثلاً ایک خط میں لکھتے ہیں[1] "شہر کلکتہ قریب چیت بازار درشملہ بازار نزدیک تالاب گرد، بمطالعہ اسد برسد۔" راۓ چھجمل کے نام اپنا پتہ یوں لکھتے ہیں[2] "در کلکتہ قریب چیت بازار، درشملہ بازار نزدیک تالاب، درحویلی مرزا علی سوداگر بہ اسد اللہ برسد۔" ایک اور خط میں لکھتے ہیں[3] "آئندہ خط مولوی ولایت حسن کے توسط سے نہیں اس پتے سے بھیجیں، شملہ بازار، گول تالاب، حویلی میر احمد۔"

غالب کے مکان اور محلہ کا ذکر کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے[4] "لارڈ امہرسٹ غالباً پہلے گورنر جنرل تھے جو شملہ گئے۔ اس وقت سے یہ رسم ہو گئی کہ ہر سال نہیں تو ہر دوسرے سال گورنر جنرل گرمیاں شملہ میں بسر کرے۔ اس زمانہ میں ریل نہیں تھی۔ الہ آباد یا کانپور تک دریا کے ذریعے پھر پالکی، گاڑی اور گھوڑے پر یہ سفر جس شاہانہ شان و شوکت اور ساز و سامان کے ساتھ ہوتا تھا اس کی تفصیلات ٹینجر (HENERY POTINGER) وغیرہ کی زبانی ہمیں معلوم ہوئی ہیں۔ ایک پورا شہر کلکتہ سے شملہ تک اور پھر شملہ سے کلکتہ تک متحرک رہتا تھا۔ بہرحال اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلا کہ مزدوروں اور ملازموں کا ایک بڑا گروہ کلکتہ میں صرف اس سفر کے لیے رہنے لگا اور اُن کے محلے کا نام شملہ بازار پڑ گیا۔ یہ چیت پور روڈ کے اُس حصّے میں تھا جو بعد کو گینڈا تالاب کے نام سے مشہور رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہیں مرزا غالب ٹھہرے تھے۔ اب یہ حصّہ بالکل بدل گیا ہے۔ پُرانے مکانوں کے نام و نشان باقی نہیں۔ ریل کے جاری ہوتے ہی کیمپ کے متعلقات بھی معدوم ہو گئے تھے۔ اس لیے شملہ بازار بھی معدوم ہو گیا۔"

حالانکہ اب شملہ بازار کے نام سے کلکتے میں کوئی بازار نہیں ہے لیکن اب بھی اسی علاقے میں شملہ اسٹریٹ کے نام سے ایک راستہ موجود ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ یہیں کہیں شملہ بازار بھی تھا اور آج بھی اس علاقے کے ایک ڈاک گھر کا نام شملہ بازار ڈاک گھر (کلکتہ نمبر ۶) ہے۔ شملہ بازار کب اجڑ گیا اس کے لیے کوئی تاریخ یا سنہ مقرر نہیں کیا جا سکتا لیکن جیسا کہ ابوالکلام آزاد نے لکھا ہے کہ ریل کے جاری ہونے کے بعد یہ بستی اجڑ گئی۔ ایسٹ انڈیا ریلوے کمپنی ۱۸۴۵ء میں قائم ہوئی لہٰذا اسی کے بعد سے یہاں کا بازار اجڑنے لگا ہوگا اور مزدوروں کے بجاۓ نئے نئے پیشے کے لوگ یہاں آکر آباد ہوۓ ہوں گے

کلکتہ میں غالب کو جو مکان ملا اُس سے وہ واقعی خوش تھے یہ غالباً پہلا موقع تھا جب انھیں کوئی اچھا مکان ملا چنانچہ انھوں نے مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ کے نام جو خط لکھا اس میں اس مکان کی تعریف کی اور اس کا کرایہ "دہ روپیہ ماہانہ بہم رسیدہ" لکھا ہے۔ اسی خط کی بنیاد پر مالک رام اور دیگر حضرات نے غالب کے اس مکان کا کرایہ دس روپیہ لکھا ہے۔ "پنج آہنگ" کے اس خط کے مطابق اس مکان کا کرایہ دس روپیہ تھا۔ لیکن ایک اور خط میں کرایہ صرف چھ روپیہ درج کیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یا تو اُن سے پہلے چھ روپیہ کرایہ لیا جاتا تھا اور بعد میں دس روپیہ لیا جانے لگا یا پھر ممکن ہے کہ اُسی شملہ بازار کے علاقے میں غالب نے اپنا مکان بدل دیا ہو کلکتہ سے تحریر کردہ ایک خط میں انھوں نے اپنے مکان کا پتہ "درحویلی مرزا علی سوداگر" لکھا ہے اور ایک اور خط میں "حویلی میر احمد" لکھا ہے حالانکہ محلہ وہی شملہ بازار ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تبدیلی کے دوران ان کے خطوط مولوی ولایت حسن کے توسط سے آتے رہے ہیں، جس کا ذکر مذکورہ خط میں کیا گیا ہے جس خط میں انھوں نے کرایہ چھ روپیہ لکھا ہے اُس میں وہ لکھتے ہیں — "منگل ۲ شعبان کو براہ خشکی عظیم آباد روانہ ہوا اور وہاں سے کلکتہ پہنچا۔ وہاں ایک اچھا مکان چھ روپیہ کراۓ کا مل گیا"[5] اس سے واضح ہوتا ہے کہ پہلے وہ جس مکان میں تھے اُس کا کرایہ چھ روپے تھا اور اس کے بعد وہ مرزا علی سوداگر کے مکان میں اٹھ آۓ جس کا کرایہ دس روپیہ درج کیا۔

---

[1] مجموعہ دھلی اور غالب۔ از قاضی عبدالودود، رسالہ اردو کراچی "غالب نمبر" ۱۹۶۹ء [2] غالب۔ از غلام رسول مہر [3] مجموعہ دھلی اور غالب۔ رسالہ اردو کراچی غالب نمبر ۱۹۶۹ء [4] غالب اور ابوالکلام۔ مرتبہ محمد عتیق صدیقی۔ [5] مجموعہ دھلی اور غالب۔ رسالہ اردو کراچی غالب نمبر ۱۹۶۹ء



اتر پردیش اردو اکاڈمی کی طرف سے اردو مصنفین کو انعامات

اور کتب خانوں اور دارالمطالعوں کو مالی امداد

اردو اکاڈمی نے یکم جنوری ۱۹۶۹ء سے ۳۰ر نومبر ۱۹۷۱ء کے درمیان شائع شدہ کتابوں پر ملک کے ۲۷ اردو مصنفین کو ۴۲ ہزار چار سو پچاس روپے کی مجموعی رقم بطور انعام دینے کا اعلان کیا ہے۔ اس سے قبل بھی اکاڈمی کی طرف سے دس ہزار کی رقم مختلف مصنفین کو انعام میں دی جا چکی ہے اور ان انعامات کی تفصیلات کا اعلان کچھ عرصہ قبل ہو چکا ہے۔

انعام یافتہ مصنفین کی فہرست حسب ذیل ہے۔ ان کی جن تخلیقات پر انہیں انعام دیا گیا ہے ان کے نام اور ان کی رقم مصنفین کے نام کے آگے درج ہے۔

نمبر شمار	مصنف	کتاب	انعام کی رقم
۱۔	جناب سید مسعود حسن رضوی (لکھنؤ)	اسلاف میر انیس	۲ —
۲۔	جناب مجروح سلطانپوری (بمبئی)	غزل	۲ —
۳	ڈاکٹر یوسف حسین خاں (دہلی)	غالب اور آہنگ غالب	۲ . — ..
۴۔	ڈاکٹر مغنی تبسم (حیدرآباد)	فانی بدایونی حیات شخصیت اور شاعری	۲۰ —
۵۔	جناب غلام ربانی تاباں (دہلی)	ذوق سفر	۲۰ . —
۶۔	جناب ساحر لدھیانوی (بمبئی)	آؤ کہ کوئی خواب بنیں	۲۰۰ —
۷۔	جناب شمس الرحمن فاروقی (لکھنؤ)	گنج سوختہ	۲ —
۸۔	ڈاکٹر اسلوب احمد انصاری (دہلی)	نقش غالب	۲ . — .
۹۔	جناب بسمل سعیدی (دہلی)	اوراق زندگی	۲ . —
۱۰۔	جناب ضیاء احمد بدایونی (دہلی)	مباحث و مسائل	۲ — . .
۱۱۔	جناب غلام احمد فرقت (دہلی)	قد مچے	۱۵ — .
۱۲۔	جناب انور عظیم (دہلی)	پرچھائیوں کی وادی	۱۵ . —
۱۳۔	جناب رتن سنگھ (لکھنؤ)	پہلی آواز	۱۵ —
۱۴۔	جناب اقبال مجید (سیتاپور)	دو بھیگے ہوئے لوگ	۱۵ —
۱۵۔	جناب بشیر بدر (علی گڑھ)	اکائی	۱۵ —
۱۶۔	جناب رسیر رضوی (دہلی)	خشت دیوار	۱۵۰ — .
۱۷۔	جناب شہریار (علی گڑھ)	ساتواں در	۱۵ —
۱۸۔	ڈاکٹر مس رشید موسوی (حیدرآباد)	دکن میں مرثیہ اور عزاداری	۱۵۰۰ —
۱۹۔	جناب اے۔ سی۔ بہار (رہتک)	نسیم بہار	۱۵۰۰ — .
۲۰۔	جناب سنجو قمر (حیدرآباد)	مرزا غالب	۱۵۰ — .
۲۱۔	جناب سوامی دیال (سیتاپور)	روح سخن	۱۵۰ — .
۲۲۔	جناب عابد علی (بمبئی)	مزدور سے منسٹر	۱۵۰۰ — .
۲۳۔	جناب کمال احمد صدیقی (کشمیر)	بیاض غالب	۱۵۰ — ..
۲۴۔	جناب نثار احمد فاروقی (دہلی)	تلاش غالب	۱۲۰۰ — .
۲۵۔	ڈاکٹر مسیح الزماں (دہلی)	اردو مرثیے کی روایت	۱۲ . — ..
۲۶۔	ڈاکٹر منظر عباس نقوی (علی گڑھ)	وحید الدین سلیم حیات اور خدمات	۱۲۰۰ — ..
۲۷۔	جناب خلیق انجم و ڈاکٹر گوپی چند نارنگ (دہلی)	کربل کتھا کا لسانی مطالعہ	۱۲۰ —
۲۸۔	محترمہ زاہدہ زیدی (علی گڑھ)	دہر حیات	۱۲ . — ..
۲۹۔	ڈاکٹر رضی الدین احمد (تروتی پتی)	نقد الوالکلام	۱۰۰۰ — ..
۳۰۔	ڈاکٹر محمد یٰسین (علی گڑھ)	انگریزی ادب کی تاریخ	۸۰۰ — ..

نمبر شمار	مصنف	کتاب	انعام کی تاریخ
۳۱	جناب عطا کاکوی (پٹنہ)	کمال غزل	۸۰۰
۳۲	ڈاکٹر شمیم انہونوی (لکھنؤ)	تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا	۷۵۰
۳۳	جناب اطہر پرویز (علی گڑھ)	فسانۂ عجائب	۷۵۰
۳۴	ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی (دہلی)	فانی کی شاعری	۷۵۰
۳۵	ڈاکٹر احتشام احمد ندوی (بی۔ یو)	تنقیدی نظریات کا مطالعہ	۷۵۰
۳۶	جناب ظفر ادیب (دہلی)	ہمعصروں پر غالب کا اثر	۷۵۰
۳۷	محترمہ عفت موہانی (حیدرآباد)	آخری تحفہ	۷۵
۳۸	محترمہ عطیہ پروین (گونڈہ)	مہ لقا	۷۵
۳۹	جناب ایم کوٹھیاوی راہی (گورکھپور)	منزل منزل	۷۵۰
۴۰	جناب اختر بستوی (الہ آباد)	نغمۂ شب	۷۵
۴۱	جناب احمد یحییٰ (کٹک)	جوئے کہکشاں	۷۵
۴۲	جناب گوہر مرادآبادی (کانپور)	آثار	۷۵
۴۳	جناب عبدالحبیب سہالوی (لکھنؤ)	الکتبیات	۷
۴۴	جناب پریم پال اشک (دہلی)	روزمرہ و محاورۂ غالب	۶
۴۵	جناب مجتبیٰ حسین (حیدرآباد)	قطع کلام	۶
۴۶	محترمہ حسینہ بانو (لکھنؤ)	شمع ہر رنگ میں جلتی ہے	۶۰
۴۷	محترمہ مسرور جہاں (لکھنؤ)	پیکر	۶
۴۸	جناب مظفر حنفی (بھوپال)	دو غنڈے	۶
۴۹	جناب مدانا صلی (بمبئی)	لفظوں کا پل	۶
۵۰	جناب غلام مرتضیٰ راہی (علی گڑھ)	لاسکاں	۶
۵۱	جناب صبا حانسی (کانپور)	صحرا صحرا	۶۰
۵۲	جناب کمال حانسی (کانپور)	نامہ و پیام	۶
۵۳	جناب پیام فتح پوری (کانپور)	مادۂ ستارہ	۶۰
۵۴	جناب شاعر فتح پوری (کانپور)	تیر نیم کش	۶۰۰
۵۵	جناب مطرب سلطانپوری (لکھنؤ)	محل فکر	۶۰۰
۵۶	جناب مرتضیٰ حسین (حیدرآباد)	ہندوستان کی بڑی ہستیاں (حصہ اول و دوم)	۶۰۰
۵۷	جناب صفدر حسین (حیدرآباد)	مہاتما گاندھی	۶۰
۵۸	جناب سعادت علی صدیقی (لکھنؤ)	حسنۂ غالب	۵۰
۵۹	جناب دور آفریدی (رامپور)	دیوانیاں	۵
۶۰	جناب ذکی کاکوروی (لکھنؤ)	نسرین و نسترن	۵۰
۶۱	جناب عشرت انور (علی گڑھ)	دنیا کہیں جسے	۵۰
۶۲	جناب رشی سہاگل (دہلی)	منزل نور	۵۰
۶۳	جناب کیف احمد صدیقی (سیتاپور)	گرد کا درد	۵۰
۶۴	محترمہ طیبہ سہیل (سہارنپور)	رفیع احمد قدوائی	۵
۶۵	جناب ایس ایچ عارف (حیدرآباد)	ڈاکٹر ذاکر حسین	۵۰
۶۶	جناب کشفی لکھنوی (لکھنؤ)	سازِ نغمہ	۵۰
۶۷	ڈاکٹر لطیف حسین ادیب (دہلی)	ناشاد کانپوری	۵
۶۸	جناب مظفر الدین (حیدرآباد)	سخن در سخن	۴۰
۶۹	جناب جلیل الہ آبادی (پونا)	لہو رنگ	۴۰
۷۰	جناب یاس احتراددی (مرادآباد)	چراغ راہ	۴
۷۱	جناب قمر بسوانی (سیتاپور)	ایکتا کا جیس	۴
۷۲	پنڈت خوش دل (دہرہ دون)	شرارے	۴

اس کے علاوہ اردو اکاڈمی نے ۸ اکتب خانوں اور دارالمطالعوں کو اردو کی کتابیں، رسائل اور اخبارات خریدنے کے لیے کل ۵۰۳۰ روپے کی مالی امداد دینا منظور کیا ہے۔ اس سے قبل اکاڈمی نے ۳۹ کتب خانوں اور دارالمطالعوں کو ۲۷۶۵ روپے کی امداد دی تھی۔ اس طرح سنہ ۱۹۷۲ء میں اترپردیش اردو اکاڈمی نے ۷۴ اکتب خانوں اور دارالمطالعوں کو ایک لاکھ پانچ ہزار روپے کی امداد منظور کی ہے۔



Regd No L. 319



ھائی کمشنر بنگلہ دیش متعینہ ھندستان ڈاکٹر اے آر۔ ملک نے ۱۹ دسمبر سنہ ۱۹۷۲ء کو نئی دھلی میں وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کو ایک کار پیش کی۔ تصویر میں ڈاکٹر ملک وزیر اعظم کو کار کی کنجیاں پیش کر رہے ھیں

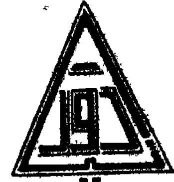




گورنر تسری اکبر علی خاں لکھنؤ میں پی۔ آر۔ ڈی کے ہیڈ کوارٹر پر منعقدہ ۱۱ ویں ریاستی دیہی نوجوانوں کے کھیل کود کے مقابلے
کی اختتام پر مینی تال کو جمناسٹک چیمپین شپ شیلڈ عطا کرتے ہوئے

محکمۂ اطلاعات اور پریس کلب لکھنؤ کے درمیان ایک دورہ کرکٹ میچ کا ایک منظر۔ یہ میچ محکمۂ اطلاعات نے جیتا





جلد ۲۸ نمبر ۱۲

مارچ ۱۹۷۳ء
پھاگن ۱۸۹۴ شک

چندہ سالانہ پانچ روپے
فی پرچہ ۵۰ پچاس پیسے

ایڈیٹر
خورشید احمد

پبلشر
شرومنی شرما
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

پرنٹر
اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری۔ یوپی

مطبوعہ
نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ، لکھنؤ

شائع کردہ
محکمۂ اطلاعات۔ اترپردیش

فہرست عنوانات

اپنی بات

حسبِ سابق اس سال بھی یومِ جمہوریہ کے موقع پر صدرِ جمہوریہ نے ادب و فنونِ لطیفہ اور قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں کارنامے انجام دینے کے صلے میں ۱۰۶ افراد کو اعزازات دیئے۔ اس سال ملک کا سب سے بڑا اعزاز بھارت رتن کسی کو نہیں ملا۔ ملک کا دوسرا بڑا اعزاز پدم وبھوشن ۶ ممتاز شخصیتوں کو اور پدم بھوشن ۱۱ افراد کو دیا گیا۔ ان کے علاوہ پدم شری کا اعزاز ۸۹ افراد کو ملا جن میں اردو کے مشہور و معروف شاعر قوم پرور اور وطن کے شیدائی جناب سلام مچھلی شہری بھی شامل ہیں۔ اپنے افکار و خیالات اور اپنی شاعری کے ذریعے ادب کی خدمت کرنے کے ساتھ ساتھ سلام نے قومی اتحاد و یکجہتی کو فروغ دینے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ ملک کی تہذیبی سرگرمیاں اور دورِ حاضرہ کے مسائل آپ کی شاعری کے خاص موضوعات ہیں۔ مادرِ وطن سے محبت کو جزوِ ایمان جانتے ہیں چنانچہ جب بھی وطن پر وقت پڑا ہے تو انھوں نے خود بھی قلم سے تلوار کا کام لیا ہے اور دوسروں کو بھی "شیشہ و پیمانے" کی بجائے تلوار اٹھانے اور نغمۂ طرب کی جگہ نغمۂ جنگ سنانے کی تلقین کی ہے۔ شاعری کے ساتھ ساتھ سلام صاحب نثر نگاری میں بھی ایک دل کش انداز رکھتے ہیں۔ ہم انھیں اس اعزاز کے ملنے پر ہدیہ تہنیت پیش کرتے ہیں۔

پدم وبھوشن کا اعزاز پانے والوں میں ڈیش بندھو سی۔ آر۔ داس کی بیوہ جنگ آزادی کی مجاہدہ شریمتی بسنتی دیوی، سابق صدر کانگریس میر جنگ آزادی کی ایک اور نامور مجاہدہ شریمتی نیلی سین گپتا اور شری یو۔ این۔ ڈھیبر سابق صدر کانگریس بھی شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر ڈی۔ ایس۔ کوٹھاری سابق چیرمین یونیورسٹی گرانٹس کمیشن، ڈاکٹر ناگیندر سنگھ جج عالمی عدالت (جو پہلے ہندستان کے چیف الیکشن کمشنر تھے) اور شری ٹی۔ این۔ سوامی ناتھن کو بھی پدم وبھوشن کا اعزاز ملا ہے۔ پدم بھوشن کا اعزاز پانے والے ۱۱ افراد میں ممتاز مصور مقبول فدا حسین، ممتاز صحافی اور مصنف شری بنارسی داس چترویدی (اتر پردیش)، ممتاز ادیب شری ہریندر ناتھ چٹوپادھیائے، ممتاز اخبار نویس مسٹر پوتھن جوزف (بعد از مرگ)، کرکٹ کے ممتاز کھلاڑی شری دیو سنگھ اور شری بی۔ ایم۔ ایس کیٹل (جنگ آزادی کے مجاہد) شامل ہیں۔ شری سلام مچھلی شہری کے علاوہ پدم شری کا اعزاز جن دیگر افراد کو ملا ہے ان میں ممتاز کرکٹ کھلاڑی رنچ ماں کجھ ممتاز ڈرامہ نویس شری بلونت گارگی (پنجاب)، سارس (اتر پردیش) کے ہردل عزیز اور حاذق ڈاکٹر بھولا ناتھ، ممتاز ناول نگار شری رحمت راکم جیدر راؤ، لدھیانہ اسپتال کے ڈاکٹر جگدیش بہوا، کالی کٹ یونیورسٹی (کیرالا) کے صدر شعبۂ ہندی ڈاکٹر محمد عبدالقادر، ملک محمد کماری، روہینی گوپا سابق پرنسپل کراسٹھویٹ کالج (الہ آباد)، شری شیام لال گپتا پرساد (اتر پردیش) اور جوجیہ (اتر پردیش) کے جیبی اور ٹی کے زخموں کے ماہر ڈاکٹر ترلوک ناتھ شرما شامل ہیں۔

اعزازات کا اعلان ۲۶ جنوری کو ہوتا ہے۔ اس کے بعد ماہنامہ کی پہلی اشاعت مارچ ہی کی ہوتی ہے جس میں اعزاز پانے والوں کو مبارک باد پیش کی جا سکتی ہے۔ لہذا ادارہ ماہنامہ ان سب حضرات کی خدمت میں تہنیت پیش کرنے کی مسرت حاصل کر رہا ہے۔

● حکومت اتر پردیش اردو زبان کی ترویج و ترقی اور اس کے پڑھنے والوں کے لیے سہولتیں بہم پہنچانے کی جانب خصوصی توجہ کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں اسکولوں میں اردو پڑھانے کا انتظام، معمر اور مالی پریشانیوں میں مبتلا ادیبوں اور شاعروں کے لیے ماہانہ مدد کی اسکیم، اردو کتابوں پر انعامات، اردو میں سرکاری گزٹ کی اشاعت، اردو میں درخواستیں دینے اور رجسٹری کے لیے دستاویزیں قبول کرنے کے احکامات، آٹھویں درجہ تک بیاض ہونے والی کتابوں کی اردو میں اشاعت، نظامت تعلیمات میں ایک ڈپٹی ڈائرکٹر (اردو) کی تقرری، اردو اکادمی کا قیام، اکادمی کے ذریعے اردو کتابوں پر انعامات، اردو کے ادیبوں اور لائبریریوں اور مطالعہ گھروں کی مالی امداد اور اردو کتابوں کی اشاعت کا پروگرام وغیرہ وغیرہ وہ چند اہم اقدامات ہیں جو حکومت اب تک کر چکی ہے۔ اب حال ہی میں اس نے پردیش کے تمام میونسپل بورڈوں کے پرائمری اسکولوں میں ایک ایک اردو ٹیچر مقرر کیے جانے کے احکام بھی جاری کیے ہیں۔ اس فیصلے کے نتیجے میں پردیش کے میونسپل بورڈوں کے تقریباً ۳ پرائمری اسکولوں میں تین ہزار اردو جاننے والے افراد بحیثیت اردو ٹیچر مقرر ہو جائیں گے۔ یاد ہوگا کہ اس سے قبل پردیش کے ۲۵ پرائمری اسکولوں اور بعض مکتبوں اور مدرسوں میں اردو پڑھانے کا انتظام کیا جا چکا ہے۔ تسلیم شدہ مکتبوں، اردو کے ذریعے تعلیم دینے والے اسکولوں اور مدرسوں کو جنھیں اب تک سرکاری امداد نہیں مل رہی ہے، انھیں امداد دینے کے سوال پر بھی ریاستی حکومت غور کر رہی ہے۔ اس طرح یہ دیکھا جائے گا کہ ریاست میں اردو کی تعلیم کی سہولتیں بہم پہنچانے اور اردو زبان کو فروغ دینے کا جو وعدہ حکومت نے کر رکھا ہے اسے پورا کرنے کی جانب وہ نہ صرف پوری طرح متوجہ ہے بلکہ اس کے سلسلے میں برابر عملی اقدامات بھی کر رہی ہے۔

● لکھنؤ میں انجمن تکمیل ادب کے زیرِ اہتمام ۲ جنوری ۱۹۷۱ء کو گنگا پرشاد میموریل ہال امین آباد میں یومِ دبیر منایا گیا۔ یومِ دبیر کا افتتاح اتر پردیش کے گورنر مسٹر اکبر علی خاں نے کیا۔ اپنی افتتاحی تقریر میں موصوف نے مرزا دبیر کے علم و فضل اور مرثیہ گوئی میں ان کی عظمت پر مختصر مگر جامع الفاظ میں روشنی ڈالی اور مرزا صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کیا۔ مرزا سلامت علی دبیر کا شمار ان کاملینِ فن میں ہوتا ہے جنھوں نے صنفِ مرثیہ کو اس کے کمال تک پہنچا دیا۔ تخیل کی بلندی، الفاظ کی شان و شوکت اور تشبیہوں کی ندرت آپ کے مرثیوں کی خاص خصوصیتیں ہیں۔ مرثیہ گوئی کے فن میں مرزا صاحب کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ مرزا دبیر اس کے یقیناً مستحق تھے کہ ان کا یوم منایا جائے۔ خوشی کی بات ہے کہ انجمن تکمیل ادب لکھنؤ نے یومِ دبیر منا کر ایک ادبی فرض ادا کیا۔

● ہندستان اور انگلینڈ کے درمیان کرکٹ ٹسٹ میچوں کا حالیہ سلسلہ ہندستان کی فتح پر ختم ہوا۔ پانچ ٹسٹ میچوں کے اس سلسلے میں ہندستان پہلا ٹسٹ دہلی میں ہارا۔ اس کے بعد کلکتہ اور مدراس کے دونوں ٹسٹ ہندستان نے جیتے۔ کانپور کا چوتھا اور بمبئی کا پانچواں ٹسٹ ہار جیت کے فیصلے کے بغیر ختم ہوا۔ اس طرح ہندستان نے ایک کے مقابلے میں انگلینڈ کو ۲ میچوں سے ہرا کر ربڑ جیت لیا۔ انگلینڈ کے خلاف یہ دوسرا ربڑ ہے جو ہندستان نے جیتا۔ پہلا ربڑ اس نے سرزمین انگلستان پر ۱۹۷۱ء کے ٹسٹ سلسلے میں جیتا تھا اور اس مرتبہ ہندستان میں اس کو انگلستان کے خلاف یہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ ٹسٹ میچوں کے اس سلسلے میں جہاں اور بہت سے ریکارڈ قائم ہوئے وہاں اجیت واڈیکر کی کپتانی میں ہندستان کی فتح کی "ہیٹ ٹرک" بھی ہوئی۔ واڈیکر کی کپتانی میں ہندستان ۱۹۷۱ء میں یکے بعد دیگرے ویسٹ انڈیز اور انگلستان سے برابر جیتا تھا اور اب یہ مسلسل تیسرا ربڑ ہے جو انگلینڈ ہی کے خلاف ہندستان نے جیتا ہے۔ اس کے لیے کپتان اجیت واڈیکر اور ہندستانی ٹیم کے سبھی کھلاڑی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ہندستان نے کھیل کے ہر شعبے میں ٹنگ، بولنگ اور فیلڈنگ میں شاندار کارگزاری دکھائی اور یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ اسے یہ غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی۔ امید ہے کہ ہندستانی کھلاڑی سہل پسندی سے کام نہ لیں گے اور اس شاندار ریکارڈ کو نہ صرف برقرار رکھیں گے بلکہ اسے اور بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔ دوسری طرف کرکٹ کے ابھرتے ہوئے کھلاڑی اس کامیابی سے تحریک حاصل کریں گے اور اپنے کو ان کھلاڑیوں کی جگہ لینے کا اہل ثابت کریں گے جنھوں نے ہندستانی کرکٹ کے معیار کو بلند کر دیا ہے اور کرکٹ کی دنیا کی ایک "بڑی طاقت" بنا دیا ہے۔

——— ایڈیٹر



محمد بدیع الزماں

جناب رشید احمد صدیقی کا کہنا ہے کہ "آرٹ بالعموم شعریت کا دوسرا نام ہے" مگر یہ شعریت ہے کیا؟ پروفیسر موصوف اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں کہ:

"شعریت" حقیقت آگہی" کا ایک دلکش اور جامع مترادف ہے حقیقت سے باخبر رہنا ایک ایسی نعمت و سعادت ہے اور وہ ہماری مسرتوں کا ایسا لامحدود اور لازوال سرچشمہ ہے کہ اس کے بے دریغ کششوں کے مقابلے میں زندگی کی ساری تلخیاں ہیچ محسوس ہونے لگتی ہیں شعریت سے مراد منظوم حماقتیں نہیں ہیں اور نہ اس سے شاعروں کا مخصوص انکسار زدہ ماحی یا حلیہ ہے ترک موالات کی مانند شعریت ایک طرح کا میلان ذہنی ہے۔ یہ ایک ایسی امید ہے جو کبھی مایوسی میں تبدیل نہیں ہوتی۔ کوئی شخص خواہ وہ عرف عام میں شاعر کہلائے یا سائنسداں، آقا یا غلام، مریض یا تندرست، مفلس یا تونگر، موحد یا ملحد کچھ بھی کیوں نہ ہو اگر متذکرہ صدر خصوصیات کا حامل ہے تو وہ شعریت سے بہرہ ور ہے۔

"شعریت... ایک ذوق، ایک وجدان، ایک قسم کا میلان ذہنی ہے جس کا تعلق براہ راست انسانیت سے ہے یہ ایک افتاد طبع ہے اس وجدان کی صحیح کارروائی اور پھر اس کی صحیح و دلکش ترجمانی کرنا اور اس کو مرئی اور متشکل نا ممکن اس انداز اور سلیقے سے کہ تصور اور تصویر میں بیش از بیش مناسبت ہو شاعری ہے۔ یہ شاعری کا وسیع ترین مفہوم ہے۔" (مقدمہ مانیات حالی)

حقیقت پرستی ہی چونکہ ادب کا جوہر ہے اس لیے ادب جذبات کے لطیف پردوں میں رہ کر بھی حقائق سے بیگانہ نہیں رہ سکتا۔ اگر شاعر عالم رنگ و بو سے گذر کر فلسفہ و حکمت کے نکتہ ہائے سربستہ اور ہر کیفیت مجردہ کی دلکش ترجمانی کرنے کا اہل ہے تو اسکی حقیقت آگہی ایک عہد کے لیے منزل اور آنے والے عہد کے لیے نشان راہ بن سکتی ہے۔ اگر شعر کی بنیادیں حقیقت، خلوص، شرافت اور وسیع النظری پر رکھی گئی ہیں تو ضرور ہے کہ شاعر انسان کو داخلی طور پر بدلنے کا اہل ہوگا۔ شاعر اگر بحیثیت انسان کے بڑا ہے، اسکی شخصیت وسیع اور ہمہ گیر ہے، اس کی بصیرت، وجدان اور جمالیاتی احساس میں گہرائی ہے، اگر وہ اپنی قوی تر قوت مشاہدہ سے دقیق نکتوں کی موشگافی کر سکتا ہے، اپنے لطیف احساسات کے ذریعے غیر مادی حقائق سے بھی لذت اندوزی حاصل کر سکتا ہے اور اسی کے ساتھ اگر وہ عرفان کی اس مجموعی کیفیت کی تصویر جدت بیاں اور حسن ادا کے ساتھ شعر کے لباس میں ملبوس کر کے دوسروں کی بھی لذت اندوزی کا باعث بن سکتا ہے تو اس کا کلام سحر سے گذر کر اعجاز بن جاتا ہے اور یہی اعجاز بن جانا اس کے کلام میں شعریت کی دلیل ہے۔ اس لیے کہ بقول پروفیسر رشید احمد صدیقی یہی شعریت ہی "ہماری مسرتوں کا لامحدود اور لازوال سرچشمہ ہے" اور جب ایسا ہے تو شعریت کا تعلق براہ راست انسانیت سے ہو جاتا ہے اسی لیے ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا کہنا ہے کہ "شعر کو قدر کا خادم ہونا چاہیے" کیونکہ اگر شاعر اس کلیہ کو ملحوظ خاطر نہیں رکھتا تو ظاہر ہے کہ وہ نہ حقیقت سے باخبر رہ سکتا ہے اور نہ انسانیت کی ترجمانی کر سکتا ہے اور اس طرح جسے شعریت کہتے ہیں اس کی تلاش

بھی بے معنی ہو جائے گی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف اپنے اس خیال کی مزید وضاحت اس طرح کرتے ہیں کہ:

قدریں وہ کنجی ہے جس سے زندگی کے سارے طلسم کھلتے ہیں شعر کو قدر کا خادم ہونا چاہیے نہ کہ اس کا مٹانے والا۔ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ شعریت تخیل، فکر اور جذبے کی آمیزش کے بغیر نہیں ہو سکتی اور یہی دونوں ہم تغزل کی جان ہیں۔ انہی سے حسن ادا کی جلوہ گری ہوتی ہے جو ادب کی بنیادی قدر ہے۔ تخیل فکر کی قوت اس کی گہرائی میں پوشیدہ ہے۔ یہ قوت صورت پذیری اور نظم آفرینی کے سارے اسرار اپنے اندر نہاں رکھتی ہے جو جب خارجی حقائق کو اپنے اندر جذب کر لے تو موضوع و معروض کی دوئی باقی نہیں رہتی۔ اس طرح عین اور غیب، حقیقت، فطرت اور آزادی، شعور اور لاشعور، انفرادیت اور اجتماع کے تضاد دور ہو جاتے ہیں اور شعر زندگی کا مظہر بن جاتا ہے۔

(از ماہنامہ "نقوش"۔ لاہور (ادب عالیہ) جولائی ۱۹۶۰ء)

ان سب باتوں سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ شعر کی بنیادیں زندگی کی ابدی قدروں اور حیات کی اصلیتوں پر قائم ہیں۔ زندگی کی قدروں، اس کے تنوع اور رچاؤ پر اگر شاعر فکر و نظر کی عمارت تعمیر کر کے دلوں کے تاروں کو چھیڑتا اور زندگی کے حسن کو بیدار کرتا ہے تو زندگی کی حقیقتیں بے نقاب نظر آنے لگتی ہیں۔ شاعر تخیل کے سہارے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کر کے ایک نامکمل داستان کو اس کے فطری انجام تک پہنچا کر زندگی کی ہمہ گیر ترجمانی کرتا ہے۔ تخیل کا یہی پرتو جذبے کی کارفرمائیوں کو پیچیدہ اور رنگین بنا دیتا ہے۔ یہ تخیل ایک داخلی اور انفرادی اپج ہے۔ تخیل اور جذبے کی یہی آمیزش شعر کو شعریت عطا کرتی ہے۔

تخیل اگرچہ شعر کا ایک نہایت اہم عنصر ہے مگر محاسن شعری کا انحصار یا شعریت کا دارومدار فقط تخیل پر نہیں اور نہ تعقل اور منطق پر ہے بلکہ وجدان سے ہے جس کی تخلیقی منزل کی طرف اشارہ غالب نے اپنے اس شعر میں کیا ہے کہ ؎

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

اس تخلیقی منزل کے زادِ راہ میں شعور کو بھی اتنا ہی دخل ہے کیونکہ جہاں وجدان کا سوال ہے شاعری جیسے لطیف فن کی تو پرورش ہی وجدان کی آغوش میں ہوتی ہے۔ اگر شاعر زندگی اور فطرتِ انسانی کی ساری پیچیدگیوں اور تاریخ انسانی کی قابلِ احترام روایات کو اپنے شعور میں جذب کر کے اور اپنی شخصیت میں رچا کر ان میں حسن اور زندگی پیدا کر دے تو اس کے شعر میں شعریت کا خلیل الرحمٰن اعظمی کے الفاظ میں حال یہ ہوگا کہ:

"اس کے پاؤں کیچڑ میں ہوتے ہوئے بھی اس کا ہاتھ تاروں کی طرف بڑھے گا۔"

حالی مقدمہ شعر و شاعری میں شعریت کا کہیں نام تو نہیں لیتے مگر اس کے جواز میں شاعر کی قوتِ متخیلہ کے عمل اور اس کے ذوق کے متعلق فرماتے ہیں

"ہر ایک شے کی روح میں جو خاصیتیں ہیں ان کا انتخاب کرنا اور ان کی تصویر کشی شاعر کا کام ہے۔ وہ ہر ایک شے میں سے صرف وہ خاصیتیں چن لیتا ہے جن پر قوت متخیلہ کا عمل چل سکے اور جو عام نظروں سے مخفی ہوں جس طرح ایک نیاریا ریت میں سے چاندی کے ذرے نکال لیتا ہے جو کسی کو نہیں سوجھتے اسی طرح شاعر ہر ایک چیز اور ہر ایک واقعہ میں سے صرف وہ کیفیات لے لیتا ہے جن میں اس کے سوا کسی کا حصہ نہیں اور باقی کو چھوڑ دیتا ہے۔"

یہ صحیح ہے کہ "حقیقت آگہی" یا "تخیل، فکر و جذبہ کی آمیزش" شعریت کو وجود میں لاتی ہے لیکن یہی کافی نہیں ہے حسن خیال کے ساتھ ساتھ مکمل شعریت کا راز حسنِ ادا میں بھی پنہاں ہے۔ شعریت پر آج سے بیس سال قبل پروفیسر آل احمد سرور اور پروفیسر کلیم الدین احمد میں تبادلۂ خیال ہوا تھا۔ سرور صاحب نے اسلوب کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے کہا تھا

"شعریت سے میری مراد وہ رسیلا پن نہیں ہے جس کی طرف آپ نے اشارہ کیا بلکہ جذبات کی شدت، وہ والہانہ کیفیت، وہ بات کو اس طرح کہنے کی عادت کہ پڑھنے والا تھوڑی دیر کے لیے چونک اٹھے اور اس کے سامنے حالات کی ایک پوری دنیا آ جائے، غرض وہ سارا اسلوب جو شعر کو نثر ہونے سے بچاتا ہے کم نظر آتا ہے۔"

جناب کلیم الدین احمد نے ماہنامہ "معاصر" پٹنہ کے جولائی ۱۹۴۱ء

کے شمارہ میں اپنے مضمون میں (جو بعد میں انکی کتاب "سخن ہائے گفتنی" مطبوعہ ۱۹۵۵ء میں بھی شامل کیا گیا) سرورؔ صاحب کے خیالات سے اتفاق کرتے ہوئے صرف اس قدر اختلاف کیا کہ:

"شاعری نہ تو شعبدہ بازی ہے اور نہ جادوگری۔ شاعری نام ہے انسانی تجربات، خیالات و جذبات کے اظہار کا اور یہ اظہار الفاظ نقوش (یا تخیلی پیکروں) اور اوزان کی مدد سے ہوتا ہے۔ اگر تجربات میں اصلیت ہو اور شاعر کو الفاظ، نقوش اور اوزان پر قدرت حاصل ہے تو پھر نتیجہ کامیاب شاعری ہے۔ اگر تجربہ میں اصلیت نہیں اور اگر اس میں کسی قسم کا نقص ہے تو یہ نقص، یہ اصلیت کی کمی اسلوب بیان میں ظاہر ہو جائے گی۔ سرورؔ صاحب کا فرماتے ہیں کہ شعریت کے لیے جذبات کی شدت، ایک والہانہ کیفیت ضروری ہے لیکن شرط یہ ہے کہ یہ والہانہ کیفیت یہ "جذبات کی شدت" حقیقی ہو نقلی نہ ہو۔"

حالیؔ نے بھی مقدمہ شعر و شاعری میں اصلیت کو سادگی اور جوش کے ساتھ ایک ضروری عنصر قرار دیا ہے۔ جناب کلیم الدین احمد نے بھی وہی بات کہی مگر توڑ مروڑ کر۔ اگر اصل و نقل کا فرق ایک شاعر نہیں رکھتا تو وہ شاعر نہیں جو کر کہا جائے گا حالیؔ نے بھی تو یہی کہا اور واضح طور پر کہا ہے کہ:

"شعر اصلیت پر مبنی ہو اس سے یہ غرض ہے کہ خیال کی بنیاد ایسی چیز پر ہونی چاہیے جو درحقیقت کچھ وجود رکھتی ہو نہ یہ کہ سارا مضمون ایک خواب کا تماشا ہو کر ابھی تو سب کچھ تھا اور آنکھ کھلی تو کچھ نہ تھا۔"

اور پھر اصلیت پر مبنی ہونے سے ان کی کیا مراد ہے وہ اسے اور بھی واضح کرتے ہیں کہ:

"اصلیت پر مبنی ہونے سے یہ مراد نہیں ہے کہ ہر شعر کا مضمون حقیقت نفس الامر پر ہی مبنی ہونا چاہیے، بلکہ یہ مراد ہے کہ جس بات پر شعر کی بنیاد رکھی گئی ہے وہ نفس الامر میں یا لوگوں کے عقیدہ میں یا محض شاعر کے عندیہ میں فی الواقع موجود ہو۔"

قربات حسن بیان اور شعریت کی ہو رہی تھی جس کا براہ راست تعلق اثر آفرینی سے ہے اور یہ منحصر ہے موزونیت پر۔ موزونیت شعر کو بے پناہ شمشیر بنانے اور وجدان کو گل بوٹوں میں ڈھالنے میں شیرازہ کا کام کرتی ہے۔ شعر میں طرفگی، اعجوبیت اور اچھے پن کے لیے متناسب الفاظ اور الفاظ کی تراکیب کو بہت بڑا دخل ہے اور یہی سب مل کر شاعر کے لب و لہجے میں والہانہ پن اور فریفتگی پیدا کرتے ہیں مگر مکمل شعریت کے لیے شاعر کی شخصیت کا بھی عظیم ہونا ضروری ہے کیونکہ خیال، انداز بیان اور خود شاعر کی شخصیت کے ایک نکتہ پر جمع ہونے ہی سے شعریت وجود میں آتی ہے۔ سرورؔ صاحب کے "چونک اٹھنے" والی بات جو کہی یہ اظہار بیان کے اسی لب و لہجے پر منحصر ہے جو انتخاب الفاظ یا شعری قرینے سے تشکیل پاتی ہے متناسب الفاظ کا انتخاب اور ان کی مناسب ترتیب ہی کا نام شعری قرینہ ہے۔ سوداؔ کے اس شعر سے شعری قرینہ کے ساتھ شعریت کے وجود میں آنے والی بات واضح ہو جاتی ہے ؎

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

شعریت اور آئینہ الفاظ کے تعلق پر فراق گورکھپوری نے کیا خوب روشنی ڈالی ہے:

"عقل و خیال کیفیت کی ضد ہیں لیکن الفاظ شعر عقل و خیالات کی گرفت یا گرانباری سے سو فیصدی آزادی حاصل نہیں کر سکتے۔ اچھے سے اچھا شعر قریب قریب شعر ہوتا ہے یا شعریت کی طرف اشارہ کر کے رہ جاتا ہے۔ یہی کیا کم ہے۔ جہاں تک آئینۂ الفاظ یا ساغر الفاظ کا تعلق ہے حقیقی غزل کے اشعار کا حسن شعریت اور مادۂ کیفیت آئینہ گداز و جاں گداز ثابت ہوتے ہیں الفاظِ اشعار سوز شعریت میں پگھلتے نظر آتے ہیں کچھ مثالیں ملاحظہ ہوں

سوداؔ جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

"لفظ" اتنا "معنویت، شعریت، کیفیت و لطافت کی شدت سے تھرتھرا رہا ہے۔"

(ماہنامہ "نگار"، لکھنؤ۔ جنوری و فروری ۱۹۵۷ء اصناف سخن نمبر)

پیر کتاب "امارت")

"حسنِ خیال" اور "حسنِ بیان" میں شعریت کے لیے جو قدر مشترک ہے وہ ہے شاعر کا خود اپنا "حسنِ نظر" جو اس کی قوتِ متخیلہ پر اثر انداز ہوتا ہے۔ قدرِ مشترک بقول عطا دھلوی شعریت کی جان اور شاعری کی روح رواں ہے۔ کہتے ہیں:

"جتنی زیادہ حسنِ نظر شاعر میں ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ حسن آفرینی، دلکشی، دل آویزی، کششِ قلبی و جاذبیت اس کے تصورات اور ان کے مظاہر میں ہوگی۔ شاعر کا حسنِ نظر شعریت کی جان اور شاعری کی روحِ رواں ہے۔"

شعریت اور پھر مکمل شعریت پر بھی ان کے خیالات قابلِ قدر ہیں اور موضوع کا حق ادا کر دیتے ہیں کہ

"انسان کے خارجی تصورات و تخیلات اور داخلی جذبات و احساسات کو حسنِ بیان کے ساتھ لفظی جامہ پہنایا اس حسین اور لطیف اور موزوں عبارت آرائی کو جو دماغی و قلبی، داخلی اور خارجی پہلوؤں پر روشنی ڈالتی ہے حسنِ بیان اور صوتیاتی توازن رکھتی ہے ہم شعریت کہیں گے اور اس کا بہ تسوید سے شاعری تعبیر ہے

تسوید و تحریر میں ترنم، خوش آہنگی، صوتیاتی موزونیت، حسنِ تصور و تخیل اور حسنِ خیال اور حسنِ بیان کے ساتھ مکمل طور پر موزونیت تامہ رکھتی ہو جاتی شعریت یعنی شاعر کی ذہنی و نفسیاتی صلاحیت کے لیے طبع کی موزونیت اولیں وصف اور شعریت کا جزو لاینفک ہے۔ علم و فضل اور ذہنی صلاحیت کو ثانوی درجہ حاصل ہے:"

(ماہنامہ "آج کل" دہلی ستمبر ۱۹۶۳ء)

الغرض شعریت شعر کا معنوی و صوری حسن ہی نہیں بلکہ ان دونوں کا حسین امتزاج ہے اور اسی کے اقبال طالب ہوئے تھے ؎

جوہرِ طبیعت کو عطا کردہ آلی
جو حسن کی جگہ تاج سرِ عرش پہ خالی

اور جب شاعر اس عطیہ سے مالا مال ہو جاتا ہے تو اس کی تخلیق کیا بن جاتی ہے اقبال سے سنیے ؎

وہ شعر کہ پیغامِ حیاتِ ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگِ سرافیل



پریس رجسٹریشن آف بکس ایکٹ ۱۸۶۷ء (ترمیم شدہ ۱۹۵۶ء) کی دفعہ ۱۹(ڈی) کے قاعدہ ۸ کے مطابق ماہنامہ "نیا دور" کی ملکیت وغیرہ کے بارے میں مندرجۂ ذیل تفصیلات شائع کی جاتی ہیں

(۱) مقامِ اشاعت	لکھنؤ
(۲) وقفۂ اشاعت	ماہوار
(۳) پرنٹر کا نام، قومیت اور پتہ	شری اشوک کمار۔ ہندوستانی۔ سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ اینڈ اسٹیشنری، اتر پردیش، الہ آباد۔
(۴) پبلشر کا نام، قومیت اور پتہ	شری سردیش شرما۔ ہندوستانی۔ ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اتر پردیش۔ لکھنؤ۔
(۵) اڈیٹر کا نام، قومیت اور پتہ	شری خورشید احمد۔ ہندوستانی۔ اڈیٹر "نیا دور" محکمۂ اطلاعات۔ لکھنؤ
(۶) ان اصحاب کے نام جو اس رسالے کے مالک یا حصہ دار ہیں یا اس کے تمام سرمایے کے ایک فی صدی سے زیادہ کے حصہ دار ہیں۔	نیا دور سرکاری جریدہ ہے اس لیے اس کے بارے میں ان اصحاب کے نام اور پتے کا جو اس جریدے کے مالک یا حصہ دار ہیں یا ساری پونجی کا ایک فیصدی سے زیادہ کے حصہ دار ہیں سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

میں سردیش شرما اعلان کرتا ہوں کہ مندرجہ بالا تفصیلات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

(دستخط) سردیش شرما (پبلشر)





مہتاب رضوی

بدل کے بھیس محبت کی چوٹ اُبھر آئی
ہماری بات تمھاری زبان پر آئی

نخیبت ایک حسیں انقلاب کر آئی
ہمارے حال پہ آج ان کی آنکھ بھر آئی

کسی کو دیکھ کے بے چین ہو گئیں نظریں
کوئی دبی ہوئی چوٹ آج پھر اُبھر آئی

اُسے بھی مصلحتِ حُسن کہہ دیا ہم نے
تری نگاہ جو بدلی ہوئی نظر آئی

وہ زندگی جو عبارت ہے نامرادی سے
جدھر جدھر میں گیا ہوں ادھر ادھر آئی

جنھیں حقیر سمجھتے ہیں اہلِ دیر و حرم
انھیں میں کچھ ہمیں انسانیت نظر آئی

ترے کرم کی تجلی جسے کہا جائے
کبھی قریب کبھی دور پر نظر آئی

ترے خیال کی انگڑائی کہکشاں کی طرح
سنوارتی ہوئی یادوں کے بام و در آئی

بہت سی باتوں کے با وصف یہ خوشی ہے نہاں
غرورِ شام مٹاتی ہوئی سحر آئی



سید نقی علی ثاقب

دشت کی دھوپ ہے، جلتا ہوا سناٹا ہے
ہائے کس وقت مجھے تیرا خیال آیا ہے

رنگ بکھرے ہیں نہ ٹوٹا ہے طلسمِ زنداں
رات ابھی رات ہے احساس کہاں جاگا ہے

خنکیِ موسمِ گل ہے کہ ترے جسم کا لمس
نشۂ نیم شبی ہے کہ ترا سایہ ہے

غم کے اظہار سے روکے ہے اُدھر وحشتِ غم
اور اِدھر دل کا ہر اک زخم صدا دیتا ہے

میں وہ اک حرفِ سحر ہوں ورقِ دل پہ ندیم
آج تک موسمِ گل بھی جسے دہراتا ہے

دشتِ تنہائی میں مضرابِ یقیں ہے تری یاد
تیرے چھو لینے سے سناٹا کھنک جاتا ہے

زندگی رات ہے مقتل کی اسے کچھ نہ کہو
کرب وہ ہے کہ اجالوں کا بدن ٹوٹتا ہے

منشی مسیح الدین بریلوی مرحوم

جگر بریلوی

میرا لڑکپن تھا۔ ہم لوگ اپنے آبائی مکان میں رہتے تھے۔ ۱۹ء سے پہلے کی بات ہے۔ ایک صاحب لانبا قد ذرا خمیدہ اکہرا بدن۔ کھچڑی داڑھی سفید یا سیاہ شیروانی۔ چوڑی دار پاجامہ پہنے ترکی ٹوپی لگائے ایک چھوٹا سا بید ہاتھ میں ایک سفید پیلے دبلے پتلے ٹانگن پر سوار کوئی نو دس بجے صبح کے دروازے کے پھاٹک سے داخل ہوتے ہیں۔ ایک پاؤں ابھی رکاب میں ہے کہ زبان مبارک سے کوئی فارسی شعر یا دار بلند نکلا۔ ادھر سے میرے والد بزرگوار جو انھیں دیکھتے ہی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اسی طرح بلند آواز سے کوئی دوسرا فارسی شعر پڑھتے اور مصافحہ کرتے ہوئے لاکر اپنے قریب کرسی پر بٹھاتے ہیں۔ اب دونوں فدائیان فارسی زبان کی گفتگو میں قہقہے اور شعر خوانیاں دیکھنے اور سننے کے قابل ہوتی ہیں گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے صحبت رہتی۔ پھر وہ بزرگ اٹھ کر رخصت ہوتے۔ والد ماجد پھاٹک تک پہنچاتے۔ میں اس تمام وقت مبہوت سا بنا دیکھتا۔ میری سمجھ میں تو ان کی شعر خوانی کچھ نہ آتی، صرف اتنا ضرور جانتا تھا کہ فارسی زبان ہے۔ لیکن میرے دل و دماغ میں شراب کا سا نشہ سما جاتا تھا اور یہ کیفیت کافی دیر تک مسرور رکھتی بس جب کبھی ان بزرگوار کو آتے دیکھتا میں باغ باغ ہو جاتا۔ یہ تھے منشی مسیح الدین بریلوی مرحوم۔

والد ماجد ۱۹۱۹ء میں پریوی کاؤنسل لندن سے کئی لاکھ کی جائداد کا مقدمہ اپنے دو چھوٹے بھائیوں کے خلاف ہار گئے۔ یہ معمولی شکست نہ تھی۔ اس شکست نے تباہی، ویرانی، خانماں خرابی اور بربادی کے دروازے کھول دیے جن سے وہ سیلاب داخل ہوا کہ گراں قیمت ساز و سامان، بیش قیمت فرش فروش گھوڑے گاڑیاں وغیرہ سب بہا کر لے گیا۔

اسی سال موسم سرما میں بریلی میں وبائے طاعون نازل ہوئی۔ بہت لوگ شہر چھوڑ کر دور دور جا کر، جہاں جس کے سینگ سمائے آباد ہو گئے۔ مگر وبا کے دور ہوتے ہی اپنے اپنے گھروں کو واپس آ گئے، اطمینان و تسلی کا سانس لیا۔ مگر آہ ہم لوگ ایسے نکلے کہ پھر مکان سکونہ کی صورت بھی دیکھنا نصیب نہ ہوا۔ کرایہ کے مکانوں میں تھوڑے تھوڑے عرصے قیام کرتے رہے یہ بہت طولانی اور المناک داستان ہے جس کے بیان کرنے کا یہ موقع نہیں۔ یہ جانکاہ و روح فرسا ذہنیں ۱۹۲۴ء تک چلتی رہیں جنھوں نے آخر آخر والد ماجد کی آخری سانس بھی نکال کر دم لیا۔

حالات سقیم سے سقیم تر ہوتے گئے۔ ہاں میرا سلسلۂ تعلیم کسی نہ کسی طرح جاری رہا اور خدا کا شکر ہے کہ میں ۱۹۳۰ء میں بی۔اے فائنل میں آ گیا۔ میں نے فارسی ادب، انگریزی ادب اور فلسفہ لیا تھا۔ فارسی کی درسی کتاب میں ایسے ایسے سنگلاخ انتخاب نظم کے تھے کہ جن کا پڑھانے والا بریلی میں کوئی نہیں تھا۔ بریلی کالج کے فارسی کے پروفیسر ایک ملائے مکتبی سے زیادہ استعداد نہیں رکھتے تھے۔ شہر میں فارسی کے دو استاد معروف تھے ایک منشی قاسم علی خواہاں اور دوسرے مولوی رستم بیگ قیصر۔ اول الذکر سرکاری اسکول بریلی میں فارسی کے معلم بھی تھے۔ اکثر طلبا انھیں دونوں سے اپنی دشواریاں حل کیا کرتے تھے مگر اب کے فارسی کتاب اس قدر مشکل آئی تھی کہ یہ لوگ بھی اس کے پڑھانے سے اپنی معذوری کا اظہار کر چکے تھے۔

میں اور میرے ایک ہم جماعت سورگیہ منشی من موہن لال ماتھر جو بعد کو ایڈوکیٹ ہو کر بریلی میں آفتاب کی طرح چمکے، فارسی کتاب کا مطالعہ

ساتھ ساتھ کرتے اور اپنی فکر و فہم سے بہت سی دشواریوں کو آسان کر لیتے۔ مگر پھر بھی کچھ حصہ ایسا رہ گیا جو ہمارے لیے عقدۂ لاینحل بنا رہا۔ ادبی کی سطروں میں سوہن گھیدوالد کی فارسی دانی کے متعلق جو کچھ عرض کر چکا ہوں اس سے یہ تو نتیجہ قارئین نے نکال ہی لیا ہو گا کہ ان کو اس زبان کا کافی شوق تھا۔ اس جگہ عین مناسب ہو گا یہ اور اضافہ کر دیا کہ وہ فارسی کے عالم متبحر تھے۔ اسی کے نشے میں چور رہتے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ منجملہ اسباب ویرانی ایک فارسی کا شغف بھی تھا جس نے انھیں دنیا اور کاروبار دنیا سے ہمیشہ بے نیاز بنائے رکھا اور اصلاح حالات کی تدابیر سوچنے کی اجازت ہی نہیں دی۔

میں نے ایک روز ڈرتے ڈرتے ہمت کر کے عرض کیا کہ میری فارسی درسی کتاب میں متعدد مقامات ایسے ہیں جن کو سمجھنے کے لیے بہتیرا سر مغزن کرتا ہوں مگر سمجھ میں نہیں آتے۔ آپ انھیں کچھ بتا دیں تو تھوڑا تھوڑا روز پڑھ لیا کروں۔ فرمایا اور سچ فرمایا کہ میں فکروں کے مارے رات دن پریشان رہتا ہوں۔ دماغ چکراتا رہتا ہے تم منشی مسیح الدین کے پاس چلے جاؤ۔ کہنا ان کا بیٹا ہوں وہ ضرور تمھاری مشکلات آسان کر دیں گے۔

منشی مسیح الدین کون تھے؟ اور کہاں رہتے تھے؟ بریلی شہر سے نکل کر جو سڑک بریلی کالج کی طرف مڑتی ہے اس کے بائیں گوشہ کو ڈپٹی نصیرالدین کا احاطہ کہا جاتا تھا۔ یہ کافی وسیع رقبہ تھا اور یہاں پر ایک لوہار اور ادرتنا کی کے کارخانے کا پھیلاؤ رہتا تھا جو ٹوٹے ہوئے پہیّوں، گھوڑا گاڑیوں اور بہلیوں کی مرمت کیا کرتا تھا۔ جہاں اب بریلی کوتوالی کی شاندار عمارت ہے وہیں اسی احاطہ میں آثار الصنادید کی مثال ایک چھوٹی سی خستہ عمارت تھی اسی میں منشی صاحب مرحوم گوشہ گیر تھے۔

منشی مسیح الدین چنگی میں ملازم تھے۔ انگریزی سے نابلد۔ بزاز جو کپڑے باہر سے منگاتے تھے ان کی بلٹیاں دیکھنا اور جانچنا ان کا منصبی تھا۔ چونکہ اس کام کے لیے انھیں دکان دکان جانا ہوتا تھا انھوں نے ایک ٹٹو سفید رنگ کا رکھ چھوڑا تھا۔ وہ اپنے یابو پر سوار قدم قدم جا رہے ہیں اور ایک لڑکا جو طالب علم رئیس الدین جو بعد کو پاگل ہو گیا تھا اور ایک پوٹلی کپڑوں کی بغل میں دبائے قریاں پکڑا کرتا تھا، ان کے پیچھے پیچھے۔ اسے کے گوردس کی فارسی کتاب ہاتھ میں لیے چل رہا ہے جب تک کسی دکان پر بیٹھ کر اپنا فرض منصبی انجام دے لیتے

ہیں، تھوڑی دیر یہ طالب علم اپنی کتاب میں سے کچھ پڑھتا ہے اور سمجھتا ہے۔ اسی طرح تمام وقت دونوں شغل جاری رہتے۔ یہ میری آنکھوں دیکھی بات ہے۔ اور کل کی سی بات آج تک یاد ہے۔

ایک دن چار بجے شام میں منشی صاحب مرحوم کے دولت کدے، نہیں نہیں دولت کدے تو امرا کے مقسوم ہیں، انھیں عالموں کے آستانے کہنا چاہیے جہاں فرشتے سجدہ کرتے ہیں۔ اسی آستانے کی طرف گھر سے روانہ ہوا۔ اس آستانہ پر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ مرحوم تن تنہا ایک کھرّی چارپائی پر دراز ہیں اور چاروں طرف سناٹا ہے۔ اتنی گھنی آبادی اس وقت نہیں تھی جیسی اب ہے کہ چپہ چپہ پر شور و غل غوغا کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ آپ مجھے دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ میں نے جھک کر سلام کیا۔ اس کا جواب دیتے ہوئے پوچھا کون صاحب؟ عرض کیا ان کا بیٹا ہوں، فرمایا آؤ بیٹھو اور خود ذرا اوپر کو سرک گئے۔ پھر فرمایا کیسے آئے۔ میں نے اپنی مشکلات بیان کیں، ساتھ ہی ساتھ والد صاحب کی اور اپنی گفتگو بھی بیان کر دی اور اپنی حاضری کی علت غائی بھی۔ پوچھا کس کس فارسی انشا پرداز اور شاعر کے انتخاب تمھاری کتاب میں ہیں۔ عرض کیا انشائے ابوالفضل۔ اخلاق جلالی۔ اخلاق محسنی۔ سہ نثر ظہوری۔ چہار عنصر بیدل نثر میں اور جملہ ختم نہ ہو پایا تھا کہ بیدل کا نام گوش گزار ہوتے ہی ایک ترنگ میں آ کر بیدل کی غزل کا مطلع پڑھا ؎

ستم است اگر ہوست کشد کہ بہ سیر سرو چمن درا
تو ز غنچہ کم نہ دمیدہ در دل کشا بہ چمن درا

اتفاق سے مجھے بھی اس غزل کے کچھ شعر یاد تھے۔ میں نے شعر پڑھا ؎

بہ کدام آئنہ مائلی کہ ز فرصت ایں ہمہ غافلی
تو نگاہ دیدہ بسملی مژہ وا کن و بہ کفن درا

فرمایا صاحبزادے کچھ سمجھے بھی کہ شعر پڑھ ہی دیا۔ میں نے اپنی سمجھ کے مطابق معنی بیان کیے میری پیٹھ ٹھونکی اور کہا تمھیں کسی کی رہنمائی کی ضرورت نہیں۔ ماشاء اللہ تم خود ذہین ہو۔ تمام مشکلات حل کر لو گے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں ٹالتا ہوں۔ ہرگز نہیں۔ جب کبھی کوئی مقام بے سمجھے ہوئے ہو جائے میرے پاس چلے آنا۔ دوران گفتگو میں یہ شعر بڑے افسوس سے فرمایا ؎

کس نہ آموخت علم تیر از من
کہ مرا عاقبت نشانہ نہ کرد

(باقی صفحہ ۳۲ پر)



سید شوکت سرمد

چمن میں پھر خوشی کا دور آیا ہے
زمانہ پھر نوید عیش دیتا ہے
ہوا گلشن کی ہر سو ہے طرب افزا
بہار آئی ہے آیا روز ہولی کا

جوانی کی امنگوں کا یہ موسم ہے
نشاط و کامرانی کا یہ موسم ہے
مسرت کے پھریرے سب اڑاتے ہیں
خوشی سے ناچتے گاتے بجاتے ہیں

مرادوں کے بر آنے کا زمانہ ہے
جوانی کے لیے ہولی بہانہ ہے
فضا سے ہر طرف مستی برستی ہے
مے و ساقی کی خواہش بھی بھڑکتی ہے

مزاجِ حسن ہولی میں نکھرتا ہے
جنونِ عشق ہولی میں ابھرتا ہے
جہاں دیکھو وہاں رنگوں کا طوفاں ہے
غضب کا آج یہ رنگِ بہاراں ہے

عبیر و رنگ سے رخ ہو گیا گلگوں
حسینوں کا بنا ہے جسم بوقلموں
ہنسی ہے دل لگی ہے قہقہے بھی ہیں
پری زادوں کے ہر سو جمگھٹے بھی ہیں

بھلاتے ہیں غمِ ایام ہولی میں
بہت رنگیں ہیں صبح و شام ہولی میں
بنائے دوستی ڈالے وہ ہولی ہے
کرے جو دشمنی کو دور، ہولی ہے

مبارک ہو یہ ہولی اپنی بھارت کو
جواں کو پیر کو ہر مرد و عورت کو

آمد بہار

مختار حسین مختار

پھر نئے انداز سے آئی ہے گلشن میں بہار
ہے ہوا کیسی سبک موسم ہے کتنا خوشگوار
ہے فضا میں کیسی بھینی بھینی پھولوں کی مہک
عطر بیزی کر رہی ہے صحنِ گلشن میں بہار

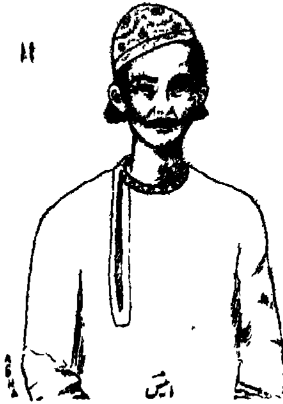
بلبلوں کے زمزمے کانوں میں پھر آنے لگے
کر رہی ہے صحنِ گلشن میں نوا سنجی ہزار
ہیں نئی پوشاک پہنے سب جوانانِ چمن
اور اوپر سے پڑے ہیں مختلف پھولوں کے ہار

محوِ آرائش کہیں پر تو ہے کوئی سیم تن
اور کہیں مصروفِ زیبائش ہے کوئی گل عذار
ہو کے دیوانہ کوئی صحرا کی جانب چل دیا
کر رہا ہے بیخودی میں کوئی جامہ تار تار

چھا رہا ہے سر پہ پھر ابرِ بہاری آج کل
ٹھنڈی ٹھنڈی چل رہی ہے پھر ہوائے خوشگوار
پھول کر مارے خوشی کے ناچتا پھرتا ہے وہ
صحنِ گلشن میں جو مالی کو نظر آیا نکھار

جس طرف دیکھو ڈھکے ہیں بور سے آموں کے پیڑ
آ گئی میوہ فروشوں کی امیدوں میں بہار
ہر غمی کے بعد شادی، بعد ہر شادی کے غم
انقلابِ روزمرہ ہے یہ دنیا کا مدار

شکر کیسے ہو ادا مختار اس اللہ کا
نعمتوں کا جس کی دنیا میں نہیں کوئی شمار



انیس

میر انیسؔ کا غیر مطبوعہ کلام

★ ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری

میر انیسؔ[1] ان خوش قسمت شعرا میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں جن کا دامنِ شہرت دامنِ قیامت سے وابستہ ہے۔ ان کی پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہو رہی ہے۔ ؎

خود نوید زندگی لائی قضا میرے لیے
شمع کشتہ ہوں فنا میں ہے بقا میرے لیے

انیسؔ کو شاعری ورثے میں ملی تھی۔ ان کے پردادا میر ضاحک، دادا میر حسنؔ، والد میر خلیقؔ، اور تین چچا میر خلقؔ، میر مخلوقؔ اور میر محسنؔ سبھی مسندِ شاعری پر فائز تھے اور مرثیہ کہتے تھے۔ انیسؔ نے بالکل بجا فرمایا ؎

عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں
پانچویں پشت ہے شبیرؑ کی مداحی میں

مراثی انیسؔ پہلی مرتبہ مطبع نولکشور لکھنؤ سے کئی جلدوں میں چھپے۔ اس کے بعد مختلف اوقات میں اسی مطبع سے کئی ایڈیشن شائع ہوئے نظامی پریس بدایوں سے بھی مجموعہ کلام انیسؔ تین ضخیم جلدوں میں آج سے کوئی ۴۰ سال پہلے بڑے سلیقہ اور عمدگی سے چھپا۔ پاکستان میں بھی یہ مرثیے چھپے لیکن اس کے باوجود انیسؔ کا کلام کمیاب ہوتا جا رہا ہے۔ اب معلوم ہوا ہے کہ دلی میں مرکز کی امداد سے جناب مالک رام صاحب کی نگرانی میں مجموعۂ کلام انیسؔ ترتیب دیا جا رہا ہے۔

میر انیسؔ کا بہت سا کلام ہنوز غیر مطبوعہ ہے۔ جناب سید مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم صاحب محمود آباد کے ذخیرۂ مراثی میں ان کے بہت سے قلمی اور غیر مطبوعہ مرثیے محفوظ ہیں۔ ذیل میں چند نایاب اور غیر مطبوعہ سلام درج کیے جاتے ہیں:

لحد میں سامنے جب دفترِ حساب آیا
گناہ دیکھ کے کیا کیا مجھے حجاب آیا

پیامِ مرگ ہے ہوئے سعید او عامل
کبھی سنا ہے کہ پیری گئی شباب آیا

پہاڑ ڈھونڈھتی ہے بخشش اے گنہگارو
خدا نے رحم کیا جب مجھے حجاب آیا

عطش نے تشنہ کے کلیجے میں آگ بھڑکا دی
مگر زباں پہ نہ حرفِ سوالِ آب آیا

عجب جگہ ہے زہے نعیں مرقدِ شبیرؑ
کہ نامراد گیا جو وہ کامیاب آیا

جہاں سے جاتے ہیں شیعہ تو کہتے ہیں قدسی
یہ قافلہ سوئے جنت بہت شتاب آیا

پکارتا ہے یہ رضواں خوشا نصیب آؤ
تمہارے لینے کو سرِ رند بوتراب آیا

چلو چلو کہ علی منتظر ہیں کوثر پر
ڈھونڈھو کہ بہشت بریں کا باب آیا

خطا کی راہ کو چھوڑا جو شہ کے مہماں نے
مصافحہ کو بہادر کے خود صواب آیا

سرِ حسینؑ گیا شام میں جو وقت سحر
پکاری خلق کہ نیزے پہ آفتاب آیا

چلے دغا کو جو دولہا بنے ہوئے قاسمؑ
مثلِ نے پھول تاروں کے آفتاب آیا

سیاہ خانۂ زنداں میں جب چلے عابدؑ
ہوا یہ شور کہ ظلمت میں آفتاب آیا

حسینؑ و حرؑ کی ملاقات تھی کہ عالمِ نور
ادھر سے چاند بڑھا تھا کہ آفتاب آیا

برہنہ سر وہ ہوئے دالضیب وہ قسمت
کہ اپنے سایے سے جن کو سدا حجاب آیا

ندا یہ آئی کہ گردن اٹھا کے دیکھ لے حرؑ
معانقہ کے لیے مالکِ الرقاب آیا

رخِ حسینؑ سے میں نے کبھی نہ دی تشبیہ
چمک کے سامنے سو بار آفتاب آیا

غمِ حسینؑ میں جب آہ کی تو برسے اشک
ادھر چمک گئی بجلی ادھر سحاب آیا

ورق الٹ گیا برہم ہوئی ہر اک صحبت
یہ کس طرح کا زمانے میں انقلاب آیا

---

[1] تفصیل کے لیے راقم کی کتاب "اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا" ملاحظہ فرمایئے۔

ادھر ہلے لبِ سرور دعا سے باراں میں ادھر فلک پہ گرجتا ہوا سحاب آیا
ظہورِ نورِ محمدؐ ہوا خلیل کے بعد چھپا جو چاند زمانے میں آفتاب آیا
حسب آفتاب میں نکلے محمدِ عربی تو چتر ان کے سر پاک پر سحاب آیا
نہ سر اٹھا یو بحرِ جہاں میں اے غافل صدا یہ دے گیا پانی پہ جب حباب آیا
وہ کیا نمود کرے آہ بحرِ ہستی میں جو ایک دم کے لیے صورتِ حباب آیا
فلک یہ شور تھا پہنچے جو کربلا میں حسینؑ کہ اپنی خاک پہ فرزندِ بو تراب آیا
جہاں میں رہتی ہے گردش دلوں کی تا مدت سحر کو چاند چھپا دن کو آفتاب آیا
دلا حجاب کر اب تو سیاہ کاری سے سفید بال ہوے موسمِ خضاب آیا
پدر کی پیاس کو بھولے نہ ایک دم عابدؑ چھری جگر پہ چلی جب خیالِ آب آیا
ورق ہیں مصحفِ ناطق کے اکبر و اصغر حرے عدیل ہے سوارا، تو لاجواب آیا
شب آئی جب تھے یہ نانی سے کہتی تھیں صغرا کہ دم الجھنے لگا وقتِ اضطراب آیا
نہ موت آتی ہے مجھ کو نہ نیند آتی تھی اجل کو آئی اجل خواب کو بھی خواب آیا
وہ کہتی تھیں کہ میں قربان جاؤں لیٹ رہو یہ کیا غضب ہے شب آئی کہ اک عذاب آیا
جو زیست ہے تو خدا کاٹ دے گا مدتِ غم سنو گی اب کہ جگر بندِ بو تراب آیا
کسی کا کون ہے اکبر جب ہم کو بھول گئے گیا تھا جلد سو قاصد بہت شتاب آیا
رہا نوں گی علی اکبر مجھے بھلا ہیں گے نعل ہیں قبر کی جب منہ گیا تو جواب آیا
اٹھائے شہ نے کلیجے پہ جب پیمبرؐ داغ تو سید الشہداؑ عرش سے خطاب آیا
زمیں پکاری لحد میں اتارا جب مجھ کو زہے نصیب علامِ ابو تراب آیا
ادھر ہلے لبِ منکر نکیر بہرِ سوال مری زباں پہ برابر ادھر جواب آیا
اٹھائی لذتِ تلخیِ تنگنائے جہاں عرق عرق ہوا شیشے میں جب گلاب آیا
خوشا نصیب تھے حرؑ کے عجب تھا بختِ رسا نکل کے کفر سے سوئے رہِ صواب آیا
غش آگیا یہ نہ جانا کے رنڈی واہ رے صبر دولہن کو دولہا کے لاشہ پہ بھی حجاب آیا
لحد میں صیان جو تھا فاطمہ کے پھولوں کا اڑھائی چادرِ گل جب مجھے تو خواب آیا
زمین کہتی تھی میت کے دیکھ قبر کو دیکھ کہاں تھا تو کدھر اے خانماں خراب آیا
وطن میں جاؤں گا کس منہ سے کہتے تھے عابدؑ علی کے لال کو مٹی میں گاڑ داب آیا
ہیں ایک حال پہ تسبیر خدا کے در کے فقیر خبر نہیں کہ گیا کب کب انقلاب آیا

کوئی بھی سوتا ہے پیری میں اسقدر غافل
اٹھو انیسؔ اٹھو سر پہ آفتاب آیا

جگر نبائی جو کثرت میں سانس لینے کی میانِ بحرِ فنا دم بخود حباب آیا

زمیں کا زرد چلا خاک بھی نوبتِ نثار مری زباں پہ جو نامِ ابو تراب آیا
اٹھے سب مرے مضمون پڑھے مرے آگے مزا تو یہ ہے کہ اس پر بھلے حجاب آیا
وہ لوگ کون تھے بھیجا سلام جب شہ پر ضریح قبلہ کونین سے جواب آیا
طبیب شرح تو دیکھ کر بن گیا صرکو نجف کی راہ میں جب شیشۂ گلاب آیا
خیال ہے سری زلفِ شہ کا سودا واہ چمن تو کیا مجھے سنبل پہ پیچ و تاب آیا
جہاں سے ہم اسی حسرت میں پیر ہو کے چلے نہ عمرِ رفتہ پھر آئی نہ پھر شباب آیا

الٹ گیا نہ فقط لکھنؤ کا اک طبقہ
انیسؔ ملکِ سخن میں بھی انقلاب آیا

(۲)

ہم اُن کا بحرِ مصیبت میں نام لیتے ہیں جو ڈوبتے ہوئے بیڑے کو تھام لیتے ہیں
سحر کو اٹھ کے زباں سے یہ کام لیتے ہیں خدا کے بعد محمدؐ کا نام لیتے ہیں
پہنچ کے خلد میں پیاسے حسینؑ کے رفقا علیؑ کے ہاتھ سے کوثر کا جام لیتے ہیں
یہ زائرانِ امامِ زمن کا رتبہ ہے کہ حق کے سبطِ محمدؐ سلام لیتے ہیں
خوشا سحال کہ آقا کی اک زیارت میں ثوابِ حج کا علیؑ کے غلام لیتے ہیں
نکل کے فوج سے حرؑ نے کہا کہ اے غافل جناں کی راہ علیؑ کے غلام لیتے ہیں
کوئی گھڑی میں ہوا کی طرح اڑا کے فرس رکابِ شاہ کو اب حل کے تھام لیتے ہیں
لسیر کے ہر میں حسن قت درد اٹھتا ہے جگر کو بیٹھ کے شمشیر تھام لیتے ہیں

انیسؔ ظلم سے اعدا کے مہدیِ ہادی
ظہور کر کے بس اب انتقام لیتے ہیں

(۳)

غنچے ہیں اس چمن میں اگر زر لیے ہوئے بھرائی اپنی چشم نے گوہر لیے ہوئے
مجلس میں بہرِ نذرِ شہنشاہ کربلا دستِ مژہ ہے سبحۂ گوہر لیے ہوئے
سر ننگے نکلیں بی بیاں ڈیوڑھی پہ جب گئے بیٹے کی لاش سبطِ پیمبرؐ لیے ہوئے
بھائی کی لاش پر جو گئے سرورِ امم گودی میں تھے سکینہ کو اکبر لیے ہوئے
عبرت کی ہے یہ جا کہ گیا جانبِ عدم دنیا سے خالی ہاتھ سکندر لیے ہوئے
کہتے تھے شاہ دیکھیے کیا ہو مآلِ کار جاتا ہے کربلا کو مقدر لیے ہوئے
عباسؑ حرؑ سے کہتے تھے دیکھا اپنا مرتبہ ہے تیرے سر کو زانو پہ سرور لیے ہوئے
نکلے ہے وقتِ جنگ یہ فرماتے تھے حسینؑ گھوڑے کی باگ علی اکبرؑ لیے ہوئے
عزّ وقت نزع کہتا تھا سولا ترے نثار حوریاں کھڑی ہیں شربت کی ساغر لیے ہوئے

بکھرے گیسو رن میں تو سہرے نظارہ تھے — ہاتھوں میں برچھیوں کو ستمگر لیے ہوئے
یوسف چھپائے تھے منہ اپنا نقاب میں — حیراں تھا آئینہ کو سکندر لیے ہوئے
حوریں کھڑی ہیں منتظرِ حُرِّ تشنہ لب — ہاتھوں میں اپنے ساغرِ کوثر لیے ہوئے
عباس مشک بھر کے بڑھے جب تو بولے شاہ — بھائی ہیں آج دوش پہ کوثر لیے ہوئے
روتی تھی بنت فاطمہ بکھرا کے سر کے بال — ہنستا تھا شمر ہاتھ میں جلاد لیے ہوئے
مانند ابر روتے تھے دریا پہ شاہ دیں — ہاتھوں میں اپنے دست برادر لیے ہوئے
کس کو ملے یہ صبر کے جوہر بجز حسینؑ — کھلتے تھے زخم تیغ دو پیکر لیے ہوئے
ہنستے تھے کس شکوہ سے زہرا کے لاڈلے — ہاتھوں میں نیمچوں کو برابر لیے ہوئے
کہتے تھے شاہ شوکت عباس دیکھ کر — گویا علم ہیں دوش پہ جعفر لیے ہوئے
آئے بہر شاہ جبینِ شہادت پہ کے ساتھ — مٹھی میں نقد جان علی اصغر لیے ہوئے
اللہ رے زور بازوئے دست خدا کا ردر — دو انگلیوں پہ تھے درِ خیبر لیے ہوئے
آواز فاطمہ تھی دی شہ کو وقت ذبح — آتی ہوں لاش محسن بے سر لیے ہوئے
آنکھیں پھرا کے دیکھتے ہو کیا ادھر ادھر — اماں تو دیر سے ہے ترا سر لیے ہوئے
ذبح نبی پکاری بس اب ہاتھ تھام لو — مارا کھڑا ہے قتل کا محضر لیے ہوئے
نیزے پہ تھا جو دھوپ میں سبطِ نبی کا سر — سورج مکھی تھا مہرِ منور لیے ہوئے
کعبہ میں بہرِ بت شکنی واہ رے عروج — کاندھے پہ تھے علی کو پیمبرؐ لیے ہوئے

چھیڑا اسد طبع کو تعریف شہ میں جب
مضموں خود آیا سامنے لشکر لیے ہوئے

(۴)

خاکِ درِ شبیر ہے جاگیر ہماری — اے عجبی کیا خوب ہے تقدیر ہماری
صحرا میں رکا اسپ تو شہ رو کے پکارے — تربت بھی یہیں ہووے گی تعمیر ہماری
شہ کہتے تھے اعدا سے پلاؤ ہمیں پانی — حالت ہے بہت پیاس سے تغییر ہماری
وہ کہتے تھے پانی کا تو مذکور نہیں ہے — ہے تشنۂ خوں آپ کی شمشیر ہماری
کہتی تھی سکینہ ہمیں لا دیجیے پانی — ہے خشک زباں یا شہ دلگیر ہماری
شہ نے کہا مجبور ہیں لاچار ہیں بیٹا — سنتا نہیں یہ لشکر بے پیر ہماری
کبریٰ نے کہا بیاہ کے دن رانڈ ہوئے ہم — کیا سو گئی اے صاحبو تقدیر ہماری
مسلم نے کہا سر تو قلم کرتے ہو اعدا — پر لاش نہ تم کیجیو تشہیر ہماری
شہ کہتے تھے اعدا ہمیں مجبور نہ سمجھیں — چلتی ہے تو رکتی نہیں شمشیر ہماری
آواز نبی آتی ہے امت کو نہ مارو — خاطر ہے جو یا حضرتِ شبیر ہماری
کہتے تھے یہ لاشہ اکبر پہ رو رو — افسوس کہ اب مٹ گئی تصویر ہماری
کہتی تھی سکینہ کہ چچا منہ نہ چھپاتے — گر مشک نہ ہوتی ہدفِ تیر ہماری
تھا دھیان دم ذبح بھی یہ شاہِ امم کا — خیمے سے نکل آئے نہ ہمشیر ہماری
عابد نے کہا ہم کو نہیں طاقت رفتار — اور اس پہ کئی من کی ہے زنجیر ہماری
شہ کہتے تھے کیوں ذبح میں کرتا ہے تامل — ثابت ہے بتا کون سی تقصیر ہماری
آتی تھی صدا رن میں گلوے تر دیں سے — گردن تو نہ تھی لائق شمشیر ہماری
سمجھے نہ ہمیں اپنے پیمبرؐ کا نواسا — کاٹی گئی گردن دم تکبیر ہماری

ہوتی ہے جو مشکل تو انیسِ جگر افگار
کرتے ہیں مدد حضرتِ شبیرؑ ہماری

(۵)

مجرائی رو کے کہتی یہ زہرا کی جائی ہے — سر کاٹا میرے بھائی کا ماں دہائی ہے
کہتا تھا شمر فوج سے لڑنا سمجھ کے آج — عباس ہے یہیں یہ علی سے لڑائی ہے
کہتے تھے شاہ بچوں کی کیونکر بجھے گی پیاس — دریا پہ ناریوں نے تو چوکی بٹھائی ہے
اکبر جو آیا رن میں تو لشکر سے بولا شمر — اس کو بھی مار لو تو پھر آگے صفائی ہے
بانو پکاری شاہ کو ڈیوڑھی پہ آن کر — میری تمام عمر کی لٹتی کمائی ہے
دوڑو خبر لو بیٹے کی اے فاطمہ کے لال — برچھی ستم کی سینہ پہ اکبر نے کھائی ہے
کہتی تھی بانو بی سے رباب مارے پیاس کے — اصغر کو میرے مردنی چہرے پہ چھائی ہے
زینب پکاری کر کے مونہہ اپنا سوئے نجف — جلد آئیے یا علیؑ دم مشکل کشائی ہے
کچھ بس نہیں ہے چلتا کھڑی دیکھتی ہوں میں — بھائی پہ میرے فوج ستم کی چڑھائی ہے
گھر مصطفیٰ کا ہوتا ہے برباد ظلم سے — رن میں بتول پاک کی لٹتی کمائی ہے
بانو یہ بین کرتی تھی اصغر کی لاش پر — واری گئی یہ ماں ترے لاشے پہ آئی ہے
ہرگز نہ ہو گا صاحبِ اولاد وہ لعیں — جس نے یہ خاک تیری ہی صورت ملائی ہے
زینب پکاری سبطِ نبی کا نہ کاٹ سر — اے شمر ڈر خدا سے یہ کیا بے حیائی ہے
جو شہ کے سر کو پوچھتا زینب یہ کہتی تھی — لوگو میں کیا بتاؤں کہ یہ میرا بھائی ہے
حاکم نے پوچھا شمر سے اپنا جو منہ چھپائے — یہ کون ہے جو شام کی بندی میں آئی ہے
بولا یہ شمر خواہرِ شبیر ہے یہی — زینب اسی کا نام ہے زہرا کی جائی ہے

مداح ہے جو سبط پیمبرؐ کا اے انیس
بے شبہ اس کی خلد بریں تک رسائی ہے

(۶)

کب بزم غم میں شہ کے سلامی کو کل پڑے — جب تک نہ آہ سرد کے ساتھ اک دل جلے

سر کیوں نہ روز عقدہ کشا دیوے وہ بلا — اس طرح جب غریب کے پیچھے اجل پڑے
عباس شہ سے کہتے تھے بھائی قبول ہے — گر مجھ پہ لاکھ تیغ تمہارے بدل پڑے
بانو نے جب سنا علی اکبر ہوئے شہید — نزدیک تھا کہ منہ سے کلیجہ نکل پڑے
خنجر کے نیچے کہتے تھے شبیرؑ یہ دعا — امت کی مغفرت میں یا رب خلل پڑے
یا فیوں نے کاٹ کے تھا شجار باغ دیں — تھے ان میں لاکھوں خوں بھرے تیغوں کے پھل لگے
میداں میں خون بھرے ہوئے لاشے شہیدوں کے — کرتے تھے شکر نعمت ادا عزوجل پڑے (کذا)[۱]
آیا جو سر حسین کا آگے یزید کے (ق) — جس کی نگاہ جا پڑی آنسو نکل پڑے
کھولے چھڑی سے ہونٹ جب اس نے حسین کے — زینب پکار اٹھی کہ ترا ہاتھ گل پڑے
دریا سے روتے گئے منہ پھیرے اہل بیت — تا پانی کے لیے نہ سکینہ مچل پڑے
زنداں میں بیٹھیں زینبؑ و کلثوم کیوں فلک — اور ان کے ہوں مدینے میں خالی محل پڑے
فریاد بن حرم کی یہ کہتے تھے اہل شام — شاید یہ لوگ قید ہیں پہلے ہیل پڑے

ایسا سلام نظم کیا تو نے اے انیس
جو اہل فہم اس کو سنے اور اچھل پڑے

(۷)

سلامی چشم میں آنسو ہیں یا دریا چھلکتا ہے — جگر کے داغ ہیں یا کھیت لالہ کا لہکتا ہے
دم تحریر گلریزی ہے یا سطریں ہیں کاغذ پہ — صریر کلک ہے یا باغ میں بلبل چہکتا ہے
چلے تھے کربلا کی راہ کو پہچان کر حضرت — دگر رہبر عالم کسی رستا کھٹکتا ہے
حرم روئے کہا جب آسماں کو دیکھ کر ترنے — علی اکبر اداں دو صبح کا تارا چمکتا ہے
کہا صغرا نے شاید میرے بابا جان پیاسے ہیں — گلے میں ساتویں تاریخ سے پانی اٹکتا ہے
زمین کربلا پر فاطمہ کے پھول بکھرے ہیں — شہیدوں کی یہ خوشبو ہے کہ رستہ جنگل مہکتا ہے
شہ دیں دیکھتے ہیں شوق حرمین لعل کو میداں — کہ جیسے کوئی آنے کی کسی کی راہ تکتا ہے
علی اکبر طلب کرتے تھے رخصت کوئی کیا جانے — لگی ہے ماں کو ہچکی غم سے دل زینب کا دھکتا ہے
گل زہرا کے غم میں نوحہ خواں ہیں بلبلیں ساری — صدا فریاد کی آتی ہے جب غنچہ چٹکتا ہے
وہاں بٹتا ہے غلہ قحط ہے یاں آب و دانے کا — ادھر فاقہ ہے اور کھانا وہاں لشکر میں پکتا ہے
تن رنجور پر ہاتھ اپنا زینبؑ رکھ نہیں سکتی — تپ غم سے بدن سجاد کا ایسا دہکتا ہے
کہا بانو نے شہ سے تیر چلتے ہیں کلیجے پر — مرا ہو نہ جب یہ بچہ نرگسی آنکھوں سے تکتا ہے
یہ ننھے ننھے دونوں تھے بن کھانے میں تیغیں ہیں — سو لے ہو گئے ہیں ہچکیوں تا لو لعیکتا ہے

مرثیہ دار یہ گردن ڈھلی جاتی ہے بن پانی — گلے میں سانس جب رکتی ہے سر ڈھلکتا ہے
بچا لو واسطہ زہرا کا صاحب میرے اصغر کو — دبھائی تو نہیں لیتا ہے نہ اب آنکھیں جھپکتا ہے
دغا میں حضرت عباس یوں جاتے ہیں دشمن پر — گرسنہ شیر جیسے جانب آہو لپکتا ہے
ہے زہرا کی صدا آتی ہے یوں جا کے پھٹکو — الٰہی پانی کوئی لا دو مرا بچہ بلکتا ہے
اندھیرے سے جو گھبراتا ہے ہم ایام گرما ہے — ہر اک بچہ زنداں پہ سر دے کے پٹکتا ہے

انیس اللہ تجھ پر سہل کر دے قبر کی منزل
لحد کا دھیان جب آتا ہے کیا کیا دل دھڑکتا ہے

میر انیس نے کتنے سلام کہے تھے اس کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ان کے مطبوعہ مجموعہ مراثی میں چند سلام شامل ہیں۔ نظامی پریس لکھنؤ کے مالک نے چھوٹے سائز ۲۰×۳۰ میں میر انیس کے ۴۸ سلاموں کا انتخاب شائع کیا ہے غالباً صاحب مطبع کو اتنے ہی سلام دستیاب ہوئے تھے کیونکہ انتخاب اچھا نہیں ہے۔

میر انیس کے انتقال کے صرف ۴ سال بعد میر غلام علی نے ۱۲۹۶ھ میں گلبرگہ حیدرآباد میں میر خلیق، میر انیس، میر مونس اور میر نفیس کے چند مرثیے اور کچھ سلام مرتب کیے تھے۔ بعد میں یہ مجموعہ مراثی ذخیرۂ شوا کے نام سے سید اسداللہ عرف میر نواب کی فرمائش سے سید مستجاب حسین نے اپنے مطبع دار الصنائع گلبرگہ میں ۱۲۹۷ھ ہجری میں شائع کیا "تاریخ طباعت" یا ظہور ہے۔ اس میں میر انیس کے سات سلام درج ہیں۔ ذخیرۂ شوا اب نایاب ہے۔ اس کا ایک نادر الوجود نسخہ دار العلوم ندوہ میں محفوظ ہے۔

اسی سال سید محمد عنایت حسین تخلص متین، سامانی سہارنپوری نے سلاموں کا مجموعہ شمع تعزیت کے نام ۱۲۹۷ھ ہجری میں شائع کیا شمع تعزیت کتاب کا تاریخی نام ہے جس سے ۱۲۹۷ ہجری برآمد ہوتے ہیں۔ یہ کتاب بھی بڑی نایاب ہے۔ اس کا غالباً واحد نسخہ جناب سید مسعود حسن رضوی کے کتب خانے میں موجود ہے۔ اس میں انیس، مونس، نفیس، اوج، آباد، دبیر، خلیق، فصیح، دلگیر، ضمیر، ناظم، افسردہ، قاسم، وغیرہ کے ۵۲۰ سلام درج ہیں۔ کتاب بڑے سائز میں ۵۰۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

جناب راجہ صاحب محمود آباد کے ذخیرۂ مراثی میں میر انیس کے

[۱] مصرع غالباً اس طرح ہوگا: کرتے تھے شکر نعمت عزوجل پڑے۔ لفظ ادا کتابت میں زائد ہے۔

سلاموں کا ایک قلمی اور غیر مطبوعہ دیوان محفوظ ہے راقم الحروف نے اس سے استفادہ کیا ہے۔ ذیل میں ہر سلام کے مطلع کا پہلا مصرعہ ردیف و تعداد اشعار درج کیا جاتا ہے۔ دیوان سلام میں مذکورہ بالا سلام درج میں ہیں نسخۂ مسعود سے مطلب وہ سلام جو سید مسعود حسن صاحب رضوی کے کتب خانے میں ہیں شمع تعزیت اور ذخیرۂ ثواب سے مراد سلاموں کے وہ مجموعے جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔

نمبر شمار	مطلع	ردیف	تعداد اشعار	کیفیت
۱	اسی کا نور ہر اک شے میں جلوہ گر دیکھا	دیکھا	۲۱	نسخۂ مسعود نامکمل، شمع تعزیت ۱۹ شعر
۲	پڑا جو عکس تو ذرہ بھی آفتاب سا	سا	۱	
۳	دل سیر ہے گدائے جناب امیر کا	کا	۲۴	شمع تعزیت ۲۵ شعر[له]، نسخۂ مسعود میں کمی ہے۔
۴	غم شہ کا حسن نے بیان کر دیا	کر دیا	۱۸	
۵	گذر گئے تھے کئی دن کہ گھر میں آب نہ تھا	نہ تھا	۲۴	ذخیرۂ ثواب ۱ شعر
۶	علی سا بھی نہ کوئی عادل زمانہ ہوا	ہوا	۲۴	شمع تعزیت ۲۲ شعر نسخۂ مسعود
۷	صبر کرتے تھے سلامی شہ والا کیا کیا	کیا کیا	۳۲	شمع تعزیت ۲۶ " نسخۂ مسعود
۸	بیکسی کا شہ کی چرچا رہ گیا	رہ گیا	۲۲	
۹	گھر سے جب زوار دو منزل گیا	گیا	۱۲	
۱۰	حسین یوں ہوئے اے مجرئی وطن سے جدا	سے جدا	۱۸	شمع تعزیت ۱۲ شعر
۱۱	اے مجرئی ہے سب کا مقدر جدا جدا	جدا جدا	۳۲	مطبوعہ نظامی میں ۱ شعر
۱۲	بھرا ہے غم شہ سے سینہ ہمارا	ہمارا	۲۳	نسخۂ مسعود ۱۶ شعر، نسخۂ ثانی ۸ شعر، شمع تعزیت ۱۴ شعر
۱۳	مجرئی شاہ کا ہوں خلد میں ہے گھر میرا	میرا	۳۱	
۱۴	آب خنجر سے گلا جب شاہ کا تر ہو گیا	ہو گیا	۲۰	
۱۵	کسی کو مجرئی ہمدم نہ ہنگام اجل پایا	پایا	۲۲	
۱۶	لحد میں سامنے جب دفتر حساب آیا	آیا	۳۱	
۱۷	مجرئی رن میں شہ پہ ستم بے حساب تھا	تھا	۱۱	شمع تعزیت ۱۱ شعر
۱۸	مجرئی ڈیوڑھی پہ زینب نے جو آ کر دیکھا	دیکھا	۱۷	
۱۹	مجرئی جس نے مزار شہ ذیشاں دیکھا	دیکھا	۲۴	شمع تعزیت ۲۱ "
۲۰	بینا جو ہر اک دیدۂ بینا ہے ہمارا	ہمارا	۹	شمع تعزیت ۹ "
۲۱	مجرائی جبکہ شہ نے سر اپنا کٹا دیا	دیا	۲	
۲۲	مجرئی شہ کے عوض رن میں جو تھا سر دیتا	دیتا	۴۲	
۲۳	کیا کیا نہ زمانے میں سنا، کیا نہیں دیکھا	دیکھا	۲۶	نسخۂ مسعود ۹ شعر
۲۴	رو کے کہتی تھیں زینب یہ رن میں	میں		
	ہائے زہرا کے پیارے حسینا		۷	مستزاد نوحہ
۲۵	سنبل ترسے پریشاں زلف اکبر دیکھ کر	دیکھ کر	۱۸	
۲۶	مجرئی صدقے ہوں اس درگاہ	پر	۱۸	

له مخطوطے میں یہ پانچواں شعر نہیں ہے

نمبر شمار	مطلع	ردیف	تعداد اشعار	کیفیت
۲۷	ہر چشم ہے مجرائی کی دریا کے برابر	کے برابر	۳۱	نسخۂ مسعود ۱۹ شعر، شمع تعزیت ۱۶ شعر
۲۸	شہ کہتے تھے جنگاہ سے آؤ علی اکبر	علی اکبر	۱۴	نوحہ
۲۹	کہتی تھی صغرا یہی اے مرے بے سر پدر	پدر	۱۱	نوحہ
۳	کچھ اور حرم سمجھ نہیں اہل سخن کے پاس	کے پاس	۱۴	شمع تعزیت ۱۴ شعر
۳۱	جو شاہ زمیں معلّیٰ زہے عصائے نجف	نجف	۱۱	
۳۲	ستم کو سنایا مجرائی اعدائے یاں تلک	تلک	۲۶	
۳۳	اے سلامی تیغ دشمن کارگر ہوتی نہیں	ہوتی نہیں	۱۸	
۳۱	شبیرِ امام زماں کھینچتے ہیں	کھینچتے ہیں	۳۸	نسخۂ مسعود ۱۶، نسخۂ ثانی ۲۶ شعر
۳۵	مرا مار دل آشکارا نہیں	نہیں	۱۵	مطبوعہ نظامی ۱۱ شعر
۳۶	ضبط گریہ ماتم سرور میں ہو سکتا نہیں	سکتا نہیں	۱۵	ذخیرۂ نقوش ۵، نسخۂ مسعود ۱۱ شعر
۳۷	سلامی کی حسرت کا چارہ نہیں	نہیں	۳۹	شمع تعزیت صد ۲۷ ، ۴۰ شعر
۳۸	رنج دنیا سے کبھی چشم اپنی نم رکھتے نہیں	رکھتے نہیں	۱۹	
۳۹	شبیر کے غم میں رو رہے ہیں	رہے ہیں	۱۳	ذخیرۂ نقوش ۱۸ شعر
۴۰	شاہ تنہا ہیں مددگار نہیں	نہیں	۱۸	
۴۱	یہ منصب سے غرض نے خواہش جاگیر رکھتے ہیں	رکھتے ہیں	۱۸	
۴۲	اشکوں کا شور ہے مری چشم پُر آب میں	میں	۲۶	
۴۳	خودرو خود کو عاقل حساب سمجھے ہیں	سمجھے ہیں	۳۴	
۴۳	السلام اے لحدِ اقدس و اعلائے حسین	حسین	۴۰	
۴۵	تحریر کی جو مجرائی شہ کے علم کی شان	کی شان	۱۱	
۴۶	زرد چہرہ ہے نحیف و زار ہوں	ہوں	۳۸	مطبوعہ نظامی ۱۳ شعر
۴۷	کہتی تھیں زینبِ دل خستہ میرے سر حسین	حسین	۹	نوحہ
۴۸	دور کر دیتا ہے اک ذرہ سب آزاروں کو	کو	۱۴	
۴۹	حسرت کا حلق مجرائی پانی سے تر نہ ہو		۲۳	
۵	سدا ہے فکرِ ترقی بلند بینوں کو	کو	۳۵	مطبوعہ ۱۳ شعر
۵۱	سلامی کہتے تھے اعدا رلاؤ زینبؑ کو	زینب کو	۳۲	نسخۂ مسعود میں خلیق کے نام منسوب ہے لیکن ایک اور نسخے میں انیس کا تخلص مقطع میں درج ہے اس میں ۲۷ شعر ہیں
۵۲	شہ کی یاد آتی ہے جب تشنہ دہانی مجھ کو	مجھ کو	۱۱	
۵۳	مجرائی فوج یوں تھی شہ کربلا کے ساتھ	کے ساتھ	۲۹	نسخۂ مسعود ۲۲ شعر ناتمام، شمع تعزیت ۲۶ شعر
۵۴	سر تھے نیزوں پہ سلامی سرِ شبیر کے ساتھ		۲۶	
۵۵	کوئی انیس کوئی آشنا نہیں رکھتے	نہیں رکھتے	۳۲	
۵۶	ابتدا سے ہم ضعیف و ناتواں پیدا ہوئے	پیدا ہوئے	۱۳	نسخۂ مسعود اول و دوم ۱۱ شعر و نسخۂ دیگر ۱۲ شعر

نمبر شمار	مطلع	ردیف	تعداد اشعار	کیفیت
۵۷	سلامی چشم سے دہ رہ کے خون دل ٹپکتا ہے	ہے	۲۲	نسخۂ مسعود ۲۲ شعر
۵۸	غبار رہ کربلا ہو گئی	ہو گئی	۳۰	
۵۹	بکا میں کئی شب سحر ہو گئی	ہو گئی	۱۳	
۶۰	جو رہے جن کسی سے تو لا نہ چاہیے	رہ چاہیے	۳۰	
۶۱	صورت آئینہ استغنا کے جوہر کھل گئے	کھل گئے	۶	
۶۲	مجرئی قید سے جب عابد بے پر چھٹے	چھٹے	۳۳	
۶۳	سلامی ملک کا آغاز و انجام اس پر ظاہر ہے	ہے		
۶۴	عجب وقت ہے اور عجب انجمن ہے	ہے	۴۲	نسخۂ مسعود ۲۵ و نسخۂ دیگر ۴۴ شعر
۶۵	خیال چہرہ شب وقت خواب رہتا ہے	رہتا ہے	۱۱	نسخۂ مسعود ۵ شعر
۶۶	ذکر جو قد قامتِ شاہ جو چل جائے اٹھی	جائے اٹھی	۱۵	شمع تعزیت ۱۲ شعر
۶۷	مثال بدر جو حاصل ہوا کمال مجھے	مجھے	۳۳	ذخیرۂ ثواب ۱۱، نسخۂ مسعود ناقص، شمع تعزیت ۲۶
۶۸	مجرئی جبکہ ماہ عزا ہوتا ہے	ہوتا ہے	۲۵	نسخۂ مسعود ۱۷، نسخۂ دیگر ۲۳ شعر
۶۹	گرد ہے اکسیر خاکِ کربلا کے سامنے	سامنے	۱۵	نسخۂ مسعود ۱۴ شعر
۷۰	اے سلامی یوں ارم ہے کربلا کے سامنے	کے سامنے	۲۶	
۷۱	گنہ کا بوجھ جو گردن پہ ہم اٹھا کے چلے	کے چلے	۱۵	نسخۂ مسعود ۱۷، نسخۂ دیگر ۷ شعر
۷۲	سین اے مجرئی قاسم کی دلہن کیا جانے	کیا جانے	۲۱	
۷۳	غم حسین میں رو مجرئی ثواب یہ ہے	یہ ہے	۴۳	
۷۴	آ کے جو بزم عزا میں رہ گئے	گئے	۱۴	
۷۵	واصب الرحم تھے زنداں کے سہرا وارث تھے	تھے	۱۵	شمع تعزیت ص۴۵ ۱۶ شعر
۷۶	غم بتہ میں گر داغ دل پر رہے	رہے	۱۹	نسخۂ مسعود ۱۵ شعر مکتوبہ ۱۹ ذی الحجہ ۱۲۷۵ھ بمقام مٹیا برج کلکتہ، نسخۂ دیگر ۲۱ شعر
۷۷	ہوا جو عشق ثنائے ابوتراب مجھے	مجھے	۸	
۷۸	خود نوید زندگی لائی قضا میرے لیے	میرے لیے	۱۸	مطبوعہ نظامی ۱۲ شعر
۷۹	سلامی در شہ پہ گر جائیں گے	جائیں گے	۱۶	
۸۰	شاب روضۂ فرزند بوتراب ملے	ملے	۱۴	
۸۱	اعدا حرم کو مثل گنہگار لے گئے		۱۱	
۸۲	مجرئی قتل جب اکبر سا سیر ہو جائے	ہو جائے	۲۲	
۸۳	مجرا سے جو لاغر و رنجور تن بھی ہے	بھی ہے	۲۷	
۸۴	زماں پر مدح ہے باغ علی کے نونہالوں کی	کی	۲۶	نسخۂ مسعود ۱۶، نسخۂ دیگر ۲۲، شمع تعزیت ۱۸ شعر
۸۵	مجرا اسے جو کہتی تھی بابا چلے گئے	چلے گئے	۱۲	
۸۶	مجرائی گردش فلکِ پیر دیکھیے	دیکھیے	۲۰	
۸۷	ذکر شہ کر کے محبوں کو رلایا میں نے	میں نے	۱۸	شمع تعزیت ۱۷، نسخۂ مسعود ۲۱ شعر

(باقی صفحہ ۲۸ پر)

غزل

[redacted]

ساحر بھوپالی

سزاوارِ رشکِ جہاں ہو گئے ہم
ترے عشق میں بے نشاں ہو گئے ہم
فسانہ غمِ ہجر کا یوں سُنایا
کہ عبرت کی اک داستاں ہو گئے ہم
شب و روز بڑھتی گئی سوزشِ غم
یہاں تک کہ آتش بجاں ہو گئے ہم
ترے آستاں تک تو لائی تھی وحشت
خدا جانے پھر گم کہاں ہو گئے ہم
یہاں تک بڑھا اعتمادِ محبت
کہ بے فکرِ سود و زیاں ہو گئے ہم
جہاں بھی ذرا ملتفت ان کو پایا
تو خود سے بھی پھر بدگماں ہو گئے ہم
تھے گویا تو یک سر حقیقت نگر تھے
ہوے چپ تو اک داستاں ہو گئے ہم
سرِ رہ غبارِ پسِ کارواں تھے
ہوے گم تو منزل نشاں ہو گئے ہم
ہوا موج زن جب کہ دریائے الفت
حدیں توڑ دیں بیکراں ہو گئے ہم
ہماری کوئی ہمسری کیا کرے گا
خود اپنے لیے آسماں ہو گئے ہم
بڑھا دردِ دل بھی تو کب آہ ساحر
کہ جب بے نیازِ فغاں ہو گئے ہم

سنگم

تکیل رضوی

تجھ پہ سنگم فخر کرتے ہیں زمین و آسماں
تو ہے تیرتھ گاہ، تو ہے نازشِ ہندوستاں
سرسوتی گنگ و جمن سب ہیں تری آغوش میں
اس لیے قدموں پہ تیرے جھک گیا ہے آسماں
آبگینے تیرے دامن میں جواہر ریز ہیں
تیری موجیں ہیں کہ بل کھاتی ہوئی اک کہکشاں
اٹھتے طوفانوں کی منزل تیرا قلبِ مضطرب
تیرے گردابوں کی انگڑائی زبانِ الاماں
سرخیاں ہیں تیرے افسانے کی یہ گنگ و جمن
ستانِ اتحادِ باہمی کا ہیں نشاں
تیرے دامن میں دمکتے حسنِ عالم سوز میں
ایک جا دیکھے ہیں ہم نے ماہ و نجم و کہکشاں
تجھ میں دیکھی ہے بہارِ جاودانِ آرزو
تیرے ساحل پر نگاہوں کو ہے جنت کا گماں
ماگھ کے میلے کی رونق آج تیرے دم سے ہے
یاتری آتے ہیں جس میں کارواں در کارواں
آج بھی جمنا پہ تیرے سامنے شانِ اشوک
قلعہ کی بارہ دری دہرا رہی ہے داستاں
قوم کے باپو کی جب راکھی ترے ہاتھوں میں ہے
کیوں نہ مانے سنگم تجھے دنیا کے قومی نشاں
رات کے دامن میں دن کی شوخیاں چھپنے لگیں
چاند نکلا دوڑنے پھرنے لگیں پرچھائیاں
کرکے ماضی کا تصور بھر کے آہ سرد اک
میں بھی بیٹھا دل میں تازہ کرکے یادِ رفتگاں
الغرض تکیل یہ تھا ایک حسنِ اتفاق
ورنہ یہ نظارۂ سنگم کہاں اور تو کہاں

سفید بال اور سفید ہو گئے

عبدالمجیب سہالوی

دیہات کے ہمارے ایک جاننے والے ہیں انھیں جوان بنے رہنے کا بے حد شوق ہے۔ ابھی مسیں بھیگ ہی رہی تھیں کہ انھیں اپنے شباب کو سجا بنا کر رکھنے کی فکر دامن گیر ہو گئی۔ کریم پوڈر سے چہرے کو چکنا بنانے کے ساتھ ساتھ انھوں نے ڈاڑھی مونچھ کے روئیں بھی صاف کر دیے اور بینگ توڑ کر بچوں میں شامل ہونے کے بجائے ڈاڑھی مونچھ مونڈ کر قبل از وقت جوانوں میں شامل ہو گئے۔ جب تک جوانی رہی اسے لہن بنائے رکھا۔ مگر جس کو جانا ہو وہ دور بھاگتا ہے وہی ان بچارے کے ساتھ ہوا ابھی چالیس ہی کے پیٹے میں ہوں گے کہ بال سن سفید ہو گئے خیریت یہ ہوئی کہ بتیسی سلامت رہی۔ نزلے کا سارا زور بالوں ہی کی طرف رہا۔ آنکھیں زد میں آئیں لیکن اس سے کوئی فرق نہ پڑا وہ عینک مقوی حسن کے طور پر پہلے ہی سے لگاتے تھے۔ مگر انھیں یہ سفید بال کھائے جاتے تھے۔

دیہات میں تو لوگ اپنا کوئی نہ کوئی رشتہ جوڑ کر ایک دوسرے کو پکارتے ہیں کوئی سفید بال دیکھ کر بابا نہیں کہنے لگتا لیکن جب شہر آتے تو ان کے یہ سفید بال جان کا جنجال ہو جاتے۔ بس پر بیٹھتے تو کنڈکٹر کہتا بابا کہاں کا ٹکٹ دوں۔ رکشے والے کہتے بڑے میاں کہاں چلنا ہے۔ ایک مرتبہ تو انھوں نے خودکشی کا ارادہ کر لیا۔ ہوا یہ کہ وہ امین آباد میں چوک جانے کے لیے بن ٹھن کر اڈے پر آئے۔ وہاں رکتے ہی ایک ساٹھ ستر سالہ بوڑھے میاں پہلے سے بیٹھے تھے یہ لپک کر اسی رکشے پر بیٹھ گئے تاکہ دوسری سواری کا انتظام نہ کرنا پڑے رکشا روانہ ہوا۔ ان ستر سالہ بزرگ نے ان سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا بڑے میاں نخاس ہی تک جایئے گا یا چوپٹیاں چلیے گا۔ ان کے پوپلے منہ سے اپنے لیے بڑے میاں کا لقب سنا تھا کہ ان کا دل چاہا کہ اُٹھیں رکشے سے کود کر جان دے دیں لیکن انھیں اکلی اور صدمے سہنے تھے اس لیے ہمت نہ پڑی لیکن راستے بھر مارے غصے کے اپنے سفید بالوں کو دل ہی دل میں کوسنے کے ساتھ ساتھ ان بوڑھے میاں پر بھی لعنت بھیجتے رہے جنھوں نے انھیں بڑے میاں کہہ کر گویا انھیں چڑھانے کی کوشش کی تھی۔

ایک مرتبہ بس کے انتظار میں کھڑے تھے انھوں نے دیکھا کہ ایک صاحبہ لپ اسٹک اور پوڈر سے لیس ان کی طرف بڑھی چلی آ رہی ہیں۔ انھوں نے فوراً اپنی ٹوپی آگے کی طرف کھسکائی اور جھانکتے ہوئے ظالم سفید بالوں کو اندر کی طرف ٹھونس دیا مگر آپ جانتے ہیں کہ انسان کی ؎

لاکھ تدبیر کرے تو کیا ہوتا ہے

وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

چنانچہ ان صاحبہ نے قریب آ کر ادب سے پوچھا بڑے صاحب! چار باغ جانے والی بسیں کہاں ملیں گی؟ یہ سنتے ہی ان پر سکتے کا سا عالم طاری ہو گیا۔ یہ جواب دینا چاہتے تھے لیکن منہ سے آواز نہ نکل رہی تھی ان کا بس چلتا تو وہ ان صاحبہ کا منہ نوچ لیتے۔ ان کا بے اختیار دل چاہ رہا تھا کہ پوچھیں نیک بخت! آپ کو صرف میرے سفید بال ہی نظر آئے میرا چکنا چپڑا چہرا اور چوڑا چکلا جسم دکھائی نہ دیا۔ مگر انھوں نے سینے پر سل رکھ کر ذرا ترشی سے کہا میں باہر کا آدمی ہوں

غزل

ساحر بھوپالی

سزاوارِ رشکِ جہاں ہو گئے ہم
ترے عشق میں بے نشاں ہو گئے ہم

فسانۂ غمِ ہجر کا یوں سنایا
کہ عبرت کی اک داستاں ہو گئے ہم

شب و روز بڑھتی گئی سوزشِ غم
یہاں تک کہ آتش بجاں ہو گئے ہم

ترے آستاں تک تو لائی تھی وحشت
خدا جانے پھر گم کہاں ہو گئے ہم

یہاں تک بڑھا اعتمادِ محبت
کہ بے فکرِ سود و زیاں ہو گئے ہم

جہاں بھی ذرا ملتفت ان کو پایا
تو خود سے بھی پھر بدگماں ہو گئے ہم

تھے گویا تو یک سر حقیقت نگر تھے
ہوئے جب تو اک داستاں ہو گئے ہم

سرِ رہ غبار ہیں کارواں تھے
ہوئے گم تو منزل نشاں ہو گئے ہم

ہوا موج زن جب کہ دریائے الفت
حدیں توڑ دیں بیکراں ہو گئے ہم

ہماری کوئی ہمسری کیا کرے گا
خود اپنے لیے آسماں ہو گئے ہم

بڑھا دردِ دل بھی تو کب آہ ساحر
کہ جب بے نیازِ فغاں ہو گئے ہم

[redacted]

سنگم

شکیل رضوی

تجھ پہ سنگم فخر کرتے ہیں زمین و آسماں
تو ہے تیرتھ گاہ، تو ہے نازشِ ہندستاں

سرسوتی گنگ و جمن سب ہیں تیری آغوش میں
اس لیے قدموں پہ تیرے جھک گیا ہے آسماں

یہ نگینے تیرے دامن میں جواہر ریز ہیں
تیری موجیں ہیں کہ بل کھاتی ہوئی اک کہکشاں

اٹھتے طوفانوں کی منزل تیرا قلبِ مضطرب
تیرے گرداوں کی انگڑائی زبانِ الاماں

سرخیاں ہیں تیرے افسانے کی یہ گنگ و جمن
ستانِ اتحادِ باہمی کا ہیں نشاں

تیرے دامن میں دمکے حسنِ عالم سوز میں
ایک جا دیکھے ہیں ہم نے ماہ و انجم کہکشاں

تجھ میں دیکھی ہے بہارِ جاودانِ آرزو
تیرے ساحل پر نگاہوں کو ہے جنت کا گماں

ماگھ کے میلے کی رونق آج تیرے دم سے ہے
یاتری آتے ہیں جس میں کارواں در کارواں

آج بھی جمنا پہ تیرے سامنے شانِ اشوک
قلعہ کی بارہ دری دہرا رہی ہے داستاں

قوم کے باپو کی جب راکھی ترے ہاتھوں میں ہے
کیوں نہ اے سنگم تجھے دنیا کہے قومی نشاں

رات کے دامن میں دن کی شوخیاں چھپنے لگیں
چاند نکلا دوڑنے پھرنے لگیں پرچھائیاں

کر کے ماضی کا تصور بھر کے آہ سرد اک
میں بھی پلٹا دل میں تازہ کر کے یادِ رفتگاں

الغرض تکمیل یہ تھا ایک حسنِ اتفاق
ورنہ یہ نظارۂ سنگم کہاں اور تو کہاں

سفید بال اور سفید ہو گئے

عبدالمجیب سہالوی

دیہات کے ہمارے ایک جاننے والے ہیں انھیں جوان بنے رہنے کا بے حد شوق ہے۔ ابھی مسیں بھیگ ہی رہی تھیں کہ انھیں اپنے شباب کو سجا بنا کر رکھنے کی فکر دامن گیر ہو گئی۔ کریم پوڈر سے چہرے کو چکنا بنانے کے ساتھ ساتھ انھوں نے ڈاڑھی مونچھ کے روئیں بھی صاف کر دیے اور سنگھ توڑا کر بچھڑوں میں شامل ہونے کے بجائے ڈاڑھی مونچھ مونڈا کر قبل از وقت جوانوں میں شامل ہو گئے۔ جب تک جوانی رہی اسے دلہن بنائے رکھا۔ مگر جس کو جا ہو وہ دور بھاگتا ہے وہی ان بچارے کے ساتھ ہوا ابھی چالیس ہی کے پیٹے میں ہوں گے کہ بال سن سفید ہو گئے خیریت یہ ہوئی کہ بتیسی سلامت رہی۔ نزلے کا سارا زور بالوں ہی کی طرف رہا۔ آنکھیں زد میں آئیں لیکن اس سے کوئی فرق نہ پڑا وہ عینک مقوی حسن کے طور پر پہلے ہی سے لگاتے تھے۔ مگر انھیں یہ سفید بال کھائے جاتے تھے۔

دیہات میں تو لوگ اپنا کوئی نہ کوئی رشتہ جوڑ کر ایک دوسرے کو پکارتے ہیں کوئی سفید بال دیکھ کر بابا نہیں کہنے لگتا لیکن جب شہر آتے تو ان کے یہ سفید بال جان کا جنجال ہو جاتے۔ بس پر بیٹھتے تو کنڈکٹر کہتا بابا کہاں کا ٹکٹ دوں۔ رکشے والے کہتے بڑے میاں کہاں چلنا ہے۔ ایک مرتبہ تو انھوں نے خودکشی کا ارادہ کر لیا۔ ہوا یہ کہ وہ امین آباد میں چوک جانے کے لیے بن ٹھن کر اڈے پر آئے۔ وہاں رکشے پر ایک ساٹھ ستر سالہ بوڑھے میاں پہلے سے بیٹھے تھے۔ یہ لپک کر اسی رکشے پر بیٹھ گئے تاکہ دوسری سواری کا انتظام نہ کرنا پڑے۔ رکشا روانہ ہوا۔ ان ستر سالہ بزرگ نے ان سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا بڑے میاں نخاس ہی تک چلیے گا یا چوپٹیاں چلیے گا۔ ان کے پوپلے منہ سے اپنے لیے بڑے میاں کا لقب سنا تھا کہ ان کا دل چاہا کہ اچھل کر رکشے سے کود کر جان دے دیں لیکن انھیں ابھی اور صدمے سہنے تھے اس لیے ہمت نہ پڑی لیکن راستے بھر مارے غصے کے اپنے سفید بالوں کو دل ہی دل میں کوسنے کے ساتھ ساتھ ان بوڑھے میاں پر بھی لعنت بھیجتے رہے جنھوں نے انھیں بڑے میاں کہہ کر گویا انھیں چڑھانے کی کوشش کی تھی۔

ایک مرتبہ بس کے انتظار میں کھڑے تھے انھوں نے دیکھا کہ ایک صاحبہ لپ اسٹک اور پوڈر سے لیس ان کی طرف بڑھی چلی آ رہی ہیں۔ انھوں نے فوراً اپنی ٹوپی آگے کی طرف کھسکائی اور جھانکتے ہوئے ظالم سفید بالوں کو اندر کی طرف ٹھونس دیا مگر آپ جانتے ہیں کہ انسان ؏

لاکھ تدبیر کرے تو کیا ہوتا ہے

وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے

چنانچہ ان صاحبہ نے قریب آ کر ادب سے پوچھا بڑے صاحب! چار باغ جانے والی بسیں کہاں ملیں گی؟ یہ سنتے ہی ان پر سکتے کا سا عالم طاری ہو گیا۔ یہ جواب دینا چاہتے تھے لیکن منہ سے آواز نہ نکل رہی تھی ان کا بس چلتا تو وہ ان صاحبہ کا منہ نوچ لیتے۔ ان کا بے اختیار دل چاہ رہا تھا کہ پوچھیں نیک بخت، آپ کو صرف میرے سفید بال ہی نظر آئے میرا چکنا چپڑا چہرا اور چوڑا چکلا جسم دکھائی نہ دیا۔ مگر انھوں نے سینے پر سل رکھ کر ذرا ترشی سے کہا میں باہر کا آدمی ہوں

مجھ سے کیا پوچھتی ہیں کہ کس سے پوچھا۔ اس واقعہ سے وہ اتنا جھنجھلا گئے کہ بس پر لعنت بھیج کر گئے پیدل گھر کو روانہ ہو گئے۔

اب دیہات میں بھی نوکروں کا اتنا کال ہو گیا ہے کہ جن گھروں میں نوکرانیوں اور ناودوں کی بھیڑ لگی رہتی تھی اب انھیں جھاڑو برتن کے لیے بھی ڈھونڈھنے سے کوئی عورت نہیں ملتی۔ ایک دن قریب کے اسٹیشن پر انھیں ایک پگلی سی عورت مل گئی۔ انھوں نے خیال کر مانگی مراد ملی اور ساتھ گھر لے آئے۔ بیوی نے بھی یہ سوچ کر چلو ہاتھ ہی بٹائے گی کچھ نہیں تو سالن پینے اور برتن مانجھنے سے تو چھٹکارا مل جائے گا بڑے چاؤ سے اسے رکھ لیا۔ لیکن پگلی تو پگلی آتے ہی ایسے اینڈے بینڈے سوالات شروع کر دیے کہ ان کا ناک میں دم ہو گیا ایک دن ہمارے دوست دھوپ میں بیٹھے اخبار پڑھ رہے تھے اور ان کے سفید بال دھوپ میں سورج کی طرح چمک رہے تھے اسی وقت انھوں نے سنا کہ وہ پگلی ان کی بیگم سے باورچی خانے میں بیٹھی پوچھ رہی تھی کہ 'ای بوڑھو ڈکرے کو ہوئیں؟' بیگم جھنجھلا کر بولیں ہمارے میاں ہیں اور کون ہوتے اس پر پگلی نے کہا 'ہٹو بی بی ہمکا نہ بکاؤ یہ تو ترے ابا ایسے لگت ہیں'۔ یہ سن کر ہمارے دوست کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور غصے سے ادھر مڑ کر جو دیکھا تو ان کی بیگم کے چہرے پر مسرت نمایاں تھی اور ان کے کھچڑی بالوں سے ایک سیاہ لٹ دوپٹے سے جھانک کر کہہ رہی تھی کہ 'بات ٹھیک ہے مگر ایسا نہ کہو کہیں برا مان گئے تو تمھارا پتّا کٹ جائے گا'۔ دوسرے دن صبح جب بیگم اٹھیں تو وہ پگلی عورت غائب تھی۔

ہمارے یہ دوست غلط فہمی سے اپنے کو جوان ہی نہیں بلکہ کسر د جوان سمجھتے تھے اور اس دھوکے میں بھی تھے کہ ان کے پاس سے گزرنے والی کوئی عورت انھیں کنکھیوں سے دیکھے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ایک دن پھر میاں یہ اپنی بوڑھی جوانی کے نشے میں مست گھومتے چلے جا رہے تھے کہ انھوں نے محسوس کیا کہ ان کے پیچھے پیچھے کوئی صاحبہ تیز قدم چلی آ رہی ہیں پھر کیا تھا یہ فوراً سمجھ بیٹھے کہ ہو نہ ہو وہ ان کے حسن و جوانی پر فریفتہ ہو کر ان کا پیچھا کر رہی ہیں حالانکہ انھیں سوچنا چاہیے تھا کہ ہمارے یہاں کی خواتین ابھی مغربی ممالک کی خواتین سے بہت پیچھے ہیں اور فریفتہ ہونے کے باوجود اپنے محبوب کا پیچھا نہیں کرتیں۔

مگر یہ بیچارے تو بڑھوں کا فلسفہ بیان کر رہے تھے۔ عورت کو اپنے پیچھے تیز قدم آتے دیکھ کر ان کے قدم ڈگمگانے اور دل دھڑکنے لگا۔ یہ دل سنبھالتے تو قدم لڑکھڑانے لگتے اور جب پاؤں سنبھال کر رکھتے تو دل مچل جاتا۔ یہ دھڑکتے دل اور لڑکھڑاتے پاؤں سے یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے ؎

قدم یہ اٹھتے نہیں ہیں اٹھائے جاتے ہیں

ان کے قدم اٹھ نہیں رہے تھے اور پیچھے والی خاتون تیزی سے بڑھتی چلی آ رہی تھیں۔ یہ آہٹ پہ کان لگائے آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹ رہے تھے لیکن ان کی مایوسی کی اس وقت کوئی حد نہ رہی جب وہ ان کی للچائی ہوئی نظروں کے جواب میں مسکرانے کے بجائے منہ سکوڑ کر آگے بڑھ گئیں اور آگے جانے والے صاحب کا ہاتھ پکڑ کر اتراتے ہوئے کہا کہ یہ بوڑھے میاں تو بڑے شوقین معلوم ہوتے ہیں۔ یہ سنتے ہی ان کا دل چاہا کہ اپنے بال نوچ ڈالیں اور آتی ہوئی بس کے سامنے لیٹ جائیں۔ ابھی یہ ارادہ ہی کر رہے تھے کہ ان کی نظر اچانک ایک اشتہار پر پڑی جس میں لکھا تھا 'سفید جھوٹ ہے کہ جوانی لوٹ کر نہیں آتی اور بڑھاپا آ کر کبھی نہیں لوٹتا' ہمارا سدا بہار خضاب لگانے اور بڑھاپے میں جوانی کا لطف اٹھایئے۔

یہ اپنے کو بوڑھا تو نہیں سمجھتے تھے لیکن برا ہو سفید بالوں کا کہ ان کی وجہ سے 'بابا' 'بابا' سنتے سنتے تنگ آ چکے تھے اس لیے انھوں نے طے کر لیا کہ بزعم خود جوان ہونے کے باوجود خضاب کا سہارا لیں گے اور بابا اور بوڑھے میاں کہنے والوں کا منہ بند کر دیں گے۔

وہ خضاب خریدنے شہر نہیں آئے تھے بلکہ اپنی ٹوٹی عینک ٹھیک کرانے آئے تھے۔ پیسے زیادہ نہیں تھے لیکن پھر بھی انھوں نے طے کر لیا کہ وہ خضاب ضرور خریدیں گے چاہے چشمہ نہ ٹھیک کرائیں انھوں نے سوچا اور غالباً ٹھیک ہی سوچا کہ بغیر عینک کے کوئی اندھا نہ کہے گا۔ لیکن بغیر خضاب کے لوگ برابر بوڑھے کہتے چلے آئے ہیں لیکن اب وہ ایک منٹ کے لیے بھی اپنے کو بوڑھا کہلانے کے لیے تیار نہیں

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

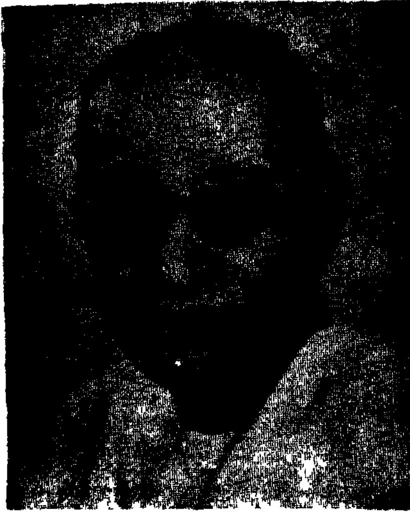
راجہ جی — ایک جائزہ

کے۔ رنگا سوامی

شری چکرورتی راج گوپال اچاری، جنھیں لوگ پیار سے سی۔ آر۔ یا راجہ جی کہا کرتے تھے ایک سورگباش ہو جانے کے تھوڑے عرصے بعد کچھ کہنا آسان کام نہیں ہے۔ کئی خوبیوں سے بھری ان کی سرگرمیوں پر تو کئی کتابیں لکھی جا سکتی ہیں۔ وہ ایک ذہین دانشور قابل ایڈمنسٹریٹر اور ایک عظیم فلاسفر نیز باہمت اور ذہین باشعور سیاست دان کے طور پر اپنی ایک چھاپ چھوڑ گئے ہیں۔ ان کی انتہائی سادہ، پرخلوص اور بامقصد زندگی اپنے دور کی نسلوں کے لیے ہمیشہ قابل تقلید رہے گی۔ کوئی ان کے انکار سے متفق ہو یا نہ ہو لیکن جب بھی وہ کسی موضوع پر اظہار خیال کرتے تھے تو اس کی طرف دھیان دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا تھا۔

ہمارے ذہن میں سب سے پہلے جو بات آتی ہے وہ ہے ان کے عزم کی طاقت اور نتائج سے بے خوف ہو کر اس راہ پر چلنے کا مصمم ارادہ جسے وہ ایک بار چن لیتے تھے۔ یہ بات تو ابھی کئی لوگوں کو یاد ہوگی کہ ۱۹۴۲ء کی "بھارت چھوڑو" تحریک کی انھوں نے کس طرح ڈٹ کر مخالفت کی تھی اور اس کے خلاف مہم چلائی تھی۔ اسے کئی لوگوں نے پسند نہیں کیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ جب گاندھی جی اور دیگر قومی رہنما جیلوں میں بند ہوں تو راجہ جی کیسے ایک ایسے راستے پر چلنے کی وکالت کر سکتے ہیں جو دراصل برطانوی حکمرانوں کے ساتھ تعاون کے مترادف ہو؟ یہ وہ دن تھے جب مدراس کے چوٹی کے کانگریسیوں نے ان کے "غیر عمل پرستانہ" رویہ کے لیے ان کے خلاف پارٹی کی جانب سے تادیبی کارروائی کرنے کی بات سوچی۔

مجھے یہ بات اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں نے ایسی کارروائی کی مذمت کرنا چاہی تو سردار ولبھ بھائی پٹیل نے کس طرح غصے سے بھرے ردعمل کا اظہار کیا تھا۔ راجہ جی کے خلاف لوگوں کا غصہ اور بھی زیادہ بڑھ گیا تھا جب انھوں نے مسلم لیگی رہنما مسٹر جناح کے ساتھ بات چیت چلائی اور ملک کے مسلم اکثریتی علاقوں میں خود ارادیت کی پیش کش کی بشرطیکہ مسلم لیگ بھارت کی مکمل آزادی کا مطالبہ کرنے میں کانگریس کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہو جائے۔



راجہ جی

جناح نے راجہ جی کی تجاویز تو رد کر دیں لیکن وہ ان رعایتوں کو لینے کے لیے اڑ گئے جو راجہ جی کی تجاویز میں شامل تھیں اور برطانوی سرکار نے اسی کو بنیاد بنا کر پاکستان قائم کر دیا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ راجہ جی کے اندر اتنی دوراندیشی تھی کہ وہ یہ اندازہ لگا سکتے تھے کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ راجہ جی کا فلسفہ یہ تھا کہ مخالفت کو جیتنے سے ملک کے مفادات کی خدمت بہتر طریقے سے ہو سکتی ہے

تیکھی ذہانت

ان کی تیکھی ذہانت ہر ایک کو لاجواب کر دیتی تھی۔ جب بھی وہ کسی بات کے حق میں یا اس کے خلاف اپنے دلائل پیش کرتے تھے وہ دوسروں کو

قائل اور لاجواب کرنے والے ہوتے تھے اور اس وقت بہت ہی کم لوگ ان کے دلائل رد کر سکتے تھے۔ بھارت چھوڑو تحریک کے خلاف ان کے دلائل اتنے ٹھوس تھے کہ گاندھی جی صرف یہی کہہ سکے کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ ان کے ذہن کو تو متاثر کرتا ہے لیکن ان کے دل کو نہیں۔ جب راجہ جی نے الگ راستہ اختیار کر کے ایک نئی سیاسی جماعت بنائی تو جواہر لال نہرو نے یہی بہتر سمجھا کہ راجہ جی کی نکتہ چینی کا جواب نہ دیا جائے۔

۱۹۳۷ء میں صوبائی کونسلوں کے چناؤ کے بعد کانگریس پارٹی کو حکومت بنانے کی اجازت نہیں دی گئی تھی کیونکہ اس کا منصوبہ آئین کو اندر سے کھوکھلا کرنے کا تھا۔ راجہ جی نے غیر کانگریسیوں اور برطانوی حکمرانوں کی طرف سے قائم کی گئی عبوری وزارت کے خلاف مدراس میں ایک مہم چلائی۔ طنز سے بھری ان کی نکتہ چینی کو سننے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ باقی ہندوستان میں بھی کانگریسیوں نے اسی طریقے کو اپنایا اور اسے اپنے فائدے کے لیے استعمال کیا۔

راجہ جی بھارت کے آخری گورنر جنرل تھے۔ ملک کے سب سے بڑے عہدہ پر فائز رہنے کے بعد بھی جب جواہر لال نہرو نے انھیں مرکزی وزارت میں شرکت کی دعوت دی تو وہ سرگرم سیاست میں لوٹ آئے۔ راجہ جی نے کس وجہ سے یہ وزارت چھوڑ دی اس کی وضاحت نہ تو خود انھوں نے اور نہ ہی جواہر لال نہرو نے کی ہے۔ اگر یہ دونوں رہنما گہرے تعاون اور مفاہمت کے ساتھ مل کر کام کرتے رہتے تو ملک کی تاریخ غالباً کچھ اور ہی ہوتی۔

اس کے کئی برس بعد بھی ذہنی اور جسمانی طور پر راجہ جی اتنے چاق و چوبند تھے کہ انھوں نے سوتنترا پارٹی قائم کی اور حکمراں کانگریس پارٹی کے ایک زبردست نکتہ چیں بن گئے۔ راجہ جی کو اس بات سے ضرور گہری مایوسی ہوئی ہوگی کہ کانگریس پارٹی کے متبادل ایک جماعت قائم کرنے کا ان کا خواب پورا نہ ہو سکا۔

ایک متنازعہ شخصیت

ماضی کے واقعات پر نظر دوڑانے کے بعد یہی کہا جا سکتا ہے کہ راجہ جی ایک متنازعہ شخصیت تھے۔ جب ۱۹۳۷ء میں وہ مدراس کے وزیر اعلیٰ تھے تو وہاں کے اسکولوں میں ہندی کو ایک لازمی مضمون بنانے والے سب سے پہلے شخص وہی تھے۔ لیکن اس کے کئی برس بعد انھوں نے ہندی کے خلاف مہم چلائی اور بھارت کی رابطہ کی سب سے بڑی زبان کے طور پر انگریزی کو جاری رکھنے کے لیے جد و جہد کی۔ لیکن اپنے نظریات میں اس تبدیلی کو بھی انھوں نے اپنے معمول کے مدلل طریقہ سے حق بجانب ٹھہرایا۔

آندھرا میں موجودہ ایجی ٹیشن اور آسام میں لسانی جھگڑے کے ضمن میں کوئی بھی شخص راجہ جی کے اس تیکھے تبصرہ کو یاد کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ لسانی بنیادوں پر ملک کی از سر نو تقسیم ایک "قبائلی نظریہ" ہے اور یہ بات انھوں نے ایک ایسے موقع پر کہی جب مدراس کی متحدہ ریاست سے تیلگو بولنے والے اضلاع کی علاحدگی کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔

راجہ جی "ازموں" کی پرواہ نہیں کیا کرتے تھے۔ ایک بار انھوں نے اعلان کیا کہ کمیونسٹ ان کے دشمن نمبر ایک ہیں۔ وہ بنیادی طور پر بڑے فراخدل تھے اور نظریات میں رجعت پسند بھی تھے لیکن راجہ جی کے بارے میں جو بات خاص قابل ذکر ہے وہ تھی ان کی علمی ذہانت اور ایسے اقدامات اختیار کرنے کی ان کی ہمت جن سے کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کا فائدہ ہوتا ہو۔

کیا بھارت میں پھر کبھی راجہ جی جیسی کوئی شخصیت ہوگی؟



طائر شہرت

روشن پیپانوی

کبھی سکّہ رواں ہوگا ہمارا دو جہانوں میں
اُڑے گا طائرِ شہرت کبھی پھر آسمانوں میں

کیا قربان سر بہرِ وفا جب سرفروشوں نے
ملائک بھی خوشی سے جھوم اُٹھے آسمانوں میں

حفاظت کے لیے اپنے وطن کی جان تک دے دیں
شہادت کا ہے وہ جذبہ وطن کے پاسبانوں میں

غلامی کی مٹی ظلمت، یہ آزادی کی برکت ہے
بہاریں لوٹ کر آئیں وطن کے گلستانوں میں

حیاتِ جاوداں پائی ہے قومی سرفروشوں نے
رہے گا ذکرِ خیر ان کا وفا کی داستانوں میں

جو ناممکن ہے اس کو بھی بنا سکتے ہیں یہ ممکن
ہے ایسی جرأتِ بے باک قومی نوجوانوں میں

مشامِ جاں معطر ہو گیا خوشبوئے الفت کی
کھلے ہیں پھول ایسے اب وطن کے گلستانوں میں

مٹیں گے صفحۂ ہستی سے غدارِ وطن ایسے
کہ ان کی داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

گلستاں قوم کا محفوظ رہتا ہے اُسی دم تک
نہ خود غرضی کی خو پیدا ہو جب تک باغبانوں میں

نگاہیں خیرہ ہوں گی جس سے ساری نسلِ آدم کی
جِلا ہوگی کچھ ایسی قوم کے آئینہ خانوں میں

محبانِ وطن ہنس کر چڑھے جب دار پر روشن
تو شوقِ سرفروشی ہو گیا پیدا جوانوں میں

غزل

محمد قیصر خان قیصر

یہ عشقِ دوست میں حسنِ نظر کا عالم ہے
نگاہِ شوق نہیں جلوہ زارِ پیہم ہے

چمن کی سیر کجا قلبِ داغدار کجا
ستم نصیب کو اپنی بہار کیا کم ہے

اگرچہ عشق ہے سرتا بپا الم لیکن
یہی الم ہے جو رازِ نشاطِ عالم ہے

گلا تو ایک طرف شکریہ بھی یاد نہیں
وہ آئے ہیں تو نظامِ حواس برہم ہے

فسانۂ غمِ الفت ہے میری آہ نہیں
تمام قصّۂ دل ایک لفظِ مبہم ہے

یہ جلوہ ریزیِ حسن و شباب کیا کہنا
فضائے دہر پہ دوشیزگی کا عالم ہے

سکوں سے واسطہ کیا زندگی کو اے قیصرؔ
کہ اضطراب ہی رازِ حیاتِ عالم ہے

گاہے گاہے باز خواں ایں دفترِ پارینہ را

انوار احمد خاں۔ ایم۔ اے

ناظر ہمارے جدید شعرا میں خاصے اہم شاعر ہیں اور اردو کے ان شعرا میں سے ہیں جو نظیر اکبر آبادی کی طرح کلی طور پر نظر انداز کر دیے گئے اور جن پہ ہمارے ادیبوں نے قلم اٹھانا شاید اپنی کسرِ شان سمجھا۔ اس کی وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ دونوں غزل سے زیادہ نظم کے شاعر تھے۔

ناظر نے جب ہوش سنبھالا تو سرسیّد کی اصلاحی تحریک روز روں پر تھی۔ اس کا دائرہ روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا تھا۔ بڑے بڑے شاعر اور ادیب سر سید احمد خاں اور ان کی تحریک سے متاثر ہو کر اس کے دام میں اسیر ہو چکے تھے۔ ان تمام متاثرین کی زندگی کے چھوٹے چھوٹے دھارے جو ادھر ادھر آہستہ خرامی کے ساتھ بہہ رہے تھے، اب سرسید کی تحریک میں شامل ہو کر ایک بڑے دھارے کی شکل میں تیزی کے ساتھ بہنے لگے۔ یہ دھارا مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے کا دھارا تھا۔ سرسید کی دوررس نگاہوں نے بھانپ لیا تھا کہ مسلمانوں کا مستقبل تاریک ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمان سماجی، معاشی اور اقتصادی طور پر بدحال ہیں۔ انھوں نے مسلمانوں کو اقتصادی طور پر خوشحال، معاشی طور پر بہتر اور سماجی طور پر بلند کرنے کا نہ صرف یہ کہ مصمم ارادہ کیا بلکہ فوراً ہی عملی طور پر بھی کام میں جٹ گئے۔ سائنٹفک سوسائٹی اور پھر علی گڑھ کالج کا قیام اسی کا نتیجہ تھے۔ اس تحریک کا اثر مسلمانوں کی زندگی پر اتنا گہرا ہوا کہ ان کی زندگی میں نئے تصورات جنم لینے لگے۔ سوچنے کے انداز کے ساتھ ساتھ زندگی کے معیار اور قدروں میں بھی تبدیلی پیدا ہونے لگی۔ اس کا براہِ راست اثر ادب پر بھی پڑا اور جلد ہی ادب بھی نئے راستوں پر گامزن نظر آنے لگا۔ اردو شاعری جو اب تک گل و بلبل کے چہچہے اور معشوق کی زلفوں کے پیچ و خم میں الجھی ہوئی تھی اور جو معشوق کی کمرِ موہوم اور زیرِ ناف کے مزے میں غرق تھی اب نئے راستے پر نظر آنے لگی۔ اس نے کمر، زلفوں اور زیرِ ناف کو چھوڑ کر انسان کی پوری زندگی کا احاطہ کیا اور زندگی کے دوسرے تقاضوں کو پورا کرنے کی کوشش میں رواں نظر آنے لگی۔ شاعری کے اس روپ کو جدید شاعری کے نام سے یاد کیا گیا۔ سرسیّد کی اس تحریک کے زیرِ اثر جدید شاعری کا آغاز انجمن پنجاب کے زیرِ اہتمام ہوا جس میں حالی اور محمد حسین آزاد پیش پیش تھے۔

یہ ماحول تھا جس میں ناظر نے آنکھ کھولی اور اپنی شاعری کی ابتدا کی۔ ناظر پنجاب کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کی تاریخ پیدائش کا تعین ابھی نہیں ہو سکا ہے۔ انتخابِ نذیر جو سر سید راس مسعود نے ترتیب دیا تھا اس میں ناظر کی پیدائش کے بارے میں مرتب نے لکھا ہے کہ "سالِ پیدائش تقریباً ۱۸۷۲ء مطابق ۱۲۸۹ھ ہے۔" ناظر کا نام خوشی محمد خاں تھا، اور ناظر تخلص۔ یہ مولاداد خاں کے تین بیٹوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ ان کا آبائی گھر پنجاب ضلع گجرات کے ایک قصبہ ہیجہ والا میں تھا۔ ابتدائی تعلیم ناظر نے ہیجہ والا میں اور پھر لاہور میں رہ کر حاصل کی۔ لاہور سے میٹرک پاس کرنے کے بعد علی گڑھ کالج میں داخلہ لے لیا۔

ناظر کی نظم گوئی کی ابتدا ۱۸۸۱ء سے ہوتی ہے اس کے بارے میں ناظر نے خود ہی واضح طور پر لکھ دیا ہے۔ ۱۸۸۱ء میں انھوں نے جو پہلی نظم کہی وہ اب دستیاب نہیں۔ اس پہلی نظم کا ذکر کرتے ہوئے ناظر لکھتے ہیں کہ:

میں نے پہلی نظم جناب غوث الاعظمؒ کی مدح میں ۱۸۸۱ء میں لکھی۔ اس کا صرف ایک مصرع یاد رہ گیا ہے ؎



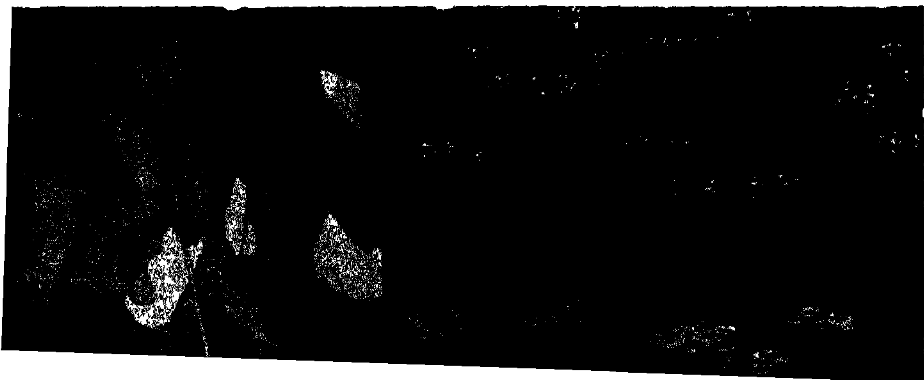
گورنر سری اکبر علی خاں یوم جمہوریہ کے موقع پر پولو گراؤنڈ
لکھنؤ پر فوج، پولیس اور این سی سی کی مشترکہ پریڈ کی
سلامی لے رہے ہیں



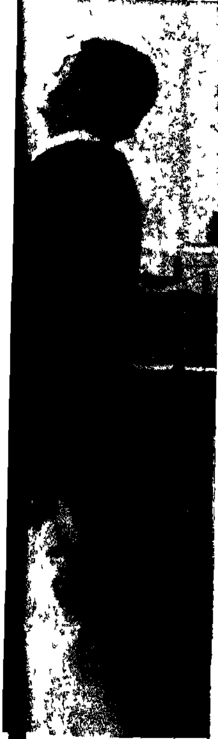
گورنر سری اکبر علی خاں ہارکورٹ بٹلر
ٹیکنالوجیکل انسٹی ٹیوٹ، کانپور کی
گولڈن جبلی کے آخری دن انسٹی ٹیوٹ
کے اوّل آنے والے طالب علم کو سونے
کا تمغہ عطا کر رہے ہیں

یوم شہیداں کے موقع پر شہید اسمارک، لکھنؤ کے قریب
گورنر سری اکبر علی خاں گومتی میں دیپ دان کرتے ہوئے

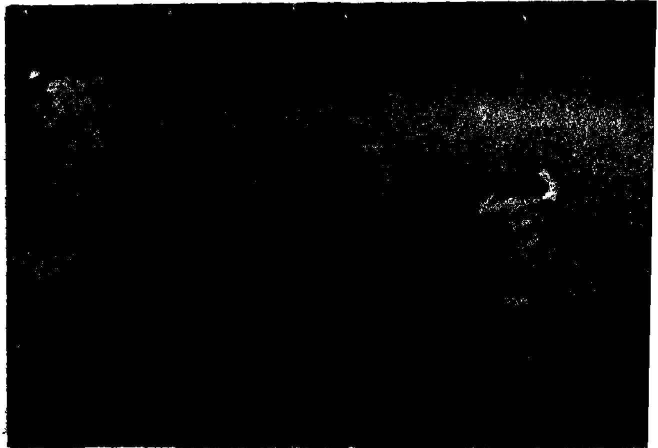








ہندستان
اور
ایم سی سی کرکٹ ٹیموں کے درمیان





...کیر انڈر ووڈ کی گیند پر
...لگا رہے ہیں

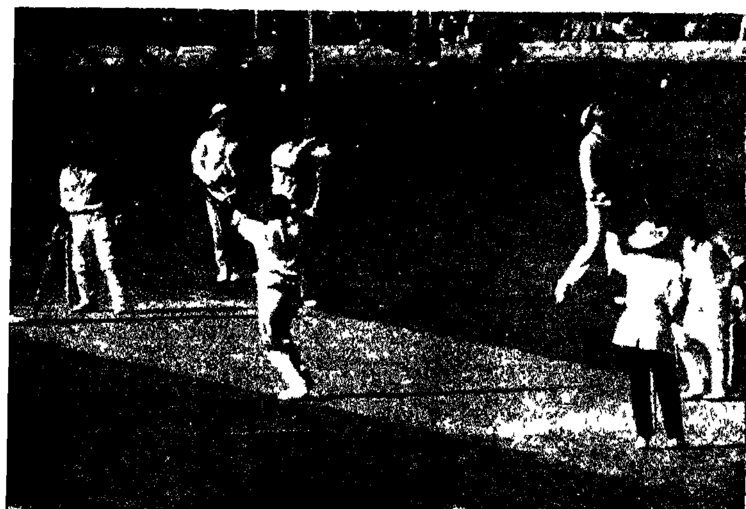


...ور انگلینڈ
...کرتے ہوئے

کانپور

میں

چوتھا ٹسٹ میچ جنوری ۱۹۷۳ء



...سادولکر نے انڈر ووڈ کی گیند
...ٹ بیگ سے کیچ کا نظارہ...



وزیر اعلیٰ شری کملاپتی ترپاٹھی لکھنؤ سے ۱۰ کیلومیٹر کے فاصلے پر کملاپوری مثالی گاؤں کا افتتاح کرتے ہوئے



اخبار نویسوں نے کھنتی تالاب اور موہن لال گنج لکھنؤ میں خاندانی منصوبہ بندی کیمپوں کا معائنہ کیا۔ تصویر میں ایک اخبار نویس نس بندی ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں

بیگم حضرت محل پارک لکھنؤ میں محکمہ اطلاعات کے زیر اہتمام ہونے والی یوم آزادی کی ۲۵ویں سالگرہ کی نمائش کے پنڈال میں ۲ جنوری ۱۹۷۳ء کو راجہ ہریش چندر ناٹک کا ایک منظر



بلبل طبعم بہ داغ وصف تو پرواز کرد

ناظرؔ اس زمانے میں مولوی نور الدین صاحب انورؔ سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ مولوی نور الدین انورؔ بھی ہربہ والا کے ہی رہنے والے تھے اور وہیں مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ عربی فارسی کے عالم اور مدرس تھے۔ اس زمانے میں پنجاب کے کہنہ مشق شعرا میں موصوف کا شمار ہوتا تھا۔ ناظرؔ نے یہ نظم جب ان کے سامنے اصلاح کی غرض سے پیش کی تو انھوں نے پہلے مصرع کو بدل کر اس طرح کر دیا تھا ع

بلبل طبعم بہ باغ وصف تو رنگیں نواست

محمڈن کالج ڈائرکٹری جو ۱۹۱۱ء میں طفیل احمد صاحب منگلوری نے حسب ایما، اولڈ بوائز ایسوسی ایشن مدرستہ العلوم تیار کی تھی اس سے پتا چلتا ہے کہ خوشی محمد خاں ناظرؔ نے ۱۸۸۹ء میں علی گڑھ کالج میں انٹرمیڈیٹ کے پہلے سال میں داخلہ لیا۔ ۱۸۹۱ء میں انٹرمیڈیٹ سکنڈ ڈویژن میں پاس کیا اور بی۔ اے ۱۸۹۳ء میں فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ ۲ مئی ۱۸۹۳ء کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ایڈیٹر کی طرف سے نوٹ لکھا ہوا ملتا ہے کہ:

"بی۔ اے اور انٹرمیڈیٹ کا نتیجہ نہایت ہی عمدہ ہے ہم کو نہایت ہی خوشی ہے کہ ہمارے کالج کے طالب علم خوشی محمد بی۔ اے امتحان میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوئے اور انگلش اور فارسی دونوں زبانوں میں آنر کا درجہ لیا۔ انھوں نے طلائی تمغہ پانے کا اپنے کو پورا مستحق ثابت کیا ہے اور امید ہے کہ وہ اس کو لے گا۔"

یوں تو خوشی محمد خاں ناظرؔ سرسید کی تحریک سے پہلے ہی متاثر تھے لیکن علی گڑھ پہنچنے کے بعد ان کی تحریک میں عملی طور پر بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔ اسی زمانے میں حالیؔ کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا اور اب حالیؔ کے سامنے اپنا کلام اصلاح کے لیے پیش کرنے لگے۔ حالیؔ سے تلمذ کا اظہار انھوں نے نظم و نثر دونوں میں کیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

پیام استاد حالیؔ کا زبان چرخ گرداں سے
سناتا ہوں کہ پند پیر سے کچھ بہرہ ور تم ہو

یہ شعر اس نظم میں شامل ہے جو بتقریب جلسہ جوبلی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ناظرؔ نے پڑھی تھی۔

چونکہ سرسید اور حالیؔ عاشقانہ غزل سرائی کے مخالف اور نیچرل شاعری کے حامی تھے اس لیے اپنی طالب علمی کے زمانے میں ہی ناظرؔ بھی قومی اور نیچرل شاعری کی طرف راغب ہو گئے۔ علی گڑھ کے زمانۂ طالب علمی میں ناظرؔ نے نظم کے دو مقابلوں میں حصہ لیا۔ یہ مقابلہ آرنلڈ نے رکھا تھا۔ اس کا مقصد تھا شعرا کو نیچرل شاعری کی طرف راغب کرنا۔ ان مقابلوں میں بہترین نظم پر انعام کا اعلان کیا جاتا تھا۔ ناظرؔ نے دو دفعہ مقابلوں میں حصہ لیا اور یہ انعام حاصل کیا۔ ان دونوں نظموں کے عنوانات "اخوت" اور "چہار موسم" ہیں جن پر ناظرؔ کو انعام ملا تھا۔ ناظرؔ نے اپنے مجموعۂ کلام نغمۂ فردوس حصہ اول کی تمہید میں لکھا ہے کہ:

"مسٹر آرنلڈ (آنجہانی) نیچرل شاعری کی ترغیب و تربیت میں خاص دلچسپی لیتے تھے اور دو سال متواتر انعامی نظم کا اعلان فرماتے رہے۔ یہ دونوں انعام میں نے حاصل کیے اور یہ دونوں نظمیں یعنی "اخوت" اور "چہار موسم" اسی وقت شائع ہو گئی تھیں۔"

علی گڑھ میں ناظرؔ لانگ فیلو کے لقب سے مشہور تھے اور یہ لقب صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کا دیا ہوا تھا۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں جو بعد میں علی گڑھ کے وائس چانسلر بھی رہے خوشی محمد خاں ناظرؔ کے ہم جماعت تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ناظرؔ نے فرسٹ ایر میں داخلہ لیا تھا۔ یونین کے جلسہ میں روضہ ممتاز محل پر ایک نظم پڑھی۔ مطلع تھا ؎

کچھ بتا احوال دل اے منزل خامش بیاں
کیوں نظر آتا ہے حسرت خیز تیرا آستاں

ناظرؔ کی اس نظم کا آخری شعر بہت مشہور ہوا۔ یہ شعر فارسی میں ہے اور بقول امتیاز علی خاں عرشی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی ایرانی نے کہا ہے۔ شعر یہ ہے ؎

گاہے گاہے باز خواں این دفتر پارینہ را
تازہ خواہی داشتن گر داغہائے سینہ را

یونین کے اسی جلسہ میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے ناظرؔ کو لانگ فیلو کے لقب سے نوازا تھا۔ حبیب اللہ خاں کے نام ایک خط میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"یونین کلب کے ایک جلسہ میں صاحبزادہ صاحب نے میرے لیے "لانگ فیلو"

کا لقب وضع فرمایا تھا۔"

ناظر کے اس خط سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن جس کا پہلے "برادرہڈ" نام تھا کا سنگ بنیاد ناظر ہی نے رکھا تھا، تھیوڈور ماریسن اس کے سکریٹری مقرر ہوئے تھے۔ لکھتے ہیں:

"دوسری طرف ایم۔ اے۔ او۔ کالج برادرہڈ (انجمن اخوان) تھی جس کا سنگ بنیاد رکھنے کا فخر بندۂ ناظر کو حاصل ہے۔ میری استدعا پر مسٹر (بعدہٗ سر) تھیوڈور ماریسن نے "برادرہڈ" کا سکریٹری ہونا منظور فرمایا اور فراہمی چندہ بشرح ایک فی صدی معقول تعداد تک ہونے لگی تھی۔ صاحبزادہ صاحب کے خاص معاون تھے۔ رپورٹ پیش ہونے پر سرسید علیہ الرحمۃ نے ایک نہایت رقت آمیز چٹھی لکھی جس کا خلاصہ یہ تھا "بہ حیثیت طالب علم ہونے کے میں ابھی اولڈ بوائے ہوں لہٰذا مجھ کو بھی ممبر "برادرہڈ" میں شامل کیا جائے۔" میرے کالج چھوڑنے کے بعد کسی جلسہ میں "برادرہڈ" کا نام اولڈ بوائز ایسوسی ایشن" قرار پایا۔"

ناظر اس ایسوسی ایشن کے سالانہ جلسوں اور تقریبات میں آخر دم تک شریک ہوتے رہے اور اپنی نظمیں نذرانے کے طور پر پیش کرتے رہے۔ خوشی محمد خاں ناظر علی گڑھ میں پوئٹ لاریٹ کے نام سے مشہور تھے کالج اور اس سے متعلق کوئی جلسہ ایسا نہ ہوتا تھا جس میں وہ اپنی کوئی نظم نہ پڑھتے ہوں۔ قومی، ملی اور نیچرل شاعری کو فروغ دینے میں خوشی محمد خاں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ حسرت موہانی جو کہ ان دنوں علی گڑھ کالج میں زیر تعلیم تھے عاشقانہ غزل سرائی میں مست تھے۔ آخر ناظر اور حسرت میں بن نہیں سکی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی شاعری پر اپنے اپنے مضامین میں خوب خوب اعتراضات کیے ہیں۔ علی گڑھ میں اس زمانے میں غزل گویوں کی بہ نسبت نظم گویوں کی تعداد زیادہ تھی۔ یوں بھی سرسید نے عشقیہ غزل گویوں پر کالج کی فضا میں پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔ قومی، وطنی اور ملی نظموں کی گونج علی گڑھ کی فضا میں ہی نہیں بلکہ اب علی گڑھ سے باہر بھی چاروں طرف سنائی دینے لگی تھی۔ حالی کے علاوہ چکبست، اقبال، نادر کاکوروی، درگا سہائے سرور اور بہت سے دوسرے اس طرح کی نظمیں شد و مد کے ساتھ لکھ رہے تھے۔ قومی اور نیچرل شاعری کو رواج دینے میں "مخزن" اور "زمانہ" کا بھی بہت بڑا ہاتھ ہے۔ "مخزن" شیخ عبدالقادر لاہور سے نکالتے تھے اور "زمانہ" دیا نرائن نگم کی نگرانی میں کانپور میں شائع ہوتا تھا۔ یہ سارے نظم نگار اپنی تخلیقات انہیں دونوں پرچوں کو بھیجا کرتے تھے۔ ناظر کی نظمیں عموماً مخزن میں شائع ہوا کرتی تھیں۔ "جوگی" جو ناظر کی بہت مشہور نظم ہے اور اکثر و بیشتر انتخابات میں شامل رہی ہے، اس زمانے میں مخزن میں شائع ہوئی تھی۔

ناظر کی زندگی کا بڑا حصہ ملازمت کے دوران کشمیر میں بسر ہوا۔ ۱۸۹۹ء کے لگ بھگ ناظر کشمیر آئے اور آخر میں یہیں کی خاک کے پیوند ہوئے۔ ۱۹۲۳ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ عرصۂ ملازمت میں مختلف بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ کشمیر میں ناظر نے فطرت کے مختلف حسین مناظر پر بہت ہی خوبصورت نظمیں لکھی ہیں۔ جس طرح علی گڑھ میں بقول ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی "اس نوع کی شاعری کو مقبول عام بنانے میں پہلے علی گڑھ کے ان طلبا نے حصہ لیا جن کے سرگروہ چودھری خوشی محمد خاں ناظر تھے۔" (علی گڑھ تحریک) اسی طرح کشمیر میں بھی خوشی محمد خاں ناظر نے اس طرح کی شاعری کو مقبول عام بنانے میں بڑا کام کیا۔ کشمیر کے ابتدائی زمانہ قیام میں ہی خوشی محمد خاں ناظر نے اپنے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ایک انجمن کی بنیاد ڈالی۔ اس کا نام "انجمن مفرح القلوب" تھا۔ یہ انجمن تقریباً چھ سال تک اپنی ادبی محفلیں منشی سراج الدین احمد خاں کے دولت خانہ پر یا پھر نشاط اور شالیمار میں منعقد کرتی رہی۔ اس انجمن کا ذکر کرتے ہوئے ناظر لکھتے ہیں

"ہم نے چند ادب دوست احباب کی ایک لٹریری کمیٹی یا انجمن بنا رکھی تھی جس کا نام "انجمن مفرح القلوب" تھا۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۷ء تک یہ انجمن کشمیر کے باغوں میں مفرحات کی نکہت بکھیرتی رہی۔ اس کے بعد میں لداخ چلا گیا۔"

کشمیر میں اس زمانہ میں خوشی محمد خاں ناظر، مولانا عبدالصمد، مفتی محمد حسین کاشمیری، محی الدین قمر خاں صاحب، منشی سراج الدین احمد خاں، سعد الدین سعد، اور صاحبزادہ عبدالرحمٰن ذکی اردو شاعری کی روح رواں تھے۔ یہ کشمیر میں اردو ادب کے دور اولیں کے شاعر تھے۔ ان میں سے مرزا سعد الدین سعد زیادہ تر فارسی میں کہتے تھے۔ ان کا شمار فارسی کے کہنہ مشق اور پختہ شاعروں میں ہوتا تھا۔ اردو میں بھی کبھی کبھی کہہ لیا کرتے تھے۔ کشمیر میں کبھی کبھی سعد اور ناظر کی اردو میں منظوم خط و کتابت بھی ہوا کرتی تھی۔

دونوں حضرات کا ایک ایک منظوم خط جنوری ۱۹۰۳ء کے مخزن میں "سنت اور ناظر" کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ ناظر کی نظم "جوگی" جس کا ہم اوپر بھی ذکر کر آئے ہیں، اس کا پہلا حصہ کشمیر کے دوران قیام کے اولین زمانے ہی میں لکھا گیا تھا۔ یہ نظم دسمبر ۱۹۰۳ء کے مخزن میں شائع ہوئی تھی۔ "جوگی" ناظر کی شاہکار نظموں میں سے ایک ہے۔ اس نظم کے دوسرے بند میں ناظر نے الفاظ کے پردے میں جوگی کے رہنے کی جگہ اور جوگی کی ایسی بولتی چالتی تصویر کھینچی ہے کہ پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ الفاظ کی نشست و روبست اور پھر سادگیِ بیان ملاحظہ ہو ؎

چیلوں کے جھنڈے گاڑے تھے پربت پر چھاونی چھائی تھی
تھے نیچے ڈیرے بادل کے کہرے نے قنات لگائی تھی
یاں برف کے تودے گلتے تھے جاڑی کے فوارے چلتے تھے
چشمے سیماب اگلتے تھے نالوں نے دھوم مچائی تھی
یاں قلۂ کوہ پہ رہتا تھا اک مست قلندر بیراگی
تھی راکھ جٹوں میں جوگی کی اور انگ بھبوت رمائی تھی
تھا راکھ کا جوگی کا بستر اور راکھ کا پیراہن تن پر
تھی ایک لنگوٹی زیبِ کمر جو گھٹنوں تک لٹکائی تھی
سب خلق خدا سے بیگانہ وہ مست قلندر دیوانہ
بیٹھا تھا جوگی مستانہ آنکھوں میں مستی چھائی تھی

ناظر نے تقریباً سبھی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کا کلام مندرجہ ذیل اجزا پر منقسم ہے "سروشِ غیب" اخلاقی اور صوفیانہ کلام۔ "افکارِ ملی" قومی اور ملی نظمیں "نیا در نگکاں" مراثی اور قطعات تاریخ وفات۔ "تہنیات درباری" مدحیہ قصائد وغیرہ۔ "یاران نجد" "سہرے" "مناظر قدرت" "مطائبات" "متفرقات" "غزلیات" "مثنوی پیر رانجھا" "رباعیات" ناظر غزل کے مخالف تو نہیں تھے لیکن عاشقانہ غزل سرائی کے ضرور مخالف تھے۔ وقت کا عام رجحان نظم کی طرف تھا۔ ناظر نے اس چیز کو اپنی ایک رباعی میں اس طرح بیان کیا ہے ؎

وہ شعر و غزل کا اب زمانہ نہ رہا | وہ مطربِ عشق کا ترانہ نہ رہا
بلبل پہ قفس و شمع پروانہ مرا | وہ نجد میں قیس کا فسانہ نہ رہا

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ناظر غزل بالکل ہی نہیں کہتے تھے۔ غزل کہتے تھے اور خوب کہتے تھے البتہ نظموں کے مقابلے میں غزلوں کی تعداد ضرور کم ہے۔ ان کی ایک غزل کے اشعار تو آج بھی لوگوں کی زبان پر ہیں۔ دو اشعار ذیل میں پیش خدمت ہیں ؎

شہر میں اپنے یہ لیلیٰ نے منادی کر دی | کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانے کو
خون دل پینے کو اور لخت جگر کھانے کو | یہ غذا ملتی ہے جاناں ترے دیوانے کو

ناظر کے یہاں ان کے اپنے زمانے کے حالات کا شدید درک موجود ہے جسے ہم عصری حسیت کہہ سکتے ہیں۔ ہندو مسلم نفاق کا جو بیج انگریزوں نے بویا تھا ہندستان کا تعلیم یافتہ اور سمجھدار طبقہ اسے ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ ناظر میں وطن دوستی اور وطن پرستی کا جذبہ شدید تھا۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے۔ وہ ہندو اور مسلمانوں میں نااتفاقی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ فرقہ پرستی سے انھیں سخت نفرت تھی ... ... اور وہ ایک ملک اور ایک قوم کے حامی تھے۔ ذیل کے اشعار ان کے انھی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں ؎

کاش شیخ و برہمن مل کر کریں کچھ روک تھام
ورنہ بھارت پر کوئی بھاری عذاب آئے گا پھر

جن کی لو سے بزم میں لگ جائے آگ
ایسی شمعوں کو بجھانا چاہیے
گو بہت ہوں راستوں کے ہیر پھیر
سب کو اک منزل پہ لانا چاہیے
خود زباں سے بھی زباں مل جائے گی
پہلے دل سے دل ملانا چاہیئے

کشمیر سے ریٹائر ہونے کے بعد خوشی محمد خاں ناظر ریاست رام پور چلے گئے تھے۔ رام پور میں وہ دسمبر ۱۹۲۰ء سے دسمبر ۱۹۲۲ء تک افسر نو آبادی کے عہدہ پر فائز رہے۔ اس کے بعد وہ پھر کشمیر آ گئے۔ اور عزلت نشینی کی زندگی گزارنے لگے۔ لائل پور میں خوشی محمد خاں کی جائیداد تھی اور کشمیر میں سکونت۔ چنانچہ جاڑوں میں وہ لائل پور چلے جاتے تھے اور گرمیاں کشمیر میں گزارتے تھے۔ خوشی محمد خاں ناظر کا انتقال اوائل اکتوبر ۱۹۴۴ء میں کشمیر میں ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔ محمد امین داراب

جو کشمیر کے جانے پہچانے ادیب اور شاعر ہیں۔ انھوں نے ان کی موت پر ایک مختصر مرثیہ لکھا ہے جس کے آخری شعر سے سنہ ہجری اور سنہ عیسوی میں ان کی تاریخ وفات نکلتی ہے۔ اس مختصر مرثیہ سے ان کی زندگی کے بعض پہلوؤں پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مرثیہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے ؎

دریغا کہ مقدر روز بزم ادب　　ہمہ تیرہ از مرگ ناظر جوش

بباغ ادب بلبل نغمہ سنج　　کہ بودش مدل از سخن گنج گنج

گہہ حکمرانی ہمہ عدل و داد　　دم نغمہ سنجی سخن او ستاد

بعہدش ز رشوت نشانے نماند　　ز بیداد جو داستانے نماند

بدل خواستے دایم آں حق پرست　　رسیدن بفریاد بہر و بدست

دفاعش مدل داد و رنجیدگی　　کہ یاد شدہ دفن سنجیدگی

کنادم پئے تصید تاریخ شست　　گزیدہ دو تاریخ آمد بدست

کے ہجری آں "خوش تمیز" ای عزیز

دگر عیسوی "شاعر خوش تمیز"

۱۹۴۴ء



میر انیس کا غیر مطبوعہ کلام (سلسلہ کا بقیہ)

نمبر شمار	مطلع	ردیف	تعداد اشعار	کیفیت
۸	چشموں میں اشک ہیں جو سراسر بھرے ہوئے	بھرے ہوئے	۲۵	
۸۹	فقیری میں دل بادشاہ چاہیے		۱۶	
۹۰	قاسم تار و حال قتل جو پیاسا ہو جائے	ہو جائے	۱۸	
۹۱	صغرا کہتی تھی جو بابا کی خبر ہاتھ لگے	ہاتھ لگے	۱۵	
۹۲	سنگ مارا ہے جو اس غم سے رہو دل پانی	پانی	۱۶	
۹۳	اے مجرئی فریاد و فغاں کر کے نہ روئے		۱۷	
۹۴	مجرائی بزم شاہ میں آہ و بکا رہے	رہے	۱۵	شمع تعزیت ۱۴ اشعر
۹۵	کوئی پیری کوئی جوانی دیکھ لی	دیکھ لی	۱۴	
۹۶	دکھا یا صنعت نے زور اپنا جب مکاں سے چلے		۲۹	ذخیرۂ ثواب ۸ شعر
۹۷	مجرئی خیمے میں جب برچھیوں والے آئے		۱۶	
۹۸	مجرئی تب دل غمدیدہ کا ارماں نکلے	نکلے	۲۸	
۹۹	دنیا میں آج حشر کا دن آشکار ہے		۹	نوحہ
۱۰۰	اے مجرئی حسینؑ کی بھی کیا جناب ہے		۳۲	



اے مرے محنت کشو اے وقت کے جلوہ نگار

عبرت بہرائچی [redacted]

سبزہ زاروں میں بدل دو تم وطن کے ریگ زار
موسمِ صرصر کے عوض آجائے گلشن میں بہار
دہر میں دو بالا کر دو ہند کا عز و وقار
مادرِ ہندوستاں کو ہے اسی کا انتظار
صحنِ گلشن سے مٹا دو اے تم موجِ غبار

رقص فرمائی رہے دوشِ ہوا پہ نکہتِ بہار
تذکرہ پھولوں کا کیا کانٹوں پہ آجائے نکھار
رنج و غم کا پھر نہ گلشن میں ہو کوئی بھی شکار

تم اگر چاہو تو مٹ جائیں غریبی کے نشاں
خانماں برباد بھی پا جائیں رہنے کو مکاں
اے مسیحائے گلستاں اے مسیحائے زماں
مہربانی کا تمہاری ہے ہر اک امیدوار

درحقیقت جو سینے میں تمہارے آب ہے
وہ ہے گر سورج کہیں پر تو کہیں مہتاب ہے
کیا ہو تم، یہ جاننے کو کل جہاں بیتاب ہے
تم اگر چاہو تو کر سکتے ہو ظلمت کا حصار

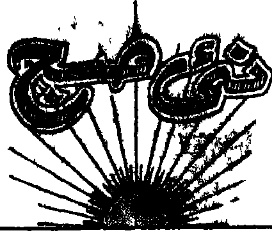
باندھ کر رہیاند کو تم نے کیا ہے وہ کمال
اہلِ دانش کے لیے جو بن گیا ہے اک سوال
بھاکڑا بھی سرزمینِ ہند پہ ہے بے مثال
کیسے کیسے کر دیے ہیں تم نے پیدا آبشار

ٹرے وایوداں[1] تم نے ملک میں پیدا کیے
راکٹ و نایام بھی تم نے وطن کو ہیں دیے
بہت گولے بھی بنائے تم نے بیروں کے لیے
کر نہیں سکتا تمہاری خوبیوں کا میں شمار

چپہ چپہ پر وطن کے ہے تمہیں کل اختیار
ہے وطن کو تم پہ اور تم کو وطن پر اعتبار
لب پہ آتا ہے تمہارا نام سب کے بار بار
آؤ سب مل کر بنا دیں گلستاں کو لالہ زار
اے مرے محنت کشو اے وقت کے جلوہ نگار

[1] ٹ دایوداں، نیٹ ہوائی جہاز

افسانہ



عبدل بھکاری اپنی شکستہ کوٹھری کے کونے میں پڑی ہوئی ٹوٹی جھول کی چارپائی پر بیٹھے پرانے گودڑوں میں اس طرح گر پڑا جیسے زخمی پرندہ مسلسل جدوجہد کے بعد طاقت پرواز ختم ہونے پر بے بس ہو کر گھونسلے میں جا گرتا ہے۔ عبدل آج اپنی زندگی سے بری طرح بیزار تھا۔ زندگی نے اسے کیا بنا کر رکھ دیا۔ کبھی اس کا بھی زمانہ تھا۔ تمنائیں اور آرزوئیں تھیں، عزم و حوصلہ تھا، امنگیں تھیں، بڑا آدمی بننے کی خواہش تھی۔ لیکن قسمت کے کھیل بھی نرے ہی عجیب ہوتے ہیں۔ آج وہ بڑا آدمی ہونے کے بجائے صرف ایک بدنصیب بھکاری تھا اور صاف ستھرے مکان کی جگہ اس تنگ کوٹھری کے تنگ کونے کو آباد کیے ہوئے تھا جو مغلیہ عہد سے بھی زیادہ قدیم تاریخ اپنے میں چھپائے ہوئے تھی۔ اس کی دیوار زمانے کی مسلسل چوٹیں سہتے سہتے کسی مظلوم بیوہ کے چہرے کی طرح اپنے وجود کے سارے نقوش سے بے نیاز ہو چکی تھیں۔ کوٹھری کے اوپر چھپر کے بجائے کویلوؤں کی ایک بوسیدہ چھت تھی جس میں سے آسمان اسی طرح نظر آرہا تھا جیسے جسم پر برص کے داغ نمایاں ہوں۔ کوٹھری کا ایک دروازہ سرے سے تھا ہی نہیں۔ دوسرا تھا بھی تو عبدل کو اسے دن بھر میں کئی دفعہ اٹھا اٹھا کر بڑے سلیقہ کے ساتھ جمانا پڑتا تھا کیونکہ دروازے کے گرتے ہی جون جولائی کی تیز اور گرم ہوائیں سارے آداب کو فراموش کرکے رحم و ہمدردی کے تمام اصولوں کو نظر انداز کرکے بغیر کسی رکاوٹ کے اس کی چارپائی پر جابر حکمرانوں کے بے رحم سپاہیوں کی طرح دندناتی گھس آتی تھیں اور اس کی بوڑھی ہڈیوں میں بندوق کی گولیوں کی طرح پیوست ہو کر اس کی روح تک کو جھنجھوڑ ڈالتی

تھیں۔ آج عبدل در در داتاؤں کی خیر مناکر واپس آیا ہی تھا کہ ہوا کے ایک تیز جھونکے نے کوٹھری کے کواڑ کو دھڑام سے گرا دیا۔ ویسے بھی بوڑھا بھکاری صبح سے شام تک بھیک مانگتے مانگتے اپنے بوڑھے جسم کی ساری طاقت صرف کر چکا تھا، اس پر یہ مزید پریشانیاں اسے زندگی سے اور زیادہ بیزار بنا رہی تھی۔ وہ چارپائی سے بڑی مشکل سے اٹھا اور دروازے کے پٹ کو دوبارہ اس کی جگہ پر کھڑا کرکے پھر بستر پر گر گیا اور خالی خالی نظروں سے ٹوٹی چھت کو گھورنے لگا۔ داتاؤں کو سینکڑوں دعائیں دینے اور در در آواز لگانے کے بعد بھی آج وہ کچھ نہ پا سکا تھا۔ اس کی جھولی خالی ہی تھی اور خالی جھولی کی طرح اس کا پیٹ بھی خالی تھا۔ بالکل خالی۔

دھیرے دھیرے دن بھر کا تھکا ہوا سورج مغرب کے آغوش میں پہنچ گیا اور عبدل کی تاریک کوٹھری کی روشن چھت سرمئی اندھیروں کے طلسم میں اپنے وجود سے ہاتھ دھو بیٹھی لیکن اس کی نگاہیں مسلسل چھت پر گڑی رہیں، یہاں تک کہ شام کے سرمئی جسم کو رات کی سیاہ زنجیروں نے جکڑ لیا اور چھت کے اوپر پھیلے ہوئے آسمان پر چمکتے تارے چھت کے سوراخوں سے جھانکنے لگے، جیسے عبدل کی بے بسی پر مسکرا رہے ہوں۔ عبدل نے چھپ چھپ کر مسکراتے ہوئے ان ستاروں کو دیکھ کر ایک آہ بھری اور سوچا۔ یہ تارے بھی میری مجبوری کا مذاق اڑاتے ہیں۔ یہ تارے جن کے خود کے وجود کی کوئی گارنٹی نہیں، جنھیں خود نہیں معلوم کہ کب ایک کالی گھٹا آکر اچانک ان کی زندگی کو ختم کر دے گی۔ عبدل نے اس تکلیف دہ خیال سے خود کو بچانے کے لیے

کر دوشالی اور اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ عبدل کے آنکھیں بند کرتے ہی اس کے چہرے پر پڑی ہوئی سینکڑوں جھریوں کی طرح اس کے دماغ میں بھی سینکڑوں آڑی ترچھی لکیریں ایک دوسرے سے مل مل کر نئے نئے نقش بنانے لگیں اور خالی پیٹ سے اٹھنے والی ٹیسیں ان نقوش میں رنگ بھرنے لگیں۔ اچانک ہی اس کے دماغ کے اسکرین پر داتاؤں کے سخت چہرے ابھرے اور پھر ان کی آوازیں گونجنے لگیں بھوکا ہے۔ بوڑھا ہے۔ کمزور ہے۔ کام نہیں بنتا تو مرکیوں نہیں جاتا مرکیوں نہیں جاتا؟ مرکیوں نہیں جاتا کی آواز ٹوٹے ہوے ریکارڈ پر رکھی ہوئی سوئی سے نکلنے والی آواز کی طرح بار بار گونج کر عبدل کے دماغ پر لوہار کے ہتھوڑے کی طرح چوٹیں مارنے لگی۔ وہ تڑپ کر رہ گیا اس کا دل چاہا کہ وہ تمام لوگوں کا گلا دبادے۔ اس نے غصہ میں اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ اُف کتنے بے درد اور بے رحم ہیں یہ لوگ ہمدردی اور انسانیت سے تو جیسے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اوہ میں کیا کروں۔ میں بھی تو کتنا مجبور ہوں۔ کتنا بے بس ہوں، نہ انہیں کچھ کہہ سکتا ہوں، نہ انھیں مار سکتا ہوں، نہ ہی خود مر سکتا ہوں اور نہ ہی پیٹ کی آگ پر پانی ڈال سکتا ہوں — نہ اپنے حق کے لیے آواز بلند کرسکتا ہوں۔ سماج کے بے رحم ٹھیکیداروں نے میری زندگی سے سارے حقوق اس طرح غائب کر دیے ہیں جس طرح سائنسی عہد نے انسانی چہروں سے رونق۔ اُف! حق۔ حق۔ میرا حق مجھے کیسے ملے گا۔ میں اپنے حقوق کس طرح حاصل کرسکتا ہوں۔ حق کے لفظ نے عبدل کے دماغ میں داخل ہو کر ایک نئی ہلچل پیدا کر دی اور بے اختیار صبح کا ایک واقعہ اس کے دماغ کے پردے پر ابھر آیا۔ صبح جب وہ ٹیکسٹائل مل کے سامنے سے اپنا خالی کٹورا لیے گزر رہا تھا کہ لوگوں کا ہجوم دیکھ کر رک گیا تھا بہت سے مزدور مل کے دروازے کے سامنے جمع تھے اور ان کے سامنے اونچائی پر کھڑا ایک مزدور لیڈر پرجوش انداز میں کہہ رہا تھا "اس مل پر اور اس مل کی آمدنی پر ہمارا اتنا ہی حق اور اختیار ہے جتنا سیٹھ بلدیو پرشاد کا۔ اگر وہ اس مل کے مالک ہیں تو اس ملکیت میں ہمارا بھی حصہ ہے کیونکہ اس میں ہماری محنت مشقت اور خون پسینہ شامل ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ سیٹھ تو مل کی بڑھتی ہوئی آمدنی

سے عیش کریں اور ہم بڑھتی ہوئی مہنگائی میں فاقے کریں۔ ہم نے بار بار اس زیادتی کی جانب توجہ دلانے کی کوشش کی اور اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کیا لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے سرمایہ داروں کو ہم سے کوئی ہمدردی نہیں انھیں ہماری اور ہمارے بچوں سے زیادہ اپنی آمدنی کی فکر رہتی ہے چنانچہ ہماری یونین نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم ان کی بے حسی کو ختم کرنے کے لیے اور اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے متحد ہو کر جدوجہد کریں گے اور اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں گے جب تک کہ ہمارے مطالبات منظور نہیں ہوتے۔ مزدور رہنما کی تقریر تالیوں کی گڑگڑاہٹ میں ختم ہوگئی۔ اچانک عبدل کے خیالات کا سلسلہ دھڑام کی آواز سے ٹوٹ گیا اور وہ اپنے تھکے ہوے جسم کو بستر سے اٹھا کر گرے ہوے دروازے کو دوبارہ اس کی جگہ پر جمانے کے لیے چل پڑا۔ اس ناخوشگوار فرض کو انجام دینے کے بعد ایک دفعہ پھر اس کا پرانا پلنگ اس کے بھوکے وجود سے دب کر سسک اٹھا۔ پھر دھیرے دھیرے رات کی بڑھتی ہوئی سنسان تاریکی نے اس کی بڑھتی ہوئی بھوک کو شکست دے دی اور ہوا کے نرم جھونکوں نے بھوک کے احساس پر غالب آکر اسے خوابوں کی بے فکر دنیا میں پہنچا دیا۔ خواب میں عبدل بھکاریوں کے ایک بڑے جتھے کو خطاب کرتے ہوے کہہ رہا تھا "ہم بھی انسان ہیں سماج پر ہمارا بھی حق ہے۔ انسانیت کے ناطے دنیا کے لوگوں کو جن کے پاس دولت ہے روپیہ پیسہ ہے یہ سوچنا چاہیے کہ اس پر ہمیں کا حق ہے اور انھیں حقداروں کو ان کا حق دینا چاہیے۔ ہم مجبور ہیں، بے بس ہیں کما نہیں سکتے ہماری مدد کرنا اور ہماری بھوک مٹانا ان کا فرض ہے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے یا اس بات کو نہیں سمجھتے تو ہمیں انھیں یہ بات سمجھانا پڑے گی لیکن یہ کام کسی ایک آدمی کے بس کا نہیں بلکہ اس کے لیے ہمیں آپس میں متحد ہو کر یونین بنانا پڑے گی تاکہ ہم میں طاقت پیدا ہو اور ہم اپنے حق کے لیے لڑسکیں" بوڑھا عبدل بولتا رہا لیکن اس نے محسوس کیا کہ اس کی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دے رہا ہے نہ ہی جلسہ تالیوں سے گونج رہا ہے ابھی عبدل اس بات کو محسوس ہی کر پایا تھا کہ مجمع سے فضل کا لڑکا اسلم جسے اس کے باپ نے اسکول میں داخل کرا دیا تھا نکل کر عبدل کے سامنے

کھڑا ہوگیا اور معصومانہ انداز میں عبدل سے پوچھنے لگا:

عبدل چاچا! تم میں طاقت ہے۔ یونین بنا سکتے ہو تو محنت مزدوری کرکے پیٹ کیوں نہیں بھرتے؟ بھیک کیوں مانگتے ہو؟ بھیک کے لیے تو لڑنے کو تیار ہو۔ مزدوری کے لیے تیار کیوں نہیں ہوتے؟ جب تم کام کرتے ہی نہیں تو پھر حق کیا؟

عبدل کے پاس اسلم کے سوالوں کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ خاموش نظروں سے مجمع کو دیکھنے لگا۔ سب ہی خاموش تھے۔ عبدل نے اپنی نگاہیں جھکالیں۔ اسلم کی آواز اس کے شعور پر ہتھوڑے کی طرح چوٹیں مارنے لگی۔ اس نے محسوس کیا جیسے اسے بھرے مجمع میں ننگا کر دیا گیا ہو۔ وہ ذلت اور شرم کے مارے پسینے سے تربتر ہوگیا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اپنی نظریں اوپر اٹھائیں۔ مجمع جا چکا تھا اور اس کی آنکھوں کے سامنے کٹے ہوئے دروازے کے باہر کوٹھری کی تاریکی سے دور افق پر روشنی کی کرنیں جھلملا جھلملا کر آگے بڑھنے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ اس نے گھبرا کر بستر چھوڑ دیا۔ پھر صبح کی سنہری کرنوں نے دیکھا کہ بوڑھا عبدل بھیک کے کٹورے کے بجائے ہاتھ میں ڈلیا لیے چہرے کی جھریوں میں مسکراہٹ چھپائے ایک نئے عزم کے ساتھ مزدوروں کے اڈے کی طرف بڑھ رہا ہے۔



منشی مسیح الدین ... [illegible]

وہ لوگ جنھوں نے میرے آگے سر ٹیک کر پڑھا آسودہ حال ہوکر کہیں مل جاتے ہیں تو توقع رکھتے ہیں کہ میں انھیں سلام کروں۔ (یہ اشارہ رئیس الدین کی طرف تھا جس کا ذکر اوپر آیا، جو وکیل ہوگیا تھا۔ مکان (رئیس منزل) بھی بنوالیا تھا۔ پھر پاگل ہوگیا۔ یہ مشیت ایزدی ہے) مگر تم سے یہ اندیشہ ہرگز نہیں۔ تم عالم فاضل باپ کے فرزند ہو۔ پھر فرمایا

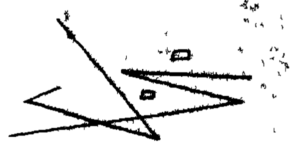
[illegible]

سفید بال اور سفید ہوگئے (مسعود ...)

تجھے عضب نہیں تو اور کیا ہے کہ ۲۵ سالہ عورت بھی انھیں بڈھے کہہ کر پکارے۔ ان کا بس چلتا تو وہ اسے بڑے میاں کہنے کا مزا اسی وقت چکھا دیتے لیکن پٹائی کے ڈر اور پان والے کی دوکان پر لگے ہوئے آئینے نے ان کا ہاتھ روک لیا۔ پولیس والے کے ڈنڈے نے ڈرایا اور پان والے کے آئینے نے سفید بال دکھا کر شرما دیا۔

اب وہ شرمندہ کرنے والے سفید بالوں کو زیادہ دنوں تک برداشت نہیں کرسکتے تھے انھوں نے آخری فیصلہ کرلیا کہ وہ ان موذی سفید بالوں کا منہ کالا کیے بغیر دم نہیں لیں گے۔ انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ فوراً دوکان پر جاکر خضاب خریدا اور بڑھاپے میں جوانی کا خواب دیکھتے ہوئے شہر سے دیہات روانہ ہوگئے۔ جانے کا زمانہ ریل کی بھیڑ بھاڑ۔ جیب میں سدا بہار خضاب ہونے کے باوجود بلا عینک کے بوڑھا پا قدم قدم پر ٹھوکریں مارتا اور جوانی کا خواب پاش پاش کرتا رہا۔ یہ پچھتا رہے تھے، خضاب مسکرا رہا تھا، سفید بال اور سفید ہوگئے تھے۔





پیام فتح پوری

وہ شدتِ الم ہے دعا کو ترس گئے
ساز شکستہ ہیں کہ صدا کو ترس گئے

کسے کھلا نہیں چمنِ خونِ دل نہ پوچھ
رنگِ حنا و دستِ حنا کو ترس گئے

یہ دشتِ آرزو، یہ کڑکتی غموں کی دھوپ
گھنگھور گیسوؤں کی گھٹا کو ترس گئے

کیا پوچھتے ہو گوش بر آواز کب سے ہیں
جھکے ہوئے لبوں کی دعا کو ترس گئے

یا اپنے دم قدم سے تھی نشو و نمائے زیست
یا زندگی کی آب و ہوا کو ترس گئے

ہر سمت ہے جہاں میں کدورت بھری ہوئی
مدت سے اہلِ صدق و صفا کو ترس گئے

یا ہر ادائے زیست ہمارے ہی دم سے تھی
یا ہم ہی زندگی کی ادا کو ترس گئے

سجتی ہے کب وہ محفلِ یاراں کہ آہ ہم
یارانِ ہم نفس کی صدا کو ترس گئے

ہر رہ گزر کو ہم سے ملی منزلِ مراد
یا ہم ہی منزلوں کی ہوا کو ترس گئے

اے ساکنانِ شہرِ محبت کہاں ہو تم
بزمِ خلوص و بزمِ وفا کو ترس گئے

غزل

احترام اسلام اشک

لے اٹھ رہا ہوں بزم سے میں تشنگی کے ساتھ
ساقی مگر یہ ظلم نہ ہو اب کسی کے ساتھ

ہنس ہنس کے جی رہا ہوں مگر میرے دل سے پوچھ
وابستہ کتنے غم ہیں میری زنہ.گی کے ساتھ

پھر دیکھئے کس قدر ہے سکوں بخش زندگی
پہلے کوئی گذار تو لے سادگی کے ساتھ

کھویا ہوں اس کے حسن کی رنگینیوں میں میں
الجھا ہوا ہے وہ بھی مری سادگی کے ساتھ

بیہم ستم نے آپ کے مجھ کو سکھا دیا
ہر امتحانِ غم سے گزرنا خوشی کے ساتھ

میں خود پہ ہنس پڑا ہوں تمھیں دیکھنے کے بعد
اک اجنبی دیار میں اک اجنبی کے ساتھ

حاضر ہے اشکؔ آیئے بسمل بنایئے
کیوں جا رہے ہیں آپ شکستہ دلی کے ساتھ

خسرو متین خسرو

جنگ آزادی کا ایک جانباز سپاہی



مولانا ارشاد دلیانوی

ہندستان کی آزادی ہزاروں شہیدوں اور لاکھوں جانبازوں کی رہین منت ہے۔ یہ آزادی کے متوالے عیش و عشرت، دھن دولت اور گھر بار کو چھوڑ کر آزادی کی راہ میں نکل پڑے۔ اس راہ میں انھوں نے لاتعداد زخم کھائے، تکلیفیں سہیں اور دار و رسن کی منزلیں طے کیں۔ لیکن اپنے موقف سے ایک انچ ہٹنا گوارا نہ کیا۔ انھوں نے غلامی کی زندگی پر موت کو ترجیح دی۔ ان مجاہدین آزادی میں سے ہزاروں تو شہادت کا جام نوش فرما چکے ہیں مگر کچھ ابھی تک بقید حیات ہیں۔ ان لوگوں میں سے بعض تو نام و نمود اور پبلسٹی سے بے نیاز گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ انھی میں سے ایک ہیں مجاہد آزادی مولانا ارشاد دلیانوی۔

حکیم چودھری ارشاد اللہ خاں ولد چودھری احمد اللہ خاں، مقیم شکر کوئی سالکڑی گیٹ شہر میرٹھ، ۹ فروری ۱۹۰۵ء کو دلیانہ ضلع میرٹھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم آپ نے گاؤں ہی کے مدرسے میں پائی اور پھر اس کے بعد تحصیل علم کے لیے آپ میرٹھ تشریف لائے۔ جہاں سے آپ نے عالم، فاضل اور مولوی وغیرہ کی اسناد حاصل کیں۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد جب اپنے اردگرد نظر ڈالی تو ہندستان کو غلامی کی زنجیر میں جکڑا ہوا پایا۔ اس وقت گاندھی جی کی تحریک آزادی زوروں پر تھی۔ نوجوان گاندھی جی کی آواز پر لبیک کہہ رہے تھے۔ آپ بھی اس فضا کو دیکھ کر متاثر ہوئے اور سنہ ۱۹۲۳ء میں کانگریس اور خلافت کمیٹی کے ممبر بن گئے۔ یہیں سے آپ کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔

آپ کو اردو شاعری سے شروع ہی سے ایک خصوصی لگاؤ رہا ہے۔ آپ زمانۂ طالب علمی سے ہی شعر کہا کرتے تھے چنانچہ اس موقعہ پر آپ کے اس ذوق نے بڑا ساتھ دیا۔ آزادی سے قبل کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اردو شاعری صرف "گل و رخسار" تک ہی محدود ہے لیکن مولانا ارشاد نے اپنی شاعری کے ذریعے یہ ثابت کر دیا کہ اردو زبان اور اردو شاعری دنیا کی کسی زبان سے کم نہیں۔ یہ ہماری زندگی کے ہر مسئلے کو حل کر سکتی ہے اور ضرورت پڑنے پر تلوار سے بھی زیادہ کام دے سکتی ہے۔ آپ نے اپنی شاعری کے ذریعے نوجوان دلوں کو گرمایا اور نیند کے ماتوں کو جھنجھوڑ کر بیدار کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے آزادی کی شان میں کئی قصیدے بھی لکھے تحریک آزادی کو بڑھانے کے لیے گیت بھی گائے۔ خاص طور سے ان کی یہ نظمیں تو بے حد مقبول ہوئیں۔ میرٹھ کے بچے بچے کی زبان پر یہی شعر تھے

شیر بکری کا جھگڑا ہوا آج کل — آبرو رکھنا مولا تیرے ہاتھ ہے
جب مزہ ہے کہ گھر گھر میں چرخہ چلے — لیکے سوراج مہاراج گاندھی چلے

جب ۱۹۲۸ء میں مولانا اسد اللہ خاں گرفتار کر لیے گئے تو میرٹھ کے سرکردہ لیڈر جناب نجم الدین احمد صاحب مرحوم نے زور دیا کہ اس وقت میرٹھ میں سوائے مولانا ارشاد کے ایسا دوسرا کوئی شخص نظر نہیں آتا کہ جس کو جمعیۃ العلماء کا ناظم بنایا جا سکے۔ مولانا موصوف نے لاکھ کہا کہ میں بحیثیت ایک والنٹیر ہی زیادہ بہتر کام کر سکتا ہوں مگر کانگریسی لیڈران کے آگے ان کی ایک نہ چلی اور آپ کو جھکنا پڑا۔ چنانچہ آپ ناظم بنا دیے گئے۔ ناظم ہونے کے بعد آپ نے میرٹھ اور اس کے

کے بڑے بڑے جلسوں میں دھواں دھار تقریریں کیں۔ آپ کی تقریروں میں طنز اور خوش طبعی کا پہلو زیادہ ہوتا تھا اسی لیے عوام آپ کی تقاریر کا بڑے شوق سے انتظار اور خیر مقدم کیا کرتے تھے۔

ایک روز آپ کو علم ہوا کہ میری گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو چکا ہے مگر آپ کو تحصیل باغپت اور تحصیل سردھنہ جانا تھا کیونکہ ان علاقوں میں آپ کی تقریروں کی بڑی ضرورت تھی۔ آپ بے خوف و خطر اپنی منزل کو روانہ ہو گئے اور باغپت، بڑوٹ چھپرولی اور کوتانہ وغیرہ میں وہ تندرو دار تقریریں کیں کہ لوگ آپ کی ہمت اور شجاعت کو دیکھ کر عش عش کر اٹھے۔ تحصیل باغپت سے فارغ ہو کر آپ تحصیل سردھنہ اور مواانہ کے دیہاتوں کو اپنی تقاریر سے گرمانے چلے گئے۔

وہاں سے اکتوبر ۳۲ء میں لوٹے اور جب یہ دیکھا کہ اب میری کوئی ضرورت نہیں رہی ہے تو کوتوال میرٹھ کو ایک پرچہ لکھا کہ میں نے سنا ہے کہ میری گرفتاری کا وارنٹ جاری ہو چکا ہے اور پولس میری تلاش میں سرگرداں ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو میں آزادی وطن کی خاطر اپنے آپ کو بخوشی گرفتار کرانے کے لیے تیار ہوں۔ فوراً کوتوال صاحب میرٹھ معہ چند سپاہیوں کے آئے اور آپ کو گرفتار کر کے جیل پہنچا دیا گیا۔ مسٹر رام سہائے مجسٹریٹ درجہ اوّل کے اجلاس میں مقدمہ ۵۵ و ۱۹۳ دفعہ ۱۰۸/۱۱۲ ضابطہ فوجداری کر کے آپ پر چلایا گیا، جہاں سے آپ کو ایک سال کی قید کا حکم ہوا۔

جیل کے اندر جھنڈے کی سلامی بلوانے والے کے ساتھ انتہائی تشدّد سے کام لیا جاتا تھا۔ جیل کے حکام کی جانب سے یہ حکم ہو گیا تھا کہ اگر کوئی شخص جھنڈے کی سلامی بلوانے کی کوشش کرے تو اس پر ڈنڈوں کی بارش کر دی جائے۔ اس کے علاوہ بھی مختلف طریقوں سے اس کو اذیتیں دینے کا حکم تھا۔ ابتدا میں چند لوگوں نے جھنڈے کی سلامی بلوائی مگر جب یہ حکم ہوا تو کسی کی ہمت نہ پڑی۔ مولانا موصوف نے جب یہ دیکھا کہ کوئی جھنڈے کی سلامی بلوانے کے لیے تیار نہیں تو آپ نے کہا کہ آج سلامی میں بلواؤں گا۔ ساتھیوں نے یہ سمجھا کہ مذاق کر رہے ہیں کیونکہ اس سے قبل مولانا کبھی جھنڈے کی سلامی میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ مگر جب آپ بارک سے نکل کر زور زور سے چلانے لگے۔

"وجئی وشو ترنگا پیارا — جھنڈا اونچا رہے ہمارا"

تو دوسرے ساتھیوں نے بھی آپ کی آواز پر لبیک کہا۔ آن کی آن میں پچیس تیس ساتھی جمع ہو گئے۔ جیل کے حکام اور سپاہیوں نے جب یہ کیفیت دیکھی تو ڈنڈے اور لاٹھی لے کر دوڑے اور مجمع پر برسانے لگے۔ مگر گیت نے دلوں میں کچھ ایسا جوش بھر دیا تھا کہ کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلا اور جھنڈے کی سلامی برابر ہوتی رہی۔ اس موقع پر لالہ سکھ ٹولہ پھلاودہ والوں نے بڑی دلیری کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے چلا کر کہا:

"ہم جیتے جی جھنڈے کی سلامی بند نہیں کریں گے۔ کوئی اپنی جگہ سے ایک انچ نہ ہٹے۔"

آخرکار حکّام جیل کو اپنی ہار ماننی پڑی اور جھنڈے کی سلامی پوری ہوئی۔ اگلے دن مولانا موصوف کو سپرنٹنڈنٹ جیل نے طلب کیا اور کل کے واقعہ کی وضاحت چاہی۔ آپ نے صاف صاف سب کچھ بتا دیا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل مولانا کی اس دلیری پر تاؤ کھا گیا اور اس نے جھلّا کر پندرہ دن کے لیے ہینڈ کف کی سزا دی۔ آپ نے مسکرا کر جواب دیا: "تھینک یو۔"

سپرنٹنڈنٹ جیل نے کہا: "اچھا ڈنڈا بیڑی بھی رہے گی۔"

آپ نے پھر فرمایا: "تھینک یو ویری مچ۔" اس پر اس نے ٹاٹ کی وردی کا اور اضافہ کر دیا۔ آپ اسی شان سے تقریباً دس ماہ جیل میں رہے۔ اسی دوران گاندھی اروِن پیکٹ ہو گیا جس کے تحت تمام سیاسی قیدی رہا کر دیے گئے۔ اس کے بعد آپ بہ سلسلۂ روزگار لاہور چلے گئے اور ۴۴ء تک برابر سیاسی تقاریر کرتے رہے جس کے صلے میں آپ کو بورسٹل جیل لاہور کی دو مرتبہ مہمانی کرنی پڑی۔ کچھ دنوں فیروز پور جیل کا بھی پانی پیا۔ ۴۵-۴۶ء میں میرٹھ واپس آئے اور تحصیل ہاپوڑ کے دیہاتوں میں کانگریسی امیدوار کے حق میں تقریریں کرتے رہے۔ اسی دوران کئی جگہ مخالف پارٹیوں کی طرف سے آپ پر جانی حملے بھی ہوئے مگر ہر بار اپنی سخت جانی کی وجہ سے بچتے رہے۔

حصول آزادی کے بعد آپ نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار

(باقی صفحہ ۴۵ پر)

جواہرات

محمود نیازی

جواہرات جوہر کی جمع الجمع ہے لیکن صرف اردو میں ہی مستعمل ہے۔ جوہر کی جمع جواہر ہے اس کا اطلاق مفرد پر بھی ہوتا ہے جواہرات کو عام طور پر رتن بھی کہا جاتا ہے۔ ان کا استعمال زمانہ قدیم سے ساز سنگار، زیب و زینت، تزئین و آرائش اور نشان دولت و عزت کے لیے ہوتا آرہا ہے۔ ان کے زیورات بنائے جاتے ہیں، چاندی اور سونے کے زیورات میں ان کو جڑا جاتا ہے، بادشاہوں کے تاج اور ملکہ کے گلے کی زینت بنتے ہیں۔ اس کے علاوہ جنگی ہتھیاروں کے دستوں کو منقش کرنے میں، برتن بنانے اور عمارتوں کی پچی کاری میں بھی ان کا استعمال ہوتا ہے۔ ان کے سگریٹ کیس، گلدان، قلمدان، پیپر ویٹ، شیروانی اور قمیص کے بٹن بھی بنائے جاتے ہیں۔ غرضکہ جواہرات بادشاہوں، سرداروں اور امیروں کے لیے تعیش پسندی کی چیز ہے۔ البتہ غریب لوگوں میں ان کا استعمال دواؤں کی حد تک محدود ہے۔ ہاں ادنیٰ اور کم قیمت رتنوں کا استعمال عام لوگ کرتے ہیں جیسے عقیق، یشب، فیروزہ، مونگا، کچی و کچے یاقوت اور ان کی چنیاں، تامڑا، پھیکے رنگ کے نیلم و پکھراج، بدرنگے زمرد اور مرجان وغیرہ۔

مشہور ہے کہ آغا خاں سوم کو جواہرات کا بہت شوق تھا اور ان کے پاس تھے بھی بہت۔ ایک بار جب وہ میر عثمان علی خاں بہادر نظام حیدر آباد سے ملنے گئے، تو دوران گفتگو جواہرات کا ذکر بھی ہوا۔ آغا خاں کو نظام کے جواہرات دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ نظام نے اپنے سرہانے کی میز سے ایک میلا کچیلا گرد آلود پیپر ویٹ اٹھا کر آغا خاں کے ہاتھ میں دیدیا۔ آغا خاں نے جب اس کو پانی سے دھو کر صاف کیا تو پیپر ویٹ کا سرخ احمریں رنگ چمکنے لگا معلوم ہوا کہ وہ پیپر ویٹ ایک ڈال یاقوت کا تھا۔ آغا خاں اس کو دیکھ کر ششدر رہ گئے۔ اس وقت دنیا کا مشہور ترین ہیرا "کوہ نور" تاج برطانیہ کی زینت ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ ہیرا سورج دیوتا نے کسی شخص کو دیا تھا۔ پھر سنہ ۳۰۰۰ ق م اس کو راجہ کرن انگ اپنے گلے میں پہنا کرتا تھا۔ اس کے بعد بکرماجیت کے پاس رہا۔ صدیوں تک اسی طرح بادشاہوں کے قبضہ میں رہتے ہوئے آخر کار سنہ ۱۸۴۹ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھ لگا اور اس نے ملکہ وکٹوریا کو نذر کر دیا۔ یہ ہیرا اپنی آب و تاب، جسامت اور قیمت کے لحاظ سے دنیا میں فرد ہے۔ اس ہیرے کے متعلق طرح طرح کی روایتیں اور افسانے مشہور ہیں جو اکثر کتابوں میں مذکور ہیں۔ اسی طرح اور رتنوں کی تاریخی اہمیت، ان کے اثرات اور ان کی چوریوں پر مضامین ملتے ہیں لیکن جواہرات کی اقسام، شناخت، افادیت، افعال و خواص اور نسبت نجوم پر سیر حاصل تبصرہ کم ملتا ہے۔ ان کا استعمال چونکہ ایک مخصوص اور محدود طبقہ میں ہوتا ہے اس لیے عام طور پر لوگوں کو ان سے واقفیت کم رہتی ہے۔ اس مختصر مضمون میں چند مخصوص اور مشہور جواہرات کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

(۱) **لعل**۔ لعل ہندی لال کا معرب ہے۔ اس پتھر کو جواہرات میں قسم اول کا سمجھا جاتا ہے اس کا رنگ سرخ و چمکدار بیر بہوٹی کی مانند ہوتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ لعل کا علیحدہ کوئی وجود نہیں ہے۔ بلکہ درحقیقت یہ کوکب اور گوہر شب چراغ یاقوت کا نام ہے جو نہایت آبدار شفاف اور دہکتے ہوئے انگارے کی مانند سرخ ہوتا ہے بعض کا قیاس ہے کہ سرخ ہیرے کو کہتے ہیں۔ حقیقت کچھ بھی ہو لیکن مشہور

روایت بھی ہے کہ لعل کی تابانی اور چمک اس قدر ہوتی ہے کہ اس کے پرتو سے اندھیرے میں سوئی پرولی جائے۔ قدیم کتب میں بھی اس کا تذکرہ موجود نہیں ہے۔ ... الاحجار نے لکھا ہے کہ تین سو سال قبل بدخشاں کا ایک پہاڑ بسبب زلزلۂ عظیم شق ہو گیا تھا اور اس میں سے بیضہ کے برابر لعل برآمد ہوئے تھے۔ یہ لعل مختلف الالوان تھے۔ کوئی سیاہی مائل بنفشی تھا تو کوئی پیازی رنگ۔ کسی کا رنگ کھجور کا تھا تو کوئی سرخ۔ تراشنے کے بعد سرخ لعل سب سے بہتر ثابت ہوئے۔ ان لعلوں کا رنگ سرخی میں یاقوت سے کسی قدر کم تھا اور اس میں ارغوانی اور بنفشی رنگ بھی شامل تھا۔ دکن میں بھی لعل پیدا ہوتے ہیں لیکن بدخشاں اور ختلان کے لعل اب بھی مشہور ہیں۔

لعل کی افسانوی اہمیت بھی بہت ہے۔ عربی، فارسی اور اردو ادب میں جگہ جگہ "لال" کا ذکر موجود ہے۔ میر امن نے باغ و بہار میں خواجہ سگ پرست کے کتے کا ذکر کیا ہے۔ نیشاپور کے اس سوداگر نے اپنے کتے کے گلے میں سات سات مثقال وزن کے بارہ دانے لعل بے بہا کے ڈال رکھے تھے۔ اسی لیے وہ خواجہ سگ پرست کے نام سے مشہور تھا۔ اب یہ تلمیح ایسے شخص کے لیے استعمال ہوتی ہے جو اپنے ملازمین اور جانوروں کو اپنے عزیز و اقارب سے برتر سمجھے اور اشراف کے مقابلے میں رذیل کو فوقیت دے۔

لال کا رنگ چونکہ سرخ احمریں ہوتا ہے اسی لیے لالہ کے پھول کا یہ نام رکھا گیا ہے۔ سرخ ہونٹوں کو بھی "لب لعل" کہا جاتا ہے ؎

رنگیں لب لعل کی صدا ہے　　کیا خوب یہ لال بولتا ہے (وزیرؔ)
شاہ کا لال ہے وہ صاحب جوہر یہ ہے　　ہنستے ہونے کے لیے لعل بدخشاں پایا (جلیلؔ)

(۲) الماس (ہیرا)۔ جواہرات میں ہیرے کا دوسرا درجہ ہے اور اگر لعل کو فرضی پتھر سمجھ لیا جائے تو پھر اس کا درجہ اول ہو جاتا ہے۔ یہ سفید، درخشاں، شفاف اور سخت ترین رتن ہے۔ اس کو ہر موسم میں پہنا جاتا ہے۔ اس لیے اسے "سدا بہار" کا جوہر کہتے ہیں۔

ہیرے کا شمار رنگ و سخت ترین نفیس پتھروں میں ہوتا ہے۔ یہ عام طور پر سفید رنگ کا ہوتا ہے اور اس میں سے آفتاب کی مانند کرنیں پھوٹتی ہیں۔ اس کے رنگ اور قسمیں بھی مختلف ہیں جیسے نیلگوں، زرد، سیاہ، سرخ، سبز اور گلابی جھلک کا کم رنگ۔ سیاہ ہیرے کو ہندی میں تیلیا کہتے ہیں۔ سبز، گلابی اور سیاہ جھلک والے ہیرے چاہے وہ کم رنگ ہوں یا خالص یک رنگ کمیاب سمجھے جاتے ہیں۔ تیلیا اور داغ دار سفید کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ اگر داغ سرخ ہوں تو اس کو دیسی کہا جاتا ہے۔ رنگ کے اعتبار سے یہ مختلف ناموں سے پکارا جاتا ہے جیسے:

بسنت برن ہیرا۔ زرد رنگ کی جھلک کا ہیرا جو زیتی اور سُلقی بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے استعمال سے مرض کا دفعیہ (یرقان) ہو جاتا ہے۔

نوسادری۔ نوسادر کے رنگ کے بالکل سفید ہیرے کا نام ہے جو سب سے بہتر سمجھا جاتا ہے۔ اس کو "برہمن ہیرا" بھی کہتے ہیں۔

قلبوسی۔ چاندی کے رنگ کا سفید ہیرا جو سفیدی میں "نوسادری" سے کم ہوتا ہے۔ اسکو سیمابی الماس بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے بڑے نگوں کو مقدونی اور رسینی بھی کہتے ہیں۔

ترملی۔ ہیرے کی مادین کا نام ہے جو چمک میں کم، سختی میں نرم اور افعال میں گرم ہوتا ہے۔ یہ ہیرے کی ادنیٰ قسم ہے۔

سب سے بہتر اور قیمتی ہیرا وہ سمجھا جاتا ہے جو سفید، ہمہ یک رنگ، شفاف، براق اور وزن میں بڑا ہو۔ ہیرے کے متعلق عام خیال یہی ہے کہ یہ کوئلہ سے بنتا ہے۔ اسی لیے کوئلہ، ہڑتال ورقی اور ابرک کی مانند اس کے بھی ورق ورق ہوتے ہیں، لیکن یہ ورق غیر محسوس اور باہم پیوستہ ہوتے ہیں۔ بعض لوگ ان ورقوں کو جدا کرنے میں بھی درک رکھتے ہیں لیکن یہ انتہائی مہارت کا کام ہے۔

ہیرے کو نکالنے کا طریقہ یہ ہے کہ زمین کو کھود کر وہاں کی خاک لے لی جاتی ہے اور پھر اس خاک کو زمین پر پھیلا کر پانی چھڑکا جاتا ہے اور ارتفاع آفتاب کے وقت اس پر نظر رکھی جاتی ہے۔ جس جگہ بھی بجلی سی کوندتی معلوم ہوتی ہے وہاں کی خاک پر بھی یہی عمل دہرا کر ریزہ ہائے الماس چن لیے جاتے ہیں۔ ابتدا میں تراش سے قبل ہیرے میں صفائی و چمک کم ہوتی ہے لیکن اس کی تراش کے بعد اس کے حسن و نکھار ظاہر ہوتے ہیں۔ ہیرے کی تراش کا کام ہندوستان میں زمانۂ قدیم سے ہوتا آ رہا ہے۔ اس کام کے لیے سورت کا مقام مشہور ہے۔

لیکن بلجیم کے تراشیدہ ہیرے سب سے بہتر اور بیش قیمت سمجھے جاتے تھے۔ ہیرے کی تراش میں اب سر ترشیل کا نام بھی سر فہرست ہے۔ یہ بات غلط طور پر مشہور ہے کہ ہیرے کو سیسہ سے کاٹا جاتا ہے۔ درحقیقت ہیرے کی تراش سیاہ ہیرے سے ہی ہوتی ہے کیمیں دیگر عمل، آگ یا جدید آلات کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا ہے لیکن ہندستان میں مخصوص ماہرین اور فقیر اس کا کشتہ کر لیتے ہیں جو بہترین نافع خیال کیا جاتا ہے۔ ہندستان میں ہیرے کی کانیں دکن اور پنا کی مشہور ہیں۔

ہیرے کی سفیدی ضرب المثل کی حیثیت رکھتی ہے یونس کا شعر ہے۔

رنگ ایسا کہ میلا ہو جسے دیکھ کے الماس
ابر ایسا کہ پی لے سنط خوں ا ورنہ مجھے پیاس

(۳) یاقوت۔ معدنی پتھروں میں اس نفیس اور عظیم القدر پتھر کا نمبر تیسرا ہے۔ یہ مختلف رنگ اور اقسام کا پایا جاتا ہے جیسے سرخ، زرد، کبود، پستئی اور سفید۔ ان رنگوں کی ہر قسم میں تیز رنگ، متوسط اور کم رنگ کی ہوتی ہے۔ ان میں سے بہترین قسم بہت زیادہ سرخ رنگ کی ہے جو قندھاری انار کے دانوں کی مانند سرخ ہو۔ قیمت کے تعین کے لیے ضروری ہے کہ سرخ رنگی کے ساتھ ساتھ شفاف، بے جرم، بے داغ اور بے رنگ بھی۔ وزن میں بڑا ہو اور اس کے تمام اجزا کا رنگ متساوی ہو۔ الماس کے بعد سختی میں یاقوت کا ہی نمبر آتا ہے۔ ان میں بھی یاقوت کبود سخت ترین ہوتا ہے۔ اس کے بعد سختی میں سرخ، زرد، پستئی اور سفید کا درجہ ہے۔ زرد یاقوت کو عربی میں بسراق اور ہندی میں پکھراج کہتے ہیں۔ نیلے یاقوت کو فارسی میں نیلم اور ہندی میں نیلمن کہا جاتا ہے۔ بہ اعتبار رنگ اس کے مختلف نام مشہور ہیں جیسے:

یاقوت احمر۔ سرخ رنگ کا مائل بہ سیاہی۔ رنگ کی تیزی اس کی آب کو دبا دیتی ہے۔

ارغوانی یا تامڑا۔ تامڑا گنجے کی کھوپڑی کو کہتے ہیں یہ چمک اور آب میں کم ہوتا ہے۔

دردی یاقوت: سرخ مائل بہ زردی کم قیمت و معمولی۔

یاقوت رُمانی۔ قندھاری انار کے دانوں کی مانند آب دار، سرخ، درخشاں۔

کحلی یاقوت: سیاہی مائل۔ عام طور پر دستیاب ہے۔

کوکب یا گوھر شب چراغ: نہایت سرخ و شفاف۔ منور، درخشاں دہکتے ہوئے انگارے کی مانند جو اندھیرے میں بھی چمکے۔

لالڑی: یاقوت کی ادنیٰ قسم۔ رنگ پھیکا۔ چمک کم اور سختی میں نرم۔

چُنّی، گہرے سرخ رنگ کے کسور کے دانے کے برابر قدرتی دانے جو جڑاؤ زیورات میں کام آتے ہیں۔

لاجوردی اور پستئی یاقوت کمیاب ہیں۔ یاقوت کبود قیمت میں برتر ہوتا ہے۔ آگ میں ڈالنے سے یاقوت کا رنگ متغیر نہیں ہوتا ہیرے کے علاوہ یہ دوسرے تمام جواہرات کو کاٹ اور پیس سکتا ہے۔

ظفر اس کے لب رنگیں سے ہم تو کام رکھتے ہیں
کہاں کا لعل رمانی ہے یاقوت یمن کس کا

(بہادر شاہ ظفر)

یاقوت کا مادۂ پیدائش گندھک اور سیماب ہے مشہور ہے کہ پیگو میں جس جگہ یاقوت کا معدن ہے وہاں پر گندھک کی بو آتی ہے۔ یاقوت کی پیدائش کے لیے یمن، بدخشاں، برما، سیلون اور برازیل مشہور مقامات ہیں لیکن ان سب میں سیلون کا نام سرفہرست ہے۔ عربی مصنفوں نے تو اس کا نام ہی جزیرۂ یاقوت رکھ دیا تھا۔ مارکو پولو نے لکھا ہے کہ قوبلا قان نے ایک بڑے یاقوت کی تعریف سن کر اپنا ایک سفیر سیلون بھیجا تھا اور منہ مانگی قیمت دینے کا حکم دیا تھا لیکن وہاں کا راجہ اس کو فروخت کرنے پر راضی نہ ہوا معلوم ہوا کہ اس یاقوت کی قیمت اب کروڑوں روپے ہے۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ جزیرۂ سیلون میں یاقوت متعدد مقامات سے نکالا جاتا ہے۔ وہاں کی عورتیں یاقوت کے ہار اپنے گلے میں ڈالے رہتی ہیں یہاں تک کہ ہاتھوں میں اس کی چوڑیاں اور پاؤں میں اس کے پازیب بھی پہنتی ہیں۔ سفید ہاتھی کے سر پر سات یاقوت مرغی کے انڈے سے بھی بڑے زیور کے طور پر ہیں۔ یہ ہاتھی وہاں کے راجہ کا خاص ہاتھی ہے۔ ابن بطوطہ

ھالگس ۱۸۹۴ سک

نے راجہ کے یہاں ایک پیالی یاقوت کی دیکھی جو ہتھیلی کے برابر تھی اور اس میں عود رکھا ہوا تھا۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں ایک تولہ چار ماشہ گیارہ رتی یاقوت کی قیمت پچاس ہزار روپے قرار دی ہے جبکہ اس کے زمانے میں ایک روپیہ کا کئی من گیہوں فروخت ہوتا تھا۔

یاقوت کی انگشتری کا استعمال قضائے حاجات، دفع ضرر صاعقہ اور طاعون کے لیے مفید ہے۔ اس سے تشنگی بھی رفع ہوجاتی ہے اور دل کے واسطے تفریح و نشاط بھی۔ اس کے علاوہ یہ تقویتِ نورِ بصر، حفظِ صحت اور تحلیلِ انجمادِ خون کے لیے بھی نافع ہے۔ یہ بدبوئے دہن کو دور کرتی ہے۔

(۴) **زمرّد**۔ زمرد کو ہندی میں پنا کہتے ہیں۔ رتنوں میں اس کو نفیس اور بہترین قرار دیا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ سونے کی کان میں پیدا ہوتا ہے اور اس کا اصل مادہ بھی سونا ہی ہے جو جمنے سے سبز ہو جاتا ہے اور اکیس سال میں زمرد کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ بعض لوگ زمرد اور زبرجد کو ایک ہی جنس سمجھتے ہیں کہ اختلاف مادہ سے علیحدہ علیحدہ صورتیں اختیار کرلیتا ہے لیکن سختی میں برتر ہے۔ زبرجد نرم اور ملائم پتھر ہے۔ جبکہ زمرد سخت ترین ہے۔ پرانی کان کا زمرد سبز تر اور نئی کان کا سفیدی مائل سبز ہوتا ہے۔ اس کا رنگ جتنا زیادہ شفاف اور گہرا سبز ہوا اتنا ہی قیمتی ہوتا ہے۔ وہ زمرد جو شفاف نہ ہو اور اس کی رنگت میں مکڑی کا جالا سا ہو وہ عیب دار اور منحوس سمجھا جاتا ہے۔ زمرد کو برسات میں پہنتے ہیں اس لیے اس کو "برکھا رُت کا جوہر" کہا جاتا ہے۔

زمرد کی اقسام بہ اعتبار رنگ مختلف ہیں۔ مثلاً:

ذبابی زمرد۔ اس کا رنگ ذباب سبز (سبز مکھی) کی مانند ہوتا ہے۔ مشہور ہے کہ ذبابی زمرد پہننے والے شخص پر مکھی نہیں بیٹھتی ہے۔ اس لیے اس کو بہترین سمجھا جاتا ہے۔ اس کے صاف و شفاف رنگ میں آب متموج اور رقصاں معلوم ہوتی ہے۔ اگر اس میں صورتِ مستقیم مخفی مرئی و رقصاں نظر آئے تو اسے "صعیدی زمرد" کہتے ہیں۔

ریحانی زمرد۔ اس کو زمرد نو، بھی کہتے ہیں۔ اس کا رنگ برگِ ریحان کے مانند ہوتا ہے۔

سلقی زمرّد۔ چقندر کے پتوں کی مانند مائل بہ سیاہی رنگ کا۔

زنگاری زمرد۔ زنگار یعنی طوطیا سے سبز اور تانبے کے کساؤ کے رنگ کا۔

کرّاثی زمرّد۔ گندنا اور لہسن و پیاز کے پتوں کے رنگ کا

اشتی زمرّد۔ دھان کے پتوں سے مشابہ رنگ کا۔

فستقی زمرّد۔ سبزی مائل بہ سیاہی رنگ کا یہ زمرد کہنہ ہوتا ہے۔

مرگج۔ یہ زمرد کی مادیں ہے۔ اس کا رنگ ہلکا سبز مائل بہ سفیدی ہوتا ہے۔ اس کو صابونی بھی کہتے ہیں۔ غیر شفاف اور کم رنگ ہونے کی وجہ سے یہ زمرد کی ادنیٰ قسم ہے۔

زمرد کی انگوٹھی کا استعمال رفع طاعون کے لیے موثر اور قروح خبیثہ کے لیے مفید ہے۔ اگر ایک مثقال (ساڑھے چار ماشہ) زمرد کو ایک ایک مثقال سونا و چاندی ملا کر انگوٹھی میں جب آفتاب طالع میزان کے برج ہوائی میں ہو نصب کیا جائے تو تسخیر قلوب اور ہیبت نظر کے واسطے بے نظیر ہوگی۔ قضائے حوائج کے لیے بھی مجرب ہوگی۔ اس کے علاوہ بے شمار فوائد اور بھی اس کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔ مثلاً مشہور ہے کہ اگر اس انگوٹھی کو پہننے والے کے سامنے زہر آلود طعام آتا ہے تو زمرد پسیجنے لگتا ہے۔ اس کو پہننے والے کو کبھی معیشت کی تنگی نہیں ہوتی ہے۔ یہ بھی روایت ہے کہ افعی اس کو دیکھ کر اندھا ہوجاتا ہے یا اس کی آنکھوں سے پانی جاری ہوجاتا ہے صاحبِ مخزن نے لکھا ہے کہ انھوں نے افعی کی آنکھوں پر زمرد لگا کر دیکھا تھا لیکن نہ وہ اندھا ہوا اور نہ اس کی آنکھوں سے پانی جاری ہوا۔ زمرد کی انگوٹھی کے مسلسل استعمال سے آنکھوں کی روشنی بھی بڑھتی ہے۔

دواؤں میں زمرد کے استعمال سے جملہ بیت غریزی اور اعضائے رئیسہ کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ مرگی، خفقان، جلندر، یرقان اور کوڑھ کو نافع ہے۔

(۵) **موتی**۔ موتی کو عربی میں لؤلؤ، اور فارسی میں مروارید اور دُر کہا

جاتا ہے۔ یہ معدنی پیداوار نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اس کا شمار جواہرات میں ہوتا ہے۔ جواہرات اور موتی میں ایک فرق تو یہ ہے کہ جواہرات دوسرے معدنیات کی طرح کان سے نکالے جاتے ہیں اور موتی ایک سمندری جانور صدفہ کے جسم میں پرورش پاتا ہے۔ موتی دوسرے جواہرات کی بہ نسبت نرم ہوتے ہیں اور ان پر آسانی سے خراش ڈالی جاتی ہے۔

موتی کی پیدائش کے متعلق زمانۂ قدیم سے طرح طرح کی روایتیں مشہور ہیں، جیسے یہ سمندری جانور صدفہ کی بیماری کے دانے ہیں یا ابرِ نیسان کی پہلی بوند سے سیپ میں موتی، کیلے میں کافور، سانپ میں زہر اور ہاتھی میں گج مکتی پیدا ہوتا ہے، لیکن یہ ساری روایتیں غلط ہیں۔ جدید تحقیق سے یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ موتی ایک خاص قسم کے صدف کے مادے سے تیار ہوتے ہیں۔ یہ مادہ صدف کی تہ میں جمع رہتا ہے جس کو "صدفی تہ" کہا جاتا ہے۔ جب کوئی خارجی ذرّہ یا کیڑا مکوڑا اس صدفہ میں داخل ہوتا ہے تو صدف ساز خلیے اس ذرّہ کو لعاب دار مادے سے گھیر لیتے ہیں اور اس ذرہ یا کیڑے پر مادے کی تہیں چڑھتی رہتی ہیں اور کچھ سال کے بعد موتی بن جاتا ہے۔ موتی کا رنگ بھی وہی ہوتا ہے جو اس صدفی مادہ کا ہوتا ہے۔

عام طور پر موتی تین قسم کے پائے جاتے ہیں۔ اول تو قدرتی موتی جو صدفے میں خود بخود بنتے ہیں۔ دوم کلچرڈ موتی جو مصنوعی طور پر صدفے کے اندر پالے جاتے ہیں۔ یہ کم وقت میں تیار ہو جاتے ہیں اور ان کی تہیں قدرتی موتیوں سے کم اور موٹی ہوتی ہیں۔ کلچرڈ موتی کی کاشت جاپان میں بہت ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ شیشے کے نقلی موتی بھی ہوتے ہیں جو پالش کیے ہوئے بازار میں عام طور پر ملتے ہیں۔

موتی بڑے سے بڑا کبوتر کے انڈے کے برابر اور چھوٹے سے چھوٹا خشخاش کے دانے کے برابر ہوتا ہے۔ بڑے موتی کی قیمت اس کے سائز کے اعتبار سے بڑھتی جاتی ہے اور چھوٹے موتی عام طور پر وزن کے حساب سے فروخت ہوتے ہیں اور دواؤں کے کام آتے ہیں۔ بڑے موتی زیورات کے کام میں آتے ہیں اور کبوتر کے انڈے کے برابر موتی تو نوادرات میں شمار ہوتا ہے۔

موتی بہت کم گول ہوتے ہیں۔ زیادہ تر گھونگھی نما، قطرہ نما اور غیر معین شکل کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح ان کا رنگ بھی مختلف ہوتا ہے۔ رنگ اور شکل کے اعتبار سے موتی مختلف ناموں سے پکارے جاتے ہیں۔ مثلاً

دُرِ غلطاں۔ بالکل گول موتی جو اپنی گولائی کے سبب ایک جگہ قائم نہیں بلکہ غلطاں رہتا ہے۔ اس کو قیمتی خیال کیا جاتا ہے۔

دُرِ شہوار۔ بڑا اور خوش آب موتی جو بادشاہوں کے خزانے میں ہی ملتا ہے۔

دُرِ یتیم۔ وہ موتی جو سیپ میں ایک ہی بنے۔ یہ عموماً بڑا اور قیمتی ہوتا ہے۔ اس کو دُرِ یکتا بھی کہتے ہیں۔

شلغمی موتی۔ ایک طرف سے چپٹا اور گول موتی جو دوسری طرف سے ٹھیک دار ہو۔

عدسی موتی۔ مسور کے چھلکے کے رنگ کا موتی۔ اس کو ہندی میں کاکاپاسی کہتے ہیں

نجم۔ بالکل سفید بغیر کسی رنگ کا موتی۔

یتنی موتی۔ زردی مائل سفید موتی۔ دونوں کناروں سے قدرے دبا ہوا۔

رصاصی۔ قوس قزح کے مانند ہفت رنگی جھلک کا موتی۔

رمانی۔ سرخ رنگ کا موتی۔

شمعی۔ دھانی رنگ کی جھلک کا موتی۔

شیر فام۔ دودھ کی رنگت کا سفید موتی۔

عباسی۔ ترنجی رنگ کا موتی۔

موتی کی پیداوار کے لیے بحرین اور عمان مشہور مقامات ہیں۔ اس کے علاوہ سیلون، برازیل اور ہندوستان میں بھی پیدا ہوتا ہے۔ جس سمندر کے نیچے کی جگہ سنگلاخ ہو وہاں کا موتی اچھا سمجھا جاتا ہے۔

موتی اعضائے رئیسہ، دل، دماغ اور آنکھ کو تقویت بخشتا ہے۔ بہتے ہوئے خون کو روکتا اور بند کرتا ہے۔ وحشت، جنون اور بدبو کو...

کو دور کرنے میں مفید ہے۔ بواسیر کو نافع ہے۔ اس کا سرمہ اور محلول آشوبِ چشم میں فائدہ دیتا ہے اسی طرح اس کا سنون بھی مقوی دندان ہے۔ فسادِ خون کی بیماریوں میں مفید ہے اس کو حل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ خوب باریک پیسنے کے بعد ایک شیشی میں بھر کر اس میں آبِ ترنج بھر دیا جائے اس شیشی کو گِلِ حکمت کرکے ایسے برتن میں معلق لٹکا دیا جائے جس میں سرکہ بھرا ہو۔ پھر اس برتن کو گھوڑے کی لید میں دفن کر دیا جائے۔ چودہ روز میں مروارید محلول ہو جائے گا بعض لوگ غیر شفاف اور کم رنگ موتی کو صاف کرکے اس کی قیمت بڑھا لیتے ہیں۔ اس کو صاف کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ کبوتر یا مرغ کو کھلا دیا جائے۔ اس کے معدہ کی گرمی سے موتی صاف ہو جاتا ہے۔ اول تو وہ پرند اپنی بیٹ میں ہی صاف شدہ موتی خارج کرے گا ورنہ پھر اس کو ذبح کرکے پوٹے یا سنگ دانہ سے نکال لیا جائے

موتی یا دُر کو اردو شاعری میں خصوصی جگہ ملی ہے۔

آبرو اپنے غلاموں کی بڑھانے کے لیے آج دریائے کرم کا دُرِ غلطاں آیا
سچ ہے کہ آبرو کوئی موتی کی آب ہے تم نے جو دُر[1] کہا میری عزت بگڑ گئی
(جلال لکھنوی)

(۶) فیروزہ۔ یہ مشہور پتھر فیروزی، آسمانی، سِلا اور سبز ہوتا ہے۔ اس کا معدن نیشاپور، خجند، کرمان، شیراز، آذربائیجان اور ہرات میں ہے۔ سب سے بہترین اور خوش رنگ فیروزہ نیشاپور کا ہوتا ہے اس کا رنگ صاف اور متوازی ہوتا ہے۔ مشہور ہے کہ ہوا کی صفائی کے ساتھ فیروزہ صاف ہوتا ہے اور ہوا کی کدورت اس کو بھی مکدر کر دیتی ہے۔ مشک کی خوشبو، پسینہ اور چربی سے بدرنگ ہو جاتا ہے۔ اس کو مردہ تصور کرتے ہیں۔ ارسطو کے نزدیک جو رتن بھی مردہ ہو جائے اور اپنا رنگ خراب کرے اس کو نہ پہننا چاہیے۔ اس قسم کے فیروزہ کو ابو اسحاق کہتے ہیں۔ یہ آٹھ قسموں کا ہوتا ہے۔ ازہری، سلیمانی، درنوئی، آسمان گونی یا خاکی، عبدالحمیدی، اندلسی اور گنجیہ۔ آخری قسم سب سے کم قیمت اور ارزانی ہے۔ سُنہری جھلک والے فیروزہ کو سیلا اور آسمان گونی فیروزہ کو کٹبلا کہتے ہیں۔

فیروزہ کا مادۂ تکون میں کثیر گندھک اور قلیل سیماب ہے۔ اس کا انعقاد نظرِ زحل سے سرد و سرد یا کر سات سال میں ہوتا ہے

کرمان اور شیراز کا فیروزہ قدرے سفیدی مائل ہوتا ہے۔ اس کو تیر بوم کہتے ہیں۔ نیشاپوری فیروزہ میں نیلاہٹ زیادہ ہوتی ہے۔ اسے نیل بوم کہتے ہیں۔ یہ حرارتِ عزیزی، روحِ باصرہ اور دل و دماغ کے لیے مقوی ہے۔ اس کا استعمال (پہننا)، دشمن پر فتح مندی کا سبب ہوتا ہے۔

(۷) زبرجد۔ یہ پتھر بھی زمرد کی مانند سونے کی کان سے برآمد ہوتا ہے۔ اس کے کئی مختلف رنگ ہوتے ہیں۔ صاف اور کم رنگ کو مصری، زردی مائل بہ سبزی کو قبرسی اور زردی مائل بہ سرخی کو ہندی زبرجد کہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ قمر جب منزلِ حوت میں ہو تو اس پر صورت عین مرکی کندہ کرکے انگشتری میں نصب کرنا چاہیے۔ یہ انگشتری باعثِ تسہیلِ ولادت اور فرحتِ قلب دار وارج ہوتی ہے جب طالع سرطان میں ہو تو اس پر مچھلی کی صورت کندہ کرکے جال میں لگا لیا جائے۔ رانگے میں لپیٹ کر تو مچھلیاں بہ آسانی جال میں آجاتی ہیں۔ یہ بھی مشہور ہے کہ زبرجد کے پیالے میں شراب پینے سے نشہ نہیں ہوتا ہے۔

ان کا رنگِ سبزۂ رخسار گہرا ہو گیا جو زبرجد تھا زمرد کا نمونا ہو گیا
(داغ)

(۸) لاجورد۔ یہ مخصوص اور مشہور پتھر ہے جو عموماً کاشغر سے درآمد ہوتا ہے۔ اس کا اصلی رنگ نیلا براق نقطہائے طلاء کے ساتھ ہے۔ یہی بہترین سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد کبود بہ سرخی بنفشی اور سبزی مائل بھی ہوتا ہے۔

لاجورد کے داخلی و خارجی استعمال سے دردِ گردہ، وحشت و غم اور امراضِ سوداویہ کو فائدہ ہوتا ہے۔ دل و دماغ کو فرحت دیتا ہے۔ آشوبِ چشم اور جالے و ماڈے کو مفید ہے۔ اس کی بنی ہوئی سلائی پھیرنا آنکھوں کے امراض کے لیے بالخاصہ مفید ہے۔

[1] دُر ہندی میں کلمہ تحقیر و تنفر ہے۔ اس کے معنی ہیں دور ہو جا۔ نکل جا

اس کا رنگ بھی تیار کیا جاتا ہے جو فیروزی ہوتا ہے۔ آتش کہتے ہیں۔ کرتے مصور اس کو تصویر خضر میں صرف ہوتا جو ترے خط سا کچھ لاجوردیا

(۹) یشب۔ یہ پتھر مختلف الالوان اور سخت ترین ہے۔ اس کا سب سے بہتر رنگ زیتونی سمجھا جاتا ہے۔ پھر سبز مائل بہ زردی اور اس کے بعد سبز مائل بہ سفیدی۔ آخر والے کو کافوری بھی کہتے ہیں یشب کی قیمت اس کے خوش رنگ ہونے، صفائی ہیلی اور شفاف ہونے پر منحصر ہے۔ کہتے ہیں کہ قمر جب برج آتشی میں ہو تو اس پر صورت انسانی کندہ کر کے انگوٹھی میں نصب کرنا چاہیے۔ یہ الو ہی آلام باطنی، وسواس، خفقان اور امراض دماغی کے لیے نافع ہوتی ہے۔ اس کا داخلی استعمال دل اور معدہ کو قوت دیتا ہے۔ بستہ خون کو تحلیل کرتا ہے اور مرگی میں مفید ہے۔

مرجان۔ مرجان کو ہندی میں مونگا کہتے ہیں یہ ایک سمندری درخت ہے مگر اس کا شمار بھی جواہرات میں ہوتا ہے۔ مونگے کا درخت شاخ دار بے برگ و ثمر ہوتا ہے جس کو ایک سمندری جانور اپنے لعاب دہن سے بناتا ہے یا ان جانوروں کا گھر ہے یہ جانور مونگے کے پہاڑ، دیواریں اور جزیرے تک بنا ڈالتے ہیں۔ اس کی جڑ کو بُسد کہتے ہیں۔

مونگے کے مختلف رنگ ہوتے ہیں یعنی سُرخ، سفید اور سیاہ۔ بہترین مونگا بڑا سرخ، بے جرم اور بے سوراخ کا ہوتا ہے۔ اس کے بعد سفید کا درجہ ہے۔ سیاہ سب سے ادنیٰ سمجھا جاتا ہے۔

اس کا استعمال فالج، لقوہ اور رعشہ کے لیے مفید ہے۔ معدہ، جگر و طحال کو طاقت دیتا ہے۔ بچوں کے گلے میں ڈالنے سے نیند میں چونکنے، دانت کٹکٹانے اور ڈر کر رونے کے لیے نافع ہے

(۱۱) عقیق۔ سرخ رنگ کا ایک پتھر ہے جس کی اکثر مہریں کھودتے ہیں اور انگوٹھیوں میں لگاتے ہیں۔ دوسرے جواہرات کی مانند آگ کا اس پر بھی اثر کم ہوتا ہے۔ سب سے بہتر عقیق یمن کا سمجھا جاتا ہے جو سختی میں بھی زیادہ ہوتا ہے اس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں سرخ، زرد، سفید و سیاہ۔ ان میں سے ہر ایک ہمہ رنگ، کم رنگ، صاف و شفاف، مکدر و غیر شفاف ہوتا ہے معدن سے نکلتے وقت کم رنگ ہوتا ہے لیکن اس کو طبخ دے کر رنگین کیا جاتا ہے اور اس کے بعد تراشا جاتا ہے۔ بعض نگوں پر شاخ و درخت کی شکل بنی ہوتی ہے۔ اس کو عقیق شجری کہتے ہیں۔ اکثر عقیق سیاہ کی بالائی سطح کے خطوط سفید ہوتے ہیں۔ ایسے عقیق کو سنگ سلیمانی اور باباغوری کہتے ہیں۔ اس کی تسبیح بنائی جاتی ہے۔

احادیث میں عقیق کی فضیلت و بے شمار خواص و فوائد مذکور ہیں۔ اس کو پہننے سے غضب و غصہ کی حدت و تیزی کم ہوتی ہے خفقان اور وسواس کو تسکین ہوتی ہے۔ تسخیر قلوب اور استجابت دعوات کے لیے مفید ہے کہتے ہیں کہ عقیق کو مشک و کافور در روغن زیتون میں بسا کر انگوٹھی میں نصب کیا جائے اور بادشاہ و حکام کے سامنے جاتے وقت اس کو اپنے ہاتھوں اور منہ پر ملا جائے تو قدر و منزلت حاصل ہوتی ہے اور اس کی انگوٹھی کو پہننے والا محبوب خلائق ہوتا ہے۔ اردو شعرا کے یہاں اس کا ذکر بھی اکثر ملتا ہے۔

آوبرہ ترے گوش کا ہو اس آب در کیا کیا عقیق کان یمن سے نکل گیا
(آتش)

سارا جہان نام کے پیچھے ساتھ ہے انسان کیا، عقیق یمن سے نکل گیا
(امیر مینائی)

(۱۲) دہنہ فرنگ۔ دہنہ فرنگ مشہور پتھر ہے جو تانبے اور چاندی کی کان سے برآمد ہوتا ہے۔ یہ مختلف الالوان ہوتا ہے سب سے بہتر رنگ سبز تیرہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے بعد طاؤسی مائل بہ سرخی، پھر زرد رنگ کہ سب سے ادنیٰ ہوتا ہے۔ فولاد پر گھسنے سے یہ سونے، چاندی اور تانبے کا کس دیتا ہے۔ سونے کے کس والا سب سے اعلیٰ سمجھا جاتا ہے اور اس کے بعد چاندی کے کس کا۔ دہنہ فرنگ جس کس کا ہو اس کو اسی دھات کی انگوٹھی میں پہنا جاتا ہے۔ مشہور ہے کہ یہ درد گردہ کو جذب کر لیتا ہے یا درد کی شدت سے خود ہی پھٹ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ حافظ روح اور پاک کنندہ سموم ہے۔ اس کا سرمہ بینائی کو قوت دیتا ہے۔

اردو اکادمی کی ایک سال کی سرگرمیوں پر ایک سرسری نظر

اور آئندہ کا پروگرام

اتر پردیش اردو اکادمی کی مجلس انتظامیہ کی پہلی میٹنگ ۳۰ جنوری ۷۲ء کو منعقد ہوئی تھی۔ اس وقت سے اب تک ایک سال کے عرصے میں اردو اکادمی کی کونسل کی ایک میٹنگ (۱۵ جولائی ۷۲ء) اور مجلس انتظامیہ کی سات میٹنگیں ہو چکی ہیں۔

مجلس انتظامیہ کے فیصلے کے مطابق اس وقت حسب ذیل دس سب کمیٹیاں اکادمی کے مختلف شعبوں کی دیکھ بھال کر رہی ہیں (متعلق مسائل پر پہلے سب کمیٹی غور کرتی ہے اور اس کی سفارش کو مجلس انتظامیہ کے سامنے تحریری صورت میں پیش کیا جاتا ہے مجلس انتظامیہ کے فیصلے کے بعد کارروائی کی جاتی ہے۔)

(۱) تعلیمی سب کمیٹی (۲) انعامی سب کمیٹی (۳) مسودات سب کمیٹی (۴) لائبریری سب کمیٹی (۵) امداد مصنفین سب کمیٹی (۶) اشاعت کتب سب کمیٹی (۷) رابطۂ عوام سب کمیٹی (۸) تقریبات سب کمیٹی (۹) اکاؤنٹس سب کمیٹی اور (۱۰) تقررات سب کمیٹی ان سب کمیٹیوں کی متعدد نشستیں ہو چکی ہیں۔

اردو اکادمی کا بجٹ جو حکومت نے منظور کیا ہے 510,000/ روپیہ ہے۔ اس میں سے 10,000/- ۱ روپے کتب خانوں اور دارالمطالعوں کے لیے اردو کتابیں رسائل اور اخبارات خریدنے کے واسطے مخصوص کر دیا گیا ہے اور 00,000/-۱ روپیہ کتابوں پر انعامات دینے کے لیے دیا گیا۔ تین لاکھ اردو اکادمی کے زیر اہتمام کتابوں کی اشاعت، اردو کے معمر اور مالی حیثیت سے پریشان ادیبوں اور شاعروں کو مالی امداد دینے، اردو ریسرچ کے لیے اردو اسکالرس کو مالی امداد دینے، اردو مسودات کی طباعت میں جزوی مالی امداد دینے، اردو کے سلسلے میں سیمینار منعقد کرانے اور مشاعرہ، سیلوں کا کلچر کرانے اور دفتر کے اخراجات کے لیے رکھا گیا ہے۔

اردو اکادمی کے پہلے سال یعنی ۷۲-۱۹۷۱ء میں ۵ لاکھ ۵ ہزار روپے کی رقم دی گئی تھی۔ یہ رقم ٹریزری سے نکال کر فروری ۷۲ء کے اخیر میں ایک بینک میں جمع کر دی گئی۔ اس رقم میں ۳۱ مارچ ۷۲ء تک تقریباً ڈیڑھ ہزار روپیہ صرف ہو سکا تھا حکومت نے ۷۳-۷۲ء کے بجٹ میں ۵ لاکھ دس ہزار روپیہ اردو اکادمی کے لیے منظور کر دیا اور اس طرح مالی سال رواں کے شروع میں اردو اکادمی کے پاس تقریباً دس لاکھ انیس ہزار روپیہ موجود تھا۔

اردو اکادمی نے اس وقت تک ۱۴۷ کتب خانوں اور دارالمطالعوں کو اردو کتابوں رسالوں اور اخبارات خریدنے کے لیے ایک لاکھ پانچ ہزار روپیہ منظور کیا ہے کتب خانوں سے اکادمی کے تیار کیے ہوئے فارم پر مالی امداد کے لیے دوبارہ درخواستیں طلب کی گئی ہیں۔ درخواستیں موصول ہو جانے پر سب کا ایک چارٹ تیار کیا جائے گا اور پہلے لائبریری سب کمیٹی ان پر غور کرے گی پھر مجلس انتظامیہ کے فیصلے کے بعد مارچ کے اندر اندر ایک لاکھ دس ہزار روپے اور انھیں تقسیم کر دیے جائیں گے۔ جن کتب خانوں کو مالی امداد ملی ہے ان کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ دوسری درخواستیں اس وقت بھیجیں جب اس کے ہمراہ مجاز آفیسروں کے دستخط سے یوٹی لائزیشن سرٹیفکیٹ بھی منسلک ہو۔

انعامی سب کمیٹی اس وقت تک ۸۳ اردو مصنفین کو جو ملک کے مختلف شعبوں میں پھیلے ہوئے ہیں تقریباً ۸۶ ہزار روپے ان کی شائع شدہ کتابوں پر تقسیم کر چکی ہے یکم دسمبر ۷۱ء سے ۳۱ دسمبر ۷۲ء تک کی مدت میں شائع شدہ اردو کتابیں ۲۲ جنوری ۷۳ء تک طلب کی گئی تھیں اور تقریباً ۱۱۵ کتابوں کی آٹھ آٹھ جلدیں اکادمی کے دفتر کو موصول ہو چکی ہیں

ہر کتاب کی ایک جلد حسب قاعدہ انعامی سب کمیٹی کے ممبران کو بھیج دی جائے گی اور مارچ کے شروع میں انعامی سب کمیٹی کی میٹنگ بلائی جائے گی تاکہ اراکین اس کے بارے میں رائے دے سکیں۔ سب کمیٹی کی سفارشوں کو مجلس انتظامیہ کے سامنے جو مارچ کے وسط تک بلائی جائے گی پیش کیا جائے گا۔ اور پوری امید ہے کہ ایک لاکھ روپیہ جو ۷۳-۱۹۷۲ء کے تحت میں مخصوص کیا گیا تھا مارچ کے اندر ہی خرچ ہو جائے گا اس طرح شائع شدہ معیاری اردو کتابوں پر ان کے مصنفین کو تقریباً دو لاکھ روپیہ تقسیم کر دیا جائے گا۔

اکاڈمی معیاری اور مفید مسودوں کی طباعت میں اخراجات کے پچاس فی صدی تک مالی امداد دیتی ہے۔ اس وقت تک تقریباً ایک سو بیس مسودے اکاڈمی کو موصول ہوئے اور ۲۳ مصنفین کو ۲ ہزار سات سو پچاس روپیہ ان کے مسودوں کی طباعت میں مالی امداد کے طور پر دیا گیا۔ مسودات کی طباعت کے سلسلے میں اکاڈمی کے لیے کچھ قواعد و ضوابط بھی وضع کیے گئے ہیں۔

معمر، معذور اور مالی حیثیت سے پریشان اردو مصنفوں اور شاعروں کو مالی امداد دینے کے لیے بھی قواعد و ضوابط تیار کیے گئے ہیں اور ان کے مطابق اس وقت تک ۱۸ ادیبوں اور شاعروں کو کل ملا کر سات ہزار آٹھ سو پچاس روپیہ منظور کیا گیا۔ اردو کے ایک مشہور ادیب جناب حامد اللہ افسر میرٹھی کو جو بہت بیمار اور مالی حیثیت سے پریشان ہیں یکم دسمبر ۱۹۷۲ء سے سو روپیہ ماہانہ مالی امداد منظور کی گئی ہے اور ایک دوسرے شاعر جناب نشور واحدی کو جو ملازمت سے ریٹائر ہو چکے ہیں اور انھیں کوئی پنشن بھی نہیں ملتی اس مہینے سے سو روپیہ ماہانہ دینے کی سفارش کی گئی ہے۔

اکاڈمی کے اغراض و مقاصد میں ایک نہایت اہم مقصد اکاڈمی کے زیر اہتمام مختلف موضوعات پر کتابیں شائع کرانا، دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمہ کرا کر کتابیں شائع کرانا، بچوں سے متعلق کتابیں شائع اور نایاب اہم کتابوں کو دوبارہ شائع کرانا شامل ہے۔ اکاڈمی نے اب اس پروگرام پر بھی عمل درآمد شروع کر دیا ہے۔ اشاعت کتب سب کمیٹی نے اکاڈمی کے زیر اہتمام شائع ہونے والی کتابوں کے سلسلے میں قواعد و ضوابط وضع کر لیے ہیں۔ ان قواعد و ضوابط کے مطابق جن مصنفین کی کتابیں اردو اکاڈمی شائع کرے گی انھیں کتابوں کی قیمت فروخت پر دس فی صدی رائلٹی دی جائے گی جس میں حق طبع بھی شامل ہے۔ اکاڈمی نے فی الحال اپنے اہتمام میں تین کتابیں شائع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پہلی کتاب جناب ناز ش پرتاب گڈھی کی قومی نظموں کا مجموعہ "نیا ساز نیا انداز" ہے، دوسری کتاب جناب علی جواد زیدی کی "قصیدہ نگاران اتر پردیش" اور تیسری کتاب ڈاکٹر محمد حسن کی "اردو ادب کی تنقیدی تاریخ حصہ اول" ہے۔ اکاڈمی اردو کی تعلیم سے متعلق تمام سرکاری احکام یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کرانے کا ارادہ بھی رکھتی ہے۔ ان سرکاری احکام کا اردو ترجمہ ہو گیا ہے۔ اگلے سال سے اکاڈمی کے اس پروگرام پر زیادہ سرگرمی سے عمل درآمد ہوگا۔ کتابوں کے موضوعات طے کیے جائیں گے اور مصنفین سے نئی کتابیں لکھوائی جائیں گی وغیرہ۔

اردو اکاڈمی کی ایک نہایت اہم تعلیمی سب کمیٹی ہے جو اردو تعلیم کے سلسلے میں مختلف پہلوؤں پر غور کرتی رہی ہے اور اس پر مجلس منتظمہ فیصلہ کرتی ہے۔ اکاڈمی اس وقت تک اردو تعلیم سے متعلق ۵۰-۶۰ تجویزیں منظور کر چکی ہے ان کا تعلق پرائمری سطح سے لے کر اسکول کی سطح تک ہے۔ یہ تمام تجویزیں حکومت کے پاس بھیج دی گئیں۔ اردو تعلیم اور اردو سے متعلق دوسرے امور کے سلسلے میں ایک میمورنڈم تیار کر لیا گیا ہے، جس میں اردو تعلیم کے سلسلے میں اور اردو کے سلسلے میں عام طور سے پیش آنے والی تمام دقتوں کو بیان کر دیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ یہ دقتیں کیسے دور ہو سکتی ہیں۔

تقریبات سب کمیٹی کا مقصد یہ ہے کہ اردو کو فروغ دینے کے سلسلے میں سیمینار، لیکچر اور دوسری تقریبات کا انتظام کیا جائے۔ یہ سب کمیٹی حال ہی میں تشکیل ہوئی ہے اور اساتذہ اردو جامعات ہند کی چوتھی کانفرنس کے موقع پر پہلی تقریب اکاڈمی کی طرف سے کی گئی اور ایک مذاکرہ کا بھی اہتمام کیا گیا۔ سب کمیٹی نے اردو کے تعلیمی مسائل، آزادی کے بعد اردو مسائل اور اردو کی موجودہ صورت حال پر سیمینار کرنے کے علاوہ ایک شب افسانہ منانے کا بھی پروگرام بنایا ہے جس میں یہ تجویز کی گئی ہے کہ سارے ہندستان سے اردو کے تمام مشہور افسانہ نگار لکھنؤ مدعو کیے جائیں اور دونشستوں میں ان سے غیر مطبوعہ اور تازہ ترین افسانے سنانے کی استدعا کی جائے۔ اس موقع پر اردو افسانہ نگاری پر دو ایک مقالے پڑھوانا بھی پروگرام میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ ایک شب



لکھنؤ میں ریاستی اتر پردیش لاٹری کی ۱۲ویں قرعہ اندازی. تصویر میں دائیں اور زیڈ سیر پرنٹ کے ہمراہ دکھائی دے رہے
ہیں جنہیں اوّل انعام ملے

Regd No. L 319



یوم جمہوریہ کی پریڈ کے موقع پر نئی دہلی میں ملک بھر کے ۲۲ ٹیبلوؤں نے ثقافتی جلوس میں حصہ لیا۔ ان ٹیبلوؤں کے ذریعے
ہندوستان کی جد و جہد آزادی کو پیش کیا گیا تھا۔ تصویر میں مختلف ریاستوں کے ٹیبلوؤں کا جلوس راج پتھ سے گزر رہا ہے